بسم الله الرحمن الرحيم

سرسیدین

پاکستانی ادب

(چار جلدوں میں)

دوسری جلد

ترتیب و انتخاب

رشید امجد

فاروق علی

مجلہ	:	سرسیدین۔ پاکستانی ادب
ترتیب و انتخاب	:	رشید امجد۔ فاروق علی
ناشر	:	فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج راولپنڈی
طبع	:	اوّل، جولائی ۱۹۸۱ء
مطبع	:	ایس۔ ٹی۔ پرنٹرز دریا آباد راولپنڈی
کتابت		اعجاز کھوکھر
تعداد	:	گیارہ سو
قیمت	:	پچاسی روپے

اشتراک:

آرمی ایجوکیشن پریس، جی۔ ایچ۔ کیو

پوسٹ بکس نمبر ۱۷۹، راولپنڈی

پاکستانی نثری ادب

انتخاب

۱۹۴۷ء — ۱۹۸۰ء

ترتیب

(حروفِ تہجی کی ترتیب سے)

سفرنامہ

طنز و مزاح

افسانہ

ا

ب

انشائیہ

خاکے

يُؤْتِى الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِىَ خَيْرًا كَثِيْرًا

(اللہ تعالیٰ) جس کو چاہتا ہے دانائی عطا کرتا ہے اور جس کو دانائی عطا کی جاتی ہے گویا کہ اسے خیرِ کثیر عطا کر دیا جاتا ہے،

(القرآن)

ابتدائیہ

رشید امجد

پاکستانی ادب کی دوسری جلد نثری اصناف سے متعلق ہے۔

اس جلد میں پاکستان کا خواب، قائدِاعظم کی آواز اور غالب سے اقبال تک تین ایسے مضامین ہیں جو پاکستان کی تاریخ کے تین اہم ادوار کا تعین کرتے ہیں، تخلیقی نثر کے انتخاب میں سفرنامے، طنزومزاح، افسانے، انشائیے اور خاکے شامل کئے گئے ہیں۔ ان تمام تخلیقات میں پاکستان کہیں بلاواسطہ اور کہیں بالواسطہ پس منظر میں موجود ہے کہ ان کے لکھنے والے اسی سرزمین پر سانس لیتے ہیں اور پاکستان کو ایک زندہ مظہر کے طور پر محسوس کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ پاکستانی ادب موضوعات کے حوالے ہی سے نہیں بلکہ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔ پاکستانی اردو کا سمندر اپنی علاقائی زبانوں کے دریاؤں سے بھرا پڑا ہے، اس کے مرکزی مزاج پر علاقائی لب و لہجہ کے اثرات نے اسے ایک تشکل عطا کی ہے، پاکستان کی مجموعی ثقافت بھی علاقائی رہن سہن اور مزاج سے مرتب ہوتی اور نکھرتی ہے، یوں پاکستانی ادب کے ڈانڈے اپنے علاقائی ادب اور لوک ثقافت میں دور تک اترتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے اب تک پاکستانی ادب کی مختلف اصناف مسلسل ارتقائی سفر میں رہی ہیں، اور نہ صرف موضوعات اور تکنیک کی سطح پر بلکہ اسلوب و اظہار میں بھی نت نئے تجربوں کی گرماہٹ اور نئی نسل کا تازہ خون شامل ہوتا رہا ہے۔ کسی ملک کے ادب کے لئے یہ تجربے اگرچہ وقتی طور پر افراط و تفریط کی صورت ضرور پیدا کرتے ہیں، لیکن مجموعی لحاظ سے ایسے تجربے ادب کی عصری صداقتوں اور روحِ عصر کے علمبردار ہوتے ہیں۔ پاکستانی ادب کی نثری اصناف میں سے سفرنامہ، افسانہ اور انشائیہ خاص طور پر نئے تجربوں سے آشنا ہوئے ہیں، جن کی وجہ سے نہ صرف ان اصناف میں موضوعاتی تنوع اور تکنیکی رنگارنگی پیدا ہوئی بلکہ نئی نسل نے اپنے تازہ ذہن اور گہری تخلیق سے انہیں زندگی کے معیار، برتری اور رفتار سے بھی ہم آہنگ کیا۔ پچھلے دس پندرہ سالوں میں سفرناموں کا گویا احیاء

ہوا ہے اور کسی حد تک سفرناموں نے کہانی کی جگہ لینے کی کوشش بھی کی ہے۔ نت نئی دنیاؤں کی رنگین داستانوں میں سفرنامہ نگار کی پاکستانیت اور قومی وابستگی نے سفرناموں میں ایسی خوشبو پیدا کردی ہے جسے خالصتاً پاکستانی انگ کہا جاسکتا ہے۔

کہانی بچپن سے لے کر بڑھاپے تک ہمارا ساتھ دیتی ہے۔ لوک کہانیوں سے جدید علامتی افسانے تک اردو کہانی کی ایک طویل داستان اور رنگا رنگ تجربوں کا ایک لمبا سفر ہے۔ اس سفر میں موضوع تکنیک اور اسلوب تینوں سطحیں شامل ہیں، پچھلے چند سالوں میں تو خاص طور پر افسانے نے بہت سے نئے فکری اور فنی موڑ کاٹے ہیں۔ حقیقت پسندی سے علامت، تجرید اور پھر لایعنیت تک پاکستانی افسانے کی راہ تجربات سے بھری پڑی ہے ان تجربوں میں محض تجربے بھی ہیں اور تجربے سے آگے نکل کر تخلیق کا ایک نیا سفر بھی، افراط و تفریط کے ڈھیر سارے خام موادمیں سے بہرحال نئے افسانے نے اپنا چہرہ بنایا ہے اور آہستہ آہستہ اپنا قاری بھی پیدا کرلیا ہے۔

افسانے کی طرح انشائیے میں بھی بہت سے اضافے ہوئے ہیں اور انشائیہ نے نہ صرف اپنا تکنیکی اور صنفی چہرہ مکمل کیا ہے بلکہ وسعت اور تخلیقی عظمت سے بھی آشنا ہوا ہے

پاکستانی ادب کے پینتیس سالوں میں سے درمیان والے دس بارہ سال تکنیکی اور اسلوبی تجربوں کا دور ہیں کہ اس دوران تقریباً تمام اصناف میں نئی راہیں تلاش کی گئیں خصوصاً افسانے اور شاعری میں نئی نسل نے اظہار کے نئے راستے دریافت کئے۔ لسانی تشکیلات سے تکنیکی سانچوں کی توڑ پھوڑ تک نظم اور افسانہ نے کئی چہرے بدلے، کبھی یہ چہرے اتنے دھندلائے کہ نقادوں کو یہ فکر لاحق ہوگئی کہ یہ اصناف ختم ہو رہی ہیں، لیکن رفتہ رفتہ نئے تجربے اعتدال کی کسوٹی سے گزر کر ایک ایسی راہ پر آنکلے کہ نظم اور افسانہ پر لگا ہوا موت کا فتویٰ خود بخود ختم ہوتا گیا۔ سو روایت سے لے کر ناراض نسل کے اکھڑ ے، کھردرے لہجہ اور پھر اعتدال تک کئی نشیب و فراز ہیں، لیکن اس پورے عرصہ میں پاکستانی ادب اپنے سماجی، تہذیبی اور سیاسی سیاق و سباق سے علیحدہ نہیں ہوا۔ پاکستانی ادیب نے مملکت اور سرزمین پاکستان کو ہمیشہ مقدس جانا اور کھل کر آگے بڑھ کر اس کے تقدس کی گواہی دی، چنانچہ ۶۵ء کی جنگ ہو یا ۷۱ء کا المیہ یا کوئی اور قومی بحران پاکستانی ادیب نے مجموعی طور پر قلم کی عصمت کو داغدار نہیں ہونے دیا۔ پاکستانی ادب اپنی قومی روایات کے ساتھ نئے تجربوں کی تازگی اور نئے خون کی گرماہٹ کو ساتھ لئے مستقل ارتقائی سفر میں ہے، اپنی علاقائی ثقافت، زبان، نظریاتی اساس اور حب الوطنی کی روشنی سے منور اپنی ایک علیحدہ پہچان رکھتا ہے، یہ پہچان ہے، ایک زندہ و تابندہ پاکستان!

مختلف اصناف کے انتخاب میں تمام نمائندہ فنکاروں کو شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، تاہم اگر کوئی کمی رہ گئی ہو تو اسے کسی ذاتی پسند یا ناپسند کی بجائے محدود دسترس اور محدود ضخامت سمجھنا چاہیئے۔ خاکوں کے انتخاب میں ضخامت کی حدود نے ہاتھ کچھ اس طرح باندھ دیئے ہیں کہ اس صنف کا نمائندہ انتخاب شامل نہ ہو سکا، جس کا ہمیں دلی افسوس ہے۔ شامل خاکے محض نمونے کے طور پر ہی شامل کئے گئے ہیں کہ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہرحال بہتر ہے۔

اس انتخاب کے بارے میں آپ کی رائے اور مشورے دوسرے ایڈیشن میں ہمارے لئے معاون ثابت ہوں گے۔ اگر کوئی کمی رہ گئی ہے تو ہم کوشش کریں گے کہ آپ کے مشوروں کی روشنی میں اگلے ایڈیشن میں اسے دور کر سکیں۔

قائداعظم کی آواز

جمیل ملک

ارسطو نے کہا تھا کہ انسان اپنے کلام سے پہچانا جاتا ہے۔ یوں بھی مثالی انسان وہی سمجھا جاتا ہے جس کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہ ہو۔ یہ معیار بظاہر جتنا سادہ ہے، عملاً اتنا ہی سخت بھی ہے۔ برصغیر کی سیاسی تاریخ میں قائداعظم محمد علی جناح کی شخصیت میں اس کی تکمیل اتنے خوب صورت اور پروقار انداز میں ہوتی چلی گئی کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس معیار کی تکمیل کا جیتا جاگتا مظہر پاکستان کی صورت میں دنیا کے نقشے پر جلوہ گر ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب علامہ اقبال نے کہا تھا۔

ع   فرارِ خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق

تو ان کے سامنے قائداعظم ہی کی شخصیت تھی جن کی ذات میں زبان و دل کی دوئی نے ایک دوسرے میں مدغم ہو کر اکائی کی صورت اختیار کر لی تھی اور یہ اکائی مسلمان قوم کے لئے وہ مرکز بن گئی تھی جس سے روشنی، عزم، امید، ہمت اور جدوجہد کی کرنیں پھوٹ پھوٹ کر چاروں طرف پھیل رہی تھیں اور ایک بکھری ہوئی قوم کو اکٹھا کر کے منزل کا راستہ دکھا رہی تھیں۔ قائداعظم کی شخصیت ایک مینارۂ نور تھی جو سیاست، قانون، مجلسی زندگی انتظامی امور اور بین الاقوامی صورتِ حال کو بیک وقت اپنی نظروں میں سمیٹے ہوئے تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی لفظ، کوئی فقرہ، کوئی بات ان کے منہ سے نکلتی تھی تو وہ اتنی نپی تلی، برجستہ اور برمحل ہوتی تھی کہ اس کے پیچھے دانائی، تجربے، مشاہدے اور علم کا بے پناہ سمندر موجزن ہوتا تھا۔ یہی وہ بے کراں سمندر تھا جس نے قائداعظم کے لب و لہجے اور اندازِ تخاطب کو اپنے تمام معاصرین سے الگ اور ممتاز جگہ پر متمکن کر دیا تھا۔ یوں تو مسلمانوں کی جدوجہدِ آزادی کے دوران ہمیشہ مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان، اور عطاء اللہ شاہ بخاری جیسے شعلہ بیان مقرر ابھرتے رہے ہیں اور قوم کے خونِ گرم کو شعلہ جوالہ بنا کر آزادی کی راہ پر ڈالتے رہے ہیں لیکن قائداعظم کا اندازِ خطابت سب سے جداگانہ تھا۔ ان کی آواز میں دبدبے اور طنطنے کے ساتھ ساتھ

سنبھالے اور ٹھہراؤ کی کیفیت بھی رواں دواں رہتی تھی۔ وہ اپنی تقریر کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرے کو پوری سیاسی صورت حال کے سیاق و سباق میں رکھ کر اور اسے فکری کسوٹی پر جانچ پرکھ کر اس طرح تول تول کر بیان کرتے تھے کہ ان کا اندازِ تخاطب قوم کی رگوں میں جہاں خون کی گردش کو تیز تر کر دیتا تھا وہاں ان کی ایک ایک بات تاریخی سچائی کی طرح نظریۂ پاکستان کا حصّہ بن کر دل و دماغ میں اترتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ ہمارے یقین کا حصّہ بن جاتی تھی۔ انسانوں کے درمیان ہمیشہ زبان ہی رابطے کا بہترین ذریعہ رہتی ہے جس کے ذریعے غلط فہمیاں ختم کر کے دوریوں کو قربتوں میں تبدیل کیا جا سکتا ہے مگر اس کے لئے سلیقہ شرط ہے اگر یہ سلیقہ نہ ہوگا تو زبان اور اندازِ گفتگو انسانی جذبات کی تہذیب کرنے کے بجائے ان میں نفرت کے بیج بوتی چلی جائے گی۔ قائداعظم کی نشست و برخاست سے لے کر ان کی چال ڈھال اور لباس تک میں جو سلیقہ تھا، اسی کا اظہار ان کی تقریروں سے بھی ہوتا تھا۔ اور پھر قوم نے دیکھا کہ یہی سلیقہ مسلمانوں کو منظم کر کے، انہیں اتحاد و یقین کی نعمتوں سے مالا مال کرتا چلا گیا۔ اسی لئے جب قائداعظم کی زبان سے اتحاد، یقین اور تنظیم کے الفاظ ادا ہوتے تھے تو ان کی نظروں کے سامنے تخلیقِ پاکستان کے ساتھ ساتھ تعمیرِ پاکستان کی راہیں بھی اجاگر ہوتی چلی جاتی تھیں یہی وجہ ہے کہ قائداعظم کے اندازِ تقریر میں اپنے عہد کی صلابت بھی تھی اور تازگی بھی اسی تازگی اور صلابت سے وہ برصغیر کی سیاسی فکری اور تہذیبی تاریخ رقم کرتے چلے جاتے تھے۔ ؎

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

مجھے زندگی میں دو دفعہ قائداعظمؒ کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا۔ ایک دفعہ جب میں سکول میں پڑھتا تھا اور میرے بڑے بھائی مجھے اپنے ساتھ ان کی تقریر سنانے کے لئے اسلامیہ ہائی سکول لے گئے تھے، جہاں معززینِ شہر نے انہیں استقبالیہ دیا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب تحریکِ پاکستان، قرارداد پاکستان کی صورت میں ابھی سامنے نہیں آئی تھی۔ میں نے ایک بچے کی سی معصومیت کے ساتھ قائداعظم کی نکھری ستھری شخصیت کو نہ صرف قریب سے دیکھا بلکہ ان کے اسلوبِ گفتگو سے بھی اپنی ذات کی ننھی منی کیاری میں ہمیشہ کے لئے بھینی بھینی خوشبو بھری۔ ان کی مدلل اور دل نواز باتیں سن کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں موسمِ بہار کی غیر متوقع ہلکی ہلکی بارش میں نہا نہا کر سرسبز و شاداب ہو رہا ہوں۔ یہ خوشبو،

یہ بارش آج بھی میری یادوں کا بہترین سرمایہ ہے۔ قائداعظم کی دوسری تقریر میں نے ۱۹۴۶ء میں لیاقت باغ میں سنی، جو اس وقت کمپنی باغ تھا۔ یہ تحریک کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ ہر طرف جوش و ایثار کے چراغ روشن تھے۔ اب میں بی۔اے کا طالب علم تھا اور میری معصومیت، شباب نئے سانچے میں ڈھل چکی تھی۔ لیکن جوشباب میں نے قائداعظم کی تقریر میں دیکھا، اصل شباب تو وہ تھا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ ایوانِ شباب میں محبت کے چراغ تو اس وقت جلتے ہیں جب اس کا رخ کسی عظیم مقصد کسی لازوال منزل کی طرف موڑ دیا جائے۔ اور میں نے محسوس کیا کہ قائداعظم نے جیسے اپنے حسنِ تقریر اور زورِ خطابت سے مجھے ہی کیا، قوم کے تمام نوجوانوں کو تحریکِ پاکستان کی صورت میں اس عظیم مسلک سے آشنا کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا گرویدہ اور جاں نثار بنا لیا ہو۔ انہی یادوں کے جلو میں چلتے چلتے مجھے قائداعظم کی وہ تقریر یاد آجاتی ہے جو ۱۹۴۶ء میں آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سالانہ اجلاس میں کی گئی تھی۔ قائداعظم کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ گونجتا ہوا آج بھی اسی طرح ہماری نسلوں کی رہنمائی کر رہا ہے۔

"میں آپ کو متنبہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جب تک آپ کا سلسلہ تعلیم جاری ہے، آپ کی سیاسی سرگرمیاں محض نظری ہونی چاہئیں۔ موجودہ سیاسی جدوجہد میں جو اس وقت جاری ہے عملی حصہ لینے سے احتراز کرنا چاہیئے۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ آپ کو سیاست میں حصہ لینے سے احتراز کرنا چاہیئے تو آپ کو کسی قسم کی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ آپ عملی سیاست کے لئے تیار ہو جائیں۔ خود میں اہلیت اور صلاحیت پیدا کر لیں۔ یہ سب سے مقدم چیز ہے۔ اہم ضرورت اس امر کی ہے کہ آپ تعلیم اور صرف تعلیم حاصل کریں۔"

اسی طرح دو قومی نظریہ کے بارے میں قائداعظم نے ایک تقریر میں یوں دو ٹوک اور فیصلہ کن انداز میں بات کی:۔

"ہندوستان میں مسئلہ کی نوعیت فرقہ وارانہ نہیں ہے بلکہ یہ مسئلہ ایک بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے اور اس نقطۂ نظر سے اس کا تصفیہ ہو سکتا ہے۔ جب تک اس اساسی اور بنیادی حقیقت کا احساس نہ کیا

جائے گا، خواہ کسی آئین کو بھی معرضِ عمل میں لایا جائے، تباہ کن
نتائج پیدا کرے گا اور نہ صرف مسلمانوں کے لئے بربادی اور استہلاک
کا موجب ثابت ہو بلکہ ہندوؤں اور انگریزوں کے لئے بھی"

قائداعظم اپنی تقریروں میں بات پر زور ضرور دیتے تھے مگر ان کے ہاں بلاوجہ تکرار کی کوئی کیفیت نظر نہیں آتی۔ وہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ وسعت پیدا کرتے ہیں۔ یوں اختصار میں جامعیت کا رویہ ہی ان کے اندازِ تخاطب کا مخصوص پیرایہ بن کر سامنے آتا ہے۔ ان کے ہاں دعویٰ خود ہی دلیل بن جاتا ہے۔ ان کی تقاریر میں الفاظ کا دروبست اس طرح ہوتا ہے کہ ایک لفظ کو بھی اِدھر سے اُدھر کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ قائداعظم اپنی لکھی ہوئی تقریروں کے بارے میں اتنے محتاط تھے کہ انہوں نے اپنے پریس سیکرٹری کو یہ ہدایت کر رکھی تھی کہ اگر دورانِ تقریر وہ کسی جگہ، کسی ایک لفظ یا ایک فقرے کا بھی اضافہ کریں یا ضرورت کے مطابق اِسے بدل دیں تو اسے فوراً نوٹ کر لیا جائے تاکہ اس لمحے اس صورتِ حال کو تاریخ میں محفوظ کیا جا سکے جس کے لئے انہیں اپنی تقریر میں ردوبدل کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اپنی ذات اور تاریخ کے سامنے جوابدہ ہونے کی اس سے بڑی سچائی کی مثالیں برصغیر میں تو کیا پوری دنیا کی تاریخ میں بھی کم ہی ملتی ہیں۔

قائداعظم کی آواز وقت کی آواز تھی۔ اس آواز نے ہمیں ایک نظریہ دیا ہمارا پاکستان، اسی آواز، اسی نظریئے کی تخلیق ہے۔ قائداعظم کی آواز کی طرح یہ عظیم تخلیق بھی زندہ و پائندہ رہے گی۔

پاکستان کا خواب

ڈاکٹر صفدر محمود

سرسید انگلستان گئے اور آپ نے مغربی اقوام کو زندگی کے ہر میدان میں تیزی سے آگے بڑھتے دیکھا تو آپ کو اپنی قوم کی کمزوریاں اور قوم کے مستقبل کی فکر اور بھی شدت سے لاحق ہوئی۔ ایک مدت کے غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمان قوم کی تمام بیماریوں کا علاج صرف جدید تعلیم ہے۔ آپ انگلستان سے لوٹے تو اس مصمم ارادے کے ساتھ کہ اپنی قوم کو جدید تعلیم سے آراستہ کریں گے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ جہالت تمام برائیوں اور عیوب کی جڑ ہے اور مسلمان دنیا کے حالات سے بے خبر اور ترقی کی راہوں سے ناواقف ہیں۔ اس لئے تعلیم سب سے زیادہ اور اہم چیز ہے ان کے نزدیک تعلیم کا حصول صرف اس لئے ضروری نہیں تھا کہ ذریعۂ معاش پیدا کی جائے اور زیادہ سے زیادہ نوکریوں پر قبضہ کیا جائے بلکہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ ہندو اس میدان میں ترقی کر کے مسلمانوں سے آگے نکل گئے تھے اور اس وقت اگر ہندوستان میں کوئی بھی تحریک شروع کی جاتی تو اس پر ہندوؤں کا اثر غالب ہوتا۔ سرسید نے ایک خط میں مولوی سید علی حسن خان کو بھی یہی لکھا کہ "انگریزی نہ جاننے کے سبب روز بروز مسلمانان ہند ذلت و خواری میں پڑے جاتے ہیں۔ عہدہ ہائے سرکاری سے روز بروز خارج ہوتے جاتے ہیں۔ ہندو و بنگالی روز بروز ترقیاں پاتے ہیں اور مسلمان ہر رو میں ان کے مغلوب اور دستِ نگر ہوتے جاتے ہیں پس مسلمانوں کو ہندوؤں پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے انگریزی زبان کی تعلیم دینا ضروری ہے۔" یہ صورت حال واقعی بڑی تکلیف دہ تھی۔ ہندوستان جیسے وسیع و عریض برصغیر میں ۱۸۵۷ء میں مسلمان گریجویٹس کی تعداد صرف (۲۰) بیس تھی جب کہ ہندو گریجویٹس کی تعداد ۸۴۶ تک پہنچ چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ اگر سرسید اس وقت مسلمانوں کو نہ جھنجھوڑتے اور انہیں تعلیم کی طرف راغب نہ کرتے تو سرسید کی وفات کے بعد جس طرح ہندوستان کی سیاست نے پلٹا کھایا اور سیاسی سرگرمیوں کا دور شروع ہوا، اگر مسلمان تعلیم یافتہ نہ ہوتے تو سیاسی دوڑ میں وہ ہندوؤں سے دو نہیں رہ جاتے اور نہ جانے ان کا مستقبل کیا ہوتا۔

یہ سمجھنا کہ سر سید احمد خان جدید تعلیم کو پھیلانے کے لئے کوشاں تھے کہ اس طرح مسلمانوں کو ملازمتیں ملیں گی ان میں بے روزگاری کم ہوگی اور اس کے نتیجے میں ان کے ذہنوں سے مایوسی کے سائے ہٹ جائیں گے ایسا سوچنا اصل میں ان کے مشن کی اہمیت کو گھٹانا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ملازمتوں کا حصول بھی ان کے پیش نظر تھا لیکن درحقیقت سر سید احمد خان مسلمانوں کو اس لئے تجارت اور تعلیم کے میدان میں آگے بڑھانا چاہتے تھے کہ معاشی خوشحالی سیاسی آزادی کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے انہیں اس بات کا علم تھا کہ جدید تعلیم ہماری تہذیب و تمدن پر اثر انداز ہوگی اور ہمارے انداز فکر کے دھارے بدل دے گی۔ وہ سمجھتے تھے کہ تعلیم کے حصول سے نہ صرف قوم کے ذہن کو جلا ملے گی۔ اور ان کے دیرینہ تعصبات دور ہوں گے بلکہ تعلیم اپنے ساتھ جمہوری طرز فکر بھی لائے گی، آزادانہ خیالات بھی لائے گی۔ غلامی کے خلاف نفرت کے احساس کو بھی جنم دے گی۔ اور قوم کے شاہین بچوں میں غیرت و حمیت کا احساس پیدا کر کے ان میں آزادی کی امنگ جگا دے گی۔ بالآخر ان کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا اور وہی ہوا جو انہوں نے سوچا تھا یہ سچ ہے کہ سر سید احمد خان نے ان خیالات کا اظہار اس طرح کبھی نہیں کیا لیکن اس وقت ان خیالات کے اظہار کا نہ موقع ہی تھا اور مناسب وقت۔ اس وقت وہ مسلمان نوجوانوں کو ہنگاموں سے الگ تھلگ رہ کر تعلیم کے حصول کی تلقین کرتے رہے۔ انہیں سیاسیات سے الگ رہنے کی نصیحت کرتے رہے اس لئے کہ ان حالات میں اپنے مشن کی کامیابی کے لئے سر سید احمد خان کو انگریز حکومت کی مدد کی ضرورت تھی۔ اور وہ کسی طرح انگریزوں کو شبے یا شک میں مبتلا نہیں کرنا چاہتے تھے۔

سر سید احمد خان نے جب مغربی تعلیم کا بیڑا اٹھایا تو انہیں سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، کیونکہ مسلمان انگریزوں سے سخت متنفر تھے۔ اور انہیں انگریزی تعلیم بھی سخت ناپسند تھی آپ نے سب سے پہلے فضا کو ہموار کرنے کے لئے "تہذیب الاخلاق" نکالنا شروع کیا۔ حالی کے الفاظ میں' قوم کو جگانے اور تعلیم کی طرف مائل کرنے کے لئے پرچہ "تہذیب الاخلاق" نکالا، اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ "جوں جوں تہذیب الاخلاق' مدرسۃ العلوم کی طرف لوگوں کو بلاتا تھا اور جس قدر انگریزی تعلیم کی ضرورتیں ان کے ذہن نشین کرتا تھا، اس قدر مدارس اسلامیہ قائم کرنے کا شوق مسلمانوں میں بڑھتا جاتا تھا چنانچہ اس تحریک سے بے شمار اسلامی مدرسے ہندوستان میں قائم ہوگئے۔"

اس کے بعد سر سید نے علی گڑھ کالج کے قیام کا منصوبہ بنایا اور اس مقصد کے لئے انہوں نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج فنڈ کمیٹی تشکیل دی جس کا مقصد چندہ جمع کرنا تھا۔ چندہ جمع کرنے کے لئے سر سید نے کیا کچھ نہ کیا۔ انہیں سٹیج پر ناچنا بھی پڑا تو انہوں نے دریغ نہ کیا انہیں بھیک بھی مانگنی پڑی تو انہوں

یہ محسوس نہ کی وہ ایک دیوانے کی مانند اپنا من تن تار تار کئے میدان میں کود پڑے اور دن رات اتنے جوش سے کام کیا کہ لاکھوں روپے جمع ہو گئے اور آج ان کے دامن کا ایک ایک تار تاریکی میں ہماری راہوں پر روشن مینار بن کر جگمگا رہا ہے اور ہمیں جرأت، حوصلہ، عظمت اور امید کا درس دیتا ہے کیا قوم کے لئے ان کی یہ دیوانگی اور تعلیم کی ترویج کے لئے دن رات جدوجہد، انگریزوں کی خوشامد اور انعامات کے لئے تھی! علیگڑھ کالج کے قیام کے سلسلے میں ان پر کیا گزری، خود ان کے قلم سے سنیئے۔

میں نے کوئی پہلو نہ چھوڑا جس سے قوم کے بچوں کے اخراجات تعلیم میں مدد پہنچے۔ کون ہے جو مجھ کو اسٹیج پر دیکھ کر حیران ہوتا، خود لوگوں سے بھیک مانگی۔ لیکن قلیل ملی۔ والنیٹر بنانے چاہے مگر بہت کم بنے جو بنے ان سے کچھ بن نہ آئی پس اسٹیج پر آیا تاکہ قوم کے بچوں کی تعلیم کے لئے کچھ کر سکوں۔ میں نے کہا کہ مجھ کو اس کے قائم کرنے میں ایک قلی چمار کی مانند تصور کیجئے اور میری محنت اور مشقت سے اپنے لئے گھر بننے دیجئے اور اس وجہ سے کہ اس کے بنانے والا ایک قلی چمار ہے اپنے حرمت ڈھائیے۔ اب یہ حال ہو گیا ہے کہ ہمارے دوست کبھی ہم سے ملتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کچھ سوال نہ کر بیٹھیں۔ میری قسمت میں بھیک مانگنا لکھا تھا مگر شکر ہے اپنے لئے نہیں قوم کے لئے۔ ارے میاں اب ہم کوئی دن میں مر جائیں گے، پھر کون چندہ مانگے گا۔ ہمارا حال تو اس بڑھیا کا سا ہو گیا ہے جس کو بازار کے لونڈے چھیڑا کرتے تھے اور جب وہ چھیڑنے والے نہ ہوتے، تو کہتی کیا آج بازار کے لونڈے مر گئے ہیں؟"۔

علیگڑھ کالج کے قیام سے قبل ایک موقع پر آپ لکھتے ہیں کہ جب میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی جب کبھی عالموں اور مہذب لوگوں کو دیکھا، جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے، جب کبھی عمدہ پھول دیکھے تو مجھ کو ہمیشہ اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہائے ہماری قوم ایسی کیوں نہیں؟ جہاں تک ہر موقع پر میں نے قوم کی ترقی کی تدبیروں پر غور کیا۔ سب سے اول یہی تدبیر سوجھی کہ قوم کے لئے قوم ہی کے ہاتھوں سے ایک مدرسۃ العلوم قائم کیا جائے۔ سر سید کی انتھک کوششوں اور دن رات کی محنت کے سبب علی گڑھ کالج قائم ہو گیا اور ۱۸۸۱ء تک بی اے اور ایم اے کے درجے تک ترقی کر گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے علی گڑھ نے ایک علمی تحریک کی صورت اختیار کر لی جس سے سیاست کے ان گنت دھارے بہہ نکلے۔ یہی ندیاں جب مل کر طوفان بنیں تو ہندوستان کی سیاست کا نقشہ ہی بدل گیا پوری مسلم قوم کا شعور بیدار ہو گیا اور آزادی کی امنگ

ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیل گئی۔ مسلمان قوم کے ولولے سرد پڑ گئے تھے لیکن علی گڑھ تحریک کے پیدا کردہ نوجوانوں نے مسلمانوں کے دلوں میں آزادی کی شمعیں روشن کر دیں جب مسلم لیگ معرض وجود میں آئی تو اسے سب سے زیادہ مدد علی گڑھ کے تربیت یافتہ نوجوانوں سے ملی۔ جنگ آزادی کے بعد مسلمانان ہند کی زندگی میں جو سیاسی خلا پیدا ہو گیا تھا علی گڑھ کی تحریک نے اسے پورا کر دیا اور ایک مختصر سے عرصے میں انگریزوں سے مسلمانوں کا وجود تسلیم کروا لیا۔ یہی دراصل اس کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔ سر سید احمد خان خود یہ سب کچھ نہ دیکھ سکے۔ لیکن انہوں نے اپنے ہاتھوں سے جو پودے لگائے تھے جب ان پر جوبن آیا تو ان کی مہک سارے گلستان میں پھیل گئی اور انہوں نے سیاسی آزادی کے حصول کے لئے رات دن تگ و دو کر کے سرسید کی بے پایاں محنت کا حق ادا کر دیا

اگرچہ سرسید دن رات مسلمانوں میں تعلیم کی ترویج کے لئے کوشاں تھے لیکن انہیں اس بات کا پورا احساس تھا کہ مسلمان زیادہ دیر تک غلامی کی زنجیروں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ انہیں اس امر کا علم تھا کہ کوئی بھی غیر قوم دوسری قوم کو زیادہ عرصے تک آزادی سے محروم نہیں رکھ سکتی اور وہ اس بات کے قائل تھے کہ ہندوستان کے مسلمان جن کی رگوں میں عربوں کا خون دوڑ رہا تھا اور جو اس مذہب کے ماننے والے ہیں جو دنیا میں انسانی آزادی کا پیامبر بن کر آیا ہے زیادہ عرصے تک غیر ملکی استعمار برداشت نہ کریں گے۔ ان کو جب بھی موقع ملے گا وہ غلامی کی زنجیریں توڑ دیں گے۔ انہی نئی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے وہ مسلمان قوم کو تعلیم دے کر تیار کرنا چاہتے تھے اسی دور کا سر سید احمد خان کا لکھا ہوا ایک خط اس احساس کا غمازی کرتا ہے کہ وہ ذہنی اور قلبی طور پر اس حقیقت کے قائل تھے کہ مسلمان جلد یا بدیر بہر حال آزاد ہو کر رہیں گے اور انگریز کو بہر حال یہاں سے رخصت ہونا پڑے گا۔ یہ خط انہوں نے کسی معزز انگریز کے نام لکھا جس کا نام درج نہیں لیکن اس خط کو پڑھنے سے یہ احساس ضرور ہوتا ہے لیکن سرسید نے صبح آزادی کی کرن کو افق کے اس پار طلوع ہوتے دیکھ لیا تھا اور انہیں مسلمانوں کی سیاسی آزادی کا پورا شعور اور یقین تھا۔ وہ ہندوستان میں انگریزوں کے قیام کو ایک عارضی دور کہتے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ یہ دور امن و امان سے گزر جائے ورنہ انگریز کا ہندوستان میں مستقل قیام سرسید کا ہرگز مقصود نہ تھا۔ وہ دنیا کی ہر چیز کو صرف ایک ہی پیمانے سے ناپتے تھے اور وہ پیمانہ تھا قوم۔ وہ دنیا کی ہر چیز کو صرف اس نگاہ سے دیکھتے تھے کہ یہ میری قوم کے لئے مفید ہے یا نہیں وہ انگریزوں کی حکومت کے بہی خواہ صرف اس حد تک تھے جس حد تک وہ اسے اپنی قوم کے لئے فائدہ مند سمجھتے تھے انہیں انگریز کی خوشامد صرف اس حد تک گوارا تھی جب تک وہ اسے قوم کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ ورنہ دنیا

میں انہیں قوم سے بڑھ کر کوئی او رشتے زیادہ محبوب نہ تھی۔ اس خط میں سرسید نے نہ صرف اس راز سے پردہ اٹھایا ہے کہ مسلمان کسی غیر قوم کے تابع نہیں رہ سکتے بلکہ خلیفہ کے انداز میں ایک منتخب صدر کا بھی تصور پیش کیا ہے۔ سرسید لکھتے ہیں کہ "میں مسلمان ہوں۔ ہندوستان کا باشندہ ہوں اور عرب کی نسل سے ہوں انہی دو باتوں سے آپ سمجھتے ہیں کہ مذہب اور خون دونوں کے لحاظ سے میں ریڈیکل ہوں عرب اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ بجائے اس کے کہ وہ اپنے اوپر حکومت کریں کوئی اور ان پر حکومت کرے وہ اپنی آزادی کو دنیا کی تمام نعمتوں سے بہتر جانتے ہیں ابھی تک میری رگوں میں عرب کا خون گردش کرتا ہے اور میرا مذہب یعنی اسلام جس پر مجھے پورا اور پکا یقین ہے، وہ بھی ریڈیکل اصولوں کو سکھاتا ہے۔ اور شخصی گورنمنٹ سے موافق نہیں اور نہ لمیٹڈ مانرکی کو مانتا ہے بلکہ موروثی حکومت ناپسند کرتا ہے اور ایک پریذیڈنٹ جس کو لوگ منتخب کریں اس کو اسلام پسند کرتا ہے" گویا اس خط میں سرسید نے یہ واضح کر دیا ہے کہ مسلمان آزادی کو تمام نعمتوں سے افضل سمجھتے ہیں اور انہیں موروثی حکومت یا لمیٹڈ مانرکی سخت ناپسند ہے یہ اشارہ بادشاہت برطانیہ کی طرف تھا جہاں لمیٹڈ مانرکی عرصہ دراز سے قائم ہے" ایک صدر جسے لوگ منتخب کریں" سے مراد صدارتی طرز کی جمہوریت تھی۔

ایک تو وہ دور تھا جب سرسید احمد خان انگریزی کے اقتدار کے استحکام کے لئے کوشاں تھے لیکن ایک دور وہ بھی آیا جب وہ انگریزوں سے مایوس ہو گئے اور ان کے رویے پر کھلم کھلا تنقید کرتے تھے انہیں توقع تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ غیر ملکی حکومت کا رویہ مسلمانوں کے حق میں بہتر ہو جائے گا لیکن جب ان کی توقع پوری نہ ہوئی تو انہوں نے بلا جھجک انگریزوں کے رویے کو غیر منصفانہ قرار دیا۔ سرسید کو انگریزوں کا غرور اور متکبرانہ رویہ سخت ناپسند تھا، ان کا ایک خط سید محمود کے ضمن میں اخبارات میں شائع ہوا جس میں انہوں نے لکھا کہ "ہمارے یورپین دوست جو اس ملک کے فاتح ہیں اور نیچرل تفوق ان کو فتح مندی کا ہے اور ہندوستانی جو مفتوح ہیں اور مفتوح ہونے کی نیچرل حقارت ان کو ملی ہے وہ دونوں ایک بینچ پر بیٹھ کر مساوی اعزاز اور افتخار کے ساتھ کام کر سکیں اگر ہندوستانی اپنی سلف اور ریسپکٹ کو جو مقتضائے شرافت اور ایمانداری ہے قائم رکھے تو دونوں کی زندگی تلخ رہتی ہے۔ ہاں اگر وہ اپنے آپ کو اپنے ہمسر کی مرضی کا جس کے دل میں بہ سبب فاتح قوم کے ایک فرد ہونے کے ایک نیچرل تفوق سمایا ہوا ہے تابع رکھے اور اس بے حمیت مسئلے پر کہ "وادھم ما دمت فی دارھم وارضھم ما دمت فی ارضھم" پر عمل کرے تو

خوش رہتا ہے مگر جو شخص اپنے کانشنس (ضمیر) کا تابع رہنا چاہے اس سے تو یہ کام نہیں ہو سکتا بات کچھ پوشیدہ نہیں کہ انگریزوں کا برتاؤ جو اپنی قوم کے ساتھ ہے اور جو دوسری قوم کے ساتھ ہے اس میں وہی نسبت ہے جو سیاہ اور سفید میں ہے۔"

سر سید نے انگریز حکومت کے خلاف کھلم کھلا مایوسی کا اظہار ۱۸۸۴ء تقریر کرتے ہوئے کیا۔ آپ نے کہا "وہ زمانہ جس میں انگریزی حکومت قائم ہوئی، ایسا زمانہ تھا کہ بیچاری انڈیا بیوہ ہو چکی تھی اور اس کو ایک شوہر کی ضرورت تھی۔ اس نے خود انگلش نیشن کو اپنا شوہر بنانا پسند کیا تاکہ گاسپل کے عہد نامے کے مطابق دونوں مل کر ایک تن ہوں مگر اس پر کچھ کہنا ضروری نہیں کہ انگلش نیشن نے اس پاک وعدہ کو کہاں تک پورا کیا گویا سر سید نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ وہ زمانہ گذر چکا جب انڈیا بیوہ تھی اور اسے خاوند کی ضرورت تھی الہ آباد یونیورسٹی کی مخالفت میں سر سید نے بڑے جذباتی مضمون لکھے جن کو پڑھنے کے بعد احساس ہوتا تھا کہ اب سر سید نے مسلمان قوم کو اپنے حقوق کے حصول کے لئے جدوجہد اور استقلال کا سبق دینا شروع کر دیا تھا ان کے ایک مضمون کے چند جذباتی فقرے ملاحظہ کیجئے "ہم کو کیا کرنا چاہیئے؟ ہماری رائے میں اس کا جواب صاف ہے! استقلال استقلال، ہمت ہمت، کوششیں کوششیں ہم کو گورنمنٹ کی پالیسی کی کچھ پرواہ نہیں کرنی چاہیئے اور اگر ہم میں سلف ریسپکٹ کا کچھ اثر باقی ہے تو گورنمنٹ کو دکھا دینا چاہیئے کہ بلاشبہ گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے مگر لوگوں کی رائے پر نہیں" یہ عبارت نہ صرف حکومت سے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے زور بازو استعمال کرنے کا درس دیتی ہے بلکہ آزادی گفتار کا پروانہ بھی ہے اور اس دور میں یہ لکھنا کہ ہم کو حکومت کی کچھ پرواہ نہیں اور حکومت کو صرف جانوں پر اختیار حاصل ہے رائے پر نہیں، سر سید ہی کا کارنامہ ہے ان خطوط کے ہر لفظ سے بیزاری ٹپکتی ہے اور جا بجا احساس ہوتا ہے کہ سر سید ہندوستان میں غیر ملکی استعمار کا خاتمہ چاہتے ہیں لیکن ان حالات میں جب کہ انگریزی اقتدار کی جڑیں انتہائی مضبوط تھیں۔ وہ صحیح آزادی کا تصور پیش نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی تحریروں، تقریروں اور خطوط سے بے چینی اور اضطراب کا اظہار تو نمایاں طور پر ہوتا ہے لیکن وہ خود بھی اپنے ذہن میں واضح نہیں تھے کہ آخر اس کشمکش کا کیا حل ہے؟ اس ضمن میں ان کی وہ تقریر بڑی معنی خیز ہے جو انہوں نے ۱۸۸۴ء میں جالندھر کے مقام پر کی تھی اور اس تقریر کے ہر فقرے میں آزادی کی امنگ دھڑکتی محسوس ہوتی ہے۔ اس تقریر میں سر سید نے بڑے اچھے انداز سے مسلمانوں کے مستقبل کی جھلک پیش کی اور مسلمانانِ ہند کو یہ امید دلائی کہ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب تمہیں اپنے اوپر

اختیار ہوگا اور تم اپنے نظام تعلیم کو اپنی خواہشات کا آئینہ دار بنا سکو گے حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں سرسید سیاسی آزادی کے سب سے پہلے علمبردار تھے اور وہ اکثر اس کا اظہار علمی انداز سے کرتے تھے، نہ کہ سیاسی اور ہنگامہ خیز انداز سے۔ اس تقریر میں سرسید نے کہا: "دوستو! ہماری پوری پوری تعلیم اس وقت ہوگی جب ہماری تعلیم ہمارے ساتھ میں ہوگی، ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے۔ بغیر یونیورسٹیوں کی غلامی کے ہم آپ اپنی قوم میں تعلیم پھیلائیں فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر"

اس تقریر کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے وہ خواب دیکھ لیا تھا جو پاکستان کی صورت میں شرمندۂ تعبیر ہوا۔ آپ کے دل سے آزادی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں اور آپ مسلمانوں کو اس دور کا تصور پیش کر رہے تھے جب کلمہ شہادت کا تاج ان کے سر پر ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی پیشگوئی بالکل صحیح ثابت ہوئی اس کی بنیادیں بھی لا الٰہ الا اللہ پر رکھی گئیں اور یہی کلمہ اس میں بسنے والے مسلمانوں کے سر کا تاج بنا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ مسلمان عوام ابھی تک تعلیم کے میدان میں بہت پیچھے تھے ان میں سیاسی شعور بھی بیدار نہیں ہوا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے نتیجے کے طور پر ہر طرف خوف و ہراس کی چھاپ تھی۔ ان حالات میں سیاسی آزادی کے لئے کوئی راہ متعین کرنا ناممکن تھا۔ پھر سرسید نے ۱۸۵۷ء کے حالات اور مسلمانوں کا حشر خود دیکھا تھا اور اتنی جلدی مسلمانوں کو سیاسی آزادی کے حصول کے لئے کسی سیاسی تحریک کو چلانے کا مشورہ نہیں دے سکتے تھے۔ مسلمان سیاسی طور پر منظم تھے نہ کوئی سیاسی پلیٹ فارم ہی موجود تھا۔ جہاں وہ سیاسی آزادی کا کوئی واضح تصور پیش کر سکتے اس وقت تک ایک ہی سیاسی جماعت معرض وجود میں آئی تھی اور وہ تھی کانگریس۔ لیکن سرسید کانگریس کے مخالف تھے۔ اور وہ ہمیشہ مسلمانوں کو اس سے علیحدہ رہنے کی تلقین کرتے رہے اس کی ہرگز وجہ یہ نہیں کہ آپ کانگریس میں شمولیت سے اس لئے منع کرتے تھے کہ انگریز اس سے ناخوش ہوں گے۔ اب وہ دور گذر رہا تھا۔ اب تو سرسید انگریز سے خود بھی ناخوش تھے ویسے کانگریس کے پس پردہ انگریز بھی تھے اس لئے کانگریس میں شمولیت سے حکومت کی ناراضی کا خطرہ تو شاید نہیں تھا اور نہ سرسید سیاسی آزادی کے مخالف تھے دراصل وہ سمجھتے تھے کہ کانگریس خالصتاً ہندوؤں کی جماعت ہے اس لئے وہ کانگریس میں مسلمانوں کی شمولیت پسند نہیں کرتے تھے اگرچہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ سرسید ہندی اردو کشمکش کے موقع پر ہندوؤں سے بدظن ہونے لیکن صحیح صورتحال یہ ہے کہ اس سے پہلے بھی سرسید یہی سمجھتے تھے کہ ہندو اور مسلمان الگ الگ دو قومیں ہیں۔ ان کا تہذیب و تمدن، مذہب اور انداز فکر الگ الگ ہیں اس لئے یہ قومیں مل کر زیادہ دیر تک اکٹھی نہیں رہ سکتیں۔ ان کو اس امر کا پورا احساس

تھا کہ ہندو مسلمان ایک جھنڈے تلے جمع نہیں ہو سکتے ۔ انہوں نے بہت عرصہ پہلے یہ کہہ دیا تھا۔ کہ یہ ناممکن ہے کہ ہندو یا مسلمان میں کوئی یہاں حاکم ہو اور امن و امان قائم رکھ سکے"۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ سرسید کو علم تھا کہ ہندو اور مسلمان کبھی متحد نہیں ہو سکتے اور ان کو ایک دوسرے سے بہر حال جدا ہونا ہے دوسرے ان کو یہ بھی احساس تھا کہ انگریزوں کو ہندوستان سے جانا ہے اور یہاں آزادی کا سورج طلوع ہونا ہے تو پھر آخر ان کے ذہن میں اس مسئلے کا کیا حل تھا؟ کیا یہی وہ بنیادیں ہیں جن پر ۱۹۴۷ء میں پاکستان قائم ہوا۔

اگرچہ سرسید جانتے تھے کہ ہندو مسلم اکٹھے نہیں رہ سکتے اس کے باوجود آپ ہندی اردو کشمکش سے قبل ہندو مسلم اتحاد کے لئے کوششیں کرتے رہے۔ آپ نے ایک موقع پر کہا کہ "میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مثل دو آنکھوں کے سمجھتا ہوں۔ ہندوستان ایک دلہن کی مانند ہے جس کی خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں اگر وہ دونوں میں نفاق رکھیں گے تو وہ پیاری دلہن بھینگی ہو جائے گی"۔ حقیقت یہ ہے کہ سرسید نے اس اتحاد کا نعرہ سیاسی مصلحت کے پیش نظر بلند کیا وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفاق پیدا کریں اور انگریز اس صورت حال سے فائدہ اٹھا سکیں۔ انگریزوں کی پالیسی تو یہی تھی کہ ان دونوں کو آپس میں لڑاؤ اور حکومت کرو۔ اور وہ اس میں کسی حد تک کامیاب بھی رہے لیکن جب بقول مولانا عبدالحق "ہندوؤں کی طرف سے سرکاری دفتروں اور مدارس سے اردو کے خارج کرنے کی تحریک شروع ہوئی تو سرسید کے دل کو بڑی ٹھیس لگی"۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ انہی دنوں ان کی ملاقات مسٹر شیکسپیر سے ہوئی جو اس وقت بنارس کے کمشنر تھے وہ سرسید کی باتیں سن کر متعجب ہوئے اور کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمان کی ترقی کا ذکر سنا ہے اس لئے پہلے تم عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال کرتے تھے سرسید نے جواب دیا کہ "اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ اب تو بہت کم ہے، آگے اس سے بھی زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے"۔ سرسید کی یہ پیشین گوئی بالکل درست نکلی۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس کے بعد بھی جب کبھی ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں کی گئیں تو ہمیشہ ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ سرسید نے ایک اور خط میں بھی ہندی اردو تنازعہ کا ذکر کیا ہے جس کا ذکر یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔

"مسلمان ہندی پر متفق نہ ہوں گے اور اگر ہندو مستعد ہوئے اور ہندی پر اصرار کیا تو وہ اردو پر متفق نہ ہوں گے اور نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ ہندو علیحدہ، مسلمان علیحدہ ہو جائیں گے بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ

"اگر مسلمان ہندو سے علیحدہ ہو کر اپنا کاروبار کریں گے تو مسلمانوں کو زیادہ فائدہ ہوگا اور ہندو نقصان میں رہیں گے۔"

یہ خط سرسید کے جذبات کا صحیح آئینہ دار ہے اور اس امر کا شاہد ہے کہ سرسید مسلمانوں کی ہندوؤں سے علیحدگی کو مسلمانوں کے لئے فائدہ مند اور بہتر سمجھتے ہیں اس لحاظ سے سرسید کی پیشین گوئی بالکل درست نکلی۔ جوں جوں تعلیم یافتہ طبقے کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہندو مسلم نفاق بڑھتا گیا حتیٰ کہ مسلمانوں کو یقین ہو گیا کہ ہندو مسلمان ایک ہی ملک میں بحیثیت قوم اکٹھے نہیں رہ سکتے اور انہوں نے ایک الگ آزاد ریاست کا مطالبہ شروع کر دیا۔ بقول مولانا عبدالحق "اگر سرسید کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قصر پاکستان کی بنیادیں رکھنے میں سب سے پہلی اینٹ اسی پیر مرد نے رکھی تھی۔"

یہ تھی وہ فضا اور سیاسی حالات جب ہندی اردو تنازعہ کی راکھ پر انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آئی مولوی عبدالحق کے الفاظ میں عام طور پر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ہندو مسلم تنازعہ سیاسی ہے اور سرسید نے انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت کر کے اس کی بنیاد ڈالی۔ یہ سراسر غلط ہے کہ اس کی بنیاد اس وقت پڑی جب ہندوؤں نے اردو کو مٹانے کی کوششیں کیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندو مسلم کبھی بھی متحد نہیں تھے اگرچہ اکبر سے لے کر عصر حاضر تک اس مسئلے کو سلجھانے کی کوششیں کی جاتی رہیں تاہم تاریخ نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ سب محض سراب تھا اور ہندو مسلم اتحاد کی حیثیت ریت کی دیوار کی حیثیت سے زیادہ نہ تھی۔

کانگریس قائم ہوئی تو سرسید نے مسلمانوں کو اس میں شامل ہونے سے روکا کیونکہ وہ اسے مسلمانوں کے حق میں نہایت مضر سمجھتے تھے۔ سب سے پہلے تو یہ سمجھتے تھے کہ کانگریس بنیادی طور پر ہندوؤں کی جماعت ہے اور مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت نہیں کر سکتی۔ سرسید نے ایک خط میں بھی یہی بات کہی، آپ نے لکھا: "میں نے اپنے ملک کے دانا بھائیوں میں اپنے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کو یہ صلاح دی کہ کانگریس کی خطرناک اور گمراہ کرنے والی تحریک سے الگ رہیں باوجود اس کے کہ کانگریس کی رپورٹوں میں مسلمان ممبروں کو بہت بڑھایا جاتا ہے لیکن اگر غور سے امتحان کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ ایک بھی بڑا یا معزز شخص مسلمانوں میں سے اس میں شریک نہیں ہوا اور کانگریس معقول طور پر اپنے اس دعوے کو صحیح طور پر ثابت نہیں کر سکتی کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے خیالات اور کاروبار اور خواہشوں اور امیدوں کو ظاہر کرتی ہے۔" دوسرے سرسید کو کانگریس کے اس مطالبے سے بھی اختلاف تھا جو اس نے مقابلے کے امتحان کے ضمن میں کیا۔ سرسید نے اس ضمن میں ایک تقریر میں کہا کہ اس امتحان کے لئے ہمارا ملک تیار نہیں

ہے۔ انگلستان میں مقابلے کا امتحان ہر شخص ڈیوک سے لے کر ادنیٰ درزی کا بیٹا تک دے سکتا ہے۔ اس لئے جو لوگ انگلستان سے عام مقرر ہو کر آتے ہیں وہ ہماری نظر سے اتنی دور ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ وہ کس لارڈ کے بیٹے ہیں یا درزی ہیں، مگر ہندوستان کا حال اس کے برخلاف ہے، ہندوستان کی شریف قومیں ملک کے ایک ادنیٰ درجے کے شخص کو جس کی جڑ بنیاد سے واقف ہیں کبھی اپنی جان و مال پر حاکم ہونا پسند نہ کریں گے۔ پھر تعلیم و تربیت کے لحاظ سے ہندوستان کی حالت اس قدر مختلف متفاوت ہے کہ بہت سی قومیں جیسے مسلمان راجپوت، سکھ، جاٹ وغیرہ موجودہ حالت میں کبھی مقابلے کے امتحان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔" جب انڈین نیشنل کانگرس نے یہ مطالبہ کیا کہ کونسل کے ممبران انتخاب سے مقرر ہوں تو سرسید نے کہا کہ اگر کونسل کے ممبر انتخاب سے مقرر ہوں تو کسی طرح سے مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے برابر نہیں ہو سکتی کیونکہ ہندوؤں کی تعداد ہندوستان میں بمقابلہ مسلمانوں کے چوگنی ہے۔ اس طریقے سے اگر ایک مسلمان ممبر ہوگا تو چار ہندو ہوں گے" اصل میں سرسید محسوس کرتے تھے کہ ان حالات میں جبکہ مسلمان تعلیم یافتہ نہیں اور نہ ہی ان میں منظم سیاسی شعور ہی موجود ہے انہیں سیاست کی خاردار جھاڑی" سے الجھنا نہیں چاہیئے۔ مولانا حالی کے الفاظ میں "وہ خوب جانتے تھے کہ مسلمان اور ہندوؤں کی اکثر قومیں عموماً تعلیم کے لحاظ سے نہایت پست حالات میں ہیں اور آزادی کے مفہوم اور برٹش حکومت کے اصول سے محض بے خبر۔ ان میں غالب حصہ ان لوگوں کا ہے جن کے نزدیک تمام ملک کا متفق ہو کر گورنمنٹ کے انتظام پر نکتہ چینی کرنا اور ایجی ٹیشن پھیلانا، بعینہٖ ایسا ہے جیسے سلطنت سے بغاوت اختیار کرنا۔ پس ان کی اور مسلمانوں کی خیر اسی میں ہے کہ وہ ایجی ٹیشن سے علیحدہ رہیں۔" سرسید کے ذہن میں یہی خیال کارفرما تھا اس لئے وہ مسلمانوں کو کانگرس سے علیحدہ رہنے کی تلقین کرتے رہے سرسید نے لکھنؤ میں اپنی تقریر میں کہا تھا "کہ گورنمنٹ سے حقوق طلب کا یہی ایک طریقہ ہے کہ اپنے تئیں ان حقوق کا مستحق بناؤ" اور اس مستحق بنانے سے ان کی مراد یہ تھی کہ مسلمان تعلیم حاصل کریں، اپنے آپ کو منظم کریں اور ہر لحاظ سے ہندوؤں کے برابر ہو جائیں ورنہ ان حالات میں آزادی کے معنی یہ ہوں گے کہ مسلمان انگریزوں کی غلامی سے نکل کر ہندوؤں کے غلام ہو جائیں گے اور ہندوؤں کی غلامی بہرحال انگریزوں کی غلامی سے بدتر ہے۔

کانگرس نے جب ریپریزنٹیٹو گورنمنٹ کی تحریک شروع کی تو سرسید نے اس مطالبے کی بھی مخالفت کی تعلیم یافتہ طبقہ سرسید کی اس مخالفت کی وجہ سے کشمکش و پیچ میں پڑ گیا اخبارات نے بڑی تنقید کی اور بنگالی صحافت نے تو آپ کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ ہمیشہ ہر مطالبے اور ہر چیز کو صرف اسی

نگاہ سے دیکھتے تھے کہ کیا یہ میری قوم کے لئے بہتر ہے؟ آپ نے اس تحریک کی مخالفت بھی اس بنا پر کی ورنہ آپ ریپریزنٹیٹو گورنمنٹ کے مخالف نہیں تھے۔ آپ کو ریپریزنٹیٹو گورنمنٹ پسند تھی کونسل میں آپ نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ "میں خوش ہوں کہ میں اس عرصے تک زندہ رہا کہ میں اس دن کا آغاز دیکھ لیا جب کہ ہندوستان اپنے حاکموں کے ہاتھ سے سلف ہیلپ اور سلف گورنمنٹ کے وہ اصول سیکھنے کو ہے جنہوں نے انگلستان میں ریپریزنٹیٹو انسٹی ٹیوشن پیدا کئے ہیں۔" اس تقریر سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ آپ ریپریزنٹیٹو گورنمنٹ کے حامی تھے لیکن آپ نے اس کی مخالفت کیوں کی؟ اس کا جواب آپ کے خط سے ملتا ہے جو آپ نے ایڈیٹر پائنیر الہ آباد کے نام لکھا۔ سرسید لکھتے ہیں کہ "میں نے اس مسئلے پر غور کیا تھا کہ آیا ریپریزنٹیٹو گورنمنٹ ہندوستان کے مناسب حال ہے؟ اور جان اسٹورٹ مل کی آراء پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ چونکہ اول لازمی امر ایسے طریقہ حکومت کے لئے جس کا انتظام صرف کثرت رائے پر چلتا ہو، یہ ہے کہ ووٹرز میں ہم جنسیت ہو بلحاظ قوم کے اور مذہب کے عادات ومعاشرت کے، رسومات کے اور تمدنی حالات کے اور بلحاظ تاریخی وملکی روایات کے جب یہ باتیں موجود ہوں تو یہ طریقہ حکومت عمل میں آسکتا ہے۔ ایسے حالات میں جیساکہ ہندوستان ہے کہ جہاں کسی امر بالا میں ہم جنسیت نہیں سوائے ملک کے امن اور بہبودی کو نقصان پہنچنے کے اور کوئی نتیجہ نہیں ہوسکتا۔" اسی خط میں سرسید نے کانگریس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا "اور یہ فرض کرلیتے ہیں کہ مسلمان اور مرہٹہ برہمن اور چھتری مدّاسی اور رلپثا وغیرہ سے ایک قوم کی طرح برتاؤ کیا جاسکتا ہے اور ان کا مذہب، زبان، عادات، مراسم اور ملکی اور تاریخی روایات بالکل ایک ہیں۔ گویا وہ انسانوں کا ایک گلہ ہے۔ میں اس خیال کو وہم سے کم نہیں سمجھتا کہ جمہوری طریقہ کل اقوام اور مذاہب اور ممالک اور ازمنہ کے لئے یکساں موزوں ہے میری رائے میں یہ طریقہ عقلاً بھی نامکمل ہے کیونکہ کیا یہ ضروری بات ہے کہ انسان کی مجارٹی اس قابل ہے کہ یہ فیصلہ کرسکیں کہ نہ صرف اپنے آپ پر بلکہ نارضامند منیارٹی پر بھی حکومت کی جائے جیسا کہ مسٹر کارلائل نے بھی کہا ہے کہ کثرت انسان عقلمندی سے بہت دور ہے یہ خیال خیالی نہ ہو، مگر بدقسمتی سے ٹھیک ہے" گویا سرسید ریپریزنٹیٹو حکومت کے مطالبے کی مخالفت اس لئے کرتے تھے کہ ہندوستان میں کئی اقوام بستی ہیں جن کے مذاہب، تہذیب وتمدن اور روایات ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، اس لئے یہاں یہ طریقہ حکومت کامیاب نہ ہوسکے گا کیونکہ اس طریقہ حکومت کو اپنانے کے معنی یہ ہوں گے کہ یہاں کی حکومت اکثریت کی ہوگی اور وہ دوسری اقوام کو دبائے رکھے گی۔ اس ضمن میں سرسید نے آئرلینڈ کی بھی مثال دی جس کے لئے ہوم رول کا بل اس لئے نہ پاس ہوسکا کہ وہاں رومن کیتھولکس کی تعداد بمقابلہ پروٹسٹنٹ فرقہ کے زیادہ تھی۔ اس لئے مخالف پارٹی

نے یہ اعتراض کیا کہ اس طرح پر دسٹنٹوں کو نقصان پہنچے گا اور وہ اکثریت کے رحم و کرم پر ہوں گے سرسید نے اس کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ آئیر لینڈ جیسے ملک میں جہاں قومی اور مذہبی اختلافات یقیناً ہندوستان سے بہت کم ہیں ایک فرقے کی میجارٹی دوسرے فرقے کے حق میں اس قدر مضر خیال کی جاتی ہے تو ہندوستان میں جہاں برخلاف تمام دنیا کے مذہبی اور قومی تعصبات ترقی تعلیم کے ساتھ بڑھتے جاتے ہیں۔ ریپریزنٹیٹو اصول سے بھلائی کی امید کیا ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد اس حقیقت میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ سرسید احمد خان نے کانگریس کی مخالفت اس لئے کی کہ وہ ان مطالبات کو مسلمانوں کے حق میں بہتر نہیں سمجھتے تھے اور وہ ہندوؤں کی اکثریت سے بھی بہرحال خوفزدہ تھے اس لئے سرسید بار بار یہ کہتے رہے کہ کانگریس ہندوؤں کی نمائندہ جماعت ہے اور وہ مسلمانوں کے احساسات کی آئینہ دار نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ وقتی طور پر سرسید کے اعتراضات کو ٹھیک اہمیت نہیں دی گئی لیکن بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ کانگریس مسلمانوں کی بھلائی کی ضامن نہیں ہو سکتی تھی اور اسی ردِ عمل کا یہ نتیجہ نکلا کہ مسلمانوں نے الگ سیاسی جماعت بنانے کی ضرورت محسوس کی اور اس ضرورت کو عملی جامہ پہنایا۔

سرسید احمد خان کے نظریات اور ان کی سرگرمیوں پر نگاہ ڈالنے کے بعد ہمارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ چاہتے کیا ہیں؟ اول تو سرسید کو یقین تھا کہ ہندو اور مسلمان اکٹھے نہیں رہ سکتے اور تعلیم کے ساتھ ساتھ ان دونوں قوموں کا نفاق بڑھتا جائے گا۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ اگر ان دونوں قوموں میں سے کوئی بھی حاکم ہو تو یہاں امن وامان قائم نہیں رہ سکتا اس لئے ان کا الگ الگ ہو جانا ہی مفید اور بہتر رہے گا۔ دوم ان کو اس امر کا یقین تھا کہ مسلمان کبھی بھی کسی دوسری قوم کے غلام نہیں رہ سکتے۔ ان کو علم تھا کہ تعلیم کا لازمی نتیجہ ہوگا کہ مسلمان قوم آزادی کے لئے جدوجہد کرے گی سوم ان کو یہ بھی احساس تھا کہ کوئی دوسری قوم زیادہ عرصے تک غلام نہیں رہ سکتی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ آہستہ آہستہ ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف بیزاری پھیل رہی تھی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ انگریزوں کو یہاں سے جانا پڑے گا۔ علاوہ ازیں وہ کانگریس کے بھی مخالف تھے اور ان کے ریپریزنٹیٹو گورنمنٹ کے مطالبے کو بھی ناپسند کرتے تھے۔ گو سرسید سیاسی آزادی کے دلدادہ تھے لیکن وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان حالات میں آزادی کا مطلب ہندوؤں کی آزادی اور مسلمانوں کی غلامی ہوگا وہ بار بار یہی کہتے تھے کہ ان حالات میں جمہوریت کا مطلب ہندو اکثریت کی حکومت کا ہوگا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر سرسید چاہتے کیا تھے؟ یقیناً سرسید یہ تو چاہتے تھے کہ ہندوستان کو سیاسی آزادی ملے لیکن ہندو اور مسلمان الگ الگ ہوں۔ مسلمانوں کے پاس علیحدہ خطۂ زمین ہو جس میں وہ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے زندہ رہ سکیں اور وہ اپنے مذہب اور اپنی روایات کی روشنی میں اپنے لئے ایک الگ زندگی کا نقشہ مرتب کر سکیں۔ ان کا نظام تعلیم

ان کے اسلامی نظریات کا آئینہ دار ہو۔ ان کے ایک ہاتھ میں قرآن پاک ہو اور ان کے سر پہ کلمہ لا الہ الا اللہ کا تاج ہو۔" سرسید کی تحریروں اور تقریروں کے ان ٹکڑوں کو یکجا کرنے سے کیا یہی احساس نہیں ہوتا کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے نام سے جو عظیم اسلامی مملکت دنیا کے نقشے پر ظہور پذیر ہوئی۔ سب سے پہلے اس کا خواب سرسید ہی نے دیکھا تھا؟

غالب سے اقبال تک

صدیق سالکؔ

اکتوبر ۱۹۷۳ء کے ابتدائی دن تھے۔ ماہِ صیام تازہ تازہ شروع ہوا تھا۔ ہم حسبِ معمول رات کو عبادت کرتے اور دن کو روزے رکھتے اور جب یادِ وطن ستاتی تو

گر بوئے گل نہیں، نہ سہی، یادِ گل تو ہے

کہہ کر دل کو تسلی دے لیتے۔ دہلی معاہدے کی پیدا کردہ امیدیں اب پھر حقیقت کی دبیز چادر اوڑھ کر سو چکی تھیں۔ ہم غیر مصدقہ اطلاعات سے یہ اخذ کر چکے تھے کہ آگرہ کے مکینوں کی باری دسمبر یا جنوری میں آئے گی۔

انہی دنوں کیمپ کے سرکاری دفاتر میں غیر معمولی ہلچل ہونے لگی۔ بھارتی بابو دن رات کھٹ کھٹ ٹائپ کرتے رہتے جب ان سے کام سنبھالا نہ جاتا تو کیمپ سے پاکستانی ٹائپسٹ بے گار پر لگا لیتے۔ بھارتی افسر اب خلافِ معمول سہ پہر اور شام کو دکھائی دینے لگے۔ ہمارے سراغرسانوں کو اس غیر معمولی مصروفیت کی بھنک پڑی تو وہ اصل بھید پانے کی ٹوہ میں لگ گئے۔ کئی روز کی غواصی کے بعد وہ خبر لائے کہ آگرہ جیل پہلے خالی کی جائے گی، پروگرام بدل گیا ہے، اس لئے کیمپ کی انتظامیہ دن رات کام کر کے ہماری بروقت روانگی کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ ہم نے سمجھا چلو۔

کچھ کچھ سحر کے رنگ پُر افشاں ہوئے تو ہیں!

لیکن اس خوش فہمی کی کوئی سرکاری تائید یا تردید نہ ہو سکی۔ پھر بھی خیالوں کو حرص کے خوشے لگنے لگے ہماری نگاہِ تصور اس سعیدِ روشن کے بوسے لینے لگی جو ہمیں واہگہ بارڈر پر طلوع ہوگا۔ جب نظر میں پھول مہکیں گے، دل میں شمعیں جلیں گی اور جب ارضِ وطن کا ذرہ ذرہ اٹھ کر ہمارے قدموں سے لپٹ جائے گا۔

اتنے میں عرب و اسرائیل جنگ چھڑ گئی۔ ایک صاحب بھاگے بھاگے آئے اور سرگوشی کے انداز میں کہنے لگے: "تم نے سنا؟ عربوں نے اپنے علاقے واپس لینے کے لئے جنگ چھیڑ دی ہے۔" عرض کیا:

"جی ہاں، نہ صرف خبر سنی ہے بلکہ یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ مصر نے اسرائیلی مدافعت کے باوجود نہر سویز پار کر لی ہے اور اب مصری فوجیں سینائی میں پیش قدمی کر رہی ہیں۔"

کہنے لگے: "وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ بتاؤ کہ اگر اس جنگ کا دائرہ وسیع ہو گیا تو کیا ہماری وطن واپسی تو ملتوی نہیں ہو جائے گی؟" عرض کیا: "ایسا کوئی امکان تو نظر نہیں آتا لیکن پھر بھی کسی نہ کسی بہانے روانگی ملتوی ہونے کے لئے ذہنی طور پر تیار رہنا چاہئیے تاکہ بعد میں مایوسی نہ ہو۔"

عرب و اسرائیل جنگ میں ہماری دلچسپی ایک قدرتی امر تھا، چنانچہ ہم نے پرانی کتابوں سے میدانِ جنگ کے نقشے نکال کر سامنے رکھ لیے اور ان کی مدد سے مصری فوج کی پیش قدمی اور اسرائیلیوں کی پسپائی کا مطالعہ کرنے لگے۔ جب مصری تازہ حملہ کرتے، ہم خوشی سے اچھلنے لگتے اور جب اسرائیلیوں کے جوابی حملے کی خبر آتی تو ہمارے دل بیٹھنے لگتے۔ لیکن اس فوجی اور اسلامی اہمیت کے معرکے کی کشش کے باوجود بعض احباب کے دل ابھی تک آگرے سے رہائی کے تصور سے جدا نہیں ہوئے تھے۔ ایک آدھ دفعہ آتے جاتے کسی ریڈیو سننے والے سے جنگ کی تازہ صورتِ حال پوچھی تو جواب ملا: "پہلا قافلہ اکتوبر کے دوسرے ہفتے میں روانہ ہو گا۔"

چند دن بعد واقعی ریڈیو پاکستان نے جنگ کی خبروں کے ساتھ ساتھ یہ خوشخبری بھی سنائی کہ پہلے آگرے سے قیدی آئیں گے پھر بریلی اور پھر میرٹھ سے۔ دل میں خوشی کے لڈو پھوٹنے لگے۔ گویا صبح ہونے کو ہے اے دلِ بے تاب ٹھہر! لیکن آگرہ کیمپ سے مراد لازماً کیمپ نمبر ۴۴ تو نہ تھی کیونکہ آگرے میں جیل کے اندر اور باہر کوئی نصف درجن کیمپ تھے۔ کیا پتہ پہلے پی۔ ڈبلیو ہسپتال اور اس سے ملحقہ کیمپ خالی کئے جائیں یا آگرہ جیل کے کیمپ نمبر ۴۰ اور کیمپ نمبر ۲۰ چلے جائیں اور ہماری باری بعد میں آئے اور اگر کیمپ نمبر ۴۴ بھی کوچ کر جائے تو اس کا کیا اعتبار کہ ہم سب چلے جائیں گے کیونکہ بھارت کو ایک سو بانوے جنگی قیدی روکنے بھی تو تھے۔ کیا پتہ کچھ لوگ ہمارے کیمپ سے بھی روک لئے جائیں ــــ دل پھر وسوسوں کی پر پیچ راہوں میں کھو گیا۔

ریڈیو پاکستان کی اس خبر سے وسوسوں کے کئی بادل چھٹ گئے کہ آگرہ سے پہلی گاڑی دس اکتوبر کو واہگہ پہنچے گی اور اس کے بعد ایک دن چھوڑ کر ۲۸ اکتوبر تک ہر روز جنگی قیدیوں کا ایک قافلہ آزاد فضا میں پہنچے گا۔ ہم نے آگرہ جیل کی کل آبادی کو ان پانچ گاڑیوں میں تقسیم کیا تو اوسطاً ایک گاڑی میں ایک

ہزار نفوس بنتے تھے جو رواج کے مطابق ایک ٹرین کے مسافروں کی تعداد بنتی ہے۔ اس سے دل کو تسلی ہوئی اور لوگ تیاریوں میں لگ گئے۔

جن لوگوں پر "جان بنانے" کا بھوت سوار تھا وہ صبح و شام پی ٹی اور ورزش کرنے لگے۔ جنہوں نے ڈاڑھی اور سر کے بال بے لگام چھوڑ رکھے تھے، انہوں نے انہیں قینچی اور مشین دکھائی۔ اس عمل سے جو چہرے بے نقاب ہوئے انہیں پہچاننا مشکل ہو گیا۔ جتنے حصے پر ڈاڑھی کے جنگل کا تسلط رہا تھا وہ باقی حصہ کی نسبت زیادہ گورے اور سفید نظر آنے لگا۔ گویا ایک ہی چہرے کے دو رنگ نظر آنے لگے۔ گورا اور کالا، گورا اور زیادہ گورا یا کالا اور کم کالا۔ لیکن اس دو رنگی کے شکار حضرات کو کوئی تشویش نہ ہوئی بلکہ تسلی تھی کہ وطن پہنچنے تک رنگ سے رنگ مل جائے گی۔

اسیری کے دوران کچھ لوگوں کے سر پر برف اگ آئی تھی۔ انہوں نے خضاب سے اسے پگھلانا شروع کر دیا اور ہر دوسرے روز ایک بوڑھا جوان نظر آنے لگا۔

البتہ ہمارے ایک دوست کا مسئلہ ذرا پیچیدہ تھا جو نہ ڈاڑھی منڈوانے سے حل ہو سکا اور نہ خضاب لگانے سے۔ اس مسئلے کا پس منظر یہ تھا کہ اسیری سے پہلے ان کی شادی کی بات چل رہی تھی اور خیال تھا کہ چالیس برس کے سن کے باوجود کوئی نہ کوئی بنتِ حوا ایسی مل جائے گی جو سچ مچ کے سومیٹھا ہو' پر اعتقاد رکھتی ہو لیکن اسیری کے دو سال نے نہ صرف ان کی عمر میں اضافہ کر دیا تھا بلکہ اور بھی کئی چرکے لگائے تھے۔ اب نہ صرف ان کے جسم کا ہر نمایاں حصہ سفید بالوں کی زد میں تھا بلکہ ان کے چہرے پر جھریاں، آنکھوں میں تیرتا ہوا پانی اور ہاتھوں میں رعشے کی سی کیفیت پیدا ہو چلی تھی۔ وہ اکثر سر، ڈاڑھی اور کلائیوں پر خضاب لگاتے، چہرے پر مالش کرنے اور ہاتھوں کی ورزش کرتے نظر آتے۔ ایک شرارتی نوجوان نہایت سنجیدہ بن کر ان کے پاس گیا اور ہمدردی سے کہنے لگا: "حضور! آپ صبح صبح اٹھ کر ریڈیو سری لنکا سنا کیجئے، اللہ تعالیٰ شفا دے گا۔" مریض نے تعجب سے اپنی خضاب آلود بھنویں اوپر سکیڑ کر وضاحت طلب کی تو نوجوان نے کہا، "میری مراد کمرشل ریڈیو سے ہے جس میں صحت بخش گانوں کے علاوہ بالوں کو سیاہ کرنے، جھریاں مٹانے اور رعشے پر قابو پانے کے نئے ادویات کا اعلان ہوتا رہتا ہے۔ آپ آزما کر تو دیکھئے، ان چیزوں میں ضرور تاثیر ہو گی۔ ریڈیو والے صبح سویرے ہر روز جھوٹ تو نہیں بول سکتے۔" محترم نے اصولی طور پر مشورہ قبول کر لیا لیکن وقت کی کمی کے پیشِ نظر اس پر عمل پاکستان واپسی تک ملتوی کر دیا۔

چہرے اور جسم کے بناؤ سنگھار کے ساتھ ساتھ کپڑوں کی بھی فکر لاحق ہوئی۔ کئی صاحب حیثیت قیدیوں نے پاکستان آنے والے فالتو کپڑے سنبھال کر سٹور میں جمع کرا دیے تھے کہ واپس جاتے وقت پہنیں گے۔ لیکن ایسے دور اندیش لوگوں کی تعداد زیادہ نہ تھی عموماً لوگ تحائف والے کپڑے استعمال کر چکے تھے اور ان پر پی ڈبلیو کی چھاپ لگی ہوئی تھی اب وہ مختلف طریقوں سے یہ چھاپ مٹانے لگے تاکہ بارڈر پار کرتے وقت ذلت کے یہ داغ سینے پر روشن نہ ہوں — لیکن یہ داغ ایسے پکے تھے کہ مٹائے نہ مٹے۔

ہم اپنی اپنی تیاریوں میں مصروف تھے کہ خبر آئی کہ پہلی ٹرین کیمپ نمبر ۵ کے افسروں اور جوانوں کو لے کر جائے گی۔ جوانوں کے متعلق تو پہلے ہی تسلی تھی کہ ان پر نام نہاد جنگی جرائم کی تہمت نہ تھی۔ لیکن افسروں کے متعلق سوچنے لگے کہ پتہ نہیں کون کون جاتا ہے، کیونکہ آغاز اسیری میں یہ خبر اڑی تھی کہ "جنگی مجرموں" کا ڈیرہ کیمپ نمبر ۵ میں ہوگا۔ اگر وہ چلے گئے تو سمجھ لیجئے کہ جنگی جرائم کا پرچار محض ایک ڈھونگ تھا، البتہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس کیمپ کے موجودہ مکینوں کو پہلے پاکستان روانہ کر کے باقی تمام کیمپوں سے "جنگی مجرم" یہاں رکھے جائیں کیونکہ جیل کا مرکزی حصہ ہونے کی وجہ سے یہ ہندوستان کا محفوظ ترین مقام تھا اور بالآخر یہی ہوا)

ایک افواہ یہ بھی پھیلی کہ کیمپ سے لوگ روانہ ہوں گے، لیکن راستے میں مناسب مقام پر "جنگی مجرموں" کا ڈبہ الگ کر لیا جائے گا اور دوسرے مسافروں کو اس کی خبر واہگہ پہنچ کر ہوگی۔ اس احتیاطی تدابیر کی وجہ یہ بتائی گئی کہ بھارت کو ڈر ہے کہ کیمپ میں اگر چند جنگی قیدیوں کو مقدمہ بازی کے لئے الگ کیا گیا تو باقی قیدی مشتعل ہو جائیں گے اور نظم و نسق میں خلل پڑے گا۔

اس افواہ کا ہمارے پاس ایک ہی توڑ تھا کہ پہلی ٹرین میں جو لوگ آگرہ (کیمپ ۵،۶) سے روانہ ہوں ان کے ناموں کی تصدیق اگلے روز شام کو ریڈیو پاکستان سے کر لی جائے کیونکہ وطن پہنچنے والوں کے ناموں کا اعلان بلاناغہ ہوتا تھا۔ لہذا ہم نے کیمپ نمبر ۵ سے "ڈپلومیٹک بیگ" کر رہی والی بال میں بھروانے کا بہ کے ذریعے ناموں کی فہرست منگوائی۔ اس کی تین نقلیں تیار کیں اور اگلے روز تین مختلف افراد نے ریڈیو پاکستان کے نشریے سے ان ناموں کی تصدیق کی دل کو تسلی ہوئی کہ ڈبہ کاٹ لینے والی بات غلط نکلی۔

اس کے باوجود سارے کیمپ میں ایک ہیجانی کیفیت تھی، کسی کو کسی کل قرار نہ تھا۔ کوئی کہتا کہ یہ گھر جانے کے لئے بے قراری ہے، کوئی توضیح کرتا کہ یہ پیچھے رہنے والے نام نہاد جنگی مجرموں سے ہمدردی کا پر

ہے۔ کوئی ساری بحث کو نفسیاتی رنگ دے کر کہتا کہ یہ تحت الشعور میں کشمکش کا نتیجہ ہے۔ ایک طرف یہ خوشی ہے کہ وطن واپسی کا وقت آ پہنچا ہے اور دوسری طرف تحت الشعور میں یہ خوف ہے کہ ایک سو بچانوے کی فہرست میں نام نہ ہو۔ وجہ کچھ بھی سہی کیمپ کا رنگ یکسر بدل گیا تھا اب نہ کسی کا خوش گپیوں سے وقت گزرتا تھا نہ کسی شغل (مطالعہ وغیرہ) میں دل لگتا۔ ہر شخص سیمابی کیفیت میں تھا۔ کوئی کونے میں بیٹھا سگریٹ پہ سگریٹ پھونک رہا تھا۔ کوئی سوچ کا بت بنا خلا میں گھور رہا تھا اور کوئی تیز تیز ڈگ بھرتا ایک دروازے سے دوسرے دروازے تک جاتا، اور راستے میں جو ملتا اسے پوچھتا: "کیا آج نو اکتوبر ہے؟..... آج نو اکتوبر ہی ہے نا..... اچھا۔" ایک صاحب بے قراری پر قابو پانے کے لئے دور سب سے الگ بنچ پر جا بیٹھتے، لیکن چند لمحوں بعد اٹھ کھڑے ہوتے اور آنکھ جھپکنے میں درخت کے تنے کے ساتھ مٹی کی منڈیر پر جا بیٹھتے، وہاں بھی قرار نہ آتا تو اندر چارپائی پر جا لیٹتے۔

اب ہم حساب لگاتے کہ اگر آخری گاڑی ۱۱ اکتوبر بھی چل گئی تو پانچویں دن واہگہ پہنچیں گے یعنی آزادی میں ایک سو بیس گھنٹے باقی ہیں۔ کیا واقعی منزل اتنی قریب ہے، کیا واقعی ہم نے ظلمت کی دیوار چاٹ چاٹ کر اتنی پتلی کر دی ہے کہ اس کے پیچھے نورِ وطن نظر آنے لگا ہے، کیا یہ سچ ہے کہ ہم چھٹے دن انارکلی، گلبرگ اور مال روڈ کی سیر کر رہے ہوں گے؟! کہیں اس تصور کو نظر نہ لگ جائے۔ کہیں یہ شیشے، یہ ساغر لبوں تک پہنچنے سے پہلے ہی چور چور نہ ہو جائیں، کہیں ساقی کی نیت نہ بدل جائے۔

ہم نے اس خیالی جنت کے کسی گوشے میں وہم کے منحوس پرندوں کو گھونسلا بنانے کی اجازت نہ دی۔ ہمارے ذہن میں حسبِ دستور ارضِ وطن کی روشن کلیاں سجی ہوئی تھیں۔ ان کی مانوس راہیں ہمیں آوازیں دے رہی تھیں۔ گویا ہجر و وصل کی صورت اختیار کر گیا تھا۔

یوں گماں ہوتا ہے، گرچہ ہے ابھی صبحِ فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن، آ بھی گئی وصل کی رات

لیکن گرد و پیش پر نگاہ دوڑائی تو پھر وہی جیل کی پژمردہ فصیلیں، وہی لوہے کی سلاخیں، وہی خاردار تار، وہی پہرے دار اور وہی رول کال۔ یا اللہ! سحر ہونے میں اتنی دیر کیوں ہے؟ شبِ انتظار اتنی سست رو کیوں ہے؟ دیار کی اوٹ سے آزادی کا سورج طلوع ہونے سے ہچکچاتا کیوں ہے؟ اگر ہم لپک کر منزل کی آغوش میں نہیں پہنچ سکتے تو منزل چند قدم آگے بڑھ کر ہمارا استقبال کیوں نہیں کرتی؟!

جنہیں ۱۲ اکتوبر کو واہگہ پہنچنا تھا انہیں دو روز پہلے روانگی کا حکم سنایا گیا۔ دفتر میں بلا کر ان سے ضروری کاغذات پر دستخط کرائے گئے اور تحفے کے طور پر ایک ایک خاکی جنگل ہیٹ JUNGLE HAT دیا گیا جس کے پیٹ پر (FOR REAL BROTHERS) یعنی "حقیقی بھائیوں کے لیے"۔ درج تھا۔
یہ تحفہ وصول پانے والوں کا ایک تو جی چاہا کہ اسے غلاظت کا پلندہ سمجھ کر فوراً پھینک دیں، لیکن یہ سوچ کر پھر ہاتھ روک لیا کہ کہیں یہ واہگہ پہنچنے کا پاسپورٹ نہ ہو اور فیصلہ کیا کہ فی الحال اسے رخت سفر کے طور پر ساتھ رکھ لیتے ہیں، واہگہ پہنچ کر اسے نذرِ آتش کریں گے۔ روانگی سے پہلے کا ایک مرحلہ تلاشی تھا! ہم بھارت سے کیا لے جا سکتے تھے؟ اور جو یادیں ہم نے محفوظ کر رکھی تھیں وہ تلاشی لینے سے کہاں چھن سکتی تھیں!

"تلاشی کے متعلق کیمپ والوں نے پہلے ہی یہ بات پھیلا دی کہ تلاشی نہایت مفصل اور سخت ہوگی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہم سخت تلاشی کے ڈر سے "خطرناک" چیزیں خود ہی جلا دیں اور آخری وقت کہیں کسی چیز کے قابلِ اعتراض ہونے یا نہ ہونے پر جھگڑا نہ کھڑا ہو۔ لیکن دو سالہ قید نے ہمیں خاصا پکا کر دیا تھا، اب ہم ستم گر کی ادا آزمائے بغیر بسمل ہونے کے حق میں نہ تھے۔ چنانچہ ہم نے آپس میں طے کیا کہ جب پہلی پارٹی ہم سے جدا ہو کر اپنی آخری رات سیلوں CELLS میں گزارے گی تو وہاں سے تلاشی کے متعلق مفصل رپورٹ بھیجے گی اور بعد میں آنے والے اس تجربے کی روشنی میں اپنی اپنی چیزیں مثلاً کاغذات وغیرہ چھپائیں گے یا جلائیں گے۔

سیلوں سے رپورٹ منگوانے کے لئے یہ طریقہ طے کیا کہ وہاں سے کسی بھارتی این، سی، او یا جے، سی، او کو ایک پرچی پر پاکستان کے کسی مشہور شہر کا ٹیلی فون نمبر لکھ کر دیا جائے گا اور رقعہ بردار کو ہدایت کی جائے گی کہ کیمپ میں فلاں افسر کو یہ ٹیلی فون نمبر پہنچا دینا اور کہنا کہ پاکستان میں مجھ سے ملنا ہو تو اس نمبر پر فون کر لینا۔
سارا راز ٹیلی فون نمبر میں پوشیدہ تھا جس کے لئے کوڈ (CODE) یہ مقرر کیا کہ اگر ٹیلی فون نمبر کراچی کا ہوا تو اس کا مطلب ہوگا بہت ہی مفصل اور سخت تلاشی۔ اگر لاہور کا ہوا تو سمجھنا تلاشی میں اوسط درجے کی سختی برتی گئی اور اگر اسلام آباد کا نمبر ہوا تو سمجھنا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ تلاشی کا درجۂ حرارت ماپنے کے لئے تو یہ بیرومیٹر (BAROMETER) کافی تھا۔ لیکن ہم یہ بھی معلوم کرنا چاہتے تھے کہ

سامان میں سے کس چیز کو پرکھ کر دیکھتے ہیں پاؤڈر کے ڈبے کو، شیشے کی پشت کو یا برش کے تلے (۵ ای) کو، لہٰذا ان سب چیزوں کو نمبر الاٹ کئے۔ پاؤڈر کا ڈبہ — ۱، صابن دانی — ۲، تکیہ — ۳، گدا — ۴، برش کا تلہ — ۵، شیشے کی پشت — ۶ وغیرہ۔

اگر ٹیلی فون نمبر میں کسی ہندسے کو دہرایا گیا تو سمجھ لیا کہ اس کو بار بار دیکھا، کسی کو ایک بار لکھا گیا تو مراد ہو گی کہ دیکھا ضرور لیکن سرسری طور پر اور اگر صفر کا ہندسہ آئے تو سمجھ لیا کہ اس نمبر بعد آنے والی شے کو سرے سے دیکھا ہی نہیں۔

سیل میں پہنچنے کے بعد لیفٹیننٹ شاہد نے جو ٹیلی فون نمبر مجھے حوالدار تارا سنگھ کے ہاتھ بھیجا، وہ یہ تھا اسلام آباد ۲۰۴۴۴ یعنی مجموعی طور پر تلاشی سخت نہ تھی۔ دو نمبر والی چیز (یعنی صابن دانی) کو ایک بار دیکھا، چار نمبر والی (گدا) کو بار بار ٹٹولا، پانچ نمبر (برش کے تلے) کو نہیں چھیڑا اور چھ نمبر (شیشے کی پشت) کو ایک آدھ دفعہ دیکھا۔

ہم نے اس رپورٹ کی روشنی میں اپنے کاغذات اور دیگر خزینے سنبھال لئے۔

چند دن پہلے بھارتی افسروں کی یہ بات مجھ تک پہنچی کہ یہ ہیں باقی افسروں کی تہی دامنی کا پورا پورا علم ہے لیکن میجر سالک ذات کی تنہائیوں میں اکثر لکھتا ہوا دیکھا گیا ہے اس کی تلاشی سے ضرور قابل اعتراض کاغذات برآمد ہوں گے لیکن اس دھمکی سے ڈر کر اپنا سرمایہ جلانے کو دل نہ مانا اور فیصلہ کیا کہ یوں ہے تو یوں ہی سہی۔ کاغذوں کی اہمیت کچھ بھی سہی اب معاملہ بھارت کے چیلنج کا ہے۔ اسے اس میدان میں ضرور مات دینی ہے۔

چنانچہ میں نے ایک ایسا طریقہ سوچا جس کے ذریعے کاغذات بحفاظت پاکستان لائے جا سکتے تھے۔ میرے پاس گردے کی بیماری کا بہانہ تو تھا ہی۔ بھارتی ڈاکٹر کیپٹن پتنگے سے ایک سرٹیفکیٹ لیا کہ میجر صدیق سالک کو فلاں فلاں بیماری کی وجہ سے "منہ کے راستے" زیادہ سے زیادہ پانی پینے کا مشورہ دیا گیا ہے، لہٰذا دوران سفر اسے پانی کی صراحی ساتھ رکھنے کی اجازت ہے۔ سرٹیفکیٹ پر اس کے دستخطوں کے علاوہ سرکاری مہر لگوائی اور اپنے پاس محفوظ کر لی۔

---

۵) (PLENTY OF WATER BY MOUTH) دواؤں کی عدم موجودگی میں یہ مشورہ مجھے کئی بار دیا گیا اور میں نے اسے مفید پایا۔

اس کے بعد بھارتی گارڈ ماسٹر کو بیچے ہوئے کوپن دے کر ایک صراحی منگوائی۔ وہ صراحی بھی نہایت موزوں لایا، منہ تنگ اور گلا اس سے بھی تنگ، گویا بالکل شاعر کی خیالی محبوبہ کی طرح، غنچہ دہن اور صراحی دار گردن! ایسی صراحی کی ایک خوبی یہ تھی کہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ اس کے اندر کیا ہے، ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا (شاید شاعر کی محبوبہ کے دل کا راز بھی ہمیشہ تاریکی میں رہتا ہے)

میجر راٹھور جو شکار بازی سے سرنگ بازی تک کے محاذوں پر اپنی اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے تھے، اب بھی میرے بہت کام آئے۔ انہوں نے صراحی کے پیندے میں نہایت خوب صورتی سے ایک انچ قطر کا سوراخ کیا اور پولی تھین (POLYTHENE) کا غذ میں لپیٹ کر میرے پرزوں کو واٹر پروف (WATER PROOF) بنایا اور سوراخ کے راستے انہیں صراحی میں ڈال دیا۔ اس بنڈل کا آخری سرا سوراخ میں پھنسا دیا تا کہ ہلانے سے اندر کسی چیز کے کھٹکنے کی آواز نہ آئے۔ سوراخ کو پہلے سے چوری کیے ہوئے سیمنٹ سے بند کیا اور جب وہ خشک ہونے لگا اس پر پیندے سے اتری ہوئی مٹی پیس کر لگا دی۔ رنگ سے رنگ ملا، دو چار قریبی احباب کو دکھائی تو انہوں نے تصدیق کی کہ کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ روانگی سے قبل اس میں پانی ڈال کر اوپر گلاس رکھ دیا۔

ہمارے کیمپ کا پہلا قافلہ روانہ ہونے لگا تو ہمارے ایک بزرگ نے ہمیں اکٹھا کر کے وعظ کیا کہ جب واہگہ بارڈر پر پہنچو تو اپنے جذبات پر قابو رکھنا اور سپاہیانہ وقار کے ساتھ پار اترنا۔ اہلِ وطن یہ نہ سمجھیں کہ ہم دو سال میں فوجی ڈسپلن بھول گئے۔ خواہ مخواہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم نے ان کا مشورہ پلے باندھا اور روانگی کا انتظار کرنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد ہم اس قافلے کو الوداع کہنے پھاٹک تک گئے جہاں انہیں گلے لگایا، ماتھے پر بوسہ دیا اور دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ جب ہم پھاٹک سے لوٹے تو ہمارے واعظ بار بار رومال سے آنسو خشک کر رہے تھے، مجھے دیکھ کر کہنے لگے: "ہاں، جذباتی ہونا اچھا نہیں، لیکن یہ موقع ہی ایسا ہے۔" میں نے سوچا کہ اگر یہ موقع ہی ایسا ہے تو واہگہ والا موقع کیسا ہوگا!

تیسرے قافلے میں میرا نام تھا۔ چنانچہ مجھے اور میرے ساتھ چھتیس افسروں کو کاغذات کو دستخط کرنے کے لئے دفتر طلب کیا گیا۔ ہمارے دل سے ابھی تک "۱۹۷۱ء جنگی مجرموں" والا خطرہ بالکل نابود نہ ہوا تھا اور دفتر میں بلائے جانے یا کاغذات پر دستخط کرنے کا قطعاً یہ مطلب نہیں تھا کہ ہم واقعی پاکستان پہنچ جائیں گے چنانچہ

ہم ایڈجوٹنٹ کے کمرے میں باہر کھڑے تھے۔ ماحول میں کشیدگی، غیر یقینی اور بیقراری تھی، لیکن اس کے باوجود میجر عزیز کو شرارت سوجھی انہوں نے ہمارے ایک سادہ لوح ساتھی سے کہا: "آپ اس خطرناک ٹولے میں کیسے آپھنسے؟ یہ تو خطرناک لوگوں کا گروہ ہے جنہیں جنگی جرائم کے سلسلے میں پیچھے رہنا ہے۔ بھارت کو ۱۹۵ جنگی قیدی گھر سے تو پورے کرکے نہیں دینے...... یہ دیکھو خطرناک آدمی ملا سالک کھڑا ہے جو ڈھاکے میں پتہ نہیں کیا کچھ کرتا رہا کہ کلکتہ سیل میں گھٹنا سٹرتا رہا ہے۔ یہ دیکھو خطرناک آدمی ملا، ایم۔پی ہونے کی وجہ سے نظم و ضبط بحال رکھنے کی خاطر اس نے کئی بنگالیوں کے دل دکھائے۔ وہ دیکھو میجر غفور...... کیسے خطرناک شعبے سے ان کا تعلق ہے...... میجر صاحب آپ تو خالص سپاہیانہ فرائض انجام دیتے رہے ہیں، آپ اس ٹولے میں کیسے آپہنچے، اللہ رحم کرے!"

تیر نشانے پر بیٹھا۔ سادہ لوح میجر صاحب نے ہونٹوں پر زبان پھیری، دو تین بار تیز تیز پلکیں جھپکیں اور پھر "آرام تھور STAND EASY کی حالت میں کھڑے ہو کر سینہ پھلایا اور سپاہیانہ جذبے سے کہا: "کوئی بات نہیں۔ آنے دو، دیکھا جائے گا!"

ہم دستخط کرکے لوٹے تو ریڈ کراس (ہلال احمر) کی طرف سے واپسی (REPATRIATION) کے کارڈ جاری ہوئے جو اس بات کی علامت تھے کہ یہ قیدی ضرور واہگہ پہنچیں گے۔ ریڈ کراس والے بھلا فالتو کارڈ بھروا کر کیوں ضائع کرتے!

سابقہ قافلوں کی طرح ہمیں بھی چوبیس گھنٹے قبل کیمپ سے نکال کر جیل کے ایک ویران حصے میں بھیج دیا گیا (آخری ذائقے کے طور پر سیل بھیجنے کی پالیسی ختم ہو چکی تھی)، ہمیں بھی پیچھے رہنے والوں نے نہایت خوشی اور جوش کے ساتھ رخصت کیا۔

ہمارے بعد آنے والے قافلے کے کاغذات تیار ہو چکے تھے، لیکن اٹھارہ ساتھی ایسے بھی تھے جن کو نظر انداز کیا گیا تھا۔ کیمپ ۳۰ کے بائیس افسروں کی طرح ہمارے یہ ساتھی بھی ۱۹۵ کی تعداد پوری کرنے کے لئے روکے جا رہے تھے۔ ہمارے دل میں ان جیالوں کے لئے احترام اور ہمدردی کے جذبات تھے، لیکن ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ ہم نے انہیں تسلی دی کہ صرف چند ماہ کی بات ہے، انشاء اللہ آپ بھی باعزت طور پر وطن آجائیں گے۔ وہ مسکرا کر کہنے لگے: "ہماری فکر نہ کرو، چند ماہ کیا چند سال بھی لگ جائیں تو پرواہ نہیں۔"

لمبی ہے غم کی شام، مگر شام ہی تو ہے

بس اہل وطن کو اتنا کہنا کہ ہماری طرف سے دل رنجیدہ نہ کریں، ہمیں قید یا تختۂ دار کا بھی ڈر نہیں۔ لیکن اگر اہلِ وطن نے ہمیں سچ مچ "مجرم" سمجھ لیا تو ہمیں بہت قلق ہوگا۔"

ہم ان سے وداع ہو کر جس بیرک میں عارضی طور پہ رکے، وہ میرے لئے نئی تھی لیکن کئی ساتھی دو سال قابل کیمپ میں داخل ہونے سے پہلے اسی بیرک کے ٹھنڈے فرش پر چند راتیں گزار چکے تھے تاہم آج صورت حال مختلف تھی۔ آج نہ صرف ان کے پاس پہننے کو کپڑے اور سونے کے لئے کمبل تھے۔ بلکہ اب انہیں یقین تھا کہ یہ طویل تیرہ و تار رات کا آغاز نہیں بلکہ ان کا انجام ہے، اسی رات کے سائے میں سحر کا نور پوشیدہ ہے، یہ رات ڈھلے گی تو ہم ٹرین میں ہوں گے ــــــ پاکستان جانے والی ٹرین !

۱۵ اکتوبر کو تین بجے صبح ہمیں ٹرکوں میں بٹھا کر گارد سمیت جیل سے باہر نکالا گیا۔ جونہی ہم جیل کے آخری پھاٹک سے نکل کر سڑک پر پہنچے، تو کئی ساتھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں نشان راہ تلاش کرنے لگے۔ اچانک دو تین ساتھی چلا اٹھے: وہ دیکھو، سڑک، سچ مچ سڑک، دیکھو تو سہی کتنی کشیدہ، لمبی ہے" واقعی دو سال قید میں صرف چار فٹ چوڑی اور بیس بائیس فٹ لمبی، پہرے داروں کی روشیں دیکھنے کے بعد یہ سڑک کشیدہ اور طویل لگتی ہے! میں نے کہا" ہاں، ہاں، واقعی سڑک ہے، اور غالباً ریلوے اسٹیشن کو جاتی ہے"۔

ریل گاڑی میں بیٹھ چکے تو ایک ساتھی جو اپنے ناکردہ گناہوں کی وجہ سے ہمیشہ اپنے آپ کو نام نہاد جنگی مجرموں میں شمار کرتے ہے، میرے پاس آئے اور کہنے لگے:" تم تو بڑے محفوظ ڈبے میں ہو۔ تمہارے آگے ریڈ کراس والے ہیں اور پیچھے ڈاکٹر کا کیبن (CABIN) ہے۔ تمہاری بوگی تو کٹنے کا ڈر نہیں"۔ میں نے چند فقرے کہہ کر ان کے ذہن سے وہم کے پرندے کو اڑایا۔ اور اپنے ساتھ سفر کرنے کی دعوت دی، کہنے لگے:" نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں، میرے ساتھ پچیس افسر اور بھی ہیں"۔

گاڑی چلنے سے پہلے ہمارے کیمپ کے موجودہ اور سابقہ کمانڈنٹ آئے اور پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر ہمارے نمائندے (SPOKESMAN) سے باتیں کرنے لگے آج خلاف معمول انہوں نے مسکراہٹ کا نقاب (MASK) پہن رکھا تھا لیکن اس کے پیچھے ان کے مکروہ خدوخال اور گھناؤنے عزائم صاف دکھائی دے رہے تھے۔ چنانچہ کسی نے ان کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے نہ دیا۔ وہ کھسیانی بلی کی طرح پلیٹ فارم پر کھڑے رہے اور گاڑی چل دی۔

سنا تھا کہ آگرے سے چلنے والی پہلی گاڑی کی کھڑکیاں بند رکھی گئی تھیں لیکن ہماری روانگی کا موقع آنے سے پہلے یہ پالیسی ترک کر دی گئی تھی۔ اب کھڑکیاں کھلی تھیں، دروازے پر گارڈ کھڑی تھی لیکن اس کی موجودگی سے ہمارے لطف تماشا میں کوئی فرق نہ آتا تھا۔ چنانچہ ہم نے خوب اِدھر اُدھر دیکھا تا کہ کہیں تاج محل کی جھلک ہی نظر آجائے۔ لیکن بے سود۔ ریل کی پٹڑی کے دونوں جانب مفلوک الحال مرد، عورتیں اور بچے صبح کی ضروریات میں مصروف نظر آئے۔ آگرہ، کلکتہ سے بھی غلیظ تر نکلا۔

شہر سے نکلے تو کشادگی کا احساس ہوا۔ لہلہاتے کھیت، سربلند فصلیں اور سرگرم کسان۔ حدِ نگاہ تک سبزہ ہی سبزہ۔ جہاں سبزہ نہ تھا، وہاں کھیتوں کی بھربھری مٹی مہک رہی تھی۔ اس قطعۂ زمین سے بھارت خاصا خوشحال نظر آیا، لیکن جب اس کی آبادی کا خیال آیا تو سمجھا کہ نجانے ایک ایک کھیت پر کتنے پیٹ پلتے ہوں گے! ایک ایک خوشہ نجانے بٹ کر کتنے تہی دستوں کے قبضے میں چلا جائے گا۔ بمبئی سے کلکتہ اور سری نگر سے کوچین تک کتنے بھوکے منہ اور ترستی آنکھیں ان فصلوں کے کٹنے کی منتظر ہوں گی ـــــ لیکن ہمیں بھارت کی خوشحالی یا قحط سالی سے کیا، ہمیں تو واہگہ پہنچنے کا انتظار تھا!

دن کے بارہ بجے گاڑی دہلی ریلوے اسٹیشن پر رکی۔ وہی دہلی جس پر ہلالی پرچم لہرانے کے نعرے ہم نے بچپن میں لگائے تھے۔ وہی دہلی جو آج اپنی فتح کے نشے میں اپنا حلقۂ اثر کابل سے برما تک پھیلانا چاہتا تھا، جس کے پہلو میں صرف پاکستان کا وجود کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا!

میں کھڑکی میں بیٹھا پلیٹ فارم کی رونق دیکھ رہا تھا کہ ایک لال پٹی والا بھارتی افسر آیا اور کھڑکی کے پاس آکر کہنے لگا: "میرا نام کرنل بالی ہے۔ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟" میں جواب دینے کی بجائے اس کو دیکھتا رہا۔ لمبا قد، پچکا ہوا پیٹ، سانولا رنگ، کھچڑی مونچھیں، چہرے مہرے سے افسر کم اور بنیا زیادہ لگتا تھا، لیکن اس کے کندھوں پر فل کرنل کے پھول اور کالر پر سرخ پٹی کہہ رہی تھی کہ بات کرنے پر جی نہیں چاہتا تو مت کرو، کم از کم بے چارے کی افسری پر تو شک نہ کرو!

کرنل بالی نے پھر کہا: "آپ راولپنڈی کے رہنے والے ہیں؟" اگرچہ میرا تعلق راولپنڈی سے نہ تھا، پھر بھی میں نے ہوں ہاں کر دی۔ اس پر وہ پرانے رشتے جگانے لگا کہ "میں بھی پنڈی میں پلا بڑھا ہوں، چھاچھی محلہ میں میرا مکان تھا۔ آپ کا کون سا محلہ ہے؟" میں نے اسے چھیڑنے کے لئے کہہ دیا: "گوالمنڈی۔"

"اچھا، اچھا، وہی گوالمنڈی جہاں ہمارے چچا رہتے تھے، ضرور آپ کے والد صاحب انہیں جانتے ہوں گے۔

وہ بڑے نیک اور نرم دل انسان تھے۔ کپڑے کا کاروبار کرتے تھے اور مسلمانوں کی بہت مدد کرتے تھے، کیوں نہ ہو ہمارے باپ دادا کی یہی ریت چلی آ رہی تھی۔ ہمارے دلی رشتے اتنے گہرے تھے کہ تقسیم ہند ان رشتوں کو نہ مٹا سکی۔ اب بھی کسی سے ہربنس سنگھ کا نام لینا، تو اشتیاق سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ جائیں گے، کیوں نہ ہو صدیوں پرانے ثقافتی اور تمدنی رشتے چلے آتے ہیں وہی زبان، وہی خوراک، وہی جسمانی ساخت، وہی عادات و اطوار......"

جی چاہا کہ زور سے اس کے منہ پر طمانچہ رسید کروں۔ کینہ کمینی کا ۱۰ دسمبر ۱۹۷۱ء سے آج تک یہی لیکچر سنتے سنتے ہمارے کان پک گئے ہیں۔ ابھی کچھ کسر باقی تھی کہ جاتی دفعہ زخم تازہ کرنے ضروری سمجھے! میں نے کہا: "مجھے ان تہذیبی رشتوں کے ساتھ ساتھ ہندو ذہن کا بھی پورا پورا علم ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ہندوؤں کی تنگ دلی اور کینہ پروری کس انتہا کو پہنچ چکی تھی کہ مسلمانوں کو الگ گھر بنانے کی ضرورت پڑی، مجھے پتہ ہے......"

اتنے میں گاڑی چل دی اور کرنل بال اپنی سرکاری ٹوپی سہلاتا پلیٹ فارم ہی پر رہ گیا۔

دوپہر اور رات کے کھانے کا وقت آیا اور گزر گیا۔ اگرچہ بھوک بہت تھی، تاہم کچھ کھانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ میری نظریں تو واہگہ پر تھیں۔ کوئی لقمہ لیتے ہوئے اگر منزل اوجھل ہو گئی تو مجمل سے بچھڑنے کا خطرہ تھا۔ لہٰذا میں کھڑکی سے گردن لگائے مغرب کی جانب دیکھتا رہا کہ کس منزل پر بوئے وطن آ کر استقبال کرتی ہے!

۱۶ اکتوبر کی رات طویل سہی، اکڑی ہرگز نہ تھی، دھیرے دھیرے بہتی رہی اور ہم اس کی لہروں میں ہچکولے کھاتے رہے۔ گاڑی کے پہیے کے ہر چکر کے ساتھ بجر کی ایک گھڑی کم ہوتی گئی، گاڑی کا ہر جھٹکا ہمیں منزل کی طرف دھکیلتا رہا۔

میں کمبل بچھا کر لیٹ گیا۔ پلکیں جڑ گئیں۔ میں محوِ خواب ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ کیمپ میں سب لوگ کاغذوں پر دستخط کر رہے ہیں، اپنا سامان سمیٹ رہے ہیں، کتابوں کو تولیے کے بیگ میں ڈال رہے ہیں، اب باری باری پھاٹک سے باہر جا چکے ہیں، میں جیل میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ پھر بیرک کی دیواریں سمٹ کر قریب آ گئی ہیں، بیرک، سیل میں بدل چکی ہے، دور دور گشت کرنے والا سنتری اب سلاخوں کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا ہے اور بلا وجہ بدزبانی پر اتر آیا ہے اور سیل کے باہر سے سنگین کی نوک مجھے چبھو رہا ہے۔

میں اس کی ٹیس سے چونک اٹھتا ہوں۔ آنکھ کھلتی ہے تو گاڑی چھک چھک چل رہی ہوتی ہے اور میرے ڈبے میں سفر کرنے والے افسر بلب کی مدھم روشنی میں تلاوت کر رہے ہیں۔ گھڑی دیکھتا ہوں تو صبح کے ساڑھے تین بجے ہیں۔

یہی سحری کا وقت تھا، میرے ساتھی مسافروں نے بتایا کہ رات کے اندھیرے میں کہیں گاڑی روک کر دو دو چپاتیاں فی قیدی تقسیم کی گئیں۔ ہم نے تمہیں جگانا مناسب نہ سمجھا کہ شاید گھر پہنچنے کے حسین خواب دیکھ رہے ہو گے۔ لو، یہ رہی تمہارے حصے کی سحری"۔ میں نے ایک چپاتی کھا کر صراحی سے پانی پیا اور روزہ رکھ لیا۔

اب سحر ہونے کو تھی، ایک طویل شب ہجر کی سحر، سحر جو ہمیشہ شب سے عظیم تر ہے! اب وہ مجھے دستک دے کر جگا رہی تھی اور ستاروں کو الوداع کہہ رہی تھی

جاؤ اب سو رہو ستارو
درد کی رات ڈھل چکی ہے

پو پھٹتے امرتسر پہنچے۔ اگلا سٹیشن اٹاری تھا جہاں ہمیں اترنا تھا۔ چنانچہ اٹھ کر شیو بنائی، منہ ہاتھ دھویا۔ "پی۔ ڈبلیو" کی چھاپ کے بغیر پرانی وردی پہنی، کمبل تہہ کر کے ایک طرف کیا، بوٹوں کے تسمے کسے اور اٹاری کا انتظار کرنے لگے۔

اٹاری اترے تو بھیڑ بکریوں کی طرح ہماری گنتی ہوئی، فہرستوں کے مطابق ہمارے نام پکار پکار کر تین قطاروں میں کھڑا کیا۔ یہی وہ تربیت تھی جس کے مطابق ہمیں واہگہ بارڈر پار کرنا تھا۔ چاروں طرف بھارتی گارد نے حصار باندھا اور ہمیں اٹاری سے واہگہ تک پیدل چلنے کا حکم ہوا۔ ہم تو پاکستان پہنچنے کے لئے آگرے سے پیدل مارچ کرنے کو تیار تھے یہ دو میل کا فاصلہ کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا لیکن اس سفر میں جو ذلت شامل تھی، اس سے خاصا دکھ ہوا۔ ہم بھارتی سنگینوں کے زیر سایہ خاک اڑاتے سرحدی گاؤں سے گزرے تو وہاں بچے، بوڑھے اور جوان سڑک کے کناروں یا مکان کی چھتوں سے ہمارے سفر ذلت کا نظارہ کرنے لگے۔ ہم ان علاقوں میں کبھی کسی اور روپ میں داخل ہونے کے خواب دیکھتے تھے، آج انہی سے ذلت کی بیڑیاں پہنے گزر رہے تھے۔ یہ دیہاتی کیا سوچتے ہوں گے کہ پاکستانی فوج جس کی دھاک ان کے دل پر بیٹھی تھی اب اس حالت کو پہنچ چکی ہے! کیا ہمیں صرف اس لئے پیدل چلایا گیا کہ سرحدی علاقے کے باشندوں کے دل سے پاکستانی فوج کا ڈر مٹ جائے۔۔۔! ہم چار و ناچار چشم نم اور جان شوریدہ لئے چلتے رہے۔

آدھے راستے میں میرے پہلو میں درد کی ٹیس اٹھی۔ یوں محسوس ہوا کہ گردے نے اس رسوائی پر احتجاج کیا ہے۔ درد کو تھپکی دے کر سلانا چاہا تو یہ اور بھڑک اٹھا۔ بھارتی گارڈ سے آخری وقت مدد مانگنے کو جی نہ چاہا۔ میں زبان دانتوں میں دبائے بازو ہلاتا دوسروں کے ساتھ قدم ملا کر چلتا رہا، لیکن درد بتدریج بے قابو ہوا جاتا تھا۔ میں نے گردن اکڑا کر سامنے دیکھا تو دور "خوش آمدید" کے موٹے موٹے حروف دکھائی دیئے۔ منزل کا نشان دیکھ کر جسم میں ایک انجانی قوت آ گئی۔ قدم تیز تیز اٹھنے لگے، اسیر و رنجور اعضاء جوان ہو گئے۔ میں نے درد پر قابو پا لیا ـــ اور چلتا رہا، چلتا رہا۔

واہگہ بارڈر پر پہنچے تو سرحد کی بھارتی جانب ہی ہمیں روک کر از سر نو گنتی ہوئی اور سرحد پار کرنے کی ترتیب چیک کی گئی۔ قیدی پاکستان کے حوالے کرنے کا وقت ۱۲ بجے صبح تھا، لہٰذا ہم بنچوں پر بیٹھ گئے اور جوان زمین پر ہی کھڑے رہے۔

انتظار کی یہ گھڑیاں بھی عجیب تھیں۔ منزل چند قدم پر سامنے تھی لیکن ہم نہ پلک کر اسے چوم سکتے تھے نہ وہ سرک کر ہمارے پاس آ سکتی تھی۔ اس چند گام فاصلے کے ایک طرف غلامی، قید اور ذلت تھی اور دوسری جانب آزادی اور عزتِ نفس ہماری منتظر تھی۔

انتظار کی گھڑیاں طویل ہو گئیں، ہم بار بار گھڑی دیکھتے۔ اب پانچ منٹ باقی ہیں، اب چار، اب ساڑھے تین، اب صرف تین۔ لو، جوانوں کا ایک گروہ پار اتر گیا۔ دوسرا بھی گیا، تیسرا بھی، اب ہماری باری ہے۔

بارڈر پر ریڈ کراس (ہلالِ احمر) کے نمائندے کی موجودگی میں بھارتی اور پاکستانی افسروں نے فہرست چیک کی۔ ہم اپنا اپنا نام پکارنے پر غلامی سے آزادی میں قدم رکھنے لگے۔ تین قطاروں میں ہم آگے بڑھے۔ اہلِ وطن نے پھول برسائے، خوش آمدید کہا اور فوجی بینڈ نے خوشی کے ترانے بجائے۔ ہر طرف رنگا رنگ جھنڈیاں اور سنہری لڑیاں جھلمل جھلمل کر رہی تھیں، لیکن سچ پوچھیے تو اس وقت یہ تفصیلات ذہن میں محفوظ کرنے کا ہوش نہ تھا۔ میری آنکھیں کھلی تھیں، وہ سب کچھ دیکھ بھی رہی تھیں، لیکن ابھی جزئیات قبول نہ کرتی تھیں۔

لیفٹیننٹ جنرل عبدالحمید خان سے لے کر جونیئر افسروں تک نے خوش آمدید کہا۔ سرکاری استقبال سے فارغ ہوا تو اخبار نویسوں اور فوٹو گرافروں نے گھیر لیا۔ انہوں نے خوشی کا اظہار کیا کہ ان کا صحافی برادری کا فوجی رکن بخیر و خوبی واپس آ گیا ہے۔

لاہور چھاؤنی کے استقبالیہ کیمپ میں پہنچا تو لواحقین اور احباب نے پھولوں، خوشیوں اور بوسوں سے استقبال

گیا۔ جونہی پھولوں سے لدی ہوئی سفید کار سے اترا، انہوں نے مجھے ہاروں سے لاد دیا۔ رنگا رنگ پھولوں کے ہار، طلائی تاروں کے ہار، نوٹوں کے ہار۔ میں ہار اتارنے لگا تو کیمرے والوں نے کہا کہ ذرا رک جائیے! میں رُک گیا اور وہ تصویریں اتارنے لگے۔

کمرے کے اندر ایک اور بیتاب ہجوم منتظر تھا۔ کسی نے ہار پہنائے، کسی نے دعا کی اور اکثر نے گلے لگایا۔ میرے تینوں کمسن بچوں کے چہروں پہ مسرت کی کہکشاں پھیلی ہوئی تھی اور ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلملا رہے تھے۔ میں نے پانچ سالہ سرمد کو تین سال کی جدائی کے بعد گود میں لے کر کہا "کیوں بیٹے، پہچانا مجھے؟" "کیوں نہیں؟ ابو دو سال آپ کے لئے دعائیں کرتا رہا، پہچانتا کیسے نہ!" اس کے بعد اس نے مشورہ دیا کہ "مجھے اتار کر منی کو اٹھالیں کراتی کے ساتھ بیٹھ کر ہر نماز کے بعد یہ دونوں ہاتھ اٹھا کر آپ کے لئے دعا مانگتی تھی۔" بڑی بیٹی صحیفہ قانت کی تصویر بنی کندھے سے لگی کھڑی تھی۔

اس ہجوم انبساط میں ایک ہمدرد نے دبی زبان میں کہا "افسوس کہ آپ کی والدہ کو خوشی کا یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوا"۔ "کیوں، کیا ہوا؟" — "آپ کے آنے سے چند روز پہلے وہ مایوس ہو کر اس دارِ فانی سے رحلت فرما گئیں۔" اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ہ

ٹھنڈی تھی جس کی چھاؤں وہ دیوار گر گئی

مجھے یوں لگا کہ ارض و سما چکرا گئے ہیں۔ سلسلۂ کائنات میں خلل پڑ گیا ہے۔ اس تیز گرد باد میں میں ایک ادنیٰ اور بے بس ذرے کی طرح تھپیڑے کھا رہا ہوں۔ طوفان ذرا تھما تو یوں محسوس ہوا کہ مجھے جیل سے نکال کر عمر بھر کی قید تنہائی میں ڈال دیا گیا ہے۔ ایک ایسی قید تنہائی جو کلکتہ جیل سے کہیں زیادہ تاریک، طویل اور گمبھیر ہے۔ کیا میں تنہا اس قید کا بوجھ سہار سکوں گا یا ہمت ہار کر دم توڑ دوں گا؟

دل کو لاکھ سمجھایا کہ زندگی اور موت قدرت کے اٹل اصول ہیں، ان سے کسی کو مفر نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے ماں اور بیٹے کا چند سالہ فراق ابدی جدائی میں بدل دیا ہے تو اسی میں رضائے الٰہی ہوگی لیکن دل ناتواں کسی طور نہ سمجھتا تھا۔

میں نے ذاتی المیے کو قومی المیے میں ڈھالنے کی کوشش کی کہ چند سال قبل جب اسی لاہور سے ڈھاکہ روانہ ہوا تھا تو میں نے اپنی ماں کے علاوہ مادرِ وطن بھی چھوڑی تھی۔ آج دونوں ہی فوت ہو گئیں۔ ایک طبعی موت مر گئی، دوسری سانحاتی۔ میں بہر صورت دونوں سے محروم ہو گیا۔ جب ہر بڑی چیز چھوٹی چیز کو نگل جاتی

ہے تو اتنا بڑا قومی المیہ میرے ادنیٰ سے ذاتی غم کو کیوں نہیں نگل سکتا!

لیکن افسوس کہ یہ استدلال بھی دل کو قائل نہ کرسکا۔ جس ماں کی کوکھ سے جنم لیا تھا، اس کی گود سے دائمی محرومی ایک ایسا زخم تھا جو مندمل ہونے میں نہ آتا تھا۔ میری آنکھیں بار بار اس مشتِ استخواں کو تلاش کرتی تھیں جس کی دعاؤں نے ہمیشہ مجھے ڈھارس دی تھی، جس کے چہرے کی جھریوں میں پیار دفن تھا، جس کی اشک آلودہ آنکھوں سے ہر وقت مامتا چھلکتی تھی، جس کی آغوش گہوارۂ سکون اور جس کا وجود باعثِ رحمت تھا۔ آج میں ان سب سے محروم ہو چکا تھا۔ ایک دو دن کے لئے نہیں ہمیشہ کے لئے۔

مجھے لیفٹیننٹ رضوی شہید کی ماں کا خیال آیا، جو آجکل اپنے لختِ جگر کی بلائیں لینے کے لئے بیتاب تھی، جس کی گود اجڑ گئی تھی اور دل بجھ چکا تھا۔ مجھے میجر نصیر اللہ شہید کے گھر والے یاد آئے جو داگہ پر جلنے والے چراغوں سے اپنا گھر منور نہ کر سکے۔ مجھے سپاہی انور کا خیال آیا جس نے آگرہ جیل کے حبس میں دم توڑ دیا تھا۔ پتہ نہیں اس کے لواحقین میں سے کتنوں نے حبسِ زندگی سے تنگ آکر قبائے حیات چاک کر دی تھی۔

نجانے اس صبحِ مسرت کے طلوع ہونے کے انتظار میں کتنے در و دیوار ہمیشہ کے لئے سیاہ ہو گئے، کتنی تمنائیں دم توڑ گئیں اور کتنی آرزوئیں خاک ہو گئیں!

عزیز و اقارب مجھے سرکاری کاغذات کی تکمیل وغیرہ کے لئے استقبالیہ کیمپ میں چھوڑ کر دو روز بعد آنے کا وعدہ کرکے چلے گئے۔ میں نے پہلے روز کا کام مکمل کرلیا، تو رنج و الم کا بوجھ ہلکا کرنے کو لاہور شہر کے کوچہ و بازار کی طرف چلا گیا۔ گلبرگ، مال روڈ، انار کلی، موچی گیٹ، بھاٹی گیٹ اور گول باغ سے ہوتا ہوا ٹی ہاؤس کی طرف نکل گیا جہاں میرے ادبی دوست بیٹھا کرتے تھے۔ سوچا ناصر کاظمی، مختار صدیقی اور دوسرے احباب کا دیدار ہوگا تو سارے غم مٹ جائیں گے، سارے رنج ڈھل جائیں گے، لیکن وہاں پتہ چلا کہ میری عدم موجودگی میں ناصر کاظمی فوت ہو گئے اور مختار صدیقی بھی، باقی صدیقی بھی چلے گئے اور حفیظ ہوشیارپوری بھی، عابد علی عابد بھی الوداع ہو گئے اور یوسف ظفر بھی۔ یا خدا ذرا سی غفلت کی اتنی بڑی سزا! ذرا بیٹھ کی اور موت کے ظالم ہاتھ نے سارے چراغ گل کر دیئے! میرے گلشن کے سارے البیلے پھول چن لئے! میرے آسمانِ شعر و ادب کے سارے مہر و ماہ بے نور کر دیئے! میں ناصر کاظمی کے یہ دو

شعر گنگنانے لگا۔

بول اے مرے دیار کی سوئی ہوئی زمیں
وہ جن کو ڈھونڈتا ہوں کہاں ہیں وہ آدمی؟

وہ شاعروں کا شہر لاہور بجھ گیا
اُگتے تھے جس میں شعر وہ کھیتی ہی جل گئی!

چلتے ہو تو چین کو چلیے

ابنِ انشا

اپریل کے مہینے کی چھبیسویں تھی اور اتوار کا روز کہ ہم علی الصبح دیوارِ چین کی زیارت کو روانہ ہوئے۔ یہ پیکنگ سے کوئی پچیس تیس میل کی دوری پر ہے اور چین کا لاکھوں مربع میل علاقہ اس کے شمال میں پھیلا ہے۔ اب سے بائیس تیئس سو برس پہلے جب یہ بنی تھی تو اس کا مقصد شمال سے تاتاریوں کے حملے کو روکنا تھا۔ تحقیق کہتی ہے کہ جہاں تہاں دیواریں تو مختلف حکمرانوں نے پہلے ہی کھڑی کر رکھی تھیں۔ ہاں شہنشاہ اوّل چن شہ ہوانگ ٹی نے ۲۱۴ ق م میں ان کو مربوط کیا۔ ان پر برج بنائے اور دھوئیں کے سگنل دینے کا طریقہ رائج کیا جو اس کے پایۂ تحت بیان سے نظر آسکیں، چین والے اپنی زبان میں اس کو دس ہزار میل لمبی دیوار کہتے ہیں لیکن فی الحقیقت یہ ڈیڑھ ہزار میل کے لگ بھگ ہے کہیں یہ پندرہ فٹ اونچی ہے کہیں پچاس فٹ۔ کچھ حصہ بڑی بڑی اینٹوں سے بنا ہے کچھ پتھروں سے۔ دیوار کے زیادہ تر حصے کے ساتھ ایک بیرونی خندق بھی کھدی دکھائی دے گی۔ یہ ڈیڑھ ہزار میل کا تسلسل بھی ٹوٹ گیا ہے۔ کہیں سے ریل در آتی گزرتی گئی ہے کہیں کہیں سڑک بن گئی ہے کہیں استدادِ زمانہ نے شکست و ریخت کا عمل کیا ہے لیکن جہاں سے ہم نے اسے دیکھا اور اس پر چڑھے وہاں سڑک اسے کاٹ کر نہیں بلکہ اس کے نیچے سے گزرتی ہے۔ سیڑھیاں چڑھ کے آپ ایک برج پر پہنچتے ہیں جس پر چھت بھی ہے وہاں سے چڑھائی شروع ہوتی ہے اور فرش اینٹوں کا ہے۔ یہ اینٹوں کا فرش بعد کا معلوم ہوتا ہے کیونکہ چودھویں اور سولھویں صدی میں بھی اس کی مرمت ہو چکی ہے۔ بایں ہمہ نیچے کے آثار ضرور دو ہزار برس سے زیادہ پرانے ہوں گے۔

یہاں سیر کو آنے والوں کا ہمیشہ ہجوم رہتا ہے اور اتوار کو بالخصوص زیادہ تر لوگ ریل سے آتے ہیں اور ریل کے سٹیشن سے جو غالباً میل بھر دُور ہے پیدل۔ اس کے بعد میلوں تک چڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اس روز سردی بھی خاصی تھی۔ یہاں میاں ظل الرحمٰن کا کوٹ کام آیا۔ ہمارے لیڈر پرنسپل ابراہیم خان نے اوورکوٹ کے

رنگ کا ایک ڈریس گاؤن نکالا جو اوورکوٹ کا بہت عمدہ کام دے رہا تھا چونکہ اس پر ریشمی دھاگے کی کشیدکاری بھی تھی لہٰذا سب نے ان کو خاقانِ چین کا خطاب دیا۔ ہماری پارٹی کے زیادہ تر لوگ پچاس ساٹھ ستر کی عمر کے دائرے میں تھے وہ تو برُج کی منڈیر پر بیٹھ گئے، ڈاکٹر وحید قریشی باوجود اپنی جوانی کے چڑھائی چڑھنے سے گھبرائے۔ اعجاز بٹالوی البتہ ہمیشہ چاق و چوبند رہتے ہیں، اگر کسی گھوڑا پر چڑھنے کی نوبت آئی تو ہیں دونوں نے۔ اُت کی۔ لیکن یہاں دیوارِ چین کی چڑھائی میں بازی ہمارے ہاتھ رہی۔ اعجاز دو برُج پیچھے رُک گئے جی تو اور آگے جانے کو چاہتا تھا لیکن ساتھیوں کے ساتھ واپس بھی تو پہنچنا تھا۔ ان آخری دو برُجوں کے درمیان چڑھائی اتنی سیدھی ہے کہ ستر بہتر درجے کا زاویہ بنتا ہوگا۔ اترنے میں گرنے کا اندیشہ زیادہ تھا، جوتا پتھروں پر سے رپٹ رپٹ جاتا تھا اس لئے ہم نے نعلین کو در تعلین کیا یعنی اپنے جوتے اتار کر ہاتھ میں لے لئے جس نے دیکھا، تماشا سمجھا اور بچوں نے تو تالیاں بھی بجائیں۔

نیچے اس کے چھوٹا سا چائے خانہ ہے۔ وہاں چائے پی گئی اور پھر دیوارِ عظیم کے سائے میں تصویر کھنچوائی گئی۔ یہ دیوار جبری مزدوری سے بنی تھی۔ ہماری کتاب، چینی نظمیں، میں ایک نوحہ ہے۔ ایک بی بی مینگ چیانگ نو کے میاں کو زبردستی بیگار میں پکڑ کر لے گئے تھے۔ پھر کیا ہوا، معلوم نہیں، غالباً ہزاروں دوسرے مزدوروں کی طرح وہیں مشقت کرتا ہوا مر کھپ گیا۔ یہ نوحہ بارہ ماسہ کی صورت میں ہے۔ نئے سال یعنی جنوری سے شروع ہوتا ہے۔

لو نیا سال آیا بہاریں لئے
آج آنوچے پھولوں سے بھرپور ہیں
آج ہر گھر کے در پر ہیں روشن دیے
لوگ خوش بخت ہیں، لوگ مسرور ہیں
ہر طرف، ہر جگہ تازگی چھا گئی
جنوری آگئی
آج پورا ہے بستی کا ہر خاندان
ایک میرا ہی دل زار و مہجور ہے
وہ آن کو لے گئے ہیں وہ بے گار میں
اب وہ دیوارِ عظیم کا مزدور ہے

میرے دل کو یہاں سے گلی کھا گئی
جنوری آ گئی

فروری آئی ہے
اور دامن میں لائی ہے خبانیاں
چڑیاں آنے لگیں
اور دکھن کی جانب کی دار پہ
ایک اک کر کے ڈیرے جمانے لگیں
گھونسلوں کو سجا کر دلہن کی طرح
ان کے جوڑے تو گلگشت کرنے لگے
بڑھ گئیں میرے دل ہا ویرانیاں
فروری آئی

مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی سب کی اپنی اپنی کیفیت ہے۔ پنجابی سندھی دکنی سب میں بارہ ماسے موجود ہیں، اردو میں بیس تیس برس پہلے سلام مچھلی شہری نے ایک بارہ ماسہ لکھا تھا جسے اردو ادب میں اعلیٰ مقام ملنا چاہیئے۔ ہمارے جیسی بارہ ماسہ میں سے اب اگست کی سنیئے

ماہِ اگست بھی گلِ بدسہ آ گیا
تیج پات آ کے گلشن مہکا گیا
ہنس آنے لگے
چھٹیاں خوش نصیبی لانے لگے
اور بے فکرے گاتے چوپال میں
ساوادن بیٹھ کر گدگدانے لگے
یہ مہینہ بھی یونہی گزرے گا
اس کی پوشاک کو دُھلائے گا

آخر نومبر میں وہ خود فیصلہ کرتی ہے۔ مرثی بھرپور ہے۔

برف کے گالے پھر چار سو چھا گئے

یعنی پھر سے نومبر کے دن آ گئے

آپ ہی جاؤں گی

وان کو اس کی پوشاک پہنچاؤں گی

جنگلوں اور پہاڑوں کے کوّے مجھے

راہ بتلائیں گے

اور میں روتی ہوئی

زیرِ دیوارِ اعظم پہنچ جاؤں گی۔

عجیب حسرت آمیز نوحہ ہے خصوصاً ایک جگہ جہاں وہ کہتی ہے:

میرے پیتم مرے وان کو چھوڑ دو

ظالمو چھوڑ دو

زیرِ دیوارِ عظیم بیٹھے اپنے چینی دوستوں سے ہم نے ذکر کیا۔ سب نے اسے سُن رکھا تھا۔ شمالی چین کے لوک ادب کی یہ مشہور چیز ہے

مسافر کو پرانی تہذیبوں اور گزرے زمانوں کے آثار ہر جگہ ہر ملک میں ملتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں کہ دل کو فوراً گداز کرتے ہیں۔ ہم پر جو اثر شیراز میں مزارِ سعدی کی زیارت پر ہوا ویسی کیفیت تو پھر یا اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی لیکن دیوارِ عظیم نے کہ جس کا احوال دنیا کے سات عجوبوں کے ضمن میں ہم بہت صغر سنی میں پڑھا تھا ایک عجیب اثر جی پر چھوڑا یا پھر دل گداختگی کی یہ کیفیت کینٹن میں رسُول اللہ کے صحابی ابی وقاص کے مقبرے اور نواحی قبرستان کے گُل بوٹوں کو دیکھ کر طاری ہوئی۔

تو صاحبو! اب واپسی، لیکن راستے میں منگ بادشاہوں کے زیرِ زمین مقابر دیکھتے چلو یہ مقبرے کہ زمین کی سطح سے چالیس پچاس گز نیچے ہوں گے۔ غالباً اس لئے زیرِ زمین بنائے گئے کہ آنے والوں کی تاخت و تاراج سے محفوظ رہیں۔ منگ وہ چینی خاندان تھا جس نے چنگیز خان کے پوتوں سے سلطنت چھینی اور عہد اس کا ۱۳۶۸ء سے ۱۶۴۴ء تک ہے۔ یوں کہیے کہ مقبروں والے یہ بادشاہ اکبرِ اعظم کے ہم زمانہ تھے۔

صدیوں یہ مقبرے دنیا کی نظروں سے پنہاں رہے۔ یہ غالباً پچھلی صدی کی بات ہے کہ تجسس کرنے والوں کو ایک لوح ملی جس میں ان کے راستے کی سمت مرموز تھی۔ برسوں کی کھدائی کے بعد ایک دروازہ تیغہ کیا ملا۔ اندر اترے تو بند ایوانوں میں مقبروں کے علاوہ بڑے بڑے چینی کے ظروف میں انواع واقسام کی نعمتیں موجود پائیں۔ سونے چاندی اور جواہر کے ڈھیر لگے تھے۔ چوبی تابوت تو سیلن اور موسمی اثرات سے خستہ وخراب ہو کر مٹی ہو چلے تھے اور بعد میں دوبارہ انہی نقشوں پر بنوائے گئے لیکن باقی چیزیں سلامت تھیں۔ سیڑھیاں اترنے کے بعد دروازوں کو کھولنا آسان نہ تھا۔ جن لوگوں نے دروازے بند کئے۔ انہوں نے اندر کی بلیاں گرا کر ایسا انتظام کیا تھا کہ کوئی باہر سے نہ کھول سکے لیکن دانشمندوں نے یہ گرہ بھی کھول ہی لی۔ عجیب آسیبی ماحول ہے اوپر ستر اسی فٹ اونچی چھت ہے، نیچے غلام گردشیں اور طاقچے۔ ایک بڑے ظرف میں قربان گاہ کی قندیلوں کے لئے تیل بھرا تھا، اب بھی موجود ہے لیکن بہت گاڑھا ہو گیا ہے۔ اتنے میں ہمارے چینی دوستوں نے کہا کہ ایک چیز اور رہ گئی ہے ادھر آؤ۔

ایک بہت بوسیدہ چار پانچ سو برس پہلے کا چوبی دروازہ جھک کر پار کیا تو اندر پہنچ کر سب آنکھیں جھپکنے لگے۔ تو کیا منگ زمانے میں ہماری طرح کے صوفے کرسیاں اور میز بھی ہوتے تھے میزبان مسکرائے اس دور کے اس بغلی کمرے کو مہمانوں کی نشست کے لئے درست کر لیا گیا تھا فقط دروازہ عہد قدیم کا باقی رکھا تھا۔ سب بیٹھے چائے آئی اور سب اپنی حیرانی پر ہنسے۔

معلوم ہوا کہ ابھی ایک دو مقبرے کھولے گئے ہیں نشاندہی سترہ اٹھارہ کی ہو چکی ہے۔ جو ان نواحات میں میلوں تک نصف دائرے کی شکل میں پھیلے ہوئے ہیں۔

باہر آئے تو میزبانوں نے سب کو ٹھنڈا پلوایا۔ ٹھنڈا سے یہاں مطلب اور نکے ہی لیجئے ستر کروڑ کا یہ ملک کوکاکولا، پیپسی کولا، سیون اپ، کناڈا ڈرائی اور فانٹا دور جدید کے ان تمام لذائذ کو جانتا بھی نہیں ان کے بغیر ہی ترقی کر رہا ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ کیسے کر رہا ہے۔ جب یہ بیرونی نعمتیں اس کے دروازے ہانگ کانگ اور پڑوسی جاپان تک میں موجود ہیں تو اپنے ہی سنگترے نچوڑنے پر اتنا اصرار کیوں؟

کھانے کی باتیں پھر کبھی سہی اب ذرا پینے کی بات سن لیجئے۔ عام آدمی کا مشروب گرم پانی ہے آج سے نہیں صدیوں سے۔ یا تو گھر میں پتیلا چڑھا رہے گا ورنہ بازار میں دیگ ابل رہی ہے وہاں سے دو پیسے میں بالٹی بھروا لائیے۔ طالب علم اسکول جاتا ہے یا باہر تفریح کو تو اس کے بستے کے ساتھ ایک مگ لٹکا رہتا ہے۔ اس سے زیادہ

عیاشی مطلوب ہے تو چند پتیاں چائے کی ڈال لیجئے اور چسکی لیتے رہیئے جہاں گئے اسی مشروب سے خاطر ہوئی۔ وزیر خارجہ چن ژی نے بھی اسی سے تواضع کی اور فیکٹری مزدوروں نے بھی بازار میں یہ چیز ایک پیسے کی ہے گھر میں تو مفت ہی سمجھئے۔ اسی ایک مد میں دیکھا جائے تو ہم جو شکر اور دودھ کا جوشاندہ پیتے ہیں اس کے مقابلے میں چینی لوگ سال بھر میں کروڑوں روپے بچاتے ہوں گے۔ ہم کالی چائے کے رسیا لوگوں کے لئے البتہ ہوٹلوں میں انتظام ہے۔ آپ بلیک ٹی معہ دودھ اور شکر مانگئے۔ چینی میں اسے خونچا کہتے ہیں۔ اس ایک لفظ میں ملباری ہوٹل کی چائے کا مزہ مٹھاس اور گاڑھاپن سبھی آجاتے ہیں۔

ریل میں ہر نشست کے ساتھ چائے کے گلاس رکھنے کی جگہ ہے۔ اکثر سینماؤں اور تھیٹروں میں کرسی کے دہنے ہتھے کے اندر گلاس رکھنے کے لئے سوراخ بنا ہے، کام کرتے جایئے اور ایک ایک گھونٹ چسکتے پیئے۔ تھوڑی دیر میں کوئی آئے گا اور اس میں مزید گرم پانی ڈال جائے گا۔ معلوم ہوا کہ اس سے معدے کا نظام درست رہتا ہے۔ جراثیم کا دفعیہ بھی ہو جاتا ہے۔ کم خرچ بلکہ بے خرچ بالانشیں، ہم نے بھی کچھ دن گرم پانی پیا۔ پھر چھوڑ دیا۔ کس برتے پر تتاپانی۔

کھانے سے پہلے اور بعد۔ بلکہ آپ یوں بھی باہر سے آئیں تو آپ کو گرم پانی میں بھیگا ایک تولیہ یا رومال پیش کیا جائے گا۔ اس سے منہ ہاتھ پونچھئے اور تر و تازہ ہو جایئے۔ یہ رواج ہم لوگوں کو بہت اچھا لگا۔ واقعی خستگی اور ماندگی اس سے دور ہو جاتی تھی۔ ہمارے پیر سائیں حسام الدین راشدی صاحب نے تو کچھ تولیے وہاں سے خرید سے بھی کر وطن عزیز جا کر میں بھی یہی کیا کروں گا، لیکن وطن عزیز آکر تو اور بھی کچھ کرنے کا عزم ہمارے سارے ساتھیوں نے کیا تھا۔ کسی سے ایسے آثار ابھی ظاہر نہیں ہوئے۔ شاید کان نمک میں آکر پھر سب نمک ہو گئے۔ پیر صاحب تولیے استعمال کرنے کی حد تک ثابت قدم رہے ہوں تو شاید رہے ہوں۔

دھنک پر قدم

اختر ریاض الدین

"ڈینی کوور" کے بعد ہمارے جہاز نے سان فرانسسکو کا رخ کیا۔ رات کے گیارہ بجے آسمانی ستاروں کو پشت پر چھوڑتے ہوئے شہر کے برقی ستاروں کو چیرتے ہوئے اترے کسٹم کے تکلفات اور ہوٹل کے غلط پتے کے باعث اپنے کمرے میں پہنچتے پہنچتے ڈیڑھ بج گیا۔ نہا دھو کر نکلی تو سخت بھوک لگی۔ میں ہوائی جہاز میں بہت کم کھا سکتی ہوں۔ اس لئے زمین پر پاؤں لگتے ہی آنتیں غزغر کرتی ہیں۔ دو بجے رات مجھ کو کون کھانا دے گا؟ بچے اور میاں تو سونے کی نیت رکھتے تھے۔ میں تو خالی پیٹ سو ہی نہیں سکتی۔ ڈائننگ روم سو چکا تھا۔ میں ہوٹل سے باہر نکلی۔ ساتھ ہی نکڑ پر ایک ریستوران پر لکھا ہوا تھا۔ "یہ کبھی نہیں سوتا۔" میں نے کہا مرحبا! یہ ایک زندہ دل شہر کی نشانی"۔ اندر گئی تو واقعی رت جگا تھا۔ کئی مرد، عورتیں، بچے کھا پی رہے تھے۔ میں نے اپنا مرغوب "ٹیونا فش سینڈوچ" اور ملک شیک کا آرڈر دیا۔

اس شہر کی زندگی دیکھ کر سونے کو جی نہیں چاہتا تھا! خیر تھکی ہوئی واپس لوٹ آئی۔ دوسری صبح ہمارے میزبان مسٹر موئز منہاٹے دھوئے اپنے قد برابر لمبی کار لے کر دس بجے حاضر۔ عزیب نے پانچ دن صبح و شام ہم کو اس بے پناہ، بے تاب شہر کا چپہ چپہ دکھایا۔

سان فرانسسکو میں امریکنیت سب سے کم ہے۔ اس لئے یہ شہر مجھے سب سے زیادہ بھایا۔ امریکہ میں مجھے رہنے کی کوئی تمنا نہیں۔ لیکن اگر مجبوراً رہنا پڑے تو یہ ایک شہر ہے جہاں میں دو تین سال گزار سکتی ہوں۔ اس شہر کا نہ تو نیویارک کی دم نچت مخلوق سے تعلق ہے جو فلک پیما شکنجوں میں تجارتی دل رکھتی ہے نہ واشنگٹن کی سرکاری فضا سے مشابہت جہاں عموماً دفتری حبس اور سیاسی بیوپار چلتا ہے۔

سان فرانسسکو ایک شہر نہیں، شخصیت ہے اور اس شخصیت کا مخصوص پہلو انفرادیت ہے۔ امریکہ میں شمال سے جنوب تک ایک بیزار کن یکسانیت نظر آتی ہے۔ یہاں ایک تنوع ہے۔ اس کے جغرافیے

میں تنوع، معاشرے میں تنوع، شہری خدوخال میں جدت، باشندوں میں ہمہ گیر اختلاف، یہ امریکہ سے بھی اور نہیں بھی۔ اس شہر نے امریکہ کی لاج رکھ لی ہے۔ یہ جتنا نیویارک کی فضا سے دور پڑتا جاتا ہے۔ اتنا ہی انسانیت کے قریب تر آتا جاتا ہے۔ انسان کی طرح یہ بھی ایک وقت میں سب کچھ ہے۔ فراخدل بیہودہ صفت، حسین، غلیظ، روشن، تاریک، کبھی ہنگامہ خیز، کبھی خاموش، بیک وقت تخلیقی اور انحطاطی! متعصب مگر پھر بھی رواداراس کی کون تشریح کرے؟

اس شہر کی تاریخ ضعیف ہے بہ خود جوان ہے۔ یہ اپنے افسانوی گزشتہ "طلائی تمدن" کو مڑ مڑ کر دیکھتا ہے۔ ذرا خاموشی سے سنیں تو اس کے سمندری ساحلوں کی بلند موجوں میں کئی شور پنہاں ہیں، شروع میں آبی پرندوں کے غولوں کا، پھر ازلی باشندوں کے منتروں کا، کبھی برطانیہ کے "سمندری کتوں" کا، کبھی قدیم مبلغوں کی کلیسائی گھنٹیوں کا۔

جب اس کی سرزمین پر امریکی پرچم لہرایا اور ہسپانوی پرچم سرنگوں ہوا تو قسمت سے سونا دریافت ہو گیا گھاٹ گھاٹ کے منچلے قسمت آزمانے پہنچ گئے۔ برسوں لوٹ کھسوٹ مارکٹائی ہوتی رہی اور ابھی تو یہ محض ڈرامے کا آغاز ہے۔ اس شہر کی تلاش میں نکلیں تو شہر نہیں ملتا۔ اس کی شناخت کیسے کریں؟ ایک طرف حبشیوں کے حسرت کدے دوسری طرف چینیوں کے مخصوص محلے۔ مغربی دنیا کا سب سے بڑا "چائنا ٹاؤن" یہاں ہے کھچا کھچ بھرا ہوا۔ ٹیلی فون ڈکشنری اٹھا کر دیکھو تو "لی وونگ فونگ" سے صفحے کالے کہیں اطالویوں کے مخصوص طعام اڈے اور اخبارات۔ کہیں چند سنگی کردہ پتیوں کے خیراتی مجرے اور فنی ادارے ایک چیز جو بالکل دکھائی نہ دی۔ وہ تھی ہسپانوی کلچر یا کم سے کم اس کے بچے کھچے نشان سوائے چند ہسپانوی ناموں کے (وہ بھی محض سڑکوں یا محلوں کے) اور کوئی علامت اس معاشرے کی نہیں جو اس کا فرمانروا تھا۔ یہاں کے عجائب خانے بھی اس عہد پر عمداً خاموش ہیں غالباً اس کی یاد سے ان کے ضمیر کو تکلیف ہوتی ہے اور "میکسیکو" کا تو نام لو تو ہمارے ملنے والے نظر بچا کر موضوع بدل دیتے تھے۔ اس شہر کا سب سے نرالا راز یہ ہے کہ اس میں بے شمار ننھی پہاڑیاں ہیں اور ہر پہاڑی میں ایک مخصوص علاقہ بسا ہوا ہے۔ ان علاقوں کا ضروری نہیں کہ صرف شاہراہوں سے رشتہ ناطہ جوڑا جائے کہیں رشتے کی کڑیاں آبی پل ہیں کہیں سنگلاخی یا چوبی زینے مجھے اس کی یہ ادا بہت پیاری لگی یہ انفرادیت اور جگہ بہت کم پائی جاتی ہے مثلاً "ٹیلی گراف ہل" کے بل کھاتے ہوئے موڑ تو ڑ ہی کھولے لیجئے، یہ شہر کا

قدیم ترین محلّہ ہے۔ جس کے ساحلی غاروں میں "گولڈ رش" GOLDRUSH کے اولین اچکے آکر بسے تھے اور اندھیر نگری چوپٹ راج مچایا تھا۔ اس وقت یہ سان فرانسسکو کا سب سے دشوار پہاڑی علاقہ ہے جس کا تنوع، بے تکا پن شہریوں کو بیحد محبوب ہے۔ اس کی بعض گلیاں اتنی تنگ ہیں کہ ایک کار مشکل سے گزرتی ہے (یہ امریکہ کے لئے عجوبہ ہے جس طرح ہمارے ہاں گلی بازار و صرافے بازار میں ایک گائے نہیں گزر سکتی، بعض گلیاں ایک دم اونچائی پر شروع ہو جاتی ہیں وہاں نہ سڑک نہ موڑ۔ پیدل چلیے، پتھروں کو کاٹ کر قدمچے بنے ہوتے ہیں۔ ایک گلی دنیا کی سب سے ٹیڑھی گلی کہلاتی ہے۔ اس میں پانچسو پیچ و بل ہیں۔ چلتے چلتے چکرا جاتے ہیں، بچے وہاں خوب "گیڑی کا ڑا" کھیلتے ہیں، اس محلے میں بھانت بھانت کے "کرخنداروں" کے شاہ بشانہ فنون کی گیلریاں بھی ہیں۔ یہاں بیٹ نک کے غول کے غول نظر آئے۔ ڈاڑھیاں میلے، تعفن۔ نغمے، بے حسی، جوانی، جنسی بد نظمی، گیتا یوگا! احتجاج! یہ ہے اس انسانوی نسل کا حلیہ۔ یہ بوہیمین بیل جو پروان چڑھتے چڑھتے نا معلوم کتنے نام اور حلیے بدلے گی۔ فی الحال "ہپ" کہلاتی ہے۔ یہ ماحول کی ناانصافی پر جہاد کرنے کی بجائے راہِ فرار اختیار کرتی ہے۔ حکومتی عملے کو حقارت سے ESTABLISHMENT کہہ کر رد کر دیتی ہے۔ کسی بھی آئیڈیالوجی کو "معاشرتی دروغ" قرار دیتی ہے۔ مایا کی کھوج کو چوہوں کی دوڑ کا نام دیتی ہے۔

ایک پہاڑی علاقہ روسی ہل RUSSIAN HILL کہلاتا ہے۔ اس روسی ہل کا "روسیاہوں" سے کوئی تعلق نہیں یہ "روسیاہ" کہیں اور بستے ہیں۔ اس علاقے سے تمام سمندر اور باقی پہاڑیاں نظر آتی ہیں۔ اس کی بھی سڑکیں اکثر غائب ہو جاتی ہیں اور موٹر روک کر پا پیادہ چڑھائی کرنی پڑتی ہے۔

(NOB HILL) مخفف ہے NABOB HILL کا جہاں پرانے زمانے کے نواب و روسا رہتے تھے، جنہوں نے یہاں اوٹ پٹانگ رنگ برنگے محل دو محلے بنا کر اس کو بھی ایک انوکھا علاقہ بنا دیا ہے۔

"پریزیڈیو" PRESEDIO دو صدیوں تک فوجی نظام کا گڑھ رہا ہے۔ اب اس کے ایک حصے کا پارک بنا کر پبلک کے لئے کھول دیا گیا ہے۔ اس میں ایک چشمہ ہے "ایل پولن" EL POLIN ہمارے دوست نے بتایا کہ یہاں کے اصلی انڈین باشندے اس چشمے کو افزائش نسل کی دیوی سمجھتے تھے ہسپانوی عہد میں بھی اس کا پانی اسی لالچ میں پیا جاتا تھا جس کی برکت سے فوجی جرنیلوں کے خاندان کبھی بارہ کبھی سولہ کبھی بیس بچوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ اب امریکی فوج نے اپنے "اعمال" گننے بند کر دیئے ہیں۔

ہمارے دوست ڈاکٹر پال کی بیٹی نے ہمیں اس شہر میں مزید چکر دیئے اعصاب کا ڈھیر ہو گیا۔
امریکہ میں اسی میل کی رفتار سے کم کار چلانے والا مجرم یا مریض سمجھا جاتا ہے۔ سان فرانسسکو کی مشہور لامتناہی شاہراہیں ایک وقت میں دس اطراف سے آکر ملتی ہیں اور آر پار ہو جاتی ہیں۔ امریکہ کی تند رفتاری اور تند ترقی کا راز یہی شاہراہیں ہیں۔ جو فولادی ڈھانچوں کی مدد سے تہہ بہ تہہ بنائی گئی ہیں۔ ان کی حرکت سے شہر اور اقتصادیات میں برکت ہے۔ ورنہ بے پناہ آبادی کے مدِ نظر ایک محلے یا کارخانے سے دوسرے مقام پر جانے میں چیونٹی کی چال چلنا پڑتا ہے۔ ان شاہراہوں پر چاروں طرف کاروں کی قطاریں دیکھ کر چکر آتے ہیں۔

تین اگر سر پر سے زناٹے سے گزرتی ہیں تو پانچ پھر پاؤں تلے سے نکل جاتی ہیں۔ ہر کار زناٹے سے اڑ رہی ہے اگر کم بخت ایک اڑے تو چالیس اور لے مرے۔

امریکہ میں اول تو گرامر سے خاصا مانوس ہونا پڑتا ہے کیونکہ ہر چیز تصغیر سے برعکس تکبیر کے صیغے SUPERLATIVE میں پائی جاتی ہے۔ دنیا کی سب سے اونچی عمارت دنیا کا سب سے لمبا پل دنیا کا سب سے امیر طبقہ، دنیا کی سب سے رنگین بیوہ، دنیا کا سب سے بڑا سینٹر، سب سے خطرناک بم، سب سے زیادہ بجٹ۔ غرضیکہ اعداد و شمار کی گردان سن سن کر آپ کی ساری شخصیت، آپ کا ملک یہ معاشرہ ایک اسم تصغیر بن کر رہ جاتا ہے آپ سوچتے ہیں کہ کہاں ان دیوزادوں کے ملک میں پہنچ گئے۔ اس شہر کا اصلی ہیرو تو میں بھی بھول ہی گئی۔ جس کی وجہ سے سان فرانسسکو عالم میں تشہیر پا چکا ہے۔ وہ ہے "گولڈن گیٹ برج" اس طلائی پل کے فوٹو ہر موسم میں دھوپ کے ہر گھٹتے بڑھتے لمحے میں ہر زاویے سے اترتے رہیں۔ واقعہ ہے کہ یہ دنیا کا سب سے حسین اور لمبا پل، انجنیئرنگ اور سائنس کا کارنامہ ہے۔ لیکن جس طرح پیرس میں "سی این" SIENE اور لندن میں "واٹرلو برج" کی اپنی اپنی جگہ ہے۔ تو یہ پل بھی امریکی ادب میں ایک اہم باب بن گیا ہے اور اس کی فضا کا ایک مخصوص کردار ہے۔

سان فرانسسکو اور نیویارک میں شدید قسم کی ثقافتی رقابت ہے نیویارک میں ذخائر زیادہ ہوں گے لیکن ذوق اس شہر میں زیادہ ہے۔ یہاں چار تھیٹر کمپنیاں ہیں۔ جب اعلیٰ آرٹ گیلریوں میں کوئی نمائش ہوتی ہے تو فٹ بال سے زیادہ بھیڑ ہوتی ہے۔ حالانکہ نیویارک کی آبادی یہاں سے دس گنا زیادہ ہے۔ لیکن ہر کونسرٹ میں ٹکٹ یہاں زیادہ بکتے ہیں۔ ٹیلی ویژن پر سب سے پہلے تعلیمی اور معیاری

پروگرام اس شہر نے شروع کئے۔ گو اس نے ابھی تک کوئی بڑا فن کار پیدا نہیں کیا۔ لیکن فن کاروں کی جائے پناہ یہیں ہے اور کم سے کم وہ فضا رکھتی ہے جس میں آرٹ پروان چڑھ سکتا ہے۔ اس ثقافتی بہتات کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس شہر میں پولیس اور منصف سے پہلے لطیف ہنر داخل ہو چکے تھے۔ اس سے پہلے کہ قوانین امن و استحکام کا سبب بنتے یہاں ایک خانہ بدوش تھیٹر کمپنی نے قدم جما لئے تھے۔ جہاں وہ ایک رات سرکس اور ایک رات شیکسپئر کے ڈرامے کرتی تھی (شیکسپیئر اور سرکس!! انا للہ وانا الیہ راجعون) اس پر مجھے ایک ماسی لطیفہ یاد آگیا۔ امریکہ کے صحرا نورد، نیم مہذب "ٹیکساز" کو پیسہ کمانے کا اتنا ہی شوق ہے جتنا "رلی چلانے" کا۔ بدقسمتی سے وہاں ایک شیکسپیئر تھیٹر جھومتا جھامتا پہنچ گیا۔ کھیل "اوتھیلو" شروع ہوا۔ حاضرین کو اس قدر پسند آیا کہ لگے چلانے "ڈرامہ نویس!! ڈرامہ نویس کو بلاؤ" اب کس کی مجال کہ یہ فرمائش پوری نہ کرے۔ غریب تھیٹر کا مالک ہڑبڑا کر خود شیکسپیئر بن کر سٹیج پر جو پہنچا تو پٹاخ سے ایک گولی اس کے سر کو لگی۔

اس کو کہتے ہیں فنونِ لطیفہ کی سرپرستی۔

جنوبی کیلیفورنیا کی مشہور یونیورسٹیاں "سٹین فورڈ STANFORD اور "برکلے" BERKELEY ہیں۔ اس شہر کے ہر پھیرے گرد و نواح میں میلوں کے پھیلاؤ میں علم کی دیوی سرسوتی نے پوری گمبھیرتا سے اپنے مندر چنے ہیں۔ مجھے "سٹین فورڈ" یونیورسٹی سے مخصوص دلچسپی تھی۔ ایک تو اس کا "یونانی تھیٹر" اپنی مرمریں نفاست کے لئے مشہور تھا۔ دوسرا اس کا ننھا سا عجائب گھر (ننھا سا اس یونیورسٹی کے رقبے کے لحاظ سے ہے، ورنہ اس ملک میں "ننھی" کوئی چیز نہیں ہوتی)

یہاں پر دسویں صدی کا جاپانی کانسی میں "ادھی بُدھا" سجا ہوا ہے جس کے کشادہ چہرے پر نروان کھلا ہوا ہے۔ بہت سے بدھا دیکھے لیکن اتنا سکون کہیں نہیں دیکھا۔ یونیورسٹی کے چاروں طرف پروفیسروں کی حسین کوٹھیاں، باغ، ہماری پرائی کے دوست "پول خا" بھی یہیں مقیم تھے۔ ایک سبز ٹیلے پر ان کا بنگلا امریکہ کے مشہور معمار FRANDLLOYD WRIGHT نے بنایا تھا۔ جب اس معمر عالم، منکسر المزاج شخصیت نے اپنا سارا گھر اندر سے دکھایا۔ ہر کمرے میں ملک ملک کے نوادر سجے تھے۔ اس کے بچے دونوں خوشحال ہیں۔ اس لئے یہ گھر غالباً قوم کے لئے عجائب خانہ بن جائے گا۔

میرا دل پھر حسرت سے بھر آتا ہے۔ تعلیم امریکہ کا غریب ترین پیشہ سمجھا جاتا ہے اور اس پر یہ ٹھاٹ

ہیں کہ ڈاکٹر پال حنا کی ایک ایک کتاب پر ہی لاکھوں روپے رائلٹی آتی ہے۔ میرا اس حسین گھر کو چھوڑنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ امریکی ناراض تھے کہ جنوبی کیلیفورنیا کی یونیورسٹیوں کے معیار بہت پست ہوگئے ہیں۔ اور یہ علمی ادارے نہیں رہے بلکہ طلبا ساخت کرنے کے کارخانے بن گئے ہیں۔ ان یونیورسٹیوں کی ڈگریوں کی بہت کم قدر ہے۔ "ہارورڈ، پرنسٹن، ییل" تو کیا دوم درجے کی یونیورسٹیاں بھی انہیں خاطر میں نہیں لاتیں۔ لیکن طالب علم ہیں کہ ہماری طرح چلے آتے ہیں اور یہاں بھی کھچا کھچ بھرے ہوتے ہیں۔

خدا نے انسان کو جو ڈھالا ہوگا سو ہوگا۔ لیکن خود انسان نے خدا کو خوب گھڑا ہے ہر ملک ہر مذہب نے اسے اپنے رنگ میں رنگا۔ اپنے پیرہن میں ڈھالا۔ اس طرح پیغمبروں کی شخصیت معاشرے کے ساتھ ساتھ ڈھل گئی۔ افریقہ کے مسیح اور مریم کالے بھجنگ۔ جاپانی بدھا ٹکنا چپٹا۔ اسی طرح ہر ملک نے اسلام کو نئے اوتار میں پیش کیا۔ انڈونیشیا میں نامی دیویوں دیوتاؤں سے ملا دیا۔ مدراس میں محرم الحرام کو دسہرہ بنا دیا گیا یا ایران میں تقیہ کرکے فارغ ہو بیٹھا۔ نائجیریا، گھانا میں لوگ توہمات میں پڑ گیا۔ لندن میں کرسی میزوں پر سجدے ادا کئے گئے۔ امریکیوں نے بھی اسلام کے نام پہ ایک نیا سوانگ رچایا۔ ایک طبقے کا کہنا ہے کہ کیونکہ ہم سیاہ ہیں ہمارا اسلام بھی سیاہ ہے اور خدا بھی سیاہ۔ یہ ہیں بلیک مسلم BLACK MUSLIM ویسے تو امریکہ میں دو اور قسم کے مسلمان بھی ہیں۔ ایک احمدیہ دوسرے کلیسیا یا اسمعیہ۔ یہ غلط سلط جو بھی ہو اسلام کی خدمت کر رہے ہیں اور صرف ان میں ایثار اور تبلیغ پائی جاتی ہے۔ انہی کی جماعت اچھی طرح منظم ہے۔ سان فرانسسکو میں سب سے بڑی اور اکلوتی مسجد انہوں نے ہی بنوائی ہے دوسرے محض کلمے یا نام کے مسلمان ہیں۔ ان کا شجرہ نسب کیلیفورنیا سے نکالو تو جا کر کیمبل پور پہنچتا ہے۔ ان میں حسب معمول عموماً پنجابی ہیں اور باقی پٹھان۔ جنہوں نے پنجابیوں کی دیکھا دیکھی وطن سے باہر روزی تلاش کی گزشتہ صدی کے عین اختتام اور پہلی جنگ عظیم کے آغاز تک ان کے غول کے غول رجن میں زیادہ تر کسان اور مزدور تھے اور کچھ بھگوڑے سپاہی) لدھیانہ، رہتک اور کیمبل پور سے روانہ ہو کر ہزار دشواریوں سے چالاکیوں سے سنگاپور اور ہونگ کونگ کے راستے کیلیفورنیا پہنچے۔ کچھ سکھ شمال سے کینیڈا کے ذریعے داخل ہوئے اور امریکہ کے سب سے زرخیز صوبے میں بس گئے۔ لیکن ان معصوموں کے لئے عرش پر بھی بیگار تھی۔ یہ سب مزدور بھرتی ہو گئے۔ کوئی تو سیب چن کر پیٹ بھرتا۔ کوئی ریل کی پٹڑی پر پتھر کوٹتا۔ خیر ان سب نے جفاکشی اور کفایت شعاری سے کچھ پیسہ بچایا۔ پھر ہندوستان میں آزادی کی تحریک کی شروعات اور سرگرمیاں

ان کے کان میں پڑیں۔ ہر دیال، موتی لال نہرو، محمد علی، شوکت علی، گاندھی کے نام سے ان کے خون میں جوش اٹھا۔ ان میں سے کئی خاندانوں نے گاڑھے پسینے کی کمائی کا حصہ سیاسی جماعتوں خاص طور پر کانگرس کو بھیجا۔ ہندو سکھ پہلے پگڑیاں پہنتے تھے۔ پھر جب شرمانے لگے خود پہننا چھوڑ دیں۔ لیکن بازار میں بیچنا شروع کر دیں۔ امریکن کوئی بھی عجوبہ ہو اسے خریدنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک مسلمان فضل احمد پر خدا کا بہت فضل ہوا۔ اس نے دو ہزار ایکڑ زمین "چیکو" CHICO میں پٹے پر لے کر آہستہ آہستہ جائیداد بنانی شروع کی۔ کہتے ہیں کہ وہ چیکو شہر کی پاؤ جائیداد کا مالک بن گیا اور جب مرا تو امریکہ کا پہلا مسلم لکھ پتی تھا۔

ہندو سکھ عموماً آپس میں شادیاں کرتے تھے اور اپنی زبان پنجابی کو برقرار رکھتے تھے۔ البتہ مسلمانوں نے حسب معمول باہر شادیاں کیں۔ چراغ کی بیوی میکسیکی جس کا نام سبا تونی، فتح دین کی زوجہ عراقی، تیسرے کی اطالوی۔ غرضیکہ خوب مسلم خون خلط ملط ہوا۔ مسلمانوں نے نہ صرف اپنا لباس بدلا بلکہ رسوم و آداب بدل ڈالے۔ میں نے ایک شام سان فرانسسکو کی مسجد کے قریب ایک گھر میں گذاری۔ جہاں اس قسم کے خاندانوں کے کچھ افراد ہم سے ملنے خاص طور پر جمع ہوئے تھے۔ ان کی پرانی اور نئی پود میں زمین آسمان کا فرق تھا بوڑھوں میں کچھ حجاب تھا۔ انہیں ابھی تک "السلام علیکم" کہنے کی عادت تھی۔ ہمارے لئے کچھ لسانہ آلو کا سالن بھی بنایا ہوا تھا۔ کچھ اسلام اور پاکستان کے لئے دبی دبی چنگاری بھی سینے میں تھی۔ لیکن نئی نسل بالکل امریکی۔ بلکہ امریکنوں سے بھی زیادہ امریکی۔ لہجہ زبردست جو صرف ناک میں ادا ہو۔ وہی بالوں کی تراش وہی تنگ پتلون، وہی سیاسی اور تعلیمی پرچارک سے اندھا تعصب۔ ایک جوان فرماتے ہیں۔

"سب ویت نامی اور "کوریں" لوگوں کو مار دینا چاہئیے۔ ہم کہاں تک ان کو کھلاتے جائیں۔ آخر امریکہ نے ساری دنیا کو پالنے کی قسم تھوڑی کھائی ہے۔" دوسرے بولے "کیموزم ایک خطرناک اژدھا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم کو نگلے اس کا سر کچل دینا چاہئیے۔"

مجھے احساس ہوا کہ میں امریکی ٹیلی ویژن دیکھ رہی ہوں۔ مجھے بتایا گیا کہ بعض درمیانی نسل کے ابھی تک کنوارے بیٹھے ہیں۔ اور "بڈھے چچا" کے نام سے چھیڑے جاتے ہیں۔ ان کی شادی ایک مسئلہ بن گئی ہے۔ میں نے ایک "انکل" سے پوچھا "کیوں"؟ بولے "شادی مسلمان ہی سے کرنی ہے۔ اپنے وطن کی ہم عمر نہیں ملتی۔ ایرانی لڑکی تیز ہے۔ عراقی صرف شہریت کے حقوق حاصل کرنے کے لئے مجھ سے شادی کرنا چاہتی

ہے اور امریکی لڑکی مجھے حقارت سے دیکھتی ہے۔"

ان میں ایک خاندان بہت دلچسپ تھا۔ باپ کا نام "نیامت خان" (یہ اسی لہجے میں ادا ہو رہا ہے جس میں بتایا گیا تھا) بیٹے کا نام "نیامتا جونیئر" بیٹی کا نام "مسز لولٹیا" "مس آمنہ" یہ نیامتا سینئر ۶۰ سال کا چیچک زدہ بڈھا تھا جس نے تھوڑا سا کما لیا تھا کہ بڑھاپے میں اولاد کا دست نگر نہ ہو۔ آج ۴۵ سال بعد بھی سگریٹ اسی انداز میں پی رہا تھا جس طرح اپنے ضلع "انباڑے" میں سوٹنے مار کر گڑ پیتا تھا۔ کھانے کی میز پر سڑپ سڑپ مار کر سوپ پینا شروع کیا تو بچے کچھ شرمندہ ہو گئے لیکن نیامت خان کے کان اتنے لمبے تھے کہ سڑپ سڑپ کی آواز وہاں تک غالباً پہنچنی ہی نہ تھی۔ کونے میں اس کی موٹی نیم ہسپانوی بیوی بیزار سی بیٹھی اپنے ضخیم صوفے سے بھی باہر بہی جا رہی تھی بڈھے نیامت سے امریکن معاشرہ دور سے بھی چھو کر نہیں گزرا تھا اس کا لہجہ خاص اپنے وطن "انباڑے" کا تھا گھر بالکل معمولی۔ کوئی سالم برتن نہیں غسل خانے میں تعفن، لیکن باہر کار لمبی اور نئی۔ بیٹیاں فراکوں میں دم کٹی بٹیروں کی طرح بالکل اینگلو انڈین کی۔ "مالک" غالباً داماد پیسے والا تھا۔ "نیامتا جونیئر" قابلِ رحم ہے۔ اسکول میں سفید امریکی اس کے مذہب اور معاشرے پر جملے بازیاں کرتے تھے۔ یہ اپنے ماضی پر سخت نادم نظر آتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو اپنے مشرقی خون کو ہسپتال میں بدلوا دیتا۔ اپنے آبائی نام پر سفید چونا پھروا دیتا۔ کنکھیوں میں وہ اپنے سوٹنے "مارتے" ہوئے باپ پر شرمندہ ہو رہا تھا۔

ان مسلمانوں کا کوئی پرسان حال نہ ہوتا۔ اگر یہاں احمدی اور عرب مبلغ نہ پہنچے۔ ان کی تنظیم کے صدقے آج نہ صرف سان فرانسسکو میں ایک مسجد ہے اور چند نمازی ہیں۔ بلکہ "ایری زونا" کی یونیورسٹی میں بھی بقول "نیامتا جونیئر" کے ایک "مسلم گروپ" ہے۔ جہاں ۵۰ پاکستانی طلباء اور تقریباً اتنے ہی مسلم خاندان (مع عرب کے) بسے ہوئے ہیں۔ کچھ شکایات پاکستانی طلباء کے خلاف ہیں کہ وہ بدتمیز بھی ہیں اور مغرور بھی اور کیلیفورنیا کے مسلمانوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یا عربوں سے حجت کرتے ہیں۔ وہاں اسلامی مرکز میں بھی باقاعدہ وعظ ہوتے ہیں۔ "الانوئے" کی یونیورسٹی کی حدود میں پہلی ستمبر کو زبردست "مسلم کنونشن" منعقد ہونے والی تھی۔ جس میں تمام امریکہ کے مسلمان ہر نوع ہر رنگ کے اپنے واعظ اور مقرر بھیج رہے تھے۔ اس شام دو نوجوانوں سے اچھی بحث رہی۔ ان کا کہنا تھا کہ "اگر اسلام میں لچک نہ آئی تو یہ مٹ جائے گا۔ فراک پہننے "منی" ناچنے یا خنزیر کھانے سے اسلام ختم نہیں ہو جاتا۔" انہوں

نے مثال دی کہ "حال ہی میں "سیکرامنٹو" کی مسجد کے ساتھ ہی ایک "سمر اسکول" — SUMMER SCHOOL برائے مذہبی تعلیم کھولا گیا ہے جہاں جوانوں کے لئے ہوسٹل کا بھی اضافہ ہوا ہے۔ اس "یوتھ ہوسٹل" میں امام ایک دن نیکر پہن کر لیکچر دینے آ گیا۔ تو چند وضع دار مسلمان طلباء بگڑ گئے۔ برعکس اس کے جب اس سکول سے تالاب کے اوقاتِ غسل لڑکیوں کے لئے الگ کر دیئے گئے تو خواتین "سیگری گیشن SEGREGATION کا نعرۂ احتجاج لگا کر اس میں مردوں کے سامنے کود پڑیں۔ یہ ہے اسلام اور نئی روشنی کی ٹکر!

ہے اور امریکی لڑکی مجھے حقارت سے دیکھتی ہے۔"

ان میں ایک خاندان بہت دلچسپ تھا۔ باپ کا نام "نیامت خان" (یاسس لہجے میں ادا ہو رہا ہے جس میں بتایا گیا تھا) بیٹے کا نام "نیامتا جونیئر" بیٹی کا نام "مسز لولیٹا"، "مس آمنہ"۔ یہ نیامتا سینئر ۸۰ سال کا چیپ زدہ بڈھا تھا۔ جس نے تھوڑا سا کما لیا تھا کہ بڑھاپے میں اولاد کا دست نگر نہ ہو۔ آج ۴۵ سال بعد بھی سگریٹ اسی انداز میں پی رہا تھا جس طرح اپنے ضلع "انباڑے" میں سوٹے مار کر گڑ پیتا تھا۔ کھانے کی میز پر سڑپ سڑپ مار کر سوپ پینا شروع کیا تو بچے کچھ شرمندہ ہو گئے لیکن نیامت خان کے کان اتنے لمبے تھے کہ سڑپ سڑپ کی آواز وہاں تک، غالباً پہنچنی ہی نہ تھی۔ کونے میں اس کی موٹی نیم ہسپانوی بیوی بیزار سی بیٹھی اپنے ضخیم صوفے سے بھی باہر بہی جا رہی تھی بڈھے نیامت لے امریکن معاشرہ دور سے بھی چھو کر نہیں گزرا تھا۔ اس کا لہجہ خاص اپنے وطن "انباڑے" کا تھا گھر بالکل معمولی۔ کوئی سالم برتن نہیں غسل خانے میں تعفن، لیکن باہر کار لمبی اور نئی۔ بیٹیاں فراکوں میں دم کٹی بٹیروں کی طرح بالکل اینگلو انڈین کی۔ "مالک" غالباً داماد پیسے والا تھا۔ "نیامتا جونیئر" قابلِ رحم ہے۔ اسکول میں سفید امریکی اس کے مذہب اور معاشرے پر جملے بازیاں کرتے تھے۔ یہ اپنے ماضی پر سخت نادم نظر آتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو اپنے مشرقی خون کو ہسپتال میں بدلوا دیتا۔ اپنے آبائی نام پر سفید چونا پھروا دیتا۔ کنکھیوں میں وہ اپنے سوٹے "مارتے" ہوئے باپ پر شرمندہ ہو رہا تھا۔

ان مسلمانوں کا کوئی پرسان حال نہ ہوتا۔ اگر یہاں احمدی اور عرب مبلغ نہ پہنچتے ان کی تنظیم کے صدقے آج نہ صرف سان فرانسسکو میں ایک مسجد ہے اور چند نمازی ہیں۔ بلکہ "ایری زونا" کی یونیورسٹی میں بھی بقول "نیامتا جونیئر" کے ایک "مسلم گرجا" ہے۔ جہاں ۵۰ پاکستانی طلباء اور تقریباً اتنے ہی مسلم خاندان (مع عرب کے) بسے ہوئے ہیں۔ کچھ شکایات پاکستانی طلباء کے خلاف ہیں کہ وہ بد تمیز بھی ہیں اور مغرور بھی اور کیلیفورنیا کے مسلمانوں کا مذاق اڑاتے ہیں، یا عربوں سے حجت کرتے ہیں۔ وہاں اسلامی مرکز میں بھی باقاعدہ وعظ ہوتے ہیں۔" الانوئے کی یونیورسٹی کی حدود میں پہلی ستمبر کو زبردست "مسلم کنونیشن" منعقد ہونے والی تھی۔ جس میں تمام امریکہ کے مسلمان ہر نوع ہر رنگ کے اپنے واعظ اور مقرر بھیج رہے تھے۔ اس شام دو نوجوانوں سے اچھی بحث رہی۔ ان کا کہنا تھا کہ "اگر اسلام میں لچک نہ آئی تو یہ مٹ جائے گا۔ فراک پہننے "منکی" ناچنے یا خنزیر کھانے سے اسلام ختم نہیں ہو جاتا۔" انہوں

نے مثال دی کہ "حال ہی میں "بیکرامنٹو" کی مسجد کے ساتھ میں ایک "سمر اسکول" SUMMER
SCHOOL برائے مذہبی تعلیم کھولا گیا ہے جہاں جوانوں کے لئے ہوسٹل کا بھی اضافہ ہوا ہے۔ اس "یوتھ ہوسٹل" میں امام ایک دن نیکر پہن کر لیکچر دینے آ گیا۔ تو چند وضع دار مسلمان طلبا بگڑ گئے۔ برعکس اس کے جب اس سکول سے تالاب کے اوقاتِ غسل لڑکیوں کے لئے الگ کر دیئے گئے تو خواتین "سیگری گیشن" SEGREGATION کا نعرۂ احتجاج لگا کر اس میں مردوں کے سامنے کود پڑیں۔ یہ ہے اسلام اور نئی روشنی کی ٹکر!

خوابوں کے جزیرے

پروین عاطف

کئی شہر پتا نہیں کیوں ذہن میں اپنی جغرافیائی حدود خود مقرر کر لیتے ہیں۔ کئی ہزاروں میل دور ہونے کے باوجود لگتا ہے چاہیں تو ابھی پہنچ جائیں۔ کبھی جادوئی کہانیوں کی طرح از خود ہی اتنے دُور سرک جاتے ہیں کہ وہاں جانے کے تصور سے ہی اعصاب شکستہ ہونے لگتے ہیں۔ فلپائن کا تصور بھی برس ہا برس سے میرے ذہن میں کچھ کالے گلاب جیسا تھا کہ کوہ قاف کی منزلیں طے کر لیں لیکن اس تک پہنچ نہ پائیں۔ منیلا شہر کی لائٹیں تو شاید میرے ذہن میں پہلی بار اس وقت ابھریں جب محمد علی باکسر وہاں عالمی چیمپئن شپ جیتنے گئے اور وہاں کی رنگین فضاؤں نے ان کے مبسوط ذہن میں یوں قمقمے جلا دیئے کہ انہوں نے چکا چوند ہو کر اس کمپنا رگلی کی بیبی ہمیشہ کے لئے تھامنے کا اعلان کر دیا۔ اپنے لئے تو کسی شہر کی رنگینیوں میں بہک جانے کا ملیا جوڑا اندیشہ نہ تھا۔ دو نوجوان، بیٹا اور بھانجا ساتھ تھے کہ جن کی آنکھوں میں آج کل ہوا کے معطر جھونکے سے ستارے جھلملانے لگتے ہیں۔ کوئی حریری دامن چھو جانے سے فضاؤں میں روشنیاں بکھر جاتی ہیں کہ زندگی کی بہاریں نقطۂ عروج پہ ہیں گلوں میں از خود رنگ بھرے جا رہے ہیں۔ یہی فکر دامن گیر تھا کہ ایسی ہوائے ناموافق میں ان دو گورلیوں کو سنبھالنا میرے بس میں نہ ہوگا کہ وہ میری اس کمزوری کو جانتے ہوئے ہر نئے شہر پہنچتے ہی مونچھوں پہ تاؤ دینا شروع کر دیتے تھے کہ یا تو آپ پاکستان اکیلی واپس جائیں گی یا آپ کو یہاں سے ایک آدھ بہو ساتھ لے کر جانا پڑے گا۔

ہمارا دوسرا مسئلہ بجٹ تھا کہ میرے لئے عام زندگی میں بھی بجٹ بنانا یا سلیقے سے پیسے رکھنا ٹکٹکی میں لگ کر کوڑے کھانے کے مترادف ہے اور سفر میں تو یوں بھی ہر چیز اتھل پتھل ہوتی رہتی ہے۔ پیسوں کا ناپ تول کون کرتا۔ بنکاک، ہانگ کانگ میں تو زیادہ وقت عزیزوں کی مہمان نوازی کے سر چڑھ گیا۔ منیلا سے آگے ہاتھ بٹانے والی کوئی خاص اسامی نظر نہیں آتی تھی اس لئے وہاں پہنچتے پہنچتے پیسے کم ہو جانے کا خوف

میرے حواس پر بُری طرح طاری ہو گیا تھا۔ یہ خوف میرے ساتھیوں پر بھی بُری طرح اثر انداز ہوا۔ تو جوانی میں یوں بھی انسان میں واسکوڈی گاما یا کولمبس کی کوئی رگ ضرور موجود ہوتی ہے۔ آرام دہ سفر اور آرام دہ رہن سہن سے ان دونوں کے انوکھے تجربے کرنے کی رومانیت کی تسکین نہیں ہو رہی تھی۔ مالی حالات مخدوش دیکھ کر میرے بیٹے نے منیلا اترنے سے پہلے ہی ہوائی جہاز میں بڑی پُرجوش تقریر کی کہ سیاحت کا سچا جذبہ رکھنے والوں کو آرام و آسائش سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ فلم "ٹریژر آف سیرا مادری" اور "دی لاسٹ لیجنڈ" میں ہمفری بوگرٹ اور صوفیہ لارین جیسے تعیش پسند لوگوں نے ناقابلِ تصور اذیتیں اٹھائی تھیں۔ کم سے کم پیسوں میں زیادہ سے زیادہ جگہیں دیکھ لینا ہی سیاحوں کی کامیابی ہوتی ہے اس لئے منیلا میں ہم صرف سڑکوں اور پارکوں میں وقت گزاریں گے۔ یوں بھی ہمیں پاکستانی سفیر کے علاوہ منیلا میں کوئی نہیں جانتا۔ جو محفلوں میں بیٹھ کر چہ میگوئیاں کرے۔ بچے کی تقریر میرے بھی جی کو لگی پھر مجھے اسلام آباد کے روز گارڈن جیسے گارڈن کا خیال آ گیا کہ ترقی یافتہ ممالک کے کیسے کیسے چشم و چراغ وہاں نچی گھسی گھاس پر پڑے خوش و خرم وقت کاٹ جاتے ہیں۔ میں نے بچوں سے کہا ٹھیک ہے ہم بھی دن بھر سیر و تفریح کریں گے۔ رات یونہی کہیں گل لالہ گلِ راحت کی کیاریوں کے دامن میں یا ساحلِ سمندر پر ریت کے چمکتے ذرات کے روپہلے بستر پر فطرت کے قریب وقت گزر جائے گا کہ ڈاکٹر اقبال نے بھی اپنی کئی نظموں میں فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی لطافت اور حسن کو بیان کیا ہے۔ بس ذرا نہانے دھونے کا فکر تھا کہ مسلمان خواہ ٹورسٹ ہی کیوں نہ ہوں اس معاملے میں ذرا شکی مزاج ہوتے ہیں اور ایک ہی "جینز"، بے بالوں کی میلی جیکٹ چٹیں لٹکائے گزارہ نہیں کر سکتے کہ ابھی صنعتی دور کا طوفان ان کے گھروں کی چار دیواریوں سے آر پار نہیں گزرا۔ سو ہم نے فیصلہ کیا کہ اس کے لئے ہم کسی ریلوے سٹیشن یا ہوائی اڈے پہ چلے جایا کریں گے۔ یوں تو منیلا میں مقیم پاکستان کے موجودہ سفیر ہمارے رشتے کے چچیرے بھائی ہوتے ہیں اور انہوں نے جاتی دفعہ ہمیں منیلا آنے کی بڑی مشفقانہ دعوت دی تھی۔ پھر ایک تو بیگم یعنی ہماری بھابی کیرالہ ریاست کے وزیر اعظم کی بہن لگتی ہیں اور کیرالہ کے وزیر اعظم سے ہماری برادری کی کوئی نسبت نہیں نکلتی۔ دوسرے سیاحت کی مستی میں سرشار دونوں نوجوان ہر قسم کے رکھ رکھاؤ سے دُور بھاگنا چاہتے تھے اس لئے فیصلہ یہی ہوا کہ سفیر صاحب کو اپنی آمد کی کوئی اطلاع نہ دی جائے۔

منیلا کے ہوائی اڈے سے باہر نکلے تو صبح کے سات بج چکے تھے۔ فضا بھیگی بھیگی اور بوجھل سی تھی۔ ہوا چل تو رہی تھی پر انسانوں کو چھوئے بغیر گزر جاتی تھی۔ سب کچھ صبح ہی صبح مرطوب سا لگ رہا تھا۔ قرائن سے

پتہ چلتا تھا سمندر کہیں پاس ہی ہوگا۔ ٹیکسیاں اور بسیں ہماری ہراساں شکلیں دیکھ کر کئی بار رکیں لیکن لڑکوں نے فخر سے نفی میں یوں سر مارے جیسے وہ بیلی کوپٹر یا مرسڈیز کے انتظار میں ہوں۔ پھر ہم تینوں نے اپنے اپنے صندوق گھسیٹے۔ سڑک پار کی تو ایک سرسبز باغیچہ نظر آیا۔ لڑکے بولے دیکھا۔ خدا شکر خورے کو آپ شکر دیتا ہے۔ اب ٹھکانے کا کوئی فکر نہیں رہا۔ امی آپ تھک گئی ہوں گی فوراً گھاس پر سو جائیے پل کی پل وہ مخملیں سبزہ ہمیں بھی بڑا اچھا لگا۔ آگے بڑھ کر پاؤں رکھا تو اوس کی تہیں ٹخنوں تک گیلا کر گئیں۔ یہاں گیلی گھاس میں بسیرا نہیں ہو سکتا۔ ہم بیمار ہو جائیں گے۔ میں نے بچوں سے کہا۔ ساتھ ہی پارک کے بیچوں بیچ سیمنٹ کی پٹڑی بنی ہوئی تھی۔ وہ دونوں اسے دیکھ کر یوں ناتجاذا انداز سے خوش ہوئے جیسے میرے لئے انہوں نے قوم کا ڈبل بیڈ ڈھونڈ لیا ہو۔ "یہاں آجائیے بڑی صاف ستھری آرام دہ ہے۔" وہ بولے۔ پھر ہم تینوں خیلا کی اس تاریخی جیح اپنا اپنا صندوق سر کے نیچے دبا کر پٹڑی کے عین بیچوں بیچ لیٹ گئے وہاں اتنے بڑے شہر میں سیمنٹ کی اس اجنبی راہگذر پر پڑے پڑے زندگی میں پہلی بار احساس ہوا کہ اپنے اوپر چڑھائی ہوئی معاشرے کی مختلف کینچلیاں اتار کر آزادی سے جینے میں کتنی لذت ہے۔ پھولوں کی چھوٹی چھوٹی کیاریوں کے درمیان سیمنٹ کی کھری پٹڑی پر چاروں شانے چت لیٹے ہوتے تھوڑی دیر کے لئے یوں محسوس ہوا جیسے روئیں روئیں میں بندھی زنجیریں چھن سے ٹوٹ گئی ہیں۔ کوئی پل میں برف کے بے وزن گالے کی طرح خود بخود فضا میں تیرنے لگوں گی۔ قرن ہا قرن۔ پھر یونہی تیرتے تیرتے کسی روز کسی لمحے چپ چاپ وقت کا شو کریں مارتا سمندر مجھے اپنے اتھاہ دامن میں جذب کر لے گا۔ جب تک پرت در پرت یہ ادپرا وجود فنا کے اٹل دھارے میں معدوم نہیں ہو جاتا مکمل آزادی کے وہ خوبصورت لمحات جو فلپائن میں میں نے سیمنٹ کی کھردری پٹڑی پر لیٹ کر گزارے تھے۔ جب میں نہ بیوی تھی نہ ماں تھی نہ بیٹی نہ بہن، میرا کسی سے کوئی رشتہ نہیں تھا میرا کوئی مذہب نہیں تھا۔ کوئی قومیت نہیں تھی کوئی وطن نہیں تھا بس میں، میں تھی۔ اور ممتا سے بھری کائنات کی اتھاہ وسعتیں افق در افق، لہر در لہر، ناک ناموس۔ رکھ رکھاؤ STATU طبقاتی اقتدار Z PL (ڈوسیلن) عورت مرد، سماج جھوٹ، جھوٹ، جھوٹ "جناب والا! یہ سب کالی کے مارے ہا تھ ہیں۔ ہمارا دم گھٹ رہا ہے۔۔۔ ہمارا خوف ہر گھڑی چوسا جا رہا ہے۔۔۔۔۔ اپنی اصل کی آنکھوں میں ڈال کر دیکھنے دیجیئے۔ جناب والا" جھٹکے سے آنکھ کھلی تو سورج سوا نیزے پر آ چکا تھا۔ وہیں سیمنٹ کی کھردری پٹڑی پر سوئے سوئے دوزخ نے گنگا اشنان کر لیا تھا، لیکن برسوں سے آرام کا عادی جسم جگہ جگہ سے اکڑ گیا تھا۔ میں نے لڑکوں کی طرف نظر ڈالی وہ نہایت بھولپن سے پوری رہگذر پر پھیل کر سو رہے تھے۔ تخلیق کے شدید شور میں خوبصورتی اور روشنی تلاش کرو کہ صرف اسی طرح تم اس کی ذات کو ڈھونڈ سکو گے۔ ان دونوں کے گرد ہزاروں سورج دمک رہے تھے۔ ان کے ہر سانس میں سے

معصومیت کی دبیز خوشبوئیں بہہ رہی تھیں۔ میں مُسکراتی مسکراتی ان کو دیکھے جا رہی تھی۔ خدا ضرور نوجوان ہوگا۔ میں نے دل میں سوچا۔ اس لمحے روشنی کی کچھ لپوتر کرنیں ان کے وجود سے پھوٹ پھوٹ کر میرے تھکے ہارے شکستہ پا جسم میں مدغم ہوتی جا رہی تھیں ۔

میں نے چونک کر دیکھا۔ لوگوں کا رستہ رکا ہوا تھا۔ وہ متحیر نظروں سے ارد گرد کھڑے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ان کی نظروں سے صاف ظاہر تھا کہ اس پٹڑی پر پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا۔ ہم نے ساتھیوں کو جگا کر کہا چھت کے بغیر رات گزارنا ممکن نہیں ہوگا۔ چلو کوئی سستی سی جگہ ڈھونڈ لیتے ہیں ۔

ملپائن میں وہاں کے لوگوں کے ساتھ بات چیت کرنے کی کوئی مشکل پیش نہیں آتی کیونکہ وہاں" انگریزی کو جلاوطن کرو"جیسی کوئی تحریک ابھی تک نہیں چلی۔ ٹیکسی ڈرائیور پڑھا لکھا ذہین آدمی تھا فوراً ہماری بات چیت سمجھ گیا۔

اللہ کا کرنا کیا ہوا کہ ٹیکسی والے کی مہربانی سے ہمیں نہایت مناسب دام پہ نہایت آرام دہ جگہ مل گئی۔ انتظامیہ کی انچارج ہلکے صندلی رنگ کی چھوٹی سی ناک والی کھر مکھر ہنستی گڑیا سی تھی۔ کمرہ تو صرف میں نے ہی دیکھا۔ لڑکوں نے تو صرف اسے ہی دیکھ کر ڈھیریاں ڈھا دیں۔ ہورے صاحبزادے نے تو اس کی آنکھوں میں جلتے قمقمے دیکھ کر ہکلانا شروع کر دیا۔ میں کمرے میں جا کر سو گئی تو وہ دونوں جانے کہاں کھسک گئے۔ شام پڑے واپس آئے تو دونوں کے رنگ لال گلال ہو رہے تھے۔ مسکراہٹیں پھوٹ پھوٹ پڑ رہی تھیں کہنے لگے" چلیے سیر کریں" تیار ہو کر ہوٹل سے باہر نکلے تو چاروں طرف شادی کا سا ہنگامہ تھا۔ بتیاں جگمگا رہی تھیں۔ موسیقی امرتوں کی طرح فضا میں بکھر رہی تھی۔ بنی سنوری چھوٹے چھوٹے گول گول جسموں والی ان گنت حسینائیں ہنستی مسکراتی، مٹکتی جھٹکتی تیز تیز ادھر سے اُدھر آ جا رہی تھیں۔ ہر آنے جانے والا ہمیں بڑے پرتپاک لہجے میں ہیلو ہیلو کرتا جا رہا تھا۔ چاروں طرف سے گرمجوشی کی لپٹیں سی آ رہی تھیں۔ ہم بھونچکے سے چلتے جا رہے تھے۔ پھر دائیں بائیں نظریں اٹھائیں تو شیشے کی دیواروں کے پیچھے لال پیلے رنگوں میں لڑکیوں کے نیم عریاں جسم شعلوں کی طرح دہکتے نظر آئے تو پتہ چلا کہ بنکاک کی طرح ایک بار پھر ہم ستاروں کے اسی جھرمٹ میں گھر گئے ہیں جو راتوں کو بیگانوں کی خواب گاہوں میں جھلملاتا ہے اور دن کو لوگوں کی شکستگیاں سینے سے لگائے اپنی اپنی چھتوں تلے سستا لیتا ہے۔

حالات تو بنکاک میں بھی المناک تھے، پر ملپائن والوں نے تو لڑکیوں کو بالکل کاٹھے بیروں کی طرح سڑکوں پہ ڈھیر کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہر آدھے فرلانگ پہ آٹھ دس خوبصورت لڑکیاں بن سنور کر سر شام بیٹھ جاتی ہیں۔ ساتھ "دکھڑا کے ماردیاں ریوڑیاں" یا پھینی ہوئی مونگ پھلی کے انداز میں بورڈ لگا ہوتا ہے۔ بورڈ پہ لکھا ہوتا ہے

"HOSPITALITY GIRLS" یعنی میزبان لڑکیاں کس قسم کی۔ HOSPITALITY۔ واللہ اعلم بالغیب اجارہ داری وہاں بھی بیشتر مردوں کے ہاتھ تھی۔ شیشے کی ایک دیوار کے پیچھے یوں سربازار ناچتے ہوئے دیکھ کر پتا نہیں مجھے ہر پگاتون اور ہر آرگن سے ایک ہی آواز آنا شروع ہوگئی "جنا تیری مرضی نچا بیلیا"۔ COMMODITY "کموڈیٹی" مکیپ، میں منہ میں بڑ بڑا رہی تھی۔ دونوں لڑکے اپنی دھن میں رنگوں کی پچکاریوں میں بھیگے چلے جارہے تھے، مسرور، شاداں.... پھر ہمیں سٹریٹ CAFE کے اونچے سٹولوں پر کھانا کھاتے وہ مل گئی "روز"۔ انگ انگ میں سے چاکلیٹ کی نہریں بہہ رہی تھیں۔ ہونٹوں پر ستارے جگمگا رہے تھے۔ جلد میں شہد ہی شہد گھلا ہوا تھا۔ آنکھوں میں مروارید موتیوں کی دمک، جسم براؤن صندل کا مجسمہ سولہ سنگھار۔ پورے سراپے میں تمازت اتنی کہ پاس بیٹھنے والے کے پر جل جائیں۔ ہنس کر کہنے لگی تم لوگ کتنے حسین ہو کیا پاکستان سارا ہی اتنا حسین ہے؟

پھر بڑا لڑکا اس کے جی کو بھا گیا۔ کہنے لگی۔ یہ ہر بات پر ہنستا ہے۔ ہنسنے والے لوگ بہت اچھے ہوتے ہیں۔ سامنے والے ہوٹل میں ایک سال سے اکیلی رہ رہی ہوں کل سے تمہارے ساتھ والے کمرے میں آجاؤں گی۔ ہنسنے والے ٹھیک ہے نا! اچھا، وہ قدرے توقف سے بڑے والے کی طرف شرارت سے دیکھ کر بولی۔ میں آج ہی رات تمہارے ہوٹل میں شفٹ کرلوں گی۔ کچھ ناتجربہ کاری، کچھ کلچر کا نیا پن، خوف سے اسکی گھگھی بندھ گئی۔

"آنٹی جی اب کیا ہوگا؟" میں کچھ نہیں کہتی، مجھ سے مت ڈرو۔ میں نے ہنس کر کہا۔ وہ اسی روز ہمارے ہوٹل میں شفٹ کر آئی، رات بھر میرے بھانجے کی پائینتی لیٹی اسے گالیاں دیتی رہی۔ کتنے بزدل نوجوان ہو، حسین عورت کے قرب سے چہرے پر سرسوں پھولی جارہی تھی۔ اس نے چھوٹے سے کہا "یار اس باجی کنجری سے میرا پیچھا چھڑا دو"۔ روز کچھ جھکی تھی۔ اس نے میری طرف رخ کیا۔ تم اسے میرے ساتھ گھومنے کیوں نہیں بھیجتیں میں تم سے پیسے تو نہیں مانگ رہی۔ اس کے گدرائے ہوئے جسم کی معطر خوشبوؤں سے کمرے کی فضا بوجھل سی ہوگئی۔ وہ گم صم پڑا رہا۔

میں نے پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "روز ہمارے ہاں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں راتوں کو تنہا باہر نہیں جاتے۔ اسے اخلاقیات کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ اس قدر سگریٹ مت پیا کرو"۔ اس نے سگریٹ کے بہت سے مرغولے میرے چہرے پر پھینکے۔

ریڈیو پر مغربی موسیقی کا سٹیشن کھولا۔ اوپر کا سکرٹ اتار کر میری طرف پھینکا اور صندل کا نیم عریاں براؤن مجسمہ محوِ رقص ہوگیا۔

لئے میری وجہ سے سراسیمہ ہوئے جا رہے تھے۔ میرے ہونٹوں پر خود بخود مسکراہٹ ابھر رہی تھی۔ میں نے جھنجھلاہٹ میں انہیں اپنی زبان میں ڈانٹنا شروع کر دیا۔ یہاں پڑے پڑے کیا دیکھ رہے ہو۔ جاؤ باہر تازہ ہوا میں چکر لگا کر آؤ۔ یہ فضا اس کے سحر میں یوں جکڑی ہوئی تھی کہ کوئی اپنی جگہ سے ہل نہ سکا۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ ایک لڑکی نے سر اندر کر کے زور سے کہا "روز تمہارا بیٹا جاگ رہا ہے"۔ وہ ٹھٹھکی "تم چلو میں آتی ہوں" روز نے لڑکی سے کہا۔ ہم سناٹے میں آگئے "روز تم شادی شدہ ہو" میں نے حیرت سے پوچھا۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ روز کے انگ انگ سے ٹپکتے کندے پھل میں بدل گئے۔ آنکھوں کے مروارید آنسوؤں میں بدل گئے۔ عجب حساس لڑکی تھی۔ مجھ سے لپٹ کر رونے لگی "نہیں میری شادی نہیں ہوئی۔ لوگ صرف میرے خوبصورت جسم کے متوالے ہیں۔ میری روح محبت کی پیاسی ہے۔ مجھے اب بھی اسی سے محبت ہے' جو یہ بیٹا میری جھولی میں ڈال کر مجھے اس بازار میں ڈال گیا ہے۔ اپنے جسم کے ذریعے اپنے ہونے کا، اپنا آپ منوا لینے کا طریقہ بھی میں نے اس کی جھوٹی محبت میں کرچیوں کی طرح بکھر جانے کے بعد سیکھا ہے۔ تمہارے بھانجے کی آنکھوں میں پاکیزگی ہے۔ سچ ہے۔ میرا جسم اور روح دونوں ہی سچ اور پاکیزگی کے پیاسے ہیں۔ مجھے معاف کر دینا میرے بیٹے کے دودھ کا وقت ہے۔

پتا نہیں وہ روز تھی' زرینہ تھی یا لتا۔ لیکن اس کی بے چین روح اور پرنم آنکھوں نے ایک بات واضح کر دی کہ مشرق کی عورت کتنی بھی آزاد ہو جائے مرد کی محبت کے گھمن گھیر سے کبھی آزاد نہیں ہو سکتی۔ کبھی نہیں۔ صبح میرا بھانجا اس کے بچے کے لئے کھلونے لے کر ہوٹل کے کاؤنٹر پر اس کا کمرہ نمبر پوچھنے لگا تو پتہ چلا کہ وہ صبح کی گاڑی سے اپنا بچہ ساتھ لے کر کچھ دنوں کے لئے گاؤں چلی گئی ہے۔ اس دن ہم تینوں بے معنی بازاروں میں گھومتے رہے "روز" جاتے جاتے ایک اداسی سی چھوڑ گئی تھی۔

اگلی شام ہم نے رسال پارک میں گزاری۔ شام گہری ہو رہی تھی۔ بازاروں میں گھومتے گھومتے بہت بڑے پارک میں نکل گئے۔ روشنیوں اور زندگی سے جگمگاتا یہ پارک ان کے ایک تاریخی ہیرو رسال کے نام پر ہے۔ لگتا تھا سارا "منیلا" امڈ آیا ہے ہر کوئی پکنک کے موڈ میں تھا۔ جگمگاتے آپس میں مدغم ہوتے جا رہے تھے۔ رنگا رنگ فواروں اور پھولوں کی معطر گھپاؤں کی چھاؤں میں کہیں کہیں بڑے رنگین نظارے بکھرے ہوئے تھے۔ یورپ میں بھی ایسے پر ہجوم پارکوں میں سے بارہا گزر رہا۔ بیشتر لوگوں کی مسکراتی نظروں کے پیچھے بھی ایک ہی پیغام نظر آتا ہے "ہمارا ملک بھر شت مت کرو تم کالے ہو غریب ہو جلدی چلے جاؤ یہاں سے" وہاں پورے پارک میں لوگوں کا ایک ہی مشغلہ لگتا تھا کہیں ہمیں اجنبیت کا توجہ کی کمی کا احساس تو نہیں ہو رہا۔ اس شام جرنیل "رسال" کے عظیم بت کے نیچے گھاس کے خنک قطعے پر بیٹھے بیٹھے جتنی محبت اور اپنائیت ہماری جھولی میں ڈالی' روح برسوں اس کی یاد میں

شاداب سے گی۔ اس لیے ان سب کو زندگی کی رونقیں لوٹتے اور ایک دوسرے میں خوشیاں بانٹتے ہوئے دیکھ کر عجیب جھٹکا سا لگا میں سوچ رہی تھی۔ دولت تو فلپائن میں بھی ہمارے ملک کی طرح بائیس نہیں تو بیاس خاندانوں کے پاس ہوگی۔ بڑی طاقتیں ان کو بھی رہ رہ کر شہرات دیتی ہیں۔ پھر ان کی روحوں پر فولادی خول کیوں نہیں پڑے ہوئے۔ طمانیت اور آسودگی فضا میں زعفران کی طرح کیوں بکھری ہوئی ہے۔ زندگی مستقل موت اور حیات کے درمیانی کرب میں کیوں مبتلا نہیں ؟

یہی ایک وجہ ہے کہ اتنے زہر خند دور میں بھی ان کی تخلیقی قوتیں مصوری اور بت تراشی کے عظیم شاہکار پیدا کر رہی ہیں۔ فلپائن مشرق بعید کا واحد ملک ہے جہاں ایٹم اور ہائیڈروجن کے دھوئیں سے لبریز دنیا میں لوگ سمندر کی اونچی لہروں کی اوٹ، کسی معطر گھنی جھاڑی کے نیچے سرسبز کھیت کی منڈیر پر تخلیق کے ذریعے نروان حاصل کر رہے ہیں۔ گلی گلی قریہ قریہ آرٹ کے یہ نادر شاہکار مکھیوں کی طرح بکھرے پڑے ہیں۔ کسی بھی آرٹ کی دکان میں چلے جائیے حسینائیں مسکرا مسکرا کر اپنے ملک کے فن پارے کوڑیوں کے مول آپ کی جھولی میں ڈال دیں گی۔ خود ایسی شہد میں لپٹی ہوئی کہ جی چاہے تو آرٹ کے ساتھ حسینہ کو بھی کاغذ میں پیک کر کے ساتھ لے جائیں۔ اسی طرح ایک روز سیپیوں اور گھونگھوں کے بنے ہوئے شمعدان خریدتے خریدتے چھوٹی سی جوگیا جیسے رنگ کی ایک گڑیا نے میرے بیٹے پر مٹھاس کی اتنی پچکاریاں ماریں کہ اس زمانے کا چھوٹا سا دل آپے سے باہر ہو گیا۔ میں چپکی تکتی رہی۔ رات بھر میرے ساتھ والے پلنگ پر اس کی آہوں کے چھوٹے چھوٹے دیئے جلتے رہے۔ صبح صبح آنکھ کھلی تو بستر سے غائب تھا۔ میں نے سوچا چہل قدمی کے لئے نکل گیا ہوگا۔ دس گیارہ بجے واپس آیا تو چہرے پر گلاب کھلے ہوئے تھے۔ آنکھیں تحیر سے پھیلی ہوئی تھیں۔ جتنے ڈالر جتنے پونڈ پورے سفر پر خرچ کے طور پر جمع کرتا رہا تھا ان سب کے اس لڑکی سے سیپیوں کے شمعدان اور لیمپ کلاوے میں بھر لایا۔ ہاتھ میں اس لڑکی کی دستخط شدہ رنگین تصویر تھی۔ میرے گلے میں باہیں ڈال کر کہنے لگا "آپ ٹوکیو اور پیکنگ ہو آئیں۔ میں اتنے روز منیلا میں ٹھہرتا ہوں۔ ابھی فلپائن اچھی طرح نہیں دیکھا" ہائے اٹھارہ برس کی محبتوں کے رنگین آتش فشاں "جو شہزادہ تخت ہزارہ چھوڑ کر کچے برتنوں کی دکان پر بیٹھ گیا تھا وہ یقیناً ۱۸ برس سے بڑا ہوگا" میں نے سوچا اور اگلے دن ٹوکیو کے لئے سیٹیں بک کروا لیں۔ لوگ ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔ عالمی چیمپئن محمد علی اگر اپنی موجودہ بیوی کو منیلا کی رنگین فضاؤں میں نہ ملتے تو شاید ان کی محبت پایۂ تکمیل کو نہ پہنچتی۔ اسی لئے وہاں سے چلے آنے کے بعد جب بھی میرے میاں فلپائن جانے کا نام لیتے ہیں گھٹنے کھڑ کھڑ بجنے لگتے ہیں۔

تماشا مرے آگے

جمیل الدین عالی

میں لندن سے بون جا رہا ہوں جو جرمنی (مغربی جرمنی) کا عملی دارالسلطنت ہے۔

انگلستان چھوڑتے وقت مجھے بہت خوشی ہوئی جیسے میں دوبارہ آزاد ہوا ہوں مگر پھر ہٹلر کا بھوت آنکھوں کے آگے ناچنے لگا۔ ہٹلر جس کا نام لے کر دلی کے گلی کوچوں میں بچے ایک دوسرے کو ڈراتے تھے۔ اور بڑے تو خود ہی ڈرتے رہتے تھے۔

یہ رودبار انگلستان گزر رہی ہے ہم اسے سیدھا پار نہیں کریں گے کیونکہ اس طرح تو فرانس کا ساحل آجاتا ہے۔ ہم رودبار پر ہی بائیں طرف کو مڑ جائیں گے یعنی مشرق کی طرف جہاں سے وہ سمندر شروع ہو جاتا ہے جسے بحر شمالی کہتے ہیں۔ بحر شمالی کا ساحل تقریباً فرانس سے شروع ہو کر بلجیم، ہالینڈ، مغربی جرمنی شرقی جرمنی اور پولینڈ سے گزرتا ہوا روس میں مدغم ہو جاتا ہے اور پولینڈ سے بحر بالٹک شروع ہو جاتا ہے۔ خیر بحر بالٹک کا قصہ دوسرا ہے بلکہ بحر شمالی کا قصہ بھی الگ ہونا چاہیئے کیونکہ اس کے پانی ناروے ڈنمارک اور سویڈن جیسے ملکوں کو چھوتے ہیں جو اپنی اپنی جگہ شمالی فلاحی ریاستیں یعنی ویلفیئر اسٹیٹس ہیں۔ فی الحال تو جرمنی پر ہی قناعت کی جائے۔

مگر کیوں جرمنی پر قناعت کی جائے جب "آزاد" دنیا کا باشندہ جرمنی کہتا ہے تو اس کی مراد مغربی جرمنی سے ہوتی ہے اور کمیونزم ملک کا آدمی جرمنی کہے تو معنی مشرقی جرمنی سمجھتا ہے۔ بےچارہ جرمنی دو حصوں میں تقسیم ہے جیسے کشمیر دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک نسل، ایک زبان ایک مذہب ایک تہذیب، ایک تاریخ، ایک جغرافیائی وحدت اور پھر بھی دو ملک دو حکومتیں! مغربی جرمنی میں مغربی قسم کی جمہوریت ہے اور مشرقی جرمنی میں غیر مغربی قسم کی اشتراکیت ہے۔ اصل نقصان جرمنی کا ہے جو کٹ گیا ہے نقصان کشمیر کا ہے جو کاٹ دیا گیا ہے۔

(ماں ڈیڑھ ہدر دجرمنی۔ اگر جرمنی اقوامِ متحدہ کا رکن ہوتا تو کیا کشمیر کے معاملے پر اسی جرأت سے حقِ خود ارادی کی بات کرتا جس طرح تم پاکستانی جرمنی کی تقسیم پر کرتے ہو۔ شاید۔ شاید)

یہ کولون آگیا۔ میں دن جا رہا ہوں مگر وفاقی جرمنی کے دارالسلطنت میں کوئی ہوائی اڈہ نہیں ہے۔ بلکہ قریبی شہر کولون پر اترنا پڑتا ہے۔ کولون جس کے نام سے منسوب فرانسیسی خوشبو او ڈی کولون ہم سب پاکستانیوں کی "وہ" بڑے شوق سے استعمال کرتی ہیں، پتا نہیں یہ خوشبو دار معطر کولون سے کیوں منسوب ہے، کوئی "مل گیا" تو ضرور پوچھوں گا۔ مگر ایسا ہونا عجب نہیں۔ تاج محل بنایا تھا شہجہاں بادشاہ نے اور ہندوستان کے متعصب ہندو جب آنکھیں اور منہ پھاڑے ہوئے غیر ملکی زائرین کو اس کی سیر کراتے ہیں تو اسے "ہمارا ثقافتی ورثہ" کہہ کر پکارتے ہیں اور ادھر ہم بھی کچھ کم نہیں، کیونکہ اب ہم بھی ٹیکسلا اور ہڑپہ کے آثار قدیمہ کو آثار قدیمہ کی بجائے ہمارا ثقافتی ماضی کہنے لگے ہیں جب کہ اپنے ملک کو جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کہنے پر بھی اصرار کرتے ہیں۔

جیسے یہ بڑوں کی باتیں ہیں آخر وہ تاجر بھی تو بڑے لوگ ہیں جو فرانس میں رہ کر اپنی بنائی ہوئی خوشبو کولون سے منسوب کرتے ہیں۔

کولون کا ہوائی اڈہ بھی چھوٹا سا ہے، جس دلی کی زبان لکھتا تو کہتا نام بڑے درشن چھوٹے۔ مگر شکر ہے کہ میں ابھی تک ان بیساکھیوں کے بغیر چل پھر سکتا ہوں۔ کہیں کہیں کسی روش پر اچھے خوشبو دار پودوں کے پھول نظر آجائیں تو سونگھ لینے میں کوئی ہرج نہیں، جیسے اس ہوائی اڈے پر اترنے میں کوئی ہرج نہیں جو اس شہر کا نہیں اور جہاں مجھے جانا ہے اور جہاں سے مجھے ایکیا رگی محبت اور تعاون کی خوشبو آتی ہے۔ شاید یہ خوشبو نہ ہو بلکہ انگریزی کسٹم کی بدبو دماغ سے جانے کا اثر ہو، کیونکہ انگریز کسٹم افسران ہم "کالوں" کے لئے بدترین خلائق ثابت ہوتے ہیں اور یہ کسٹم افسران شرافت کے پتلے بنے ہوئے ہیں۔

"ہیر عالی" ایک سرخ رنگ کا موٹا تازہ کسٹم افسر پوچھتا ہے، ہر کا تلفظ وارث شاہ والی ہیر ہے نہ پر سے دنوں پر ہیر ہے بلکہ ایک دیچ کی سی آواز ہے جو ڈھیر پھیر کی ہے کو مختصر کر دیا جائے تو ادا ہو جاتی ہے اس کے معنی ہیں مسٹر جناب وڈ ہیر عالی۔ اوہو آپ پاکستانی ہیں۔

"جی ہاں" میں بڑے تذبذب اور انکسار سے جواب دیتا ہوں۔ معلوم نہیں اب کیا پیش آئے۔

"کچھ نہیں۔ بالکل ٹھیک ہے۔ اجی آپ سامان کھولنے کی زحمت نہ کیجئے، آپ ہمارے دوست ہیں،

پاکستان ہمارا دوست ہے۔ مرحبا۔ خوش آمدید۔ کیا آپ چائے پئیں گے۔ کئی دن سے آپ کے وطن کے لوگ ادھر نہیں آرہے ہیں کیا بات ہے؟" انہوں نے کھٹ کھٹ میرے دونوں بکس بند کر دیئے اور چٹ سے میرے پاسپورٹ پر مہر داخلہ لگا دی۔

"بھئی واہ"، میں نے سوچا۔ (ہلدی لگی نہ پھٹکری دیہ خوشبو دار محاورہ ہے اور اس زور سے آیا ہے کہ روکا نہیں جاتا) اور رنگ چوکھا آیا۔ پھر میں نے سوچا کہ اب انہی حضرت سے رہبر اوّل یعنی پہلے گائیڈ کا کام لیا جائے کیونکہ میں یہاں ان کی حکومت کا مہمان تو ہوں نہیں اور مجھے ان کی زبان بھی نہیں آتی، اندھیرا ہو چلا ہے۔ بون نہ جانے کتنی دور ہو، سردی ہے کہیں رات تک میرا پٹڑا نہ ہو جائے۔

وہ چند منٹ دوسرے مسافروں میں مصروف رہے اور اس کے بعد صرف دو منٹ میں انہوں نے میرے سب کام پورے کر دیئے۔ بون ایک فون کیا کرنسی والے سے دو نوٹ بھنائے اور باہر کھڑی ہوئی ایک بس تک پہنچا دیا۔

"یہ بس آپ کو ۴۵ منٹ میں سیدھی بون پہنچا دے گی۔ اڈے کے سامنے بان ہوف ہے۔ بان ہوف یعنی ریلوے اسٹیشن۔ بائیں ہاتھ کو ایک نائٹ کلب ہے مگر آج وہاں نہ جائیے یا جائیے لیکن بس سے اترنے کے بعد نائٹ کلب جانے کی بجائے یعنی بائیں ہاتھ کو جانے کی بجائے دائیں ہاتھ کو جائیے۔ دس قدم بعد ایک عمارت نظر آئے گی وہ نیشنل ہوٹل ہے۔ معمولی، صاف اور سستا۔ کرایہ دس مارک کھانا تین چار مارک اور صبح اپنے متعلقہ دفتر جائیے تاکہ آپ کے قیام کا بہتر انتظام کر دیا جائے۔ اگر ہو سکا تو آپ کو صبح بھی دیکھ لوں گا۔ اس دوران میں جس سے بات کرنی ہو بے دھڑک انگریزی بولیئے۔ نہیں سمجھے گا تب بھی کچھ نہ کچھ جواب دے گا۔ ہم جرمنوں کو غیر زبانیں بولنے کا بہت شوق ہے اور انگریزی اور فرانسیسی سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ آپ چاہیں تو آپ کی زبان پاکستانی بھی سیکھنے پر تیار ہیں۔"

وہ ابھی اور کچھ کہتے مگر بس چل دی۔ میں نے شکریہ ادا کیا کہ اگر "پاکستانی" زبان کی بات چھڑ جاتی تو مجھے نہ جانے کیا کیا کہنا پڑتا۔

یہ راستہ بے مزا گزرا۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ اپریل کا مہینہ تھا مگر شدید سردی تھی یا مجھے زیادہ لگ رہی تھی۔ لندن سے بہت زیادہ تھی۔ مگر یہ سردی مصفّا اور بے کہر بے دھند تھی۔ لندن کی سردی سے آنکھوں میں چبھن سینے میں جلن، تیوری پہ شکن اور ـــــ اور قافیوں میں گھٹن ہو جاتی ہے یہ سردی تیز ہے مگر صاف شفاف ہے سیدھی سادی صرف سردی جیسے کوئی کوئی عورت صرف عورت ہوتی ہے۔ جسے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

کوبون سخت تاریخی شہر ہے مگر یہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ یہ "تفریح گاہ" بھی ہے اور بون اس کے آگے قصبہ ہے گاؤں ہے اور وہاں سے لوگ عیاشی اور تفریح کرنے اِدھر آتے ہیں۔ مگر یہ سب دیکھا جائے گا۔ ابھی تو بون دیکھو بون جو اُس کا عارضی دارالسلطنت ہے (کیونکہ قانوناً ابھی تک برلن کو دارالسلطنت کہا جاتا ہے اور وہ اس لئے کہ برلن غیر منقسم جرمنی کا دارالسلطنت تھا اور ابھی مغربی جرمنی کی حکومت جرمنی کی تقسیم کو قانونی طور پر تسلیم نہیں کرتی اور وفاق کے لئے کوشاں رہتی ہے۔)

مگر بون جو وفاقی جمہوریہ مغربی جرمنی کا عارضی دارالسلطنت کہا جاتا ہے اصل میں خود بھی دارالسلطنت نہیں ہے بلکہ ہمارا پنڈی ہے جس کا اسلام آباد اس سے تین چار میل دور ہے اور اس اسلام آباد کا نام ہے باڈگوڈس برگ۔ باڈگوڈس برگ میں تمام سرکاری دفاتر اور سفارت خانے اور سفیروں اور وزیروں کے مکانات ہیں۔ باڈگوڈس برگ امریکی طرز تعمیر کا ایک نمونہ ہے۔ پہلے یہاں امریکی فاتح افواج رہتی تھیں۔ ان کے افسروں نے اپنے لئے بڑے ٹھاٹ دار دفتر اور گھر بنوائے جو اُن کے جانے کے بعد جرمن حکومت اور دوسرے ملکوں کے سفارتی نمائندوں کے حصے میں آگئے۔ یہاں تک کہ پاکستانی افسر بھی جو کراچی کے ڈی ٹائپ لارنس روڈ والے کوارٹروں میں رہتے تھے وہاں اس طرح براجمان ہیں کہ

زیب دیتا ہے انہیں جس قدر اچھا کہیئے

مگر ابھی ٹھہریئے، وزیر اعظم مغربی جرمنی یعنی جناب ایڈنائر، باڈگوڈس برگ میں بھی نہیں رہتے بلکہ اس کے قریب ایک گاؤں میں رہتے ہیں جس کا نام ہے رونٹڈورف۔ ایک لطیفہ یہ بھی مشہور ہے کہ وزیراعظم نے بون کا اس لئے دارالسلطنت کے لئے انتخاب کیا کہ ان کے اپنے گاؤں رونٹڈورف میں اتنی گنجائش نہ تھی (یعنی اگر ممکن ہوتا تو وہ رونٹڈورف ہی کو دارالسلطنت بنا لیتے) واللہ اعلم بالصواب۔ اور یہ معاملہ ذرا نازک بھی ہے۔

بون دریائے رائن کے کنارے ہے اور باڈگوڈس برگ بھی دریائے رائن کے کنارے واقع ہے اور ایڈنائر صاحب کا گاؤں رونٹڈورف بھی دریائے رائن کے کنارے واقع ہے۔ اصل میں سارا مغربی جرمنی ہی ایک طرح دریائے رائن کے کنارے واقع ہے۔ رائن ان کا بندھ ہے گنگا ہے سب سے اچھی بیئر بھی رائن سے منسوب ہے بلکہ بھی رائن کلچر کہہ دیا جاتا ہے۔ گو تقہ جرمن اس کا بُرا مانتے ہیں۔

بون اور گوڈس برگ میں کوئی خاص بات نہیں سوائے اس کے کہ اس کی یونیورسٹی خاصی قدیم ہے

مشہور فلسفی اور اقبالؔ کا مجذوب فرنگی نطشے بون یونیورسٹی کا طالب علم تھا یا یہ کہ دوسری جنگ عظیم کی مشہور سیگفریڈ لائن کی حدوں میں یہ علاقہ بھی شامل تھا جسے اتحادی فوجوں نے توڑ کر اسے فتح کر لیا تھا۔ ویسے یہاں چند تاریخی لطائف ضرور پیش آئے۔ مثلاً دوسری جنگ سے فوراً پیشتر برطانیہ کے وزیراعظم چیمبرلین چھتری والے جب ہٹلر کی ہٹلرانہ شرطیں ماننے جرمنی آئے تھے تو یہیں کے پیٹر شوف ہوٹل میں ٹھہرے تھے اور دوسری جنگ عظیم کے بعد یا اس واقعے کے چھ برس بعد اتحادی فاتحین نے اسی پیٹر شوف ہوٹل کو اپنا صدر مقام بنایا تھا۔ بون شاید دنیا کے دارالسلطنتوں میں سب سے کم آبادی کا دارالسلطنت ہے کیونکہ یہاں کی کل آبادی کوئی ڈیڑھ لاکھ ہو گی۔ بعض گلیاں بھاٹی گیٹ کی اندرونی گلیوں سے بھی چھوٹی یعنی کم لمبی چوڑی ہیں مگر ہیں پختہ صاف اور روشن۔ کھانا وافر سستا مگر ہر قسم کا نہیں ہے۔ یعنی کہیں سے خوشبوئے نکوری نہیں آتی۔

پاکستانی نووارد کے لئے جرمنی غیر زبان (یعنی غیر کفو) سہی مگر ایک شفیق دوست کی طرح ہے جو بے تکلف بھی ہو جائے زبان نہ جاننے کے باوجود مجھے یہاں بہت کم تکلیف ہے۔ روٹی نہیں ملی بن مل گیا۔ بن نہ ملا مرغا مل گیا۔ سور کی پہچان ہو گئی ہے، سانپ، بچھو، کنکھجوروں کا یہاں رواج نہیں اس لئے کھانے پینے کی کوئی دقت نہیں۔ ہر جرمن خلیق اور مہمان نواز نظر آتا ہے۔ اٹک اٹک کر بات کرنے میں دقت بھی لگے تو رہنمائی کرنے میں پتا بتانے سے یا کوئی مشورہ دینے سے گریز نہیں کرے گا۔ بون کا ہر شہری لندن کا بابی لگتا ہے۔ مشہور مہربان شفیق دوست جو آپ کی مدد اپنا فرض سمجھتا ہے۔

اب مشکل یہ ہوئی کہ یونیسکو والوں نے جس دفتر سے میرا رابطہ قائم کرایا تھا وہ بالکل بوگس نکلا۔ میں اخلاقاً اس کا نام نہیں لوں گا کیونکہ اس کی نالائقی سے مجھے جو پریشانیاں ہوئیں وہ عام جرمنوں کی محبت نے دھو دی ہیں مگر اس میں شک نہیں کہ وہ دفتر سخت بیکار ثابت ہوا۔

"میں کہاں سستے کمرے پر آرام سے ٹھہر سکتا ہوں؟"

"جہاں آپ چاہیں جو جگہ آپ پسند کریں۔"

"میرا پروگرام کیا ہو گا؟"

"جیسا آپ چاہیں گے۔"

"یعنی میں کس کس سے ملوں گا، کن کن اداروں میں جاؤں گا اور کس کس شہر میں اور کب کس دن"

" یہ سب آپ کی مرضی پر ہے، بہرحال ہم آپ کو بالکل آزاد رکھنا چاہتے ہیں۔ اے واہ بھئی آپ تو خود ہی
یاں قبول کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

کیا آپ کسی بے حد نوعمر حسینہ سے لڑے ہیں (جو آپ کی بیوی نہ ہو) کم از کم مجھے پہلے یہ سعادت حاصل نہ
ںھی اور اب یہ موقع ملا تو وہ بھی ہاتھ سے جا رہا تھا۔ میرا یہ مکالمہ مس بیٹیسین (بے ٹے سین) سے ہو
ما جو بہت ہی نوعمر تھیں یعنی مغربی معیار سے کیونکہ ہمارے ہاں تو برس پندرہ یا سولہ کا سن آتے ہی
ن کی راتیں مرادوں کے دن طاری کر لئے جاتے تھے۔ اب بھی ایسا ہی ہوتا ہوگا۔) لیکن مغرب میں نوعمری
س بیس تک چلتی ہے۔ یہ اٹھارہ کی ہوں گی اور بے حد حسین اور بے وقوف تھیں۔ بہت دن ہوئے
سلسلے میں جگر صاحب نے مجھے خط میں اپنا ایک شعر لکھا جس پر میں جھوم جھوم اٹھتا تھا۔

حُسن جس رنگ میں ہوتا ہے جہاں ہوتا ہے
اہلِ دل کے لئے سرمایۂ جاں ہوتا ہے

مگر اب معلوم ہوا کہ جگر صاحب اتنے بڑے آدمی ہونے کے باوجود سخت ناتجربہ کار بھی تھے
ونکہ اتنی پیاری ہونے کے باوجود بے ٹے سین مجھے وبالِ جان معلوم ہو رہی تھیں۔ چنانچہ میں نے اپنے
ساتھی اپنے آپ تلاش کیے جو زیادہ تر سیاست نویس انٹلکچوئل ثابت ہوئے ادب دوست اور کتب خانوں کا
روگرام کم ہوا اور دیگر معاملات زیادہ۔

چند روز فرانس میں

ڈاکٹر محمد اجمل

رات پونے گیارہ بجے ائیر فرانس کے طیارے میں سوار ہوا اور صبح فرانس کے وقت کے مطابق کوئی ساڑھے چھ بجے پیرس پہنچا۔ سفر خاصا خوشگوار گذرا اور نشست کی لچک کی وجہ سے تہران سے روم تک سوتا آیا۔ لیکن بار بار جہاز کے C R A S H کا خیال آتا تھا C R A S H کے خوف سے فرار بھی کرتا رہا۔ لیکن جب اسے پوری طرح محسوس کیا تو خوف بہت حد تک بے معنی معلوم ہونے لگا۔ کارل راجرز کا نظریہ کہ احساسات کو پوری طرح محسوس کرنا چاہیئے اور جو شخص اپنے احساسات و جذبات کو قبول کرتا ہے وہ انھیں دوسروں پر حاوی نہیں کرتا، بہت صحیح نظر آتا ہے، لیکن محسوس کرنے کے بعد افکار کی تصحیح بھی کرنی چاہیئے۔ ہمارے اندر ہر وقت جو تحت اللسان بات چیت ہوتی رہتی ہے اس کا شعور حاصل کرکے افکار کو صحیح کرلینا چاہیئے۔ اس طرح کچھ جذباتی صحت میسّر آجاتی ہے۔

پیرس پہنچا تو یہاں کے دفتر خارجہ کی ایک نمائندہ خاتون میرے خیر مقدم کو ہوائی اڈہ پر موجود تھیں۔ پاکستانی سفارت خانے کے ایک تھرڈ سیکرٹری مسٹر جاوید چوہان بھی وہاں آئے ہوئے تھے۔ سفارت خانے کی کار میں اوڈیئن ہوٹل پہنچے تو پتہ چلا کہ کمرہ نمبر ۲۰۸ جو میرے لئے ریزرو کیا گیا تھا، بارہ بجے سے پہلے خالی نہیں ہوگا۔ چنانچہ میں موسیٰ جاوید چوہان کے ساتھ اس کے فلیٹ میں چلا گیا۔ یہ نوجوان بہت شریف اور مہمان نواز تھا۔ گورنمنٹ کالج کا سابقہ طالب علم تھا۔ بہت محبت سے پیش آیا۔ استاد اور شاگرد کے رشتے میں جو حجاب ہوتا ہے وہ مانع آتا رہا اور کچھ بے تکلفی سے اور کچھ جھجک سے میرے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ اس نے اپنا کمرہ میرے لئے خالی کردیا اور میں کوئی ساڑھے گیارہ بجے تک سوتا رہا۔ اس کے بعد چائے پی اور میں اوڈیئن ہوٹل میں آگیا۔ کمرہ نمبر ۲۰۸۔ کمرہ کیا ہے اٹھارویں صدی کے آثار میں سے تنگ و تاریک کمرہ جس میں ایک بہت بڑے پلنگ نے ساری جگہ گھیر رکھی ہے۔ دیواروں کو اس قدر قریب دیکھ کر زندانی ہونے کا احساس ہوتا ہے اور ضیق النفس کی شکایت پیدا ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ میں اس کرے

میں رہنے کو اپنی ذلت سمجھے لگا۔

رات بھر اپنے میزبانوں پر غصہ آتا رہا کہ مجھے یہ معمولی سا کمرہ دیا ہے۔ یہ کہاں کی مہمان نوازی ہے! سویا بھی خوب، بہت خواب آئے جن میں سے فقط یہ یاد ہے کہ ایک فرانسیسی عورت، اور میں ایک کار میں جا رہے ہیں اور ایک چھوٹا سا لڑکا کار چلا رہا ہے۔ ایک جگہ سڑک خراب ہے اور وہ لڑکا بائیں طرف موڑ کر ایک پہاڑی پر کار کو لے جاتا ہے اور پھر نہایت خطرناک طریقے سے پہاڑوں سے نیچے کار کو لاتا ہے۔ پہاڑی پر سے اترائی بالکل سیدھی ہے لیکن وہ بہرحال کار کو نیچے لے آتا ہے، اور میں اس لڑکے کو بہت ڈانٹتا ہوں۔ صبح جب اٹھا تو ماحول سے خفگی بہت حد تک ختم ہو چکی تھی اور میں نے نیچے SALON میں جا کر ناشتہ کیا۔ ناشتہ کرنے کے بعد طبیعت میں کچھ ٹھہراؤ آگیا ہے۔ یہی کمرہ اب اچھا لگنے لگا ہے۔ سوچتا ہوں کہ پہلے یہ کمرہ اس لئے تو برا نہیں لگا تھا کہ پاکستانیوں میں جگ ہنسائی ہو گی تو یہ میرا اپنا احساس تو نہیں تھا کہ کمرہ برا ہے۔ رتبے کا احساس، لوگوں کی توقعات کا احساس ہے اپنا ذاتی احساس تو نہیں INTROJECT کس طرح دماغ میں سما جاتے ہیں۔ کہیں فرانس آنا بھی کسی INTROJECT ہی کی بدولت تو نہیں تھا کہ لوگ رشک کریں گے کہ فرانس گیا ہے۔ فرانس کی کشش دل کی تہہ میں یہ تھی کہ احمد ابوبکر سے ملوں گا اور ان سے روحانی فیض حاصل کروں گا، اور اس طرح شاید اپنی بکھری ہوتی شخصیت میں کسی قدر جمعیت پیدا ہو اور سکون سے آشنا ہو جاؤں لیکن سب لوگ یہ سمجھتے ہیں اور اپنی بیوی اور بچوں کو بھی میں معقول وجوہات بتاتا رہا کہ وہاں یونیورسٹیاں دیکھنا ہیں، مدرسے دیکھنا ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح ہر داخلی کشش کو میں لوگوں سے پوشیدہ رکھتا ہوں کیونکہ اگر انھیں معلوم ہو گیا تو وہ مجھ پر ہنسیں گے اور یہ عجیب سی بات ہے کہ جب لوگ مجھ پر ہنسیں تو مجھے سب سے پہلے اپنے جسم کی کم قدری کا احساس ہوتا ہے گویا یہ جسم حقیر ہے، سکڑ گیا ہے ـــ اور اس کے بعد اپنے ذہن کی تحقیر کا... اگر مغرب کا جرم یہ ہے کہ اس نے روح کو نظرانداز کیا تو ہم نے اپنے آپ پر یہ ستم کیا کہ ہم نے جسم کو شعوری طور پر ایک حقیر مقام دیا۔

کوئی پانچ بجے ہوٹل واپس آیا۔ فرانسیسی عورت صبح پونے دس بجے کار میں لینے آئی۔ ہم پرمیشر ہوٹل گئے اور وہاں ایک جاپانی پروفیسر تیمیا اور ان کی بیوی کو ساتھ لیا اور ہم سیدھے CHANTILLY گئے جو پیرس سے کوئی چالیس کلومیٹر دور ہے۔ بہت دلکش اور دلفریب جگہ ہے۔ ایک عظیم عمارت ہے جس میں ایک محل بھی ہے اور ایک قلعہ بھی ہے۔ دیواروں پر جا بجا فرانس کے مصوروں کے شاہکار آویزاں ہیں ڈیوک

ڈی ایتول کا بہت بڑا اور جامع کتب خانہ ہے جس میں غالباً تیس ہزار کتابیں بھی ہوئی ہیں جن کی مرصع اور قیمتی جلدیں ہیں۔ یہ ڈیوک اکیڈمی آف سائنس کے علاوہ فلسفہ کی اکیڈمیوں کا رکن بھی تھا۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ اس کو یہ اعزاز کیوں کر حاصل ہوتے۔ اس عمارت کا ایک حصہ COLLEGE DEFRANCE کے بڑے بڑے پروفیسروں کی رہائش کے لئے مخصوص ہے کہ وہ جب چاہیں یہاں آکر کام کریں۔ علم و فضل کی یہ قدردانی دیکھ کر خیال آیا کہ جب تک اس تہذیب میں یہ عناصر موجود ہیں یہ مردہ نہیں ہوسکتی۔ اس محل کے ساتھ ایک بڑی شکارگاہ بھی ہے لوگ یہاں آکر گھوڑ دوڑ کا تماشہ کرتے ہیں یا خود گھوڑے کی سواری کرتے ہیں اور شکار کے موسم میں شکار کھیلتے ہیں۔ یہاں نہایت عمدہ اور خوش ترتیب باغ لگے ہوئے ہیں جن میں کئی رنگوں کے لالے کے پھول کھلے ہوئے ہیں اور باغوں کے بیچ میں پانی کے چشمے بہتے ہیں۔ بہت حسین اور دلربا منظر تھا۔ روح میں ایک شادابی سی محسوس ہونے لگی۔ جی چاہتا تھا کہ اس فضا کو اپنا آپ سپرد کرکے حسن کے ہر منظر سے لپٹ جاؤں۔ شاید اسی چند لمحوں کی کیفیت کو دائمی تجربہ کہتے ہیں، جس طرح محبوب سے چند لمحوں کی ملاقات ابدی اور ازلی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ واپس آنے لگے تو باہر دور لمبے لمبے درخت نظر آتے۔ جنھوں نے اپنے چمکیلے پتوں سے سڑک پر سایہ کر رکھا تھا۔ ان پتوں کی سبزی میں ایک اجالا، ایک آب و تاب تھی جو ابر آلود فضا میں دمک رہی تھی۔ اور ابھی ہم وہاں سے نکلے ہی تھے کہ دھوپ نکل آئی۔ ہوا کی خنکی کم ہوئی اور بہار آگئی۔ ہمارے رہبر نے کہا، چلو آپ لوگوں کو SENLIS دکھالاؤں۔ ہم نے کہا، چلو۔ کوئی دس میل کے فاصلے پر سان لین ایک اجڑا ہوا گاؤں ہے جس کے پرانے گھروں اور دیواروں اور اونچے دروازوں میں گویا اُن کے مرحوم باسیوں کی دنیا باہر کی دنیا سے پوشیدہ آباد تھی۔ ایک جگہ کار کھڑی کی، اور ہم ٹہلتے ٹہلتے ایک عظیم اور بلند قامت کلیسا کے پاس جسے NOTRE DAME OF SENLIS کہتے ہیں۔ آن نکلے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں جون آف آرک نے انگریزوں کو شکست دی تھی۔ اس کے سامنے یہ کلیسا ہے جس کے ایک بڑے دروازے کی محراب پر بہت سے صنم تراشے ہوتے ہیں۔ مرکزی صنم حضرت مریمؑ کی موت کے واقعے کو بیان کر رہے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کا صنم بھی ہے اور دونوں طرف مختلف مقدس شخصیتوں کے اصنام ہیں۔ کلیسا کے اندر گئے تو ایک خاص قسم کا سادہ جلال و جمال نظر آیا۔ کلیسا کیا تھا فرانس کا ایک راہب تھا جو ہیبت ایزدی سے مسحور کھڑا تھا۔ ہم جیسے تماشائی اسے دیکھتے اور اس کے وقار کو اپنے ذہنی اثاثے کے مطابق اس کی تعبیر کرکے چلے جاتے باہر نکلے تو پروفیسر تیمیا نے کہا، بھوک لگی ہے یہیں کھانا کھالیں۔ وقت دیکھا تو ایک بج چکا تھا اور

بھوک بہت لگ چکی تھی۔ معجزۂ فن کے ان مظاہر میں اس قدر انہماک تھا کہ بھوک کی آگاہی نہ تھی۔ ہم کوئی معقول ریسٹوران ڈھونڈنے لگے۔

دو صفحے سے زیادہ لکھنے کی ہمت نہیں ہوتی ورنہ جو گفتگو کھانے پر ہوئی وہ بہت دلچسپ تھی اور اسے محفوظ کرنے کو جی چاہتا تھا۔ ورنہ پھر لکھوں گا، اس وقت رات کا خواب لکھ لوں۔ رات میں نے خواب دیکھا کہ ایک ضروری اجلاس قائم کرنا ہے اور اس کا اہتمام میرے ذمے ہے۔ وہ اہتمام مکمل ہو جاتا ہے لیکن اس سلسلے میں بہت سی دشواریاں بھی پیش آتی ہیں۔ دوسرا حصہ خواب کا یہ تھا کہ اختر (میری بیوی) بھی میرے ساتھ ہے اور ایک کھویا ہوا بچہ بھی۔ خواب کا مطلب میں نہیں سمجھنا چاہتا۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ کھویا ہوا بچہ میری "انا" ہے جو کسی بھول بھلیاں میں کھو گئی ہے اور جو مقاصد اور اقرار کے الجھاؤ میں مبتلا ہے۔ کل پروفیسر تیمیا کے ساتھ کھانے پر بڑی دلچسپ باتیں ہوئیں، پروفیسر تیمیا کی باتوں میں بڑی خود اعتمادی تھی۔ اور مزاح کی جھلک بھی تھی۔ وہ ہنسا بھی خوب کھلکھلا کے اور ہر جاپانی سیاح کی طرح بار بار کیمرہ اٹھا کر تصویر بھی لے لیتا تھا۔ اس کی بیوی کے چہرے پر ایک مستقل حیرانی کی کیفیت طاری تھی اور اس کے اپنے چہرے پر ایک نقاب ـــــ سکون کا۔ جب جاپانیوں کی شخصیت کے بارے میں بات چیت شروع ہوئی تو میں نے وہ نقاب لرزتے دیکھا اور چہرے کی فطری زردی میں سرخی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لیکن آہستہ آہستہ اس نے اپنے متعلق باتیں شروع کیں اور کھلتا گیا۔ فرانسیسی لڑکی نے کہا کہ جاپانی کام اتنا کرتے ہیں کہ وہ تفریح کو پسند نہیں کرتے۔ میں نے کہا کہ صنعت یافتہ ممالک میں لوگ اپنے آپ سے اس قدر خوف کھاتے ہیں کہ وہ چھٹی کو برداشت نہیں کر سکتے۔ پروفیسر تیمیا کچھ نفسیاتی توجیہہ کا قائل نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے میرے تبصرے کو نظر انداز کرنا چاہا لیکن نفسیاتی توجیہہ پر نفسیات دشمن لوگوں کا ردعمل ہمیشہ جذباتی ہوتا ہے۔ اگر اسے وہ نظر انداز کریں گے بھی تو جذباتی ہو کر، گویا نظر انداز نہیں کر سکتے اور اس سے بے اعتنائی نہیں برت سکتے۔ برطانوی ماہر نفسیات آئزنک کو دیکھو تو تقریباً ہر موضوع پر کس قدر غیر جذباتی انداز میں اظہار خیال کرتا ہے اور کس قدر پھیکا اور بے رنگ ہے اس کا طرز تحریر لیکن جونہی تجزیۂ نفس پر تنقید کرنے لگتا ہے فوراً انداز میں تندی اور جوش ابلتا نظر آتا ہے۔ گویا کسی نے اس کی دکھتی رگ چھیڑ دی ہو۔ تڑپ تڑپ کر لکھتا ہے اِدھر اُدھر سے دلائل جمع کرتا ہے اور اس طرح تجزیۂ نفس کو غلط ثابت کرنا چاہتا ہے کہ اس میں سانس باقی نہ رہے اور اس کا جنازہ دھوم کے بغیر نکل جائے، لیکن اس طرح وہ کئی بار اس مدرسۂ فکر کا جنازہ نکال چکا ہے اور پھر بھی یہ مدرسہ

رندہ ہے۔ پروفیسر تیمیا کی خود اعتمادی رشک آفریں تھی۔ لیکن نفسیاتی تجزیہ کے ایک ہی وار سے وہ متزلزل ہو گئی۔ اس نے کہا کہ میں چھٹی اس لئے نہیں لیتا کہ مجھے کام بہت ہے۔ میں نے کہا کہ صنعت میں ترقی یافتہ ہونے سے انسان آہستہ روی کی لذتوں سے ناآشنا ہو جاتا ہے۔ وہ روح کی آواز سننے سے قاصر رہتا ہے کیونکہ خارجی دنیا کا شور و غوغا اس کی توجہ اپنی طرف کھینچے رکھتا ہے۔

۲۹ر اپریل ۱۹۷۳ء

پروفیسر تیمیا کی باتیں اور کلیسا کے حسن کے بارے میں کچھ لکھنا چاہتا تھا لیکن آج پروفیسر کلود لیوی سٹراؤس سے کچھ باتیں ہوئیں۔ میں نے ان کی جو کتابیں پڑھی تھیں ان کا ذکر کیا۔ پھر میں نے پوچھا کہ ان کی ژنگ کا ذکر نہیں ہے۔ وہ کہنے لگے "ہاں، اس لئے نہیں ہے کہ ژنگ ایک تصویر IMAGE کو علیحدہ کر کے اس کے معنی تلاش کرتا ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ جب ہر تصویر سیاق و سباق میں ٹھیک طرح بیٹھ جائے تو پھر اس کا مطلب متعین ہو جاتا ہے۔" میں نے کہا ژنگ بھی تو کوکبۂ اعیان کا ذکر کرتا ہے۔ یعنی کوئی عین بذات خود علیحدہ ظاہر نہیں ہوتا بلکہ مختلف اعیان سے مل کر معنی حاصل کرتا ہے "ہر عین انا" کی ایک موجودہ حالت کے ردعمل کے طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ژنگ میں شاید الجھاؤ ہے کہ وہ کبھی عین تصور کہتا ہے اور کبھی تصور کی صورت کو"۔ مجھے پروفیسر موصوف کی باتوں سے یہ احساس ہوا کہ انھوں نے ژنگ کو غور سے نہیں پڑھا۔ میں نے پوچھا کہ تیسری دنیا میں جو تشخص کا آشوب آیا ہے اس سے آپ بحیثیت ایک مغربی مفکر کے کیسے متاثر ہوتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ جو غلطیاں ہم نے انقلاب فرانس کے وقت اور اس سے پہلے کی تھیں وہ تیسری دنیا کے لوگوں کو نہیں کرنی چاہئیں۔ یہ ممکن ہے کہ آپ لوگ صنعت کو اپناتے ہوئے اپنے کلچر سے بیگانہ ہو جائیں۔ یہ بہت بڑی غلطی ہو گی۔ صنعت یابی اور تحفظِ ثقافت میں توازن قائم کرنا چاہیئے۔ ہم لوگ آپ اپنی غلطی پر پچھتا رہے ہیں۔ پھر کہنے لگے کہ یہ ایک CARTESIAN غلطی ہے میں نے سمجھا کہ شاید ڈیکارٹ نے جو روح اور مادے کی دوئی کو قطعی قرار دیا تھا اس کا ذکر رہے ہیں لیکن دونوں باتوں کا تعلق سمجھ میں نہ آیا۔ چنانچہ میں نے پوچھا کہ CARTESIAN کن معنوں میں؟ کہنے لگے کہ ڈیکارٹ نے چیزوں میں مماثلت ڈھونڈنی شروع کی تھی اور مماثلت کو اتنی اہمیت دی کہ لوگ چیزوں کے اختلافات کو فراموش کر گئے ——— گویا ہر کلچر کی ایک منفرد ساخت ہے اس ساخت کا بیان اور اس کی پہچان اجتماعی علوم کا کام ہے۔ فوراً میرے دل میں اس نظریے کے خلاف بغاوت پیدا ہوئی اور اس کے ساتھ لیوی سٹراؤس کی فن کارانہ عظمت کا

احساس بھی ہوا۔ میرے ذہن نے اس نظریے سے بغاوت اس لئے کی یہ RUTH BEEDICT کے PATTERNS OECULTURE کی طرح کا نظریہ ہے اور اس سے SPENGLER تک کی مسافت بہت مختصر ہے۔ ۱۹۶۳ء میں جب میں امریکہ گیا تو ماہرین نفسیات نے ثقافتی اختلافات کو اس طرح ایک مذہبی سی حیثیت دیدی تھی کہ مجھے بہت کوفت ہوئی۔ چنانچہ میں نے اپنے ایک دوست HAROWDPEPINSK HAROLDPEPINSKY پر جو اس نظریے کی بہت تبلیغ کر رہے تھے اسکی لغویت ثابت کرنے کی کوشش کی اور کسی حد تک کامیاب بھی رہا۔ آج کلوڈ لیوی سٹراؤس کی عظمت کا میں اس طرح قائل ہوا کہ وہ ہر کلچر کو ایک فن پارہ سمجھتا ہے اور اس فن پارے کے بیان اور تجزیے ہی کو علم الانسان کا کام سمجھتا ہے۔ لیکن وہ رویہ جو عمومی نتیجہ نہیں نکال سکتا اگر عمومی ہو جائے تو دنیا میں ایک ثقافتی انقلاب آجائے۔ اس رویے سے ہم ہر ثقافت کو ایک فن پارہ تصور کریں گے اور اس کے مختلف عناصر کو جوڑنے اور ایک سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں گے۔ یہ ایک جمالیاتی نظریہ ہے، سائنسی نہیں عقلی نہیں۔ اس نظریے کی رو سے عقل محض ایک ذیلی حیثیت رکھتی ہے ـــــ ایک حاشیہ بردار کی حیثیت، یہ نظریہ اچھا تو لگتا ہے جمالیاتی نقطۂ نظر سے، لیکن ہے رجعت پسندانہ، عقل مماثلت تلاش کرتی ہے اور اس تلاش میں مختلف ثقافتوں کے درمیان مکالمے کے امکانات دیکھتی ہے۔ لیکن لیوی سٹراؤس کے ہاں "مکالمہ" ایک لایعنی چیز بن گیا ہے۔

لیوی سٹراؤس سے ملاقات کے بعد میں ایڈتھ کے ساتھ لکسمبرگ کے باغ میں سے گذرتا ہوا واپس ہوٹل پہنچا۔ لکسمبرگ کا باغ بہت دلکش مناظر لئے ہوئے ہے۔ چاروں طرف خوبصورت اور قدآور درخت ہیں اور سبزے میں ایک لاثانی تنوع ہے۔ بیچ میں ایک تالاب ہے جس کے گرد کچھ بچے کھیل رہے ہیں۔ شہر کے وسط میں اس قسم کے باغ شہریوں کو خود بخود اپنی طرف کھینچتے ہیں، بنچوں پر جوڑے ـــــ بوڑھے اور جوان جوڑے بیٹھے تھے۔ ایک گوشے میں ایک لڑکی کرسی پر بیٹھی پڑھ رہی تھی اور ایک حبشی اسے اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مس ریشماں نے کہا کہ یہاں اگر کوئی لڑکی اکیلی بیٹھی ہو تو کوئی نہ کوئی جوان لڑکا اسے تنگ کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ میں نے کہا کہ یہ آزادی کے خطرے ہیں۔ آزادی ایک فطری حق ہے، لیکن اس حق کو نبھانے کے لئے بھی انسانیت کو بہت سے دشوار مراحل سے گذرنا پڑے گا۔ اسی طرح کی باتیں کرتے ہم ہوٹل تک پہنچے۔ وہاں سے مس ریشماں

اپنے دفتر چلی گئی، اور میں کھانے کی تلاش میں۔

رات کو موسیو ورنان سے ملاقات ہوئی اور ان کے ہاں کھانا کھایا۔ بہت لطف آیا۔ موسیو ورنان ایک فاضل انسان ہے اور اس کی بیوی اس سے بھی زیادہ فاضل عورت معلوم ہوتی ہے وہ (ASSYRIOLOGY) کی ماہر ہے۔ اس نے مجھے اپنی تحقیقات کے بارے میں بہت سی دلچسپ باتیں بتائیں۔ ایک کتاب جس کا نام "یونانی عہد میں جنگ کا تصور" ہے اس کی اور چند اور لوگوں کی تصنیف ہے ـــــ اس نے کہا کہ بادشاہوں کی طاقت کے مختلف اظہار ہوتے ہیں۔ شیر اور بیل اس طاقت کی علامتیں ہیں۔ موہنجو داڑو میں جو شیر اور بیل ہیں وہ بھی اسی ملوکیت کا اظہار ہے۔ ان کا ڈرائنگ روم دنیا کے مختلف نوادر سے بھرا پڑا ہے۔ کہیں مہاتما بدھ کا مجسمہ ہے، کہیں انڈونیشیا کے ایک کچھوے کی شبیہہ جو تانبے سے بنائی گئی ہے اور کہیں چینی پنکھا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

۲ مئی ۱۹۷۴ء

دو دن گذر گئے لیکن کچھ لکھنے کی فرصت نہ ملی، نہ ہمت میسر آئی۔ آج گرزول سے واپسی پر ریل گاڑی میں بیٹھ کر چند یادیں محفوظ کر رہا ہوں۔ ریل گاڑی میں میرے سامنے میری راہنما مس ریشماں بیٹھی ہے، اور میرے داہنے ہاتھ پر ایک معمر خاتون، اور اس کے سامنے غالباً اس کی جواں سال اور حاملہ لڑکی۔ یہ دونوں خواتین بہت خوش مزاج واقع ہوئی ہیں۔ بات بات پر ہنستی ہیں اور بیٹی ایسی خندہ دہن ہے کہ ماں اس کی ہر بات کو لطیفہ سمجھ کر کھل کھلا دیتی ہے۔ ماں کے چہرے سے ایک خاص قسم کی درشتی جھلکتی ہے جو عورتوں کو بہت بدصورت بنا دیتی ہے۔ بیٹی میں وہ نرمی نظر آتی ہے جو نسوانی حسن کی رونق بڑھا دیتی ہے۔ لیجیئے ماں نے کتاب پڑھنی شروع کر دی اور بیٹی ایک بہت بڑا رنگین اخبار کھول کر بیٹھی ہے۔ مس ریشماں نے بھی کتاب تان لی ہے۔ گاڑی سے باہر فرانس کے جنوبی حصے کے مناظر نظر آتے ہیں جو اس گاڑی کے مخالف رخ کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ زیر و بم سی مترنم وادیاں جن پر سبزہ بچھا ہے اور کہیں کہیں پھولوں کا سیلاب ہے جو دھوپ سے دہک رہا ہے۔ نیلگوں آسماں پر جس پر سمندر کا دھوکا ہوتا ہے سیاہ بادلوں کے ٹکڑے آویزاں ہیں اور ان بادلوں کے پردے میں سورج نے آگ جلائی ہوئی ہے۔

فرانس کا فن تعمیر ہمارے لئے نہایت اجنبی اور منفرد ہے۔ بعض شہروں میں ایک ہی رنگ کی کئی عمارتیں نظر آتی ہیں اور عمارت چاہے کتنی ہی پرانی اور بوسیدہ کیوں نہ ہو جائے، اسے گراتے نہیں، کسی نہ

کسی طرح اسے قائم رکھتے ہیں۔ ابھی ابھی گرینوبل میں ستاندال کے دادے کا مکان دیکھا۔ جوں کا توں کھڑا ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ ابھی دیواریں سر پر آگریں گی اور چھتیں دھڑام دھڑام ڈھے کر مکان کے رہنے والوں کو زندہ دفن کر دیں گی، لیکن ابھی تک اس مکان کو گرانے اور اس کی جگہ بہتر مکان بنانے کا خیال کسی کو نہیں آیا۔

۲ر مئی ۱۹۷۴ء

چند سطریں گاڑی میں لکھی گئیں۔ رات جب پیرس واپس پہنچے تو میں نے ایک ڈرگ سٹور میں کھانا کھایا۔ میں MENU سے بچا کچھ تھا مگر سامنے کچھ اور ہی آگیا۔ زبان نہ سمجھنے سے بہت کوفت ہوتی ہے۔ بہر حال میں نیم فرانسیسی اور نیم انگریزی لڑھکا دیتا ہوں، اور اکثر اس آدھے تیتر اور آدھے بٹیر سے کام چل جاتا ہے۔ ہوٹل میں واپس آتے ہی سو گیا۔ اور رات ایک دلچسپ خواب آیا۔

(کوچہ چابک سواراں لاہور (ملک کرم الٰہی مرحوم کے مکان کے سامنے)

: پنجاب یونیورسٹی کے بہت سے لڑکے ہنگامہ کر رہے ہیں۔ کچھ چھتوں پر چڑھے ہوئے ہیں اور کچھ گلی میں کھڑے ہیں اور تشدد آمیز انداز میں چلّا رہے ہیں کہ وائس چانسلر کو بلاؤ۔ میں اپنے گھر سے نکلتے ہوئے ڈرتا ہوں لیکن پھر ہمت کر کے ہر چہ بادا باد کہہ کر دل کو دلاسا دیتا ہوں اور وہاں پہنچ جاتا ہوں جہاں لڑکے جمع ہیں۔ ان سے غصے میں بات چیت کرتا ہوں۔ میں شروع میں ڈرتا ہوں کہ اوپر چھتوں سے اینٹیں نہ برسائیں لیکن لڑکے خلاف توقع خاموش ہو جاتے ہیں۔ میں خوش ہوں کہ لڑکوں پر میری باتوں کا کچھ تو اثر ہوا۔ یکا یک وہ لڑکے غائب ہو جاتے ہیں، اور ان کی جگہ میرے پرانے طالب علم میرے ساتھ باتیں کر رہے ہیں۔ دو مجھے یاد ہیں، باقی اور تحسین۔ میں خاص قسم کی خود اعتمادی محسوس کر رہا ہوں۔

وقت : غالباً سہ پہر کا ہے۔ وقت ایک مسئلہ بنا ہوا ہے ـــــ کم از کم میرے لئے ـــــ وقت کیا ہے؟ ابھی میں گاڑی میں تھا اور اب میں یہاں پیرس میں بیٹھا روزنامچہ لکھ رہا ہوں۔ یہ لکھنا بھی وقت ہی میں ممکن ہے۔ گاڑی میں بیٹھنے والا، روزنامچہ لکھنے والا اور اس سے پہلے کئی سال بچہ پھر جوان، پھر شوہر اور پھر والد، معلم، پرنسپل، وائس چانسلر...... وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب ایک میں ہوں۔ کیا یہ میں وقت کے ساتھ نہیں بدلتا؟ لیکن یہ "میں" بھی مر جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں بھی مر جاؤں گا۔ لیکن میں، اپنی موت کا تصور نہیں کر سکتا۔ اپنی موت استنباط ہے، ادراک نہیں۔ کیا "میں" کبھی عدم میں بھی داخل ہوگا، لیکن "میں" کا شعور بقا کا شعور ہے۔ کروڑوں انسان اس دنیا میں آئے اور بقا کا دھوکا کھا کے زمین کو آباد کر گئے ثقافتیں

نہذیبیں بنا گئے۔ آج ہم ان کے قصے کہانیاں کہتے ہیں سنتے ہیں اور وقت کے احساس کو وقت کی تاریخ رکھے زیادہ خوشگوار بناتے ہیں۔

اکثر لوگ جب خواب بیان کرتے ہیں تو خواب کے واقعات کو تو بیان کرتے ہیں لیکن خواب میں وقت کو ن نہیں کرتے۔ خواب کے واقعے کی تاریخ نہیں پوچھتے کہ یہ واقعہ کس دن، کس سن میں ہوا۔ اگر یہ صحیح ہے داخلی نقطۂ نظر سے، خواب کا ہر جزو، خواب دیکھنے والے کی شخصیت کا ایک پہلو ہے تو خواب کا وقت بھی ن شخصیت کا ایک پہلو ہونا چاہیئے، خواب میں مکان دیکھوں تو مکان میری شخصیت کا ایک اظہار ہے اور اب کا پیغام اس وقت سمجھ میں آتا ہے جب میں مکان سے مکالمہ قائم کروں۔ اس طرح میں خواب کے قت سے بھی مکالمہ کر سکتا ہوں تاکہ اس کا پیغام مجھ تک ـــــ میری "انا" تک پہنچ جائے۔

فریڈرک پرلز نے اس اصول کی جو ایک مثال دی ہے وہ مجھے بہت پسند آئی ہے۔ اس کے ایک ریض نے خواب میں دیکھا کہ وہ نیویارک کی سنٹرل پارک میں ٹہل رہا ہے۔ پرلز نے کہا کہ تم سنٹرل پارک ہو اب اپنے آپ سے مکالمہ کرو۔ چنانچہ اس نے سنٹرل پارک بن کر کہا کہ "میں لوگوں کے پاؤں تلے روندا جاتا ہوں اور لوگ مجھ پر تھوکتے تھے"۔

خواب کے اجزا کو اگر شخصیتیں سمجھا جائے اور ان میں مکالمے کروائے جائیں تو وہ خوابیدہ قوتیں جو ہر انسان میں مضمر ہیں، آگہی میں سماجانے پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ خواب کا ہر جزو ایک شخصیت ہے، ہنگامی اور بدلتی ہوئی شخصیت، جس کے ساتھ مکالمے اور رابطے سے انسان کی پوری شخصیت میں حرکت اور تغیر کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

۴ مئی ۱۹۷۴ء

رات کے ساڑھے دس بجنے والے ہیں۔ ابھی ابھی موسیو ورناں کے ساتھ کھانا کھا کر آیا ہوں۔ کھانے پر جارج فشر اور اس کی بیوی، تاریخ اسلام کا ایک ماہر، ایک نوجوان جو فرانس کے دفتر خارجہ کا ملازم ہے، موجود ہے۔ کھانے پر بہت دلچسپ باتیں ہوئیں۔ فرانس اور پاکستان کی جو باہمی کمیٹی ہے۔ اس کے لئے موسیو ورناں نے یہ موضوع تجویز کیا۔ "روایت اور جدید تہذیب کے تقاضے" اس موضوع پر سب نے اتفاق کیا۔ پاکستان کے علماء (محض عالم کی جمع) فرانس کی تہذیب و ثقافت پر ایک سوالنامہ مرتب کریں گے اور ان سوالوں کے جواب میں فرانس کے عالم مقالے لکھیں گے، اور اسی فرانس کے علماء پاکستان کی تہذیب

ثقافت پر سوال تیار کریں گے اور ان سوالوں کی تحریک سے پاکستان کے عالم مقالے رقم کریں گے۔ پھر ایک کانفرنس جو پہلے پیرس میں ہوگی اور بعد میں پاکستان کے کسی شہر میں، وہ مقالے پڑھے جائیں گے۔ ان پر بحث و تمحیص ہوگی اور بحث و تمحیص کے بعد وہ مقالے ایک جامع خلاصے کے ساتھ فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں شائع کئے جائیں گے اور پھر اس کتاب کا اردو ترجمہ ہوگا۔

اس سیمینار کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس میں ایک ہی موضوع پر مختلف زاویہ ہائے نظر سے اظہارِ خیال کیا جائے گا۔ معاشیات کے ماہر اسے معاشی نقطۂ نظر سے دیکھیں گے اور نفسیات کے ماہر نفسیاتی نقطۂ نظر سے پیش کریں گے۔ جدید علم کا رجحان ایک طرف تو یہ ہے کہ علم کی بہت سی شاخیں ہو گئی ہیں اور ہر شاخ کا ہر پتہ ایک علیحدہ اور مکمل مضمون بن گیا ہے۔ دوسری طرف کوئی مضمون علیحدہ نہیں رہا۔ اب ہر مسئلے کو سمجھنے کے لئے بین المضامینی نقطۂ نظر کے نشوونما کی ضرورت ہے ورنہ ہر مطالعہ ناقص اور ادھورا رہ جاتا ہے۔ روایت بھی ایک جامع تصور ہے لیکن آپ اسے معاشی، تاریخی، ثقافتی اور نفسیاتی نقطہ ہائے نظر سے دیکھ سکتے ہیں۔ ہر نقطۂ نظر دوسرے نقطۂ نظر کی تکمیل کرتا ہے کیونکہ ہر نقطۂ نظر کچھ "خلا" چھوڑ دیتا ہے اور اس کی اپنی بلوغت کے لئے یہ لازمی ہے کہ خلا کو کوئی اور نقطۂ نظر پُر کرے، انسان کو معاشی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو وہ مختلف طبقوں میں بٹ جاتا ہے۔ حیاتیاتی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو وہ بندر کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے دیکھیں، تو وہ جبلی محرکات اور روحانی تقاضوں کی ایک آماجگاہ ہے جس کی زندگی یہی کشمکش اور تصادم ہے اور وہ بہتر انسانیت کی طرف بڑھتا ہے۔

موضوع بھی دلچسپ ہے اور سیمینار کا مجوزہ انداز بھی بہت نادر ہے۔ دیکھیں یہ سیمینار کیسے رہتا ہے؟ مجھے قوی امید ہے کہ سیمینار اچھا رہے گا۔

موسیو ورتان کی دعوت ختم ہوئی AUR EVOIR کے کورس (CHORUS) میں دوستوں سے رخصت ہوا۔ اور موسیو ورتان، ان کی بیوی اور بھائی مجھے ہوٹل تک چھوڑنے آئے۔ میں سونے سے پہلے اس سیمینار کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہا۔ تجزیاتی غور کم تھا اور خواب زیادہ —— بہرحال میں جلدی سو گیا —— اتوار کی صبح کو موسیو بوسکے سے ملنا تھا لیکن پروگرام میں اُلجھاؤ کی وجہ سے مل نہیں سکا۔ اس کی بجائے غیور الاسلام کے ساتھ پیرس کے میلے میں پہنچ گیا۔ اتنی زیادہ چیزیں دیکھ کر میری نظریں تھک جاتی ہیں، الجھن ہوتی ہے کہ جلدی یہاں سے نکل جاؤں۔ یہی حال میرا نیویارک میں ہوا تھا۔ ٹائم سکوئر سے ہمیشہ بھاگنے کو جی چاہتا تھا۔ مجھے

اشیا کے اژدحام میں اپنی کم قدری کا احساس ہوتا ہے اور اس کثرت سے وحشت ہوتی ہے جو وحدت کے رشتے میں پروئی نہیں جا سکتی۔ میں مؤرخوں کے عام اندازِ تحریر کی وجہ سے محض تاریخ میں کبھی دلچسپی نہیں پیدا کر سکا۔ جب تک تاریخی واقعات کی کڑیاں سلسلہ نہ بنائیں، میں ان میں دلچسپی نہیں لے سکتا۔ اسی لئے تاریخ سے زیادہ فلسفۂ تاریخ سے شغف ہے۔ سوانح عمریاں اچھی لگتی ہیں، خود نوشت سوانح عمریاں پسند نہیں آتیں۔ پلوٹارک کردار نگاری کس قدر حسین اور سحر آفریں ہے۔ گبن کا شاہکار، روم کا زوال اس ایک نادر کتاب ہے کہ اس کے ہاں تاریخ ایک تمثیل بن جاتی ہے جس میں وہ ہر شخصیت کا پہلو وار تجزیہ کرتا ہے گبن محض مؤرخ نہیں مفکر بھی ہے اور تقریباً ہر پیرے میں کوئی نہ کوئی فلسفیانہ بصیرت بیان کرتا ہے۔ جس سے عقل میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ ابن خلدون، کارل مارکس، ٹائن بی اور ٹریولر رد پڑھ کر خبر و نظر دونوں مضطرب ہوتی ہے اور دونوں تسکین پاتی ہیں میلے سے میں جلدی بھاگ نکلا رات کو (BOULVARD ST. GERMAIN) کی سیر کی اور ایک کیفے میں جا کر کھانا کھایا —— رات کے دو بجے تک پڑھتا رہا اور تحقیق و تجسس کے نئے منصوبے بنا کر سو گیا۔

۶ مئی ۱۹۷۴ء

پیر کی صبح کو آیڈتھ آئی اور مجھے فرانس کی وزارت خارجہ کے ایک نمائندے کے پاس لے گئی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ باتوں باتوں میں میں نے یہ بھی کہا کہ موسیو مور کے یورپ میں جنون کی تاریخ لکھ رہے ہیں، کیا ہی اچھا ہو اگر ہم ایشیا میں جنون کی تاریخ میں ان کا تعاون کریں یا وہ ہمارا تعاون کریں۔ یہ بات فرانسیسی نمائندے کو بہت پسند آئی اور میں نے سوچا کہ یہ ایک انقلابی منصوبہ رہے گا۔

دو بجے ہم مہاتما گاندھی روڈ پر واقع ایک لوک کلچر کے عجائب گھر میں گئے۔ فرانس کے ہر خطے پر شہر سے وہاں کی تاریخی اور روایتی اشیا جمع کی گئی ہیں اور انھیں تاریخی اعتبار سے نہیں بلکہ مماثلت کے لحاظ سے یکجا کیا گیا ہے۔ کھیتوں میں ہل چلانے، بار برداری، مویشی پروری وغیرہ کے متعلق بہت سے اوزار جمع کئے گئے ہیں۔ انھیں باہمی مشابہت کی بنیاد پر ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کلچر میں سب کچھ آجاتا ہے خطاطی موسیقی، مصوری، طب وغیرہ وغیرہ۔

غرضیکہ وہ ہر چیز جو کسی کلچر کی ساخت کا جزو ہے اس میں شامل کر دی جاتی ہے۔ یہ عجائب گھر دیکھ کر مجھے اپنے ہاں فن خطاطی کے انحطاط کا شدید احساس ہوا۔ اگر یہ فن محض عجائب گھروں کی زینت ہی بنا رہا تو

اس کے بہترین نمونے یکجا کر لینے چاہئیں یا یہ کہ اس کی باقاعدہ تربیت نیشنل کالج آف آرٹس میں ہونی چاہیئے ورنہ یہ فن ماضی کے گمنام دفینوں میں کھو جائے گا۔ ہم یہ عجائب گھر محض اس لئے نہیں دیکھتے کہ ماضی کے عجائب و غرائب کو دیکھیں اور محض تماشائی کی طرح اس زمانے کے فنون کی داد دیں۔ بلکہ اس لئے دیکھتے ہیں اور یہی بنیادی بات ہے کہ ان فنون کے ساتھ اپنا ثقافتی تعلق پیدا کریں۔ یہ تعلق ڈھل کر ہمارے ہنگامی شعور میں کوئی صورت اختیار کرے۔

ہر ثقافت کی ایک ساخت ہوتی ہے لیکن یہ ساخت کسی قطعی خود اختیاری کی حامل نہیں ہوتی بلکہ اس کے رابطے دوسری ثقافتوں کے عروج و زوال سے قائم ہوتے ہیں اور اس ساخت کا ایک تاریخی پس منظر بھی ہوتا ہے۔ اجتماعی اور معاشی اور سیاسی حالات اس کے قیام کے بہت حد تک ذمہ دار ہوتے ہیں۔ یہ عجائب گھر اور اس کے متنوع اجزا کو دیکھ کر ایک نئی دنیا میں داخل ہونے کا احساس ہوا۔ گویا یہ چھوٹی چھوٹی گھریلو چیزیں جنھیں ہم فقط استعمال کرتے ہیں اور جن کا ادراک ایک چیز کا ادراک ہوتا ہے کس طرح ایک کلچر کے وسیع سانچے میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ جمالیاتی تسکین کچھ اور اصولوں سے بھی پیدا ہوتی ہے۔

ہمارے ہاں ضرورت ہے قومی تشخص کی شناخت کی۔ جہاں تک تشخص کا تعلق ہے اس کی تہہ میں نو آبادیاتی کم قدری ذات کا احساس ہے۔ اگر ہم کبھی اپنے تحت اللسان الفاظ کو سنیں جسے صوفیائے کرام نے حدیث النفس کہا ہے تو ہم پر یہ کھلے گا کہ ہم اکثر و بیشتر اپنے آپ کو کم قدر سمجھتے ہیں اور اپنے آپ سے ایسی باتیں کرتے ہیں جن میں تحقیر ذات کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ غیر متعین تشخص کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ سے یہ کہہ سکے:

(۱) میں زندہ ہوں۔

(۲) میں ایک انسان ہوں۔

(۳) بحیثیت ایک انسان کے میری ایک بنیادی قدر ہے ـــــ یا ـــــ بحیثیت ایک انسان کے مجھ میں ایک کبریائی شرر ہے۔

یہ بنیادی قدر زندگی کی طرح گھٹتی بڑھتی نہیں، یہ نہیں کہ اگر میں کوئی اچھا کام کروں تو میری قدر بڑھ جائے گی۔ اور اگر برا کام کروں تو کم ہو جائے گی یا یہ کہ اگر میں ذہین ہوں تو میری قدر زیادہ ہے اور اگر کند ذہن ہوں تو قدر کم ہے۔ یہ سب خارجی قدریں ہیں۔ میرا انسان "ہونا" ہی ایک بنیادی قدر ہے۔ مجھ میں

ہر وقت بدلنے کی اپنی شخصیت کو نئے تجربوں سے آشنا کرنے کی اور ان تجربوں کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کی صلاحیت موجود ہے۔ ایک عورت ایک ماہر تجزیہ نفس کے پاس اپنے شوہر کی برائیاں کرتی رہی۔ جب دل کا غبار اچھی طرح نکال لیا تو ایک وقفے کے بعد کہنے لگی، "وہ اچھا بننے کی کوشش ضرور کرتا ہے" یہ ایمان کہ ہر شخص اچھا، بہتر بننے کی کوشش ضرور کر سکتا ہے، اس بنیادی قدر پر ایمان ہے۔

(۴) مجھے اپنا آپ بننے کے لئے کسی کی محبت یا مقبولیت نہیں چاہیئے۔ ایک بالغ انسان کی حیثیت سے میرا کام احترام ذات یا عزت نفس پیدا کرنا ہے اور دوسروں سے محبت کرنا ہے، محبت مانگنی نہیں، دوسروں کی محبت کی احتیاج نہیں پیدا کرنا۔ بلکہ دوسروں کو محبت دینا ہے۔ کسی کی محبت میسر آجائے تو مسرت کا باعث ہے لیکن اگر نہ آئے تو اس سے کوئی قیامت نہیں آجاتی، محبت کی طلب اور احتیاج سے پریشانی، اپنی ذات کی کم قدری، ذہنی بیماریاں اور جذباتی الجھاؤ پیدا ہوتے ہیں۔

رشک کی کیفیت، حسد کی کیفیت سے مختلف ہے، رشک کسی دوسرے شخص کی خوشی برداشت نہ کرنے کا نام ہے، لیکن حسد تین اشخاص کے رشتے کا نام ہے۔ اگر دو شخص ایک ہی محبوب کو چاہتے ہیں یا ایک چیز کو پسند کرتے ہیں تو ان کا باہمی رشتہ حسد ہوتا ہے۔ رشک کی کیفیت یہ ہے کہ کسی دوسرے انسان کو خوش رو، دولت مند، ہنستے کھیلتے، زندگی کی لذتوں سے متمتع ہوتے دیکھ کر جل جاتا ہے اور دل میں یہ خواہش کرتا ہے کہ کسی طرح اس کی خوشی اس کی کامیابی کو چھین لیا جائے لیکن جو شخص ایسا کرتا ہے اس کے اپنے اندر بھی خوش ہونے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے لیکن وہ اسے اجتماعی ضمیر کے بوجھ تلے دبا دیتا ہے۔ اگر وہ اس دباؤ کا شعور حاصل کرے اور چن چن کر ان اثرات کا تجزیہ کرے جنھوں نے اسے خوشی اور مسرت سے باز رکھا ہے تو اس کے دل میں بھی خوشی کے چشمے پھوٹیں گے اور دوسروں کا رشک جاتا رہے گا۔ جب بھی میں کسی شخص پر اخلاقی حکم لگاتا ہوں۔ اس کی کسی حرکت پر اسے برا بھلا کہتا ہوں تو داخلی طور پر میں اپنی آرزوؤں پر تنقید کر رہا ہوتا ہوں جو دوسروں کو جا بجا برا بھلا کہتا رہتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو بھی کوستا رہتا ہے دوسرے لوگوں کی خوشی کو میں جبھی برداشت کر سکتا ہوں جب میں اپنی خوشی کی صلاحیت کو قبول کر لوں۔

اس طرح حسد میں یہ خیال عاشق کے لئے سوہان روح بن جاتا ہے کہ اس کا محبوب کسی اور عاشق کی صحبت میں بیٹھے۔ ذہن میں طرح طرح کے تصورات آتے ہیں کہ رقیب اور محبوب رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ لیکن ان تصورات کی تہہ میں اپنی کم قدری کا احساس ہوتا ہے۔ اگر محبوب آپ کو پسند نہیں کرتا تو یہ اس

کا مسئلہ ہے۔ کسی محبوب کو کھو دینا اپنے آپ کو کھو دینے سے کہیں بہتر ہے۔ اگر انسان اپنی اساسی قدر پہچان لے اور یہ سمجھ لے کہ محبوب کی محبت نہ ملنے سے قیامت نہیں آ جاتی، حشر نہیں برپا ہو جاتا، تباہی نہیں آ جاتی، بلکہ یہ محض ایک حادثہ ہے جس سے میری اساسی قدر میں شمہ بھر بھی فرق نہیں آئے گا تو اس خیال کو بار بار ذہن میں لانے سے حسد کا جذبہ اپنی شدت سے محروم ہو جائے گا، محبوب کی جدائی غم انگیز تو ہے مگر کوئی بربادی نہیں کہ انسان اس کے احساس سے ہر وقت پریشان رہے۔

ارادی طور پر ہمیں یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ میں ایک مختلف شخصیت ہوں۔ میرا ایک علیحدہ تشخص ہے محبوب کی شخصیت ایک الگ شخصیت ہے۔ اس کے تقاضے اور ہیں اور میرے تقاضے اور۔ اس سوچ کی تکرار سے وہ لاشعوری بندھن ٹوٹ جاتا ہے جس کی وجہ سے محبوب سے جدائی المناک ہو جاتی ہے یعنی IDENTIFICATION کو دانتوں سے چبا دینا چاہیئے۔ یہ کام ہے تو مشکل، لیکن اسے نہ کرنا مشکل تر ہے۔

وہ باتیں جو ذہن میں خلل پیدا کرتی ہیں اور اکثر و بیشتر لوگوں کو پریشان رکھتی ہیں، ان میں ایک مفروضہ یہ بھی ہے کہ جو باتیں ہو چکی ہیں ان پر ندامت کا احساس پیدا ہو اور جی چاہے کہ کاش ایسا نہ ہوتا، لیکن یوں ہوتا تو کیا ہوتا؟ کی تکرار سے الم کا احساس بڑھتا ہے اور انسان تخیل کی دنیا میں ماضی کے گذرے ہوئے واقعات کو اُلٹتا پلٹتا رہتا ہے۔ یہ ایک غیر معقول مفروضہ ہے گویا آپ بیٹھے ہوئے واقعات کو بدل رہے ہیں۔ اس مفروضے میں ایک قباحت یہ بھی ہے کہ آپ اس فریب میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ میں وقت کو تبدیل کر سکتا ہوں۔ صحیح مفروضہ یہ ہے کہ آپ سے جو کچھ بھی ہوا ہے وہ اٹل ہے اور اس کے آپ ذمے دار ہیں "یوں ہوتا تو کیا ہوتا" کا احساس انسانی ذمہ داری کے احساس کو کم کرتا ہے اور مشیئتِ ایزدی کے خلاف جارحانہ بغاوت کی علامت ہے۔

اسی کے ساتھ ایک اور مفروضہ وابستہ ہے۔ یہ غیر معقول مفروضہ کہ محض فکر و تشویش سے حالات بدل جائیں گے، لیکن فکر کرنے سے حالات نہیں بدلتے، اس مفروضے کی ضد کی تکرار کرنا چاہیئے۔ کہ فکر کرنے سے حالات نہیں بدلیں گے بلکہ تشویش کی حالت میں انسان میں وہ قابلیت نہیں رہتی کہ وہ حالات کا پوری طرح محاسبہ کر سکے۔ حالات عقل و عشق کی راہنمائی ہی میں بدل سکتے ہیں۔

شب جائے کہ من بودم

شورش کاشمیری

۵ رنومبر (۱۹۶۹ء) کو صبح سوا نو بجے جہاز کو کراچی سے جدہ کے لئے اُڑنا تھا لیکن پونے گیارہ بجے اُڑا اور بحرین میں ٹھہرتا ہوا وہاں سے ایک گھنٹہ سینتالیس منٹ میں جدہ کے ایئرپورٹ پر پہنچ گیا۔

پچھلی رات میں نے کراچی ایئرپورٹ کو مڑتی ہوئی سڑک کے سامنے واقع ہوٹل ڈی فرانس میں کاٹی۔ ہوٹل ڈی فرانس میرے مذاق اور میلان کے منافی تھا لیکن پی آئی اے کے رابطہ افسر کا چاؤ تھا اور مجھے صرف رات ہی بسر کرنا تھی۔ صبح سویرے اٹھا غسل کیا نماز پڑھی، احرام باندھا۔ قدرے جھجک محسوس ہوئی کہ اچھا خاصا آدمی لپٹ کے رہ جاتا ہے لیکن احرام باندھ چکا تو کایا ہی پلٹ گئی۔ محسوس ہوا گویا دنیا ہی دوسری ہے۔ ایک اہتزاز خون میں گردش کرنے لگا۔ ایک نشہ، ایک سرور رگ و ریشہ میں دوڑ گیا۔ ایئرپورٹ پہنچا تو وہاں بارہ چودہ آدمی جن میں اکثریت اٹھارہ سے بائیس برس کے مسین نوجوانوں کی تھی، احرام باندھے موجود تھے۔ میں نے اپنے دل کو ٹٹولنا چاہا کہ احرام باندھنے سے پہلے اس کو جھجک کیوں ہوئی۔ پھر خود ہی اس خیال سے اطمینان ہو گیا کہ عشق کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اس قسم کی جھجک عموماً اُبھرتی ہے۔ ممکن ہے یہ جھجک اس لئے پیدا ہوئی ہو کہ احرام کا بھی ایک مطالبہ ہے۔ دل میں غیر اللہ ہو، خوف یا شرک دونوں حالتوں میں احرام کی غیرت ان کے اخراج کا مطالبہ کرتی ہے۔ "لبیک اللھم لبیک لبیک لا شریک لک لبیک ان الحمد والنعمۃ لک والملک، لا شریک لک" کہنا آسان نہیں۔ جب تک دل خوف اور شرک سے دُھل نہ جائے احرام سے جو شخصیت پیدا ہوتی ہے وہ اُبھرتی نہیں مدھم رہتی ہے۔ میرا دل خوف اور شرک دونوں سے تہی تھا اور ہمیشہ ہی رہا لیکن جھجک پیدا ہوئی تو شاید اس لئے کہ احرام ہر شخص باندھ لیتا ہے لیکن اس کی رفعت ہر شخص کے حصے میں نہیں آتی۔ بہرحال احساس کی ایک لہر تھی، آگہ کی

چھپکی میں نکل گئی۔ زندگی خوشیوں اور غموں کا مجموعہ ہے۔ بعض غم مسرت افزا ہوتے ہیں بعض خوشیاں غم افروز لیکن اس خوشی کے بے پناہ ہونے میں رتی بھر شک نہ تھا۔ یہ پارس کے سونے کی طرح خالص خوشی تھی۔ اس میں کوئی ملاوٹ اور کوئی آمیزش نہ تھی۔

عشق کی محرومی یہ ہے کہ زبان نہیں رکھتا۔ ہم اس کی ترجمانی کے لئے جو الفاظ بولتے ہیں، وہ اس کے ترجمان نہیں ہوتے، جذبات کا ادھورا عکس ہوتے ہیں۔ جس طرح بعض چیزوں پر کاغذ کی تہیں چڑھا دی جاتی ہیں، اسی طرح عشق الفاظ کی تہوں میں لپٹ کر ملفوف ہو جاتا ہے۔ اس سے بڑی فخر و مسرت کی بات کیا ہوتی کہ غلطی ہوتی اور میں روانہ ہو گیا۔

دل اور جہاز دونوں اڑتے چلے جا رہے تھے۔ بحرین کے ہوائی اڈے پر جہاز ۴۵ منٹ ٹھہرا۔ یہاں سے عرب شروع ہو جاتے ہیں لیکن انگریزوں کے تصرفات نے بحرین کو تاراج کر دیا ہے۔ ایئرپورٹ پر شراب کی ایک کھلی دکان ہے۔ ادھیڑ عمر کی ایک ولندیزی عورت اس کی مہتمم ہے۔ وہ ہر نوعی شراب کی بوتلوں کے پوش منظر میں کھڑی مسافروں کو گھورتی اور پچکارتی ہے۔ فربہ اندام جیسے سفید تھیلے میں گودا بھرا ہو چہرے پر پیلے رنگ کی بندیاں ہیں جیسے کسی سفید کاغذ پر تجریدی آرٹ کی مشق میں سیاہی کے قطرے ٹپک گئے ہیں۔ یہ عورت غالباً ان بوتلوں کے ساتھ ہی درآمد کی گئی ہے۔ بحرین عربوں کے حاشیہ میں یورپی تہذیب کا دم واپسیں ہے۔ استعمار نے اس کا خون نچوڑ لیا اور اس کی جگہ شراب دے گیا ہے۔

پاکستان کے ساحل سے حجاز کے ساحل تک عدن، ابوظہبی، کویت، بحرین، مسقط وغیرہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں نفس کی حکمرانی ہے۔ ان کے والی شکروں سے شکار کرتے ہیں۔ ہر نوعی شکار پرندوں سے لے کر عورتوں تک کا شکار، ان کے افراد مسلمان کہلانے کے باوجود قبل از اسلام کے ایام جہالت میں زندگی گزار رہے ہیں اور اپنے حقیقی شرف کو بھول چکے ہیں۔ ان کے لئے تیل کے چشموں نے دولت کے پٹ کھول دیئے ہیں۔ ان کی زمینیں دولت اگلتی اور نفس عیش مانگتے ہیں۔ ان کے حرم حسن و جوانی کے مذبح ہیں۔ یہ زندگی گزارنے کے لئے نہیں، زندگی نچوڑنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔

میں نے بحرین کے ہوائی اڈے پر کسی عرب کے چہرے کو شگفتہ نہیں پایا۔ وہ رونق جو حضرت بیٹھ

۔ان کے چہروں سے اُڑ چکی ہے۔عرب دنیا میں امیروں اور غریبوں کے درمیان واضح طور
ل کھنچی ہوئی ہے۔امراء زندگی گزارتے ہیں اور غرباء کو زندگی بسر کرتی ہے۔تیل کی دولت نہیں ان
رتی ہیں۔میں نہیں کہہ سکتا عرب کا نیا خون کب تک اسلام کا ساتھ دے گا اور اسلام کب
ں ساتھ لے کر چلے گا۔وہ قیامت ضرور آنی چاہیئے اور آکر رہے گی جس کی خبر قرآن نے
۔۔یہ تمام اس کی نشانیاں ہیں جو بحرین سے جدہ تک پھیلی ہوئی ہیں۔

ٖحرین سے اُڑتے وقت تھوڑی دیر تک میں غیر متوازن خیالوں کی کشمکش میں اُلجھا رہا افکار
ع و عروب کا ایک عجیب سلسلہ تھا جس نے میرے دل و دماغ کو بوجھل رکھا تھا۔لیکن جلد ہی
و پر میرا عشق غالب آگیا۔

یرہوسٹس نے کہا تھوڑی دیر میں ہم جدہ ایئرپورٹ پر اُترنے والے ہیں۔اُمید ہے آپ کا سفر
وار گزرا ہوگا۔میں نے جھروکے سے باہر جھانکا تو پہاڑی سلسلے کالکوں کی طرح پھیلے ہوئے
۔تھے اور پھر تھوڑی سی دیر میں ہم جدہ ایئرپورٹ پر اُتر گئے ——— لبیک اللھم لبیک
ٹ وغیرہ کی چیکنگ تو فوراً ہوگئی تکلیف نہ تاخیر لیکن کسٹم والوں نے دو گھنٹے تک روکے رکھا۔
ے ہاں سب سے خطرناک چیز کتابیں، اخبار اور رسالے ہیں۔اصل دقت زبان کی ہے۔
اللہ کا اُردو ترجمہ بھی روک دیا جاتا ہے لیکن لبنان کے عربی جرائد و رسائل بالخصوص جن
ّوا کے بیٹوں اور زلیخا کی ہم نشینوں کا نخرہ نمایاں ہوتا ہے، ہر قدغن سے آزاد ہیں، وہ
نہ آتے اور روزانہ بکتے ہیں۔حرمین شریفین کے آس پاس کی دکانوں میں بکتے ہیں اور
یداری عورتوں میں بکثرت ہوتی ہے۔ان برہنہ و نیم برہنہ رسالوں پر کوئی پابندی نہیں پابندی
لٹریچر پر ہے جس پر یقین کیا شبہ ہو کہ اس میں مزاج شاہی پر چوٹ کی گئی ہے ——— ؎

نازک مزاج شاہاں تابِ سخن ندارد

شراب، ہیروئن اور کتاب تینوں پر کسٹم کی نگاہیں رہتی ہیں۔لطف یہ کہ کتاب یا رسالہ کسٹم سنسر نہیں
ا۔وہ محکمہ تعلیم کے پاس جاتا اور محکمہ تعلیم کے ارکان کی مرضی پر ہے کہ وہ مہینوں اور ہفتوں میں سنسر
یں۔چاہے روک لیں چاہے پاس کر دیں۔میں اپنے ساتھ علامہ اقبالؒ کے خطبات و کلمات کا مجموعہ
مانِ اقبالؒ" لے گیا تھا لیکن روک لیا۔میں پندرہ روزہ کر واپس آگیا "فیضانِ اقبالؒ" سنسر نہ ہو سکا

کتابیں ان کے سنسر آفس میں کوڑے کرکٹ کی طرح پڑی رہتی ہیں، قرآن پاک کے ترجمے بھی ان میں گڈمڈ ہوتے ہیں۔ کوئی تخصیص یا کوئی احترام نہیں، بس جو شخص وہاں بیٹھا ہے اس کی مرضی کا نام سنسر ہے اور اس کی فرصت کا نام وقت۔ میں نے کسٹم کے مہتمم سے بہتیرا کہا کہ ان میں کوئی بات معترض نہیں، یہ تو اس شخص کے کلمات کا مجموعہ ہے جو حجاز کے عشق میں گندھا ہوا تھا لیکن اس نے چھٹے پر ہاتھ ہی نہ دھرنے دیا۔ آخر "فیضانِ اقبال" کے تمام نسخے وہیں چھوڑے، باہر کچھ دوست انتظار کر رہے تھے اور سبھی میرے لئے نئے تھے۔ میں ان سے کبھی نہیں ملا تھا انہیں مختلف واسطوں سے ایک محبت کھینچ لائی تھی۔ ہمارے رفیقِ قلم اقبال سہیل تھے۔ اس سے پہلے انہیں دیکھا تک نہیں تھا لیکن قلم کی رفاقت نے رشتۂ خاطر پیدا کر دیا تھا۔ مختنی قامت لیکن ذکاوت میں کہسار، ملک عباس حسین جن کے نام سے یہ اوراق منسوب ہیں الخبر (ظہران) میں تھے، انہیں بھی دیکھا نہیں تھا لیکن میرے اس سفر کی دستگیری کر رہے تھے۔ ان کی طرف سے الفضل میڈیکل سٹور کے مالک فضل حق موجود تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ملک صاحب کل پرسوں تک آ رہے ہیں، آپ کے لئے پندرہ سو ریال کا ڈرافٹ بھجوایا ہے اور آپ ان کے مہمان ہیں۔ ایک ایسا دوست جس سے میں آج تک نہیں ملا تھا اس کا یہ احسان میرے لئے احسانِ ایزدی تھا۔ فضل حق کے ہمراہ ڈیرہ اسماعیل خان کے ایک نوجوان محمد اشفاق قریشی اپنی کار لے کر آئے تھے۔ راؤ محمد اختر اور ان کے بعض دوست جماعت اسلامی کی وجہ سے آئے تھے۔ ان سب دوستوں سے معانقہ اور معانقہ کیا۔ پھر اپنی بے مائگی کی سرافرازی سے خوش ہو کر ان کے ہمراہ ہو گیا۔ میرے دل کی جو کیفیت تھی قلم سے سمیٹنا مشکل ہے۔ نسیمِ حجاز سے مشامِ جاں معطر ہو رہا تھا میں بیت اللہ اور رسول اللہ کی سرزمین میں آ چکا تھا۔

ایک عام کیفے میں جو سڑک کے کنارے واقع تھا قہوہ پیا، کچھ اس میں سُرور تھا کچھ عشق نے سُرور پیدا کیا وہ آتشہ ہو گیا۔ یہ تھا آغا کے گیتی پناہ کے ہاں پہلا مشروب۔ ؎

بہ عُذر خواہیِ رنداں بادہ نوش آمد

میں ظہر کے وقت جدہ پہنچا اور عصر کی نماز بیت اللہ میں پڑھنا چاہتا تھا۔ دل مچلا ہوا تھا کہ جلد سے جلد بیت اللہ پہنچوں، ہم چاروں فوراً روانہ ہو گئے۔ موٹر فراٹے بھرنے لگی۔ مکہ مکرمہ تک دُہری سڑک ہے، ایک سے موٹریں آتی اور دوسری سے جاتی ہیں۔ وسط میں دو بازوؤں کی طرح بجلی کی

ٹیو بیں پھیلی ہوئی ہیں آزو بازو پہاڑوں کا زاویہ بنا ہوا سلسلہ ہے۔اس کے بیچوں بیچ سڑک اس طرح نکلتی ہے جس طرح کسی دوشیزہ کی مانگ نکلی ہو۔جدہ کی بھیڑ چھٹ جاتی اور روشنیوں کے آویزے ایک حد پر ختم ہو جاتے ہیں پھر پہاڑ سڑک کا ہالہ کرتے یا سڑک پہاڑوں میں بہتی ہوئی چلی جاتی ہے ۔اتنی صاف سڑک کہ ہر چیز ستھری نظر آتی ہے۔محبوب کے راستے ہمیشہ دلفریب ہوتے ہیں۔آخر تک پہاڑ ہی پہاڑ ہیں، مرصع و مسجع عبارتوں کی طرح صدیوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے گو اب منہ میں گھنگھنیاں ڈالے کھڑے ہیں لیکن کبھی گویا ہوں گے۔آدم علیہ السلام جنت سے نکلے تو سراندیپ سے ہوتے ہوتے عرب پہنچے تھے حضرت حوا کی قبر جدہ ہی میں بیان کی جاتی ہے۔اللہ کے نبیوں اور رسولوں میں سے جانے کون یہاں سے گزرا ہوگا؟ یہ پہاڑ تب سے اب تک کھڑے ہیں، چپ چاپ، جیسے یہ کہہ رہے ہوں ؎

گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

پہاڑ کیا ؟ دھرتی کے جوڑے کی گند ھاوٹ ہیں۔ان کے کئی سلسلے اور کئی نام ہیں۔جبل قائم پر گمان ہوتا ہے کہ زمین نے اپنا علم گاڑ رکھا ہے اور جبل عمامہ گویا دھرتی کے سر پر عمامہ بندھا ہو۔جدہ کے حدود سے نکلتے ہی گاؤں شروع ہو جاتے ہیں لیکن سارے راستے میں چھ سات بستیاں ہوں گی۔بحرہ ہے جہاں پولیس کی چوکی ہے اور پاسپورٹ وغیرہ کی چھان پھٹک ہوتی ہے۔اس کے بعد فاطمہ ہے، سرسبز، زرخیز کہ ساری وادی قدرتی چشموں کے پانی سے سیراب ہوتی ہے۔یہاں سبزیاں اور پھل بکثرت ہوتے اور دساور کو جاتے ہیں۔مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کا قدیمی راستہ اسی وادی سے گزرتا ہے۔حضورؐ نے ہجرت کی تو اسی راستہ سے گئے تھے۔ساڑھے تیرہ سو برس بیت چکے ہیں لیکن قدموں کی چاپ اب بھی سنائی دیتی ہے۔اس سے کچھ آگے حدہ کا گاؤں اور اس سے ملحق حدیبیہ ہے۔یہیں سے حدودِ حرم شروع ہو جاتے ہیں۔کتبہ لگا ہوا ہے کہ اس کے اندر کوئی نامسلمان داخل نہیں ہو سکتا۔ہم نے موٹر روک لی کر دو نفل پڑھ لیں۔دیہاتی انداز کی ایک مسجد جانے کس زمانے سے چلی آتی ہے۔باہر کچھ لوٹے پڑے ہیں ایک بدو لڑکا پانی لایا ہم سب نے باری باری وضو کیا، نفل پڑھے۔میں وضو کر رہا تھا بدو لڑکا ہانک پکار رہا تھا یا شیخ ——— لیکن میں یا شیخ کے سوا کچھ سمجھنے سے قاصر تھا۔فضل حق سے کہا یہ لڑکا کیا کہہ رہا ہے ؟ وہ مسکرائے اور بتایا کہ یہ کہتا ہے اے شیخ! تمہارا وضو نہیں ہوا، دائیں ٹخنے پر پانی نہیں پڑا وہ خشک ہے تر کر لو حدیبیہ کے میدان میں کھڑے ہو، یہ وہ جگہ ہے جہاں اللہ کا آخری نبیؐ اور اس کے جاں نثار

یہ وہ معاہدہ ہے جو محمدؐ رسول اللہ نے تسلیم فرمایا۔ عمرو بن سہیل نے پھر اعتراض کیا کہ ہم آپ کو پیغمبر تسلیم کرتے تو پھر جھگڑا ہی کیا تھا، اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھوائیں۔ حضورؐ نے فرمایا گو تم تکذیب کرتے ہو لیکن خدا کی قسم میں اللہ کا پیغمبر ہوں۔ حضرت علیؓ کو حکم دیا خالی میرا نام لکھو۔ علیؓ ہچکچائے وہ رسول اللہ کے الفاظ کیونکر مٹاتے۔ حضورؐ نے ان الفاظ پر خود قلم پھیر دیا۔ عمرو بن سہیل نے معاہدہ اٹھایا تو حدیبیہ کے پہاڑوں نے کہا اس کی عمر زیادہ نہیں کہاں جاتے ہو ہم اپنے دامن پر یہ الزام لینے کو تیار نہیں کہ اللہ کا آخری نبیؐ یہاں سے عمرہ کئے بغیر مڑ گیا تھا۔

حضورؐ تین دن حدیبیہ میں ٹھہرے —— مدینہ لوٹے تو راہ میں یہ سورۃ اتری۔

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا (فتح)

(ہم نے تجھ کو کھلی ہوئی فتح عنایت کی۔)

اور حدیبیہ کے پہاڑ اگلے سال سچے ہو گئے۔

ان پہاڑوں کے پیچ و خم اور ان راستوں کے زیر و بم پر انسان دنگ رہ جاتا ہے کہ چودہ سو برس پہلے وہ قافلہ گھر سے کس طرح نکلا اور کس طرح مدینہ پہنچا ہوگا۔ لیکن وہ ایک انسان کا نہیں، اللہ کے ایک پیغمبر کا سفر تھا جو آخری حجت کے طور پر مبعوث کیا گیا۔ اس کے لئے مشیتِ ایزدی نے پہاڑوں کی مسافت کو سہل اور راستوں کی مشکل کو آسان کر دیا تھا۔

میں بیت اللہ کے تصور میں اتنا گم سم تھا کہ گرد و پیش تاکنے جھانکنے کا سوال ہی نہ رہا تھا۔ لبیک اللھم لبیک کہتے ہوئے ہم کہیں آگے نکل چکے تھے۔ پوری فضا میں تکبیریں سانس لے رہی تھیں اور پہاڑوں سے ان حدی خوانوں کے لہجے سنائی دے رہے تھے جو امتدادِ زمانہ کے ساتھ واصل بحق ہو چکے تھے۔

میرے کانوں میں اَلَا یا خیمگی خیمہ فرو ہل کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ میں قرنِ اوّل میں سے گزر رہا تھا، تاریخ پیچھے کھا رہی تھی، ورق پہ ورق الٹے جا رہے تھے۔ کبھی یہ شاہراہیں پگڈنڈیاں تھیں، جنہیں بدوؤں کی نقل و حرکت نے بنایا اور قافلوں کی آمد و رفت نے سنوارا تھا۔ میں نے اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد کی مسافتوں کو یاد کیا۔ وہی انسان وہی شخصیتیں آجا رہی تھیں، جلال بھی تھا جمال بھی۔ سیدنا ابراہیمؑ اور حضرت ہاجرہؑ کس راستے سے آئے اور لوٹے تھے۔ تاریخ کی وہ صحبتیں سامنے نہ تھیں لیکن

ساتھی آ رہے تھے۔ سہیل نے بتایا کہ وہ دائیں طرف کی پہاڑیوں کے عقب میں کفارِ مکہ کا لشکر تھا اور ادھر بائیں ایک پہاڑی کے دامن میں رسول اللہ اپنے چودہ سو لشکریوں سمیت فروکش تھے۔ جہاں بیعتِ رضوان ہوئی۔ اس درخت کی جڑیں حضرت عمرؓ نے شرک کے خوف سے اکھاڑ دی تھیں، اب وہ جگہ جہاں صلح نامہ حدیبیہ لکھا گیا ایک چار دیواری میں محفوظ کر دی گئی ہے لیکن اس پر کوئی تختی یا کتبہ نہیں۔

حدیبیہ مکہ معظمہ کے پڑوس میں دس میل کے فاصلہ پر ہے گاؤں بھی ہے اور کنواں بھی، کنوئیں کی وجہ سے گاؤں کا نام پڑا یا گاؤں کی وجہ سے کنواں حدیبیہ ہو گیا بہرحال صلح حدیبیہ نے اس کو زندہ جاوید کر دیا کہ تاریخِ انسانی میں ہمیشہ کے لئے روشن ہو گیا۔

سہیل نے بتایا کہ وہ سامنے کے پہاڑوں میں حضورؐ نے مکہ سے مدینہ کا سفر اختیار کیا اور انہیں کاٹتے ہوئے وادیٔ فاطمہؓ کی سمت سے مدینہ طیبہ پہنچے تھے۔ میں نے پہاڑوں پر نظریں جما دیں اور نگاہوں سے ذرہ ذرہ کو بوسہ دیتا رہا ہر نگاہ قدم چومتی گئی اور ہر سانس میں وہ آوازیں گھلتی رہیں جو ازل سے ابد تک کے ان عظیم انسانوں کے حلق سے نکلیں اور خلق تک پہنچی تھیں۔ میں نے قرنوں کا سفر آنِ واحد میں طے کر لیا۔

عروہ قریش کے نمائندہ ہو کر آئے اور جا کر ان سے کہا میں نے قیصر و کسریٰ و نجاشی کے دربار دیکھے ہیں لیکن جو وارفتگی اور شیفتگی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ان کے ساتھیوں کو ہے وہ دیکھی نہ سنی۔ وہ بات کرتے ہیں تو ساتھی گوش بر آواز ہو جاتے، کوئی نظر بھر کر نہیں دیکھتا۔ وہ وضو کرتے ہیں تو جو پانی گرتا ہے وہ اس پر لوٹ پڑتے ہیں، لعابِ دہن گرتا ہے تو عقیدت مند چہروں اور ہاتھوں پر مل لیتے ہیں۔ قریش کہاں ماننے وہ لڑنے کی ٹھان کے نکلے اور مکہ سے باہر بلدح میں جمع تھے۔ حضورؐ نے حضرت عثمانؓ کا انتخاب کیا کہ مکہ جائیں اور قریش سے کہیں کہ ہم عمرہ کرنے آئے ہیں اس کے بعد لوٹ جائیں گے۔ وہ گئے تو افواہ اڑ گئی کہ قریش نے حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا ہے۔ حضورؐ تک خبر پہنچی تو آپ نے فرمایا خونِ عثمانؓ کا قصاص لینا فرض ہو گیا ہے۔ اس بیعت کا نام بیعتِ رضوان ہے۔ عشق نے آنکھ کھولی تو سامنے ببول کا درخت تھا اور حضورؐ ساتھیوں سے بیعت لے رہے تھے۔

خیال نے ایک اور کروٹ لی۔ معاہدہ حدیبیہ لکھا جا رہا ہے۔ حضرت علیؓ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا تو عمرو بن سہیل نے اعتراض کیا کہ باسمک اللھم، لکھیں۔ حضورؐ نے منظور فرمایا۔ حضرت علیؓ نے لکھا۔

عشق کی مشعلوں نے وجدان کے راستے روشن کر دیئے تھے اور میں دیکھ رہا تھا کہ ابراہیمؑ اور ہاجرہؓ مکہ کی پہاڑیوں کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ایک غریب الدیار قافلہ بڑھ رہا ہے ـــــ وادیٔ غیر ذی زرع کی طرف۔ خدا کا گھر بسانے، اس گھر کی نیو اٹھانے اور اس کو شکل دینے جو ابدالآباد تک آباد رہے گا جہاں خدا کے آخری پیغمبرؐ کی آخری حجت قائم ہوگی، جہاں لیل و نہار کی گردشیں تعظیماً ٹھہرا کریں گی جہاں ملائکہ کا انبوہ ہوگا جہاں رہتی دنیا تک دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں سے ایک سیکنڈ بھی بغیر طواف نہ گزرے گا، جہاں سال بھر لاکھوں انسان جمع ہوتے رہیں گے۔جہاں اس قافلہ کے پیر ہوں گے وہاں انسانوں کی سجدہ گاہ ہوگی۔

اس وادیٔ غیر ذی زرع (بنجر زمین) کو یہ شرف ہوگا کہ سب سے بڑی جلوہ گاہ بن جائے۔ کرۂ ارضی کے ہر گوشے سے انسان کھچ کھچ کے وہاں آتے ہیں۔اس کی بولی پر تمام بولیاں نثار ہوں۔ وہ کائناتِ انسانی کا مرکزِ ثقل ہو۔ وہ اسلام کا مولد، رسالت کا وطن اور قرآن کا مہبط قرار پائے۔ اس بنجر زمین سے کائنات کی کھیتیاں ہری ہو جائیں اور اس کے بسانے والوں کی پیرو ایک ایسی اُمت ہو جو شمالاً جنوباً شرقاً غرباً اپنے معبدوں کا رُخ اس کی طرف پھیر دے۔جہاں تہاں عبادتِ الٰہی کا چراغ روشن ہو اس کی لو اسی طرف ہو، دنیا بھر کی مسجدیں اس کی بیٹیاں کہلائیں۔

حرم کے نزدیک سڑک اس طرح چکر کاٹتی ہے جیسے ہمارے ہاں کے گبھرو جوان پٹکا باندھتے ہیں۔

میں دیکھ رہا تھا کہ ہاجرہؓ اپنے لختِ جگر اسمٰعیلؑ کے ہمراہ شانہ پر مشکیزہ اور ہاتھ میں روٹی لئے چلی جا رہی ہیں اسی وادیٔ غیر ذی زرع کی طرف، جسے ابد تک کے لئے زندہ ہونا تھا اور جس کی پہاڑیاں ان کے قدم لینے کے لئے بیقرار تھیں۔انہیں غیرت کے اس آبگینے، استقامت کے اس پہاڑ اور عبادت کے اس سہ رکنی قافلہ کا انتظار تھا۔

حضرت ابراہیمؑ عراق میں اُر سے نکلے، حران چلے گئے۔ وہاں سے فلسطین، فلسطین سے مصر اور مصر سے حجاز۔ حجاز میں کعبۃ اللہ کی بنیاد رکھی۔ اسمٰعیلؑ اینٹیں چنتے ابراہیمؑ گارہ لگاتے اور اس طرح ایک گھر جو اُس وقت تنہا تھا، اللہ کے نام پر آباد ہوگیا۔ ابراہیمؑ نے اپنے بھتیجے حضرت لوطؑ کو شرقِ اُردن بھجوایا کہ وہاں دعوتِ ربانی کا مرکز قائم کریں۔ شام و فلسطین میں حضرت اسحٰقؑ کو مامور کیا اور اندرونِ عرب کا علاقہ حضرت اسمٰعیلؑ کو سونپ دیا کہ اللہ کے آخری نبیؐ کو آپ کی اولاد میں سے ہونا

تھا ــــ قریش کی بنا رکھی گئی۔

تاریخ افکار سے پیدا ہوتی، کردار سے پرورش پاتی پھر شاہراہوں میں اپنے نقش پا چھوڑ کر انسانوں کے حافظہ کی سرگزشت بن جاتی ہے۔

لبیک اللھم لبیک! ناقہ کہاں کہاں کر میں اس کی مہار تھامے حرم کے حدود میں داخل ہو تا کہ یہ بھی سنتِ نبوی ہے۔ دل نے کہا کہ پلکوں سے موتی چنو وہاں آ گئے ہو جہاں ابراہیمؑ آئے تھے، ہاجرہؓ آئی تھیں، اسمٰعیلؑ آئے تھے، جہاں محمدؐ پیدا ہوئے تھے اور جہاں وقت کے بہترین انسانوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا تھا، جہاں بدترین انسانوں نے ان کی نافرمانی کی تھی، ان کا مذاق اڑایا تھا اور وہ ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ پھر جہاں وہ فاتح کی حیثیت سے اس طرح لوٹے تھے کہ ابوسفیانؓ ہی کا گھر سب کی پناہ گاہ بنا دیا۔ جہاں بادِ صبحگاہی میں محمدؐ کی سانسیں چلتیں اور شب کے آویزے (تارے) ان کے آنسوؤں سے تیار ہوتے تھے۔ جہاں اب بھی بلالؓ کی اذانیں محفوظ ہیں اور سنی جاتی ہیں۔ جہاں ہر چپہ ایک تاریخ ہے، جہاں ایک عہد کے سب سے بڑے انسان عمریں بتا گئے ہیں، جہاں ان کی مشعلیں روشن ہیں، جہاں ان کے نقشِ قدم سنگِ میل ہیں، جہاں جبرائیلؑ آتے رہے، وحی نازل ہوتی رہی اور قرآن اترتا رہا۔

بیت اللہ کے مینار ابھر آئے اور میں ان پہاڑوں سے گزر رہا تھا جن میں سے ایک پہاڑ (کوہ) پر چڑھ کر حضورؐ نے فرمایا تھا۔

"اے معشرِ قریش! اگر میں تم سے کہوں کہ اس پہاڑ کے عقب سے لشکر آ رہا ہے تو تم کو یقین آئے گا؟ سب نے کہا ہاں کیونکہ تم ہمیشہ سچ بولتے ہو۔ آپ نے فرمایا تو میں یہ کہتا ہوں اگر تم ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر شدید عذاب نازل ہوگا۔"

یہ سن کر وہ لوگ کہ ان میں آپ کا چچا ابولہب بھی تھا، برہم ہو کر چلے گئے۔ لیکن خدا کا آخری نبیؐ اعلان کر چکا تھا کہ:۔

"اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند لا کر دے دیں تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہیں آؤں گا۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے آخری حجت کے طور پر مبعوث کیا ہے۔ اللہ ایک ہے، محمدؐ اس کے رسول ہیں، سب عبادتیں اس کی ایک ذات کے لئے ہیں۔

ان بتوں کو تم نے اللہ بنا لیا ہے، یہ پتھر کی مورتیاں ہیں اور کوئی شے نہیں۔ اپنے اللہ کی عبادت کرو، اس کی نماز پڑھو، پاک دامنی اختیار کرو، سچ بولو، اہلِ قرابت کا حق ادا کرو۔"

وہ پہلے دن تنہا تھا اس کے ساتھ صرف اس کا خدا تھا۔ پھر وہ دو ہو گئے، دو سے تین اور تین سے پانچ حتیٰ کہ بعجلت ایک کارواں بن گیا۔ نئی دنیا نے جنم لیا اور اس طرح۔ ع

اک عرب نے آدمی کا بول بالا کر دیا

یہ مکہ ان زندہ و پائندہ انسانوں کا گھر ہے جو بظاہر ہم میں نہیں لیکن ہر لحظہ ہم میں ہیں اور جن پر دنیا بھر میں جہاں جہاں اسلام کی آواز ہے، دن میں کئی کئی دفعہ درود و سلام بھیجا جاتا ہے جس طرح بدلیاں پانی کے ڈول بھر کر چلی آتی ہیں اس طرح کرۂ ارضی کی ہوائیں ان کے لئے درود و سلام کے گلدستے لیکر آتیں اور لٹا کر لوٹ جاتی ہیں۔ صبح و شام صدیوں سے یہی ہو رہا ہے اور یہ قافلہ ابد تک کے لئے رواں دواں ہے۔

سلام ہو اس زمین پر جس کے ویرانے نے ہمیں آباد کیا اور جس کے نشیب پر دنیا بھر کی بلندیاں کھنچی چلی آتی ہیں، سب سے بڑی سجدہ گاہ! جہاں ایک پتھر کو یہ رتبہ حاصل ہے کہ صبح و شام کروڑوں انسان ایک عظیم انسان کے اتباع میں اسے بوسہ دیتے اور یہ اعزاز صبح محشر تک اس کے لئے خاص ہو گیا ہے ـــــــ لبیک اللھم لبیک۔

شوقِ آوارگی

عطاء الحق قاسمی

میونخ ریلوے اسٹیشن پر اترتے ہی میں نے حسب معمول ٹوٹی ہوئی مٹھ والے اٹیچی کیس کو بائیں کاندھے پر رکھا کہ گناہوں کی رپورٹنگ کرنے والے فرشتے سے حساب چکانے کا یہی ایک طریقہ تھا: بیگ گلے میں لٹکایا اور دائیں ہاتھ سے دوسرا اٹیچی اٹھانے ہی کو تھا کہ مٹھ میرے ہاتھ میں رہ گئی اور اٹیچی زمین پر جا گرا۔ ثابت ہوا کہ دوسری اٹیچی کی مٹھ بھی ٹوٹ گئی ہے۔ یک نہ شد دو شد۔ یہ اٹیچی میں نے دائیں کاندھے پر رکھا۔ جہاں نیکیاں نوٹ کرنے کے لئے ایک فرشتہ مامور ہے اور چونکہ عرصۂ دراز سے کوئی نیکی سرزد ہونے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ لہٰذا اس سرپلس (SURPLUS) فرشتے کو بھی زحمت دینے میں کوئی حرج نہ تھا۔ اب میرے دونوں کاندھوں پر ایک ایک اٹیچی کیس تھا اور بیگ گلے میں، جو دائیں بائیں اٹیچی کیس ہونے کی وجہ سے اپنے پورے وزن سمیت گردن کے پیچھے پشت کی جانب لڑھک گیا تھا اور اس کی ڈوری میرے حلق کے گرد پیوست ہو گئی تھی۔ یوں میں مجبور تھا کہ گردن اکڑا کر اور سینہ تان کر چلوں لیکن اس "تمکنت" کا پردہ میری آنکھیں چاک کر رہی تھیں جو ڈوری سے گلا گھونٹے جانے کے سبب باہر کو نکل رہی تھیں۔ بہرحال میں چند قدم چلنے کے بعد سانس لینے کے لئے رکتا اور پھر یہ صلیبیں اٹھائے چل پڑتا۔ حتیٰ کہ پلیٹ فارم سے نکل کر ٹرام کی پٹڑی کراس کر کے افتاں و خیزاں اسٹیشن کے قریب ایک ہوٹل کے لاؤنج میں داخل ہو گیا۔ اس کا نام FELD HUTTER تھا اور اندر جاتے ہی پتہ چلا کہ خاصا ٹھیک ٹھاک ہوٹل ہے اور اس کی تصدیق بھی ہوئی کیونکہ ایک دن کا کرایہ پچیس مارک تھا۔ تاہم مجھے یہ "وارا" کھاتا تھا کیونکہ میرا اصول سفر یہ ہے کہ میں دوران سفر کچھ دن بچت کرتا ہوں اور پھر ایک دن ساری کسر نکال دیتا ہوں۔ باوردی پورٹر نے میرا سامان اٹھایا (کس طرح اٹھایا؟ اب یہ مسئلہ تھا) اور پانچویں فلور پر آ گیا۔ پھر اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور سامان ایک کونے میں رکھ کر پسینہ پونچھنے کے لئے رومال جیب سے نکالنے لگا۔ میں نے جھٹ سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پیشتر اس کے کہ اس مزدور کا پسینہ خشک ہو کچھ رقم اس کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ اس نے سر کی جنبش سے شکریہ ادا کیا اور ہولے سے دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔

میرا کمرہ سڑک کی جانب واقع تھا۔ میں نے کھڑکی کھول دی اور اس کے ساتھ ہی اگست کی نم آلود ہواؤں نے مجھے خوش آمدید کہا۔ آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور لگتا تھا کہ بارش ہونے کو ہے۔ میں نے کھڑکی کے قریب پہنچ کر پانچویں فلور سے نیچے سڑک پر نگاہ ڈالی تو تیز ٹریفک رواں دواں تھا۔ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے انسان اتنے ہی چھوٹے دکھائی دے رہے تھے جتنے بلندیوں پر کھڑے لوگوں کو دکھائی دیتے ہیں۔ میں چند لمحے پوری محویت کے ساتھ یہ منظر دیکھتا رہا اور پھر کپڑے تبدیل کر کے سلیقے سے بچھے ہوئے اس کمرے کے آرام دہ بستر پہ دراز ہو گیا۔ میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا تاہم چند لمحوں میں اپنے ہی ہاتھوں سے "اپنی مٹھی چاپی" کرنے کے نتیجے میں مَیں نے خاصا لطیف محسوس کیا۔ میرے لئے یہ امر اطمینان بخش تھا کہ میں اس اجنبی شہر میں بالکل اجنبی نہیں ہوں بلکہ پرویز اور مسعود جو ماڈل ٹاؤن میں میرے ہمسائے تھے، گزشتہ کئی برس سے یہاں مقیم ہیں۔ میں اسٹیشن سے اتر کر ان کی طرف اس لئے نہیں گیا تھا کہ جانتا تھا وہ پہلے ہی سے گوناگوں مشکلات خصوصاً رہائشی مسئلے سے دوچار ہیں اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے ان کی مشکلات میں مزید اضافہ ہو۔

پرویز اور مسعود اگرچہ آپس میں گہرے دوست تھے لیکن ان کے طبائع میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ پرویز انتہائی مخلص، سخت جان اور دوستوں کی خاطر جان قربان کرنے والا شخص تھا۔ وہ سب کے دکھ درد میں شریک ہوتا تھا اور اپنا درد کسی کو نہیں بتاتا تھا۔ وہ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی ماں بچپن ہی میں فوت ہو گئی تھی اور اس کے فوراً بعد اس کے کھوتی باپ نے دوسری شادی کر لی اور پھر وہ جوان بیوی کے ناز نخرے اٹھانے میں مشغول ہو گیا اور پرویز کو یکسر فراموش کر دیا۔ دوسری بیوی سے جب اولاد ہوئی تو سوتیلی ماں نے باپ اور بیٹے کے درمیان دیواریں مزید اونچی کر دیں تاکہ تمام جائداد کی مالک تنہا اس کی اولاد بن سکے۔ اس کی یہ سکیم اس حد تک کامیاب ہوئی کہ ایک دن پرویز کو گھر سے نکال دیا گیا۔ اس وقت اس کا ایف اے کا داخلہ جانے والا تھا تاہم اس نے ہمت نہ ہاری اور کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی بجائے کوکا کولا کے ایک ایجنسی ہولڈر کے ہاں ملازمت کر لی اور اب وہ ریڑھے پر بیٹھ کر بوتلوں کے کریٹ دوکانداروں میں تقسیم کرنے کے لئے نکلتا تھا۔ وہ ریڑھا خود چلاتا تھا۔ کبھی کبھار اس کا گذر اپنے باپ کی عظیم الشان کوٹھی کے سامنے سے بھی ہوتا۔ یہ صورت حال اس کے باپ کے لئے بظاہر خاصی تکلیف دہ تھی۔ لیکن انسان ایک بار عورت کے سحر میں آجائے تو وہ ناقابلِ یقین حد تک بے غیرت ہو جاتا ہے۔ اس دوران در در کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے اس کے خیالات میں بڑی بنیادی تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ اپنے ساتھ گذرنے والے اس المیے کا ذمہ دار دولت کو سمجھنے لگا تھا اور اس کے باعث رفتہ رفتہ وہ ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے لگا۔ مگر کچھ عرصہ

بعد وہ اپنے ساتھیوں کی بے عملیوں سے دل برداشتہ ہو گیا اور اس نے ان سے کنارہ کشی کرلی تاہم اس علیحدگی کے باوجود اس کے خیالات میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔ مسعود کا معاملہ بھی پرویز سے قدرے ملتا جلتا تھا۔ وہ ایک امیر باپ کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ ابھی وہ سات آٹھ برس کا تھا کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بڑے بھائیوں نے شادیاں کر لیں بچے پیدا کئے اور اپنے اپنے کاروبار میں مست ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد ماں بھی فوت ہو گئی جو اس کی واحد غم خوار تھی۔ اب وہ بہن بھائیوں کے ہوتے ہوئے بھی بے سہارا رہ گیا۔ اسے اپنی تعلیم بالکل آغاز ہی میں چھوڑنا پڑی اور وہ کاروبار کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے کئی کام شروع کئے لیکن کم عمری، ناتجربہ کاری اور رہنمائی کے فقدان کے باعث ہر بار نقصان اٹھایا۔ اب وہ COMPLEXES کا مجموعہ بن گیا تھا۔ وہ خود کو خاندان کے دیگر افراد کے مقابلے میں کمتر محسوس کرتا تھا اور اس احساس کو دبانے کے لئے اپنی برتری ظاہر کرنے میں لگا رہتا تھا۔ اس کا ایک کمپلکس تعلیم بھی تھا۔ چنانچہ وہ کچھ بھی نہ جانتے کے باوجود ہر چیز کے جاننے کا دعویٰ کرتا تھا جس سے متعدد بار طرفین کے لئے مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہو جاتی۔ پرویز اور مسعود کے خاندانی حالات اور پس منظر میں مشابہت کے باوجود ان کا ردعمل دونوں پر جدا جدا تھا۔ مسعود اپنے خاندان کے دیگر افراد کے سٹیٹس تک پہنچنے کے لئے پیسے کے جنون میں مبتلا ہو گیا تھا اور اب وہ ہمہ وقت اسے جمع کرنے کی فکر میں رہتا تھا، جبکہ پرویز کو اس صورت حال نے انتہائی درد مند بنا دیا تھا۔ پھر ایک روز نجانے کیا ہوا کہ ان دونوں نے سامان باندھا اور اجنبی عزیزوں سے دور مغربی جرمنی پہنچ گئے۔ اب یہاں پرویز ایک رومی کھانوں کے ریستوران "ڈانٹز" میں باورچی کے عہدے پر تعینات تھا اور مسعود سامان سے بھرے ہوئے ٹرک "ان لوڈ" (UNLOAD) کرتا تھا۔

میں نے سرہانے پڑے ٹیلیفون کو مزید قریب کیا اور پرویز کو اپنی آمد کی اطلاع دینے کے لئے ڈانٹز کا نمبر ملایا دوسری طرف کوئی جرمن تھا اور اپنی قومی روایت کے عین مطابق انگریزی جاننے سے صاف انکاری تھا۔ بہر حال اس نے "پرویز" کا لفظ سن کر میرا مدعا جان لیا اور چند لمحوں بعد مجھے پرویز کی محبت بھری آواز سنائی دی۔

"آپ کب آئے؟" وہ اگرچہ مجھ سے خاصا بے تکلف تھا مگر عمر میں چھوٹا ہونے اور اپنی طبعی شرافت کی وجہ سے ہمیشہ "آپ" کہہ کر مخاطب ہوتا تھا۔

"کوئی ایک گھنٹے پہلے پہنچا ہوں۔ تم سناؤ کیسے حال ہیں؟"

"بالکل ٹھیک ہوں۔" اس نے افسردہ لہجے میں رسمی جواب دیا۔

"مسعود کی کھرک (خارش) کا کیا حال ہے؟" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا

ابھی تک وہ ویسی کی ویسی ہی ہے۔ وہ اس کے لئے کبھی نیم کے پتے گھوٹ کر پیتا ہے اور کبھی کچھ اور کرتا ہے مگر ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتا۔ وہ پہلے سے زیادہ کنجوس ہو گیا ہے۔"

"کیا وہ اب بھی تم سب کو خارش میں مبتلا دیکھنے کے لئے بہانے بہانے اپنا ہاتھ تمہارے بازو اور گردن پر پھیرتا ہے؟" میں نے اس کی دیرینہ عادت کے بارے میں تازہ ترین صورت حال جاننے کے لئے پوچھا۔

"ہاں! وہ ابھی تک باز نہیں آیا۔ کئی دفعہ اشاروں، کنایوں میں اسے سمجھا چکے ہیں، صاف کہتے ہوئے لحاظ آتا ہے، مگر وہ سمجھتا ہی نہیں ہے۔" پرویز نے ہنستے ہوئے کہا۔ ویسے آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟

"میں اسٹیشن کے قریب FELD HUTTER میں مقیم ہوں اور اس وقت اپنے کمرے ہی سے بول رہا ہوں۔"

"آپ ہوٹل میں کیوں ٹھہرے ہیں؟" اس نے پرخلوص لہجے میں شکایت کی "مجھے آپ کی اس حرکت سے دکھ ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ مجھے بیگانہ سمجھتے ہیں۔"

"ارے نہیں! میں تمہیں بیگانہ کیسے سمجھ سکتا ہوں، میں نہیں چاہتا تھا کہ تم لوگوں کی مشکلات میں مزید اضافہ کر دوں۔"

"خیر ملاقات ہوتے ہی آپ سے نبٹ لوں گا۔ یہ بتائیں مل کب رہے ہیں؟"

"میں تو فارغ بیٹھا ہوں، جب کہو آ جاؤں گا۔"

"آپ کو یہاں پہنچنے میں دشواری ہوگی۔ میں مسعود کو پیغام پہنچاتا ہوں کہ وہ آپ کو آ کر لے جائے میں اس وقت بہت بری طرح پھنسا ہوا ہوں ورنہ خود آتا۔"

"تم کتنے بجے فارغ ہو جاؤ گے؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے ابھی تین چار گھنٹے لگیں گے۔"

"ٹھیک ہے تم مسعود کو بھیج دو۔ مجھے کچھ کام بھی کرنے ہیں، اس کے بعد ہم تمہارے پاس پہنچ جائیں گے۔"

میں نے فون بند کر دیا۔ بستر سے اٹھ کر اٹیچی کیس میں سے گندے کپڑے نکالے اور دھونے کے لئے غسل خانے میں چلا گیا۔ سگھڑ بیویوں کی طرح یہ کام انجام دے کر میں ایک بار پھر کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ کالی گھٹاؤں نے بارش کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اور سڑک پر لوگ چھتریاں لئے تیز تیز قدم چلتے اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کی کوشش میں تھے۔ دور تک پھیلی ہوئی بلند و بالا جدید عمارتیں دھل کر اور نکھر گئی تھیں۔ اتنے میں بغیر ناک (KNOCK) کئے کسی نے دروازہ کھولا اور میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ مسعود تھا۔ اس نے برساتی پہنی ہوئی تھی اور ہاتھ میں

بند چھتری تھی جس میں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ وہ ہاتھ کے بڑھے ہوئے ناخنوں سے گردن کھجلا رہا تھا۔ پھر اس نے چھتری ایک کونے میں رکھی اور مجھ سے لپٹ گیا۔

"مارے گئے ––– کھرک" میں نے سوچا: مجھے اگرچہ ایک عرصہ بعد اسے مل کر بہت خوشی ہوئی تھی۔ مگر یہ کھرک (خارش) کا خوف میرے ذہن سے زائل نہیں ہوا تھا۔ دراصل میں نے ماڈل ٹاؤن میں اسے اپنے ملازم سے جھاڑیوں کے ساتھ بہت بے دردانہ طور پر جسم کھجلواتے کئی بار دیکھا تھا۔

اب وہ کرسی گھسیٹ کر میرے سامنے بیٹھ گیا تھا اور ماضی کی یادیں دہرا رہا تھا۔ پھر اس نے میرے قیام امریکہ کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ "وہاں تمہارا وقت کیسا کٹا؟"

"بہت اچھا" میں نے جواب دیا۔

"پھر واپس کیوں آگئے ––– یہاں ہم لوگ تو امریکہ جانے کے لئے ترستے ہیں"۔

"اگر ہو سکے تو ضرور جاؤ۔ تمہاری تمام خواہشیں وہاں پوری ہو جائیں گی"۔

"لیکن تم کیوں چلے آئے؟"

"میں اس دنیا کے ایک ایک کونے کو بوسہ دینا چاہتا ہوں لیکن میری سجدہ گاہ میرا وطن ہے۔ ان دو برسوں میں میری جبیں سجدوں کے لئے ترس گئی ہے"۔

"تم نے یہ بات کہہ کر دل خوش کر دیا ہے۔ اس پر تمہارا بوسہ لینے کو جی چاہتا ہے"۔ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور میری طرف بڑھا۔

"کھرک" اس خیال سے میرے رونگٹے ایک بار پھر کھڑے ہو گئے۔ "بس تم سمجھو کہ میں نے تمہارا بوسہ وصول کر لیا"۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے واپس کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا اور وہ ہنستے ہوئے خلاف توقع واپس کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اب کیا پروگرام ہے؟" مسعود نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے پوچھا۔

بارش تھم گئی تھی اور اب قدرے حبس محسوس ہو رہا تھا۔

"مجھے دو کام کرنے ہیں، ایک تو اٹیچی کیس مرمت کرانے ہیں اور دوسرے پرسوں کے لئے استنبول کا ٹکٹ خریدنا ہے۔ اس کے بعد پرویز کی طرف چلیں گے۔ "ویسے پرویز کا سناؤ۔ یہاں آکر اس میں کوئی نئی تبدیلی تو نہیں آئی؟"

"بس ایک ہی تبدیلی آئی ہے اور وہ یہ کہ بے حساب پینے لگ گیا ہے۔ نیز یہ کہ بن پئے وہ افسردہ نظر

ہے اور پینے کے بعد وہ اتنا کھلنڈرا بن جاتا ہے کہ ایک مختلف انسان نظر آتا ہے ـــــ رہا معاملہ ابھی مرت
نے کا تو یہ خیال دل سے نکال دو کیوں کہ اپنے پیسوں میں تم نشے اچھی خرید سکتے ہو۔ اور ٹکٹ ابھی جا کر
لیتے ہیں"۔

"چلو" میں نے کہا اور پھر ہم اٹھ کر سڑک پر آ گئے۔

ٹکٹ بنوانے کے بعد ہم اسٹیشن کے تہہ خانے میں واقع ایک ہال نما ریستوراں میں چلے گئے۔ اس تہہ خانے
ئی ریستوراں ہیں اور یہاں سے "ایس بان" (زیر زمین ٹرین) بھی چلتی ہے۔ یہاں سیلف سروس تھی۔ میں نے
سعود نے لائن میں لگ کر روسٹڈ چکن ٹرے میں رکھے۔ کاؤنٹر کلرک کو اپنے اور میرے چکن کی ادائیگی کرتے
ئے مسعود نے پوچھا کہ "تمہارے پاس ٹوٹے ہوئے پیسے ہیں؟ مجھے مارک بھنوانا پڑے گا" اور میں نے جیب میں
ڈال کر چینج ہتھیلی پر پھیلا دیا جو قریباً میری مرغی کی قیمت کے برابر تھا۔ یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری
ہے کہ امریکہ کی طرح یورپ میں بھی چکن غریبوں کی غذا ہے جبکہ بقول اشفاق احمد ہمارے ہاں امیر آدمی مرغی
وقت کھاتا ہے جب وہ بیمار پڑتا ہے اور غریب آدمی مرغی اس وقت کھاتا ہے جب مرغی بیمار پڑتی ہے اور
یہ غربا و مساکین وبتامیٰ ہی کا ریستوراں تھا کیونکہ یہاں ہر کسی کے ایک ہاتھ میں مرغی اور دوسرے میں
کا گلاس تھا۔ یہاں بے پناہ رش تھا اور بیٹھنے کا کوئی انتظام نہیں تھا چنانچہ لوگ شانے سے شانہ ملائے
ے تھے اور خورد و نوش میں مشغول تھے۔ یہاں شائستگی مفقود تھی۔ لوگ مرغی کو اس طرح "چک" مارتے
جس طرح انگریزی فلموں میں سفاک بادشاہوں کو دکھایا جاتا ہے۔ ایک ادھیڑ عمر جرمن مجھ سے کچھ فاصلے پر
متواتر مجھے گھورنے میں مشغول تھا پہلے میں سمجھا کہ مجھے محض شبہ ہوا ہے لیکن جب میں نے شعوری طور پر نوٹ
تو پتہ چلا کہ وہ بغیر پلک جھپکائے مجھے دیکھے چلا جا رہا ہے۔ میں نے مسعود کو ٹہوکا دیا اور صورت حال سے مطلع
واس نے کہا "پرواہ مت کرو۔ اس کی طرف توجہ دیئے بغیر جلدی سے کھانا ختم کرو اور یہاں سے نکل چلو۔
"مگر معاملہ کیا ہے؟"

"معاملے کو چھوڑو۔ اگر تم نے اسے مسکرا کر دیکھ لیا تو وہ ادھر چلا آئے گا اور پھر جان نہیں چھوڑے گا۔

"مگر کیوں؟" میں نے پوچھا

"بس اپنا اپنا شوق ہے"۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا "یہاں پاکستانی نوجوانوں کو جب شروع شروع میں نوکری
ملتی تو ان میں سے بعض ایسے بزرگوں ہی کی خدمت کر کے اپنا اور ان کا پیٹ بھرتے ہیں اور یہ بزرگ جرمنی

کے دوسرے شہروں کی نسبت میونخ میں زیادہ کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔"

کاغذ کے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے باہر نکلے تو میں نے مسعود سے پوچھا "تو پھر کیا خیال ہے، اچھی کیس نئے خرید لئے جائیں؟"

"تیری مانو تو کسی نہ کسی طرح کام چلا لو۔ میں تمہیں مضبوط ڈوری کی مٹھ بنا دوں گا جو پاکستان تک نہیں ٹوٹے گی۔"

"مشکل ہے" میں نے اس کی تجویز رد کرتے ہوئے کہا "مجھے کسی دکان پر لے چلو۔"

"یہاں ایک ڈیپارٹمنٹل سٹور ہے، جہاں سب کچھ مل جاتا ہے۔ وہیں چلتے ہیں۔"

"کتنی دور ہے؟" میں تھکا ہوا تھا اور مزید تھکن کا شکار نہیں ہونا چاہتا تھا۔

"بس قریب ہی ہے۔" اس نے کہا۔

"تمہیں پتہ بھی ہے وہ کہاں واقع ہے؟" میں نے پوچھا کیونکہ مسعود نے ساری عمر لاہور میں بسر کی تھی اور وہ ابھی تک لاہور کے راستوں سے بھی بے خبر تھا۔

"کیوں نہیں کیوں نہیں" اس نے بڑے وثوق سے گردن ہلائی جس پر مجھے شبہ ہوا کہ وہ رستہ نہیں جانتا کیونکہ جس چیز کے بارے میں وہ نہ جانتا ہو۔ وہ اتنے زور سے گردن ہلانے کا عادی تھا کہ بسا اوقات منکا ٹوٹنے کا خطرہ پیدا ہو جاتا تھا۔

"یار کیسی باتیں کرتے ہو۔ تم مجھے بالکل ہی چغد سمجھتے ہو۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور سڑک پار کر کے دوسری سمت آ گیا اور پھر ہم نے چلنا شروع کر دیا۔ چلتے چلتے میری ٹانگیں جواب دے گئیں تو اسے کہا کہ اگر دکان دور ہے تو ٹیکسی، بس یا ٹرام پر بیٹھ جاتے ہیں اور اگر تمہیں رستے کا علم نہیں ہے تو کسی سے پوچھنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس پر وہ با دل نخواستہ ایک جرمن نوجوان کی طرف بڑھا اور "بتے" (پلیز) کہہ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ راہگیر چند ثانیے منتظر رہا کہ وہ آگے سے کچھ کہے مگر جب اسے خاموش پایا تو حیران نظروں سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

"کیا تمہیں جرمن نہیں آتی؟" میں نے مسعود سے پوچھا۔

"مجھے تو آتی ہے۔ اسے نہیں آتی۔" مسعود نے سنجیدگی سے کہا اور اس پر میری ہنسی چھوٹ گئی۔

چلتے چلتے مسعود اچانک دائیں جانب ہر واقع ایک دکان میں داخل ہو گیا۔ اس پر میں بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ میں سمجھا کہ شاید یہاں سے اچھی کیس دستیاب ہیں مگر یہ سیکس شاپ تھی۔ کاؤنٹر پر ایک لڑکی تھی۔ یہاں ننگی تصویریں، بلیو فلمیں، عورتوں اور مردوں کے مصنوعی اعضا، قوت باہ کی گولیاں، ٹیکے اور خدا جانے کیا کچھ

تھا۔ ایک طرف چھوٹے چھوٹے کیبن بنے ہوئے تھے۔ جن میں بلیو فلمیں دکھانے کی مشینیں نصب تھیں۔ ان میں سکہ ڈالا جاتا ہے جس پر فلم شروع ہو جاتی ہے مگر یہ اسی طرح دیکھی جاتی ہے جس طرح، سب بچپن میں بارہ من کی دھوبن اور تاج محل دیکھا کرتے تھے۔ یہاں ایک "جدت" انھوں نے یہ بھی پیدا کی ہے کہ دو منٹ کے بعد فلم عین اس مقام پر آ کر رک جاتی ہے، جسے نازک مقام ہی کہا جا سکتا ہے۔ اگلا سین دیکھنے کے لئے ایک سکہ اور ڈالنا پڑتا ہے، تھوڑی دیر بعد یہ پھر کسی نازک مقام پر رک جاتی ہے اور ایک سکہ مزید ڈالنا پڑتا ہے۔ یوں پوری فلم دیکھنے کے لئے کئی مارک ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس میں کچھ ایسا سسپنس قائم کیا گیا ہوتا ہے کہ شائقین جیبیں خالی کر کے ہی دکان سے باہر نکلتے ہیں۔ یہ تماشا میں نے ایک بار امریکہ میں دیکھا تھا بعد میں مجھے یہ سب کچھ مضحکہ خیز معلوم ہوا اس لئے مسعود کو کیبن میں داخل ہوتے دیکھا تو مجھے ہنسی آ گئی۔ وہ ایک آنکھ روزن سے لگائے پورے خضوع و خشوع سے فلم دیکھنے میں مشغول تھا۔ تھوڑی دیر بعد ٹک، کی آواز آئی اور ٹائم ختم ہو گیا۔ اس نے جلدی سے ایک سکہ اور نکالا اور ایک بار پھر فلم کا بقیہ حصہ دیکھنے میں محو ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ٹک، کی آواز آئی اور مسعود نے اضطراب کے عالم میں جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور وہ دونوں ہاتھوں سے اس نے مشین کو جپھا ڈالا ہوا تھا۔ اس نے ایک سکہ مزید ڈالا اور آنکھ سوراخ کے ساتھ چپکا دی۔ چند لمحے گذرنے پر فلم پھر رک گئی تھی۔ اس بار اس نے سخت ایمرجنسی کے عالم میں مجھے آواز دی "یار کھلے ہوئے پیسے دئیں۔ ذرا چھیتی کریں"۔ (یار کچھ ٹوٹے ہوئے پیسے دو۔ ذرا جلدی کرو) میں نے جیب سے ریز گاری نکال کر سے دے دیا۔ اور کاؤنٹر پر کھڑی لڑکی کو دیکھنے لگا جو ایک گاہک کو قوتِ باہ کے ٹیکے فروخت کرتے ہوئے ان کی افادیت پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈال رہی تھی۔ "ان کے استعمال سے آپ اپنے اندر ایک بالکل نئی زندگی محسوس کریں گے۔ یہ ٹیکے بہترین دماغوں کے تیار کردہ ہیں۔ طویل عمر میں مسرت کے لمحات بھی طویل ہونے چاہئیں اور ان کی مدد سے آپ مسرت کے لمحوں کو جتنا چاہیں طویل کر سکتے ہیں۔ اس کے سائیڈ افیکٹس بھی نہیں ہیں"

اتنے میں مسعود نے ایک بار پھر کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا "یار کھلے ہوئے پیسے دئیں"۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور حالت غیر تھی۔ اس پر میں نے خارش کی پروا کئے بغیر اسے گردن سے پکڑا اور دکان سے باہر لے آیا۔ اس نے پہلے تو بُرا سا منہ بنایا اور پھر کچھ دیر بعد نارمل ہونے پر ہنسنے لگا۔

رستے میں ایک بوڑھا شخص فٹ پاتھ پر گٹار لئے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنا ہیٹ زمین پر پھیلایا ہوا تھا

اور جرمن میں کچھ گانے کی کوشش کر رہا تھا جو یقیناً "تیرے جا سجیا راہِ خدا تیرا اللہ ہی بوٹا لا دے گا" قسم ہی کی چیز تھی۔ میں نے کچھ سکّے اس کے ہیٹ میں اچھالے اور آگے بڑھ گیا۔ کچھ آگے چل کر ایک اور بوڑھا جرمن دکھائی دیا جو چلتا جاتا تھا اور مٹھیاں بھینچ بھینچ کر پرجوش تقریر بھی کرنے میں مشغول تھا۔ اس کا لہجہ کرخت تھا، اتار چڑھاؤ، خطیبانہ تھا۔ چہرہ کھنچا ہوا تھا اور زورِ بیاں سے منہ لال ہو رہا تھا۔ دلّی کے لال قلعے پر ایک بار پھر جھنڈا گاڑنے جیسی باتیں کر رہا تھا۔ لوگ ایک نظر اس کی طرف دیکھتے تھے اور پھر زیادہ توجہ دیئے بغیر آگے چل پڑتے تھے۔ کیونکہ اب وہ ایک عرصہ تک اس نوع کی تقریریں نہیں سننا چاہتے تھے۔ میونخ میں دو دن کے قیام میں مَیں نے اس قسم کے کم و کم و بیش پانچ چھ پاگل دیکھے۔

ہم اب تک دو تین میل چل چکے تھے لیکن وہ ڈیپارٹمنٹل سٹور کہیں نظر نہیں آیا تھا جہاں مسعود مجھے لے جانا چاہتا تھا۔ یہاں سڑکوں کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں جہاں سے روزمرہ کی چیزیں دستیاب تھیں۔ طویل سفر اور "تھیلیبین" اٹھا کر چلنے کی وجہ سے میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ اوپر سے اس "ڈاک" نے میرے لئے "مرے کو مارے شاہ مدار" والی صورت حال پیدا کر دی تھی۔ اس پر میں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ اور زمین پر "پتھلا (چوکڑی) مار کر بیٹھنے کو تھا کہ مسعود نے ہنستے ہوئے مجھے اس حرکت سے رہنے کو کہا اور برابر والی دکان کے کاؤنٹر پر کھڑی لڑکی سے راستہ پوچھنے کے لئے اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا دور سے میں نے دیکھا تو لڑکی کے پنکھڑی ایسے ہونٹ اور مسعود کی کمانی دار گردن حرکت میں تھے۔ وہ گردن کو کبھی آگے پیچھے ہلاتا اور کبھی بڑی بیدردی سے بائیں یا دائیں طرف لڑھکا دیتا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دکان سے باہر نکلا "ٹھیک ہے۔ سمجھ گیا ہوں" اس نے کہا اور مجھے ایک بار پھر پیچھے لگا لیا۔

دفتروں میں چھٹی ہو گئی تھی۔ دن بھر کے تھکا دینے والے کام کے باوجود ہر طرف تر و تازہ اور خوش و خرم چہرے دکھائی دیتے تھے۔ یہ قوم لٹ پٹ کر بھی ویسی کی ویسی ہی ہے۔ "عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی"۔ غالباً ہمارا اقبال ٹھیک کہتا ہے۔ ان کا گوئٹے بھی ٹھیک کہتا ہے۔ بس سارا جھگڑا گفتار اور کردار کے غازی ہونے کا ہے۔

"مسعود میں تھک گیا ہوں۔"

غالباً اس بار میری تمام تھکن مسعود میں سرایت کر گئی ہے۔ وہ کہتا ہے۔ "چلو ٹرام میں بیٹھ جاتے ہیں" ٹرام اس قدر خوبصورت ہے کہ اسے پاؤں کی دھول سے آلودہ کرتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی

یہاں ایک خستہ حال پاکستانی چہرہ دکھائی دیتا ہے۔

"قیصر سٹریٹ اتر جاؤ، وہاں کئی ڈیپارٹمنٹل سٹورز ہیں۔" وہ مسعود کو بتاتا ہے۔

"کمال ہے یار، ہم لوگ تو اس کے قریب ہی رہتے ہیں۔ ڈاشر ریستوران بھی تو وہیں ہے۔" مسعود میرے کان میں کہتا ہے۔

"تم اتنے عرصے میں کبھی اس طرف نہیں گئے؟" میں پوچھتا ہوں۔

"کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ پاکستان سے چلتے وقت ضرورت کے تمام کپڑے اور دیگر چیزیں ساتھ لے آیا تھا۔ سارا دن کام کرتا ہوں۔ اور شام کو واپس 'بابے دی ہائم' آ کر سوچتا ہوں۔ نوید، پرویز اور دوسرے پاکستانی رات کو بیئر پینے کے لئے کسی بار میں چلے جاتے ہیں یا میکسی ہاؤس کا رخ کرتے ہیں۔ لیکن میں نے کبھی ادھر کا رخ بھی نہیں کیا۔

"یہ بابے دی ہائم اور میکسی ہاؤس کیا ہے؟"

"ہائم (Heim) یہاں اس بڑی بلڈنگ کو کہتے ہیں جہاں بہت سے لوگ رہتے ہوں۔ پاکستانیوں نے ان ہائمز کے اپنے نام رکھے ہوئے ہیں مثلاً چاچے دی ہائم، تائے دی ہائم وغیرہ۔ جہاں ہم رہتے ہیں اس کا نام 'بابے دی ہائم' ہے۔ میکسی ہاؤس چکلے کو کہتے ہیں، جو شہر میں مختلف جگہوں پر ہے یہ کئی منزلہ عمارت ہوتی ہے جو سیڑھیوں کے ذریعے طے کرنا پڑتی ہے۔ ہر منزل پر جہاں سیڑھیاں ختم ہوتی ہیں وہاں کمروں کے باہر سیڑھیوں کی ریلنگ کے ساتھ طوائفیں بیٹھی ہوتی ہیں۔ چالیس مارک!! بہت زیادہ ہیں۔"

"تم جب سے آئے ہو، میونخ ہی میں رہے ہو یا کسی دوسرے شہر میں بھی قسمت آزمائی کی ہے؟"

"بون بھی گیا ہوں مگر وہاں نوکری نہیں ملی مجھے یوں بھی میونخ زیادہ اچھا لگا ہے۔ یہ جو اتنی خوبصورت ٹرامیں اور بسیں تم یہاں دیکھ رہے ہو۔ بون میں نظر نہیں آئیں گی۔ وہاں چلنے والی ٹرام اور کراچی کی ٹرام میں کوئی فرق نہیں۔ بسیں بھی انتہائی خستہ ہیں۔ کنڈکٹروں نے ٹکٹ کی گڈیاں ہاتھ میں پکڑی ہوتی ہیں۔"

یہ ٹرام عین قیصر سٹریٹ کی بجائے اس کے گرد و نواح میں تھی اور وہ علاقہ قریب آنے کو تھا۔ پیشتر اس کے کہ مسعود بغیر ٹکٹ اتر جاتا، کنڈیکٹر اس کے پاس پہنچ چکا تھا۔ مسعود نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر میری طرف دیکھ کر کہا "یار ذرا ٹوٹے ہوئے پیسے ......"

بابلے دی ہائم کی دیواریں ایک عرصے سے سفیدی نہ ہونے کے باعث سیاہ پڑ چکی تھیں اور عمارت اتنی خستہ حال تھی کہ اس کی چھتیں اور دیواریں کسی بھی وقت گر سکتی تھیں۔ سیڑھیاں چڑھتے جگہ جگہ بلغم کے نشان دکھائی دیئے۔ پرویز پہلی ہی منزل میں مقیم تھا۔ ہال نما کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے قطار اندر قطار چارپائیاں بچھی دکھائی دیں۔ ان میں سے بیشتر کی پائنتی پر بستر لپیٹے ہوئے رکھے تھے۔ کچھ چارپائیاں ایسی بھی تھیں جن پر لوگ لیٹے ہوئے تھے۔ کمرے کے ایک کونے میں تیل والا چولہا پڑا تھا جس پر مٹی کی ہنڈیا چڑھی تھی اور ایک پاکستانی جوان اس میں ڈوئی ہلا رہا تھا۔ ایک دوسرا شخص پاؤں کے بل بیٹھا ہل ہل کر ایک کٹالی میں آٹا گوندھ رہا تھا۔ آٹا گوندھنے کی مسلسل حرکت اور چولہے کی تپش سے پسینوں پسینے ہو رہا تھا۔ اس نے ایک لمحہ توقف کر کے ماتھے پر سے پسینہ پونچھا، اور پھر انہی ہاتھوں سے دوبارہ آٹا گوندھنے میں مشغول ہو گیا۔ چارپائی پر بیٹھا ایک نوجوان سوئی دھاگا ہاتھ میں لئے قمیص میں بٹن ٹانک رہا تھا—— کمرے کے درمیان میں پڑی ایک چارپائی پر بیمار کا ایک ملگجی رضائی لپیٹے پڑا تھا۔ اسے تیز بخار تھا اور وہ وقفے وقفے بعد کراہ رہا تھا—— "پانی" اس نے نحیف سی آواز میں کہا اور اس کے سرہانے بیٹھے ایک نوجوان نے صراحی میں سے پانی انڈیل کر اسے دیا۔ یہ سب لوگ پنجاب کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے چہروں پر غربت و افلاس اور محنت و مشقت کی لکیریں اتنی گہری تھیں کہ باقی تمام نقوش ان میں چھپ گئے تھے اور یوں ان سب کی شکلیں ایک جیسی ہو گئی تھیں۔ جب ہم کمرے میں داخل ہوتے تو ہمارے پاؤں کی چاپ سن کر قمیص میں بٹن ٹانکنے والے زرد رو نوجوان نے سر اٹھا کر ہماری طرف دیکھ اور پھر مسعود کے ساتھ ایک خوش پوش اور مختلف شکل کے اجنبی کو دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ میرے اور پرویز کے دوست ہیں عطا صاحب! ان سے ملو" مسعود نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

وہ نوجوان بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آگے بڑھا اور مرعوبیت کے عالم میں اپنے دونوں ہاتھ مصافحے کے لئے میری طرف بڑھا دیئے۔ اس اثنا میں آٹا گوندھنے والے نے کٹالی پرے سرکائی اور ہاتھ دھو کر مجھ سے ہاتھ ملانے کیلئے بڑھا۔ میں چارپائی پر بیٹھنے ہی کو تھا کہ زرد رو نوجوان نے "نہ نہ" کرتے ہوئے مجھے رکنے کا اشارہ کیا اور پھر لپٹا ہوا بستر کھول کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ یہ بستر گھگھر کی بنی ہوئی دری اور کڑھے ہوئے غلاف والے سرہانے پر مشتمل تھا اتنے میں سامنے والے کمرے سے سسکیوں کی آواز سنائی دی

اور پھر یہ بلند ہوتی چلی گئی۔

"یہ کون رو رہا ہے ؟" میں نے مسعود سے پوچھا۔

"جہلم کے ایک شخص کا والد فوت ہو گیا ہے۔ اسے پرسوں تار کے ذریعے اطلاع ملی تھی۔ اس وقت سے یہ مسلسل روئے جا رہا ہے۔" مسعود نے میرے برابر میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

دوسرے لوگ سامنے والی چارپائی کے کنارے پر بیٹھ گئے تھے۔

"اس کمرے میں کتنے لوگ رہتے ہیں ؟" میں نے رونے والے کی طرف سے اپنا دھیان ہٹانے کے لئے کمرے میں بچھی کم و بیش پچیس چارپائیوں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"جتنی چارپائیاں آپ کو نظر آ رہی ہیں۔ اس سے دو گنے لوگ مقیم ہیں۔ رات کو کام کرنے والے دن کو یہاں آ کر سو جاتے ہیں۔ اور دن کی شفٹ والے رات کو یہاں آرام کرتے ہیں۔ بوقتِ ضرورت ایک چارپائی پر دو افراد بھی سو جاتے ہیں۔"

مسعود، پرویز کو بلانے چلا گیا تھا۔ اتنی دیر میں کئی اور نوجوان ایک نووارد کو دیکھ کر سامنے والے کمرے سے آئے اور میرے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے۔

"وطن کا کیا حال ہے جی ؟ بڑی بری بری خبریں سننے میں آ رہی ہیں۔" ایک نے پوچھا۔

"اس بارے میں میری معلومات بھی آپ جتنی ہیں۔"

"آپ پاکستان سے نہیں آ رہے ؟"

"نہیں ــــ میں پاکستان جا رہا ہوں۔"

"آپ کہاں سے آ رہے ہیں ؟"

میں نے انھیں مختصراً اپنے بارے میں بتایا تو وہ چارپائیاں کھسکا کر میرے اور قریب آ گئے۔ "آپ ہمیں امریکہ کا ویزا نہیں دلوا سکتے۔" ان کے لہجے میں لجاجت تھی۔

"وہاں پہنچنا بہت مشکل ہے۔ پہلے وہاں سے کسی دوست سے SPONSER کروانا پڑتا ہے، پھر ویزے کا مرحلہ آتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ ملک سات سمندر پار ہے۔ کرایہ بھی بہت زیادہ ہے۔" وہاں پہنچنا اور وہاں رہنا ان بے آسرا اور غریب لوگوں کے بس میں نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے دل پر جبر کر کے صحیح صورت حال سے انھیں آگاہ کر دیا۔ میں انھیں کسی نئی خود فریبی میں مبتلا نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

ان کے چہروں پر لمحہ بھر کے لئے امید کی جو روشنی نمودار ہوئی تھی، وہ آناً فاناً غائب ہو گئی۔

اتنے میں دروازے میں ایک سرخ و سفید چہرے والا موٹا تازہ شخص نمودار ہوا وہ اگرچہ قمیص پتلون میں ملبوس تھا لیکن چہرے مہرے سے گنوار اور کھردرا سا شخص لگتا تھا۔ اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور پھر کوئی توجہ دیئے بغیر بوٹوں سمیت چارپائی پر چت لیٹ گیا۔

"اڑے فقیریئے، اِدھر آ کے میری ٹانگیں دبا۔" اس نے لیٹے لیٹے رعب دار آواز میں حکم دیا۔ اس پر قمیص میں بٹن ٹانکنے والا زرد رو نوجوان پلک جھپکنے میں اُٹھا اور چارپائی کی پائنتی کے کنارے پر بیٹھ کر اس کی ٹانگیں دابنے لگا۔

"یہ کون شخص ہے؟" میں نے اس کے رویے پر حیران و پریشان ہو کر سامنے بیٹھے نوجوان سے پوچھا۔

اُنھوں نے جواب میں ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ ان کے چہرے پیلے پڑ گئے تھے۔ پھر ان میں سے ایک اونچی آواز میں بولا۔ "یہ ہمارے چودھری صاحب ہیں۔ ہمارے بڑے مہربان ہیں۔ ہم انہی کی وجہ سے یہاں ہیں، ورنہ کب کے نکالے گئے ہوتے۔"

"نواز کے بچے، تم بھی ادھر آؤ، یہ جوتے اتار کے چارپائی کے نیچے رکھ دو۔" اور اب کے آٹا گوندھنے والا برق رفتاری سے اس کی طرف بڑھا اور تسمے کھولنے لگا۔ "تمہاری ماں کو...... ہاتھوں میں جان نہیں ہے کیا؟ کوڑھوں کی طرح دبا رہے ہو؟" اس نے فقیریئے کو موٹی سی گالی دی۔

یہ سب کچھ دیکھ کر میرے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا تھا۔ پیشتر اس سے کہ میں زبان کھولتا کہ سامنے بیٹھے ہوئے خوفزدہ نوجوان نے ایک بار پھر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کی درخواست کی۔

"تم لوگوں کے پاس یہ کون بیٹھا ہوا ہے؟" اس نے پلٹا کھا کر اوندھے ہوتے ہوتے اپنا چہرہ میری طرف کرتے ہوئے کہا۔

"یہ پرویز صاحب کے مہمان ہیں جی۔"

"اچھا اچھا۔" وہ چارپائی پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا لہجہ ایک دم تبدیل ہو گیا تھا۔ "پرویز تو اپنا یار ہے۔ کیا حال ہے جناب۔ آپ ویسے ہی کے نہیں میرے بھی مہمان ہیں، چل اوئے نواز جلدی سے ان کے لئے چائے بنا کے لا۔"

"میں چائے نہیں پیوں گا۔" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ میرے دل میں اس مکروہ شخص کیلئے

نصرت کا لاوا اُبل رہا تھا۔

اُوہ میرا پرویز بادشاہ آگیا" اچانک اس نے اپنے بازو ہوا میں پھیلائے اور چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ پرویز دروازے میں داخل ہو رہا تھا چوڑی چکلی چھاتی، گٹھا ہوا بدن اور سانولے چہرے پر خود اعتمادی کا غازہ۔ اس کے ساتھ مسعود بھی تھا۔ پرویز ادھر اُدھر دیکھے بغیر سیدھا میری طرف آیا اور میرے سینے سے چپک گیا۔ اس کے معانقے میں گہری محبت اور خلوص کی گرمی تھی۔ اس نے کافی دیر تک مجھے لپٹا کے رکھا اور پھر میرے برابر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"جب سے آپ کا فون آیا، میرا کام میں جی نہیں لگ رہا تھا۔ آپ اتنی دیر کیا کرتے رہے؟"

"کچھ کام کرنے تھے۔ ان میں دیر لگ گئی"

پرویز کے آنے سے کمرے میں بیٹھے ہوئے نوجوانوں کے چہروں سے خوف زائل ہوگیا تھا اور اب وہ چہک رہے تھے۔ ان کا آقا بھی اب ان سے مصنوعی ملائمت کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا۔

"چلو اٹھو کہیں سیر کو چلتے ہیں" پرویز نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ میں اور مسعود اس کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ کراہنے والے شخص نے ایک بار پھر پانی مانگا۔ اس بار پرویز نے کونے میں پڑی صراحی سے پانی انڈیل کر اسے دیا۔ پرویز نے اس موٹے شخص کو مخاطب کیا "تم سے پھر ملاقات ہوگی"

اور پھر ہم بابے دی ہائم سے نکل کر میونخ "فرائی ہائٹ" (بسوں کا آخری سٹاپ) سے انگلش گارڈن کی طرف نکل گئے۔ ہمارے ساتھ پاکستان کے ایک مضافاتی ہفت روزے کا ایک ایڈیٹر بھی تھا جو ہیڈ پیوں میں مل گیا تھا اور پرویز اسے بھی ساتھ لے آیا تھا۔ اس کا نام تنویر تھا اور یہ بھی دیگر لوگوں کے ساتھ یہاں دھکے کھا رہا تھا۔

"یہ موٹا سا شخص کون تھا؟" میرے دل میں اس شخص کے لئے شدید نفرت پیدا ہو گئی تھی اور میں اس کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔

"کیا بات ہے اس حرامزادے نے آپ کو تو کچھ نہیں کہا؟" پرویز چلتے چلتے ایک دم رک گیا۔ اس کے چہرے پر غصے کے آثار نمایاں تھے۔

"نہیں لیکن اس کا رویہ ان غریب لوگوں کے ساتھ انتہائی حاکمانہ اور جابرانہ تھا"

"یہ شخص یہاں ایک طویل عرصے سے مقیم ہے۔ اسے امیگریشن ویزا مل چکا ہے۔ اس نے کچھ غنڈے

پالے ہوئے ہیں جن کے بل بوتے پر اس نے ان مظلوم لوگوں کو اپنا غلام بنایا ہوا ہے۔ ان سے باقاعدہ ٹیکس وصول کرتا ہے، خدمت لیتا ہے۔ جو حکم عدولی کرے اسے مار مار کر لہولہان کر دیتا ہے۔ یہ سب لوگ اس لئے ظلم سہہ جاتے ہیں کہ یہ پولیس کو ان کے غیر قانونی قیام کے بارے میں مطلع کرنے کی دھمکیاں دیتا رہتا ہے اور یوں اس کا سارا کاروبار بلیک میلنگ کے ذریعے چل رہا ہے"

"لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ یہ تم سے خاصا دبتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟"

"وجہ یہ ڈولے ہیں" پرویز نے بازو کی مچھلیاں دکھاتے ہوئے کہا۔ "جب میں پہلے روز یہاں آیا تو اس نے مجھے بھی تابع فرمان بنانے کی کوشش کی۔ میں نے مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیا۔ اگلے روز یہ غنڈوں کو ساتھ لے آیا۔ یہ ڈیڑھ ڈیڑھ پسلی کے غنڈے تھے۔ مگر ان پسے ہوئے مجبور و مظلوم لوگوں کی کمزوری نے انھیں شیر بنا رکھا تھا۔ میں نے ان کی بھی خبر لی۔ پھر اس نے مجھے دھمکی دی کہ میں تمہیں دو دن میں جرمنی سے نکلوا دوں گا۔ میں نے اسے کہا کہ میں تو یہاں سے زندہ جاؤں گا لیکن تمہاری لاش وطن واپس جائے گی۔ اس پر اس کا دماغ درست ہو گیا۔ یہ اندر سے بہت خار کھاتا ہے مگر فی الحال مصلحتاً خاموش ہے۔ اب یہ میرے سامنے ان بے نوا اور بے آسرا لوگوں کو بھی کچھ نہیں کہتا مگر بعد میں ساری کسریں نکال لیتا ہے۔ میرا دل ان کے لئے روتا ہے لیکن میں اکیلا ان کا دفاع نہیں کر سکتا۔ اپنی رہائی کے لئے انہیں بھی کچھ کرنا ہوگا"۔

"اچھا خیر چھوڑو" میں آزردہ ہو گیا اور گفتگو کا رخ موڑنا چاہتا تھا۔ "تمہیں جرمن زبان میں ابھی تک کچھ شد بدھ حاصل ہوئی ہے یا نہیں؟"

"شد بدھ کیا، اچھی خاصی روانی سے بول لیتا ہوں۔ بلکہ میں تو پڑھنا بھی سیکھ گیا ہوں۔ یہاں کا سب سے مشہور اخبار سود دودچے رماٹی ودونگ" SUD DEUTCHE ZIETUNG ہے اور میں باقاعدگی سے اس کا مطالعہ کرتا ہوں"۔

"میونخ سے کتنے اخبار نکلتے ہیں؟"

"بہت سے ہیں تاہم اسی میں آبنبت سائی ٹونگ، ٹی۔ زیڈ اور وی ولیٹ وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ ان میں بعض اشتہار ہم پاکستانیوں کے لئے بڑے مزے کے ہوتے ہیں، مثلاً ایک اشتہار جو عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے۔

INDIANER MODLE FUR-SIE

یعنی آپ کے لئے خوبصورت ہندوستانی نوجوان ماڈل دوشیزہ۔ اس کے ساتھ ٹیلیفون نمبر بھی دیا ہوتا ہے پاکستانی اس نمبر پر ٹیلیفون کرکے ان ہندوستانی دوشیزاؤں کو تنگ کرتے ہیں اور وہ جواب میں انہیں اردو کی بجائے جرمن میں گالیاں دیتی ہیں۔"

"یہ ہندوستانی لڑکیاں صرف ماڈلنگ ہی کا کام کرتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ ماڈلنگ تو محض آڑ ہے ورنہ ان کا اصل کام جسم فروشی ہے۔ ماڈلنگ کی آڑ انھیں اس لئے لینا پڑتی ہے کہ ایک طوائف کا لائسنس حاصل کرنے کے لئے یہاں خاصے دشوار گذار مراحل سے گذرنا پڑتا ہے اور دوسرے غیر ملکی لڑکیوں کو اس کے لئے یہاں "ورک پرمٹ" نہیں ملتا۔"

میونخ میں پاکستانی لڑکیاں بھی تو ہوں گی۔

"ایک نہیں کئی ہیں لیکن وہ اونچے گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں اور یہاں تعلیم کے لئے آئی ہیں۔ ان میں سے ماڈل ٹاؤن کی سے میری ملاقات بھی ہوئی تھی۔ آپ شاید اسے نہیں جانتے۔ وہ ایک جرمن لڑکے کے ساتھ باہوں میں باہیں ڈالے نشارن برگ جھیل کے قریب پھر رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر نظریں چرانے کی کوشش کی لیکن اتفاق سے وہ جرمن میرا دوست تھا اور پھر ہم تینوں ایک قریبی بار میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی ہمارے ساتھ ناؤ نوش میں مشغول ہو گئی۔"

اتنی دیر میں ہم لوگ انگلش گارڈن میں گھنے درختوں کے درمیان پہنچ گئے تھے۔ جہاں بے شمار لڑکے لڑکیاں سبز گھاس پر تیج بلبلوں کی جوڑی کی طرح لیٹے ہوئے تھے۔ پارک کے بیچوں بیچ ایک جھیل تھی جس میں بطخیں تیر رہی تھیں۔ جھیل کا پانی خاصا گدلا تھا۔ نوجوان جوڑے یہاں بوٹنگ کر رہے تھے اور ان کشتیوں کی اندرونی صورت حال بھی کچھ اس طرح کی تھی کہ اندر لیٹے ہوئے جوڑوں نے چپو چلانے بند کر دیئے تھے اور کشتی کو موجوں کے سہارے چھوڑ دیا تھا۔ کچھ جرمن نوجوان یہاں بکھرے بالوں اور الجھی داڑھیوں کے ساتھ اکیلے بھی گھوم رہے تھے۔ پرویز نے ان کی طرف اشارہ کیا اور کہا "یہ سب چرسی ہیں اور انگلش گارڈن میں کسی محفوظ گوشے میں بیٹھ کر اپنا شوق پورا کرتے ہیں۔ یہاں درختوں کی شاخوں میں سیروں کے حساب سے چرس بھی چھپا کر رکھی جاتی ہے۔ چرس کے تاجر یہاں آتے ہیں اور ان درختوں کے نیچے سودے طے پاتے ہیں۔ پولیس یہاں اکثر چھاپے مارتی رہتی ہے۔ کئی پولیس والے یہاں سادہ لباس میں بھی پھرتے رہتے ہیں۔"

پرویز اپنے ساتھ پوری بوتل لایا تھا۔ اس نے اسے منہ لگایا اور پھر تنویر کی طرف بڑھا دی۔
تنویر کہہ رہا تھا "ہم لوگ پاکستان میں درآمد ہونے والی یورپی فلموں میں جو کچھ دیکھتے تھے اور پھر حاصل کرنے کی تمنا کرتے تھے۔ یہاں آکر ان میں سے کچھ بھی نہیں ملا۔ نہ کار، نہ ٹیلیویژن، نہ ریفریجریٹر، نہ ایئرکنڈیشنڈ گھر، نہ سوئمنگ پول اور نہ خوبصورت لڑکیاں۔ ہم لوگ یہاں سارا دن کوئی نچلے درجے کا کام کرتے ہیں۔ یا بے دی ہائم میں رہتے ہیں۔ مقامی لوگوں سے ہمارا کوئی ربط ضبط نہیں، وہ ہمیں حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان عوامل کے نتیجے میں فرسٹریشن کا شکار ہوکر، ہم اپنی خون پسینے کی کمائی سے شراب پیتے ہیں عورت کی تلاش میں میکسی ہاؤس کی طرف نکل جاتے ہیں اور چالیس مارک خرچ کرکے آجاتے ہیں۔ ایک بار ہمارا ایک ساتھی اپنی خوبصورت جرمن گرل فرینڈ کو ہائم میں لے آیا تھا، یہاں ایک انار تھا اور سو بیمار تھے، سو گڑبڑ ہوگئی۔ پولیس تک نوبت پہنچی۔ اس کے بعد کوئی لڑکی اس سڑک کا رخ بھی نہیں کرتی۔ ہم لوگ تمام محرومیوں کے باوجود یہاں رہ رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بیشتر کے پاس واپسی کا کرایہ تک نہیں ہے۔ دوسرے ہم لوگ بڑی ڈینگیں مار کر یہاں آئے تھے کہ وہاں جاکر یہ کریں گے، وہ کریں گے اور تیسرے ہم یہاں تمام تر تشنہ حسرتوں کے باوجود ایک نعمت سے ہم کنار ہیں اور وہ آزادی کی نعمت ہے۔ ہم متوسط طبقے کے لوگ جن گھروں سے تعلق رکھتے ہیں وہاں بے شمار ناروا پابندیاں روا رکھی جاتی ہیں جب کہ ہم یہاں آزاد ہیں۔ ہماری سرگرمیوں پر کوئی انگلی دھرنے والا نہیں۔ اپنی مرضی سے گھر سے نکلتے ہیں اور اپنی مرضی سے واپس آتے ہیں ـــــ البتہ یہ جو دوسرے لوگ آپ کو یہاں نظر آتے ہیں، ان کا معاملہ مختلف ہے۔ یہ انتہائی پس ماندہ علاقوں سے یہاں آئے ہیں۔ ان میں سے کوئی اپنی بیوی کے زیور فروخت کرکے یہاں ہے، کسی نے اپنی کٹیا رہن رکھی ہے۔ کوئی اپنے چند کِلے زمین بیچ کر آیا ہے اور کسی نے اپنے عزیز و اقارب سے ادھار لیا ہے۔ انھیں اپنے بوڑھے والدین کو پالنا ہے۔ اپنی بہنوں کی شادیاں کرنی ہیں، اپنے بچوں کے لئے دو وقت کی روٹی مہیا کرنی ہے۔ سو ان کا مسئلہ صرف زندہ رہنا ہے اور وہ کچھ نہ کچھ رقم ہر مہینے گھر بھیج دیتے ہیں اور کچھ رقم واپسی پر بھی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں، جس سے وہ کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کر لیتے ہیں ـــــ ان کا مسئلہ بھوک ہے اور یہ انفرادی آزادی وغیرہ ہم لوگوں کے مسئلے ہیں۔"!
پرویز نے ایک بار پھر بوتل کو "ڈیک" لگائی اور مجھ سے پوچھا "یہ تنویر کیا کہہ رہا تھا؟ خیر جو بھی کہہ رہا تھا، ٹھیک ہی کہہ رہا ہوگا۔ آئیں بوٹنگ کرتے ہیں؟"

جب چہچہاتے چہچہاتے پرویز کے بازو شل ہوگئے تو اس نے کشتی کنارے پر لگا دی۔ شروع میں وہ کچھ افسردہ سا نظر آرہا تھا۔ لیکن اب نشہ بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کے لہجے میں شگفتگی آتی جارہی تھی۔ تنویر پہلے سے زیادہ DEPRESSED ہوگیا تھا، مسعود نہ خوش تھا نہ افسردہ، وہ صرف لڑکیوں کو گھورنے میں مشغول تھا۔ کبھی ایک کو دیکھتا اور کبھی دوسری کو اور پھر کھجلانے میں مشغول ہو جاتا۔ انگلش گارڈن پر شام محیط ہوتی جارہی تھی اور یہاں کی رونقیں ماند پڑنا شروع ہوگئی تھیں۔ ہم یہاں سے نکلے اور شوابنگ کے بارونق علاقے میں آ گئے۔ مسعود اور تنویر واپس ہاٹم چلے گئے تھے۔ تنویر نے بقعۂ نور بنے ہوئے شوابنگ میں سے گزرتے ہوئے زور سے پاؤں زمین پر پٹکا اور کہا "یہ ہے وہ یورپ جس کے ہم خواب دیکھا کرتے تھے۔ ہم یہاں رہ کر بھی خواب ہی دیکھتے ہیں"۔

یہاں زندگی کی تمام رونقیں اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر تھیں، یہ سارا علاقہ رنگا رنگ روشنیوں اور نیون سائنوں سے مرکزِ نگاہ بنا ہوا تھا۔ مقامی لوگوں کے علاوہ غیر ملکیوں کی ایک بڑی تعداد بھی یہاں گھوم رہی تھی۔ یہاں بڑے بڑے سٹور بھی تھے اور نائٹ کلب بھی۔ بار بھی تھے اور سنیک بار بھی۔ یہاں ہر طرح کے لوگ جمع تھے۔ ایک کثیر تعداد حیوانیت کے وہ مظاہر دیکھنے کے لئے آئی تھی جو یہاں پر موجود نائٹ کلبوں کا خاصہ ہیں۔ کچھ لوگ اپنی گرل فرینڈز کے ساتھ محض ڈرنک اور ڈانس کے لیے یہاں آئے تھے۔ کچھ نارمل ڈنر کے موڈ میں تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو کسی سنیک بار کے باہر "گرم کتوں" (HOT DOG) ہی سے کام و دہن کی تواضع میں مشغول تھے۔ ایک جگہ ہپیوں کے غول بھی دکھائی دیئے۔ وہ ان سارے ہنگاموں سے بے نیاز اپنی گدڑی میں مست تھے۔ ایک کونے میں ایک خوبصورت گل فروش لڑکی پھول بیچ رہی تھی۔ پرویز اب پوری طرح فارم میں تھا، وہ انتہائی خوش دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے لڑکی سے ایک گلدستہ خریدا اور پھر یہی گلدستہ عاشقانہ انداز میں اسے پیش کرتے ہوئے کہا "یہ میری طرف سے تمہارے لئے ہے"۔ لڑکی کے چہرے پر ایک دلنواز مسکراہٹ ابھری۔ یہ دیکھ کر پرویز نے مجھے کہنی ماری اور کہا "ہن کی کراں؟ (اب کیا کروں)

ایک جرمن لڑکی فٹ پاتھ پر چوکڑی مارے گیان دھیان میں مصروف تھی، پرویز اس کے ساتھ گھٹنے سے گھٹنا جوڑ کر یوگا کے انداز میں براجمان ہوگیا۔ لڑکی نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر شرارت دیکھ کر جرمن میں اسے کہا "یہاں سے اٹھ جاؤ"۔

"مجھے جرمن نہیں آتی" پرویز نے بھولا بنتے ہوئے کہا۔

وہ تھوڑی دیر چپ رہی، لیکن کچھ دیر بعد اس نے پھر جرمن میں کہا "یہاں سے اٹھ جاؤ۔"

"مجھے جرمن نہیں آتی۔"

"میں کہتی ہوں یہاں سے فوراً اٹھ جاؤ۔" اس نے اس بار قدرے درشت لہجے میں کہا۔

"مجھے جرمن نہیں آتی۔" پرویز نے دونوں ہاتھوں کو بے چارگی سے پھیلاتے ہوئے کہا۔

وہ تھوڑی دیر خاموشی سے اس کے شرارت بھرے چہرے کو تکتی رہی اور اس نے انگلی کھڑی کرتے ہوئے انگریزی میں چیخ کر کہا "میں کہتی ہوں یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

پرویز کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہو گیا اور ہنستے ہوئے جرمن میں کہنے لگا "میری زندگی کا واحد مقصد تم جرمنوں سے یہ اعتراف کرانا ہے کہ تم انگریزی جانتے ہو۔"

"میرا نام باربرا ہے" ایک کھلے بالوں والی انگور زادی نے اچانک سامنے سے آکر شستہ انگریزی میں مجھ سے اپنا تعارف کرایا "اور مجھے ایک کوکا کولا پینی ہے۔"

"تم چاہو تو کھانا بھی کھا سکتی ہو۔" پرویز نے اس من و سلویٰ کو اسرائیلی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کھانا میں کسی اور سے کھا چکی ہوں، اب میری ضرورت صرف کوکا کولا ہے۔"

ہم سامنے والے سنیک بار میں قطار کے لئے بنی ہوئی ریلنگ میں کھڑے ہو گئے اور پھر ایک ایک بوتل ہاتھ میں لئے دوبارہ باہر آن کھڑے ہوئے۔

"میں انڈیا جا رہی ہوں، وہاں مہارشیوں اور جوگیوں سے ملاقات کروں گی، مجھے یقین ہے تم بھی انڈین ہو۔ اگر میرا خیال درست ہے تو اپنا پتہ لکھاؤ میں وہاں تم سے ملاقات کروں گی۔ تم تو وہاں بڑے محل میں رہتے ہو گے۔"

میں نے جیب سے کاغذ کا پرزہ نکالا اور اس پر کرشن چندر کا ایڈریس لکھ کر اس دوشیزہ کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "یہ میرا ایڈریس ہے، سارا انڈیا میرے نام سے واقف ہے۔ میں وہاں کا مشہور افسانہ نگار ہوں۔ تمہیں وہاں ریسیو کرتے ہوئے مجھے دلی مسرت ہو گی۔"

کرشن چندر کی طرف سے مجھے شکریے کا خط اگر پہلے موصول نہیں ہوا تو اب موصول ہو جانا چاہیئے۔

"چٹاخ" ایک کونے سے خوفناک طمانچے کی آواز گونجی۔ ایک جرمن نوجوان اپنی محبوبہ کی پٹائی کر

رہا تھا۔ "چٹاخ" ایک اور طمانچہ۔ پھر کچھ گالی گلوچ اور دوشیزاؤں کا اپنے محبوب کے بال نوچنا وغیرہ ——!

"یہ منظر میرے لئے نیا نہیں ہے، شاید آپ کے لئے نیا ہو" پرویز نے مجھے بتایا۔

"میرے لئے بھی نیا نہیں ہے —— امریکہ میں بھی میں نے مردوں کو اسی طرح عورتوں کی پٹائی کرتے دیکھا ہے"۔

"مجھے پھر سے پیاس لگنے لگی ہے" پرویز نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ غالباً اس کا نشہ کم ہو رہا تھا۔

وہ بائیں جانب کے ایک بار میں گھس گیا اور قریباً ایک گھنٹہ بعد واپس آیا۔ وہ اب بُری طرح نشے میں تھا اور اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے ایک بوتل اس کے ہاتھ میں بھی تھی۔

"آئیں ماریں پلاٹس چلتے ہیں"

"وہاں کیا ہے؟"

"وہاں ایک میکسی ہاؤس ہے"!

"لعنت بھیجو"، میں پہلی بار پرویز کے بارے میں مشوش ہوا "پرویز خود کو سنبھالو، تم یہاں اپنی زندگی برباد کرنے نہیں آئے! تم شب و روز محنت کے باوجود وہیں کھڑے ہو جہاں تمہارے بدخواہ تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں"!

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اس نے فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "اگر آپ نہیں جانا چاہتے تو نہ سہی، چلیں کھانا کھاتے ہیں"!

ہم ایک ہوٹل سے کھانا کھا کر نکلے تو رات گہری ہو چکی تھی۔ محبوب سے طمانچے کھانے اور جواباً اس کے بال نوچنے والی لڑکی اب اس کے کاندھوں پر سر رکھے سڑک کے کنارے کنارے جا رہی تھی اس کے چہرے پر محبت کی سرخوشی اور طمانیت تھی۔ پرویز کھانے کے بعد بھی برابر پینے میں مشغول تھا۔ گھر کے قریب پہنچ کر اس نے ایک جگہ اکڑوں بیٹھ کر قے کی اور پھر وہیں زمین پر لیٹ گیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے بمشکل اسے اٹھایا اور سہارا دے کر سیڑھیاں طے کراتے ہوئے اس ہال نما کمرے میں لے گیا جہاں قطار اندر قطار بچھی ہوئی چارپائیوں پر زندہ لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک کونے سے سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ رونے والے نے اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ اس نیم تاریک کمرے

میں کسی کا چہرہ بھی روشن نہیں تھا۔ میں نے پرویز کو اس کی چارپائی پر لٹایا اور بابے دی ہائم سے نکل کر
(FELD HUTTER) میں چلا آیا۔

صبح ٹیلیفون کی گھنٹی بجی گوٹن ٹاگ" (صبح بخیر) دوسری طرف کا کوئی ملازم تھا "واخ ٹراخ ڈزن فذق"
وہ جرمن میں کچھ کہہ رہا تھا۔ اس نے تو خدا جانے کیا کہا تھا لیکن مجھے یہی محسوس ہوا جیسے "واخ ٹراخ
ڈزن ڈزن" کہہ رہا ہو — یہ لوگ امن کے دنوں میں بھی توپیں داغنے سے باز نہیں آتے۔
"آئی ڈونٹ نو جرمن" میں نے "اتحادیوں" کی طرف سے اس "جارحیت" کا انگریزی میں جواب دیا۔
تھوڑی دیر تک محاذ پر خاموشی رہی اور پھر کسی دوسرے شخص نے ٹیلیفون اٹھایا۔ "سر آپ ناشتے میں
کیا پسند کریں گے۔"
"دو انڈے، سلائس، چائے اور دودھ کا ایک گلاس"
"سر آپ کو ہمارا بیکن (سور کا گوشت) بھی بہت پسند آئے گا؟"
مجھے یہ بیکن تو کیا پسند آنا تھا۔ غالباً میرا جواب بھی پسند نہیں آیا کیونکہ اس نے ریسیور رکھ دیا تھا۔
ویٹر کمرے میں ناشتہ رکھ کر جا ہی رہا تھا کہ ایک بار پھر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔
"پیارے کیا حال ہے؟" یہ مسعود تھا اور اس وقت خاصی بے تکلفی کے موڈ میں تھا۔
"ارے تم صبح صبح کہاں سے ٹپک پڑے؟"
تھوڑی دیر تک اُدھر سے کوئی جواب نہ آیا، بس سسکاریاں سی سنائی دیتی رہیں۔ غالباً وہ کھجلانے
میں مصروف ہو گیا تھا۔
"مجھے پرویز نے تمہیں فون کرنے کے لئے کہا ہے۔ وہ تیار ہو رہا ہے۔ تم بھی فوراً تیار ہو جاؤ۔ ہم
ٹیگرن سی (TEGERNSEE) جا رہے ہیں اور وہاں سے کل لوٹیں گے، تم چاہو تو ہوٹل چھوڑ دو کیونکہ
کل تمہیں استنبول کے لئے روانہ ہونا ہے" بالآخر اس کی آواز سنائی دی۔
"ٹیگرن سی کیا چیز ہے اور بیٹھے بٹھائے یہ پروگرام کیسے بن گیا؟"
ٹیگرن سی یہاں سے قریباً پچاس کلومیٹر دور ایک انتہائی خوبصورت صحت افزا مقام ہے۔ میونخ
کا طبقۂ امرا یہ سیزن وہیں گذارتا ہے۔ وہاں پرویز کے ایک دوست ہانس کی سووینئرز کی دکان ہے۔

ہم اسی کے ہاں ٹھہریں گے۔ اتفاق سے پرویز کا باس بھی آج اُدھر ہی جا رہا ہے۔ ہم بڑے آرام سے اس کی کار میں چلے جائیں گے۔ پرویز نے اس سے بات کر لی ہے۔"

"کیا اس کے لئے مجھے بلیبے وی ہائم آنا پڑے گا؟"

"نہیں تم یہیں ٹھہرو، ہم تمہارے پاس آرہے ہیں۔"

ٹیلیفون بند کرکے میں نے جلدی سے ناشتہ کیا اور پھر ہوٹل کے قریب واقع جنرل پوسٹ آفس چلا گیا جہاں میں نے اباجی کو خیریت کا خط لکھا اور استنبول میں اپنے دوست منور کو اپنی آمد کی تاریخ سے مطلع کرنے کے لئے تار دیا۔

واپسی پر میں نے اپنا سامان پیک کیا اور بلوں کی ادائیگی کے بعد لاؤنج میں بیٹھ کر ان کا انتظار کرنے لگا۔ انھوں نے آنے میں کافی دیر لگا دی تھی۔"

"آؤف ویدر زین" (AUF WIEDER SEIN) کاؤنٹر کلرک نے کاروباری مسکراہٹ کے ساتھ مجھے "خدا حافظ" کہا اور میں پرویز مسعود کے ساتھ باہر نکل آیا۔

کار میں پرویز کا باس ایک بازو کھڑکی پر جمائے سگریٹ کے کش لگانے میں مصروف تھا۔ اس کی عمر چالیس بیالیس کے قریب تھی اور جسم پھولا پھولا سا تھا بھوری رنگت پر بھوری مونچھیں،

"گوٹن مارگن" میں نے اس کے قریب پہنچ کر دس بجے کے بعد کا جرمن سلام کیا۔

اس نے مسکرا کر میرا استقبال کیا اور پھر اپنے برابر والی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا "نیمن زی پلیٹز" بیٹھے (تشریف رکھیے)

پرویز اور مسعود پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد کار شہر کی حدود سے نکل کر ہائی وے پر آگئی۔

"مجھے تمہارے دوست نے بتایا ہے کہ تم صحافی ہو، تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی" بھالو نے اپنے ترجمان پرویز کی وساطت سے خیر سگالی کے یہ جذبات مجھ تک پہنچائے۔

"کیا اسے واقعی انگریزی نہیں آتی یا یہ بھی پوز کر رہا ہے؟" میں نے پرویز سے پوچھا اور پھر تصدیق کے بعد کہا "میری طرف سے جو کچھ کہنا چاہو کہہ دو۔" سو پرویز نے جی میں جو آیا اس نے کہہ دیا۔

"جب پرویز نے مجھے بتایا کہ تم صحافی ہو تو میں ڈر گیا۔ ہم جرمن لوگ صحافیوں سے بہت ڈرتے ہیں۔"

اس نے خوش طبعی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گپ شپ کا آغاز کیا۔

"صحافیوں سے ڈرنے کی کیا بات ہے۔؟" میں نے بھی اسی ٹون میں پوچھا۔

"دراصل ہم لوگ اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں پر بہت جلد ایمان لے آتے ہیں اور اسی لئے اپنے معاملے میں بھی ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں کل کلاں ہمارے بارے میں بھی کوئی اسکینڈل اخبار میں شائع ہو جائے اور لوگ اس پر ایمان لے آئیں۔ اس سلسلے میں ایک جرمن لطیفہ بہت اچھا ہے، سنو گے؟"

"سناؤ۔" مجھے یہ شخص خاصا دلچسپ لگا تھا۔

"ایک شیر جنگل میں سو رہا تھا کہ ایک بندر اُدھر آ نکلا اور اس نے جنگل کے بادشاہ کو سوتے دیکھ کر بے ادبی کرنے کی کوشش کی۔ اس پر شیر کی آنکھ کھل گئی اور وہ اس کے پیچھے بھاگا۔ بندر بھاگتا ہوا ایک پارک میں گھس گیا جہاں لوگ بنچوں پر بیٹھے اخبار پڑھنے میں مشغول تھے۔ بندر نے بھی ایک اخبار پکڑا اور ان کے درمیان بیٹھ گیا۔ اتنے میں شیر ہانپتا ہوا وہاں پہنچا اور بندر کی پشت کی جانب کھڑے ہو کر پوچھا "تم نے یہاں کوئی بندر تو نہیں دیکھا؟"

"تم اس بندر کے بارے میں تو نہیں پوچھ رہے، جس نے شیر کے ساتھ بے ادبی کی ہے؟ بندر نے اخبار چہرے کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔

اس پر جنگل کے بادشاہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور اس نے گھبراہٹ کے عالم میں کہا "بیڑہ غرق کیا یہ خبر اخبار میں شائع ہو گئی ہے؟"

اس پر ہم سب کھِل کھلا کر ہنس پڑے۔

"تمہارا دوست بہت اچھا شخص ہے۔ انتہائی محنتی اور دیانت دار ہے" بھالو نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ اس کا اشارہ پرویز کی طرف تھا۔

"یہ تو مجھ سے پوچھو۔" مسعود نے مجھے مخاطب کر کے ہنستے ہوئے پنجابی میں کہا۔ "یہ محنتی تو یقیناً بہت ہے لیکن بکرے کی ران جو ڈاشر ریستوراں کی سب سے مہنگی ڈش ہے نہ صرف یہ کہ روزانہ چوری چھپے پوری کی پوری کھا جاتا ہے بلکہ ہائم کے تمام مکینوں کو ڈبل روٹی مکھن اور انڈوں وغیرہ کے علاوہ بکرے کی ران والے راشن میں بھی اپنے ساتھ برابر شریک کرتا ہے۔ کئی دفعہ ہم ... کر عصا ... سے

دودھ اور دہی بھی سپلائی کرتا ہے اور اوپر سے کہتا ہے کہ نیک کام کر رہا ہوں ـــــ اس کے مالک کو پتہ چلے تو ابھی چلتی گاڑی سے اسے نیچے پھینک دے۔"

گاڑی ہائی وے سے اتر کر ایک بل کھاتی چھوٹی سڑک پر آ گئی۔ یہ سڑک دونوں طرف سے درختوں میں گھری ہوئی تھی اور ان کی شاخوں نے سائبان کی طرح سڑک پر سایہ کیا ہوا تھا۔ اب قدرے چڑھائی شروع ہو گئی تھی۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد ہم ٹیگرن سی میں تھے۔ مجھے یہاں پہنچ کر یوں لگا جیسے جاگتے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں تا حدِ نظر پھیلی ہوئی وسیع و عریض "جھیل" کے ساتھ ساتھ پہاڑیوں کے سلسلے تھے جو پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔ اگرچہ یہ جگہ زیادہ بلندی پر نہ تھی۔ اس کے باوجود یہاں اچھی خاصی خنکی تھی۔ پرویز کے باس نے اس کے اشارے پر ایک جگہ کار کھڑی کر دی اور ڈکی سے سامان نکال کر "ڈانکے ویل" (شکریہ) کہتے ہوئے ہم رخصت ہونے لگے تو اس نے گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "اگر تم چاہو تو آج رات میری کاٹیج میں بسر کر سکتے ہو۔" میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر اس کی کار خاموش وادی کی پر سکون فضاؤں میں ہلکا سا ارتعاش پیدا کرتی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اب ہم اس پر سکون بستی کے چھوٹے سے بازار میں تھے۔ یہاں لکڑی کی بنی ہوئی دکانیں تھیں اِکا دکا لوگ باسکٹ ہاتھ میں لئے سودا سلف خریدنے میں مشغول نظر آتے تھے۔ ایک دکان پر پوسٹ کارڈز اور اس وادی سے متعلق سووینیرز شوکیس میں سجے ہوئے تھے اور اندر پچیس چھبیس سال کا ایک خوبرو نوجوان کھڑا تھا ـــــ یہ ہانس تھا۔ وہ پرویز کو دیکھتے ہی آگے بڑھا اور کہا "........ " یہ ٹھیٹھ پنجابی میں ایک موٹی گالی تھی اور بعد میں پتہ چلا کہ یہ سکھانے والا خود پرویز ہی ہے۔

تعارف پر اس نے مجھ سے اور مسعود سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور پھر دکان بند کر کے ہمارے ساتھ جھیل کے کنارے چلا آیا۔ اس کی اس حرکت پر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"مجھے تو یہ شخص اپنی عادات سے پاکستانی لگتا ہے۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا کہ یورپ میں کوئی شخص اپنے کسی دوست کی آمد پر یوں دکان بند کر کے اس کے ساتھ چل پڑے۔" میں نے پرویز سے کہا۔

آپ ٹھیک کہتے ہیں، یہ آدھا پاکستانی ہے۔ اسے یوں بھی پاکستان اور پاکستانیوں سے عشق ہے، یہ کہتا ہے کہ جب تم پاکستان واپس جاؤ تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانا، میں وہیں آباد ہونا چاہتا ہوں خصوصاً جب سے میں نے اسے بتایا ہے کہ وہاں چرس وافر مقدار میں اور قریباً مفت ملتی ہے تو یہ کہنے لگا کہ جلد

پاکستان چلو ورنہ تمہارے غیر قانونی قیام کے بارے میں پولیس کو مطلع کر دوں گا۔"

جھیل کے کنارے ایک ریستوران تھا اور اس کے ساتھ ساتھ دور دور تک کرسیاں بچھی ہوئی تھیں جن پر رنگین سائبان تنے ہوئے تھے۔ یہاں بہت رونق تھی اور شہر کے ہنگاموں سے بچ کر اس وادی میں سکون کے چند لمحات گذارنے کے لئے آئے ہوئے لوگ اپنے بیوی بچوں اور پیاروں کے ساتھ کرسیوں پر ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔

"کیا پیو گے؟" ہانس نے مجھ سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں پوچھا۔

"آپ جو بھی پلاؤ گے پی لوں گا" مجھے مسرت ہوئی تھی کہ جرمنی میں ایک شخص تو ایسا ملا جو غلاموں کے ساتھ ان کی زبان میں بات کر سکتا ہے۔ "ویسے میرا جی چائے پینے کو چاہ رہا ہے" میں نے اسے بتایا۔

"اور تم؟" اس نے مسعود سے پوچھا۔

"کوئی ٹھنڈی چیز پلاؤ" اس نے کھجلاتے ہوئے کہا۔ دراصل اسے اندرون لوہاری کے حکیم نور احمد نے ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ ہمیشہ ٹھنڈی چیزوں کا استعمال کرے۔

"تم سے تو پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں" ہانس نے پرویز کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا اور پھر دو بیئر، چائے اور جوس کے علاوہ "ام الخبائث" کا آرڈر دے دیا۔

ایک گھنٹے کی مسلسل مے نوشی کے بعد پرویز اور ہانس چہکنے لگے۔ خصوصاً پرویز ایک بار پھر مختلف روپ میں نظر آنے لگا تھا۔

"تمہارے باس کا کیا حال ہے؟" ہانس نے اس سے پوچھا۔

"ہم اسی کے ساتھ یہاں آئے ہیں، کل واپسی بھی اسی کے ساتھ ہوگی۔"

"یہ تمہارا باس کیسا آدمی ہے؟ مجھے تو بہت شریف سا انسان لگا ہے" میں نے پرویز سے پوچھا۔

"یہ اتنا ہی شریف ہے جتنا میں ایماندار ہوں" اس نے ہنستے ہوئے کہا "میں سارے ریستوران میں سب سے زیادہ محنت کرتا ہوں مگر یہ میری مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے سب سے کم پیسے دیتا ہے۔"

"تم اس کے ہاں معمولی سے ملازم ہو مگر میں نے دیکھا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ برابری کا سلوک کر رہا تھا۔ پھر اس نے میرے ساتھ بھی خاصے حسن سلوک کا مظاہرہ کیا ہے، خدا جانے تم یہ بات کیسے کہہ رہے ہو"

"پاکستان اور یورپ کے سرمایہ دار میں یہی فرق ہے" پرویز نے کہا "یہ لوگ حتی المقدور مزدور کی

عزتِ نفس مجروح نہیں ہونے دیتے کیونکہ انھیں ماہرینِ نفسیات نے بتایا ہے کہ اس صورت میں تم ان سے زیادہ کام لے سکتے ہو اور پھر سوشلزم کے خوف نے بھی انہیں کافی سیدھا کر رکھا ہے چنانچہ اب یہاں "ہنس مکھ سرمایہ داری" نافذ ہے۔ باقی آپ کے ساتھ خوش کلامی کی وجہ وہ بھی تھی جو اس نے بندر اور شیر والے لطیفے میں خود ہی بیان کر دی تھی، ورنہ وقت آنے پر یہ کسی سے کم سئور نہیں ہے۔"

برابر والی میز پہ ایک ادھیڑ عمر جرمن اور اس کی بیوی کھانا کھا رہے تھے۔ مرد نے کھانا کھاتے ہوئے جیب سے رومال نکال کر ناک پر رکھا اور زور سے "سُوں" کیا۔ یہ "سوں" کی آواز اس قدر زوردار تھی کہ ہم لوگوں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے بڑے اطمینان سے ایک بار اور "سوں" کی اور پھر وہی رومال جیب میں ڈال کر پہلے جیسے یکسوئی کے ساتھ کھانا کھانے میں مشغول ہو گیا۔

"یہ جرمن قوم بھی خالص جٹ ہے۔" پرویز نے ہنستے ہوئے کہا۔ یہ لوگ رکھ رکھاؤ اور آدابِ محفل کا کم ہی خیال رکھتے ہیں۔"

"سوں" ایک بار پھر مرد نے ناک سنکی اور اب کے گھن گرج پہلے سے زیادہ تھی۔ اس بار میری ہنسی چھوٹ گئی۔

جب اس نے تیسری بار یہی حرکت دہرائی تو پرویز اپنی جگہ سے اٹھ کر لڑکھڑاتا ہوا اس کی میز کی طرف گیا اور کہا "اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بار پھر اپنے فن کا مظاہرہ کریں۔ میرا دوست آپ کی اس پرفارمنس سے بہت محظوظ ہوا ہے۔"

مرد نے بُرا سا منہ بنایا اور پھر خاموشی سے کھانا کھانے میں مشغول ہو گیا۔ وہ غالباً جان گیا تھا کہ یہ مردِ ناداں اس وقت نشے میں ہے۔

"پرویز تم اپنی ان حرکتوں سے کسی دن بُری طرح پٹو گے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"پٹو گے کیا مطلب؟ یہ ایک مرتبہ بُری طرح پٹ چکا ہے۔" ہانس مجھ سے مخاطب ہوا۔ "ایک دن یہ شراب میں بُری طرح دُھت تھا۔ ہاٹم سے نکلا اور سڑک پر اسے جو پہلی لڑکی نظر آئی اسے لپٹا کر پٹاخ پٹاخ شروع ہو گیا۔ یہ جو اس کے سر کے ایک حصے سے بال اڑے ہوتے ہیں، یہ اسی واقعے کا شاخسانہ ہے۔"

"پاکستان میں تو یہ ایسا نہیں تھا۔"

یہاں بھی یہ جب تک ہوش میں ہو بالکل ٹھیک ہوتا ہے۔ البتہ اس کے بعد اس کے بارے میں کوئی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔ ایک بار اس کے اصرار پر میں نے ایک لڑکی سے اس کی ڈیٹ طے کی۔ اگلے روز وہ لڑکی میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ اپنے دوست کو سمجھاؤ کہ ڈیٹ پر کپڑے پہن کر آیا کرتے ہیں۔

اس پر پرویز نے بھرپور قہقہہ لگایا اور کہا۔" اس کی باتوں پر یقین نہ کرنا، اب یہ بالکل من گھڑت بکواس پر اتر آیا ہے۔"

"میں جو کچھ کہوں گا خدا کو حاضر ناظر جان کر کہوں گا۔" ہانس نے عدالت کے حلفیہ بیان کی طرح ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا اس کی ان حرکتوں کی تفصیل تو ابھی میں نے بیان ہی نہیں کی۔ ہمارے ہاں ایک لطیفہ ہے اور وہ غالباً اسی کے بارے میں ہے ـــــ کیا تم سننا پسند کرو گے؟"

"سناؤ" میں نے اس کے انداز بیان سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

"اسی طرح کے ایک نوجوان نے اپنے دوست سے کہا کہ ایک لڑکی پر بری طرح عاشق ہو گیا ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں مگر وہ گھاس نہیں ڈالتی۔ وہ بھی اسی رائیڈنگ کلب کی ممبر ہے جس کا میں رکن ہوں۔ چنانچہ روزانہ اسے دیکھتا ہوں اور روزانہ دل پکڑ کر بیٹھ جاتا ہوں۔ دوست نے پوچھا اس کی آنکھیں کس رنگ کی ہیں؟ عاشق زار نے بتایا کہ نیلے رنگ کی ہیں۔ اس پر دوست نے مشورہ دیا کہ تم اپنے گھوڑے کو نیلا رنگ کرا لو چونکہ گھوڑا کبھی نیلے رنگ کا نہیں ہوتا اس لئے وہ دیکھ کر چونکے گی اور پھر تم سے پوچھے گی کہ تم نے اسے نیلا رنگ کیوں کرایا ہے! اس کے جواب میں تم کہنا کہ چونکہ تمہاری آنکھیں نیلی ہیں اور مجھے تم سے پیار ہے، اس لئے میں نے وارفتگی کے عالم میں اپنے گھوڑے کا رنگ بھی نیلا کرا لیا ہے۔ اس پر وہ تمہاری طرف مائل ہو گی، پھر رفتہ رفتہ تم ایک دوسرے کے قریب آتے جاؤ گے اور پھر ایک دن مناسب موقع دیکھ کر اسے کہہ دینا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے قوی توقع ہے کہ وہ انکار نہیں کرے گی۔ اس نوجوان نے مشورہ پلے باندھا اور گھوڑے کو نیلا کرا کے دوشیزہ کا انتظار کرنے لگا۔ لڑکی نے وہ گھوڑا دیکھا تو حیران ہوئی، اس کے پاس آئی اور پوچھا" تم نے گھوڑے کو نیلا رنگ کیوں کرایا ہے؟" یہ سن کر نوجوان نے عالم اضطراب میں اسے کاندھوں سے پکڑا اور کہا" کیوں کہ میں نے تم سے شادی

کرنی ہے؟"

"تم باز آجاؤ، نہیں تو میں بھی تمہاری عمر بھر روزگار باتیں انھیں بتادوں گا؟" پرویز نے ہمارے ساتھ ہنسی میں شریک ہوتے ہوئے کہا "میں انھیں بتاؤں گا کہ تم نے بے شمار لڑکیوں کی خواہش کو ٹھکراتے ہوئے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟"

"بتا دو، اس میں چھپانے کی کون سی بات ہے۔"

"تو پھر سنو" پرویز نے چہکتے ہوئے کہا۔ ہانس کہتا ہے کہ میں اس لڑکی سے شادی کروں گا جس نے کبھی کسی غیر مرد کے فلیٹ میں رات بسر نہ کی ہو۔ پاکستان سے محبت اور وہاں آباد ہونے کی شدید خواہش کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کا خیال ہے وہاں ایسی عورتیں مل جاتی ہیں۔"

"کیا پرویز سچ کہتا ہے؟" میں نے حیرت زدہ نظروں سے ہانس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں! لیکن اس میں حیران ہونے کی کون سی بات ہے۔" اس نے یوں پوچھا جیسے اس میں حیران ہونے کی واقعی کوئی بات نہیں۔

"مجھے واقعی حیران نہیں ہونا چاہیئے۔" میں نے اس دلچسپ شخص کی اس دلچسپ خواہش سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا "کیونکہ جب تم ہماری خاطر دکان بند کر کے یہاں چلے آئے تھے اس پر پرویز نے میرے اچنبھے پر بتایا تھا کہ یہ شخص اپنی عادات سے آدھا پاکستانی ہے، لیکن تمہاری یہ بات سن کر میرا خیال ہے کہ تم آدھے نہیں پورے پاکستانی ہو۔ ہم پاکستانی مرد بھی ساری عمر کا سانووا کی طرح گذارنے کے بعد شادی کے لئے کوئی مریم تلاش کرتے ہیں۔ تم یورپ میں ہمارے واحد نمائندے ہو۔"

"واحد نہیں بلکہ اس جیسے اور بھی بے شمار لوگ یورپ میں موجود ہیں، جو اس جوہڑ میں کنول کے پھول تلاش کرتے ہیں اور کئی ایک کو تو واقعی مل بھی جاتے ہیں۔" پرویز نے کہا۔

اس اثناء میں سامنے والی میز پر بیٹھے ادھیڑ عمر جوڑے نے کھانا ختم کر لیا تھا۔ مرد نے بل ادا کرنے کے بعد اپنی میز سے اُٹھتے ہوئے زور سے کھنکار کر اپنی طرف متوجہ کیا اور جب ہم نے اُدھر دیکھا تو اس نے پرویز پر ایک ستم ظریفانہ نگاہ ڈالتے ہوئے جیب میں سے رومال نکالا اور ناک پر رکھ کر پوری قوت سے "سوں" کر کے دوبارہ جیب میں ڈال لیا۔ اور پھر اپنی بیوی کا بازو تھام کر گھنے درختوں میں سے گذرنے والی پگڈنڈی میں گم ہو گیا۔

کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ کافی دیر تک بوٹنگ کرتے رہے۔ جھیل کے کنارے کے ساتھ ساتھ دور تک لکڑی کے چھوٹے چھوٹے خوشنما گھر بنے ہوئے تھے جن کے مکین باہر بنچوں پر بیٹھے تھے۔ سرسبز و شاداب پہاڑوں کے دامن میں سے گذرتی ہوئی جھیل کی سیر کرتے ہوئے ہم دور تک نکل گئے حتیٰ کہ واپسی پر شام ہو گئی۔ سورج غروب ہونے کا منظر کچھ ایسا دلفریب تھا کہ ہمارے سمیت بہت سے لوگ اس منظر میں کھوئے ہوئے تھے۔ واپسی پر ہانس کی رہائش گاہ کی طرف جاتے ہوئے ہم چھوٹی سی سڑک کے دونوں طرف بنے ہوئے خوبصورت مکانوں کو دیکھ رہے تھے جو سبز بیلوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ لان رنگ برنگے پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان مکانوں کے جن حصوں میں پھول اگانے کی گنجائش نہ تھی وہاں گملوں میں پھول سجا دیئے گئے تھے پھولوں کی اس وادی میں تھوڑی دیر بعد چاند اتر آیا تھا۔ اور چاند جیسے چہرے گھنے درختوں کے تاریک سایوں میں سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد یوں نمودار ہوتے جس طرح بدلیوں کی اوٹ میں سے چاند نکلتا ہے۔ ذرا آگے چل کے ہم بائیں جانب ایک پگڈنڈی پر مڑ گئے۔ یہ ایک کھلا جنگل تھا جو چاروں طرف سے رنگ برنگے پتوں والے درختوں میں گھرا ہوا تھا۔

"آج کی رات کے لئے میرا گھر اس جنگل میں ہے"۔ ہانس نے سامنے ایک خیمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "کل میرا یہ خیمہ کسی اور جگہ نصب ہوگا اور پرسوں تم اسے کہیں اور دیکھو گے"۔

"جہاں تک میں جانتا ہوں، یورپ میں مخصوص مقامات کے علاوہ کہیں خیمے نصب کرنے کی اجازت نہیں ہے"۔

"مجھے بستی کے سارے لوگ جانتے ہیں۔ وہ بھی جن کا کام محاسبہ کرنا ہے۔ مجھے پرویز نے بتایا تھا کہ پاکستان میں سب چلتا ہے، تم لوگوں کو یہ علم نہیں کہ کچھ نہ کچھ یہاں بھی چلتا ہے"۔

ہم گردن نیہوڑا کر خیمے میں داخل ہو گئے۔

"مجھے ایک بستر ہمیشہ فالتو رکھنا پڑتا ہے تاکہ شادی کے لئے مطلوبہ لڑکی تک کبھی رسائی نہ ہو سکے"۔ ہانس نے ہنستے ہوئے کہا "تاہم آج کی رات میرے خیمے میں ایک کی بجائے اکٹھے تین مہمان ہوں گے۔ آؤ"۔

میں نے خیمے کا جائزہ لیا، اس میں تین افراد تو بخوبی سما سکتے تھے، البتہ چوتھے کا مستقبل خاصا مخدوش تھا

"میں باہر کھلے آسمان میں پتوں کے بچھونے پر سوؤں گا"۔ میں نے ہانس سے کہا۔

"رات کو خنکی اتنی بڑھ جائے گی کہ صبح جولاہے کے جوائی کی طرح ہنستے پلٹے جاؤ گے"۔ مسعود نے مسکراتے ہوئے مجھے صحیح صورت حال سے آگاہ کیا۔

"مجھے خنکی پسند ہے۔" میں نے کہا اور کھڑکھڑاتے پتوں پر بیٹھ گیا۔

"تو پھر میں بھی تمہارے ساتھ ہی سوؤں گا، مجھے علیم نے ٹھنڈ دی.....!"

"کھڑک" میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ لیکن پیشتر اس کے کہ میں کوئی عذر تراش کر اسے خیمے میں سونے پر مجبور کرتا، پرویز میری میری کمک کو پہنچا اور اس نے کہا "مجھے عطا صاحب سے ضروری باتیں کرنا ہیں، تم اندر ہانس کے ساتھ سو جاؤ۔"

پرویز کی آنکھیں نشے سے بوجھل ہو رہی تھیں اور زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

ہانس نے ایک بستر اور کمبل خیمے سے لا کر باہر بچھا دیا۔ بستر تو اس کے پاس فالتو تھا لیکن کمبل ایک ہی تھا اور وہ اس نے اپنے مہمانوں کے لئے "سرنڈر" کر دیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر سوچا کہ یہ شخص پاکستانی ہے اور اس کا نام ہانس نہیں بلکہ عبدالشکور وغیرہ ہے۔

"آپ صبح واقعی استنبول جا رہے ہیں؟" پرویز نے میرے برابر لیٹتے ہوئے کہا اس کی آواز میں گہرے غم کی جھلک نمایاں تھی۔ ہانس اور مسعود خیمے میں چلے گئے تھے۔

"ہاں!"

"پھر وہاں سے پاکستان جائیں گے؟"

"ہاں!"

"اس عرصہ میں آپ کے ابا جی اور بہن بھائی آپ کے لئے اداس ہو گئے ہوں گے؟"

"ہاں" میں نے اس کے لہجے کے کرب کو محسوس کر لیا تھا، سو میں نے موضوع بدلنے کیلئے کہا۔ "تمہیں مجھ سے کچھ ضروری باتیں کرنا تھیں۔"

"ہاں!" اب کے میری بجائے اس نے یہ گونگا لفظ ادا کیا اور پھر کروٹ بدل کر اپنے بازو میری گردن میں حمائل کر دیئے اور اپنا سر میرے سینے میں چھپا لیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا وہ کچھ کہے بغیر اپنا آپ مجھ میں چھپائے سو گیا تھا۔

اگلے روز پرویز اور مسعود استنبول کو جانے والی اورینٹ ایکسپریس میں مجھے سوار کرانے کے لئے سٹیشن پر موجود تھے۔ گاڑی چلنے کو تھی۔ مسعود نے کہا "اگر میرے گھر والے میرے بارے میں پوچھیں تو انہیں

بتانا کہ وہ وہاں بہت ٹھاٹھ کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس کے پاس بھی کار ہے، ٹیلیویژن ہے، ریفریجریٹر ہے اور وہ ایئرکنڈیشنڈ مکان میں رہتا ہے۔ انھیں "بابے دی ہائم" کے بارے میں کچھ نہ بتانا۔"

پرویز نے مجھ سے گلے ملتے ہوئے کہا "میرے بارے میں تم سے کوئی دریافت نہیں کرے گا، اور اگر کوئی پوچھے تو بتا دینا کہ وہ وہاں بھی بابے دی ہائم ہی میں رہتا ہے۔"

گاڑی پلیٹ فارم سے سرکنے لگی تھی اور میں نے بڑے بڑے شیشوں والی کھڑکی میں سے باہر جھانک کر دیکھا تو لگا بابے دی ہائم کے سارے مکین پلیٹ فارم پر جمع ہیں۔ ان کی زبانیں ساکت تھیں اور چہرے بول رہے تھے۔ "بابے دی ہائم کی دیواریں اور چھتیں خستہ ہو گئی ہیں۔ یہ عمارت منہدم ہونے والی ہے۔ ہم زیادہ دیر تک بے گھر نہیں رہیں گے۔ وہ ہمیں زیادہ دیر تک ہمارے گھروں سے دور نہ رکھ سکیں گے۔ ہم اپنے گھروں کو لوٹیں گے، ہم اپنے وطن کو لوٹیں گے۔"

مغربی جرمنی میں ایک برس

محمد کاظم

ہمارا جرمن زبان کا کورس اب دوسرے ہفتے میں داخل ہو چکا ہے۔ اس کورس میں شامل ہونے کے لئے جتنے طلبہ آنے تھے وہ سب پہلے ہفتے میں آ چکے، اور اس گاؤں کی سرسبز ڈھلانوں پر اوپر نیچے کھڑے ہوئے مکانوں میں بسائے جا چکے۔ درجوں کی ترتیب بھی ابتدائی ردوبدل کے بعد آخری شکل پا چکی۔ حالات نے سکون پا کر اب ایک آرام دہ معمول کی صورت اختیار کر لی ہے۔ چہرے جو پہلے اجنبی اور بے مہر تھے اب مانوس اور روشناس جان پڑتے ہیں، اور ماحول و منظر کی غرابت رفتہ رفتہ زائل ہوتی جاتی ہے —— اب یوں لگتا ہے جیسے ہم ایک عرصے سے جرمن زبان پڑھتے چلے آ رہے تھے، اور ہمارا تعلق مدت سے اس بین الاقوامی برادری کے ساتھ تھا جو بالائی بوادیا کے اس بے نام گاؤں میں آ بسی ہے۔ کاغذ پر چھپا ہوا یا کسی عمارت کے ماتھے پر لکھا ہوا جرمن لفظ جو پہلے ہمارے لئے ایک مبہم اور دھندلی علامت ہوتا تھا، اب دھیرے دھیرے معنی کی جوت سے جگمگانے لگا ہے۔ اب ہم راہ جاتے ہوئے کسی جرمن کو بڑے اعتماد کے ساتھ "گرس گوٹ[1]" کہہ لیتے ہیں، اور اس سے اس کے مزاج اور موسم کا حال بھی پوچھ لیتے ہیں۔ گاؤں کے سٹور میں سودا بیچنے والی فروائن کے ساتھ اب ہماری گپ شپ پانچ چھ جملوں تک چلی جاتی ہے۔

گرس گوٹ! یہ اس صوبے بواریا کا خاص سلام ہے۔ جرمنی کے دوسرے علاقوں میں صبح اور پہلے پہر کا سلام "گُٹن مورگن" ہوتا ہے، جیسے انگریزی کا "گڈ مارننگ" کہہ لیجئے۔ لیکن اہلِ بواریا کا یہ سلام جو سارے دن کے لئے کارآمد ہوتا ہے دو انسانوں کے درمیان خدا کو واسطہ بناتا ہے۔ سلام کا یہ وہی انداز ہے جو عربی میں سلام اللہ علیک کا ہے (اللہ کا سلام ہو تم پر)۔ بوارین لوگوں کے سلام کی یہ خصوصیت کوئی اوپری اور اتفاقی چیز نہیں۔ اس کے پیچھے

---

[1] GRUSS GOTT

دراصل ان لوگوں کا خاص مزاج ہے، ان کی عادات اور روایات ہیں۔

جرمنی کا طبعی نقشہ اگر آپ کے سامنے ہو، تو آپ دیکھیں گے کہ اس ملک کا یہ جنوبی حصہ جس کی سرحد ایلپس کے سلسلے میں جا مدغم ہوتی ہے۔ سطح سمندر سے کافی بلندی (تقریباً تین ہزار فٹ) پر واقع ہے، اور جتنا آپ شمال کو چلے جائیں یہ بلندی کم ہوتی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جرمنی کے سب دریا جنوب سے شمال کی طرف، یا جنوب سے شمال مغرب کے رخ بہتے ہیں اور بالکل شمالی سرے پر سمندر ہے، اور اس کے کنارے واقع ہامبرگ کی بندرگاہ، جسے جرمنی میں "دنیا کی سمت کھلنے والا صدر دروازہ" کہا جاتا ہے —— یہ وہی ہامبرگ ہے، اگر آپ کو یاد ہو، جس میں ایک علاقہ سینٹ پاؤلی ہے اور اس کی وہ بدنام شبانہ زندگی، جس نے یورپ میں جنسی تفریح کا ایک نیا معیار قائم کیا ہے۔ پیرس کے مول مارت اور لندن کے سوہو میں بات جہاں عروج کو پہنچتی ہے سینٹ پاؤلی کے "بڑی آزادی کے کوچے" میں بات وہاں سے شروع ہوتی ہے اور تماشائی کو تاروں سے بھی آگے ایسے جہانوں میں لے جاتی ہے جن کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا —— ایسا لگتا ہے کہ سمندر کے کنارے رہنے والے جس طرح اپنا جسمانی لباس اتارنے کے عادی ہوتے ہیں، اسی طرح ان کے لئے حیا و عزت کا جامہ اتارنا بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں رہتی - مجھے کوئی تعجب نہ ہوگا اگر علم تشکیل سیرت (ETHOLOGY) کا یہ بھی کوئی قاعدہ ہو کہ سمندر کے قرب میں آرام طلبی، عریانی اور آزادہ روی ہوتی ہے، اور اوپر پہاڑوں کے دامن میں جفاکشی، غیرت مندی اور اخلاقی انضباط! —— علم سیرت کے کسی ایسے ہی قاعدے کے مطابق ہامبرگ اور شمالی علاقوں کے برعکس جنوب کے اس صوبے بواریا کے لوگ بہت مذہبی، روایت پسند اور آن کے پیچھے واقع ہوئے ہیں، اور ان سب اوصاف کے حامل جو کسی کوہستانی قوم کی خصوصیت ہوا کرتے ہیں۔ عقیدے کے اعتبار سے آرین لوگ زیادہ تر رومن کیتھولک ہیں۔ ان کے قبرستانوں کی رونق، سجاوٹ اور تروتازگی دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ موت اور اس کے بعد کی زندگی کا خیال ان کے ذہنوں میں کتنا مستحضر رہتا ہے۔ ان کے شہروں اور قصبوں میں اگر آپ چلے جائیں تو آپ کو جگہ جگہ مسیح مصلوب کے مجسمے (CRUCIFEX) لگے دکھائی دیں گے۔ کسی نکڑ والی عمارت کے محراب میں یا کسی درخت کے تنے پر ایک نحیف و نزار مسیح، ایک مختصر سی لنگوٹی کمر کے گرد لپیٹے، صلیب پر کیلوں سے جڑا ہوگا۔ سر دائیں جانب کو لٹکا ہوا۔ اور کیلوں کی جگہ پر ہاتھوں اور پاؤں سے لال خون رستا ہوا —— یہاں آخن میں بھی میرے گھر کے قریب گریسٹ ہاؤس کے سامنے ایک درخت پر اسی طرح کا ایک صلیبی مجسمہ نصب ہے، اور میں آتے جاتے اس پر ایک نظر ڈالتا ہوں، اور اس نیک دل اور

ابنِ آدم الانسان کی مصیبت اور مظلومیت پر تاسف کرتا ہوں کہ اس کی اتنی بڑی قربانی کے باوجود دنیا میں لوٹ، ظلم اور کمینگی کا اسی طرح دور دورہ ہے، اور نوعِ انسان سے گناہوں کا اتنا عظیم کفارہ ادا ہو جانے پر بھی انسانوں کے دل احساسِ گناہ کے بوجھ تلے سے کبھی نہیں نکل سکے۔ ان کے من کو شانتی کبھی نصیب نہیں ہوئی!! ——— پھر بوارین لوگوں کا اپنا کلچر ہے، اپنے لوک گیت اور علاقائی رقص ہیں۔ ان کا 'والڈ فیسٹ[1] جو وہ گرما کی راتوں کو کھلے آسمان کے نیچے مناتے ہیں، اپنے دھوم دھڑکے اور رونق و دلکشی کا جواب نہیں رکھتا۔ لکڑی کے تختوں کے وسیع سٹیج پر دیوہیکل جسم کے خوش دل جرمن جب رقص کرتے ہوئے ایک تال پر دھم سے بوٹ مارتے ہیں تو جنگل کا دل دہل جاتا ہے، اور جرمن دوشیزائیں اپنے مردوں کی جسمانی قوت پر نازاں، اپنا علاقائی لباس درندل[2] پہنے اور بیئر کے پانچ پانچ جگ ایک ہاتھ کی انگلیوں میں لٹکائے، تماشائیوں کے درمیان گھوم پھر کر میزبانی کے فرائض انجام دیتی ہیں۔ پھر جونہی وہ آنا کے تیز والز یا رقصِ سیارگان (STERNEN TANZ) کی دھن بجتی ہے، وہ فوراً سٹیج پر پہنچ جاتی ہیں اور دوسرے ہی لمحے اپنے مردوں کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے موسیقی کی لہروں پر جھومتی دکھائی دیتی ہیں۔ میلے کی یہ دلچسپ رنگا رنگ فضا تماشائیوں کو دور دور سے کھینچ لاتی ہے اور وہ سٹیج کے چاروں طرف لگی میزوں پر بیٹھے، ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈالے جھوم جھوم کر کورس گاتے ہیں ——— میں نے اگر کسی قوم کو آسودہ خاطری سے میلہ مناتے اور مکمل بے فکری کے قہقہے لگاتے دیکھا ہے تو وہ بواریا کے یہ سادہ دل، بیئر کے جگ پر جگ چڑھانے والے خوش اعتقاد جرمن ہیں!

بوارِیا کے یہی جرمن ——— بات ساری اس سے چلی تھی ——— جب سرِ راہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں، تو ایک دوسرے پر خدا کا سلام بھیجتے ہوئے ہمیشہ ایک ہی لفظ کہتے ہیں۔ گرُس گوٹ!!

ایک دن صبح کو کلاس لگتے ہی ہماری ٹیچر فرولائن واکس نے اعلان کیا کہ آج ہم جرمن زبان کا سبق بند کمرے میں بیٹھ کر پڑھنے کی بجائے کھلے آسمان کے نیچے گھومتے پھرتے ہوئے پڑھیں گے۔" ہم ایک جنگلاتی بستی روس ہولزن کو جا رہے ہیں۔" اس نے تفصیلات بتلاتے ہوئے کہا۔ "پہلے کچھ دیر ہم بس میں سفر کریں گے، اس کے بعد

---

[1] (WALDFEST): جنگلاتی میلہ [2] DIRNDL: بوارین لڑکیوں کا موسمِ گرما کا روایتی لباس۔ گھاگرے اور سفید فراک کے اوپر ایک سرصدری، چھاتیوں کے نیچے سے گزرتی اور ان کا ابھار نمایاں کرتی ہوئی۔

پیدل ایک پہاڑی راستہ طے کر کے جائیں گے۔۔۔۔ بس کا وقت ہونے والا ہے، میرا خیال ہے آپ سب لوگ شاپ کی طرف چلیں "۔۔۔ بس سٹاپ آخن میوہچے کے ریلوے سٹیشن کے قریب ہی تھا۔ بس کے آنے میں ابھی کچھ وقت تھا، اس لئے کچھ لوگ جو پہلے آ گئے تھے اسٹیشن کی پشت کی جانب واقع بار کے سامنے رکھی ہوئی کرسیوں پر اٹک گئے، بعد میں آنے والوں کے لئے کرسیاں باقی نہ رہیں ہمارا ساتھی شہزادہ بھی آ کر کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں نازک لڑکی بحراں آ نکلی اور کچھ فاصلے پر وہ بھی کھڑی ہو گئی۔ شہزادے کو اس موقع پر حسبِ معمول ایک اپیچ سوجھی، اس سے کہنے لگا "تم بیٹھ کیوں نہیں جاتیں ؟"

"کہاں بیٹھوں ؟" اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا "کوئی کرسی خالی نہیں ہے۔"

"یہاں ۔۔۔ ہمارے اس دوست کے ساتھ" شہزادے نے ایسی قطعیت کے ساتھ جواب دیا جیسے اس میں پوچھنے کی کوئی بات ہی نہ ہو۔

ایک سیکنڈ کے توقف کے بغیر بحراں میرے ساتھ ٹک کر بیٹھ گئی، وہ بغیر بازوؤں کے چوبی نشست والی، ایک تنگ سی کرسی تھی، اور مجھے اس کے جسم کا ملائم لمس اپنے سارے وجود میں سرایت کرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ شہزادہ میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ اس کی نگاہوں میں شرارت کی چمک تھی، اور احسان جتانے کی ایک ایسی کیفیت جس میں ملامت بھی شامل تھی۔ "ہم ہی تمہارے لئے کچھ کریں تو کریں، تم سے کبھی کچھ نہ ہوگا" وہ اپنی نگاہوں سے کہتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اگر بحراں سے میری بے تکلفی ہو چکی ہوتی تو میں اس دلچسپ صورتِ حال سے جس میں میں اس وقت دھکیل دیا گیا تھا دل و جان سے محظوظ ہوتا، اور میری خواہش ہوتی کہ بس کے انتظار کے وہ لمحے کبھی ختم نہ ہوں لیکن اس وقت میری حالت بالکل مختلف تھی۔ جسموں کا یہ اتصال جبکہ ہماری روحیں ابھی ایک دوسرے کے لئے بالکل ٹھنڈی اور اجنبی تھیں، مجھے مضطرب اور بے چین کئے دے رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ لاری اب آ ہی جائے تو اچھا ہو، لیکن لاری کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔

بحراں کے پہلو میں بیٹھے ہوئے اس دن میں نے اپنے آپ کو بہت کوسا۔ اور اپنی اس شخصیت پر خدا کی پھٹکار بھیجی، جس کے تسلط سے میں یہاں مغربی جرمنی میں پہنچ کر بھی آزاد نہیں ہو سکا تھا اور جو ایک سائے کی طرح یہاں تک میرے ساتھ ساتھ چلی آئی تھی۔ اس ملک کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے میں نے بہت سنہری خواب دیکھے تھے۔ میرا خیال تھا کہ میں، جس نے اپنی جوانی مذہبی اور سماجی بندشوں کی گھٹن میں بسر کی تھی، ایک نئی اور مختلف دنیا میں پہنچ کر ایک شدید اور صحت مند ردِ عمل سے دوچار ہوں گا، اور اپنی پرانی کینچلی اتار کر اور

ایک نیا انسان بن کر اس زندگی کی سب اچھی چیزوں سے لطف اندوز ہوں گا ــــ لیکن پچھلے چند دنوں کے تجربے سے میں نے یہ جانا کہ اپنے چہرے کی ہیئت بدل لینا تو آسان تھا کہ اس کے لئے سیفٹی ریزر کی ایک جنبش درکار تھی لیکن اپنی شخصیت کا چولا بدلنا اتنا آسان نہ تھا جتنا لگتا تھا اس کے لئے کچھ وقت درکار ہوگا اور ایک مضبوط ارادہ اور آنکھیں بند کر کے خطرات میں کود پڑنے کا حوصلہ! ــ مجھے پہلی بار اس حقیقت کا احساس ہوا کہ گزرتی ہوئی عمر کے ساتھ انسان کی شخصیت اخروٹ کی کھال کی طرح سخت ہو جاتی ہے، اور وہ چاہے سات سمندروں کا سفر کر کے کسی گمنام جزیرے میں کیوں نہ جا بسے، اس کے لئے یک جست اپنے خول سے باہر نکلنا ممکن نہیں ہوتا ــــ اب یہ لڑکی ہجراں، جس کے کولہے اور ران کا گداز لمس اس وقت میرے سارے بدن میں بجلیاں دوڑا رہا تھا، میری بھی اسی طرح ہم جماعت تھی جس طرح تہمزادے کی، اور مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ میں اپنے کمرے کی تنہائی میں اکثر اس کے بارے میں سوچا کرتا تھا لیکن مجھے کبھی یہ توفیق نہ ہوئی کہ پہل کر کے اس سے کوئی بات کروں۔ اس کی کسی چیز کی تعریف کروں (جبکہ اس میں) اتنی چیزیں سچ مچ قابلِ تعریف تھیں: اس کے شہد رنگ بال، اس کی خوب صورت بادامی آنکھیں، اس کے جسم کے ہیجان خیز پیچ و خم، اس کی حس مزاح، اس کا چلبلا پن! یا اس سے اتنا ہی پوچھ لوں کہ اسے جرمن گرامر پڑھتے ہوئے کوئی ایسی مشکل تو پیش نہیں آ رہی جس میں میں اس کی کوئی مدد کر سکوں۔ میں نے اپنی زندگی کی چار دہائیاں جس طرح کے گرد و پیش میں گزاری تھیں، اس نے میری طبعی بزدلی اور ہچکچاہٹ، میری کم سخنی اور دیر آشنائی، اور ایک لایعنی قسم کے احساسِ خودداری کو پال پوس کر محکم اور سنگین کر دیا تھا۔ ان سب چیزوں سے مل کر میری شخصیت کا حصار بنا تھا جس کے اندر میری روح اب ایک قیدی کی طرح بے بس پڑی تلملاتی تھی!

بس آخر کو آ گئی اور ہم سب اس میں سوار ہو گئے۔ روس ہولزن کا تقریباً سارا راستہ چڑھائی تھی اور جنوب کی ان پہاڑیوں کے درمیان بل کھاتی ہوئی سڑک کے دائیں بائیں ایش اور لائم کے سدا بہار درختوں کی خنک چھاؤں پھیلی تھی۔ ان کے نیچے کہیں کہیں ایک جھرنا بہتا ہوا ڈھال کے نشیب کو جاتا تھا۔ یہ ایسا منظر تھا جو انسان کو محسوسات کی دنیا سے نکال کر تخیل و رومان کی دنیا میں لے جاتا ہے، اور میں اس وقت ہجراں اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے خیال سے بے پروا، بس کے لمبے چوڑے شیشے میں سے ایلپس کی جانب بڑھتے ہوئے اس پہاڑی راستے کا حسن اپنی آنکھوں کی راہ اپنے اندر اتار رہا تھا۔ مکان ان پہاڑی ڈھلوانوں پر بھی موجود تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد درختوں کے سبزے کے پیچھے سرخ مائل کی ڈھلواں چھت والا ایک خوب صورت ولا اپنی شیشے کی کھڑکیوں اور

ان سے آگے ٹنگی چھوٹوں کی ٹوکریوں کے ساتھ نگاہوں کو اپنی جانب کھینچ لیتا۔ تہذیبی زندگی کی پرشور آلودگیوں سے ہٹ کر پہاڑ۔ سبزے میں چھپے ہوئے یہ مکان کتنے پرسکون، اور شاعر کے خیال کی طرح کتنے لطیف اور غیر ارضی لگتے تھے اور میں سوچتا تھا کہ ان مکانوں میں رہنے والوں کی زندگی کس انداز کی ہوگی۔ کیا اس میں تلخیوں اور محرومیوں اور ناآسودگیوں کا گذر ہوگا؟ اس خوابناک ماحول کے باوجود! —— شاید نہیں! —— یا شاید ہاں! کہ آج کی تہذیبی زندگی کے ہر سو پھیلتے ہوئے ریلے سے دنیا کا کوئی گوشہ بھی تو خشک اور محفوظ نہیں رہا۔ قیمتوں کے اتار چڑھاؤ اور ٹیکسوں کی نئی پالیسی کا اثر ان روحانی گھرندوں تک کیسے نہیں پہنچتا ہوگا۔ پھر انسان جب تک انسان ہے اسے بڑھاپے اور موت سے کہاں مفر ہے۔ اور پہاڑوں کے دامن میں گھرا ہوا کوئی مسکن چاہے کتنا ہی پرسکون اور خوب صورت اور ملکوتی ہو۔ وہ ایک کھوئی ہوئی جوانی کی حسرت کا مداوا تو نہیں ہو سکتا اور نہ دبے پاؤں سرایت کرتے ہوئے بڑھاپے کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔

پہاڑی راستوں کے سنگم پر واقع اس آبادی روکس برازن، میں بس ہم لوگوں کو اتار کر آگے چلی گئی، اور ہم ایک ناہموار، ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی پر ہو لئے جو سرسبز جنگلات سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں کی طرف جاتی تھی۔ اس تفریحی سفر پر اس دن ہماری کلاس کے ساتھ ایک دو افراد باہر کے بھی شامل ہو گئے تھے۔ ان میں ایک تو اوپر کی تیز تر کلاس کا ترک لڑکا مصطفےٰ تھا۔ دانتوں کا ڈاکٹر، برف کی طرح سفید رنگت والا، اور دوسرا نو دس برس کا ایک جرمن لڑکا آندریس، جو النسلی ٹیوٹ کی کسی دوسری استانی کا نورچشم تھا۔ پہاڑی پگڈنڈی طویل بھی تھی اور دشوار بھی۔ لیکن ہماری ٹیچر فرولائن واکس کی چال میں جوانوں کی سی چستی اور سرگرمی تھی اور ہم میں سے اکثر لڑکوں کو اس کی باتیں سننے کے لئے تیز تیز قدم اٹھانے پڑ رہے تھے۔ دوسری طرف ہجراں کھلے آسمان کے نیچے دیئے جانے والے اس سبق سے بے پروا۔ آندریس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی اور کدکڑے مارتی بہت آگے آگے جا رہی تھی۔ کبھی وہ دونوں چھوٹے چھوٹے پتھر اٹھا کر نشانہ بازی کرنے لگتے اور کبھی وہ آگے بھاگ کر ایک درخت کی اوٹ میں چھپ جاتی اور جب آندریس وہاں سے گزرتا تو اس کے پیچھے سے نکل کر اسے حیران کرتی۔ اس کھیل کود میں وہ اپنی ذہنی سطح کے اعتبار سے بالکل آندریس کی ہم سن لگ رہی تھی اور وہ لڑکا بھی فر فر جرمن بولنے والی اپنی اس بڑی عمر کی ہجولی کے ساتھ گھل مل گیا تھا۔

درختوں کے گھنے ذخیرے سے نکل کر چلتے چلتے ہم بالآخر بلندی پر کھڑے ہوئے ایک ایسے مکان تک آ پہنچے جو لگ بھگ دو سو سال پرانا تھا اس کی مالکن ایک گراں تھی پست قد کی، اکہرے جسم والی، ایک ساٹھ سالہ دیہاتی عورت

جس کے لیے میں "بڑھیا" کا لفظ استعمال نہیں کروں گا۔ اس لئے کہ اس کی چلت پھرت میں بارہ تیرہ سال کے لڑکے کی سی چستی اور سبک پن تھا۔ وہ اب بھی بچوں کی سی چلبلی تھی اور اس کا ہر وقت مسکراتا ہوا چہرہ ایسا تھا کہ اس پر سن وسال کا کوئی اثر دکھائی نہ دیتا تھا ـــ ایک لازمان (AGE LESS) اور لاجنس (SEX LESS) چہرہ! (اگر ہم ایسا کہہ سکیں!) ہمیں وہاں دیکھتے ہی وہ ہنس مکھ اور زندہ دل عورت خاموشی سے ہماری خاطر تواضع میں لگ گئی (جس کے لئے ہماری ٹیچر نے بعد میں اسے باقاعدہ معاوضہ دیا)۔ بیئر، لیمونادے، اور ملش (دودھ) یہ تین مشروب اس نے ہمیں مہیا کر کے دیئے۔ فرولائن واکس اور میں نے جنگل کی گایوں کا تازہ مہکتا ہوا دودھ پیا، ہمارے کچھ ساتھیوں نے لیمونادے پسند کیا۔ اور اکثریت نے ٹھنڈی بیئر سے اپنی پیاس بجھائی۔ ہم نے وہ سارا مکان اندر پھر کے دیکھا۔ مکان کیا تھا ایک عجائب گھر تھا۔ جس کے ایک حصے میں دو سو برس پہلے کے برتن، چولہے، فرنیچر اور رہن سہن کی دوسری چیزیں بڑے قرینے سے سجی ہوئی تھیں، اور یوں لگتا تھا جیسے اس میں بود و باش رکھنے والی وہ عورت بھی دو سو برس کی عمر کی تھی۔ بھوتوں اور پریوں کی دنیا کی وہ "بڑھیا" جو اپنے مکر کے ساتھ ہر کہانی میں موجود ہوتی ہے، اور جسے کبھی موت نہیں آتی! مکان اتنا صاف اور اجلا تھا کہ تم اگر چاہتے تو بے جھجک اس کے چمکتے ہوئے فرش پر پھسکڑا مار کر بیٹھ جاتے تمہارے کپڑوں کا کچھ بھی نہ بگڑتا۔

ملک جرمنی کے اس ـــ غالباً ـــ سب سے قدیم مکان میں کچھ دیر ستانے کے بعد ہم آگے چل دیئے اور تھوڑی ہی دیر میں کچھ اور بلندی پر واقع ایک کھلی جگہ پر آ گئے، جہاں ایک شاہ بلوط سایہ کئے ہوئے تھا۔ یہ جگہ اس سارے علاقے میں نسبتاً اونچی تھی، اور یہاں اردگرد کا منظر ارضی (LAND SCAPE) ایک وسیع کینوس کی طرح ہماری نگاہوں کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ اونچی نیچی پہاڑیاں، جن پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہری دوب کا دبیز قالین بچھا تھا اور ان کے درمیان وادی میں کھڑے ہوئے "تانے ابنشے" کے بلند و بالا درخت تھے! انسان کی نظر شمال سے مغرب، اور مغرب سے جنوب کی طرف گھومتی ہوئی جب مشرق میں واقع الپس کی ایک برف پوش چوٹی پر جا پڑتی، تو مارے حیرت و انبساط کے منہ سے ایک ہلکی سی "آہ" نکل جاتی!

"وادی میں کھڑے ہوئے صنوبروں سے اس پار الپس کی چوٹیوں کی نیلگوں برف دھوپ میں بلور کی طرح چمک رہی تھی۔"

میں نے اس دن واپس آ کر شام کو اپنی ڈائری میں یہ جملہ اردو میں رقم کیا تھا اور اپنے ذہن میں میں نے یورپ کے اس پرفسوں منظر کو ہمیشہ کے لئے اپنے الفاظ میں مقید کر لیا تھا لیکن اب میں اس منظر کا تصور کرتا ہوں اور اپنی ڈائری کے انگریزی صفحے پر اردو کا یہ تنہا اور حیران جملہ تیرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو اپنی اس کوشش پر ہنسی آتی ہے۔ سورج کی شعاعوں میں

نہائی ہوئی پہاڑوں کی شفاف برف میں اس دن میں نے اسی نور کی جھلک دیکھی جو موسیٰ نبیؑ کو سرِ وادیٔ سینا دکھائی دی ہوگی، اور اس منظر کو دیکھتے ہوئے میرے دل نے ایک ایسے خدا کے حضور میں سجدہ کیا جو سراپا جمال تھا اور جس کی عظمت اور ہیبت اور شکوہ کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا!

یہ ہمارے "آؤس فلوگ[1]" کی آخری منزل تھی، اور یہاں ہم نے دو ڈھائی گھنٹے قیام کیا۔ پہاڑی کی بلندی پر یہ جگہ اگرچہ مسطح تھی، لیکن اس میں نشیب و فراز تھے۔ یہاں پہنچتے ہی ہم، جو تھکے ہوئے تھے، ہری گھاس پر ستاتے اور لیٹنے لگے۔ ایک مکمل بے فکری اور آزادی کا موڈ سب پر غالب تھا اور فرلائن واکس برتی ہوگی ہماری ٹیچر، اس وقت وہ ہم میں سے ایک تھی، اور استادی شاگردی کے سب فاصلے ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اس نے بیٹھتے ہی تجویز پیش کی کہ سب لوگ اپنے اپنے ملک کا گیت گا کر سنائیں، اور خود اس نے جرمن کا ایک "فوک لیڈ[2]" گا کر پہل کر دی۔ یہ گیت صبح دم جنگل کی سیر کے بارے میں تھا۔

وہ دیکھو جنگل کیسے ایک معبد کی طرح خاموش ہے

درختوں میں چکاوک (LARK) ابھی بیدار نہیں ہوئے

صرف ہریالی کے نیچے بہتا ہوا جھرنا دھیرے سے صبح کا گیت الاپتا جاتا ہے۔

اس کے بعد بحرآل، مصطفیٰ اور یاطوم نے مل کر ایک ترکی گیت سنایا جو ہمارے کانوں کو بہت بھلا لگا، اور ہم نے پرجوش داد دے کر انہیں ایک اور، اور پھر ایک تیسرا گیت گانے پر مجبور کیا۔ اس منڈلی (CHORUS) میں سب سے سریلی اور رس دار آواز بحرآل کی تھی، اور جس طرح وہ مسکراتے ہوئے پورے اعتماد کے ساتھ گا رہی تھی اس سے لگتا تھا جیسے وہ ایک مشاق گلوکار ہو۔ تین گانوں کے بعد ترک طائفے نے بالکل جواب دے دیا۔ اس کے بعد ہمارے ساتھی شہزادے نے جو اوپر ایک مینڈ پر بیٹھا تھا، ایک پرانا ہندوستانی گیت چھیڑا: بالم آن بسو مورے من میں،...... اور ساون آیا تم نہیں آئے... شروع میں اس کی آواز کچھ دیر کے لئے کپکپائی، لیکن پھر جم گئی۔ میرا جی چاہا کہ میں بھی اس کی سنگت کروں۔ اس لئے کہ یہ گیت میں نے بھی بچپن میں گایا تھا، لیکن پھر خیال آیا کہ یہ "خلوتِ حمام" نہیں ہے، کھلے آسمان کے نیچے سرِ عام جگہ ہے اور اتنے لوگ سننے والے موجود ہیں، اور میرے لئے کسی کے سامنے سر نکالنا ایسا ہے جیسا کسی کے سامنے کپڑے اتارنا! ——— شہزادے کو بھی بہت داد ملی، اور اسے۔

---

[1] AUSFLUG : پکنک، آؤٹنگ۔   [2] VOLKLIED لوک گیت

یک گیت اور سنانا پڑا اتنے میں الجزائر کے راشد بلبلی کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا وہ گا تو نہیں سکتا لیکن اس نے محفل کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کیلئے ایک مزاحیہ رقص پیش کیا۔ رقص کی حرکات میں کبھی دیوانگی اور کبھی مسخرے پن کا اظہار ہوتا تھا۔ حرکات جوں جوں تیز ہوتی جاتی تھیں دیکھنے والوں کے لیے ہنسی ضبط کرنا محال ہو رہا تھا۔ آخر میں بلبلی بالکل بندروں کی سی اچھل کود پر اتر آیا، اور ہم ہنستے ہنستے دہرے ہو گئے ——— اس مزاحیہ رقص کے بعد اوپر بیٹھے ہوئے ہیروشی اور اس کی بیوی تامگیکو نے ایک جاپانی لوری گا کر سنائی جس کی ہلکی اور مدھر تانیں روح کو تھپکی دیتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں، اور دل چاہتا تھا کہ شاہ بلوط کے سائے تلے کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کر کے خواب کی دنیا میں چلا جائے۔ لوری کے آخری الفاظ اردو کے بعض لفظوں کے بالکل ہم صورت تھے۔ یہ میں نے شاید پہلے نہیں بتایا کہ ہیروشی تاکی گوچی ایک پیشہ ور پیانو نواز تھا، اور مغربی جرمنی کچھ عرصہ موسیقی کا کیریئر کرنے کے لیے آیا ہوا تھا۔ اس کے بعد ایک دفعہ پھر ترکوں کی باری آئی اور اب کے بحران نے ایک ہندوستانی فلمی گانا "آوارہ ہوں ——— آسمان کا تارا ہوں" گا کر ہمیں حیران کر دیا۔ اس کا اردو تلفظ تو خوف ناک تھا لیکن اس نے گانے کی لے کو بہت خوبی سے نبھایا تھا۔ ہمارے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ترکی میں اس نے کافی ہندوستانی فلمیں دیکھی تھیں اور فلم سٹار نرگس ترک لوگوں میں خاص طور پر بہت مقبول تھی۔

ہمارے اس سارے ورائٹی پروگرام میں فرانس کی ڈانیل لاوسنے بالکل خاموش، ایک طرف بیٹھ کر کسی کو خط لکھنے میں مصروف رہی، مشرق کی سمت دور دیکھتی ہوئی نگاہوں کے ساتھ کوئی اچھا سا مضمون سوچتی ہوئی! اس وقت ہم نے یہی سمجھا کہ وہ اپنے کسی "فرانڈ" کو اس "آرس فلوگ" کا آنکھوں دیکھا حال لکھ رہی ہوگی۔ اور اس کو یہ بتا رہی ہوگی کہ "سامنے الپس کی برفوں کا حسن مجھے پاگل کیے دے رہا ہے کاش اس وقت تم بھی میرے ساتھ ہوتے!" ——— لیکن یہ ایک اندازہ ہی تھا، اور ہمارے اکثر اندازے بالکل بیکار ہوتے ہیں۔ جب سات آٹھ ماہ بعد میں پیرس گیا تو ایک شام ڈانیل نے میرے ساتھ گزاری اور ادھر ادھر کی باتوں میں اس نے مجھے یہ بتا کر تعجب میں ڈال دیا کہ اس نے ابھی تک کوئی بوائے فرینڈ نہیں بنایا تھا، اور نہ ہی اس معاملے میں اسے کوئی جلدی تھی مجھے آج تک اس کی بات کا یقین نہ آیا۔ ہم اس وقت آئفل ٹاور کی بلندی سے نیچے سڑکوں پر "کھلونا موٹروں" کو رینگتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ اس پر میں نے اسے بتایا کہ اس نے دراصل فلسفے میں ڈاکٹریٹ کا کورس لے کر غلطی کی تھی، اس لئے کہ اتنا فلسفہ پڑھ کر انسان "یہاں" (سر کی طرف اشارہ) بہت سیانا ہو جاتا ہے، اور جب انسان "یہاں" بہت سیانا ہو جائے تو دوستوں اور ساتھیوں کے معاملے میں انتخاب بہت کڑا ہو جاتا ہے۔

"میں تم سے زیادہ سیانی تو نہیں ہوں" ـــ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے انگریزی میں جواب دیا۔ وہ جرمن زبان بھولتی جا رہی تھی۔ اور چند ماہ پہلے لندن میں سیکھی ہوئی انگریزی کو کام میں لا رہی تھی۔

"لیکن میرا مسئلہ وہ نہیں ہے جو تمہارا ہے ڈانیل" میں نے کہا۔ "تمہیں ایک اچھے ساتھی کا انتخاب کرنا ہے، اور میں تو، تم جانتی ہو، اس منزل سے دور نکل آیا ہوں"

اس دن ہم نے اسے فرانسیسی میں کچھ سنانے کی بہتیری فرمائش کی۔ لیکن وہ اور موسیو ڈی دونوں اپنی ضد پر اڑے رہے!

موسم اس دن بہت معتدل اور خوشگوار تھا۔ ایک صاف اور بے ابر آسمان وادی کی ان سرسبز ڈھلانوں پر ایک نیلے خیمے کی طرح تنا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے ہماری زندگی میں وہ دن صرف بے فکری اور خوش باشی کے لئے طلوع ہوا ہو۔ دوسری کی طرح میں بھی گھاس پر اوندھا لیٹا تھا۔ میرے بائیں جانب ایلپس کی برفوں کا الوہی حسن تھا۔ انسان چاہتا تھا کہ اس منظر پر ایک لمحے کے لئے اپنی نظریں جما دے، پھر کسی معجزے سے وہ لمحہ ٹھہر جائے۔ اور اس طرح دیکھنے والا کچھ دیر کے لئے خود بھی اس منظر کا حصہ بن جائے! ـــ اور میرے دائیں جانب تھوڑے فاصلے پر ہجرآل لیٹی تھی اس دن اس نے چست نیلے جینز پر فالسئی رنگ کی پتلی سی جرسی پہن رکھی تھی۔ گھاس پر لیٹے لیٹے اس نے دو تین کروٹیں جو لیں تناؤ اس کی جرسی پتلون سے باہر نکل آئی، اور اس کا میدے کی طرح سفید اور ملائم پیٹ نمایاں ہو کر انسان کے حیوانی اندروں میں ہلچل مچانے لگا۔ ہمارے قریب لیٹے ہوئے وہ ہر زاویے سے اپنے جسم کی نمائش کر رہی تھی، اور بالکل لاشعوری طور پر اپنے جسم کی بے پناہ جنسی کشش کا اسے جیسے کوئی احساس ہی نہیں تھا، اور اس کی حرکات اور بیٹھنے لیٹنے کا انداز ایک ایسی الھڑ اور نادان بچی کا سا تھا جسے جلد باز قدرت نے وقت سے پہلے عورت تو بنا دیا، لیکن اس کے اندر اس واقعے کا شعور پیدا نہ کیا ہو!

واپسی پر ہم پھر اسی گوالن کے گھر سے گذرے۔ ہماری آواز سن کر وہ الوداع کہنے کے لئے باہر نکل آئی۔ باتوں باتوں میں بجانے کس طرح ناچ کا ذکر آ گیا، اور وہ اپنا وہ زمانہ یاد کرنے لگی جب وہ اپنا محبوب رقص والز ناچا کرتی تھی۔ اس پر ہمارے ترک لڑکے مصطفٰے نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور کہنے لگا۔ "والز تو ہم آج بھی ناچ سکتے ہیں ـــ "واروم نشت[1]" فرولائن والکس اور ایک دو، دوسرے لوگوں نے والز کی دھن میں سیٹی بجائی اور مصطفٰے اور وہ جھومنے لگے

---

[1] WARUM NICHT: کیوں نہیں۔

ندکی ساٹھ سالہ گوالن ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ناچنے لگے انہیں دیکھ کر بلیّی بھی اکیلا میدان میں کود پڑا لیکن پیشتر اس سے کہ رقص کے عاشقوں کی چھوت دوسروں کو لگتی ہمارے گیپر نے اس عورت کا شکریہ ادا کیا، اور ہم پہاڑی راستے پر نیچے اترنے لگے۔

ڈھلانوں پر سے نیچے اترتے ہوئے اب ہجراں اور آندریس کا ساتھ چھوٹ گیا تھا، اس لئے کہ اب لڑکی کو دو بڑے ہجولیوں نے اپنے درمیاں میں لیا ہوا تھا، اور دو بازو اس کی کمر کے گرد حمائل تھے۔ ان میں سے ایک بازو یونانی نٹ کھٹ لڑکے پاپوڈو پولس کا تھا اور دوسرا ہمارے ساتھی شہزادے کا!

"شہزادہ صاحب کی آخر سن لی خدا نے" چھوٹے قد کے عینک والے شیخ نے میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

ہم ان لوگوں سے چند قدم آگے جا رہے تھے۔

"اچھا ہے" میں نے لاپرواہی سے کہا "بیچارے نے اس دن کے لئے انتظار بھی تو کافی کیا ہے"

"قسم ہے ایسی لڑکی میں نے نہیں دیکھی ۔۔ بڑے مزے میں چلی آرہی ہے ان دونوں کے درمیان! عورتوں والی تو کوئی بات ہی نہیں ہے اس پر شیخ نے میری طرف تائید کے لئے دیکھا۔

"عورت تو وہ ہے شیخ صاحب" میں نے اپنی اصل کیفیت چھپاتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے ہم ہی کچھ دوسری طرح کے مرد ہیں!"

آخن میرلے کے اس گاؤں میں پہلے آٹھ دس روز تو موسم صاف رہا اور دن خوب چمکاکئے۔ اس کے بعد جو جھڑی لگی اور بوندا باندی شروع ہوئی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے کا اصل موسم یہی ہے، اور سورج کا حال یہ ہے جیسے چند دن کا مہمان کہ آیا اور پھر لمبے عرصے کے لئے چلا گیا۔ یہی سورج کی یہاں بڑی چاہت ہے اور جرمن لوگ اسے مونث مانتے ہیں (ویسے عربوں کا آگ برسانے والا سورج بھی مونث ہی ہے، یہ ایک عجیب اتفاق ہے!) جس دن دھوپ نکلی ہوئی ہو اس دن جرمن لوگ سلام دعا کے بعد موسم کے بارے میں اپنی مسرت کا اظہار کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں "ڈس ویٹر اسٹ شون ہائیٹے" (موسم آج بہت سہانا ہے) یہاں کی بارش کا طور بھی اپنا ہے، نہ بادل گرجتے ہیں، نہ بجلی کڑکتی ہے اور نہ موسلا دھار مینہ پڑتا ہے۔ بس ایک ہلکی سی بے صدا بوندا باندی جو شروع ہوتی ہے تو بغیر رکے تین تین دن تک چلی جاتی ہے۔ ہم نے اس طرح کے موسم کا مقابلہ کرنے کے لئے اب تک کوئی تیاری نہ کی تھی۔ ہم میں سے کسی کے پاس چھتری تھی نہ برساتی۔ نتیجہ یہ کہ ہم انسٹی ٹیوٹ آتے جاتے ہوئے چوہوں کی طرح بھیگنے لگے، اور اگلا ویک اینڈ آتے ہی ہم نے بڑے شہر میونش (MUNICH) جانے کا پروگرام بنایا تاکہ

اپنے آپ کو چھتریوں اور برساتیوں سے لیس کریں، اور آخر ہفتہ کی چھٹیوں میں گھر کھانا پکانے کے لئے سودا سلف بھی لے آئیں۔ بارش کا سلسلہ چونکہ ابھی جاری تھا، شہزادے کی نیک دل "ہاؤس فراؤ" نے اپنی ایک اعلیٰ قسم کی چھتری ہمارے ساتھ کر دی۔ آخن میو ہلے سے ایک بس میں بیٹھ کر ہم پہلے روزن ہائیم گئے۔ وہاں سے ایک ریل گاڑی پکڑی۔ اور ایک ڈیڑھ گھنٹے میں میونشن پہنچ گئے۔ میونشن میں جب ہم چھتریاں خریدنے کے لئے ایک سٹور میں داخل ہونے لگے تو شہزادے نے ہمیں روک کر اچانک پوچھا: ہماری اپنی چھتری جو ہم ساتھ لائے تھے! ـــــ وہ چھتری کسی کے پاس نہیں تھی، اور ہم احمقوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھنے لگے ـــــ وہ تو اس بس میں رہ گئی جس کو ہم نے روزن ہائیم میں چھوڑا تھا۔ ہم میں سے کسی نے اسے بس کے اندر لگے ہوئے سامان کے جنگلے پر اوپر رکھ دیا تھا۔ جب اترنے لگے تو کسی کو اٹھانا یاد نہ رہا۔ پھر جیسے ہمیشہ ہوتا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک نے دوسرے کو اس بیہودہ غفلت کا ذمہ دار ٹھہرانے کی کوشش کی، اور ہماری میونشن کی سیر کا مزا کچھ دیر کے لئے کرکرا ہو کر رہ گیا۔

میونشن مغربی جرمنی کے تین مہانگروں (METROPOLISES) میں سے ایک ہے۔ دوسرے دو بڑے نگر فرینکفرٹ اور ہامبرگ ہیں۔ فرینکفرٹ (جسے جرمن فرانک فرٹ کہتے ہیں) ملک کا سب سے بڑا فضائی اڈہ اور اہم ترین تجارتی اور کاروباری مرکز ہے۔ ہامبرگ سمندری بندرگاہ ہے اور درآمد و برآمد کے معاملے میں یورپ کی تیسری بڑی بندرگاہ سمجھی جاتی ہے۔ اس میں غیر ملکی جہازوں کے عملے کے دل بہلاوے کے لئے سینٹ پاؤلی کے نام سے شہر کا ایک پورا محلہ ساحل کے قریب ہی موجود ہے ـــــ لیکن یہ دو تو بالکل بین الاقوامی قسم کے شہر ہیں، اور ایسے شہر ملتی جلتی شکل میں تمہیں ہر ملک میں مل جائیں گے۔ بخلاف ان کے میونشن ایک سو فیصد جرمن شہر ہے۔ ایسا شہر جو صرف بواریا جیسے صوبے کا صدر مقام ہو سکتا ہے۔ ایک شہر جس کا اپنا کردار ہے، اپنی فضا اور اپنی بوباس ہے، جس کی قدیم عمارتوں اور گرجوں کے فن تعمیر، اور جس کے عجائب گھروں اور آرٹ گیلریوں اور عجائب گھروں میں جرمن تہذیب و ثقافت اپنی تمام انفرادیت اور تفصیل کے ساتھ موجود ہے جس کی یونیورسٹی میں علاوہ دوسرے فنون کے بیئر کشید کرنے کے فن کی تعلیم بھی دی جاتی ہے اور کوئی شک نہیں کہ مغربی جرمنی کے جنوبی حصے میں سب سے اچھی بیئر میونشن ہی میں کشید ہوتی ہے ـــــ موازنہ سو فیصدی تو کبھی درست نہیں ہوا کرتا، لیکن اگر میں مغربی جرمنی اور پاکستان کا موازنہ کروں تو یوں سمجھ لیجئے کہ کراچی پاکستان کا ہامبرگ ہے اور لاہور میونشن! ـــــ اور لاہور میں بجائے بیئر کے لسی کشید ہوتی ہے جس کی دور دور تک شہرت ہے۔

میونشن کی سیر کو آتے ہوئے ہم نے اپنی استانی فراؤ ئن واکس سے کچھ اشارات (TIPS) لئے تھے۔ اس

نے کہا تھا کہ شہر کے وسط میں ایک چوک ہے جس کا نام مارین پلاٹز ہے، اور اس میں ایک گھنٹہ گھر ہے۔ جب دن کے گیارہ بجتے ہیں تو گھنٹہ گھر کی چوٹی میں لگی ہوئی کھڑکیاں کھل جاتی ہیں اور اس میں سے کچھ مورتیاں ظاہر ہو کر کوئی کھیل دکھاتی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد مورتیاں اندر چلی جاتی ہیں اور کھڑکیاں خود بخود بند ہو جاتی ہیں۔ اس کھیل کو جرمن زبان میں گلوکن شپیل (گھنٹیوں کا کھیل) کہتے ہیں۔ "آپ جب میونشن جائیں تو گیارہ بجے سے چند منٹ پہلے مارین پلاٹز پہنچ کر یہ کھیل ضرور دیکھیں" — ہم جب چھتریوں، برساتیوں اور دوسری چیزوں کی خرید فروخت سے فارغ ہو کر تھکے ہارے مارین پلاٹز پہنچے تو سوا گیارہ بجے تھے، اور "گلوکن شپیل" کب کا ہو چکا تھا ہمارے منہ کا مزا جو اس گمشدہ چھتری کے باعث پہلے ہی بگڑا ہوا تھا، کچھ اور خراب ہو گیا — لیکن ابھی کہاں!

مارین پلاٹز سے پھرتے پھراتے ہم اشیائے خوردنی کی مارکیٹ میں جا نکلے۔ وہاں ہم نے بڑے شوق سے بند گوبھی کا ایک پھول خریدا، اور اس کے ساتھ آدھ سیر (تین پاؤ کے قریب) "رنڈ فلائش" بھی (بڑا گوشت جو وہاں سب سے عمدہ اور سب سے مہنگا ہوتا ہے) واپس آ کر ہم نے بڑے چاؤ سے ہانڈی پکائی، اور بھوک سے نڈھال جب شام کو کھانے کے لئے بیٹھے تو معلوم ہوا کہ جسے ہم بند گوبھی سمجھ کر لائے تھے وہ اصل میں سلاد کا پھول تھا۔ جس کی وجہ سے ہمارا گوشت کا پکوان بالکل بے مزا اور پھیکا سیٹھا ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک نوالہ حلق سے اتارنے کے بعد دوسرا نوالہ لینے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ شہزادے کی زیر نگرانی ہم نے اس ہانڈی کے پکانے میں بڑی محنت کی تھی، اور میرے ہاتھوں میں تو پیاز کاٹنے کی وجہ سے مستقل بو بھی رچ گئی تھی، لیکن ہانڈی جب تیار ہوئی تو ایسی کہ لذتِ کام و دہن کا سامان کرنے کے ہمارے سارے منصوبے دھرے رہ گئے، اور ہم نے پیٹ کا خلا پر کرنے کے لئے دو وقت سلاد کے اس سالن پر گزارہ کیا۔

آخن میں ویسے بس کا سٹاپ میرے گھر کے قریب ہی تھا۔ لیکن اتوار کو بسوں کا نظام الاوقات بدل جانے سے میں اس بس کا پتہ نہ لگا سکا جس میں ہماری چھتری رہ گئی تھی۔ پیر کی صبح کو انسٹی ٹیوٹ کے وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے جا کر میں یونہی بس سٹاپ پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے روزانہ ٹائم جانے والی بس آ گئی۔ میں نے اندر جا کر ڈرائیور سے پوچھا "اس بس میں پرسوں ایک 'رنگین شرم' رہ گئی تھی۔۔۔؟" میرا جملہ ابھی مکمل نہ ہوا تھا کہ ڈرائیور بیچ ہی سے بولا "پیچھے جا کر دیکھ لو، پڑی ہوگی" — میں نے پیچھے جا کر ریلنگ پر دیکھا تو چھتری بالکل اسی جگہ رکھی تھی جہاں ہم اسے چھوڑ گئے تھے۔ بس — اس چھتری کے مل جانے سے ہم تینوں کو جو خوشی ہوئی اس کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکے گا۔ ہم نے یہ تو سوچ ہی رکھا تھا کہ آپس میں پیسے جوڑ کر شہزادے کی "نازس فراؤ" کو چھتری کی قیمت ادا کر دیں گے

لیکن یہ خیال ہمیں کھائے جاتا تھا کہ وہ جرمن عورت ہم لوگوں کے بارے میں کیا رائے قائم کرے گی۔ ہم پاکستانی لوگ اتنے بھلکڑ اور غیر ذمہ دار ہوتے ہیں کہ کسی کی امانت بھی سنبھال کر نہیں رکھ سکتے۔ بس ــــ شکر ہے کہ اس کی نوبت نہ آئی اور ہماری لاج رہ گئی!

لبنان کی اس حسینہ کی گڑیا ــــ منا ــــ اور میرے درمیان تعلق کی ایک ایسی منفی صورت ترتیب پا رہی ہے جس کا تجربہ میرے لئے بالکل نیا ہے، اور اس وجہ سے کافی دلچسپ بھی! اور میں اس دلچسپی کی خاطر اسے جان بوجھ کر طول دیئے جاتا ہوں۔ تعلق کی اس نوعیت کا بھی کوئی نام تو ضرور ہوگا جس میں دو انسان بیشتر وقت ایک دوسرے کی موجودگی سے آگاہ ہوتے ہوئے بھی اپنے رویے سے یہی ظاہر کرنا چاہتے ہوں جیسے وہ ایک دوسرے کے وجود سے بالکل خالی الذہن ہوں، انہیں ایک دوسرے کی مطلقاً پروا نہ ہو!

ہماری انسٹی ٹیوٹ کا نیچے کا کمرہ ایک وسیع مستطیل شکل کا ڈائننگ ہال ہے، جس میں چوڑائی کے رخ پر میزوں کی پانچ لمبی قطاریں بچھی ہیں۔ پہلے کچھ دن تو ہم کھانے کے لئے اس میں جہاں جگہ مل جاتی وہیں بیٹھ جاتے۔ لیکن پھر جیسے عموماً ہوتا ہے ہم نے اپنے لئے کچھ خاص جگہوں کو ترجیح دینی شروع کی۔ ہم تینوں ساتھی ہمیشہ آخیر والی پانچویں قطار میں بیٹھتے جس سے ملحق کامن روم تھا اور اس کی شیشے کی دیوار میں سے باہر درختوں کا سبزہ دکھائی دیتا تھا۔ اس قطار میں مجھے سرے والی نشست، جس کے پیچھے سڑک کی جانب کھلنے والی کھڑکی تھی، خاص طور پر پسند تھی، اور میں اپنی کلاس کے ساتھ جب بھی کھانے کے لئے نیچے اترتا تو سیدھا آخری قطار کا رخ کرتا اور وہاں وہ سرے والی نشست سنبھال لیتا۔ ایک دن ہماری کلاس کو برخاست ہوتے میں ذرا دیر لگ گئی۔ ہم نیچے اترے اور میں نے اپنی نشست کا رخ کیا تو وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ آنسہ منیٰ بڑے دھڑلے سے میری کرسی پر براجمان ہے اور ایک دکھاوے کی بے پروائی کے ساتھ اپنے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے لوگوں کو سپے کی رکابیں بھر بھر کے دے رہی ہے۔ اسے اگرچہ میری آمد کا پتہ چل گیا تھا اور وہ نیچی نگاہوں سے میری کیفیت کا جائزہ لے رہی ہے، لیکن اس نے ظاہر یہی کیا جیسے اس نے میرے آنے کا کوئی نوٹس نہ لیا ہو ــــ میں نے پیچھے کھڑکی کی سل پر اپنی کتابیں دھریں اور منیٰ سے دو تین نشستوں کے فاصلے پر ایک خالی جگہ پر بیٹھ گیا۔ وہ اس دن ایک فاتحانہ انداز میں خوش تھی، اور میرے سامنے کو بات بات پر اونچے قہقہے لگا رہی تھی۔ جیسے اس نے پی رکھی ہو! ایسے موقعوں پر اکٹھا کھانا کھاتے ہوئے ایک دوسرے کو رکابیاں اور پانی وغیرہ بڑھانا ہی پڑتا ہے۔ میں جب منیٰ کی طرف کوئی چیز بڑھاتا تو وہ بڑے رسمی طریقے پر اونچی آواز میں "ڈانکے" کہتی، جیسے میز کے دوسرے سرے

والے آدمی کو سنا رہی ہو! میں اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتا رہا لیکن کسی وقت بے خیالی میں نگاہ ادھر اٹھ جاتی، اور جونہی ہماری نظریں ملتیں، وہ ایک لاتعلقی کے ساتھ اپنے بائیں جانب بیٹھی ہوئی ہسپانوی لڑکی ماریا سے چٹر پٹر باتیں کرنے لگتی!

لیکن منیٰ کا یہ قبضہ مخالفانہ صرف ایک دن کی بادشاہت ثابت ہوا۔ اس کے بعد میں ہمیشہ وقت پر آنے اور اپنی پسندیدہ جگہ پر بیٹھنے لگا۔ منیٰ نے یہ دیکھ کر قریب کی قطار کے سرے پر بیٹھنا شروع کیا۔ میز کے سرے والی صدارتی نشست میری طرح اسے بھی بہت پسند تھی۔ اب ہمارے درمیان اس بارے میں گویا ایک خاموش مفاہمت ہو گئی تھی، اور نشستوں کے معاملے میں ہم نے آپا دھاپی چھوڑ دی تھی۔ ہم دونوں اپنی اپنی میز کے سرے پر بیٹھے بظاہر ایک دوسرے کی موجودگی سے بے پروا، کھانا کھانے اور اپنے آس پاس کے لوگوں سے باتیں کرنے میں مصروف رہتے! ــــ اس سارے عرصے میں منیٰ کی اکڑفوں اور تنگ مزاجی میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی، اور میں اس صورت حال سے بہت خار کھانے لگا۔ نجانے ہم لوگوں سے ایسی کون سی گستاخی شروع میں ہو گئی تھی کہ اس کا رویّہ ہمارے ساتھ پہلے دن سے ہی نارمل نہ رہا تھا۔ جبکہ وہ دوسروں کے ساتھ بالکل ٹھیک اور اپنے آپ میں ہوتی تھی!

ایک دن گردے یاد نے، میں ہم نیچے اترے۔ میں نے اپنے اور شیخ کے لئے ایک ایک پیالہ کافی کا لیا، اور ہم ہال کے وسط میں بچھی ہوئی ایک گول میز پر بیٹھنے کے لئے چلے۔ جب ہم اس میز پر پہنچے تو وہاں ستون کی اوٹ میں یکلخت منیٰ بیٹھی ہوئی دکھائی دی۔ جو اپنا کوئی خط پڑھنے میں مصروف تھی اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو میں نے فی الفور اپنا رخ بدلا اور قریب پڑی ہوئی ایک دوسری گول میز پر منیٰ کی طرف پشت کر کے بیٹھ گیا۔ شیخ کو میرے اس رویے پر بڑا اچنبھا ہوا اور وہ پنجابی میں کہنے لگا۔

"اے میں کہیا، کی گل اے۔ حسن دی سرکار اچ اینی گستاخی، کچھ خیال کرو بادشاہو!"

"آپ نہیں جانتے شیخ جی" میں نے کہا۔ "حسن کی سرکار کے مزاج جب آسمان پر ہوں تو اس کے ساتھ یہی رویہ مناسب ہے۔"

منیٰ نے میری اس حرکت کا بدلہ چکانے میں کوئی دیر نہ کی۔ اس دن دوپہر کے کھانے پر وہ بجائے سرے والی نشست پر میرے متوازی بیٹھنے کے قریب کی ایک نشست پر میری طرف پیٹھ کر کے بیٹھی، اور پھر مسلسل کئی روز وہ میری طرف پشت کر کے بیٹھتی رہی۔ اب اس کا چہرہ مجھ سے اوجھل رہتا، اور میری نگاہیں اس کے لمبے، کھلے ہوئے سیاہ

بالوں اور اس کی پیٹھ اور کمر کے خم کے ساتھ کھیلتی رہتیں۔

ہماری انسٹی ٹیوٹ کے پڑھانے والے سٹاف میں ایک استاد منیر شاہین بھی تھا۔ لبنان کا ایک عیسائی نوجوان جو اس ملک میں رہ کر جرمن زبان کی تدریس کا کوئی ڈپلومہ کر رہا تھا۔ جرمن زبان پر اسے بڑی دسترس حاصل تھی۔ ہفتے میں ایک دو دن وہ ہماری کلاس بھی لیتا اور نصابی کتب کی عین مطابقت میں چلتے ہوئے دونوں کا کورس گھنٹوں میں پورا کر دیتا۔ ایک دن دوپہر کے کھانے پر وہ میرے قریب کی نشست پر آ بیٹھا، اور میں نے اس کے ساتھ عربی زبان میں سلسلۂ کلام چھیڑا۔ وہ میرے منہ سے عربی گفتگو سن کر حیران ہوا۔ اور مجھے اس کی زبان بڑی رواں اور شستہ فصیح عربی زبان سن کر اس سے بھی زیادہ حیرت ہوئی، اس لئے کہ اس سے پہلے عرب لڑکوں نے مجھے اس بارے میں کافی مایوس کیا تھا۔ میں نے اس کے طریقِ تدریس کی بہت تعریف کی جس میں کسی قسم کا مبالغہ نہیں تھا، اور پھر اس سے فصیح عربی میں رواں ہونے کا راز پوچھا۔ وہ کہنے لگا: "میں دراصل بیروت یونیورسٹی میں پڑھاتا رہا ہوں اور یونیورسٹی میں چونکہ مراکش، الجزائر جیسے دور دراز ممالک سے طلبہ پڑھنے کے لئے آتے ہیں، ہمیں ان کی خاطر فصیح عربی بولنی پڑتی ہے۔ اگر ہم لبنان کی مقامی بولی میں لیکچر دیں تو بہت سی باتیں ان کے پلے ہی نہ پڑیں ——— لیکن مجھے تعجب اس پر ہے کہ آپ اتنی اچھی فصیح عربی بول لیتے ہیں۔ آپ نے یہ کہاں سیکھی اور کیوں کر سیکھی؟" اس دن ہم نے دیر تک باتیں کیں اور میں نے اسے ان سب کتابوں کے بارے میں بتایا جو میں نے جدید عربی ادب پر پچھلے چند برسوں میں پڑھی تھیں۔ جن میں ایک ناول بیروت کے ایک محلے الخندق الغمیق کے نام سے تھا۔ وہ یہ سن کر خوشی سے اچھل پڑا کہ میں ایک ناول کے واسطے سے اس کے اپنے محلے کو اتنا قریب سے جانتا تھا ——— اس نے وہاں سے اٹھ کر سب عرب طلبہ سے میری اس گفتگو کا تذکرہ کیا، اور ان میں منیٰ بھی شامل تھی ——— لیکن اس سے بھی کوئی فرق نہ پڑا۔ اور اس کے کلف لگے رویے میں ذرہ بھر نرمی پیدا نہ ہوئی۔

دوپہر کے کھانے اور سہ پہر کی کلاسوں کے درمیان تقریباً چار گھنٹے کا وقفہ ہوتا تھا۔ جو دور کے رہنے والے طلبہ اکثر انسٹی ٹیوٹ میں ہی گزارتے تھے۔ منیٰ اس وقفے میں کامن روم کے باہر پڑی میز پر پنگ پانگ کھیلا کرتی تھی۔ مجھے جب کبھی اس سے چھیڑ خانی کا خیال آتا، میں آہستہ سے قدم پر قدم رکھتا ہوا وہاں جا کر کھڑا ہوتا۔ منیٰ اچانک مجھے دیکھتے ہی سنجیدہ اور خود آگاہ ہو جاتی۔ اس کے کھیل کا انداز یکلخت بدل جاتا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو کر اس کے ہونٹوں سے ہم رنگ ہو جاتا۔ چھوٹی سفید گیند پر اس کے بلّے کی ضربیں کچھ زیادہ سخت پڑنے لگتیں اور اس کے مقابل کھیلنے والے لڑکا یا کھیلنے والی کا زیادہ وقت گیند کے پیچھے بھاگنے میں گزرنے لگتا۔ لیکن جب اس کی جانب گیند ذرا دور نکل

جاتی تو وہ اپنی جگہ سے ذرا نہ ہلتی، اور دوسروں کو گیند لانے کے لئے بھیجتی —— میں تھوڑی دیر اس منظر سے لطف اندوز ہو کر خراماں خراماں آگے چل دیتا، اور کچھ فاصلہ چل کر مجھے اپنے پیچھے گیند کی ٹِک ٹِک سے اندازہ ہوتا کہ کھیل اپنی نارمل حالت پر واپس آگیا ہے!

ایک دن میں ٹیبل ٹینس کی میز سے ذرا فاصلے پر بنچ پہ بیٹھا تھا۔ منیٰ اور ہسپانوی لڑکی ماریا کھیل رہی تھیں۔ اتنے میں دوسری جانب کامن روم کی طرف سے منیر شاہین برآمد ہوا۔ اور مجھے دیکھ کر دور ہی سے پکارا۔

”کیف الاحوال یا سید کاظم!۔ لماذا تجلس بعیداً ولا تلعب ؟“ ۱؎

میں نے کہا میرا کھیلنے کو جی نہیں چاہ رہا۔ میں صرف دیکھنا چاہتا ہوں۔

”لا و ربک“ وہ پھر للکارا ”تعال تلعب انت و منیٰ، وانا و ھذا الحسناء من اسبانیا“ ۲؎

تم اور منیٰ —— یہ سننا تھا کہ منیٰ نے کانوں تک سرخ ہو کر اپنا بلاّ میز پر پٹخ دیا، کرسی پر سے اپنی جرسی اٹھا کر کندھوں پر ڈالی، اور کامن روم کی طرف چل دی۔ الاستاذ منیر شاہین نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن اس نے ایک نہ مانی اور غائب ہو گئی۔ منیر اس کے یوں اچانک کھیل ختم کرنے اور اس کی تجویز کو ٹھکراتے ہوئے گھر کو چل دینے پر حیران و سراسیمہ تھا۔ لیکن میرے لئے اس میں حیرانی کی کوئی بات نہ تھی۔ میں مسکراتے ہوئے اس کی طرف آیا اور بلاّ اس کے ہاتھ تھماتے ہوئے کہا ”چلئے ہم دو کھیلتے ہیں —— لڑکیوں کے ساتھ کیا کھیلنا!“

منیٰ لبنان کی ایک عیسائی لڑکی ہے۔ اور مجھے ڈانیل نے بتایا کہ اس کا باپ عرب ہے۔ لیکن ماں فرانسیسی ہے۔ ”جبھی“ ڈانیل کہتی ہے ”وہ فرانسیسی اتنے خالص لہجے میں بولتی ہے جیسے میں خود بولتی ہوں“ —— اپنی شکل و صورت، لباس اور چال ڈھال میں سو فیصد ایک یورپین لڑکی! لیکن اپنی پیدائش اور پرورش کے ناطے وہ ’مشرق‘ کی ہی بیٹی ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ اپنے مزاج کی ’مشرقیت‘ سے پوری طرح آزاد نہیں ہو سکی۔ اپنے رنگ اور روپ کے بارے میں اتنی خود آگاہی، اپنے صنفِ نازک ہونے کا اتنا حد سے بڑھا ہوا احساس، اپنے مداحوں سے کامل نیازمندی اور فروتنی اور چاپلوسی کی توقع،

۱؎ کیا حال ہے مسٹر کاظم، تم دور کیوں بیٹھے ہو اور کھیل کیوں نہیں رہے۔

۲؎ یہ نہیں ہوگا آؤ کھیلیں، تم اور منیٰ ہو جاؤ اور میں اور سپین کی یہ حسینہ!

اور یہ توقع پوری نہ ہونے پر جھنجھلانا، بگڑنا، زمین پر پاؤں پٹخنا اور لال پیلا ہو ہو جانا ——— یہ رویہ ایک حساسیت زدہ مشرقی لڑکی کا ہی ہو سکتا ہے۔ مغرب کی لڑکی ان منزلوں کو بہت پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گئی ہے۔ اور میں انسانی نفسیات کا اتنا علم تو رکھتا ہوں کہ یہ جان سکوں کہ مینا کے دل میں کیا ہے، اور وہ اپنے رویے میں کیونکر اعتدال پر آسکتی ہے۔ لیکن پھر میں بھی تو اپنی فطرت میں مشرقی ہوں اور اپنے مزاج اور احساس خودداری کے ہاتھوں مجبور۔ ایک طرف اگر غرور و تمکنت ہو تو دوسری طرف ہٹ دھرمی اور سرکشی کا پایا جانا کوئی ایسی انہونی بات نہیں ہے ——— پھر اس چھیڑ خانی میں اپنا ایک لطف بھی تو ہے، اور حسن برہم کے نظارے میں ایک اور ہی مزا ہے، اور جب تک حالات اس نہج پر چلے جاتے ہیں انسان اپنی زندگی کے اس انوکھے اور دلچسپ تجربے سے کیوں محروم رہے!!

نظر نامہ

محمود نظامی

ہم ایک بارونق بازار میں سے گزر رہے تھے تو ہمارے بائیں جانب کے علاقے کے اندر چھپی ہوئی کسی مسجد سے عصر کی اذان کے آخری جملے میرے کان میں پہنچے اور میرا دھیان فوراً ان مساجد کی طرف گیا جو جدید و قدیم قاہرہ میں جگہ جگہ نظر آتی ہیں اور جن میں سے بعض کو میں اپنے سابقہ سفر کے دوران میں دیکھ چکا تھا۔ اس شہر میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی تاریخی مسجد سے لے کر عہد جدید کی نئی تعمیر شدہ مساجد تک ہر خانۂ خدا ایک عجیب شان رکھتا ہے۔ حضرت سیدہ زینب بنت فاطمۃ الزہرا کی مسجد اور حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد جس کے احاطے کے ساتھ سلاطین اور بیگمات کا قبرستان ہے۔ دل پر ایک کیفیت طاری کرتی ہیں لیکن قلعے کے اندر سلطان نصیر اور محمد علی پاشا کی مسجدیں اور شہر میں سلطان برموق اور سلطان حسن کی مسجدیں کچھ اور ہی کیفیت رکھتی ہیں۔ گو ان سب میں خوب صورت اور نظر نواز مسجد تو وہی ہے جو محمد علی پاشا سے منسوب ہے۔ جو اپنے جھاڑوں، فانوسوں، بجلی کی روشنیوں، رنگین ستونوں، منقش محرابوں اور فرش کے قالینوں کی وجہ سے بالکل دلہن کی طرح سجی ہوئی نظر آتی ہے لیکن یہ حسن و آرائش کچھ اسی مسجد سے مخصوص نہیں۔ قاہرہ کی بیشتر مسجدیں ایسی آراستہ اور مکلف ہیں کہ وہاں سے اٹھ کر جانے کو جی نہیں چاہتا۔

پھر ہم ازبکیہ باغات کی طرف بڑھ گئے جس کے مغرب میں قاہرہ کی غیر ملکی آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کی سکونت ہے۔ اس علاقے میں سرکاری دفاتر، جدید رنگ کی دکانیں اور یورپین طرز تعمیر کی اقامت گاہوں کی افراط ہے۔ اور یہاں زندگی اپنی گہما گہمی سے مقامی تموّل و ثروت کی ایک مستقل نمائش میں مصروف نظر آتی ہے۔ ازبکیہ سے گزر کر کئی بارونق سڑکوں کو طے کرتے ہوئے ہم قصر النیل کی حسین شاہراہ پر جا نکلے جو شہر کو اس دریائی جزیرے سے جا ملاتی ہے جس پر اسمٰعیل پاشا کا محل اب ہوٹل کی صورت میں تبدیل ہو چکا ہے اور جس میں

کھیتوں اور گھڑدوڑ کے ہریالے میدان اور محکمۂ زراعت کے پرشکوہ دفاتر ہیں۔ یہاں سے یہ پرفضا سڑک دریا کے مغربی کنارے پر اتر کر جیزہ کے اصل راستے سے مل گئی جس کے دونوں طرف حسین سایہ دار پیڑوں کی دو رویہ قطاریں اہرام کے قریب تک چلی گئی ہے جو یہاں سے چھوٹی چھوٹی مخروطی عمارتوں کی طرح فاصلے کی دھند میں تیرتے اور بہتے نظر آرہے تھے۔

چڑیا گھر اور پھر عجائب خانے سے گزر کر ہم جیزہ کے قصبے کی طرف بڑھنے لگے تو ہمارے ایک طرف دریا کا اونچا کنارہ اور دوسری طرف ایک وسیع و عریض ویرانہ حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا تھا جس کی وسعت میں اونٹ اور بکریاں اِدھر اُدھر جنگلی بوٹیوں اور خاردار جھاڑیوں کو چر رہی تھیں۔ ہمارے ساتھ ساتھ ٹرام کی پٹڑی بچھی ہوئی تھی جس پر مسافروں سے بھری ہوئی گاڑیاں قاہرہ سے جیزہ کی جانب اور جیزہ سے قاہرہ کی جانب آجا رہی تھیں۔ دور ایک طرف دریا سے ذرا ہٹ کر جدید جیزہ کے ہوٹلوں، آرام گاہوں دفاتر اور دکانوں کی سنگی عمارتیں سورج کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ اور ان سے پرے قدیم قصبے کے مٹیالے جھونپڑوں کے اوپر سے کھجور اور تاڑ کے درختوں کے سر نظر آرہے تھے۔ ان کے مقابل صحرا کے سرے سے جیزہ کے مینار بڑھتے اور ابھرتے میری دلچسپی اور اشتیاق کے ساتھ وہی کھیل کھیل رہے تھے جو سمندر میں گزرتے ہوئے جہاز کا نظارہ دیکھنے والوں کی توجہ کے ساتھ کھیلا کرتا ہے۔

ٹرام کے اڈے سے گزر کر کار ایک ریستوران کے مقابل رک گئی۔ جیسے ہی ہم باہر نکلے درجن بھر لوگ جن میں زیادہ تعداد لڑکوں کی تھی۔ دکانوں کے سایوں میں سے نکل کر ہم پر چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے اور عربی اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں تہذیب حاضرہ کے لوازم از قسم چوانگ گم، چاکلیٹ، سگریٹ سانس کی نالی کو ٹھنڈا کرنے والی گولیاں، چوسنے کی مٹھائی اور ایسی ہی دوسری چیزیں بیچنے کے لیے چلانے لگے۔ ان خوانچہ فروشوں میں دو تین لوگ ایسے بھی تھے۔ جو احساس کمتری کی وجہ سے چپ چاپ ہمارے سامنے اپنے مال لیے کھڑے تھے کہ ان کے پاس ڈبوں میں بند کی ہوئی کھجور اور ترکی راحت الحلقوم جیسی دیسی چیزوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ ان خوانچہ فروشوں کو لڑتے بھڑتے چھوڑ کر ہم آگے بڑھے اور آخر ایک سال خوردہ اور امتداد زمانہ سے گھسی ہوئی سنگی سڑک کو طے کرکے ریت میں سے گزرتے ان میناروں کے سامنے جا پہنچے

۱۔ اسس کا معری تلفظ انگیزہ ہے۔

جو چٹانوں پر سے اٹھ کر آسمان تک جا پہنچے تھے۔

جن لوگوں نے اہرام کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا وہ کسی بیان اور تحریر سے ان کی حقیقی شان اور شکوہ کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ جس طرح لاہور کی بادشاہی مسجد کے متعلق کسی زبانی تفصیل کسی تحریری یا عکسی تصویر سے اس کی اصل عظمت کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح انہیں یا کم از کم ان تینوں اہرام میں سے ایک یعنی مینار کبیر کو دیکھے بغیر یہ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ انسان اپنے خوابوں کی تعبیر کے لئے کیونکر پہاڑوں کا جگر چیر سکتا ہے اور اپنے فانی ہاتھوں کی ابدی تخلیقات سے کس طرح مظاہر قدرت کا دل دہلا سکتا ہے۔

مصر کی پراسرار سرزمین پر جو عصر حاضر کے پیہم تجسس اور تحقیق کے باوجود ابھی تک نیم دریافت شدہ بھید ہے۔ تاریخ انسانی کے اولین تہذیب و تمدن کے بانی فرمانرواؤں نے ایسی ایسی پرشکوہ عمارات، رفیع الشان مندر، عظمت مآب معبد اور نخیر آفریں مجسمے تعمیر کئے تھے جن کا کوئی جواب آج کی مہذب دنیا اپنے تمام فنی کمالات کے باوجود پیش نہیں کر سکی اور جن کا شاہانہ وقار انکی موجودہ بربادی کے عالم میں بھی ان سے جدا نہیں ہو سکا۔ ان تمام عمارات میں سب سے عظیم تعمیر مینار کبیر ہے جو پتھر اور مسالے کی صورت میں عہد قدیم کے بے مثال علم و فضل، فنی استعداد اور کسب کمال کا ایسا زندہ جاوید ثبوت ہے۔ جسے دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ عہد جدید اپنی سائنسی فنی اور ٹیکنیکل ترقی کے باوجود عہد پارینہ کی معلومات علم ہندسہ، حساب، نجوم اور فن تعمیر اور اس کے کمال نقاشی، صناعی اور سنگ تراشی کو پہنچ نہیں سکا۔ چھ ہزار برس سے یہ عمارت سینۂ زمین پر پنجہ گاڑے پیشانی فلک سے سر بھڑائے محکم و قائم کھڑی ہے اور انسان کے اپنے تباہ کن ہاتھوں کی غارت گری کے ماسوا وقت اور عناصر قدرت کی کوئی تخریبی کوشش اسے فنا کرنے اور اس کی عظمت کو مٹانے میں کامیاب و بامراد نہیں ہو سکی۔ اس عمارت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انسان جو آدم سے لے کر اس وقت تک قدرت کے عناصر اور کائنات کی طاقتوں کو مطیع و منقاد کر کے خلافت ارضی کا تاج اپنے سر پر رکھنا چاہتا ہے اپنے عزائم میں کس بلندی کو پہنچ سکتا ہے۔

مینار کبیر جو چوتھے شاہی خاندان کے دوسرے بادشاہ خوفو نے اپنے مقبرے کے لئے تعمیر کیا تھا۔ چونکہ قدیم مصریوں کے عقیدے کے مطابق مردے کا تمام اثاث البیت اور سارا دھن دولت اس کے ساتھ دفن کی جاتی تھی اس لئے خوفو کو اس بیش بہا زر و مال کی حفاظت کا بہت خیال تھا، جو سالہا سال کی لوٹ کھسوٹ اور

پیہم فتوحات سے اس نے ذاتی املاک کے طور پر تاراج شدہ اور باجگزار ملکوں سے جمع کیا تھا۔ اس گنج گراں مایہ کو لٹیروں کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کے لئے اس نے اپنے مرقد کو ایک سنگین حصار کی صورت میں تعمیر کیا۔ جس کی ساخت میں قد آدم پتھر کے کئی لاکھ تیس تیس چالیس چالیس من وزنی ٹکڑے استعمال کئے گئے۔ یہ عمارت اپنی بنیادوں پر تقریباً ۷۰۰ فٹ مربع اور چوٹی تک ۴۸۵ فٹ بلند ہے۔ اس کے قرب میں اسی خاندان کے دو اور بادشاہوں خافرع اور منکاؤرع کے دو اہرام بھی موجود ہیں۔ لیکن یہ دونوں اسی مینارِ کبیر کی نقل ہیں اور اپنی بلندی، وسعت اور فنی کیفیت میں اس سے کمتر ہیں۔

مینارِ کبیر کی تعمیر پر ایک لاکھ انسان جو مصر کے مختلف علاقوں اور اس کے زیر نگیں ملکوں سے خاص طور پر اس کام کے لئے لائے گئے تھے، بیس سال تک محنت مزدوری کرتے رہے۔ ان میں سے ہزاروں تعمیر کے دوران ہی مر مٹ گئے اور ہزاروں جو اس کی بنیاد رکھے جانے کے وقت عنفوان شباب میں تھے اس کی تکمیل پا جانے تک مشقت کے ہاتھوں پیش از وقت کہولت اور بڑھاپے کو پہنچ گئے۔ شاید دنیا کی کسی عمارت پر آج تک اتنے انسانوں نے اتنی مدت تک ایسی جفاکشی سے کام نہیں کیا۔ اس عمارت کے لئے سنگ خارا کی چٹانوں کو صحرائے نوبیہ میں تراشا جاتا تھا۔ پہلے یہ عظیم ٹکڑے پہاڑوں پر سے کاٹے جاتے۔ پھر انہیں نیل کے راستے کشتیوں میں ڈال کر جیزہ میں چار سو میل نیچے دریا کے بہاؤ پر لے جایا جاتا۔ یہاں انہیں رسوں اور زنجیروں کے ذریعے تپتی ہوئی ریت پر سے کھینچ گھسیٹ کر مینار کی جائے تعمیر پر پہنچایا جاتا۔ پھر انہیں جرِ ثقیل اور ہزاروں سخت جان غلاموں کے قوی ہاتھوں کے توسط سے اوپر کھینچا جاتا اور انسانی ناخن کی دبازت سے بھی باریک رو سے کے کسی نامعلوم مسالے سے ایک دوسرے کے اوپر جوڑا جاتا۔

اس عمارت کے چاروں طرف ایک مہیب اسرار احاطہ کئے ہوئے دکھائی دیتا ہے اور انسانی فہم حیران رہ جاتی ہے کہ کس طرح ایک زبردست شخص کی ذاتی آرزو کے ایک مہیب خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی خاطر ایک لاکھ زبردست اشخاص بیس برس تک اپنا خون پسینہ ایک کرتے رہے۔ میں اس عمارت کا نظارہ کرنے کے دوران میں غور کر رہا تھا کہ اپنی خونیں تعمیر کے بیس سال کے دوران میں اس مینار نے نہ جانے انسانی ظلم و شقاوت، ذلت و بے آبروئی اور اذیت و درد کے کیسے کیسے جگر خراش المیے اور نمائش ثروت اور نمود و شوکت کے کیسے کیسے دلفریب مناظر دیکھے ہوں گے۔ میں سوچنے لگا کہ اگر کوئی شخص میرے پاؤں تلے کی منوں ریت کے اندر مدفون ان ہزاروں مزدوروں، معماروں اور غلاموں کے دل کی کیفیت کو بھانپ سکتا،

جو سالہا سال تک اس عمارت کی تعمیر کی خاطر بھوک اور تھکن خوف اور اسکراہ، علالت اور نقاہت، تعزیر اور ظلم کے ہاتھوں تپتے ہوئے صحرا کے سینے پر گر گر کر دم توڑتے رہے ہیں تو وہ اندازہ کر سکتا کہ ہر وہ چیز جس کی فطرت انسانی نے آرزو کی ہے یا قوائے انسانی نے جس کے حصول کی خاطر مصائب جھیلے ہیں کسی نہ کسی صورت سے اس عمارت کی تعمیر میں مزدور کار فرما رہی ہے۔ عشق و محبت، عقیدت و ایمان، اطاعت و فرمانبرداری، عزم و ایقان کے بلند جذبات کے ساتھ ساتھ وہ خواہشات سفلی جن کی تکمیل کی خاطر انسان دوست سے فریب اور سازشوں سے بے ایمانی کو اپنا شعار بناتا ہے یا طلب زر اور حصول انعام کا بندہ بن جاتا ہے یا حرص و ہوس کو زندگی کا ماحصل سمجھنے لگتا ہے، اس عالی شان عمارت کی تکمیل میں برابر کے شریک رہے ہیں۔

اور پھر میری چشم تصور کے سامنے وہ تمام انسان جو چھ ہزار برس قبل اس عمارت کی تعمیر پر مامور تھے زندہ اور متحرک نظر آنے لگے۔ غربت و افلاس اور محنت و مشقت کے مارے ہوئے سیاہ فام ننگ دھڑنگ مزدوروں اور غلاموں کی بیسیوں لمبی لمبی قطاریں تھیں جو آگ برسانے والے سورج کی جھلستی ہوئی شعاعوں کے نیچے تپتی ہوئی ریت پر پسینے میں شرابور، تھکن سے چور، زخموں سے نڈھال، سنگ خارا کے بڑے بڑے ٹکڑوں کو رسیوں اور زنجیروں کی مدد سے کپکپاتے ہوئے دانتوں اور مشقت سے پھولی ہوئی رگوں کے ساتھ کنارۂ نیل سے جانب صحرا گھسیٹ رہے تھے۔ ان کے سر پر جلاد صفت کارندے ہاتھوں میں دو دو ہاتھ لمبے چابک لئے للکار للکار کر کام کی نگرانی کر رہے تھے اور ان کے کوڑوں کی ضربوں سے نحیف و نزار آدمی زخمی ہو ہو کر گر رہے اور لڑکھڑا لڑکھڑا کر اٹھنے کی کوشش میں دم توڑ رہے تھے۔ دریا کے کنارے سے لے کر اس سنگی چبوترے تک جو چٹان کے اوپر مقبرے کی کرسی کے لئے تعمیر ہو چکا تھا، ایک قیامت برپا تھی، جس میں نفسا نفسی کی کیفیت آشکارا اور میدان حشر کا ہنگامہ نظر آتا تھا۔ کارندے اور منتظمین لپک لپک کر کاریگروں اور معماروں کے کام کا جائزہ لے رہے تھے۔ ہر طرف ایک بے پناہ شور بلند تھا۔ جس میں احکامات کی صدائیں اور عجلت کار کی ہدایات گونج رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کائنات کو خدا کے کسی عذاب نے آلیا ہے اور انسان ڈھور ڈنگروں کی حالت اختیار کر گئے ہیں۔

پھر یک لخت یوں دکھائی دینے لگا جیسے یہ تمام کاروبار اچانک رک گیا ہے اور دور ساحل نیل کی طرف سے ایک غبار اٹھا ہے جو بتدریج ہماری طرف بڑھتا آ رہا ہے۔ اب یہ قریب آگیا ہے اور قریب آگیا ہے اور اب اس غبار کے اندر سے ایک شاہانہ جلوس مصر قدیم کی تمام تمدنی شوکت کے ساتھ ہماری

طرف بڑھنے لگا ہے فاصلے پر سے سونے چاندی کے زیورات، زرنگار لباس، مجلا ہتھیار، ہاتھی دانت
کے منور ساز و سامان کی آب و تاب، سورج کی تیز روشنی میں آنکھوں کو خیرہ کر رہی ہے۔ جلوس میں سب
سے آگے پیادوں کا لشکر جرار ہے، اس کے پیچھے گھڑ چڑھی فوج کے رسالے ہیں، ان کے عقب میں مسلح
شتر سواروں کے دستے ہیں جو بڑے شاہانہ تزک و احتشام اور فوجی ضبط و اہتمام کے ساتھ چلے آ رہے ہیں
ان کے بعد دربار مصر کے مقربان خاص کی جماعت اپنے اپنے مرتبے کے ملبوسات زیب تن کئے آ رہی ہے
ان کے عقب میں شاہی بیگموں اور ساحروں کی ٹولیاں ہیں جن کے پیچھے شاہی معبد کا مہا پجاری اور اس
کے پہلو میں دیوتا آمن رع کے ہیکل کا بڑا کاہن اپنے اپنے منصب کے شاہی نشانات ہاتھوں میں لئے
پجاریوں کی اس منڈلی کے سر کے اوپر بڑے وقار سے چلے آ رہے ہیں جو دیوتاؤں کی ثنا کے گیت گا
رہی ہے۔ ان کے پیچھے آئیسس دیوی کے مندر کی پچاس دیوداسیاں اور پجارنیں ہیں، جن کی پشت
پر آٹھ شاہی چوبدار ہاتھوں میں جڑاؤ عصا لیے سینہ تانے سر اٹھائے بڑھے چلے آ رہے ہیں، ان کے عقب
میں ایک سو مصری دوشیزائیں زری کے پارچات پہنے، گلے میں ریشم کے دوپٹے لٹکائے، سونے کے
کمر بند باندھے، پھولوں کے ہار اور کنٹھے پہنے، بادشاہ کے راستے پر برگ گل بچھا رہی ہیں۔ حسن و جوانی کے
اس سیلاب کے خاتمے پر خود فرعون کی پرشکوہ سواری ہے۔ دونوں معبودوں کے دیار و امصار کا بادشاہ
ایک بہت بڑے جڑاؤ تخت کے اوپر جسے امراء اور درباریوں نے کندھے پر اٹھا رکھا ہے، سر پر افعی والا
مکٹ رکھے، شاہانہ زیب و زینت کے بیش قیمت زیورات پہنے ہاتھ میں دیوتاؤں کی عظمت و تقدس
کا عصا تھامے، سونے کی ایک عالی شان مسند لی پر بڑے کبر و نخوت سے بیٹھا ہے، اس کے جلو میں دربار
کے بڑے بڑے اہل کار، نامی امراء، عالی مرتبہ رئیس، جلیل القدر حکماء اور ان کے پیچھے لونڈی غلاموں اور شاہی
خدمت گاروں کا ایک جم غفیر قدم بڑھاتا چلا آ رہا ہے۔ میں سوچنے لگا کہ شکوہ انسانی کے اس ظاہری کر و فر
کو دیکھ کر اگر مصر کے سادہ دل لوگ خالق ارض و سما کے اقتدار کل سے منکر ہو کر فرعونوں کو دیوتاؤں کا اوتار
سمجھنے لگے تھے تو یہ کون سے اچنبھے کی بات تھی۔

پھر شوکت انسانی کا یہ سمندر جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک متلاطم نظر آ رہا تھا، دفعتہً تھم گیا
ہر فرد بشر نے اظہار عقیدت میں اپنا سر جھکا دیا اور فرعون خود بھی مصر کے دوہرے تاج والا بادشاہ، مسند پر
سے اتر کر پھولوں میں چھپے ہوئے راستے پر سے ایسے غرور و تکبر سے گزرا گویا فرش زمین کو نفرت و حقارت

سے ٹھوکر مار رہا ہے۔ پھر وہ وزراء اور کاہنوں کے ساتھ، خمیدہ سر خلقت کے ابرو اور سو قد فوج کے ہجوم میں سے گزرتا مقبرے کی عمارت کے اندر اس کی تعمیر کا جائزہ لینے کے لیے چلا گیا۔ غالباً وہ ہر مرحلے پر اس امر کی تشفی کرنے کی خواہش رکھتا تھا کہ اس کا سنگین و مستحکم مقبرہ اس بیش بہا مال و منال کی حفاظت کا ضامن ہوسکے گا یا نہیں جو اس کی میت کے ساتھ اس کے اندر دفن ہونے والا تھا۔ نہ جانے اس نے اس سنگی حصار کو اس دفینے کی حفاظت کے لئے کس قدر قابلِ اعتماد سمجھا تھا کہ اس نے پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ اپنی لاش کے علاوہ کروڑوں روپے کے ساز و سامان کا بھی امین بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مگر اسے کیا خبر تھی کہ اس کی تدفین کے چند سو سال بعد ہی لوٹ کھسوٹ کا دلدادہ انسان اس کی میٹھی نیند کی راحت میں یکایک خلل انداز ہو جائے گا اور وہ مال و دولت جس کی حفاظت کے لئے اس نے ایسا محکم انتظام کیا تھا۔ ان لٹیروں کے ہاتھوں نیست و نابود ہو جائے گی جو اس کی ہڈیوں کو بھی تابوت کے اندر سے کھینچ کر فرشِ زمین پر بکھیر دیں گے۔

صالح حسین نے کہا: "کبھی یہ عظیم عمارات فراعنۂ مصر کی شاہی سطوت کا پُرشکوہ ثبوت تھی۔ لیکن آج اس کے اندر چمگادڑوں اور حشرات الارض کا بسیرا ہے اور ایک پر ہول تاریکی اور غم کی ایک روح فرسا لہر کی اس میں مستقل فرمانروائی ہے۔ اگر آپ کہیں تو اس کے اندر چلیں۔"

اس مشورے پر جس وقت میں غور کر رہا تھا تو وہ جذبۂ تحقیق جو حضرت آدمؑ کے وقت سے آج تک ہر انسان کے لئے بشریت کا ایک کمزور پہلو ہے، میرے تجسس اور دلچسپی کو اکسانے لگا کہ میں اس پُراسرار مقبرے کے اندھیرے کے اندر جا کر ایک نظر یہ مزید دیکھوں گا کہ اس بربادی کے عالم میں یہ کس خوف ناک بھید کو اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہے۔ میں نے اس مینار پر ایک نظر ڈالی۔ ایک بے پناہ حسرت و یاس اس عظیم عمارت کے چہرے پر برس رہی تھی اور پھر دفعتاً اس عمارت کی سوگواری کا احساس میرے حواس کو اہرام جیزہ سے ہٹا کر سکندرے کے قصبے میں شہنشاہ ہند جلال الدین اکبر کے حسرت آگیں اور درد انگیز مقبرے کی طرف لے گیا۔ میں سوچنے لگا کہ مغلوں کی تمام عمارات میں یہ تعمیر کس قدر سوگوار اور افسردہ ہے کہ اس میں داخل ہونے والا کوئی شخص دلگیر اور پژمردہ ہوئے بغیر یہاں سے باہر نہیں آ سکتا۔ تاج محل بھی ایک مدفن ہے لیکن اسے دیکھ کر ایک قلبی فرحت میسر آتی ہے۔ ہمایوں اور جہانگیر کے مقبرے بھی مزارات ہیں لیکن وہ دل پر افسردگی کا کوئی اثر چھوڑنے کے بجائے اپنے شاہانہ وقار سے ناظر کو مرعوب کر لیتے

ہیں۔ حد یہ ہے کہ ملکہ نورجہاں کا بے حیثیت مرقد بھی اپنے اندر ایک مخصوص کشش رکھتا ہے، لیکن ہندوستان کے سب سے جلیل القدر شہنشاہ کی یہ آخری آرام گاہ اپنی عجیب طرزِ تعمیر کے طفیل کچھ ایسی اداس ہے کہ یہاں پہنچ کر ہنستا کھیلتا انسان، اگر قطعاً افسردہ نہیں تو کم از کم سنجیدہ ضرور بن جاتا ہے۔

میں نے صالح حسین سے کہا: "میں ان اہرام کو صرف باہر سے دیکھنا چاہتا تھا۔ اگر آپ میرے ساتھ آئیں تو ہم انہیں دوسری طرف سے دیکھنے کے بعد قاہرہ کو لوٹ چلیں۔"

ہم اس چٹان سے ہٹ کر جس پر ان میناروں کی بنیادیں ہیں، ٹوٹے پھوٹے مندروں اور حجروں کے قریب سے گزرتے ہوئے ابوالہول کے اس عجیب و غریب بت کے پاس پہنچے جس کا دھڑ شیر کا اور سر عورت کا ہے۔ یہ بت جو سنگ خارا کی پوری چٹان کو تراش کر بنایا گیا ہے۔ ہزارہا سال سے ان اہرام کی پاسبانی کر رہا ہے۔ لیکن ہزارہا سال کی طویل مدت میں کوئی شخص یہ عقدہ حل نہ کر سکا کہ اس بت کے قیام کا صحیح مقصد کیا تھا اور اس نے آج تک کیا مخصوص خدمت سرانجام دی ہے۔

ہم اس مجسمے کے عقب سے نکل کر اس کے سامنے آئے تو میں نے اس کے عجیب و غریب چہرے پر نظر ڈالی۔ اس کی بے نور آنکھیں کائنات کے کسی سربستہ راز کو بڑی انسانی دلچسپی کے ساتھ تک رہی تھیں اور غالباً اس کی دید کی وجہ سے ایک پراسرار تبسم اس کے ہونٹوں پر کھیل رہا تھا۔

صالح حسین نے کہا: "نہ جانے اس مجسمے کو کس رعایت سے ابوالہول کہا جاتا ہے۔ اگر اس سنگی حسینہ کے چہرے پر موٹی ناک، جس کا ایک حصہ طویل مدت گزری حربی سرگرمیوں کے باعث توپ کے ایک گولے سے ٹوٹ گیا تھا، سالم ہوتی تو آپ کو اس حقیقت پر تعجب ہوتا کہ اپنے خدوخال کی وجہ سے آج کل کی مصری لڑکیاں اس سے کتنی مشابہت رکھتی ہیں۔"

ریت کے تودوں اور چٹان کے پتھروں پر آگے بڑھتے ہم اس بت کے اور قریب آئے تو میں نے دیکھا اس کے اگلے بازوؤں کے درمیان ایک مجوبہ سا بنا ہوا تھا جس کی نصف سنگی چوکھٹ اس ریت سے باہر نکلی ہوئی تھی جس نے ابوالہول کو ایک تہائی ڈھانپ رکھا تھا۔

صالح حسین نے کہا: "یہ مجسمہ سنگی چٹان کے اوپر بنایا گیا تھا۔ لیکن تین چار صدیوں کے بعد صحرا کی طرف سے آنے والی آندھیوں اور جھکڑوں نے ریت کو اڑا اڑا کر اسے یوں ڈھانپ دیا کہ یہ انسانی نظروں سے قطعاً اوجھل ہو گیا۔ ایک روایت مشہور ہے کہ فرعون ثات میس چہارم ایامِ شہزادگی میں شیر کا شکار کھیلتے ہوئے

اس چٹان کے سائے میں تھک کر سو رہا تھا کہ اس نے خواب دیکھا کہ دیوتا اس سے کہہ رہے ہیں کہ اگر وہ اس ریت کو صاف کروا دے جس نے ابوالہول کو ڈھانپ دیا ہے تو اس کے صلے میں دیوتا اسے دونوں مصروں کا دہرا تاج بخشیں گے جب تھت موس تخت پر بیٹھا تو اس نے پہلا کام یہی کیا اور پھر جب دیوتاؤں نے بھی اپنا وعدہ پورا کر دیا تو اس نے اس مجسمے کے قدموں میں ایک مندر تعمیر کروایا جس کی دیواروں پر اس نے اس واقعے کو درج کیا۔ یہ سنگی دہلیز جس کا اوپر کا حصہ آپ کو سامنے نظر آ رہا ہے اسی مندر کے دروازے کی چوکھٹ ہے۔

پھر ہم سابقہ راستے پر سے چلتے اس مقام پر پہنچے جہاں ہماری کار کھڑی تھی اور جہاں ایک مرتبہ پھر عہدِ جدید کے لوازماتِ حیات کو فروخت کرنے والے خوانچہ بردار اپنا اپنا سامان لے کر ہم پر جھپٹے۔ جب ہم گاڑی میں بیٹھ گئے تو میں نے ایک آخری نگاہ خوفو، خافرع اور منکاؤرع کے جلیل القدر مرقدوں اور ابوالہول کے عظیم مجسمے پر ڈالی پھر میری نظریں قریب کے ایک ریسٹوران کی ایک دیوار پر پڑیں جہاں ایک قدِ آدم بورڈ آویزاں تھا۔ اس بورڈ پر ایک ایسی مغربی دوشیزہ کا چہرہ دکھایا گیا تھا جس کے رنگین ہونٹوں کے ساتھ ایک کاغذی نال کے ذریعے سرخ سیال کی ایک بیگول بوتل لگی ہوئی تھی۔ اس نازنین کی نیم وا آنکھوں کی کیفیت سے اس روح پرور لطف کا اندازہ ہوتا تھا جس کے ساتھ وہ اس مشروبِ حیات کو پی رہی تھی تصویر کے پہلو میں جلی رسم الخط میں لکھا تھا "کوکا کولا"۔

سفر نصیب

مختار مسعود

یہ ایک ایسے سفر کی داستان ہے کہ جب منزل آئی تو مسافر سواری سے نیچے اترے ہی نہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ لمحہ بھر کے لئے وہاں رکے بھی نہیں۔ چلتے چلتے کسی نے منزل پر نگاہ غلط انداز ڈالی اور کسی نے نظرانداز کیا۔ نظر بھر کر دیکھنے والے بھی گو دو چار سہی اس قافلہ میں شامل تھے۔ دور دراز اور دشوار گزار منزل کے گرد چکر لگایا اور سب الٹے پاؤں واپس لوٹ گئے۔ رکتے کیسے اور اترتے کہاں۔ سفر ہوائی تھا اور منزل برف کدہ قراقرم کی سب سے اونچی چوٹی تھی۔ ہوائی سفر میں ہاتھ باگ پر اور پاؤں رکاب میں رکھنے کی شرط نہ مسافروں کے لئے ہوتی ہے اور نہ ان کے خیالات کے لئے۔ سو دونوں محو پرواز تھے فرق تھا تو رفتار کا تھا۔ اس روز طیارہ نے ایک ہزار میل کا سفر ایک دائرہ کی صورت میں کیا۔ تخیل کے سفر کا دائرہ البتہ ملکوں اور برسوں پر محیط تھا۔

ایک در بند ہو تو سو کھل جاتے ہیں۔ یہ بات ہوائی سفر پر بالکل صادق آتی ہے۔ ادھر سیڑھی ہٹی اور دروازہ بند ہوا ادھر راہی زمین کا رہتا ہے نہ آسمان کا۔ زمین سے فاصلہ بڑھتا چلا جاتا ہے اور آسمان سے کم ہونے میں نہیں آتا۔ ذرا سی دیر میں اڑان اتنی اونچی ہو جاتی ہے کہ چار سو ایک بے نشان خلا کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ البتہ غور سے دیکھیں تو اس خلا میں دروازے ہی دروازے ہیں اور سیڑھیاں ہی سیڑھیاں۔ جس دروازے پر چاہیں دستک دیں اور جس دنیا میں چاہیں داخل ہو جائیں۔ جس سیڑھی پر چاہیں چڑھ جائیں اور جس ستارے پر چاہیں جا اتریں۔ ایک روز مسافر جلال و جمال کے دروازے سے داخل ہوا اور سیڑھی اسے ایک برفانی اور نورانی چوٹی پر لے گئی۔ دور تک پھیلے ہوئے سلسلہ کوہ کی برف سے پٹی ہوئی خوب صورت وادیوں اور ڈھکی ہوئی بارعب چوٹیوں کو ہوائی جہاز کے دریچے سے پہلی بار دیکھا تو پتہ چلا کہ گمراہی میں بے ذوقی اور کفر میں کم نظری کو کتنا دخل ہے۔ اتنے خوش منظر اور پائدار برف کدے کے ہوتے ہوتے لوگ کیوں کر آتش

پرست ہوگئے۔ آگ میں وہ کیا بات ہے جو برف میں نہیں۔ اس میں حدّت اس میں شدت، وہ طلائی یہ نقرئی، وہ دھواں دھواں یہ اجلی اور بے داغ۔ اور دونوں معمولاتِ زندگی کے لیے درکار اور کارآمد۔ ایک جنگ میں آتشِ انتقام بھڑکائی جاتی ہے اور دوسری سرد جنگ کہلاتی ہے۔ شعر کا ایک مصرع اگر آتشِ شوق کے ذکر سے شروع ہو تو دوسرا آہِ سرد پر ختم ہوتا ہے۔ رزم ہو کہ بزم اگر آگ لازم ہے تو برف ملزوم۔

واقعات میں خیالات کی تونگری کہاں اور شعور میں شوق کی ثروت کہاں۔ واقعہ یک زمانی ہوتا ہے۔ سو رات گئی بات گئی۔ خیال پر کوئی ایسی بندش نہیں۔ جب چاہا اور جہاں چاہا بات دہرالی، قندِ مکرر کا مزہ لیا اور رات پھر سے سہانی۔ کچھ ایسا فرق شعور اور شوق میں بھی ہوتا ہے۔ جو شے وہاں غائب وہ یہاں موجود اور اُدھر جو بات وہاں محال وہ یہاں ممکن اور آسان۔ یہی وجہ ہے کہ برف کدہ کا وہ سفر جو مسافر نے صرف ایک بار کیا تھا شوق نے خیال کے وسیلہ سے اسے بار بار طے کیا ہے۔ آج پھر وہ از سرِ نو اس سفر پر روانہ ہو رہا ہے۔

اس سفر کا انتظام سرکاری ہے اور نام ہوائی سفاری ہے۔ پہاڑوں کا یہ طائرانہ سفر اسلامی ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس کے سلسلہ میں آئے ہوئے بیرونی صحافیوں کے اس طائفہ کے لئے ہے جو کام ختم کر کے واپس جا چکا ہے۔ نشستیں نا مکمل ہیں اور انہیں پر کرنے والوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ میلہ کا منظر ہے۔ طرح طرح کے لوگ حتیٰ کہ طرحدار لوگ بھی اس بھیڑ میں شامل ہیں۔ سفر سے پہلے جو ہلچل ہوتی ہے وہ معمول سے بڑھی ہوئی ہے کیونکہ بلاوے والے عام مہمانوں میں بن بلائے خاص مہمانوں کی کھیپ شامل ہو گئی ہے اور ان دونوں کی تعداد کل نشستوں سے کچھ زیادہ ہے۔ واقفِ حال یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ نشستیں جن پر بیٹھ کر اس سفر کا لطف لیا جا سکتا ہے تھوڑی سی ہیں، باقی محض خانہ پری ہے۔ جہاز کی چار وسطی قطاریں اس قسم کی نظارگی کے لئے ناکارہ ہیں۔ وہ تنہائی نشستیں جو دونوں جانب دریچوں کے ساتھ ہیں۔ ان کی نصف بھی اس رعایت سے نامناسب ہیں کہ جہاز کے انجن اور شہپر نگاہ کا راستہ روک لیتے ہیں۔ لیکن یہ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ جسے موزوں دریچہ سے لگ کر بیٹھنے کا موقع ملے گا وہ کم نگاہی کا شکار نہیں ہو گا۔ دلوں کا حال خدا جانتا ہے مگر نظارہ کرنے کے لئے جمع ہونے والے ان معزز مہمانوں میں بہت سے چہرے میدانوں کی طرح سپاٹ ہیں۔ مسافروں کو اس ہجوم میں اب تک صرف ایک چہرہ ایسا نظر آیا ہے جس کی فطرت اور اس سفر کی نوعیت دونوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ یہ ایک کوہ پیما کا چہرہ ہے جو اس سفر کے منتظم ہیں۔ ان

کارواں تبصرہ پرجوش ہوگا کیونکہ یہ دو سلسلوں پر بڑے انہماک سے گفتگو کرتے ہیں، ایک سلسلہ بیعت اور دوسرا سلسلۂ قراقرم۔ اعلان ہوا، انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئی۔ لوگ ہوائی جہاز کی طرف روانہ ہوئے۔ جہاز میں سب سے پہلے ایک خوش نوا شاعر داخل ہوئے، دوسرے مسافر انہیں دور سے دیکھتے ہی رہ گئے۔ انتظار گاہ میں جب ہر ایک کی ٹکٹکی شیشہ کی دیوار کے پار جہاز پہ بندھی ہوئی تھی اس وقت یہ تجاہل شاعرانہ کے ساتھ ادھر پشت کئے کھڑے تھے۔ ان کی نظریں محکمہ سیاحت کے سربراہ کی چشم و ابرو پر لگی رہیں جن کی جنبش پہ روانگی کا دار و مدار تھا۔ یہ اشارہ پاتے ہی جہاز کی طرف یوں گنگناتے ہوئے روانہ ہو گئے گویا فکر سخن میں غلطاں ہوں۔ جب تک باضابطہ اعلان ہوا وہ دوسرے مسافروں سے بہت آگے نکل گئے۔ کوئی بڑھ کر ان کی اچکن کا دامن نہ تھام سکا جو ہوا میں بحرِ طویل کی طرح لہرا رہا تھا۔ سیاست ہو کہ سفر، اقتدار کی مسند ہو کہ جہاز کی نشست، کرسی کے حصول کے اصول یکساں ہوتے ہیں۔ جہاز میں داخل ہو کر بھی مسافروں کو چین نہ آیا۔ کوئی آگے یا پیچھے بیٹھنے کے فوائد بیان کر رہا ہے اور کوئی دائیں اور بائیں بازو کی بحث میں الجھا ہوا ہے۔ وہاں پیش و پس، یہاں چنیں و چناں۔ بعض مسافر محرموں کے ساتھ بیٹھنا چاہتے اور بعض نامحرموں کے ساتھ۔ ادھر دوستی کا دعویٰ اور کشش، ادھر ہوس کا جواب دعویٰ اور بہکاوے۔ سب متذبذب نظر آتے ہیں۔ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ اگر تذبذب لاحق نہ ہوتا تو ہر شخص خدائی کا دعوے کر بیٹھتا۔ بیچارگی بشریت کی پہچان ٹھہری اور بے نیازی مشیت کا خاصہ۔

خدا خدا کر کے جہاز روانہ ہوا۔ پرواز ابھی بہت نیچی ہے۔ سگریٹ نوشی سے پرہیز اور حفاظتی بند باندھنے کی برقی اشارے ابھی روشن ہیں۔ اطمینان کا سانس بھی نہیں لیا، کسی سے بات بھی نہیں پوچھی کہ اعلان کی رو سے اس سفر کا پہلا قابلِ دید مقام آ گیا ہے۔ مسافر نے دریچے سے جھانکا، اسے منظر اور پس منظر دونوں نظر آئے۔ نیچے ذرا سا نیچے، تربیلا بند ہے جو تکمیل کے آخری مراحل میں ہے اور پیچھے، بہت سالوں پیچھے، دوسری جنگ عظیم ہے جو ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔

یہ ۱۰ مئی ۱۹۴۰ء کی بات ہے، ہٹلر کے جرمنی نے ملکہ ولہلمینہ کے ہالینڈ پر حملہ کیا۔ پانچ دن میں ہالینڈ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ان دنوں ہٹلر کی فوجیں ملک پر ملک فتح کئے جا رہی تھیں۔ میدانِ جنگ میں ہر کامیابی ان کے لئے نئے اعزاز اور نئے علاقے اور نئے دشمن ہمراہ لا رہی تھی۔ ملکہ تو انگلستان چلی گئیں اور تحریک مزاحمت کے کارکن زیرِ زمین چلے گئے۔ جیتنے والوں نے ہالینڈ کا انتظام آرتھر وان سیس

انکوارٹ کے سپرد کیا۔ انہیں ہاری ہوئی قوموں پر بالجبر حکومت کرنے کا وسیع تجربہ تھا کیونکہ آسٹریا کی شکست کے وقت یہ ہٹلر کے معاون تھے اور پولینڈ کی شکست کے بعد وہاں کے نائب گورنر جنرل۔ آرتھر نے اپنا کام بڑی نرمی اور فریب سے شروع کیا اور اپنے پیر جماتا اور جال پھیلاتا چلا گیا، یہاں تک کہ چند ہفتوں میں انتہائی سخت گیری اور شکنجہ گری تک پہنچ گیا۔ تحریک مزاحمت کو اس سختی سے بڑا نقصان پہنچا اور بڑی تقویت ملی۔ جانوں کا نقصان ہمیشہ تحریکوں کے لئے زندگی کا پیغام ہوتا ہے۔ شہید قلب تاریخ است۔ عام فہم بات ہے جو سب کی سمجھ میں آجاتی ہے۔ ایک نوشتۂ دیوار ہے جسے سب پڑھ لیتے ہیں۔ مگر تاریخ کے ہر موڑ پر حقیقت خود پسند نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ تحریر موڑ کے ایک طرف ہوتی ہے۔ اور صاحب اقتدار دوسری طرف۔ آرتھر کا انجام جو ہوا سو ہوا مگر جس دن تک ہالینڈ پر اس کی حکومت تھی ہزاروں لوگ مارے گئے اور لاکھوں پکڑے گئے جو ولندیزی قیدی بیگار کیمپوں میں بھیجے گئے صرف ان کی تعداد دو لاکھ تھی۔ ان قیدیوں میں معاشیات کا ایک نوجوان پروفیسر بھی شامل تھا جس کا نام ڈاکٹر پیٹر لیفنلنک تھا۔ بیگار کیمپ میں ہر طرح کی مشکل اور مشقت تھی۔ جگہ تنگ، کھانا ایک وقت، کپڑے وہی جو تن پر ہوں، سونا خاک پر، موسم سخت اور صیاد اس سے کہیں زیادہ درشت۔ کیمپ میں سزا اکثر ملتی تھی اور انعام کے لئے غداری کی شرط تھی۔ بیگار کیمپ کا کوئی مستقل ٹھکانہ بھی نہ تھا۔ آج یہاں تو کل وہاں۔ جہاں ضرورت پڑی وہاں یہ مصیبت کے مارے ہانک کر لے جائے جاتے۔ مسلسل ایک سفر جس میں قیدی سامان اٹھا کر پیدل چلتے اور ڈھول پھانکتے، محافظ سوار ہوتے اور ڈھول اڑاتے۔ ڈاکٹر لیفنلنک کے ساتھ ان کے بہت سے دوست اس قید میں شریک تھے۔ جرم ایک مگر قید میں رہنے کا انداز مختلف۔ یہ ہم عمر قیدی دوست صبح اٹھتے تو اس خوف کے ساتھ کہ یہ ان کی زندگی کا آخری دن ہے اور رات سوتے تو یہ آس لگائے ہوئے کہ جنگ رات ہی رات ختم ہو جائے گی۔ دنیا کے حقائق اور زندگی کے حوصلہ بخش معمولات سے ان کا تعلق کٹ گیا۔ ان کے اعصاب پر صرف ایک ہی خیال سوار تھا کہ یہ قید کب ختم ہو گی۔ اعصاب کتنے برس اس سوار کو اٹھائے رکھتے۔ ان کی ٹوٹ پھوٹ شروع ہو گئی۔ ڈاکٹر لیفنلنک کے بیشتر دوست نڈھال ہو کر مر گئے، کچھ سزا کے طور پر مارے گئے، چند بچے تو وہ پہیہ والی کرسیوں پر جا بیٹھے۔ ڈاکٹر لیفنلنک نے بیگاری بنتے ہی صورت حال پر غور کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ جنگ طویل اور صبر آزما ہو گی، اسے ختم ہونے میں کئی سال لگیں گے۔ موت ہو کہ رہائی وہ خود چل کر

میرے پاس آئے گی۔ مجھے اس کے انتظار میں روز و شب کا حساب رکھنے کی ضرورت نہیں۔ میں جینا تو جینا چاہتا ہوں۔ مجھے حوصلہ درکار ہے اور وہ بھی صرف ایک بات کا، وقت کاٹنے کا حوصلہ، پھر کئی برس تک ڈاکٹر لیفننگ نازی فوج کی بیگار میں مختلف محاذوں پر خندہ پیشانی سے خندقیں کھودتے رہے۔ ان کو کپڑے کا ایک تھیلا اور ٹین کا ایک ڈبہ رکھنے کی اجازت مل گئی۔ اعتبار بڑھا تو لوازمات میں کاغذ اور پنسل کا اضافہ ہو گیا۔ اس اضافے کے بل بوتے پر وہ معاشیات کی ایک کتاب لکھنے میں مشغول ہو گئے۔ ورق ورق لکھ کر ٹین کے ڈبے میں ڈالتے رہے۔ ڈبے کے بھرنے میں چار سال لگے، اور اس کے بھرتے ہی جنگ ختم ہو گئی۔ کتاب چھپی اور نصاب میں داخل ہو گئی۔ مصنف کابینہ میں شامل ہو کر وزیر خزانہ ہو گئے۔

واشنگٹن میں ایک رات ڈاکٹر ایبلر لیفننگ کے گھر دعوت تھی۔ وہ ان دنوں عالمی بنک سے وابستہ تھے۔ اپنے کام سے کام رکھنے والے ٹھنڈے اور دھیمے آدمی شمار ہوتے تھے۔ اس رات انہوں نے مسافر کو ساتھ بٹھایا اور عمرِ رفتہ کو آواز دی۔ وہ دوسری جنگِ عظیم کے ان تمام تجربات کو ہمراہ لے کر آگئی جو صرف ایک گرم جوش اور حساس آدمی کے حصے میں آتے ہیں۔ مسافر کو تعجب ہوا کہ سال بھر کی سرکاری شناسائی کے دوران اسے کبھی اس شخص کا سراغ بھی نہ ملا جو اس رات کھانے پر نظر آیا۔ ڈاکٹر لیفننگ عالمی بنک کے ایک خصوصی جائزہ وفد کے قائد تھے جو دریائے سندھ پر بند باندھنے کے سلسلے میں پاکستانی اصرار کا جائزہ لینے کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ بلحاظِ عہدہ مسافر بھی اس بحث میں شریک ہو گیا۔ اس نے موقع غنیمت جانا اور بہت سفر کیا۔ راہ میں کئی دلچسپ مقام اور اشخاص آئے۔ سکردو، چیلاس، بونجی اور کوٹ کائی۔ ڈاکٹر لیفننگ، سلادو، ہوریگل، اور داشٹ۔ اجلاس جا بجا ہوئے۔ واشنگٹن، نیویارک، بوسٹن، لندن، لاہور اور تربیلا۔ وہی تربیلا جس پر اس وقت ہوائی سفاری پرواز کر رہا ہے۔ وہی تربیلا جس نام کے غلط تلفظ نے لندن کے ایک اجلاس میں اس طالب علم کی تسکین کا سامان مہیا کیا جو غیر ملک کے نامانوس ناموں کے صحیح تلفظ اور ہجے اور بدیسی تلمیحات اور تمثیلات کو یاد کرنے کی کوشش میں بچپن کی کئی معصوم خوشیاں قربان کر چکا تھا۔ اب وہ غیر ملکی مزاج کو بھی تھوڑا بہت سمجھ لیتا ہے اور گاہے غیر ملکی تلفظ پر بھی ہنس لیتا ہے تاکہ اسکول میں کھوئی ہوئی ہنسی کی تلافی کر سکے۔

ہوائی جہاز نے ایک طرف جھک کر تربیلا کا چکر لگایا۔ یہ مٹی کا لمبا چوڑا اور اونچا بند ہے۔ ایک ذرا سے حصے میں خلا ہے جسے اب پر کر رہے ہیں۔ یہ بند کی تعمیر کا آخری مرحلہ ہے۔ چند سال ہوئے دریا کے دائیں کنارے ایک چھوٹا سا بند بنایا تھا جس میں کئی دروازے تھے۔ پہلے دریا کا رخ موڑ کر اسے ان دروازوں سے گزارا پھر

دریا کا پاٹ خالی ملا تو اس پر بڑا سا بند باندھ دیا اور پہاڑیوں میں لمبی لمبی سرنگیں کھود ڈالیں۔ اس کے بعد پھر لے بند پر اتنی مٹی ڈالی کہ وہ اس کے نیچے دفن ہو گیا۔ ابھی اور مٹی ڈالیں گے یہاں تک کہ اس کی سطح بڑے بند کے برابر ہو جائے گی۔ پانی کا رخ ذرا دائیں جانب سرکا دیا ہے جہاں دو پیاسی سرنگوں کے دہانے اوک لگائے دریائے سندھ کو غٹا غٹ پی رہے ہیں۔ کبھی دریا یہاں سے دیوانوں کی طرح گزرتا تھا، منہ میں کف اور گریباں لیر لیر۔ اب جنون کو افاقہ ہے۔ ایک پرسکون چھوٹی سی جھیل بن گئی ہے۔ دریا اسی جھیل کے پنگھوڑے میں پڑا سو رہا ہے۔ تربیلا تک یہ اژدھا بلا روک ٹوک چلا آیا مگر یہاں بند نے اس کا راستہ روک کر اسے کفایت اور کفالت کی نئی راہ پر ڈال دیا ہے۔ اب اسے لہر لہر کے لئے جواب دینا ہوگا اور قطرہ قطرہ کا حساب رکھنا ہوگا بالکل اسی طرح جیسے انسان سے وقت کے دھارے اور اس کے لمحہ لمحہ کا حساب مانگا جائے گا۔ دریا اور زندگی دونوں پر بند باندھنا پڑتا ہے تاکہ ضائع ہونے سے بچ جائیں۔ دریا کو مٹی کا بند درکار ہے اور پیکرِ خاکی کو ضبط کا مضبوط بند۔ بلوچستان میں بہت سے پہاڑی ندی نالے ہیں جو چڑھتے تو بڑے زور و شور سے ہیں مگر صرف ذرا سی دیر کے لئے اور تھوڑی دور تک۔ پٹ تک پہنچتے پہنچتے وہ اتنے رقبہ پر پھیل جاتے ہیں کہ سارا زور ٹوٹ جاتا ہے اور وہ میدان پار کرنے سے پہلے ہی خشک ہو جاتے ہیں۔ مسافر نے بہت سی باصلاحیت جوانیوں کو بلوچستان کے نالوں کی طرح چڑھتے اور سوکھتے دیکھا ہے۔ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے کا اصول دولت، دریا اور جوانی تینوں پر بلا استثنا عائد ہوتا ہے

ہوائی جہاز نے دوسری طرف جھک کر تربیلا کا چکر لگایا۔ تصویر کا نیا رخ سامنے آیا۔ پہاڑوں کی بلندیوں سے اترا ہوا برف کا پانی اتنی دور سے آکر اس جھیل میں جمع ہو رہا ہے۔ یہاں سے وہ ایک اور طویل سفر پر روانہ ہو جائے گا۔ جھیل ان دنوں پایاب ہے۔ کل یہ بھر جائے گی۔ پھر رابطہ نہروں کے باریک بنتے ہوئے جال اور زیرِ زمین آبی ذخیروں کے پیچیدہ نظام کی بدولت اس جھیل کا پانی دور دراز کے خشک علاقوں کو سیراب کرے گا۔ وہاں نئی فصلیں اور نئی نسلیں پیدا ہوں گی۔ فرد اور معاشرہ دونوں بدل جائیں گے۔ خانہ بدوش کاندھے سے گھر اتار کر زمین پر رکھ دے گا۔ سادگی کی جگہ پرکاری لے گی۔ مویشیوں کی جگہ مشینیں نظر آئیں گی۔ کیچڑ نچوڑ کر پینے والے گھاٹ گھاٹ کے مشروبات پئیں گے۔ الٹی کھال کی دیسی جوتی کی نسل در نسل کھلی رہنے والی دکان بند ہو جائے گی، دورِ فتنہ باز ہوگا، عداوتیں اور عدالتیں الجھ جائیں گی، خشک زمین سیراب ہو کر ستر پوش ہوگی، انسان خوشحال ہو کر عریاں ہوگا۔ اسباب و انجام کا نظام آبپاشی کے نظام سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ فرد

معاشرہ اور ملک کٹھ پتلی کی طرح اسباب کے دھاگوں سے بندھے ہوئے ہیں۔ کچھ دھاگے اتنے باریک ہیں کہ نظر نہیں آتے، کچھ اتنے گنجلک ہیں کہ دوسرا سرا نہیں ملتا۔

مسافر نے تربیلا کی پایاب جھیل پر ایک نظر ڈالی۔ آنے والی برسات میں یہ بھر جائے گی۔ تعمیراتی سامان کا ملبہ اور ناکارہ مشینوں کے ڈھانچے پانی کی زد میں آنے والے ہیں۔ اجاڑ کھیت، خالی گھر اور سنسان بستیاں سب جھیل کی نذر ہو جائیں گی۔ کچی پکی سڑکوں کا جال جو تعمیر کے دوران بنا تھا اب تہہ میں بیٹھنے والا ہے۔ کل بہت سی یادیں جو اس وادی اور اس بند سے وابستہ ہیں ایک بڑی اور گہری جھیل میں ڈوب جائیں گی۔ ڈوبتے کو بچانا فرض ہے اور مسافر ایک چھوٹی سی عمارت کے سلسلے میں یہ فرض پورا کرنا چاہتا ہے۔ جھیل کی سطح اس عمارت کی چھت سے بلند ہو چکی ہے۔ نظریں پانی کی بے نشان سطح پر اس مقام کو ڈھونڈ رہی ہیں جہاں، کبھی ایک ڈاک بنگلہ ہوا کرتا تھا۔ دس برس ہوئے مسافر اس عمارت میں دو چار دن ٹھہرا تھا۔ وہ چھوٹا سا بنگلہ جنگل میں یوں کھڑا تھا جیسے ایک خوشنما کھلونا جسے کوئی بچہ دریا کے کنارے بھول گیا ہو۔ سفید عمارت جس کے برآمدہ کی محرابیں سفید رنگ کی جالی سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ دور سے عمارت ایسے لگتی جیسے کسی کانچ کی فریم کی ہوئی تصویر وادی میں آویزاں ہو۔ تین چھوٹے چھوٹے کمرے، فرش پہ کم قیمت اور سادہ قالین۔ ملکہ وکٹوریہ کے زمانہ کا ایک صوفہ بھی تھا، اس پر بیٹھتے ہی آدمی ماضی کی وسیع اور نرم آغوش میں گم ہو جاتا۔ جہاں سے اب ملک بھر میں بجلی فراہم کی جائے گی۔ سو عملہ ان دنوں چراغ شام کی لو اٹھانے کے لئے مٹی کا تیل استعمال کرتے تھے۔ سہ پہر کو صاحب لوگ کے لئے باغ میں آرام کرسیاں لگ جاتیں اور ملازم دودھیا شیشہ کی چمنیوں سے دھوئیں کی کالک چھڑانے میں مصروف ہو جاتے۔ وادی کا سارا حسن اس ڈاک بنگلہ کے پائیں باغ میں امڈ آیا تھا۔ عمارت کی کرسی باغ سے گز بھر اونچی تھی مگر دریا کی سطح باغ کے بالکل برابر تھی۔ باغ اور دریا کی حد بندی پھولوں سے لدی مہندی کی باڑیاں کیا کرتی تھیں۔ سبزہ پہ بیٹھ کر دیکھا تو سطح آب پر پھول کھلے ہوئے تھے۔ مغرب کی نماز پڑھی تو یوں لگا جیسے سجدہ آب رواں پر کیا ہو۔

جھیل کے دو چکر لگانے کے بعد ہوائی جہاز نے رخ سیدھا کیا اور شمالی پہاڑیوں کی طرف اڑنے لگا۔ دریا کے اس پار چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا بے ترتیب سلسلہ ہے۔ ان کے وسط میں ایک بہت بڑا میدان نظر آرہا ہے۔ پہاڑیاں سبز اور نیلی ہیں لیکن میدان سفید اور خاکستری۔ پہاڑیوں پر جھاڑیاں اور جھنڈ ہیں لیکن میدان گنجا اور ننگا۔ پہاڑیاں پرانی ہیں اور میدان نیا۔ یہاں اس میدان کی موجودگی بالکل اوپری لگتی ہے۔

آٹھ پہاڑیاں اس جگہ پہنچ کر یکایک چار پانچ میل پرے کیوں ہٹ گئیں، جیسے کسی نے ہاتھ کے ایک اشارے سے انہیں بزم یار سے اٹھا دیا ہو۔ اس میدان میں مختلف گہرائیوں کے چوکور قطعے بنے ہوئے ہیں۔ پہلی نظر میں یوں لگا جیسے کسی نے کروشیے سے بنی چادر دھو کر پہاڑیوں کے درمیان سوکھنے کے لئے پھیلا دی ہے جہاز اونچا ہوا، منظر اور تشبیہ بدل گئی۔ دوسری نظر میں یوں لگا جیسے کسی نے شالامار بنانے کے لئے زمین کو درجہ بدرجہ تراشا ہو۔ یہ نامکمل شالامار بھی خوبصورت لگا۔ ایک ایک کر کے اس کے مختلف طبقے نظر سے اوجھل ہو گئے جیسے وہ پہاڑیاں جو کل تک اس میدان میں جمی کھڑی تھیں اور یکے بعد دیگرے اس ملبہ میں گم ہو گئیں جس سے تربیلا بند کی تعمیر ہوئی ہے جہاز آگے نکل گیا ہے اور میدان پیچھے رہ گیا ہے۔ منظر ہر لمحہ بدلتا رہتا ہے۔ کل اس میدان کی صورت بھی نہ پہچانی جائے گی۔ کل اس نشیبی قطعہ پر قبضہ جمانے کے لئے مقابلہ شروع ہو جائے گا۔ اس مقابلہ میں ہوا اور پانی، مٹی اور سبزہ، جانور اور انسان سب حصہ لیں گے۔ پہلے اس میں بارش کا پانی جمع ہو گا، کہیں دلدل بنے گی اور کہیں تالاب سا۔ ٹیلے مرغابیاں آئیں گی اور کسی نہ معلوم جگہ سے مچھلیاں اور مینڈک۔ جو رقبہ کھوڑے پانی کی مار سے بچ رہا اس میں سبزہ اپنے پیر جمائے گا۔ نرم خودرو سبزہ کے تعاقب میں سخت جان جھاڑیاں اور خود سر درخت آئیں گے۔ جنگل گھنا ہوا تو درندہ پناہ لینے اور آدمی لکڑی لینے کے لئے آنکلے گا۔ ہوا اور پانی دوسری پہاڑیوں کی مٹی ڈھو کر یہاں ڈالتے رہیں گے اور ایک نہ ایک دن اسی نشیب پر فراز کا قبضہ ہو گا۔ زمین کو ایک حالت پر قرار نہیں۔ اس کا نقشہ ہر دم بدلتا رہتا ہے۔ منظر کبھی ایک جگہ قیام نہیں کرتا۔ اس کی زندگی بس ایک جھلک تک ہے۔ اس کے بعد دوسرا منظر اس کی جگہ لے لیتا ہے اور تیسرا تعاقب میں ہوتا ہے۔ مناظر میں تسلسل ہوتا ہے تکرار نہیں ہوتی۔ ہر منظر جدید اور جدا ہوتا ہے۔ سمندر کی سطح لمحہ بھر کے لئے بھی یکساں نہیں رہتی۔ صحرا میں ہر روز ایک نیا ریگزار جنم لیتا ہے۔ جہاں آج پہاڑ نظر آتے ہیں وہاں کبھی سمندر ہوا کرتا تھا۔ آج جو پہاڑ میخوں کی طرح گڑے ہوئے ہیں کل وہ روئی کے گالوں کی طرح ہوا میں اڑتے پھریں گے۔

اس وقت ہوائی سفارت کا بوئنگ سات سو سات بھی روئی کے گالے کی مانند بادلوں میں اڑ رہا ہے۔

اُندلس میں اجنبی

مستنصر حسین تارڑ

مسلمانوں کے عہد میں متعدد عرب قبیلے ایسے بھی تھے جو ہسپانیہ میں سینکڑوں برس سے قیام پذیر ہونے کے باوجود آبائی خانہ بدوشی کی حس کو دبا نہ پائے تھے۔ یہ قبائل شہروں سے دور دریاؤں کے کنارے اور زرخیز وادیوں میں خیمہ زن ہوتے اور پھر جس صبح گرد و نواح کے مناظر سے اجنبیت کا پہلا پردہ سرکتا ان کے خیموں کی طنابیں ڈھیلی پڑ جاتیں، میخیں اکھڑ جاتیں اور وہ ایک مرتبہ پھر ان دیکھی سرزمینوں کی تلاش میں وہاں سے کوچ کر جاتے۔ ایک سیاح کی مانند کسی انجانے مقام پر اجنبی کی حیثیت سے وارد ہونا ان کے لئے زندگی کا سب سے بڑا جذباتی تجربہ ہوتا تھا۔ ایک ایسے ہی صحرانورد قبیلے نے دریائے مینزناس کے کنارے ایک بلند ٹیلے پر ایک حصار تعمیر کیا اور اسے مجریط کے نام سے پکارا۔ مجریط صدیوں قرطبہ، غرناطہ اور اشبیلیہ ایسے چمکتے شہروں کی روشنی تلے گمنامی کے اندھیروں میں بھٹکتا رہا۔ ۱۵۶۱ء میں فلپ دوم نے کتب خانہ و خانقاہ ال اسکوریل کی تعمیر کے دوران یہاں چند برس پہلے قیام کیا اور اس کی مرکزیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے ملک کا صدر مقام قرار دیا۔ اسی مرکزیت کی بنا پر مجریط

جو اب بگڑ کر میڈرڈ ہو چکا ہے، ہسپانیہ کا پیٹ بھی کہلاتا ہے۔ آج سے دو سال پیشتر تک دریائے مینزناس

کے کنارے عربوں کے تعمیر کردہ حصار القصر کے کھنڈرات موجود تھے۔ اب وہاں شاہی محل کی عالی شان عمارت

کھڑی ہے اور میڈرڈ اس کے گرد میلوں میل تک پھیلا ہوا ہے۔ ہسپانیہ کی قدیم تاریخ میں ایک نووارد شہر۔

پیرانیز کی بلندیاں اور قشتالیہ کے ریگزاروں کو عبور کر کے اب لوئی کی جیپ کا سالای کا مپو کے جنگل میں پائن اور فر کے درختوں تلے کھڑی تھی۔ اور ہم دونوں مڈگارڈ پر بیٹھے پچھلے دو روز کے سفر کی یادیں تازہ کر رہے تھے۔ ثوریا کی شب کا ذکر آیا تو لوئی جیسا سکھ بھی جذباتی ہو گیا۔

یقیناً ثوریا کے پاسیو میں حصہ لینے والی ہسپانوی لڑکیوں کے قدموں کی چاپ افریقہ کے جنگلوں تک میرا پیچھا کرے گی۔ دلچسپی ہو اس قہوہ خانے میں ضرور جانا جہاں اس شب ......"

"اس شب ٹونی؟...... ابھی کل کی تو بات ہے"

"ہاں شاید کل کی ہی بات ہو مگر مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے صدیاں بیت گئی ہوں"

اس سے پہلے کہ ٹونی کی حالت مزید غیر ہوتی میں نے اپنا ایک ہاتھ اس کے کاندھے پر ڈالا اور اس سے اجازت چاہی۔

"آہم" اس نے بمشکل گلا صاف کیا "یہ شہر بے جان اور ڈول سا لگتا ہے..... تم میرے ساتھ افریقہ کیوں نہیں چلتے؟"

"مگر جھیل اور آدم خوروں سے ملاقات کرنے؟..... ہو گیا ناچھوٹا سا لطیفہ؟"

"تم کہتے ہو تو ہو گیا" اس نے منہ بنا کر کہا "مجھے یقین ہے کہ تم واپسی پر ثوریا ضرور جاؤ گے اور پاسیو میں شامل اس لڑکی کو تلاش کرو گے جس نے بالوں میں چنبیلی کے پھول سجائے تھے......"

فر اور پائن کے درختوں کی چوٹیاں ایک سبز دیوار کی صورت میں سورج کا راستہ روکے کھڑی تھیں۔ روشنی کی ایک کرن بھی مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔

"نہیں ٹونی ڈیر..... تم خود ہی تو کہہ رہے تھے کہ وہ صدیوں پہلے کی بات ہے۔ اب اگر واپس بھی چلا جاؤں تو ہو سکتا ہے ان منقش پہاڑیوں کے درمیان ثوریا کا وجود بھی نہ ہو..... بہرحال لفٹ کا شکریہ! اور ٹونی تمہاری رفاقت میں یہ طویل سفر بے حد خوشگوار طریقے سے کٹا....."

"یہ تم دوبارہ کہہ سکتے ہو! ..... لاؤ اب ایک سگرٹ تو پلاؤ ..... اب ہو لے نا ایک چھوٹا سا لطیفہ۔ کیوں مورٹان؟" ٹونی کی جھاڑی داڑھی میں حرکت ہوئی اور درمیان میں سے اس کا مخصوص قہقہہ برآمد ہو گیا۔

"ہاں ہو گیا" میں نے اسے سگریٹ سلگا کر دیتے ہوئے اعتراف کیا "خدا حافظ ٹونی!"

ایک طویل کش لگانے کے بعد اس نے داڑھی کھجائی۔ میرے دونوں کندھوں پر تھپکی دی اور جیپ میں سوار ہو کر چابی گھما دی۔ درختوں میں چند نیم خوابیدہ پرندے انجن کی آواز سے خوفزدہ ہو کر پھڑپھڑائے۔ کاساڈی کا پہیہ کی کچی پگڈنڈی پر دھول اٹھی اور ٹونی کی جیپ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ پائن کے ایک درخت کے تنے پر یوتھ ہوسٹل بائیں جانب کی تختی آویزاں تھی۔ میں ایک پہاڑی قلی کی طرح کاندھوں پر بوجھ اٹھائے سر جھکا کر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ جنگل کے وسط میں کھڑی ہے ایک کرم خوردہ پھاٹک پر "میلر ڈیتھ ہوسٹل" کے الفاظ لکھے دکھائی دیئے۔ کواڑ دھکیل کر میں نے اندر جھانکا۔ دھول میں اٹا ہوا ایک وسیع و عریض سنسان صحن میلر ڈ کی تپتی دوپہر میں چمک رہا تھا۔ بائیں ہاتھ پر ایک بیرک نما سادہ سی عمارت تھی۔ فرلانگ بھر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جب میں عمارت

میں داخل ہوا تو اندر بالکل خاموشی تھی ٹھنڈک اور نیم تاریکی۔ میں نے رک سیک کاندھے سے اتار کر اپنے تیئں ایک خالی بستر پر رکھ دیا۔

"کون ہے؟" بستر پر لیٹے ایک ہیولے نے اپنے پیٹ پر رکھے رک سیک کو بیحد خوفزدہ ہو کر ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔

"میں ہوں!" میں نے جلدی سے رک سیک اٹھا لیا "یہ جگہ یوتھ ہوسٹل ہی ہے نا؟"

"یہ جگہ....." ہیولے صاحب اٹھ کر بیٹھ گئے اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر جھک گئے "یہ جگہ قدیم مصر ہے.....فرعون رمسیس کی سواری آ رہی ہے۔"

"ہیلو" میں نے خوش دلی سے کہا۔

"ہائے ہائے ہا....." مخالف سمت میں ایک بنکر پر آدھا لیٹا آدھا بیٹھا، ایک ہپی غنودگی کے عالم میں بڑبڑایا۔

"الو! الو!" کسی صاحب نے بنکر کے نیچے سے ہاتھ نکال کر میری ٹانگ پکڑ لی۔

"آپ سے مل کر بیحد مسرت ہوئی" میں نے مسکرا کر نیچے جھانکا۔

نیم واسکراہٹ لبوں پر سجائے اب وہ صاحب گٹار کو آغوش میں لئے اونگھ رہے تھے۔

میری نظریں تاریکی کی عادی ہوئیں تو انکشاف ہوا کہ ہوسٹل کے بنکروں پر درجنوں حضرات نروان کی مختلف منزلوں کی سمت رواں ہیں۔ ایک حبشی لڑکا میری جانب ٹکٹکی باندھے تب تک آنکھیں جھپکاتا رہا جب تک میں نے بھی اسی رفتار سے آنکھیں جھپکا کر اسے "ہیلو" نہ کہہ دیا۔ قندھار کے ہوٹل میرواعظ میں جس بُو سے واسطہ پڑا تھا اس کی مہک ان فضاؤں میں بھی رچی بسی تھی۔ اتنے میں ہوسٹل کی ایک کھڑکی کے پٹ کھلے اور ایک یونانی نقوش کا حامل نوجوان چھلانگ لگا کر اندر آ گیا۔

"کھڑکی!..... بند کر دو۔ روشنی!..... نہیں چاہیئے" ٹنگ یاباؤں نے آنکھیں ڈھانپتے ہوئے دھیرے دھیرے احتجاج کیا۔ نوجوان نے باآوازِ بلند ہسپانوی زبان میں چند ناپسندیدہ کلمات کہے اور کراک سے کھڑکی بند کر دی۔

"آپ بھی شاید میری طرح یہاں نو وارد ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں۔ نہیں....." اس نے شانوں تک آئی ہوئی زلفوں کو جھٹکا اور بے دھیانی میں بولا "میں تو دلتوں کی ڈاک سے ملنے گیا تھا۔ پچھلے دس روز سے تپسیا کر رہا ہوں مگر وہ کمبخت تو برازیلین لڑکیوں سے بھی گئی گزری ہے

مانتی ہی نہیں۔ ہر روز پوری دوپہر وارڈن صاحب اپنی چہیتی مرغیوں کو دانہ ڈالتے ہیں اور میں ان کی چہیتی ۔۔۔۔خیر۔۔۔ تم کون ہو؟"

میں نے اپنا تعارف کروایا۔

"اچھا اچھا تو ایسے ہوتے ہیں پاکستانی!" اس نے سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیتے ہوئے کہا "تم میرے پہلے پاکستانی ہو" اور پھر بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا "میرا نام بانکو ہے۔ برازیل سے آیا ہوں۔ عرف عام میں مجھے بانکو دی براز یلین کہ جاتا ہے۔ میڈرڈ تو پسند نہیں آیا البتہ یہاں کے وارڈن کی بیٹی پسند آگئی ہے۔"

"مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے ہوسٹل کے کسی بھی مکین کو میڈرڈ پسند نہیں آیا جو اس وقت شہر کی سیر کی بجائے عالم بالا کی سیر کر رہے ہیں۔"

"یہ حضرات؟" اس نے اونگھتی ہوئی مخلوق کی جانب اشارہ کرتے ہوئے قہقہہ لگایا۔

"یار تمہیں یسوع مسیح کا واسطہ۔ خاموشی سے ہنسو" ایک مخلوق نے احتجاج کیا۔

"ہسپانوی بندرگاہ الجیسرس سے مراکش صرف دو گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے" بانکو نے سرگوشی کی "اور وہاں اعلیٰ قسم کی حشیش کی اتنی بہتات ہے کہ سبزی فروش بھی آلوؤں اور ٹماٹروں کے ساتھ اسے ٹوکروں کے حساب سے فروخت کرتے ہیں چنانچہ اپنے یہ ہپی بھائی مراکش میں قدم رکھتے ہی سٹون ہو جاتے ہیں۔"

"سٹون! یعنی پتھر ہو جاتے ہیں؟"

"نہیں سٹون یعنی وجد ہو جاتے ہیں۔ مکمل نروان۔ اور پھر جب تک مراکشی حکومت انہیں کان سے پکڑ کر ملک سے باہر نہیں کر دیتی یہ وہاں سے ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ ہسپانیہ واپسی پر ان کے رک سیکوں میں خلیظ نیکروں اور جرابوں کے نیچے سیروں حشیش بھری ہوتی ہے اکثر پکڑے جاتے ہیں اور ہسپانوی جیلوں میں سڑتے ہیں۔ جو بچ نکلتے ہیں وہ سیدھے میڈرڈ کے اس ہوسٹل میں چلے آتے ہیں۔ یہاں کے وارڈن کو جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں اپنی مرغیوں سے ہی فرصت نہیں اس لئے یہ حضرات خوب کھل کھیلتے ہیں بلکہ کھل پیتے ہیں۔"

"یہاں خوب گزرے گی۔" میں نے اپنا سونے کا تھیلا بستر پر بچھا دیا اور لیٹ کر ڈائری لکھنے میں مشغول ہو گیا۔

جس دھواں بھری فضا میں میں سانس لے رہا تھا وہاں زیادہ دیر تک ذی ہوش رہنا ناممکنات میں سے تھا چنانچہ تھوڑی دیر بعد میں نے ڈائری بند کر دی اور اونگھنے لگا۔ آنکھ کھلی تو رات کے بجنے کو تھے اور حسب سابق ہر سو خاموشی تھی۔ میں نے بانکو کی جانب دیکھا وہ نہایت ... لمبا کش کھینچ کر ... لے رہا تھا۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور صرف ایک نیکر میں ملبوس

عمر رسیدہ وارڈن کاندھے پر بندوق جمائے اندر داخل ہوا۔اس نے فوجی انداز میں ایڑیوں پر گھوم کر دروازہ
بند کیا اور پھر ہوسٹل کی راہ داری میں باقاعدہ پریڈ کرنے لگا۔ دو چکر لگانے کے بعد اس نے بندوق کندھے سے اتار
کر بغل میں داب لی اور پوپلا منہ کھول کر کاشن دینے لگا "ڈاکر! دس بج رہے ہیں۔ اب قانونی طور پر تم اس ہوسٹل سے باہر
نہیں جا سکتے، صدر دروازہ مقفل کر دیا گیا ہے۔ روشنیاں گل کر دو۔ (حالانکہ روشنیاں پہلے سے گل تھیں) اور سو جاؤ
(سب لوگ سو رہے تھے)" "شب بخیر!" اس تقریر کے بعد وارڈن نے حسب سابق دو مرتبہ راہداری میں مٹرگشت کی اور
پھر دروازہ کھول کر پریڈ کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلنے کی دیر تھی کہ تمام نیم مردہ اجسام نے چھلانگیں لگائیں
اور بستروں سے باہر آ گئے۔ "براوو۔ ویوا۔ ہرے"۔ متعدد زبانوں میں زندہ باد کے مفہوم کے نعرے فضا میں گونجنے لگے۔ تمام
بتیاں روشن کر دی گئیں۔ بھر کسے نیچے لیٹا ہپی گٹار بجانے لگا۔ اگر واقعی بغلوں کو بجایا جا سکتا ہے تو وہ اس وقت بجائی جا
رہی تھیں۔

"بانکو بھائی! میں نے بانکو کے ویوا۔ ویوا میں مداخلت کرتے ہوئے دریافت کیا۔" کیا سلسلے ہیں؟"

"اب میڈرڈ کی سیر کا وقت ہے۔۔۔۔ ویوا" اس نے نعرہ لگایا۔

"لیکن صدر دروازہ مقفل ہے اور باہر وارڈن صاحب بندوق لئے ٹہل رہے ہوں گے۔"

"صدر دروازے کے پہلو میں جو پتھر نصب ہے اس پر چڑھ کر دیوار با آسانی پھلانگی جا سکتی ہے اور رہی ۱۹۳۶ء
کی خانہ جنگی کی زنگ آلود نشانی وارڈن صاحب کی بندوق تو وہ خانہ جنگی کے بعد آج تک کارتوس کے لمس سے آشنا
نہیں ہوئی بلکہ شاید ان دنوں بھی نہیں ہو گی۔ بہرحال تم فکر نہ کرو۔ تمام دن بستروں پر پڑے اونگھنا اور پھر پوری
شب میڈرڈ کی آوارہ گردی کرنا اس ہوسٹل کے مکینوں کی روایت ہے۔"

تھوڑی دیر بعد پوری قوم سج بن کر زیر زمین ریلوے اسٹیشن پر میڈرڈ کے مرکز "پورتا ویل سول" جانے والی
گاڑی کے انتظار میں کھڑی تھی۔ گاڑی آئی تو یوں لگا کہ جیسے مغل پورہ لوکو شیڈ میں زیر مرمت کسی مال گاڑی کو تکمیل
کے بغیر اسٹیشن کے اندر بھیج دیا گیا ہو۔ البتہ یہاں مال گاڑیوں ایسی وسعت ناپید تھی۔ ہر سو مسافر ٹھنسے پڑے تھے۔ فیصلہ
دے دیا گیا کہ گاڑی میں سوار ہونا ناممکنات میں سے ہے۔ سفروں کو چونکہ لاہور کی اومنی بسوں میں سوار ہونے کا وسیع تجربہ
تھا اس لئے یہاں بھی چنداں دشواری پیش نہ آئی۔

پورتا ویل سول یعنی "باب شمس" میڈرڈ کا ثقافتی اور تجارتی مرکز ہے۔ کلاسیکی طرز تعمیر کی چند عمارتیں ایک نیم
دائرے کی شکل میں اسے گھیرے ہوئے ہے اور اس کے وسط ہی سے میڈرڈ کی دس شاہراہیں جنم لیتی ہیں۔ ناول نگاروں

نے پوئرتا دیل سول کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے مگر مجھے اس "باب شمس" میں سے خوب صورتی کی کوئی شعاع طلوع ہوتی نظر نہ آئی۔ میڈری لینوز یعنی میڈرڈ کے باشندوں کی وضع قطع بھی دوسرے یورپی ملکوں کے باشندوں کی نسبت قصباتی اور عامیانہ ہے۔ البتہ ان کے چہروں پر انگریزوں کی سنجیدگی، جرمنوں کی کرختگی، سوسوں کی کاروباری مسکراہٹ اور اطالویوں کی شاطرانہ ہنسی مفقود تھی۔ یہ چہرے ایک کھلی کتاب تھے۔ تازہ، ہنس مکھ اور بےفکر میڈرڈ میں مجھے کوئی خاصیت نظر نہیں آئی جسے خالص میڈرڈی کہا جاسکے۔ قہوہ خانوں پر امریکی چھاپ ہے ملبوسات کی دکانوں پر فرانسیسی رنگ غالب ہے اور طرز تعمیر بھی کسی طور منفرد نہیں۔ دل سول سے دائیں ہاتھ والی سڑک کے اختتام پر پلازا میئر کا خوب صورت چوک ہے جہاں ۱۶۸۰ء میں جنونی بادشاہ کارلوس دوم نے دربار عام لگا کر ڈیڑھ سو سے زائد "کافروں" کو اذیتیں دے کر مروایا تھا۔ اسی دروازے کے عقب میں درجنوں چھوٹے چھوٹے بازار اور تنگ گلیاں ہیں جنہیں قدامت کی وجہ سے میڈرڈ کا خوب صورت ترین علاقہ شمار کیا جاتا ہے۔ بانکو نے انہیں گلیوں سے ایک میں ایک ایسا ریستوراں دریافت کیا تھا، جہاں بقول اس کے دنیا کا ارزاں ترین ڈنر دستیاب ہوتا ہے۔ ٹھنڈا سوپ، مچھلی، تورتلا یعنی آملیٹ، سویٹ ڈش، کافی اور ان سب کو ہضم کرنے کے لئے سرخ شراب۔ صرف پچیس پیسیتے!

ایک مرتبہ جنوبی فرانس کے انگوروں کے باغوں میں سرشام جانے کا اتفاق ہوا۔ پہلے پہل کسی انگور کے خوشے میں سے ایک آدھ جھینگر کے بولنے کی آواز بلند ہوئی۔ پھر وقفے کے ساتھ ان میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ آدھ گھنٹے کے اندر میل ہا میل تک پھیلے ہوئے باغات ان کے شور سے گونجنے لگے نوبت یہاں تک پہنچی کہ بات کرنی بھی مشکل ہوگئی۔ رات کے تین بجے جب ہم بانکو کے تجویز کردہ ریستوراں میں کھانا کھانے کے بعد کاساڈی کامپو کے گھنے درختوں میں سے گزر رہا تھا تو یہاں بھی ہر سو جھینگروں کا شور تھا۔ البتہ سپانوی جھینگر اپنے فرانسیسی بھائی بندوں کی نسبت زیادہ مضبوط پھیپھڑوں کے مالک واقع ہوئے تھے۔ یہ جنگل ایک زمانے میں شہر سے خاصے فاصلے پر تھا مگر بعد میں میڈرڈ کی پھیلتی ہوئی آبادی نے اسے مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیا۔ ان دنوں یہ صرف شاہی خاندان کے افراد کے لئے مخصوص تھا اور بطور شکار گاہ استعمال کیا جاتا تھا۔ شکار اب بھی ہوتا ہے مگر شکاری شہزادوں کی بجائے ہسپانوی نوجوان ہوتے ہیں اور شکار جانوروں کا نہیں متناسب جسم کی مالک ان جرمن اور سویڈش لڑکیوں کا کیا جاتا ہے، جو شام ڈھلے جنگل کے مختلف حصوں میں واقع قہوہ خانوں میں بیٹھی آنکھیں جھپکتی ملتی ہیں۔ اسی قسم کا ایک قہوہ خانہ ہوسٹل کے رستے میں پڑتا تھا۔ جہاں اس وقت بانکو سمیت ہوسٹل کے تمام مکین ہڑبونگ مچا رہے تھے۔ سویڈش

لڑکیاں وافر مقدار میں۔ سرخ شراب مٹکوں کے حساب سے اور موسیقی ہوسٹل والے ہپی لڑکے کی گٹار میں سے اُبلتی ہوئی۔ ایک غیر ملکی لڑکی انگلیوں میں کاستانت پروئے میز پر کھڑی بولیرو رقص ناچنے کی کوشش میں۔ بانس کے ساتھ بندھے رستے سے جھولتے ہوئے رنگ برنگے قمقمے۔ میں پاس سے گزرا تو بانکو نے مجھے بھی دبوچ لیا۔

"ہائے ہائے کیا کر رہے ہو امیڈیرڈا میں رات کے تین بجے بھی کوئی سوتا ہے"۔

میرے لئے "ہورشا تا ڈی شوفا" منگوایا گیا۔ ناریل ملا دودھ قسم کا مشروب۔ اپنی "سردائی" جیسا ذائقہ تھا۔ گلاس ختم کرنے کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے کا ساڈی کا میور کے جھینگر زیادہ زور نہیں کر رہے باقاعدہ چلا کے سمفنی بجا رہے ہیں۔ گٹار کی لے ہے کہ دل میں ہی اترتی چلی جا رہی ہے۔ جنگل میں سرسراتی ہوا کچھ زیادہ ہی خوشگوار ہے اور میز پر ناچنے والی لڑکی جو پہلی نظر میں بس یونہی سی لگی تھی اب بہت ہی خوب صورت ہو چلی ہے۔

دوسرے روز معلوم ہوا کہ بانکو نے دیڑ کے ساتھ ساز باز کر کے ہورشا تا میں برانڈی کی آمیزش کر دی تھی!

صبح سات بجے ہوسٹل واپسی پر ابھی ہم بستروں میں ٹانگیں اور بازو پھیلا کر سونے کے لئے مناسب پوزیشن کی جستجو میں تھے کہ دروازہ کھلا اور وارڈن صاحب حسبِ معمول بندوق تھامے وارد ہو گئے۔ "حضرات صبح کے سات بج چکے ہیں۔ امید ہے آپ رات مزے سے سوئے ہوں گے اب آپ اچھے سیاحوں کی مانند تیار ہو کر میڈرڈ کی سیر کو نکل جائیے۔ صبح بخیر" وارڈن نے دروازے سے باہر قدم رکھا تو ایک مرتبہ پھر نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے۔ تکیوں میں سے منہ باہر نکال کر ان میں چرس ملائی گئی۔ کش لگے۔ تھوڑی دیر بعد قبرستان میانی صاحب۔ ہر سو مکمل خاموشی!

میں نے سفید ہورشا تا کا ایک گھونٹ لیا۔ میز پر بکھرے گھر سے آئے ہوئے خطوط پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ جنہیں میں تین مرتبہ پڑھ چکا تھا اور پھر سر کھجانے لگا۔ اب کیا کیا جائے؟ آج میڈرڈ میں قیام کا چوتھا روز تھا۔ پہلے دو روز تو ہوسٹل کی روایات کے مطابق گزرے یعنی دن بھر پڑے اونگھنا اور پھر کا ساڈی کا میور کے قہوہ خانے میں رت جگا۔ تیسرے روز فہرست بنا کر میڈرڈ کے تمام قابلِ دید (؟) مقامات کو بھگتایا اور آج صبح کا پہلے ڈی الکالے پر واقع سٹوری لوا ڈے تھامس کک سے پاکستان کی ڈاک وصول کر کے اب میں پچھلے دو گھنٹوں سے پلازا ڈیل نیپچونا کے ایک قہوہ خانے کے باہر ہورشا تا کا تیسرا گلاس سامنے رکھے سر کھجانے میں مصروف تھا۔ یہاں میری طرح کے سینکڑوں تھکے لوگ قطار اندر قطار منہ اٹھائے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ان لوگوں کو دیکھ رہے تھے جنہیں زندگی میں اور بھی بہت سے کام تھے۔ مثلاً کسی اور قہوہ خانے میں جا کر بیٹھنا اور پھر فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ان لوگوں

کو دیکھا جنہیں...... فٹ پاتھ کے ایک سرے پر لاہور کی بیڈن روڈ کی طرح درجنوں بوٹ پالش کرنے والے بیٹھے تھے البتہ یہ حضرات برش سٹینڈ پر کھٹکھٹا کر "خو بوٹ پالیش" کے نعرے بلند کرنے کی بجائے اخبار سامنے پھیلائے پچھلے بل فائٹ کی تفصیلات پڑھنے میں مگن تھے اگر کوئی صاحب ان کی بے خبری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سٹینڈ پر اپنا بوٹ جما دیتے تو وہ شکایت بھری نظروں سے یوں دیکھتے جیسے کہہ رہے ہوں "بھلے آدمی بل فائٹر آل کوروبس پچھلے اتوار بارسلونا کے اکھاڑے میں مرتے مرتے بچا ہے اور تمہیں بوٹ پالش کروانے کی پڑی ہے" بہرحال وہ دو چار مرتبہ بڑی بے دلی سے برش چلا کر انہیں فارغ کر دیتے اور پھر باچھیں پھیلا کر مطالعہ میں محو ہو جاتے۔ ان کے ساتھ دو بوڑھے ہسپانیہ کی مشہور نیشنل لاٹری کے کوپن گلے میں لٹکائے " لاٹری کوپن، لاٹری کوپن" کی صدائیں بلند کر رہے تھے۔ ہمارے ان کی طرح ایک عام ہسپانوی کی ہزار دل خواہشیں ایسی نہیں ہوتیں جن پر اس کا دم نکلتا ہے۔ ان کی تعداد صرف چار ہوتی ہے (۱) بل فائٹر بننا (۲) جرمنی میں ملازمت کرنا (۳) کسی سویڈش دوشیزہ کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لانا (۴) نیشنل لاٹری جیتنا۔ خواہش نمبر تین ہر ہسپانوی کی باآسانی پوری ہو جاتی ہے بلکہ اتنی مرتبہ پوری ہوتی ہے کہ واقعی دم نکلنے لگتا ہے۔ جرمنی میں چونکہ پہلے سے ہی لاتعداد ہسپانوی موجود ہیں۔ اس لئے وہاں ملازمت کا بندوبست بھی ہو جاتا ہے، البتہ بل فائٹر بننا اور کروڑوں پیسیٹے کی نیشنل لاٹری جیتنا ایسے ارمان ہیں جو کم ہی نکلتے ہیں۔ ان دنوں ایک چھوٹے سے قصبے کی بڑی دھوم تھی جس کے باشندے پچھلے کئی برسوں سے اجتماعی طور پر نیشنل لاٹری کے کوپن خرید رہے تھے، اور بالآخر اس ماہ کروڑوں پیسیٹے کی نیشنل لاٹری ان کے نام نکل آئی تھی۔ وہاں کے تمام مردوں نے کام سے ریٹائر ہونے کا اعلان کر دیا ہے اور اب سارا دن مقامی قہوہ خانے میں بیٹھے گپیں ہانکتے رہتے ہیں۔

میڈرڈ کے بارے میں لوٹی کے تاثرات سو فیصد درست ثابت ہوئے تھے بے جان اور ڈل سا شہر۔ پچھلے چار روز سے میرے جیسے "ٹرگر ہیپی" شخص کے سامنے ایک بھی ایسی عمارت نہیں آئی تھی جسے دیکھ کر کیمرے کا بٹن دبانے کو جی چاہے۔ کسی شہر کے بے جان ہونے کے حق میں اس سے زیادہ ثبت دلیل اور کیا ہو سکتی ہے۔ اپنے عالی جناب میر دبیر قاضی ولی محمد صاحب بھی میڈرڈ آئے۔ "سفرنامہ اندلس" میں لکھتے ہیں:

جدید شہر کے ہرا دار ہفت منزل محلات، کشادہ شوارع۔ پر فضا باغات، نکہت افزا چمن۔ پیرس و فرانکفورٹ یاد دلاتے ہیں۔ پٹڑیوں پر قہوہ خانے سجے ہوئے ہیں۔ صہبائے جلیقیہ وشریش کا دور چل رہا ہے برف کی بھرمار ہے برقی پنکھوں کے علاوہ خوش وضع سبک پنکھیے کو نازک کلائیاں ایک خاص انداز دلربائی سے چلا رہی ہیں۔"

قاضی صاحب نے قدیم شہر کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ لکھتے ہیں:

"بجز عزیلو مساکین کے اس کی تنگ، پیچیدہ اور متعفن گلی کوچوں میں اور کوئی بھلا آدمی نہیں رہتا۔ شکستہ سڑک پر ٹاٹ بچھا ہوا ہے جس پر سامان بساط خانہ کے پاس فربہ اندام اندلسی خاتون مانگ پٹی سے آراستہ برہنہ سر ہاتھ میں پنکھا لیے ایک مونڈھے پر بیٹھی گاہکوں کا منہ تک رہی ہے۔ میوہ فروش کیا ٹن خربوزوں کی ڈھیری پر ایسی بے تکلفی سے بیٹھی ہے جس طرح پیداوار ریاست پر ٹونک کی غیور پٹھانی پیشواز پہنے متمکن ہو۔ بلنشیہ کی کھاوی اور مالقہ کی اوڑھنیاں ایک طرف فروخت ہو رہی ہیں طلیطلہ کے چاقو دوسری طرف جمع ہیں۔ ایک ساقن دو پیسے کے معاوضہ میں آب زلال کا ایک جرعہ پیش کر رہی ہے۔ تمباکو فروش ایک ایک پیسہ کے تلخ گلو سوز سگریٹ فروخت کر رہا ہے۔ خچر کھا بچیوں کے پاس کھڑے ہیں۔"

میں نے پورٹا ٹا کا چوتھا گلاس منگوایا اور چوک میں ایستادہ سروانٹ میموریل کے کانسی کے مجسموں کا جائزہ لینے لگا۔ روزی نانتے پر سوار بارلیش ڈان کوئکزاٹ ہاتھ میں نیزہ تھامے اور اس کا وفادار ساتھی سانچو پانزا خچر ہانکتا ہوا۔

"معاف کیجیے گا شاید میری پنسل آپ کی میز کے نیچے گر گئی ہے۔" میں نے سانچو پانزا کے آہنی خدوخال سے نظریں ہٹا کر امریکی لہجہ کی اس "معاف کیجیے گا" کی جانب دیکھا۔ درمیانی عمر کی ایک قدرے قبول صورت خاتون ساتھ والی میز پر کہنیاں ٹیکے میری جانب نہایت معصومیت سے ٹکٹکی لگائے جا رہی تھیں۔ میڈرڈ کی طرح جدید، بے جان اور ڈل سا چہرہ۔ مجھ جیسے شرفاء کو پنسل گرا کر متوجہ کرنے کے طریقہ کار سے میں بخوبی واقف تھا۔ بہرحال میں نے پنسل اٹھا کر انہیں تھما دی۔

"بہت بہت شکریہ" انہوں نے نہایت بھولپن سے مسکرا کر کہا۔

"یو آر ویلکم" میں نے حسب آداب تکلف برتا۔

"اوہ...." ان کی آنکھیں مصنوعی حیرت سے پھیل گئیں "آپ تو انگریزی بھی جانتے ہیں۔"

"جی!"

"بہت خوب! مجھے تو میڈرڈ سے پیار ہو گیا ہے اور آپ کو؟"

"نہیں ہوا۔"

"اوہو.... آپ نے یہاں کیا کیا دیکھا؟"

"الفتیرو۔ پلازاویل سول دیکھ لیا ہے..... اور یہ پلازادیل نیپ چونا اب دیکھ رہا ہوں۔"

"کیا ؟" ان پر تو دو ساختہ سکتہ طاری ہو گیا" یعنی آپ نے ابھی تک پراڈو نہیں دیکھا ! یا خدا وہ دیکھئے، سامنے ہی تو نظر آ رہا ہے۔ جس کی عمارت کے سامنے گویا کا مجسمہ نظر آ رہا ہے۔"

"گویا کر..... "

"نہیں نہیں گویا کر نہیں گویا۔ مشہور ہسپانوی مصور..... "

"جس نے ڈچس آف ایلبا کی برہنہ تصویر بنائی تھی۔"

"اوہ ! یہ تو شرارت ہے۔" انہوں نے انتہائی مسرت سے اعلان کر دیا۔ یہ آخری فقرہ قطعی طور پر خطرے کا الارم تھا۔ چنانچہ میں نے بقیہ کورشانا ایک ہی سانس میں ختم کیا اور اٹھ کھڑا ہوا" آپ سے مل کر بیحد خوشی ہوئی مجھے اس وقت ٹورسٹ آفس سے کچھ معلومات حاصل کرنا ہیں اس لئے اجازت دیجئے۔"

"اوہ.. " انہوں نے فوراً اپنا ٹوکری نما پرس اٹھایا اور کھڑی ہو گئیں" مجھے بھی اس وقت ٹورسٹ آفس سے..... "

ٹورسٹ آفس میں میں نے کاؤنٹر پر رکھا ایک کتابچہ اٹھایا اور باہر نکل آیا۔ ان محترمہ نے بھی وہی کتابچہ اٹھایا اور میرے ساتھ ہی چپکی چلی آئیں۔

"اب ہم کیا کریں ؟" محترمہ نے "ہم" پر یوں زور دیا جیسے ہم ایک مدت سے ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا چلے آ رہے ہیں۔

"میں سونا چاہتا ہوں۔" میڈرڈ کی گرم دوپہر اور محترمہ کے بے جا التفات سے بچاؤ کا واحد طریقہ ہوٹل واپس جا کر آرام کرنا تھا۔

"اوہ ! پھر شرارت۔ تم یقیناً اپنا وقت ضائع کرنے میں یقین نہیں رکھتے۔" انہوں نے ایک گہری سانس بھر کر پیار سے کہا" لیکن اس وقت..... پراڈو چلتے ہیں۔"

ہسپانیہ کے شاہی خاندانوں کو شاید فن مصوری کی سرپرستی کا اتنا شوق نہ تھا جتنا اپنی ذاتی تصاویر بنوانے کا چاؤ تھا۔ چنانچہ پراڈو آرٹ گیلری کی دیواروں سے موٹے بادشاہ، بدہیئت شہزادیاں اور پست قد شہزادے آپ کو حقارت سے گھورتے نظر آتے ہیں۔ کارلاس پنجم، فلپ دوم اور فلپ چہارم کی تصاویر کی تو اتنی بہتات ہے کہ آنکھیں دکھنے کو آتی ہیں۔ پراڈو دنیا کی دوسری آرٹ گیلریوں سے یوں ممتاز ہے کہ اس میں آویزاں تمام

شاہکار یا تو نقد رقم ادا کر کے حاصل کئے گئے اور یا پھر تیتیان، ولاسکز، اور روبنز جیسے شہرۂ آفاق مصوروں کو ٹھیکے دے کر سینکڑوں کی تعداد میں بنوائے گئے۔ نپولین کی طرح نہیں کہ یورپ فتح کرنے کے بعد ہر شاہکار تصویر پر "لوور" کا ٹھپہ لگایا اور پیرس روانہ کر دی جہاں اس فن پرستی سے بہت سے مصوروں کا بھلا ہوا۔ وہاں ہسپانوی بادشاہ بھی گھاٹے میں نہ رہے۔ فلپ دوم نے ولاسکز سے ایک بڑھیا قسم کی تصویر بنوا کر ولایت روانہ کی جسے دیکھ کر ایک اٹھتیس سالہ نوخیز شہزادی اس بری طرح عاشق ہوئی کہ جہیز سے بھرے ہوئے جہاز میں سوار ہو کر خود شادی کرنے ہسپانیہ آ پہنچی۔ تیتیان، ولاسکز اور روبنز کے علاوہ پراڈو میں مریلو، دیتیرا، گریکو اور گویا کی تصاویر بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ روبنز نے متناسب جسم کی خواتین کی تصاویر بنائی ہیں اور حسب عادت ننگی بنائی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے دودھیا رنگ مرمر نرم ہو کر جسمانی ابھاروں اور پیچ و خم میں ڈھل گیا ہے۔ گویا کی بنائی ہوئی سیاہی مائل "بلیک گویا" سیریز کی چودہ تصویریں جنگ کی ہولناکیوں کے خلاف ایک مصور کا احتجاج ہے۔

ہم پراڈو کے کرہ نمبر ۱۲ میں گئے۔ جو صرف ولاسکز کے لئے مخصوص ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اگر اس کمرے میں آویزاں تصاویر کو نیلام کیا جائے تو بارہ ارب روپے سے زائد رقم حاصل ہو سکتی ہے۔

باہر نکلنے سے پیشتر گویا کی "دوماجا" نامی تصاویر بھی سامنے آئیں۔ ایک میں ڈچیس آف ساماشرلیف زاویوں کی طرح ڈھکی چھپی صوفے پر نیم دراز دوسری اسی حالت میں مگر بالکل برہنہ۔ ناقدین فن آج تک یہ طے نہیں کر پائے کہ ان ہر دو تصاویر میں سے کون سی کینوس پر پہلے اتری۔ حالانکہ ظاہر ہے برہنہ تصویر بعد میں ہی بنائی جا سکتی ہے۔

ہم پراڈو سے باہر آئے تو ملحقہ باغ میں بلند ستون پر آویزاں گویا کا مجسمہ دیکھ کر محترمہ پھر جذباتی ہو گئیں۔

"اوہ گویا......"

"گویا کر"

"یہ تم گویا کو ہمیشہ گویا کر کیوں کہتے ہو؟"

"ہمارے ہاں اسے گویا کر ہی کہتے ہیں"

"اور اب ہم داسترو کی مارکیٹ میں چلیں گے" انہوں نے نہایت بے تکلفی سے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھتے ہوئے اعلان کیا

"اور اب ہم یعنی صرف میں واپس ہوسٹل جا رہا ہوں"۔ میں نے ان کا ہاتھ بصد احترام نیچے کرتے ہوئے کہا

"مجھے صبح قرطبہ جانے کے لئے سامان پیک کرنا ہے"۔

"اوہو! لیکن واسترو میں نوادرات ملتے ہیں" وہ گھبرا گئیں۔

"ایک دن کے لئے میں نے ضرورت سے زیادہ نوادرات دیکھ لئے اور ان میں آپ سے ملاقات بھی شامل ہے"۔

"اوہ... لیکن ہو سکتا ہے کہ ہمیں وہاں کسی کباڑیئے کے سٹور میں سے ان درجن بھر گویا کی تصاویر میں سے ایک ہاتھ لگ جائے جو ۱۹۰۸ء میں پراڈو سے چوری ہو گئی تھیں"۔

"ہو سکتا ہے"۔

"پھر!" وہ کھل اٹھیں۔

"پھر خدا حافظ مسز... کیا نام ہے آپ کا!"

"مس جین ہاورڈ۔ آرٹ ٹیچر ان باسٹن ہائی یو ایس اے" وہ رومانسی ہو گئیں۔

"خدا حافظ مس ہاورڈ" میں نے جلدی سے کہا اور پھر چوروں کی طرح نظریں نیچی کئے تیزی سے چلتا ہوا پراڈو کے احاطے سے باہر آ گیا۔ مس ہاورڈ کے ساتھ میں میڈرڈ کو بھی خدا حافظ کہہ دینا چاہتا تھا اور اب میرا رخ اٹوچا سٹیشن کی جانب تھا جہاں قرطبہ جانے کے لئے پیشگی ٹکٹ ملتے تھے۔ ایڈورڈ ہٹن نے اپنی کتاب "ہسپانیہ کے شہر" میں لکھا ہے "میڈرڈ کی سڑکیں ناپختہ اور گندی ہیں۔ یہاں کے لوگ منہ پھٹ اور بدتمیز ہیں۔ آب و ہوا ہسپانیہ بھر میں بدترین۔ ایک ایسا شہر جس سے کوئی بھی پیار نہیں کر سکتا"۔ ہٹن کے آخری فقرے سے میں کلی طور پر متفق ہوں۔ کم از کم میرے اور میڈرڈ کے درمیان کسی قسم کا تعلق پیدا نہیں ہو سکا تھا۔ برسلز اور فرینکفورٹ کے ہمراہ میں نے میڈرڈ کو بھی یورپ کے ناپسندیدہ شہروں کی فہرست میں شامل کر دیا ہے۔

دماغ چاٹنے والے

ابراہیم جلیس

میرے ملاقاتیوں کی کوئی تعداد متعین نہیں ہے۔ مگر ان میں سے چند ملاقاتی ایسے ہیں جن کے بارے میں رہ رہ کر مجھے خیال آتا ہے کہ کاش ان سے میری ملاقات نہ ہوتی۔ یا کاش اب ان سے میری راہ و رسم منقطع ہوجائے۔ یہ فرد ہے پہلی بار جب میں کسی ملاقاتی سے ملتا ہوں تو عادتاً یہ ضرور کہہ دیتا ہوں کہ "مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے" یہ جملہ تکرار سمی ہے۔ اس کے معنیٰ و مفہوم اور اس کی اہمیت پر غور کیے بغیر خود بخود زبان سے نکل جاتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ جملے سے ناجائز فائدہ اٹھائے جائے اور اس لئے بار بار ملاقات کی جائے کہ پہلی بار مجھے ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی تھی — ویسے اب میں سچ سچ بتادوں کہ اب تو ان ملاقاتیوں سے مل کر مجھے بے حد کوفت ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ذرا ڈھیٹ بن کر۔ ذرا بے مروّت ہوکر صاف صاف کہہ دوں کہ صاحبان — میں آپ سے ہرگز نہیں ملنا چاہتا۔ مجھے آپ سے مل کر نہ پہلی بار کوئی خوشی ہوتی تھی اور نہ اب ہوئی ہے اور نہ آئندہ کبھی ہوسکتی ہے۔ میں بڑی عاجزی سے درخواست گذار ہوں کہ مجھے معاف کیجئے اور خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دیجئے۔

لیکن کیا اب میں ایسا کہہ سکتا ہوں؟ نہیں نہیں شاید میں ایسا نہیں کہہ سکتا۔ میں لاکھ کوشش کروں تب بھی ایسا نہیں کہہ سکتا کیونکہ مجھ میں وہ اخلاقی جرأت ہی نہیں ہے جس کی ہر بڑے آدمی نے تلقین کی ہے اور جو ابتدائے آفرینش سے آج تک پیغمبروں اور غیر معمولی آدمیوں کو چھوڑ کر کسی انسان میں پیدا نہ ہوسکی۔ اس دنیائے آب و گل میں اخلاقی جرأت رکھنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ لیکن چونکہ میرے دل گردے بہت کمزور ہیں اور فطرتاً تو آسان بھی ہوں۔ اس لئے مجھ میں اخلاقی جرأت پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ ہر زید بکر، عمر سے پہلی ملاقات پر میں بے کھٹکے یعنی بغیر سوچے سمجھے کہہ دیتا ہوں کہ مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔

مگر ازراہِ انصاف آپ فرمایئے کہ سید شاہ ضیاء الحسن سے مل کر کسی صحیح عقل و دماغ رکھنے والے انسان کو خوشی ہوسکتی ہے؟

مجھے اپنے دوست محمود ریاض خاں پر بے حد غصہ آتا ہے کہ جس نے سید شاہ ضیاء الحسن سے ایک مبارک یا منحوس دن میرا تعارف کرایا۔ یہ کوئی سخن سازی نہیں بلکہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جس دن بھی سید ضیاء الحسن سے کسی شخص کا تعارف ہوگا وہ دن اس شخص کے لئے یقیناً ایک منحوس دن ہوگا۔ چنانچہ میری زندگی میں اب اس منحوس دن کے علاوہ روز بروز منحوس گھڑیوں کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے کیونکہ سید شاہ ضیاء الحسن روز بروز مجھ سے ملتا ہے۔ میں جتنا اس سے دور بھاگتا ہوں وہ اتنی ہی تیزی سے میری طرف دوڑتا ہے۔ مجھے پکڑ لیتا ہے اور مجھے اپنی شکست مان کر مجبوراً دانت کھول کر مسکرانا پڑتا ہے اور پھر میں پوچھتا ہوں ــ

"اوہ! سید شاہ ضیاء الحسن صاحب۔ کہئیے مزاج تو اچھے ہیں! اب پھر کچھ نہ پوچھئے۔ سید ضیاء الحسن کی زبان چلنے لگتی ہے تو پھر گھنٹوں چلتی رہتی ہے۔ رُکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ آپ بیٹھے اور اپنے صبر و ضبط کا امتحان دیتے رہیئے۔ نتیجتاً ناکامی آپ کو یا مجھے ہی ہوگی۔ سید شاہ ضیاء الحسن کبھی ناکام نہیں ہو سکتا۔

وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ چونکہ وہ دو دو تین تین گھنٹوں تک بے تکان گفتگو کر سکتا ہے اور سننے والے چپ چاپ اس کی باتیں سنتے رہتے ہیں تو یقیناً اس کی گفتگو بڑی دلچسپ ہوتی ہے۔ جبھی تو لوگ اپنے زخم جگر کو دیکھنے کی بجائے ہمہ تن گوش ہو کر بڑے انہماک سے اس کی باتیں سنتے رہتے ہیں۔ سید شاہ ضیاء الحسن کبھی یہ جاننے یا محسوس کرنے کی کوشش نہیں کرے گا کہ آپ کس موڈ میں ہیں۔ وہ اس کی کبھی پروا نہیں کریگا کہ آپ کو بخار اور درد سر ہے۔ یا آپ اپنی محبوبہ کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ اسے تو بس یہ خوش فہمی ہے کہ وہ بڑا دلچسپ باتونی یا ایک اچھا مجلسی آدمی ہے۔ اسی لئے وہ باتیں شروع کر دیتا ہے۔ ہر قسم کی باتیں۔ ہر موضوع کی باتیں ایران کی باتیں، توران کی باتیں، مہمل باتیں، بیکار باتیں ــ ضیاء الحسن باتیں ہی باتیں کرتا رہتا ہے مگر نزدیک سے بغور دیکھنے پر بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ باتیں نہیں کر رہا بلکہ اپنے مخاطب کا دماغ چاٹ رہا ہے۔

میں مانتا ہوں کہ انسان کے حلق میں زبان اسی لئے جڑی گئی ہے کہ وہ باتیں کرے۔ باتیں کرنا ہرگز کوئی غیر انسانی حرکت نہیں مگر مجھے یہ کہنے میں ذرہ برابر بھی باک نہیں ہے کہ دماغ چاٹنا یقیناً غیر انسانی حرکت ہے۔

ضیاء الحسن جب کبھی ملتا ہے تو پہلے یہ ضرور کہہ دیتا ہے کہ "نہیں نہیں کوئی خاص بات نہیں۔ بس ادھر سے گزر رہا تھا سوچا تم سے دو ایک منٹ کے لئے باتیں کرتا چلوں"۔

اب سنئے اس کی دو ایک منٹ کی باتیں ــ

"ارے بھئی ــ کچھ سُنا تم نے ــ ابھی ابھی ایک بڑا افسوس ناک واقعہ ہوا۔ وہ موہن لال ہے نا ــ جیتی موتی سے

گر پڑا۔ بے چارے کو بڑی محنت چوٹ آئی "
میں پوچھتا ہوں ـــــ
"کون موہن لال ـــــ؟

وہ حیرت سے کہتا ہے ـــــ "ارے موہن لال کو نہیں جانتے۔ ہاں ہاں موہن لال کو تم نہیں جانتے۔ تم اس سے کبھی ملے بھی نہیں۔ موہن لال بے چارا ایک بڑا پیارا دوست ہے۔ ڈپٹی دیا نرائن کا بھانجا۔ بڑا دلچسپ ہنس مکھ ـــــ بالکل ڈپٹی دیا نرائن کی طرح خوش مذاق اور زندہ دل ـــــ ہے ہے۔ ڈپٹی دیا نرائن کی کیا تعریف کی جائے۔ ابھی ابھی پچھلی جولائی میں وہ سو۔ گباش ہوئے ہیں ـــــ بڑی حسرت ناک موت تھی ـــــ ہاں اس حسرت ناک موت پر خوب یاد آیا۔ وہ بے چارا قمرالدین بھی تو مر گیا۔ اس کی موت بھی بڑی دردناک تھی۔ قمرالدین کو بھی شاید تم نہیں جانتے۔ بے چارے کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔

ارے ہاں بھئی۔ تمہارے چھوٹے بچے کا مزاج اب کیسا ہے؟ کون سے ڈاکٹر کا علاج کر رہے ہو۔ آج کل تو یہاں کوئی اچھا ڈاکٹر رہا ہی نہیں۔ سب نیم حکیم خطرہ جان ہیں۔ اب تو یار میرے علاج کرنے والے بھی ڈاکٹر ہیں اور کالج میں پڑھانے والے بھی ڈاکٹر ہیں۔ اس پر ایک بات یاد آ گئی۔ وہ جو ڈاکٹر فاروق حسین جو معاشیات کے پروفیسر تھے۔ انہوں نے استعفیٰ دے دیا ہے۔ بڑا خوددار آدمی تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں دو ہی خوددار آدمی دیکھے ہیں۔ ایک تو ڈاکٹر فاروق حسین، دوسرا اپنا محمد قاسم طبلہ مرچنٹ۔ تم نے محمد قاسم طبلہ مرچنٹ کا وہ واقعہ تو ضرور سنا ہوگا کہ ایک بار انہوں نے ایک بڑے رئیس کا طبلہ درست کرنے سے اس لئے انکار کر دیا تھا کہ رئیس نے دکان کے باہر ہی سے موٹر میں بیٹھے بیٹھے بڑی رعونت سے کہا تھا کہ ـــــ

"اے میاں طبلے والے ادھر آؤ۔ اسے درست کرنا ہے۔"

محمد قاسم خوددار آدمی تھا۔ اس نے ویسے دکان میں ہی بیٹھے بیٹھے کہا ـــــ

"غرض پڑی ہے تو موٹر سے اتر کر یہاں آؤ۔ ورنہ اپنا راستہ ناپو۔" یہ ہے خودداری ـــــ تجارت کرتا ہے۔ آزاد پیشہ آدمی ہے۔ وہ بھلا کسی رئیس کا دبیل کیوں ہو۔ وہ تو اس وقت .... ارے بھائی جلیس اٹھ کھڑے ہوگئے۔

"اماں یار بیٹھو ـــــ کہاں جا رہے ہو، بیٹھو بھئی بیٹھو۔

مگر میں نے جواب دیا کہ مجھے ساڑھے گیارہ بجے ایک صاحب سے ملنا ہے۔ معاف کرنا ضیاء الحسن میں محمد قاسم طبلچی کی داستان خودداری پوری طرح نہ سن سکا مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے اُن صاحب سے ملنا

ضروری ہے اور اب گیارہ بجنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں۔ اچھا پھر ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ۔

اس کے بعد میں وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتا ہوں۔ یہ بالکل جھوٹ ہے کہ ساڑھے گیارہ بجے مجھے کسی صاحب سے ملنا ہے۔ مگر یہ بالکل سچ ہے کہ مجھے زخمی موہن لال یا اُن کے خوش مذاق، زندہ دل ماموں ڈپٹی دیا نرائن آنجہانی یا چھوٹے چھوٹے بچوں والے مرحوم قمرالدین یا ڈاکٹر فاروق حسین سابق پروفیسر معاشیات اور خود دار طبلہ مرچنٹ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ موہن لال جسے میں جانتا تک نہیں سمجھئے اگر موٹر سے گر پڑا تو میں کیا کروں! ڈپٹی دیا نرائن بڑے خوش مذاق اور زندہ دل آدمی تھے تو وہ ہوں گے۔ قمرالدین کی موت بڑی حسرت ناک تھی تو تھی اس کی موت میں میرا کیا دخل! ڈاکٹر فاروق حسین نے استعفیٰ دے دیا۔ تو میرا کیا بگڑا۔ محمد قاسم طبلہ والے اگر خود دار ہیں تو ہوا کریں۔ مجھے وان سے طبلہ درست نہیں کرانا ہے۔

مجھے صرف اکیلے ضیاءالحسن ہی سے شکایت نہیں ہے بلکہ ضیاءالحسن کے سارے بھائیوں سے شکوہ ہے میرا روئے سخن ضیاءالحسن کے سگے یا رشتے کے بھائیوں کی طرف نہیں ہے بلکہ میری ضیاءالحسن کے پیشے کے بھائیوں یعنی ضیاءالحسن کی طرح دماغ چاٹو لوگوں سے ہے۔ دماغ چاٹنا نہ صرف ایک پیشہ ہے بلکہ اس کا شمار فنون لطیفہ میں بھی ہوتا ہے۔ سید شاہ ضیاءالحسن کے ایک ہم پیشہ بھائی ابوالفضل صاحب ہیں: یہ ابوالفضل صاحب کسی ضلع کی ایک تحصیل کے پیشکار ہیں اپنی کسی نہ کسی کارروائی کے سلسلے میں ہر آٹھوارے پندرھواڑے شہر آتے رہتے ہیں اور جب بھی مجھ سے ملتے ہیں تو پہلا سوال یہ کرتے ہیں۔

"میاں تم کب آئے؟"

میں جواب دیتا ہوں "جی میں تو یہیں ہوں۔ عرصے سے یہاں رہتا ہوں میں تو پانچ سال سے کہیں چھوٹے سے سفر پر بھی نہیں گیا۔"

وہ فرماتے ہیں — "اوہ، وہ شاید آپ کے بھائی ہیں جو بمبئی میں ہیں۔" میں کہتا ہوں "جی میرے تو کوئی بھائی بمبئی میں نہیں ہیں۔" وہ مُصر ہو جاتے ہیں "ارے کوئی تھے تو میاں تمہارے بمبئی میں؟"

اب میں اُن سے کس طرح بحث کروں۔ اس لئے جھوٹ موٹ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں "اچھا آپ عابد حسین کو پوچھ رہے ہیں۔ جی، وہ تو بمبئی میں فلم ایکٹر بن گئے۔" (حالانکہ عابد حسین تو یہیں ہیں اور یہیں ایک دفتر میں ملازم ہیں) وہ خوش ہو کر فرماتے ہیں "ہاں میں نے کہا تھا نا۔ اچھا اب آپ کیا کر رہے ہیں" "جی تو چاہتا ہے کہہ دوں، جھک مار رہا ہوں" مگر چونکہ میرے بزرگوں کے ملنے والوں میں سے ہیں اس لئے جواب دیتا ہوں — "جی ایک اخبار کا اڈیٹر ہوں"

فرماتے ہیں اخبار کے ایڈیٹر ہو! خوب اچھا، آج کل اخباروں میں کیا چھپ رہا ہے؟" ایسے سوال کے بعد اپنا اور اُن کا جی ایک کر دینے کو چاہتا ہے۔ مگر انسان ایک بندۂ مجبور ہے اور وہ صرف تحصیل کے ہیشکار ہیں مگر میرے بزرگوں کے ملنے جلنے والے بھی ہیں۔

وہ جب کبھی اپنی تحصیل سے شہر آتے ہیں تو ادھر کئے ہوئے سوالات ہر مرتبہ دہراتے ہیں اور دو تین گھنٹے تک برابر دماغ چاٹتے رہتے ہیں مگر پرسوں میں نے انہیں بڑا چکمہ دیا۔ وہ شہر آئے تھے۔ اتفاق سے عابد روڈ پر نظر آ گئے۔ میں سائیکل پر جا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر پکارا۔

"میاں۔ ارے ٹھہرو۔ ٹھہرو بات تو سنو"

مگر میں نے بالکل انجان ہو کر پیڈل تیز کئے اور نامپلی سڑک پر مڑ گیا۔ حالانکہ مجھے معظم جاہی مارکیٹ جانا تھا۔

ضیاء الحسن کے تیسرے برادر طریقت ہمارے ایک پڑوسی بزرگ بھی محکمہ مالگزاری کے پنشن یافتہ منتظم ہیں۔ انہیں بڑھاپے کی وجہ سے جلدی نیند نہیں آتی۔ اس لئے بے خوابی کا وقت میرا دماغ چاٹنے میں گذارتے ہیں۔ روزانہ رات کو کھانے کے بعد آ جاتے ہیں اور آتے ہی پہلا سوال یہ کرتے ہیں—

"سناؤ بابا۔ آج اخبار میں کیا لکھا ہے؟"

میں کوئی حافظ اخبار تو نہیں ہوں۔ اس لئے عمداً اخبار اُن کی طرف بڑھا دیتا ہوں۔ مگر وہ اخبار مجھ کو واپس کرتے ہوئے فرماتے ہیں "اخبار تو میں صبح کا ہی پڑھ چکا ہوں۔ اس میں کیا رکھا ہے۔ کچھ تو سناؤ اشالن ہندستان پر کب حملہ بولنے والا ہے؟"

میرا ارادہ ہے کہ کسی دن جب میرے صبر و تحمل کا پیالہ چھلک جائے گا تو میں اُن سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ قبلہ نہ تو اشالن کو باؤلے کتے نے کاٹا ہے کہ وہ ہندوستان پر حملہ کرے اور نہ مجھے کرنی آپ کے ساتھ بیٹھ کر دو تین گھنٹوں تک اخبار کا آموختہ پڑھوں۔ آپ پنشن یافتہ ہیں۔ آپ کو بے خوابی کی شکایت ہے تو پھر آپ اپنے گھر بیٹھ کر تارے گنتے رہیے میرا جوان وقت کیوں ضائع کرتے ہیں۔ میرا دماغ کہاں اتنا فالتو ہے کہ آپ بیٹھے چاٹا کیجئے۔ حضرت مجھے سونے دیجئے۔ رات کے گیارہ بج رہے ہیں اپنی بزرگی یا میری سعادت مندی سے اللہ ناجائز فائدہ تو نہ اٹھائیے۔

ضیاء الحسن کے ایک چوتھے ہم مشرب آرٹسٹ ہیں۔ لوگ انہیں ہرفن مولا کہتے ہیں۔ مگر انہوں نے انتہائی سادگی سے اپنا تخلص بے کمال رکھا ہے۔ وہ ایک بہت اچھے شاعر بہت اچھے افسانہ نگار، بہت اچھے مصوّر بہت

چھے گوّیے اور بہت اچھے لطیفہ گو ہیں۔ جل ترنگ بھی بہت اچھا بجاتے ہیں۔ آج کل ناچ بھی سیکھ رہے ہیں
لر ایک اچھائی یا خرابی یہ ہے کہ وہ سنانے کے مرض میں گرفتار ہیں جب کبھی میں انہیں نظر آجاتا ہوں تو بس پکڑ
ر زبردستی موٹر میں بٹھا سیدھا گھر لے جاتے ہیں۔ حکم ہوتا ہے کہ پہلے چھ سگریٹ پی کر تازہ دم ہو جاؤ۔ جیسے
ی کر پہلا ہی سگریٹ جلاتا ہوں کہ وہ اپنی تازہ نظم یا غزل شروع کر دیتے ہیں۔ اب میں ہوں کہ بات بے بات واہ
اہ کہنے لگتا ہوں۔ پندرہ بیس تازہ منظومات کا اسٹاک ختم ہو گیا تو وہ اندر سے چمڑے کا موٹا بیگ لے آئے۔ اب
سنانے شروع ہوتے ہیں۔ رومانوی افسانے، سیاسی افسانے، تاریخی افسانے، جاسوسی افسانے۔
دو بج گئے۔ اندر سے دوپہر کا کھانا آیا۔ کھانا کھاتے کھاتے بھی اپنی نگارشات اور ان کی شانِ نزول زیر
بحث آ جاتی ہے کھانا ختم کرنے کے بعد بچے کچھے مقالے، تقریریں، اقتباسات، ڈائری کچھ بڑے لوگوں کے
خطوط اور کچھ فرضی لڑکیوں کے محبت نامے لیجیئے اب پانچ بج گئے شام کی چائے آتی ہے۔ شام کا وقت چونکہ
نثر نظم کے سے وزنی پروگراموں کے لئے موزوں نہیں ہوتا اس لئے لطیفہ گوئی اور بیت بازی شروع ہو گئی۔ رات
کے آٹھ بج گئے۔ اندر سے رات کا کھانا کھاتے کھاتے ٹیبل ٹاک ہوتی ہے۔ نو بج جاتے ہیں۔ اب ذرا سکوت
ور سناٹا طاری ہو جاتا ہے۔ مگر اس پر بھی مصوری کے شاہکار دکھانے لگے۔
یہ تاج محل ہے، یہ نخلستان ہے، یہ نسیم جو نیر کی تصویر ہے۔
"یہ ایک لڑکی کی تصویر ہے جس کا چہرہ عشق کی ناکامی کے تاثرات ظاہر کرنے کی میں نے انتہائی کوشش کی ہے۔"
"میری یہ تیندوے کی تصویر ــــ اب کے سال بمبئی کی آرٹ اگزیبیشن میں بھیجی جانے والی ہے۔"
خدا خدا کر کے رات کے دو بج گئے۔ دو بجے سے موسیقی کا پروگرام شروع ہو گیا۔ پھر رات کے پانچ بج گئے۔
اب جل ترنگ پر بھیرویں بجانے لگے۔ یہ مجلس راگ و رنگ ابھی جاری تھی کہ قریب میں کسی ٹاپے سے مرغ بول پڑا۔ ایک
مسجد سے موذن کی اذان گونجی۔
فرمایا "ارے دیکھا تم نے۔ آرٹسٹ کو گردشِ شام و سحر کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔ اچھا، ارے تمہاری آنکھیں لال ہو
رہی ہیں۔ اب تم سو جاؤ۔ میں ذرا شفق کا نظارہ کروں۔"
میں سوچتا ہوں کہ کیا میں سو جاؤں؟ ـــ مگر شاید میں نہ سو سکتا ہوں اور نہ سوچ سکتا ہوں۔ کیونکہ میرے سر میں جتنا
بھی مغز تھا۔ آرٹسٹ نے سارے کا سارا چاٹ لیا ہے۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے!
اب مجھے یہ کرنا چاہیئے کہ جب بھی مجھے دوبارہ آرٹسٹ صاحب سے ملنا پڑے تو پہلے ہی اپنے بیوی بچوں کو

نصیحت کراؤں تاکہ میری بھی آرٹسٹ بن جاؤں اور مجھے گردشِ شام وسحر کی خبر ہی نہ ہو. ظاہر بات ہے کہ جب سارا دماغ چاٹ لیا جائے گا تو پھر گردشِ شام وسحر کی خبر ہی نہ ہوگی۔

ضیاءالحسن صاحب کے پانچویں بھائی چودھری رام کشن جی ہیں. بہت بچپن سے میرے ساتھ پرائمری جماعت میں پڑھتے تھے۔ پرائمری پاس کرنے کے بعد وہ اپنے باپا کی کپڑے کی دکان پر بیٹھ گئے. پھر زمانہ گذر گیا. میں بی، اے پاس کر لیا. اس کا رام کشن جی کو بھی پتہ چل گیا. وہ مجھے بڑا لائق آدمی سمجھنے لگے۔ اپنے کاروباری خطوط پڑھانے اور لکھانے کے علاوہ اپنے راج پھوڑے کے علاج سے لے کر اپنی لڑکی کی شادی تک ہر معاملے میں مجھ سے مشورہ کرتے ہیں. ان کی گفتگو کا بار بار دہرایا جانے والا جملہ یہ ہے۔

' بھئی تم علم وادب کے خوب چرچے کرتے ہو. کچھ بتاؤ تو سہی کہ کیا دیسی کپڑوں کے ساتھ ولائتی کپڑوں کی بھی تجارت کروں؟'

"کیا چھوٹے لڑکے کو گرجا کے اسکول میں بھیج دوں! یا اپنے سرکاری مدرسہ میں ہی شریک کراؤں؟"

"کیا راج پھوڑے کا اپریشن کراؤں یا دوائیاں ہی کھاتا رہوں؟"

'کیا دیوان خانے کی دیوار اینٹوں سے چنواؤں یا لکڑی کی جالی ٹھکوا دوں؟"

'کیا حقہ چھوڑ کر سگریٹ شروع کر دوں یا صرف پان کھاؤں؟"

غرضیکہ رام کشن جی ہر روز مجھ سے میری قابلیت کا امتحان لینے کے لئے کوئی نہ کوئی صلاح مشورہ کرنے ضرور آتے ہیں اور محض اس لئے کہ میں بقول ان کے علم وادب کے خوب چرچے کر رہا ہوں اور میری کھوپڑی میں بہت بڑا دماغ ہے۔ اب میں رام کشن جی کو کس طرح سمجھاؤں کہ میری کھوپڑی میں جتنا کچھ مغز تھا وہ ضیاءالحسن نے پیشکار تحصیل نے، بڑوسی بزرگ نے، آرٹسٹ نے اور۔ خود آپ نے چاٹ ڈالا ہے. اب میں آپ کو کیا مشورہ دے سکتا ہوں کہ اپنے راج پھوڑے کا آپریشن کرانا چاہیئے۔

اس لئے اب مجھے معاف کیجئے اور اجازت دیجئے۔ خدا حافظ!

ایک سپاسنامہ، ایک بے لوث کارکن کی طرف سے

ابنِ انشا

"جناب والا۔ پاکستان کے بے لوث کارکنوں کی جماعت انجمنِ بے لوث کارکنانِ پاکستان (رجسٹرڈ) تہہ دل سے جناب والا کا خیر مقدم کرتی ہے۔ جناب والا۔ اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام محبِ وطن پاکستانی مل کر حکومت کے ہاتھ مضبوط کریں۔ چنانچہ انجمن ہذا بھی خلوص دل سے موجودہ حکومت کے ہاتھ اسی طرح مضبوط کرنے کو تیار ہے جس طرح پیشتر ازیں صدر ایوب کے ہاتھ مضبوط کرتی رہی ہے صدر یحییٰ کے ہاتھ مضبوط کرتی رہی ہے بلکہ ہر حکومت کے ہاتھ مضبوط کرتی رہتی ہے۔

جناب والا، ہماری انجمن کی ایک خصوصیت حکومت کے ہاتھ مضبوط کرنے کے علاوہ میدان میں کود پڑنا ہے، چنانچہ آج بھی ہم اپنے محبوب صدر کے ادنیٰ اشارے پر میدان میں کود پڑنے کو تیار ہیں، بشرطیکہ میدان میں یہاں سے وہاں تک روئی کے گدّے، نہالچے اور نمالیچے بچھا دیئے جائیں۔ ان کے بغیر میدان میں کودنا گزند کا باعث ہو سکتا ہے۔ چوٹ آ سکتی ہے جو ملک کے موجودہ حالات کے پیش نظر مناسب نہیں ہے۔

جناب والا۔ انجمن ہذا یعنی انجمن بے لوث کارکنان پاکستان (رجسٹرڈ) کے دروازے سب پر کھلے ہیں کیونکہ اس کے اندر کچھ نہیں ہے۔ پہلے تھا۔ لیکن اس کو کارکنانِ مذکور ہاتھوں ہاتھ اٹھا لے گئے اب فقط دروازے کا ساٹن بورڈ باقی ہے جسے انجمن ہذا بخوشی قوم کی نذر کرنے کو تیار ہے۔ یہ مضبوط شیشم کی لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ اس پر دھوبی کپڑے پٹخ سکتے ہیں، جو دھوبی نہیں وہ سر پٹخ سکتے ہیں۔ غسال مُردے نہلا سکتے ہیں۔ بلکہ مُردے اپنی مدد آپ کے اصول کے تحت آپ نہا سکتے ہیں۔

جناب والا۔ انجمن ہذا کے سبھی کارکنان پورے درجے کے بے لوث کارکن ہیں ان سے کوئی ان کی خدمت کے صلے کی بات کرے تو مارنے کو دوڑتے ہیں۔ یہ خاکسار میاں فقیر محمد سیکرٹری جنرل انجمن ہذا بالخصوص فقیر منش آدمی ہے۔ اسے آپ سے کوئی خواہش نہیں ہے سوائے عہدے کی خواہش کے، اور کسی قسم کا لالچ

ہیں، سوائے روپے کے لالچ کے۔ گزشتہ حکومتوں نے خاکسار کو خریدنے کی بہت کوشش کی لیکن نہیں خرید سکے۔ پہلے وزارت پیش کی گئی۔ خاکسار نے اس پر لات ماردی۔ خاکسار دولت پر لات مار چکا ہے۔ شہرت پر لات مار چکا ہے اور بھی کئی چیزوں پر لات مار چکا ہے جو اس وقت یاد نہیں۔ افسوس اب یہ لات اس قابل نہیں رہ گئی کہ مزید کسی چیز پر ماری جاسکے۔ لات مارنے کی عادت سے مجبور ہو کر اس خاکسار نے ایک کتے کے بھی لات ماردی تھی۔ وہ محاورے نہیں سمجھتا تھا اس نے اس جذبۂ ایثار کی قدر نہ کی جواب میں دانت مار دیئے۔ آدمیت سے بعید حرکت کی۔

جناب والا۔ جیسا کہ خاکسار نے عرض کیا، خاکسار کو آپ سے یا حکومت سے کسی قسم کی غرض نہیں ہے تاہم خاکسار کو شہر کی مین مارکیٹ میں جو زیر تعمیر ہے کونے والی بڑی دکان الاٹ کردی جائے تو خاکسار کا قوم کی بے لوث خدمت کا جذبہ روز افزوں ہو سکتا ہے اس لئے کہ انجمن ہذا کی عہدہ داری کے علاوہ جسے خاکسار ذاتی اغراض کے لئے استعمال کرنا حرام سمجھتا ہے۔ خاکسار کا چھوٹا سا کاروبار بھی فقیر اسٹون ورکس کے نام سے ہے۔ ہمارے محبوب صدر نے پچھلے دنوں فرمایا ہے کہ ہمیں محنت کرنی چاہیئے۔ پیٹ پر پتھر باندھ کر بھی محنت ہونی چاہیئے۔ لہٰذا خاکسار کی فرم نے لوگوں کو پیٹ پر باندھنے کے لئے پتھر بارعایت نرخوں پر سپلائی کرنے شروع کرنے شروع کر دیئے ہیں۔ یہ پتھر منگھو پیر کی پہاڑی کے ہیں لہٰذا مضبوط ہونے کے علاوہ روحانیت سے بھرپور اور خیرو برکت سے معمور ہیں۔ یہ پتھر پیٹ پر باندھنے کے علاوہ اور بھی کئی کام آسکتے ہیں۔ محبوب لوگ ان سے سنگِ آستاں بنواتے ہیں اور اس پر عاشق لوگوں سے جبیں گھسواتے ہیں ناک رگڑواتے ہیں۔ ناک اور جبیں کے علاوہ ان پر ہلدی اور مرچ بھی بخوبی پیس سکتے ہیں۔ خودکشی کے لئے بھی ہمارے ہاں کے پتھر آزمودہ ہیں۔ جو کوئی ان کو اپنے ساتھ باندھ کر دریا میں کودا پھر پانی کی سطح پر نہ ابھرا۔ ظالم سماج ہاتھ ملتا ہی رہ گیا۔ خودکشی کرنے والوں کے بے شمار تصدیقی سرٹیفکیٹ ہمارے پاس موجود ہیں کہ ہم کو ایک ہی پتھر سے فائدہ ہوا۔ قیدِ حیات و بندِ غم سے نجات مل گئی۔ اب چند پتھر فلاں فلاں حضرات کو ہماری طرف سے بھیج دیجیئے۔ دکان سے دریا کے پل تک پتھر پہنچانے کا خرچ ہم اپنے پلے سے دیتے ہیں گاہک سے چارج نہیں کرتے۔

جناب والا۔ جانے کس شاعر نے کہا ہے لیکن خوب کہا ہے کہ اس رزق سے موت اچھی جس رزق سے

آتی ہو پرواز میں کوتاہی۔ واقعی ساری خرابیوں کی جڑ رزق یعنی غلہ وغیرہ ہے۔ اس وقت ہماری قوم کو غلے کی اتنی ضرورت نہیں جتنی کہ پتھروں کی ہے۔ ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ ہمارے ایک بزرگ جن کا نام میں اس وقت بھول رہا ہوں، دانہ گندم کی وجہ سے جنت سے نکالے گئے۔ آج تک کوئی پتھروں کی وجہ سے نہیں نکالا گیا۔ شاعر مذکور نے جو رزق کو موت سے بہتر بتایا ہے تو اس کی وجہ ہے۔ مرنے والے کے مزار پر ہماری دکان سے مضبوط اور خوبصورت پتھر لگائے جا سکتے ہیں، کسی زندہ آدمی کے مزار پر نہیں۔ جس نے ایک بار اپنی قبر پر ہمارے ہاں سے پتھر کی تختی لگوائی ہمیشہ کے لئے ہمارا گرویدہ ہو گیا۔ جناب والا ایک لوح مع قطعہ تاریخ ہم آپ کی نذر بھی کرتے ہیں۔ وقت آنے پر کام آئے گی۔ گر قبول افتد ......

چچا چھکن نے تصویر ٹانگی

امتیاز علی تاج

چچا چھکن کبھی کبھار کوئی کام اپنے ذمے کیا لیتے ہیں گھر بھر کو تگنی کا ناچ نچا دیتے ہیں۔ آ بے لونڈے جا بے لونڈے۔ یہ کیجو وہ دیجو۔ گھر بازار ایک ہو جاتا ہے۔ دور کیوں جاؤ، پرسوں پرلے روز کا ذکر ہے دکان سے تصویر کا چوکھٹا لگ کر آیا۔ اس وقت تو دیوان خانے میں رکھ دی گئی۔ کل شام کہیں چچی کی نظر اس پر پڑی، بولیں "چھٹن کے ابا تصویر کب سے رکھی ہوئی ہے۔ خیر سے بچوں کا گھر ٹھہرا، کہیں ٹوٹ پھوٹ گئی تو بیٹھے بٹھائے روپے دو روپے کا دھکا لگ جائے گا۔ کون ٹانگے گا اس کو؟"

"ٹانگتا اور کون، میں خود ٹانگوں گا۔ کون سی ایسی جوئے شیر لانی ہے۔ رہنے دو میں ابھی سب کچھ خود ہی کئے لیتا ہوں۔"

کہنے کے ساتھ ہی شیروانی اتار چچا تصویر ٹانگنے کے درپے ہو گئے۔ امامی سے کہا "بیوی سے دو آنے پیسے لے کر مینخیں لے آ۔" اِدھر وہ دروازے سے نکلا اُدھر مودے سے کہا "مودے! مودے جانا امامی کے پیچھے۔ کہیو تین تین انچ کی ہوں مینخیں۔ بھاگ کر جا۔ جا لیجو اسے راستے ہی میں۔" لیجیے تصویر ٹانگنے کی داغ بیل پڑ گئی اور اب آئی گھر بھر کی شامت۔

ننھے کو پکارا "او ننھے جانا ذرا میرا ہتھوڑا لے آنا۔ بنو جاؤ اپنے بستے میں سے جنتری نکال لاؤ اور سیڑھی کی ضرورت بھی تو ہوگی ہم کو۔ ارے بھئی للو! ذرا تم جا کر کسی سے کہہ دیتے سیڑھی یہاں لا کر لگا دے اور دیکھنا وہ لکڑی کے تختے والی کرسی بھی لیتے آتے تو خوب ہوتا۔ چھٹن بیٹے! چائے پی لی تم نے؟ ذرا جانا تو اپنے ان ہمسائے میر باقر علی کے گھر۔ کہنا ابا نے سلام کہا ہے اور پوچھا ہے آپ کی ٹانگ اب کیسی ہے۔ اور کہیو، وہ جو ہے نا آپ کے پاس کیا نام ہے اس کا۔ اے لو بھول گیا۔ پلول تھا کہ ٹلول۔ اللہ جانے کیا تھا خیر وہ کچھ ہی تھا۔ تو یوں کہہ دیجو کہ وہ جو آپ کے پاس آلہ ہے نا جس سے سیدھ معلوم ہوتی ہے

وہ ذرا دار سے دیجیے، تصویر ٹانگنی ہے۔ جاؤ، میرے بیٹے؛ پر دیکھنا سلام ضرور کرنا اور ٹانگ کا پوچھنا نہ بھول جانا۔ اچھا؟ ...... یہ تم کہاں چل دیئے مٹو؟ کہا جو ہے ذرا یہیں ٹھہرے رہو۔ سیڑھی پر روشنی کون دکھائے گا ہم کو؟ آ گیا امامی؟ لے آیا میخیں؟ سوال گیا تھا؟ تین تین انچ کی ہیں نا؟ بس بہت ٹھیک ہیں۔ اے لو سُتلی منگوانے کا تو خیال ہی نہ رہا۔ اب کیا کروں؟ جاتا میرا بھائی جلدی سے۔ ہوا کی طرح جا اور دیکھیو بس گز سوا گز ہو سُتلی۔ نہ بہت موٹی ہو نہ پتلی۔ کہہ دینا تصویر ٹانگنے کو چاہیئے ہے۔ لے آیا؟ اودو! اودو! کہاں گیا؟ ودّو میاں! اسی وقت سب کو اپنے اپنے کام کی سوجھی ہے۔ یہ نہیں کہ آ کر ذرا ہاتھ بٹائیں۔ یہاں آؤ۔ تم کرسی پر چڑھ کر مجھے تصویر پکڑا، ہاں۔"

لیجیے صاحب خدا خدا کر کے تصویر ٹانگنے کا وقت آیا۔ مگر ہونی شدنی، چچا اسے اٹھا کر ذرا وزن کر رہے تھے کہ ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ گر کر شیشہ چور چور ہو گیا۔ "ہئی ہے!" کہہ کر سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ چچا نے کچھ خفیف ہو کر کرچوں کا معائنہ شروع کر دیا۔ وقت کی بات، انگلی میں شیشہ چبھ گیا۔ خون کی تللی بندھ گئی۔ تصویر کو بھول اپنا رومال تلاش کرنے لگے۔ رومال کہاں سے ملے؟ رومال تھا شیروانی کی جیب میں، شیروانی اتار کر نہ جانے کہاں رکھی تھی۔ اب جناب گھر بھر نے تصویر ٹانگنے کا سامان تو طاق پر رکھا اور شیروانی کی ڈھنڈیا پڑ گئی۔ چچا میاں کمرے میں ناچتے پھر رہے ہیں۔ کبھی اِس سے ٹکر کھاتے ہیں کبھی اُس سے۔ "سارے گھر میں سے کسی کو اتنی توفیق نہیں کہ میری شیروانی ڈھونڈ نکالے۔ عمر بھر ایسے نکموں سے پالا نہ پڑا تھا۔ اور کیا جھوٹ کہتا ہوں کچھ؟ چھ چھ آدمی ہیں اور ایک شیروانی نہیں ڈھونڈ سکتے جو ابھی پانچ منٹ بھی تو نہیں ہوئے میں نے اتار کر رکھی ہے۔ بھئی بڑے......"

اتنے میں آپ کسی جگہ سے بیٹھے بیٹھے اٹھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ شیروانی پر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ اب پکار پکار کر کہہ رہے ہیں: "ارے بھئی رہنے دینا۔ مل گئی شیروانی۔ ڈھونڈ لی ہم نے۔ تم کو تو آنکھوں کے سامنے بیل بھی کھڑا ہو تو نظر نہیں آتا۔"

آدھے گھنٹے تک انگلی بندھتی بندھاتی رہی۔ نیا شیشہ منگوا کر چوکھٹے میں جڑا اور تمام قصے طے کرنے کے پورے دو گھنٹے بعد پھر تصویر ٹانگنے کا مرحلہ درپیش ہوا۔ اوزار آئے، سیڑھی آئی، چوکی آئی۔ شمع لائی گئی۔ چچا جان سیڑھی پر چڑھ رہے ہیں اور گھر بھر (جس میں ماما اور کہاری بھی شامل ہیں) نیم دائرے کی صورت میں امداد دینے کو کیل کانٹے سے لیس کھڑا ہے۔ دو آدمیوں نے سیڑھی پکڑی تو چچا جان نے اس پر قدم رکھا۔ اوپر پہنچے۔

ایک نے کرسی پر چڑھ کر مینیں بڑھائیں۔ ایک قبول کرلی۔ دوسرے نے ہتھوڑا اوپر پہنچایا، سنبھالا ہی تھا کہ میخ ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑی۔ کھسیانی آواز میں بولے "اے لو۔ اب کمبخت میخ چھوٹ کر گر پڑی۔ دیکھنا کہاں گئی؟"

اب جناب سب کے سب گھٹنوں کے بل ٹٹول ٹٹول کر میخ تلاش کر رہے ہیں اور چچا میاں سیڑھی پکڑے مسلسل بڑبڑا رہے ہیں "ملی؟ ارے کمبختو ڈھونڈی؟ اب تک تو میں سو مرتبہ تلاش کر لیتا۔ اب میں رات بھر سیڑھی پکڑا اسو کھا کروں گا۔ نہیں ملتی تو دوسری ہی دے دو اندھو!"

یہ سن کر سب کی جان میں جان آتی ہے تو پہلی میخ ہی مل جاتی ہے۔ اب میخ چچا جان کے ہاتھ میں پہنچاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے اس عرصے میں ہتھوڑا غائب ہو چکا ہے۔

"ہتھوڑا کہاں چلا گیا؟ کہاں رکھا تھا میں نے؟ لاحول ولا قوۃ۔ الّو کی طرح آنکھیں پھاڑ سے میرا منہ کیا تک رہے ہو؟ سات آدمی اور کسی کو معلوم نہیں ہتھوڑا میں نے کہاں رکھ دیا؟"

بڑی مصیبتوں سے ہتھوڑے کا سراغ نکالا اور میخ گڑنے کی نوبت آئی۔ اب آپ یہ بھول بیٹھے ہیں کہ ماپنے کے بعد میخ گاڑنے کو دیوار پر نشان کس جگہ کیا تھا۔ سب باری باری کرسی پر چڑھ کر کوشش کر رہے ہیں کہ شاید نشان نظر آجائے۔ ہر ایک کو الگ الگ نشان دکھائی دیتا ہے۔ چچا سب کو باری باری الّو گدھا کہہ کر کرسی سے اتر جانے کا حکم دے رہے ہیں۔ آخر پھر چھنتی لی اور کونے سے تصویر ٹانگنے کی جگہ کو دوبارہ ماپنا شروع کیا۔ مقابل کی تصویر کونے سے پچیس انچ کے فاصلے پر لگی ہوئی تھی۔ بارہ اور بارہ اور کے انچ اور؟

بچوں کو زبانی حساب کا سوال ملا۔ آواز بلند حل کرنا شروع کیا اور جواب نکالا تو کسی کا کچھ تھا اور کسی کا کچھ۔ ایک نے دوسرے کو غلط بتایا۔ اسی تُو تُو میں میں سب بھول بیٹھے کہ اصل سوال کیا تھا۔ نئے سرے سے ماپ لینے کی ضرورت پڑ گئی۔

اب کے چچا چھنتی سے نہیں ماپتے سُتلی سے ماپنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ سیڑھی پر ۴۵ درجے کا زاویہ بنا کر سُتلی کا سرا کونے تک پہنچانے کی کوشش میں ہیں کہ سُتلی ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے۔ آپ لپک کر اسے پکڑنا چاہتے ہیں کہ اسی کوشش میں زمین پر آ رہتے ہیں۔ کونے میں ستار رکھا تھا اس کے تمام تار چچا جان کے بوجھ سے یک لخت جھنجھنا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔

اب چچا جان کی زبان سے جو منجھے ہوئے الفاظ نکلتے ہیں سننے کے قابل ہوتے ہیں مگر بچی روک دیتی ہیں اور

کہتی ہیں "اپنی عمر کا نہیں تو ان بچوں ہی کا خیال کرو۔"

بہت دشواری کے بعد چچا جان از سرِ نو میخ گاڑنے کی جگہ متعین کرتے ہیں۔ بائیں ہاتھ سے اس جگہ میخ رکھتے ہیں اور دائیں ہاتھ سے ہتھوڑا سنبھالتے ہیں۔ پہلی ہی چوٹ جو پڑتی ہے تو سیدھی ہاتھ کے انگوٹھے پر۔ آپ "سی" کر کے ہتھوڑا چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ نیچے آ کر گرتا ہے کسی کے پاؤں پر۔ ہائے ہائے اور اف اوہ اور مار ڈالا شروع ہو جاتی ہے۔

چچی جل بھن کر کہتی ہیں "یوں میخ گاڑنا ہوا کرے تو مجھے آٹھ روز پہلے خبر دے دیا کیجئے۔ میں بچوں کو لے کر میکے چلی جایا کروں۔ اور نہیں تو!"

چچا نادم ہو کر جواب دیتے ہیں "یہ عورت ذات بھی بات کا بتنگڑ بنا لیتی ہے۔ یعنی ہوا کیا جس پر طعنے دیئے جا رہے ہیں؟ . صاحب کان ہوئے۔ آئندہ ہم کسی کام میں دخل نہ دیا کریں گے۔"

اب نئے سرے سے کوشش شروع ہوئی۔ میخ پر دوسری چوٹ جو پڑی تو اس جگہ کا پلستر نرم تھا پوری کی پوری میخ اور آدھا ہتھوڑا دیوار میں اور چچا اچانک میخ گڑ جانے سے دیوار سے ٹکرائے۔ اگر ناک غیرت والی ہوتی تو پچک کر رہ جاتی۔

اس کے بعد از سرِ نو حیتی اور رسی تلاش کی گئی اور میخ گاڑنے کی نئی جگہ مقرر ہوئی اور کوئی آدھی رات کا عمل ہو گا کہ خدا خدا کر کے تصویر ٹنگی۔ وہ بھی کیسی! ٹیڑھی بینگی اور اتنی جھکی ہوئی کہ جیسے اب سر پر آئی کہ اب سر پر آئی۔ چاروں طرف گز گز بھر دیوار کی یہ حالت تھی گویا چاند ماری ہو رہی ہے۔ چچا کے سوا باقی سب تھکن سے چور نیند میں جھوم رہے ہیں۔ اب آخری سیڑھی پر سے دھم سے اترتے ہیں تو کہاری غریب کے پاؤں پر پاؤں۔ غریب کے ڈیل تھی تڑپ ہی تو اٹھی۔ چچا اس کی چیخ سن کر ذرا سراسیمہ تو ہوئے مگر پل بھر میں داڑھی پر ہاتھ پھیر کر بولے "اتنی سی بات تھی لگ بھی گئی۔ لوگ اس کے لئے مستری بلوایا کرتے ہیں۔"

قصہ پہلے درویش کا

اے۔ حمید

پہلے درویش نے دوسرے درویش کی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سگریٹ سلگایا اور اپنے قصے کی ابتدا غالب کے اس شعر سے کی کہ ؎

اچھے عیسیٰ ہو مریضوں کا خیال اچھا ہے
وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

تینوں درویش اس شعر پر عش عش کرتے ہوئے اٹھے اور پہلے درویش کا سر دھننے لگا۔ پہلے درویش کی پگڑی کھل گئی۔ اس نے پگڑی باندھتے ہوئے آنکھوں میں آنسو لا کر کہا۔

"بھائیو! اس غلام کمترین کی داستان بڑی المناک ہے اس قدر المناک کہ رسالہ "شام سویرا" کے ایڈیٹر نے اسے محض اس لئے چھاپنے سے انکار کر دیا تھا کہ اسے پڑھ کر کاتب کے آنسو نہیں تھمتے تھے۔ میری داستان عزیب حمزہ ایک ایسے شہر کے ریلوے اسٹیشن سے شروع ہوتی ہے جو ہم سے تھوڑی دور ہمارے اردگرد پھیلا ہوا ہے۔ میں پہلی مرتبہ اس شہر میں وارد ہوا تو شریف آدمیوں کے لباس میں ملبوس تھا۔ چنانچہ اسٹیشن پر ہی پکڑ لیا گیا اور جیل خانے میں ڈال دیا گیا۔ دوسری مرتبہ میں گرہ کٹ کے بھیس میں نمودار ہوا تو ریلوے اسٹیشن پر خوب آؤ بھگت اور جاؤ بھگت ہوئی۔ لوگوں نے فرط محبت سے میرے گلے میں اتنے ہار ڈالے کہ میرا چہرہ ان میں چھپ گیا اور جب میرا چہرہ چھپ گیا تو ایک آدمی نے فرط محبت عقیدت سے مجبور ہو کر میری دونوں جیبیں کاٹیں اور ان میں سے ہوٹلوں کے بل نکال کر لے گیا۔ ایک اور آدمی ہجوم کو چیرتا ہوا میری طرف بڑھا۔ قریب آ کر اس نے اپنے رومال سے میری داہنی مونچھ جھاڑی اور اس پر ایک بوسہ دیا اور جیب سے سموسہ نکال کر کھانے لگا۔ میں نے پوچھا۔

"ار بھائی یہ بوسہ اور سموسہ کیا ہوا؟"

اس پر وہ مرد ید نگام لیکن خوش کلام یوں بولا۔

"وہی جو طنزہ اور نشتر طنزہ ہوتا ہے۔"

میں دماغ ہی دماغ میں اس آدمی کی عقل پر دنگ رہ گیا۔ اتنے میں لوگ مجھے دھکیلتے ہوئے اسٹیشن سے باہر لے آئے۔ باہر آکر ان میں سے ہر ایک نے مجھ سے باری باری مصافحہ کیا اور میرے گلے سے اپنا اپنا ہار اتار کر چلتے بنے۔ ابھی ابھی ایک تانگہ میرے قریب سے گزرا جسے دیکھ کر میرے کندھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس لئے کہ اس کی پچھلی سیٹ پر ایک لمبے منہ والا گھوڑا حاجیوں والا زرد رومال سر پر باندھے، عینک لگائے اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ یا الہیٰ مٹ نہ جائے درد دل —— یہ میں کون سے شہر میں آگیا ہوں۔

خیر تو میں سر جھا جو! میں وہاں سے ایک بازار کی جانب چل پڑا۔ ایک جگہ مجھے کچھ بھیڑ نظر آئی۔ پاس جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کتا زمین پر نیم جاں سا لیٹا ہے اور اس کی ٹانگ میں سے خون بہہ رہا ہے۔ پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ اسے ایک آدمی نے کاٹ کھایا ہے۔ قریب تین چار کتے کھڑے تھے۔ ایک کتے نے کان میں انگلی پھیرتے ہوئے دوسرے کتے سے کہا

"اسے فوراً ٹیکے لگوانے چاہئیں۔"

اتنا سن کر میں پیچھے سے ایک طرف کھسک گیا کیونکہ میرے آس پاس بہت آدمی کھڑے تھے۔

جس بازار سے میں گزر رہا تھا وہ کافی بارونق تھا۔ دونوں طرف کی دکانیں خوبصورت اور آراستہ پیراستہ تھیں چونکہ رمضان شریف کا مہینہ تھا اس لئے لوگ جوق در جوق ریستورانوں میں داخل ہو رہے تھے۔ ایک بہت بڑے ریستوران سے دروازے پر چھوٹا سا بورڈ ٹنگ رہا تھا جس پر جلی حروف میں لکھا تھا۔

"یہ ہوٹل رمضان شریف کے احترام میں بند ہے۔

نوٹ: کھانا کھانے کے لئے پچھلی گلی سے تشریف لائیں۔"

میں ابھی بورڈ پڑھ ہی رہا تھا کہ نزدیکی دکان میں سے دو ننگ دھڑنگ آدمی بھاگتے ہوئے نکلے اور سامنے والی گلی میں گم ہو گئے۔ میں نے غور سے دیکھا تو دکان کی پیشانی پر سرخ الفاظ میں لکھا تھا۔

"یہاں بھاگتے چوروں کی لنگوٹیاں بکتی ہیں۔"

میں وہاں سے بھاگنے ہی لگا تھا کہ اچانک مجھے اپنی "لنگوٹی" کا خیال آگیا اور میں پہلے سے بھی زیادہ آہستگی سے چلنے لگا۔ کچھ دور چلنے پر میں نے دیکھا کہ وہ دو آدمی کسی بات پر بڑی گرماگرمی سے جھگڑا کر رہے تھے۔ ایک آدمی دوسرے سے کہنے لگا۔

"میں تمہاری اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔"

دوسرے آدمی نے بڑی لاپرواہی سے کہا۔

"دیکھ لوں گا جب تم اینٹ سے اینٹ بجاؤ گے!"

اس پر پہلے آدمی نے آگے بڑھ کر سڑک پر سے دو اینٹیں اٹھائیں اور ہاتھوں میں لے کر آہستہ آہستہ بجانے لگا۔ اس کے بعد اس نے اپنے ہاتھ جھاڑے اور ایک طرف چل پڑا۔ بس پھر کیا تھا دوسرے لوگ ہاتھ جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گئے۔ اسی ہجوم میں اچانک ایک کم سن لڑکا ایک بزرگ صورت آدمی کو کان سے پکڑ کر کھینچتا ہوا نکال لایا اور آنکھیں لال کرتے ہوئے گرجا۔

"ابا جان میں نے آپ سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ دوپہر کے وقت گھر سے باہر نہ نکلا کریں مگر آپ سنی ان سنی کر دیتے ہیں۔"

اس بزرگ صورت آدمی نے منہ لٹکا کر اور کانپتے ہوئے کہا۔

"بیٹا جان! میں تو زمیندار اخبار لینے آیا تھا۔"

لڑکے نے کان چھوڑ کر اپنی قمیض کا کالر ٹھیک کیا اور کہا۔

"اب سیدھے گھر جائیے اور اسکول کا سبق یاد کیجیے ——— مائی گڈنس! کیسے والدین سے سابقہ پڑا ہے!"

میرے ہم شکل اور میرے ہم عقل بھائیو! میں بھائیوں کی دکان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں ششدر ہو کر رہ گیا اور وہاں سے جلدی جلدی بھاگ نکلا۔ آگے بڑے چوک کے وسط میں ایک خوبصورت فوارہ لگا تھا جس سے پانی ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر باہر اُبل رہا تھا۔ فوارے کے نیچے ایک پرندہ بیٹھا تھا جو اپنے بدن پر پانی نہیں پڑنے دیتا تھا۔ اس کے اوپر ایک اور پرندہ درخت کی شاخ پر بیٹھا تھا اور وہ پلڑوں میں ڈالے انہیں تول رہا تھا۔ فوارے کی داہنی جانب میں نے سبز سبز گھاس پر ایک بڑے ہی پیارے اور معصوم صورت گڈے سے بچے کو دیکھا جو چھوٹے چھوٹے کھلونوں سے کھیل رہا تھا اور خود بخود ہنس رہا تھا۔ بچہ مجھے اس قدر پیارا لگا کہ میں، جو کبھی بچوں کو پیار نہیں کرتا اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے بڑی محبت سے اس کی ٹھوڑی کو انگلی سے چھوتے ہوئے کہا۔

"ہیلو بے بی! ہیلو سویٹ بے بی! او ہیلو کڈی بسکٹ کھاؤ گے؟"

بچے نے اچانک کھلونے ہاتھ سے رکھ دیئے۔ نیکر کی جیب سے لائبریری فریم والی عینک نکال کر آنکھوں پر لگائی اور مجھے گھورتے ہوئے بھاری آواز میں بولا۔

"مسٹر! مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کرو!"

اے اللہ کے درویشو! اتنا سننا تھا کہ میری پگڑی اچھل کر مجھ سے دور جا گری۔ جب میں وہاں سے بھاگنے لگا تو پیچھے سے ٹھنڈی آہ بھر کر یہ شعر پڑھا۔ ؎

کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
میں خود "لایا" نہیں "آیا" گیا ہوں

میرے حواس ابھی اپنے ٹھکانے پر نہیں آئے تھے۔ میں انہیں ٹھکانے پر لانے کے لئے ایک بنچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ جب میرے حواس مکمل طور پر جمع ہو گئے تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے پاس ہی دستار اور عبا پوش ایک بوڑھے بزرگ تشریف فرما ہیں اور کچھ پڑھ رہے ہیں۔ ان کا منہ کتاب نے ڈھانپ رکھا تھا۔ میں نے سوچا کہ چلو ان سے ذرا دو دو باتیں ہی کر لیں۔ میں نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں صاحب آج موسم کیسا ہے؟"

دوسری طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ میں نے کان صاف کرتے ہوئے اپنا سوال پھر دہرایا۔ جواب میں حسب سابق خاموشی طاری رہی۔ میرے تیسری مرتبہ استفسار کرنے پر وہ بزرگ کتاب پرے ہٹا کر مجھے قہر بھری نگاہوں سے گھورنے لگے۔ انہیں دیکھ کر میرے۔ بنچ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی کیونکہ وہ بزرگ منہ میں چوسنی لئے جلدی جلدی شہد چوس رہے تھے۔ میں وہاں سے سر پر جوتے رکھ کر بھاگا اور شہر کی سب سے بڑی سڑک پر آ کر دم لیا۔ لیکن یہاں آ کر ایک عجیب ہی تماشا دیکھا۔ چوک میں ٹریفک کا سپاہی بے شمار سائیکل سواروں کے درمیان کھڑا اُن کا چالان کر رہا تھا۔ اگرچہ دھوپ کافی روشن تھی۔ پھر بھی ان لوگوں کا محض اس لئے چالان ہو رہا تھا کہ وہ صبح کے وقت بغیر بتی کے سائیکل چلا رہے تھے۔ ایک کوچوان میری پگڑی دیکھ کر تانگہ میرے پاس لا کر بولا۔

"داتا کے دربار چلیئے گا جناب؟"

میرے انکار پر کوچوان نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

"سرکار چٹک جھپکنے میں پہنچا دوں گا۔ پندرہ ہارس پاور کا گھوڑا ہے۔"

میں نے ڈر کر گھوڑے کی طرف دیکھا۔ گھوڑے نے گردن گھما کر مجھے دیکھا اور ناک چڑھا کر بولا۔

"جھوٹ بکتا ہے۔ میں صرف ایک ہارس پاور ہوں۔"

جوں جوں شام ہو رہی تھی میرے دردیش بھائیو! میرے دل کو یہ فکر دامن گیر تھا کہ رات کہاں گزاری جائے

گھومتے گھومتے میں شہر کی چار دیواری میں آ گیا۔ یہاں ایک جگہ قوالی ہو رہی تھی۔ طبلے بج رہے تھے اور قوال جھوم جھوم کر یہ دوہا بار بار پڑھ رہے تھے ۔

اک ماجرا سناتا ہوں میں حسن و عشق کا
"لیلیٰ" کا ایک عاشق دیوانہ قیس تھا
بعدِ فنا تھے دونوں کے مرقد جدا جدا
لیکن وہ دونوں قبروں سے آتی تھی یہ صدا

کیا؟

تیرے مکھڑے تے کالا کالا تِل وے

وے منڈیا سیالکوٹیا!

پہلے قوال اٹھے تو ایک اور قوال صاحب تشریف لائے جو ٹیلر ماسٹر تھے۔ انہوں نے بیٹھتے ہی گانا شروع کر دیا

میں نے لاکھوں کے کوٹ سیے ستمگر تیرے لئے

اس پہلے ہی مصرعے سے لوگ اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اٹھ کر ناچنا شروع کر دیا اور اپنے اپنے کوٹ پھاڑ ڈالے۔ درزی قوال کے شاگرد فوراً آگے بڑھے اور آن کی آن میں سارے کوٹ جمع کر کے لے گئے۔ میں نے اپنے کوٹ کے بٹن بند کئے اور آگے چل پڑا۔

اے میرے پیارے چوتھے درویش! اس سے پیشتر کہ میں کہانی کا آخری حصہ بیان کروں، تو اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب میں اپنا داہنا ہاتھ ڈال کر بنگلے کا ایک سگریٹ نکال کر مجھے پلا تاکہ میرے حواسِ باطنہ حواسِ خمسہ سے لطف اندوز ہوں۔

اس پر چوتھے درویش نے رونی صورت بناتے ہوئے بنگلے کا سگریٹ نکالا اور پہلے درویش کو دیا۔

بنگلے کے سگریٹ کا کش کھینچ کر پہلا درویش ایک ٹانگ پر کھڑا ہو گیا اور اپنی داستان بیان کرنے لگا

"بھائیو! شام ہو چکی تھی۔ میں نے کہیں سے سُن رکھا تھا کہ اس شہر میں شام کے وقت خوشحال لوگ دسترخوان پر کھانا چن کر مہمانوں کی تلاش میں گلیوں میں چکر لگایا کرتے ہیں، چنانچہ اسی امید میں، میں بھی گلیوں میں گھومنے لگا۔ ایک گلی کا موڑ مڑتے ہوئے اچانک کسی نے میرے منہ میں کپڑا ٹھونسا اور دو آدمی مجھے اٹھا کر کسی پُراسرار ہوٹل میں لے گئے۔ مجھے کرسی پر بٹھلا کر ایک نے پستول نکال کر باہر رکھ دیا اور باقی دونوں آدمی کرسیاں کھینچ کر میز کے گرد بیٹھ گئے۔ ایک نے کہا۔

"ہمیں کھانا کھلا دیا ہماری گولیاں ٹھنڈی کر دو"

میں سناٹے میں آگیا۔ انہوں نے اس دوران میں طرح طرح کے کھانوں کا آرڈر دیا اور کھا پی کر بل میرے حوالے کر کے چلتے بنے۔ میں نے اٹھتے ہوئے بل ہوٹل کے منیجر کے حوالے کر دیا اور ہوٹل کے منیجر نے مجھے حوالۂ پولیس کر دیا اور پولیس مجھے حوالات میں لے گئی۔ اتفاق دیکھئے کہ اچانک مجھے خیال آیا کہ میرے کلاہ میں ایک قیمتی پتھر جڑا ہوا ہے۔ اسے بیچ کر میں نے جوہری سے ساڑھے گیارہ روپے وصول کئے۔ پانچ روپے حوالات کے داروغے کو دیئے، دو روپے ان لوگوں کا بل ادا کیا جو میزبان کی تلاش میں رات کو گلیوں میں گھوما کرتے ہیں اور باقی پیسے جیب میں ڈال کر پاک ٹی ہاؤس میں جا بیٹھا اور چائے پینے لگا۔

میرے بالکل سامنے ایک لمبے ناک والا آدمی پلیٹ میں برف ڈالے اس کے ساتھ روٹی کھا رہا تھا۔ ایک اور آئس کریم میں کھیرے کے ٹکڑے ڈال کر نوش جان کر رہا تھا۔ بچی ہوئی آئس کریم اس نے اپنے جوتے میں ڈالی، بوٹ کے تسمے کھول کر روپے کا نوٹ نکالا۔ بل پر دستخط کئے اور ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ ایک نوجوان لڑکا چائے کی پیالی سامنے زار زار رو رہا تھا اور بار بار ایش ٹرے اٹھا کر اس میں آنسوؤں کے قطرے گرا رہا تھا۔ سگریٹ ابھی ختم بھی نہ ہوا تھا اس نے اسے چائے کے پیالے میں ڈال کر بجھایا۔ ادھر اُدھر دیکھ کر ایش ٹرے جیب میں ڈال کر ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ جہاں وہ بیٹھا تھا اس کے عین اوپر لکھا تھا۔

"براہِ مہربانی سگریٹ پیالوں میں مت بجھایئے اور اگر آپ
ایسا کرنے پر مجبور ہیں تو بیرے کو کہیئے کہ چائے ایش ٹرے میں لائے"

میں اٹھنے ہی والا تھا کہ دو گنجے سروں والے بقراط ٹائپ آدمی اندر آئے۔ بڑی احتیاط سے میز کے گرد بیٹھ کر پلیٹ بکری کے مغز کا آرڈر دیا اور جب مغز آیا تو بڑی خاموشی سے مغز کھانے لگے۔ اس ہوٹل سے باہر نکل کر میں نے کہاں جاؤں؟ کدھر جاؤں؟ وہ ادیب میرے پاس سے گاتے ہوئے گزر گئے۔

من کا پنچھی بول اٹھا ہے۔

بول بھئی تیری جیب میں کیا ہے؟ ——— جیب میں کیا ہے؟

میری جیب کی بات نہ پوچھو

ہائے کوئی پیسہ نہیں

اب میرے سامنے کوئی منزل مقصود نہ تھی۔ چنانچہ میں نے یونہی بے مقصد گھومنا شروع کر دیا۔ مصری شاہ ؟

باہر نکلا ہی تھا کہ مجھے دو پولیس کے سپاہیوں نے روک لیا۔

"کون ہو تم؟"

میں نے کہا

"پہلا درویش!"

میرا اتنا ہی جواب سن کر وہ مجھے پکڑ کر تھانے لے گئے اور آوارہ گردی کے جرم میں مجھے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ اس حوالات میں میری ملاقات ایک ایسے آدمی سے ہوئی جو قتل کے جرم میں وہاں رات بھر کے لئے رکھا گیا تھا۔ اس کے خلاف الزام یہ تھا کہ اس نے ایک آدمی سے نیکی کی تھی اور پھر اس آدمی کو دریا میں ڈال دیا تھا۔

رات بھر میں اس آدمی سے ڈر کر ایک کونے میں دبکا بیٹھا رہا اور وہ آدمی چیخ چیخ کر پکارتا رہا۔

"نیکی کر دریا میں ڈال!"

خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور پولیس والوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ باہر نکل کر میں کیا دیکھتا ہوں کہ میرے پیچھے دُم نکل آئی ہے میں نے جلدی سے اسے دبایا اور اسٹیشن کی طرف بھاگ اٹھا۔ کہیں گانا ہو رہا تھا۔

میری گٹھڑی کو لاگا چور

مسافر بھاگ ذرا

....

اور اے میرے درویش بھائیو! اب میں نے اس تکیے میں آکر دم لیا ہے اور انشاء اللہ اسی جگہ دم دوں گا۔"

یہ قصہ سن کر دو درویش تو ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے اور تیسرے درویش نے اچھل کر کہا۔

"بھائی! خدا کے لئے مجھے یہ قصہ قلمبند کر دے۔ میں نیا نیا اخبار کا ایڈیٹر ہوا ہوں۔"

ہونا قریب الاختتام پہلے درویش کے قصے کا۔

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

پطرس بخاری

گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف دوڑتا ہے، ہماری جو شامت آئی تو ایک دن اپنے پڑوسی لالہ کرپا شنکر جی برہم چاری سے برسبیل تذکرہ کہہ بیٹھے کہ "لالہ جی! امتحان کے دن قریب آتے جاتے ہیں، آپ سحر خیز ہیں ذرا ہمیں بھی جگا دیا کیجیے۔"

وہ حضرت بھی، معلوم ہوتا ہے نفلوں کے بھوکے بیٹھے تھے، دوسرے دن اٹھتے ہی انہوں نے ایشور کا نام لے کر ہمارے دروازے پر مکا بازی شروع کر دی۔ کچھ دیر تک تو ہم سمجھے کہ عالم خواب ہے، ابھی سے کیا فکر جاگیں گے تو لاحول پڑھ لیں گے۔ لیکن یہ گولہ باری لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی گئی اور کمرے کی چوبی دیواریں لرزنے لگیں صراحی پر رکھا ہوا گلاس جل ترنگ کی طرح بجنے لگا اور دیوار پر لٹکا ہوا کلنڈر پنڈولم کی طرح ہلنے لگا تو بیداری کا قائل ہونا ہی پڑا۔ مگر اب دروازہ ہے کہ لگاتار کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔ میں کیا میرے آباء اجداد کی روحیں اور میری قسمت خوابیدہ تک جاگ اٹھی ہو گی۔ آوازیں دیتا ہوں....... اچھا!...... اچھا!....... تھینک یو.... جاگ گیا ہوں........ بہت اچھا! نوازش ہے! آں جناب ہیں کہ سنتے ہی نہیں۔ خدایا کس آفت کا سامنا ہے۔ یہ سوتے کو جگا رہے ہیں یا مردے کو جلا رہے ہیں اور حضرت عیسیٰ بھی تو بس واجبی طور پر ہلکی سی آواز میں "قم" کہہ دیا کرتے ہوں گے۔ زندہ ہو گیا تو ہو گیا نہیں تو چھوڑ دیا۔ کوئی مردے کے پیچھے لٹھ لے کے پڑ جایا کرتے تھے۔ توپیں تھوڑی داغا کرتے تھے۔ یہ تو ہم سے بھلا کیسے ہو سکتا تھا کہ اٹھ کر دروازے کی چٹخنی کھول دیتے۔ پیشتر اس کے کہ بستر سے باہر نکلیں، دل کو جس قدر سمجھانا بجھانا پڑتا ہے، اس کا اندازہ کچھ اہلِ ذوق ہی لگا سکتے ہیں۔ آخر کار جب لیمپ جلایا اور ان کو باہر سے روشنی نظر آئی تو طوفان تھما۔

اب جو ہم کھڑکی میں سے آسمان کو دیکھتے ہیں تو جناب ستارے ہیں کہ جگمگا رہے ہیں! سوچا کہ آج پتا چلائیں گے یہ سورج آخر کس طرح نکلتا ہے لیکن جب گھوم گھوم کر کھڑکی میں سے اور روشندان میں سے چاروں

طرف دیکھا اور بزرگوں سے صبح کاذب کی جتنی نشانیاں سنی تھیں ان میں سے ایک بھی کہیں نظر نہ آئی تو فکر سا لگ گیا کہ آج کہیں سورج گرہن نہ ہو۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو پڑوسی کو آواز دی۔ "لالہ جی! ...... لالہ جی!"

جواب آیا "ہوں"

میں نے کہا "آج یہ کیا بات ہے کچھ اندھیرا اندھیرا سا ہے؟"

"تو اور کیا تین بجے ہی سورج نکل آئے۔"

تین بجے کا نام سن کر ہوش گم ہو گئے۔ چونک کر پوچھا "کیا کہا تم نے، تین بجے ہیں؟"

کہنے لگے "تین...... تو ...... نہیں ...... کچھ سات ساڑھے سات ...... منٹ اوپر تین ہیں۔"

میں نے کہا "ارے کم بخت، خدائی فوجدار، بدتمیز کہیں کے۔ میں نے تجھ سے یہ کہا تھا کہ صبح جگا دینا یا یہ کہا تھا کہ سرے سے سونے ہی نہ دینا۔ تین بجے جاگنا بھی کوئی شرافت ہے۔ ہمیں تو نے کوئی ریلوے گارڈ سمجھ رکھا ہے۔ تین بجے ہم اٹھا کرتے تو اس وقت والد جان کے منظورِ نظر نہ ہوتے۔ ارے احمق کہیں کے! تین بجے اٹھ کے ہم زندہ رہ سکتے ہیں۔ امیرزادے ہیں کوئی مذاق ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔"

دل تو چاہتا تھا کہ عدم تشدد و تشدد کو خیرباد کہہ دوں لیکن پھر خیال آیا کہ بنی نوع انسان کی اصلاح کا ٹھیکا کوئی ہمیں نے لے رکھا ہے۔ ہمیں اپنے کام سے غرض۔ لیمپ بجھایا اور بڑبڑاتے ہوئے پھر سو گئے

اور پھر حسب معمول نہایت اطمینان کے ساتھ بھلے آدمیوں کی طرح اپنے دس بجے اٹھے۔ بارہ بجے تک منہ ہاتھ دھویا اور چار بجے چائے پی کر ٹھنڈی سڑک کی سیر کو نکل گئے۔

شام کو واپس ہوسٹل میں وارد ہوئے۔ جوشِ شباب تو ہے ہی اس پر شام کا رومان انگیز وقت، ہوا بھی نہایت لطیف تھی۔ طبیعت بھی ذرا مچلی ہوئی تھی۔ ہم ذرا ترنگ میں گاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔

ع بلائیں زلفِ جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے

کہ اتنے میں پڑوسی کی آواز آئی "مسٹر!"

ہم اس وقت ذرا چٹکی بجانے لگے تھے۔ بس انگلیاں وہیں پر رک گئیں اور کان آواز کی طرف لگ گئے۔

ارشاد ہوا۔

"یہ آپ گا رہے ہیں؟" (زور "آپ" پر)

میں نے کہا "اجی میں کس لائق ہوں لیکن خیر فرمائیے؟" بولے "ذرا...... وہ میں...... میں ڈسٹرب ہوتا ہوں"

بس صاحب ہم میں جو موسیقیت کی روح پیدا ہوئی تھی۔ فوراً مر گئی۔ دل نے کہا "او نابکار انسان دیکھ! پڑھنے والے یوں پڑھتے ہیں۔" صاحب خدا کے حضور میں گڑگڑا کر دعا مانگی کہ "خدایا ہم بھی اب باقاعدہ مطالعہ شروع کرنے والے ہیں۔ ہماری مدد کر اور ہمیں ہمت دے۔"

آنسو پونچھ کر اور دل مضبوط کر کے میز کے سامنے بیٹھے۔ دانت بھینچ لئے، نکٹائی کھول دی، آستینیں چڑھا لیں لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کریں کیا؟ سامنے سرخ، سبز، زرد سبھی قسم کی کتابوں کا انبار لگا تھا۔ اب ان میں سے کون سی پڑھیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ پہلے کتابوں کو ترتیب سے میز پر لگا دیں کہ باقاعدہ مطالعے کی پہلی منزل یہی ہے۔ بڑی تقطیع کی کتابوں کو علیحدہ رکھ دیا۔ چھوٹی تقطیع کی کتابوں کو سائز کے مطابق الگ قطار میں کھڑا کر دیا۔ ایک نوٹ پیپر پر ہر ایک کتاب کے صفحوں کی تعداد کو دنوں کی تعداد پر تقسیم کیا۔ ساڑھے پانسو جواب آیا۔ لیکن اضطراب کی کیا مجال جو چہرے پر ظاہر ہونے پائے۔ دل میں کچھ تھوڑا سا پچھتائے کہ صبح تین بجے ہی کیوں نہ اٹھ بیٹھے لیکن کم خوابی کے طبی پہلو پر غور کیا تو فوراً اپنے آپ کو ملامت کی۔ آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ تین بجے اٹھنا تو لغویات ہے۔ البتہ پانچ چھ سات بجے کے قریب اٹھنا نہایت معقول ہوگا۔ صحت بھی قائم رہے گی اور امتحان کی تیاری بھی باقاعدہ ہوگی۔ ہم خرما و ہم ثواب۔

یہ تو ہم جانتے ہیں کہ سویرے اٹھنا ہو تو جلدی ہی سو جانا چاہئیے۔ کھانا باہر ہی سے کھا آئے تھے۔ بستر میں داخل ہو گئے۔

چلتے چلتے خیال آیا کہ لالہ جی سے جگانے کے لئے کہہ ہی نہ دیں! یوں ہماری اپنی قوت ارادی کافی زبردست ہے۔ جب چاہیں اٹھ سکتے ہیں لیکن پھر بھی کیا حرج ہے؟ ڈرتے ڈرتے آواز دی۔ "لالہ جی!"

انہوں نے پتھر کھینچ مارا۔ "یس"

ہم اور بھی سہم گئے کہ لالہ جی کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ تتلا کے درخواست کی کہ "لالہ جی! صبح آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ کل اگر ذرا مجھے چھ بجے یعنی جس وقت چھ بجیں ....

جواب ندارد۔

میں نے پھر کہا جب چھ بج چکیں تو ... سنا آپ نے؟ چپ

"لالہ جی!"

سڑکتی ہوئی آواز نے جواب دیا۔ "سن لیا۔ سن لیا۔ چھ بجے جگا دوں گا۔ تھری گاما پلس فور ایلفا پلس ...."

ہم نے کہا "ب۔ب۔ب بہت اچھا۔ یہ بات ہے۔"

توبہ خدا کسی کا محتاج نہ کرے۔

لالہ جی آدمی بہت شریف ہیں۔ اپنے وعدے کے مطابق دوسرے دن صبح چھ بجے انہوں نے دروازے پر دستک کی بارش شروع کر دی۔ ان کا جگانا تو محض ایک سہارا تھا ہم خود ہی انتظار میں تھے کہ یہ خواب ختم ہو اور ہم جاگتے ہیں۔ وہ نہ جگاتے تو میں خود ایک دو منٹ بعد آنکھیں کھول دیتا۔ بہر صورت جیسا کہ میرا فرض تھا، میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے اسے شکل میں قبول کیا کہ گولہ باری بند کر دی۔

اس کے بعد کے واقعات ذرا بحث طلب سے ہیں اور ان کے متعلق روایات میں کسی قدر اختلاف ہے۔ اس بات کا تو مجھے یقین ہے اور میں قسم بھی کھا سکتا ہوں کہ آنکھیں میں نے کھول دی تھیں۔ پھر یہ بھی یاد ہے کہ اٹھنے سے پیشتر دیباچے کے طور پر ایک آدھ کروٹ بھی لی۔ پھر کا نہیں پتا۔ شاید لحاف اوپر سے اتار دیا شاید اور میں لپیٹ دیا۔ یا شاید کھانسا کہ خدا جانے ہم پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے تھے۔ انہیں ہمارا خیال ہے ہم پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے ہوں۔ بہر صورت یہ نفسیات کا مسئلہ ہے جس میں نہ آپ ماہر ہیں نہ میں۔ کیا پتا لالہ جی نے جگایا ہی دس بجے ہو یا اس دن چھ دیر میں بجے ہوں۔ خدا کے کاموں میں ہم آپ کیا دخل دے سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے دل میں دن بھر یہ خبہ رہا کہ قصور کچھ اپنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ جناب شرافت ملاحظہ ہو کہ اس شبے کی بنا پر صبح سے شام تک ضمیر کی ملامت سنتا رہا۔ اور اپنے آپ کو کوستا رہا مگر لالہ جی سے ہنس ہنس کر باتیں کیں۔ ان کا شکریہ ادا کیا اور اس خیال سے کہ ان کی دل شکنی نہ ہو حد درجے کی طمانیت کا اظہار کیا کہ آپ کی نوازش سے میں نے صبح کا سہانا اور روح افزا وقت بہت اچھی طرح صرف کیا ورنہ اور دنوں کی طرح آج بھی دس بجے اٹھتا۔ لالہ جی صبح کے وقت دماغ کیا صاف ہوتا ہے۔ جو پڑھو خدا کی قسم فوراً یاد ہو جاتا ہے۔ بھئی خدا نے صبح بھی کیا عجیب چیز پیدا کی ہے۔ یعنی اگر صبح کی بجائے شام ہوا کرتی تو دن کیا بری طرح کٹا کرتا۔

لالہ جی نے ہماری اس جادو بیانی کی داد یوں دی کہ آپ پوچھنے لگے "تو میں آپ کو چھ بجے جگا دیا کروں؟"

میں نے کہا "ہاں ہاں واہ! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ بے شک۔"

شام کے وقت آنے والی صبح کے مطالعہ کے لئے دو کتابیں چھانٹ کر میز پر علیحدہ جوڑ دیں۔ کرسی کو چارپائی کے قریب سرکا لیا اور کوٹ اور گلوبند کو کرسی کی پشت پر آویزاں کر دیا۔ کنٹوپ اور دستانے پاس ہی رکھ لئے۔ دیا سلائی

کو تکیے کے نیچے ٹٹولا۔ تین دفعہ آیۃ الکرسی پڑھی اور دل میں نہایت ہی نیک منصوبے باندھ کر سو گیا۔ صبح لالہ جی کی پہلی دستک کے ساتھ ہی جھٹ آنکھ کھل گئی۔ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ لحاف کی ایک کھڑکی میں سے ان کو گڈ مارننگ کیا اور نہایت بیدارانہ لہجے میں کھانسا۔ لالہ جی مطمئن ہو کر چلے گئے۔

ہم نے اپنی ہمت اور اولوالعزمی کو بہت سراہا کہ آج ہم فوراً ہی جاگ اٹھے۔ دل سے کہا "دل بھیا صبح اٹھنا تو محض ذرا سی بات ہے۔ ہم یوں ہی اس سے ڈرا کرتے تھے۔" دل نے کہا "اور کیا تمہارے تو یوں ہی اوسان خطا ہو جایا کرتے ہیں۔" ہم نے کہا "سچ کہتے ہو یار! یعنی اگر ہم سستی اور کسالت کو خود اپنے قریب نہ آنے دیں تو ان کی کیا مجال ہے کہ ہماری باقاعدگی میں خلل انداز ہوں۔ اس وقت اس لاہور شہر میں ہزاروں کاہل لوگ ہوں گے جو دنیا و مافیہا سے بے خبر نیند کے مزے اڑاتے ہوں گے اور ایک ہم ہیں کہ ادائے فرض کی خاطر نہایت شگفتہ طبعی اور غنچہ دہنی سے جاگ رہے ہیں۔ بھئی کیا برخوردار سعادت آثار واقع ہوئے ہیں۔" ناک کو سردی سی محسوس ہونے لگی تو اسے ذرا یوں ہی سا لحاف کی اوٹ میں کر لیا اور پھر سوچنے لگے......

خوب! تو ہم آج کیا وقت پر جاگے ہیں۔ بس ذرا اس کی عادت ہو جائے تو باقاعدہ قرآن مجید کی تلاوت اور فجر کی نماز بھی شروع کر دیں گے۔ آخر مذہب سب سے مقدم ہے۔ ہم بھی کیا روز بروز الحاد کی طرف مائل ہوتے جاتے ہیں۔ نہ خدا کا ڈر، نہ رسول کا خوف۔ سمجھتے ہیں کہ بس اپنی محنت سے امتحان پاس کر لیں گے۔ اکبر بیچارا یہی کہتا کہتا مر گیا لیکن ہمارے کان پر جوں تک نہ چلی...... (لحاف کانوں پر سرک آیا)...... تو گویا آج ہم اور لوگوں سے پہلے جاگے ہیں...... بہت ہی پہلے...... یعنی کالج شروع ہونے سے بھی چار گھنٹے پہلے...... کیا بات ہے! خداوندان کالج بھی کس قدر سست ہیں! ہر ایک مستعد انسان کو چھ بجے تک قطعی جاگ اٹھنا چاہیے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کالج سات بجے کیوں نہ شروع ہوا کرے......

(لحاف سر پر)...... بات یہ ہے کہ تہذیب جدید ہماری تمام اعلیٰ قوتوں کی بیخ کنی کر رہی ہے۔ عیش پسندی روز بروز بڑھتی جاتی ہے...... (آنکھیں بند)...... تو اب چھ بجے ہیں۔ تو گویا تین گھنٹے تو متواتر مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ پہلے کون سی کتاب پڑھیں۔ شیکسپیئر یا ورڈزورتھ۔ میں جانوں، شیکسپیئر بہتر ہوگا۔ اس کی عظیم الشان تصانیف میں خدا کی عظمت کے آثار دکھائی دیتے ہیں اور صبح کے وقت اللہ میاں کی یاد سے بہتر چیز کیا ہو سکتی ہے؟ پھر خیال آیا کہ دن کو جذبات کے محشرستان سے شروع کرنا ٹھیک فلسفہ نہیں۔ ورڈزورتھ پڑھیں۔ اس کے اوراق میں فطرت کو سکون و اطمینان میسر ہوگا اور دل اور دماغ پھر

کی خاموشی دل آویزیوں سے ہلکے ہلکے لطف اندوز ہوں گے...... لیکن شیکسپیر...... نہیں: ورڈز ورتھ ہی ٹھیک رہے گا...... شیکسپیر...... ہیملٹ...... لیکن ورڈز ورتھ...... لیڈی میکبتھ...... دیوانگی...... سبزہ زار...... سبزہ زار...... سنجر سنجر باد بہاری...... صید زبوں...... کشمیر...... میں آفت کا پرکالہ ہوں۔

یہ معمہ اب مابعد الطبیعیات ہی سے تعلق رکھتا ہے کہ پھر جو ہم نے لحاف سے سر باہر نکالا اور ورڈز ورتھ پڑھنے کا ارادہ کیا تو دس بج رہے تھے۔ اس میں نہ معلوم کیا بھید ہے!

کالج ہال میں لالہ جی ملے۔ کہنے لگے "مسٹر! صبح میں نے پھر آپ کو آواز دی تھی۔ آپ نے جواب نہیں دیا۔"

میں نے زور کا قہقہہ لگا کر کہا "اوہو! لالہ جی! یاد نہیں میں نے آپ کو گڈ مارننگ کیا تھا۔ میں تو پہلے ہی سے جاگ رہا تھا۔"

بولے "وہ تو ٹھیک ہے لیکن بعد میں...... اس کے بعد...... کوئی سات بجے کے قریب میں نے آپ سے تاریخ پوچھی تھی آپ بولے ہی نہیں۔"

ہم نے نہایت تعجب کی نظروں سے ان کو دیکھا، گویا وہ پاگل ہو گئے ہیں اور پھر ذرا متین چہرہ بنا کر ماتھے پر تیوری چڑھائے غور و فکر میں مصروف ہو گئے۔ ایک آدھ منٹ تک ہم اس تعمق میں رہے۔ پھر یکایک ایک محبوبانہ اور معترفانہ انداز سے مسکرا کر کہا "ہاں ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ میں اس وقت...... اے...... اے نماز پڑھ رہا تھا۔"

لالہ جی مرعوب سے ہو کر چل دیئے اور ہم اپنے زہد و اتقا کے مسکینی میں سر نیچا کئے کمرے کی طرف چلے آئے۔

اب یہی ہمارا روزمرہ کا معمول ہو گیا ہے۔ جاگنا نمبر ایک چھ بجے۔ جاگنا نمبر دو دس بجے اس دوران میں لالہ جی آواز دیں تو نماز۔

جب دل مرحوم ایک جہانِ آرزو تھا تو یوں جاگنے کی تمنا کیا کرتے تھے کہ "ہمارا فرق ناز محو بالش کم خواب ہو" اور سورج کی پہلی کرنیں ہمارے سیاہ پیچ دار بالوں پر پڑ رہی ہوں۔ کمرے میں پھولوں کی بوئے سحری روح افزائیاں کر رہی ہو......

غضب یہ ہے کہ پہلے سٹر سٹر کی آواز اور دروازے کی دنادن سامعہ نوازی کرتی ہے اور پھر چار گھنٹے بعد کالج کا گھڑیال دماغ کے ریشے ریشے میں دس بجانا شروع کر دیتا ہے اور چار گھنٹے کے عرصے میں گراریوں کے گر پڑنے، دیگچیوں کے الٹ جانے، دروازوں کے بند ہونے، کتابوں کے جھاڑنے، کرسیوں کے گھسیٹنے، کلیاں اور غرغرے کرنے، کھنکارتے اور کھانسنے کی آوازیں تو گویا۔ فی البدیہہ ٹھمریاں ہیں۔ اندازہ کر لیجیے کہ ان سازوں میں سر تال کی کس قدر گنجائش ہے!

موت مجھ کو دکھائی دیتی ہے
جب طبیعت کو دیکھتا ہوں میں

بکریوں کا کارنامہ

حاجی لق لق

آپ نے اپنے شہر سے دوسرے شہر تک کئی دفعہ سفر کیا ہوگا اور کئی بار تجربہ کیا ہوگا کہ کسی دوست نے کہا: بھائی جان! منزل مقصود پر جا کر یہ چٹھی میرے فلاں دوست تک پہنچا دیجئے گا۔ یا اچھے آموں کی ایک ٹوکری آپ کے حوالے کر دی اور کہا کہ وہاں جا کر میرے چچا کے گھر پہنچا دیجئے گا۔ لیکن کبھی نہ ہوا ہوگا کہ کسی دوست نے کہا ہو "حضرت یہ دو بکریاں لیتے جائیے اور فلاں شخص تک پہنچا دیجئے"۔ یہ معاملہ ہمارے ساتھ ہوا ہم ملتان جا رہے تھے کہ ہمارے ایک دوست نے کہا۔ تکلیف تو ہوگی۔ اگر آپ میری دو بکریاں حرم دروازے میں شیخ اللہ بخش کے ہاں پہنچا دیں تو ممنون احسان ہوگا۔"

ہم بکریوں کا نام سن کر بوکھلا گئے۔ لیکن ہمیں اس دوست کا کہنا ضرور ماننا تھا اس لئے جواب دیا۔ بھائی مجھے اس سے انکار نہیں ہو سکتا مشکل یہ ہے کہ انہیں اسٹیشن پہنچانے کا کیا بندوبست ہوگا۔ کوچوان تو انہیں تانگے میں بٹھا کر لے جانے سے رہا۔ باقی رہے بس والے، وہ بھی صرف دو ٹانگوں والے حیوانوں کو سوار ہونے کی اجازت دیتے ہیں۔ اس لئے اگر آپ بکریاں اسٹیشن تک پہنچا دیں تو عنایت ہوگی۔

ہمارے دوست ہمیں یہ رعایت دینے پر رضامند ہو گئے اور اگلے روز صبح ہم اور بکریاں اسٹیشن پر پہنچ گئے۔

بکریوں کو بک کرا یا تھا اور ریل والوں نے ہر ایک کے گلے میں تاگا باندھ کر ایک ایک ٹکٹ لگا دیا۔ ہم بکریاں لئے پلیٹ فارم پر پہنچ گئے اور ایک جگہ کھڑے ہو کر ریل اور ریل کے اس ملازم کا انتظار کرنے لگے جس کا فرض بکریوں کو گارڈ کی بریک میں سوار کرانا تھا۔

اب کرنا خدا کا یہ ہوا کہ سگریٹ سلگاتے وقت ہمارے ہاتھ سے بکریوں کی رسیاں چھوٹ گئیں اور ایک بکری پان سگریٹ بیچنے والے کے خوانچے پر جھپٹ پڑی اور ہٹاتے ہٹاتے چند پان اٹھا ہی تو لے گئی۔ دکاندار نے چلانا شروع کر دیا اور بکری خاموشی کے ساتھ پان کھانے لگی۔ وہ ایسی نگاہوں سے پان فروش کی طرف دیکھ رہی تھی

گویا کہہ رہی ہو "کیوں جی! آپ برہم کیوں ہوتے ہیں؟ جب انسان منہ میں پان رکھ کر بکری کی طرح جگالی کرتا ہے تو بکری انسان کی طرح پان کیوں نہ کھائے۔ اور جب انسان ہماری نباتات مثلاً شلغم، مولی، ساگ پات پر ہاتھ صاف کرتا ہے تو ہم انسان کی من بھاتی نباتات یعنی پان پر کیوں نہ دانت تیز کریں؟"

پان فروش بڑبڑاتا ہوا زمین پر گرے ہوئے پان اٹھا کر خوانچہ میں رکھ رہا تھا اور ہم بکری کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ ہم حیران تھے کہ کتھے چونے کے بغیر پان کھانا کیا معنی؟ کمبخت بکری! اگر تم نے پان کھانا ہی تھا تو کتھا چونا لگے ہوئے پان اٹھاتی۔ ہم نے دو پیسے نکال کر پان فروش کی طرف پھینکے اور کہا کہ بکری کے منہ میں کتھا اور چونا ڈال دو۔

اس پر پان فروش بہت بگڑا اور ہمارے قریب آکر بولا "بابوجی! میرے پانوں کے پیسے دلا دیجئے" اس کا ہماری طرف بڑھنا تھا کہ دوسری بکری اس کے خوانچے کی طرف جھپٹی پان فروش نے گھوم کر اس کی تھوتھنی پہ تھپیڑ رسید کیا اور اسے ہماری طرف دھکیل دیا۔ لیکن اس عرصے میں پہلی بکری پان ختم کر چکی تھی۔ اس لئے وہ پھر خوانچے کی طرف بڑھی خوانچے والے نے شور مچاتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے دونوں بکریوں کو اس طرح دھکیلنا شروع کر دیا کہ وہ بھاگ اٹھیں۔ لیکن ایک ہی طرف کو نہیں، بلکہ ایک پلیٹ فارم کے اس طرف کو جدھر سے اپ ٹرین آتی ہے۔ دوسری اُس طرف کو جدھر سے ڈاؤن ٹرین آتی ہے۔

ہمارے ہاتھ سے سگریٹ گر گیا۔ ہم اب بکری کی طرف بے تحاشہ بھاگے اور بھاگتے وقت ڈاؤن بکری کی طرف اشارہ کر کے کہہ دیا کہ "اسے پکڑ لاؤ، ایک آنہ دیں گے"۔

اب آگے آگے بکری اور پیچھے پیچھے ہم۔ چلا چل۔ چلا چل بکری ہمارے ہاتھ آیا ہی چاہتی تھی کہ اس کی ٹکر ایک چائے فروش سے ہو گئی جو سر پر خوانچہ اُٹھائے اُس طرف کو جا رہا تھا جس طرف کو ہم یعنی ہماری طرف اُس کی پیٹھ تھی چائے فروش اس عقبی گھونسے سے ایسا گھبرایا کہ خوانچہ اس کے سر سے نیچے آ رہا، چائے کا دیگچہ لڑھکتا ہوا پلیٹ فارم سے نیچے لائن پر جا ٹھہرا اور مٹی کی کوریاں چور چور ہو گئیں لیکن چائے فروش کو یہ معلوم کرنے سے پہلے کہ یہ کیا حادثہ گذرا ہے، یہ فکر ہوئی کہ اپنے پیسے چنے جو فرش پر بکھر گئے تھے۔

ہم نے بکری کو تھاما اور چائے فروش نے ہمیں آ پکڑا کہ بابوجی ہمارے نقصان کا ہرجانہ دو۔ ارد گرد لوگ جمع ہو گئے اور سب متفق اللسان ہو کر کہنے لگے کہ "بابو صاحب آپ کو پیسے دینے چاہئیں چائے فروش بے چارہ غریب آدمی ہے" ہم چاہتے تھے کہ کسی طرح معاملہ ٹل جائے لیکن ایسا نہ ہو سکا اور ہم نے اس سے کہا۔ "تم ہمارے ساتھ آؤ"

اب ڈاؤن بکری کا حال سنیئے۔ ہم جب اپ بکری کو لئے جارہے تھے تو سامنے سے قلی اسے پکڑے آرہا تھا۔ لیکن ساتھ ایک ٹکٹ کلکٹر بھی تھا جب ہمارا اس کا "کراس" ہوا اور ہم ٹھہر گئے تو ٹکٹ کلکٹر لگا ڈیم فول بکنے۔ ہم نے پوچھا "صاحب کیا معاملہ ہے"؟

صاحب بہادر بولے "ڈیم یو۔ یہ تمہارا بکری ہمارا دفتر میں آگیا اور میز پر چڑھ گیا۔ سب ڈواٹ لوگ الٹ گیا اور ہمارا رجسٹر کھراب ہوگیا۔ ہم تم کو اسٹیشن ماسٹر صاحب کے پاس لے جانا مانگتا۔ مالوم!"

ہم نے اپنے اردگرد نظر دوڑائی۔ چار "قرض خواہ" محاصرہ کیسے کھڑے تھے۔ چائے فروش، پان فروش قلی اور کلکٹر۔ ہم نے پہلے تین آدمیوں کو منہ مانگے دام دیکر رخصت کیا اور بکریوں کی رسیاں تھامتے ہوئے صاحب بہادر سے معذرت طلب کی۔ پہلے تو وہ مانتے نہ تھے لیکن آخرکار دو شرفا نے جو پاس آکھڑے ہوئے تھے۔ سفارش کر کے ہماری جان چھڑائی۔

اتنے میں ٹرین آئی اور ریلوے کے ایک خاص پورٹر نے آکے بکریوں کو گاڑی میں سوار کر لیا۔ ہم کچھ عرصے تک وہیں کھڑے رہے اور ہم نے دیکھا کہ "اپ" بکری نے "ڈاؤن" بکری کا ٹکٹ کھا لیا اور "ڈاؤن" بکری اپ بکری کا ٹکٹ چبا گئی ہے۔ ہم نے چاہا کہ بھاگ کر بکنگ والے دفتر میں جا کر اطلاع کریں لیکن گاڑی نے وسل کیا اور ہم بھاگ کر ایک ڈبے میں گھس گئے اور گاڑی چل پڑی۔

رائے ونڈ کے اسٹیشن پر ہم کو گاڑی بدلنا تھا۔ چنانچہ ہم اترے اور بکریاں بھی اتریں۔ چند منٹ کے بعد ایک ٹکٹ کلکٹر صاحب ٹہلتے ٹہلتے قریب آئے اور بولے۔ بکریوں کے ٹکٹ کہاں ہیں؟ ہم نے کہا۔ ان کے پیٹ میں۔ بابو صاحب سمجھے کہ ہم ان کا تمسخر اڑا رہے ہیں۔ اس لئے لال پیلے ہو کر بولے ہم چارج کریں گے ادھر لاؤ انہیں دفتر کی طرف۔ ہم نے عرض کیا۔ ہم نے آپ سے مذاق نہیں کیا۔ ٹکٹ بکریوں کے پیٹ میں ہیں۔ اگر یقین نہ ہو تو ان کے ایکسرے کرا دیکھئے۔ اس پر بابو صاحب اور بھی برافروختہ ہوئے اور لگے گارڈ کو آوازیں دینے۔ گویا ایک مددگار بلا کر ہمیں پھینٹنا چاہتے تھے۔ گارڈ آیا اور اس نے شہادت دی کہ بکریاں "بک شدہ" ہیں اور میری کتاب میں درج شدہ ہیں۔

ٹکٹ کلکٹر صاحب مطمئن ہو کر ایک طرف چل دیئے اور ہم سگریٹ سلگانے لگے کہ گاڑی نے بڑے زور سے وسل کیا جس سے ڈر کر بکریاں پھر بھاگ اٹھیں اور ہمارے سامنے پھر وہی اپ اور ڈاؤن کا معاملہ پیش ہوا لیکن اس دفعہ ہم نے خود تعاقب نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور دو قلیوں سے کہا کہ جو بھی انہیں پکڑ لاؤ ایک ایک آنہ دیں گے۔

بکریاں پھر ہمارے پاس لائی گئیں اور اب کہ ہم ایسے پریشان تھے کہ اگر چھری پاس ہوتی تو دونوں کو آنے والی عید الاضحیٰ کے سلسلے میں ذرا پہلے ہی ذبح کر کے خدا پر احسان کرتے لیکن ہم بے بس تھے۔

آخر ہمیں ایک خیال سوجھا۔ ہمارے شہر کے باشندے بابو عطا محمد میاں کے ٹکٹ کلکٹر تھے ہم بکریاں لئے ان کے پاس پہنچے اور کہا "قاضی صاحب" یہ لیجئے دو بکریاں۔ انہیں پاس رکھیئے۔ لاہور سے کوئی آدمی ہماری چٹھی دکھا کر انہیں لے جائے گا قاضی صاحب رضامند ہو گئے اور ہمیں ان بکریوں سے نجات ملی، لیکن ہمیں ڈاکٹر اقبال کے فلسفے کا پتہ چل گیا کہ انہوں نے کیوں کہا تھا۔

الحذر از گوسفنداں الحذر

لوگ کہیں گے کہ گوسفند بھیڑ کو کہتے ہیں اور ڈاکٹر اقبال کا مطلب بھیڑوں سے تھا لیکن ہمیں یقین ہے کہ علامہ کا مطلب بکریوں سے تھا اور خصوصاً مذکورہ بالا دو بکریوں سے ....

رونا

چراغ حسن حسرت

آپ نے کبھی اس بات پر بھی غور کیا کہ ..... بعض لوگوں کو "فی البدیہہ" رونے میں بڑا کمال حاصل ہے سنیما میں کوئی دردانگیز منظر دیکھا اور ساون بھادوں کی جھڑی بندھ گئی۔ گھر میں بیوی سے کسی بات پر تکرار ہو گئی۔ اور ٹسوے بہانے شروع کر دیئے۔ جو لوگ اس طرح نہیں روتے تو وہ قوم کا نام لے کر روتے ہیں۔ ایک دفعہ ہائے قوم کہا اور آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔ دوسری دفعہ "قوم قوم" پکارا، اور گالوں پر آنسو بہنے لگے۔ غرض قوم کیا ہے۔ پیاز کی گٹھی اور رونے رلانے کا ایک کارآمد نسخہ ہے۔

پیاز کی گٹھی پر ایک اور بات یاد آئی۔ راقم الحروف نے اکثر بزرگوں سے یہ بھی سنا ہے کہ یہ "فی البدیہہ" رونا نرا سوانگ ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ جیب میں پیاز کی گٹھی رکھتے ہیں۔ جب رونا ہوا، پیاز کو رومال میں لپیٹ کر آنکھوں پر رکھ لیا۔ اب کسی کو کیا خبر کہ یہ رومال نہیں مداری کی پٹاری ہے۔ پھر کچھ ایسے بھی ہیں جو کان کا میل نکال کر آنکھوں میں لگا لیتے ہیں۔ اس طرح بھی آسانی سے رونا آ جاتا ہے۔ عشرہ محرم کی مجلسوں میں ایسے رونے والے آپ کو بہت مل جائیں گے۔ لیکن حضرت سلامت! پیاز کی گٹھی اور کان کے میل کے سہارے کوئی کب تک روئے گا ؏

رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

آخر اللہ کے ایسے بندے بھی تو ہیں کہ نہ ان کی جیب میں رومال نہ کان میں میل، پھر بھی پہروں روتے ہیں۔ عام اصطلاح میں ایسے لوگوں کو "درد دل رکھنے والے بزرگوار" کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں ایسے لوگوں کی کثرت ہے۔ کوئی کہاں تک نام گنوائے۔ لیکن ہندوؤں میں بھی دو ایک ہیں لالہ خوشحال چند خورسند نظر آتے ہیں۔ میں نے دیکھا تو نہیں البتہ سنا ضرور ہے کہ جب وہ کبھی دفتر میں بیٹھے بیٹھے "ہندو جاتی کا کیا بنے گا؟" کہتے ہیں تو ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپکنے لگتے ہیں۔ اب آپ یہ تو نہ کہیئے کہ لالہ جی بھی

ہروقت جیب میں پیاز کی گٹھی رکھتے ہیں۔

اسی قسم کے ایک درد دل رکھنے والے بزرگوار گوجرانوالہ سے گاڑی میں سوار ہوئے اتفاق سے جس ڈبہ میں وہ بیٹھے ان میں ایک مولوی صاحب اور اسلامیہ کالج کے دو تین طالب علم بھی تھے۔ وہ مناسب موقع پاکر اسلاف کی عظمت کی داستانیں لے بیٹھے۔ ہارون الرشید اور الپ ارسلان کا ذکر کیا۔ محمود اور بابر کی یلغاروں کا ایسا نقشہ باندھا کہ سب کی نظروں کے سامنے تلواریں سی چمکنے لگیں۔ یہ تو خیر مرثیہ کا چہرہ تھا۔ اب اصل مرثیہ شروع ہوا۔ یعنی انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے افلاس اور پستی کا افسانہ چھیڑ دیا اور مصائب کا ذکر اس انداز میں کیا کہ وہ تو خیر الگ رہے۔ سننے والوں پر رقت طاری ہو گئی۔ جب وہ رونے رلانے سے فارغ ہو چکے تو بڑے جلال سے فرمایا کہ ہم کہاں آ گئے۔ یہ الفاظ انہوں نے اس طرح بلند آواز میں کہے کہ ایک مسافر جو کھڑکی کے پاس اونگھ رہا تھا، چونک پڑا اور دریچہ سے سر نکال کر کہنے لگا "کالا شاہ کاکو"۔

راقم الحروف سے تو جب کسی اس قسم کے درد دل رکھنے والے بزرگوار کی ملاقات ہوتی ہے اور وہ منہ بسور کر فرماتے ہیں کہ ہم کہاں آ پہنچے؟ تو میں عرض کرتا ہوں کہ "کالا شاہ کاکو"! وہ دیکھئے سامنے اسٹیشن کا نام لکھا ہے۔ اور جب جناب خوشحال چند خورسند کہتے ہیں کہ ہندوؤں کا کیا بنے گا؟ تو میں ان سے بھی صاف عرض کر دیا کرتا ہوں کہ "تو تم اور آپ پسند فرمائیں تو پنڈے بھی بن سکتے ہیں"۔

اس پر ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ سنیما میں ایک فلم دکھائی جا رہی تھی۔ فلم کا نام تو یاد نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ خاتمہ پر قصہ کا ہیرو مارا جاتا ہے اور ہیروئن اس کی لاش پر ماتم کرتی نظر آتی ہے، عموماً خاتمہ سے کچھ دیر پہلے ہی سنیما کے دروازے کھل جاتے ہیں اور خوانچے والے ہانکنا پکارنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس موقع پر یہ عجیب اتفاق ہوا کہ ادھر ہیروئن نے کہا "اے خدا۔ اے خدا میرے لئے دنیا میں اب کیا رہ گیا ہے" ادھر باہر سے آواز آئی "گنڈیریاں"۔

مقدس پیشہ

زاہد ملک

تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہر سو دو سو سال بعد اس زمین پر کوئی نہ کوئی ایسی طلسماتی اور عہد ساز شخصیت پیدا ہو جاتی ہے جو تاریخ کا دھارا موڑ کر رکھ دیتی ہے ایسی ہمہ پہلو شخصیات کو تقریباً تمام مروجہ علوم و فنون پر یکساں عبور حاصل ہوتا ہے۔ ہر ہر علم کی گہرائیوں اور باریکیوں پر اس حد تک ان کی باریک بین نظر ہوتی ہے کہ یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ تاریخ ساز شخصیات بنیادی طور پر فلاسفر ہیں، ریاضی دان ہیں، ماہر فلکیات ہیں۔ طبیب ہیں یا ادیب ہیں۔ اب مثلاً ہماری طرف ہی دیکھئے بعض کوتاہ نظر لوگ ہمیں صرف ایک ادیب، صحافی مورخ، ماہر تعلیم اور سیاستدان کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو بصیرت عطا کر رکھی ہے اور وہ اپنے گرد و پیش سے باخبر رہتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہمیں فلسفہ، طب اور سائنس جیسے سائنسی مضامین پر بھی مکمل دسترس حاصل ہے علم چھپانے نہیں چھپتا اور بالآخر سورج کی طرح عیاں اور روشن ہو کر رہتا ہے۔ اسی لئے عام طور پہ ہم اپنی خوبیاں خود ہی بیان کرنا ضروری اور اچھا فعل نہیں سمجھتے اور جانتے ہیں کہ بھٹکے ہوئے لوگ اِدھر اُدھر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد بالآخر ہماری ہی طرف رجوع کریں گے لیکن چونکہ ہم یہ مضمون ڈاکٹری کے مقدس پیشے کے بعض پہلوؤں پر لکھنے بیٹھے ہیں اس لئے ایسے ہی ہم نے سوچا کہ فن طب سے اپنے گہرے قلبی تعلق اور اعلیٰ پیچیدہ امراض کی اکسیرانہ تشخیص میں، اپنے وسیع تجربہ کا بھی سرسری سا ذکر کر دیں۔

یہ اُس وقت کی بات ہے جب ہم بی اے کا امتحان دے چکے تھے اور امتحان کے نتیجہ کے انتظار میں دو تین ماہ کے لئے اپنے آبائی گاؤں میں مقیم تھے۔ ہمارے گاؤں کی آبادی دس ہزار کے قریب ہے اس پاس کے چھوٹے چھوٹے دس بیس ملحقہ دیہات میں ہمارے گاؤں کو وہی مقام اور اہمیت حاصل ہے جو شہروں میں شہر کراچی کو حاصل ہے اسی لئے تعلیم، کھیل کود، سیاست اور ثقافت وغیرہ میں ہمارے گاؤں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور دوسرے دیہات کی نسبت یہاں روزگار کے مواقع بھی زیادہ ہیں چنانچہ انہی دنوں ایک ڈاکٹر صاحب روزگار کی تلاش میں ہمارے گاؤں آ پہنچے اور انہوں نے چار کمروں پر مشتمل ایک مکان آٹھ روپے ماہانہ کرایہ پر حاصل کر کے اپنی پریکٹیس شروع کر دی

ہمیں جب گاؤں میں ڈاکٹر صاحب کی آمد کا علم ہوا تو ہم نے ان پر کال آن کا ارادہ کیا۔ ہم چونکہ خود صاحب علم آدمی ہیں اس لئے صاحب علم شخصیات سے دوستی عزیز رکھتے ہیں اسی خیال ہی سے ہم نے ڈاکٹر صاحب سے ملنے کا ارادہ کیا۔ جونہی ہم ڈاکٹر صاحب کے مکان پر پہنچے ہمیں گوناگوں روحانی مسرت ہوئی۔ اس لئے کہ ہمارا اندازہ درست ثابت ہوا۔ ڈاکٹر صاحب واقعی علم اور تجربے کا سمندر تھے۔ کرائے پر حاصل کئے گئے ان کے مکان و مطب کے باہر بورڈ پر لکھا تھا: "ڈاکٹر فضل الٰہی چشتی قادری ایل۔ ایم۔ سی سی ڈی اے، کے ڈے اے، بی آر بی، کانفیڈنیشل، پرائیویٹ، ماہر امراض مخصوصہ و خبیثہ" بورڈ کی آخری سطر میں لکھا تھا: "ہر طرح کے دانت انگلی سے نکالے جاتے ہیں" بورڈ پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ ہمارا فوری ردِ عمل یہ تھا کہ یہ گاؤں کی خوش قسمتی ہی ہے کہ ایک قابل اور تجربہ کار ڈاکٹر نے دکھی انسانیت کی خدمت کے لئے گاؤں کا رخ کیا ہے۔ مطب میں داخل ہوئے تو ڈاکٹر صاحب ایک مریض کو دیکھ رہے تھے انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں ایک خالی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بڑی سنجیدگی سے سٹیتھوسکوپ لگائے مریض کے دل کی دھڑکن جانچ رہے تھے۔ دل کے نازک علاقہ سے فارغ ہو کر انہوں نے سٹیتھوسکوپ مریض کی گردن، ہونٹوں، ماتھے اور سر کے مختلف حصوں پر لگانا شروع کیا۔ مطب پر مکمل سکوت طاری تھا صرف دیوار پر لگے ایک ٹوٹے گھڑیال کی ٹک ٹک کی آواز آ رہی تھی۔ سٹیتھوسکوپ کو مریض کے مختلف اعضا کی سیر کرانے کے بعد انہوں نے اپنے ہم عمر گھڑیال کی طرف دیکھا اور گھڑیال کی طرف دیکھتے دیکھتے ہی اپنا دایاں ہاتھ مریض کی نبض کی طرف بڑھایا لیکن ان کا نشانہ ٹھیک نہ بیٹھا۔ انہوں نے مریض کی نبض کی بجائے اس لکڑی کی کرسی کے بازو کی نبض ٹٹول کر ایک جگہ پر اپنی انگلیاں جما دیں جس پر مریض بیٹھا ہوا تھا۔ پھر گھڑیال کی طرف دیکھتے دیکھتے ہی کہا: "آپ کی نبض بالکل بند ہے۔ خیر کوئی بات نہیں چالو کر دیں گے۔" کرسی کی نبض دیکھ چکنے کے بعد انہوں نے اپنا چشمہ اتار کر میز پر رکھا اور اب مریض کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں پاکستان میں واحد ڈاکٹر ہوں جو مریض کے پاؤں سے لے کر سر تک ہر عضو پر سٹیتھوسکوپ لگاتا ہے ورنہ عام ڈاکٹر صرف سینے اور کمر وغیرہ کا معائنہ کر کے ڈال دیتے ہیں۔ جب تک آپ مرض کو جڑ سے نہ پکڑیں اسے جڑ سے نہیں اکھاڑ سکتے۔ میں اسی لئے بازاری سٹیتھوسکوپ پر اعتبار نہیں کرتا اور اپنے اوزار خود تیار کرتا ہوں۔" ہم نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ واقعی سٹیتھوسکوپ قبلہ ڈاکٹر صاحب کا اپنا شاہکار ہے۔ سٹیتھوسکوپ کی نالیاں پودوں کو پانی دینے والی ربڑ کی کسی بوسیدہ ایک انچ موٹی ٹیوب سے تیار کی گئی تھیں۔ ایک نالی کا رنگ سرخ اور دوسری کا کالا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے پھر مریض کی طرف قدرے جھک کر بڑے رازدارانہ انداز میں کہا "بھائی صاحب آپ کے چاروں گردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے یہ ساری خرابیاں اسی وجہ سے پیدا ہو گئی ہیں بہرحال آپ فکر نہ کریں۔

میری دوائی سے آپ ایک ڈیڑھ مہینہ میں مکمل صحت مند ہو جائیں گے۔ یہ کہہ کر انہوں نے مریض کو مختلف مرتبانوں سے چودہ پڑیاں نکال کر دیں اور صبح و شام ایک ایک پڑی پانی کے ساتھ استعمال کرنے کو کہا۔ مریض تشخیص سے اس قدر مطمئن اور خوش نظر آرہا تھا کہ اظہار تشکر کی خاطر جھکا جھکا جا رہا تھا۔ مریض نے بل کے متعلق پوچھا تو ڈاکٹر صاحب نے کہا "بھائی صاحب کیسا بل اور کیسی فیس! اگر مجھے دولت کا لالچ ہوتا تو لاہور یا کراچی پریکٹس کرتا میں تو خدمت خلق کے لئے یہاں آیا ہوں اور ڈاکٹری کو مقدس پیشہ سمجھتا ہوں۔ بہرحال آپ کے پیسے ہوئے چودہ اور پانچ انیس اور دو یعنی کل بل ملا کر اکیس روپے۔" ڈاکٹر صاحب اکیس روپے والے مریض سے فارغ ہوئے تو اپنا زنگ خوردہ سٹیتھوسکوپ لے کر ہماری طرف بڑھے۔ اُدھر سے ہم نے تعارف کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے سٹیتھوسکوپ کی ڈبی ہماری ہتھیلی پر رکھنے کی کوشش کی اور کہا "اچھا پاؤں کے بجائے ہاتھ ہی سے مرض کی تشخیص کا آغاز کرتے ہیں۔" ہم نے کہا ڈاکٹر صاحب ہم تو بس ایسے ہی آپ سے ملنے چلے آئے ہیں۔ گاؤں میں بڑا چرچا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ میں شفا دی ہے اس لئے ہم نے سوچا کہ ہم بھی آپ کا دیدار کر لیں۔ ویسے ہم مکمل طور پر صحت مند ہیں اور اگر ہمیں کوئی مرض ہے تو بس یہی کہ ہم اہلِ علم کے پرستار ہیں ڈاکٹر صاحب سے پہلے ہی نشست میں نوے منٹ کے قریب بات چیت ہوئی بات چیت میں ڈاکٹر صاحب نے زیادہ وقت گاؤں کے مختلف لوگوں کی مالی حالت کے متعلق متعدد سوالات کئے یا پھر علم طب میں ہماری گہری دلچسپی اور وسیع مطالعہ کے متعلق تبادلہ خیالات کیا۔ قصہ مختصر یہ کہ ڈاکٹر صاحب سے ہماری دوستی ہو گئی اور ہمیں جب بھی دوسرے مشاغل سے فرصت ملتی ہم ڈاکٹر صاحب کے مطب جا بیٹھتے۔ جلد ہی ہم نے ڈاکٹر صاحب کو ان کے مطب میں آنے والے نئے نئے مریضوں کے امراض کی تشخیص میں مدد دینا شروع کر دیا۔ پھر کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے زنگ خوردہ اور خود ساختہ سٹیتھوسکوپ کو مریض کے مختلف اعضاء پر آزادانہ استعمال کرنے کے بعد کہا "بھائی صاحب آپ کے جگر میں گرمی ہے" لیکن ہم نے بغیر سٹیتھوسکوپ کے استعمال کے اپنی اعلیٰ خداداد مرض شناس صلاحیتوں کی بنا پر کہہ دیا کہ "ڈاکٹر صاحب میرے خیال میں مریض کے جسم میں دو دل ہیں جس کی وجہ سے اس کا دوران خون بہت بڑھ گیا ہے۔" چنانچہ ڈاکٹر صاحب اکثر ہمارا ماہرانہ مشورہ مان لیتے۔ دو تین دفعہ یوں بھی ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کے پاس کوئی سیریس کیس آ گیا تو انہوں نے ہمیں گھر سے بلا لیا اور کہا کہ ایمرجنسی ہے۔

کوئی ایک ماہ بعد خدا کا کرنا یوں ہوا کہ ہمارے گاؤں میں ایک نئے آنے والے ڈنگر ڈاکٹر نے بھی فارغ اوقات بھی ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب چشتی قادری کے مطب میں آنا جانا شروع کر دیا اور اس طرح ہمارے پینل میں ایک اور ماہر کا اضافہ

ہوگیا اور اس کے بعد شاید ہی کوئی ایسا کیس ہوگا جو ہم تینوں سے بچ کر چلا گیا ہو۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے مطب کے اوقاتِ کار از سرِ نو ترتیب دیئے۔ عام امراض والے مریضوں کو وہ صبح کے وقت اکیلے دیکھتے لیکن سیریس امراض یا بقول ان کے امراض مخصوصہ و خبیثہ والے مریضوں کو شام کے وقت ہم دونوں کی موجودگی میں دیکھتے۔ ہماری موجودگی میں جب کوئی مریض آتا تو ڈاکٹر صاحب حسبِ معمول اپنے سٹیتھوسکوپ کو مریض کے جسم کی سیر کراتے۔ پھر مریض کی نبض دیکھتے۔ پھر ٹکٹکی باندھ کر مریض کے چہرے کی طرف دیکھتے اور طرح طرح کے سوالات کرتے۔ سوالات میں وہ ایک یہ سوال ضرور پوچھتے کہ "آپ کے خاندان میں تو کسی کو یہ تکلیف نہیں" اگر کوئی بدہضمی کا شکار مریض بھی آ جاتا تو اس سے بھی پوچھتے کہ آپ کے خاندان میں تو کسی کو کسی وقت بدہضمی کی شکایت نہیں رہی؟ سوال جواب کے مرحلے سے فارغ ہو کر وہ بغیر کچھ کہے ڈنگر ڈاکٹر اور ہماری طرف دیکھتے۔ ہم دونوں ماہرین سمجھ جاتے کہ اب ڈاکٹر صاحب ہماری ماہرانہ رائے جاننا چاہتے ہیں۔ پہلے ڈنگر ڈاکٹر اپنے اینگل سے رائے دیتے اس کے بعد ہم علم طب میں ہونے والی نئی نئی دریافتوں کی روشنی میں مشورہ دیتے۔ جب کوئی بہت ہی مخصوصہ و خبیثہ امراض والا مریض آ جاتا تو پھر ہم تینوں ماہرین ڈاکٹر صاحب کے آفس سے ملحقہ ایک دوسرے کمرے میں چلے جاتے اور وہاں ایک گول میز کے اردگرد بیٹھ کر ایک گول میز کانفرنس کرتے۔ یہاں بھی ڈاکٹر صاحب حسبِ دستور بغیر کچھ کہے ہماری طرف دیکھتے۔ ایک مرتبہ اس طرح کی ایک گول میز کانفرنس میں ایک مریض کے مرض کی تشخیص کرتے ہوئے ڈنگر ڈاکٹر نے دلائل دیتے ہوئے کہا کہ میرے خیال میں اسے رانی کھیت (مرغیوں کی ایک عام بیماری) کا مرض ہے۔ چنانچہ متفقہ رائے سے اس مریض کا رانی کھیت کا ہی علاج کیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب کی جو بات ہمیں سب سے زیادہ پسند تھی وہ یہ تھی کہ انہیں اپنے پرانے مریضوں کا بہت خیال رہتا تھا۔ ہر اتوار کی شام ، ڈنگر ڈاکٹر کو لے کر وہ اپنے پرانے مریضوں سے ملنے قبرستان چلے جاتے اور کسی ایک قبر کی طرف اشارہ کر کے کہتے اسے نمونیہ تھا میں نے نمونیہ کا علاج کیا یہ بالکل تندرست ہو گیا لیکن بعد میں فالج سے چل بسا۔ یہ تیری قبر والا تپ دق کا مریض تھا۔ میرے علاج سے تپ دق کا تو خاتمہ ہو گیا لیکن بعد میں یہ اپنی لاپرواہی سے مر گیا۔ پھر کسی بچے کی قبر کی طرف اشارہ کر کے کہتے کہ یہ بچہ بہت ہی لاغر تھا اسے سوکڑا تھا میں نے اسے ایسے ٹانک دیئے کہ ہاتھی کا بچہ نظر آنے لگا لیکن بعد میں اس کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ رات کو سویا تو اس کا ہارٹ کام کر رہا تھا، صبح اٹھا تو فیل ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اسی طرح باری باری اپنے تمام پرانے مریضوں سے ملتے اور جب قبرستان سے واپس ہونے لگتے تو انہیں ہاتھ خدا ترسی اور مریض دوستی سے کام لیتے ہوئے کہتے: "اچھا بھائی۔ جہاں رہو خوش رہو" اپنے مریضوں کے لئے شمول سابق

مریضوں سے اس طرح کا پرسنل کانٹیکٹ (ذاتی رابطہ PERSONAL CONTACT) ہم نے کسی دوسرے ڈاکٹر میں نہیں دیکھا۔ جس طرح ڈاکٹر صاحب کا مریضوں سے اپنا رویہ بے مثال تھا اسی طرز وہ اپنے مریضوں سے بھی توقع کرتے کہ ان کا رویہ بھی اپنے ڈاکٹر سے انتہائی فراخدلانہ ہونا چاہیئے۔ مریضوں کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا قول تھا کہ اچھا مریض وہ ہوتا ہے جو مرتے دم تک ایک ہی ڈاکٹر کو کنسلٹ CONSULT کرتا رہے۔

قبلہ ڈاکٹر صاحب کی بات جو ہمیں پسند تھی اور جواب یہ مضمون لکھتے وقت بہت پسند آرہی ہے وہ یہ تھی کہ وہ خود اعلیٰ پایہ کے ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے یہ ایم بی بی ایس قسم کے کتابی ڈاکٹروں کے بہت خلاف تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ آج کل طرح طرح کے امراض اس لئے پیدا ہو رہے ہیں کہ اشیائے خوردونوش میں ملاوٹ بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ یہ بات سب ڈاکٹر اچھی طرح جانتے ہیں لیکن آج تک کسی بھی ڈاکٹر نے انفرادی طور پر یا پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن قسم کی ڈاکٹروں کی انجمنوں نے اجتماعی طور پر ملاوٹ کے خلاف کبھی کوئی مہم نہیں چلائی۔ قبلہ ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ یہ میڈیکل کالجوں کے پڑھے ہوئے "بچو کرے" مریضوں کو جو بظاہر مہر بند اور ہوا بند قسم کی دوائیاں دیتے ہیں ان میں بھی ملاوٹ ہوتی ہے اور میرا بس چلے تو میں یہ تمام دوائیاں اور کیپسول وغیرہ سمندر میں پھینک دوں لیکن ڈر صرف اس بات کا ہے کہ غریب مچھلیاں مرجائیں گی۔ ڈاکٹر صاحب اکثر سوال کیا کرتے۔ آخر یہ ڈاکٹر ملاوٹ کے خلاف احتجاج کیوں نہیں کرتے؟ پھر خود ہی اپنے سوال کا اس انداز سے جواب دیتے جیسے اپنے آپ سے بات کر رہے ہوں "کبھی گورکن بھی لوگوں کے نہ مرنے کی دعا کر سکتا ہے"۔

ماضی کے ان واقعات کا ہم نے سرسری سا ذکر محض اس لئے کر دیا تاکہ جن کوتاہ نظر حضرات کے علم میں اب تک یہ بات نہیں کہ علم طب پر ہمارے کیا کیا احسانات ہیں اور ہمیں مریضوں کو ہینڈل کرنے کا عملی تجربہ کس قدر حاصل ہے وہ بھی یہ بات جان لیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم خود کبھی بیمار نہیں پڑے۔ آخر ہم بھی انسان ہیں۔ لہٰذا ہم بھی ایک دفعہ بیمار پڑے تھے۔ یہ ۱۹۶۵ء کے اوائل کی بات ہے اور بیمار بھی ایسے پڑے کہ حقیقت یہ ہے کہ آج تک بیمار ہی چلے آرہے ہیں اور شاید یہ ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب چشتی قادری کے کسی پرانے مریض کی دعا کا اثر ہے کہ دن بدن ڈاؤن بھی جا رہے ہیں۔ ان دنوں ہم وزارتِ اطلاعات و نشریات میں فائلوں کو ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر کیا کرتے تھے۔ ایک دن دفتری اوقات میں ہمارے پیٹ میں شدید درد اٹھا پہلے تو ہم نے سوچا کہ آج دل کے میٹھے درد کی لہر دل کے بجائے غلطی سے پیٹ میں جا اٹھی ہے گزر جائے گی لیکن نہیں۔ درد بڑھتا گیا جوں جوں انتظار کیا۔ چند ہی منٹوں میں ہم لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ بیٹھیں تو شدید درد کھڑے

ہوں تو کاٹ دار درد، لیٹیں تو مزید لٹا دینے والا درد یعنی ہر حالت اور ہر صورت میں درد ہی درد۔ دفتر کے ساتھیوں نے سنٹرل گورنمنٹ ہسپتال کی ایمبولینس منگوائی اور ہمیں ہسپتال کے ایمرجنسی روم میں لٹا دیا گیا۔ نیم بیہوشی کی حالت میں ہم دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑے ہائے ہائے کرتے رہے۔ ایک نرس نے دوسری نرس کو آہستہ سے کہا "یہ تو میٹرنٹی کیس معلوم ہوتا ہے" دوسری نے بھی سرگوشی کی "نواں مہینہ لگتا ہے"۔ پھر دونوں کی دبی دبی ہنسی کی آوازیں ہمارے کانوں کے پردوں سے ٹکرائیں۔ ان کا خیال تھا کہ مریض شدت درد سے نڈھال ہے جو چاہو کہو اور جو چاہو اس کے ساتھ کر لو۔ ہم بے شک درد سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے لیکن اتنے نڈھال بھی نہ تھے کہ زنانہ نرسوں کی موجودگی کا احساس نہ ہو لیکن ہم نے ان کی طنز کا جواب جان بوجھ کر نہ دیا کہ مبادا ہڑتال پر نہ چلی جائیں۔ ہمارے ملک میں ڈاکٹر اور نرسیں بات بات پہ ہڑتال ہڑتال کھیلتی رہتی ہیں۔ ویسے بھی ہم ڈاکٹروں اور حجاموں کی ناخوشگوار باتوں پر کوئی ناخوشگوار ردِ عمل ظاہر نہیں کرتے۔ ہمارے ساتھ کئی دفعہ ایسے ہو چکا ہے کہ شیو کے دوران حجام کا میڈ اِن وزیر آباد MADE IN WAZIRABAD اُسترا ہماری گردن پہ ہے اور ہم صاف دیکھ رہے ہیں کہ اس نے بعض بالوں کو اس بُری طرح جڑوں سے اکھاڑ دیا ہے کہ وہاں سے خون کے ننھے ننھے قطرے اُبل پڑے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے چہرے پر خون کا پسینہ آ گیا ہے لیکن ہم کہتے ہیں ماشاء اللہ کیا تمہارا ہاتھ ہے جیسے کسی نو خیز بچہ کے پر سے شیو بنا رہے ہو۔ حجام کہتا ہے "بس جی اچھے کاریگر کی پہچان بھی کوئی کوئی کر سکتا ہے"۔ اسی طرح ہم اپنے ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب کی ہدایت کے مطابق ڈاکٹروں اور نرسوں سے بھی نہیں بگاڑتے۔ ڈاکٹر صاحب کہا کرتے تھے کہ ڈاکٹر اگر مریض سے ناراض ہو جائے تو وہ مریض کو ایک اضافی مرض بن کر چمٹ سکتا ہے۔ خیر ہم اپنا پیٹ اور نرسوں کے حُسنِ اخلاق کے بارے میں اپنا ردِ عمل دبا ہی رہے تھے کہ اتنے میں ڈاکٹر آن ڈیوٹی آ گئے۔ انہوں نے آتے ہی درد کم کرنے کا انجکشن دیا۔ آنکھوں کی پتلیوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا پیٹ کے مختلف حصوں کو دبا کر ٹٹولا۔ دو چار سوالات پوچھے اور کہا کہ پیٹ میں السر ہے!! چنانچہ ہمارے السر کا علاج شروع ہو گیا چونکہ ہمارا السر ہمارا نجی معاملہ تھا اس لئے ہم تفصیل میں نہیں جاتے کہ ہم نے پانچ چھ سال السر کے علاج کے لئے کیا کچھ نہ کیا۔ اُن دنوں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صدر پاکستان تھے ہم نے ان کے ذاتی معالج کو بھی کنسلٹ کیا۔ معالج صاحب نے پوچھا کیا معاملہ ہے۔ ہم نے کہا السر ہے۔ معائنہ کے بعد کہا "واقعی السر ہے" اور اس کے بعد انہوں نے ہمارے زیرِ استعمال درجن بھر دوائیوں میں معمولی سا رد و بدل کر دیا لیکن ہر قسم کے علاج اور ہر ممکن پرہیز کے باوجود السر کے دائرہ کار میں معمولی سا بھی فرق نہ پڑا۔ ہر ماہ دو ماہ بعد پیٹ میں درد ہوتا۔ بعض اوقات قے بھی ہوتی

اِدھر اُدھر کا علاج کرنے سے درد کا زور ٹوٹ جاتا اور اس طرح یہ درد کا سائیکل پانچ چھ سال تک چلتا رہا۔ ۱۹۷۱ء میں ایک دن ہمارے پیٹ کے درد نے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔ پہلے جن دو نرسوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ اگر اس دن موجود ہوتیں تو درد کی شدت اور پھیلاؤ دیکھ کر یقیناً کہتیں "اٹھارواں مہینہ لگتا ہے"۔ ڈاکٹروں کی ایک ٹیم نے کہا کہ السر پھٹ گیا ہے چنانچہ السر کو کاٹ پھینکنے کے لیئے اپریشن کا دن اور وقت مقرر ہوگیا۔ ہم نے اپنے تمام عزیز و اقارب کو اطلاع بھجوا دی کہ جسے جسے آخری بار ملنا ہو آ کر مل لے۔ خدا بھلا کرے کراچی کے نامور اور نیک سیرت سرجن مسٹر امان اللہ کا اپریشن والی صبح انہوں نے کہہ دیا کہ مریض کے پتہ کا بھی ایکسرے کرا لیا جائے۔ پتہ کا ایکسرے کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارا غصہ ختم کرنے کے لیئے پتہ کو سنگسار کیا ہوا ہے اور چھوٹی چھوٹی کنکریوں سے بھرا ہوا پتہ ڈاکٹروں کی زبان میں مردہ (DEAD) ہو چکا ہے۔ اس مرحلہ پہ مزید چھان بین کے بعد معلوم ہوا کہ السر کا سرے سے نام و نشان ہی نہیں بلکہ پتہ میں پتھروں کی وجہ ہی سے پیٹ میں درد ہوتا تھا اور اب پتہ کا ہی اپریشن ہوگا!!! چنانچہ سرجن امان اللہ نے پتہ کا ہی اپریشن کیا اور پتہ مع پتھروں کے نکال کر ہمارے حوالے کر دیا اور یوں سات سال بعد ہمارا "السر" ختم ہوگیا

اپریشن سے ایک دن پہلے جب سرجن امان اللہ مختلف کمروں کا راؤنڈ لگاتے ہوئے ہمارے کمرے میں آئے تو ہم نے کہا ڈاکٹر صاحب اب جبکہ آپ ہمارا پیٹ کھول ہی رہے ہیں تو براہ کرم ہمارے گردے کلیجی اور دوسرے اعضاء بھی اچھی طرح چیک کر لیں اور جو جو عضو بھی کمزور نظر آئے نکال دیں۔ ڈاکٹر صاحب مسکرائے اور کہا آپ مطمئن رہیں میں پیٹ کے سارے کونے اچھی طرح دیکھ لوں گا۔ چونکہ طب ہمارا مضمون رہا ہے اس لیئے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے ڈاکٹر صاحب سے اپریشن کے بارے میں کئی ایک سوالات پوچھے تاکہ اگر ہم محسوس کریں اور جہاں جہاں ضروری ہو سرجری کے موضوع پہ ڈاکٹر صاحب کی معلومات میں اضافہ کر دیں۔ مثلاً ہم نے ان سے پوچھا کہ آپ اپریشن کے لیئے کتنا پیٹ کھول لیتے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے کہا یہی کوئی چار پانچ انچ۔ ہم نے ان کی معلومات میں اضافہ کی خاطر کہا کہ اب بعض امریکی ڈاکٹر آٹھ نو انچ تک پیٹ کھول دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب فوراً بولے لیکن میں پیٹ کے اندر جا کر نہیں بلکہ باہر کھڑا ہو کر اپریشن کرتا ہوں۔ سچی بات یہ ہے کہ اس موقع پر ہمیں اپنے پرانے کولیگ (ساتھی COLLEAGUE) ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب چشتی قادری بہت یاد آئے۔ اگر یہاں اپنے ڈاکٹر صاحب ہوتے تو یقیناً ہماری معلومات اور مشورے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور آٹھ انچ کیا وہ مریض کا پیٹ ایک فٹ تک بھی کھول سکتے تھے۔ بہر حال ہمارا اپریشن ڈاکٹری زبان میں بڑا کامیاب رہا لیکن اپریشن کے بعد نہ جانے یہ کیا ہوا کہ سال دو سال کی ملازمت کے بعد استعفا دینے کو جی چاہتا ہے۔ چنانچہ اپریشن کے بعد ہم اب تک تین چار ملازمتوں سے استعفا دے چکے ہیں۔

یہ تو تھا مختصر سا ذکر (۱) ہماری نسل کے بعض نمائندہ بیماروں کا (ب) ملک میں علاج معالجے کی سہولتوں کا (ج) نرسوں کے مریضوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا اور (د) ڈاکٹروں کی قابلِ تعریف تشخیص کی اعلیٰ صلاحیتوں کا اب اگر آخر میں اس نئی نسل کی صحت کا دو چار سطروں میں جائزہ لے لیا جائے۔ جو آج کل سکولوں میں تعلیم پا رہی ہے اور جو آگے چل کر ملک کی باگ ڈور سنبھالے گی تو مناسب رہے گا ہم مستقبل کے ان حکمرانوں کی صحت کی صورتِ حال اس ایک مثال سے واضح کریں گے۔ مثال یہ ہے کہ ہمارے والد صاحب کے والد صاحب کے والد صاحب یعنی ہمارے پردادا صاحب نے زندگی کی سو سے کچھ اوپر بہاریں دیکھیں۔ ساری زندگی انہوں نے آنکھیں چار نہیں کیں یعنی نظر کی عینک استعمال نہیں کی۔ ہمارے والد صاحب کے والد صاحب یعنی ہمارے دادا صاحب نے تقریباً اسی برس کی عمر میں وفات پائی اور عمر بھر ان کی بینائی و دانائی بغیر عینک کے بحال رہی۔ ہمارے والد محترم ماشاء اللہ اب ستر کے قریب ہیں البتہ پچھلے پانچ سالوں سے نظر کی عینک استعمال کرنے لگے ہیں۔ ہم خود اب تک زندگی کی بیالیس خزائیں دیکھ چکے ہیں البتہ پچھلے چھ سالوں سے عینک لگاتے ہیں ہمارے ایک صاحبزادے یعنی نئی نسل کے ایک نمونے صاحب اس وقت آٹھ سال کے ہیں البتہ پچھلے سات سال سے نظر کی عینک استعمال کرتے ہیں (اب ہمارے صاحبزادے کے اتفاق سے جو صاحبزادے پیدا ہوں گے وہ شاید عینک لگا کر پیدا ہوں گے۔) اور اس کے باوجود کبھی ایک کبھی دوسری آنکھ جھپکتے رہتے ہیں۔ ایک دن ہمارے صاحبزادے کی ایک میڈم نے ہمیں سکول بلوایا اور بڑی سنجیدگی سے شکایت کی کہ آپ کا بیٹا مجھے آنکھیں مارتا ہے۔۔ جانے کس پر گیا ہے؟ ہم نے میڈم سے افسوس کا اظہار کیا اور بتایا کہ "ویسے ہمارا بیٹا گیا تو ہم پر ہی ہے لیکن ہم اسے ابھی بلا کر سمجھا دیتے ہیں۔" اس کے بعد ہم نے اپنے بے نور آنکھوں والے نورِ چشم کو بلا کر میڈم کی موجودگی میں سمجھایا اور کہا کہ بیٹا کبھی اسی میڈم کو آنکھ نہیں مارتے۔

ہم نے جس طرح بزرگ نسل، اپنی نسل اور نئی نسل کی بینائی میں جنریشن گیپ کی روشن مثال دی ہے اسی طرح ان کے دل و دماغ، دانتوں، آنتوں اور بعض دوسرے اہم اعضا کی کارکردگی میں نمایاں فرق کے متعلق مثالیں دے کر ثابت کر سکتے ہیں کہ آنے والے دور میں یعنی سو دو سو سال بعد ہمارے بچوں کے ہاں چوزے ہی پیدا ہوا کریں گے۔ چوزوں سے بڑی کوئی چیز پیدا کرنا ان کے بس کی بات نہ ہوگی۔ اور وہ چوزے بھی جنرا میٹری سیل سے ہی چلا کریں گے۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمیں آنیوالی نسلوں کی صحت کی فکر نہ ہوتی اگر ملک میں ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب چشتی قادری ایل ایم سی سی ڈی اے ڈی اے، بی آر پی جیسے ماہرین کی کمی نہ ہوتی لیکن ایسی شخصیات کہاں روز روز پیدا ہوتی ہیں اور پھر اگر ایسے ڈاکٹر پیدا ہو بھی جائیں تو ڈنگر ڈاکٹر اور ہم جیسے کو ینگز کہاں سے ملیں گے؟

چاچا دینا

سیّد ضمیر جعفری

"چاچا دین محمد" ہمارے کالج کے ان نامی گرامی طلباء میں سے تھے جو مسلسل فیل ہو کر طالب علم سے زیادہ "پروفیسر" معلوم ہونے لگتے ہیں اور پایان کار "خلیفہ" کے خطاب سے سرفراز ہوتے ہیں۔ دین محمد البتہ "خلیفہ" کے بجائے "چاچا" کے ہر دل عزیز نام سے یاد کئے جاتے تھے۔ وہ "خلیفہ" کیوں نہیں تھے، یا "چاچا" کیوں تھے یہ دراصل آثار قدیمہ کی ایک ایسی بحث تھی جس میں پڑنے کی ہمیں نہ فرصت تھی نہ ہمت۔ وہ ہم سے بہت پہلے چاچا کی حیثیت میں "کنفرم" ہو چکے تھے۔ بلکہ "دین محمد" تو مدت سے غائب ہو چکا تھا۔ ہمارے زمانے میں محض "چاچا" رہ گیا تھا۔ پرنسپل سے لے کر گھنٹی بجانے والے بوڑھے لسین چپڑاسی تک سب انہیں "چاچا" ہی کہتے تھے۔ اب اتنے پرانے راسخ اور رچے ہوئے چاچا کو اکھاڑ کر پاتال سے "دین محمد" کو ڈھونڈنا اور نئے سرے سے اس پہ "قبائے خلافت" موزوں کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔

یوں بھی وہ اپنے نوعمر اور نسبتاً کم سن ہم سبقوں کے چچا ہی معلوم ہوتے تھے خود ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ شیخ صاحب عمر میں ان سے چھوٹے تھے۔ اپنے پروفیسروں میں سے بعض جو اسی کالج کے پرانے طالب علم تھے چاچا سے بہت پیچھے ہوتے تھے پھر وہ ان کے ہم سبق ہوئے پھر آگے نکل گئے۔ پھر یہیں پروفیسر مقرر ہو گئے۔ مگر چاچا وہی طالب علم کے طالب علم۔

ہمارے وقت میں چاچا رفتہ رفتہ بی اے کے آخری سال میں پہنچ چکے تھے۔ مگر فائنل میں ڈیرے ڈالے ابھی صرف چار یا پانچ سال ہوئے تھے ان کی عمر تیس سے خاصی اوپر نکل چکی تھی۔ مگر ان کے عزم و استقلال سے نظر آتا تھا کہ بقیہ زندگی مادر علمی ہی کے آغوش میں گزارنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یار لوگوں کا خیال تھا کہ اگر چاچا کی رفتار یہی رہی —— اور رفتار کے معاملے میں صاف ظاہر تھا کہ جب تک یونیورسٹی اپنی تونہ بدلے گی وہ اپنی وضع ہرگز نہ بدلیں گے —— تو چاچا کا بڑا لڑکا جو اس وقت آٹھویں جماعت میں تھا، والد

نامدار کو یہیں آ پکڑے گا. بلکہ عجب نہیں کہ وہ باپ سے آگے نکل کر اس کا "استاد" تک بن جائے بعض زندہ دلوں کی رائے تھی کہ چاچا کالج میں دراصل اپنے فرزندِ ارجمند ہی کے انتظار میں ٹِکے ہوئے تھے۔

چاچا دین محمد بلا کی بھرپور دلچسپ اور گوناگوں شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک خاصے کھاتے پیتے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ فکرِ نہ فاقہ. کالج سے نکل کر سیاسیات میں حصہ لینے کا پروگرام تھا. مگر یہ کالج کا مرحلہ ہی کسی صورت میں طے ہونے میں نہ آتا تھا۔ ادھر پالٹیکس بھی آخر کالج سے باہر کھڑے کھڑے کب تک انتظار کرتی؟ چنانچہ چاچا کے کالج سے نکلنے کی جب کوئی اُمید نظر نہ آئی تو پالٹیکس نے انہیں کالج کے اندر آ لیا۔ چاچا گو اب تک اسمبلی میں نہ پہنچ سکے تھے اگرچہ پروگرام کے مطابق وہ صوبے کا سب سے کم عمر وزیر ہوتے کا امتیاز حاصل کرنے کی تمنا رکھتے تھے، تاہم کالج کو انہوں نے اپنے لئے "اسمبلی" بنا لیا تھا۔ مدت تک وہ طلباء کی لیڈری کرتے رہے۔ ہڑتالیں کرواتے اور جلوس نکلواتے لیکن اب کچھ مدت سے انہوں نے گویا "سپیکر" کی سی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ اب وہ نوجوان لیڈروں کی پیٹھ ٹھونکا کرتے، مشورے اور رولنگ دیتے۔ مقامی سیاست کا ہر جوڑ توڑ انہیں کے کمرے میں صورت پذیر ہوتا۔

باتیں کرنے کا انہیں خاص لپکا تھا اور بات کرنے کا خاصا ڈھب بھی آ گیا تھا۔ کالج میں اپنی گذشتہ پندرہ سالہ زندگی میں لے دے کر انہوں نے یہی ایک فن سیکھا تھا۔

اپنی مستقل سینیارٹی کے زور پر چاچا ہوسٹل کے شاندار سے شاندار کیوبیکل کے حق دار تھے وہ اچھے سے اچھے کیوبیکل میں برسوں بود و باش رکھ بھی چکے تھے. مگر پچھلے دو ایک سالوں سے تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے کونے کی ایک لمبی ڈارمیٹری میں پڑے تھے جس کے ساتھ ملی ہوئی ٹک شاپ تھی۔ پھر غسلخانے تھے جن کے سب سے بڑے سرپرست آپ ہی تھے دراصل اب چاچا کی سوشل حیثیت اتنی پھول پھل چکی تھی کہ کیوبیکل کی "تنگنائے غزل" اس پھیلاؤ کے لئے قطعاً ناکافی تھی۔

یوں تو چاچا دن میں بھی کالج کچھ واجبی ہی جایا کرتے تھے۔ دن بھر ان کی ڈارمیٹری میں ناغہ کرنے والوں کا جمگھٹ لگا رہتا۔ خیر دین کی ٹک شاپ سے لسی شربت، فالودے اور چائے کے ٹرے دن بھر دوڑتے رہتے اور ــــــ دن بھر ــــــ چاچا اپنا "خطبۂ صدارت" ارشاد فرماتے رہتے۔ مگر رات کو کھانے کے بعد ان کے ہاں باقاعدہ دربار جمتا تھا۔ کامن روم کی سب کرسیاں سمٹ کر وہیں آ جاتیں اور رات کو دو دو بجے تک گپ شپ کا سلسلہ جاری رہتا سپرنٹنڈنٹ اس "مجمع خلاف قانون" کا سخت مخالف تھا۔ "تازہ واردانِ بساط

برائے دل" کو فرداً فرداً وہ اس خطرے سے متنبہ بھی کر دیتا تھا۔ مگر چاچا کو اس محفل آرائی سے روکنے کی ہمت اس میں نہ تھی۔ چاچا کو ہوسٹل اور کالج دونوں جگہ ایک قسم کی صوبائی خود مختاری حاصل تھی اور واقعی جب وہ اس دربار عام میں صرف بنیان اور دھوتی پہنے آلتی پالتی مار کے بیٹھتے تو اپنے گھٹے ہوئے سر، کمر سے دس بارہ انچ آگے بڑھتی ہوئی توند اور تیل پلائی ہوئی رانوں کے ساتھ یوں معلوم ہوتے جیسے کارپوریشن کا کوئی دیہاتی میمبر بیٹھا ہو۔

چاچا ہوسٹل کے بے تاج بادشاہ تھے!

چاچا کی باتوں کا کوئی خاص موضوع نہ ہوتا تھا۔ وہ ہر موضوع پر گفتگو کرتے تھے گفتگو برائے گفتگو میں کسی خاص موضوع کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ اور چاچا تو خیر گھٹنوں بیٹھے پرنسپل ہی میں سے کیڑے نکال سکتے تھے۔ تاہم دو تین موضوعات انہیں بطور خاص مرغوب تھے۔ ایک تو انہیں سنیما سے سخت نفرت تھی۔ لہٰذا اس کے خلاف مسلسل بولتے تھے۔ ایکٹروں، ایکٹرسوں، ڈائریکٹروں، پروڈیوسروں، تماشائیوں سب کو بے نقط سناتے۔ سنیما سے ان کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ کسی ایکٹر کے نام یا اس کی صورت تک سے واقف نہ تھے دیواروں پر سنیما کے اشتہارات دیکھتے تو آنکھیں بند کر لیتے۔ منہ پھیر لیتے۔ گمان ہوتا تھا۔ جیسے سہراب مودی، شانتا رام وغیرہ سے انہیں کوئی ذاتی دشمنی تھی۔

چاچا کو اپنے خاندانی شرف و امتیاز پر فخر تھا۔ ایک نامور قدیم خاندان میں پیدا ہوئے تھے ان کے اجداد میں اکثر بزرگ جلیل القدر شہنشاہوں کے وزیر اور منصب دار تھے۔ موجودہ اور گذشتہ دونوں نسلوں کے رشتہ داروں میں تحصیل دار، نامزد ڈپٹی کلکٹر، ڈپٹی کمشنر، کمشنر، کمیٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے صدر اور صوبائی اور مرکزی وزرا دھرے پڑے تھے۔ ہوسٹل میں انہیں جو رشتہ دار ملنے آتا اس کا کوئی نہ کوئی بڑا عہدہ ضرور ہوتا جس سے ہمیں بعد میں مطلع کیا جاتا۔ حتیٰ کہ اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ پچھلے چار سالوں میں صوبے کا جو بڑا آدمی بھی مرا تھا، چاچا کا رشتہ دار تھا۔ چاچا نے ایک ایک کا تعلق خاطر کے ساتھ سوگ منایا ——آخر میں تو نوبت یہ ہو گئی تھی کہ کسی بڑے افسر یا نامور لیڈر کے مرنے کی خبر اخبار میں نظر آتی نہیں کہ لوگ خود بخود اظہار تعزیت کے لئے چاچا کی ڈارمیٹری میں پہنچ گئے۔ اس طرح ترقیوں اور تقرریوں، صدارتوں اور وزارتوں وغیرہ پہ مبارک باد کی تقریبات رہتیں —— بدخبری ہو یا خوشخبری۔ وہ احباب کی خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے، خاطر و مدارت کے خلوص، گرم جوشی اور انداز مدارت سے آپ یہ سمجھ ہی نہ سکتے

تھے کہ یہ کوئی مجلس غم تھی یا محفل نشاط ۔

منظور اور میں ہم دونوں چاچا کے پاس مستقل بیٹھنے والوں میں سے تھے ۔ چاچا کا دستور تھا کہ کھانے کے بعد شام کو بیٹھک ہوتی تھی ، اس میں زیادہ تر اپنے عزیزوں ، رشتہ داروں کے " فضائل " بیان کیا کرتے تھے ایک مرتبہ شجرہ نسب کے درخت " پر چڑھ جاتے تو اترنے کا نام نہ لیتے ۔ پہلی سانس میں خان خاناں بیرم خان پر جا کر رکتے ۔ دوسرا پڑاؤ تیمور کے ایک وزیر پر ہوتا تیسری منزل سکندر اعظم کے جرنیل سلیوکس پر شجرہ نسب کا یہ درخت بہت ہی لمبا چوڑا تھا ۔ اور چاچا باقاعدگی سے اس کی شاخوں ، ٹہنیوں وغیرہ کا جائزہ لیتے تھے ہم دونوں یہ قصہ سن سن کر عاجز آ چکے تھے ۔ مگر ہوسٹل میں رہ کر چاچا کے ہاں گئے بغیر بات بنتی نہ تھی ۔

سالانہ امتحان ختم ہو چکا تھا ہوسٹل کا شیرازہ بکھرنے والا تھا ۔ فائنل کے طلباء کو گھروں کی راہ لینے والے تھے ۔ فرصت ، بے فکری ، بے تکلفی اور چل چلاؤ کے دن تھے ۔ چاچا کی ڈارمیٹری معمول سے زیادہ آباد تھی ۔

میں اور منظور ایک شام چاچا کی طرف جا رہے تھے کہ منظور بولا " یار یہ چاچا کے رشتہ داروں نے دم ناک میں کر دیا ہے " ۔

" بات تو یہی ہے مگر بھائی ۔۔۔ تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گذر نے دے " میں نے جواب دیا ۔

" نہیں جی " منظور نے جو خود بھی ایک ہنگامہ پسند " لیڈر طبع " نوجوان تھا سر کے گنجان بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا " خدا کی قسم ! میں اس چاچا کو سبق سکھا کر چھوڑوں گا کم از کم اسے معلوم تو ہو جائے کہ ہم لوگ جو اتنی مدت " چپتے " رہے ہیں نرے چغد نہ تھے " ۔ " مگر کیسے " ؟ میں نے اسکیم پوچھی ۔

" اسکیم یہ ہے " منظور کچھ سوچتے ہوئے بولا ۔ اسکیم یہ ہے کہ آج میں بھی اپنے رشتہ داروں کی ڈینگیں اڑاؤں گا ۔ سو رشتہ دار لٹاؤں گا ۔ رشتہ دار پہ رشتہ دار چھوڑوں گا نہلے پر دہلے ماروں گا " ۔

" مگر اتنے ڈھیر سے اونچے اونچے رشتہ دار کہاں سے لاؤ گے پیارے ! " میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا ۔۔ " لے دے کے تمہارا ایک چچا دفعہ ۳۰ کا مجسٹریٹ تھا ۔ سو پچھلے سال سے موقوف ہو کر وہ بھی گھر آ بیٹھا ہے ۔ ننگی نہائے کیا ۔۔۔ نچوڑے کیا " ؟

منظور نے زور کا ایک قہقہہ لگایا اور کہا " جیسے وہ ساری دنیا سچ مچ چاچا کی رشتہ دار ہوتی ہے تمہارے نزدیک ایشیا کی پوری تاریخ غالباً چاچا کے خاندان پر اترتی ہے ؟ ۔۔۔ میرے بھائی جب رشتہ دار گھڑنے ہی ٹھہرے تو ۔۔۔ ملک خدا تنگ نیست " ۔

ہم پہنچے تو ڈارمیٹری کی محفل رنگ پر جاری تھی۔ سامعین برف میں لگے ہوئے دہی کی یخ لسی پی رہے تھے اور چاچا اپنے شجرہ نسب کے درخت پر بہت اونچے جا چکے تھے۔ غالباً سلیوکس کے آس پاس کہیں پھر رہے تھے۔ چاچا ذرا اونچا جانے لگے تو منظور نے ٹوکنا شروع کیا۔ درمیان میں موقع بے موقع اپنے بزرگ چھوڑنے شروع کئے۔ ظاہر ہے کہ چاچا کے لئے یہ بات سخت ناگوار تھی۔ انہوں نے پہلے تو نرمی اور شفقت سے سمجھانے کی کوشش کی کہ عزیزمن دیکھو۔ دوسرے کی بات کاٹنا سخت بدتمیزی کی بات ہے لیکن جب منظور باز نہ آیا تو چاچا قدرے برہم ہو کر بولے۔

۔ ـــــ افسوس کہ بی۔ اے کا امتحان تک دے بیٹھے ہو اور جن ذلیل ٹٹ پونجیوں میں سے تم ہو۔ اندیشہ ہے کہ پاس ہو کر رہو گے لیکن برخوردار! تم یہاں سے کچھ سیکھ کر نہیں جا رہے۔ اس کلرکی والی ڈگری کو شہد لگا کر چاٹتے رہنا۔

لیکن منظور پر کسی تادیب یا سرزنش کا کوئی اثر نہ تھا وہ چاچا کے روبرو اپنے رشتہ داروں اور بزرگوں کے ڈھیر کے ڈھیر لگائے جا رہا تھا ـــ چاچا کی پیش قدمی کا راستہ روکے کھڑا تھا لوگ حیران تھے۔

بات جب بڑھ گئی تو پنچوں کے بیچ بچاؤ کرنے پر طے یہ ہوا کہ اگلے ہفتے کی رات کو چاچا اور منظور دونوں اپنے اپنے قدیم و جدید قابل فخر رشتہ داروں کی تصویریں لائیں گے اور تاش کے تپلک طرح ان تصویروں سے کھیلا جائے گا۔ کرکٹ ٹیم کے ہر دلعزیز کپتان آفتاب احمد خاں کو ثالث بخیر مقرر کیا گیا۔ اور فتح و شکست کا اصول یہ وضع ہوا کہ عہدہ و منصب کے بھی خیر کچھ نمبر ہوں گے لیکن ہار جیت کا اصل دارومدار رشتہ داری کی شکل و صورت پر ہوگا۔ دونوں طرف سے پانچ قدیم "بزرگ" اور دس جدید رشتہ دار کھیلنے کی اجازت ہوگی ـــ اتنے بڑے دو خاندانوں میں سے دس بیس آدمی تو نکل ہی آنے چاہئیں اور وہ بڑا خاندان ہی کیا جس کے پاس بزرگوں کی تصاویر تک نہ ہوں۔

ہفتے کی رات کو چاچا کی ڈارمیٹری میں رش کا یہ حال تھا کہ اکھاڑہ ڈارمیٹری میں سے اٹھا کر ہوسٹل کے چمن زار میں قائم کرنا پڑا۔ کچھ ایسا منظر تھا۔ جو الیکشن کے دنوں میں پولنگ اسٹیشن پر نظر آتا ہے۔ چاچا اور منظور کے حامیوں کے الگ الگ کیمپ تھے۔ چاچا کے کیمپ میں میں رونق اور گہما گہمی تھی۔ لسی اور فالودہ تقسیم ہو رہا تھا۔ منظور کے کیمپ میں تعلقات کے مارے ہوئے ہم آٹھ دس آدمی بیٹھے مکھیاں مار رہے تھے بلکہ ہمارا "پہلوان" جو پچھلے دنوں چار روز سے خدا معلوم کہاں غائب تھا ابھی تک پہنچا بھی نہ تھا۔

بارے کوئی نو بجے کے قریب ہمارا پہلوان بھی آ پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا لفافہ تھا جس میں اس کے بزرگ بند تھے۔ دوسری طرف چاچا نے ایک بڑے تھیلے میں "بزرگوں" کا انبار لگا رکھا تھا۔ لیکن ہمیں منظور کے ہاتھ میں ایک لفافہ دیکھ کر بھی ایک گونہ اطمینان ہو گیا۔ ورنہ یہاں تو اندیشہ یہ تھا کہ اسے کہیں خالی ہاتھ ہی نہ لڑنا پڑے۔

ٹھیک نو بجے درمیان میں ایک میز بچھا دی گئی اور ثالث آفتاب احمد خاں نے مقابلے کا اعلان کر دیا۔ چاچا دنیا اور منظور آمنے سامنے بیٹھ گئے اور دونوں کے دو دو حمایتی تصویروں کے بنڈلوں سمیت میز کے قریب آ گئے۔ ہجوم پر ایک سناٹا چھا گیا۔ جیسے واقعی کوئی تاریخی معرکہ ان کے سامنے تھا۔

چاچا نے سب سے پہلے وہی خان خاناں بیرم خاں کھیلا۔ ثالث نے بیرم خاں کی تصویر اٹھا کر چاروں طرف گھما کر تماشائیوں کو دکھائی اور پھر چاچا کے سرگرم حمایتی لالہ لیعقوب نے تاریخ ہند میں سے بیرم خاں کے حالات پڑھ کر سنائے حاضرین نے پرشور تالیوں سے "بیرم خاں" کا استقبال کیا ـــ بیرم خاں ہندوستان میں چاچا کے مورث اعلیٰ تھے۔

"بیرم خاں" کو دیکھ کر ہمارے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ ہمیں یقین تھا کہ منظور کے لفافے میں پٹواریوں، گرداوروں اور نہر کے پنسال نویسوں وغیرہ کے سوا اور کیا ہوگا؟ اور یہ سب کے سب مل کر بھی "بیرم خاں" کو چت نہیں کر سکتے۔ مگر منظور بڑے اطمینان سے اُٹھا اور لفافے میں سے ایک تصویر کھینچ کر میز پر ڈال دی۔ ثالث نے تصویر ہاتھوں میں بلند کی تو لوگ بھونچکا رہ گئے۔ یہ جلال الدین اکبر شاہنشاہ ہندوستان کی تصویر تھی۔

تصویر اگرچہ خاندانی نوادر کے بجائے کسی کتاب میں سے پھاڑی گئی تھی، مگر اکبر بہر حال اکبر تھا۔ لالہ لیعقوب نے ایک آئینی اعتراض کرتے ہوئے پوچھا تو کیا آپ مغل بادشاہوں کی اولاد میں سے ہیں؟

"جی ہاں! میں دارا شکوہ کی نسل میں سے ہوں۔ ذرا صبر کیجئے ابھی اورنگ زیب بھی میدان آتا ہے۔"

اس پر دونوں طرف بڑا ہنگامہ ہوا۔ ایک دوسرے سے ثبوت طلب کئے گئے، لیکن معلوم ہوا کہ ثبوت دونوں کے پاس کوئی نہ تھا ـــ چاچا کے پاس بیرم خاں کی پرانی روغنی تصویر ضرور تھی لیکن ہمارا جواب تھا کہ ایسی تصویریں تو کباڑیوں کے ہاں سے عام مل جاتی ہیں! بہر حال ثالث نے "اکبر" کے حق میں فیصلہ دے دیا اور اس پہلی شاندار فتح کے ساتھ ہی رائے عامہ کی ہمدردیاں بھی ہمارے ساتھ ہو گئیں۔ ثالث کو منظور نے

پہلے کا نمونہ دکھا تھا۔

یہاں چاچا کے طرف داروں نے ایک اور چال چلی، انہیں معلوم تھا کہ چاچا کے پاس قدیم بزرگوں میں وزراء، اُمرا اور جاگیردار وغیرہ ہی تھے یا زیادہ سے زیادہ سلیوکس اور امیر تیمور کا ایک سپہ سالار تھا مگر وہ اب جان گئے تھے کہ منظور کے لفافے میں بابر سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک پورا خاندان مغلیہ بند تھا۔ بادشاہ لاکھ لٹ پٹ جائے آخر بادشاہ ہے۔ پھر بابر، ہمایوں، اکبر اور جہانگیر وغیرہ کو کون شکست دے سکتا ہے۔ ان کے مقابلے کے لئے سلیوکس کے آقا نے ولی نعمت خود سکندر اعظم کی ضرورت تھی مگر اسکندر اعظم بدقسمتی سے چاچا کی ٹپاری میں موجود نہ تھا اور یہ بیرم خاں، خانی خاں، آصف الدولہ اور شائستہ خاں جنہیں چاچا اٹھائے پھر رہے تھے اگرچہ بڑے نام آور بزرگ تھے لیکن اگر سچ مچ یہ تصویریں زندہ ہو جائیں اور منظور کے لفافے میں سے نکل کر شاہنشاہ ہند جلال الدین اکبر ان کے سامنے آ جائیں تو یہ سب ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جائیں گے۔ یہ سوچ کر چاچا کے حامیوں نے پینترا بدلا۔ انہوں نے کہا چونکہ مغل بادشاہوں کا معاملہ درمیان میں آ گیا ہے اور بادشاہوں کے معاملے میں مسلمان بے حد جذباتی ہیں لہٰذا ہمیں انصاف کی توقع نہیں

اب جدید زمانے کے رشتہ داروں میں مقابلہ شروع ہوا۔

چاچا کی طرف سے ایک بزرگ کھیلے گئے۔

خشخشی داڑھی اور لبوں پر سے کتری ہوئی مونچھیں، سنہری فریم کی عینک لارڈ لنلتھگو کے زمانے میں پبلک سروس کمیشن کے ممبر رہ چکے تھے، یہ ان کے پھوپھا تھے۔

الہٰی خیر! پرانے زمانے کے قصے میں تو منظور بادشاہوں کو اپنی کمک پر لے آیا تھا، لیکن ان ذی مناصب کا توڑ کہاں سے لائے گا ——؟ ہمیں اپنی شکست یقینی نظر آنے لگی۔

"یہ میرے ماموں" منظور نے ایک خوبصورت نوجوان کی تصویر میز پر رکھتے ہوئے کہا "ایم۔ اے میں پڑھ رہے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ بی۔ اے میں یونیورسٹی بھر میں اول آئے تھے، زندہ رہتے تو بڑے مرتبے کو پہنچتے۔

تصویر گھمائی گئی تو وہ الناصر یا دلیپ کمار میں سے کسی فلم ایکٹر کی تصویر تھی۔ چاچا کو تو خیر کیا پتا چلتا۔ مگر لالہ یعقوب نے فوراً اعتراض کیا۔

"یہ تو فلم ایکٹر الناصر کا فوٹو ہے۔"

"ممکن ہے دونوں ہم صورت ہوں ویسے یہ میرے ماموں خداداد حسین خاں ہیں" منظور نے انتہائی بے پروائی اور بے اعتنائی سے جواب دیا اور ثالث نے اعتراض رد کر دیا۔

اب چاچا کے حامیوں نے پبلک سروس کمیشن کی ممبری کو اچھالنا شروع کیا، لیکن ادھر خداداد حسین خاں بھی بڑی صلاحیتوں کا نوجوان تھا۔ بی۔ اے میں بی۔ اے کا ریکارڈ توڑ چکا تھا موت مہلت دیتی تو کیا عجب تھا کہ ایم۔ اے میں سرے سے یونیورسٹی کو ہی توڑ کے رکھ دیتا اور پھر سول سروس کے مقابلے میں کم از کم پہلے نمبر پہ آتا اور کسی "برخوردار صوبے" کی چیف کمشنری پہ ہاتھ صاف کر جاتا۔"

یہاں چاچا کے وکیل یعقوب لالہ نے ایک دلچسپ آئینی نکتہ اُٹھا کر چاچا کے پھوپھا کی فضیلت ثابت کرنے کی ایک آخری کوشش کی دلیل یہ تھی کہ پھوپھا وزیر مناسب تھے لہٰذا خداداد حسین خاں کی کامیابی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یوں بھی چننے والے چنے جانے والے میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔

منظور نے جواب دیا۔

اگر آپ کے پھوپھا میاں خداداد جیسے جینیس نوجوان کے چناؤ کی مخالفت کرتے تو اس کے معنی صاف یہ تھے کہ وہ خود اپنے منصب کے نااہل تھے —" اور اس پہ رائے عامہ نے جو اب جا و بے جا امیر کے مقابلے میں غریب کا ساتھ دے رہی تھی، واہ واہ کا ڈونگرا برسا دیا اور جوانا مرگ خداداد حسین پبلک سروس کمیشن پہ بازی لے گیا۔

چاچا نے اس پر تاؤ کھا کر بڑے زور سے ایک تصویر میز پہ پٹخ دی۔ شیروانی کے ساتھ شلوار پہنے ہوئے بڑی بڑی مونچھوں والے ایک صاحب تھے جنہوں نے سکندر حیاتی طرے والی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ مڈل تک پڑھے ہوئے تھے، مگر ایک صوبے کے وزیر رہ چکے تھے۔ اب اگرچہ مدت سے بے مصرف سے ہو چلے تھے تاہم صوبے کے اونچے لیڈروں میں ان کا شمار ہوتا تھا اور وزارتی ردوبدل کے موقع پر زیر غور امیدواروں کی فہرست میں ان کا نام ضرور لیا جاتا تھا۔ ہاں ایک ٹانگ دوسری سے قدرے چھوٹی تھی۔

چاچا نے ان کی تصویر کے ساتھ اخبارات کے تراشوں کا ایک ڈھیر بھی میز پہ ڈال دیا۔ یہ وہ بیانات تھے جو چاچا کے اس خالو نے وقتاً فوقتاً شائع کرائے تھے مگر چاچا کے یہ سابق وزیر اور حالی لیڈر خالو شکل و صورت کے نمبروں پر منظور کے چچا "سہراب مودی" کے ہاتھوں پٹ گیا۔

خالو کے بعد چاچا کے سات آٹھ چچے اور تاؤ چچوں کے پیچھے اور تاؤ جن میں دیہات سدھار کا

کمشنر، تعلقات عامہ کا ڈائرکٹر اور فوج کا ایک بوڑھا آنریری کپتان زیادہ نمایاں تھے۔ یکے بعد دیگرے یہ سب منظور کے ایکٹروں کے ہاتھوں مارے گئے۔ چاچا کے رشتہ داروں کو اصل میں بھوگ پڑا تھا کہ دفتر کی کرسیوں نے ان کے چہرے بری طرح مسخ کر ڈالے تھے۔ فائلوں نے آنکھوں سے چمک اور رخساروں سے زندگی نچوڑ رکھی تھی۔ کہیں کہیں اگر چہرے پر تھوڑی بہت رونق بحال تھی تو چاچا کے خاندان کے خوفناک طور پر اونچی ناکوں اور مڑی ہوئی خاندانی ناکوں نے حالات کو سخت ابتر کر رکھا تھا۔ دوسری طرف منظور کے معمولی معمولی عہدہ دار سیاح، تاجر اور پروفیسر تھے مگر دراصل چونکہ سب ایکٹر تھے۔ لہٰذا ویڈیزی کے پورے نمبر لیے جا رہے تھے جو ہار جیت کا اصل معیار طے پا چکا تھا۔ ہوسٹل کی واٹنے عامہ جیسے کالج کے بعد اپنے سامنے بھی معمولی کلرکی کا میدان سامنے نظر آ رہا تھا اور بچے منصب داروں کے خلاف تھی۔ کچھ چاچا کی خاندانی ناک نے اسے مشتعل کر رکھا تھا۔ چنانچہ جب تعلقات عامہ کے ڈائرکٹر پر بحث چھڑی تھی تو تماشائیوں میں سے کسی نے بآواز بلند کہا۔

" اسے اٹھا کر کسی عجائب خانے میں رکھ دیجیے جناب"۔

بہرحال جب رشتہ داروں کا یہ "جلوس" بہت لمبا ہو گیا تو تماشائیوں میں سے کالج ڈرامیٹک یونین کے شریر و بذلہ سنج سیکرٹری سعداللہ بٹ نے چلا کر مطالبہ کیا۔

"اپنے والد ماجد میدان میں اتار دیجیے"۔ یہ مطالبہ کچھ ایسا مقبول ہوا کہ تمام ہجوم یکبارگی چلا اٹھا " باپ چاہیے۔ باپ لائیے - - - - - باپ۔ باپ۔ باپ"۔ مگر باپ نہ چاچا کے بنڈل میں تھا نہ منظور کے لفافے میں۔

زنانہ اردو خط و کتابت

شفیق الرحمٰن

سرتاجِ من سلامت۔

کورنشات بجا لاکر عرض کرتی ہوں کہ منی آرڈر ملا۔ رسید پر پڑھ کر کہ طبیعت اچھی نہیں ہے۔ از حد تشویش ہے۔ لکھنے کی بات تو نہیں مگر مجھے بھی تقریباً دو ماہ سے ہر رات بدخوابی ہوتی ہے۔ آپ کے متعلق بُرے بُرے خواب نظر آتے ہیں خدا خیر کرے۔ صبح کو صدقے کی قربانی دے دی جاتی ہے۔ اس پر کافی خرچ ہو رہا ہے۔

آپ نے پوچھا ہے کہ میں رات کو کیا کھاتی ہوں۔ بھلا اس کا تعلق خوابوں سے کیا ہو سکتا ہے۔ وہی معمولی کھانا ہوتا ہے۔ البتہ سوتے وقت ایک سیر کڑھا ہوا دودھ، کچھ خشک میوہ اور آپ کا ارسال شدہ موہن حلوہ استعمال کرتی ہوں۔ حلوہ اگر زیادہ دیر رکھا رہا تو خراب ہو جائے گا۔

سب سے پہلے آپ کے بتائے ہوئے ضروری کام کے متعلق لکھ دوں کہ بعد میں یاد نہ رہے۔ آپ نے تاکید فرمائی ہے کہ میں فوراً بیگم فریدی سے مل کر مکان کی خرید کے سلسلے میں ان کا آخری جواب آپ کو لکھ دوں۔ کل اُن سے ملی تھی۔ شام کو تیار ہوئی تو ڈرائیور غائب تھا، یہ غفور دن بدن سست ہوتا جا رہا ہے، عمر کے ساتھ ساتھ اس کی بینائی بھی کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ اس مرتبہ آتے وقت اس کے لئے ایک اچھی سی عینک لیتے آئیں۔ گھنٹوں کے بعد آیا تو بہانے تراشنے لگا کہ تین دن سے کار مرمت کے لئے گئی ہوئی ہے، چاروں ٹائر بیکار ہو چکے ہیں، ٹیوب پہلے سے چھلنی ہیں یہ کار بھی جواب دیتی جا رہی ہے، آپ کے آنے پر نئی کار لیں گے۔ اگر آپ کو ضرورت ہو تو اس کار کو منگا لیں۔ خیر تانگہ منگایا راستے میں ایک جلوس ملا، بڑا غل غپاڑہ مچا ہوا تھا۔ ایک گھنٹے ٹریفک بند رہا۔ معلوم ہوا کہ خان بہادر رحیم خاں کے صاحبزادے کی برات جا رہی ہے۔ برات نہایت شاندار تھی۔ تین آدمی اور دو گھوڑے زخمی ہوئے۔

راستے میں زینت بوا مل گئیں۔ یہ ہماری دور کی رشتہ دار ہوتی ہیں۔ احمد چچا کے سُسرال میں جو ٹھیکیدار صاحب

ہیں نا، اُن کی سوتیلی ماں کی سگی بھتیجی ہیں۔ آپ ہمیشہ زینب بُوا اور رحمت بوا ملا دیتے ہیں۔ رحمت بُوا میری ننھیال سے ہیں، ماموں عابد کے ہم زلف کے تائے کی نواسی ہیں۔ رحمت بوا بھی ملی تھیں۔ میں نے ان سے کہا کہ کبھی باجی قدسیہ کو ساتھ لاکر ہمارے ہاں چند مہینے رہ جائیں۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے۔ باجی قدسیہ بھی اپنے عزیزوں میں سے ہیں۔ یہ وہی ہیں جو تایا نعیم کے ساتھ ہماری شادی پر آئی تھیں، تایا نعیم کی ساس ان کی دادی کی منہ بولی بہن تھیں، بلکہ ایک دوسرے سے دوپٹہ بدل چکی تھیں۔ یہ سب اس لئے لکھ رہی ہوں کہ آپ کو اپنے عزیز واقارب یاد نہیں رہتے۔ کیا عرض کروں آج کل زمانہ ایسا آگیا ہے کہ رشتہ دار کو رشتہ دار کی خبر نہیں۔ میں نے زینب بوا کو گھر آنے کے لئے کہا وہ اسی شام آگئیں۔ میں نے بڑی خاطر کی۔ خواہش ظاہر کرنے پر آپ کے ارسال شدہ روپیوں میں سے دو سو انہیں اُدھار دیئے ہاں تو میں بیگم فرید کے ہاں پہنچی، بڑے تپاک سے ملیں، بہت بدل چکی ہیں۔ جوانی میں مس فریدہ کہلاتی تھیں اب تو بالکل رہ گئیں ہیں، ایک تو بے چاری پہلے ہی اکہرے دن کی ہیں اس پہ طرح طرح کے فکر گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھتی ہیں۔ کہنے لگیں اگلے ہفتے برخوردار نعیم کا عقیقہ ہے اس سے اگلی جمعرات کو نورِ چشمی بتول سلمہا کی رخصتی ہوگی ضرور آنا۔

میں نے حامی بھر لی۔ اور مکان کے متعلق ان سے آخری جواب مانگا۔ پہلے کی طرح چٹاخ پٹاخ باتیں نہیں کرتیں آواز میں بھی وہ کرارا پن نہیں رہا۔ انہیں تو یہ بتول لے کر بیٹھ گئی، عمر کا بھی تقاضہ ہے۔ سوچ رہی ہوں جاؤں نہ جاؤں دو ڈھائی سو روپے خرچ ہو جائیں گے۔ نیا جوڑا سلوانا ہوگا۔ ویسے تو ان سردیوں کے لئے سارے کپڑے نئے بنوانے پڑیں گے۔ پچھلے سال کے کپڑے اتنے تنگ ہو چکے ہیں کہ بالکل نہیں آتے۔ آپ بار بار سیر اور ورزش کو کہتے ہیں۔ بھلا اس عمر میں مستانوں کی طرح سیر کرتی ہوئی کیا اچھی لگوں گی۔ ورزش سے مجھے نفرت ہے۔ خواہ مخواہ جسم کو تھکانا اور پھر پسینہ، نہ آج تک کی ہے نہ خدا کرائے۔ کبھی کبھی کاڈیز زنانہ کلب چلی جاتی ہوں۔ وہاں ہم سب بیٹھ کر نٹنگ کرتی ہیں۔ واپس آتے آتے اس قدر تکان ہو جاتی ہے کہ بس۔

آپ ہنسا کرتے ہیں کہ نٹنگ کرتے وقت عورتیں باتیں کیوں کرتی رہتی ہیں، اس لئے کہ کسی کام میں لگی رہیں۔

آپ نے جگہ جگہ خط میں شعر و شاعری اور الٹی سیدھی باتیں لکھی ہیں، ذرا سوچ تو لیا ہوتا کہ بچوں والے گھر میں خط جا رہا ہے، اب ہمارے وہ دن نہیں رہے کہ ایسی باتیں ایک دوسرے کو لکھیں، شادی کو پانچ برس گذر چکے ہیں، خدارا ایسی باتیں آئندہ مت لکھئے۔ توبہ توبہ اگر کوئی پڑھ لے تو کیا کہے۔

ان دنوں میں فرسٹ ایڈ سیکھنے نہیں جاتی۔ ٹریننگ کے بعد کلاس کا امتحان ہوا تھا آپ سنکر خوش ہونگے کہ میں پاس ہوگئی

پچھلے ہفتے ایک عجیب واقعہ ہوا، ہو کے لڑکے کو بخار چڑھا تھا دوں تپ رہا تھا کہ چھنے رکھوا دو بھوں لو۔ میں نے تھرما میٹر لگایا تو نارمل تھا۔ دوبارہ لگایا تو نارمل سے بھی نیچے چلا گیا۔ پتہ نہیں کیا وجہ تھی۔ پھر گھڑی لے کر نبض گننے لگی۔ دفعتہً یوں محسوس ہوا جیسے لڑکے کا دل ٹھہر گیا ہو کیونکہ نبض رُک گئی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ دراصل گھڑی بند ہو گئی تھی۔ یہ فرسٹ ایڈ بھی یونہی ہے خواہ مخواہ وقت ضائع کیا۔

ڈاکٹر میری سٹوپس کی کتاب ارسال ہے، اگر دکاندار واپس لے لے تو لوٹا دیجئے یہ باتیں بھلا ہم مشرق کے رہنے والوں کے لئے تھوڑا ہی ہیں، اس کی جگہ بہشتی زیور کی ساری جلدیں بھجوا دیجئے، ایک کتاب گھر کا حکیم کی بڑی تعریف سُنی ہے یہ بھی بھیج دیجئے۔

چند نئی فلمیں دیکھیں، کافی پسند آئیں، ہیرو کا انتخاب بہت موزوں تھا لمبے لمبے بال کھوئی کھوئی نگاہیں کھلے گلے کا کُرتہ، گانے کا شوق، کسی کام کی بھی جلدی نہیں، فرصت ہی فرصت، آپ بہت یاد آئے، شادی سے پہلے میں آپ کو اسی روپ میں دیکھا کرتی تھی، کاش کہ آپ کے بھی لمبے لمبے بال ہوتے، ہر وقت کھوئی کھوئی نگاہوں سے خلا میں تکتے۔ کھلے گلے کا کُرتہ پہن کر گلشن میں گانے گایا کرتے۔ نہ یہ کمبخت دفتر کا کام ہوتا اور نہ ہر وقت کی مصروفیت، لیکن خواب کب پورے ہوتے ہیں۔؟

ان فلموں میں ایک بات کھٹکتی ہے، ان میں عورتوں کی قوالی نہیں ہے۔ فلم بناتے وقت نہ جانے ایسی اہم چیز کو کیوں نظر انداز کر دیتے ہیں دوسرے یہ کہ گیت بے حد معمولی ہیں۔ مثلاً ایک گانا بھی ایسا نہیں ہے جس میں راجہ جی مورے راجہ یا ہو را جہ آتا ہو۔ یہ سادہ الفاظ گیت میں جان ڈال دیتے ہیں۔

ایک ضروری بات آپ سے پوچھنا تھی۔ زینب بوا نے شبہ سا ڈال دیا ہے کہ آپ کے لفافوں پہ پتہ زنانہ تحریر میں لکھا ہوا ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کے دفتر میں کوئی سکریٹری یا اسٹینو گرافر وغیرہ آ گئی ہو اور آپ مصروفیت کی بنا پہ پتہ اس سے لکھواتے ہوں۔ یہ لڑکی کس عمر کی ہے؟ شکل وصورت میں کیسی ہے؟ غالباً کنواری ہو گی؟ اس کے متعلق مفصل طور پہ لکھئے، اگر ہو سکے تو اس کی تصویر بھی بھیجئے۔

باقی سب خیریت ہے، اور کیا لکھوں، بس بچے ہر وقت آپ کو یاد کرتے ہیں، اصغر روز پوچھتا ہے کہ ابا میری سائیکل کب بھیجیں گے۔ آپ نے آنے کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ اب تو منی کی بسم اللہ بھی قریب آ چکی ہے۔ میری مانیئے تو واپس یہیں تبادلہ کرا لیجئے۔ بھاڑ میں جائے یہ ترقی اور ایسا مستقبل۔ تھوڑی سی اور ترقی دے کر محکمے والے کہیں آپ کو اور دور نہ بھیج دیں۔

آپ بہت یاد آتے ہیں۔ ننھے کی جرابیں پھٹ چکی ہیں۔ ننھی کے پاس ایک بھی نیا فراک نہیں رہا۔ بُرا ہو پردیس کا صورت دیکھنے کو ترس گئے ہیں۔ امّی جان کی اونی چادر اور کمبلوں کا انتظار ہے۔

ہر وقت آپ کا انتظار رہتا ہے۔ آنکھیں دروازے پر لگی رہتی ہیں۔ صحن کا فرش جگہ جگہ سے اکھڑ رہا ہے۔ مالی کام نہیں کرتا، اس کی لڑکی اپنے خاوند کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

آتے وقت چند چیزیں ساتھ لائیں۔ بچوں کے جوتے اور گرم کوٹ، ننھے کی جرابیں اور کنٹوپ، ننھی کی فراک، دو چمڑے کے صندوق، زینب بوا کے لئے اچھا سا تحفہ، بلّی کے گلے میں باندھنے کے لئے ربن اور کتے کا خوبصورت سا کالر، کچھ سوہن حلوہ اور ننھی کا سوئیٹر۔ ننھی کے کان میں پھنسی تھی، چچا جان سول سرجن بلانے کو کہتے تھے میں نے منع کر دیا۔ کیونکہ کل تعویذ آ جائے گا۔

یہاں کی تازہ خبریں یہ ہیں کہ پھوپھی جان کی بھینس اللہ کو پیاری ہوئی، سب کو بڑا افسوس ہوا۔ اچھی بھلی تھی دیکھتے دیکھتے دم توڑ دیا۔ میں پُرسہ دینے گئی تھی تایا نعیم کا لڑکا کہیں بھاگ گیا ہے، احمد چچا کا جس بینک میں حساب تھا وہ بینک فیل ہو گیا ہے۔ اور ملاں پھوپھا جان کی ساس جو اکثر بہکی بہکی باتیں کیا کرتی تھیں اب بالکل باؤلی ہو گئی ہیں۔ بقیہ خبریں اگلے خط میں لکھوں گی۔

مزاج کو کنیز کا آداب فقط

(ایک بات بھول گئی، منی آرڈر پر مکان کا نمبر ضرور لکھا کیجئے اس طرح ڈاک جلدی مل جاتی ہے)

امّی جان کے نام

میری پیاری امّی میری جان امّی!

بعد ادائے آداب کے عرض یہ ہے کہ یہاں پر ہر طرح سے خیریت ہے اور خیر و عافیت آپ کی خداوند کریم سے نیک مطلوب ہوں، صورت احوال یہ ہے کہ یہاں سب خیریت سے ہیں۔ والا نامہ آپ کا صادر ہوا۔ دل کو از حد خوشی حاصل ہوئی۔ چچا جان کے خسر صاحب کے انتقال پُر ملال کی خبر سُن کر دل کو از حد قلق ہوا، جب سے یہ خبر سُنی ہے چچی جان دھاروں رو رہی ہیں۔ خلیفہ جی یہ شنائونی لے کر پہنچے تو کسی سے اتنا نہ ہوا کہ ان کی دعوت ہی کر دیتا۔ میں نے سوچا کہ اگر ذرا سی الکسی ہو گئی تو خاندان بھر میں تھڑی تھڑی ہو جائے گی۔ فوراً خادمہ کو لے کر باورچی خانہ میں پہنچی۔ اُس نے جھپاک جھپاک آٹا گوندھ۔ لیکن سالن قدرے تیز آنچ پر پک گئے۔ چنانچہ پھل پھلواری سے خلیفہ جی کی تواضع کی بہت

خوش ہوئے۔ تائی صاحبہ نے خوان بھجوا کر حاتم کو شرمندہ کرنے کی کوشش کی، دوسرے روز ناشتہ پر بھی بلوایا۔ اوچھے کے ہوئے تیر باہر باندھوں کہ بھتیر۔ یہ تائی صاحبہ بھی ہمیشہ اسی طرح کرتی رہتی ہیں۔ رنگ میں بھنگ ڈال دیتی۔ الفت جمیا آئی تھیں۔ تائی صاحبہ کا فرمانا ہے کہ یہ بچپن سے بہری ہیں۔ بہری وہری کچھ نہیں، فقط وہ سُنتی نہیں ہیں۔ کیا مجال جو آگے سے کوئی ایک لفظ بول جائے۔

دل گو نہیں جا رہا تھا لیکن آپ کے ارشاد کے مطابق اوپری دل سے ہم لوگ ممانی جان سے ملنے گئے، وہاں پہنچے تو سارا کنبہ کہیں گیا ہوا تھا، چنانچہ ہم چڑیا گھر دیکھنے چلے گئے، ایک نیا جانور آیا ہے زیبرا کہلاتا ہے۔ بالکل گدھے کا سپورٹس ماڈل معلوم ہوتا ہے اچھی ہی ہوا کہ دیکھ لیا ورنہ ممانی جان کی طعن آمیز گفتگو سننی پڑتی۔

پڑھائی خوب زوروں پر ہو رہی ہے، پچھلے ہفتے ہمارے کالج میں مس سید آئی تھیں۔ جنہیں حال ہی میں ولایت سے کئی ڈگریاں ملی ہیں بڑی قابل عورت ہیں۔ انھوں نے "مشرقی عورت اور پردہ" پر لیکچر دیا۔ ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی مس سیدہ نے ستائل کا ہلکا ہلکا گلابی جوڑا پہن رکھا تھا قمیض پر کلیوں کے سادہ نقش اچھے لگ رہے تھے گلے میں گہرا سُرخ پھول نہایت خوبصورتی سے ٹانکا گیا تھا۔ سعفون کے آبی دوپٹے کا کام مجھے بڑا پسند آیا۔ بیضوی بوٹے جوڑوں میں کاڑھے ہوئے تھے، ہر دوسری قطار کلیوں کی تھی۔ ہر چوتھی قطار میں دو پھول کے بعد ایک کلی کم ہو جاتی تھی۔ دوپٹے کا تو سادہ تھا لیکن بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ مس سید نے بھاری سینڈل کی جگہ لفٹی پہن رکھی تھی، کانوں میں ایک ایک نگ کے ہلکے پھلکے آویزے تھے تراشیدہ بال بڑی استادی سے برم کئے ہوئے تھے۔ جب آئیں تو کوٹھی کی خوشبو سے سب کچھ معطر ہو گیا۔ لیکن مجھے ان کی شکل پسند نہ آئی، ایک آنکھ دوسری آنکھ سے کچھ چھوٹی ہے۔ مسکراتی ہیں تو دانت بُرے معلوم ہوتے ہیں۔ ہنستی بہت ہیں۔ ویسے بھی عمر رسیدہ ہیں، ہوں گی ہم لڑکیوں سے کم از کم دس سال بڑی۔ ان کا لیکچر نہایت مقبول ہوا۔

آپ یہ سُن کر پھولی نہ سمائیں گی کہ آپ کی پیاری بیٹی امور خانہ داری پر کتاب لکھ رہی ہے، مجھے بڑا غصہ آتا تھا جب لوگوں کو یہ کہتے سُنتی تھی کہ پڑھی لکھی لڑکیاں گھر کا کام کاج نہیں کر سکتیں۔ چنانچہ میں نے یہ آزمودہ ترکیبیں لکھی ہیں جو ملک کے مشہور زنانہ رسالوں میں چھپیں گی۔ نمونے کے طور پر چند ترکیبیں نقل کرتی ہوں۔

لذیذ آرنج سکوائش تیار کرنا

آرنج سکواش کی بوتل لو۔ یہ دیکھ لو کہ بوتل آرنج سکواش ہی کی ہے کسی اور چیز کی تو نہیں۔ ورنہ نتائج خاطر خواہ

برآمد ہوں گے دوسری ضروری بات یہ ہے کہ مہمانوں اور گلاسوں کی تعداد ایک ہونی چاہیئے۔ گلاسوں کو پہلے صابن سے دھلوا لینا اشد ضروری ہے۔ بعدازیں سکواش کو بڑی حفاظت سے گلاس میں انڈیلو اور پانی کی موزوں مقدار کا اضافہ کر کے مرکب کو چمچے سے تقریباً نصف منٹ ہلاؤ۔ نہایت روح افزا اور یخ سکواش تیار ہوگا۔
موسم کے مطابق برف بھی استعمال کیا جا سکتا ہے (لیکن برف کو صابن سے دھلوا لینا نہایت ضروری ہے)

انڈا اُبالنا

یہ عمل اتنا آسان نہیں جتنا کہ لوگ سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر مشق ہو جائے تو ذرا مشکل نہیں لگتا۔ ایک انڈا لو۔ بہتر ہوگا کہ انڈا مرغی کا ہو) پیشتر اس کے کہ عمل شروع کیا جائے یہ معلوم کر لینا بہت اہم ہے کہ انڈا خراب تو نہیں اس کا سہل اور مجرب طریقہ یہ ہے کہ انڈے کو ایک کونے سے ذرا سا توڑ کر تسلی کر لی جائے۔ اب انڈے کو پانی میں ڈبو کر پانی اور انڈا دیگچی میں ڈالو۔ دیگچی کو چولہے پر رکھ کر گرم کرو اور ذرا ذرا سی دیر کے بعد پانی میں انگلی ڈال کر دیکھتے رہو کہ اُبال آنا شروع ہوا ہے یا نہیں۔ شوں شوں کی آواز پر آگ بجھا دو اور ہاتھ یا کسی اور چیز کی مدد سے جلدی سے انڈا دیگچی سے باہر نکال کر ٹھنڈا کر لو۔ اب انڈا تیار ہے اور کھایا جا سکتا ہے۔

مزے دار فروٹ سلاد تیار کرنا

مہمانوں کے یک لخت آ جانے پر ایک ملازم کو جلدی سے بازار بھیج کر کچھ بالائی اور ایک ٹین پھلوں کا منگاؤ اس کے آنے سے قبل ایک بڑی قاب کو صابن سے دھلوا لینا چاہیئے ورنہ بعض اوقات فروٹ سلاد میں اور طرح کی خوشبو آنے لگتی ہے۔ اب ٹین کھولنے کا اوزار لے کر ٹین کا ڈھکنا کھولنا شروع کرو، اور خیال رکھو کہ کہیں انگلی کٹنے نہ پائے۔ بہتر ہوگا کہ ٹین اور اوزار نوکر کو دیدو۔ اب پھلوں کو ڈبے سے نکال کر حفاظت سے قاب میں ڈالو اور بالائی کی ہلکی ہلکی تہہ جماؤ۔ نہایت مزے دار مفرح فروٹ سلاد تیار ہے۔ نوش جان کیجئے۔

میز پوش سینا

جس میز کے لئے پوش درکار ہو اُس کا ناپ لو۔ بہتر ہوگا کہ کپڑے کو میز پر پھیلا کر لمبائی کے مطابق وہیں قینچی سے قطع کر لیا جائے۔ اب ہاتھ یا پاؤں سے چلانے والی سینے کی مشین منگاؤ، سوئی میں دھاگہ پرو کر میز پوش کے ایک کونے سے سلائی شروع کرو۔ اور سیتے چلے جاؤ حتیٰ کہ وہی کونہ آ جائے جہاں سے بخیہ شروع کیا تھا۔ اب

میز پوش کو استعمال کے لئے تیار سمجھو۔ اگر سیتے وقت سارے کپڑے کے دو چکر لگ جائیں تو دگنا پائیدار میز پوش تیار ہوگا۔ ضروریات کے مطابق بعد میں بیل بوٹے کاڑھے جا سکتے ہیں۔

استری پھیرنا

اپنے قد سے تقریباً دو فٹ نیچی میز منگاؤ، استری میں دہکتے ہوئے کوئلے ڈالو اور ہاتھ پھیر کر دیکھتے رہو کہ گرم ہو گئی ہے یا نہیں۔ جب ہاتھ پھیرنا مشکل ہو جائے تو سمجھو کہ استری تیار ہے اور پھیری جا سکتی ہے۔ اب استری کو کپڑے پر پھیرو۔ کپڑے کی تہہ درست کرنا نہ بھولنا چاہیئے۔ ساتھ ساتھ پانی کے چھینٹے دیتی جاؤ۔ کپڑے پر جب کپڑا بھاپ چھوڑنا شروع ہو جائے تو سمجھ لو کہ مکمل استری ہو گئی۔ دوسرا کپڑا پہلے استری شدہ کپڑے پر پھیلا کر یہ عمل دہرایا جا سکتا ہے۔ جب ایک جانی پہچانی بھینی بھینی خوشبو کمرے میں پھیلنے لگے تو استری یک لخت بند کر دو۔

کپڑے ڈرائی کلین کرنا

مناسب کپڑے چن کر ایک سمجھ دار ملازم کے ہاتھ ڈرائی کلین کی دکان پر بھجوا دو۔ بھیجنے سے پہلے ایک فہرست ضرور تیار کر لو۔ بہتر ہوگا کہ صرف وہی کپڑے بھیجو جنہیں بعد میں پہچان سکو۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کپڑے واقعی ڈرائی کلین کئے گئے ہیں۔ ایک بڑی آزمودہ ترکیب ہے۔ کپڑوں کو سونگھ کر دیکھو۔ اگر پٹرول کی بو آ رہی ہو تو سمجھ لو ٹھیک ہے۔ اب کپڑے ڈرائی کلین ہو چکے ہیں اور انہیں فوراً استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔

سچ بتانا امی جان آپ کو یہ ترکیبیں پسند آئیں؟ ایسے اور بہت سے نسخے بھی میرے پاس محفوظ ہیں جنہیں اگلے خط میں بھیجوں گی۔

میں علی الصبح اٹھتی ہوں۔ آپ کا ارسال شدہ ٹائم پیس اتنے زوروں سے بجتا ہے کہ رات کو اسے سنگھائی میں لپیٹ کر ایک کونے میں رکھنا پڑتا ہے۔ عید پر جو خالہ جان نے موٹاپے کا طعنہ دیا تھا اس کے لئے بڑی کوشش کر رہی ہوں، فالتو چیزوں کا استعمال آہستہ آہستہ بند کر رہی ہوں، نشاستے سے پرہیز کرتی ہوں کپڑوں تک میں نشاستہ نہیں لگنے دیتی۔

ایک خوشخبری دینا تو بھول ہی گئی، آپ کی پیاری بیٹی اس سال فارسی میں کالج میں دوئم آئی ہے یہ سب آپ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے ۔۔۔ ورنہ لونڈی کس لائق ہے۔ یہ آپ سے کس نے کہا کہ میں کلاس میں دیر سے پہنچتی تھی، پہلا

ں کا ہوتا تھا اور فارسی میں صرف دو لڑکیاں تھیں مجبراً اور میں شاید اطلاع میری سہیلیوں سے نہیں بلکہ
ہوں میں سے کسی نے پہنچائی ہوگی۔

خط ختم کرتی ہوں، میری طرف سے بزرگوں کی خدمت میں آداب، بچوں کو بہت بہت پیار۔ اور سب
۔۔ دیکھئے وہ کون سا مبارک دن ہوتا ہے کہ میں اپنی امی کو جھک کر آداب کروں اور امی جان مجھے کلیجے
ں اور سدا لگائے رکھیں۔ آمین ثم آمین! فقط ———— ناچیز آپکی بیٹی

منگیتر کو

ب بھائی صاحب!

کا خط ملا، میں آپ کو ہرگز خط نہ لکھتی لیکن پھر خیال آیا کہ آپ کی بہن میری سہیلی ہیں اور کہیں وہ
جائیں۔ وہم وگمان میں بھی نہ آسکتا تھا کہ کبھی ایک غیر مرد کو خط بھیجوں گی۔

کرتی ہوں کہ آئندہ خط لکھتے وقت اس بات کا خیال رکھیں گے کہ آپ ایک شریف گھرانے کی
لڑکی سے مخاطب ہیں۔ احتیاطاً تحریر ہے۔ میرا آپ کو خط لکھنا اس امر کا شاہد ہے کہ ہم لوگ
وسیع خیالات کے ہیں۔

بتایا گیا تھا کہ آپ رشیدہ اور حمیدہ کو جانتے ہیں کلثوم اور رفعت سے بھی واقفیت رہ چکی
ا اور اختر کو خط لکھا کرتے تھے۔ آپ کو کلب میں ناچتے ہوئے بھی دیکھا گیا ہے اور ایک شام کو آپ
پلے رنگ کی چیز چھوٹے سے گلاس میں پی رہے تھے اور خوب قہقہے لگا رہے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم
ہیں، ہمیں یہ ہوا نہیں لگی، نہ اس روش پہ چلنے کا ارادہ ہے، ہمارے ہاں جہاں مذہب، شرافت
، روایات کا خیال ملحوظ ہے وہاں اعلیٰ تربیت اور بلند خیالی بھی ہے۔

بی۔ اے آنرز میں پڑھتی ہوں۔ شام کو مولوی صاحب بھی پڑھانے آتے ہیں۔

نے لکھا ہے کہ آپ نے مجھے تانگے میں کالج سے نکلتے دیکھا ہے اور میں نے برقعے کا نقاب الٹ
پ نے کسی اور کو دیکھ لیا ہوگا۔ اول تو میں ہمیشہ کار میں کالج جاتی ہوں دوسرے یہ کہ میں نقاب نہیں
یشہ برقعہ میرے ہاتھ میں کتابوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔

ں مجھے ٹھوس مطالعہ کا شوق ہے۔ ابا جان کی لائبریری میں فرائیڈ، مارکس، ڈکنز، آگاتھا کرسٹی،

کارلائل پیرٹ چینی، مقورن سمتھ اور دیگر مشہور مفکروں کی کتابیں موجود ہیں میں نے سائیکولوجی پڑھنی شروع کی تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ سب کچھ تو مجھے پہلے سے معلوم ہے۔ فلاسفی پڑھی تو محسوس ہوا جیسے یہ سب درست ہے سوشل سائنس پڑھی تو لگا کہ واقعی یوں ہی ہونا چاہیئے تھا، آخر ہمیں ایک نہ ایک روز جدید تہذیب کے دائرے میں آنا تھا۔ زمانے کو بیسویں صدی تک بھی تو پہنچنا ہی تھا۔ میرے خیال میں کافی مطالعہ کر چکی ہوں چنانچہ آجکل زیادہ نہیں پڑھتی۔

آپ نے پوچھا ہے کہ موجودہ ادیبوں میں مجھے کون کون پسند ہیں۔ سو ڈپٹی نذیر احمد، مولانا راشد الخیری اور پنڈت رتن ناتھ سرشار میرے محبوب مصنفین ہیں، شاعروں میں نظیر اکبر آبادی مرغوب ہیں۔ خواتین میں ایک صاحبہ جن کا نام انگریزی کے حروف سے شروع ہوتا ہے بہت پسند ہیں، انہوں نے صرف دو ناول لکھے ہیں، ان میں جدید اور قدیم زیورات و پارچہ جات، بیاہ شادی کی ساری رسوم اور طرح طرح کے کھانوں کے ذکر کو اس خوبصورتی سے سمو دیا ہے کہ یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ ناول کہاں ہے اور یہ چیزیں کہاں؟

ایک اور خاتون ہیں جو باوجود ماڈرن ہونے کے ترقی پسند نہیں ہیں۔ ان کے افسانے ان کی امنگیں ان کی دنیا سب کچھ صرف اپنے گھر کی فضا اور اپنے خاندان تک محدود ہے۔ مبارک ہیں ایسی ہستیاں۔ ان صاحبہ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا پھر پتہ چلا کہ ان کا رنگ مشکی ہے اور عینک لگاتی ہیں۔

آپ کی جن کزن کا کہنا ہے کہ انہوں نے مجھے کلب میں دیکھا تھا ذرا ان سے پوچھئے کہ وہ خود وہاں کیا کر رہی تھیں۔

یہ جن حمید صاحب کا آپ نے ذکر کیا ہے وہی تو نہیں جو گورے سے ہیں جن کے بال گھنگھریالے ہیں اور داہنے ابرو پر چھوٹا سا تل ہے گاتے اچھا ہیں۔ روٹھتے بہت جلدی ہیں۔ جی نہیں، میں انہیں نہیں جانتی۔ شاید میں اُن سے کبھی نہیں ملی۔

میری حقیر رائے میں تو آپ نے آرٹس پڑھکر بڑا وقت ضائع کیا ہے۔ آپ کی بہن نے لکھا ہے کہ آپ کا ارادہ بزنس کرنے کا ہے۔ اگر یہی ارادہ تھا تو اتنے پڑھنے کی کیا ضرورت تھی۔ عمر میں گنجائش ہو تو ضرور کسی مقابلے کے امتحان میں بیٹھ جائیے۔ ملازمت کی کوشش کیجئے۔ کیونکہ ملازمت ہر صورت میں بہتر ہے اس کے بغیر نہ پوزیشن ہے نہ مستقبل۔ یہاں ڈپٹی کمشنر صاحب کی بیوی ساری زنانہ انجمنوں کی سیکریٹری ہیں اور تقریباً ہر زنانے جلسے کی صدارت وہی کرتی ہیں۔ دوسرا فائدہ ملازمت کا یہ ہے کہ انگلستان یا امریکہ جانے کے بڑے

موقعے ملتے ہیں ۔ مجھے یہ دونوں ملک دیکھنے کا ازحد شوق ہے ۔

آپ نے موسیقی کا ذکر کیا ہے اور مختلف راگ راگنیوں کے متعلق میری رائے پوچھی ہے ۔ جی ہاں مجھے بھی تھوڑا بہت شوق ہے ۔ جے جے ونتی سے آپ کو زیادہ دلچسپی نہیں ـــــ آپ کو تعجب ہوگا کہ جب دلی سے بھٹنڈہ آتے وقت میں نے جے جے ونتی سٹیشن کو دیکھا تو مجھے بھی پسند نہیں آیا ۔ میاں کی ملہار سے آپ کی مراد غالباً غا وند کی ملہار ہے ۔ جی نہیں میں نے یہ نہیں سنی ویسے ایک خاندان کے افراد بھی میاں کہلاتے ہیں شاید یہ ملہاران کی ہو ۔ آپ کا فرمانا ہے کہ ٹوڈی صبح کی چیز ہے لیکن میں نے لوگوں کو صبح وشام ہر وقت ٹوڈی بچہ ہائے ہائے کے نعرے لگاتے سُنا ہے ۔

بھوپالی کے متعلق میں زیادہ عرض نہیں کر سکتی کیونکہ مجھے بھوپال جانے کا اتفاق نہیں ہوا ۔ البتہ جوگ اور بھاگ کے بارے میں اتنا جانتی ہوں کہ جب یہ ملتے ہیں تو سوزِ عشق جاگ اٹھتا ہے (ملاحظہ ہو ـــ " جاگ سوز عشق جاگ ")

جی ہاں مجھے فنونِ لطیفہ سے بھی دلچسپی ہے ۔ مصوری، بُت تراشی، موسیقی، فوٹوگرافی اور کروشیئے کی بہت سی کتابیں ابا جان کی لائبریری میں رکھی ہیں ۔ میں اچھی فلمیں کبھی نہیں چھوڑتی ۔ ریڈیو پر بہت اچھا موسیقی کا پروگرام ہو تو ضرور سنتی ہوں ۔ خصوصاً دوپہر کے کھانے پر ۔ سیاسیات پر جو کچھ آپ نے لکھا ہے اس کے متعلق اپنی رائے اگلے خط میں لکھوں گی ۔

آپ کو میری سہیلی کے بھائی نے میرے متعلق باتیں بتائی ہیں ۔ ہاں یہ درست ہے کہ اسحٰق بھائی ہمارے ہاں آتے ہیں لیکن بس پندرہ بیس منٹ سے زیادہ دیر کے لئے نہیں ۔ اشفاق بھائی اور انور بھائی ہمارے ساتھ پہاڑ پر ضرور گئے تھے لیکن ان کی کوٹھی ہم سے ایک میل دور تھی ۔ پہاڑ کے دوسری طرف ۔ لطیف بھائی اور کلیم بھائی فقط اپنی بہنوں کو چھوڑنے آتے ہیں ۔ یہ غلط ہے کہ میں نے عفت کے بھائی کے ساتھ سفر کیا تھا ۔ رحیم بھائی یونہی اسٹیشن پر مل گئے تھے ۔ میں چھٹیوں پر گھر آ رہی تھی، انہیں کوئی کام تھا ۔ وہ اپنے ڈبے میں بیٹھے رہے میں اپنے ڈبے میں ۔ آپ جمیل بھائی اور مسعود بھائی سے پوچھ سکتے ہیں ۔

آپ کی بہن مجھ سے خفا ہیں اور خط نہیں لکھتیں ۔ ذرا ان سے کہیئے کہ شکایت تو الٹی مجھے ان سے ہونی چاہیئے ۔ انہوں نے دفن کردہ بات بتادی جو میں نے انہیں بتائی تھی کہ رفی کو نہ بتانا ۔ خیر بتانے میں تو کچھ حرج نہ تھا لیکن میں نے ان سے تاکیداً کہا تھا کہ اس سے یہ نہ کہنا کہ میں نے ان سے کہا تھا کہ اُس سے نہ کہنا ۔

اُن سے یہ بھی پوچھیئے کہ یہ کزن والی کون سی بات ہے جس پر انہوں نے مجھ سے قسم لی تھی کہ رقی تک نہ پہنچے۔ مجھے تو یاد نہیں۔ ویسے میری عادت نہیں کہ دانستہ طور پر کوئی بات کسی کو بتاؤں۔ اگر بھولے میں منہ سے نکل جائے تو اور بات ہے۔

خط گھر کے بجائے کالج کے پتے پر بھیجا کیجیئے اور اپنے نام کی جگہ کوئی فرضی زنانہ نام لکھا کیجیئے، یوں معلوم ہو جیسے کوئی سہیلی مجھے خط لکھ رہی ہے ——— باقی سب خیریت ہے۔

فقط آپ کی بہن کی سہیلی

(اور اس خط کا کسی سے بھی ذکر مت کیجئے تاکیداً عرض ہے)

سہیلی کو

پیاری سہیلی جھینلی۔

اوئی دل سخت کر لیا ہے، ایسا بھی کیا، کبھی خیر سلا کے دو لفظ ہی بھیج دیا کرو، وہی معاملہ ہوا کہ آنکھیں ہوئیں اوٹ تو دل میں آیا کھوٹ۔

شاید تمہیں پتہ نہیں کہ میں پہاڑ پر گئی ہوئی تھی۔ بوا میرا تو وہاں بالکل دل نہیں لگا، لوگ قدرتی نظارے قدرتی نظارے کی رٹ لگاتے ہیں۔ میرا تو ہفتے میں جی اچاٹ ہو گیا۔ نہ کوئی ڈھنگ کا سینما ہال، نہ اللہ ماری کوئی کام کی کپڑوں کی یا زیوروں کی دُکان۔ دو مہینے میں صرف آٹھ جوڑے سلوا سکی اور صرف ایک جوڑی سونے کے آویزے پسند آئے۔ اس آنے جانے میں نگوڑا نیا گرم کوٹ بھی نہ سِل سکا۔ اب سردیوں میں وہی پچھلے سال بنوایا ہوا کوٹ پہننا پڑے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ ساری گرمیوں میں ایک بھی نئے ڈیزائن کا جوڑا نہیں سلوا سکی۔ کسی نئی فلم میں ہیروئن کے کپڑے دیکھوں تو کچھ بنواؤں بھی۔

ایک بات بتاتی ہوں مگر وعدہ کرو کہ کسی سے نہیں کہو گی۔ کیونکہ نکلی ہونٹوں چڑھی کوٹھوں، وہ جو رشید ہے نا ——— اب تم مجھے چھیڑو گی! اے ہٹو، پہلے سُن بھی لو، اُس کے چچا کالج میں پروفیسر ہو کر آئے ہیں۔ ہوں گے کوئی پینتالیس چھیالیس برس کے، میں اگلی سیٹ پہ بیٹھتی ہوں، چنانچہ حضرت کو غلط فہمی ہو گئی۔ حالانکہ میں نے اتنی سی بھی لفٹ نہیں دی۔ سوائے اس کے کہ میں غور سے ان کی آنکھوں کو دیکھا کرتی تھی (آنکھیں اچھی ہیں) پروفیسروں کو کون غور سے نہیں دیکھتا۔ کبھی کبھار ان سے علیحدگی میں سوال پوچھ لئے تو کیا ہوا۔ کل تین یا چار مرتبہ اُن کے ساتھ

جانے ہیں، وہ بھی اُن کے بلانے پر۔ عید پر انہوں نے چھوٹے موٹے تحفے دیئے جوان کا دل رکھنے کے لئے قبول کرنے پڑے۔ صرف ایک دو دفعہ اُن کے ساتھ پکچر دیکھی بس کیا تھا شاعری پر اُتر آئے، کہنے لگے تم اب تک کہاں تھیں میری زندگی میں پہلے کیوں نہ آئیں۔ حالانکہ ان کی زندگی کے شروع کے حصے میں تو میں پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ شکل صورت معمولی ہے۔ گنجے بھی ہیں۔ سُنا ہے کئیوں سے وعدہ خلافی کر چکے ہیں۔ پانچ چھ سال کے بعد بڑے بوڑھوں میں کہلائیں گے۔ تعجب ہے اس عمر میں بھلا کوئی کیا وعدہ کر سکتا ہے۔

ناہید نے تو سب کے سامنے ان کی خبر لی، انہیں جھوٹا۔ ہٹ دھرم، مکار اور نہ جانے کیا کیا کہا، ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ خیر سے ہاکی فٹ بال کے دلیری بھی ہیں اور اس قسم کے کلمات کے عادی ہو چکے ہیں۔ دراصل ناہید بندی نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ، کھٹ شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا، بالکل بلا سوچے سمجھے جیسے کہ بعض اکثر کرتی ہیں۔

ایک شام کو ان کے مجبور کرنے پر ان کے ساتھ سنیما گئی، وہاں رشید اگلے درجے میں بیٹھا تھا۔ نہ جانے چچا کو کیا سوجھا کہ بھتیجے کو بلا کر پاس بٹھا لیا اور مجھ سے اسی طرح باتیں کرتے رہے۔ رشید کو خواہ مخواہ آگ لگ گئی۔ رشید کے چچا کی اس حرکت پر مجھے سخت غصہ آیا، انہوں نے نہ صرف میرا مستقبل کا پروگرام تباہ کر دیا بلکہ ایسی اچھی شام برباد کر کے رکھ دی۔ آج کل رشید کی مجھ سے لڑائی ہے، کل میں نے فون کیا تو طعنے دینے لگا، بولا تم بے حد خطرناک ہو۔ عجیب الٹی منطق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی عورت بھی خطرناک نہیں ہوتی — یہ مرد ہی ہے جو کمزور ہوتا ہے۔ دونوں جائیں بھاڑ میں، سُنا ہے رشید زیبو کے پیچھے لگا ہوا ہے اور اس کا چچا سلّی کے پیچھے۔

زیبو تو تمہاری ہم جماعت تھی۔ بیچاری بڑی بنتی ہے۔ میں تو اُسے تب سے جانتی ہوں۔ جب سے اُس کے متعلق کوئی چھوٹی سی افواہ تک نہیں اڑی تھی۔ پتہ نہیں کس بات پر اتراتی ہے۔ اُجڑا اُجڑا حلیہ دبلی پتلی اتنی کہ اچھی طرح دیکھنے کے لئے دوبارہ دیکھنا پڑتا ہے۔ پچھلے سال کسی سیکنڈ لیفٹیننٹ سے واقفیت تھی۔ اس سال بھی سنا ہے کسی اور سیکنڈ لیفٹیننٹ کے ساتھ سیکنڈل رہا۔ بار بار اسے سیکنڈ لیفٹیننٹ ہی ملتا ہے، پہلا لیفٹیننٹ بھاگ جاتا ہوگا۔ کیا بتاؤں ان دنوں اِتنی بدل چکی ہے کہ پہچانی نہیں جاتی۔ پچھلے ہفتے ایک پارٹی پر ملاقات ہوئی میں نے نئے بندے اور نیا نکلس پہن رکھا تھا۔ چھوٹے منہ سے ان کے بارے میں ایک لفظ نہ نکلا، حالانکہ دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی، ادھر میں نے کئی مرتبہ جھوٹ موٹ اس کی چیزوں کی تعریف کی ہے۔ مصنوعی کی ہوئی چوڑیوں کو بار بار بجاتی

تھی۔ ایسی اکل کھری ندیدی لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ سُنا ہے رشیدا سے خوابوں کی ملکہ کہتا ہے۔ ضرور خوابوں میں ڈرتا ہوگا۔

ستی غریب بائیس برس کی ہو چکی ہے اور اب تک کوئی نہیں ملا۔ میں نے تو لئی مرتبہ کہا کہ گزٹ پڑھا کرو۔ آج کل ترقی ملنے پر ادھیڑ عمر کے لوگ اکثر نئی شادی کر بیٹھتے ہیں۔ ایسے کئی مل جائیں گے۔

سُنا ہے اس کے لئے ایک رشتہ بیچ میں آیا تھا۔ کسی بڑے زمیندار کا جس کے پاس دو درجن گائیں بھینسیں تھیں اور جو دیسکی میں دودھ ملا کر پیا کرتا تھا۔ پھر جہیز کے معاملہ میں کچھ گڑبڑ ہو گئی۔

اب صاحبزادی کو بھی پر لگ رہے ہیں، کیا تو جیسے زبان تھی ہی نہیں۔ کیا اب کتر کتر چلتی ہے۔ فرماتی ہیں میں تو سرخی اس لئے لگاتی ہوں کہ اور لڑکیوں میں نمایاں معلوم نہ ہوں۔ ایک اور فقرہ ملاحظہ ہو، کہتی ہیں ــــ متوا دل کیا ہے، برف کا تودا ہے، اتنی جلدی پگھل جاتا ہے۔ یہ سب رشید کے چچا کا اثر ہے مجھے ان پر دقیانوسی صاحب پر غصہ ہے تو اس بات کا کہ ساری خرافات مجھ ہی کو سُناتے رہے، ابا جان سے کچھ بھی نہیں کہا۔ جیسے کہ خاندانی لوگوں میں دستور ہے۔ گنجے ہیں تو کیا ہوا، مرد اکثر گنجے ہو جاتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے ان کی عمر زیادہ معلوم ہوتی ہے اگر آنکھوں کی طرف دیکھتے رہو تو صرف چالیس برس کے لگتے ہیں خیر دفع کرو ان سب کو

مّو کی منگنی ہونے والی ہے، میں نے چھیڑا کر ملّو کا منگیتر پبلشر ہے۔ اس لئے انگوٹھی پر جملہ حقوق محفوظ ہیں ضرور لکھوائیں ــــ

عفو کی بات پکی ہو گئی ہے نہیں اُس نے منگیتر کو نہیں دیکھا۔ لیکن سنو گی تو خوش ہو گی کہ چھ سو روپیہ ماہوار پاتا ہے، اکلوتا ہے۔ بہن بھائی کے قضیئے سے پاک ہے۔ عفو کے والدین نے اچھی طرح یقین کرا لیا ہے کہ شراب نہیں پیتا اور کیا چاہیئے؟ اور ہاں لڑکے کی والدہ حج کرنے جا رہی ہیں۔ عفو نے تو یہاں تک سُنا ہے کہ ان کا ارادہ حج کے بعد وہیں رہ جانے کا ہے، خدا کرے یہ خبر سچ ہو۔

اچھا بہن تم اپنی سُناؤ کیا کیا مصروفیتیں ہیں، تمہاری خاموشی سے دال میں کالا نظر آتا ہے ــــ دور ہو تو کیا، تل تل ملاقاتی سب جانتی ہوں۔ اللہ وہ دن لائے کہ اپنی پیاری سہیلی کے ہاتھ رنگے ہوئے دیکھوں خدا سہیلی دے تو ایسی جس کی دسوں انگلیاں، دسوں چراغ۔

مّنو تو تمہیں یاد ہو گی۔ اس کی شادی پہ ہم سب گئے تھے۔ سُنا ہے لڑکے نے اعتراض کیا کہ نہ تو رسوم ادا کی جائیں اور نہ باجا گاجا ہو، خاموشی سے سب کچھ ہو جائے۔ تو بہ کیسا ہونق لڑکا ہوگا۔ شادی ہو رہی ہے یا کوئی چوری کر رہے ہیں۔ ولایت

سے ابھی ابھی آیا ہے اس لئے دماغ درست نہیں ہوا لیکن کون سنتا ہے رسمیں ساری ہوئیں، مانجھے بٹھانا، کنگنا باندھنا، مہندی لگانا، مسالا پسوانا، پانی بھروانا، ساچق بھیجنا، تمہیں خوشی ہوگی کہ مہر تیس ہزار مقرر ہوا ہے اور ڈیڑھ سو روپے جیب خرچ لکھا گیا ہے ــ منو کتنی خوش نصیب ہے۔ باقی کی رسمیں بھی ادا کی گئیں، جوتی کھیلنا، دلہن کا جوتی دولہا کے کندھے پر لگانا، آرسی مصحف کرنا، دولہا کے سر پر بہنوں کا آنچل ڈالنا، دولہا کو زعفران کے بہانے مرچیں کھلا دینا۔ دولہا کے جوتے چرا لینا۔ پھر دولہا کو اُلٹی چارپائی سے گرا دینا، اس کی شیروانی پلنگ سے سی دینا، مراثنوں کا بیہودہ گانا اور خوبصورت گالیاں دینا بڑا لطف رہا۔ دولہا بھی ایک چغد نکلا جنم نہ دیکھا بوریا سپنے آئی کھاٹ۔ سُنا ہے کہ نکاح کے فوراً ہی بعد کہیں فرار ہوگیا بڑی مشکلوں سے ڈھونڈ کر لائے۔ پتہ نہیں آج کل کے لڑکے کیسے ہو گئے ہیں۔ یہی رسومات تو قوموں کے زندہ رہنے کے نشان ہیں۔ دولہا نے مہر میں بھی مین میخ نکالی کہ بیس ہزار کا جو جہیز لڑکی کو دے رہے ہیں۔ یہ اپنے پاس رکھئے اور تیس ہزار کی رقم کو کم کر کے مہر دس ہزار کر دیجئے۔ لاحول ولا قوۃ!

شادی میں کچھ لڑکے بھی تھے۔ ہمیں چھیڑنے لگے۔ ڈانٹا تو بولے سنگار کیوں کرتی ہو۔ یہ لوگ اتنا نہیں جانتے کہ ہم کپڑے اور زیور صرف ایک دوسری کو دکھانے کے لئے پہنتی ہیں، موئے لڑکوں کو اس سے کیا۔

منو کی رخصت ہو گئی ــ خدا کرے کہ بنّے بنّی میں ہمیشہ بنی رہے۔ لیکن آثار اچھے نظر نہیں آتے۔ افواہ ہے کہ اس کی ساس نندیں بڑی ظالم ہیں۔ رائی کا کوا اور رائی کا پہاڑ بنانے کو ہر دم تیار ہیں ــ پر بہن یہ مرحلہ تو ہر لڑکی کو طے کرنا ہے۔

رشید کے چچا بھی آئے ہوئے تھے۔ ان کے متعلق ایک لطیفہ سنا کہ رنڈوے ہیں ــ مگر کوئی کہہ رہا تھا کہ بیوی زندہ ہیں۔ خیر مجھے اس سے کیا۔

اوئی کتنا لمبا خط لکھا ہے۔ لو اب خوش ہو یا اب بھی روٹھی رہو گی۔ اب خط لکھو، مفصل سا ہو۔ کس کس کی نسبت ٹوٹی ہے۔ کس کس کے گھر شکر رنجی ہوئی ہے یا ہونے کا امکان ہے۔ ہماری جاننے والیوں میں سے کوئی سسرال سے لڑ کر آئی ہو۔ میرے متعلق کسی سے کوئی بات تو نہیں سنی۔ ان دنوں کس کس کے سکینڈل چل رہے ہیں کوئی نیا فلمی گانا پسند آیا؟ غرارے یا جمپر کا کوئی نیا ڈیزائن ــــ ساری باتیں مفصل لکھنا۔

امید ہے کہ منشی فاضل کا امتحان پاس کر چکی ہوگی۔ کبھی آ کر مل ہی جاؤ۔ صرف چالیس پچاس میل کا تو فاصلہ ہے۔ فقط ــــــــــ تمہاری دور افتادہ سہیلی

آسیب زدہ مکان

شوکت تھانوی

کہنے لگے آسیب؟"

ہم نے عرض کیا "جی ہاں آسیب واللہ آسیب"

کہنے لگے ہش۔

ہم نے عرض کیا: "آپ کو اختیار ہے بہر حال ہم نے تو یہ مکان اسی لئے چھوڑا اور جان بچا کر یہاں سے بھاگے ہیں۔ آپ کو بھی اس لئے بتا دیا ہے کہ آپ کے ساتھ بال بچے ہیں، بہرحال آپ جانیں اور آپ کا کام، مگر آپ شکایت نہ کیجئے گا کہ پہلے نہ بتایا۔"

انہوں نے لغوریت کر داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور ہم کو حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا:

"آپ عجیب وہمی قسم کے آدمی ہیں ورنہ کسی مرد مسلمان کو اس قسم کے خباثت سے ڈرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں ہے۔"

ہم نے کہا: "تو پھر کیا ہے، آپ اگر ایسے سچے مسلمان ہیں تو بسم اللہ ہم تو اس کو نعمت سمجھتے ہیں کہ کوئی پڑوسی مل جائے، مگر اس مکان میں عرصے سے کوئی کرایہ دار نہیں آیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب ہمیں آپ ایسا بزرگ پڑوسی ملا ہے، مگر اس خوشی کے ساتھ یہ رنج بھی ہے کہ ہم سے آپ کا پریشان ہونا دیکھا نہ جائیگا۔"

مولانا نے بزرگانہ تبسم کے ساتھ فرمایا:

"انشاء اللہ سب خیریت رہے گی۔"

قصہ یہ تھا کہ ہمارے پڑوس میں ایک مکان خالی تھا اور اس کے خالی رہنے سے ہم کو طرح طرح کے کام تھے۔

مثلاً یہ کہ کوئی مہمان آیا تو اسی میں ٹھہرا دیا۔ خود کبھی ضرورت ہوئی، تو اسی میں جا کر سو رہے۔ نہانے کی

ضرورت ہوئی، تو اسی مکان کا غسل خانہ استعمال کیا۔ مختصر یہ کہ ایک مکان کا کرایہ دیتے تھے اور گویا دو دکانوں پر قبضہ رکھتے تھے۔ اس صورت میں قدرتی طور پر ہماری یہ خواہش تھی کہ یہ مکان ہمیشہ خالی رہے اور اس میں کوئی کرایہ دار نہ آنے پائے، چنانچہ خدا معلوم کتنے کرایہ داروں کو ہم اسی طرح اڑا چکے تھے کہ جہاں انہوں نے آسیب کا نام سُنا، آیت الکرسی پڑھتے ہوئے بھاگے۔ مگر یہ مولانا خود ہی کچھ ایسے آسیب قسم کے واقع ہوئے تھے کہ ہمارے اس بھرے میں نہ آئے۔ ہم نے لاکھ لاکھ سمجھایا لیکن وہ حضرت ہمارے پڑوسی بن گئے۔

یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ مولانا کے آجانے کے بعد ہم کو کس قدر تکلیف ہوگئی ظاہر ہے کہ جو شخص دو مکانوں میں پھیلا ہوا ہو، اس کو اگر ایک ہی مکان میں رکھا جائے، تو وہ خوش نہیں رہ سکتا۔ بہر حال مجبوری کا نام صبر ہے، لیکن ہم اپنی کوششوں سے اب تک غافل نہ تھے اور امید کی ایک جھلک اس بات سے پائی جاتی تھی کہ خود مولانا جو بظاہر بہت زیادہ بہادر بن رہے تھے، کچھ سٹپٹائے ہوئے متردد تھے۔ چنانچہ جب آپ مکان میں اپنی گرہستی کی باقاعدہ ترتیب فرما چکے، تو باہر تشریف لائے، اور اس خاکسار کو بلا کر فرمایا :

"اب میں دو ایک روز میں بچوں کو لے آؤں گا اور وہ بھی آپ کے یہاں کے بچوں سے مل کر خوش ہوں گے"

ہم نے عرض کیا: "ہاں صاحب آپ کی وجہ سے بڑی آبادی ہوگئی اور ہم تو گھر کی طرف سے اب بالکل بے فکر ہو گئے ہیں"۔

رازدارانہ طریقے پر فرمایا "آپ نے آسیبی خلل کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے، اس کا تو میں قائل نہیں ہوں۔ لیکن یہ تو فرمائیے کہ آخر ہوتا کیا ہے جس کو آپ آسیبی خلل کہتے ہیں"۔

ہم نے معصومیت کے ساتھ کہا۔ صاحب اللہ جانے کیا ہوتا ہے۔ بہر حال ایک مرتبہ تو میں نے خود کسی کو پہلے تو چھت پر چلتے ہوئے دیکھا، پھر صحن میں کوئی ٹہلتا ہوا نظر آیا اور میں جو اس کو پکڑنے کے لئے دوڑا، تو دیکھتا کیا ہوں کہ چارپائی سے بندھا ہوا ہوں"۔

تشویشناک طریقے پر آنکھیں پھاڑ کر بولے"۔ واللہ"

ہم نے کہا: "اور سنیئے اسی مکان میں ایک صاحب اور رہتے تھے۔ ان کو تو بہت ہی پریشان کیا گیا۔ روز ان کو سوتے میں چارپائی سے اُلٹ دیا جاتا تھا۔ اور ایک مرتبہ تو یہاں تک ہوا کہ ان کا سر نابدان میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ اسی کے بعد سے وہ بخار میں ایسے مبتلا ہوئے کہ پھر جانبر نہ ہو سکے"۔

مولانا نے گڑبڑا کر کہا۔ "یعنی وہ مر گئے؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں پھر وہ بچ نہ سکے۔"

یہ قصہ کچھ سچا بھی تھا۔ اس لئے کہ ایک صاحب کا اسی مکان میں انتقال ہوا تھا پانچ سال سے دق میں مبتلا تھے۔

مولانا نے فرمایا: "یہ تو جناب بڑی مصیبت ہے فرض کر لیجئے کہ۔" اندر کچھ کھٹکا سا محسوس ہوا غالباً بلی نے کوئی پتیلی کھولی ہوگی اور مولانا سہم کر ہماری آغوش میں آ گرے۔ ہم نے ان کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"یہ کوئی بلی وغیرہ معلوم ہوتی ہے یا شاید وہی ہو۔"

مولانا نے کوئی جواب نہ دیا۔ ان کے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے اور ہم بھی مصلحتاً اس لئے خاموش رہے کہ گویا ہماری تائید غیبی تھی۔ تھوڑی دیر تک عالم سکوت میں رہنے کے بعد مولانا نے چپکے سے کہا:

"اگر آپ مہربانی فرما کر آج رات کو میرے ہی مکان میں سوئیں۔ تو ذرا اطمینان رہے گا۔"

ہم نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"مجھ کو آپ معاف فرمائیں، البتہ آپ خود میرے یہاں آرام فرما سکتے ہیں۔"

بہرحال اس رات کو مولانا نے غریب خانہ پر آرام فرمایا اور ٹھیک اس وقت جبکہ مولانا خواب شیریں میں غافل تھے اور زور دار خراٹے لے رہے تھے ہم اس کام میں مصروف تھے کہ ان کے گھر میں جا کر تمام چارپائیوں کو اوندھا کر دیا، کرسیاں الٹی رکھ دیں تخت الٹ دیے گھڑے اور صراحیاں اوندھا دیں۔ تمام بکس اور پیٹیاں الٹ کر رکھ دیں۔ مختصر یہ کہ جو چیز بھی نظر آئی اس کو قلابازی کھلا دی اور ایک گھنٹے کی اس جد و جہد کے بعد آکر سو رہے۔

صبح کے وقت معلوم نہیں اس منظر سے مولانا نے کیا اثر لیا۔ بہرحال جب ہم سو کر اُٹھے، تو مولانا اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے ہوئے ملے، چہرہ اُترا ہوا تھا اور جسم کا خون خشک تھا۔

ہم نے پوچھا "خیریت تو ہے؟"

کہنے لگے: "جی ہاں بہت خیریت سمجھئے کہ رات کو اس گھر میں نہیں سویا ورنہ خدا جانے کیا ہو جاتا۔ ذرا اندر چل کر دیکھئے معلوم ہوتا ہے کسی نے رات کو اس گھر کے زمین و آسمان کو بدل دیا ہے اگر یہ صورت ہے، تو صاحب میں ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتا۔ ہم نے ان کے ہمراہ گھر میں جا کر ہر چیز کو بعینہٖ ویسا ہی پایا جیسا کہ ہم نے رکھا تھا۔ مولانا کہتے جاتے تھے کہ۔

"دیکھئے یہ گھڑا بھی اوندھا ہے اور دیکھئے یہ میز بھی اُلٹی پڑا ہے" اور ہم گویا نقش حیرت بنے ہوئے تھے۔ آخر میں ہم نے مولانا سے کہا:

"آپ آج اس مکان میں دھوتی دیکھئے اور میں آپ کو پڑھی ہوئی کیلیں دیتا ہوں وہ ہر گوشے میں لگا دیجئے انشاءاللہ کچھ نہ ہوگا"

اب مولانا کی رگ مولویت پھڑکی اور فوراً انہوں نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا:

"اجی استغفراللہ میں یہ ٹوٹکے نہیں کرتا ان سب کا علاج کلام پاک میں موجود ہے۔ میں آج ہی سب بندو لبست کئے دیتا ہوں"

مولانا کو کیا معلوم تھا کہ ہمارے قسم کے آسیب کا علاج کلام پاک میں نہیں ہے۔ بہرحال وہ اپنی ایمانی مضبوطی کے ساتھ تمام دن نمازیں پڑھتے رہے اور شام ہی سے تمام گھر چراغوں سے جگمگا دیا۔ البتہ رات کو یہ ضرور تھا کہ زبردستی ہمارا بستر بھی اپنی ہی طرف اٹھا کر لے گئے اور سونے سے قبل کلام پاک سرہانے رکھ کر اطمینان کر لیا اور جان پر کھیل کر سو رہے۔

واللہ قائل ہونا پڑتا ہے ایک مسلمان کی اس ایمانی طاقت کا جو روحانی طور پر اس کو حاصل ہوتی ہے ورنہ اس قسم کے موقعوں پر کوئی اور ہوتا، تو گزشتہ رات کے واقعہ کے بعد بھلا اس مکان میں ہو سکتا تھا مگر ہمارے مولانا اس طرح سو رہے تھے گویا گھوڑے بیچ کر سوتے ہیں یہاں تک کہ جب ہم نے ان کو چارپائی سے باندھا ہے اس وقت بھی وہ سوتے ہی رہے یہاں تک کہ لالٹین گل کرنے کا بھی ان کو پتہ نہ چلا مولانا کو باندھنے کے بعد ہم نے خود اپنی چارپائی میں اپنے آپ کو باندھ لیا اور سو گئے۔

کوئی رات کے دو یا تین بجے ہوں گے کہ مولانا کی نہایت آہستہ مگر لرزتی ہوئی آواز ہمارے کانوں میں آئی۔ اب ہم نے گردن اٹھائی تو مولانا نے چپکے سے فرمایا:

"مجھے کھولو میں بندھا ہوا پڑا ہوں"

ہم نے بھی ترکی بہ ترکی اسی طرح اپنی آواز میں کہا۔

"مجھ کو باندھ دیا ہے خدا کے لئے مجھ کو کھولئے"

مولانا نے خوف کے مارے آنکھیں پھاڑ کر کہا:

"ارے بھائی چپکے چپکے بولو میں بندھا بھی ہوں اور اختلاج بھی شدت سے ہو رہا ہے"

میں نے تعمیل حکم میں آہستہ سے کہا:

"مجھ کو تو بہت زور کے ساتھ پیشاب محسوس ہو رہا ہے اب کیا کروں؟"

مولانا نے جسم کو چپکے سے جنبش دی، لیکن قسمت تو دیکھئے کہ عین اسی وقت چارپائی چرچرا اٹھی اور مولانا اس آواز پر اتنے پریشان ہو کر اس طرح لیٹ رہے کہ سانس بھی روک لی تھوڑی دیر تک جب وہ چپت پڑے رہے تو ہم نے خود ہی کہا:

"ارے یہ رسی تو رینگ رہی ہے"

یہ سننا تھا کہ مولانا کا اوسان بھی انتقال ہو گیا اور انہوں نے گڑ بڑا کر کلمہ پڑھنا شروع کر دیا اور ادھر ہم نے بھی ڈاکٹر اقبال کا شکوہ اس طرح گنگنا شروع کیا کہ گویا رو رو کر اپنے گناہوں سے توبہ کر رہے ہوں۔ اب حال یہ تھا کہ جہاں کسی چوہے وغیرہ نے ہلکا سا بھی کھٹکا کیا، مولانا کا وظیفہ سول سرکس کمپنی کی ریس کی طرح تیز ہوتا جاتا تھا بہرحال اب تو وہ بے چارے مارے ڈر کے جنبش کرنا تو درکنار رسی کو بھی نہیں چھو سکتے تھے مبادا وہ بقول ہمارے رینگنے نہ لگے۔ ادھر ہم کو نیند آ رہی تھی اور جمائیوں کے مارے ناک میں دم تھا لیکن ہم ہمیشہ کے آرام کے لئے ایک رات کی نیند خراب کر کے تکلیف اٹھا سکتے تھے اور ہم کو یقین تھا کہ اس ایثار اور اس قربانی کا پھل ہم کو ضرور ملے گا بہرحال اسی عالم میں ہم نے رات گزاری اور ٹھیک اس وقت جب گھڑیال نے پانچ کا گھنٹہ بجایا ہے ہم نے جمائی لیتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا اور مولانا کی بھی جان میں جان آئی۔ اب روشنی رفتہ رفتہ بڑھتی جاتی تھی، یہاں تک کہ جب رات کی خوفناک سیاہی سرنگوں ہو گئی اور ہم مولانا کو اور مولانا ہم کو آسانی کے ساتھ دیکھنے کے قابل ہو گئے، تو ہم نے دیکھا کہ مولانا واقعی بے چارے اتنی ہی دیر میں اس قدر گھل گئے تھے کہ گویا چالیس دن کے شدید تپ کے بعد اٹھے ہیں۔ ان کی اس حالت پر بے ساختہ ہمدردی کا پیدا ہو گئی اور دل بھر آیا۔ ہم نے اپنی رسی کسی نہ کسی طرح ڈھیلی کر دی اور خود کو اس شکنجے سے نکال کر مولانا کو بھی کھولا اور ان کو اٹھا کر اپنی طرف لے آئے تاکہ ان کے حواس ٹھیک ہو جائیں، مگر مولانا کو تو جیسے چپ لگ گئی تھی۔ وہ مبہوت بیٹھے رہے ایک وحشت برس رہی تھی اور ہم بھی گویا پریشان سے تھے آخر کار جب مولانا کو چائے وغیرہ پلائی اور ان کے جسم میں تھوڑی سی گرمی پہنچنے کے بعد رات بھر کا منجمد خون حرکت میں آیا تو وہ بولے:

"واللہ عقل کام نہیں کرتی"

عرض کیا "کیا کہا جائے صاحب!"

کہنے لگے "دیکھئے تو ذرا پہلے تو غافل سلایا گیا۔ پھر کلام پاک میرے سرہانے سے غائب روشنی گل اور مجھ کو اور آپ کو باندھ دیا گیا اور پھر آپ کہتے ہیں کہ رسی رنگ رہی تھی۔"

ہم نے کہا جی ہاں جناب مجھ کو تو بالکل یہ معلوم ہوا گویا میں کسی جاندار سانپ سے بندھا ہوا ہوں مجھ کو اس میں حرکت محسوس ہوئی۔ کیا آپ کی رسی نہیں رینگی؟"

غور کر کے کہنے لگے: "شبہ تو کچھ مجھ کو بھی ہوا تھا، مگر میں نے تو رسی کو چھوا تک نہیں کہ خدا جانے کیا واردات ہو۔"

ہم نے سنجیدگی سے کہا، "بہت اچھا کیا کہ آپ نے رسی نہ چھوئی بہرحال جناب اب میں تو اس مکان میں سو نہیں سکتا۔ آپ جانیں اور آپ کا کام۔"

کہنے لگے: "حضت میں خود نہیں سو سکتا۔ جان بچی سو لاکھوں پائے۔ مگر ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ اگر کلام پاک میرے پاس سے نہ اٹھایا جاتا، تو یہ واقعہ نہیں ہو سکتا تھا ورنہ کلام پاک اٹھانے کی کیا وجہ؟"

عرض کیا "ہاں صاحب یہ بات تو واقعی آپ نے خوب نکالی۔ یقیناً کلام پاک کی موجودگی میں یہ باتیں نہیں ہو سکتی تھیں" مولانا اسی ادھیڑ بن میں رہے اور ہم دفتر چلے گئے معلوم نہیں دن بھر مولانا نے کیا کیا۔ بہرحال جب ہم شام کو دفتر سے واپس آئے، تو یہی معلوم ہوا کہ مولانا تمام دن اپنے دولت خانے تشریف نہیں لے گئے اور غریب خانے ہی پر رونق افروز رہے ہیں۔ ہم کو دیکھتے ہی کہنے لگے۔

"بھائی صاحب میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ یا تو میں اپنے کو مسلمان کہنا چھوڑ دوں ورنہ میں ہوں گا اسی مکان میں۔ اس قسم کے بھوت پریت سے ایک سچے مسلمان کے ڈرنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ یا تو مسلمان نہیں ہے ورنہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی اسلامی تعلیم کو جھوٹا سمجھتا ہے۔"

ہم نے ایک سچے مسلمان کی طرح کہا۔

"جزاک اللہ! مولانا واقعی آپ مسلمان ہیں۔ خدا کرے ہر مسلمان ایسا ہی مضبوط ایمان رکھے اور خدا مجھ کو بھی ایمانی تقویت عطا کرے۔"

فخر سے بولے: "لاحول ولا قوۃ میں ان گیدڑ بھبکیوں سے مرعوب ہو کر مکان نہیں چھوڑ سکتا۔ جو مجھ کو ستاتے ہیں ان ہی کو مکان چھوڑنا پڑے گا۔ میں ان بھوتوں کے لئے خود بھوت بن کر رہوں گا۔"

ہم نے کہا: "مگر جناب میں آج وہاں نہیں رہوں گا خواہ اس کو آپ ایمانی کمزوری کہیں یا کچھ مجھ کو اس کا اعتراف ہے، مگر مجبور ہوں میں اپنے دل سے۔"

ذرا سنبھل کر بولے۔ "آپ اپنے ملازم کو وہاں سلا لیجئے گا۔"

مولانا راضی ہو گئے اور یہاں ملازم کو پڑھانے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ وہ خود اس قسم کے معاملات میں گربجوایٹ قسم کا انسان واقع ہوا تھا۔ بہرحال رات کو دس بجے تک تو ہم خود مولانا کے پاس بیٹھے رہے اور جب وہ تعویذ وغیرہ باندھ کر اپنے بستر پر جانے لگے تو ہم بھی ملازم سے یہ کہہ کر رخصت ہو گئے کہ ذرا ہوشیار سونا اور خبردار ڈرنا نہیں۔ مولانا موجود ہی ہیں۔

معلوم نہیں مولانا سو رہے تھے یا جاگ رہے تھے بہرصورت جب ایک بجے رات کے قریب ہم سفید کفن میں لپٹے ہوئے ان کی چھت سے اتر کر ان کے صحن میں آئے ہیں۔ تو ان کا منہ لحاف کے اندر داخل دفتر تھا۔

ہم نے پہلے تو صحن میں ٹہلنا شروع کیا: مگر جب اس کی اطلاع مولانا کو نہ ہو سکی۔ تو دو تین ڈھیلے اُٹھا کر یکے بعد دیگرے ہم نے مولانا کی طرف روانہ کیے یہاں تک کہ مولانا گڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے اور پھر فوراً مردوں کی طرح چت لیٹ گئے غالباً مولانا نے ہم کو دیکھ لیا تھا۔ اس لئے کہ اب ان کی سانس بھی غالباً رکی ہوئی تھی۔ ہم برابر ٹہلتے گئے اور اب ہم نے ناک میں کہنا شروع کیا۔

" ابیں میں تجھ کو کنچاں کھا جاؤں گا۔ (اب میں تجھ کو کچا کھا جاؤں گا) یہ سننا تھا کہ مولانا نے لحاف کے اندر ہی سے دیوانہ وار چیخنا شروع کیا۔ ان کی گھگھی بندھ گئی اور ان کے ساتھ ہمارے ملازم صاحب نے بھی سر ملانا شروع کر دیئے۔ ادھر ہم وہاں سے غائب اور مولانا کے دروازے پر آکر ہم نے "کھولو کھولو" کہہ کر دروازہ پیٹنا شروع کیا اور آخر کنڈی توڑ کر گھر میں آ گئے ورنہ مولانا کا تو شاید وصال ہی ہو جاتا۔ ہم نے جب پندرہ منٹ تک مولانا کو تسلی دی ہے، پانی کے چھینٹے دیے ہیں تب کہیں جا کر ان کو ہوش آیا اور ان کا دل ٹھہرا۔

دوسرے دن صبح ان کو شدید بخار تھا اور اسی بخار کی حالت میں وہ اپنا اسباب دوسرے مکان میں منتقل کر رہے تھے۔ مختصر یہ کہ وہ مکان اب سولہ آنے ہمارے قبضے میں ہے اور اس واقعے کے بعد سے تو ہم کو کسی سے اس مکان کے متعلق کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس لئے کہ کوئی کرایہ دار آتا ہی نہیں۔

تجدید لائسنس اسلحہ

کرنل ایم۔ اے سلیمیؒ

اس سال سماج دشمن عناصر اور بعض دیگر شرپسندوں نے زندگی کے بعض شعبوں میں اپنی سرگرمیاں کچھ اس حد تک تیز کر دیں کہ حکومت کے وجود اور امن عامہ کے لئے ایک عظیم خطرہ پیدا ہو گیا تو حکومت نے اپنے شک کرنے کے حق کو استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اخباروں اور دیگر ذرائع اطلاعات کے ذریعے یہ خبر عوام تک پہنچائی گئی کہ اس سال ہر شخص تجدید کے لئے اپنے اسلحے کا لائسنس لے کر خود بنفس نفیس حکومت کے متعلقہ دفتر میں حاضر ہوگا اور جس شخص کی وضع قطع یا اس کے اعمال و اطوار سے ذرا بھر بھی شرپسند ہونے کا شبہ ہوا، اس کا لائسنس منسوخ کر دیا جائے گا۔

لائسنس کی تجدید ہمارے ہاں بہت ہی صبر و استقامت کا کام ہے۔ دفتر میں لائسنسوں کے چھ فٹ اونچے ڈھیر میں اپنا لائسنس تلاش کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ پچھلے سالوں میں تو یہ کام بس اردلی ہی کے ہاتھوں سرانجام پا جاتا تھا۔ صرف ایک مختصری چٹ لکھنا پڑتی تھی اور یہ اکیلی بہت سارے نسخوں کا کام کر جاتی تھی۔ لیکن اس سال حکومت نے سفارشی چٹھیوں کا کچھ ایسا منہ کالا کیا کہ چٹھی دینا تو ایک طرف، خود سفارش کرنے والے کی دفتر کی طرف جاتے ہوئے ٹانگیں لڑکھڑاتی تھیں تاہم تجدید کرائے بغیر بھی کوئی چارہ نہ تھا۔ آخر کافی دنوں کی مسلسل جدوجہد کے بعد دل کو سمجھانے میں کامیاب ہو گیا کہ کچہری منہ چڑھا چلیے، وہاں جائے بغیر گزارہ نہیں اور ایک دن گھر اور محلہ والوں کی نیک دعائیں اور تمنائیں ساتھ لے کر کچہری کی طرف چل کھڑا ہوا۔ بیگم نے امام ضامن باندھا۔ قرآن کے نیچے سے گزارا۔ سلامتی کے لئے ہزاروں دعائیں مانگیں اور آنکھوں میں آنسو لئے کافی دیر تک دریچے میں سے ہاتھ ہلا ہلا کر ہمیں خدا حافظ کہتی رہیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ انہیں ہمارے کچہری سے بخیریت لوٹ آنے کا پورا یقین نہیں تھا ویسے ان کے شبہات کافی حد تک درست بھی تھے کیونکہ احاطۂ کچہری میں ہونے والی قتل کی متعدد وارداتوں

نے عوام کو اس حد تک خوفزدہ کر دیا تھا کہ صرف وہی لوگ کچہری جانے کی جرأت کرتے تھے جنہیں پولیس باقاعدہ حفاظت کا یقین دلاتی، اپنی گاڑی میں بٹھا کر لے جاتی، تن تنہا کچہری کی طرف جانا جیسے دل گردے کا کام تھا، مرتا کیا نہ کرتا، روانہ ہو گیا۔ راستے میں ایک رکشے والے کو ہاتھ کے اشارے سے روکنے کی جسارت کی تو رکشے والے صاحب بڑے غیض و غضب کی حالت میں رکشے سے باہر تشریف لائے اور انتہائی تیز نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے فرمانے لگے "بابو جی کسی ایسے رکشا میں جائیے گا جس کا میٹر ٹھیک ہو اور ایسے رکشا کا نمبر ہماری کالونی کے صدر دفتر ضرور بھجوا دینا اور اگر ہو سکے تو ایک کاپی ٹریفک سارجنٹ کو بھی ارسال کر دینا"۔ میں رکشا ڈرائیور کی اس گستاخانہ ڈانٹ کو سن کر بہت سٹپٹایا۔ بسم اللہ ہی غلط ہوئی، ہمیں یہ دن بھی دیکھنا تھا کہ متمول اور صاحبِ ثروت لوگوں کے سامنے یہ مفلوک الحال لوگ اس قدر بے باکی اور جرأت کے ساتھ زبان کھول سکیں۔

بعد دشواری جب کچہری پہنچا تو خلقت کا ایک جم غفیر دیکھا کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ لوگ اس طرح جمع تھے جیسے کسی محبوب سیاسی لیڈر کی تقریر سننے والوں کے لئے دور دراز کے علاقوں سے جمع کئے گئے ہوں کچہری کے ہر کمرے کے سامنے ایک ایک سپاہی کی ہیئت کے ساتھ بیس بیس ملزم کھڑے ہوئے تھے، لیکن ان کے چہرے پہ ٹپکتی سنجیدگی اور متانت اور دوسری طرف سپاہی کی بے نیازی اور بے خوف سگریٹ کے کش اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ یا تو سپاہی حد سے زیادہ دلیر ہے یا پھر ملزم حد سے زیادہ شریف اپنی خیالات میں محو تھا کہ اچانک میرے قریب رکنے والی کار نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ اس کار کا ماڈل نہ ہی اتنا پرانا تھا اور نہ ہی اتنا نیا۔ درمیانی سی حالت تھی لیکن شاید انجن کچھ اتنا تھک چکا تھا کہ اس میں سے مسلسل ٹھک ٹھک ٹھول ٹھول کی آوازیں برآمد ہو رہی تھیں میں نے کار کو بڑے غور سے دیکھا اور سوچا کہ اس کار کا سڑکوں پہ دوڑایا جانا معجزے سے کچھ کم نہیں، ایک صاحب باہر نکلے، کوٹ کے کالر درست کئے۔ بازوؤں پر سے مٹی جھاڑی اور اپنے ضروری کاغذات کی فائل تھامے لمبے لمبے ڈگ بھرتے بے نیازی سے سر جھکائے ایک کمرے کی طرف بڑھے باہر بیٹھے ہوئے کچھ لوگوں نے تھوڑی سی زحمت فرمائی، اٹھ کر سلام کیا لیکن ان صاحب نے عمداً اس کا کوئی نوٹس نہ لیا، شاید لوگوں کو یہ تاثر دینا مقصود تھا کہ عدالت سائلوں کے ساتھ کسی قسم کی راہ و رسم نہیں [illegible] اس کے علاوہ میرے دو اور حضرات گلے میں کیمرے لٹکائے اور ہاتھوں میں پنسل تھامے نکلے تھے

جن کے بارے میں معلوم ہوا کہ یہ صاحب پریس رپورٹر ہیں، جو علاقہ مجسٹریٹ کے ساتھ گلا تھانہ کیٹ تشریف لے گئے تھے کپڑے کے تاجروں نے اپنے چند مطالبات منوانے کے لئے حکومت کو ہڑتال کی دھمکی دے رکھی تھی مجسٹریٹ صاحب صلح و صفائی کے لئے تشریف لے گئے تھے اور احتیاطاً پریس والے بھی ساتھ چلے گئے تھے تاکہ اگلے روز اخباروں میں چھپی ان کی بڑے سائز کی فوٹو اور ان کے بیان کی شہ سرخی عوام کو اپنی طرف متوجہ کر سکے اور انہیں عوام کا خادم ہونے کا یقین دلا سکے۔

ایک کونے میں کھڑے چند آدمی اس پر تبصرہ کر رہے تھے کہ کپڑے کے تاجروں نے ٹیلر ماسٹروں کی ہمدردی میں ہڑتال کرنے کا فیصلہ کیا ہے کیونکہ دو روز قبل چند ٹیلر ماسٹروں کو کسی ضروری کارروائی کے سلسلے میں پوچھ گچھ کے لئے تھانے میں طلب کیا گیا تھا اس پر علاقہ کے لوگوں کی غیرت جوش میں آئی بڑے بڑے بیان جاری ہوئے اور پولیس کو تنبیہہ کی گئی کہ پولیس والوں کو عام سکول ماسٹروں کی طرح ٹیلر ماسٹروں کو سرِ راہ سرزنش کرنے یا تھانے میں بلا کر انہیں برا بھلا کہنے کا کوئی حق نہیں ہے شہریوں نے ضلع کی انتظامیہ سے پولیس کی اس نازیبا حرکت کے خلاف سخت ترین کارروائی کرنے کا مطالبہ کیا بعض لوگوں کا خیال تھا کہ پولیس کا اس قسم کی پوچھ گچھ کرنے کا حق تو مارشل لا کا جنازہ اٹھنے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا ہے اور اب عوام کی نمائندہ حکومت کے زمانے میں شہریوں کو تھانے کی طرف لے جانا، شہری آزادی اور جمہوریت کے بنیادی تقاضوں کے بالکل منافی اور سراسر غلط ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر پولیس کی پوچھ گچھ اور تفتیش کا حق بھی ختم ہو گیا تو کیا یہ لوگ جمعہ اور عیدین کا خطبہ دینے کے لئے بھرتی کئے گئے ہیں۔

ہڑتال کا اصل سبب جو معلوم ہوا کہ درزیوں کو یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا ایک احتجاجی مراسلہ موصول ہوا۔ جس میں انہوں نے بڑے سخت الفاظ میں درزیوں کو ان کی پیشہ ورانہ مہارت کی پسماندگی پر سرزنش کی تھی انہوں نے لکھا تھا کہ آپ یونیورسٹی کے طلباء کی پتلونوں کو بیل باٹم کی شکل دے کر اپنی ثقافت کو ایسا مسخ کر رہے ہیں کہ دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ ہماری تہذیب دم توڑ چکی ہے۔ درزیوں نے چانسلر کے اس بے ضرر مشورے کو اپنے ذاتی کام میں بے جا مداخلت تصور کیا اور شدید ناراضگی کا اظہار کیا، اپنے ساتھ کپڑے کے تاجروں کو ملا کر حکومت سے اس واقعہ کی تحقیقات کا مطالبہ کر ڈالا اور اب یہ حضرات مجسٹریٹ اور ان کے ساتھ چپکے ہوئے پریس والے اسی سلسلہ میں معاملہ رفع دفع کروانے کے لئے کوشاں تھے لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ اب عدالتی افسروں کا

کپڑے کے تاجروں سے کیا تعلق ہے عدلیہ اور انتظامیہ میں تو کب کی طلاق ہو چکی ہے یہ کام تو کسی پولیس افسر کو کرنا چاہیئے یا پھر کسی مال افسر کی خدمات حاصل کرنی چاہئیں۔ مجھے اپنے عدلیہ اور انتظامیہ کے طریق کار پر بھی رونا آ رہا تھا۔ کہ ہڑتال کرنے سے باز رکھنے کے لئے پہلے انہیں ہموار کرتی ہے اور پھر ان سے کچھ کر گزرنے کی صورت میں انہیں باقاعدہ صفائی کا موقع بہم پہنچاتی ہے۔ گواہوں کی طویل لسٹیں حرکت میں آتی ہیں۔ اور یہ سلسلہ سالوں چلتا رہتا ہے بھلا یہ بھی کوئی مسائل حل کرنے کا طریقہ ہے۔ کتنا اچھا تھا وہ وقت اور کتنے قابل تھے اس اندھیر نگری اور سکھا شاہی کے قاضی جن کے متعلق اب تک مشہور ہے کہ عدالت کے کمرہ میں داخل ہوتے ہی ملزم کی مشکیں باندھنے کا حکم صادر کر دیتے تھے اور اگر وہ پانچ منٹ سے قبل ہی رو پڑتا تو اسے قصور وار ورنہ بے قصور ٹھہرا کر اسے معاف کر دیا کرتے تھے بعض مواقع میں ملزم کے سر پر خربوزہ رکھ کر جلاد کو تلوار سے خربوزہ کاٹنے کا حکم دیا جاتا۔ اگر تلوار خربوزہ کاٹ کر سر تک نہ پہنچی تو ملزم معصوم اور اگر خربوزے کے ساتھ سر بھی اڑ جاتا تو ملزم قصور وار ٹھہرایا جاتا۔ کتنا عمدہ نظام تھا۔ نہ وقت کا ضیاع نہ گواہوں کو طلب کرنے کی زحمت، سب کچھ موقع پر ہی طے ہو جاتا۔

میں انہی خیالات میں مست کھڑا تھا کہ پیچھے سے اس زور کا دھکا پڑا کہ منہ کے بل گر پڑا۔ دو تین قلابازیاں کھا کر جو ذرا سنبھلا تو دیکھا نئی استری کی ہوئی قمیض کا ستیاناس ہو چکا تھا۔ سراسیمگی کے عالم میں پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک ایسے صاحب نظر آئے جن کی توند کچھ اس طرح تین فٹ آگے کو نکلی ہوئی تھی کہ پہلی نظر میں یوں محسوس ہوتا کہ انہوں نے یہ کوئی علیحدہ بوجھ باندھ رکھا ہے میری طرف ہنستے ہوئے دیکھ کر فرمانے لگے "۔

بابو جی شریف آدمی اس طرح راستہ روک کر نہیں کھڑے ہوتے۔ لوگوں کو آنے جانے میں تکلیف ہوتی ہے میں ان کے پوپلے منہ سے ایسی باتیں سن کر دل ہی دل میں کھول رہا تھا کہ ان صاحب نے میری دلی حالت کو بھانپتے ہوئے میری بے کسی اور بے بسی پر ایسے کا قہقہہ مارا کہ ان کا پیٹ ان کے خاموش ہونے کے بعد بھی دو تین منٹ تک ہنستا رہا۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر میں بھی اپنا غم و غصہ بھول گیا اور ان سے تجدید لائسنس اسلحہ کے دفتر کا پتہ پوچھا۔ انہوں نے بکمال ہمدردی میری منزل کی نشاندہی کی کہ وہ سامنے مسجد کے زیر سایہ ایک چھوٹا سا دفتر ہے اور مسکراتے ہوئے فرمانے لگے کہ وہاں ہر قسم کی تجدید ہوتی ہے۔

میں ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ چند ہی قدم چلنے کے بعد احساس ہوا کہ منزل تک پہنچنا میرے بس کا روگ نہیں۔ میرے اور منزل کے درمیان اب ایک ایسا ٹھاٹھیں مارتا ہوا آدمیوں کا سمندر تھا جس کو عبور کرنا مجھ جیسے ناتواں آدمی کے بس سے باہر تھا۔ ڈھول، تماشہ، ناچ اور ہجوم۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے احساس ہوا کہ میں کچہری آیا ہوں یا غلطی سے کسی دیہاتی میلے میں شریک ہو گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ لب بام دو چار ہاتھ رہ گیا تھا۔ لیکن کمند ٹوٹ چکی تھی، سامنے دفتر نظر آرہا تھا اور میں صرف چند گز دور اپنی منزل کو بے بس اور حسرت بھری نگاہوں سے ایڑیاں اٹھا اٹھا کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اتنے میں ایک باریش بزرگ جن کی سفید داڑھی ان کے گھٹنوں کو چھو رہی تھی اور جن کے سر پر بندھی سفید بے داغ پگڑی ان کی عظمت اور وقار میں کچھ اور بھی اضافہ کر رہی تھی۔ سامنے اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئے بیٹا کیا دیکھتے ہو، یہی ہیں وہ ماہر قانون۔ (سامنے اشارہ کرتے ہوئے) جن کو لوگوں نے کندھوں پر اٹھا رکھا ہے اور جنہوں نے کالا کوٹ پہن رکھا ہے یہی ہیں اس شہر کے مشہور وکیل اور ماہر قانون، امان اللہ ایڈووکیٹ جن کی قابلیت کی بدولت آج میرا جوان بیٹا بہت خطرناک مقدمے سے صاف بری ہو گیا ہے۔ اس پر زبردست مقدمہ تھا، آج سے کوئی پانچ سال پہلے بچوں کے کھیلنے پر اپنے مخالفوں سے ہماری تو تو میں میں ہو گئی، اس وقت میرا یہ بچہ گھر پر نہیں تھا۔ دوسرے دن واپس آیا۔ سارا قصہ سنا تو غصے سے لال بھبھوکا ہو گیا، اسی وقت بندوق ہاتھ میں لے کر نکل کھڑا ہوا اور کھیتوں میں کام کرتے ہوئے اپنے مخالفوں کے چھ آدمیوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ ان کے مکان بھی نذر آتش کر دیئے۔ آج میرا یہ غازی اسی مقدمے میں صاف بری ہو گیا۔ کیوں بیٹا ہے نا غازی؟ ہمارے ملک کو تو ایسے ہی بہادروں کی ضرورت ہے۔ جن میں خودی کوٹ کوٹ کر بھری ہو۔ میں چپ سادھے ان بزرگوار کی طرف دیکھ رہا تھا جو اب جوش مسرت میں خود بھی ڈھول کی تال پر ناچ رہے تھے۔

بڑی تگ و دو کے بعد مطلوبہ دفتر پہنچا۔ لیکن وہاں زلف یار کی طرح طویل اور الجھی قطار دیکھ کر دل ڈوبتا محسوس ہوا۔ بار بار ایڑیاں اٹھا اٹھا کر اندر جھانکنے کی کوشش کرتا لیکن اندر سوائے لائسنس کی کاپیوں کے انبار کے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا حیران تھا کہ دن کے ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں اور بابو صاحب ابھی تک تشریف نہیں لائے لیکن جلد ہی یہ گلہ جاتا رہا۔ کیونکہ سامنے لائسنسوں کے انبار میں کوئی

چیز کچھوے کی طرح تھوڑی دیر کے لئے سر باہر نکالتی اور پھر جلد ہی چھپا لیتی، معلوم ہوا یقیناً یا اسلحہ کلرک ہی ہو سکتے تھے جن کا انبوہ کثیر کو دیکھ کر کام کرنے کو حوصلہ نہ پڑتا تھا۔ اسی کشش و پنج میں کھڑا تھا کہ میری نظر پولیس کے ایک سپاہی پر پڑی جو آنسو گیس لباس زیب تن کئے ہوئے ہجوم کے ایک سرے پر کھڑا آنکھ کی ایک معمولی سی جنبش کا منتظر تھا، میں آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا اس کے پاس پہنچا اور اپنا تعارف کرایا تو بڑی شانِ بے نیازی سے سر ہلا کر بولا جی ہاں، صحافیوں سے تو ہم تابعدار ہیں اچھے لوگ ہوتے ہیں جس کو دل چاہے اچھال دیں اور جس کی چاہیں درگت بنا دیں۔

ع جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

خیر وہ مجھے گھسیٹتا ہوا اپنے دفتر کے طرف لے گیا اور بکمال مہارت اپنی رائفل کا بٹ میری طرف کر بہ رکھ اس طرح مجھے قطار میں سے اندر دھکیلا کہ سیدھا اسلحہ کلرک کے قدموں میں جا کر گرا۔ اور وہ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھے، اپنی موٹے موٹے شیشوں والی آہنی فریم کی بوسیدہ سی عینک جس کی ایک کمانی ٹوٹی ہوئی تھی اور اس جگہ ایک دھاگہ ڈال کر کان کے گرد تین چار چکر دے رکھے تھے بار بار اوپر نیچے کرتے ہوئے مجھے ٹٹول رہے تھے اور مجھے لیطرس کی وہ حالت یاد آ رہی تھی جب مرزا جی اپنی سائیکل ان کے برآمدے میں چھوڑ آئے تھے اور لیطرس صاحب بار بار الٹ پلٹ کر اسے دیکھتے رہتے تھے لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کس جانور کا ڈھانچہ ہے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے میں ان کے قدموں سے اٹھا اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا۔ اسلحہ کلرک (جو کہ ایک حوالدار صاحب تھے) بالشت بھر کی داڑھی دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ چلو ہمارے ہاں ایسے افراد بھی ہیں جو "ایسی" کرسیوں پر بیٹھ کر بھی اپنی اسلامی وضع قطع میں کوئی فرق نہیں آنے دیتے، لیکن جلد ہی یہ احساس ہوا کہ پولیس کے عملے کا یہ رجعت پسندانہ رجحان یقیناً ان کے فرائض کی ادائیگی میں خلل ڈالتا ہوگا۔ سوچا کہ ان صاحب کو جب کسی کے خلاف نازیبا الفاظ استعمال کرنے ہوں گے (جو کہ لازمی ہیں) تو یہ کیا کرتے ہوں گے۔ میرے خیالات کا تسلسل اس وقت ٹوٹا جب اس سپاہی نے جس نے مجھے اندر داخل کیا تھا واپس مڑتے مڑتے اسلحہ کلرک سے کہا استاجی ذرا ان کا خیال رکھنا میں یہ فقرہ سن کر آگ بگولہ ہو گیا، خوب اچھلا کودا، کیونکہ میرے نزدیک سفارش کرنا اور سفارش کرانا دونوں کبیرہ گناہ ہیں اور پھر خاص کر ایسی سفارش جو ڈھول پیٹ کر کی گئی ہو۔ جس میں کسی بھی رکھ رکھاؤ کو ملحوظ خاطر نہ رکھا گیا ہو۔ آخر کار

غیرت بھی کوئی چیز ہے، میں نے وہیں سے آنے کا ارادہ کر لیا ابھی مڑنے ہی والا تھا کہ حوالدار نے اٹھ کر مجھے روک لیا۔ میرے ہاتھ سے لائسنس کی کاپی چھین کر اس پر چند حروف لکھے ایک مہر لگائی اور واپس میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ سب لوگ میری طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے میرے متعلق طرح طرح کی قیاس آرائیاں شروع ہو گئیں۔ کوئی کہتا ایس پی صاحب کا رشتہ دار ہے، کوئی کہتا نہیں فلاں ایس ایچ او کا کلاس فیلو ہے کسی نے کہا نہیں جناب یہ آج کل آٹے کے ڈپو ہولڈر ہیں غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں میرا سر ندامت سے جھکا ہوا اور بدن پسینے سے شرابور تھا اور جی چاہتا تھا کہ اس پستول یا بندوق سے تو دیسی غلیل اچھی ہوتی ہے۔ جس کے لئے کارتوس کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ اسلحہ لائسنس بنواتے یا تجدید کرانے کے چکر میں پڑنے کی ضرورت ہے۔ کیا فائدہ ایسے لائسنس ہولڈر بننے کا جس میں انسان کی عزتِ نفس کو اس حد تک ٹھیس پہنچے ان خیالات کے ساتھ میرے ذہن میں لفظ استاد جی بار بار گھوم رہا تھا۔ جس نے میری اتنی بڑی مشکل آسان کر دی۔ نہ جانے یہ کون سے کوڈ ورڈ تھے اور ان سے متعلقہ صاحب کیا سمجھے کہ میرا کام اس قدر پھرتی سے ہوا کہ سب دم بخود رہ گئے اس ہلکی اور خفیف سی سفارش نے میرا مسئلہ اس قدر آسانی سے حل کر دیا کہ اندازہ نہیں۔ اسی کام کو اگر میں اپنا بنیادی حق سمجھ کر کرانے کی کوشش کرتا تو کسی سے سخت کلامی کر بیٹھتا اور عین ممکن ہے کہ کہیں دھول دھپا بھی ہو جاتا اور اس کے ساتھ اپنا لائسنس بھی ضبط کروا بیٹھتا۔ کمرہ سے باہر نکلا تو سورج بالکل سر پر آ چکا تھا۔ کچہری کی رونق میں بھی کمی ہو گئی تھی۔ اِکا دُکا کوئی قسمت کا مارا اِدھر اُدھر پھر رہا تھا یا چند لوگ درختوں کے نیچے سر چھپائے بیٹھے تھے۔ عدالتوں کے اردلی اب بھی چیخ چیخ کر داد خواہوں کے بنیادی حقوق کا تحفظ کر رہے تھے تاکہ شام سے پہلے پہلے ان کو انصاف مل سکے۔

اپنا کام بخیر و خوبی ہو جانے کے بعد لائسنس کی کاپی کو احتیاط سے جیب میں ڈالا اور گھر کی راہ لی۔ لیکن دماغ میں مسلسل ہلچل مچی رہی۔ خیال بار بار ان لوگوں کی طرف جا رہا تھا جو پستول کو گلے کا ہار بنا کر یا بندوق کو کندھے پر رکھ کر اکڑ اکڑ کر چلتے ہیں سوچتا ہوں نہ جانے کب سے انہوں نے اپنی خودی اور عزتِ نفس کو خیرباد کہہ رکھا ہے کیونکہ خودی اور لائسنس یکجا نہیں رہ سکتے۔ یقیناً ان کو اپنے لائسنس کی تجدید کے لئے ہر سال کسی کی سفارش ڈھونڈنا پڑتی ہو گی، کسی پولیس کے اہلکار کی ہمدردیاں

حاصل کرنا پڑتی ہوں گی اور اس کے علاوہ کچہری تک آنے کے لئے چند لازمی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا، بغیر میٹر کے رکشوں میں سفر اور ڈرائیوروں کی گھرکیاں سہنا پڑتی ہوں گی یہ سب کچھ یاد آتے ہی مجھے اس عظمت و توقیر کی علامت (لائسنس) سے نفرت سی محسوس ہونے لگتی ہے اور ان لوگوں سے ہمدردی محسوس ہوتی ہے جو سکھ اور چین کی نیند سونا چاہتے ہیں کسی ہمسایہ کے غم میں شریک ہونا چاہتے ہیں، نیک نیتی سے حکومت کے کاموں میں ہاتھ بٹانا چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ ایک عدد یا ایک سے زیادہ اسلحہ کے لائسنس کے بھی مالک ہوتے ہیں۔ کبھی میں ایسے لوگوں کا مقابلہ منشی پریم چند سے کرتا ہوں اور یہ دیکھتا ہوں کہ آج لوگ مقابلتاً کتنے زیادہ رسوائی پروف ہیں بڑے بڑے جھٹکے سہنے کے باوجود بھی ہمارے لائسنس ہولڈروں کے پائے استقامت میں جنبش نہیں آئی سوچتا ہوں آخری بکری کی طرح لائسنس کو گھر میں پالنے کی کیا ضرورت ہے۔ پریم چند بے چارہ تو ایک بکری سے عاجز آگیا تھا حالانکہ اس کے لئے اسے صرف کبھی کبھی رات کی تاریکی میں پتوں وغیرہ کی چوری کرنا پڑتی تھی یا کبھی کبھار کسی زمیندار کی گھرکیاں اور ان کی بیوی کی فصاحت و بلاغت سے بھرپور ایک آدھ تقریر سننا پڑتی تھی جن کے کھیت بکری بڑی صفائی کے ساتھ صاف کر جاتی تھی۔ وہ تو اتنی معمولی سی باتوں سے عاجز آکر چیخ اٹھا اور غم نداری بز بخر کے عنوان سے ایک مضمون لکھ مارا اس پر ہی قناعت نہیں کی بلکہ بیوی کے پرزور احتجاج اور اصرار کے باوجود بکری کو خیرباد کہہ دیا۔ ان کے مقابلے میں آج کے اسلحہ ہولڈروں کی کیا گت بنتی ہے لیکن وہ ہیں کہ نبھائے جاتے ہیں اور سب کچھ سہنے کے باوجود پستول سے اپنے آپ کو آراستہ کر کے یا پھر بندوق کی بیرل اور بٹ کو زیادہ تیل کے ساتھ چمکا کر ہاتھ میں پکڑے اس شانِ بے نیازی سے جھوم جھوم کر چلتے نظر آتے ہیں کہ ہر ایک پر مغلیہ خاندان کے وظیفہ خوار ہونے کا گمان ہوتا ہے ادھر ادھر اس طرح نظریں گھما گھما کر دیکھتے ہیں کہ رگوں میں چنگیزی و ابدالی خون کے دوڑنے کا شبہ ہوتا ہے۔ جب کبھی خوش قسمتی سے کسی ہمراہی سے گفتگو کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علاقے کا کوئی بہت بڑا جاگیردار اپنے مزارعین سے مخاطب ہے، ان کی یہ آن بان اور شان دیکھ کر مجھے اپنا وہ وقت یاد آجاتا ہے جب اپنے لائسنس کی تجدید کے لئے کچہری جانے کے لئے ہزاروں دعاؤں اور تمناؤں کے ساتھ گھر سے نکلا تھا۔ بیوی کی آنکھیں ساون بھادوں کے بادل کی طرح برس رہی تھیں۔ میرے کچہری جانے کے بعد ہمسایوں میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی گئیں ہمارے ساتھ والے ہمسائے میں

بیوی اپنے میاں سے کہہ رہی تھی۔ دیکھا میں نہ کہتی تھی کہ ان میاں بیوی کی روز کی چیخ چیخ ضرور کوئی گل کھلائے گی۔ لو وہی ہوا۔ بیوی کے بڑے بھائی اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہیں اور انھوں نے اس کے میاں یعنی بہنوئی کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا ہے اس لئے تو آج یہ صاحب کچہری گئے تھے۔ ہمارے گھر کے سامنے کی دکان پر چند آدمی بیٹھے کھسر پھسر کر رہے تھے دکاندار ان کو بتا رہا تھا، یارو آج تو اپنے شیدے کی دور اندیشی کی داد دو، میں نہ تمہیں بتایا کرتا تھا کہ سامنے کوٹھی والے اس کثرت سے پیاز اور ٹماٹر کا استعمال کرتے ہیں کہ ان کی یہ فاقہ مستی ضرور ایک دن رنگ لائے گی۔ لو آج دیکھ لیا۔ ہماری بات سچ ثابت ہوئی، بیٹے نے ڈگری کروا دی ہے اور آج میاں کو عدالت میں طلب کر لیا گیا ہے۔

سامنے کی گھر والیاں جنہوں نے صبح کے وقت میاں بیوی کی آہوں اور آنسوؤں کے سائے میں کچہری کی طرف روانہ ہونے کا نظارہ اپنے کوٹھے کی چھت پر چڑھ کر کیا تھا اپنے گھر آنے والی دوسری عورتوں کو بتا رہی تھیں، بہن دیکھ لو، برے کرتوتوں کا یہی انجام ہوتا ہے، ہم بھی کہتے تھے صرف پانچ سو روپے ماہوار تنخواہ میں یہ سامنے والے لوگ کس ریٹھا نہ ٹھاٹھ سے رہتے ہیں آج سارا پول کھل گیا۔ میاں کو رشوت کے کیس میں عدالت بلایا گیا ہے۔ اللہ خیر کرے، بے چاروں کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، جاتے وقت بیوی کی حالت تو دیکھی نہیں جاتی تھی۔ خاوند سے جدائی کے غم میں اس طرح پچھاڑیں کھاتی تھی کہ کلیجہ کانپ جاتا تھا۔ اللہ کسی کو برے دن نہ دکھائے اور جب کوئی واقف حال بوڑھی انہیں سمجھانے کی کوشش کرتی اور اصلی حقیقت سے آگاہ کرتی تو وہ سب بگڑ کر کہتیں اری اماں چھوڑو ان باتوں کو۔ بھلا پردہ ڈالنے سے کیا فائدہ۔ ہم لوگ کوئی کچی گولیاں تھوڑی کھیلے ہیں آخر خوب جانتے ہیں کہ کچہری کن لوگوں کو بلایا جاتا ہے۔

جب یہ سب کچھ یاد آتا ہے اور پھر بھی لائسنس ہولڈروں کو اس شان سے چلتے دیکھتا ہوں تو دیر تک سر پکڑے بیٹھا رہتا ہوں۔

ہم لفٹین شائبہ کیمپ میں

کرنل محمد خان

(پس منظر: مصنف کو کمیشن ملے بمشکل چار ماہ ہوئے کہ اسے سمندر پار جانے کا حکم ملا اور وہ کسی قدر بادل نخواستہ یکم ستمبر ۱۹۴۲ء کو بصرہ کی بندرگاہ میں وارد ہوا)

بصرہ اگرچہ پہلے نہ دیکھا تھا تاہم ذہن اس کے تصورات سے یکسر خالی نہ تھا۔ مثلاً بچپن میں جغرافیہ کی کتابوں میں جو پڑھا تھا اس سے بصرے کا تصور سرخ میٹھی کھجوروں کی شکل میں ہمارے دماغ میں محفوظ تھا۔ انہی دنوں کے امتحانوں کے گھوٹے کی پس ماندہ یاد یہ بھی تھی کہ بصرہ لندن یا ٹمبکٹو کے رستے میں ایک بحری یا ہوائی اڈہ ہے اگرچہ اس اڈے کا تصور مرنجنگ کے تانگوں کے اڈے سے مختلف نہ تھا۔ پھر بڑے ہو کر ان فوجیوں سے بصرے کے قصے سنے تھے جو پہلی جنگ عظیم میں اسی بندرگاہ پر اتر کر میسوپوٹیمیا کے میدان میں کام آئے تھے۔ یا یوں کہیں کہ بیکار گئے تھے۔ کام آنے والوں نے آکر کیا قصے سنانے تھے؟ اور بعد میں شاید ان ہی فوجیوں کے طفیل بصرہ پنجاب کے لوک گیتوں میں گھس گیا تھا۔ مثلاً وہ پنجابی گانا

چھٹی رت بصرے نوں گئی

اگرچہ گیت کے مضمون سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خود

بہرحال جہاز سے اترے تو معلوم ہوا کہ ہماری منزل بصرہ نہیں، کوئی پندرہ میل مغرب میں ایک بہت بڑا کیمپ ہے جسے شائبہ کیمپ کہتے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس مقام کا عربی نام تو شعیبہ ہے لیکن اس کا "ع" انگریزوں کے حلق میں ہی اٹک کر رہ گیا ہے۔ ناموں کے سلسلے میں ہم انگریزوں کی زیادتی سے اپنے ملک میں بھی آشنا تھے۔ مثلاً حیدرآباد کا انگریزی نام ہائیڈرابیڈ اور کشمیر کا کیشمیر۔ لیکن عراقی ناموں کے ساتھ تو انگریزوں نے اچھی خاصی سکھا شاہی مچا رکھی تھی۔ مثلاً بغداد بیگ ڈیڈ تھا۔ موصل کو موزل کہتے تھے اور معقل کو ماگل بنا دیا تھا۔ انگریز تو خیر اپنے حلق کی بے بضاعتی کی وجہ سے شاید غلط تلفظ پر مجبور تھے بلکہ حیرت تو یہ کہ جہاں ہندوستانیوں پر آتا تھا

جنہیں اپنی فلاح بیک ڈیڈ کہنے میں ہی نظر آتی تھی۔

بہرکیف بندرگاہ سے نکل کر لاریوں میں بیٹھے اور شائبہ کو روانہ ہوئے۔ سرزمین عراق کے وہ پندرہ میل جو بصرے اور شائبہ کیمپ کے درمیان تھے۔ ہماری زندگی میں ایک انوکھا تجربہ تھے۔ ہم نے اس سے پہلے کبھی اصلی تے وڈا ریگستان نہ دیکھا تھا۔ خود بصرہ تو دجلہ کی گزرگاہ کے طفیل بہت سرسبز اور شاداب تھا اور کھجوروں کے درخت تو وہاں انسانوں سے بھی زیادہ تھے۔ لیکن بصرے سے نکلے تھا کہ سبزہ یک قلم غائب ہو گیا اور انسان بھی تقریباً غائب۔ حدِ نگاہ تک لق و دق اور ہموار ریگزار تھا۔ جس میں کسی نمودی شے کا وجود نہ تھا۔ سوائے ایک آدھ بھٹکے ہوئے گدھے یا بھیکے اونٹ کے جو وہاں پر نظر آتے تھے۔ اگرچہ ان کے وہاں ہونے کی کوئی معقول وجہ نہ تھی۔ آخر دیاں تھا نہ نباتات۔ بقول حالیؔ ، "خدا کی زمین بن جتی سر بستی" ممکن ہے کہ اس ضمن میں گدھوں اور اونٹوں کا کوئی اپنا نظریہ نگاہ ہو۔ لیکن ہمارے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ ان کے تاثرات معلوم کر سکتے۔ ہمارا قافلہ رواں تھا اور ہم برابر دیدے پھاڑ کر دیکھ رہے تھے کہ کہیں گھاس کی واحد پتی ہی نظر آ جائے لیکن نہ آئی۔ سعدی کا شعر یاد آیا۔

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

اور محسوس ہوا کہ ہم خواہ کتنے ہی ہوشیار کیوں نہ ہوں۔ شائبہ کے نواح میں ہمیں معرفت کردگار ذرا مشکل سے ہی میسر ہوگی۔ ہمارے ایک ساتھی جو سید تھے، بولے: "بجا کہتے ہو دوست۔ شائبہ کردگار سے زیادہ کربلا کے نزدیک ہے۔ یہاں پتے دیکھ کر نہیں بلکہ سر دے کر معرفت حاصل کی جاتی ہے۔ سوچا کہ اگر سعدی شیراز کی بجائے شائبہ میں پیدا ہوتے تو معرفت کا ایسا آسان نسخہ تجویز نہ کر پاتے۔

شائبہ کیمپ میں پہنچے تو پہلی مرتبہ انسان نظر آئے۔ یعنی ہندوستانی اور برطانوی فوجوں کے سپاہی۔ شائبہ تک REI NFORCEMENT CAMP تھا۔ اس وقت ہمارے دو ڈویژن محاذ پر تھے   دونوں کو کمک شائبہ سے ہی جاتی تھی۔ کیا سپاہی کیا افسر کیمپ میں   اور __________ تھے اور کیمپ میں آنے کے بعد چند دنوں یا ہفتوں میں آگے محاذ پر بھیج دیئے جاتے تھے لیکن یہاں خدا کے پراسرار بندے ایسے بھی دیکھے جنہیں فطرت نے صفت خورے کا ایک لازوال ذوق بخشا تھا اور جنہوں نے تمام تر جنگ شائبہ کے لنگر خانوں اور میسوں میں ہی گزار دی تھی۔ فوج میں پیشہ ور قسم کے آدمی بستے ہیں۔ وہ جو لڑ کر جنگ جیتتے ہیں اور وہ جو کھا کر جیتتے ہیں۔ جگر گداز منظر اس گھڑی ہوتا ہے جب ایک کھا کر جیتنے والے کو محاذ جنگ پر جانے کا حکم ملتا ہے اور وہ ٹال نہیں پاتا۔ ہم نے شائبہ میں

چند ایسے ہی مناظر دیکھے اور ہر مرتبہ کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ خصوصاً ایک کپتان صاحب کا وقتِ سفر ہمیں کبھی نہ بھولے گا۔ یہ حضرت شاہبہ کے بانیوں میں سے تھے اب آپ نے اپنا تمام وقت اس چھوٹے سے دائرے میں گزار دیا تھا جس کا مرکز کیمپ کا میس تھا۔ حضرت کا اچھا سا نام تھا جو "ڈی" پر ختم ہوتا تھا۔ مزاج میں رنگینی تھی اور آپ اکثر اپنی شجاعت اور عشق کی داستانیں سنایا کرتے تھے۔ بلکہ ان دنوں اپنی مراد آبادی معشوقہ کو بصرہ میں لانے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ اچانک ایک دن آپ کو محاذ پر جانے کا ذرا اٹل سا حکم ملا۔ کیا بتائیں اس مجاہد نے اس مہم سے بچنے کے لئے کیا کیا نادر بہانے تراشے مثلاً مراد آباد کے WAR EFFORT پر ناگوار اثر پڑے گا۔ ان کی عدم موجودگی میں شاہبہ ویران ہو جائے گا۔ ہندوستانی افواج کا مورال تباہ ہو جائے گا۔ بغرض سلطنت برطانیہ کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا، وغیرہ وغیرہ۔ دلائل بے شک وزنی تھے لیکن ظالموں نے ان کا وزن کرنے سے ہی انکار کر دیا اور حضرت کو اس لاری پر سوار ہونا پڑا جو ایک مہم محاذ کو لئے جا رہی تھی۔ اس قیامت خیز ساعت میں آپ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے جنہیں دیکھ کر سارے شاہبہ پر رقت طاری ہو گئی لیکن لاری کا حرکت کرنا تھا کہ حاضرین میں بے پناہ قہقہہ گونج اٹھا۔ ایک دل جلے نے مراد آبادی معشوقہ کو پکار کر کہا۔

تو نیز بر سرِ بام آ کہ خوش تماشا ایست

تو ذکر شاہبہ کیمپ کا تھا۔ اس وسیع کیمپ کے دو حصے تھے جنہیں ونگ (WINGS) کہتے تھے یعنی برٹش ونگ اور انڈین ونگ۔ برٹش ونگ میں فقط گورا افواج تھیں اور ان کے افسر۔ یہ ونگ کیمپ کے غربی سرے پر تھا۔ مشرقی حصہ انڈین ونگ تھا اس میں ہمارے ہندوستانی سپاہی اور ان کے افسر رہتے تھے۔ ان دنوں انڈین آرمی کے افسر بھی زیادہ تر انگریز ہی ہوتے تھے لیکن رفتہ رفتہ دیسی افسر بھی خاصی تعداد میں نظر آنے لگے تھے۔ ان میں ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی سب تھے جو باہم شیر و شکر تھے۔ یہ عجیب بات تھی کہ ہندوستان میں فوج کو چھوڑ کر زندگی ایک مسلسل ہندو مسلم دنگل تھا جس میں اکثر سکھ بھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے شامل ہو جایا کرتے تھے اور اگر خدا واسطے کا بیر تھا تو صرف انگریز افسروں سے۔ ہندوستان کی محکومی کی وجہ سے شاید ہم لوگ کچھ ضرورت سے زیادہ حساس بھی تھے اور خواہ مخواہ انگریزوں سے الجھنے کو جی چاہتا تھا۔ لیکن جنگ چھڑنے کے بعد بظاہر برٹش افسروں میں بھی تعصبات اور تنگ نظری کی بھرتی ممنوع نہ تھی اور پھر عہدے کے لحاظ سے یہ لوگ ان دنوں ہم سے تقریباً ہمیشہ سینئر ہوتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ دیسی اور انگریز افسروں میں اچھی خاصی فرقہ وارانہ کشیدگی رہتی تھی اور اسی وجہ سے افسروں کے میسوں میں بارہا نقضِ امن کی وارداتیں ہوئیں لیکن ان کا ذکر کہیں اپنی جگہ۔

شام کو پہنچے تو معلوم ہوا کہ انڈین ونگ میں اگرچہ اکثریت انگریز افسروں کی ہے مگر دیسی افسروں کی تعداد بھی خاصی تھی۔ چنانچہ خوش ہوا کہ شاہ بنے کا چند روزہ قیام خوب گزرے گا۔ مگر ابھی بستر بھی کھلا تھا کہ حکم ملا کہ تم برٹش ونگ میں قیام کرو گے۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ اس کیمپ میں صرف مائنز سگنلز کا وجود تسلیم کیا جاتا ہے۔ انڈین سگنلز کا کوئی آدمی نہیں۔

چار ماہ کے ناپختہ سیکنڈ لیفٹیننٹ کو اپنی برادری سے ادھیڑ کر اجنبی گوروں یعنی مخالفین کے سپرد کر دینا سامراجی تشدد کی ایک اور مثال تھی۔ لیکن کانگریسی تو تھا نہیں کہ لاری کے آگے لیٹ جاتا۔ بس دانت پیس کر زیر لب ہی اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ دل ہلکا ہوا تو بوریا بستر اٹھایا اور برٹش ونگ جا پہنچا۔ وہاں ہر طرف گورے ہی گورے تھے۔ کیا افسر کیا سپاہی بلکہ بیرے خانساماں تک انگلستان کی اپنی ساخت کے تھے۔

ایک گورا سپاہی ہمیں بطور اردلی ملا۔ اس نے آتے ہی ہمیں سلیوٹ کیا اور بغیر بات کئے ہمارا بستر لگایا۔ سامان قرینے سے رکھا۔ جوتے پالش کئے اور چائے لایا۔ ایک انگریز کو یوں دن دہاڑے اپنی خدمت کرتے دیکھ کر ہمارا مورال تو کچھ ضرورت سے زیادہ بلند ہو گیا اور ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوا کہ سب انگریزوں کو بد دماغ سمجھنا مناسب نہیں ہوتا۔ جب اردلی کام ختم کر چکا تو گورے اردلی نے ہم سے پہلی دفعہ بات کی۔ بات کیا تھی ایک لہراتی سی انگریزی نما آواز ہمارے سامنے سے گزر گئی لیکن ہمارے دماغ پر کوئی قابل فہم نقش نہ چھوڑا۔ ہمیں خاموش دیکھ کر گورے نے اپنی بات پھر دہرائی۔ لیکن اس دفعہ بھی ہماری سمجھ میں اتنا ہی آیا جتنا ریکارڈنگ ٹیپ کو الٹا چلانے سے آتا ہے۔ گورا اب خاموش کھڑا تھا۔ سوچا کہ کیوں نہ ہم ہی کچھ کہیں۔ چنانچہ گلا صاف کیا اور اپنی بہترین انگریزی میں اپنا مدعا بیان کیا۔ گورے اردلی نے ہماری انگریزی گولی کی داد میں ایک مخلصانہ مسکراہٹ ضرور پیش کی لیکن جہاں تک ہماری انگریزی کے ادراک کا تعلق تھا ظاہر کیا کہ وہ بیچارا سراسر معصوم ہے۔ بغیر مزید تجربے کے ہم نے طے کر لیا کہ ہماری اور گورے کی انگریزی میں کوئی نقطۂ اتصال نہیں اور یہ کہ ہماری انگریزیاں بالکل متوازی ڈنڈوں پر ایک دوسرے کو چھوئے بغیر چلتی رہیں گی۔ چنانچہ زبان کی بجائے ہاتھوں سے سمجھانے کی کوشش کی اور بلا تکلف ایک دوسرے کو سمجھنے لگے۔ بقول داغ ؎ ہاتھ نکلے اپنے دونوں کام کے۔

شام کو برٹش ونگ کے افسروں سے ملاقات ہوئی۔ یہ گورے اردلی سے بھی زیادہ تواضع اور احترام سے پیش آئے۔ پہلے تو حیران ہوا کہ کوئی غلط فہمی تو نہیں لیکن فوراً معلوم ہو گیا کہ ان کی شرافت کی وجہ کچھ اور ہے یعنی یہ کہ ان انگریزوں نے ابھی ہندوستان نہیں دیکھا اور رفرجونیت کا انہیں عملی تجربہ نہیں۔ سیدھے ولایت سے شاہ بنے آئے ہیں اور ایک غیر ملکی کو انگریزوں کی خاطر لڑتا دیکھ کر اسی طرح ممنون ہوتے ہیں۔

جیسے لاہوری مسلمان سنترہ کا باسے قبول اسلام پر مسرور ہو رہے تھے۔ یہ درست ہے کہ برٹش ونگ نے میرے لیے جلوس نکالنے کا کوئی انتظام نہ کیا لیکن جلوس کا انگریزی بدل ضرور پیش کیا۔ یعنی تپاک سے مصافحہ کیا، چائے پلائی، سگریٹ پیش کیے لیکن جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کا اندازِ ملاقات تھا۔ جو ملتا اس کے چہرے پر شگفتگی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی گفتگو میں وہ سرپرستانہ رعونت یا مخدومانہ بے نیازی نہ تھی جو ہندوستان کے انگریز حاکموں کا ٹریڈ مارک تھا۔

یہ سب کچھ تھا لیکن میں طبعاً اتنا شامی مزاج بھی نہ تھا کہ ان لوگوں میں مکمل رل جاتا۔ محض مصافحوں یا مسکراہٹوں پر مستقل گزارا مشکل تھا۔ برٹش ونگ میں آرام ضرور تھا لیکن کچھ قفس کے گوشے والے آرام سے ملتا جلتا۔ اور پھر زندگی فقط آرام کی زیادتی سے ہی عبارت نہیں، بلکہ اگر آتش جواں ہو۔ جیسا کہ وہ تھا تو فالتو آرام ایک عجیب مدی کوفت اور ذہنی فساد کا باعث ہوتا ہے۔ چنانچہ جی چاہتا کہ بھاگ کر جاؤں اور کیمپ کے ہندوستانی حصے میں اپنے ہم وطن دوستوں کے ساتھ مل کر ادھم مچاؤں۔ اور کرنا خدا کا کیا ہوا کہ انڈین ونگ میں گورکھا سپاہیوں کو سگنل کی تربیت دینے کے لیے ایک افسر کی ضرورت محسوس ہوئی اور نظرِ انتخاب ہم پر پڑی۔ چنانچہ بظاہر کسی قدر وقار کے ساتھ لیکن بباطن ہزار بے تابی سے انڈین ونگ میں پہنچا اور دو نفل شکرانے کے پڑھے۔

برٹش ونگ کی دھیمی دھیمی اور بے آواز سی فضا سے نکل کر انڈین ونگ کی رنگ رنگیلی دنیا میں پہنچا تو یوں محسوس ہوا جیسے انارکلی میں آ نکلا ہوں۔ جنہیں نہیں دیکھا تھا وہ لوگ بھی جانے پہچانے نظر آتے تھے۔ وہی انارکلی کے رنگ صورت اور وہی گہما گہمی۔ لیکن ایک عجیب بات تھی کہ عین اس وقت کوئی دیسی افسر نظر نہ آرہا تھا البتہ ایک قریب کے خیمے سے قہقہے بلند ہو رہے تھے جو لا ریب افسرانہ تھے۔ چک اٹھا کر جو داخل ہوا تو سب یکجا موجود تھے۔ مختار قاضی، امیر بتالیہ، بھاٹیہ، کیانی، امیر سومرو، نیتے، نادر، اور کئی دوسرے کہ جن سے ابھی تعارف نہیں تھا۔ ہماری آمد کو حسبِ معمول ایک ایسے نعرے سے منایا گیا جس کو دہل شانے کے دیگر خیموں میں ایک ملائم سے زلزلے کے طور پر محسوس کیا گیا۔ پوچھا فرزندانِ ہند اس بند خیمے میں بیٹھے کیا سازش کر رہے ہیں تو بتایا گیا کہ کونسل آف ایکشن کا اجلاس ہے۔ ہوا یہ تھا کہ ایک انگریز میجر بنام مڈوے (MIDWAY) نے کیپٹن ماجند رسنگھ بتالیہ کے خلاف ایک کیس کھڑا کر دیا تھا۔ یا بزبانِ فوج انہیں چارج پر رکھ دیا تھا۔ فردِ جرم میں مذکور تھا کہ ملزم کو کیبرے دیکھنے کے لیے شام چھ بجے سے پہلے جانا تھا کوئی اور سواری نہ ملی تو آپ ڈاک والی گاڑی بغیر اجازت لے کر دیکھنے چلا گیا وغیرہ وغیرہ۔ اب ایوان کے سامنے سوال یہ تھا کہ بتالیہ کیا صفائی پیش کرے۔ مختلف تجاویز پیش کی گئیں۔ مثلاً یہ کہ ملزم ارتکابِ جرم سے صاف انکار کرے اور ثبوت میں سعید اخان ڈرائیور سے

شہادت دلوائی جائے ۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ ملزم ڈٹ کر اقبال جرم کرے لیکن ٹریننگ کا بہانہ کرے۔ اگر پوچھا جائے کہ یہ حرکت سرِ شام کیوں کی گئی تو عدالت کی توجہ نائٹ ٹریننگ کی اہمیت کی طرف دلائی جائے۔ یہ سوال کہ ٹریننگ کیمبر سے پرکیوں جا ختم ہوئی تو اس کی وجہ (COMPASS ERROR) یعنی قطب نما کی غلطی بتائی جائے ۔ مجھے یہ دوسری تجویز کچھ مذاق سا معلوم ہوئی لیکن دوسرے روز بتالیہ نے کورٹ کے سامنے یہی صفائی لفظ بہ لفظ پیش کر دی ۔ عدالت نے، جس کے ارکان یقیناً اہلِ دل تھے، اپنے فاضلانہ فیصلے میں لکھا کہ کوئی جرم سرزد نہیں ہوا۔ کیپٹن بتالیہ کو ایک بہتر قطب نما مہیا کی جائے ۔

قصہ مختصر اگلی صبح بتالیہ صاحب کیمبر سے دیکھنے گئے تو ٹھیک میں تشریف لے گئے۔ حالانکہ انہیں ایسی سواری کی چنداں ضرورت نہ تھی ۔ یہ حرکت محض میجر ہڈ وے کی خوش لوذئی مزاج کی خاطر کی گئی تھی ۔ ہڈ وے جب یہ خبر سنی تو اس سے زیادہ بے بس اور مضمحل انگریز برطانوی سلطنت میں نہیں تھا ۔ بے بس اس لئے کہ ابھی ابھی ایک نئی قطب نما بتالیہ کو دے چکا تھا ۔ زبان کھلتا تو نیا ٹینک پیدا کرنا پڑتا ۔

کیپٹن بتالیہ کی مہم نے میجر ہڈ وے کی شکایتوں کا تو تقریباً قلع قمع کر دیا تھا لیکن اس کی بدتمیزی کا انسداد مشکل تھا۔ میجر ہڈ وے کی بدتمیزی کچھ خداداد سی چیز معلوم ہوتی تھی اور اس باب میں وہ خاصا برگزیدہ شخص تھا معلوم ہوتا ہے اس جنس کی تقسیم کے وقت اسے قرب خاص حاصل تھا اور کسی مغالطے کے تحت اس نے اپنا دامن ذرا زیادہ پھیلا دیا تھا اور اب اس بیکراں دولت کو اس آزادی سے استعمال کرتا تھا کہ اس کی ترکیب استعمال کو داد دینے کو جی چاہتا تھا۔ مثلاً ایک مرتبہ مجھے میجر صاحب سے کام پڑ گیا ۔ ان کے دفتر میں حاضر ہوا دروازے پر کھڑا ہو کر معروف انگریزی طریقے سے اندر آنے کی اجازت مانگی "میں ایک سیکنڈ کے لئے آسکتا ہوں ؟" میجر بولے ہاں آؤ ۔ اندر داخل ہوا اور ابتدائے کلام کرنے لگا تو گھڑی دیکھ کر بولے "ایک سیکنڈ ہو گیا ہے آپ جا سکتے ہیں" بات تو ٹھیک تھی۔ ایک چھوڑ ڈیڑھ سیکنڈ ہو گیا تھا ۔ مؤدبانہ سلوٹ کیا اور باہر آ گیا ۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میجر صاحب کی بدتمیزی پہ پیار بھی آیا ۔ لیکن بدقسمتی سے یہ بدتمیزی کسی قدر ان کی پریشانی کا باعث بنی ۔ ہوا یہ تھا کہ میں میجر صاحب کے پاس ان کی ہمکلامی کا فخر حاصل کرنے کے علاوہ ایک سرکاری کام سے گیا تھا ۔ مجھے کیمپ کے کمانڈنٹ صاحب نے چند ضروری کاغذات دے کر بھیجا تھا کہ میجر ہڈ وے کو پہنچا دینا۔ ایک سیکنڈ کی مہلت میں یہ کاغذات پیش کرنے کی نوبت ہی نہ آئی ۔ دوپہر کو جب کرنل صاحب لنچ پر آئے تو انہیں واپس کر دیئے اور ساتھ ہی وجہ بھی عرض کر دی ۔ یہ معلوم نہیں کہ بعد میں میجر ہڈ وے اور کرنل صاحب کے درمیان کیا گزری البتہ بعد ازاں

جب کبھی ہم نے میجر ٹڈرے کے دروازے پر دستک دی تو وہ یہ نہیں پوچھتے تھے کہ کیا چاہتے ہو بلکہ یہ کہ کیا لائے ہو اور جی کو الکحلک کفایت سی مسکراہٹ کا انتظام بھی فرما دیتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ میجر ٹڈرے کی بدتمیزیاں ہماری زندگی کا حصہ بن گئی تھیں۔ لیکن بدقسمتی سے ایک دو ناموافق حادثوں کے بعد میجر صاحب کسی قدر خوش اخلاقی پر اتر آئے جس کا ہماری صحت پر خاصا ناگوار اثر پڑا۔

ہم ہوئے کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا

لیکن جس چیز نے قصیدۂ شاہ کو رنگین کر دیا۔ وہ غریب ٹڈرے کا لہو نہ تھا۔ بلکہ خوبانِ بصرہ کے لب و رخسار کا غازہ تھا۔ بصرہ شاہ سے بہت دور نہیں تھا۔ یہی کوئی چودہ پندرہ میل۔ چنانچہ ہماری ہر شام بصرہ میں گزرتی تھی۔ پہلی مرتبہ ہم ایک اتوار کی صبح کو وہاں گئے اور دیکھ کر حیرت ہوئی کہ عراقی مرد تو ہم ہندیوں کی طرح گورے بھی تھے اور کالے بھی۔ لیکن خواتین عراق کی سب کی سب لالہ رخ اور سمن بر تھیں۔ یہ درست ہے کہ یہ لالہ و سمن کسی قدر افلاس کے خس و خاشاک سے آلودہ تھا۔ لیکن ہم درجہ اوّل کے متوالے ہندی شہزادوں کے دل و دماغ کو معطر کرنے کے لئے کافی تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ بصرہ کے بازاروں کی بھکارنیں بھی اگر کسی طرح ہندوستانی ریاستوں میں پہنچ جائیں تو بلا تکلف جوہیر مہارانیاں بن جائیں۔ اس قدر بے محابہ حسن کو یوں چیتھڑوں میں ملبوس اور ننگے پاؤں دیکھ کر صدمہ ہوا بلکہ ہمارے ایک دوست نے جب پہلی عراقی حسینہ کو ننگے پاؤں دیکھا تو تڑاک سے اسے جوتے خرید دیئے۔ فرمانے لگے "کیا ستم ہے۔ پھولوں جیسے نازک پاؤں اور انگاروں کی سی زمین پر چلنا پڑے۔ میری حمیت کو گوارا نہیں۔" لیکن بعد میں جب ایسی ہی گل اندا موں کے ٹھٹھ دیکھے جو بلا تکلف بصرے کے بازاروں میں ننگے پاؤں پھر رہے تھے تو کسی قدر پریشان ہوئے۔ غالباً دل ہی دل میں اپنی پونجی کو ان برہنہ پا حسینوں کی تعداد پر تقسیم کیا اور دیکھا کہ حاصل قسمت اتنا بھی نہیں کہ فی حسینہ ایک انگلی بھی ڈھک سکے۔ اس سادہ تقسیم کے سوال نے انہیں گہری رومانی دنیا سے نکال کر بصرے کے پہلے چوک میں لا کھڑا کیا۔ چنانچہ اب وہ بے پاپوش دوشیزاؤں کو دیکھتے تو ان کی حمیت کو کوئی واضح ٹھیس نہ لگتی۔

لیکن بصرے میں ایسی عورتیں بھی تھیں جو جوتے پہنتی تھیں اور قدرت کے ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ بالآخر ہمارے دوست کو واسطہ پڑا تو ایک ایسی خاتون سے جس کے جوتے کی نوک میں قیامت پنہاں تھی۔ ساتھ ہی اس سراپا ناز کو دھول دھپا سے بھی خاص پرہیز نہ تھا۔ چنانچہ ایک روز ان کے سر پر اچانک یہ قیامت ٹوٹ پڑی یعنی بغیر کسی پیش دستی کے وہ اس خاتون کی ذلیل پیش قدمی کا شکار ہو گئے اور ہفتہ بھر کسی کو منہ بلکہ سر دکھانے کے قابل نہ رہے

ہمیں پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ جوتے کا جارحانہ استعمال فقط ہندوستانی خواتین کا ہی اجارہ نہیں بلکہ یہ عراقی بیٹی کا عالمگیر ہتھیار ہے۔ بہر حال یہ صنفِ جوتے کا بپا کردہ محشر ایسی چیز نہ تھی کہ ہمارے دوست کے جنونِ عشق کے انداز چھٹ جاتے۔ چند ہی دنوں میں آپ کے نہ صرف بال اُگ آئے بلکہ اس زود پشیمان خاتون کے دل میں مہر و محبت کے چشمے بھی اُبلنے لگے۔ آج کل جب کبھی یہ میاں بیوی ہمیں پاکستان میں ملتے تو ہم شرارتاً اسکول کے دنوں کا مصرعہ گنگناتے ہیں۔

المدد پاپوشِ جاناں سر مرا کھلائے ہے

لیکن حسینانِ بصرہ کے ساتھ ہمارے تمام معاملے شادی پر ہی ختم نہ ہوئے بلکہ بعض اوقات تو ہمیں نہایت ہی جگر خراش ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا۔ مثلاً مسعودیہ ہوٹل کی وہ رنگین شام کہ اس کا وسیع دالان حسینوں سے پُر تھا اور لیفٹیننٹ کیانی یکایک ایک فتنۂ روزگار پیکر کے کرشمے سے دل لٹانے کو آمادہ ہو گئے۔ ہر چند کہ وہ کافرہ اس خرابۂ عظیم کی تحتی تھی۔ تاہم اس کا انتخاب اس اعتبار سے ناموزوں تھا کہ کتخدا تھی اور اپنے دولہا کے میں پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی۔ معلوم ہوا عراقی نصرانیوں میں سے ہیں اور مسز الیاس کہلاتی ہیں۔ بدقسمتی سے آپ کے دولہا میاں اس قدر واضح طور پر مرنجاں مرنج اور دردِ دل سے یتیم نظر آتے تھے کہ کیانی نے انہیں ایک نظر دیکھا اور خاصا نظر انداز کر دیا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھا اور جا کر مسز الیاس کے قدم جالئے اور اس سے تخلیے میں بات کرنے کی التجا کی۔ مسز الیاس کی زندگی میں غالباً کیانی پہلے پجاری نہ تھے جنہوں نے اس کے قدموں پر دل کی بھینٹ چڑھائی ہو۔ چنانچہ اس نے سکون اور وقار کے ساتھ اجنبی کی التجا سنی اور پھر اپنے خاوند کی طرف دیکھا گویا کہتی ہو کہ یہ وہ مقام ہے جہاں جواب دینا خاوند کا کام ہے اور کتنا ہی بے جان خاوند کیوں نہ ہو یہ آگ بگولہ ہونے کا وقت ہوتا ہے چنانچہ خاوند بصورت حسبِ توفیق آگ بگولہ ہوئے اور اٹھ کر کچھ کرنے کو تھے کہ کیانی نے ان کے سر کو دبا کر کرسی پر بٹھا دیا۔ بلکہ کرسی پر چپکا دیا کیونکہ اس کے بعد مسٹر الیاس نے کرسی سے اٹھنے کی کوشش نہ کی۔ اب ان میں آگ باقی رہی نہ بگولہ۔ بس ایک فیل شدہ خاوندیت لے کر حالاتِ حاضرہ کا اتار چڑھاؤ دیکھ رہے تھے۔ اب معاملہ مسز الیاس اور کیانی کے درمیان تھا۔ مسز الیاس نے موقع کا جائزہ لیا۔ کیانی کو ایک واجبی سے قہر سے دیکھا۔ اٹھی اور اٹھ کر کیانی کے رخسار پر ایک ہلکا سا تھپڑ رسید کیا۔ وہی تھپڑ جو خوانہ بدتمیزیوں کا ردائی سا نسوانی جواب ہوتا ہے۔ اس سے کوئی جسمانی گزند پہنچانا مقصود نہیں ہوتا۔ البتہ اس کا اخلاقی گھاؤ خاصا گہرا ہوتا ہے۔ اس تھپڑ کو کیانی نے ایک گونہ اطمینان سے برداشت کیا۔ بظاہر ان کی زندگی میں بھی یہ پہلا حادثہ نہ تھا۔ اگلے لمحے میں مسز

لیاس کا ردِ عمل اس چیز کی طرف تھا جو اُن کا خاوند دکھلاتا تھا۔ اس قابلِ احترام خاتون نے پہلے سے گہری حقارت کی نگاہ سے دیکھا اور پھر اس کے بائیں گال کو ایک دھڑلے کے تھپڑ سے مستفید کیا۔ تھپڑ کی گونج اور مضروب کی چیخ سے واضح تھا کہ یہ محض اخلاقی تھپڑ نہ تھا۔ یہ ہو چکا تو مسز الیاس نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور ایک تمکنت کے ساتھ تنہا ہوٹل سے باہر چل دی۔

بیستا باں بصرہ کا ذکر جتنا جمیل ہے اتنا ہی طویل ہے اور اس کی تفصیل سے احتراز ہی مناسب ہے۔ مختصر یہ کہ وہاں کی زندگی تھپیڑوں اور بوسوں کا ایک کھٹا میٹھا مرکب تھی اور اس میں شک نہیں کہ تا بنے کے بے معنی اور بے رنگ دن محض اس لیے قابلِ برداشت تھے کہ ہر دن کے انجام پر بصرے کی ایک بامعنی اور رنگین شام تھی۔ لیکن یوں معلوم ہوتا تھا کہ بصرے کے اہلکار ہمارے قوائے عسکری پر تدریجاً غالب آرہے ہیں اور اگر ہم سے کوئی جنگی مدد مقصود تھا تو یہ وقت تھا کہ ہمیں بصرے سے نکال کر کارزار میں ڈال دیا جاتا اور یہ دن دور نہیں تھا۔

بیچارے شاعر

مجید لاہوری

اب تک یہ ہوا تھا کہ یار لوگوں نے انجمن بنائی اور اس کے اہتمام میں ایک مشاعرہ کر ڈالا۔ آل پاکستان مشاعرے سے لے کر مقامی مشاعرے تک اسی طرح ہوتے رہے۔ ٹکٹ والے مشاعرے بھی اور بے ٹکٹ کے مشاعرے بھی۔ عام مشاعرے بھی اور محدود مشاعرے بھی۔ ادبی انجمنوں اور اداروں کے مشاعرے بھی اور پرائیویٹ مشاعرے بھی۔ کالج کے مشاعرے بھی اور کسی محلے کے مشاعرے بھی، جو ریڈیو پر نشر ہوتے ہیں، اور وہ بھی جو لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے گھر بیٹھے جاسوسی ناولوں کی طرح راتوں کو نیند حرام کرتے ہیں۔

یہاں تک تو خیر سب کچھ چل رہا تھا، مگر اب یہ وبا بھی شروع ہو چکی ہے کہ جس طرح جیم کے پیٹ میں ایک نقطہ ہوتا ہے، اسی طرح ہر دعوت کے پیٹ میں مشاعرہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات دعوت نامے میں لکھ دیا جاتا ہے کہ "اپنے کلام بلاغت نظام سے سرفراز فرمائیے"۔ یعنی جہاں کھانے کے لئے آپ دانت تیز کریں، یا چورن کا انتظام کریں، وہاں "ساؤنڈ بکس" کو بھی ٹھیک کریں، اور نمکین پانی سے "غرغرے" بھی کریں۔ بیاض بھی جیب میں ڈال کر لائیں وغیرہ۔

خیر ان دعوت ناموں کی وجہ سے "شاعر لوگ" کو تیاری کا موقع مل جاتا ہے، اور انہیں پتہ چل جاتا ہے کہ کھانے کے بعد گانا بھی ہوگا۔ "جس کا کھاؤ، اس کا گاؤ" نہ سہی، مگر جس کے ہاں کھاؤ، اس کے ہاں گاؤ ضرور یعنی:

کھاؤ نمک تو حق نمک بھی ادا کرو

یہاں تک چلیے، اس کی اجازت دی جا سکتی ہے کم از کم اس میں اتنی گنجائش تو ہے کہ جو لوگ اس کو پسند کرتے ہیں کہ کھانا کھا کر گانا شروع کریں، وہ دعوت قبول کر لیں، اور شوق سے جائیں، مگر جن کو یہ حرکت کچھ ناشائستہ معلوم ہوتی ہے کہ کھانا کھا کر مہمان کھسکنے اور سرکنے کی سوچیں، اور ان سے کہا جائے "حضرات تھوڑی

دیر اور زحمت گوارا فرمایئے، کیونکہ بڑا بڑا شاعر لوگ" موجود ہے، اور وہ کلام سنائے گا۔ ایسے لوگ دعوت نامہ پڑھ کر دعوت میں شرکت سے معذوری کا اظہار کر سکتے ہیں۔

مگر اس سلسلے میں ایک اور طریقہ بھی اختیار کیا جاتا ہے، وہ یہ کہ عام دعوتوں کی طرح دعوتی کارڈ بھیج دیئے جاتے ہیں۔ جب کھانے کا قصہ ختم ہو جاتا ہے، اور لوگ جانے کی سوچتے ہیں، تو بغیر کسی پیشگی اطلاع کے شاعر سے کہا جاتا ہے:

"حضرت! سب لوگ آپ کے ارشادات عالیہ سننے کے لئے بے تاب ہیں، یعنی کہہ رہے ہیں:

آج غالب غزل سرا نہ ہوا

اور دوسری طرف دو حضرات سے کہا جاتا ہے کہ تھوڑی دیر اور تشریف رکھیئے۔

"حضرت پھیپھڑا گروہ آبادی آپ کو اپنا کلام سنائیں گے، یعنی حضرت پھیپھڑا گروہ آبادی صاحب بغیر کسی اطلاع کے "بیگار" میں "این ہمہ بچہ شتر است" کہہ کر دھر لئے جاتے ہیں۔ انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ جب سب لوگ مہمان ہیں، اور سب نے کھانا کھایا ہے، تو ایک شخص کیوں گائے؟ سب کو گانا چاہیئے، مگر شاعر ہونے کی سزا حضرت پھیپھڑا گروہ آبادی کو ملتی ہے۔ اگر ٹالتے ہیں، تو نمک کی مار پڑتی ہے۔ بہر حال گلا صاف کر کے کچھ نہ کچھ سنانا ہی پڑتا ہے۔

بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے۔ ایک دعوت نامے کے ساتھ تین دعوت نامے اور بھی بھیجے جاتے ہیں کہ اپنے ہم ذوق دوستوں کو ساتھ لائیے۔ شاعر صاحب ظاہر ہے کہ یہ دعوت نامے اپنے شاعر دوستوں کو دیتے ہیں۔ اور اس طرح دعوت میں اچھا خاصا مشاعرہ جمع ہو جاتا ہے۔ اس طرح بھی شاعر لوگ اس جال میں پھنس جاتے ہیں مگر بعض اوقات دعوت کے "داعی صاحبان" صاف طور پر دعوت نامے میں لکھ دیتے، یا زبانی کہہ دیتے ہیں، کہ حضرت! دو چار شاعروں کو ساتھ لیتے آیئے گا۔

اس میں بھی "فرار" کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ یعنی بیگار میں پکڑے جانے کا خطرہ نہیں رہتا۔

یہ تو تھے، وہ مشاعرے جو دعوتوں کے پیٹ میں جنم لیتے ہیں۔ اب اور سنئے، یار لوگوں نے خوشی کی تقریبات پر بھانڈوں اور طوائفوں کو بلانے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے، کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ شاعروں کی قیمت دو کوفتے ایک قورمے کی پلیٹ اور ایک پلاؤ کی قاب ہے، بس وہ سامنے رکھ دیجئے، اور غزل لو کیا، پورا دیوان سماعت فرما لیجئے۔ شادی کے موقع پر ایسے مشاعرے ہوتے ہیں۔ غزلوں کے علاوہ ان میں شاعر لوگ سہرے بھی پڑھتے ہیں

مالن بنا کے لائی کیا پُر بہار سہرا

شادی کے بعد خوشی کی ایک اور تقریب بھی آتی ہے، خدا بیٹا بیٹی دیتا ہے۔ اگر بیٹی ہوئی، تو خیر سلسلہ آگے نہیں بڑھتا، اور اگر بیٹا ہوتا ہے، تو پھر عقیقے اور ختنے کی تقریب پر ایک مشاعرہ ہوتا ہے۔ اس قسم کے مشاعرے کراچی میں ہو چکے ہیں۔ مگر سب کے سب غیر طرحی۔ ایک خوش ذوق بزرگ نے طرحی مشاعرہ بھی کر ڈالا اس "ختنوں" مشاعرے کا مصرعہ طرح تھا،

مسلمانی میں طاقت خون کے بہنے سے آتی ہے

یہ مصرعہ اکبر الہ آبادی کا ہے، پورا شعر یوں ہے:

بوقت ختنہ میں رویا، تو نائی نے کہا ہنس کر

مسلمانی میں طاقت خون کے بہنے سے آتی ہے

خیر یہاں تک بھی گوارہ کر لیجئے، مگر خوشی کی تقریبات سے یہ سلسلہ بڑھ کر اب غم کی جلسوں تک پہنچ گیا ہے مثلاً ایک آدمی مر گیا، اس کے چالیسویں پر بجائے فاتحہ درود اور نذر و نیاز کے یار لوگ مشاعرہ کر رہے ہیں۔ اور یہ سلسلہ صرف چالیسویں پر ہی ختم نہیں ہوتا، بلکہ ہر برس "برسی" کے سلسلے میں مشاعرہ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ابھی ترقی کی گنجائش ہے۔ یعنی قل کی رسم کے موقع پر بھی یار لوگ بجائے فاتحہ درود کے مشاعرے کی رسم ایجاد کرنا چاہتے ہیں، تاکہ مرنے والوں کی روح کو غزلوں کا ثواب پہنچایا جا سکے۔ یہاں تک تو انوکھے مشاعروں کا ذکر تھا۔ اب آخر میں کچھ شاعروں کے متعلق سن لیجئے۔

مولانا الحاج ماہر القادری راوی ہیں (عذاب برگردن راوی) کہ ایک مشاعرے میں ایک شاعر صاحب تشریف لائے۔ انہوں نے منتظمین سے اصرار کیا کہ انہیں فوراً پڑھوا دیا جائے۔

منتظم حضرات نے کہا "حضور! آپ بڑے اساتذہ کرام ہیں، اس لئے آپ کی باری بعد کو آئے گی۔"

شاعر نے کہا: میں اتنی دیر نہیں رک سکتا۔ فوراً غزل پڑھ کر گھر جانا چاہتا ہوں، کیونکہ میرا بیٹا مر گیا ہے، اور اس کے کفن دفن کا بندوبست کرنا ہے۔

آخر میں ایک اور شاعر کا دلچسپ قصہ بھی سن لیجئے: ایک شاعر کسی دوسرے شہر میں مشاعرے میں شرکت کے لئے آ رہے تھے۔ اتفاق سے گاڑی کو حادثہ پیش آیا، تو گاڑی لیٹ ہو گئی، اور بجائے رات کے نو بجے پہنچنے کے تین بجے شب پہنچی۔ اس وقت "مشاعرہ گاہ" میں شاعروں کے بجائے الو بول رہا تھا۔ چند

مزدور دریاں، تمبو، قناتیں اور کرسیاں اٹھا رہے تھے۔ شاعر صاحب مایوس ہو چلے تھے کہ انہیں ایک ترکیب سوجھی، فوراً اسٹیج پر کھڑے ہو کر کہا:

"اے مزدورو! میں مزدور شاعر ہوں، بڑی دور سے آیا ہوں، گاڑی لیٹ پہنچی ہے، تو اس میں میرا کیا قصور؟ لوگ جا چکے ہیں، مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ ہم لوگ تمبو، قناتیں، کرسیاں چھوڑ کر جہاں جہاں کھڑے ہو، وہاں بیٹھ جاؤ، تمہیں ایک نظم سنانا چاہتا ہوں، جس کا عنوان ہے:

'مزدور کی موت!'"

راوی کا بیان ہے، یہ نظم جب ختم ہوئی، صبح کی اذان ہو رہی تھی، اور مزدور گہری نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔

روپے کی ضرورت

محمد احسن فاروقی

مالداری ناداری۔ غربت۔ امارت پر لوگ ہمیشہ سے سوچتے آئے ہیں اور دونوں کے فائدے اور نقصانات پر مدلل بحث ہوتی رہی ہے۔ قدیم دور میں ان بحثوں کی تان امارت کے نقصانات پر ٹوٹتی اور جدید دور میں زیادہ تر لوگ امارت اور غربت کو ختم کر کے سب کو برابر کر دینے کے خواب دیکھتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس وقت بالکل امیر اور بالکل غریب لوگ ہیں بھی کہ نہیں، میری نظر اپنے طبقہ پر ہے۔ جس میں وہ لوگ ہیں جو تھوڑا یا بہت کما کر لاتے ہیں اور اس کمائی کے بغیر وہ اور ان کے خاندان مصیبت میں پڑ جاتے ہیں اس میں وہ چھوٹا منشی بھی ہے جس کی تنخواہ محض روٹی ہی بہم پہنچا سکتی ہے اور وہ کپڑے بنانے کے لئے روپیہ کی سخت ضرورت محسوس کرتا ہے اور ان لوگوں کے خرچوں کی طرف دیکھتا ہے جن کو بڑی تنخواہیں ملتی ہیں اور وہ بڑی تنخواہ پانے والا جسٹس بھی ہے جو محسوس کرتا ہے کہ اسے ایسے ٹیپ ٹاپ سے رہنے کی عادت پڑ گئی ہے کہ جو کچھ اس نے جسٹس ہونے سے پہلے وکالت میں کما کر جمع کیا تھا وہ خرچ ہو رہا ہے اور جسٹس سے ریٹائر ہو کر پھر وکالت کرنے لگتا ہے ہر تنخواہ دار کے لئے چاہے اس کی تنخواہ کتنی بڑی یا کتنی چھوٹی ہو یہ کہا جاتا ہے کہ مہینہ میں دس دن رئیس دس دن غریب اور دس دن فقیر۔ حقیقت ہے کہ پہلی کو تنخواہ پانے والا چاہے وہ سو روپیہ پائے یا تین ہزار آخری مہینے کا حساب کرنے کے بعد اتنی رقم اپنے ہاتھ میں دیکھتا ہے کہ عیش اور خراجی کی طرف مائل ہو جاتا ہے اس کے بعد دس دن تک وہ ہاتھ روکے رہتا ہے۔ ضرورتیں کسی طرح سے نکلتی ہیں مگر کہاں تک روکے بیس تاریخ سے ہر دوست سے مانگنے لگتا ہے۔ بینک سے اوور ڈرافٹ لینے لگتا ہے کوئی سانحہ کوئی بیماری ہو جائے تو مصیبت آجاتی ہے اور مانگنے کا عمل اور تیز ہو جاتا ہے۔ مہینے کی آخری تاریخیں ناداری اور فقیری کا عجیب عالم لے کر آتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امارت اور غربت اب ویسی مستقل چیزیں نہیں رہ گئی ہیں جیسے قدیم زمانہ میں تھیں۔ یعنی جو مالدار ہے اسے روپیہ کی کبھی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوتی اور جو غریب ہے اسے ہر وقت ضرورت

ستاتی رہتی ہے۔ یہ ہر شخص پر آتی جاتی رہتی ہے اور کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جس کو روپیہ کی ضرورت نہ محسوس ہو۔ اب سب سے زیادہ مالدار لوگ زمیندار نہیں جن کی زمینداری ہر وقت روپیہ اگلتی رہتی تھی اور انہیں روپیہ کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی تھی۔ اب مالدار تجارت پیشہ ہیں اور اگر ان کے پاس روز بڑی بڑی رقمیں آتی رہتی ہیں تو انہیں تجارت کو قائم رکھنے کے لئے اتنی ہی بڑی رقمیں لگانا پڑتی ہیں۔ میں نے کوئی بڑا تاجر نہیں دیکھا جو ہر لمحہ روپیہ کی ضرورت نہ محسوس کرتا ہو۔ اپنے اخراجات پر سخت پابندی نہ لگاتا ہو اور مستقل آمدنی والے نوکر پیشہ لوگوں کو اپنے سے بہتر نہ سمجھتا ہو۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں۔

ہمہ را حاتی حسرت جانان دیدم　　　چو بحسرت کدہ گبر و مسلمان رفتم

مگر جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں مجھے اپنے طبقہ کی روپیہ کی ضرورت سے سروکار ہے اور اپنے کو اس طبقہ کا اوسط نمائندہ مان کر میں روپیہ کی عام ضرورت کا اندازہ لگا سکتا ہوں۔ میں ایسے گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں جہاں ایک طرف، بغیر محنت کی آمدنی کی وجہ سے اس بات پر عقیدہ تھا ؎

کار ساز ما بفکر کار ما　　　فکر ما در کار ما آزار ما

اور دوسری طرف یہ دھڑکا تھا کہ آئندہ یہ آمدنی ختم ہو جائے گی تو کیا ہوگا۔ اس گھرانے میں سب سے اہم اخلاقی سبق جو دیا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ روپیہ کی لالچ سب سے بڑا گناہ ہے یہی سب گناہوں کی جڑ ہے اور جس میں یہ ہو وہ پست، کم ظرف اور کمینہ ہوتا ہے۔ اس کے مطابق تربیت کی بنا پر اگر مجھے کسی چیز کے حاصل کرنے کا شوق ہوتا اور اس کے لئے روپیہ کی ضرورت محسوس کرتا تو میرا ضمیر کہتا کہ میں پستی کی طرف جا رہا ہوں۔ اگر روپے پاس آتے تو جلد سے جلد خرچ کر کے ہلکا ہو جاتا۔ مگر ضمیر انسان کے اندر کے نفس پر قابو کرنے والی ایسی قوت ہے جو قدم قدم پر ناکامیاب ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ شاید ہی کوئی دن گزرا ہو جب کسی کھلونے کو حاصل کرنے کے لئے روپیہ کی ضرورت نہ محسوس ہوئی ہو۔ جوں جوں بڑھتا گیا نئے نئے اور بڑے بڑے کھلونے سامنے آتے گئے اور ان کو حاصل کرنے کے لئے زیادہ بڑی رقموں کی ضرورت محسوس ہوتی گئی۔ تفصیل کی ضرورت نہیں اسکول میں دوسرے لڑکوں کے پاس جو کوئی نئی چیز دکھائی دیتی اس کے ملنے کی خواہش پیدا ہوتی اور اسے حاصل کرنے کے لئے روپیہ کی ضرورت محسوس ہوتی۔ ان خواہشوں میں مثالی خواہش بائیسکل حاصل کرنے کی تھی اور اس کے لئے اور چیزوں سے زیادہ رقم کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ والدہ نے وعدہ کیا تھا کہ اب کی فصل پر گاؤں سے جو روپیہ آئے گا تو بائیسکل لے دی جائے گی۔ مگر ہر فصل پر جب روپیہ آتا تو سب حسابات میں ایسا چک جاتا کہ بائیسکل کے لئے ایک روپیہ بھی

نہ بچتا۔ نہ معلوم کتنی فصلیں آئیں اور چلی گئیں اور میں بائیسکل کے لئے ضد کرتا اور روتا رہا۔ والد بائیسکل کے نقصانات پر وعظ کرتے، جن میں پھیپھڑے خراب ہو جانے، کسی گاڑی سے لڑ جانے، خواہ مخواہ وقت خراب ہونے وغیرہ کے خوف دلائے جاتے۔ میں خاموش رہتا مگر اندر ہی اندر کہتا۔ ؎

بیکار ترا ناصح سمجھانا بجھانا ہے — دل ایک ہی کافر ہے مانے گا نہ مانا ہے

تین برس گزرنے کے بعد اتفاق سے اتنی رقم مل گئی کہ سائیکل خرید لی گئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اتنی دیر لگنے کی وجہ سے دل میں خواہش پالنے اور روپیہ کی ضرورت محسوس کرتے رہنے کی عادت پڑ گئی اور پھر تو کسی نہ کسی چیز کے ملنے کے لئے روپیہ کی ضرورت محسوس کرتے رہنا فطرت ثانیہ بن گئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا قریب قریب ہر فرد کے ساتھ ہوتا ہے۔ میری خواہش پوری ہونے میں دیر لگی دوسروں کی جلدی پوری ہو گئیں مگر نتیجہ یہی ہوا کہ ایک چیز ملنے کے بعد دوسری کی خواہش پیدا ہوئی اور اسے پورا کرنے کے لئے روپیہ کی ضرورت محسوس ہوتی رہی اس ترقی یافتہ اور ترقی کرتی ہوئی دنیا میں ہر روز نئی نئی چیزیں نکل رہی ہیں اور ہر شخص ہی ان کو حاصل کرنے کی خواہش کے ماتحت روپیہ کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔

اس قسم کی ضرورت کو اخلاقی نقطۂ نظر سے ہوس کہا جائے گا اور غور سے دیکھئے تو اس کے لئے ضرورت کا لفظ مناسب نہیں ہے۔ جن چیزوں کو حاصل کرنے کی خواہش ہوتی ہے وہ بیشتر بلا ضرورت ہوتی ہے۔ ضرورت کا صحیح تعلق ان چیزوں سے ہے جو بالکل ضروری ہوں۔ انسان آرام طلب اور عیش پسند ہے اور بہتر سے بہترین محلوں میں رہنے اور بہتر سے بہترین سواریوں میں پھرنے، حسین سے حسین عورتوں کے ساتھ رہنے کا خواب دیکھتا ہے اور اس سلسلے میں روپیہ کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ میں اس سلسلے میں توازن پسند رہا۔ اونچے اونچے خواب ضرور دیکھے مگر آخر میں ان کو ناممکن سمجھ کر ایک اوسط قسم کے بنگلے میں رہنے اور چھوٹی موٹر رکھنے پر قناعت کرنا مناسب معلوم ہوا۔ اور اس معیار کی زندگی جس کے یہ لوازمات ہیں مجھے حاصل ہو گئی۔ میں نے اس زندگی کے فائدے اور نقصان دونوں دیکھے۔ اس سے اعلیٰ اور ادنیٰ زندگی پر بھی غور کیا۔ ایک وقت زیادہ عیش و آرام کی زندگی کی بڑی خواہش کی مگر اس میں رہنے والوں کی تکالیف بھی دیکھیں اور نتیجہ نکالا کہ میں ان سے بہتر ہوں۔ اپنے سے پست درجہ پر زندگی بسر کرنے والوں کا بھی حال دیکھا اور یہ بھی سمجھ میں آیا کہ وہ مجھ سے بہتر ہیں۔ میرے ایک چچا زاد بھائی تھے وہ کہا کرتے تھے "تمہیں اب کیا ضرورت۔ اچھی خاصی جگہ حسین اور سگھڑ بیوی ہے۔ یونیورسٹی میں ملازم ہو۔ اچھی تنخواہ اور کام کچھ نہیں۔ رہنے کو ایسا گھر جیسا لاکھوں کے پاس نہیں

چلنے کو موٹر شہر کے باعزت لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔ بچے ہیں، مناسب تعلیم ہو رہی ہے۔ تمہاری زندگی آئیڈیل ہے میں سوچنے لگتا کہ ہر اس چیز کو جسے وہ میرے آرام اور عیش سے متعلق کر رہے ہیں میرے لئے فکر اور روپیہ کی ضرورت محسوس کرنے کا باعث ہے۔ بیوی سنگھار کے لئے کپڑوں کے لئے روپیہ طلب کرتی ہے اور گھر چلانے میں بھی زیادہ ہی اٹھاتی ہے۔ اچھی تنخواہ اور باعزت ملازمت کے لوازمات بھی خرچہ چاہتے ہیں۔ موٹر آرام دہ چیز ہونے سے زیادہ ایک شان کی چیز ہے۔ اسٹیونس نے گھوڑے کو جانوروں کی فاؤن لیڈی کہا ہے۔ موٹر سواریوں کی فاؤن لیڈی ہے جب تک نئی ہے نخرے کرتی ہے اور اس کی سجاوٹ پر پیسے خرچ کرتے رہو اور جب پرانی ہو جاتی ہے تو روز ٹوٹ پھوٹ لگی رہتی ہے اور اسے بنوانے میں بے پناہ خرچہ ہوتا ہے۔ پھر اگر ضرورتاً اسے بیس میل چلایئے تو ضرورتاً چالیس میل ضرور چلانا پڑتا ہے اور ڈرائیور کو لیجئے تو اس کے پورے پورے غلام ہو جائیے، نہیں تو دن بھر خود ڈرائیور بنے پھریئے۔ کراچی ایسے شہر میں موٹر جتنا ضروری ہے اتنی ہی وہ مصیبت ہو جاتی ہے تنگ آ کر میں نے موٹر رکھنے سے توبہ کی اور بس پر چلنا بہت بہتر سمجھتا ہوں۔ اسی طرح ہر وہ چیز جو آرام کی زندگی سے تعلق رکھتی ہے اور اس کے لئے ضروری قرار دی جاتی ہے میرے لئے تکلیف دہ ہو گئی ہے جب کبھی کسی بڑے خوش نما اور وسیع گھر کے پاس سے گزرتا ہوں تو رہنے والے پر رشک کرنے کی بجائے ہنستا ہوں۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اگر عیش کی زندگی مل جائے تو میری تمام صلاحیتیں ختم ہو جائیں گی۔ مصنف کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ تکالیف اٹھاتا رہے تاکہ اس کے دماغ میں خیالات آتے رہیں اس کے جذبات ابھرتے رہیں اور وہ انہیں ادا کرنے کی کوشش کرتا رہے۔ اکثر میں دل سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک طرف بادشاہت رکھی ہو اور دوسری طرف میری ادبی صلاحیتیں، تو تم کیا لو گے۔ اور دل بے تحاشا کہتا ہے مجھے اپنی ادبی صلاحیتیں پسند ہیں اور ان کو عمل میں لانا عیش ہے۔ مجھے کسی پیسے کی ضرورت نہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ کثرت سے لوگ پیسے کے لئے لکھتے ہیں۔ میں انہیں کچھ نہیں سمجھتا۔ ایک صاحب نے جو لکھا کرتے تھے میرے سامنے کہا: "ایسے پیشے پر لعنت ہے جس سے بال بچوں کا پیٹ بھی نہ پل سکے۔" میں نے انہیں پست ترین انسان سمجھا۔ لکھنے کو میں نے کبھی کمائی کا ذریعہ نہیں بنایا اور پڑھانے میں بھی بہتوں کو بلا معاوضہ پڑھا دیا۔ غرض کسی بھی وجہ سے میں نے زیادہ سے زیادہ روپیہ بنانے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔

میری زندگی زیادہ تر معلمین کے درمیان گزری جن میں سے ۹۹ فی صدی روپیہ کے لئے ترستے تھے۔ ان میں سے ایک نے مجھ سے پوچھا: "آپ کو روپیہ سے محبت نہیں؟" میں نے کہا: "بالکل نہیں۔" یہ بات مشہور ہوئی تو سب ہی نے تعجب کیا۔ کراچی میں اگر میری ملاقات ایک معلم سے ہوئی جو ہر بات میں کہتا تھا: "پیسہ پیسہ

سب کچھ ہے"۔ اور معلوم ہوا کہ اپنے اس عقیدہ کی جوش کے ساتھ تبلیغ کر کے مجھے ایمان لانے پر مجبور کرنا چاہتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہر شخص اسی کا راگ گا رہا ہے۔ وہ ایسی قوم کا فرد ہے جس کے سب سے بڑے لیڈر نے ایک وعظ میں کہا "آپ کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ روپیہ کمائیں"۔ ان لوگوں کے درمیان رہ کر میں حد سے زیادہ بوکھلا گیا۔ مگر پھر مجھے یقین ہو گیا کہ یہ ساری کی ساری قوم احمق ہے۔ میں ان لوگوں کو بڑے سردارجی کہتا ہوں کیونکہ اگر سردارجی لوگ احمق مشہور تھے اور ان کی تیسری بات سے حماقت ظاہر ہوتی تھی تو ان کی پہلی ہی بات حماقت زدہ ہوتی ہے۔ ان کی حماقت یہ ہے کہ یہ پیسے کے لئے روتے بہت ہیں مگر اسے کمانے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ چاہتے ہیں کہ آپ سے آپ ان پر زیادہ سے زیادہ روپیہ آسمان سے اترتا رہے۔ اور حالات کچھ ایسے ہیں بھی کہ ان کو روپیہ ملتا رہتا ہے۔ یہ لالچی اور حرام خور ہیں اور احمق بنائے جاتے ہیں مگر بے حیائی لادے ہیں۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ اپنی کمائی سے کھانا چاہتا ہوں۔ کسی کا احسان نہ لیا اور نہ لینا چاہتا ہوں۔ بہتر کام کا دوسروں کے مقابلہ میں کم معاوضہ لیتا ہوں اور رقم کے لئے ذرا سا بھی نہیں جھگڑتا۔ لوگ اس سلسلے میں میرا استحصال کرتے ہیں مگر مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔

مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ مجھے روپیہ کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔ ہاں ضرورت یعنی محض ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لئے روپیہ حاصل کرنے کی ضرورت۔ میں نے یہ خیال کیا تھا کہ میں خلوص سے کام کرتا رہوں گا تو کم زیادہ کی بات نہیں کھانے بھر کا تو ملتا ہی رہے گا۔ مگر میں نے دیکھا کہ میں جہاں بھی گیا وہاں ایک لٹیروں کا جتھا تھا جو مجھے اپنی لوٹ مار میں سے حصہ نہیں دینا چاہتا تھا اس نے مجھے لڑ جھگڑ کر الگ کر دیا۔ ان جتھوں کے سربراہ میں احساس کمتری تھا اور ان سے ضمیر نا مطمئن تھے۔ مجھے دیکھ کر ان کے چہروں کے رنگ اڑ جاتے۔ اکثر تو کانپنے لگتے۔ غرض انہوں نے ایسا کیا کہ میں اقبال کے اس شعر کو یاد کرنے لگا۔ ؎

کس نا دانست کہ من نیز بہائے دارم   آں متاعم کہ شود دست زد بے بصراں

ان کی دست زدی کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں کام کرنے کو تیار ہر ایک سے بہتر کام کرنے والا بالکل بیکار گھومنے لگا۔ ہمیشہ جتنا آیا خرچ ہوتا گیا۔ جمع کرنے کے لئے زیادہ ہوا ہی نہیں اور نہ زیادہ لانے کی ترکیبیں کیں کھانے کی چیزوں کا حساب، گھر کا ٹیکس۔ بجلی پانی کا بل، اوپر کا کام کرنے والے کی تنخواہ، بس کا کرایہ تن ڈھانکنے کے لئے کپڑے، ہر ایک کے سلسلے میں روپیہ کی وہ ضرورت محسوس ہوئی کہ بیان نہیں کر سکتا۔ اور پھر بیماری وکمی نے تو اتنا پریشان کیا کہ خدا کی پناہ۔ بیشتر میں بیماریاں ٹالتا رہا اور قوت ارادہ سے اس

پر حاوی ہو گیا۔ مگر متعلقین کی بیماری کا یوں علاج نہیں ہو سکتا اور اس کے سلسلے میں قرض دار ہونا پڑا۔ قرضہ کی نوبت ہر سلسلے میں آگئی اور آخر کو وہ کام کرنا پڑے جن کو مذموم بلکہ گناہ سمجھتا تھا۔ ایک مصنف کے لیے "ہیک" ہو جانا ویسا ہی ہے جیسے کوئی باعزت عورت روپیہ کے لئے اپنا جسم کرایہ پر دینے لگے۔ میں نے اپنے ادبی ضمیر کے خلاف ہر قسم کا "ہیک ورک" کیا اور کر رہا ہوں۔ حالات کے خراب ہو جانے سے یہ کام بھی تک گیا ہے اور رک رک کر آتا ہے۔ ہر مہینے یہ فکر رہتی ہے کہ اگلے مہینے میں کیا ہو گا۔ محض آٹا دال ہی کہاں سے آئے گا اور پھر ادب سے قرضہ سوا ہے اس کی ادائیگی کی کیا صورت ہو گی۔ میں ان ادیبوں کا خیال کرتا ہوں جنہیں ہمیشہ فارغ البالی حاصل رہی۔ جیسے گوئٹے اور سوچتا ہوں کہ کیا وہ اسی وجہ سے زیادہ بہتر کام نہیں کر سکے کہ انہیں معاش کی طرف سے اطمینان تھا۔ پھر ان کی طرف دھیان جاتا ہے جنہوں نے پہلے بڑی تنگی میں زندگی بسر کی مگر بعد میں بڑے مالدار ہو گئے جیسے برنارڈ شا اور مالدار ہو جانے پر ان کی سب صلاحیتیں ختم ہو گئیں۔ اور پھر ان کا بھی خیال آتا ہے جو ناداری کی بنا پر کچل کر رہ گئے اور اپنا کام نہ کر سکے۔ میں یہ دیکھتا ہوں کہ "ہیک ورک" تلاش کرنے اور اسے پورا کرنے میں میرا اسی فی صدی وقت لگ جاتا ہے اگر یہ وقت میں تخلیقی کام میں لگا سکوں تو کیا کوئی شاہکار نہ لکھ سکوں گا۔ سن کے حساب سے اب وہ وقت ہے کہ معاش کی فکروں سے سبکدوش ہو چکا ہوتا۔ ہمدرد جو ہیں وہ پچھلی عقل رکھتے ہیں اور یوں تسلی دیتے ہیں: "آپ نے غلطی کی جو یہاں آ گئے۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے اب باعزت طریقہ پر ریٹائر ہوتے اور اتنا پراویڈنٹ فنڈ ملتا کہ زندگی بھر کھاتے۔" ایسی باتوں سے بھلا کیا حاصل بلکہ اور خواہ مخواہ کی تکلیف بڑھ جاتی ہے کیونکہ ماضی کو نہیں بدلا جا سکتا۔ جو ہوا وہ ہوا سوال اب کچھ کرنے کا ہے تاکہ زندہ رہا جا سکے اور اس کے بابت ناصحان مشفق کہتے ہیں "اب کیا ہو سکتا ہے۔" جن اکھاڑ پچھاڑ کرنے والوں نے مجھے ان نوبتوں کو پہنچایا وہ ان ناصحت سے بھرے ہوئے ہمدردوں سے بہتر نظر آتے ہیں انہوں نے نقصان پہنچا کر کھل کے میدان میں مجھے لا کھڑا کیا۔ وہ شیطان ہیں مگر گوئٹے کے تصور کے مطابق اسی قسم کے لازمی شیطان جو پریشان کر کے کاہلی سے نکال لیتے ہیں مگر یہ ہمدرد دوست عجیب چیز ہیں جو ماضی کی یاد کرا کر رونے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں دکھاتے۔ عجیب مخمصہ میں جان ہے اور اس کی بنیاد روپیہ کی ضرورت ہے۔ ضرورت بہت زیادہ ضرورت۔ محض ضرورت جس کے بغیر زندگی بسر ہونا ناممکن ہو گئی ہے۔ صرف حافظ کا یہ شعر امید قائم رکھے ہے۔

رسید مژدہ کہ ایام غم نخواہد ماند
چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند

فلسفہ اور شاعری مجھے ہمیشہ بڑی تسکین دیتے رہے۔ حافظ کے مشہور اشعار ؎

اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالان — طوق زریں ہمہ در گردن خری بینم
ابلہان را ہمہ شربت ز گلاب و قند است — قوت دانا ہمہ از خون جگر می بینم

سے میں یہ معنی نکالتا ہوں کہ حافظ کے دور ہی میں نہیں بلکہ ہمیشہ گدھے کے گلے میں طوق زریں رہتا ہے اور احمق کو گلاب و قند کا شربت ملتا ہے۔ خون جگر کھانا یعنی ہر وقت ضرورت محسوس کرتے رہنا دانا کی قسمت ہی نہیں بلکہ اس کی خوراک ازل سے مقرر ہے اور ابد تک رہے گی۔ یہ خوراک ہی اس کی دانائی کو زندہ رکھتی اور فروغ دیتی ہے۔ اقبال کا شعر ؎

متاع بے بہا ہے سوز و ساز آرزومندی — مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

بھی میری ضرورت مندی کی تکلیف پر مرہم لگاتا ہے جب کسی ضرورت کے نہ پورا ہونے پر تکلیف ہوتی ہے تو غالب کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

نفس قیس کہ ہے چشم و چراغ صحرا — گر نہیں شمع سیاہ خانہ لیلی نہ سہی

اور میں یہ محسوس کرنے لگتا ہوں کہ دل مارنے سے مجھے زیادہ وسیع دنیا مل جاتی ہے۔ ساری زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو کوئی ایسا دن یاد نہیں آتا جس میں کسی نہ کسی طرح روپیہ کی ضرورت نہ محسوس ہوئی ہو۔ فرق صرف یہ ہے کہ کسی دن یا کسی زمانہ میں عیش و آرام کے لئے کوئی چیز حاصل کرنے کا خیال ہوا اور کسی زمانہ میں ضروریات زندگی پورا کرنے کا بار اٹھانا پڑا۔ روپیہ کی ضرورت سانس کے ساتھ چلتی رہی اور اکثر ظاہری اسباب سے اور اکثر غیب سے پوری ہوتی رہی۔ ضرورت کا آنا اور اس کا پورا ہونا غالب کے اس شعر پر یقین دلاتا ہے ؎

غم و شادی ہمہ پیوستہ ترازیک دگراند — روز روشن پے دعائے شب تار آمد و رفت

یہ زندگی کی حقیقت ہے۔ کائنات یوں ہی چل رہی ہے۔ تولج الیل فی النہار و تولج النہار فی الیل۔ اس وقت جب کہ تاریکی کا عالم ہمیشہ سے زیادہ سخت ہے تو غالب کا یہ شعر سب سے زیادہ تسکین دیتا ہے۔

مژدہ صبح درین تیرہ شبانم دادند — شمع کشتند ز خورشید نشانم دادند

روپیہ کی ضرورت محسوس کرتے وقت مجھے یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ میں روپیہ بنانے کے طریقوں پر

نہیں اٹھایا گیا بلکہ مجھے وہ طریقے سکھائے گئے اور ان طریقوں میں مشق سے ذہن رچ گیا جو روپیہ بنانے کے تھے ہیں۔ یہ سے متضاد وہ لوگ ہیں جن کو شروع سے وہ عمل سکھائے گئے جن سے روپیہ حاصل ہو اور وہ مشق سے بے حساب اس عالم میں ہیں کہ ہر قدم روپیہ ان پر گرتا نظر آتا ہے۔ وہاں ایک تیسری قسم کے لوگ بھی ہیں جو "روپیہ روپیہ سب کچھ ہے" کہتے ہیں اور نہ ان کے پاس روپیہ ہے اور نہ وہ اس کو بنانے کے اہل ہیں۔

ہمارا روپیہ کی ضرورت کے سلسلے میں انسان کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو شدت سے روپیہ کی ضرورت محسوس کرتے ہیں مگر مجبور ہیں اور روپیہ کی اہمیت جتا کر یا زر پرستی کا اظہار کر کے اپنے دل کو تسکین دے لیتے ہیں اور ان کے ہاتھ روپیہ سے خالی ہی رہتے ہیں۔ دوسرے وہ جنہیں روپیہ کی ضرورت نے عمل پر لگایا اور تجربہ اور مشق کے بعد وہ روپوں کی تھیلیاں بھرے ہوئے ان سے کھیلتے پھرتے ہیں تیسرے وہ جو میری طرح روپیہ کی ضرورت سے بے نیاز بنائے گئے مگر ضرورت انہیں آدبوچتی ہے وہ وہ محض جذباتی لوگوں کی طرح روپیہ روپیہ کا نعرہ لگانے کو کسی طرح تیار نہیں ہیں اور روپیہ بنانے کی اہلیت پیدا ہونے کا ان میں کوئی سوال ہی نہ اٹھا۔ بلکہ اگر ان کے پاس روپیہ آپ سے آپ آ گیا تو اسے رکھ نہ سکے یہ خود ہاتھ بڑھا کر کوئی کام نہیں کر سکتے ہاں کوئی اپنے روپیہ بنانے کے سلسلے میں انہیں لگائے تو یہ ٹھیک کام کر دیں گے جب ایسا ہو جاتا ہے تو وہ روپیہ کی ضرورت سے بالاتر ہو جاتے ہیں اور جب کام رک جاتا ہے تو ضرورت محسوس کرتے ہیں اور اس امید پر جیتے رہتے ہیں کہ کوئی کام آئے گا اور یہ بھی خواب دیکھتے رہتے ہیں کہ کوئی مستقل کام مل جائے یا کہیں سے اتنا روپیہ مل جائے کہ مستقل آمدنی کی صورت نکل آئے۔

چند پاکستانی درندے

محمد خالد اختر

پچھلے دنوں ک اور میں سکاچ کارز میں ایک دوست کے ہاں جا رہے تھے کہ ایک کوٹھی پر وائلڈ لائف اور فارسٹری کے ڈیپارٹمنٹ یعنی محکمہ جنگلی حیوانات اور جنگلات کا بورڈ نظر پڑا جس میں جنگلی حیوانات کو جب ان میں اور مجھ میں دس پندرہ فٹ کا فاصلہ ہو اور بیچ میں جالی دار باڑ موجود ہو، کافی پسند کرتا ہوں اور مجھے مزاجاً و طبعاً ایسے ہی محکمے میں ملازمت کرنی چاہیئے تھی۔ ک کا بھی یہی خیال ہے کوٹھی کے اندر کافی خودرو جھاڑیاں اور جنگلات تھے انہیں مالی رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اگرچہ ہم نے اندر ایک زنجیر سے بندھا کاکر سپینیل اور سفید لاوارث بلا دیکھا مگر دوسرے جنگلی جانور کہیں دکھائی نہ دیئے۔ ویسے بھی دو بج چکنے کے بعد دفتر بند ہو چکا تھا اور وہ غالباً چھٹی کر گئے تھے۔ ایک جھاڑ داڑھی والا کلرک کوٹھی کے اندر میز کرسی لگائے فائلوں میں مصروف کار تھا۔ وہ زیادہ قابل اعتبار تو نظر نہ آتا تھا لیکن ہم نے گئے ہاتھوں ضروری معلومات حاصل کرنے کے لئے اس کی خدمت میں پیش ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس کی "وعلیکم السلام" بڑی پرتپاک اور جوشیلا نہ تھی اور ہمیں سر سے پاؤں تک دیکھنے کے بعد وہ کافی خوش لگتا تھا۔ ہم نے عرض کیا ہم قانون کا احترام کرنے والے شہری ہیں۔ اور کیا وہ ہمیں ان جنگلی جانوروں کی فہرست دے سکتا ہے جن کا ہم بغیر خاص پرمٹ کے شکار نہیں کر سکتے۔ ہم نے اسے بتایا کہ ہم کاغان اور سکردو میں شکار کے لئے جا رہے ہیں۔ اور ان جانوروں کو جاننا چاہتے ہیں جن کو شوٹ کرنے سے ہمیں گریز کرنا چاہیئے۔ اس کے پاس ایسی کوئی فہرست نہ تھی۔ مگر بعض لوگ بڑے تعاون کرنے والے اور مددگار ہوتے ہیں۔ اس نے حافظے سے اور ہمارے ساتھ بحث و تمحیص کے بعد چند جانوروں کی فہرست بتا دی جن کا شکار ممنوع تھا۔ صرف وائلڈ لائف کے افسر اور کارندے، وزراء جو بندوق اٹھا سکتے ہوں، عرب ممالک کے شیوخ، امریکی سفیر اور مقامی سب انسپکٹر پولیس اجازت نامے کے بغیر انہیں شوٹ کرنے کے مجاز تھے۔ فہرست دینے کے بعد اس نے ہمیں مزید لطف سے جانچا۔ جیسے ہمارا مول لگا رہا ہو۔ بے تکلفی سے ہمیں بیٹھا چھوڑ کر پھاٹک کی طرف چل پڑا اور اسے بند

اور کاف کو اس حرکت پر شک سا ہُوا۔ ہم اٹھ کر پھاٹک کی طرف بھاگے ابھی وہ ایک پٹ کو کھینچ کر بند ہونے والی پوزیشن پر تھا کہ ہم باہر تھے۔ اس نے ہمیں بہت آوازیں دیں مگر ہم نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا

میں نے گھر آ کر جھاڑ وار کی فہرست کا بغور مطالعہ کیا اور چونکہ آپ سب ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیئے بیتاب ہیں تاکہ ان سے حتی الامکان بہتر زمانی نہ کی جائے۔ اور انھیں فاصلے پر رکھا جائے اس لئے میں نے اپنی طرف سے ان کی عادات و خصلات پر مناسب تحقیقات کی ہے میں چڑیا گھر اور دوسری جگہوں پر بھی گیا ہوں۔ جہاں ممکن ہو سکا ان میں سے چند ایک کے ساتھ انٹرویو بھی لئے ہیں۔ ان کے بارے میں امریکن سنٹر کے ونڈر بک انسائیکلوپیڈیا اور اپنے دوست ص۔ م کی دی ہوئی کتاب "درندے" کا بھی بغائر نظر مطالعہ کیا ہے۔ اب میں بخوبی اس قابل ہوں کہ ان کی اہم خصوصیات آپ کے گوش گزار کر سکوں جھاڑ وار کی بنائی ہوئی فہرست میں میں نے ان دو ایک درندوں کا اضافہ کیا ہے جنہیں وہ بھول گیا تھا۔ (خود اس کو شامل نہیں کیا)۔

شیر

یہ کوئی اہم درندہ نہیں ہے مگر عام طور پر اسے جنگل کا بادشاہ خیال کیا جاتا ہے اور بعض لوگ اس کے کافی مداح ہیں۔ اس لئے اس کا ذکر سب سے پہلے کرنا لازمی ہے یہ درندہ اب پاکستان میں صرف چڑیا گھروں میں پایا جاتا ہے۔ دو شیر ببر لاہور چڑیا گھر میں رہتے ہیں، کافی بوڑھے اور بیزار اور ایالوں میں بہت سی جوئیں لئے ہوئے۔ وہ کبھی پنجرے سے باہر نکل کر ایک گول کٹہرا نکے احاطے میں دھوپ سینکنے کے لئے آ بیٹھتے ہیں۔ اور تماشائیوں کو لاتعلقی کی نگاہوں سے تکتے ہیں۔ ایک شیر ببر تو زیادہ عرصہ جمائیاں لیتا رہتا ہے اور زندگی سے کافی حد تک بیزار معلوم ہوتا ہے۔ بعض اوقات شیر دھاڑتے بھی ہیں۔ یہ کافی نامعقول اور بیہودہ سی آواز ہے لیکن لوگ ان کے دھاڑنے کو سن کر ان کے پنجروں کے سامنے ٹھٹھ لگا دیتے ہیں۔ تاکہ ان کا حالتِ جلال میں نظارہ کر سکیں۔ حالتِ جلال ان پر طاری ہوتی ہے جب گوشت اور چھچھڑوں کے پہنچنے میں دیر ہو جائے۔ ایک شیر ببر تو شادی شدہ اور صاحبِ اولاد ہے۔ اسی طرح چند اور چڑیا گھروں میں بھی شیر ہیں۔ اور دو تین خستہ حال شیر سرکس والے بھی لئے پھرتے ہیں۔ جو کسی کو کچھ نہیں کہتے۔ اور انہیں کان سے پکڑ کر رنگ میں لا

جاتا ہے۔ سرکس والے انہیں ببلے کہتے ہیں۔ ان شیروں کے علاوہ ایک شیر صوبہ سرحد کا کسی زمانے میں مشہور تھا۔ اب اس میں دم خم نہیں رہا۔ ایال سفید ہو کر جھڑ گئی ہے اور داڑھیں ہلنے لگی ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے پاکستان میں اور کوئی ببر شیر نہیں۔ خدا جانے وائلڈ لائف والوں نے اس کا نام کیوں درندوں کی فہرست میں درج کر رکھا ہے۔

شیر ایک مثالی شوہر اور بیوی ہے۔ مادہ شیر جسے عرف عام میں شیرنی کہتے ہیں، ازدواجی زندگی کے اوائل میں بڑی خدمت گزار، وفا شعار اور سیر سپاٹے کی شوقین ہوتی ہے اور میاں بیوی مل کر شکار کرتے ہیں۔ اور شیر جب تک پہلے اس کے (یعنی شکار کے شیرنی کے نہیں) دو تین نوالے نہ بھر لے شیرنی نر کی برتری کو پہچانتے ہوئے اسے نہیں کھاتی۔ بعض شیر اکیلے شکار مارتے ہیں اور اسے گھسیٹ کر شیرنی کے قدموں میں لا رکھتے ہیں۔ پیار اور محبت کے چونچلے ختم ہونے میں نہیں آتے۔ اگرچہ شیر فطرتاً ترش اور متین ہوتا ہے اور اسے گدگدی کئے جانے پر بھی ہنسی نہیں آتی۔ جنسی زندگی مس میری سٹوپز MISS MARY STOPPS کی MARRIED LOVE کے نمونے پر نہایت بھرپور اور رنگین ہوتی ہے۔ اگر شیر کے ساتھ ویسے کوئی خرابی نہ ہو تو جنسی ناآسودگی اور بکثرت آرگزم نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب شیرنی کے بچے پیدا ہو جاتے ہیں تو سب کچھ بدل جاتا ہے۔ شیر کو اب اکیلے ہی شکار کو مارنا اور گھر لانا ہوتا ہے کیونکہ شیرنی کو بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال سے فرصت نہیں مل سکتی۔ شیر کی حیثیت اب گھر کے وفادار ملازم یا پہرہ دار کی رہ جاتی ہے۔ اسے شکار تھوڑا یا وقت پر نہ لانے پر گھرکیاں ملتی ہیں۔ اور جنگل کے قانون کی خلاف ورزی میں شیرنی اپنی مرضی کے بغیر اسے نزدیک نہیں پھٹکنے دیتی۔ وہ پھر اکیلا سر نیہوڑائے ادھر ادھر بے مقصد گھومتا ہے۔ تاہم زور زور سے دھاڑیں مارتا ہے اور ان گنت بار جمائیاں لیتا ہے۔ بچے جوان بھی ہو جاتے ہیں تو شیرنی اپنے رویے کو نہیں بدلتی۔ اچھے دن پھر نہیں آتے۔ پھر بھی اپنی قسمت پر قانع ایک مثالی شوہر کی طرح اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر کہیں اور نہیں جاتا۔ جب قویٰ ڈھیلے ہو جاتے ہیں اور حرارت غریزی میں کمی آ جاتی ہے تو اس کے جوان بچے اپنے بوڑھے باپ کو اپنے حال پر چھوڑ دیتے ہیں۔ شیر کا بڑھاپا از حد المناک ہے۔ لومڑ اور گیدڑ تک سلام کرتا یا راہ سے ہٹنا عار سمجھتے ہیں۔ اور پیٹھ پیچھے مذاق کرتے ہیں۔ اس بڑھاپے میں جب اعضاء میں چستی چالاکی نہیں رہتی بیشتر شیر مجبوراً آدم خور ہو جاتے

ہیں ۔ وجہ یہ نہیں کہ آدمی کا گوشت انہیں بدمزہ نہیں لگتا، مجبوراً پرہیزی غذا کے طور پر کھاتا کر
ہیں۔ کیونکہ اس کو چبانے کے لئے ڈاڑھوں کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ اور ویسے زود ہضم ہوتا ہے
اور جب شیر مرنے لگتا ہے ۔ اکیلا۔ تو جنگل کے سب بجّوؤں اور گدھوں کو راتوں رات خبر ہوجا
اور نزع سے پہلے اسے نوچنے اور اس کی ہڈیاں چچوڑنے کیلئے جمع ہو جاتے ہیں۔

یہ وہی شیر ہے جس کے متعلق مصدقہ اطلاع ہے کہ شیر کسی کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا:
شیروں کے متعلق یہ سچ نہیں ہے اور خصوصاً لیوپڈ سے شیروں کے متعلق جو چھوٹا موٹا کھا جا
ہیں۔ اور ڈکار نہیں لیتے ۔ انسانی اقدار کی طرح جانوروں اور درندوں کی اقدار بھی بدل چکی
پرانے زمانے میں ایسے شیر ہوتے تھے جو پانی میں ناک کی سیدھ میں تیرتے تھے اور حمیت وغیرہ
کا یہ حال تھا کہ اگر ندی نالے کے زور سے ذرا بھی مڑ گئے تو پھر واپس لوٹ کر دوبارہ تیرتے
کئی شیر صرف اسی ہٹ کی وجہ سے کئی کئی دن ندی نالے کے پار نہیں پہنچ پاتے تھے۔
یقین ہے کہ اس دور کے شیر اپنے بزرگوں کی روایات کو بھلا چکے ہیں۔ اور حمیت وغیرہ
ان کے لئے بے معنی چیزیں ہیں۔ ندی میں تیر کر جانا تو درکنار وہ اب اسے پرے سے
کے ذریعے پار کرتے ہیں۔ اس زمانے میں شیر دوست دشمن کو پہچانتے تھے اور کسی کے احسا
کو دل میں رکھتے تھے ـــــ ایک غلام نے جنگل میں ایک شیر کے پاؤں سے کانٹا نکالا۔ شیر کو
سے نجات دلائی۔ شیر اس بات کو اور اپنے محسن کو نہ بھولا۔ چند سال کے بعد رومی کھیلوں
اسی غلام کو اکیلے شیر سے لڑنے کے لئے بھیجا گیا۔ جب شیر چھوٹا تو دھاڑتا ہوا اس کی طرف
جھپٹا، اور آگے آکر غلام کے پاؤں میں سر ڈال کر اس سے لاڈ کرنے لگا۔ یہی وہ شیر
جس کے پاؤں سے کئی سال پہلے غلام نے کانٹا نکالا تھا۔ آج کل کا شیر ہوتا تو آؤ دیکھتا نہ
کانٹا نکلواتے ہی کانٹا نکالنے والے کو چت کر دیتا۔ شیر آج کل شکار نہیں کرتے اور نہ حملہ
کرتے ہیں۔ وہ چڑیا گھروں اور سرکسوں میں رہتے ہیں ان کے راتب وقت پر ان کے لئے
جاتے ہیں۔ وہ کھاتے ہیں اور بدہضمی کی ڈکاریں لیتے ہیں اور بیشتر وقت جمائیاں لیتے ہیں کیونکہ کوئی
کام نہیں کرتے۔

بھیڑیا

یہ چالاک مکری درندہ پہلے جنگلوں اور کوہستانی خطوں میں اپنے بھٹ میں رہتا تھا معصوم چھوٹا لڑکیوں کو لب راہ روک کر میٹھی میٹھی لگاوٹ کی باتیں کرتا تھا سا ور بعد میں ان کی دادیوں کے گھر پر دستک دے کر انہیں کھا جاتا تھا۔ اب ایک مدت سے بھیڑیئے جنگل اور وادی چھوڑ کر سیدا قرار اور شہروں کے مضافات میں آبستے ہیں اور بھیڑوں کی براق پوستین پہنے سڑکوں پر چلتے پھرتے ہیں۔ ظاہری وضع قطع سے ان کی شناخت دشوار ہے یہ اپنی صحیح نسل کی بات کسی سے نہیں کرتے جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ اب دادیوں کو نہیں کھاتے وہ زیادہ جوان، نرم اور زود ہضم گوشت ترجیح دیتے ہیں۔

بھیڑیئے کی کرتوتوں سے چوکنا رہنے کی ضرورت ہے یہ تم کو بہلا پھسلا کر دوستی کی قسم دے گا اور جب تم اس کی پارسائی اور وفاداری کے بارے میں مطمئن ہو جاؤ گے تو یہ موقع دیکھ کر تمہیں بھنبھوڑ ڈالے گا۔ ایسا موقع شناس درندہ اور کوئی نہیں۔ ایک دفعہ تمہاری گردن اس کے دانتوں میں آ جائے۔ تو یہ آسانی سے نہیں جانے دیتا۔

جو عجیب و غریب واقعات سننے میں آتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بھیڑیوں کی تعداد کافی معقول ہو گی۔ اور اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہو گا۔ شہری تمدن کے زیر اثر وہ اپنے آباؤ اجداد سے کہیں زیادہ گنی اور زیرک اور تہذیب یافتہ ہو چکے ہیں۔ ان کے طور طریقے کافی کچھ بدل چکے ہیں گو ان سے مکاری اور سفاکی مطلقاً نہیں گئی۔ لوگوں نے انہیں دوائیوں اور کھانے پینے کی چیزوں میں کے زہر کی ملاوٹ کرتے دیکھا ہے اور بہت سی دوسری چالاکیاں جو وہ کرتے ہیں ان کا کسی کو وہم و گمان بھی نہیں۔ ان کی پوستین پہلے سے زیادہ براق اور رنگا رنگ کی ہوتی جاتی ہے۔ پاکستانی بھیڑیئے ملک دشمنی اور وفاداری کا دم بھرتے ہیں سیاسی مسلک ان کا کوئی نہیں۔ جو جماعت برسر اقتدار ہو یہ درندے اس میں من حیث القوم شامل ہو جاتے ہیں۔ ان کے منہ کو خون کی چاٹ لگی ہے اور اب وہ چاہتے ہیں اپنے بھٹوں کو لوٹنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے ــــ جب تک انہیں وہاں دھکیل نہیں دیا جاتا یہ گھر میں نے لکھا ہے۔ ان کی شناخت کافی مشکل ہے۔ اور وہ ہیں بھی لاتعداد۔

نر بھیڑیئے کی زوجہ بالعموم ایک ہی ہوتی ہے۔ یہ اچھا ذمہ دار خاوند اور باپ ہوتا ہے اپنے

کے آرام و آسائش کے لئے میاں بیوی سب کچھ کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔ دوسرے جینیں یا مریں بھوکا بھیڑیا مشہور ہے۔ بھیڑیا کستا ہی کیوں نہ روزانہ کھا جائے بھوکا رہتا ہے۔ اور اس کی بھوک نہیں مٹتی۔ بھیڑیے کو (اگر اسے پہچان لو تو) اپنے دروازے تک نہیں آنے دینا چاہیئے۔ داناؤں اور محققین کے مطابق دروازے پر بھیڑیا آیا تو تنگی اور نکبت اس گھر کے در و دیوار سے برسنے لگی۔ آجکل بھیڑیے اکثر گھروں کے دروازوں پر منڈلاتے رہتے ہیں۔ اگرچہ گھر والے نہیں جانتے۔ یہ درندہ گھر کے اندر داخل ہو جائے تو اللہ ہی اہل خانہ کا حافظ و ناصر ہے۔ یہ ہر ایک کا خون پیئے بغیر وہاں سے نہیں ٹلے گا۔

ریچھ

یہ مشہور درندہ بھالو کہلاتا ہے۔ اور بعض طبقوں میں (جن میں انسان کے علاوہ دوسرے حیوانات کے طبقے بھی ہیں) کافی ہر دلعزیز ہے۔ میری معلومات کی رو سے جنگلوں اور پہاڑوں کی ترائیوں میں بہت تھوڑے ریچھ رہ گئے ہیں۔ پاکستان کے بیشتر ریچھ اب چڑیا گھروں اور ریچھ والے مداریوں کے ٹھکانوں میں سکونت پذیر ہیں اور غالباً قناعت کی دولت سے مالا مال ہونے کی وجہ سے اپنے مقدر سے خاصے مطمئن اور خوش لگتے ہیں۔ چڑیا گھر کے بیشتر جانوروں کے برعکس اس نقل مکانی سے ان کے ابرو پر چین تک نہیں پڑتی۔ یہ نہیں کہ شیر کی طرح ہر وقت جمائیاں ہی لیتے رہیں۔ ریچھ کالے اور بھورے ہوتے ہیں۔ ویسے تو چٹے سفید بھی ہوتے ہیں مگر وہ قطب شمالی (یا جنوبی) میں رہتے ہیں اور اس لئے غیر ملکی ہیں اس مقالے میں ہم کو صرف ملکی ریچھوں سے سروکار ہے۔

ریچھ اپنی پچھلی دو ٹانگوں پر ہماری تمہاری طرح کھڑا بھی ہو سکتا ہے۔ اس حالت میں وہ بڑا بھلا اور دلچسپ ہے۔ اور بہت سے لوگ اس میں اپنے سے مشابہت تلاش کرنے کی خاطر سے خاص توجہ سے دیکھتے ہیں۔ اور یہ مشابہت موجود ہوتی ہے۔ اس کی ناک میں ایک ڈور بھی ہوتی ہے مالک اس سے ضروری گفتگو اس ڈور کو کھینچنے یا ڈھیل دینے سے کرتا ہے۔ ڈور کے خاص اشارے پر کھڑا ہو کر ریچھ اپنے مداحوں کو ناچ سے بھی محظوظ کرنے میں عار نہیں سمجھتا۔ مالک کی ڈگڈگی کی تال پر یہ ناچ مختلف وضع کے ہوتے ہیں۔ ماہرین حیوانات کا خیال ہے کہ ٹویسٹ اور دوسرے پر پیچ کلاسیکی رقصوں کو چھوڑ کر والز، رمبا، دھمال جیسے ناچ بنی نوع انسان نے ریچھ سے سیکھے ہیں۔ اور ساری ذمہ داری اسی پر

عائد ہوتی ہے۔ ریچھ اکثر بکرے اور بندریا کی معیت میں عرس کے موقع پر اولیائے کرام کے مزاروں اور درگاہوں پر بھی حاضری دیتا ہے۔ اور اسی لئے یہ تینوں جانور اللہ تعالیٰ کو محبوب ہیں اور اس کی خاص نظرِ کرم ان پر ہے ریچھ کے مست الست ہونے میں کلام نہیں۔ مجھے سہون شریف میں شہباز قلندر کے مزار پر ایک ریچھ نے ـــ میرا مطلب ہے اس کے مالک نے ـــ بتایا کہ اس کا ریچھ سائیں بھولو بڑا کامل اور فنافی اللہ ہے۔ دن رات کے چوبیس گھنٹے حالتِ استغراق میں رہتا ہے۔ قوالی سنتے ہی اس پر حال پڑتے ہیں۔ کئی مزاروں پر چادر چڑھانے کی رسم سائیں بھولو کی نگرانی میں ہوتی ہے اور وہ اسکول کے ماسٹر کی طرح لکھ پڑھ بھی سکتا ہے۔ میں نے خود اس ریچھ کو دیکھا۔ اگرچہ بالمشافہ گفتگو کی نوبت نہ آئی۔ مالک نے اسے ایک لال ٹوپی اور لال چوغہ پہنا رکھا تھا اور حلوے کا ایک بڑا تھال اس کے سامنے دھرا تھا۔ اس نے یعنی سائیں بھولو نے اسے پانچ منٹ میں صاف کر دیا۔ کیونکہ ریچھ مستعاب خور ہیں اور کسی شے سے انہیں پرہیز نہیں۔ اس درندے میں جو خوبیاں ہیں وہاں چند بری خصلتیں بھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ خودداری کے جذبے کا گنہگار نہیں ہے جس ریچھ کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے اسکا مالک چارپائی پر چڑھا اس کے دراز جسم پر پاؤں ٹیکے اسے گدے کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ اور ریچھ سر ڈالے احتجاج کی ایک غراہٹ کے بغیر اسے ایسا کرنے دیتا تھا شیر تو شیر، غالباً جنگل کے گھٹیا جانور گیدڑ بجو وغیرہ بھی اس سلوک کو پل بھر کے لئے برداشت نہ کرتے پھر ریچھ میں چٹورپن بہت ہے۔ شیرے اور شہد سے اس کا جی نہیں بھرتا اور میں نے ایک سدھے ہوئے ریچھ کا سنا ہے جو ایک مخدوم صاحب کا چہیتا تھا۔ اور ایک رات ان کے سوتے میں مقفل الماری کھول کر ان کی شہد گھی اسکا پچ کنٹرڈ کی تین بوتلیں چڑھا گیا ان کے کاگ بھی خدا جانے اس نے کس ترکیب سے کھولے۔ وہسکی پی کر الماری کو اسی طرح قفل لگا کر چابی مخدوم صاحب کے سرہانے دھری۔ اس ریچھ نے پھر تین دن تک آنکھ نہ کھولی۔ ساتھ ہی ریچھ کا ضابطہ اخلاق نہایت بودا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسکا اخلاق کوئی ہے نہیں۔ ہر پری چہرہ چیز کو دیکھ کر خواہ نر ہو یا مادہ اس کی رال ٹپک پڑتی ہے۔ اور اس سے متمتع ہونے کے جوش میں اسے کسی چیز کی سدھ نہیں رہتی نتیجتہً کئی با عفت بندروں، بکروں، ہرنوں، کوؤں اور بلبلوں نے اس کی دھولوں اور ٹھونگوں سے تواضع کی ہے مگر ریچھ نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ جہاں تک ممکن ہو ریچھ کو

اپنے سے بغلگیر نہیں ہونے دینا چاہیئے۔
کتے غالباً ریچھ کی پوستین اور لڑھکتی ہوئی چال کی وجہ سے اسے پسند کرتے ہیں جب کوئی ریچھ اپنے مالک کی رہنمائی میں کسی گاؤں یا مزار پر نمودار ہوتا ہے تو پاس پڑوس کے کتوں کی عید ہو جاتی ہے وہ شوقِ دیدار سے دیوانے، قصیدے عرض کرتے، نعرے لگاتے ہر کونے کھدرے سے اس کے استقبال کو نکل آتے ہیں۔ ریچھ اس والہانہ داد کو اپنا حق سمجھتا ہے۔ اور جواباً قبولیت کے اظہار کے طور پر دو تین بار خراٹے کے علاوہ اپنے مداحین کو زیادہ توجہ نہیں دیتا۔ یہ رسیا اور دھمال ناچتے اور دوسرے کرتب کر چکنے کے بعد جب وہاں سے رخصت ہوتا ہے تو کتے ایک دو فرلانگ جلو میں ہو کر رسم مشایعت عمل میں لاتے ہیں۔ تب مسلسل بخ بخ اور بھوں بھوں سے ان کا گلا بیٹھ جاتا ہے اور ریچھ کی رخصتی نسبتاً پُرسکون فضا میں ہوتی ہے
تم اگر چاہو تو بے شک ریچھ کو پالتو بنا کر اپنے گھر میں رکھ لو میں البتہ اس درندے کے لاوطفار حمیدہ کا قائل ہونے کے باوجود تم کو یہ مشورہ نہیں دوں گا دوسرے پالتو حیوانوں کی کی عصمت خطرے میں پڑ جائے گی۔

ہاتھی

یہ لحیم شحیم، ڈیل ڈول پر وقار حیوان پاکستان میں اب چڑیا گھروں اور سرکسوں میں پایا جاتا ہے ان کی تعداد شمار تو مجھے یاد نہیں۔ مگر میرا اندازہ ہے کہ اگر فیل شماری کی جائے تو سارے ملک میں بمشکل بیس تیس ہاتھی نکلیں گے۔ ہاتھیوں کی یہ قلت تشویشناک ہے میری معلومات کے مطابق ہاتھیوں کی افزائش کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جا رہی۔ اور نہ ہی ان کے درآمد کے لئے کوئی جامع منصوبہ حکومت کے زیر غور ہے۔ جنرل عیدی امین اور افریقہ کے دوسرے سربراہان مملکت غالباً اس صورت حالات سے بے خبر تھے۔ ورنہ جب وہ اسلامک سمٹ پر یہاں مدعو کئے گئے تھے تو ہمیں دینے کے لئے تھوڑے سے بہت ہاتھی لے کر آتے دس بارہ عام گزبھیر کے دانتوں اور سونڈ والے ہاتھی جن کی افریقہ میں کوئی کمی نہیں۔ ہمیں کسی حد تک ہاتھیوں میں خود کفیل بنا دیتے سفید نہ بھی ہوتے تو کوئی حرج نہ تھا بہرحال ہمیں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھنا چاہیئے۔ ہاتھیوں کے بغیر زندگی میں کیا لطف

رہ جائے گا۔ جو برکات ہیں انہیں کے طفیل تو ہیں

ایک زمانے میں جیسا کہ ہر تاریخ کا طالب علم جانتا ہے ہاتھی عام تھے جلسہ جلوس کے باہر پانچ چھ ہاتھیوں کے جھلائے بغیر کوئی شخص راجہ، مہاراجہ، نواب بننے کا خواب نہیں دیکھ سکتا تھا امراء اور رؤسا، عمائدین سلطنت کے پھاٹکوں پر ہاتھی جھولتے تھے۔ پتنگ پر نہیں ملکہ بنیے بڑے بڑے سر ہلا کر، ان کے جاوتوں کو دربار میں کرسی ملتی تھی۔ اور سال بہ سال ململ کی دستار اور زربفت کی خلعت۔ ہاتھیوں کو بھی خانی،، بہادری کے خطابات سے نوازا جاتا تھا اور طلائی نقرئی زیورات، از قسم جھومر، کنٹھ مالا، دم غلاف، دانت پوش وغیرہ انعام میں پاتے تھے تاکہ خوشنودی کی سند پاکر اور زور زور سے جھولیں۔ مغلوں کے عہد میں مولا بخش ہاتھی نے اپنے کارناموں سے بڑا نام پیدا کیا۔ فخر الامراء کا خطاب پایا اور ہفت ہزاری ہوا۔ بادشاہ اسے ہر چہارشنبہ کی صبح کو دال اپنے ہاتھ سے کھلاتے تھے۔ اور اس کی بھی وفاداری کا یہ عالم تھا کہ بادشاہ کے چار پانچ دشمنوں کو اور مجرموں کو وہ ہر تیسرے روز پاؤں تلے روند ڈالتا اور کبھی انکار نہ کرتا تھا۔

محققین ہاتھی کی سیرت اور سیانت کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ میری رائے میں کوئی خاص سمجھ دار سیانا یا دانشمند حیوان نہیں۔ اتنے دانشمند اور دانا تو کتے، گھوڑے اور گدھے بھی ہوتے ہیں۔ جن کو آدمی نے حیل و حجت سے اپنے داؤ پر چڑھا رکھا ہے۔ یہ کوئی خاص بے وقوف بھی نہیں مگر مجھ سے پوچھو تو یہ سخت ناقابل اعتماد و دغاباز حیوان ہے۔ اس کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ مہاوت اس کے تیور دیکھتے رہتے ہیں۔ کیونکہ وہ مستی میں انہیں بھی اپنے پاؤں تلے روندنے سے نہیں چوکتا۔ کئی بادشاہوں نے جیتی جتائی جنگیں صرف ہاتھیوں کی کارگزاریوں کی وجہ سے ہار دیں۔ اور تاریخ کا دھارا ہی پلٹ گیا بے چارہ داراشکوہ! اس نے پانی پت میں اپنے بھائی اورنگ زیب کے خلاف جنگ جیت ہی لی تھی کہ اس کا ہاتھی بھڑک اٹھا۔ میرا خیال ہے وہ داراشکوہ کی جیت نہیں چاہتا تھا، اور اپنے ہی لشکر کو روندتا ایک ٹیلے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ دارا کے لشکر میں کھلبلی مچ گئی انہوں نے سمجھا وہ مر گیا یا بھاگ گیا نتیجہ یہ کہ اورنگ زیب کو فتح ہوئی۔ بلاشبہ پرانی جنگوں میں

ہاتھیوں کا رول اکثر شرمناک رہا ہے اور وہ فریق جس کے پاس ہاتھی زیادہ ہوتے تھے شکست یقیناً اسی کو ہوتی تھی۔ بے چارے پورس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس کے ہاتھیوں نے پلٹ کر اپنے ہی لشکر کو روند ڈالا۔ سکندر اعظم اس لئے جیت گیا کہ اس کی فوج میں ہاتھی نہیں تھے۔ صرف گھڑ سوار پیادے تھے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ ہاتھیوں کے اس چلن کو جانتے ہوئے بھی اس زمانے کے راجے اور بادشاہ ہاتھیوں کے غول کے غول اپنے لشکر میں لے کر چلتے تھے غالباً وہ مارنا چاہتے ہوں گے۔

جنگل میں ہاتھی گلے اور ریوڑ کا حیوان ہے۔ وہ بھیڑیئے یا کلا بگڑ (؟) یا کالے بندرے (؟) کی طرح منہ اٹھا کر اکیلا نہیں چل پڑتا اور نہ ہی ٹیلوں اور ٹیکریوں میں تن تنہا بیٹھ کر ستم (؟) نوحہ خوانی سے جی بہلاتا ہے۔ ہاتھیوں میں مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ہزاروں سال کا مادری نظام ابھی تک چلا آ رہا ہے اگرچہ بہت سے دوسرے حیوانات وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مدنظر اسے کبھی کا ترک کر چکے ہیں۔ ویسے گلے میں نام کو چودھری تو نر ہاتھی ہی ہوتا ہے مگر اس کی نگہبانی اور رہنمائی کی باگ ڈور کسی کائیاں، گرم و سرد چشیدہ ہتھنی کے ہاتھ میں ہوتی ہے وہ جدھر چاہے گلے کا رُخ موڑ دے۔ باقی ہتھنیاں اور ہاتھی اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ ہاتھی سترہ یا اٹھارہ سال کی عمر میں وادیٔ شباب میں قدم رکھتے ہیں اور ان پر عجیب مستی کی کیفیت طاری رہنے لگتی ہے۔ جب جوان ہاتھی پہلے پہل مبتلائے عشق ہوتا ہے اور ہتھنیوں کی سنگ دلی کی وجہ سے نصیبہ یاوری نہیں کرتا تو مستی کی حالت میں چلا جاتا ہے اس حالت میں ہاتھی آشفتہ دل، چڑچڑے، تنک مزاج اور مطلقاً سرکش ہوتے ہیں۔ اور بڑے بوڑھے ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیتے ہیں۔ مست ہاتھی خواہ مخواہ معمولی بات پر بھڑک کر درختوں سے ٹکریں مارنے یا انہیں بیخ و بن سے اکھاڑنے میں لگ جائے گا اور کسی کی کچھ نہیں سنے گا۔ ہاتھیوں نے ہم صحبت ہونے کے لئے کوئی خاص مہینہ یا موسم مقرر نہیں کر رکھا جس طرح کتوں، گیدڑوں وغیرہ نے کیا ہوا ہے ان کے نزدیک اس کے لئے سب زمین اور سب وقت ٹھیک ہیں۔ جوان ہاتھیوں اور ہتھنیوں کی کورٹ شپ ہفتوں مہینوں تک چلتی ہے جب وہ محبت کا اظہار ایک دوسرے کے سونڈوں کو تھپک تھپک کر کرتے ہیں یہ کافی روح پرور نظارہ ہوتا ہے

کورٹ شپ کا عرصہ ختم ہونے پر وہ ہاتھی اور ہتھنی اپنی محبت کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے جو چند عملی اقدام اٹھاتے ہیں ان کے ذکر کی یہاں ضرورت نہیں۔

چھوٹے ہاتھی بچے بالعموم موسم بہار میں پیدا ہوتے ہیں۔ نومولود کے دنیا میں آنے پر جنگلی ہاتھیوں کے گلے میں خوب اودھم مچتا ہے۔ اور بڑی مسرت کا اظہار ہوتا ہے بڑے بوڑھے ڈکرا ڈکرا اور چنگھاڑ چنگھاڑ کر ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں۔ اور ناچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہو جنوں درختوں کی شامت آتی ہے اور مبارک مبارک کی چنگھاڑیں اتنی خوفناک ہوتی ہیں۔ کہ بہت سے دوسرے درندے نیند حرام ہونے پر خفگی کا اظہار کرتے ہوئے وہاں سے نوک دم ہو جاتے ہیں۔ ایسے موقع پر شیر، کالے تیندوے وغیرہ (حالانکہ وہ بھی جواباً چنگھاڑ سکتے ہیں) اپنے اپنے گھروں سے فرار ہونا قرین مصلحت متصور کرتے ہیں۔ اگر ولادتوں کا سلسلہ جاری رہے اور ہر رات ہاتھی بچے پیدا ہوتے رہیں تو شیر اور تیندوا وغیرہ اس جنگل سے نقل مکانی کر لیتے ہیں۔ مولود کی ماں اپنے کارنامے پر خوشی سے پھولی نہیں سماتی۔

مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے جو ہاتھی اپنے گلے کے قوانین سے سرکش ہو کر کھیرے ہو جاتے ہیں ان کا شیوہ بلاوجہ لوٹ مار اور غارتگری کرنا ہوتا ہے مولا بخش ہاتھی انہی کھیرے ہاتھیوں میں سے تھا۔ کھیرے ہاتھی تمہیں سونڈ میں پکڑ کر پچیس فٹ دور دیوار سے پٹخ ماریں گے۔ ان کو الزام نہیں دیا جا سکتا۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔

جنگل میں بعض اوقات دو ہاتھیوں کے درمیان زور آزمائی اور کشتی رانی کے مقابلے بھی ہوتے ہیں اور کئی ماہرین نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی گواہی دی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ دوسرے ہاتھی فریقین کے گرد حلقہ بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور کسی قسم کا دخل نہیں دیتے دیوپیکر بپھرے ہوئے درندوں کی ٹکر ایک سے ایک نہایت ہیبت ناک ہوتی ہے۔ دونوں کی لڑائی کو حیوانات اور ماہرین اسے کچھ فاصلے سے درختوں کے تنوں کے پیچھے چھپ چھپ کر ملاحظہ کرتے ہیں کچھ ماہرین کے مطابق یہ ایک دو جوان ہاتھیوں کے درمیان ایک دوستانہ میچ ہوتا ہے کیونکہ ہاتھی شام کو کچھ تفریحی شغل ضروری سمجھتے ہیں۔ اور میچ شروع بھی دوستانہ انداز سے ہوتا ہے یعنی سونڈوں کے ایک دوسرے کے گرد لپٹنے سے۔ البتہ جلد ہی حریفین اپنے خوفناک طریقے سے ٹکریں مارنا اور چنگھاڑنا

شروع کر دیتے ہیں۔ اور درختوں میں کھڑے ہوئے ماہرین اور حیوانات کا دہشت سے پتہ پانی ہو جاتا ہے۔ مقابلہ آدھ گھنٹہ یا ایک گھنٹہ جاری رہتا ہے۔ ان مقابلوں میں کئی ہاتھیوں کے کان ضائع ہو گئے اور کئی عمر بھر کے لئے لنگڑے اور معذور بن کر رہ گئے۔ ہارے ہوئے ہاتھی اکثر ناراض ہو کر گلے سے منہ موڑ لیتے ہیں اور اپنے کھسیانے پن کو مٹانے کے لئے پیڑوں کو اکھاڑتے پھرتے ہیں۔ یا ہرنوں اور خرگوشوں کا تعاقب کرتے ہیں۔

بھارت میں ہاتھی کو گنیش جی مہاراج کہہ کر پکارتے ہیں اور مندروں میں اس کی مورتی کی پوجا کرتے ہیں۔ بدھ لوگ بھی اسے مقدس اور اوتار جانتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک ہاتھی جو مست تھا گوتم بدھ کو ہلاک کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ ان دونوں کی ملاقات ہوئی مگر جب گوتم نے ہاتھی کی پیشانی کو چھوا تو ہاتھی نے اگلے گھٹنے ٹیک کر اس کی ڈنڈوت کی اور اس کا چیلا ہو گیا۔ بیشتر ہاتھیوں کو ان واقعات کا علم نہیں ورنہ وہ اپنے رویّے میں ضرور اصلاح کی فکر کرتے۔

ہاتھی کی فنونِ لطیفہ سے دلچسپی مسلّم ہے۔ ہاتھی نہ صرف ٹھمری، دادرا، اور دوسری گائیکی کو سمجھ سکتا ہے بلکہ ان راگوں کے سُر پر جھول کر تال بھی دیتا ہے۔ میں نے چند سال پہلے خود اپنی آنکھوں سے اسے ایک عالم میں ایسا کرتے ہوئے دیکھا ہے) کئی ہاتھی تجریدی آرٹ کو دیکھ کر بالکل بستا گئے اور انھیں صحیح حالت پر لانے کے لئے تجریدی آرٹ کے نمونے کو ان کے سامنے سے دور ہٹانا پڑا۔ میں نہیں جانتا کہ انھیں جدید اردو، مختصر افسانے یا نثری شاعری سے کچھ شغف ہے یا نہیں مگر وہ ادب کا بالعموم احترام کرتے ہیں۔ میں نے ایک بار لاہور کے چڑیا گھر میں ہاتھی کو گنوں کے پونڈے کھاتے دیکھا۔ اس کے پاؤں تلے پونڈوں کا ڈھیر تھا اور اس ڈھیر میں ایک ڈائجسٹ قسم کا مصوّر رسالہ بھی کسی طرح چلا آیا تھا (ہاتھیوں کے چارے میں بھی ملاوٹ ہونے لگی ہے) ہاتھی نے اپنی سونڈ سے دو تین پونڈوں اور ڈائجسٹ اٹھایا اور ان کو منہ میں ڈالنے لگا تھا کہ کچھ خیال آیا اس نے اپنے چارے کو پھر نیچے رکھ دیا اور پھر ڈائجسٹ کو سونڈ سے الگ کر کے اسے سونگھنے اور غالباً ورق گردانی کرنے لگا۔ شام پڑ رہی تھی اور ویسے بھی قریب سے ہاتھی کی بصارت بڑی کمزور ہوتی ہے میرا خیال نہیں کہ وہ کچھ پڑھ سکا ہو۔ مگر اس سے اس کے ادبی ذوق کے بارے میں اچھی توقعات پیدا ہوتی ہیں۔

ہاتھی کے متعلق اتنا ہی کافی ہے۔ چند مستحق درندے اور بھی تو ہیں۔

اونٹ

اگر کبھی کسی اونٹ نے تمہاری بے خیالی میں (جب تم کسی اور طرف دیکھ رہے تھے) تمہارے ہاتھ کی پوریں یا کان کا کچھ حصہ کینہ ور جذبات کے تحت منہ مار کے چبا ڈالا ہو تو درندوں کی فہرست میں اس کی شرکت بخوبی تمہاری سمجھ میں آ جائے گی۔ تم مجھ سے اتفاق کرو گے کہ یہ فی الحال سب سے زیادہ خونخوار، خطرناک اور بدباطن پاکستانی درندہ ہے۔ اونٹ نے اتنے لوگوں کے مختلف اعضاء کو موقع پڑنے پر کاٹا اور چبایا ہے کہ ان کی گنتی نہیں ہو سکتی ہے۔ اور بعض اس ڈر سے بتاتے بھی نہیں کہ کہیں لوگ یہ نہ سمجھنے لگیں کہ ان کا اونٹوں کے درمیان اٹھنا بیٹھنا ہے۔ اکثر لوگ جن کی انگلی، انگوٹھا، پنجہ، کان کی لَو یا ناک کی پھننگ غائب ہوتی ہے ان کی اس اعضائے قطع و برید کا سبب ۹۹ فیصدی اونٹ ہی ہوتا ہے خواہ وہ وجہ کچھ ہی بتائیں۔

اونٹ دیکھنے میں کافی حسین و جمیل، طرحدار، باوقار حیوان ہے۔ کئی لوگ اس سے اتفاق نہیں کرتے اور اونٹوں سے پوچھتے پھرتے ہیں کہ وہ ان کو بتائیں کہ ان کی کونسی کل سیدھی ہے۔ اونٹ بتانے کی بجائے ان کے ناک یا کان کو قطع کر لیتے ہیں۔ اور یوں ان کی تشفی ہو جاتی ہے۔ اونٹ پر کبھی نہ ہنسو۔ یہ درندہ مزاح کی حس سے کورا ہے۔ وہ اس کا برا مانتا ہے اور درپے ہو جاتا ہے۔

پاکستان میں اونٹ عام اور بکثرت پایا جاتا ہے اور قطعاً اس کی قلت نہیں۔ کراچی، بلوچستان، سندھ، چولستان میں لوگ اس کی ناک میں سے گذرتی ہوئی ڈور کا ایک سرا پکڑے اسے ہر جگہ لئے پھرتے ہیں۔ ان کو سواری کے کام میں بھی لاتے ہیں۔ اور باربرداری کے لئے بھی۔ اونٹ موقع کی تاک میں رہتا ہے۔ اونٹ کے کوئی ساٹھ برانڈ (یا بریڈ یعنی نسلیں) مارکیٹ میں دستیاب ہیں اور تم جب چاہو اپنی مرضی کا برانڈ، مناسب دام ادا کر کے خرید سکتے ہو۔ بعض لوگ اونٹوں کے بغیر بالکل نہیں رہ سکتے اور اگر تم ان میں سے ایک ہو تو مجھے تم سے کچھ نہیں کہنا۔

اونٹ کی ایک کوہان ہوتی ہے۔ بعض کی دو بھی ہوتی ہیں۔ کسی نے ابھی تک تین کوہانوں والا

اونٹ نہیں دیکھا لیکن اس حیوان سے کچھ بعید نہیں۔ پہلی جان پہچان پر اونٹ قدرے مغرور، ناک چڑھا، اینٹھا ہوا لگتا ہے۔ صورت پر شکرانا سے اعتنائی کی کیفیت ہوتی ہے دوستی ہو جانے پر بھی اس کی بدمزاجی، ترشروئی اور ہٹ دھرمی میں تبدیلی نہیں آتی۔ یہ کسی قسم کی بدسلوکی کو معاف نہیں کرتا۔ اس سے نیکی کرو تو اسے بھی معاف نہیں کرتا۔ اور برسوں تک بات دل میں رکھتا ہے بدلہ لینے کے موقعے کا منتظر۔ اونٹ کا کینہ ضرب المثل ہے ہم سب کو کبھی نہ کبھی شتر کینہ لوگوں کے ہاتھ لگ چکے ہیں۔ اور ان کے حافظے نے ہمیں حیران کیا ہے

اونٹنی جنسی امتیاز سے قطع نظر اونٹ سے زیادہ پرکشش، نخریلی اور مغرور ہوتی ہے نقوش تیکھے اور نازک ہوتے ہیں۔ اور چال مستانہ۔ بیشتر لوگ جو اونٹوں میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ نر اور مادہ میں تمیز نہیں کر سکتے۔ بہت سے عرب شعراء نے اپنے بیتوں میں اپنی محبوبہ کی گردن، آنکھ، چال کا موازنہ اونٹنی کی گردن، آنکھ چال سے کیا ہے اور یہ اعلان کیا ہے کہ ان کی محبوبہ اپنے محاسن میں اونٹنی سے کسی طور کم نہیں۔ بیشتر عرب شاعری اونٹنی کے حسن و نزاکت عشوہ و غمزہ کی آئینہ دار ہے اور میں نہیں جانتا کہ اونٹنی کی موجودگی کے بغیر وہ شاعری کیا کرتے کیونکہ کبک دری، چکور، مور، بلبل وغیرہ عرب کے ریگستان میں نہیں ہوتے۔ بہت سے عرب شاعروں نے کسی اونٹنی یا اونٹنی کے محاسن کی تعریف میں طویل قصیدے بھی گذرا نے ہیں۔ جن پر ممدوحہ نے کوئی اعتراض نہیں کیا ان شاعروں کے کئی عشق اونٹ کی پیٹھ پر کسے کجاوے میں ہوئے ہیں۔ جو اپنی مخصوص لڑھکتی ہوئی چال کی وجہ سے کجاوے کو اس طرح جھلاتا ہے کہ ایک خانے میں بیٹھے لوگ دوسرے خانے کے لوگوں پر خواہ مخواہ اوندھے پڑتے ہیں۔ کجاوے کے ایک خانے میں شاعر ہوتا ہے اور دوسرے میں اس کی کزن۔ اونٹ کی حرکت سے اپنے اپنے خانے میں تہہ و بالا ہوتے ہوتے وقتاً فوقتاً ان کی ناکوں کی پھننگیں یا پیشانیاں باہم چھو جاتی ہیں۔ اور اس طرح محبت کا آغاز ہو جاتا ہے جس سے شاعر کو اپنی محبوبہ (یا اونٹنی) کی شان میں ایک طویل دو عریض قصیدہ کہنے کا بہانہ میسر ہوتا تھا۔

اونٹ نفسیاتی الجھنوں کا شکار نہیں ہوتا۔ اس کی نفسیات نہیں ہوتی لیعض اونٹ ایک قسم کی بے ہنگم قسم کی اچھل کود کرتے ہیں جسے وہ ناچ کہتے ہیں۔ رقص شتر کو نہ دیکھنا ہی اچھا ہے اسے عمدہ ادب سے اور فنون لطیفہ سے بھی کوئی لگاؤ نہیں ہوتا۔ طالسطائی کے ناول یا پکاسو کی

کی بہترین پینٹنگ اس کے سفر کے سامنے رکھ کر دیکھو۔ اسے چاٹ جائے گا۔

ایک اچھا نیک نیت اونٹ آٹھ دس میل کی رفتار سے اٹھارہ میں گھنٹے تک بے تکان چلنے کا دم رکھتا ہے (ویسے اونٹ عموماً اسے پسند نہیں کرتے کہ انہیں اتنے گھنٹے چلایا جائے اور اگر چلایا جائے تو وہ اسے دل میں رکھتے ہیں) میں اب بھی سمجھتا ہوں کہ اگر اونٹ دستیاب نہ ہو تو بس یا ریل سے سفر کرنا بہتر ہے۔

اونٹوں کا ہاتھیوں کی طرح کوئی مقررہ مسافت کا موسم یا وقت نہیں ہوتا جوان کے لئے اچھا ہے اور وہ یہ فریضہ ایک بے تابانہ جھٹکے سے سرانجام دیتے ہیں۔ ہاتھیوں کی طرح اونٹ بھی مست ہوتے ہیں۔ جب کوئی اونٹ مست ہو تو اس کے نزدیک نہیں جانا چاہیئے۔ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔

اپنے سارے مندرجہ بالا عیوب کے باوجود اونٹ نے تاریخ میں نمایاں اور قابل فخر کردار ادا کیا ہے۔ اس کی خدمات نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ یہ ان منتخب جانوروں میں سے ہے جن کی عید قربان کے موقع پر قربانی دینا باعث رحمت ہے مگر یہ تب کرنا چاہیئے جب اونٹ بوڑھا ہو چکا ہو اور کسی کام کا نہ ہو۔ ایک پورے تعریباً اونٹ پر آتنی ہی لاگت آتی ہے جتنی ایک ہیک سی موٹر گاڑی پر۔ معلوم ہوتا ہے جاپانیوں نے پاکستان سے اونٹوں کی نسل کو کالعدم کرنے کی سازش کر رکھی ہے۔ حالانکہ اونٹ نے ان کا کچھ نہیں بگاڑا۔ ہمیں ان کو ایسا نہیں کرنے دینا چاہیئے۔ ۔ ۔

میں اونٹوں کا خاص عاشق نہیں۔ مگر ان کے بغیر اس ملک میں زندگی سارے رومانس اور مزے سے خالی ہو جائے گی ــــــ اور مجھے قطع شدہ ناکیں، چبائے گئے کان اور کترے ہوئے ہاتھ کسی وجہ سے اچھے لگتے ہیں۔

ماڈرن تعزیت نامہ

محمد صدیق سالک

۴۲۰ - نیو گذری

کراچی نمبر ۱۰

مائی ڈیئر نانی !

میں پچھلے ہفتے یورپ کے بزنس ٹرپ سے واپس آیا، تو ڈیڈی کا خط ملا جس میں لکھا تھا کہ آپ کے ہزبینڈ HUSBAND فوت ہو چکے ہیں۔ مجھے یہ سن کر افسوس ہوا کہ وہ ٹی بی جیسی غریبانہ بیماری کا شکار ہوئے اگر انہیں مرنا ہی تھا تو بلڈ پریشر یا ہارٹ فیل ہونے سے مرتے تاکہ ہم فخر سے ان کی موت کا دوسروں سے ذکر کر سکتے۔ آپ نے یہ بھی بڑا ظلم کیا کہ انہیں گھر پر ہی مرنے دیا۔ علاج کے لئے نہ سہی، کم از کم مرنے کے لئے انہیں مقامی ہسپتال کے وی۔ آئی۔ پی وارڈ میں داخل کرا دیتے، تو بلامعاوضہ اخباروں میں ان کا نام چھپ جاتا اور لوگوں کو بھی پتہ چل جاتا کہ واقعی کوئی بڑا آدمی فوت ہوا ہے۔ بہرحال جو کچھ ہونا تھا، ہو گیا۔ اب افسوس کرنے سے کیا فائدہ؟ یہ احتیاطی تدبیریں تو آپ کو بہت پہلے کر لینی تھیں، کیونکہ انہیں ہارٹ ٹربل جیسی جلدباز بیماری کے بجائے ٹی بی جیسی سست رفتار بیماری تھی جو خدا تعالےٰ نے عموماً اس لئے غریبوں کو نصیب کرتا ہے کہ وہ طویل بیماری میں مریض کے کفن دفن کا بندوبست کر سکیں۔

ڈیڈی نے مجھے بن پوچھے یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ میں افسوس کے لئے خود آؤں اور اگر کسی مجبوری کی وجہ سے نہ آ سکوں، تو کم از کم اپنے ہاتھ سے آپ کو ایک لیٹر آف کانڈولینس LETTER OF CONDOLENCE لکھ بھیجوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اب کرسمس بالکل قریب ہے اور خوشی کے اس موقع پر میں نے بہت سے دوستوں کو پارٹی دینے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ کرسمس کے فوراً بعد ہم مری میں سنو فال دیکھنے جا رہے ہیں۔ اب یہ پروگرام فائنلائز FINALISE ہو چکا ہے اور اسے کینسل CANCEL کرنے سے سب کا موڈ آف ہونے کا خطرہ

ہے - ان مصروفیات کی وجہ سے میں خود آنے سے مجبور ہوں، البتہ اگر آپ ضروری سمجھیں تو میں اپنے چھوٹے کو ایک دو دن کے لئے بھیج سکتا ہوں۔

مجھے آپ کے غم کا پورا پورا احساس ہے، کیونکہ پچھلے دنوں جب ہمارے ایک بزنس پارٹنر کا انتقال ہو گیا تو ہم سب کو بہت صدمہ ہوا، مرحوم تو آپ کے لائف پارٹنر تھے اور ہر نفع و نقصان میں آپ کے ساتھ رہے۔ ایسے ساتھی کا بچھڑ جانا واقعی آپ کے لئے بہت بڑی ٹریجڈی ہے۔

پچھلے سال ہی کی سالگرہ پر مرحوم سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بڑے سمارٹ اور ویل ریڈ WELL READ آدمی تھے۔ ان کے پاجامے کی موری ماڈرن کٹ کی پتلون کی موری سے بھی تنگ تھی اور ان کی داڑھی کا خضاب اور جوتوں کی پالش کبھی مدھم نہیں پڑی تھی، لٹریچر کی مختلف برانچوں کے متعلق اعلیٰ رائے رکھتے تھے، مثلاً وہ اردو شاعری اور رومانی ناولوں کو ہمیشہ برا بھلا کہتے تھے، البتہ اسلامی ناولوں کی اکثر تعریف کیا کرتے تھے ان کی پاپولیریٹی POPULARITY کا یہ حال تھا کہ ہر مقدمے میں شہادت دینے کے لئے انہیں ہی اپروچ APROACH کیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اتنی کوالیفیکیشن والا ہزبینڈ HUSBAND آپ کو اس ایج AGE میں کہاں ملے گا۔

مجھے اس بات کا ہمیشہ افسوس رہے گا کہ میں ان کے مرنے کے وقت وہاں موجود نہ تھا، ورنہ انہیں اس حالت میں ــــ اور اس بیماری سے ــــ قطعاً نہ مرنے دیتا اور اگر وہ مر بھی جاتے، تو ان کے کفن دفن کے لئے کسی ایسی مشہور فرم کو ٹھیکہ دیتا کہ لوگ یہ بھول جاتے کہ وہ ٹی بی سے مرے ہیں یا ہارٹ فیل ہونے سے۔ بلکہ میرا تو ارادہ تھا کہ ان کی قبر کا ڈیزائن بھی کسی ویل نون آرکیٹکٹ WELL KNOWN ARCHITECT سے بنوایا جاتا۔ جس آرکیٹکٹ نے گلبرگ والی کوٹھی کا ڈیزائن بنایا ہے، وہ بھی آج کل خاصا پاپولر ہے۔ میرے اس کے ٹرمز TERMS بھی اتنے فرینڈلی FRIENDLY ہیں کہ آپ اگر ڈیزائن کی قیمت قسطوں میں ادا کرنا چاہیں تو اسے کوئی اعتراض نہ ہوتا بہرحال آفر OFFER اب بھی موجود ہے اور اگر آپ نے پہلے ہی ان کا مقبرہ تیار کروا لیا ہو تو اس کی ایک عمدہ سی تصویر یا کلر نیگیٹو COLOUR NEGATIVE بھیج دیں، مشکور رہوں گا۔

آخر میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ ان کے مرنے سے متعلق جتنے بھی فنکشن کریں ان میں کھلے دل سے خرچ کریں، کیونکہ اس سے مرنے والے کا سوشل اسٹیٹس SOCIAL STATUS بلند ہوتا ہے۔ میری تجویز ہے کہ آپ مولوی صاحب کو کاٹن کا جوڑا دینے کے بجائے اعلیٰ قسم کا سوٹ دیں اور غریبوں اور مسکینوں کو انگریزی کھانا

کھلائیں تاکہ یہ لوگ جہاں جائیں آپ کی تعریف کریں۔ جب اس جہان میں ہر آدمی کے ساتھ اس کے سوشل اسٹیٹس کے مطابق سلوک کیا جاتا ہے، تو عین ممکن ہے کہ اگلے جہاں میں بھی سوشل اسٹیٹس کو اہمیت دی جاتی ہو۔

میں اور بھی اچھی اچھی باتیں آپ کو لکھنا چاہتا تھا، لیکن ابھی ابھی میری پرسنل سیکرٹری نے جرمنی سے آیا ہوا ایک تار میرے سامنے رکھا جس میں شیئرز SHARES کی قیمت گرنے کا اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے لہٰذا یہ لیٹر آف کنڈولینس LETTER OF CONDOLENCE یہیں ختم کرتا ہوں۔ آپ میرے ڈیڈی اور ممی کو اس خط کی اطلاع دے دیں تاکہ انہیں پتہ چل جائے کہ میں نے انتہائی مصروفیات کے باوجود ان کے مشورے پر عمل کیا ہے۔

یورز

گرینڈسن، آئی۔ یو۔ سعادت

کرکٹ نامہ

مسعود مفتی

خلائی سیارے کے پائلٹ نے خلا سے زمیں والوں سے بات کی تو لوگ حیران رہ گئے لیکن ہمیں اس ایجاد کا بہت پہلے یقین تھا۔ اُس دن سے، جب انگلینڈ میں کرکٹ کھیلتے ہوئے حنیف نے چوکا مارا اور وہ لاہور میں آکر ہماری کمر میں لگا

ہوا یوں کہ ہم نانی اماں کے قابو آگئے، جنہیں ہر وقت پان کھانے کی وجہ سے ہم پانی اماں کہتے ہیں۔ ہماری زندگی کی سب سے پہلی یاد اُن کی ہلتی ہوئی ٹھوڑی ہے، جو دن رات کے چکر کی طرح اُس وقت سے اب تک مسلسل چل رہی ہے اُس کی دھیمی چال میں کئی من چھالیہ، چونا، کتھا اور پان غائب ہو چکے ہیں۔ یہ تو معلوم نہیں کہاں گئے ہیں۔ لیکن پانی اماں ویسی کی ویسی ہی ہیں گو ڈاکٹروں نے اُن کو ایکس رے کے ناقابل قرار دیا ہے کیونکہ اُن کے جسم کے کسی بھی حصے پر شعاعیں ڈالی جائیں تو اندر سے کتھئی رنگ کی سرخ روشنی نکلتی ہے جو فلم پر اثر انداز نہیں ہوتی۔

وقوعہ کے روز کالج سے واپس آئے تو پانی اماں پاندان سامنے رکھے چھالیہ خوانی کر رہی تھیں۔ کیونکہ چھالیہ کا ڈبہ خالی تھا۔ یہ بڑا ہی نازک مرحلہ تھا۔ ہمارے گھر کی تواریخ کا موڑ پانی اماں کے پاندان کے کسی گوشے سے اٹھتا ہے۔ اس کی سب کٹوریاں بھری ہوتیں تو گھر میں قہقہے ناچتے اور اگر کوئی خدانخواستہ خالی ہو جاتی تو بجلیاں منڈیروں سے صحن میں جھانکنے لگتیں۔ سب بچوں کی باجماعت پٹائی تو معمولی وضعداری تھی۔ ہم نے تو سروتے کا پیچ ڈھیلا ہونے پر امی اور ابا کو طلاق کا نعرہ لگاتے سنا ہے۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ جس طرح ہندو عقیدے کے مطابق زمین کا توازن گائے کے دو سینگوں پر ہے۔ اس طرح ہمارے گھر کا توازن پانی اماں کی چنگالی پر تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہندوؤں کے لئے، چند ٹوٹے پھوٹے پنڈتوں کا بنایا ہوا موہوم خیال ہے اور ہمارے لئے حفظ امن کی تدابیر کی سکھائی ہوئی اٹل حقیقت — گھڑی کے پنڈولم کا ہلنا گھڑی کے صحیح ہونے

کی علامت ہے اور پانی اماں کی ٹھوڑی کا ہلنا ہمارے گھر کی سلامتی بتاتا ہے۔ اس لئے ہم فوراً آمادہ ہو گئے کہ جا کر بازار سے چھالیہ لائیں گے ــــ جان کی حفاظت کے لئے آدمی کیا کچھ نہیں کر گزرتا۔

پان والے کی دکان ویسے ہی بازار کا یو۔این۔او ہوتی ہے۔ جہاں ہر کوئی انسانیت کے بنیادی حقوق سے شرابور ہو کر پہنچ جاتا ہے اور اگر دکان پہ ریڈیو بھی ہو تو سبحان اللہ ــــ بدقسمتی سے اُس روز انگلینڈ میں کرکٹ کا ٹسٹ میچ ہو رہا تھا جس کا ذکر پان والے کی دکان پہ سنا جا رہا تھا۔ لوگوں کے ٹھٹھ لگے تھے پان والے تک پہنچنا عذاب تھا۔ بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑانے والی قوم جب جم کر کھڑی ہو جاتی ہے تو سیسہ پلائی دیوار بن جاتی ہے۔ اس دیوار کی جھالر پہ ایک صاحب اس قدر منگن کھڑے تھے کہ جب ہم نے مری آواز میں آگے جانے کی اجازت چاہی تو کان تو ایک طرف، اُن کے جسم کے کسی حصے پہ بھی جوں نہ رینگی۔ تہذیب کے دائرے میں رہ کر ہم نے اُن کی کنپٹی کو چھیڑا تو گدھے کے کان سے مکھی ہلانے کے انداز میں جھٹک کر وہ بدستور قائم رہے کندھے پہ ہاتھ رکھا تو انتہائی خبرسگالی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ برداشت کر گئے، ذرا دبایا تو مڑے بغیر بولے:

"حنیف کا سکور ساٹھ ہو چکا ہے۔" اب ہم ڈرتے ڈرتے تھوڑے تشدد پہ اتر آئے اور کندھا موڑ دیا۔

"بھائی صاحب مجھے ذرا آگے جانے دیں۔" بتیس کا دانت دکھاتے ہوئے بولے۔

"آگے کیا ملے گا یہیں کھڑے ہو کر سن لیں۔ صاف تو آواز آ رہی ہے۔"

"جی نہیں مجھے سودا لینا ہے۔"

"تو آگے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ پیسے دیں میں آگے بھجوا دیتا ہوں۔"

"لیکن سودا تو میں خود ہی پرکھ کر لوں گا۔"

"تو شوق سے کوئی اور دکان دیکھئے دو تین صاحب پہلے بھی یہی کہہ کر آگے گئے، تین گھنٹے سے تو ان کی پرکھ ختم نہیں ہوئی۔ سب سے اگلی قطار میں کھڑے کمنٹری سن رہے ہیں۔"

ہم نے ہتھیار ڈال دیئے اور کہا:

"آدھ پاؤ چھالیہ دلوا دیں۔" انہوں نے دن سے بھیڑ میں ہاتھ گھسیڑ دیا اور معلوم نہیں کس کو پیسے دیتے ہوئے بولے:

"بھائی ذرا آدھ پاؤ چھالیہ تو پکڑانا۔"

ایک دوسری آواز نے اس آرڈر کو دہرایا اور کمنٹری میں ڈوب گئی۔ بہرحال ہمیں تسلی ہو گئی کہ ابھی واپس جا کر پانی اماں کا موڑ ٹھیک کر دیں گے مگر کافی دیر گذر گئی اور اُدھر سے رسید بھی نہ ملی۔ یاد دہانی کی کوشش کی لیکن اُن صاحب کو کمنٹری کے سحر سے جگانا مشکل تھا۔ چنانچہ صبر کر کے خاموش ہو گئے اور باری باری پاؤں بدلتے کمنٹری سنتے رہے۔ بولنے والا چار پانچ فقروں کا ذلیفہ کرتا جاتا تھا۔ پس منظر میں کبھی سیٹیاں بجتیں، کبھی بھینسے ڈکارتے، کبھی ورکشاپ والی کار کے چلنے کی آواز آتی اور کبھی گدھے ہینکنے لگتے۔ کمنٹری کرنے والا کبھی روانی سے بولتا کبھی الفاظ ڈھونڈھنے لگتا اور کبھی ایسے چلا اٹھتا جیسے پتلون میں بھڑ گھس گئی ہے۔ سننے والوں کے چہرے بھی اسی تناسب سے چمک اُٹھتے یا ماند پڑ جاتے۔ کافی دیر بعد ہمارے محسن نے فاتحانہ انداز سے ہمیں دیکھتے ہوئے ہمیں کوئی چیز کاغذ میں لپٹی ہوئی دی۔ کھولا تو ـــ اندر سے بگلے کے سگریٹ کی ڈبیہ برآمد ہوئی۔ ہم نے حیران ہو کر اُنہیں دیکھا تو بولے:

"میں نے تو آپ کے سامنے چھالیہ ہی کہا تھا" ہم نے مصالحتی انداز میں عرض کیا:

"آپ آگے سے پوچھئے تو سہی"

اُنہوں نے پہلے والے انداز میں پکار کر پوچھا۔ اُسے حسب سابق دوسری آواز نے دہرایا اور کمنٹری میں ڈوب گئی۔ معلوم نہیں آگے کس مقام پہ کانٹا بدلا۔ بہرحال ہمیں جواب یہ ملا:

"ہاں ہاں، سگریٹ ہی تو بھجوائے ہیں"

اب ہم نے اُن سے آگے جانے کو راستہ مانگا تو صاف آنکھیں پھیر گئے کہ پہلے ہی اتنی دیر ہماری وجہ سے کمنٹری کا مزا نہیں لے سکے اور پھر گردن موڑ کر ایسے کھڑے ہوتے کہ ہماری منت، خوشامد، غصہ وغیرہ کچھ کارگر نہ ہوا۔ کیوں کہ انہیں پتا تھا کہ یہ بابو ہے۔ اس لئے طاقت ہونے کے باوجود بھی طاقت کا استعمال نہیں کرے گا۔ اُن کا یہ انداز صحیح تھا اور ہم سگریٹ کی ڈبیا جیب میں ڈال کر کسی اور دکان کی تلاش میں چل دیئے۔

لیکن دکان کہاں سے ملتی۔ وہ تو ہر جگہ محاصرہ میں تھی جس کو توڑنا ہمارے بس سے باہر تھا۔ دودھ کا جلا چھاچھ ویسے ہی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ اس لئے ہم قدم بہ قدم منزلیں طے کرنے لگے۔ جس دکان کے سامنے زیادہ لوگ نظر آتے وہاں سے آگے چل دیتے۔ لیکن نابر کے کولمبس کی طرح نئی دنیا تو دریافت کرنے نہیں جا رہے تھے کہ چلتے ہی جاتے۔ گو حالت یہی تھی کہ اس جستجو کا کنارہ نہیں ملتا تھا۔ بالآخر ہم ہر چہ بادا باد

کہتے ہوئے ایک دکان پر رک گئے اور لوگوں کے اژدہام کا پھیلاؤ دیکھ کر فیصلہ کیا کہ بابو کی بجائے مہاما بننا چاہئے اور خود پان والے کی درگاہ میں پیش ہونا چاہیئے لیکن مہم شروع کی تو مشکلات کا اندازہ ہوا۔ اول لوگوں کی توجہ کمنٹری سے ہٹانا۔ دوم اپنی طرف متوجہ کرنا اور سوم آگے جانے کے لئے راستہ مانگنے کی ناقابل قبول پیش کش کرنا ــــ ہر مرحلے کے لئے فرلمبد کے عزم اور تیشے کی ضرورت تھی جس کا کام ہم نے وقتی طور پر کبھی کنستی گھسٹرنے اور گھٹنے سے اس کی تائید کرانے، پھر قدرے توقف کرنے سے لیا وہ لوگ دیکھتے تو خوشامد سے مسکرا دیتے اور انتظار میں مورچہ بند رہتے حتیٰ کہ ریڈیو پر بولنے والا تلملا کر کوئی نعرہ لگاتا اور لوگ اچھلنے لگتے تو ہم موقعہ پاکر ایک آدھ قدم آگے کھسک جاتے۔ یقین جانیئے ہمیں پان والے تک پہنچنے میں کچھ ایسی ہی مشکلات پیش آرہی تھیں جیسی سائنس والوں کو چاند پر پہنچنے میں ــــ بہر حال ہمت مرداں اور بالآخر ہم پسینے میں شرابور دکھتی ہوئی پسلیاں لئے دکاندار تک پہنچ گئے۔

ہماری مایوسی ملاحظہ ہو، جب ہم نے دیکھا کہ وہ پان کی بجائے دودھ کی دکان تھی ــــ اب کیا کرتے خود کردہ را علاجے نیست مجبوراً واپس جانے کا عزم کرنے لگے ــــ لیکن اُسی وقت ایک زوردار گھونسہ ہماری کمر میں لگا اور ہم چکرا گئے۔ ساتھ ہی بے پناہ شور ہوا لوگ ناچنے لگے۔ فضا میں آوازیں گونج گئیں، ناموس تفیس کی نو بیٹہ چلا کر صنف نے چوکا مارا تھا جس کا زیادہ اثر ہمارے پیچھے کھڑے ہونے والے صاحب پر سب خوشگوار ہوا تھا۔ انتہائی بے خودی میں انہوں نے چوکا ہماری کمر پر منتقل کر دیا۔ ہم نے لحظہ بھر بدلہ لینے کی ٹھانی، لیکن ہمارے اندر کا نومولود مہاجا ابھی پرانے بابو سے بہت چھوٹا تھا، اس لئے خاموش، ہو گئے لیکن یقین ہو گیا کہ وہ دن دور نہیں جب آسمان سے لوگ زمین والوں سے بات کر سکیں گے اور اگر بات نہیں تو گھونسہ ضرور مار سکیں گے۔

کچھ اسی قسم کی ایک مہمات سر کرنے کے بعد ہم نے چھالیہ تو حاصل، لیکن مصیبت یہ پڑی کہ گھر سے بہت دور نکل آئے تھے۔ کافی دیر بھی ہو چکی تھی۔ اب ہمیں یقین تھا کہ اس وقت تک گھر میں کوئی ایک چھوٹے چھوٹے بھونچال آچکے ہوں گے۔ مثلاً صحن کے پرلے کونے میں پانی اماں کو کسی مونڈھے سے ٹھوکر لگی ہو گی اور باجی پر لاپرواہی سے سارے صحن میں چیزیں بکھیرنے کے لئے فرد جرم عائد ہو چکی ہو گی۔ شیشے کا گلاس پانی اماں کے ہاتھ سے چھوٹ کر ٹوٹ گیا ہو گا اور نوکر برتنوں سے چکنائی نہ دھونے کے الزام میں جہنم رسید ہو چکا ہو گا ہفتہ بھر سے برآمدے میں پڑے کھلونے کی وجہ سے پانی اماں کے ہاتھوں منے کی پٹائی آج ہو رہی ہو گی۔

غسل خانے میں صبح بھگن نے جو فینائل ڈالا تھا اُس کی بو پانی اماں سونگھیں گی تو بھگن کی بے طرفی کے احکام صادر ہونے لگیں گے کہ بو کی وجہ فینائل کی کمی ہے۔ اس لئے ہم چاہتے تھے کہ جلد از جلد امن و آشتی کی کنجی چھالیہ لے کر گھر پہنچ جائیں چنانچہ ٹیکسی کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔

ایک جگہ ایک گروپ چار پانچ ٹیکسیوں کا نظر آیا تو ہم لپکے ہوئے گئے۔ وہ سب اکٹھی کھڑی تھیں۔ سارے ڈرائیور قریب ہی حلقہ باندھ کر بیٹھے تھے اور بیچ میں ایک ٹرانسسٹر ریڈیو رکھا تھا۔

"ٹیکسی" ہم نے عقب سے آواز دی۔

جواب ندارد۔

ہم قریب گئے "ارے بھائی ٹیکسی خالی ہے"

"وہ مارا" وہ سب چلائے اور تالیاں پیٹنے لگے۔ ایک اٹھ کر ریڈیو کے گرد ناچنے لگا۔

ہم نے ایک ٹیکسی کا ہارن دبا دیا۔ اُن میں سے صرف ایک نے ایسی سرسری نگاہ ڈال کر منہ پھیر لیا جیسے چھیچھڑے کھانے کے بعد سوئی ہوئی بلی شور سن کر آدھی آنکھ کھول کر پھر سے میچ لیتی ہے۔

"ارے بھائی ٹیکسی لے چلو گے یا نہیں" تو سب نے بیزاری سے ہماری طرف دیکھا دو ایک نے تو نفرت سے منہ موڑ لیا۔ باقیوں نے گوارا کیا لیکن ایک کی آنکھوں میں ہم نے ترس کی لہر دیکھی وہ بولا:

ذرا انتظار کریں بابو جی! ابھی چلتے ہیں۔ بس ذرا حنیف سنچری کر لے"

"اور اگر مجھے بالفرض سٹیشن پر گاڑی پکڑنا ہو تو ......" ہم نے اپنی دانست میں بڑا معرکے کا سوال کیا لیکن وہ سر دھن کر تالیاں پیٹ رہے تھے اور ہم آگے چل دئے۔

تھوڑی دیر بعد ایک تانگہ نظر آیا جو فٹ پاتھ پر کھڑا تھا۔ گھوڑا سر جھکائے دانا کھا رہا تھا۔ کوچوان کہیں نظر نہ آتا تھا۔ ہم نے سوچا ہوگا کہیں یا ڈنڈری لاٹ سے پرے لیکن تانگے کی گھنٹی بجائی تو وہ سامنے والی دکان سے لپکا چلا آیا جہاں کمنٹری سن رہا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی کلیجہ دگنا ہو گیا۔

"کیوں میاں تانگہ خالی ہے؟"

جواب دینے کی بجائے اس نے عجیب خشمگیں انداز میں ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ گھوڑے کی ناک پر گو تو بخار گھونسا مار کر منہ پرے کیا چنگیزی انداز میں دانے کا بجس کھینچ لیا۔ گھوڑے نے ذرا سا خود داری دکھاتے ہوئے لنگڑا سا احتجاج کیا تو نہایت غلیظ گالیاں الاپتے ہوئے شڑاپ شڑاپ چابک جما دئے

اور پھر اچکتا پھاندتا میں چڑھ بیٹھا، راستے میں قدم قدم پر گھوڑے کی پیٹ پر چابک کی بجلیاں برساتا رہا۔ کوئی سائیکل، تانگہ یا آدمی آگے آنے لگتا تو جبڑے کھینچ کر بچنے کے نعرے لگانے کے بعد فرلانگ بھر زیرِ لب سیکڑوں کے پہاڑے گنتا جاتا ایک فقیر اپنے فقر میں مست سڑک پر بڑھا آرہا تھا تو گھوڑا روکا۔ دو چار چابک لگا کر اس کی قناعت کو توڑا اور پھر رواں ہوگیا۔ جو خوانچے والے فٹ پاتھ پر بھی بیٹھے تھے اُن سے بھی جھگڑتا گیا کہ یہ راستہ روک دیتے ہیں یا روکنے کی نیت رکھتے ہیں۔ ہم حیران تھے کہ اس کا موڈ اتنا خطرناک کیوں ہے، مگر خاموشی میں ہی سلامتی دیکھ کر چپ دبکے رہے۔ لیکن جب اُس نے ایک پیپل کے درخت کو شاخیں پھیلانے کے جرم میں گالیاں دیں تو ہم پوچھ ہی بیٹھے۔

"کیوں بھئی کسی سے ناراض ہو کر آئے ہو کیا؟" تو وہ پھٹ پڑا:

"ناراض ہو کر کسی کا کیا بگاڑ لیں گے بابوجی، سارے دن کی کمائی چھوڑ کر صبح سے کمنٹری سن رہا تھا۔ پچاس روپے کا بک موڑ دیئے۔ لیکن حنیف سالا بغیر سنچری بنائے آؤٹ ہوگیا ہے" اور اس نے ایک زوردار چابک گھوڑے پر جمایا۔ گھر پہنچے تو عرفی بھیا منہ پھاڑے بیٹھے تھے۔

"سکور کیا ہے؟"

"ریڈیو کھول کر سن لیں مجھے کیا معلوم"۔ ہم نے جل کر کہا۔

"ارے میاں ناراض کیوں ہوتے ہو، میں تو ریڈیو ہی سن رہا تھا۔ وہ تو بجلی فیل ہوگئی ہے۔"

ہم نے اپنی جان چھڑانے کے لئے ٹیلی فون کے دفتر سے نمبر ملایا۔ "ہیلو! بجلی والوں کے انکوائری آفس کا نمبر کیا ہے؟" اُس نے نمبر بتایا تو ہم نے ملایا۔ جیسے ہی اُدھر سے کسی نے ریسیور اٹھایا ہم نے کہا۔

"ہیلو!"

جواب آیا "پاکستان فور ہنڈرڈ تھری فور"۔

عرض کیا "بھائی خدا کے لئے سکور رہنے دو اور ہماری بجلی آ کر ٹھیک کر دو۔"

بولے "تو خدا کے لئے آپ بجلی والوں کو فون کریں۔"

پوچھا "آپ کون ہیں؟"

"پاکستان ٹائمز کا کرکٹ انکوائری آفس۔"

ہم نے ٹیلی فون کے دفتر والوں سے احتجاج کیا کہ انہوں نے غلط نمبر کیوں دیا۔ تو وہاں سے لڑکی

بولی کہ آپ نے غلط نمبر کیوں پوچھا جب کہ آج ساری دنیا صرف کرکٹ انکوائری آفس کا نمبر پوچھ رہی ہے اس قسم کے حادثات کوئی پہلی مرتبہ نہیں ہوئے بلکہ جب کبھی کرکٹ کا ٹسٹ میچ دنیا کے کسی دور افتادہ کونے میں بھی ہوتا ہے، یہاں زندگی لنگڑی ہو جاتی ہے، اور اُس کی سر بگڑ جاتی ہے کہتے ہیں کرکٹ ہمارا قومی کھیل ہے۔ بخدا بالکل غلط ہے۔ کرکٹ تو صرف گیارہ آدمی اور ایک منیجر کھیلتے ہیں۔ باقی قوم تو اُن کے پیچھے پاگل ہو جاتی ہے۔ اس لئے ہمارا قومی کھیل کرکٹ نہیں بلکہ کرکٹ کے نام پر پاگل ہونا ہے۔ جس میں ساری قوم شریک ہوتی ہے اور ساری زندگی سکڑ کر تین الفاظ "سکور کیا ہے" میں سما جاتی ہے۔

کرکٹ ہم بھی کھیلتے رہے ہیں، اور ایمان سے اتنے تیز کھلاڑی تھے کہ ادھر بلا پکڑ کر وکٹ پر گئے اور اُدھر واپس ۔۔۔ لیکن اُن دنوں بھی ہم اتنے دیوانے نہ تھے۔ بلکہ جب سے ایک عالم کو اس سامری کے بچھڑے کی پرستش کرتے دیکھا ہے۔ ہم نے کرکٹ سے توبہ کر لی ہے۔ نہ صرف کھیلنے سے بلکہ دیکھنے سے بھی۔ لیکن لوگ ہیں کہ پھر بھی چین نہیں لینے دیتے۔ ٹسٹ کے دنوں میں کسی کو سلام کیا تو جواب دینے سے پہلے وہ پوچھتے ہیں "سکور کیا ہے؟" کسی راہگیر سے راستہ پوچھیں تو وہ سکور کا پوچھتا ہے۔ دکاندار سے بھاؤ پوچھیں تو وہ سکور کا پوچھتا ہے بلکہ اس روز ہم نے ہسپتال میں سنا کہ نرس ایک بچے کو پیدائش کے فوراً بعد جب نہلانے لگی تو وہ اُس کا بازو پکڑ کر پوچھنے لگا۔

"مس صاحبہ سکور کیا ہے؟"

سنا ہے نرس غش کھا کر گر پڑی تھی اور دو گھنٹے بعد مر گئی تھی۔ شام تک اُسے دفنا دیا گیا۔ دوسرے دن میانی صاحب کے قبرستان کے متولی نے ہمیں بتایا کہ شام کو ارد گرد کی قبروں سے مردے نرس سے پوچھ رہے تھے کہ تمہارے مرتے وقت سکور کیا تھا۔ اور اب مردے انتظار کر رہے ہیں کہ کل کوئی مرے اور تازہ ترین سکور کا پتہ چلے۔

پچھلے دنوں ٹسٹ کے موقع پر ہم نے دیکھا کہ گاہک اُن دکانوں سے چیزیں خریدتے تھے جن پر ریڈیو سکور بتاتا تھا اور دکاندار اُن گاہکوں کو وہ چیز سستی دیتے تھے جو سکور پوچھ کر بھاؤ پوچھتے تھے خدمتِ خلق کے علمبردار سب کام چھوڑ کر سڑکوں پر تازہ ترین سکور کے نعرے مارتے تھے۔ طلباء کتابیں ہاتھوں میں لئے ریڈیو والی جگہوں پر گڑ پر مکھیوں کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ پارٹیوں میں لوگ سب سے زیادہ کرکٹ کی

باتیں کرتے تھے۔ بلکہ اشتہاروں میں فلم ایکٹرس کی بجائے کرکٹ کا کھلاڑی نظر آتا تھا۔ اُن دنوں ہم نے فیصلہ کیا کہ اخبار "کرکٹ نامہ" جاری کیا جائے جو آج کل کی خبریں لوگوں تک پہنچائے۔ ڈیکلریشن حاصل کرنے کی عام دشواریاں کرکٹ کے نام نے فی الفور رفع کر دیں اور ہم نے پہلا پرچہ ترتیب بھی دے دیا۔ اس میں ساری خبریں سچی تھیں جو ہم نے بڑی محنت سے حاصل کی تھیں۔

ہم نے اس اخبار کا پہلا نمبر بھی شائع کر دیا تھا۔ حاشیے پر قائدِ اعظمؒ، محترمہ فاطمہ جناح، محمد علی اور شوکت علی، علامہ اقبالؒ اور غازی مصطفےٰ کمال کی تصاویر تھیں۔ اخبار کے نام سے اُوپر لکھا تھا:

باطل سے ڈرنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے، تو امتحاں ہمارا

اور صفحے کے نیچے پوری دعا تھی! یا رب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے ——— کھلاڑیوں کی گذشتہ زندگی، ان کی پیدائش کے وقت جنتریوں کی حالت، اُن کے لکڑ دادا کی اپنی آئندہ نسل کے بارے میں پیش گوئیاں۔

اور مولانا ظفر علی خاں کی لکھی ہوئی نعت بھی تھی پہلے دن ۵ لاکھ کاپیاں چھپوائی تھیں۔ لیکن ایک بھی نہ بک سکی۔ کیونکہ ٹسٹ کے دنوں میں لوگوں کو کچھ پڑھنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی ——— پھر بھی ہم نے سب کاپیوں کو نہایت حفاظت سے رکھ دیا ہے تاکہ مستقبل کا مورخ ان سے فائدہ اُٹھا سکے۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا

مشتاق احمد یوسفی

اب تو معمول سا بن گیا ہے کہ کہیں تعزیت یا تجہیز و تکفین میں شریک ہونا پڑے تو مرزا کو ضرور ساتھ لے لیتا ہوں ایسے موقعوں پر ہر شخص اظہار ہمدردی کے طور پر کچھ نہ کچھ ضرور کہتا ہے قطعۂ تاریخ وفات ہی کیوں نہ ہو۔ مگر مجھے نہ جانے کیوں چپ لگ جاتی ہے۔ جس سے بعض اوقات نہ صرف پسماندگان کو بلکہ مجھے بھی بڑا دکھ ہوتا ہے۔ لیکن مرزا نے چپ ہونا سیکھا ہی نہیں، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ صحیح بات کو غلط موقع پر بے دغدغہ کہنے کی جو خداداد صلاحیت انہیں ودیعت ہوئی ہے وہ کچھ ایسی ہی تقریبوں میں گل کھلاتی ہے۔ وہ گھپ اندھیرے میں سر رہگذر چراغ نہیں جلاتے، پھلجھڑی چھوڑتے ہیں جس سے بس ان کا اپنا چہرہ رات کے سیاہ فریم میں جگمگ جگمگ کرنے لگتا ہے اور پھلجھڑی کا لفظ تو یونہی مروّت میں قلم سے نکل گیا ورنہ ہوتا یہ ہے کہ بہ

جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کر اٹھے۔

اس کے باوجود خدا کے ان حاضر ناظر بندوں میں سے ہیں جو محلے کی ہر بڑی چھوٹی تقریب میں، شادی ہو یا غمی، موجود ہوتے ہیں۔ بالخصوص دعوتوں میں سب سے پہلے پہنچتے اور سب کے بعد اٹھتے ہیں۔ اس انداز نشست و برخاست میں ایک کھلا فائدہ یہ دیکھا کہ وہ باری باری سب کی غیبت کر ڈالتے ہیں، ان کی کوئی نہیں کر پاتا۔

چنانچہ اس سنیچر کی شام کو بھی میوہ شاہ قبرستان میں وہ میرے ساتھ تھے۔ سورج اس شہر خاموشاں کو، جسے ہزاروں بندگانِ خدا نے مر مر کے بسایا تھا، لال انگارہ سی آنکھ سے دیکھتا دیکھتا انگریزوں کے اقبال کی طرح غروب ہو رہا تھا۔ سامنے بیری کے درخت کے نیچے ایک ڈھانچہ قبر بدر پڑا تھا۔ چاروں طرف موت کی عملداری تھی۔ اور سارا قبرستان ایسا اداس اور اجاڑ تھا جیسے کسی بڑے شہر کا بازار اتوار کو۔ سبھی رنجیدہ تھے (بقول مرزا دفن کے وقت میّت کے علاوہ سب رنجیدہ ہوتے ہیں) مگر مرزا سب سے الگ تھلگ ایک پرانے کتبے پر نظریں

گالے مسکرا رہے تھے چند لمحوں بعد میرے پاس آئے اور میری پسلیوں میں اپنی کہنی سے آنکس کرتے ہوئے اس کتبے تک لے گئے جس پر مجملاً تاریخ پیدائش و پنشن، مولد و مسکن، ولدیت و عہدہ (اعزازی مجسٹریٹ درجہ سوم) آسودۂ لحد کی تمام ڈگریاں مع ڈویژن اور یونیورسٹی کے نام کے کندہ تھیں، اور آخر میں، نہایت جلی حروف میں، منہ پھیر کر جانے والے کو بذریعہ قطعہ بشارت دی گئی تھی کہ اللہ نے چاہا تو بہت جلد اس کا بھی یہی حشر ہونے والا ہے۔

میں نے مرزا سے کہا "یہ لوحِ مزار ہے یا ملازمت کی درخواست! بھلا ڈگریاں، عہدہ اور ولدیت وغیرہ لکھنے میں کیا تک تھی!"

انہوں نے حسبِ عادت بس ایک لفظ پکڑ لیا، کہنے لگے "ٹھیک کہتے ہو۔ جس طرح آج کل کسی کی عمر یا آمدنی دریافت کرنا بری بات سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح، بالکل اسی طرح بیس سال بعد کسی کی ولدیت پوچھنا بداخلاقی سمجھی جائے گی۔"

اب مجھے مرزا کی چونچال طبیعت سے خطرہ محسوس ہونے لگا۔ لہٰذا انہیں ولدیت کے مستقبل پر مسکراتا چھوڑ کر میں دس قدم دور ایک ٹکڑی میں شامل ہو گیا جہاں ایک صاحب جنت مکانی کے حالاتِ زندگی مزے لے لے کر بیان کر رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ خدا غریقِ رحمت کرے مرحوم نے اتنی لمبی عمر پائی کہ ان کے قریبی اعزہ دس پندرہ سال سے ان کی انشورنس پالیسی کی امید میں جی رہے تھے۔ ان امیدواروں میں سے بیشتر کو مرحوم خود اپنے ہاتھ سے مٹی دے چکے تھے۔ بقیہ کو یقین ہو گیا تھا کہ مرحوم نے نہ صرف آبِ حیات چکھا ہے بلکہ ڈگڈگا کے پی چکے ہیں۔ راوی نے یہاں تک بیان کیا کہ ازبسکہ مرحوم شروع سے رکھ رکھاؤ کے حد درجہ قائل تھے۔ لہٰذا آخر تک اس صحت بخش عقیدے پر قائم رہے کہ چھوٹوں کو تعظیماً پہلے مرنا چاہیے۔ البتہ ادھر چند برسوں سے ان کو فلکِ کج رفتار سے یہ شکایت ہو چلی تھی کہ افسوس اب کوئی دشمن ایسا باقی نہیں رہا جسے وہ مرنے کی بددعا دے سکیں۔

ان سے کٹ کر میں ایک دوسری ٹولی میں جا ملا۔ یہاں مرحوم کے ایک شناسا اور میرے پڑوسی ان کے گیارہ لڑکے کو صبرِ جمیل کی تلقین اور گول مول الفاظ میں نعم البدل کی دعا دیتے ہوئے فرما رہے تھے کہ برخوردار! یہ مرحوم کے مرنے کے دن نہیں تھے۔ حالانکہ پانچ منٹ پہلے یہی صاحب، جی ہاں! یہی صاحب، مجھ سے کہہ رہے تھے کہ مرحوم نے پانچ سال قبل دونوں بیویوں کو اپنے تیسرے سہرے کی بہاریں دکھائی تھیں۔ اور یہ ان کے مرنے کے نہیں ڈوب مرنے کے دن تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انہوں نے انگلیوں پر حساب لگا کر کانا پھوسی کے

انداز میں یہ تک بتایا کہ تیسری بیوی کی عمر مرحوم کی پنشن کے برابر ہے یعنی بیحد سیدھی سادی اور بے زبان۔ اس اللہ کی بندی نے کبھی پلٹ کر نہیں پوچھا کہ تمہارے منہ میں دانت نہیں ہیں۔ مگر مرحوم اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ انہوں نے محض اپنی دعاؤں کے زور سے موصوفہ کا چال چلن قابو میں کر رکھا ہے۔ حالانکہ بیچاری بیوی سے ان کی کبھی نہیں بنی۔ بھری جوانی میں بھی میاں بیوی ۶۳ کے ہندسے کی طرح ایک دوسرے سے منہ پھیرے رہے۔ اور جب تک جئے ایک دوسرے کے اعصاب پر سوار رہے۔ ممدوحہ نے مشہور کر رکھا تھا کہ خدا ان کی روح کو نہ شرمائے، مرحوم شروع سے ہی ایسے ظالم تھے کہ ولیمہ کا کھانا بھی مجھ نئی نویلی دلہن سے پکوایا۔

میں نے گفتگو کا رخ موڑنے کی خاطر بھرے پُرے قبرستان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "دیکھتے ہی دیکھتے" چپہ چپہ آباد ہو گیا۔ مرزا حسبِ معمول پھر بیچ میں کود پڑے۔ کہنے لگے دیکھ لینا وہ دن زیادہ دور نہیں جب کراچی میں مردے کو کھڑا گاڑنا پڑے گا اور نائلون کے ریڈی میڈ کفن میں اوپر زپ (مزدور) لگے گی تاکہ منہ دیکھنے دکھانے میں آسانی رہے۔

میری طبیعت ان باتوں سے دبنے لگی تو دوسرے غول میں چلا گیا جہاں دو نوجوان ستار کے غلاف جیسی پتلونیں چڑھائے چہک رہے تھے "لیڈی بوائے" کی پیلی قمیص پر لڑکیوں کی ایسی واہیات تصویریں بنی ہوئی تھیں کہ نظر پڑتے ہی لوگ لاحول پڑھنے لگتے اور ہم نے دیکھا کہ ہر شخص بار بار لاحول پڑھ رہا تھا۔ دوسرے نوجوان کو مرحوم کی بے وقت موت سے واقعی دلی صدمہ پہنچا تھا۔ کیونکہ اس کا سارا "ویک اینڈ" چوپٹ ہو گیا تھا۔

چونچوں اور چہلوں کا یہ سلسلہ شاید کچھ دیر اور جاری رہتا کہ اتنے میں ایک صاحب نے ہمت کر کے مرحوم کے حق میں پہلا کلمۂ خیر کہا اور میری جان میں جان آئی۔ انہوں نے صحیح فرمایا کہ یوں آنکھ بند ہونے کے بعد لوگ کیڑے نکالنے لگیں، یہ اور بات ہے۔ مگر خدا ان کی قبر کو عنبریں کرے، مرحوم بلاشبہ صاف دل نیک نیت انسان تھے۔ اور نیک نام بھی۔ یہ بڑی بات ہے۔

"نیک نامی میں کیا کلام ہے۔ مرحوم اگر یونہی منہ دھوئے بیٹھے جاتے تو سب یہی سمجھتے کہ وضو کیے ۔۔۔۔"

جملہ ختم ہونے سے پہلے مدّاح کی چمکتی چندیا یکایک ایک دھنسی ہوئی قبر میں غروب ہو گئی۔

اس مقام پر ایک تیسرے صاحب نے، جن سے میں واقف نہیں، "روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ" والے لہجے میں نیک نیتی اور صاف دلی کا تجزیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ بعض لوگ اپنی پیدائشی کاہلی کے سبب تمام

تھم گناہوں سے بچے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس بعضوں کے دل و دماغ واقعی آئینے کی طرح صاف ہوتے ہیں ـــــ یعنی نیک خیال آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔

شامتِ اعمال کہ میرے منہ سے نکل گیا۔ "نیت کا حال تو خدا پر روشن ہے۔ مگر اپنی جگہ یہی کیا کم ہے کہ مرحوم سب کے دکھ سکھ میں شریک اور لولے سے ادنیٰ پڑوسی سے بھی جھک کر ملتے تھے۔"

ارے صاحب! یہ سنتے ہی وہ بزرگوار تو لال بھبوکا ہو گئے۔ بولے "حضرات! مجھے خدائی کا دعویٰ تو نہیں، تاہم اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اکثر بوڑھے خرانٹ اپنے پڑوسیوں سے محض اس لئے جھک کر ملتے ہیں کہ اگر وہ خفا ہو گئے تو کندھا کون دے گا؟"

خوش قسمتی سے ایک خدا ترس نے میری حمایت کی۔ میرا مطلب ہے مرحوم کی حمایت کی۔ انہوں نے کہا کہ مرحوم نے ماشاءاللہ اتنی لمبی عمر پائی مگر صورت پر ذرا نہیں برستی تھی۔ چنانچہ سوائے کنپٹیوں کے اور بال سفید نہیں ہوئے۔ چاہتے تو خضاب لگا کر خوردوں میں شامل ہو سکتے تھے۔ مگر طبیعت ایسی قلندرانہ پائی تھی کہ خضاب کا کبھی بھولے سے بھی خیال نہیں آیا۔

بزرگوار بیچ میں پھٹ پڑے "آپ کو خبر بھی ہے؟ مرحوم کا سارا سر پہلے نکاح کے بعد ہی سفید ہو گیا تھا۔ مگر کنپٹیوں کو وہ قصداً سفید رہنے دیتے تھے تاکہ کسی کو شبہ نہ گزرے کہ خضاب لگاتے ہیں۔ سو ڈر گئے قلمیں! یہ تو ان کے میک اپ میں ایک نیچرل ٹچ تھا!"

"ارے صاحب! اسی مصلحت سے انہوں نے ایسا ایک مصنوعی دانت بھی توڑ رکھا تھا۔" ایک دوسرے بدگو نے مرحوم کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی۔

"کچھ بھی سہی۔ وہ ان کھوسٹوں سے ہزار درجہ بہتر تھے جو اپنے پوپلے منہ اور سفید بالوں کی داد چھوکروں سے یوں طلب کرتے ہیں گویا یہ ان کی ذاتی جدوجہد کا ثمرہ ہے۔" مرزا نے بگڑی بات بنائی۔

ان سے پیچھا چھڑا کر کچی پکی قبریں پھاندتا میں منشی ثناءاللہ کے پاس جا پہنچا جو ایک کتبے سے ٹیک لگائے بیری کے ہرے ہرے پتے کچر کچر چبا رہے تھے۔ اور اس امر پر بار بار اپنی حیرانی کا اظہار فرما رہے تھے کہ ابھی پرسوں تک تو مرحوم باتیں کر رہے تھے۔ گویا ان کے اپنے آدابِ جان کنی کی رو سے مرحوم کو مرنے سے تین چار سال پہلے چپ ہو جانا چاہئے تھا۔

بھلا مرزا ایسا موقع کہاں خالی جانے دیتے تھے۔ مجھے مخاطب کر کے کہنے لگے: "یاد رکھو! مرد کی آنکھ اور

عورت کی زبان کا دم سب سے آخر میں نکلتا ہے:

یوں تو مرزا کے بیان کے مطابق مرحوم کی بیویاں بھی ایک دوسرے کی چھاتی پر دو تہتڑ مار مار کر بین کر رہی تھیں، لیکن مرحوم کے بڑے نواسے نے جو کہ پانچ سال سے بیروزگار تھا، چیخ چیخ کر اپنا گلا بٹھا لیا تھا۔ منشی جی بیری کے پتوں کا رس چوس کر جتنا اسے سمجھاتے پچکارتے، اتنا ہی وہ مرحوم کی پنشن کو یاد کر کے دھاڑیں مار مار کر روتا۔ اسے اگر ایک طرف حضرت عزرائیل سے گلہ تھا کہ انہوں نے ۳۰ تاریخ تک انتظار کیوں نہ کیا تو دوسری طرف خود مرحوم سے بھی سخت شکوہ تھا

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور ؟

اُدھر منشی جی کا سارا زور اس فلسفہ پر تھا کہ برخوردار! یہ سب نظر کا دھوکا ہے۔ درحقیقت زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں۔ کم از کم ایشیا میں۔ نیز مرحوم بڑے نصیبہ ور نکلے کہ دنیا کے بکھیڑوں سے اتنی جلد آزاد ہوگئے۔ مگر تم ہو کہ ناحق اپنی جوان جان کو ہلکان کئے جا رہے ہو۔

یونانی مثل ہے کہ:۔

وہی مرتا ہے جو محبوبِ خدا ہوتا ہے

حاضرین ابھی دل ہی دل میں حسد سے جلے جا رہے تھے کہ ہائے مرحوم کی آئی ہمیں کیوں نہ آگئی کہ دم بھر کو بادل کے ایک خاسی ٹکڑے نے سورج کو ڈھانپ لیا۔ اور ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ منشی جی نے یکبارگی بیری کے پتوں کا پھوک نگلتے ہوئے اس کو مرحوم کے بہشتی ہونے کا غیبی شگون قرار دیا لیکن مرزا نے بھرے مجمع میں پنڈولم کی مانند سر ہلا ہلا کر اس پیش گوئی سے اختلاف فرمایا۔ میں نے الگ لے جا کر وجہ پوچھی تو ارشاد ہوا۔

"مرنے کے لئے سنیچر کا دن بہت منحوس ہوتا ہے۔"

لیکن سب سے زیادہ پتلا حال مرحوم کے ایک دوست کا تھا، جن کے آنسو کسی طرح تھمنے کا نام نہیں لیتے تھے ــــ کہ انہیں مرحوم سے دیرینہ ربط و رفاقت کا دعوےٰ تھا۔ اس روحانی یک جہتی کے ثبوت میں اکثر اس واقعہ کا ذکر کرتے کہ بغدادی قاعدہ ختم کرنے سے ایک دن پہلے ہم دونوں نے ایک ساتھ سگریٹ پینا سیکھا۔ چنانچہ اس وقت بھی صاحب موصوف کے بین سے صاف ٹپکتا تھا کہ مرحوم کسی سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت داغ بلکہ دغا دے گئے اور بغیر کہے سنے نیچا دکھا کر چپ چپاتے جنت الفردوس کو روانہ ہوگئے ــــ اکیلے ہی اکیلے!

بعد میں مرزا صاحب نے بتایا کہ باہمی اخلاص و یگانگت کا یہ عالم تھا کہ مرحوم نے اپنی موت سے تین ماہ پیشتر موصوف سے دس ہزار روپے سکہ رائج الوقت بطور قرض حسنہ لیے تھے اور وہ تو کہیے بڑی خیریت ہوئی کہ اسی رقم سے تیسری بیوی کا مہر معجل بیباق کر گئے ورنہ قیامت میں اپنے سالے سسر کو کیا منہ دکھاتے۔

(۲)

آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ گنجان محلوں میں مختلف بلکہ متضاد تقریبیں ایک دوسرے میں بڑی خوبی سے ضم ہو جاتی ہیں۔ گویا دونوں وقت مل رہے ہوں۔ چنانچہ اکثر حضرات دعوتِ ولیمہ میں بھی ہاتھ دھوتے وقت چہلم کی بریانی کے ڈکار لیتے یا سوئم میں شبینہ فتوحات کی لذیذ داستان سنتے پکڑے جاتے ہیں۔ یہ لذت ہمسائیگی کا یہ نقشہ بھی اکثر دیکھنے میں آیا کہ ایک کوارٹر میں بھی سہرا سنایا جا رہا ہے۔ تو دوسرے جگہ دیوار کے اس طرف ہو رہا ہے۔ اور یوں بھی ہوتا ہے کہ دائیں طرف والے گھر میں آدھی رات کو قوال جلیاں اڑا رہے ہیں تو بائیں طرف والے گھر میں دو سوکنوں کی اپنی مشترکہ ساس سے کچھ اس طرح دھواں دھار لڑائی ہو رہی ہے کہ :۔

"ہم نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے گھر میں ہے"

اس تقریبی گھپلے کا صحیح اندازہ مجھے دوسرے دن ہوا جب ایک شادی کی تقریب میں تمام وقت مرحوم کی وفاتِ حسرت آیات کے تذکرے ہوتے رہے۔ ایک بزرگ تو کہ صورت سے خود پا بہ رکاب معلوم ہوتے تھے تشویشناک لہجے میں پوچھا آخر ہوا کیا؟ احباب میں مرحوم کے ایک ہم جماعت نے اشاروں کنایوں میں بتایا کہ مرحوم جوانی میں اشتہاری امراض کا شکار ہو گئے اور ادھیڑ عمر میں جنسی ژولیدگی میں مبتلا رہے۔ لیکن آخری ایام میں "تقوی" ہو گیا تھا۔

"پھر بھی آخر ہوا کیا؟" پا بہ رکاب بزرگ نے سوال دہرایا۔

"بھلے چنگے تھے ناچانک ایک ہچکی آئی اور جان بحق ہو گئے" دوسرے بزرگ نے انگوچھے سے ایک فرضی آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

"سنا ہے چالیس برس سے مرض الموت میں مبتلا تھے!" ایک صاحب نے سوکھے منہ سے کہا۔

"کیا مطلب؟ ——— چالیس برس سے کھانسی میں مبتلا تھے اور آخر اسی میں انتقال فرمایا۔"

"صاحب! ضیق تھے کہ کسی اجنبی ملک میں نہیں مرے۔ ورنہ اب تو میڈیکل سائنس کی ترقی کا یہ حال ہے کہ روزانہ ایک نیا مرض ایجاد ہوتا ہے۔"

"آپ نے گاندھی گارڈن میں اس بوہری سیٹھ کو کارنس چہل قدمی کرتے نہیں دیکھا جو کہتا ہے کہ میں ساری عمر دمے پر اتنی لاگت لگا چکا ہوں کہ اب اگر کسی اور مرض میں مرنا پڑا تو خدا کی قسم خودکشی کر لوں گا"

مرزا چٹکلوں پر اتر آئے۔

" واللہ! موت ہو تو ایسی ہو! ارے سکی! مرحوم کے ہونٹوں پر عالم سکرات میں بھی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔"

" اپنے قرض خواہوں کا خیال آرہا ہوگا" مرزا میرے کان میں پھسپھسائے۔

" گنہگاروں کا منہ مرتے وقت سور جیسا ہو جاتا ہے۔ مگر چشم بددور، مرحوم کا چہرہ گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا۔"

" یار! اس رنگ کا گلاب ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔ صرف کتابوں میں پڑھا ہے" مرزا کی ٹھنڈی ٹھنڈی ناک پھر میرے کان کو چھونے لگی۔ اور ان کے منہ سے کچھ ایسی آوازیں نکلنے لگیں جیسے کوئی بچہ چمکیلے فرنیچر پر انگلی رگڑ رہا ہو۔

اصل الفاظ تو ذہن سے محو ہو گئے۔ لیکن اتنا اب بھی یاد ہے کہ انگوچھے والے بزرگ نے ایک فلسفیانہ نغز پر سرڈالی جس کا مفہوم کچھ ایسا ہی تھا کہ جینے کا کیا ہے، جینے کو تو جانور بھی جی لیتے ہیں۔ لیکن جس نے مرنا نہیں سیکھا وہ جینا کیا جانے۔ ایک متبسم خود سپردگی، ایک بے تاب آمادگی کے ساتھ مرنے کے لئے ایک عمر کا ریاض درکار ہے۔ یہ بڑے ظرف، بڑے حوصلے کا کام ہے، بندہ نواز!

پھر انہوں نے بے موت مرنے کے خاندانی نسخے اور ہنستے کھیلتے اپنی روح قبض کرانے کے ہتھکنڈے کچھ ایسے استادانہ تیور سے بیان کئے کہ ہمیں عطائی مرنے والوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نفرت ہوگئی۔

خاتمہ کلام اس پر ہوا کہ مرحوم نے کسی روحانی ذریعہ سے کن گن پالی تھی کہ میں سنیچر کو مرجاؤں گا۔

" ہر مرنے والے کے متعلق یہی کہا جاتا ہے" باتصویر قمیض والا" ٹیلیڈی بولائے" بولا۔

" کہ وہ سنیچر کو مرجائے گا؟" مرزا نے اس بدلگام کا منہ بند کیا۔

انگوچھے والے بزرگ نے شئے مذکور سے پہلے اپنے زری کے جوتے کی گرد جھاڑی۔ پھر پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے عرفان مرگ کی شہادت دی کہ مرحوم نے وصال سے ٹھیک چالیس دن پہلے مجھ سے فرمایا تھا کہ انسان فانی ہے۔

انسان کے متعلق یہ تازہ خبر سن کر مرزا مجھے تخلیہ میں لے گئے۔ در اصل تخلیہ کا لفظ انہوں نے استعمال کیا تھا ورنہ جس جگہ وہ مجھے دھکیلتے ہوئے لے گئے وہ زنانے اور مردانے کی سرحد پر ایک چبوترا تھا جہاں [illegible]

بھرے بھرے بدن والی میراثن ڈھولک پر گالیاں گا رہی تھی۔ وہاں انہوں نے اس شغف کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جو مرحوم کو اپنی موت سے تھا، مجھے آگاہ کیا کہ یہ ڈرامہ تو جنت مکانی اکثر کھیلا کرتے تھے۔ تنے دن اپنی بیویوں کو جان پر کھیل جانے کی دھمکیاں دے کر انہیں خوب رلاتے، اپنے بے تکلف دوستوں سے بھی کہا کرتے تھے کہ واللہ! اگر خودکشی جرم نہ ہوتی تو کبھی کا اپنے گلے میں پھندا ڈال لیتا۔ کبھی یوں بھی ہوتا کہ اپنے آپ کو مردہ تصور کر کے ڈکرانے لگتے اور چشمِ تصور سے منجھلی کے موٹے سے ہاتھ دیکھ کر کہتے: "بخدا! میں تمہارا رنڈاپا نہیں دیکھ سکتا" مرنے والے کی ایک ایک خوبی بیان کر کے خشک سسکیاں بھرتے اور سسکیوں کے درمیان سگریٹ کے کش لگاتے۔ اور جب اس عمل سے اپنے اوپر رقت طاری کر لیتے تو رومال سے بار بار آنکھ کی بجائے اپنی ڈبڈبائی ہوئی ناک پونچھنے جاتے۔ پھر جب شدتِ گریہ سے ناک سرخ ہو جاتی تو ذرا صبر آتا اور وہ عالمِ تصور میں کپکپاتے ہوئے ہاتھ سے تینوں بیواؤں کی مانگ میں یکے بعد دیگرے ڈھیروں افشاں بھرتے اس سے فارغ ہو کر ہر ایک کو کہنیوں تک بہیں بہیں، پھنسی پھنسی چوڑیاں پہناتے رہتے تاکہ چار چوڑیاں کم پہناتے تھے)

حالانکہ اس سے پہلے بھی مرزا کو کئی مرتبہ ٹوک چکا تھا کہ خاقانیٔ ہند استاد ذوق ہر قصیدے کے بعد منہ بھر بھر کے کلیاں کیا کرتے تھے۔ تم پہ ہر کلمے، ہر فقرے کے بعد واجب ہیں۔ لیکن اس وقت مرحوم کے بارے میں یہ اول جلول باتیں اور ایسے واشگاف لہجے میں سن کر میری طبیعت کچھ زیادہ ہی متعفن ہو گئی۔ میں نے دوسروں پہ ڈھال کر مرزا کو سنایا۔

"یہ کیسے مسلمان ہیں مرزا؟ دعائے مغفرت نہیں کرتے نہ کریں۔ مگر ایسی باتیں کیوں بناتے ہیں یہ لوگ؟"

"خلقِ خدا کی زبان کس نے پکڑی ہے۔ لوگوں کا منہ تو جہلم کے نوالے ہی سے بند ہوتا ہے۔"

(٣)

مجھے جہلم میں بھی شرکت کا اتفاق ہوا۔ لیکن سوائے ایک نیک طینت مولوی صاحب کے جو پلاؤ کے چاولوں کی لمبائی اور گلاوٹ کو مرحوم کے ٹھیٹ جنتی ہونے کی نشانی قرار دے رہے تھے۔ بقیہ حضرات کی گل افشانیٔ گفتار کا وہی انداز تھا۔ وہی جگ جگے تھے، وہی پیچھے!

ایک بزرگوار جو نان قورمے کے ہر آتشیں لقمے کے بعد آدھا آدھا گلاس پانی پی کر قبل از وقت سیر ہو کر سیراب ہو گئے تھے، منہ لال کر کے بولے کہ مرحوم کی اولاد نہایت ناخلف نکلی۔ مرحوم و مغفور شدومد سے وصیت فرما گئے تھے

کہ میری مٹی بغداد لے جائی جائے لیکن نافرمان اولاد نے ان کی آخری خواہش کا ذرا پاس نہ کیا۔

اس پر ایک منہ پھٹ پڑوسی بول اٹھے "صاحب! یہ مرحوم کی سراسر زیادتی تھی کہ انہوں نے خود تا دمِ مرگ میونسپل حدود سے قدم باہر نہیں نکالا۔ حد یہ کہ پاسپورٹ تک نہیں بنوایا اور......"

ایک وکیل صاحب نے قانونی موشگافی کی "بین الاقوامی قانون کے بموجب پاسپورٹ کی شرط صرف زندوں کے لیے ہے۔ مردے پاسپورٹ کے بغیر بھی جہاں چاہیں جا سکتے ہیں۔"

"لے جائے جا سکتے ہیں" مرزا پھر لقمہ دے گئے۔

"میں کہہ یہ رہا تھا کہ یوں تو ہر مرنے والے کے سینے میں یہ خواہش سلگتی رہتی ہے کہ میرا کانسی کا مجسمہ (جسے قدِ آدم بنانے کے لیے بسا اوقات اپنی طرف سے پورے ایک فٹ کا اضافہ کرنا پڑتا ہے) میونسپل پارک کے بیچوں بیچ استادہ کیا جائے اور...."

"اور جملہ نازنینانِ شہر چار مہینے دس دن تک میری لاش کو گود میں لیے بال بکھرائے بیٹھی رہیں۔" مرزا نے دوسرا مصرع لگایا۔

"مگر صاحب وصیتوں کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ہمارے بچپن کا قصہ ہے۔ سہ میل والی حویلی میں پشاور میں ایک افیمی صاحب کا انتقال ہوا، جن کے متعلق محلے میں مشہور تھا کہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد نہیں نہائے۔ انہیں اتنا تو ہم نے بھی کہتے سنا کہ خدا نے پانی صرف پینے کے لیے بنایا ہے۔ ہاں تو صاحب جب ان کا وقت آخر ہونے لگا تو بجھنے والی بیڑی کا ٹکڑا اپنے ہاتھ میں لے کر یہ قول و قرار کیا کہ میری میت کو غسل نہ دیا جائے۔ بس پرلے پرلے ہاتھوں سے تیمم کرا کے کفنا دیا جائے ورنہ حشر میں دامن گیر ہوں گا۔"

وکیل صاحب نے تائید کرتے ہوئے فرمایا "اکثر مرنے والے اپنے کرنے کے کام پسماندگان کو سونپ کر ٹھنڈے ٹھنڈے سدھار جاتے ہیں۔ پچھلی گرمیوں میں دیوانی عدالتیں بند ہونے سے چند یوم قبل ایک مقامی شاعر کا انتقال ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے جیتے جی کسی فلمی رسالے نے بھی ان کی عریاں نظموں کو زیورِ طبع سے آراستہ نہیں کیا۔ لیکن آپ کو حیرت ہوگی کہ مرحوم اپنے بھتیجے کو ایصالِ ثواب کی یہ راہ سجھا گئے کہ میرا کلام حنائی کاغذ پر چھپوا کر سال کے سال میری برسی پر فقیروں اور مدیروں کو بلا ہدیہ تقسیم کیا جائے۔"

پڑوسی کی ہمت اور بڑھی "اب مرحوم ہی کو دیکھیے۔ زندگی میں ہی ایک قطعۂ اراضی اپنی قبر کے لیے بڑے ارمانوں سے رجسٹری کرا لیا تھا۔ اگرچہ بیچارے اس کا قبضہ پورے بارہ سال بعد لے پائے۔ نصیحتوں اور وصیتوں

کا یہ عالم تھا کہ موت سے دس سال پیشتر اپنے نواسوں کو ایک فہرست حوالے کر دی تھی جس میں نام بنام لکھا تھا کہ فلاں ولد فلاں کو میرا منہ نہ دکھایا جائے۔ جن حضرات سے زیادہ آزردہ خاطر تھے ان کے نام کے آگے ولدیت نہیں لکھی تھی۔ تیسری شادی کے بعد انہیں اس کا طویل ضمیمہ مرتب کرنا پڑا جس میں تمام جوان پڑوسیوں کے نام شامل تھے۔

"ہم نے تو یہاں تک سنا ہے کہ مرحوم نہ صرف اپنے جنازے میں شرکا کی تعداد متعین کر گئے بلکہ آج کے چہلم کا "مینو" بھی خود ہی طے فرما گئے تھے۔" وکیل نے خاکے میں شوخ رنگ بھرا۔

اس نازک مرحلے پر خشخشی داڑھی والے بزرگ نے پلاؤ سے سیر ہو کر شکم پر ہاتھ پھیرا اور "مینو" کی تائید و توصیف میں ایک مسلسل ڈکار داغی، جس کے اختتام پر اس معصوم حسرت کا اظہار فرمایا کہ کاش آج مرحوم زندہ ہوتے تو یہ انتظامات دیکھ کر کتنے خوش ہوتے!

اب پڑوسی نے تیغِ زبان کو بے نیام کیا۔ "مرحوم سدا سے سوءِ ہضم کے مریض تھے۔ غذا تو غذا بیچارے کے پیٹ میں بات تک نہیں ٹھہرتی تھی۔ چٹ پٹی چیزوں کو ترستے ہی مرے۔ میری سگی بہن سے بتا رہی تھیں کہ ایک دفعہ ملیریا میں سرسام ہو گیا۔ لگے بہکنے۔ بار بار اپنا سر منجھلی کے زانو پر پٹختے اور سہاگ کی قسم دلا کر یہ وصیت کرتے تھے کہ ہر جمعرات کو میری فاتحہ چاٹ اور کنواری بکری کی سری پر دلائی جائے"

مرزا پھڑک ہی تو گئے۔ ہونٹ زبان پر پھیرتے ہوئے بولے، "صاحب! وصیتوں کی کوئی حد نہیں۔ ہمارے محلے میں ڈیڑھ پونے دو سال پہلے ایک سکول ماسٹر کا انتقال ہوا۔ جنہیں میں نے عید بقرعید پر بھی سالم و ثابت پاجامہ پہنے نہیں دیکھا۔ مگر مرنے سے پہلے وہ بھی اپنے لڑکے کو ڈانٹ ڈانٹ کر ہدایت کر گئے کہ:۔

پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

لیکن ابا حضور کی آخری وصیت کے مطابق فیض کے اسباب بنانے میں لڑکے کی مفلسی کے علاوہ ملک کا قانون بھی مزاحم ہوا۔"

"یعنی کیا؟" وکیل صاحب کے کان کھڑے ہوئے۔

"یعنی یہ کہ آج کل پل بنانے کی اجازت صرف پی ڈبلیو ڈی کو ہے اور بفرضِ محال کراچی میں چار فٹ گہرا کنواں کھود بھی لیا تو پولیس اس کا کھاری کیچڑ پینے والوں کا چالان اقدامِ خودکشی میں کر دے گی۔ یوں بھی پیچیر سے پیچیر قصبے میں آج کل کنوئیں صرف ایسے موقعہ پر ڈوب مرنے کے کام آتے ہیں۔ رہے تالاب، تو حضور لے دے کے ان کا مصرف رہ گیا ہے کہ دن بھر ان میں گاؤں کی بھینسیں نہائیں اور صبح جیسی آئی تھیں اس سے کہیں

زیادہ گذری ہو کر چراغ جلے باڑے میں پہنچیں۔"

خدا خدا کر کے یہ مکالمہ ختم ہوا تو پٹاخوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

"مرحوم نے کچھ چھوڑا بھی ؟"

"بچے چھوڑے ہیں۔"

"مگر دوسرا مکان بھی تو ہے۔"

"اس کے کرایہ کو اپنے مزار کی سالانہ مرمت و سفیدی کے لئے وقف کر گئے ہیں۔"

"پڑوسیوں کا کہنا ہے کہ بیاہتا بیوی کے لئے ایک انگوٹھی بھی چھوڑی ہے۔ اگر اس کا نگینہ اصلی ہوتا تو کسی طرح بیس ہزار سے کم کی نہیں تھی۔"

"تو کیا نگینہ جھوٹا ہے ؟"

"جی نہیں۔ اصلی امی ٹیشن ہے۔"

"اور وہ پچاس ہزار کی انشورنس پالیسی کیا ہوئی ؟"

"وہ پہلے ہی منجھلی کے مہر میں لکھ چکے تھے۔"

"اس کے بارے میں یار لوگوں نے لطیفہ گھڑ رکھا ہے کہ منجھلی بیوہ کہتی ہے کہ سرتاج کے بغیر زندگی اجیرن ہے۔ اگر کوئی ان کو دوبارہ زندہ کر دے تو میں بخوشی دس ہزار روپلٹتے پر تیار رہوں۔"

"ہم نے خانگی ذرائع سے سنا ہے کہ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ مرحوم منجھلی پر ایسے لہلوٹ تھے کہ اب بھی رات برات خوابوں میں آ آ کر ڈراتے ہیں۔"

"مرحوم اگر ایسا کرتے ہیں تو بالکل ٹھیک کرتے ہیں۔ ابھی تو ان کا کفن بھی میلا نہیں ہوا ہوگا۔ مگر سننے میں آیا ہے کہ منجھلی نے رنگے چنے دوپٹے اوڑھنے شروع کر دیئے ہیں۔"

"اگر منجھلی ایسا کرتی ہے ــــ تو بالکل ٹھیک کرتی ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ ایک زمانے میں لکھنؤ کے نچلے طبقے میں یہ رواج تھا کہ چالیسویں پر نہ صرف انواع و اقسام کے پرتکلف کھانوں کا اہتمام کیا جاتا، بلکہ بیوہ بھی سولہ سنگار کر کے بیٹھتی تاکہ مرحوم کی ترسی ہوئی روح کما حقہ متمتع ہو سکے۔" مرزا نے حالو عین صحیح مخرج سے ادا کرتے ہوئے مرے پہ آخری درّہ لگایا۔

واپسی پر راستے میں میں نے مرزا کو آڑے ہاتھوں لیا۔ "تم کو تم نے وعظ نہیں سنا ؟ مولوی صاحب

نے کہا تھا کہ مرے ہوؤں کا ذکر کرو تو اچھائی کے ساتھ۔ موت کو نہ بھولو کہ ایک نہ ایک دن سب کو آنی ہے۔"
سڑک پار کرتے کرتے ایک دم بیچ میں اڑ کر کھڑے ہو گئے۔ فرمایا:-
"اگر کوئی مولوی یہ ذمہ لے کہ مرنے کے بعد میرے نام کے ساتھ رحمتہ اللہ علیہ لکھا جائے گا تو آج ہی —
اسی وقت اسی جگہ — مرنے کے لئے تیار ہوں۔ تمہاری جان کی قسم۔"
آخری فقرہ مرزا نے ایک بے صبری موٹر کے بمپر پر تقریباً اکڑوں بیٹھ کر جاتے ہوئے ادا کیا۔

جیسے کوئی چیز ٹوٹ گئی

آغا بابر

پولیس کو دیکھ کر نوجوان اِس گلی میں جا چھپتے۔ اُس سے باہر نکل آتے۔ پولیس منہ دیکھتی رہ جاتی۔ اخبار
ے اس عمل کو HIDE AND SEEK لکھتے۔ میں اس چھپو چھپ کچولیاں کہتا۔ یوں سمجھئے ایک دوسرے کا منہ کالا
رہا تھا۔ کیسوں کے حسابوں حالات کو جھکولا جا رہا تھا۔ ہمارے حسابوں کھولا جا رہا تھا۔ کوئی پولیس والا طلبار کے
ھے چڑھ جاتا تو وہ اپنا حساب پورا کر لیتے تھے۔ طلبا پولیس کے ہتھے چڑھ جاتے تو وہ حساب برابر کر لیتی تھی۔
رکی ایسی فضا تھی جب مجھے ہوائی اڈے سے یاور الیاس کی کار لے کر الیاس پیلس پہنچی۔ میں نے راستے میں کئی
پولیس کی مسلح گاردیں کھڑی دیکھیں۔ طلباء کے جلوسوں اور مظاہروں پر کئی بار گولی چل چکی تھی۔ یہ سب انتظام
ریت کے خلاف نکلنے والے جلوسوں کے سلسلہ میں کیا جا رہا تھا آمریت کے خلاف جو بہت سے الزامات تھے
میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ملک کے تیئس[۲۳] خاندانوں کو اتنی مراعات دی گئی تھیں کہ انہوں نے ملک کی ساری دولت
پنے ہاں سمیٹ لی تھی۔

کتنی دلچسپ بات تھی کہ میں تیئس[۲۳] خاندانوں میں سے ایک خاندان کا مہمان ہو رہا تھا۔ میرا کمرہ ڈیے نفس فرنیچر
سے آراستہ تھا۔ ری ورسیبل ائرکنڈیشنر لگا ہوا تھا۔ فوم ربڑ کا ڈبل بیڈ تھا جس کے فرش پر اعلیٰ قسم کے
ین بچھے تھے۔ کمرے کی دیواروں میں جدید طرز کے بنے ہوئے آبنوسی طاقچے بلغاریہ، روس اور امریکہ کی بنی
ئی زیبائشی چیزوں سے آراستہ تھے۔ ملحقہ غسل خانے کی ٹائلیں چم چم کر رہی تھیں۔ دیوارگیر سٹینڈ پر گلابی رنگ
تولیہ لٹک رہا تھا۔ سبز رنگ کے واش بیسن پر صابن کی سفید ٹکیہ میرے انتظار میں چھوٹا سا پھول بنا دکھائی
ے رہی تھی۔ دیوارگیر آئینہ میں مجھے اپنا چہرہ کچھ زیادہ ہی کھلا کھلا دکھائی دیا۔ اللہ ہو غنی ماحول کے بدلنے
دمی خود کتنا بدل جاتا ہے۔

یاور الیاس کئی کارخانوں کے مالک تھے۔ جب بھی ملے مروّت اور اخلاق سے ملے۔ میرے افسانے

شوق سے پڑھتے تھے اس لئے مجھے بھی اُن سے ملنے کا شوق رہتا تھا۔ ایک روز مجھے کہنے لگے۔ الفت نے ادبیات میں ایم اے کر لیا ہے۔ اب ادیب بننا چاہتی ہے۔ تم کبھی ہفتہ دس دن ہمارے آ کر رہو۔ لڑکی سے ادب سے متعلق باتیں کرو۔ اُسے بتاؤ لکھنے کی تحریک کیونکر ہوتی ہے۔ افسانہ کس طرح لکھا جاتا ہے۔ لکھنے کے شوق میں وہ دیوانی ہو رہی ہے۔

ایک دفعہ ٹالا۔ دو دفعہ ٹالا۔ تیسری دفعہ نہ ٹالا جا سکا۔ نتیجہ یہ کہ میں یادر الیاس کی فیملی کے ساتھ ٹیرس پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ پیڈسٹل فین چل رہا تھا۔ یادر الیاس کی بیوی پیالی میں میرے لئے چائے ڈال رہی تھی۔ اُس کے بازو اور پیٹ دونوں برہنہ تھے صرف چار گرہ کپڑا اُس کے سینوں پر پیوست تھا جو اس قفس سے بھی نکل جانا چاہتے تھے۔ اُس کے بدن کے سارے حصے یوں لوٹتے ہوئے معلوم ہوتے تھے جیسے انہیں کانیوں سے جوڑا ہوا ہے۔ اُس کی چال اِن کانیوں کی وجہ سے بڑی درغلانے والی بن گئی تھی دو تربوز اُس کی کمر کے پچھلے کے ساتھ ٹنگ رہے تھے یا شراب کی دو مشکیں تھیں۔ وہ چلتی تو ان مشکوں میں شراب چھلکتی۔ ایران اور لکھنؤ کے شاعروں کی طرح میری نگاہ بار بار جسم کے انہیں دو حصوں پر گھوم پھر رہی تھی۔ بیرا کھانے والی چیزوں سے بھری ہوئی ٹرالی میرے آگے لایا۔ الفت میرے ہاتھ میں پلیٹ اور نیپکن تھما رہی تھی کہ کسی ملازم نے آکر اُس سے کہا "آپ کا فون آیا ہے"۔

الفت پورچ میں جا کر کسی سے کہنے لگی "ہاں وہ آ گئے ہیں۔ بس ایک ہفتے میں ادیب بن جاؤں گی"۔ پھر زور سے ہنسی اور فون رکھ کر ہمارے ساتھ چائے میں آن شریک ہوئی۔

وہ گٹھے ہوئے بدن اور موٹے نقوش والی اداس سی لڑکی تھی۔ اس کا رنگ گندمی تھا۔ اس نے بغیر دوپٹہ کے بیل باٹم اور اونچی کُرتی پہن رکھی تھی۔ بالوں کے پیچھے ہیئر پن لگا ہوا تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی مگر ان میں وسعت پانے والی اور وسعت پائی ہوئی چمک کی کبھی دھوپ کبھی چھاؤں تھی۔ چائے پر اتالیق اور شاگرد اندر کمرے میں آن بیٹھے۔ میں نرم کشن والے صوفے پر بیٹھا پھر صوفے سے ٹیک لگا کر زمین پر بیٹھ گیا جس طرح ہم مشرقی لوگ فرش پر بیٹھنے کے عادی ہیں "آپ نیچے کیوں اُتر بیٹھے۔ صوفہ آرام دہ نہیں؟"

میں نے مسکرا کر کہا۔ بہت آرام دہ ہے مگر اس طرح بیٹھنا زیادہ آرام دہ اور غیر رسمی ہے۔ زیادہ ڈرامیٹک ہے۔ میرے اُٹھنے بیٹھنے پر پابندی تو نہیں ہوگی نا؟

میرے مسکرانے پر وہ بھی مسکرائی اور صوفے پر سے اٹھ کر قالین پر بیٹھ گئی۔ اُس کی بھری بھری رانوں پر

بیل باٹم اتنا تنگ ہوگیا کہ مجھے اب معلوم ہوا کہ اس لباس میں حرکت اور حرارت دونوں موجود ہیں۔ وہ اپنے نیچے کشن رکھ کر بولی "معلوم نہیں مرد کس وقت کیا چاہتا ہے۔"

"تمہارا یہ جملہ بہت افسانوی ہے۔ یہ تمہارا اپنا جملہ ہے یا کسی کا استعمال شدہ ہے۔"

اس کی آنکھوں میں دھوپ کی روشنی اور چھاؤں کے سائے سمٹنے لگے۔ میں نے لقمہ دیا "ادیب کے لئے ضروری ہے کہ وہ حقیقت اور سچ نہ چھپائے۔"

"سچ ہی بتاؤں گی۔ یہ جملہ میرا نہیں۔ ممی کا ہے جو وہ ڈیڈی سے کہا کرتی تھی۔"

"تمہاری ممی جس کے ساتھ ہم نے ابھی چائے پی ہے؟"

"نہیں یہ میری سوتیلی ممی ہیں۔ یہ تو خوب سمجھتی ہیں کہ مرد کس وقت کیا چاہتا ہے"

جب بات سے بات نکلنے لگی تو میں نے پوچھا "نا چاقی کی وجہ؟"

"ڈیڈی کچھ چاہتے وہ کچھ کرتی۔ ڈیڈی چاہتے کمرے صاف ستھرے ہوں۔ باتھ روم کی صفائی دو دفعہ روزانہ ہو۔ تولیہ صاف ملے۔ آفتابے روز منجھیں۔ برآمدے کی کرسیاں اپنی جگہ سے نہ ہلیں۔ ممی کہتی بھینس نے آج دودھ کم دیا ہے۔ اسے چارہ دیر سے ڈالا گیا۔ آج بھینس نے رسا تڑا لیا کل بھینس نے سینگ مار دیا۔ ممی کی ساری توجہ بھینس دودھ گھی اور مکھن پر لگی رہتی تھی میری ماں سو فیصدی گاؤں کی رہنے والی تھی۔ میرا باپ سو فیصدی شہری تھا۔ ایک روز ڈیڈی باتھ روم میں جو داخل ہوئے تو ممی کموڈ پر بیٹھی نوکرانی کو بھینس کے لئے ہدایات دے رہی تھیں۔ ایک روز ڈیڈی کے ٹیبل لمپ کا سبز بلب نہیں مل رہا تھا۔ یہ ٹیبل لمپ ڈیڈی پیرس کی نمائش سے لائے تھے۔ معلوم ہوا ممی نے لمپ سے سبز بلب اتار کر بھینس کے اصطبل میں لگوا دیا تھا پھر ممی نے گھر کی تمام نوکرانیوں سے باری باری کہہ رکھا تھا کہ ڈیڈی کے قریب بھی مت پھٹکنا۔ سانڈ ہیں تاڑ دیں گے۔ وہ اتنی سہمی رہتیں کہ ڈیڈی کے داخل ہوتے ہی گھبرا کر کمرے سے باہر نکل جاتیں۔ بتایئے میری ممی اب گاؤں میں کیا کرتی ہے؟"

"کیا کہہ سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔

"دودھ بیچتی ہے۔"

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ بولی "میں چھٹی جماعت میں تھی جب ڈیڈی اور ممی کی علیحدگی ہوئی۔ میں دسویں جماعت میں ہوئی تو ڈیڈی نے دوسری شادی کی۔ ڈیڈی ایک دن مجھ سے کہنے لگے جب بیوی خاوند کی خواہش کا احترام

نہ کرے تو خاوند کی زندگی بڑے جبر اور اذیت کے ساتھ گزرتی ہے"

میں نے کہا: "جیسے آمر رعایا کی خواہش کا احترام نہ کرے تو رعایا کی زندگی بڑے جبر اور اذیت کے ساتھ گزرتی ہے۔ اس موضوع پر افسانہ تخلیق کیا جا سکتا ہے۔"

"تخلیق کیا چیز ہے؟"

میں نے جواب دیا: "حقیقت کے اظہار اور اس کی تلاش کا عمل۔ تم چونکہ حقیقت بیان کرنے والی لڑکی ہو اس لئے تم میں افسانہ نویس بننے کے جراثیم موجود ہیں۔"

حقیقت کا اظہار تو فری سپیچ سے بھی ہو جاتا ہے مگر فری سپیچ کہانی تو نہیں کہلا سکتی مثلاً امریکہ میں ایک مجمع عام کے سامنے ایک اشتراکیت پسند لڑکی تقریر کر رہی تھی۔ بولی: کیا تم لوگوں کو معلوم ہے کہ لینن کو بڑی بڑی بھرپور چھاتیاں پسند تھیں۔ بالکل میری چھاتیوں جیسی۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے گریبان کے بٹن کھول دیئے۔ فری سپیچ سے اظہار تو ہو گیا مگر فری سپیچ سے کہانی تو نہیں بن سکی۔"

میں نے کسی قدر اچنبھے سے اس کی طرف دیکھا اور کہا: "فری سپیچ سے کہانی بنے نہ بنے مگر کہانی کے لئے مسالہ تو مل جاتا ہے"۔

"آپ مجھے یہ بتائیں کہ کہانی جنم کس طرح لیتی ہے؟"

"زندگی کی دلکش بے قاعدگیوں کی کوکھ سے۔ قاعدے سے ہٹ کر بے قاعدہ ہو جاؤ۔ کہانی بن جائے گی۔ ابھی تم بڑے قاعدے سے باتیں کر رہی تھی۔ تم نے بے قاعدہ ہو کر اشتراکیت پسند لڑکی کی چھاتیوں کا ذکر کیا تو گویا کہ تالاب میں کنکر پھینک دیا اور تمہارے اپنے جسم کا پورا لب و لہجہ بدل گیا۔"

اس کی آنکھوں میں پھر سورج کا چھلاوا نمودار ہوا۔

"میں نے آپ کو دیکھا نہیں تھا تو میرے دماغ میں آپ اور طرح کے تھے اب دیکھا تو آپ کا چہرہ جلے ہوئے کلاسیکی عاشقوں کا سا ہے جیسے لڑکیوں کی مخلوق نے آپ کو بہت جلایا ہو اور آپ بگلے کی طرح پورے بھگت بنے سب کچھ سہہ جاتے رہے ہو۔"

میں مسکرا کر اتنا کہہ سکا: "تو لکھنے کے لئے تمہیں خام مواد مل گیا۔"

"میں آپ کو کیسی لگتی ہوں کیا میرا ذکر کسی افسانے میں آ سکتا ہے؟"

"آ کیوں نہیں سکتا۔"

دروازے پر دستک ہوئی۔ الفت بولی ''آجاؤ''۔

بیگم الیاس اپنی تمام جلوہ نما چیزوں کے ساتھ ساڑھی چپکائے دروازے میں کھڑی تھی۔ ''الیاس ابھی آئے ہیں۔ کپڑے بدل رہے ہیں۔ ہم کسی کھانے پر مدعو ہیں۔ دیر سے واپس آئیں گے میں نے بیرا سے کہہ دیا ہے ڈرنکس آپ کے لئے موجود رہیں گی''۔

''مگر میں تو نہیں پیتا''۔

''آپ نہیں پیتے میں نہیں مانتی''۔

یہ چند لفظ نکلے تو اس کے منہ سے مگر کمر کی کمانی پہلے ٹوٹی پھر جڑی اور پھر اس طرح سے لچکی کہ اس نے میری نگاہ کے چور کو اپنی پیٹھ کے اتار کے پاس جا کر چھوڑ دیا۔ میں نے دیکھا اس کی پیٹھ کا اتار دو تربوزوں کی ڈھلوانوں میں مدغم ہو رہا تھا۔ دائیں تربوز پر سے ساڑھی نیچے کو کھسکا کر باندھی گئی تھی یا واللہ اعلم باندھنے کے بعد کولہے کے کچھ حصے کو برہنہ چھوڑنے کے لئے ایک طرف سے کھسکا لی گئی تھی جس کی وجہ سے اس کی کمر کے چھلے کا ملگجا خط زیادہ خوشنما اور دلآویز دکھائی دے رہا تھا۔

''تمہاری سوتیلی ماں کو کپڑے خوب پہننے آتے ہیں''۔

''بتائیں وہ اتنی نیچی ساڑھی کیوں باندھتی ہیں؟''

''یہی تو میں سوچ رہا ہوں''۔

''ڈانس کرنے والے کا ہاتھ نشے میں ان کی WAIST LINE پر آ کر رکا رہتا ہے۔ بڑے بڑے افسر ممی کے ساتھ ڈانس کرتے ہیں''۔

''یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ چار بچوں کی ماں ہے''۔

''بانی اور چھلیا ہفتے میں دو مرتبہ مالش کرتی ہیں''۔

''بانی اور چھلیا کون ہیں؟''

''یہ ممی کی TOILET ATTENDENT ہیں۔ ممی غسل کرنے کے بعد شیشے کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ بانی جسم پر تولیہ پھیرتی ہے۔ پھر چھلیا ایک ایک کپڑا پہناتی ہے''۔

مجھے یوں لگا کہ الفت اپنی ممی سے حسد کر رہی تھی اور جیسے یہ سب کچھ بناوٹی تھا۔ اس نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ نوکر آیا تو بولی ''بانی اور چھلیا کو بھیجو''۔

بانہی بنگڑے ہاتھ پیر کی معمر عورت تھی جس کے نقوش بھرے بھرے تھے۔اس کے اٹھے ہوئے گالوں کی ہڈیاں اور آنکھ کے خفیف بھینگے پن نے اس کے چہرے پر ایک عجیب گداز سی مستی بکھیر دی تھی۔ چھلیا کا لباس اس کے جسم پر تنگ ہو رہا تھا۔اس کی مسکراہٹ پراسرار تھی۔اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے جس نے اسے بہت ڈرامائی بنا دیا تھا۔دونوں کی دونوں اپنی قوت کو جھنگڑا ناچنے والوں کی طرح اندر کھینچنے کے بجائے باہر پھینکتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

میں نے صرف دیکھا۔کوئی بات نہ کی۔دونوں اپنے ہونٹوں میں مسکراہٹ کی مٹھاس چوستی ہوئی باہر چلی گئیں۔ان کے مسکرانے سے میرا خیال بری طرح ہزیمت کے راستے پر چل نکلا تھا مجھے کچھ تو بات کرنی چاہیے تھی۔ مجھے یہ میاں لوگ سمجھتی ہوں گی۔الفت کی آواز سے مجھے بڑا دلاسا ہوا" آپ نے ان سے کوئی بات نہیں کی۔"

"کیا بولتا۔" اوپرے سے مسکرا دیا۔

"میں آپ کو مان گئی۔"

"کیسے؟"

"یہ ممی کی نمبر ا ٹنٹی نائن جاسوس ہیں۔ اچھا کیا آپ نے ان سے کوئی بات نہ پوچھی نہ کی۔"

"میں کٹنیوں سے بات نہیں کیا کرتا۔"

"کیسے جانا کہ یہ کٹنیاں ہیں۔"

"تھوڑی سی دنیا دیکھی ہے۔"

الفت بڑے سعادت مند بالکوں کی طرح ہاتھ جوڑ کر اٹھی اور میرے قریب والے صوفے پر بیٹھ کر بولی۔
"مان گئی مگر آپ واقعی ڈرنک نہیں کرتے۔ بیرے کو بلاؤں۔آپ کیا لیں گے؟"

میں نے روک دیا۔

"میں کھانا بھی اسی کمرے میں کھاؤں گا"

"کیوں؟"

"وہ جذبہ مجھ پر اتنا حکم بھی نہیں چلا سکتا جو گوگاں کو دور افتادہ جزائر میں لے جا کر پوری زندگی وہاں گذارنے پر مجبور کر سکتا تھا۔"

"شوقِ فضول"۔ الفت مسکرائی

میں نے رات کو سوتے ہی سیر کا سوچ لیا تھا۔ صبح آنکھ کھلی تو عظیم الشان کوٹھی سے باہر نکل آیا۔ ہاتھ میں ہاتھ کر بڑی پھرتی سے چوکیدار نے صدر دروازے پر سلام کیا۔ میں شمال کی طرف مڑ گیا۔ میں نے دیکھا کوٹھی کی پشت پر نازک نازک پتوں والے پیڑ لگے ہوئے تھے۔ وہاں سے مڑ کر میں کوٹھی کی فصیل کے ساتھ والی سڑک پر ہو لیا۔ فصیل کے نیچے دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بھینس کے گوبر پر لڑ رہی تھیں۔ دونوں نے تسلے اٹھا رکھے تھے۔ ایک کہہ رہی تھی۔ یہ گوبر میں نے پہلے دیکھا ہے۔ دوسری کہتی تھی اس پر پہلے میری نگاہ پڑی تھی۔ یہ میں اٹھاؤں گی۔ میں لمحہ بھر کے لئے رکا اور پھر چل دیا۔ فصیل کے اندر متمول لینڈ سکیپ اور فصیل سے باہر ڈھنڈار افلاس۔ میں سڑک سے مڑ کر کچی پگڈنڈی پر ہو لیا۔ بھٹے سے آگے راستہ اونچا نیچا ہوتا ہوا ایک نالے پر جا کر رک گیا۔ میں اونچی چٹان پر بیٹھ گیا۔

اب کافی دن نکل آیا تھا۔ میں واپس آ رہا تھا اور سوچ رہا تھا جسم اور روح کا تعلق جسم بھی قیامت۔ روح بھی قیامت۔ دونوں بڑے بڑے پاور ہاؤس۔ دونوں میں کروٹیں لیتا سیلاب دونوں عظیم اور پھر یہ دونوں عظیم طاقتیں انسان کو مجبت کرنا سکھاتی ہیں۔

ناشتے کی میز پر الیاس، بیگم الیاس، الفت اور میں نے ناشتہ کیا۔ معلوم ہوا کہ کل شہر میں تین بسیں جلا دی گئیں۔ طالب علموں پر گولی چلی۔ بار بار ان پر آنسو گیس پھینکی گئی۔ صبح صبح جیسے موتیے کا لوٹا پھولوں اور کلیوں سے بھرا ہوتا ہے ایسے ہی صبح صبح قوم کی کلیاں اور پھول سڑکوں پر آ نکلتے اور شباب کی تہوں میں چھپا ہوا کچھ کر گزرنے کا انجان جذبہ بارود کی طرح چاروں طرف پھیل جاتا۔

یا الیاس اور ان کی بیوی کے جاہ و جلال کے تصور اور اس کے ہم خیال دوستوں کی باتوں سے میں یہی اندازہ لگا سکتا تھا کہ دنیا میں ہر جنس کی قیمت ہوتی ہے۔ طالب علم خریدے جا سکتے ہیں۔ حکومت کے پاس آگ بجھانے کا بہت بڑا بریگیڈ ہے۔ اس کو سب گر آتے ہیں۔ درست ہو گا مگر اس ہاں اور نہ کے بیچ کا فن نہایت گھٹیا اور بھونڈا ہوتا ہے۔

جب میں ہوا نا سنگار جلا کر اپنے کمرے میں آ بیٹھا تو اطمینان اور بے فکری نے میرے اردگرد ایک حصار باندھ دیا۔ اور میں نے جاہ و جلال کے ماحول میں اپنے آپ کو اس قدر ناتواں پایا جیسے میری تمام مثبت طاقتیں موم کی طرح پگھل رہی تھیں۔ جیسے کنواری لڑکی سپردگی کے عالم میں سب کچھ بھول کر پگھلنے لگے۔ اچھا

ہوا ہی زیادہ تنہا نہیں رہا۔ اچھا ہوا دروازہ کھول کر الفت اندر چلی آئی۔ فراڈ کا ہمارا یہ ڈھنگ تو بہت قدیم اور روایتی ہے کہ حرم آباد کرو۔ حرم کی تعداد بڑھاتے چلے جاؤ۔ جب حرم سے ملو ہر روزن ہر دریچہ بند کر لو۔ نشہ اترنے پر خمار محسوس ہو تو پھر پیو۔ پیے جاؤ۔ حصار نہ ٹوٹے۔ قلعہ کی ایک اینٹ نہ چٹخنے پائے۔ ممکن ہی نہیں کہ کوئی نہ کودے دمدمے پر دن رات پہرہ ہے۔

الفت کے کھلے بال شانوں پر پڑ رہے تھے۔ اس نے گوگو عینک لگا رکھی تھی۔ تنگ سلیک کے اوپر ریشمی جرسی تھی جس میں سے اس کا سینہ اچھل رہا تھا۔

"میں ایکسر سائز کر کے آئی ہوں"۔

"میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

"آپ میرا نوٹس ہی نہیں لے رہے"

"یہ سگار بہت اچھا ہے"۔

"میں اور لا دوں گی"۔

"میں نے دیکھا ہے۔ اس لباس میں بہت گلیمر ہے"۔

"لباس میں ہے۔ مجھ میں کوئی گلیمر نہیں! آپ افسانوں میں تو بڑی سیدھی بات کرتے ہیں۔ مگر افسانے سے باہر بات گھما کر کرتے ہیں۔ پوچھئے میں کون سی ایکسر سائز کر کے آئی ہوں؟"

"رسی ٹاپی ہو گی"۔

"واہ! ممی نے ایک ایسی ایکسر سائز بتائی ہے جس سے عورت کی چال میں گریس اور دلربائی پیدا ہوتی ہے۔ چلتے وقت گردن یوں اٹھا کر رکھئے۔ ایڑی کو ذرا بے معلوم سا ٹھونکا دیجئے کہ سینہ ہر قدم پر چھلک چھلک اٹھے اس طرح"۔

وہ ایک دیوار سے دوسری دیوار تک گئی۔ پھر واپس آئی۔ خود پیدا کی گئی لرزش سے اس کے سینے چھلکنے لگے۔ پھر وہ قہقہہ مار کر ہنسی اور صوفے پر گر گئی۔ "ایک دفعہ بڑا لطف آیا۔ ایم اے کلاس کی بات ہے پروفیسر نے ایک روز میرے بلاؤز پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ تم اتنا باریک بلاؤز پہن کر کالج نہ آیا کرو۔ میں نے اگلے روز بھی ویسا ہی بلاؤز پہنا۔ پروفیسر نے مجھے ٹوکا۔ میں نے کہا اس میں اعتراض کی کیا بات ہے"۔ تیسرے روز جب میں پھر وہی بلاؤز پہن کر گئی تو پروفیسر نے کلاس لینے سے انکار کر دیا اور واک آؤٹ

مر گیا۔ لڑکوں نے پوچھا" بات کیا تھی"۔

میں نے لکوی کے روسٹرم پر چڑھ کر کہا" پروفیسر کو میرے اس بلاؤز پر اعتراض ہے۔ آپ بتائیں آپ کو اس بلاؤز میں کوئی خرابی نظر آرہی ہے"۔

ساری کلاس چلا اٹھی" کوئی خرابی نہیں۔ پروفیسر احمق ہے"۔

میں بگلے کی طرح پورا بھگت بنا سب کچھ سہہ رہا تھا۔ سنگتروں کے باغ میں آپ مدعو ہوں۔ سنگتروں سے بوٹے لدے پڑے ہوں باغ کا مالک سنگتروں کی رکابی بھر کر آپ کے سامنے رکھ دے آپ کا جی چاہے درختوں سے اتار کر کھانے کو۔ بعض لوگ تو ہاں اور نہ کے بیچ کے فن کو رومان کہتے ہیں۔ بعضوں کے لئے یہ فن گھٹیا اور بھونڈا ہوتا ہے۔ بیگم الیاس کا سراپا بھری برسات کی پھوہار بن کر مجھ پر گر رہا تھا۔ مرد کا یہی اصل عمل ہے کہ اس کا پیچھا کرو جو مل نہ سکے۔

"لو سگار پیئو"۔

الفت نے پیا اور کھانسنے لگی۔ میرا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ اس ہاں اور نہ کے بیچ والے مرحلے سے نکل آئے میں نے سگار کا کش لے کر کہا" مجھے تو اپنی پہلی محبت یاد آرہی ہے"۔

"کون تھی وہ؟"

"مسجد کے ملا کی لڑکی۔ جو ہمارے گھر روٹی لینے آیا کرتی تھی اور تمہاری پہلی محبت؟" "تم بھی بتاؤنا"

"موٹر ڈرائیور۔ جو مجھے سکول لے جایا کرتا تھا"۔

میں نے بڑھاوا دیا" تمہاری محبت میری محبت سے اعلیٰ تھی۔ ملا کی لڑکی کے ہاتھ میں تو ایک بادیہ ہوتا تھا جس میں گھر گھر کا سالن مل کر ایک ملغوبہ بن جاتا تھا۔ اور تمہاری محبت کے ہاتھ میں مرسڈیز بنز کا اسٹیرنگ۔ مشین جو انسان کو چاند پر پہنچا کر چاند کی خاک اڑا دیتی ہے"۔

"ہمارے موجودہ شوفر کو آپ نے دیکھا ہے۔ جو آپ کو ایئرپورٹ سے لایا تھا۔ اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے"۔

"بھلا آدمی لگتا ہے"۔

"بہت بڑا rascal ہے۔ ایک دفعہ ایک پاوندے سے ممی نے کپڑا خریدا۔ اس ڈرائیور کو بھی لے دیا چند دنوں بعد وہ پاوندا پھر آیا۔ بڑا سخت پریشان تھا۔ ممی سے کہنے لگا۔ ایک ہزار کی مجھے ضرورت

ہے آپ قرض دے دیں یا میری لڑکی ڈیڑھ ہزار میں خرید لیں۔ جب ڈیڑھ ہزار دوں گا لڑکی لے جاؤں گا۔ اگلے روز گوری چٹی جوان لڑکی کو لے آیا جس پر ڈرائیور ریجھ پر پڑا اور جھٹ پٹ جا کر کہیں سے ایک ہزار روپے لے آیا۔ ممی نے ڈیڈی سے اجازت لے کر پانچ سو روپے اپنی گرہ سے دے دیئے۔ لڑکی ڈرائیور کی بے نکاحی بیوی بن گئی کچھ دیر بعد جب ہمیں خود ضرورت پڑی تو ممی نے ڈرائیور کو پانچ سو روپے دے کر لڑکی کو فنٹی فنٹی کر لیا۔"

"ہمیں ضرورت آ پڑی سے کیا مطلب؟"

"ڈیڈی کو چھوٹے منصب کے سرکاری افسروں کی تفریح کے لئے ایک نگے لڑکی کی ضرورت آ پڑی۔ ممی نے زرے گل کو چند دنوں کے لئے بانبی اور چھلیا کی تحویل میں دے کر پرفیکٹ کر دیا۔ ممی کی اس دور اندیشی سے ڈیڈی نے تین لاکھ کا بزنس کمایا اور پندرہ روز کے لئے ممی کو پیرس لے گئے۔"

زرے گل مجھے دف و چنگ بجانے والی الف لیلائی کردار معلوم ہوئی۔ میں نے تڑپ کر کہا "مجھے زرے گل دکھاؤ۔"

الفت کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

"زرے گل جس کے پاس گئی اسے پوشیدہ بیماری لگا آئی ممی نے ڈرائیور اور زرے گل کا علاج کرایا پھر زرے گل اس کے باپ کو واپس کر دی۔ پندرہ سو روپیہ واپس آ گیا۔ ڈیڈی کہنے لگے اس سودے میں ہمارا کیا گیا۔"

میں نے سگریٹ کا ایک کش لیا اور فراغت سے سگار کی راکھ جھاڑی یہ سوچتے ہوئے کہ شکر ہے الفت کو کہانی لکھنی نہیں آتی ورنہ اس گھر میں تو کہانیوں کا ڈھیر لگ سکتا تھا۔

میں نے پوچھا "بانبی کا شوہر کہاں ہے؟ چھلیا کس کی بیوی ہے؟"

الفت اپنے شانے سے بال جھٹک کر بولی "کس کی بیوی، کس کا شوہر۔ بانبی کا تعلق ہیڈ بیرے اور پہرہ دینے والے گن مین سے ہے۔ چھلیا کا ممی کے ڈرائیور سے اور خانسامے سے۔ ہمارے کتوں کے ٹرینر کی بھی چھلیا پر نگاہ ہے۔"

"تمہاری ممی کو معلوم ہے؟"

"وہ کہتی ہیں جس گھر میں یہ آسائشیں ملیں نوکر اس گھر سے بھاگتے نہیں۔ اس ڈر کے تو وہ غلام

بن جاتے ہیں۔"

میں نے کش لے کر بچا ہوا سگار ایش پلیٹ میں مسل دیا۔ یا اللہ اس گھر میں کیسی کنفیوژن چھا رہی تھی جس سے میں بیزار بھی تھا اور جس کا مشتاق بھی ـــــ

میں نے کہا۔ "آؤ کوئی اپنی بات کریں۔ رات کیسے کٹی؟"

"الٹے سیدھے خیال آتے رہے۔ سچ سچ بتاؤں۔"

"ہاں۔"

"جی چاہتا رہا آپ کو قتل کر دوں۔ آپ کے تمام افسانوں پر قبضہ جمالوں۔ اپنے نام سے چھپواؤں اور ادیب بن جاؤں۔"

اب کھل کھلا کر ہنسنے کی میری باری تھی۔ میں نے کہا۔ "تمہارا قصور نہیں۔ یہ جو تیرا دیوں پر جاسوسی فلموں کا اثر ہے۔ کیونکہ وہ شارٹ کٹ کے متلاشی ہیں۔"

"اپنی تحریریں دکھاؤں؟"

"آج دیکھنے کا وعدہ تو ہے۔"

چنانچہ دن کا زیادہ حصہ الفت کی پرانی اور نئی تحریروں کو پرکھنے میں گزرا۔ اس کی خاصی پھسپھسی تحریر تھی۔ سوچ سوچ کر مشکل لفظ لاتی اور ان کو جا بیجا استعمال کر دیتی۔ اس کی گفتگو جو چپک ماری تھی وہ اس کی تحریر میں نہ تھی۔ میں کہہ چکا تھا کہ تم میں افسانہ نگار بننے کے جراثیم موجود ہیں اس لئے حوصلہ افزائی کرتا رہا۔ صرف چند منٹوں کے لئے بیگم الیاس ہمارے کمرے میں صرف یہ پوچھنے کو آئیں کہ مجھے کسی قسم کی تکلیف تو نہیں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف کہوں۔ کیسے کہتا کہ بہت بڑی تکلیف یہ ہے کہ آپ نہیں آتیں۔ مجھے اس وقت نہیں بلاتیں جب مالش کرا رہی ہوتی ہیں مجھے اس وقت یاد نہیں کرتیں جب شیشے کے سامنے الف کھڑی ایک ایک کپڑا بدلتی ہیں اور بانبی اور چھلیا حیرت، خوشی اور افتخار سے پری پیکر کے چکنے سنہرے انگ پر نگاریں رولتی پولتی ہیں۔

میری جان پر زیادہ عذاب یہ آیا کہ یادو الیاس الفت اور اس کے اتالیق کو پکچر پر لے گئے۔ بیگم الیاس ہمارے ساتھ نہ جا سکیں۔ ان کو خود کہیں جانا تھا۔

پکچر پر الفت کی تحریروں کا ذکر آیا اور میری طرف سے حوصلہ افزائی کا سن کر الیاس بہت خوش

ہوئے اور انہوں نے بتایا کہ الفت کے پاس مغربی میوزک کے جو ریکارڈ ہیں وہ بھی مجھے سننے چاہئیں تاکہ موسیقی میں بھی مجھے الفت کے ذوقِ سلیم کا علم ہو سکے۔ ان کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ الفت مصوری بھی کرتی ہے۔

رات کو بڑی گہری نیند آئی۔ نور کے تڑکے جب نیند کا سرور انگیز جھونکا آتا ہے اور اس کے بعد غنودگی کی طنابیں ڈھیلی پڑنے لگتی ہیں۔ صبح کا ستارہ اجالے کا نقیب بن کر آتا ہے اور پھر آپ ہی اس اجالے پر فدا ہو جاتا ہے۔ میں نے اپنی پائنتی کی جانب ایک سایہ محسوس کیا۔ خالی دماغ میں نیند بھری ہوئی تھی۔ اور کبھر گئی۔ جسم کا سہلانے والا پروں کی طرح ملائم اور خاموش سیلاب میرے پاؤں کو چھونے لگا۔ میں جیسے نیم خوابی کے عالم میں ساحلِ سمندر پر کھڑا تھا۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میری پائنتی کے قریب مجھے قتل کرنے کے لئے کوئی بیٹھا تھا۔

"تم کون ہو؟"

"میں آپ کے پاؤں دبا رہی ہوں"۔

"مگر تم کون ہو۔ اندر کس طرح آئی ہو؟"

"میں آپ کے لئے بیڈ ٹی لائی ہوں۔ میں خدمت گار ہوں"۔

ایک سلونی سی نوجوان لڑکی میری پنڈلیاں دبا رہی تھی۔ میں نے پاؤں کھینچ لئے اور سائڈ لیمپ روشن کر دیا۔ لڑکی نے بیل باٹم پہن رکھا تھا جس کی سائڈ کے کسے ہوئے ٹیچ بٹنوں کے چرے ہوئے فاصلوں میں کولہوں کا گوشت پھنسا پھنسا دکھائی دے رہا تھا اور ریشمی کرتی کے پیچھے کا لب ولہجہ بڑا تیکھا تھا۔ گردن میں خواہ مخواہ اودے رنگ کا دوپٹہ جھول رہا تھا۔ میں نے پاؤں کھینچ لئے تو وہ میرے پاؤں چھونے کے لئے آگے بڑھی اور بڑھ کر بستر کے کنارے پر بیٹھ گئی۔

"تم کدھر سے آئی ہو۔ کمرا تو اندر سے بند تھا"

"دیوار میں چور دروازہ ہے۔ مجھے اندر بیڈ ٹی جو لانی تھی"

"کل تو تم بیڈ ٹی نہیں لائی تھی"

"میرا لایا تھا مگر آپ سیر کرنے جا چکے تھے۔ میں بی بی الفت کی ملازم ہوں۔ میں چھٹی پر گئی ہوئی تھی مجھے آدمی بھیج کر منگوایا گیا ہے کہ بی بی الفت کے مہمان آئے ہوئے ہیں۔ انہیں تکلیف

ہوتی ہے۔"

وہ صحت سے بھرا ہوا بدن دکھانے کے لئے اٹھ کر کھڑی ہو گئی کہ دیکھو میری اہمیت مجھے آدمی بھیج کر منگوایا گیا ہے۔ میں کیا ہوں۔ پھر وہ اپنی سانولی کلائی پر ایک ایک کر کے اپنی چوڑیاں اکٹھی کرتی رہی اور ساتھ ساتھ دانتوں میں کچھ چباتی رہی۔ پھر آگے بڑھ کر بولی "چائے بناؤں"۔

تبھی تو خوشبو سے معلوم ہوا الائچیاں چبا رہی تھی۔

"میں خود بناؤں گا۔ تم چلی جاؤ۔ کوئی آجائے گا"۔

اس نے میری طرف غور سے دیکھا اور بولی "سائیں اس گھر میں کوئی آٹھ نو بجے سے پہلے نہیں اٹھتا۔ سارا گھر سویا پڑا ہے"۔

اس نے میرے کندھوں کو اپنی مٹھیوں میں دبوچ لیا۔ "آپ مجھ سے ذرا دور ہو کر تو دیکھیں"۔

"تم سے میں نے کہہ دیا ہے۔ وہ ہے تمہارا راستہ۔ اٹھاؤ اپنی چائے اور نکل جاؤ"

وہ چائے کو ہاتھ لگائے بغیر کمرے سے نکل گئی۔

یہ کیا سازش تھی۔ کس نے کی تھی۔ کس کے خلاف تھی۔ یہ جال کیوں بچھایا گیا۔ میں چائے بنا کر چسکیاں لیتا رہا اور سوچتا رہا۔

بات وہی کہ مالک سنگتروں کی رکابی بھر کر سامنے رکھ دے اور آپ کا جی چاہے توڑنے کو درختوں سے اتار کر کھانے کو۔ مالی اور باغبان کو تھوڑا سا چکرا دینے کو۔ میں اٹھا۔ تیار ہوا اور باہر کی ہوا کھانے کے لئے صنعت و حرفت کی اس عالی شان لینڈ سکیپ سے نکل آیا۔ چلتا چلتا نالے کو پار کر کے اونچی چٹان پر جا بیٹھا۔ صبح کی لطیف ہوا میں کتنی تازگی تھی۔ میں سامنے نشیب کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں کی زمین پرانے کھنڈروں کی طرح کہیں اونچی کہیں نیچی تھی۔ میں سگرٹ سلگا کر آہستہ آہستہ کش لینے لگا۔ سامنے والی پگڈنڈی پر بیس برس کا ایک نوجوان لڑکا چلا آرہا تھا اس کے ہاتھ میں ٹاٹ کا ایک تھیلا تھا۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے سلام کیا۔ میں نے جواب دیا۔

اس نے تھیلے میں سے نکال کر ایک پمفلٹ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ "وقت کا تقاضا" جسے طالب علموں کی کسی تنظیم نے شائع کیا تھا۔

"آج پمفلٹ کی تقسیم کا آغاز آپ سے ہوا۔ جناب کی تعریف"۔

"میں قریب ہی سے آیا ہوں۔ صبح کی سیر کر رہا ہوں"۔

"آپ کیا کرتے ہیں؟"

"میں سٹوڈنٹ ہوں۔ اپنی تنظیم کا کارکن ہوں"۔

"ادھر رہتے ہو؟"

"جی۔ وہ رہا میرا گھر۔ خدا حافظ"۔

وہ چلا گیا۔ میں نے پہلے پمفلٹ کو دیکھا، پھر نشیب کی طرف دیکھا۔ گھر کیا تھا، فقط ایک کوٹھڑی تھی۔ نواح میں دو چار درخت کھڑے تھے۔ میں چٹان پر سے اٹھ کر نیچے اترنے لگا۔ درختوں کے پاس ایک سانڈ بندھا ہوا تھا۔ ایک مفلوک الحال عورت چولہے میں آگ جلا رہی تھی۔ کوٹھڑی کے دروازے کے باہر ایک زرد رو نوجوان لڑکی کھٹولی پر نیم دراز تھی۔ چہرے سے معلوم ہوتا تھا جیسے کافی دیر سے بیمار پڑی ہو۔ میں پلیا پر بیٹھ گیا۔ ایک مرد کوٹھڑی سے برآمد ہوا جس نے دس گیارہ سال کے لڑکے کو بازو سے پکڑ رکھا ہے۔ لڑکا کہہ رہا تھا۔ "بے بے، ماسٹر جی فیس مانگتے ہیں۔ کل بھی مار کھائی تھی، پرسوں بھی کھائی تھی"۔

عورت نے بلا کر چولہے کے قریب بٹھا لیا۔ محبت اور دلداری سے کچھ کہنے لگی جو میں نہ سن سکا۔ پھر اس نے چولہے پر سے کاڑھا اتارا، پیالے میں ڈالا اور جا کر بیمار لڑکی کو پلانے لگی۔ لڑکا اپنا ٹاٹ کا بستہ کندھے پر ڈال کر گھر کی پگڈنڈی ہو لیا۔ دوسرے نواحی راستے پر سے ایک شخص بھینس کا رسہ پکڑے نمودار ہوا جس کو دیکھتے ہی لڑکے کے باپ نے آواز دی۔

"او گلزارے۔ اپنی فیس لے جا"۔

گلزارے کے باپ نے آگے بڑھ کر بڑے میکانکی انداز میں بھینس والے سے بھینس کا رسہ پکڑ لیا اور جا کر درخت سے باندھ دیا۔ پھر سانڈ کی پیٹھ پر تھپکی دی اور کھینچ کر قریب لے گیا۔ سانڈ نے بھینس کو آگے پیچھے سے سونگھا اور بے اثر کھڑا رہا۔ گلزارے کے باپ نے بھینس کا رخ بدل دیا۔ سانڈ کو دوبارہ تھپکی دی اور کھینچ کر بھینس کے قریب لے آیا مگر سانڈ بت کا بت بنا کھڑا رہا۔ بیمار لڑکی اس کی ماں اور سکول جانے والا لڑکا اس خاموش عمل کو دیکھ رہے تھے۔ بھینس کے مالک نے رسہ کھولا۔ جس راستے سے آیا تھا اسی پر ہو لیا۔ گلزارے کے باپ کی آنکھ میں سانڈ کے لئے بہت بڑی گالی جھلک رہی تھی مگر وہ کچھ نہ بولا۔

اس نے گلزارے کی طرف دیکھا اور کہا "تو سکول جا گلزارے۔ کل دیدوں گا فیس"۔

چولہے کے پاس بیٹھی عورت سالن سے والا پیالہ دھونے لگی۔ بیمار لڑکی نے سر پہ دوپٹہ باندھ کر کروٹ بدل لی لڑکا گلی ڈنڈی پر ہو لیا۔ اس کا باپ زمین پر بیٹھ کر حقہ پینے لگا اور میں پلیا سے اتر کر اس کے پاس جا پہنچا۔ اس نے مجھے دیکھ کر قریب کی چارپائی پر بیٹھنے کو کہا۔ میں نے کہا " میں اِدھر سیر کرتا ہوا نکل آیا تھا"

"کیا آپ راستہ بھول گئے ہیں ؟"

"نہیں"

مگر دل نے کہا۔ واقعی بھول گیا ہوں۔ واقعی بھول گیا ہوں جو میں نے آج دیکھا ہے کب دیکھا تھا۔

"آپ کا ایک لڑکا ابھی ابھی مجھے راستے میں ملا تھا۔ یہ پمفلٹ اسی نے دیا ہے"۔

وہ میرا بڑا لڑکا ہے سکول میں پڑھتا ہے۔ آج پھر بغیر کچھ کھائے پیئے نکل گیا ہے"۔

"کچھ تو کھا جاتا۔ ایسی کیا جلدی تھی"۔

یہ سن کر وہ آدمی لمحہ بھر کے لئے خاموش ہو گیا۔

"بس لڑکے آج کل جلوس نکالنے میں لگے ہوئے ہیں۔ صبح صبح ہی گھر سے نکل جاتے ہیں"۔

"دوسرا لڑکا بھی کچھ کھا کر گیا ہے یا نہیں ؟" میرے لہجہ میں بڑی اپنائیت آ گئی تھی۔

"چائے کے ساتھ باسی روٹی کھا گیا ہے"۔

میرے اپنائیت کے لہجے سے وہ کچھ حیران سا ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔

" میں وہاں پلیا پر بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ بھینس گم ہونے کے نے آئی تھی۔ سانڈ اس سے مس نہ ہوا۔ آپ کا کتنا نقصان ہوا ؟"

" پانچ روپے کا"

" مل جاتے تو اچھا ہوتا۔ لڑکا اپنی فیس ہی لے جاتا۔ اسے آواز دے کر روکا تو تھا۔ مگر بھینس کو الانچیاں چباتے سونگھ کر سانڈ پیچھے ہو گیا"۔

"جی ہاں!"

میری ہمدردانہ رازداری سے اس شخص کی آنکھوں میں ایک کرن سی چھوٹی اور اس کے ہونٹوں میں سے دردمندی اور ملنساری کی مسکراہٹ جھانکنے لگی۔

" صاحب جی گزارہ نہیں ہوتا۔ فاقے بھی کرنے پڑتے ہیں۔ بچوں کو پڑھانا بڑا مشکل ہے۔ میں کیا

دکھ بتاؤں آپ کو۔ دکھ بتانے کے لئے نہیں ہوتا سہنے کے لئے ہوتا ہے۔" اس نے یہ بات اس لہجہ سے کی کہ مجھے بڑا حوصلے والا شخص معلوم ہوا۔ میں نے دوبارہ اس کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ حقہ لئے یوں اعتماد سے بیٹھا تھا جیسے زمین کی تمام حاملہ مٹی اس کے پاؤں کے نیچے اکٹھی ہو گئی ہے اور وہ اس طرح سے تمام زمین کا واحد نمائندہ بن گیا ہے۔ پھر میری نگاہ چولہے کے سامنے بیٹھی لو اس عورت کی طرف سے ہو کر بیمار لڑکی کی کھٹولی کا چکر لگا کر چارہ کھانے والے سانڈ پر آ کر رک گئی جو اس گھر کا واحد کفیل تھا۔ اور کل کے بننے والے کفیل دو نونہال جو گھر سے خالی پیٹ روانہ ہو چکے تھے حیاتِ جامد کی طرح میرے خیال کے سامنے جم کر کھڑے ہو گئے

حیاتِ جامد کے استرار اور انسانی جذبات کی تجریدیت میرے آگے پیچھے بکھری پڑی تھی۔ یہ العنت کی پینٹنگز تھیں جو مجھے دکھا رہی تھی۔ ایک تصویر بپھرے ہوئے سانڈ کی تھی جس کی پیٹھ پر نیم برہنہ عورت گری پڑی تھی اور سانڈ سینگ زمین کی طرف کئے سرپٹ دوڑے جا رہا تھا۔

"اس کا نام؟" میں نے پوچھا۔

بولی۔ "عورت اور سانڈ۔"

پھر وقفہ کے بعد بولی: "سانڈ نسل کشی اور طاقت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ قدیم زمانہ میں اس کی پرستش کی جاتی تھی۔"

ٹیڑھی ترچھی لیٹی ہوئی نیوڈ تصویر دیکھتے ہوئے میں نے پوچھا: "یہ نقل ہے یا لائف۔"

"لائف"

"تمہیں سبجیکٹ کہاں سے ملا؟"

"یہ میری خادمہ ہے جو صبح آپ کے کمرے میں بیڈ ٹی لائی تھی۔"

"میں نے پہلے نہیں دیکھا اسے۔"

"یہ رخصت پر تھی۔ میں نے آدمی بھیج کر منگوایا ہے۔"

"کیوں؟"

"بیچاری کی توہین کرانے کو۔"

"توہین کرانے کو"

"صبح آپ نے بہت تعریف کی۔"

"میں نے !!!"

میں تاڑ گیا کہ میں سازش میں ملوث ہو چکا۔ لگ گیا مجھ پر الزام بدمعاشی کا۔ بن گیا ٹکو۔ ہو گئی رسوائی۔

"آپ اتنے کنجوس کیوں ہیں کہ آپ نے اس کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔ کوئی توجہ ہی نہیں دی حالانکہ وہ آپ کے بیڈ پر بیٹھی۔ اس نے آپ کے پاؤں دبائے۔ کندھے پکڑے۔ آپ نے اسے چھوا تک نہیں اور الٹا کمرے سے باہر نکال دیا۔"

میں نے دل میں شکر ادا کیا کہ سازش سے مس نہ ہوا۔ میں نے پوچھا "تم نے چھپ کر دیکھا تھا۔"

"جی نہیں۔" بیچاری کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے آکر پہلے ممی کو سارا حال بتایا پھر میرے پاس آکر مجھے بتایا۔

"ممی نے اسے تیار ہو کر کے بھیجا تھا۔"

"کیوں ؟"

"ممی کہتی تھی بغیر رشوت کچھ نہیں ہوتا۔ چاہے کوئی بھی ہو۔"

ایک وقفہ تھا خاموشی کا جس میں میں لرلانہ وہ بولی۔ جیسے برقی پاور کے رک جانے سے فریجیڈیئر ٹھہر جائے۔

"ممی آپ سے کہنا چاہتی تھی کہ آپ ہر مہینے الفت الیاس کے نام سے ایک کہانی کسی اچھے رسالے میں چھپوا دیا کریں اور تین سو روپے فی کہانی لے لیا کریں اور جب تفریح کرنی ہو الیاس پیلس آ جایا کریں۔"

یا اللہ اس پیلس میں کس طرح کی کنفیوٹی برس رہی تھی۔ انسان کو تولنے پرکھنے کے کون سے باٹ برتے جا رہے تھے۔ کس نفس کی برات چڑھی ہوئی تھی۔ کس دولت اور تمول کا سیلاب تھا جو مثبت قدروں کو للکار رہا تھا۔

میرے اندر سے آواز آئی۔ ایسی تیسی تمہاری۔

"آپ خاموش کیوں ہو گئے ؟"

"میں سوچ رہا ہوں کہ تمہاری ممی جب مجھ سے یہ بات کرے گی تو میں کیا کہوں گا۔ ان کی میٹھی آواز۔ ان کی رعنائیاں، ان کی خوشبو، ان کا گلیمر مجھ پر پھوہار بن کر برسنے لگے گا۔"

الفت کے اندر سے اطمینان کی سانس نکلی، خوشی سے بولی "آپ کا میری تصویروں کے متعلق کیا خیال ہے؟ ڈیڈی ایک سال کے لئے مجھے پیرس بھیجنا چاہتے ہیں وہاں کی آرٹ گیلریوں میں گھوموں۔ وہاں کے مصوروں سے ملوں۔"

"تم ضرور جاؤ۔ وہاں کے مصور جو رات کو جاگتے اور دن کو سوتے ہیں تمہیں بہت کچھ سکھائیں گے جو تم پاکستان میں نہ سیکھ سکو گی۔"

وہ بولی "مجھے ان ہی شکل والے مصوروں میں رہنے کا بڑا شوق ہے۔"

میرا جی یہ بھی کہہ دینے کو چاہا کہ لمبی زلفوں اور داڑھیوں والے یہ مصور تمہیں پہلے بڑے مزے مزے سے نوچیں گے پھر اسی طرح چھیڑ ڈالیں گے جس طرح مہنت اور رساد ھو تیرتھوں پر آنے والی استریوں کو اپنی لمبی لمبی لٹوں اور داڑھیوں کے سایہ میں چھیڑ ڈالتے تھے اور کوئی سورداس اس پانچ خصمن والی رانڈ کا سانڈ گلے سے آدھا ننگا اور نشے میں پورا دھت گھٹیا ریکٹر کے چرس کے بدبودار دھوئیں سے بھرے سٹوڈیو کی سیڑھیوں پر بیٹھا لیٹنے پکڑنے اور مروڑ ڈالنے کے ٹیرالاپ رہا ہوگا اور تو اس ماحول میں اپنے غریب ملک میں تیار ہونے والی موم کی طرح پگھل رہی ہوگی اور تیری ممی کلب میں آنے والے سرمایہ دار خاندانوں کے نمائشی کنوارے لڑکوں کو تمہارے بر کے لئے دل ہی دل میں منتخب کر کے مسترد کرتی رہے گی۔ اور اپنے سرکل میں بڑی نخوت و تمکنت سے کہے گی۔ الفت پیرس میں آرٹ سیکھ رہی ہے۔

بیرا کافی لے کر آیا تو میں نے پوچھا "آج کی خبر کیا ہے؟"

"دو دفعہ گولی چلی ہے۔ سنا ہے طالب علموں نے ایک پٹرول پمپ کو آگ لگادی ہے۔ بسیں جلادی ہیں۔ شہر میں مکمل ہڑتال ہے۔"

رات کو بستر پر لیٹا تو طبیعت میں ایک اضمحلال تھا۔ سگار کا جو لطف آنا چاہئے تھا وہ نہ آیا۔ اخباروں کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو ایسے لگا جیسے خبروں میں سچائی کی بو باس نہ ہو۔ میں صبح والا پمفلٹ دیکھنے لگا۔ خون تازہ رکھنے والے اے نوجوان طالب علمو! اب آپ لوگوں کو ایک نیا سماج تعمیر کرنا ہے جس کے لئے جدوجہد کرنی ہوگی۔ اس جدوجہد کا مطلب ایسا عمل ہے جو سب سے زیادہ افضل باوقار اور بلند ہے۔ اس عمل کو جاری رکھنے کے لئے خاص خصوصیات ضروری ہوتی ہیں ان میں سب سے زیادہ اہمیت نظریہ کی سچائی پر یقین کو حاصل ہے۔ کسی کارکن کو یہ یقین کہیں باہر سے حاصل نہیں ہوگا بلکہ وہ اس کی ذات

میں سے پھوٹے گا جس کے لئے آپ کو قربانیاں دینی پڑیں گی۔

یاد رکھو۔ پاکستان کا موجودہ نظام روپے سے پیسوں پر چلنے والی گاڑی میں سوار ہے جس نے غریب کو غریب تر بنا دیا ہے۔ اس نظام سے صرف سرمایہ داروں کو فائدہ پہنچا یا ہے اس لئے ملک کے ارتقائی عمل میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا ہے۔

نئے پاکستان کی تعمیر کے لئے ہمیں تیئس سال سے جمع شدہ ملبے کو آگ لگانی پڑے گی غربت اور جہالت کو دور کرنے کے لئے جدوجہد۔ ۔ ۔ ۔

مجھے نیند آنے لگی۔

صبح آنکھ کھلی تو بستر سے یوں تیار ہوا جیسے ٹرین پکڑنی ہو۔ یہ بھی ڈر تھا کہ بیگم الیاس نئی نار کو کوئی نئی پٹی پڑھا کر اندر نہ دھکیل دے۔

اپنے سیر کے راستے پر سے ہوتا ہوا نالے کو پار کر کے اونچی چٹان پر جا پہنچا۔ پتلونوں والے نوجوان لڑکے ادھر سے ادھر جا رہے تھے۔ کوٹھڑی سے باہر چند لوگ جمع تھے۔ میں نیچے نشیب میں اتر گیا۔ مفلوک الحال عورت ہاتھ اٹھا اٹھا کر بین کر رہی تھی۔ وہ ایک چارپائی کے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی تھی جس پر ایک نعش پڑی تھی اور اس پر ایک میلا سا کپڑا۔ میں نے ایک پتلون والے لڑکے کو بلا کر پوچھا۔ "کیا ہو گیا ہے"؟

"ہمارا ساتھی سٹوڈنٹ کل شام پولیس کی گولی سے شہید ہو گیا۔ وہ اس کی ماں ہے جو بین کر رہی ہے وہ اس کا باپ ہے جو خاموش بیٹھا ہے۔ وہ مرنے والے کا چھوٹا بھائی ہے"۔

مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے زمین کی تمام حاملہ مٹی بانجھ ہو گئی۔

مرنے والے کے باپ کی نگاہوں میں گہری اداسی کی زردی اور ٹھنڈی راکھ کی آمیزش تھی۔ میں اس کی طرف بڑھا لوگ میری طرف دیکھنے لگے مرنے والے کا باپ میرے گلے میں ہاتھ ڈال کر بلوں دھاڑیں مار کر رونے لگا، جیسے میرا اس کا واقف ہو۔ مجھے یوں لگا جیسے حصار ٹوٹ گیا ناقابل تسخیر قلعہ کی کھائی میں خون بہے جا رہا ہے جو اذیت ناک دکھڑے رو رہا ہے۔ یہ ماتم اور سوگواری کی ایسی فضا تھی جسے غربت اور مظلومیت مزید لتاڑے جا رہی ہو۔ خدایا کیا تجھے اسی مفلس پر بجلی گرانی تھی۔ میں مرنے والے کے باپ کو ایک طرف لے گیا۔ میرا ہاتھ آپ ہی آپ پتلون کی جیب کی طرف گیا۔ میں نے بٹوا نکال

کر سو روپے کا نوٹ اس کو دیتے ہوئے کہا۔ "تمہارے پاس جو ہوگا سو ہوگا۔ یہ تمہاری ضرورت کا وقت ہے۔ اپنے پاس رکھ لو۔"

دو نوجوان طالب علم بیچ میں آکر بولے۔ "جی نہیں۔ آپ کی نوازش۔ دفن کفن کا انتظام ہماری تنظیم کر رہی ہے۔"

اس پر اعتماد لہجہ کے ساتھ یہ دو نوجوان بول رہے تھے یا مرنے والے کی روح تمام اطراف میں بکھر گئی تھی۔

انہوں نے میری طرف یوں دیکھا جیسے میں مفاد پرست غنیم کا ایجنٹ تھا۔ اگر وہ یہ جان لیں کہ میں الیاس پیلس سے آیا ہوں تو میرے ایجنٹ ہونے میں کیا شک رہ جائے گا۔ میں نے اپنی دوسری ہپ پاکٹ میں اڑسا ہوا ان کی تنظیم کا پمفلٹ نکال کر دکھایا اور دردمندی سے کہا۔ "شہید ہونے والے نے کل یہ مجھے دیا تھا۔"

درد کے اس باہم رشتے سے میرے ذہن کے دریچے کھلنے لگے اور فیصلہ کرنے کی طاقت، وقت اور فضا کی سوگواری میں یکسر جذب ہو کر رہ گئی۔ اب الیاس پیلس کی طرف میرے قدم نہ اٹھے۔ میں ایئرپورٹ کی طرف چل دیا۔ منضبط نظام کی کسی ہوئی تمام پرانی طنابیں ڈھیلی پڑ گئیں۔ معاشرے کے اندر کی جیسے کوئی چیز ٹوٹ گئی۔

پہاڑوں کی برف

احمد ندیم قاسمی

میں نے قلم کو کاغذ پر جھکایا ہی تھا کہ آواز آئی: "بے بی بی۔ خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے۔ تیرا بچہ جیوے!"

میں نے قلم کو واپس قلم دان میں رکھ دیا۔ اگر اس قلم کی قیمت چالیس پچاس روپے نہ ہوتی تو میں اسے یقیناً بیٹخ دیتا۔

صبح سے بارہ ایک بجے تک کی سوچ بچار کے بعد مجھے مزے کا ایک فقرہ سوجھا تھا، مگر بھکارن کی آواز نے اسے یوں نوچ لیا تھا جیسے پھونک مارنے سے چراغ کی لَو غائب ہو جاتی ہے۔

کیا بھلا سا فقرہ تھا! میرے افسانے کا یہ پہلا ہی فقرہ قاری کے ذہن کو جکڑ لیتا۔

ملازم مکان کی تیسری منزل میں تھا۔ بھکارن کی آواز اس تک شاید نہ پہنچ سکی تھی ورنہ میری ہدایت کے مطابق بھکارن کو اس کی طرف سے "دفع ہو جانے" کا مشورہ فوراً ملتا۔ بھکارن بھی ایک ہی آواز لگا کر شاید چل دی تھی۔

یکایک کھوئے ہوئے فقرے کے چند الفاظ گڈمڈ صورت میں میرے ذہن میں ابھرے۔ ایک جلتی ہوئی دیا سلائی بجھے ہوئے چراغ کی طرف بڑھی ——— اس کا رنگ پہاڑوں کی برف کی طرح صاف تھا ——— مگر نہیں میں نے برف کے رنگ میں کوئی اور رنگ بھی ملایا تھا۔ لالۂ صحرائی کا رنگ، یا شاید شفق شام کا رنگ، یا ممکن ہے ———

"بے بی بی۔ خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے۔ تیرا بچہ جیوے!"

تو وہ کم بخت ابھی تک وہیں۔ نیچے صدر دروازے میں کھڑی تھی!

دیا سلائی دھوئیں کی ایک منحنی لکیر چھوڑ کر بجھ گئی اور میں پکارا۔ "بیبیاں گھر میں نہیں ہیں۔"

"بی بی نہیں تو بابو، تو ہی خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے۔ ہے سخی، تیرا بچہ جیوے۔"

میں خاموش رہا۔ بھکاریوں سے زبان لڑانا میرا شیوہ نہیں۔ ان کے پاس سب سے بڑی دلیل بھوک کی ہوتی ہے، اور مجھے اس دلیل کا کبھی کوئی جواب نہیں سوجھ سکا۔

کچھ دیر کے بعد ذہن کی دھند میں حرکت پیدا ہوئی اور افسانے کا ابتدائی فقرہ جیسے آنکھیں ملنے لگا ———

اس کا رنگ پہاڑوں کی برف کی طرح ———

"دے دے نا سخی۔ ترُبی دے دے نا" آپ کے بھکارن کی آواز جیسے میں میرے سر پہ گونجی۔ میں نے دیکھا تو وہ میرے کمرے کے دروازے میں یوں کھڑی تھی کہ اس کا پورا دھڑ باہر سیڑھی پہ تھا۔ مجھے اس کا صرف ہاتھ نظر آیا جس سے اس نے کواڑ کو پکڑ رکھا تھا۔ اس ہاتھ کا رنگ پہاڑوں کی برف کا سا تھا چمکتا ہوا سفید، مگر کہیں کہیں ہلکی سی نیلاہٹ دیتا ہوا۔ یہ شاید اس کی رگوں کا رنگ تھا۔ مگر اس کے ناخنوں نے مجھے زیادہ سوچنے کی مہلت نہ دی۔ یہ ناخن میل سے اٹے ہوئے تھے اور کٹے پھٹے اور دندانے دار تھے۔ پھر میرے دیکھتے دیکھتے اس کی انگلیوں میں ایک نہایت متوازن حرکت پیدا ہوئی ——— تو یہ ایسی بے فکری بھکارن ہے کہ بھیک ملنے تک کا وقت گزارنے کے لئے کواڑ پہ ڈھولک بجانے لگی ہے! ——— کیا ایسوں کو بھیک دینا جائز ہے؟ —— مگر کیا اتنے سفید ہاتھوں کو بھیک مانگنے پر مجبور کر دینا جائز ہے؟ ——— لیکن کیا ہر مجبوری جائز ہو سکتی ہے؟ ———

میں نے تکیئے کے نیچے سے ایک آنہ اُٹھایا اور بولا: "یہ لے"

وہ بولی "اِدھر پھینک دے بابو"

نہ جانے مجھے اس بھکارن کے طرزِ عمل پہ غصہ سا کیوں آنے لگا تھا۔ میں نے آنہ پھینکنے کی بجائے پٹخ دیا۔ یہ آنہ کواڑ پہ بج کر کمرے کے اندر، دہلیز سے کوئی ایک گز کے فاصلے پہ رُکا۔ بھکارن نے سیڑھی پر سے ہی جھک کر ہاتھ بڑھایا۔ یوں اس کے چہرے کا ایک رُخ بھی میرے سامنے آ گیا۔ مگر یہ سب کچھ ایک سیکنڈ کے تیسرے حصّے میں ہوا۔ یوں لگا جیسے بجلی سی میرے کمرے میں کوند کر اُڑ گئی ہے۔ مجھے دروازے تک پہنچنے میں کل دو سیکنڈ لگے ہوں گے مگر سیڑھیاں خالی تھیں۔ میں پلٹ کر تیزی سے گلی میں کھلنے والی کھڑکی کے پاس آیا۔ وہ گلی کے نکڑ پر جا رہی تھی۔ پاؤں سے ننگی تھی جیسے سُرخ رنگ کی شلوار پر اس نے سیاہ رنگ کی گھیرے دار قمیص پہن رکھی تھی، اور اس کے سر اور سینے پر شلوار ہی کے رنگ کی چادر پھیلی ہوئی تھی۔ پھر وہ دوسری گلی میں مڑ گئی۔

بھکارن کے چہرے کی ایک رُخی جھلک نے مجھے اپنے افسانے سے ہٹا کر یونانی صنمیات کی دُنیا میں لا ڈالا۔ وینس اور سائیکی اور افرودائیٹ ——— ہر اساطیری خاتون کے ساتھ یہ چہرہ مماثل ہو جاتا تھا۔ یہ چہرہ، جو صرف ایک رُخ سے میرے سامنے آیا تھا، اور جتنی دیر میں "سامنے" کا لفظ بولا جا سکتا ہے، غائب ہو گیا تھا۔ اس اڑتے ہوئے لمحے میں میرے ذہن نے اس چہرے کی کتنی تفصیلیں محفوظ کر لی تھیں۔ پتلی اور بے حد سیاہ بھویں۔ موٹی اور بے حد سیاہ آنکھیں۔ لمبی اور بے حد سیاہ پلکیں۔ ستواں ناک میں نتھنوں کا بے حد خفیف ابھار۔ بے حد سُرخ ہونٹ۔ بے حد نکیلی ٹھوڑی۔ بے حد سفید گال۔

بالکل پہاڑوں کی برف کی طرح۔

پھر مجھے اپنے آپ پر ہنسی آنے لگی۔ دراصل یہ سب کچھ اس ذہنی فضا کا نتیجہ تھا جو میں نے اپنے افسانے کا آغاز کرتے ہوئے قائم کر لی تھی۔ انسان بھی کتنا بے اختیار جانور ہے! اس پر خود اپنے ذہن کا جبر کتنا شدید ہوتا ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ میں قلم اٹھا کر افسانے کا پہلا کھویا ہوا فقرہ ڈھونڈنے لگا۔

مگر چراغ کی بجھی ہوئی لَو پہلے کسی کو ملی ہے جو مجھے ملتی! ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میں افسانے کا پہلا فقرہ نہ لکھ سکا تو ایک یہی افسانہ کیا، میں کبھی کوئی افسانہ نہیں لکھ سکوں گا جیسے یہی ایک کھونٹی تھی جس پر مجھے اپنے خیالوں کا سارا پشتارا اٹھا ٹانگنا تھا، اور اب یہ کھونٹی ٹوٹ گئی ہے تو میرا ہر خیال پتھر بن گیا ہے اور میں پتھروں کے اس بوجھ تلے دوہرا ہوا جا رہا ہوں۔

پھر ردی خریدنے والے نے گلی میں ایک سانس میں کوئی بیس الفاظ کا فقرہ نہایت کراری آواز میں ادا کیا اور مجھے اس پر غصہ آ گیا۔ یہ ردی والا پچھلے کئی برس سے ہر روز ایک دو بار اس گلی میں سے گزرتا تھا اور میرے مکان کے سامنے ضرور رُکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں پڑھنے لکھنے والا آدمی ہوں، اور ایسے آدمیوں کے ہاں ردی بہت عام مل جاتی ہے۔ میں اس آواز کا عادی تھا۔ افسانہ لکھتے ہوئے بھی میں نے یہ آواز کئی بار سُنی تھی اور میرے افسانے کی روانی میں اس نے کبھی کوئی مداخلت نہیں کی تھی۔ مگر آج مجھے ردّی والے پر اتنا غصہ آیا کہ میں قلم رکھ کر اُٹھا۔ کھڑکی میں سے نہایت قہر آلود نظروں سے دیکھنا چاہا مگر میری نظر سب سے پہلے گلی کے نکڑ پر پڑی اور مجھے پہلی بار تجربہ ہوا کہ تصور محسوس بھی ہو سکتا ہے ـــــ بھکارن دوسری گلی میں مڑ رہی تھی۔

میں جیسے اس کے تعاقب میں بھاگا۔ میں کتنی گلیوں اور سڑکوں کو طے کرتا ہوا نہ جانے کہاں جا رہا تھا۔ نہ جانے میں ٹریفک سے کیسے بچا اور چوراہوں کو کیسے پار کیا۔ نہ جانے میں نے کتنے سگرٹ کب جلائے اور کہاں پھینکے پھر جب میں مال روڈ کے ایک چوک میں ٹریفک سگنل کی سُرخ بتی دیکھ کر رُکا تو مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میں کہیں جا رہا ہوں۔ میں کہاں جا رہا ہوں؟ "کیوں بھئی میں کہاں جا رہا ہوں؟" میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔

میں عشق کے سب مرحلوں اور تمام منزلوں سے آگاہ ہوں۔ میں ذرا ذرا سی بات پر رو بھی دیا ہوں اور بڑے بڑے دُکھوں کو پی بھی گیا ہوں، مگر مجھے ایسی وحشت کا تجربہ کبھی نہیں ہوا تھا کہ ایک میلی کچیلی، بدبُودار اور اُجڈ بھکارن کی صرف ایک نیم رُخی جھلک نے میرے خون کو کھولاؤ کے نقطے پر پہنچا دیا ہے اور میں وہاں جا رہا ہوں جہاں سے اگر واپس نہ آ سکوں تو شہر کے بچے مجھ پر پتھراؤ کریں۔ تو کیا یہ سچ ہے کہ ہر انسان میں تھوڑا سا جنون ضرور ہوتا ہے، مگر میرا یہ

جنون کیا کم ہے کہ جب لوگ دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہے ہوتے ہیں تو میں افسانہ لکھ رہا ہوتا ہوں۔ اور جب میرے احباب شراب پی رہے ہوتے ہیں تو میں سوچ رہا ہوتا ہوں کہ ان کے لاشعور میں کس قیامت کے رن پڑ رہے ہوں گے۔ مجھے جنون کی اسی مقدار پر قانع رہنا چاہیئے۔

میں گھر لوٹ آیا میں نے رات کا ایک بہت بڑا حصہ اپنے لیٹے ہوئے افسانے کا فقرہ سوچنے میں کاٹا مگر جہاں پہاڑوں کی برف میرے ذہن میں آئی، وہیں بھکارن نے سیڑھی پر سے ہاتھ بڑھا کر آنہ اُٹھا لیا اور کشتِ خیال میں یونانی اصنام کے چہروں کی ندیاں امڈ پڑیں۔

میں صبح کو یوں بروقت اٹھا جیسے رات پوری نیند سویا ہوں۔ پھر اپنے کمرے میں اس اہتمام سے آ بیٹھا جیسے سورج کے نکلتے ہی دوپہر ہو گئی ہے اور بھکارن اب آئی ہی ہوگی۔ اس مسئلے پر دیر تک میرے اور میرے ذہن کے درمیان خاصی تلخ بحث ہوتی رہی۔ میں کہتا تھا کہ دیکھو تو۔ میرے ہاتھ میں قلم ہے۔ میں تو افسانہ لکھنے بیٹھا ہوں، مگر میرا ذہن کہتا تھا کہ نہیں۔ "تم جھوٹے ہو۔ تم تو بھکارن کا انتظار کر رہے ہو۔ اُس وقت تو میں نے اُلٹا اپنے ذہن کو جھوٹا ثابت کر دیا تھا، مگر جب دوپہر کو بھکارن آئی تو مجھے معلوم ہوا کہ میں اسی کا منتظر ہوں

آواز آئی "ہے سخی۔ خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے۔ تیرا بچہ جیوے۔"

اور میں نے سوچا کہ کیا کسی شاعر نے کبھی اس سے بہتر شعر بھی کہا ہے؟

عجیب بات ہے کہ نہ تو پلنگ پر سے کود کر اُٹھا اور نہ قلم کو قلمدان میں رکھا۔ میں نے بڑے ٹھنڈے انداز میں صرف اتنا کہا۔ "ارے تُو آج پھر آ گئی؟"

اس پر مجھے لگا جیسے وہ ہنسی ہے۔ نہایت مختصر مگر نہایت سُریلی ہنسی۔ جیسے چینی کی پیالی کو چینی کی پیالی چھو جائے۔ پھر وہ میرے کمرے کے دروازے پر سے بولی "بابو تیرا بچہ جیوے۔"

میں نے دیکھا تو وہ میرے کمرے کے دروازے میں یوں کھڑی تھی کہ اس کا پورا دھڑ باہر سیڑھی پر تھا۔ مجھے اس کا صرف ایک ہاتھ نظر آیا جس سے اس نے کواڑ کو پکڑ رکھا تھا۔ اس ہاتھ کا رنگ پہاڑوں کی برف کا سا تھا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کل سے یہیں کھڑی ہے۔ وہ ازل سے یہیں کھڑی ہے۔

یکایک میں ڈرا کہ کہیں وہ کواڑ پر ڈھولک نہ بجانے لگے۔ کل میں نے اس کی انگلیوں کی متوازن حرکت سے اپنی شدید ہتک محسوس کی تھی۔ بھیک اتنی بے نیازی سے نہیں مانگی جاتی۔ بھکارن کو بھیک سامنے آ کر مانگنی چاہیئے۔ طوالفوں تک نے اپنے لیے اخلاق کا ایک ضابطہ مقرر کر رکھا ہے۔ بھکارن کو کم از کم بھیک مانگنے کا سلیقہ آنا چاہیئے۔

سوشامداس کی بے نیازی کو شکست دینے کے لئے، یا گزشتہ آٹھ پہر کی بھڑکی آگ کو بجھانے کے لئے، یا یونہی بے ارادہ میرے مُنہ سے نکلا: "لے ۔ لے جا۔"

"لا" وہ بولی: "اللہ تجھے بہت دیوے سخی ۔ اللہ تیرا بچہ جیوے سخی ۔"

ایک دم وہ ساری کی ساری اندر آ گئی۔ میں اپنے حکم کی اتنی بھرپور تعمیل کے لئے بالکل تیار نہیں تھا۔ میں نے ایک آنہ اتنی تیزی سے اس کی بے حد گلابی ہتھیلی پر گرا دیا جیسے وہ آنے کے انتظار میں ذرا دیر اور اسی طرح میرے سامنے کھڑی رہی تو میں کھڑکی میں سے کُود جاؤں گا۔

مگر وہ آنہ لے کر بھی اسی طرح کھڑی رہی۔ میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ شیلف پر رکھے ہوئے مٹی کے ایک کھلونے کو دیکھ رہی تھی۔

میں نے اس ایک لمحے میں اس کے سراپا کا اس نظر سے جائزہ لیا کہ کوئی خامی نظر آئے تو اسے اپنے ذہن میں سے نوچ کر پھینکنے میں آسانی ہو، مگر یکایک اس نے میری طرف دیکھ کر پوچھا: "ہرن ہے؟"

میں نے کہا: "نہیں ۔ ہرنی ہے۔"

وہ بے اختیار چینی کی پیالیوں سے چینی کی پیالیاں بجاتی دروازے میں سے نکل گئی۔

میں تیزی سے کھڑکی میں آیا۔ وہ ایک آنے کو بچوں کی طرح اچھالتی اور جھپٹتی ہوئی جا رہی تھی۔ پھر وہ دوسری گلی میں مڑ گئی۔ عورت فطرت کی نہایت خوب صورت تخلیق ہے مگر حسنِ تخلیق کی داد کا بھی ایک قرینہ ہوتا ہے۔ نوشگفتہ پھول کو دیکھ کر ہمارے احساسات کو ایک انگڑائی سی آتی ہے اور ہم آگے بڑھ جاتے ہیں۔ شفق میں رنگے ہوئے بادلوں کو ہم بار سے دیکھتے ہیں اور اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ رات کو چھت پر گرتی ہوئی بوندوں کی موسیقی چند لمحوں کے لئے ہمیں آسمانوں سے اترا ہوا سازینہ معلوم ہوتی ہے اور پھر ہم سو جاتے ہیں۔ میں نے خوب صورت عورتوں کو بھی ہمیشہ اس قرینے سے دیکھا ہے۔ حسن کی طرف ذرا سی زیادہ توجہ دیجئے تو پھر آپ کسی اور طرف ذرا مشکل ہی سے متوجہ ہو سکیں گے۔ مگر جب کوئی حسن زبردستی اتر آئے تو زندہ رہنے کی دو ہی راہیں باقی رہ جاتی ہیں۔ یا تو حسن سے نفرت کرنے لگو اور بھیڑیئے کی طرح مار مار کر کھاتے ہوئے مر جاؤ، یا پھر دنیا کے دوسرے تمام کاموں سے ہاتھ کھینچ لو اور سمندر کے ساحل کی سی زندگی گزارو کہ وہ فقط ایک کام کرتا ہے۔ وہ سمندر کے مچلتے ہوئے حسن کے لئے اپنا آغوش ہر لمحہ کھولے رکھتا ہے۔ کبھی کبھار موجیں اسے چند سیپیاں دے جاتی ہیں، مگر پھر ایک اور موج آتی ہے اور ان سیپیوں کو بھی سمیٹ لے جاتی ہے۔ اس کے باوجود ساحل کا آغوش ازل سے کھلا ہے اور ظاہر ہے کہ اس یکطرفہ کاروبار میں کوئی

قرینہ نہیں ہے۔

یہ سوچ کر جس کی یہ سوچ مجھے بھی ساحل کی سی افتادگی کی طرف لیے جارہی ہے مجھے اپنے آپ پر ایک بار پھر ہنسی آگئی۔ مجھے تو یہ سوچ کر قلوپطرہ پر بھی ہنسی آجاتی ہے کہ اس کی ناک ننھی سی تھی۔ اتنی بڑی ملکہ اتنی ذرا سی ناک کے ساتھ کیسی عجیب لگتی ہوگی، اور میں تو سپارٹا اور ٹرائے کی فوجوں پر بھی یہ سوچ کر مسکرا دیتا ہوں کہ جب ہیلن کی جوانی ڈھل گئی ہوگی، تو اسے دیکھ کر طرفین اپنی اپنی حماقت پر کیسے کیسے جھینپتے ہوں گے ہنستے ہوئے میں نے قلم اُٹھایا اور یوں لکھنے بیٹھ گیا جیسے آج افسانے کا ایک پہلا فقرہ ہی کیا، آخری فقرہ بھی لکھ کر اٹھوں گا۔

اس کا رنگ پہاڑوں کی برف کی طرح صاف تھا" ــــــ اس کا رنگ ان پہاڑوں کی برف کی طرح صاف تھا، جن پر ــــ " ــــــ " اس کا رنگ پہاڑوں کی اس برف کی طرح صاف تھا جو ــــ " ــــــ " اس کا رنگ پہاڑوں کی برف کی طرح اس حد تک صاف تھا کہ ــــــ "

اور پھر میتی کی پیالیوں سے چینی کی پیالیاں بجنے لگیں۔
ایک موج آئی اور ساحل کو اپنی یادوں کی نمی بخش کر پلٹ گئی۔

اتنی گلابی اس قدر گلابی، اس حد تک گلابی ہتھیلی پر صرف ایک آنہ رکھا اور میں نے اپنے آپ کو گالی دے دی ــــ کمینہ، بڑا حسن کار بنتا ہے۔ فطرت کی اس شہ رگ کے پھیلے ہوئے ہاتھ کی قیمت کیا صرف ایک آنہ ہے؟ تف ہے تجھ پر اور تیری حسن کاری پر!

دوسرے دن کی دوپہر تک کا وقت میں نے اس مجرم کی طرح گزارا جو جرم کرنے کے بعد اپنے اندر جھانکے تو اس کا ضمیر اس پر تھوک دے ــــــ ان دنوں تو ایک آنہ میں ایک چپاتی بھی نہیں آتی!

مگر سارے لاہور میں صرف میں ہی تو میں ہوں جس سے اس نے ایک آنہ لیا ہوگا۔ نہ جانے پورے دن میں اس نے کتنوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے ہوں گے؟ تو کیا جس طرح وہ میرے پاس آئی ہے، اسی طرح دوسروں کے ہاں بھی جاتی ہوگی؟ سارا شہر مجھے اپنا دشمن نظر آنے لگا ــــــ اچھا تو ذہن میں نراجیت یوں پیدا ہوتی ہے!

کل رات میری کشت خیال میں صرف یونانی اصنام کے چہروں کی ندیاں اُمڈتی رہی تھیں۔ مگر آج رات تو ادھر ایک چہرہ نمودار ہوتا، اُدھر ایک شعلہ سا بھڑک اُٹھتا۔ پھر دھواں سا چھا جاتا۔ پھر پتھر سے برستے۔ پھر ایسی آوازیں سی آتیں جیسے کوئی شیشے کی کرچیاں پیس رہا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ کل سارا دن گھر سے باہر رہوں گا۔ کل کسی ڈاکٹر سے بھی مشورہ کروں گا۔ کل نماز بھی پڑھوں گا۔

مگر صبح بہت دیر سے آنکھ کھلی۔ نماز کا وقت نکل چکا تھا۔ نہانے اور ناشتہ کرنے میں بھی خاصی دیر لگی۔ اوپر کی منزل میں بیٹھا اخبار پڑھنا شروع کیا تو دوپہر تک پڑھتا رہا۔ جب ملازم نے آکر کہا کہ پڑوسی چند منٹ کے لئے اخبار مانگ رہا ہے، تو میں نے وقت دیکھا۔ یکایک کسی چیز نے جیسے میرے اندر اچھل کر مجھے کمرے سے باہر دے مارا اور میں سیڑھیوں پر سے اتنی تیزی سے اُترا کہ بچے بھی یوں نہیں اُترتے ہوں گے۔ اپنا کمرہ کھول کر میں سیدھا کھڑکی کے پاس گیا اور گلی میں جھانکا۔ دو بچے سگرٹ کی ڈبیوں سے مکان بنا رہے تھے اور گلی میں ایک بڑھیا گزر رہی تھی جو ہوا سے بھرے ہوئے برقعے میں بہت چھوٹی سی لگ رہی تھی۔

میں پھر اوپر کے کمرے کی طرف لپکا اور ملازم سے پوچھا "کوئی مجھ سے ملنے تو نہیں آیا تھا؟"

وہ بولا "آپ سو تو نہیں رہے تھے صاحب، کہ کوئی آتا تو میں نہ بتاتا۔"

مزید کرید نے کے لئے مجھے کوئی دوسرا ڈھنگ کا سوال نہ سوجھ سکا اور ملازم جیسے اپنے آپ سے کہنے لگا: بس صبح صبح ایک سبزی والا آیا تھا، یا اخبار والا، یا پھر ابھی ابھی وہ مگنتی آئی تھی ——— مجھے اسی طرف گھورتا دیکھ کر وہ بولا کوئی بھی تو نہیں آیا صاحب کیا آپ نے کسی کو وقت دے رکھا تھا؟

میں جواب دیئے بغیر پلٹ آیا۔ تو وہ آئی بھی اور چلی بھی گئی! تو وہ اتنی غیر اہم تھی کہ اس کے آنے کے باوجود کوئی نہیں آیا تھا!

کیا فرشتوں کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ آج کے دن کو بھی میری زندگی میں شمار کریں!

سیڑھیوں پر سے آہستہ آہستہ اترتا ہوا میں گلی میں آگیا۔ پھر دوسری گلی میں سے ہوتا ہوا سڑک پر آیا اور دُور دُور تک نظریں دوڑائیں کہ شاید وہ کسی راہ گیر کا دامن تھامے کھڑی ہو۔ شاید کسی دکان کے سامنے پڑی ہوئی سڑی چیزوں میں سے کوئی کم سڑی ہوئی چیز چن رہی ہو۔ شاید وہ کسی درخت کے تنے کے ساتھ لگ کر اداس کھڑی ہو کہ آج اس کی لگی بندھی آمدنی میں سے ایک آنہ کٹ گیا۔

سڑک پر معمول کی زندگی رواں تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

اور واقعی کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ انسانوں کے اندر کے طوفان ان کے اندر ہی چلتے رہتے ہیں۔ ہر انسان کے اندر سے اس کا طوفان باہر آجائے تو کیسی قیامت برپا ہو جائے

میں واپس اپنی گلی میں آیا تو بچوں نے سگرٹ کی ڈبیوں سے پنج منزلہ مکان تعمیر کر لیا تھا اور میرے ساتھ والے مکان کے دروازے پر ایک بی بی، ردی والے کے ہاتھ اپنی اولاد کی پڑھائی کا سامان بیچ رہی تھی۔

اور وہ میرے مکان کی دہلیز پر بیٹھی تھی ۔ ـــ تو میری خیرات اس کے لئے اتنی اہم ہے ؟ ـــ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور بیٹھے بیٹھے ایک طرف ہٹ کر مجھے راستہ دے دیا ۔ اس کے پاؤں اتنے میلے تھے جیسے وہ غلطی سے کسی دوسرے کے پاؤں لگا کر چلی آئی ہے ۔ البتہ آج اس کے ہاتھ دھلے ہوئے تھے اور ناخن کٹے ہوئے تھے!

" آج تو تمہارے ناخن کٹے ہوئے ہیں ۔ میں نے یوں فاتحانہ انداز میں کہا جیسے محض میرے پاس آنے کی تقریب میں اس نے اپنے پیکر میں یہ خاص اصلاح کی ہے ۔

اور اس نے اپنے ہاتھ یوں گود میں چھپا لئے جیسے کہیں سے چرا لائی ہے اور اب پکڑی گئی ہے ۔ پھر چینی کی پیالی سے چینی کی سالی تھوک گئی اور میں اوپر لپکا ۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر میں نے اسے بلانا چاہا مگر پھر رک گیا جیسے میرے منہ سے ایک لفظ نکلا تو سارے شہر میں گونج جائے گا ۔ پھر میں نے اشارتاً اسے اوپر آنے کو کہا اور وہ ادھر آنے لگی ۔ مگر مجھے دروازے میں کھڑا دیکھا تو وہ سیڑھیاں چھوڑ کر رک گئی ۔ اس نے بھویں اٹھا کر اوپر میری طرف دیکھا اور میں یوں ایک طرف ہٹ گیا جیسے نہ ہٹا تو کہیں نیچے ڈوب جاؤں گا

میں نے اپنے تکئے کے نیچے سے ایک اٹھنی اٹھائی اور اس کی طرف بڑھا دی ۔ اس نے ہاتھ پھیلایا مگر اٹھنی دیکھ کر کھینچ لیا ۔

نہیں بابو میرے پاس بھان نہیں ۔

" تم اٹھنی لے لو ۔" میں نے اس کے بھولپن سے خوش ہو کر کہا ۔

" پوری ؟" اس نے پوچھا ۔

میں نے مسکرا کر کہا: " ہاں ۔ تمہارے پاس بھان جو نہیں ہے ۔"

ایک آنہ لینے والی بھکارن کے لئے اٹھنی ایسی ہی ہے جیسے افسانہ نگار کی ایک لاکھ کی لاٹری نکل آئے ۔ یوں میں نے طے کر لیا کہ اس نے اٹھنی کے لئے ہاتھ پھیلایا تو میں اسے کلائی سے پکڑوں گا ۔ اور ظاہر ہے جائز طور سے پکڑوں گا کیونکہ میرے پورے آٹھ آنے اس کے پاس ہوں گے ۔ پھر جب میں اس کی کلائی اپنی گرفت میں لے لوں گا تو اس سے کہوں گا ـــ میں اس سے کہوں گا ـــ میرے افسانے کا پہلا فقرہ ایک کوندے کی طرح میرے ذہن میں چمکا اور پہاڑوں کی برف پر شفق برس پڑی ۔ مگر قبل اس کے کہ میرا ذہن پورے فقرے کو سنبھالتا ، میں نے دیکھا کہ وہ جا رہی ہے ۔

" اٹھنی تو لیتی جاؤ ۔" میں کچھ ایسے لہجے میں بولا جیسے کوئی نیا عشقیہ شعر پڑھ رہا ہوں ۔

وہ پلٹ کر، اور دروازے میں سے جھانک کر بولی۔ لے تو لی تھی :

یہ میں نے بہت بعد میں سوچا کر میرے اٹھنی دکھانے اور اس کے جانے کی ایک صدی میں وہ ایک لمحہ کب وارد ہوا تھا جب میں نے اسے اٹھنی دی تھی، اور جب میں نے یہ سکّہ اس کے ہاتھ پر رکھا تھا، تو اس کی کلائی پکڑ لینے کا فیصلہ مجھے کیوں یاد نہیں آیا تھا۔

پھر ایک دم مجھے احساس ہوا کہ میرا کچھ کھو گیا ہے۔ اٹھنی کے علاوہ میرے افسانے کا پہلا فقرہ بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی وہ مجھے صرف اپنا چہرہ دے گئی تھی، جو اس کے جانے کے بعد دیر تک دروازے میں سے جھانکتا رہا۔ پھر وقفے وقفے سے دکھائی دینے لگا۔ پھر دھندلا گیا۔ پانچویں دن تو وہ بالکل غائب ہو گیا۔

میں نے چھٹے اور ساتویں دن شہر کی سب لائبریریوں میں یونانی سنگ تراشی پر لکھی ہوئی ضخیم کتابیں چھان ماریں مگر مجھے وینس سائیکی اور افرو ڈائیٹ کے چہروں میں وہ چہرہ نظر نہ آیا جو ان سب سے کسی نہ کسی تفصیل میں مختلف تھا تھا۔ شاید بھکارن کے نتھنوں کے خفیف ابھار نے اس کی ناک کے دونوں طرف، وینس کی ناک کے مقابلے میں زیادہ متناسب قوسیں پیدا کر دی تھیں۔ یا شاید سائیکی کی گردن بھکارن کی گردن کے مقابلے میں کوتاہ بھی تھی اور میلی بھی، یا ممکن ہے افرو ڈائیٹ کے مقابلے میں بھکارن کے ہونٹوں کے گوشے زیادہ گہرے، زیادہ جذباتی تھے۔ میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بھکارن کا چہرہ اپنے مجموعی تأثر کی صورت میں مجھے ضرور یاد تھا مگر جب میں اس کی صرف آنکھوں یا صرف گالوں یا صرف ہونٹوں کے بارے میں سوچتا تو سارا چہرہ برف کی طرح پگھلنے لگتا۔

ساتویں دن، شام کے قریب مجھ پر یکایک انکشاف ہوا کہ میں نہایت بے معنی زندگی گزار رہا ہوں۔ چہرے غالب کے شعر نہیں ہوتے کہ جب چاہو اٹھا کر پڑھ لو۔ یہ تو سامنے آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ چہرے تو لمحے ہیں اور لمحے کب واپس آئے ہیں۔ تم نے ایک چہرہ دیکھا۔ مانا کہ یہ بے حد حسین، بے حد عجیب چہرہ تھا، لیکن جیسے یہ چہرہ جس کے بارے میں تم سوچ تک نہ سکتے تھے کہ کسی عورت کا ایسا چہرہ بھی ہو گا۔ یکایک تمہارے سامنے آیا اور گزر گیا، اسی طرح کئی اور چہرے آتے رہیں گے اور گزرتے رہیں گے، اور اگر تم ہر چہرے پر سے نظریں ہٹانا بھول گئے تو آخر کار ایک روز تمہیں معلوم ہو گا کہ تمہارے ہمدردوں نے تمہیں پاگل خانے بھجوا دیا ہے۔

ہفتے میں یہ پہلی رات تھی جب میں سکون سے سویا۔ جب میں اٹھا تو سورج کافی چڑھ آیا تھا۔ ناشتے کے بعد میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے افسانے کا پہلا فقرہ لکھنے بیٹھ گیا۔ جلتی ہوئی ایک دیا سلائی بجھے ہوئے چراغ کی طرف بڑھی اور

پہاڑوں پر برف چمکنے لگی۔ ہر طرف ہزاروں آئینے لگ گئے جن میں ہزاروں سورج چمک رہے تھے پھر خیرگی کے اس طوفان میں ایک چہرہ اُبھرا اور آواز آئی۔

"بے سخی"

میں پلنگ پر سے کود کر اُترا اور دروازے میں سے جھانکا۔ پھر بجلی کی سی تیزی سے سیڑھیاں اُتر کر گلی میں پہنچ گیا۔ پھر دوسری گلی میں چلا گیا۔ پھر سڑک پر آ گیا۔ وہاں معمول کی زندگی رواں تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

اور واقعی کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔ صرف اتنی سی بات ہوئی کہ محلّے کے ایک تانگے والے نے میرے پاس آ کر حیرت سے پوچھا "کیوں بابو جی۔ خیریت تو ہے؟ آپ ننگے پاؤں کیوں کھڑے ہیں؟"

تانگے والے نے میرے ننگے پاؤں دیکھ لیے تھے، مگر میرے ذہن کو، جو زخم زخم ہو رہا تھا، ایک تانگے والا کیا کسی نے بھی نہ دیکھا۔ کوئی کسی کے زخم نہیں دیکھتا۔ شاید اس لئے کہ زخم دیکھنے دکھانے کی چیز نہیں ہیں، یا شاید اس لئے کہ سب کے اپنے اپنے زخم ہوتے ہیں۔

تو کیا یہ زخم جو میرے ذہن میں ہے، کسی اور کے ذہن میں بھی ہے؟ اگر ہے تو وہ کہاں ہے کہ میں اسے اپنے سینے سے لگا کر ذرا سا رو لوں۔ انسان آخر زخموں کے ان ناطوں کو کیوں چھپاتے پھرتے ہیں جو ظاہر ہوں تو سب انسان پیار سے ایک دوسرے کو لپٹا لیں۔

تانگے والے کو کوئی جواب دیئے بغیر میں واپس اپنے کمرے میں آیا اور بستر پر سر سے پاؤں تک چادر اوڑھ کر یوں پھیل کر لیٹ گیا جیسے کڑے کوسوں کا سفر طے کر کے آرہا ہوں۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے ذہن سے رجوع کیا، مگر اس نے بھی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ سب سو رہے تھے۔ چاروں طرف نہایت ڈراؤنا سناٹا مسلط تھا۔ آج ردی والا بھی کہیں مر گیا تھا۔

میں نے غنودگی کے عالم میں دیکھا کہ بھکارن میرے کمرے کے دروازے پر کھڑی ہے اور کہہ رہی ہے: خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے سخی۔ تیرا بچہ جیوے"

میں نے چادر نوچ کر پھینک دی۔ وہ دروازے پر سچ مچ کھڑی تھی اور کہہ رہی تھی "خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے سخی، تیرا بچہ جیوے"

میں کچھ ایسے لہجے میں بولا جیسے وہ باقاعدہ میرے نکاح میں ہے اور میں اس سے ہر قسم کی جواب طلبی کر سکتا ہوں "تم اتنے دنوں کہاں تھیں؟" میں نے ڈانٹ کر پوچھا۔ "کیا تمہیں معلوم ہے کہ آج تم پورے ایک

ہفتے کے بعد میرے پاس آئی ہو؟"

میرے لہجے کا اثر صرف اس کی آنکھوں پر ہوا جو آج کسی گلابی دوا کے حلقے میں سجی ہوئی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی۔ وہ چمک جو انتہائی پیار ڈر کی حالت میں پیدا ہوتی ہے۔

"بولو۔ کہاں تھیں تم؟" میں کڑکا۔

"میں یہیں تھی بابو۔ اور کہاں تھی:" وہ بچے کی طرح بولی۔

تو پھر تم ایک ہفتے تک آئیں کیوں نہیں؟" میں نے اسی لہجے میں پوچھا۔

اور وہ بولی: "میں اٹھنی جو لے گئی تھی سخی۔ ایک آنہ اس دن کا۔ باقی سات آنے سات دنوں کے۔ آج آٹھواں دن تھا تو آگئی:"

بھکارن کا چہرہ پھرکی کی طرح گھوما اور ایک آن میں پہاڑوں کی برف تڑاخ پڑاخ کر کے چٹخی اور اس کے بڑے بڑے چٹانوں کے سے تودے چیختے چنگھاڑتے ہوئے آئے اور میرے سر پر ٹوٹنے لگے۔ وحشیوں کی طرح میں نے بستر پر سے تکیہ اٹھا کر دور پھینک دیا اور اس کے نیچے پانچ پانچ دس دس روپے کے جتنے بھی نوٹ رکھے تھے، انہیں مٹھی میں لے کر میں بھکارن کی طرف بڑھا۔ اس کی کلائی کو لکڑی کی طرح پکڑ کر میں نے یہ نوٹ اس کی مٹھی میں ٹھونس دیئے اور چیخا: "ان روپوں میں جتنے بھی آنے ہیں، اتنے دنوں سے اگر تم ایک بھی دن پہلے یہاں آئیں تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔ جا، دفع ہو جا:"

زمین کے نیچے

انور

میری بھی ایک خوبی ہے۔ میری ہوبی چہروں کو غور سے دیکھنا ہے، میں ہر چہرے کو غور سے دیکھتا ہوں۔ بچوں کے چہرے بوڑھوں کے چہرے۔ لڑکوں کے چہرے۔ لڑکیوں کے چہرے۔ مردوں کے چہرے۔ عورتوں کے چہرے۔ اس طرح میری نظر کلیوں کی کیاریوں میں، بنجر زمینوں میں اور سرسبز میدانوں میں سے ہوتی ہوئی درۂ خیبر کی خوفناک گھاٹیوں میں جا پہنچتی ہے جہاں اگر کسی کی نظر کسی عورت پر پڑ جائے تو اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

میری ہابی بڑی خطرناک ہے اس کے آزاد سرے غنڈہ ایکٹ سے ٹکراتے ہوئے رگڑ کھاتے کھاتے ہوئے گزرتے ہیں اس کے ڈانڈے تعزیرات پاکستان کی مشہور دفعات کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے جیل کی سلاخوں سے جا ملتے ہیں۔

یا خدا! میں نے یہ ہوبی کیوں اختیار کی ہے!

اس سے بہتر تھا میں تتلیوں کے پر جمع کرتا اور ان کو اپنے ڈرائنگ روم کی دیواروں پر سجا کر اس کو نمائش گاہ بنا لیتا۔ اور میں نے پینٹنگ کی ہوبی کیوں نہ اختیار کی؟ پینٹنگ کی ہوبی جس کو پکاسو نے اس قدر آسان کر دیا ہے کہ چھ ماہ کا ایک بچہ رنگوں اور برشوں اور ہاتھوں کی مدد کے بغیر اپنے پیروں سے اور اپنے پیشاب سے تجریدی آرٹ کے بہترین نمونے پیدا کر سکتا ہے اور پھر کتابیں پڑھنے کی ہوبی بھی تو تھی۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی کتاب ہاتھ میں ہو تو کافی ہاؤس میں یا کسی ادبی میٹنگ میں بیٹھا ہوا انسان کبھی ایڈیٹ معلوم نہیں ہوتا گھر کی سب دیواروں کے ساتھ کتابوں کی الماریاں کھڑی ہوں اور سب الماریوں میں موٹی موٹی کتابوں کی ڈبل قطاریں لگی ہوں تو انسان خواہ مخواہ ایک بڑا ادیب یا ایک بڑا شاعر یا ایک بڑا نقاد معلوم ہوتا ہے۔ چاہے وہ کیبنٹ منسٹر ہو۔ اور کتابیں پڑھنے کی ہوبی یعنی کتابیں جمع کرنے کی ہوبی انسان

کی موت کے بعد اُس کے وارثوں کے لئے اور لاوارثوں کے لئے بڑی بھاری جائداد ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ اب کتابیں کرم خوردہ ہو کر نوادرات میں شامل ہو گئی ہیں۔ خصوصاً وہ کتابیں جو فٹ پاتھ پر سے پہلے ہی کرم خوردہ خریدی گئی تھیں، اب اور بھی کرم خوردہ ہو کر بالکل نایاب ہو گئی ہیں۔ چنانچہ آپ کے سوئم پر آپ کا خلفِ رشید آپ کی کتابوں کا قیمتی سرمایہ اُردو بورڈ کے کسی عہدہ دار کو اس کی فاتحہ ختم کرتے ہی پانچ سو فیصدی منافع پر فروخت کر دے گا۔ اور اگر آپ کو غلط فہمی ہے کہ آپ کی موت تک اردو بورڈ کا وجود ختم ہو چکا ہو گا تو اس غلط فہمی کو فوراً سے پیشتر دور کیجئے۔ اردو بورڈ کا وجود کبھی ختم نہیں ہو گا کیونکہ اردو بورڈ کا کام صرف اُردو لغت تیار کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اس کا کام حکومت سے مالی امداد لینا بھی ہے اور میری ہوب کیا ہے؟ میں ایک چہرے کو غور سے دیکھتا ہوں اور اُس کو تحت الشعور یا لاشعور کے تاریک غاروں میں پھینک دیتا ہوں اور پھر سالہا سال تک اس بات کا انتظار کرتا ہوں کہ وہ چہرہ پھر نظر آئے تاکہ میں ان تاریک غاروں سے اس کی شبیہ نکال کر یہ دیکھوں کہ یہ وہی چہرہ ہے یا کوئی اور ہے۔ یا یہ چہرہ وہی ہوتے ہوئے بھی کوئی اور تو نہیں ہے۔ میں کسی لڑکی کا چہرہ دیکھتا ہوں تو یہ سوچنے لگتا ہوں کہ اس کا رنگ کس پھول سے ملتا ہے۔ اور جب میں کسی پھول کو دیکھتا ہوں تو یہ سوچتا ہوں کہ یہ کونسی لڑکی کھڑی ہے۔ جب میں کسی عورت کا چہرہ دیکھتا ہوں تو اپنے آپ سے کہتا ہوں کہ ماں لڑکی سے زیادہ خوبصورت ہے۔ پھر میں یہ سوچنے لگتا ہوں کہ لڑکی خوبصورت ہوتی ہے یا ماں خوبصورت ہوتی ہے۔ جب میں کسی بوڑھے کا چہرہ دیکھتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ اب آخری بس سٹوپ نزدیک ہے۔ اور جب آخری بس سٹوپ آ جاتا ہے تو میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں کہ یہ آخری بس سٹوپ ہے یا پہلا بس سٹوپ ہے؟

اس طرح میں چہروں کی تلاش میں جگہ جگہ گھومتا پھرتا ہوں۔

اور میں اس وقت پرانی کلفٹن پر بیٹھا ہوں۔

پرانی کلفٹن کی چٹان تھیٹر کے سٹیج کی طرح سجی ہوئی ہے۔ زندگی کا ڈرامہ ہو رہا ہے۔ سامنے گہرائی میں ببول کے درخت، اُن سے پرے کلفٹن کی عمارت اُس کے پاس گھاس کے قطعے اور پھولوں کے تختے، اُن کے آگے ساحل کی ریت، سمندر کی لہریں، پانی میں ابھری ہوئی چٹانیں، منوڑے کا جزیرہ اور اس کا لائٹ ہاؤس پرانی کلفٹن کی سٹیج پر زندگی کا ڈرامہ دیکھ رہے ہیں اور میں اس پتھر کے بنچ پر بیٹھا ہوا

ایسا محسوس کر رہا ہوں جیسے میں اس ڈرامے کا ڈائرکٹر ہوں۔

میرے پاس پاکستان رائٹرز گلڈ کا ایک ممبر بیٹھا ہے جو ہر ممکن طریقے سے میرا وقت ضائع کرنے کی کوشش کر رہا ہے میں نے اُس کی کوئی بات نہیں سُنی. لیکن اُس کی آخری بات سننے کے لائق تھی۔

اُس نے کہا میاں ہم تمہیں بتائے دیتے ہیں۔ تم بڑے ادیب ہرگز نہیں ہو۔ اور نہ تم بڑے ادیب بن سکتے ہو۔"

اس بات سے اُس نے میری توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ اور میں نے کہا: "یقیناً میں بڑا ادیب نہیں ہوں اور نہ میں بڑا ادیب بن سکتا ہوں۔ آپ کے فیصلے سے پہلے مجھے اس صداقت کے ثبوت مل چکے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ میرے ماں باپ زندہ ہیں۔ بڑا ادیب بننے کے لئے ضروری ہے کہ آپ کے ماں باپ بچپن میں ہی فوت ہو جائیں۔ چنانچہ غالب کے ماں باپ بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے اور چارلس ڈکنز کو بڑا ادیب، بننے کے لئے یتیمی کی ٹھوکریں کھانی پڑی تھیں۔ دوسرے بڑے ادیبوں کے بارے میں میں نے تحقیقات نہیں کی، ورنہ میں ثابت کر دیتا کہ تمام بڑے ادیب بیچارے یتیم تھے۔ اور سب نے اپنی ادبی زندگی کے آغاز پر لوگوں سے داد کی بھیک لینے کے لئے "یتیموں کی فریاد سن لیجئے" کا گیت گایا تھا بلکہ اس سلسلے میں تحقیقات کی بھی ضرورت نہیں۔ فارمولا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یعنی چونکہ وہ بہت بڑے ادیب تھے اس لئے اُن کے ماں باپ بچپن میں ضرور مر گئے ہوں گے۔ بائی دی وے، آپ کے ماں باپ زندہ ہیں یا فوت ہو گئے ہیں؟"

اُس نے جھنجھلا کر جواب دیا "زندہ ہیں"۔

میں جلدی سے بولا: "مجھے افسوس ہے۔"

وہ اور بھی جھنجھلا گیا: "دیکھو اس بکواس کو تو بند کرو اور مجھ سے پوچھو کہ میں یہ کیوں کہتا ہوں؟"

میں نے کہا: "میں جانتا ہوں۔ اس کا دوسرا ثبوت ——"

اُس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا: "تم کچھ نہیں جانتے۔ چپکے بیٹھے رہو اور میری باتیں غور سے سنو۔"

میں نے اپنے اوپر احترام طاری کرتے ہوئے: "بہت اچھا، ابا جان!"

وہ بولا: "دیکھو! ہماری رائے تمہارے بارے میں یہ ہے کہ تم میں ایک بڑا ادیب ہونے کے آثار پائے جاتے ہیں۔ لیکن تمہیں احتیاط کی ضرورت ہے۔ تمہارے ادب میں ایک بہت بڑی کمزوری ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا؟"

اُس نے جواب دیا۔ "زبان"

"زبان تو میرے منہ میں ہے"

"دیکھو تم بے وقوف نہ بنو۔ نہ دوسروں کو بے وقوف بنانے کی کوشش کرو۔ تم خوب جانتے ہو زبان سے میری مراد کیا ہے تمہارے افسانوں کی زبان درست نہیں۔ تم مستند اردو نہیں لکھتے تم انگریزی بولتے ہو۔ انگریزی میں سوچتے ہو اور اردو میں لکھتے ہو۔ اردو ادب تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اردو ادب میں تمہیں کوئی مقام نہیں مل سکتا۔"

یہاں ہماری گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ایک لمبی داڑھی والے شخص نے ہمارے پاس آکر زور سے السلام علیکم کہا۔ ہم چونک گئے۔

لمبی داڑھی والے نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"آپ نے پہچانا نہیں مجھے؟"

میں نے اپنی نظروں سے اس کی داڑھی کے بال پرے ہٹا کر اُس کو پہچان لیا۔ وہ این۔ ڈی۔ انصاری تھا۔ یعنی نور دین انصاری۔ چونکہ وہ نرا نور دین تھا اِس لئے اُس نے اپنے نام پر انگریزی کا ملمع چڑھا کر اس کو این ڈی انصاری کر لیا تھا جس طرح بدوضع لوگ انگریزی لباس پہن کر خوشگوار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح بدصورت نام انگریزی لباس پہن کر خوبصورت ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اے ڈی سبزواری یعنی اللہ دتا سبزواری جس کا سلیس اردو میں ترجمہ اللہ دیا سبزواری ہوتا ہے اور جیسے ایف۔ ایم۔ بلتستانی یعنی فقیر محمد بلتستانی۔

نور دین میرا کلرک تھا۔ وہ اپنے کندھوں پر اتنا بوجھ اٹھا سکتا تھا جتنا گدھا اٹھا سکتا ہے۔ اس لئے اس نے میرے دفتر کے کام کے ساتھ پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے ایف۔ اے پاس کیا۔ پھر بی۔ اے اور پھر ایل ایل بی۔ اس کے بعد اس نے ملازمت چھوڑ دی۔ وکیلوں کے سائن بورڈ پر ایسے نام موثر ثابت نہیں ہوتے جیسے نور دین بی اے ایل ایل بی یا جمعہ خاں بی اے ایل ایل بی یا اللہ دتا ایم اے ایل ایل بی کیونکہ ایسے نام ایل ایل بی کو بھی نوردبہ بنا کے رکھ دیتے ہیں۔

ایک دن میں جونا مارکیٹ میں سے گذر رہا تھا۔ پرانے کوٹوں کی ایک دکان کے اوپر دوسری منزل کی اکھڑے ہوئے پلستر اور دھندلائے ہوئے چوبی والی ایک کھڑکی پر مجھے ایک سائن بورڈ نظر آیا۔ این۔ ڈی انصاری بی۔ اے۔ ایل۔ ایل بی۔ میں اس بورڈ کو دیکھ کر اس طرح آگے بڑھ گیا جس طرح لوگ وکیلوں کے بورڈ دیکھ کر

بڑھ جایا کرتے ہیں

یکایک مجھے اُس کھڑکی میں سے کسی نے آواز دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا وہ نور دین تھا۔ اُس کے منہ پر داڑھی نہیں تھی۔ اس لئے میں نے فوراً اس کو پہچان لیا۔ ہم فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔

میں نے پوچھا "کیسی چل رہی ہے وکالت؟"

اُس نے کہا خوب"

میں نے پھر پوچھا "کتنی آمدنی ہو جاتی ہے؟"

اُس نے جواب دیا "اس وقت میری ماہوار آمدنی پانچ روپے سے لے کر پانچ ہزار روپے تک ہے۔"

"پانچ روپے سے لے کر پانچ ہزار تک، یعنی؟"

"یعنی کسی مہینے تو پانچ روپے بھی نہیں ملتے۔ کسی مہینے پانچ ہزار سے بھی زیادہ کما لیتا ہوں۔"

سامنے کی مسجد سے ایک بوڑھا سفید ریش دائیں ہاتھ میں تسبیح لٹکائے ہوئے ہمارے پاس سے گذرا اُس نے میلے ملیشیا کے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور اس کے پاؤں میں نیا قیمتی جوتا تھا۔ اُس نے ہمارے برابر آکر نور دین کو بڑے احترام سے سلام علیکم کہا اور پھر نیپئر روڈ کی طرف چلا گیا۔

میں نے نور دین سے اپنی گفتگو جاری رکھی "کتنی مدت سے ملاقات نہیں ہوئی۔ کیا کام کی زیادتی ہے؟"

اُس نے جواب دیا "کام ہے بھی اور نہیں بھی۔ کبھی تو مقدموں کے سلسلے میں پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے دوروں پر چڑھا رہتا ہوں۔ اور کبھی ہفتوں، مہینوں اس چوبارے میں پڑا کھٹمل مارتا رہتا ہوں۔"

میں نے کہا "معلوم ہوتا ہے تمہارے موکل دور دور پھیلے ہوتے ہیں۔"

وہ بولا "ہاں، میں تمام مغربی پاکستان کے جیب کتروں کا وکیل ہوں۔"

میں نے ایک قہقہہ بلند کیا اور نور دین کے ایسی بے ساختگی سے یہ خبر بہم پہنچانے پر لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا "ویل ڈن، نور دین، ونڈر فل، مجھے اتنی دیر کے بعد تم سے ملنے پر بڑی خوشی ہوئی ہے۔ آج تم سے ملنے کے بعد میری ایک دیرینہ تمنا پوری ہوتی نظر آتی ہے۔ شاید تمہیں معلوم ہے مجھے دو قسم کے انسانوں کی زندگی سے بے حد دلچسپی ہے۔ پاگلوں کی زندگی سے اور مجرموں کی زندگی سے، پاگلوں کی زندگی کا تو میں نے کافی مطالعہ کیا ہے۔ میں نے پاکستان کے سب پاگل خانے دیکھے ہیں۔ بدقسمتی سے پاکستان میں پاگل خانوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ حالانکہ اتنے بڑے ملک میں ہر شہر کے اندر بلکہ ہر محلے میں ایک پاگل خانہ ہونا چاہیئے۔

ہماری نئی حکومت کو اس طرف فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اور جہاں تک مجرموں کی زندگی کا تعلق ہے۔
میں اس کے مطالعے سے بالکل محروم رہا ہوں۔ مجھے امید ہے تم مجھے اس کے موقعے بہم پہنچاؤ گے۔"
نوردین نے جواب دیا۔" انشاء اللہ۔"
اس دن کے بعد نوردین مجھے آج نظر آیا ہے۔
میں نے پاکستان رائٹرز گلڈ کے ممبر سے نوردین کا تعارف کرایا۔" یہ ہیں مسٹر این۔ ڈی۔ انصاری۔ بی۔
اے۔ ایل۔ ایل۔ بی وکیل۔ اور یہ مسٹر دیوانہ دریا بُردی۔ مشہور شاعر۔ تشریف رکھئے انصاری صاحب۔"
نوردین ہمارے پاس بینچ کے بیچ پر بیٹھ گیا۔
میں نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔" انصاری صاحب، آپ نے تو داڑھی رکھ لی ہے؟ آپ تو
داڑھی کے خلاف تھے۔"
انصاری صاحب نے سنجیدہ ہو کر کہا۔" میرے موکلوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں بنیادی جمہوریت کے انتخاب
میں حصہ لوں اور میرے ووٹروں نے مجھ پر یہ شرط لگائی کہ جب تک میں مومنوں کی شکل اختیار نہ کروں، مجھے
ووٹ نہیں دیں گے۔"
میں نے حیران ہو کر پوچھا۔" تم بنیادی جمہوریت کے ممبر بھی ہو؟"
اُس نے فخر سے جواب دیا۔" مجھے بھاری اکثریت سے بنیادی جمہوریت کا نمائندہ چُنا گیا تھا۔"
دیوانہ دریا بُردی نے پوچھا۔" مقابلے میں کون تھا؟"
"میرے مقابلے میں سیاستدانوں کی حکومت کے دو وزیر تھے۔"
میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔" زندہ باد۔ بہت بہت مبارک باد، بڑا معرکہ مارا!"
انصاری نے جواب دیا۔" شکریہ!"
اور پھر یہ کہہ کر کہ میں ابھی آتا ہوں، وہ ہمارے پاس سے اُٹھ کر کینٹین کی طرف چلا گیا۔
انصاری کے جانے کے بعد دیوانہ دریا بُردی اور میں زبان کے مسئلے پر پھر تبادلۂ خیالات کرنے لگے۔
میں نے کہا۔" دیوانہ صاحب! مجھے آپ سے اتفاق نہیں۔ زبان موضوع سے زیادہ اہم نہیں ہے۔
زبان ذریعہ ہے۔ مقصد نہیں ہے۔ راستہ ہے، منزل نہیں ہے، اس میں کوئی شک نہیں کسی وقت زبان
موضوع سے زیادہ اہم تھی۔ وہ ہمارے ادب میں غزل کا زمانہ تھا غزل کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں

ہوتا۔ صرف الفاظ ہوتے ہیں۔ غزل کے شاعر کو صرف یہ کہنا ہوتا ہے کہ وہ سات سال کی عمر میں ایک لڑکے یا لڑکی پر عاشق ہو گیا تھا۔ اب ستر سال ہو گئے ہیں لیکن اس عشق میں کمی نہیں ہوئی۔ اس ایک بات کو سترہزار انداز میں بیان کیا جاتا ہے الفاظ! الفاظ!! الفاظ!!! کیونکہ سات سال کی عمر سے شروع ہو کر ستر سال کی عمر تک قائم رہنے والا عشق انسان نہیں کر سکتا۔ صرف الفاظ کر سکتے ہیں، پھر جب ہمارے پاس کہنے کے لئے اور بھی باتیں پیدا ہو گئیں تو نظم ایجاد ہوئی۔ افسانہ ایجاد ہوا۔ موضوع آگے بڑھ گیا۔ زبان پیچھے ہٹ گئی"

دیوانہ دریا بُردی نے کہا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اگر تمہارا تجزیہ درست ہے تو غزل دوبارہ کیوں زندہ ہو گئی ہے؟"

میں نے جواب دیا "غزل اس لئے دوبارہ زندہ ہو گئی ہے کہ شاعروں کے پاس اگرچہ کہنے کے لئے بہت کچھ ہے لیکن وہ کہہ نہیں سکتے۔ صلح کل ہیں، بزدل ہیں، کلرک ہیں"

دیوانہ دریا بُردی کے چہرے پر دیوانگی کے سے آثار پیدا ہو گئے۔ اس نے غصے میں اپنی آواز بلند کرتے ہوئے کہا "اب تم پھر ذاتیات پر اتر آئے ہو۔ تم نے ہمیشہ مجھ پر ذاتی حملے کئے ہیں۔ تم میری اور میری غزل کی مقبولیت سے اس قدر جل گئے ہو کہ ہر جگہ میرے خلاف پروپیگنڈا کرتے پھرتے ہو۔ اس وقت تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں کلرک ہوں، اس لئے بزدل ہوں اور غزل اس لئے کہتا ہوں کہ اس پر حکومت کی گرفت نہیں ہو سکتی۔ اور نوکری کو گزند نہیں پہنچتا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ میں حکومت سے نہیں ڈرتا۔ اگر میں حکومت سے ڈرتا ہوتا تو آج میں کلرک نہ ہوتا۔ منسٹر ہوتا۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ میں غزل کی محبت میں میٹرک بھی پاس نہیں کر سکا ورنہ تم ادب کے لئے میری اتنی بڑی قربانی کی قدر کرنے کی بجائے مجھ پر طنز کے تیر چلاتے ہو۔ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ غزل اردو ادب کی بہترین صنف ہے ۔"

میں نے دیوانہ دریا بُردی کی لمبی تقریر کا اندازہ لگا کر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "غزل اردو شاعری کا ایبسٹریکٹ آرٹ ہے۔ جس میں دھوپ کی جڑوں اور گدھے کے سینگوں اور پہاڑ کی مینگنوں اور ہاتھی کے بیجوں کو کوٹ کر اور کپڑ چھان کر کے مچھلی کے خون میں پکایا جاتا ہے۔ جب تین جوش آ چکتے ہیں تو اس میں گلہریوں کا عرق ڈالا جاتا ہے۔ اس طرح جو قوام تیار ہوتا ہے۔ اس سے ایک حسین و جمیل خاتون کی تصویر بنائی جاتی ہے۔ اس تصویر کے نیچے صابن دانی رکھ کر اس کو نمائش میں لٹکا دیا جاتا ہے۔ جب تماشائی پوچھتے ہیں کہ بھئی یہ صابن دانی کس طرف سے ہے تو ان پر لعنت بھیجی جاتی ہے۔ بالکل یہی حال

غزل کا ہے۔ ایک شعر کہنے کے بعد غزل گو شاعر کے دماغ کا سوئچ آف ہو جاتا ہے اور اس پر مکمل نسیان کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور وہ بھول جاتا ہے کہ وہ ابھی ابھی کیا کہہ رہا تھا۔ اس نے ابھی ابھی یہ کہا تھا کہ حضور چائے میں چینی ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔ صرف چمچہ ہلا دیجئے، چائے میٹھی ہو جائے گی اور اب وہ یہ کہہ رہا ہے کہ حضور آپ رقیب کی قبر پہ فاتحہ پڑھ کر واپس جا رہے ہیں، میری قبر پہ بھی ایک لمحے کے لئے فاتحہ کہنے کو ٹھہر جائیے۔ مردوں کو زندہ کرنے کا کام یا تو صرف حضرت عیسیٰ نے کیا تھا یا اب غزل کر رہی ہے —"

اس کے بعد میری توجہ انصاری کی طرف چلی گئی۔ میں اپنی گفتگو کا سلسلہ قطع کر کے انصاری کو دیکھنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ انصاری ایک ایسے شخص کی طرف جا رہا ہے جس کو میں دیر سے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں نے اُسے کہاں دیکھا ہے۔ میں اپنی باتوں کے دوران میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اُس کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ لیکن میں اس کو پہچان نہیں سکا تھا۔ اور پھر جب میں دیر تک اسے پہچان نہ سکا تو مجھے خیال آیا کہ میں اُس کو پہچاننے کی کوشش کیوں کر رہا ہوں۔ اور میں نے اُس کو پہچاننے کی کوشش ترک کر دی۔

اب جب میں نے انصاری کو اس کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تو میں نے اُس کی طرف پھر غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ میں نے سوچا کہ اگر انصاری اس شخص کو جانتا ہے تو جب وہ میرے پاس واپس آئے گا تو میں اس سے اس کے بارے میں پوچھ لوں گا۔

لیکن انصاری نے اُس کے ساتھ کوئی بات نہ کی وہ اُس کے نزدیک سے گزر گیا۔ اور اُن چار آدمیوں کے پاس جا کر ٹھہر گیا جو کینٹین کے سامنے کھڑے چائے پی رہے تھے۔ انصاری بھی اُن کے ساتھ چائے پینے لگا۔

ادھر دیوانہ دریابُردی غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اُس نے میری توجہ اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا: "دیکھو، ہم تمہیں بتائے دیتے ہیں تمہارے خیالات زبان اور غزل کے بارے میں نہایت لغو اور لچر ہیں۔ ہم تو تمہارے دوست ہیں۔ لیکن اگر کسی کٹر اردو دان طبقے میں تم نے یہ باتیں کر دیں تو پٹ جاؤ گے۔"

میں نے کہا "ہاں، میں غزل کے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔ غزل بوڑھے بچوں کے لئے نرسری رائم کا کام دیتی ہے۔"

دیوانہ دریابُردی نے پوچھا "نرسری رائم کیا؟"

زسری رائم انگریزی زبان کا لفظ ہے زسری رائم ایسے اشعار کو کہتے ہیں جن کا ایک دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ میں نثر میں اس کی مثال دیتا ہوں مطلع ملاحظہ ہو۔ چاولوں کا رنگ سفید ہوتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ زمین گول ہے۔ مطلع ثانی ملاحظہ کیجئے۔ مچھلیاں درختوں پر چڑھی ہوئی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے سمندر میں آگ لگ گئی ہے۔ شعر سنیئے ۔۔"

نہیں نہیں، میں نہیں سننا چاہتا۔ یہ سراسر بکواس ہے۔ یہ اردو ادب کی توہین ہے۔ خدا کے لئے اردو ادب کا پیچھا چھوڑ دو۔ اور انگریزی میں لکھنا شروع کرو۔"

میں انگریزی میں نہیں لکھ سکتا۔ انگریزی غیر ملکی زبان ہے۔ انگریزی سے میری صرف دوستی ہے۔ اردو سے مجھے محبت ہے۔"

دیوانہ دریا بُردی کے چہرے پر تھوڑی سی بشاشت پھیل گئی۔ وہ بولا۔" مجھے یہ سُن کر خوشی ہوئی ہے کہ تمہیں اردو سے محبت ہے لیکن انگریزی سے دوستی میری سمجھ میں نہیں آتی۔ انگریزی زبان ہمیں غلامی سکھانے کے لئے اس ملک میں آئی تھی۔ اب ہماری ذہنیت اس قدر غلامانہ ہو گئی ہے کہ انگریزی ہمیں اپنی دوست معلوم ہوتی ہے۔ اردو سے محبت کرنے والوں کو عربی اور فارسی سے دوستی کرنی چاہیئے۔ عربی اور فارسی اردو کے والدین ہیں۔"

میں نے کہا۔" اردو کے والدین فوت ہو چکے ہیں۔ عربی اور فارسی کم سے کم ہمارے ہاں تو ادب کی حد تک انتقال کر گئیں۔ یہ ہمارے ماضی کے ادب کی زبانیں ہیں اور ہم حال میں اور مستقبل میں زندہ ہیں۔"

دیوانہ دریا بُردی میری گفتگو کا سلسلہ ختم کرنے کے لئے حقارت آمیز انداز میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور بس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہاں کئی بسیں آ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔

اُس نے کہا۔" میں پیدل واپس جانے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ رش ختم ہو گیا ہے۔ چلو بس میں چلیں۔"

میں نے کہا۔" میں تو پیدل واپس جاؤں گا۔ آپ چلئے۔ میں بعد میں آ جاؤں گا۔"

لیکن جانے سے پہلے اُس نے ایک آخری بات کہنا اپنا فرض سمجھا۔" میں تمہیں ایک دفعہ پھر مشورہ دوں گا کہ اپنی زبان کی طرف توجہ دو با محاورہ زبان لکھو اور اس میں چٹخارہ پیدا کرو۔"

میں نے جواب دیا۔" مجھے محاوروں اور فارسی ترکیبوں سے ہمیشہ نفرت رہی ہے۔ ایسے محاورے جیسے ناک کا بال ہونا۔ تھوک کر چاٹنا۔ چناب میں سے مچھلیاں پکڑنا تو میں برداشت بھی نہیں کر سکتا۔ اور

زبان کا چٹخارہ میری سمجھ میں کبھی نہیں آیا۔ میں نے اردو زبان میں چٹخارہ کہیں نہیں دیکھا۔ رہی یو۔پی۔کی اردو، تو وہ موجودہ اردو کی نانی تھی، وہ دلی میں پیدا ہوئی۔ لکھنؤ میں جوان ہوئی اور حیدرآباد دکن میں فوت ہوگئی۔ اُس کی اکلوتی لڑکی نے پنجاب کے ایک گھبرو جوان سے شادی کرلی، جو مکئی کی روٹی اور ساگ کا دلدادہ تھا۔ اس طرح اردو سادہ ہوگئی اور بناوٹوں سے پاک ہوگئی۔ میں تو جو بات کہنا چاہتا ہوں، اُس کو چبائے بغیر دوسرے کے سامنے پھینک دیتا ہوں۔"

دیوانہ دریابُردی پھر طیش میں آگیا۔ اور بنچ پر بیٹھ گیا اور زور زور سے بولنے لگا "تم نے ہمارے کلاسیکی ادب کی توہین کی ہے میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ اگر تم ادب میں زندہ جاوید رہنا چاہتے تو ہمارے کلاسیکی ادب کا مطالعہ کرو۔"

میں نے جواب دیا "تخلیقی کام کرنے والوں کو کلاسیکی ادب کے مطالعے کا وقت کہاں ہوتا ہے۔ کلاسیکی ادب کا مطالعہ ادبی مؤرخوں کا کام ہے۔ جو بعد میں ترقی کرکے ادبی نقاد بن جاتے ہیں اور ادیبوں کو برا بھلا کہتے رہتے ہیں۔ تخلیقی کام ہول ٹائم جوب ہے تخلیق صرف تخلیق کی اجازت دیتی ہے کسی دوسرے کام کی اجازت نہیں دیتی۔ تخلیقی ادیب اگر تخلیق کے علاوہ کوئی اور کام مثلاً کلاسیکی ادب کا مطالعہ وغیرہ بھی کر سکتے ہوں تو اسی نسبت سے ان میں تخلیقی قوتیں کم ہوتی ہیں۔ تخلیقی ادب پیدا کرنے والوں کا ماضی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ان کے مطالعے کا میدان حال اور مستقبل میں پھیلا ہوا ہے اور یہ اتنا وسیع، سرسبز اور خوشگوار میدان ہے کہ اس کو چھوڑ کر کلاسیکی ادب کے تاریک اور بدبودار ریکارڈ روم میں جھانکنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔ آپ اپنی مثال لیجئے۔ آپ نے کلاسیکی ادب کا اتنا مطالعہ کیا ہے، اتنا مطالعہ کیا ہے کہ آپ صرف غزل کے قایل رہ گئے ہیں۔"

دیوانہ دریابُردی کی دیوانگی کی کوئی حد نہ رہی۔ وہ پہلے پیلا ہوا، پھر سُرخ ہوگیا اور پھر نیلا ہوگیا اور قریب تھا کہ وہ اپنے کلاسیکی ادب کی پوری طاقت سے مجھ پر حملہ کردیتا کہ سرخ رنگ کی ایک خوبصورت کار ہمارے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ اور اس میں سابق آرٹسٹ رمزی نے نکل کر مجھے کہا۔

"ہیلو کمانڈر!"

میرے بے لوث عزیز دوست جو تعداد میں بہت کم ہیں مجھے بڑے پیار سے بڑے پرخلوص لہجے میں کمانڈر کہتے ہیں۔ اور ان کا مطلب ہوتا ہے کہ تم کمانڈر شمانڈر کچھ نہیں ہو۔ ہمارے دوست ہو۔ ہمارے پاس

بیٹھو۔ ہمارے ساتھ باتیں کرو۔ لیکن جب سابق آرٹسٹ رمزی یا ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری یا پروفیسر ممتاز حسین مجھے کمانڈر کہتے ہیں تو ان کا مطلب ہوتا ہے کہ میاں تم افسانہ نگار وغیرہ کچھ نہیں ہو تم صرف کمانڈر ہو۔ اپنا کام کرو۔

اب سابق آرٹسٹ رمزی سے تو مجھے کوئی خطرہ نہیں۔ لیکن ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور پروفیسر ممتاز حسین کے خلاف میں نے جوابی حملوں کا انتظام کر لیا ہے۔ میں نے ارادہ کیا ہے کہ میں آئندہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کو صرف ڈاکٹر کہوں گا اور پروفیسر ممتاز حسین کو صرف پروفیسر اس طرح بہت سے لوگ ڈاکٹر سے مویشیوں کا ڈاکٹر سمجھیں گے اور پروفیسر سے بینڈ فیسر کو کب یا پروفیسر سامری۔ اور اگر وہ پھر بھی باز نہ آئے تو پھر میں ایک دن اُن کے سامنے کھڑا ہو کر اعلان کر دوں گا کہ میں بغیر کسی شک و شبہ کے ایک مکمل مکمل افسانہ نگار ہوں اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ میں تنقید نگار نہیں ہوں۔

میں نے آرٹسٹ رمزی کو سابق آرٹسٹ کہا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آرٹسٹ رمزی مصور ماضی ہے۔ اور وہ ہمارے ماضی کے آرٹ کا نمائندہ ہے۔ جس طرح چغتائی آرٹ۔ چغتائی آرٹ ماضی کا آرٹ ہونے کے باوجود حال اور مستقبل کا آرٹ بھی ہے۔ کیونکہ وہ زندہ جاوید ہے۔ سابق آرٹسٹ رمزی سے میری مراد یہ ہے کہ وہ کسی وقت میں آرٹسٹ ہوتا تھا اب وہ موٹروں کا دلال ہے۔

رمزی نے خوبصورت سرخ کار میں سے نکل کر کہا: "ہیلو کمانڈر!" — "ہیلو دیوانے"

دیوانہ دریابُردی نے تصحیح کرتے ہوئے کہا: "دیوانے نہیں۔ دیوانہ دریابُردی!"

رمزی نے ہنستے ہوئے جواب دیا: "حضرت دیوانہ دریابُردی، آپ کے تخلص کے ساتھ یہ بڑی ٹریجڈی ہے کہ گفتگو میں اور سٹیٹمنٹ میں دیوانہ اکثر دیوانے بن جاتا ہے۔ مثلاً دیوانے نے غزل پڑھی۔ دیوانے نے حجامت کروائی۔ اگر کہا جائے دیوانہ نے غزل سنائی اور دیوانہ نے حجامت بنوائی تو یہ غلط گرامر ہے۔"

پھر رمزی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "کمانڈر یہ کار پسند ہے۔ بڑی سستی مل رہی ہے۔ ٹیسٹ کر رہا ہوں۔ اچھی سروس دے رہی ہے۔ پندرہ میں مل جائے گی۔

میں نے کہا: "جناب میرے پاس پندرہ ہزار روپے کہاں ہیں۔

اُس نے مشورہ دیا: "اچھا میں یہ کار خرید لیتا ہوں تم دس میں میری کار خرید لو۔ او کے چیریو۔"

اس نے کار سٹارٹ کر لی۔

دیوانہ دریا بُردی نے جلدی سے کہا۔"بھئی، مجھے بھی ساتھ لے چلو۔"

سابق آرٹسٹ رمزی اور دیوانہ دریا بُردی چلے گئے۔

اچھا ہوا میں اکیلا رہ گیا۔ کچھ دیر پہلے ٹیڈی لڑکیوں کا ایک غول آیا تھا۔ میں اُن کو غور سے دیکھنا چاہتا تھا۔ اُن میں سے ایک لڑکی اپنے ٹیڈی ڈریس کے باوجود بڑی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک سوٹ کیس تھا۔ اس سوٹ کیس کے بوجھ سے اُس کے جواں سال جسم کے سڈول حصوں میں نہایت کا تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اور وہ اُس کے تنگ لباس کو پھاڑ کر باہر نکلے پڑتے تھے۔

لیکن کیا میں اُس لڑکی کے جسم کو دیکھ رہا تھا؟

نہیں میں اُس ٹیڈی گرل کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں اُس سوٹ کیس کو دیکھ رہا تھا جو اُس کے ہاتھ میں تھا۔

یہ لڑکی کلفٹن کے ساحل سے پکنک کر کے آئی تھیں اور اس سوٹ کیس میں غالباً ان لڑکیوں کے سوئمنگ سوٹ بند تھے۔ پھر میں اس سوٹ کیس کو غور سے کیوں دیکھ رہا تھا۔

یکایک اس سوٹ کیس میں اور اس شخص میں رشتہ پیدا ہو گیا، جس کو میں دیر سے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اُس کو پہچان لیا۔ یہ وہ شخص ہے جس نے مجھے سوٹ کیس دیا تھا۔

میں لاہور کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا میری پکچر فیل ہو گئی تھی۔ پروڈیوسر نے میرا معاوضہ دینے سے صاف انکار کر دیا تھا میرے پاس ہوٹل کا بل ادا کرنے اور کراچی کے ٹکٹ کے لئے ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ اُس دن شام کو یہ شخص میرے پاس آیا۔

اس نے کہا:"میں آج کراچی جا رہا تھا۔ لیکن کسی خاص وجہ سے مجھے یہاں رکنا پڑ گیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کراچی جا رہے ہیں۔ اگر زحمت نہ ہو تو آپ میری جگہ اس ٹکٹ پر سفر کیجئے۔ یہ لاہور سے کراچی تک سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ ہے۔ اور یہ ایک ہزار روپیہ آپ کے ضروری اخراجات کے لئے ہے۔ اس سفر کو ملتوی کرنے میں ہماری فرم کا لاکھوں کا نقصان ہے۔"

اس نے ٹکٹ اور ایک ہزار روپے کے نوٹ میرے سامنے میز پر رکھ دیئے اور اُٹھ کر جانے کے لئے کھڑا ہو گیا جاتے ہوئے اس نے کہا:"اب میں آپ سے رات کے دس بجے پلیٹ فارم پر ملوں گا۔ ایک آدمی ایک سوٹ کیس لائے گا۔ میں اس کو آپ کے کمپارٹمنٹ میں رکھوا دوں گا۔ کراچی سٹیشن پر اسی قسم کا ایک آدمی آ کر یہ سوٹ کیس اٹھا کر لے جائے گا۔ آپ ان دونوں آدمیوں سے کوئی بات نہ کیجئے اور اگر راستے میں اس

سوٹ کیس کے بارے میں کوئی تفتیش ہو جائے تو آپ کہیں گے کہ یہ سوٹ کیس آپ کا نہیں۔ اور ہم دونوں کے بارے میں آپ مکمل لاعلمی ظاہر کریں گے۔"

اس کی جلدی نے اور میری مالی حالت نے مجھے سوچنے کا موقعہ نہ دیا۔

اچھا! یہ ہے وہ آدمی!

سامنے سے این ڈی انصاری آتا ہوا نظر آیا۔ اُس کے ساتھ وہی سفید ریش بوڑھا تھا جو میں نے جونا مارکیٹ میں مسجد سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ اُس نے میلے ملیشیا کے کپڑے پہنے ہوئے تھے لیکن اُس کا جوتا نیا نہیں تھا۔

این ڈی انصاری نے تعارف کرایا: "ان سے ملئے یہ مغربی پاکستان میں سب سے بڑے جیب تراش ہیں۔"

پھر اُس نے بوڑھے سے مخاطب ہو کر کہا "فرہاد خان، ان کا بٹوا اور پین دے دو۔"

فرہاد خاں نے میرا بٹوا اور پین دے دیا۔ میرا بٹوا عید کی نماز کے بعد مسجد سے نکلتے ہوئے ہجوم میں گم ہو گیا تھا اور پین بس میں کسی نے نکال لیا تھا۔

انصاری نے کہا "فرہاد خان۔ اب تم جاؤ۔"

فرہاد خاں چلا گیا۔ انصاری میرے پاس بیٹھ گیا۔

میں نے کہا: "انصاری یہ کیا"

اُس نے جواب دیا: "جس دن فرہاد خاں نے آپ کا بٹوا اور پین نکالا ہے گینگ کے ساتھ میری ڈیوٹی تھی یہ چیزیں اُسی دن سے میرے پاس محفوظ پڑی تھیں۔ پچھلی دفعہ جب آپ کی مجھ سے ملاقات ہوئی ہے میں آپ کو یہ بتانے کی جرأت نہ کر سکا کہ آپ کی چوری میرے سامنے ہوئی پھر جب آپ نے مجرموں کی زندگی سے دلچسپی کا اظہار کیا تو یہ میرے لئے آسان ہو گیا۔"

میں نے: "پھر تم نے پچھلی ملاقات میں یہ چیزیں واپس کیوں نہ کیں؟"

"اس وقت آپ کے بٹوے کے پیسے مجھ سے خرچ ہو گئے تھے۔ آج آپ کو یہاں دیکھ کر میں یہ چیزیں ابھی ابھی لے کر آیا ہوں۔"

میں نے دیکھا کہ انصاری کے ذہن پر یہ باتیں گراں گذر رہی ہیں۔ اس لئے میں نے موضوع بدل دیا۔ میں نے

کہا "اب میں سمجھا کہ تم نے اپنی صورت کیوں بدل رکھی ہے"

اُس نے کہا "بنیادی جمہوریت کا نمائندہ چنا جانے کے بعد میں اپنی اصلی صورت کی طرف واپس آنے ہی والا تھا کہ ہماری یونین میں تنسیخ عائلی قوانین کمیٹی قائم ہو گئی اور مجھے اس کا صدر چن لیا گیا۔ چنانچہ مجھے اپنی موجودہ حیثیت جاری رکھنی پڑی مجھے عائلی قوانین کے خلاف تقریریں کرنی پڑتی ہیں اور ان کی مذمت میں عورتوں کے جلوس تنظیم دینے پڑتے ہیں۔ اس میں شوقوں کے علاوہ یہ حیثیت کمائی بھی بہت کام آتی ہے"

"ارے نور دین، تم عائلی قوانین کے خلاف بھی کام کر رہے ہو۔ یہ تو بڑی حماقت ہے عائلی قوانین تو عورتوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے بنے ہیں۔"

"مجھے آپ سے اتفاق نہیں۔ یہ قوانین سب عورتوں کی حفاظت نہیں کرتے۔ ان عورتوں کو ان قوانین سے سخت نقصان پہنچا ہے جن میں کوئی نہ کوئی نمایاں نقص ہو۔ ان بیچاریوں کی شادیاں صرف ان مردوں سے ہو سکتی ہیں جن کی پہلے شادیاں ہو چکی ہوں، عائلی قوانین نے ان کی شادیوں کے چانس بالکل ختم کر دیئے ہیں۔ چنانچہ میں اس وقت تک ایسی عورتوں کے چالیس جلوس نکلوا چکا ہوں۔ ان میں وہ عورتیں بھی شامل ہو جاتی ہیں جن کے شوہروں نے چار چار شادیاں کر رکھی ہیں۔ کیونکہ وہ چاہتی ہیں کہ وہ مصیبت میں پھنسی ہیں تو سب مصیبت میں پھنس جائیں۔"

میں نے کہا "میں یہ ہرگز ماننے کے لئے تیار نہیں کہ عائلی قوانین نے کسی کو نقصان پہنچایا ہے"

اُس نے کہا "مجھے پہنچایا ہے میری ایک مالدار بوڑھی عورت سے دوسری شادی ہونے ہی والی تھی کہ عائلی قوانین آ گئے۔ اور میرا دولت مند ہونے کا چانس مارا گیا۔ اور اس عورت کا شادی کا چانس مارا گیا۔ اب ادھر وہ عورتوں کو عائلی قوانین کے خلاف بھڑکا رہی ہے۔ ادھر میں آدمیوں کو ان کے خلاف اُکسا رہا ہوں۔ اور اس سلسلے میں ہم دونو کے لیڈری کے چانس بھی چمک اُٹھے ہیں"

یکایک کالے رنگ کی ایک بہت بڑی چمکدار کار کے ہارن نے سب کو چونکا دیا۔ وہ کار تقریباً درمیان میں آ کر رک گئی۔ اُس کار میں سے ایک لمبا تڑنگا شاندار آدمی نیلے رنگ کے سوٹ میں اور گہرے رنگ کا چشمہ لگائے باہر نکل کر کار کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اور ہجوم کو غور سے دیکھنے لگا۔

انصاری پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ وہ دیر تک نیلے سوٹ والے آدمی کو دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔

آخر میں نے پوچھا "انصاری کیا بات ہے؟"

انصاری چپ چاپ نیلے سوٹ والے آدمی کو دیکھتا رہا۔

میں نے پھر پوچھا: "کیا بات ہے انصاری؟"

انصاری نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر نہایت مدھم آواز میں مجھ سے بولا: "آج یہاں بڑے خوفناک واقعات پیش آنے والے ہیں۔"

"کیا؟"

"قتل!"

"کس کا؟"

"زیادہ سوالات مت کیجئے۔"

"یہ کون ہے؟"

"گینگ کا سردار۔"

میں نے اٹھ کر کہا: "میں جا رہا ہوں۔"

اُس نے اُسی رازدارانہ مدھم آواز میں کہا: "نہیں آپ کو آج رات کی گاڑی سے پشاور جانا ہے۔ ایک آدمی سٹیشن پر ایک سوٹ کیس لے کر آئے گا۔ ایسا ہی ایک آدمی اس کو پشاور سٹیشن پر اتار لے گا۔ دونوں آدمیوں سے کوئی بات نہ کیجئے۔ راستے میں سوٹ کیس کے بارے میں کوئی تفتیش ہو جائے تو کہیئے کہ سوٹ کیس آپ کا نہیں۔"

میں گھبرا گیا۔ اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا: "انصاری۔ نہیں مجھ سے یہ نہیں ہو گا میں ایسا نہیں کروں گا۔ مجھے جرائم سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں مجرموں کی زندگی کا مطالعہ نہیں کرنا چاہتا۔"

اور میں اُٹھ کر جلدی جلدی نئی کلفٹن کی طرف چل پڑا۔

فرشتہ

سعادت حسن منٹو

سُرخ کھردرے کمبل میں عطا اللہ نے بڑی مشکل سے کروٹ بدلی اور اپنی مندی ہوئی آنکھیں آہستہ آہستہ کھولیں کہرے کی دبیز چادر میں کئی چیزیں لپٹی ہوئی تھیں۔ جن کے خدوخال نظر نہیں آتے تھے۔ ایک لمبا بہت ہی لمبا، نہ ختم ہونے والا دالان تھا یا شاید کمرہ تھا جس میں دھندلی دھندلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایسی روشنی جو جگہ جگہ میلی ہو رہی تھی

دُور بہت دُور، جہاں شاید یہ کمرہ یا دالان ختم ہو سکتا تھا، ایک بہت بڑا بت تھا جس کا دراز قد چھت کو پھاڑتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ عطا اللہ کو اس کا صرف نچلا حصہ نظر آ رہا تھا جو بہت پر ہیبت تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید یہ موت کا دیوتا ہے جو اپنی ہولناک شکل دکھانے سے قصداً گریز کر رہا ہے۔

عطا اللہ نے ہونٹ گول کرکے اور زبان پیچھے کھینچ کر اس پُر ہیبت بت کی طرف دیکھا اور سیٹی بجائی، بالکل اسی طرح جس طرح کُتّے کو بلانے کے لیے بجائی جاتی ہے۔ سیٹی کا بجنا تھا کہ اس کمرے یا دالان کی دھندلی فضا میں ان گنت دُمیں لہرانے لگیں لہراتے لہراتے یہ سب ایک بہت بڑے شیشے کے مرتبان میں جمع ہو گئیں جو غالباً اسپرٹ سے بھرا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ مرتبان دھندلی فضا میں بغیر کسی سہارے کے تیرتا، ڈولتا اس کی آنکھوں کے پاس پہنچ گیا۔ اب وہ ایک چھوٹا سا مرتبان تھا جس میں اسپرٹ کے اندر اس کا دل ڈبکیاں لگا رہا تھا اور دھڑکنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

عطا اللہ کے حلق سے دبی دبی چیخ نکلی۔ اس مقام پر جہاں اس کا دل ہوا کرتا تھا۔ اس نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ رکھا اور بے ہوش ہو گیا۔

معلوم نہیں کتنی دیر کے بعد اسے ہوش آیا مگر جب اس نے آنکھیں کھولیں تو کہرا غائب تھا۔ وہ دیو ہیکل بت بھی اس کا سارا جسم پسینے میں شرابور تھا اور برف کی طرح ٹھنڈا۔ مگر اس مقام پر جہاں اس کا دل تھا ایک آگ سی لگی ہوئی تھی، ــــ اس آگ میں کئی چیزیں جل رہی تھیں بے شمار چیزیں۔ اس کی بیوی اور بچوں کی ہڈیاں تو چٹخ رہی تھیں مگر اس کے

گوشت پوست اور اس کی ہڈیوں پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ جھلس دینے والی تپش میں بھی وہ یخ بستہ تھا۔

اس نے ایک دم اپنے برفیلے ہاتھوں سے اپنی زرد رو بیوی اور سوکھے کے مارے ہوئے بچوں کو اٹھایا اور پھینک دیا — اب آگ کے اس الاؤ میں عرضیوں کے پلندے کے پلندے جل رہے تھے — ہر زبان میں لکھی ہوئی عرضیاں۔ ان پر اس کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے دستخط جل رہے تھے آواز پیدا کئے بغیر۔

آگ کے شعلوں کے پیچھے اُسے اپنا چہرہ نظر آیا۔ پسینے سے — سرد پسینے سے تر بتر۔ اس نے آگ کا ایک شعلہ پکڑا اور اس سے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر ایک طرف پھینک دیا۔ الاؤ میں گرتے ہی یہ شعلہ بھیگے ہوئے اسفنج کی طرح رونے لگا — عطاء اللہ کو اس کی یہ حالت دیکھ کر بہت ترس آیا۔

عرضیاں جلتی رہیں اور عطاء اللہ دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی زرد رو بیوی نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں گندھے ہوئے آٹے کا تھال تھا۔ جلدی جلدی اس نے پیڑے بنائے اور آگ میں ڈالنا شروع کر دیئے جو آنکھ جھپکنے کی دیر میں کوئلے بن کر سُلگنے لگے۔ انہیں دیکھ کر عطاء اللہ کے پیٹ میں زور کا درد اُٹھا۔ جھپٹا مار کر اس نے تھال میں سے آخری پیڑا اٹھایا اور منہ میں ڈال لیا لیکن آٹا خشک تھا۔ ریت کی طرح۔ اس کا سانس رُکنے لگا اور وہ پھر بے ہوش ہو گیا۔

اب اس نے ایک بے جوڑ خواب دیکھنا شروع کیا۔ ایک بہت بڑی محراب تھی جس پر جلی حروف میں یہ شعر لکھا تھا۔

روزِ محشر کہ جاں گداز بود
اولیں پرسشِ نماز بود

وہ فوراً پتھریلے فرش پر سجدے میں گر پڑا۔ نماز بخشوانے کے لئے دعا مانگنا چاہی۔ مگر بھوک اس کے معدے کو اس بُری طرح ڈسنے لگی کہ بلبلا اُٹھا۔ اتنے میں کسی نے بڑی بارعب آواز میں اُسے پکارا

"عطاء اللہ"

عطاء اللہ کھڑا ہو گیا — محرابوں کے پیچھے — بہت پیچھے اونچے منبر پر ایک شخص کھڑا تھا۔ مادر زاد برہنہ اس کے ہونٹ ساکت تھے، مگر آواز آ رہی تھی۔

عطاء اللہ تم کیوں زندہ ہو؟ آدمی صرف اس وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک اسے کوئی سہارا ہو — ہمیں بتاؤ، کوئی ایسا سہارا ہے جس کا تمہیں سہارا ہو؟ — تم بیمار ہو — تمہاری بیوی آج نہیں تو کل بیمار ہو جائے گی۔ وہ جن کا کوئی سہارا نہیں ہوتا، بیمار ہوتے ہیں — زندہ در گور ہوتے ہیں۔ اس کا سہارا تم ہو جو بڑی تیزی سے ختم ہو رہا

ہے۔ تمہارے بچے بھی ختم ہو رہے ہیں ۔۔۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم نے خود اپنے آپ کو ختم نہیں کیا۔ اپنے بچوں اور بیوی کو ختم نہیں کیا ۔ کیا اس خاتمے کے لئے بھی تمہیں کسی کے سہارے کی ضرورت ہے ۔۔ تم رحم و کرم کے طالب ہو ۔۔ بے وقوف، کون تم پر رحم کرے گا۔ موت کو کیا پڑی ہے کہ وہ تمہیں مصیبتوں سے نجات دلائے۔ اس کے لئے یہ مصیبت کیا کم ہے کہ وہ موت ہے ۔۔ کس کس کو آئے ۔۔ ایک طرف تم عطاء اللہ نہیں ہو، تم ایسے لاکھوں عطاء اللہ اس بھری دنیا میں موجود ہیں ۔۔ جاؤ اپنی مصیبتوں کا علاج خود کرو ۔۔ دو مریل بچوں اور ایک فاقہ زدہ بیوی کو ہلاک کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ اس بوجھ سے ہلکے ہو جاؤ تو موت شرمسار ہو کر خود بخود تمہارے پاس چلی آئے گی ۔"

عطاء اللہ غصے سے تھر تھر کانپنے لگا ۔۔ تم ۔۔ تم سب سے بڑے ظالم ہو ۔۔ بتاؤ تم کون ہو۔ اس سے پیشتر کہ میں اپنی بیوی اور بچوں کو ہلاک کروں، میں تمہارا خاتمہ کر دینا چاہتا ہوں ۔"

مادر زاد برہنہ شخص نے قہقہہ لگایا اور کہا: "میں عطاء اللہ ہوں ۔۔ غور سے دیکھو ۔۔ کیا تم اپنے آپ کو بھی نہیں پہچانتے ؟"

عطاء اللہ نے اس ننگ دھڑنگ آدمی کی طرف دیکھا اور اس کی گردن جھک گئی ۔۔ وہ خود ہی تھا، بغیر لباس کے اس کا خون کھولنے لگا جوش میں اس نے اپنے بڑھے ہوئے ناخنوں سے کھرچ کھرچ کر ایک پتھر نکالا اور تاک کر منبر کی طرف دیکھا ۔۔ اس کا سر ٹکرا گیا ۔ ماتھے پر ہاتھ رکھا تو اس میں سے لہو نکل رہا تھا ۔ وہ بھاگا ۔۔ پتھریلے صحن کو عبور کرکے جب باہر نکلا تو ہجوم نے اسے گھیر لیا ۔ ہجوم کا ہر فرد عطاء اللہ تھا جس کا ماتھا لہولہان تھا ۔

بڑی مشکلوں سے ہجوم کو چیر کر وہ باہر نکلا ۔ ایک تنگ و تاریک سڑک پر دیر تک چلتا رہا ۔ اس کے دونوں کناروں پر حشیش اور دھتورے کے پودے اُگے ہوئے تھے ۔ ان میں کہیں کہیں دوسری زہریلی بوٹیاں بھی تھیں عطاء اللہ نے جیب سے بوتل نکال کر دھتورے کا عرق جمع کیا ۔ پھر زہریلی بوٹیوں کے پتے توڑ کر اس میں ڈالے اور انہیں ملاتا ملاتا اس موڑ پر پہنچ گیا جہاں سے کچھ فاصلے پر اس کا مکان تھا ۔۔ شکستہ اینٹوں کا ڈھیر ۔

ٹاٹ کا بوسیدہ پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوا ۔۔ سامنے مٹی کے تیل کی کپّی سے کافی روشنی نکل رہی تھی اس مٹیالی روشنی میں عطاء اللہ نے دیکھا کہ جھلنگی پلنگڑی پر اس کے دونوں مریل بچے مرے پڑے ہیں

عطاء اللہ کو بہت ناامیدی ہوئی ۔ بوتل جیب میں رکھ کر جب وہ پلنگڑی کے پاس گیا تو اس نے دیکھا کہ وہ بھی پرانی گدڑی جو اس کے بچوں پر پڑی ہے آہستہ آہستہ ہل رہی ہے ۔ عطاء اللہ بہت خوش ہوا ۔۔ وہ زندہ تھے ۔ بوتل

جیب سے نکال کر وہ فرش پر بیٹھ گیا۔

دونوں لڑکے تھے ایک چار برس کا دوسرا پانچ کا — دونوں بھوکے تھے، دونوں ہڈیوں کا ڈھانچہ تھے گدڑی ایک طرف ہٹاکر جب عطاءاللہ نے ان کو غور سے دیکھا تو اسے تعجب ہوا کہ اتنے چھوٹے بچے اتنی سوکھی ہڈیوں پر اتنی دیر سے کیسے زندہ ہیں۔ اس نے زہر کی شیشی ایک طرف رکھ دی اور انگلیوں سے ایک بچے کی گردن ٹٹولتے ٹٹولتے۔ ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔ ہلکی سی تڑاخ ہوئی اور اس بچے کی گردن ایک طرف لٹک گئی۔ عطاءاللہ بہت خوش ہوا کہ اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے کام تمام ہوگیا۔ اسی خوشی میں اس نے اپنی بیوی کو پکارا "جیناں! جیناں — ادھر آؤ۔ دیکھو میں نے کتنی صفائی سے رحیم کو مار ڈالا ہے — کوئی تکلیف نہیں ہوئی اس کو۔"

اس نے ادھر ادھر دیکھا — زینب کہاں ہے؟ — معلوم نہیں کہاں چلی گئی ہے؟ — شاید بچوں کے لئے کسی سے کھانا مانگنے گئی ہو — یا ہسپتال میں اس کی خیریت دریافت کرنے — عطاءاللہ ہنسا — مگر اس کی ہنسی و" دب گئی، جب دوسرے بچے نے کروٹ بدلی اور اپنے مُردہ بھائی کو ہلانا شروع کیا "رحیم — رحیم"

وہ نہ بولا اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا — ہڈیوں کی چھوٹی چھوٹی سیاہ پیالیوں میں اس کی آنکھیں چمکیں: "ابا — تم آگئے۔"

عطاءاللہ نے ہولے سے کہا "ہاں کریم، میں آگیا۔"

کریم نے اپنی استخوانی ہاتھ سے رحیم کو جھنجوڑا "اٹھو رحیم — ابا آگئے ہسپتال سے۔"

عطاءاللہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "خاموش رہو — وہ سوگیا ہے۔"

کریم نے اپنے باپ کا ہاتھ ہٹایا "کیسے سوگیا ہے — ہم دونوں نے ابھی تک کچھ کھایا نہیں۔"

"تم جاگ رہے تھے؟"

"ہاں ابا۔"

"سو جاؤ گے ابھی تم۔"

"کیسے؟"

"میں سلاتا ہوں تمہیں۔" یہ کہہ کر عطاءاللہ نے اپنی سخت انگلیاں کریم کی گردن پر رکھیں اور اس کو مروڑ دیا۔ مگر تڑاخ کی آواز پیدا نہ ہوئی۔

کریم کو بہت درد ہوا "ابا آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"کچھ نہیں" عطاء اللہ حیرت زدہ تھا کہ اس کا یہ دوسرا لڑکا اتنا سخت جان کیوں ہے "کیا تم سونا نہیں چاہتے؟"
کریم نے اپنی گردن سہلاتے ہوئے جواب دیا "سونا چاہتا ہوں۔ کچھ کھانے کو دے دو۔ سو جاؤں گا"
عطاء اللہ نے زہر کی شیشی اٹھائی "پہلے یہ دوائی لو"
"اچھا" کریم نے اپنا مُنہ کھول دیا۔
عطاء اللہ نے ساری شیشی اس کے حلق میں انڈیل دی اور اطمینان کا سانس لیا "اب تم گہری نیند سو جاؤ گے"
کریم نے اپنے باپ کا ہاتھ پکڑا اور کہا "ابا ۔۔ اب کچھ کھانے کو دو"
عطاء اللہ کو بہت کوفت ہوئی "تم مرتے کیوں نہیں؟"
کریم ہنس کر سپٹا سا گیا "کیا ابا؟"
"تم مرتے کیوں نہیں ۔۔ میرا مطلب ہے اگر تم مر جاؤ گے تو نیند بھی آجائے گی تمہیں"
کریم کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا باپ کیا کہہ رہا ہے "مارتا تو اللہ میاں ہے ابا"

اب عطاء اللہ کی سمجھ میں آیا کہ وہ کیا کہے "مارا کرتا تھا کبھی ۔۔ اب اس نے یہ کام چھوڑ دیا ہے ۔۔ چلو اٹھو" بلنگڑی پر کریم تھوڑا سا اٹھا تو عطاء اللہ نے اسے اپنی گود میں لے لیا اور سوچنے لگا کہ وہ اللہ میاں کیسے بنے ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر جب باہر گلی میں نکلا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے آسمان اس پر جھکا ہوا ہے۔ اس میں جا بجا مٹی کے تیل کی کپیاں جل رہی تھیں۔ اللہ میاں خدا جانے کہاں تھا ۔۔ اور زینب بھی ۔۔ معلوم نہیں وہ کہاں چلی گئی تھی۔

کہیں سے کچھ مانگنے گئی ہوگی ۔۔ عطاء اللہ ہنسنے لگا لیکن فوراً اسے خیال آیا کہ اسے اللہ میاں بننا تھا۔ سامنے موری کے پاس بہت سے پتھر پڑے تھے۔ اس پر وہ اگر کریم کو دے مارے تو ۔۔

مگر اس میں اتنی طاقت نہیں تھی۔ کریم اس کی گود میں تھا۔ اس نے کوشش کی کہ اسے اپنے بازوؤں میں اٹھائے اور سر سے اوپر لے جا کر پتھروں پر پٹک دے۔ مگر اس کی طاقت جواب دے گئی۔ اس نے کچھ سوچا اور اپنی بیوی کو آواز دی "جیناں ۔۔ جیناں"

زینب معلوم نہیں کہاں ہے ۔۔ کہیں وہ اس ڈاکٹر کے ساتھ تو نہیں چلی گئی جو ہر وقت اس سے اتنی ہمدردی کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ وہ ضرور اس کے فریب میں آگئی ہوگی۔ میرے لئے اس نے کہیں خود کو بیچ تو نہیں دیا۔
یہ سوچتے ہی اس کا خون کھول اٹھا۔ کریم کو پاس بہتی ہوئی بدرو میں پھینک کر وہ ہسپتال کی طرف بھاگا۔

اتنا تیز دوڑا کہ چند منٹ میں ہسپتال پہنچ گیا۔

رات نصف سے زیادہ گذر چکی تھی۔ چاروں طرف سناٹا تھا جب وہ اپنے وارڈ کے برآمدے میں پہنچا تو دو آوازیں سنائی دیں۔ ایک اس کی بیوی کی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی "تم دغاباز ہو — تم نے مجھے دھوکا دیا ہے — اس سے جو کچھ تمہیں ملا ہے تم نے اپنی جیب میں ڈال لیا ہے"

کسی مرد کی آواز سنائی دی "تم غلط کہتی ہو — تم اس کو پسند نہیں آئیں۔ اس لئے وہ چلا گیا"

اس کی بیوی دیوانہ وار چلائی "بکواس کرتے ہو — ٹھیک ہے کہ میں دو بچوں کی ماں ہوں — میرا وہ پہلا سا رنگ روپ نہیں رہا — لیکن وہ مجھے قبول کر لیتا۔ اگر تم بھاگی نہ مارتے — تم بہت ظالم ہو — بڑے کٹھور ہو" اس کی آواز گلے میں رندھنے لگی "میں کبھی تمہارے ساتھ نہ چلتی — میں کبھی اس ذلت میں نہ گرتی۔ اگر میرا خاوند بیمار اور میرے بچے کئی دنوں کے بھوکے نہ ہوتے — تم نے کیوں یہ ظلم کیا؟"

اس مرد نے جواب دیا "وہ — وہ کوئی بھی نہیں تھا — میں خود تھا — جب تم میرے ساتھ چل پڑیں تو میں نے خود کو پہچانا — اور تم سے کہا کہ وہ چلا گیا ہے — وہ جس کے لئے میں تمہیں لایا تھا — مجھے معلوم ہے کہ تمہارا خاوند مر جائے گا — تمہارے بچے مر جائیں گے۔ تم بھی مر جاؤ گی — لیکن"

"لیکن کیا؟" اس کی بیوی نے تیکھی آواز میں پوچھا۔

"میں مرتے دم تک زندہ رہوں گا — تم نے مجھے اس زندگی سے بچا لیا ہے جو موت سے کہیں زیادہ خوفناک ہوتی — چلو آؤ — عطاء اللہ تمہیں بلا رہا ہے"

"عطاء اللہ یہاں کھڑا ہے" عطاء اللہ نے بھینچی ہوئی آواز میں کہا۔

دو سائے پلٹے — اس سے کچھ فاصلے پر وہ ڈاکٹر کھڑا تھا جو زینب سے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اس کے منہ سے صرف اس قدر نکل سکا تھا "تم!"

"ہاں میں..... تمہاری سب باتیں سن چکا ہوں" یہ کہہ کر عطاء اللہ نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا "جیناں — میں نے رحیم اور کریم دونوں کو مار ڈالا ہے — اب میں اور تم باقی رہ گئے ہیں"

زینب چیخی "مار ڈالا تم نے دونوں بچوں کو؟"

عطاء اللہ نے بڑے پرسکون لہجے میں کہا "ہاں — انہیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ تمہیں بھی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب جو موجود ہیں"

ڈاکٹر کانپنے لگا — عطاء اللہ آگے بڑھا اور اس سے مخاطب ہوا "ایسا انجکشن دے دو کہ فوراً مر جائے"

ڈاکٹر نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنا بیگ کھولا اور سرنج میں زہر بھر کے زینب کے ٹیکہ لگا دیا۔ ٹیکہ لگتے ہی وہ فرش پہ گری اور مر گئی۔ اس کی زبان پر آخری الفاظ میرے بچے — میرے بچے، تھے مگر اچھی طرح ادا نہ ہو سکے۔ عطاء اللہ نے اطمینان کا سانس لیا "چلو یہ بھی ہو گیا — اب میں باقی رہ گیا ہوں۔"

"لیکن ...... لیکن میرے پاس زہر ختم ہو گیا ہے۔" ڈاکٹر کے لہجے میں لکنت تھی۔

عطاء اللہ تھوڑی دیر کے لئے پریشان ہو گیا، لیکن فوراً سنبھل کر اس نے ڈاکٹر سے کہا "کوئی بات نہیں — میں اندر اپنے بستر پر لیٹتا ہوں۔ تم بھاگ کر زہر لے آؤ۔"

بستر پر لیٹ کر سُرخ کھردرے کمبل میں اس نے بڑی مشکل سے کروٹ بدلی اور اپنی مندھی ہوئی آنکھیں آہستہ آہستہ کھولیں۔ کہرے کی چادر میں کئی چیزیں لپٹی ہوئی تھیں، جن کے صحیح خدوخال نظر نہیں آتے تھے — ایک لمبا بہت ہی لمبا، نہ ختم ہونے والا دالان تھا — یا شاید کمرہ جس میں دھندلی دھندلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایسی روشنی جو جگہ جگہ میلی ہو رہی تھی۔

دور بہت دور ایک فرشتہ کھڑا تھا جب وہ آگے بڑھنے لگا تو چھوٹا ہوتا گیا۔ عطاء اللہ کی چارپائی کے پاس پہنچ کر وہ ڈاکٹر بن گیا۔ وہی ڈاکٹر جو اس کی بیوی سے ہر وقت ہمدردی کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اور اسے بڑے پیار سے دلاسا دیتا تھا۔

عطاء اللہ نے اسے پہچانا تو اُٹھنے کی کوشش کی "آیئے ڈاکٹر صاحب۔"

مگر وہ ایک دم غائب ہو گیا۔ عطاء اللہ لیٹ گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ کہرا دُور ہو چکا تھا۔ معلوم نہیں کہاں غائب ہو گیا تھا۔

اس کا دماغ بھی صاف تھا۔ ایک دم وارڈ میں شور بلند ہوا۔ سب سے اونچی آواز جو چیخ سے مشابہ تھی، زینب کی تھی۔ اس کی بیوی کی۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی — معلوم نہیں کیا کہہ رہی تھی۔ عطاء اللہ نے اُٹھنے کی کوشش کی۔ زینب کو آواز دینے کی کوشش کی مگر ناکام رہا — دھند پھر چھانے لگی اور دالان لمبا — بہت لمبا ہوتا چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد زینب آئی۔ اس کی حالت دیوانوں کی سی ہو رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے عطاء اللہ کو جھنجوڑنا شروع کیا "میں نے اُسے مار ڈالا ہے۔ میں نے اس حرامزادے کو مار ڈالا ہے۔"

"کس کو؟"

"اسی کو جو مجھ سے اتنی ہمدردی جتایا کرتا تھا...... اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ تمہیں بچا لے گا...... وہ جھوٹا تھا

.... دغا باز تھا اس کا دل توے کی کالک سے بھی زیادہ کالا تھا ۔ اس نے مجھے ۔ اس نے مجھے ۔" اس کے آگے زینب کچھ نہ کہہ سکی ۔

عطاء اللہ کے دماغ میں بے شمار خیالات آئے اور آپس میں گڈمڈ ہو گئے ۔ "تمہیں تو اس نے مار ڈالا تھا ؟"

زینب چیخی : "نہیں میں نے اسے مار ڈالا ہے ۔"

عطاء اللہ چند لمحے خلا میں دیکھتا رہا ۔ پھر اس نے زینب کو ہاتھ سے ایک طرف ہٹایا : "تم ادھر ہو جاؤ ۔ وہ آ رہا ہے ۔"

"کون ؟"

وہی ڈاکٹر ۔۔۔ وہی فرشتہ ۔"

فرشتہ آہستہ آہستہ اس کی چارپائی کے پاس آیا اس کے ہاتھ میں زہر بھری سرنج تھی ۔ عطاء اللہ مسکرایا : "لے آئے ۔"

فرشتے نے اثبات میں سر ہلایا : "ہاں لے آیا ۔"

عطاء اللہ نے اپنا لرزاں بازو اس کی طرف بڑھایا : "تو لگا دو ۔"

فرشتے نے سوئی اس کے بازو میں گھونپ دی ۔

عطاء اللہ مر گیا ۔

زینب اسے جھنجوڑنے لگی : "اٹھو ۔۔۔ اٹھو ، کریم رحیم کے ابا اٹھو ۔۔۔ یہ ہسپتال بہت بری جگہ ہے ۔ چلو گھر چلیں ۔"

تھوڑی دیر کے بعد پولیس آئی اور زینب کو اس کے خاوند کی لاش پر سے ہٹا کر اپنے ساتھ لے گئی ۔

سیاہ فام

شوکت صدیقی

سڑک کے ایک موڑ سے کئی آوارہ کتے نکل کر زور زور سے بھونکنے لگے اس نے جھنجلا کر کتوں کو موٹی سی گالی دی۔ سامنے نظر ڈالی تو دل دھک سے رہ گیا۔ ایک سایہ کار کی تیز روشنی میں لہرایا۔ اندھیرے میں ایک دردناک انسانی چیخ ابھری، کار اچانک زور سے اچھلی اور سڑک کے کنارے لگے ہوئے بجلی کے کھمبے سے جا کر زور سے ٹکرا گئی۔

یہ سب کچھ آناً فاناً ہوا۔ وہ ذرا دیر تک تو ہکا بکا سا اسٹیرنگ پر بُت بنا بیٹھا رہا۔ پھر وہ کار سے نکل کر باہر آ گیا۔

سڑک کے بیچوں بیچ کوئی پڑا کراہ رہا تھا وہ سہما ہوا اس کے پاس گیا تاروں کی دھندلی روشنی میں اس نے دیکھا، ایک لمبا چوڑا آدمی اوندھے منہ لیٹا تھا۔ اس کے چاروں طرف خون ہی خون پھیلا تھا۔ دور دور تک کسی انسان کا پتہ نہ تھا۔ ہر طرف گہرا اندھیرا تھا اور میلوں تک پھیلی ہوئی سنسان سڑک، موقعہ غنیمت تھا۔ ودّانی نے کپکپاتے ہاتھوں سے اس کو گھسیٹ کر سڑک کے کنارے کیا اور جلدی سے کار کے اندر جا کر اس کو اسٹارٹ کرنے لگا مگر کار اسٹارٹ نہ ہوئی۔

جب وہ ہر کوشش کے باوجود بھی کار اسٹارٹ نہ کر سکا تو مجبوراً اتر کر نیچے آ گیا۔ ایک بار وہ پھر ڈرتے ڈرتے خون میں ڈوبے ہوئے آدمی کے پاس گیا، اب اس نے کراہنا بند کر دیا اور آنکھیں بند کئے پڑا تھا ودّانی اس کے قریب وحشت زدہ سا کھڑا سوچتا رہا کہ اب کیا کیا جائے۔ کئی بار اس نے سوچا کہ کار چھوڑ کر وہاں سے پیدل ہی بھاگ کھڑا ہو مگر وہ ایسا نہ کر سکا اس لئے کہ کار کی موجودگی اس کے خلاف پورا پورا ثبوت بہم پہنچا سکتی تھی۔

کوئی پندرہ منٹ بعد سڑک پر موٹر کی روشنی جھلکتی نظر آئی۔

ذرا ہی دیر بعد ایک ٹرک گھڑگھڑاتا ہوا اس کے قریب آگیا۔ اس نے اپنے حواس درست کئے۔ آگے بڑھ کر ٹرک کو رکوایا اور ڈرائیور سے قریب جاکر کہنے لگا۔

"ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے مجھ کو فوراً تھانے تک لے چلو۔"

ٹرک کے اندر ڈرائیور سے ہمراہ ایک آدمی اور بیٹھا تھا۔ دونوں نے باہر جھانک کر دیکھا۔ ان کے سامنے خون میں لتھڑا ہوا ایک کالا کلوٹا آدمی پڑا تھا۔ ذرا آگے بڑھ کر ایک موٹر کھڑی تھی جس کا اگلا حصہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ ڈرائیور نے گھبرا کر پوچھا۔

"بڑا زبردست ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ کیا ایک دم سامنے آگیا تھا؟"

درانی تیزی سے بولا "باتیں کرنے کا وقت نہیں۔ مجھ کو جلدی لے چلو۔"

وہ جھٹ سے ٹرک پر چڑھ گیا اور ٹرک شور کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ تھانہ وہاں سے کوئی میل بھر پر تھا۔ درانی ٹرک سے اتر کر سیدھا تھانہ کے اندر چلا گیا۔ رات کی ڈیوٹی پر جو سب انسپکٹر تعینات تھا دروازے ہی پر اس درانی سے اس کی مڈبھیڑ ہوگئی۔ وہ اس وقت گشت پر جا رہا تھا۔ درانی نے اس کو علیٰحدہ لے جاکر حادثہ کی نوعیت بتائی۔ دو سو روپے زبردستی اس کی جیب میں ڈالے اور جب ذرا اطمینان ہوگیا تو اس کو لئے ہوئے ڈیوٹی روم میں پہنچا۔ چھوٹے بھائی کو ٹیلیفون پر ہدایت کی کہ وہ اسٹیشن ویگن لے کر فوراً تھانہ آجائے۔

آدھ گھنٹہ کے اندر اندر اسٹیشن ویگن تھانہ پر موجود تھی۔ درانی اور سب انسپکٹر دو کانسٹیبلوں کے ہمراہ اس میں سوار ہوکر موقعہ واردات کی طرف چل دیئے۔ جب وہ وہاں پہنچے تو سڑک اسی طرح سنسان پڑی تھی۔ وہ آدمی خاک پر بے سدھ پڑا تھا۔ سب انسپکٹر نے اس کے جسم کو چھو کر دیکھا۔ ابھی تک وہ زندہ تھا۔ البتہ بہت سا خون بہہ چکا تھا۔ سب سے پہلا کام یہ کیا گیا کہ زخمی کو اسٹیشن ویگن میں ڈال کر ہسپتال پہنچایا گیا۔

رات کے پچھلے پہر جب درانی گھر پہنچا تو بے حد تھکا ہوا تھا۔ ہسپتال سے اس کو یہ رپورٹ مل ہی چکی تھی کہ زخم مہلک نہیں آئے ہیں البتہ ایک ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ کر چکنا چور ہوگئی تھی۔ لہٰذا وہ ایکسیڈنٹ سے بے نیاز ہوکر اس وقت صرف یہ سوچ رہا تھا کہ کار کو جو نقصان پہنچا ہے اس کے عوض بیمہ کمپنی سے کس طرح پانچ ہزار کی رقم وصول کی جائے۔ وہ دیر تک بستر پر پڑا اس کے متعلق اسکیم بناتا رہا۔

یہ تو پتہ نہیں کہ پولیس کے روزنامچے میں حادثہ کی کیا رپورٹ درج کی گئی البتہ بعض اخبارات میں اس ایکسیڈنٹ سے متعلق جو خبریں شائع ہوئیں ان سے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ اس آدمی کا نام عبداللہ تھا۔ رکشا چلایا کرتا تھا۔ حادثہ کی رات وہ مالک کو رکشا واپس کر کے گھر لوٹ رہا تھا۔ نکلسن روڈ کے موڑ پر وہ ایک تیز رفتار کار کی زد میں آگیا۔ زخم ایسا کاری لگا تھا کہ وہ اسی وقت بے ہوش ہو گیا۔ جب اس کو ہوش آیا تو وہ ہسپتال میں تھا۔

عبداللہ ڈیڑھ ماہ تک سرجیکل وارڈ میں پڑا رہا۔ جس روز اس کو ہسپتال سے چھٹی ملی تو اس کو وہاں لینے صرف اس کی بیوی آئی تھی۔ کالا کلوٹا عبداللہ جس کی ایک ٹانگ کٹ چکی تھی اور جس کی چودہ سالہ لڑکی ایک دوسرے رکشا والے کے ساتھ فرار ہو گئی تھی۔ اور جو اب بیساکھی کے سہارے چل رہا تھا۔ اس کا چوڑا چکلا جسم کبڑوں کی طرح جھک گیا تھا۔

اب وہ تمام دن کوٹھری میں پڑا کھانستا رہتا۔ بات بات پر بیوی سے لڑ پڑتا۔ اس کو بے تحاشا گالیاں دیتا اور مارنے کی دھمکیاں دیا کرتا۔ اس کا رنگ اور سیاہ ہو گیا تھا، داڑھی بڑھ کر بے ترتیب ہو گئی تھی۔ آنکھوں سے ہر وقت وحشت برسا کرتی۔ اس کا چہرہ روز بروز خوفناک ہوتا جا رہا تھا۔ ملنے جلنے والے جو از راہِ ہمدردی کبھی کبھار اس کے پاس آکر گھڑی دو گھڑی بیٹھ جاتے تھے۔ اب وہ بھی اس سے کترانے لگے تھے۔

عبداللہ جس محلہ میں رہتا تھا اس کی آبادی زیادہ تر نچلے طبقے کے افراد پر مشتمل تھی۔ بستی میں ہر طرف جھکی ہوئی چھتوں والے نیم پختہ مکانات تھے۔ چند قدیم وضع کی عمارتیں تھیں جو امتدادِ زمانہ سے کھنڈر بن گئی تھیں۔ درمیان میں انگریزوں کا پرانا قبرستان تھا جس کے چاروں طرف پختہ چار دیواری تھی۔ قبرستان میں ایک اونچی سی لاٹ تھی جس پر سنگِ مرمر کا ایک کتبہ آویزاں تھا۔ یہ کسی کرنل کی قبر تھی جس کی تمام زندگی میدانِ جنگ میں غنیم سے لڑتے گزری تھی مگر اس کی موت خودکشی سے واقع ہوئی تھی۔ محلہ بھر میں مشہور تھا کہ مرنے کے بعد کرنل بھوت بن گیا ہے۔ اکثر سنسان راتوں میں لوگوں نے اس کو گلیوں میں منڈلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ تھی کہ جب کبھی بھی وہ کسی کو نظر آیا تو اس کی زبان پر ایک ہی سوال ہوتا "مکھن توش"۔ خدا معلوم اس کی اس طلب کا کیا پسِ منظر تھا البتہ اتنا ضرور ہے کہ جب کسی سے بھی اس کی مڈبھیڑ ہوئی اس نے ہمیشہ یہی آواز سنی۔ اور یہ آواز اتنی خوفناک ہوتی کہ اچھے بھلے جی دار آدمی کے اوسان خطا ہو جاتے اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتا۔ یہی وجہ تھی کہ قبرستان کے احاطہ کے ساتھ ساتھ جو تنگ سی گلی جاتی تھی رات

گئے راہگیر اس سے گزرتے ہوئے ڈرتے تھے۔

اس کے علاوہ محلہ کی دوسری خصوصیت سکینہ بیگم تھیں جن کے شوہر لاکھوں روپے کی جائیداد چھوڑ کر مرے تھے۔ صرف ایک لڑکا تھا وہ بھی چند سال ہوئے کہ گھر سے روٹھ کر چلا گیا تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ اس نے ماں سے ارہر کی کھچڑی کی فرمائش کی تھی۔ سکینہ بیگم کی اس روز طبیعت کچھ ناساز تھی۔ باورچی نے کچھ توجہ نہ دی۔ دسترخوان پر کھچڑی نہ پاکر صاحب زادے اس قدر برافروختہ ہوئے کہ بغیر کچھ کھائے پیئے دسترخوان سے اٹھ گئے اس کے بعد اس کو کسی نے نہیں دیکھا۔ البتہ کچھ عرصہ بعد یہ اطلاع ملی کہ وہ ٹرین کے حادثہ میں ہلاک ہو گیا۔ اس بات کے کئی عینی گواہ تھے مگر سکینہ بیگم کسی طرح اس بات کو ماننے پر رضامند نہ تھیں۔ اگر کوئی ایسی بات کہتا بھی تو اس کے پیچھے ہاتھ دھوکر پڑ جاتیں۔ ایک سانس میں ہزاروں کوسنے دے ڈالتیں۔ لہٰذا سب نے اس حقیقت کا ان سے اظہار ہی کرنا چھوڑ دیا تھا بلکہ بعض عورتوں نے ان کو ٹھگنا شروع کر دیا وہ آئے دن کوئی نت نیا قضیہ گھڑ لاتیں اور ان سے کچھ نہ کچھ اینٹھ کر لے جاتیں۔ ہر تہوار پر وہ اپنے بیٹے کا نیا جوڑا سلواتیں۔ خاندان کی ہر خوبصورت لڑکی کے لئے اپنے بیٹے کا پیغام دے دیتیں۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر مشاطائیں بلواتیں اور ان کے ذریعہ بہو تلاش کرواتیں۔ کوئی پوچھتا تو مسکرا کر کہتیں "بس آنے ہی والا ہے۔ ابھی کل ہی تو ایک شخص آیا تھا جس سے اس نے میری خیریت دریافت کروائی ہے" کبھی کبھی وہ اس کے خط کا بھی حوالہ دیتیں اور پھر مزے لے لے کر خواہ مخواہ ایک طول طویل قصہ سنا ڈالتیں۔ پھر روز وہ اس کے آنے کا انتظار کرتیں۔ ہر شام ارہر کی کھچڑی تیار ہوتی اور صبح باسی ہو جاتی جس سے محلے کے کسی مسکین کا پیٹ پل جاتا۔ کئی سال سے یہی سلسلہ چل رہا تھا۔ جب سے عبداللہ ایک ٹانگ سے معذور ہوا تھا اس کھچڑی میں سے اس کو بھی حصہ مل جاتا۔ سویرے ہی سویرے اس کی بیوی بارہ دری کی ڈیوڑھی پر پہنچ جاتی اور جب واپس لوٹتی تو دونوں میاں بیوی کے لئے ایک وقت کے کھانے کا بندوبست ہو جاتا۔

عبداللہ کے دن اسی طرح کٹ رہے تھے اتفاق سے اس کی بیوی بیمار پڑ گئی۔ طبیعت اچانک کچھ ایسی گڑبڑ ہوئی کہ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گئی۔ عبداللہ کو متواتر کئی روز فاقہ کرنا پڑا۔ آخر جب کوئی صورت نظر نہ آئی تو ایک روز رات گئے اس نے بیساکھی سنبھالی اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ دسمبر کا مہینہ تھا آسمان پر بادل گھرے ہوئے تھے۔ غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ سر شام ہی سے محلہ میں سناٹا پڑ گیا تھا۔ عبداللہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا قبرستان سے ملحق تنگ و تاریک گلی میں داخل ہوا تو اس کو دھندلی روشنی میں کسی

آدمی کا سایہ نظر آیا۔ وہ اسی طرف آ رہا تھا۔ عبداللہ وہیں ٹھہر گیا جب وہ قریب آیا تو عبداللہ نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیا۔ وہ آدمی ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس نے عبداللہ کے چہرے کی جانب دیکھا اور یکبارگی اس کی گھگھی بندھ گئی۔ پھر وہ حلق کے اندر سے نہ جانے کیسی کیسی آوازیں نکالتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔ گھبراہٹ میں اس کے ہاتھ میں دبا ہوا ایک بنڈل بھی گر پڑا۔

عبداللہ خود بھی گھبرا گیا۔ لمحہ بھر تک وہ سکتے کے سے عالم میں کھڑا رہا پھر اس نے بڑھ کر بنڈل اٹھایا۔ کھول کر دیکھا۔ گرم گرم امرتیاں تھیں۔ عبداللہ کی باچھیں کھل گئیں۔ فوراً ہی گھر پہنچا۔ دونوں میاں بیوی نے مزا لے کر امرتیاں کھائیں اور اللہ کا شکر ادا کیا۔

دوسرے روز رات کو عبداللہ پھر گلی میں پہنچا اس وقت کچھ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ اندھیرا بہت گہرا تھا۔ سردی اور بڑھ گئی تھی۔ وہ دیر تک گلی میں کھڑا رہا مگر کوئی بھولے سے بھی اس طرف سے نہیں گزرا۔ سردی کے مارے اس کا جسم کپکپا رہا تھا۔ آخر جب وہ مایوس ہو کر واپس لوٹ رہا تھا تو اچانک ایک موٹا سیٹھ گلی میں داخل ہوا۔ عبداللہ نے اس کے قریب جاکر بجائے ہاتھ پھیلانے کے ناک میں منمنا کر کہا۔

"ذرا ٹھہر جانا بھائی!"

عبداللہ کا ہیبت ناک چہرہ، بھوتوں کا سا لہجہ اور سنسان رات۔ اس آدمی پر کچھ ایسا خوف طاری ہوا کہ کئی لمحے تک تو وہ آنکھیں پھاڑے چیخنے کی بے سود کوشش کرتا رہا اور پھر بے ہوش ہو کر وہیں گر پڑا۔ عبداللہ نے اطمینان سے چادر میں سوا سیر ہرنگ پھلیاں باندھیں اور چپ چاپ گھر آگیا۔

ان دو واقعات سے محلہ بھر میں سنسنی پھیل گئی۔ لوگوں میں چرچا ہونے لگا کہ کرنل کا بھوت اب راہگیروں کو بہت پریشان کرنے لگا ہے۔ پاس پڑوس کے رہنے والوں پر خاصی دہشت طاری ہو گئی تھی۔ عبداللہ نے اس خوف سے اور بھی فائدہ اٹھایا جب راستے سنسان پڑ جاتے تو وہ چپ چاپ گلی کے اندھیرے میں دبک کر کھڑا ہو جاتا۔ ادھر کوئی راہگیر گلی میں داخل ہوا اور وہ اس کی تاک میں لگ گیا۔ قریب آتے ہی وہ بڑی ہیبت ناک آواز میں کہتا "مکھن توش دو" اب اس نے باقاعدہ کرنل کے بھوت کا روپ اختیار کر لیا تھا اور اس کا یہ حربہ کارگر بھی ثابت ہوا۔ پہلے وہ صرف کھانے پینے کی چیزوں ہی پر اکتفا کر لیتا تھا پھر ایسا بھی ہوا کہ اگر آدمی بے ہوش ہو جاتا تو وہ اس کی جیبیں ٹٹول کر ساری نقدی اپنے قبضہ میں کر لیتا۔

محلے میں کرنل کے بھوت کا چرچا روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ لوگوں میں خوف و ہراس زیادہ پھیل گیا تھا ادھر عبداللہ اپنے کام میں اتنا بڑھ گیا تھا اور اس کی ہمت اتنی بڑھ گئی تھی کہ اکثر تو وہ چھپ کر آدمی کو دبوچ بھی لیتا تھا کسی کو صرف قہقہہ لگا کر خوفزدہ کر دیتا۔ کسی کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لی۔ کسی کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا جیسا موقعہ ہوتا وہ اسی مناسبت سے نیا حربہ استعمال کرتا۔

پھر ایک ایسا وقت آیا کہ راہگیروں نے رات کو قبرستان کے پاس والی گلی سے بالکل گزرنا چھوڑ دیا۔ مگر عبداللہ پر اس کا بھی اثر نہ ہوا۔ اس نے گلی سے باہر نکل کر سنسان راتوں کے اندھیرے میں راہگیروں سے اپنا "ٹیکس" وصول کرنا شروع کر دیا۔ یہ سلسلہ بھی ایک مدت تک چلتا رہا۔

محلے والے کچھ اس قدر خوفزدہ ہو گئے تھے کہ سرِ شام ہی ہر طرف ہُو کا عالم طاری ہو جاتا اور اس ہولناک سناٹے میں عبداللہ اطمینان سے کسی گلی کی نکڑ پر دیوار سے لگا ہوا موجود ہوتا۔ اس کا چہرہ اب اور بھی خوفناک ہو گیا تھا۔ آنکھوں کی وحشت بڑھ گئی تھی اور آواز میں دم توڑتے ہوئے انسان کا سا کرب پیدا ہو گیا تھا۔ وہ دن بھر کوٹھڑی میں پڑا سویا کرتا اور پھر رات گزرتے ہی کمبل میں سارے جسم کو لپیٹ کر بیساکھی کے سہارے گھر سے باہر آ جاتا اور رات گئے تک سنسان گلیوں کے اندھیرے میں شکار کی تلاش میں مارا مارا پھرتا۔

اتفاق ہوا کہ عبداللہ کو کئی روز تک کوئی شکار نہیں ملا۔ اس کی بیوی نے سکینہ بیگم کے گھر ایک مدت سے آمدورفت بند کر دی تھی لہٰذا دونوں کو مسلسل کئی وقت سے فاقے کرنے پڑے۔ اس رات عبداللہ بڑی بے چینی کے عالم میں اندھیری گلیوں میں منڈلا رہا تھا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر گئی مگر کوئی بھولا بھٹکا راہگیر اس کو نہیں ملا۔ اس کی بے چینی اور بڑھ گئی، اس لئے کہ اب رات کی وہ گھڑی قریب آ رہی تھی جب صرف گشت کرنے والے کانسٹیبلوں کے بھاری بھاری قدموں کی آہٹ سنائی پڑتی اور جن کی نظروں سے بچنے کے لئے اس کو بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا۔

آخر جب وہ ناامید ہو گیا تو اس نے ایک نئی تجویز سوچی۔ کئی مکانوں کے دروازوں سے کان لگا کر اس نے اندر کی آہٹ لی اور پھر ایک دروازہ پر جا کر آہستہ سے دستک دی لیکن اس وقت وہ خود بھی خوف سے کانپ رہا تھا اس لئے کہ اس دفعہ وہ نیا حربہ آزما رہا تھا جو بے حد خطرناک تھا۔ وہ کرتا بھی کیا۔ اس وقت اس کے علاوہ اور چارہ کار بھی نہ تھا۔

اس نے رک رک کر کئی بار دروازے پر دستک دی۔ ذرا دیر بعد کسی نے اندر سے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا "کون؟" عبداللہ نے آہستہ سے کہا "دروازہ کھولو"

فوراً ہی دروازہ کھل گیا کسی نے اندر سے جھانک کر پوچھا "کون ہے سامنے آؤ" عبداللہ اندھیرے نکل کر ایک دم اس کے سامنے آگیا اور خوفناک آواز میں بولا۔

"مکھن ٹوش"

اس آدمی کی سٹی گم ہوگئی۔ گلا پھاڑ کر بولا "باپ رے باپ"

عبداللہ نے اس دفعہ اور بھی بھیانک آواز میں کہا "مکھن ٹوش"

وہ آدمی یکبارگی چلاّنے لگا "بھوت۔ بھوت"

اپنے سابقہ تجربے کے پیش نظر عبداللہ کو اب وہاں سے کھسک جانا چاہیئے تھا لیکن وہ بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ دروازے پر کھڑا رہا۔ اس نے سوچا کہ اب تو یہ خوف زدہ ہو ہی چکا ہے ایک وار اور کروں گا تو بیہوش ہوکر گر ہی پڑے گا۔ اس نے انتہائی خوفناک لہجہ میں حلق سے آواز نکالی۔

"ماکھان ٹوش"

اس آدمی پر عبداللہ کی اس خوفناک آواز کا یہ اثر ہوا کہ وہ اور بھی وحشت ناک طریقہ پر چیخنے لگا۔ کمرے کے اندر کچھ اور لوگ بھی سو رہے تھے۔ پہلے تو وہ بیدار ہوئے، ذرا دیر سہمے پڑے رہے پھر سب خوفزدہ ہوکر چیخنے لگے۔

"بھوت۔ بھوت"

اتنی بہت سی آوازوں کا شور سن کر عبداللہ بھی گھبرا گیا۔ وہ فوراً ہی دروازہ پر سے ہٹ آیا اور کسی نہ کسی طرح قبرستان کے پاس والی تنگ گلی میں داخل ہوگیا۔ اب آس پاس کے مکانوں میں بھی لوگ جاگ اٹھے تھے۔ کچھ دروازوں سے نکل کر باہر آگئے تھے۔ کچھ اونچی آوازوں میں بول رہے تھے۔ عبداللہ نے دیکھا گلی کے دونوں سروں پر ملی جلی آوازوں کا شور ابھر رہا تھا۔ آگے جانے کے بجائے وہ اندھیرے میں دیوار سے چمٹ کر کھڑا ہو گیا۔ کئی سیکنڈ تک وہ اسی عالم میں کھڑا رہا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اچانک کوئی تیزی سے آکر اس سے ٹکرایا اور پھر "بھوت۔ بھوت" کہتا ہوا سرپٹ بھاگا۔

اس کے بعد ایک بارگی بہت سی ملی جلی آوازیں ابھریں۔

عبداللہ سوچ ہی رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ اچانک ایک پتھر اس کے داہنے کندھے پر آکر زور سے لگا۔ یہ ابتدا تھی۔ اس کے بعد تو چاروں طرف سے پتھر آکر گلی میں گرنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی ملی جلی آوازیں آرہی تھیں۔

"گلی میں بھوت ہے"

"وہ دیکھو! کچھ نظر آرہا ہے"

اس کے بعد "بھوت۔ بھوت" کا نعرہ پھر بلند ہوا اور پتھروں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ پتھر برابر آ کر اس کے جسم پر لگ رہے تھے اور ایک پتھر تو اس زور سے اس کے ماتھے پر لگا کہ وہ چکرا کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت ایک دوسرا پتھر اس کی کن پٹی پر لگا اور عبداللہ نڈھال ہو کر زمین پر لیٹ گیا۔

قریب ہی ایک بدرو تھا عبداللہ نے سوچا کہ کسی طرح اگر وہ اس میں داخل ہو جائے تو وہ اس سنگ باری سے بچ جائے گا سہلتے کرتے وہ گھسٹتا ہوا بدرو کی طرف کھسکنے لگا۔ اچانک ایک بڑا سا پتھر اس کے سر پر آ کر گرا اور عبداللہ جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ پھر ایک بار ہی وہ گلا پھاڑ کر چیخا۔

"ہائے مرا"

اس کے بعد عبداللہ نے کئی بار چیخا کئی بار اس نے التجا کی لیکن دوسری طرف اس قدر شور تھا کہ کوئی اس کی آواز نہ سن سکا۔ پتھر برابر چلتے رہے۔ لوگ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختے رہے وہ اس وقت گلی کے بھوت کو سنگسار کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ وہ پاگلوں کی طرح چلا رہے تھے اور گلی کے اندر بے تحاشا پتھر برسا رہے تھے۔ رات کے سناٹے میں ان کا شور بڑا خوفناک معلوم ہو رہا تھا۔

دوسرے دن محلہ والوں نے دیکھا۔ گلی کے بیچوں بیچ ایک بے حد غلیظ آدمی منہ اوندھائے پڑا تھا۔ اس کے چاروں طرف پتھر ہی پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے جسم کے ہر حصہ پر کالا کالا خون بہہ کر جم گیا تھا۔ اس کا چہرہ بدرو کے اندر تھا اور کیچڑ میں لت پت۔ یہ عبداللہ تھا جو رات ہی کو مر گیا تھا۔

اوور کوٹ

غلام عباس

جنوری کی ایک شام کو ایک خوش پوش نوجوان ڈیوس روڈ سے گزر کر مال روڈ پر پہنچا اور چیرنگ کراس کا رخ کر کے خراماں خراماں پٹڑی پر چلنے لگا۔ یہ نوجوان اپنی تراش خراش سے خاصا فیشن ایبل معلوم ہوتا تھا۔ لمبی لمبی قلمیں، چمکتے ہوئے بال، باریک باریک مونچھیں گویا سرمے کی سلائی سے بنائی گئی ہوں۔ بادامی رنگ کا گرم اوور کوٹ پہنے ہوئے جس کے کاج میں شربتی رنگ کے گلاب کا ایک ادھ کھلا پھول اٹکا ہوا، سر پر سبز فیلٹ ہیٹ ایک خاص انداز سے ٹیڑھی رکھی ہوئی، سفید سلک کا گلوبند گلے کے گرد لپٹا ہوا، ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں، دوسرے میں بید کی ایک چھوٹی چھڑی پکڑے ہوئے جسے کبھی کبھی وہ مزے میں آ کے گھمانے لگتا تھا۔

یہ ہفتے کی شام تھی۔ بھرپور جاڑے کا زمانہ۔ سرد اور تند ہوا کسی تیز دھار کی طرح جسم پر آ آ کے لگتی تھی مگر اس نوجوان پر اس کا کچھ اثر معلوم نہیں معلوم ہوتا تھا اور لوگ خود کو گرم کرنے کے لئے تیز تیز قدم اٹھا رہے تھے، مگر اسے اس کی ضرورت نہ تھی جیسے اس کڑکڑاتے جاڑے میں اسے ٹہلنے میں بڑا مزہ آ رہا ہو۔

اس کی چال ڈھال سے ایسا بانکپن ٹپکتا تھا کہ تانگے والے دور ہی سے دیکھ کر سرپٹ گھوڑا دوڑاتے ہوئے اس کی طرف لپکتے، مگر وہ چھڑی کے اشارے سے نہیں کر دیتا۔ ایک خالی ٹیکسی بھی اسے دیکھ کر رکی، مگر اس نے "نو تھینک یو" کہہ کر اسے بھی ٹال دیا۔

جیسے جیسے وہ مال کے زیادہ بارونق حصے کی طرف پہنچتا جاتا تھا، اس کی چونچالی بڑھتی ہی جاتی تھی۔ وہ منہ سے سیٹی بجا کے رقص کی ایک انگریزی دھن نکالنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے پاؤں بھی تھرکتے ہوئے اٹھنے لگے۔ ایک دفعہ جب آس پاس کوئی نہیں تھا تو یک بارگی کچھ ایسا جوش آیا کہ اس نے دوڑ کر جھوٹ موٹ بال دینے کی کوشش کی۔ گویا کرکٹ کا میچ ہو رہا ہے۔

رستے میں وہ سڑک آئی جو لارنس گارڈن کی طرف جاتی تھی، مگر اس وقت شام کے دھندلکے اور سخت کہرے

بھی اس باغ پر کچھ ایسی اداسی برس رہی تھی کہ اس نے ادھر کا رخ نہ کیا اور سیدھا چیرنگ کراس کی طرف چلتا رہا۔ ملکہ کے بت کے قریب پہنچ کر اس کی حرکات و سکنات میں کسی قدر متانت پیدا ہو گئی۔ اس نے اپنا رومال نکالا جسے جیب میں رکھنے کے بجائے اس نے کوٹ کی بائیں آستین میں اڑس رکھا تھا اور ہلکے ہلکے چہرے پر پھیرا تاکہ کچھ کچھ گرد جم گئی ہو تو اتر جائے۔ پاس گھاس کے ایک ٹکڑے پر کچھ انگریز بچے ایک بڑی سی گیند سے کھیل رہے تھے۔ وہ بڑی دلچسپی سے ان کا کھیل دیکھنے لگا۔ بچے کچھ دیر تک اس کی پروا کئے بغیر کھیل میں معروف رہے مگر جب وہ برابر تکے ہی چلا گیا تو وہ رفتہ رفتہ شرمانے سے لگے اور پھر اچانک گیند سنبھال کر ہنستے ہوئے اور ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے وہ گھاس کے اس ٹکڑے ہی سے چلے گئے۔

نوجوان کی نظر سیمنٹ کی ایک خالی بنچ پر پڑی اور وہ اس پر آ کے بیٹھ گیا۔ اس وقت شام کے اندھیرے کے ساتھ ساتھ سردی اور بھی بڑھتی جا رہی تھی اس کی یہ شدت ناخوشگوار نہ تھی، بلکہ لذت پرستی کی ترغیب دیتی تھی۔ دسمبر کے عیش پسند طبقے کا تو کہنا ہی کیا وہ تو اس سردی میں زیادہ ہی کھل کھیلتا ہے تنہائی میں بسر کرنے والے بھی اس سردی سے ورغلائے جاتے ہیں اور وہ اپنے اپنے کونوں کھدروں سے نکل کر محفلوں اور مجمعوں میں جانے کی سوچنے لگتے ہیں تاکہ جسموں کا قرب حاصل ہو۔ حصول لذت کی یہی جستجو لوگوں کو مال پر کھینچ لائی تھی اور وہ حسب توفیق ریسٹورانوں، کافی ہاؤسوں، رقص گاہوں، سینماؤں اور تفریح کے دوسرے مقاموں پر محظوظ ہو رہے تھے۔

مال روڈ پر موٹروں، تانگوں اور بائیسکلوں کا تانتا بندھا ہوا تو تھا ہی پٹڑی پر چلنے والوں کی بھی کثرت تھی۔ علاوہ ازیں سڑک کی دو رویہ دکانوں میں خرید و فروخت کا بازار بھی گرم تھا، جن کم نصیبوں کو نہ تفریح طبع کی استطاعت تھی نہ خرید و فروخت کی وہ دور ہی سے کھڑے کھڑے ان تفریح گاہوں اور دکانوں کی رنگا رنگ روشنیوں سے جی بہلا رہے تھے۔

نوجوان سیمنٹ کی بنچ پر بیٹھا اپنے سامنے سے گزرتے ہوئے زن و مرد کو غور سے دیکھ رہا تھا اس کی نظر ان کے چہروں سے کہیں زیادہ ان کے لباس پر پڑتی تھی۔ ان میں ہر وضع اور ہر قماش کے لوگ تھے بڑے بڑے تاجر، سرکاری افسر، لیڈر، فن کار، کالجوں کے طلبہ اور طالبات، نرسیں، اخباروں کے نمائندے، دفتروں کے بابو۔ زیادہ تر لوگ اوورکوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ہر قسم کے اوورکوٹ قراقلی کے بیش قیمت اوورکوٹ سے لے کر خاکی پٹی کے پرانے فوجی اوورکوٹ تک جنہیں نیلام میں خرید لیا گیا تھا۔

نوجوان کا اپنا اوور کوٹ تھا تو خاصا پرانا۔ مگر اس کا کپڑا خوب بڑھیا تھا پھر وہ سلا ہوا بھی کسی ماہر درزی کا تھا۔ اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی بہت دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ کالر خوب جما ہوا تھا۔ باہوں کی کریزیں بڑی نمایاں، سلوٹ کہیں نام کو نہیں، بٹن سینگ کے بڑے بڑے چمکتے ہوئے۔ نوجوان اس میں بہت مگن معلوم ہوتا تھا۔

ایک لڑکا پان بیڑی سگریٹ کا صندوقچہ گلے میں ڈالے سامنے سے گزرا نوجوان نے آواز دی۔

"پان والا!"

"جناب"

"ڈنس کا چینج ہے؟"

"ہے تو نہیں۔ لا دوں گا۔ کیا لیں گے آپ؟"

"نوٹ لے کے بھاگ گیا تو؟"

"اجی واہ۔ کوئی چور اچکا ہوں جو بھاگ جاؤں گا۔ اعتبار نہ ہو تو میرے ساتھ چلئے۔ لیں گے کیا آپ؟"

"نہیں نہیں ہم خود چینج لائیں گے۔ لو یہ اکنی نکل آئی۔ گولڈ فلیک کا ایک سگرٹ دے دو اور چلے جاؤ۔"

لڑکے کے جانے کے بعد مزے مزے سے سگرٹ کے کش لگانے لگا۔ وہ ویسے ہی بہت خوش نظر آتا تھا۔ گولڈ فلیک کے مرغولوں نے اس پر سرور کی کیفیت طاری کر دی۔

ایک چھوٹی سی سفید رنگ کی بلی سردی میں ٹھٹھرتی ہوئی بنچ کے نیچے اس کے قدموں کے پاس آکر میاؤں میاؤں کرنے لگی۔ اس نے پچکارا تو اچھل کر بنچ پر آ چڑھی۔ اس نے پیار سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور کہا: "پوُر لٹل سول!"

اس کے بعد وہ بنچ سے اٹھ کھڑا ہوا اور سڑک کو پار کر کے اس طرف چلا جدھر سینما کی رنگ برنگی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ تماشا شروع ہو چکا تھا۔ سینما کے برآمدے میں بھیڑ نہ تھی۔ صرف چند لوگ تھے۔ جو آنے والی فلموں کی تصویروں کا جائزہ لے رہے تھے۔ یہ تصویریں چھوٹے بڑے کئی بورڈوں پر چسپاں تھیں۔ ان میں کہانی کے چیدہ چیدہ مناظر دکھائے گئے تھے۔

تین نوجوان اینگلو انڈین لڑکیاں ان تصویروں کو ذوق و شوق سے دیکھ رہی تھیں۔ ایک خاص شانِ استغنا کے ساتھ مگر صنفِ نازک کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے وہ بھی ان کے ساتھ ساتھ مگر مناسب فاصلے سے ان تصویروں

کو دیکھتا رہا۔ لڑکیاں آپس میں جنسی مذاق کی باتیں بھی کرتی جاتی تھیں اور فلم پر رائے زنی بھی۔ ناگہاں ایک لڑکی نے جو اپنی ساتھ والیوں سے زیادہ حسین بھی تھی اور شوخ بھی۔ ایک قہقہہ لگایا اور پھر وہ تینوں ہنستی ہوئی باہر نکل گئیں۔ نوجوان نے اس کا کچھ اثر قبول نہ کیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ خود بھی سینما کی عمارت سے باہر نکل آیا۔

اب سات بج چکے تھے اور وہ مال کی پٹڑی پر پھر پہلے کی طرح سرگشت کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ ایک ریستوران میں آرکسٹرا بج رہا تھا۔ اندر سے کہیں زیادہ باہر لوگوں کا ہجوم تھا۔ ان میں زیادہ تر موٹروں کے ڈرائیور، کوچوان، پھل بیچنے والے جو اپنا مال بیچ کے خالی ٹوکرے لئے کھڑے تھے۔ کچھ راہ گیر جو چلتے چلتے ٹھہر گئے تھے۔ کچھ مزدوری پیشہ لوگ تھے۔ اور کچھ گداگر۔ یہ اندر والوں سے کہیں زیادہ گانے کے رسیا معلوم ہوتے تھے، کیونکہ وہ غل غپاڑا نہیں مچا رہے تھے، بلکہ خاموشی سے نغمہ سن رہے تھے، حالانکہ دھن اور ساز اجنبی تھے۔ نوجوان پل بھر کے لئے رکا اور پھر آگے بڑھ گیا۔

تھوڑی دور چل کے اسے انگریزی موسیقی کی ایک بڑی سی دکان نظر آئی اور وہ بلا تکلف اندر چلا گیا۔ ہر طرف شیشے کی الماریوں میں طرح طرح کے انگریزی ساز رکھے تھے۔ ایک لمبی میز پر مغربی موسیقی کی دو ورقی کتابیں چنی تھیں۔ یہ نئے چلنتر گانے تھے سرورق خوب صورت رنگ دار مگر دھنیں گھٹیا۔ ایک چھچھلتی ہوئی نظر ان پر ڈالی، پھر وہاں سے ہٹ آیا اور سازوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ایک ہسپانوی گٹار پر جو ایک کھونٹی سے لٹکی ہوئی تھی ناقدانہ نظر ڈالی، اور اس کے ساتھ قیمت کا جو ٹکٹ لٹک رہا تھا اسے پڑھا۔ اس سے ذرا ہٹ کر ایک بڑا جرمن پیانو رکھا تھا۔ اس کا کور اٹھا کے انگلیوں سے بعض پردوں کو ٹٹولا اور پھر کور بند کر دیا۔

دکان کا ایک کارندہ اس کی طرف بڑھا۔

"گڈ ایوننگ سر۔ کوئی خدمت؟"

"نہیں شکریہ۔ ہاں اس مہینے کی گراموفون ریکارڈوں کی فہرست دے دیجئے۔"

فہرست لے کے اوور کوٹ کی جیب میں ڈالی۔ دکان سے باہر نکل آیا اور پھر چلنا شروع کر دیا۔ راستے میں ایک چھوٹا سا بک سٹال پڑا۔ نوجوان یہاں بھی رکا۔ کئی تازہ رسالوں کے ورق الٹے۔ رسالہ جہاں سے اٹھاتا بڑی احتیاط سے وہیں رکھ دیتا۔ اور آگے بڑھا تو قالینوں کی ایک دکان نے اس کی توجہ کو جذب کیا۔ مالک دکان نے، جو ایک لمبا سا چغہ پہنے اور سر پر کلاہ رکھے تھا، گرم جوشی سے اس کی آؤ بھگت کی۔

"ذرا یہ ایرانی قالین دیکھنا چاہتا ہوں۔ اتاریے نہیں یہیں دیکھ لوں گا۔ کیا قیمت ہے اس کی؟"

"چودہ سو بتیس روپے۔"

نوجوان نے اپنی بھنوؤں کو سکیڑا جس کا مطلب تھا "او ہو اتنی"۔

دکاندار نے کہا۔ "آپ پسند کر لیجئے۔ ہم جتنی بھی رعایت کر سکتے ہیں کر دیں گے۔"

"شکریہ لیکن اس وقت تو میں صرف ایک نظر دیکھنے آیا ہوں۔"

"شوق سے دیکھئے۔ آپ ہی کی دکان ہے۔"

دو تین منٹ کے بعد اس دکان سے بھی نکل آیا۔ اس کے اوور کوٹ کے کاج میں شربتی رنگ کے گلاب کا جو ادھ کھلا پھول اٹکا ہوا تھا۔ وہ اس وقت کاج سے کچھ زیادہ باہر نکل آیا تھا۔ جب وہ اس کو ٹھیک کر رہا تھا۔ تو اس کے ہونٹوں پر ایک خفیف اور پراسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے پھر اپنی مٹر گشت شروع کر دی۔

اب وہ ہائی کورٹ کی عمارتوں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اتنا کچھ چل لینے کے بعد اس کی طبیعت کی چونچالی میں کچھ فرق نہیں آیا تھا۔ نہ تکان محسوس ہوئی تھی نہ اکتاہٹ۔ یہاں پٹڑی پر چلنے والوں کی ٹولیاں کچھ چھٹ سی گئی تھیں اور ان میں کافی فصل رہنے لگا تھا۔ اس نے اپنی بید کی چھڑی کو ایک انگلی پر گھمانے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی اور چھڑی زمین پر گر پڑی۔ "او سوری" کہہ کر زمین پر جھکا اور چھڑی کو اٹھا لیا۔۔۔۔

نوجوان نے شام سے اب تک اپنی مٹر گشت کے دوران میں جتنی انوکھی شکلیں دیکھی تھیں ان میں سے کسی نے بھی اس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف نہیں کیا تھا۔ فی الحقیقت ان میں کوئی جاذبیت تھی ہی نہیں۔ یا پھر وہ اپنے حال میں ایسا مست تھا کہ کسی دوسرے سے اسے سروکار ہی نہ تھا۔ مگر ایک دلچسپ جوڑے نے، جس میں کسی افسانے کے کرداروں کی سی ادا تھی، جیسے یک بارگی اس کے دل کو موہ لیا تھا۔ اور اسے حد درجہ مشتاق بنا دیا کہ وہ ان کی اور بھی باتیں سنے اور ہو سکے تو قریب سے ان کی شکلیں بھی دیکھ لے۔

اس وقت وہ تینوں بڑے ڈاک خانے کے چوراہے کے پاس پہنچ گئے تھے لڑکا اور لڑکی پل بھر کو رکے اور پھر سڑک پار کر کے میکلوڈ روڈ پر چل پڑے۔ نوجوان مال روڈ پر ہی ٹھہرا رہا۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ فی الفور ان کے پیچھے گیا تو ممکن ہے انہیں شبہ ہو جائے کہ ان کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ اس لئے اسے کچھ لمحے رک جانا چاہیئے۔

جب وہ لوگ کوئی سو گز آگے نکل گئے تو اس نے لپک کر ان کا پیچھا کرنا چاہا۔ مگر ابھی اس نے آدھی ہی سڑک پار کی ہو گی کہ اینٹوں سے بھری ہوئی ایک لاری پیچھے سے بگولے کی طرح آئی اور اسے روندتی ہوئی میکلوڈ

روڈ کی طرف نکل گئی۔ لاری کے ڈرائیور نے نوجوان کی چیخ سن کر پل بھر کے لئے گاڑی کی رفتار کم کی۔ وہ سمجھ گیا کہ کوئی لاری کی لپیٹ میں آ گیا۔ اور وہ رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لاری کو لے بھاگا۔ دو تین راہ گیر جو اس حادثے کو دیکھ رہے تھے شور مچانے لگے نمبر دیکھو نمبر دیکھو۔ مگر لاری ہوا ہو چکی تھی۔

اتنے میں کئی اور لوگ جمع ہو گئے ٹریفک کا ایک انسپکٹر جو موٹر سائیکل پر جا رہا تھا رک گیا۔ نوجوان کی دونوں ٹانگیں بالکل کچل گئی تھیں۔ بہت سا خون نکل چکا تھا اور وہ سسک رہا تھا۔

فوراً ایک کار کو روکا گیا اور اسے جیسے تیسے اس میں ڈال کے بڑے ہسپتال روانہ کر دیا گیا۔ جس وقت وہ ہسپتال پہنچا تو اس میں ابھی رمق بھر جان باقی تھی۔

اس ہسپتال کے شعبۂ حادثات میں اسسٹنٹ سرجن مسٹر خان اور دو نو عمر نرسیں مس شہناز اور مس گل ڈیوٹی پر تھیں۔ جس وقت اسے سٹریچر پہ ڈال کے آپریشن روم میں لے جایا جا رہا تھا تو ان نرسوں کی نظر اس پر پڑی۔ اس کا اودای رنگ کا اوور کوٹ ابھی تک اس کے جسم پر تھا۔ اور سفید سلک کا مفلر گلے میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کے کپڑوں پر جا بجا خون کے بڑے بڑے دھبے تھے۔ کسی نے ازراہ دردمندی اس کی سبز فیلٹ ہیٹ اٹھا کے اس کے سینہ پر رکھ دی تھی تا کہ کوئی اڑا نہ لے جائے۔

شہناز نے گل سے کہا۔ "کسی بھلے گھر کا معلوم ہوتا ہے بے چارہ۔"

گل دبی آواز میں بولی: "خوب بن ٹھن کے نکلا تھا بے چارہ ہفتے کی شام منانے۔"

"ڈرائیور پکڑا گیا یا نہیں؟"

"نہیں بھاگ گیا۔"

"کتنے افسوس کی بات ہے۔"

آپریشن روم میں اسسٹنٹ سرجن اور نرسیں چہروں پر جراحی کے نقاب چڑھائے جنہوں نے ان کی آنکھوں سے نیچے کے سارے حصے کو چھپا رکھا تھا۔ اس کی دیکھ بھال میں مصروف تھے۔ اسے سنگ مرمر کی میز پر لٹا دیا گیا۔ اس نے سر میں جو تیز خوشبودار تیل ڈال رکھا تھا اس کی کچھ کچھ مہک ابھی تک باقی تھی۔ پٹیاں ابھی تک جمی ہوئی تھیں۔ حادثے سے اس کی دونوں ٹانگیں تو ٹوٹ چکی تھیں۔ مگر سر کی مانگ نہیں بگڑنے پائی تھی۔

اب اس کے کپڑے اتارے جا رہے تھے۔ سب سے پہلے سفید سلک کا گلو بند اس کے گلے سے اتارا گیا۔

اچانک نرس شہناز اور نرس گل نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا اس سے زیادہ وہ کر بھی کیا سکتی تھیں۔ چہرے جو دلی کیفیات کا آئینہ ہوتے ہیں، جراحی کے نقاب تلے چھپے ہوئے تھے اور زبانیں بند۔

نوجوان کے گلو بند کے نیچے نکٹائی اور کالر کیا، سرے سے قمیض ہی نہیں تھی۔ اوورکوٹ اتارا گیا تو نیچے سے ایک بوسیدہ اونی سویٹر نکلا جس میں جابجا بڑے بڑے سوراخ تھے۔ ان سوراخوں سے سویٹر سے بھی زیادہ بوسیدہ اور میلا کچیلا ایک بنیان نظر آ رہا تھا۔ نوجوان سلک کے گلوبند کو کچھ اس ڈھب سے گلے پر لپیٹے رکھتا تھا کہ اس کا سارا سینہ چھپا رہتا تھا۔ اس کے جسم پر میل کی تہیں بھی خوب چڑھی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کم سے کم پچھلے دو مہینے سے نہیں نہایا البتہ گردن خوب صاف تھی اور اس پر ہلکا ہلکا پوڈر لگا ہوا تھا۔ سویٹر اور بنیان کے بعد پتلون کی باری آئی اور شہناز اور گل کی نظریں پھر بیک وقت اٹھیں۔

پتلون کو پیٹی کے بجائے ایک پرانی دھجی سے جو شاید کبھی نکٹائی ہوگی خوب کس کے باندھا گیا تھا۔ بٹن اور بکسوئے غائب تھے۔ دونوں گھٹنوں پر سے کپڑا مسک گیا تھا۔ اور کئی جگہ کھونچیں بھی لگی تھیں۔ مگر چونکہ یہ حصے اوورکوٹ کے نیچے رہتے تھے اس لئے لوگوں کی ان پر نظر نہیں پڑتی تھی۔

اب بوٹ اور جرابوں کی باری آئی اور ایک مرتبہ پھر مس شہناز اور مس گل کی آنکھیں چار ہوئیں۔

بوٹ تو پرانے ہونے کے باوجود خوب چمک رہے تھے۔ مگر ایک پاؤں کی جراب دوسرے پاؤں کی جراب سے بالکل مختلف تھی۔ پھر دونوں جرابیں پھٹی ہوئی بھی تھیں۔ اس قدر کہ ان میں سے نوجوان کی میلی میلی ایڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

بلاشبہ اس وقت تک وہ دم توڑ چکا تھا۔ اس کا جسم سنگ مرمر کی میز پر بے جان پڑا تھا۔ اس کا چہرہ جو پہلے چھت کی سمت تھا کپڑے اتارنے میں دیوار کی طرف مڑ گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جسم اور اس کے ساتھ روح کی اس برہنگی نے اسے خجل کر دیا ہے اور وہ اپنے ہم جنسوں سے آنکھیں چرا رہا ہے۔

اس کے اوورکوٹ کی مختلف جیبوں سے جو چیزیں برآمد ہوئیں وہ یہ تھیں۔

ایک چھوٹا سا سیاہ کنگھا۔ ایک رومال، ساڑھے چھ آنے، ایک بجھا ہوا آدھا سگریٹ، ایک چھوٹی سی ڈائری جس میں لوگوں کے نام اور پتے لکھے تھے نئے گراموفون ریکارڈوں کی ایک ماہانہ فہرست اور کچھ اشتہار جو مٹرگشت کے دوران میں اشتہار بانٹنے والوں نے اس کے ہاتھ میں تھما دیئے تھے اور اس نے انہیں اوورکوٹ کی جیب میں ڈال لیا تھا۔

افسوس کہ اس کی بید کی چھڑی جو حادثے کے دوران میں کہیں کھو گئی تھی اس فہرست میں شامل نہ تھی۔

ماں جی

قدرت اللہ شہاب

ماں جی کی پیدائش کا صحیح سال معلوم نہ ہو سکا۔

جس زمانے میں لائل پور کا ضلع نیا نیا آباد ہو رہا تھا۔ پنجاب کے ہر قصبے سے غریب الحال لوگ زمین حاصل کرنے کے لئے اس نئی کالونی میں جوق در جوق کھنچے چلے آ رہے تھے۔ عرف عام میں لائل پور، جھنگ، سرگودھا وغیرہ کو "بار" کا علاقہ کہا جاتا تھا۔

اس زمانے میں ماں جی کی عمر دس بارہ سال تھی۔ اس حساب سے ان کی پیدائش پچھلی صدی کے آخری دس پندرہ سالوں میں کسی وقت ہوئی ہو گی۔

ماں جی کا آبائی وطن تحصیل روپڑ ضلع انبالہ میں ایک گاؤں منیلہ نامی تھا۔ والدین کے پاس چند ایکڑ اراضی تھی۔ ان دنوں روپڑ میں دریائے ستلج سے نہر سرہند کی کھدائی ہو رہی تھی۔ نانا جی کی اراضی نہر کی کھدائی میں ضم ہو گئی۔ روپڑ میں انگریز حاکم کے دفتر سے ایسی زمینوں کے معاوضے دیئے جاتے تھے۔ نانا جی دو تین بار معاوضے کی تلاش میں شہر گئے۔ لیکن سیدھے آدمی تھے۔ کبھی اتنا بھی معلوم نہ کر سکے کہ انگریز کا دفتر کہاں ہے اور معاوضہ وصول کرنے کے لئے کیا قدم اٹھانا چاہیئے۔ انجام کار صبر و شکر کر کے بیٹھ گئے اور نہر کی کھدائی میں مزدوری کرنے لگے۔

انہی دنوں پرچہ لگا کہ بار میں کالونی کھل گئی ہے اور نئے آباد کاروں کو مفت زمین مل رہی ہے۔ نانا جی اپنی بیوی، دو ننھے بیٹوں اور ایک بیٹی کا کنبہ ساتھ لے کر لائل پور روانہ ہو گئے۔ سواری کی توفیق نہ تھی۔ اس لئے پاپیادہ چل کھڑے ہوئے۔

راستے میں محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے۔ نانا جی جگہ بہ جگہ قلی کا کام کر لیتے یا کسی ٹال پر لکڑیاں چیر دیتے۔ نانی اور ماں جی کسی کا سوت کات دیتیں۔ یا مکانوں کے فرش اور دیواریں لیپ دیتیں۔ لائل پور کا صحیح راستہ کسی کو نہ آتا تھا۔ جگہ جگہ بھٹکتے تھے۔ اور پوچھ پاچھ کر دنوں کی منزل ہفتوں میں طے کرتے تھے۔

ڈیڑھ دو مہینے کی مسافت کے بعد جڑانوالہ پہنچے۔ پا پیادہ چلنے اور محنت مزدوری کی مشقت سے سب کے جسم نڈھال اور پاؤں سوجے ہوئے تھے۔ یہاں پر چند ماہ قیام کیا۔ ناناجی دن بھر غلہ منڈی میں بوریاں اٹھانے کا کام کرتے۔ نانی چرخہ کات کر سوت بیچتیں اور ماں جی گھر سنبھالتیں جو ایک چھوٹے سے جھونپڑے پر مشتمل تھا۔

انہی دنوں بقر عید کا تہوار آیا ناناجی کے پاس چند روپے جمع ہو گئے تھے۔ اُنہوں نے ماں جی کو تین آنے بطور عیدی دیئے۔ زندگی میں پہلی بار ماں جی کے ہاتھ اتنے پیسے آئے تھے۔ انہوں نے بہت سوچا لیکن اس رقم کا کوئی مصرف ان کی سمجھ میں نہ آسکا وفات کے وقت ان کی عمر کوئی اسی برس کے لگ بھگ تھی لیکن ان کے نزدیک سو روپے دس روپے، پانچ روپے کے نوٹوں میں امتیاز کرنا آسان کام نہ تھا۔ عیدی کے تین آنے کئی روز ماں جی کے دوپٹے کے ایک کونے میں بندھے رہے جس روز وہ جڑانوالہ سے رخصت ہو رہی تھیں ماں جی نے گیارہ پیسے کا تیل خرید کر مسجد کے چراغ میں ڈال دیا۔ باقی ایک پیسہ اپنے پاس رکھا اس کے بعد جب کبھی گیارہ پیسے پورے ہو جاتے وہ فوراً مسجد میں تیل بھجوا دیتیں۔ ساری عمر جمعرات کی شام کو اس عمل پر بڑی وضعداری سے پابند رہیں۔ رفتہ رفتہ بہت سی مسجدوں میں بجلی آ گئی لیکن لاہور اور کراچی جیسے شہروں میں بھی انہیں ایسی مسجدوں کا علم رہتا تھا جن کے چراغ اب بھی تیل سے روشن ہوتے ہیں۔ وفات کی شب بھی ماں جی کے سرہانے ململ کے رومال میں بندھے ہوئے چند آنے موجود تھے۔ غالباً یہ پیسے بھی مسجد کے تیل کے لئے جمع کر رکھے تھے چونکہ وہ جمعرات کی شب تھی۔

ان چند آنوں کے علاوہ ماں جی کے پاس نہ کچھ اور رقم تھی، نہ کوئی زیور۔ اسباب دنیا میں ان کے پاس گنتی کی چند چیزیں تھیں۔ تین جوڑے سوتی کپڑوں کے ایک جوڑا دیسی جوتا، ایک جوڑا ربڑ کے چپل، ایک عینک، ایک انگوٹھی جس میں تین چھوٹے چھوٹے فیروزے جڑے ہوئے تھے۔ ایک تسبیح اور باقی اللہ اللہ جس میں تین چھوٹے چھوٹے فیروزے جڑے ہوئے تھے۔ ایک جائے نماز ایک تسبیح اور باقی اللہ اللہ۔

پہننے کے تین جوڑوں کو وہ خاص اہتمام سے رکھتی تھیں۔ ایک زیب تن دوسرا اپنے ہاتھوں سے دھو کر تکیے کے نیچے دبا کر رکھا رہتا تھا۔ تاکہ استری ہو جائے۔ تیسرا دھونے کے لئے تیار۔ ان کے علاوہ اگر چوتھا کپڑا ان کے پاس آتا تھا تو وہ چپکے سے ایک جوڑا کسی کو دے دیتی تھیں۔ اسی وجہ سے ساری عمر انہیں ٹرنک یا بکس رکھنے کی حاجت محسوس نہ ہوئی۔ لمبے سے لمبے سفر پہ روانہ ہونے کے لئے انہیں تیاری میں چند منٹ سے زیادہ نہ لگتے تھے۔ کپڑوں کی پوٹلی بنا کر انہیں جائے نماز میں لپیٹا۔ جاڑوں میں اُونی فرد اور گرمیوں میں ململ کے دوپٹے کی بکل ماری اور جہاں کہیئے چلنے کو تیار۔ سفرِ آخرت بھی انہوں نے اسی سادگی سے اختیار کیا۔ میلے کپڑے اپنے ہاتھوں سے دھو کر تکیئے کے نیچے رکھے۔ نہا دھو کر بال سکھائے اور چند

بی منٹوں میں زندگی کے سب سے لمبے سفر پر روانہ ہو گئیں جس خاموشی سے دنیا میں رہی تھیں اسی خاموشی سے عقبیٰ کو سدھار گئیں۔ غالباً اسی موقع کے لئے وہ اکثر یہ دعا مانگا کرتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ ہاتھ چلتے چلاتے اٹھا لے۔ اللہ کبھی کسی کا محتاج نہ کرے ....

کھانے پینے میں وہ کپڑے لتے سے بھی زیادہ سادہ اور غریب مزاج تھیں۔ ان کی مرغوب ترین غذا مکئی کی روٹی، دھنیے پودینے کی چٹنی کے ساتھ تھی۔ باقی چیزیں خوشی سے تو کھا لیتی تھیں، لیکن شوق سے نہیں۔ تقریباً ہر نوالے پہ اللہ کا شکر ادا کرتی تھیں۔ پھلوں میں کبھی بہت ہی مجبور کیا جائے تو کبھی کبھار کیلے کی فرمائش کرتی تھیں۔ البتہ ناشتے میں چائے کے دو پیالے اور تیسرے پہر سادہ چائے کا ایک پیالہ ضرور پیتی تھیں۔ کھانا صرف ایک وقت کھاتی تھیں اکثر و بیشتر دوپہر کا شاذ و نادر رات کا۔ گرمیوں میں عموماً مکھن نکالی ہوئی پتلی نمکین لسی کے ساتھ ایک آدھ سادہ چپاتی ان کی محبوب خوراک تھی۔ دوسروں کو کوئی چیز رغبت سے کھاتے دیکھ کر خوش ہوتی تھیں اور ہمیشہ یہ دعا کرتی تھیں۔ سب کا بھلا۔ خاص اپنے یا اپنے بچوں کے لئے انہوں نے براہ راست کبھی کچھ نہ مانگا۔ پہلے دوسروں کے لئے دعا مانگتی تھیں اور اس کے بعد مخلوق خدا کی حاجت روائی کے طفیل اپنے بچوں یا عزیزوں کا بھلا چاہتی تھیں۔ اپنے بیٹوں یا بیٹیوں کو انہوں نے اپنی زبان سے کبھی "میرے بیٹے" یا میری بیٹی" کہنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ہمیشہ ان کو اللہ کا مال کہا کرتی تھیں۔

کسی سے کوئی کام لینا ماں جی پر بہت گراں گزرتا تھا۔ اپنے سب کام وہ اپنے ہاتھوں خود انجام دیتی تھیں۔ اگر کوئی ملازم زبردستی ان کا کوئی کام کر دیتا تو انہیں ایک عجیب قسم کی شرمندگی کا احساس ہونے لگتا تھا اور وہ احسان مندی سے سارا دن اسے دعائیں دیتی رہتی تھیں۔

سادگی اور درویشی کا یہ رکھ رکھاؤ کچھ تو قدرت نے ماں جی کی سرشت میں پیدا کیا تھا۔ کچھ یقیناً زندگی کے زیر و بم نے سکھایا تھا۔

جڑانوالہ میں کچھ عرصہ قیام کے بعد جب وہ اپنے والدین اور خورد سال بھائیوں کے ساتھ زمین کی تلاش میں لائلپور کی کالونی کی طرف روانہ ہوئیں تو انہیں کچھ معلوم نہ تھا کہ انہیں کس مقام پر جانا ہے اور زمین حاصل کرنے کے لئے کیا قدم اٹھانا ہے۔ ماں جی بتایا کرتی تھیں کہ اس زمانے میں ان کے ذہن میں کالونی کا تصور ایک فرشتہ سیرت بزرگ کا تھا جو کہیں سر راہ بیٹھا زمین کے پروانے تقسیم کر رہا ہوگا۔ کئی ہفتے یہ چھوٹا سا قافلہ لائلپور کے علاقے میں پا پیادہ بھٹکتا رہا۔ لیکن کسی راہ گزر پر انہیں کالونی کا خضر صورت رہنما نہ مل سکا۔ آخر تنگ آ کر انہوں نے چک نمبر ۳۹۲ میں جو ابھی نیا نیا آباد ہو رہا تھا ڈیرے ڈال دیے۔ لوگ جوق در جوق وہاں آ کر آباد ہو رہے تھے۔ نانا جی نے اپنی سادگی میں یہ سمجھا کہ کالونی میں آباد

ہونے کا شاید یہی ایک طریقہ ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے ایک چھوٹا سا احاطہ گھیر کر گھاس پھونس کی جھونپڑی بنائی اور بنجر اراضی کا ایک قطعہ تلاش کر کے کاشت کی تیاری کرنے لگے۔ انہی دنوں محکمہ مال کا عملہ پڑتال کے لئے آیا۔ نانا جی کے پاس الاٹمنٹ کے کاغذات نہ تھے چنانچہ انہیں چک سے نکال دیا گیا اور سرکاری زمین پر ناجائز جھونپڑا بنانے کی پاداش میں ان کے برتن اور بستر قرق کر لیے۔ عملے کے ایک آدمی نے چاندی کی دو بالیاں بھی ماں جی کے کانوں سے اتروا لیں۔ ایک بالی اتارنے میں ذرا دیر ہوئی تو اس نے زور سے کھینچ لی جس سے ماں جی کے بائیں کان کا زیریں حصہ بُری طرح سے پھٹ گیا۔

چک نمبر ۳۹۲ سے نکل کر جو راستہ سامنے آیا اس پر چل کھڑے ہوئے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ دن بھر لُو چلتی تھی۔ پانی رکھنے کے لئے مٹی کا پیالہ بھی پاس نہ تھا۔ جہاں کہیں کوئی کنواں نظر آیا ماں جی اپنا دوپٹہ بھگو لیتیں تاکہ پیاس لگنے سے اپنے چھوٹے بھائیوں کو چساتی جائیں۔ اس طرح وہ چلتے چلتے چک نمبر ۵۰ میں پہنچے جہاں ایک جان پہچان کے آبادکار نے نانا جی کو اپنا مزارع رکھ لیا۔ نانا جی ہل چلانے لگے۔ نانی مویشی چرانے لے جاتی تھیں۔ ماں جی کھیتوں سے گھاس اور چارہ کاٹ کر زمیندار کی بھینسوں اور گائیوں کے لئے لایا کرتی تھیں۔ ان دنوں انہیں اتنا مقدور بھی نہ تھا کہ ایک وقت کی روٹی بھی پوری طرح کھا سکیں۔ کسی وقت جنگلی بیروں پر گذارہ ہوتا تھا۔ کبھی خربوزے کے چھلکے اُبال کر کھا لیتے تھے۔ کبھی کسی کھیت میں کچی انبیاں گری ہوئی مل گئیں تو ان کی چٹنی بنا لیتے تھے۔ ایک روز کہیں سے توریئے اور گھیتے کا ملا جلا ساگ ہاتھ آ گیا۔ نانی مزدوری میں مصروف تھی۔ ماں جی نے ساگ چولہے پر چڑھایا۔ جب پک کر تیار ہو گیا اور ساگ کو الن لگا کر گھوٹنے کا وقت آیا تو ماں جی نے ڈوئی ایسے زور سے چلائی کہ ہنڈیا کا پیندا ٹوٹ گیا اور سارا ساگ بہہ کر چولہے میں آ گیا۔ ماں جی کو نانی سے ڈانٹ پڑی اور مار بھی۔ رات کو سارے خاندان نے چولہے کی لکڑیوں پر گرا ہوا ساگ انگلیوں سے چاٹ چاٹ کر کسی قدر پیٹ بھرا۔

چک نمبر ۵۰ نانا جی کو خوب راس آیا۔ چند ماہ کی محنت مزدوری کے بعد نئی آبادکاری کے سلسلے میں آسان قسطوں پر ان کو ایک مربعہ زمین مل گئی۔ رفتہ رفتہ دن پھرنے لگے اور تین سال میں ان کا شمار گاؤں کے کھاتے پیتے لوگوں میں ہونے لگا۔ جوں جوں فارغ البالی بڑھتی گئی توں توں آبائی وطن کی یاد ستانے لگی۔ چنانچہ خوشحالی کے چار پانچ سال گزارنے کے بعد سارا خاندان ریل میں بیٹھ کر منیلہ کی طرف روانہ ہوا۔ ریل کا سفر ماں جی کو بہت پسند آیا۔ وہ سارا وقت کھڑکی سے باہر منہ نکال کر تماشہ دیکھتی رہیں۔ اس عمل میں کوئلے کے بہت سے ذرّے ان کی آنکھوں میں پڑ گئے جس کی وجہ سے کئی روز تک وہ آشوب چشم میں مبتلا رہیں۔ اس تجربے کے بعد انہوں نے ساری عمر اپنے کسی بچے کو ریل کی کھڑکی سے باہر منہ نکالنے کی اجازت نہ دی۔

ماں جی ریل کے تھرڈ کلاس ڈبے میں بہت خوش رہتی تھیں۔ ہم سفر عورتوں اور بچوں سے فوراً گھل مل جاتیں۔ سفر کی تھکان اور راستے کے گرد و غبار کا ان پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ اس کے برعکس اونچے درجوں میں بہت بیزار ہو جاتیں۔ ایک دو بار جب انہیں مجبوراً ایئر کنڈیشن ڈبے میں سفر کرنا پڑا تو وہ تھک کر چور ہو گئیں اور سارا وقت قید کی صعوبت کی طرح ان پر گزرا۔

لائل پور پہنچ کر نانا جی نے اپنا آبائی مکان درست کیا۔ عزیز و اقارب کو تحائف دیئے۔ دعوتیں ہوئیں اور پھر ماں جی کے لئے بَر ڈھونڈنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس زمانے میں لائل پور کے مربعہ داروں کی بڑی دھوم تھی۔ ان کا شمار خوش قسمت اور باعزت لوگوں میں ہوتا تھا۔ چنانچہ چاروں طرف سے ماں جی کے لیے پے در پے پیام آنے لگے۔ یوں بھی ان دنوں ماں جی کے بڑے ٹھاٹھ باٹھ تھے۔ برادری والوں پر رعب گانٹھنے کے لئے نانی جی انہیں ہر روز نت نئے کپڑے پہناتی تھیں اور ہر وقت دلہنوں کی طرح سجا کر رکھتی تھیں۔

کبھی کبھار پرانی یادوں کو تازہ کرنے کے لئے ماں جی بڑے معصوم فخر سے کہا کرتی تھیں۔ ان دنوں میرا تو گاؤں میں نکلنا دوبھر ہو گیا تھا۔ میں جس طرف سے گزر جاتی لوگ ٹھٹھک کر کھڑے ہو جاتے اور کہا کرتے یہ خیال بخش مربعہ دار کی بیٹی جا رہی ہے۔ دیکھیے کون سا خوش نصیب اسے بیاہ کر لے جائے گا۔

"ماں جی! آپ کی اپنی نظر میں کوئی ایسا خوش نصیب نہیں تھا؟" ہم لوگ چھیڑنے کی خاطر اُن سے پوچھا کرتے۔

"توبہ توبہ پُت"۔ ماں جی کانوں پر ہاتھ لگاتیں۔ "میری نظر میں بھلا کوئی کیسے ہو سکتا تھا۔ ہاں میرے دل میں اتنی سی خواہش ضرور تھی کہ اگر مجھے ایسا آدمی ملے جو دو حرف پڑھا لکھا ہو تو خدا کی بڑی مہربانی ہوگی۔"

ساری عمر میں غالباً یہی ایک خواہش تھی جو ماں جی کے دل میں خود اپنی ذات کے لئے پیدا ہوئی۔ اس کو خدا نے یوں پورا کر دیا کہ اسی سال ماں جی کی شادی عبداللہ صاحب سے ہو گئی۔

ان دنوں سارے علاقے میں عبداللہ صاحب کا طوطی بول رہا تھا۔ وہ ایک امیر کبیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے لیکن پانچ چھ برس کی عمر میں یتیم بھی ہو گئے اور بے حد مفلوک الحال بھی۔ جب باپ کا سایہ سر سے اُٹھا تو یہ انکشاف ہوا کہ ساری آبائی جائداد رہن پڑی ہے۔ چنانچہ عبداللہ صاحب اپنی والدہ کے ساتھ ایک جھونپڑے میں اُٹھ آئے۔ زرخیز زمین کا یہ انجام دیکھ کر انہوں نے ایسی جائداد بنانے کا عزم کر لیا جو مہاجنوں کے ہاتھ گروی نہ رکھی جا سکے۔ چنانچہ عبداللہ صاحب دل و جان سے تعلیم حاصل کرنے میں منہمک ہو گئے۔ وظیفے پر وظیفہ حاصل کر کے اور دو دو سال کے امتحان

ایک ایک سال میں پاس کرکے پنجاب یونیورسٹی کے میٹریکولیشن میں اوّل آئے۔ اس زمانے میں غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ کسی مسلمان طالب علم نے یونیورسٹی امتحان میں ریکارڈ قائم کیا ہو۔

اُڑتے اُڑتے یہ خبر سرسید کے کانوں میں پڑ گئی جو اس وقت علی گڑھ مسلم کالج کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ انہوں نے اپنا خاص منشی گاؤں میں بھیجا اور عبداللہ صاحب کو وظیفہ دے کر علی گڑھ بلا لیا۔ یہاں پر عبداللہ صاحب نے خوب بڑھ چڑھ کر اپنا رنگ نکالا۔ اور بی۔ اے کرنے کے بعد انیس برس کی عمر میں وہیں پر انگریزی، عربی، فلسفہ اور حساب کے لیکچرر ہو گئے۔

سرسید کو اس بات کی دھن تھی کہ مسلمان نوجوان زیادہ سے زیادہ تعداد میں اعلیٰ ملازمتوں میں جائیں۔ چنانچہ انہوں نے عبداللہ صاحب کو سرکاری وظیفہ دلوایا کہ وہ انگلستان میں جاکر آئی سی ایس کے امتحان میں شریک ہوں۔ پچھلی صدی کے بڑے بوڑھے سات سمندر پار کر کے سفر کو پانے ناگہانی سمجھتے تھے۔ عبداللہ صاحب کی والدہ نے بیٹے کو ولایت جانے سے منع کر دیا۔ عبداللہ صاحب کی سعادت مندی آڑے آئی اور انہوں نے وظیفہ واپس کر دیا۔

اس حرکت پر سرسید کو بے حد غصہ بھی آیا اور دُکھ بھی ہوا۔ انہوں نے لاکھ سمجھایا بجھایا، ڈرایا، دھمکایا لیکن عبداللہ صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔

"کیا تم اپنی بوڑھی ماں کو قوم کے مفاد پر ترجیح دیتے ہو؟" سرسید نے کڑک کر پوچھا۔

"جی ہاں" عبداللہ صاحب نے جواب دیا۔

یہ ٹکا سا جواب سن کر سرسید صاحب آپے سے باہر ہو گئے۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے پہلے انہوں نے عبداللہ صاحب کو لاتوں، مکّوں، تھپڑوں اور جوتوں سے خوب پیٹا اور کالج کی نوکری سے برخواست کر کے یہ کہہ کر علی گڑھ سے نکال دیا۔ "اب تم ایسی جگہ جاکر مرو جہاں سے میں تمہارا نام بھی نہ سن سکوں۔"

عبداللہ صاحب جتنے سعادت مند بیٹے تھے۔ اتنے سعادت مند شاگرد بھی تھے۔ نقشے پر انہیں سب سے دُور اُفتادہ اور دشوار گزار مقام گلگت نظر آیا۔ چنانچہ وہ ناک کی سیدھ گلگت پہنچے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کی گورنری کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

جن دنوں ماں جی کی منگنی کی فکر ہو رہی تھی۔ انہی دنوں عبداللہ صاحب بھی چھٹی پر گاؤں آئے ہوئے تھے۔ قسمت میں دونوں کا سنجوگ لکھا ہوا تھا۔ ان کی منگنی ہو گئی اور ایک ماہ بعد شادی بھی ٹھہر گئی تاکہ عبداللہ صاحب دلہن کو اپنے ساتھ گلگت لے جائیں۔

منگنی کے بعد ایک روز ماں جی اپنی سہیلیوں کے ساتھ پاس والے گاؤں میں میلہ دیکھنے گئی ہوئی تھیں۔ اتفاقاً یا

نادانستہ عبداللہ صاحب بھی وہاں پہنچ گئے

ماں جی کی سہیلیوں نے انہیں گھیر لیا اور ہر ایک نے جھٹر جھٹر کر ان سے پانچ پانچ روپے وصول کر لیے عبداللہ صاحب نے ماں جی کو بھی بہت سے روپے پیش کئے لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ بہت اصرار بڑھ گیا تو مجبوراً ماں جی گیارہ پیسے کی فرمائش کی

"اتنے بڑے میلے میں گیارہ پیسے لے کر کیا کرو گی ؟" عبداللہ صاحب نے پوچھا۔

" اگلی جمعرات کو آپ کے نام سے مسجد میں تیل ڈلوا دوں گی ۔" ماں جی نے جواب دیا۔

زندگی کے میلے میں بھی عبداللہ صاحب کے سامنے ماں جی کا لین دین صرف جمعرات کے گیارہ پیسوں تک ہی محدود رہا۔ اس سے زیادہ رقم نہ کبھی انہوں نے مانگی نہ اپنے پاس رکھی۔

گلگت میں عبداللہ صاحب کی بڑی شان و شوکت تھی خوبصورت بنگلہ، وسیع باغ، نوکر چاکر، دروازے پر سپاہیوں کا پہرہ جب عبداللہ صاحب دورے پر باہر جاتے تھے یا واپس آتے تھے تو سات توپوں کی سلامی دی جاتی تھی۔ یوں بھی گلگت کا گورنر خاص سیاسی انتظامی اور سماجی اقتدار کا حامل تھا۔ لیکن ماں جی پر اس سارے جاہ و جلال کا ذرہ بھی نہ اثر نہ ہوا کسی قسم کا چھوٹا بڑا ماحول ان پر اثر انداز نہ ہوتا تھا بلکہ ماں جی کی اپنی سادگی اور خود اعتمادی ہر ماحول پر خاموشی سے چھا جاتی تھی ۔

ان دنوں سر مالکم ہیلی حکومت برطانیہ کی طرف سے گلگت کی روسی اور چینی سرحدوں پر پولیٹکل ایجنٹ کے طور پر مامور تھے۔ ایک روز لیڈی ہیلی اور ان کی بیٹی ماں جی سے ملنے آئیں۔ انہوں نے فراک پہنے ہوئے تھے اور پنڈلیاں کھلی تھیں یہ بے حجابی ماں جی کو پسند نہ آئی۔ انہوں نے لیڈی ہیلی سے کہا" تمہاری عمر تو جیسے گزرنی تھی گزر ہی گئی ہے۔ اب آپ اپنی بیٹی کی عاقبت تو خراب نہ کرو" یہ کہہ کر انہوں نے مس ہیلی کو اپنے پاس رکھ لیا۔ اور چند مہینوں میں اُسے کھانا پکانا سینا پرونا، برتن مانجنا کپڑے دھونا سکھا کر ماں باپ کے پاس واپس بھیج دیا۔

جب روس میں انقلاب برپا ہوا تو لارڈ کچنر سرحدوں کا معائنہ کرنے گلگت آئے۔ ان کے اعزاز میں گورنر کی طرف سے ضیافت کا اہتمام ہوا۔ ماں جی نے اپنے ہاتھ سے دس بارہ قسم کے کھانے پکائے۔ کھانے لذیذ تھے۔ لارڈ کچنر نے اپنی تقریر میں کہا" مسٹر گورنر جس خانساماں نے یہ کھانے پکائے ہیں براہ مہربانی میری طرف سے آپ ان کے ہاتھ چوم لیں۔"

دعوت کے بعد عبداللہ صاحب فرحاں و شاداں گھر لوٹے تو دیکھا کہ ماں جی باورچی خانے کے ایک گوشے میں چٹائی پر بیٹھی نمک اور مرچ کی چٹنی کے ساتھ مکئی کی روٹی کھا رہی ہیں۔

ایک اچھے گورنر کی طرح عبداللہ صاحب نے ماں جی کے ہاتھ چومے اور کہا "اگر لارڈ کچنر یہ فرمائش کرتا کہ وہ خود خانساماں کے ہاتھ چومنا چاہتا ہے تو پھر تم کیا کرتیں؟"

"میں" ماں جی تنک کر بولیں: "میں اس کی مونچھیں پکڑ کر جڑ سے اکھاڑ دیتی۔ پھر آپ کیا کرتے؟"

"میں" عبداللہ صاحب نے ڈرامہ کیا "میں ان مونچھوں کو روئی میں لپیٹ کر وائسرائے کے پاس بھیج دیتا اور تمہیں ساتھ لے کر کہیں اور بھاگ جاتا جیسے سرسید کے ہاں سے بھاگا تھا"

ماں جی پر ان مکالموں کا کچھ بھی اثر نہ ہوتا تھا۔ لیکن ایک بار ——— ماں جی رشک و حسد کی اس آگ میں جل بھن کر کباب ہو گئیں۔ جو ہر عورت کا ازلی ورثہ ہے۔

گلگت میں ہر قسم کے احکامات "گورنری" کے نام پر جاری ہوتے تھے۔ جب یہ چرچا ماں جی تک پہنچا تو انہوں نے عبداللہ صاحب سے گلہ کیا

"بھلا حکومت تو آپ کرتے ہیں لیکن گورنری گورنری کہہ کر مجھ غریب کا نام بیچ میں کیوں لایا جاتا ہے خواہ مخواہ!"

عبداللہ صاحب علی گڑھ کے پڑھے ہوئے تھے۔ رگِ ظرافت پھڑک اٹھی اور بے اعتنائی سے فرمایا۔ "بھاگوان یہ تمہارا نام تھوڑا ہے۔ گورنری تو دراصل تمہاری سوکن ہے۔ جو دن رات میرا پیچھا کرتی رہتی ہے۔"

مذاق کی چوٹ تھی۔ عبداللہ نے سمجھا بات آئی گئی ہو گئی لیکن ماں جی کے دل میں غم بیٹھ گیا۔ اس غم میں وہ اندر ہی اندر کڑھنے لگیں۔

کچھ عرصہ کے بعد کشمیر کا مہاراجہ پرتاب سنگھ اپنی مہارانی کے ساتھ گلگت کے دورے پر آیا۔ ماں جی نے مہارانی کو اپنے دل کا حال سنایا۔ مہارانی بھی سادہ عورت تھی۔ جلال میں آ گئی "ہائے ہائے ہمارے راج میں ایسا ظلم۔ میں آج ہی مہاراج سے کہوں گی کہ وہ عبداللہ صاحب کی خبر لیں۔"

جب یہ مقدمہ مہاراج پرتاب سنگھ تک پہنچا تو انہوں نے عبداللہ صاحب کو بلا کر پوچھ گچھ کی۔ عبداللہ صاحب بھی حیران تھے کہ بیٹھے بٹھائے یہ کیا افتاد آ پڑی۔ لیکن جب معاملے کی تہہ تک پہنچے تو دونوں خوب ہنسے۔ آدمی دونوں ہی وضعدار تھے۔ چنانچہ مہاراجہ نے حکم نکالا کہ آئندہ سے گلگت کی گورنری کو وزارت اور گورنر کو وزیر وزارت کے نام سے پکارا جائے۔ ۱۹۴۷ء کی جنگ آزادی تک گلگت میں یہی سرکاری اصطلاحات رائج تھیں۔

یہ حکم نامہ سن کر مہارانی نے ماں جی کو بلا کر خوشخبری سنائی کہ مہاراج نے گورنری کو دیس نکالا دے دیا ہے۔

"اب تم دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو۔" مہارانی نے کہا۔ "کبھی ہمارے لئے بھی دعا کرنا۔"

مہاراجہ اور مہارانی کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اس لئے وہ اکثر ماں جی سے دعا کی فرمائش کرتے تھے۔
اولاد کے معاملے میں ماں جی کیا واقعی خوش نصیب تھیں؟ یہ ایک ایسا سوالیہ نشان ہے جس کا جواب آسانی سے نہیں سوجھتا۔

ماں جی خود ہی تو کہا کرتی تھیں کہ ان جیسی خوش نصیب ماں دنیا میں کم ہی ہوتی ہے لیکن اگر صبر و شکر تسلیم و رضا کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو اس خوش نصیبی کے پردے میں کتنے دکھ۔ کتنے غم۔ کتنے صدمے نظر آتے ہیں۔

اللہ میاں نے ماں جی کو تین بیٹیاں اور تین بیٹے عطا کئے۔ دو بیٹیاں شادی کے کچھ عرصے بعد یکے بعد دیگرے فوت ہو گئیں۔ سب سے بڑا بیٹا عین عالم شباب میں انگلستان جاکر گزر گیا۔

کہنے کو تو ماں جی نے کہہ دیا کہ اللہ کا مال تھا اللہ نے لے لیا۔ لیکن کیا وہ اکیلے میں چھپ چھپ کر خون کے آنسو رویا نہ کرتی ہوں گی؟

جب عبداللہ صاحب کا انتقال ہوا تو ان کی عمر باسٹھ سال اور ماں جی کی عمر پچپن سال تھی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ عبداللہ صاحب بان کی کھردری چارپائی پر حسب معمول گاؤ تکیہ لگا کر نیم دراز تھے۔ ماں جی پائنتی پر بیٹھی چاقو سے گنا چھیل چھیل کر ان کو دے رہی تھیں۔ وہ مزے مزے سے گنا چوس رہے تھے اور مذاق کر رہے تھے۔ پھر یکایک وہ سنجیدہ ہو گئے اور کہنے لگے "بھاگاں! شادی سے پہلے پہلے میں نے تمہیں گیارہ پیسے دئے تھے۔ کیا ان کو واپس کرنے کا وقت نہیں آیا؟"

ماں جی نے نئی نویلی دلہنوں کی طرح سر جھکا لیا اور گنا چھیلنے میں مصروف ہو گئیں۔ ان کے سینے میں بیک وقت بہت سے خیال امڈ آئے "ابھی وقت کہاں آیا ہے۔ سرتاج شادی کے پہلے گیارہ پیسوں کی تو بڑی بات ہے۔ لیکن شادی کے بعد جس طرح تم نے میرے ساتھ نباہ کیا ہے۔ اس پر میں نے تمہارے پاؤں دھو کر پینے ہیں۔ اپنی کھال کی جوتیاں تمہیں پہنانی ہیں۔ ابھی وقت کہاں آیا ہے میرے سرتاج۔

لیکن قضا و قدر کے بہی کھاتے میں وقت آ چکا تھا۔ جب ماں جی نے سر اٹھایا تو عبداللہ صاحب گنے کی قاش منہ میں لئے گاؤ تکیہ پر سو رہے تھے۔ ماں جی نے بہترا ہلایا، بلایا، چمکارا لیکن عبداللہ صاحب ایسی نیند سو گئے تھے جس سے بیداری قیامت سے پہلے ممکن ہی نہیں۔

ماں جی نے اپنے باقی ماندہ دو بیٹوں اور ایک بیٹی کو سینے لگا لگا کر تلقین کی بچو! رونا مت۔ تمہارے ابا جی جس آرام سے رہتے تھے، اسی آرام سے چلے گئے۔ اب رونا مت ان کی روح کو تکلیف پہنچے گی۔"

کہنے کو تو ماں جی نے کہہ دیا کہ اپنے ابا کی یاد میں نہ رونا ورنہ ان کو تکلیف پہنچے گی۔ لیکن کیا وہ خود چوہدری جیسے اس خاوند کی یاد میں نہ روتی ہوں گی جس نے باسٹھ سال کی عمر تک انہیں ایک الہڑ دلہن سمجھا اور جس نے گورنری تک کے علاوہ اور کوئی سوکن اس کے سر پہ لا کر نہیں بٹھائی۔

جب وہ خود مر دیں تو اپنے بچوں کے لئے ایک سوالیہ نشان چھوڑ گئیں جو قیامت تک انہیں عقیدت کے بیابان میں سرگرداں رکھے گا۔

اگر ماں جی کے نام پر خیرات کی جائے تو گیارہ پیسے سے زیادہ ہمت نہیں ہوتی۔ لیکن مسجد کا ملاں پریشان ہے کہ بجلی کا ریٹ بڑھ گیا ہے اور تیل کی قیمت گراں ہو گئی ہے۔

ماں جی کے نام پر فاتحہ دی جائے تو مکئی کی روٹی اور نمک مرچ کی چٹنی سامنے آتی ہے لیکن کھانے والا درویش کہتا ہے کہ فاتحہ درود میں پلاؤ اور زردے کا اہتمام لازم ہے۔

ماں جی کا نام آتا ہے تو بے اختیار رونے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن اگر رو دیا جائے تو ڈر لگتا ہے کہ ان کی روح کو تکلیف نہ پہنچے اور اگر ضبط کیا جائے تو خدا کی قسم ضبط نہیں ہوتا۔

آدھے چہرے

ممتاز مفتی

"میں سمجھتا ہوں کہ آج کی دنیا میں سب سے اہم مسئلہ ایموشنل سٹرس اور سٹرین کا ہے،" اسلم نے کہا۔ "اگر ہم ایموشنل سٹرس کو کنٹرول کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو بہت سے کمپلیکشنز سے نجات مل سکتی ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے ٹرانکولائزر قسم کی چیز؟" رشید نے پوچھا۔

"نہیں نہیں،" اسلم نے کہا۔ "ٹرانکولائزر نے مزید پیچیدگیاں پیدا کر رکھی ہیں۔ ایلوپیتھی نے جو مرض کو دبا دینے کی رسم پیدا کی ہے اس سے امراض میں اضافہ ہو گیا ہے اور صرف اضافہ ہی نہیں، اس سپریشن کی وجہ سے مرض نے کیا فلاڈ کرنا سیکھ لیا ہے لہٰذا مرض بھیس بدل بدل کر خود کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی وجہ سے اس میں اسرار کا عنصر بڑھتا جا رہا ہے تشخیص کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ کیوں طاؤس تمہارا کیا خیال ہے؟" اسلم نے پوچھا۔

"میں تو صرف ایک بات جانتا ہوں،" طاؤس بولا "ہمارا طریقِ علاج یعنی ہومیو پیتھی یقیناً روحانی طریقۂ علاج ہے۔ ہماری ادویات میٹر کی نہیں بلکہ انرجی کی صورت میں ہوتی ہیں۔ جتنی دوا کم ہو اس میں اتنی ہی طاقت کم ہوتی ہے۔ یہی اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔"

"وہ تو ہے،" عظیم نے کہا۔ "یقیناً یہ طریقِ علاج اپنی نوعیت میں روحانی ہے لیکن ہمارے پریکٹنگ ہومیو پیتھس کا نقطۂ نظر ابھی مادیت سے نکل نہیں سکا۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔"

"ڈاکٹر صاحبان!" رشید ہنس کر بولا۔ "آپ لاکھ کوشش کریں لیکن ایلوپیتھی کو ڈیفیٹ نہیں کر سکتے۔"

"وہ کیوں؟" حامد نے پوچھا۔

"سیدھی بات ہے،" رشید نے جواب دیا، "آج کل مریض کیور نہیں چاہتا۔ وہ صرف ریلیف چاہتا ہے۔ کیور کے لئے صبر چاہیے، استقلال چاہیے۔ آج کل لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ کیور کا انتظار کریں۔ بس ایک گولی ہو یا ایک ٹیکہ لگے اور شام کو انٹرکلاس کی محفل میں شو آف کا موقعہ ہاتھ سے نہ جائے۔"

"سچ کہتے ہو بھائی!" حامد نے آہ بھری۔

"اسلم صاحب!" طاؤس نے کہا "میں سمجھتا ہوں کہ آج کے دور کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنی آئیڈنٹٹی کھو چکے ہیں۔ ماڈرن ایج کی یہ ایک ڈیزیز ہے۔ کینسرس ڈیزیز۔"

"میں سمجھا نہیں!" حامد بولا۔

"میرا مطلب ہے آج کل کے نوجوانوں کو پتہ نہیں کہ وہ کون ہیں۔ پتہ نہیں وہ چاہتے کیا ہیں۔ موومنٹ کے دیوانے تو ہیں۔ چلتے رہنے کا بھوت سوار ہے لیکن انہیں پتہ نہیں کہ ہم کیوں چلے رہے ہیں۔ ہمیں کہاں پہنچنا ہے۔ ہمارے نوجوان ہیڈ کراؤڈ کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے اندر کے فرد کو دبا رکھا ہے بالکل ایسے جس طرح اینٹی بائیوٹکس اندر کی بیماری کو دبا دیتے ہیں۔ وہ اکیلے ہونے سے ڈرتے ہیں۔" طاؤس نے ایک لمبی آہ بھری اور گویا اپنے آپ سے بولا "کاش کہ میں کوئی ایسی دوا بنانے میں کامیاب ہو سکتا جو اندر کے فرد کو ریلیز کر سکتی۔ ہیڈ کراؤڈ کی نفی کر سکتی۔"

"ہوں دلچسپ بات ہے۔" عظیم نے سوچتے ہوئے کہا "آپ کو اس کا خیال کیسے آیا؟" حامد نے طاؤس سے پوچھا۔

"دو سال ہوئے" طاؤس کہنے لگا "جب میں نے پریکٹس شروع کی تو پہلا مریض جو میرے پاس آیا اس نے مجھ سے پوچھا تھا ڈاکٹر صاحب یہ بتائیے کہ میں کون ہوں۔"

"عجیب بات ہے!" رشید زیرِ لب بولا۔

"اور وہ مریض مکمل ہوش و حواس میں تھا کیا؟" اسلم نے پوچھا۔

"بالکل" طاؤس نے جواب دیا۔

"شاید ڈس بیلنسڈ ہو!" عظیم نے گویا اپنے آپ سے پوچھا۔

"بظاہر تو نہیں لگتا تھا۔" طاؤس نے جواب دیا۔

"حیرت کی بات ہے۔" رشید نے دہرایا۔ اُس وقت وہ سب لوگ رشید کے مکان سے ملحقہ لان میں بیٹھے تھے۔

دراصل رشید ہومیوپیتھی کا بہت دلدادہ ہے۔ ہومیوپیتھ ڈاکٹروں سے اس کے بڑے مراسم ہیں۔ اس روز اس نے چار ہومیوپیتھ ڈاکٹروں کو اپنے گھر پہ مدعو کر رکھا تھا۔ غالباً کوئی تقریب تھی یا ویسے ہی۔ رشید خود ہومیوپیتھ نہیں تھا لیکن اُسے ہومیوپیتھی کے کیسز سننے کا بڑا شوق تھا۔ بہرحال کھانا کھانے کے بعد وہ سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے سبز چائے پی رہے تھے کہ دورِ حاضرہ کی بات چل نکلی تھی۔

طاؤس کے اس کیس پر ڈاکٹر لوگ تو نہیں البتہ رشید بہت متاثر ہوا۔ اس کے اصرار پر طاؤس نے انہیں اس نوجوان کا واقعہ سنایا ــــ طاؤس نے بات شروع کی۔

" ان دنوں میں نے نیا نیا مطب کھولا تھا اور مطب بھی کیا۔ میں نے گھر کے ایک کمرے پر بورڈ لگایا تھا اور وہاں چند ایک نمونے کتابیں اور دواشیاں رکھ لی تھیں۔

شام کا وقت تھا میں اپنے مطب میں بیٹھا ایک رسالے کا مطالعہ کر رہا تھا کہ دروازے پر ٹک ٹک کی آواز آئی۔

دیکھا تو دروازے میں ایک خوش پوش نوجوان کھڑا ہے " میں اندر آ سکتا ہوں؟" اس نے کہا۔

" تشریف لائیے " میں نے رسالہ ایک طرف رکھ دیا۔ " بیٹھیے "

" آپ ہومیوپیتھ ہیں کیا؟ " اس نے پوچھا۔

" جی! " میں نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

اس کی شکل شباہت ایک پریکٹیکل نوجوان جیسی تھی۔ سمارٹ۔ ذہین، مضطرب۔ شوخ۔ لاابالی۔ جھکتی آنکھیں، چوڑا منہ، شکستہ مونچھیں اور سر پر بالوں کا ٹوکرا۔

" دراصل میں آپ سے ایک بات پوچھنے آیا ہوں " نوجوان نے کہا۔

" پوچھیئے " میں نے جواب دیا۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا غالباً اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے بات شروع کرے۔

پھر وہ ایک دم کہنے لگا " میری ایک پرابلم ہے۔ جناب! میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آیا میں حمید ہوں یا اختر ہوں۔"

طاؤس رک گیا۔ حاضرین حیرت سے طاؤس کی طرف دیکھنے لگے۔ ہاں ہاں رشید بے صبرا ہو رہا تھا یہ کیا بات ہوئی بھلا میں حمید ہوں یا اختر۔

طاؤس نے بات شروع کی بولا " نوجوان کی بات سن کر میں گھبرا گیا۔ سمجھا شاید اس کا ذہن گڈمڈ ہے لیکن اس نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا۔ پھر نوجوان خود ہی بولا " آئی ام ناٹ اے مینٹل کیس سر ــــ میرا ذہن بالکل ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر دراصل مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیسے بات کروں۔"

" یہ بتائیے کہ حمید کون ہے۔ اختر کون ہے " میں نے پوچھا۔

" میں ہوں۔ میں حمید بھی ہوں اختر بھی، میرا نام حمید اختر ہے " اس نے کہا۔

" تو کیا حمید اختر ایک ہی فرد کا نام ہے " میں نے پوچھا۔

"جی ایک ہی فرد کا۔" اس نے جواب دیا۔

"پھر آپ نے یہ کیوں پوچھا کہ میں حمید ہوں یا اختر"

"میں نے بالکل ٹھیک پوچھا ڈاکٹر! یہی میری پرابلم ہے۔ لیکن میں اپنی پرابلم کسی کو بھی نہیں سمجھا سکتا۔ میں اس امید پر یہاں آیا تھا کہ شاید ہومیوپیتھی میں کوئی ایسی دوا ہو جو میری پرابلم کو حل کر سکے لیکن اِٹس نو یوز۔" وہ جانے کے لئے مڑا۔ معاف کیجئے میں نے آپ کا وقت ضائع کیا۔"

"ذرا ٹھہریئے تو بیٹھ جائیے" میں نے اُٹھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔

"فائدہ" وہ بولا۔

"نقصان بھی تو نہیں" میں نے جواب دیا۔

"جب میں اپنی پرابلم پیش ہی نہیں کر سکتا تو۔"

"گولی ماریئے پرابلم کو۔" میں نے کہا "آیئے اکٹھے بیٹھ کر چائے کا پیالہ پیتے ہیں دنیا میں سب سے عمدہ دوا اکٹھے بیٹھ کر باتیں کرنا ہے۔"

"لیکن آپ کا وقت" اس نے کہا۔

"بے فکر رہیئے۔ میں بالکل فارغ ہوں۔" "احمد دین!" میں نے بآواز بلند اپنے ملازم کو پکارا "بھئی چائے لے آؤ" اس پر وہ نوجوان رُک گیا۔

بیٹھئے نا" میں نے نوجوان کو صوفے پر بٹھا دیا۔ "دیکھئے موسم کتنا خوشگوار ہے اور یہاں سے پہاڑوں کا منظر کتنا اچھا لگتا ہے۔" میں نے اس سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ دیر تک بیٹھے ہم دونوں چائے پیتے رہے۔ اس دوران میں دو ایک مرتبہ اس نے اپنی پرابلم کی بات شروع کرنے کی پھر سے کوشش کی۔ آخر میں نے اس سے کہا "حمید صاحب آپ اپنی پرابلم پیش نہ کریں بلکہ اپنی آپ بیتی سنائیں۔ آپ کی پرابلم آپ ہی آپ باہر نکل آئے گی۔"

بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے مجھے اپنی کہانی سنانی شروع کر دی۔

کہنے لگا "ڈاکٹر صاحب میرا نام حمید اختر ہے لیکن گھر میں مجھے سب حمید کہتے ہیں۔

ہم شہر کے پرانے قصبے کوچہ قاضیاں میں رہتے ہیں۔ میرے آباؤ اجداد نہ جانے کب سے اس محلے میں رہتے ہیں۔ یہ محلہ ایک کوچہ بند محلہ ہے۔ میرا مطلب ہے چاروں طرف سے بند ہے اندر جانے کے لئے ایک بہت بڑی ڈیوڑھی بنی ہے اور کوئی راستہ نہیں محلے میں صرف قاضی آباد ہیں جو ایک دوسرے کے عزیز یا رشتہ دار ہیں۔" وہ رک گیا۔ اور کچھ دیر

کے توقف کے بعد بولا ۔

"آپ چونکہ شہر کے جدید حصے میں رہتے ہیں آپ نہیں سمجھ سکیں گے کہ محلے میں رہنے کا مطلب کیا ہے۔ محلے میں ہر شخص ہر دوسرے شخص کو جانتا ہے۔ جونہی آپ محلے میں داخل ہوتے ہیں، لوگوں کی نظریں آپ پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ بولتا کس طرح ہے سر اٹھا کر یا نیوا کے لڑکیوں کی طرف کن نگاہوں سے دیکھتا ہے۔

ہم لوگ جو پشتوں سے محلے میں رہتے آئے ہیں۔ محلہ ہماری ہڈیوں میں رچ بس گیا ہے۔ جونہی ہم محلے میں داخل ہوتے ہیں آپ سے آپ آنکھیں جھک جاتی ہیں۔ گفتگو میں شوخی ختم ہو جاتی ہے۔ انداز کا غنڈہ پن ڈھل جاتا ہے۔ لڑکیاں نگاہ میں لڑکیاں نہیں رہتیں بڑوں کے لئے ادب و احترام کا ایک خول چڑھ جاتا ہے۔

اگرچہ اب محلے میں بڑی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں۔ برقعے اُتر گئے ہیں لباس بدل گئے ہیں۔ کاریں آگئی ہیں۔ ڈرائنگ روم سج گئے ہیں لیکن محلے والوں کا رُخ نہیں بدلا۔ اگر بدلا بھی ہے تو یہ تبدیلی باہر تک محدود ہے۔ محلے میں داخل ہوتے ہوئے کایا پلٹ جاتی ہے کسی مجبوری کی وجہ سے نہیں ویسے ہی بے اختیاری طور پر۔

ملّاں میں اس محلے میں پلا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب سمجھے آپ اور مجھے اپنی ماں سے محبت ہے۔ نہیں محبت نہیں عشق ہے عشق۔ میری ماں نے جتنی محبت مجھے دی ہے اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ میں اپنی ماں کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا ہوں ڈاکٹر!"

ماں کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ جذباتی ہو گیا۔ طاؤس ایک ساعت کے لئے رک گیا۔ پھر بولا۔

آپ کا باپ" میں نے اس سے پوچھا۔

اب تو میرا باپ ایک اچھی خاصی نوکری پہ ہے پہلے وہ ایک معمولی سے عہدے پہ کام کرتے تھے آج کل تو ہمارا گھر ایک اچھا خاصا مڈل کلاس گھرانہ ہے۔ اچھا گزارہ ہو رہا ہے۔ پہلے یہ بات نہ تھی بہت مشکل سے پورا ہوتا تھا۔

پھر ہم پر ایک مصیبت نازل ہو گئی۔ ابا بیمار پڑ گئے۔ وہ ایک عجیب سی بیماری تھی۔ انہیں ریڑھ کی ہڈی میں شدت کا درد اٹھتا تھا۔ ہم نے انہیں ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ ہسپتال والوں نے انہیں درد سے بچانے کے لئے نشے والے ٹیکے لگانے شروع کر دیئے۔ دو سال کے بعد جب وہ صحت مند ہو کر گھر آئے تو ان ٹیکوں کے عادی ہو چکے تھے۔ ایڈکٹ ہونے کی وجہ سے ان کی نوکری چھوٹ گئی بدمزاجی حد سے بڑھ گئی جیسے کہ ہر اس ڈرگ ایڈکٹ کی ہوتی ہے جس کے پاس نشہ پورا کرنے کے لئے پیسے نہیں ہوتے۔

اف وہ چار سال ہم پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔ ہماری ہڈیاں توڑ دیں۔ امی چھوٹی بہن اور میں لیپ کر رہ گئے۔ ہم

بیتوں نے مزدوروں کی طرح کام کیا۔ ریڈی میڈ کپڑے سیئے۔ بیچے دیسی نائیوں کو سپلائی کرنے کے لئے فیس کا
تھیلے سیئے۔ سیلوکین کے لفافے بنائے۔ ان دنوں ہمیں کئی کئی روز فاقے آئے لیکن امی نے آبا کے علاو
تعلیم کو ہر قیمت پر جاری رکھا۔ اگر امی نہ ہوتیں تو گھر کے پرخچے اُڑ جاتے۔ امی ایک بہت بڑی عورت ہے
اس نے ہم سب کا حوصلہ بندھائے رکھا۔ ہم میں مصیبتیں سہنے کی ہمت پیدا کی۔ آبا کی دیوانگی برداشت کی
بیت گئے ابا کی وہ عادت چھوٹ گئی اور پھر انہیں پہلے سے بھی بہتر ملازمت مل گئی ایسی کہ اب ہم خاصے
ہو گئے ہیں۔

گھر میں مجھے سب حمید کہتے ہیں، ڈاکٹر صاحب! کبھی کسی نے اختر کہہ کر نہیں بلایا محلے میں بھی مجھے سد
نام سے بلاتے ہیں۔ جب کوئی مجھے حمید کے نام سے بلاتا ہے تو آواز میرے کانوں سے داخل ہو کر گویا سیدھی
پہنچ جاتی ہے اور میرے دل میں گھر اور محلے کی بادیں یوں جھن جھن کرنے لگتی ہیں جیسے ساز کی تاریں۔ گھر سے
جذبات ابھرنے ہیں۔ ادب۔ احترام۔ عجز۔ خدمت برداشت ایک مٹھاس سی پیدا ہو جاتی ہے۔ میری گردن
جاتی ہے۔ نگاہیں جھک جاتی ہیں۔ منہ سے جی ہاں جی ہاں نکلتا ہے ایک عجیب سا ٹھہراؤ۔ عجیب سا سکون۔
نہیں کر سکتا، ڈاکٹر صاحب، نوجوان نے جھرجھری لے کر کہا۔

"میں سمجھتا ہوں آپ کی بات کو" میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

"اسے صرف وہی سمجھ سکتا ہے۔ جو پشت در پشت سے محلے میں رہتا آیا ہو ڈاکٹر!" نوجوان نے پھر بات ش
جب میں کالج میں داخل ہوا۔ ان دنوں ہماری گھریلو مصیبت نئی نئی ختم ہوئی تھی۔ محنت مشقت اور غربت کا د
ہوا تھا۔ کالج میں میرا جی چاہتا تھا کہ الٹی چھلانگیں لگاؤں، ہنسوں کھیلوں۔ قہقہے لگاؤں۔ اس کو چھیڑوں۔ اس
پھر وہاں محلے کی بندشیں بھی تو نہ تھیں۔ ایک عجیب سی آزادی کا احساس ہوا مجھے مادر پدر آزادی پھر یہ بھی تھا
مجھے کوئی حمید کے نام سے پکارنے والا نہ تھا۔ پتہ نہیں کیسے وہاں کالج میں سبھی مجھے اختر کہہ کر بلاتے تھے۔ شاید
سے میں محسوس کرنے لگا تھا کہ میں ایک نیا نکور نوجوان ہوں جسے حمید سے دور کا تعلق نہیں یعنی یوں سمجھ لیجئے کہ کا
یوں تھا جیسے بوتل سے نکلا ہوا جن ہو۔

میں نے بال بڑھائے مونچھیں لٹکا لیں۔ جیکٹ اور جین پہن لئے میرا بولنے کا انداز بدل گیا سوچنے کا اند
گیا۔ جینے کا انداز یوں بدل گیا جیسے کوئی چھت سے پٹ ہو جائے۔

ایک ہی سال میں میں کالج کی ہرا کٹویٹی میں پیش پیش ہو گیا۔ آزادی کے نعرے لگانے میں پروفیسروں کا مذاق

میں گرل سٹوڈنٹس کو چھیڑنے میں گلیڈاآئی چھکنے میں چمکیلی باتیں کر کے اپنی دھاک جمانے ہسٹرائیک کرانے میں جلسہ جلوس آرگنائز کرنے میں ہاتھا پائی کرنے میں لڑکیوں سے رومان لڑانے میں میں ڈیبیٹ کلب کا سیکرٹری بن گیا۔ سپورٹس میں کھلاڑی تو نہ بن سکا لیکن پنڈال میں کھڑا ہو کر جس کو چاہتا سپورٹ کر کے ہیرو بنا دیتا جس لڑکی پہ توجہ دیتا وہ ابھر کر کالج کی فضا پہ چھا جاتی۔ جس پارٹی کو چاہتا اسے کامیاب بنا دیتا جسے نہ چاہتا اسے یوں توڑ کر رکھ دیتا جیسے ہاتھ کا کھلونا ہو۔

یعنی تین سالوں میں اختر کالج کی آنکھ کا تارا بن گیا۔ سب سے بڑا ئی بن گیا۔ ڈینڈی بن گیا۔

اب پروفیسر اس سے دبتے ہیں۔ لڑکے اس کے پیچھے چلنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ لڑکیاں اس سے خائف ہیں سامنے ہی اس کی طرف کھینچی چلی آتی ہیں۔ بولتے بولتے نوجوان رُک گیا۔

"اور حمید؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"حمید! وہ مسکرایا۔ حمید اپنی جگہ جوں کا توں قائم ہے۔ جب بھی اختر محلے میں داخل ہوتا ہے تو اس کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ اوپر سے اختر کا چھلکا اتر جاتا ہے اور نیچے سے حمید نکل آتا ہے۔ گردن جھک جاتی ہے تنے ہوئے سینے میں لچک پیدا ہو جاتی ہے۔ نگاہوں میں ادب اور لحاظ کا لگاؤ ابھر آتا ہے لڑکی کو دیکھ کر وہ متہابی نہیں چھوٹتی جس سے کالج کی فضا تارے تارے ہوئی رہتی ہے۔ الٹا لڑکیاں ماں بہنوں کا روپ دھار لیتی ہیں۔ بڑے بوڑھوں کے لئے وہ تحقیر نہیں رہتی بلکہ اس کی جگہ احترام اور ادب کا جذبہ ابھرتا ہے اور جب وہ گھر میں داخل ہوتا ہے تو ماں یوں نظر آتی ہے جیسے دیوی ہو اور اس کا جی چاہتا ہے کہ ساری دنیا کو اٹھا کر دیوی کے قدموں کی بھینٹ کر دے تے۔ نوجوان خاموش ہو گیا اس کی آنکھوں سے پیار بھری پھوار نکل رہی تھی۔

دیر تک کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ آخر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ قادس نے کہا اور بن سوچے سمجھے ایک ایسا سوال کر دیا کہ میں خود حیران رہ گیا۔ میں نے کہا آپ کو کیا یہ احساس شروع سے ہی تھا کہ حمید اور اختر دو مختلف افراد ہیں؟"

"نہیں۔ نہیں" نوجوان نے بڑی شدت سے نفی میں سر ہلایا مجھے اس کا قطعی احساس نہیں تھا اگر کل وہ واقعہ نہ ہوتا تو شاید میں بے خبری ہی میں رہتا۔"

کل دوپہر کے وقت کالج کے کھلے میدان میں ہم ایک بڑے فنکشن کا انتظام کر رہے تھے۔ اختر اس فنکشن کا ناظم بھی تھا اور روح رواں بھی اس وقت وہ لڑکوں کو ہدایات دے رہا تھا کہ ہمارے محلے کا چاچا غفور وہاں آ گیا اس نے باآواز بلند آوازیں دینی شروع کر دیں۔ حمید حمید۔ اختر نے وہ آواز سنی بھی لیکن اس وقت اس کے لئے حمید کا کوئی مفہوم تھا۔ پتہ نہیں حمید کون تھا۔

پھر لڑکوں نے شور مچا دیا "بھئی اختر یہ صاحب کسی حمید کو پوچھ رہے ہیں"

"یہی تو اپنا حمید ہے" چاچا نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔

دفعتاً میں نے مڑ کر دیکھا۔ سامنے چچا غفور کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر اختر کا ذہن کنڈ ہو گیا۔ شاید دھکا لگا جب چچا نے بتایا کہ ماں بیمار ہے تو اختر کی نگاہوں میں وہ میدان وہ کالج اور وہ لڑکے سب دھندلا گئے۔ ایک خلا نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ پھر حمید جاگ اٹھا۔ یوں جیسے بٹن دبانے سے بتی جل اٹھتی ہے۔

نوجوان خاموش ہو گیا۔ کافی دیر خاموش رہا۔ پھر گویا اپنے آپ سے کہنے لگا "آج سارا دن میرے ذہن میں یہی سوال گھومتا رہا کہ میں کون ہوں اختر یا حمید۔

وہ پھر چند ساعت کے لئے خاموش ہو گیا پھر میری ہومیوپیتھک کتابوں کی طرف دیکھ کر بولا "میری ماں ہومیوپیتھی کی بڑی قائل ہے۔ یہاں سے گزر رہا تھا کہ آپ کا بورڈ دیکھ کر خیال آیا۔ کیوں نہ آپ سے پوچھوں کیا آپ کے ہاں کوئی ایسی دوا ہے جو میری اصلیت کو ظاہر کر دے۔ سامنے لے آئے تاکہ مجھے پتہ چلے کہ مجھے حمید بن کر زندگی گزارنی ہے یا اختر بن کر۔ یہ میری پرابلم ہے ڈاکٹر صاحب کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں"

نوجوان نے جلتی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ طاؤس رک گیا اور ارد گرد کا جائزہ لینے لگا۔

اسلم چھت کی طرف گھور رہا تھا۔ حامد ہاتھوں کے پیالے میں ٹھوڑی ٹیکے بیٹھا سوچ رہا تھا۔

عظیم بظاہر پھٹی پھٹی آنکھوں سے طاؤس کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن اس کی نگاہیں نہ جانے کن خلاؤں میں بھٹک رہی تھیں۔

رشید منہ میں پنسل ڈالے بیٹھا تھا۔

"بڑا دلچسپ کیس ہے" اسلم نے چھائی ہوئی خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

"اسے سپلٹ پرسنیلٹی تو نہیں کہہ سکتے۔" عظیم بولا "ڈول پرسنیلٹی بھی نہیں"

"کیا یہ صرف حمید اختر کا خصوصی کیس ہے یا ہر ماڈرن نوجوان کا المیہ ہے کا جو پشتوں سے محلے میں رہتا آیا ہے" حامد نے پوچھا۔

"کچھ نہیں کہا جا سکتا" طاؤس نے جواب دیا۔

"چھوڑو یار ان باتوں کو" رشید بولا "یہ بتاؤ کہ تم نے حمید اختر کو کیا جواب دیا"

"وہی جو معالج دیا کرتے ہیں" طاؤس نے جواب دیا "میں نے کہا میں آپ کا کیس سٹڈی کروں گا مجھے چار ایک دن کی مہلت دیجئے" یہاں پر نوجوان اٹھ بیٹھا "میں پھر آؤں گا۔ شاید اتوار کے دن امید تو ہے۔ اب مجھے اجازت دیجئے" یہ کہہ کر اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گیا۔

"کیا وہ اگلی اتوار کو آیا" رشید نے پوچھا۔

طاؤس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"یعنی بات ختم ہو گئی"

"نہیں" طاؤس بولا۔ "بلکہ بات شروع ہو گئی"

"کیا مطلب" عظیم نے پوچھا۔

"میرے دل میں ایک سوال کھڑا ہو گیا" طاؤس بولا کہ "اگر اس کیس کو ہومیوپیتھی نہیں حل کر سکتی تو ہومیوپیتھی کے قدم کا کوئی جواز نہیں"

بالکل اسلم بولا۔ "ایسے کیس کو صرف ہومیوپیتھی ہی حل کر سکتی ہے"

"اگر ہومیوپیتھی شیپر سٹڈ سلف کو باہر نہیں لا سکتی تو یہ ہمارا قصور ہے۔ سسٹم کا نہیں۔ طاؤس نے کہا" اگر ہومیوپیتھی ہپوکریسی کی عادت کو توڑ نہیں سکتی تو یہ ایک افسوسناک بات ہے قصور ہمارا ہے کہ ہم نے ہومیوپیتھی کو اس نا دیے سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ میٹریا میڈیکا میں زیادہ تر سیمٹمز ایسے درج ہیں جو جسم نہیں بلکہ شخصیت کی حد میں آتے ہیں" طاؤس جوش میں آ گیا۔

"وہ تو سب ٹھیک ہے۔ حامد نے کہا۔ لیکن ہمیں یہ بتائیے کہ کیا مریض پھر کبھی آپ سے ملا"

"ہاں ملا۔ طاؤس نے بات شروع کی" مگر اتفاقاً۔ تقریباً چھ مہینے بعد۔ اس روز میں اتفاقاً میونسپل پارک میں جا نکلا تھا وہاں گھومتے پھرتے دفعتاً میں نے دیکھا کہ وہ اکیلا ایک بنچ پر بیٹھا گہری سوچ میں کھویا ہوا ہے"

"ہیلو" میں نے کہا۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکا "شاید آپ کو یاد نہ رہا ہو۔ میں طاؤس ہومیوپیتھ ہوں"

"اوہ" وہ اُٹھ بیٹھا۔

"کیوں آپ وعدہ کے مطابق تشریف نہ لائے" میں نے پوچھا۔

"اصل بیماری کی وجہ سے میں سب کچھ بھول گیا۔ ڈاکٹر" وہ بولا۔

"اب کیا حال ہے ان کا" میں نے پوچھا۔

"ٹھیک ہو گئیں ہیں لیکن ڈاکٹر میں ایک نئی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہوں" اس نے آہ بھر کر کہا۔

"کیا ہوا" میں نے پوچھا۔

"مجھے کالج کی ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے ڈاکٹر" اس نے جواب دیا۔

آپ کا مطلب اختر کو محبت ہو گئی ہے یا حمید کو۔

• ہاں اختر کو" وہ ہنسنے لگا۔

• لیکن اختر اور محبت بے جوڑ بات ہے"

• ہاں ہاں" وہ چلایا۔ اختر تو خود ایک بگڑا ہوا محبوب ہے۔ اسے محبت نہیں ہو سکتی تھی لیکن ہو گئی۔ ڈاکٹر ہو گئی پتہ نہیں کیسے پہلے تو اختر یہ سمجھتا رہا کہ محض دل لگی ہے اپنے آپ کو دھوکا دیتا رہا۔ بہلاتا رہا۔ پھر"

• لیکن وہ لڑکی کون ہے" میں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

کہنے لگا "سمر ڈایری کی ایک لڑکی ہے اس کا نام سنبل ہے۔ یہ بڑی عجیب و غریب لڑکی ہے ڈاکٹر! بڑی عجیب و غریب! جب وہ نئی نئی ہوسٹل میں داخل ہوئی تھی تو سب نے سمجھا تھا کہ وہ بہت ہی معصوم ہے۔ وہ بات بات پر شرما جاتی تھی۔ اس کی شرماہٹ بہت ہی جاذب نظر تھی وہ ایک چھوٹی سی تیلا دبلی سمارٹ لڑکی ہے تیز بہت تیز۔ گندمی رنگ خدو خال تیکھے سوئی کی طرح چبھ جانے والی لڑکی ہے وہ۔"

• خیر صاحب نوجوان نے پھر بات جاری کی چند ہی مہینوں میں سنبل نے پر پرزے نکال لئے اور لڑکوں کو پتہ چل گیا کہ وہ لجاتی شرماتی نہیں۔ بلکہ شرماہٹ کو استعمال کرتی ہے اور ڈاکٹر اسے شرماہٹ کو استعمال کرنا آتا ہے لجا لجا کر توجہ جذب کرتی ہے ایسے کہ میک اَپ کیا کرے گا۔ جب شرماتی ہے اس وقت اس کی پلکیں اڑتی تیتری کے پروں کی طرح پنکھی جھلتی ہیں۔ گال سرخ ہو جاتے ہیں۔ آنکھیں غروب ہو کر طلوع ہوتی ہیں پھر غروب ہو جاتی ہیں۔ باقی لڑکیوں کا انداز تو دھویا دھایا ہوتا ہے میٹر آف فیکٹ قسم کا چونکہ وہ رومانٹک انداز کو رجعت پسندی کا نشان سمجھتی ہیں اور شرمانے کو نفرت کی آنکھ سے دیکھتی ہیں۔ اسی وجہ سے سنبل کی اپیل انوکھی تھی۔ سبھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پھر پتہ چلا کہ سنبل بڑی حرام زادی ہے وہ لڑکوں سے کھیلتی ہے۔ کھیلنے کا گر جانتی ہے آج آپ کی طرف متوجہ ہوئی۔ شرما شرما کر آپ کا بُرا حال کر دیا کل آپ کو یوں نظر انداز کر دیا جیسے جانتی ہی نہ ہو۔ اس کا انداز کچھ ایسا ہے ڈاکٹر کہ جس کی طرف متوجہ ہو جائے وہ سمجھنے لگتا کہ میرے قابو میں ہے قابو میں لانے کی کوشش کرو تو یوں انگلیوں سے پھسل جاتی ہے جیسے جیتی مچھلی ہو۔ ایک نگاہ ڈالے تو اتنی قریب آجاتی ہے کہ بس ہاتھ بڑھانے کی بات معلوم پڑتی ہے۔ دوسری نگاہ ڈالتی ہے تو کوسوں دور چلی جاتی ہے بڑی چالاک ہے وہ ڈاکٹر لیکن ہے جادوگرنی۔"

نوجوان ہنسنے لگا۔

اس وقت اس کی آنکھوں سے پھلجھڑی سی نکل رہی تھی یوں جیسے پھلجھڑیاں چل رہی ہوں۔ ایک ساعت کے لئے وہ رکا پھر از خود بات شروع کر دی۔

" قصہ مختصر یہ کہ چھ سات مہینے میں سنبل نے سب لڑکوں کو گھائل کر کے رکھ دیا لیکن کسی کے ہاتھ نہ آئی۔ اس پر اختر کی آنا جاگی۔ وہ سنبل کے قریب گیا۔ اسے جیتنے کے لئے نہیں بلکہ قابو میں لا کر دکھانے کے لئے۔ خیر وہ چار دن تو سنبل نے وہ وہ نگاہ ڈالی کہ اختر پگھل کر رہ گیا۔ چھینٹے اڑنے لگے۔ پھر سنبل پیچھے ہٹ گئی اور اس نے "ذرا ہٹ کر ہیلو مسٹر" کا انداز اپنا لیا۔ بس کیا تباؤں ڈاکٹر اختر اور سنبل میں بڑی لڑائی ہوئی گھمسان کا رن پڑا۔ اختر بری طرح گھائل ہوا۔ ایا ہیچ بن کر رہ گیا۔"

میں نے اس کی بات کو ٹوک کر کہا " آپ تو کہتے ہیں وہ بڑی مکار ہے چالاک ہے حرام زادی ہے پھر آپ کو اس سے محبت کیسے ہو گئی۔"

" اسی لئے ہوئی ڈاکٹر کہ وہ مکار ہے۔ چالاک ہے حرام زادی ہے۔ اگر وہ سیدھی سادی معصوم لڑکی ہوتی تو میں اس سے کھیلتا اور پھر لوں پھینک دیتا۔ جیسے کھلونا ہو۔"

" اوہ یہ بات ہے!" میں نے مسکرا کر کہا: "اچھا تو کیا آپ نے اظہارِ محبت کیا۔"

" پیشتر اس کے کہ اظہار کرتا نوجوان نے جواب دیا: "ایک مسئلہ پڑ گیا۔ ویسے اظہار کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اسے سب پتہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ میری کیا کیفیت ہے اور یہ بھی کہ میں نے والیسی کی سب کشتیاں اپنے ہاتھوں سے جلا دی ہیں۔"
وہ رک گیا

" ہاں تو وہ مشکل کیا تھی" میں نے پوچھا۔

ایک دن امّی نے مجھے بلایا کہنے لگی "حمید تو نوشابہ کو جانتا ہی ہے"

نوشابہ امی کی واحد سہیلی تھی جس زمانے میں ہم پر مصیبت پڑی تھی۔ اس بھری دنیا میں نوشابہ ہماری واحد ہمدرد تھی۔ اس نے ہم پر بڑے احسان کئے تھے۔ میں ان احسانات کو اچھی طرح جانتا تھا۔

' ہاں امّی میں نوشابہ کو اچھی طرح جانتا ہوں' میں نے امی سے کہا۔ امی بولی " نوشابہ کے میاں فوت ہو چکے ہیں۔ اس کی اکلوتی بچی صفیہ اب جوان ہے۔ کالج میں پڑھتی ہے۔ خوش شکل ہے۔ سمارٹ ہے ماڈرن بھی ہے لیکن گھر داتی ہے۔ اتنی سلیقے والی، اتنی خدمت گذار کہ یوں لگتا ہے جیسے اسے اس زمانے کی ہوا بھی نہیں لگی۔ میں چاہتی ہوں بیٹے کہ اسے بہو بنا کر گھر لے آؤں۔ ارے تو تو گھبرا گیا۔ امّی نے غالباً میری حالت بھانپ کر کہا نہیں نہیں کوئی زبردستی نہیں۔ اگر تیرا جی نہیں چاہتا تو نہ سہی ___ یہ تو میری آرزو ہے۔ اگر تو مان جائے تو میری زندگی سپھل ہو جائے سوچ لے۔ کوئی جلدی نہیں سوچ کر مجھے بتا دینا۔'

" پھر آپ نے کیا فیصلہ کیا" میں نے پوچھا۔

"فیصد نوجوان ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسی میں ٹوٹ سی آواز تھی۔ جس وقت سے امی نے شادی کی بات کی ہے سنبل کے لئے میرا جذبہ یوں اُبھر آیا ہے جیسے دودھ کی کڑاہی پہ ملائی آجاتی ہے۔ اب مجھے پتہ چلا کہ سنبل سے مجھے لگاؤ ہی نہیں ہے عشق ہے عشق ہے۔ اس کے بغیر زندگی بے معرف نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب میں پھانسی پہ لٹکا ہوا ہوں۔ پہلے میرا خیال تھا کہ امی کی خواہش پہ میں اپنی ہر خواہش قربان کر سکتا ہوں لیکن اب —" نوجوان نے بے بسی سے دونوں ہاتھ اٹھائے اور پھر چپ ہو گیا۔

طاؤس نے چاروں طرف دیکھا۔

کتنی انوکھی بات ہے۔ رشید بولا۔

" انوکھی تو نہیں" اسلم نے کہا۔" عام سی بات ہے۔ ایسے واقعات روز ہوتے ہیں"

"ہاں تو پھر نوجوان نے کیا فیصلہ کیا" عظیم نے پوچھا۔

" ہماری وہ مختصر سی ملاقات تھی" طاؤس نے بات جاری کرتے ہوئے کہا۔ "ہم دونوں بنچ پہ بیٹھے تقریباً ایک گھنٹہ باتیں کرتے رہے تھے وہ سخت کش مکش میں مبتلا تھا۔ ابھی وہ کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا۔ اس کے ذہنی کرب کو محسوس کر کے میں سخت گھبرا گیا اور اسے چھوڑ کر چلا آیا"

"ہاں!" اسلم بولا "ذہنی کرب متعدی ہوتا ہے"

" اس کے بعد وہ نوجوان آپ سے ملا کیا" حامد نے پوچھا

" ہاں چھ مہینے بعد" طاؤس نے جواب دیا

" تو کیا اس نے آپ کو بتایا —" رشید نے بے تابی سے پوچھا۔

"ہاں!" طاؤس نے پھر سے بات شروع کی۔ "اس روز میں سینما کا سپیشل شو دیکھنے گیا تھا۔ بڑی آؤٹ سٹینڈنگ پکچر لگی تھی۔

ہال میں میں خاصہ لیٹ پہنچا۔ سیٹ پر بیٹھ کر میں نے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ حمید اختر مجھ سے اگلی رو میں بیٹھا ہے اس کے ساتھ ایک لڑکی تھی۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ نئی بیاہی ہوئی دلہن ہے۔ یعنی اس کی شادی ہو چکی تھی۔ میرے دل میں کھد بد ہونے لگی کہ وہ لڑکی کون ہے سنبل ہے یا صفیہ۔ سچی بات یہ ہے کہ فلم پر میری توجہ نہ تھی بس یہی سوچتا رہا۔

پھر جب انٹرول ہوا اور حمید اختر باہر نکلا تو میں بھی پیچھے پیچھے باہر نکل گیا۔ اس نے جلد ہی مجھے دیکھ لیا۔ "ہیلو ڈاکٹر"

وہ چلایا۔

"کیسے میں نے انجان ہو کر پوچھا۔ آپ نے کوئی فیصلہ کیا؟"

"میری تو شادی بھی ہو گئی ڈاکٹر صاحب" وہ چلایا۔

"سنبل سے یا صفیہ سے" میں نے پوچھا "مجھے ساری بات سنائیے۔"

اس نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔ بولا "ڈاکٹر صاحب امی کی خواہش کو رد کرنا میرے لئے ممکن نہ تھا میں نے دل پہ پتھر رکھ لیا اور امی سے کہہ دیا۔ امی میں وہاں بیاہ کروں گا جہاں آپ چاہتی ہیں۔ بس یہی میرا فیصلہ ہے۔ پھر کیا تھا ڈاکٹر امی نے جھٹ منگنی پٹ بیاہ والی بات کی۔ اور اس طرح صفیہ سے میری شادی ہو گئی۔ پھر سہاگ کی رات جب میں نے صفیہ کا گھونگھٹ اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے سامنے سنبل بیٹھی ہوئی ہے۔"

"ارے" میرے منہ سے چیخ سی نکلی۔ طاؤس رک گیا۔

سبھی لوگ حیرت سے طاؤس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"صفیہ سنبل نکلی۔ مطلب کیا ہوا" رشید چلایا۔

"مجھے تو ساری بات ہی گپ نظر آتی ہے" اسلم نے کہا

"آپ نے حمید اختر سے نہیں پوچھا کہ اس کا مطلب کیا ہوا" عظیم بولا۔

"ہاں پوچھا تھا" طاؤس نے کہا۔

"تو پھر کیا بتایا اس نے" رشید نے پوچھا۔

پوچھا تو حمید اختر نے کہا "ڈاکٹر صاحب صفیہ کو اپنا نام اچھا نہیں لگتا تھا اس لئے اس نے کالج میں اپنا نام سنبل مشہور کر رکھا تھا۔

درونِ تیرگی

میرزا ادیبؔ

کمرے کے سب دروازے، کھڑکیاں اور روشندان ایک مدت سے بند پڑے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کمرے کے اندر فضا پر ہر وقت ایک بوجھل، سواد، بھیانک تاریکی رینگتی رہتی تھی۔ اس گہرے اندھیرے میں نہ تو کبھی سورج کی حیات آفریں شعاعوں نے سانس لینے کی کوشش کی تھی اور نہ کبھی چاند تاروں کی ٹھنڈی روشنی نے اسے چھوا تھا اور نہ تو ہوا کی لہریں بھی کسی وقت اندر آنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ شاید انہیں بھی کمرے کی نحوست آلود منجمد تیرگی سے ڈر لگتا تھا۔

یہ کمرہ زندگی کی تمام ہما ہمی زائیوں سے بالکل محروم ہو چکا تھا۔ اور اگر اس میں زندگی کا کوئی نشان تھا بھی تو صرف ان ننھے ننھے نظر نہ آنے والے ہزاروں ذرات کی بدولت تھا۔ جو ایک دیوار سے لے کر دوسری دیوار تک فضا میں دن رات سرکتے رہتے تھے۔ ان میں بھی حرکت اس وقت پیدا ہوتی تھی۔ جب کبھی ہوا کی کوئی لہر یا سورج کی کوئی کرن دروازے کے سوراخ یا دیوار کی دراڑ میں سے اندر آ جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ان میں کبھی کسی قسم کا اضطراب یا ہلچل نظر نہیں آتی تھی۔ وہ تاریکی کے اجزا بن کر رہ گئے تھے۔ ان میں انفرادیت نام کو بھی باقی نہیں رہی تھی۔

یہی ماحول طاری تھا کہ ایک دن اسی تاریک کمرے کے ایک تاریک ترگوشے میں ایک چھوٹا سا ذرہ لڑھک کر زمین کے بالکل قریب پہنچ گیا اور انتہائی مایوسی کے عالم میں بولا۔

"توبہ کس قدر اندھیرا ہے۔ کہیں بھی روشنی کی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ نہ جانے کب اس سے نجات ملے گی؟"

یہ الفاظ سن کر ایک بوڑھے ذرے نے حقارت انگیز قہقہہ لگایا۔

"خوب! ناچیز ذرے ہو کر روشنی کی سوچ رہے ہو بیٹا! ہم اندھیرے کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی

نے ہمیشہ اندھیرے ہی سے وابستہ رہیں گے ہمارا وجود تاریکی سے الگ نہیں ہے۔"

"نہیں کبھی نجات نہیں ملے گی کبھی اس اندھیرے سے باہر نہیں نکل سکیں گے۔" ننھا ذرہ بولا۔

"کبھی نہیں ——— میری مانو ایسی بے ہودہ باتیں نہ سوچا کرو۔ یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ تم ایک حقیر ذرے ہو۔"

یہ کہہ کر بوڑھے ذرے نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ننھا ذرہ سہم کر خاموش ہو گیا۔ کچھ اور پوچھنے کی اس میں ہمت نہیں رہی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ اس نے اپنی ساری زندگی میں صرف ایک ہی دفعہ روشنی دیکھی تھی ——— اور اس وقت اس کا سینہ ایک شدید تیز و تند ولولے کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ اس کی رگ رگ میں ایک پُر لذت سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ اور اسے پہلی مرتبہ محسوس ہوا تھا کہ وہ ایک حقیر، ایک بے مایہ وجود نہیں ہے ——— اپنی دنیا میں اس کی کچھ اہمیت بھی ہے ——— وہ کچھ کر بھی سکتا ہے۔ اس میں کچھ کر سکنے کی ہمت بھی ہے۔ اس کے سامنے ایک وسیع، ایک روشن دنیا پھیلی ہوئی ہے۔ جس میں وہ پرواز کر سکتا ہے۔ ناچ سکتا ہے، گا سکتا ہے ——— مگر افسوس اسی وقت ہوا کے ایک تھپیڑے نے اسے دروازے سے پیچھے دھکیل دیا اور کچھ دیر کے بعد جب اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو اس کے اردگرد دوبارہ بے کنار اور ہمہ گیر تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اور اس کے جسم کا ہر عضو بری طرح دکھ رہا تھا۔ اس کے سارے حسین خواب چٹان کی طرح سخت اندھیرے سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گئے تھے اور بظاہر تاریکی سے نکل کر روشن دنیا میں جانے کی کوئی امید باقی نہیں رہی تھی۔ تاہم شدید سے شدید مایوسی بھی اس مشعل کو بجھانے میں کامیاب نہ ہو سکی جو ایک مرتبہ روشنی دیکھنے کے بعد اس کے دل کی گہرائیوں میں جل چکی تھی ——— اسے توقع تھی کہ ایک نہ ایک دن وہ منور اندھیرے کی تہوں سے نکل کر باہر کی لامحدود دنیا میں پہنچ جائے گا ——— اور وہ اسی وقت سے لے کر اس وقت تک اسی گھڑی کا انتظار کر رہا تھا۔

بوڑھے ذرے کے تلخ اور ہمت شکن الفاظ نے اس پر گہرا اثر کیا تھا۔ اس لیے وہ اپنے وجود کو سنبھال نہ سکا اور زمین پر گر پڑا۔ چند لمحے خاموشی طاری رہی۔ وہ بے بس ہو کر، مجروح ہو کر، چپ چاپ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اسی حالت میں یکایک بوڑھے نے حسب معمول کرخت لہجے میں کہا۔

"تمہارا خیال ہے گھر کی مالکن پھر کبھی یہاں آ جائے گی اور کمرے کا دروازہ کھول دے گی"

ننھے ذرے نے کوئی جواب نہ دیا۔ دراصل یہ الفاظ اس کے کانوں تک پہنچ ہی نہیں سکے تھے اور اگر وہ یہ الفاظ سن بھی لیتا جب بھی کچھ نہ کہہ سکتا۔ مایوسی نے اسے بیدم کر دیا تھا۔

بزرگ ذرّے نے آنکھیں جھپکا کر کہا۔

"گھر کی مالکن کبھی نہیں آئے گی یہ خیال اپنے دماغ سے نکال دو۔ اس زمانے میں گھر کا کچھ سامان یہاں پڑا تھا اور وہ یہی سامان لینے کے لئے یہاں آگئی تھی۔ ورنہ وہ اس متعفن فضا میں کبھی آنے کا ارادہ نہ کرتی۔ سنا بیٹا! تم سن نہیں رہے کیا؟"

ذرّہ خاموش تھا۔

"غائب کہاں ہو گئے ہو ـــ اچھا بھئی تمہاری مرضی۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں"۔ بڑے ذرے کی بوڑھی آواز ایک لمحے کے لئے تھرتھرائی اور پھر گہرے اندھیرے میں جذب ہو گئی۔ کچھ دیر گزرنے پر ننھے ذرّے کا شعور بیدار ہونے لگا۔ اسے وہ واقعہ تمام جزئیات کے ساتھ یاد آ گیا۔ جس سے وہ ابھی ابھی دوچار ہوا تھا۔ اس نے بزرگ ذرّے کی آواز نہیں سنی تھی۔ تاہم وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے اردگرد پھیلے ہوئے بزرگ ذرے کس انداز میں سوچا کرتے ہیں اور روشنی کی تمنا کو کتنا بیہودہ خیال تصور کرتے ہیں۔

ذرّوں کی دنیا کا یہ سب سے ننھا وجود چند لمحے مسلسل حیرت و مایوسی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ وہ پوری طرح مایوس ہو جانا چاہتا تھا۔ مگر ہو نہیں سکتا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک خلش سی، ایک اضطراب سا موجزن تھا۔ اس خلش اور اضطراب میں روشنی کی آرزو کے علاوہ ایک قسم کا باغیانہ احساس بھی کارفرما تھا۔ اپنے آپ کو وہ اس قدر حقیر نہیں سمجھتا تھا کہ ایک مرتبہ زمین پر گر کر دوبارہ اٹھنے کا نام ہی نہ لے اور روشنی کی تمنا کو ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دے۔

اس سے بہت دور، کافی بلندی پر اندھیرے کے سینے میں روشنی کی ایک نہایت مدہم سی ننھی سی لکیر لرز رہی تھی اور یہی لکیر اس کی نظر کا مرکز بن گئی تھی ـــ نہ صرف مرکز بن گئی تھی بلکہ اس کے اندر زندگی کی نئی امنگ اور نئی ترنگ بھی پیدا کر رہی تھی ـــ وہ مایوسی کی سطح سے بلند ہو رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا ـــ آخر گھر والے اس کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے کھول کیوں نہیں دیتے۔ انہیں ہم سے کیا دشمنی ہے۔ وہ ہمیں کیوں اس محدود فضا میں بند کر کے روشنی سے محروم کر رہے ہیں؟"

کافی دیر کے بعد وہ گرتا پڑتا اوپر آ گیا۔ اب وہ اپنے سامنے بزرگ ذرّے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بوڑھے سے یہ سوال پوچھنا چاہتا تھا مگر اس خیال سے کہ یہ بوڑھا اسے مایوس کرنے کی کوشش کرے گا۔ اسے بولنے کی جرأت نہ ہوئی۔

بزرگ ذرّہ اس کا خیال بھانپ گیا اور کہنے لگا۔

"میں نے ایک دفعہ کہہ دیا ہے کہ ہم تاریکی کا ایک حقیر حصہ ہیں۔ آخر سوچو روشنی کے ساتھ ہمارا کیا واسطہ ہے تم بالکل ننھے ہو۔ بے فائدہ اس چیز کے لئے بیتاب ہو جسے کبھی حاصل نہیں کر سکتے۔ میری مانو، اس قسم کی خیال آرائی نہ کیا کرو۔ سنا تم نے بیٹا؟"

ننھا ذرّہ اب خاموش نہ رہ سکا۔ جھٹ بول اٹھا۔

"وہ لوگ دروازہ کیوں نہیں کھول دیتے۔ دروازہ کھلے گا تو روشنی خود بخود اندر آجائے گی؟"

"بہت خوب بھئی" بزرگ ذرّے نے خوفناک قہقہہ لگایا "تم انسان سے یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بیتابی کا خیال کر کے دروازہ کھول دے گا۔ یہ تمہاری بھول ہے۔ تم نے انسان کو سمجھا ہی نہیں ــ اسے ہم حقیر ذرّوں کی کیا پروا ہو سکتی ہے ــ اگر تم نے اس مجنونانہ خواہش کو دماغ سے نہ نکالا۔ تو ایک دن تمہارا دم گھٹ جائے گا اور تم مر جاؤ گے۔"

اس وقت ذرّے کی آنکھوں پر مایوسی کے سائے چھا گئے۔

تاریک فضا اور تاریک ہو گئی۔ روشنی کی وہ ننھی لکیر بھی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ ذرّے کا دم سچ مچ گھٹنے لگا۔ اس نے اپنے آپ کو ہوا میں چھوڑ دیا ــ اس حالت میں اسے کچھ خبر نہ تھی کہ اس کے اردگرد کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔

پستی سے لے کر انتہائی بلندی تک چاروں طرف گہری تاریکی مسلط تھی۔ اس تاریکی میں اس کے ہم عمر، لاکھوں ذرّے اپنی مختصر سی دنیا میں گردش کر رہے تھے۔ آگے بڑھتے تھے، ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے اور پھر پیچھے چلے جاتے تھے۔ ان میں کئی ایسے بھی ہوں گے۔ جنہیں روشنی کی تمنا ہوگی جو وسیع اور روشن دنیا میں پرواز کرنا چاہتے ہوں گے۔ لیکن اپنے گردوپیش بے شمار رکاوٹیں دیکھ کر ان کے حوصلے پست ہو جاتے ہوں گے۔ ان کی خواہشیں سسک سسک کر دم توڑ دیتی ہوں گی اور نوجوان ذرّہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ راستے کی مشکلات کا مقابلہ کر کے دروازے تک پہنچ جانا بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ اسے یاد آیا کہ ایک دفعہ پہلے بھی اس نے اوپر جانے کی کوشش کی تھی مگر طاقتور ذرّوں نے اس کا راستہ روک لیا تھا۔ وہ ایک بیوقوف اور ضدی بچے کو ہلاکت آفریں تگ و دو سے بچانا چاہتے تھے ــ کم از کم ان کا نقطۂ نظر یہی تھا اور ان کی باتوں سے بزرگانہ شفقت نمایاں تھی۔

"کیا وہ اسی طرح ختم ہو جائے گا ــ؟" اس نے سوچا اور روشنی کا تصور پوری شدت کے ساتھ اس

کے دل میں جاگ اٹھا اور وہ اپنے اندر ایک نئے ولولے کا ہیجان محسوس کر کے بلندی کی طرف پرواز کرنے لگا۔ نئی فضاؤں میں گردش کرتے بھٹے ذرّے جب اس سے ٹکراتے تو وہ ایک کہیں سے کہیں جا پہنچتا۔ ایک مرتبہ تو وہ اسی پستی میں پہنچ گیا۔ جہاں سے نکل کر وہ اوپر اٹھا تھا۔ اگرچہ وہ چند لمحے وہاں ٹھہرا لیکن اس مختصر سے وقفے میں بھی اس کے بزرگوں اور ساتھیوں نے طعن و تشنیع سے اسے پریشان کر دیا۔

ایک بزرگ کہنے لگا۔

"دیکھو ایسی بے ہودہ حرکت نہ کرو۔ تم نہیں جانتے کہ ۔۔"

اس سے پہلے کہ بزرگ کا فقرہ مکمل ہوتا۔ وہ تیزی سے اوپر کے کرّے میں آ گیا۔

خوش قسمتی سے ہوا کا ایک جھونکا ادھر آ نکلا۔ اور اس جھونکے نے اسے فضا کے اس حصے میں پہنچا دیا جو کافی بلند تھا اور جہاں وہ پہلے کبھی نہیں پہنچا تھا۔ یہاں پہنچ کر ذرا رک کر اس نے نیچے دیکھا۔ دور اس کے پست ہمت ساتھی کلبلا رہے تھے اور اپنی محدود و تاریک دنیا میں بے معنی گردش کر رہے تھے۔ یہاں سے اپنا پہلا مقام اسے اس قدر پست نظر آیا کہ وہ خود ہی اپنی کامیابی پر حیران رہ گیا ۔ مگر حیرت و مسرت کے یہ لمحے بہت جلد ختم ہو گئے کیونکہ اب وہ جن ذروں کے درمیان موجود تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھی نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ تاریک پستیوں کا باشندہ کہتے تھے۔ اور اسے اپنے کرے میں آنے کی اجازت دینا پسند نہیں کرتے تھے۔ جب اس نے اپنے ارادے کا اظہار کیا تو اسے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ نئے ساتھی بجائے اس کے کہ اس کی ہمت و عزمِ بلند پر تحسین کہیں، الٹا اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ایک ذرے نے تو صاف صاف کہہ دیا۔

"بھئی! یہ تمہاری خوش قسمتی تھی کہ یہاں تک پہنچ گئے۔ اب فوراً واپس چلے جاؤ۔ تمہارا مقام اسی پستی میں ہے۔ جہاں سے تم آئے ہو۔ اگر ہم میں سے کسی کے طاقتور وجود سے تمہارا تصادم ہو گیا تو ایک ہی لمحے کے اندر فنا ہو جاؤ گے۔ یا زخمی ہو کر نیچے زمین پر گر پڑو گے۔ اور زمین کے ذرّوں میں جذب ہو کر رہ جاؤ گے اور پھر کبھی نہیں اٹھ سکو گے"۔

باقی ذرّوں نے بھی یہی کوشش کی کہ وہ ایک لمحہ توقف کئے بغیر واپس چلا جائے۔ لیکن وہ تھکاوٹ کے باوجود وہ اوپر جانے لگا یہاں تک کہ ایک نئی بلندی پر پہنچ گیا۔

اس بلندی پر اس کی ملاقات ایک تیز رو مسافر سے ہو گئی۔ یہ ذرّہ بھی اسی کی طرح ایک دور دراز گڑھے سے نکل کر بالائی حصے کی طرف پرواز کر رہا تھا۔ چنانچہ وہ خوشی خوشی اس کا ہم سفر بن گیا۔

ایک دن وہ دونوں ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے کہ یکایک اس کا ساتھی چیخ اٹھا۔

"آندھی!"

"کیا؟" نوجوان ذرہ آندھی کا مطلب نہیں سمجھتا تھا۔

"باہر آندھی آ رہی ہے یہ شور سن رہے ہو نا؟" اس کا ساتھی بولا۔

"مجھے معلوم نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔ باہر وسیع دنیا میں یوں اندھیرا چھا گیا ہے۔ اتنی جلدی رات کیونکر آ گئی ہے آج؟"

اس کے ہم سفر نے بتایا۔ آندھی تیز و تند ہوا کو کہتے ہیں اور اگرچہ کمرے کے سب دروازے بند ہیں، تاہم آندھی کے جھونکے اندر بھی آ جائیں گے اور اگر ہم کسی جھونکے کی زد میں آ گئے تو وہ نہ جانے ہمیں کہاں پھینک دے اور ——— یہ بھی خبر نہیں کہ ———'

یکایک اِدھر اُدھر ایک ہلچل سی مچ گئی ——— ایک طوفان سا برپا ہو گیا چھوٹے ذرے نے محسوس کیا کہ سب ذرّے مل کر اسے پستیوں کی طرف دھکیل رہے ہیں خوف سے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور اس کا ننھا سا وجود اس طرح گردش کرنے لگا جیسے کسی طاقت ور چیز سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا۔

کافی عرصے کے بعد جب اس کا شعور بیدار ہوا تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک تنکے کے سرے پر چپکا ہوا ہے اور یہ تنکا دیوار کی طرف جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ دیوار کے ساتھ جا لگا ہے۔ فضا میں ابھی تک اندھیرا مسلط تھا اور لمحہ بہ لمحہ گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے اردگرد چند ذرّے موجود تھے۔ وہ سب کے سب تھک کر، مضمحل ہو کر سو رہے تھے ایک بڑا مایوس کن خیال اس کے ذہن میں آیا ——— "کیا میری زندگی حرکت اور حرارت سے محروم ہو گئی ہے اور کیا میں اپنا سفر پورا کر کے پھر اسی ناپیدا کنار تاریکی کا جزو بن رہا ہوں۔ جس کے بطن سے میں پیدا ہوا تھا۔ کاش میں اس ناکامی سے پیشتر صرف ایک مرتبہ دروازے سے نکل کر روشنی کے سیلاب میں چھلانگ لگا سکتا ——— صرف ایک مرتبہ اور ———

"روشنی میں جانے کا مزا دیکھ لیا ہے نا؟" قریب سے ایک بوڑھی آواز آئی۔

"کیا مطلب؟" اس نے کہنے والے کی طرف مخاطب ہوئے بغیر پوچھا۔

"مطلب کیا ——— شکر کرو اس کمرے کے سب دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں ——— اگر ایک بھی کھڑکی کھلا رہتی تو ہم میں سے کسی کا وجود بھی سلامت نہ رہتا۔ ہم مٹی کے بوجھ تلے دب کر ختم ہو گئے ہوتے۔ ہمیں بند دروازوں

اور کلرکیوں نے بچالیا ہے"

بات بالکل درست تھی۔ آندھی کا ایک ہلکا سا جھونکا اندر آسکا تھا اور اس ہلکے سے جھونکے نے ایک ہلچل سی مچادی تھی۔ اگر وہ باہر ہوتا یا دروازہ کھلا ہوتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔ وہ مایوس تھا۔ مگر اب کے مایوسی میں کچھ اطمینان بھی تھا۔

وقت چپ چاپ گزرتا رہا اور ایک دن پھر اس نے یکایک بلندی پر ایک روشن نقطہ دیکھ لیا۔ اس کے سینے میں سوئی ہوئی امید جاگ اٹھی "ہائے وہ باہر کی دنیا کس قدر وسیع، کس قدر خوبصورت ہے" اس نے آہ بھر کر کہا اور اچانک اسے محسوس ہوا کہ وہ اوپر آگیا ہے۔ ایک نئے مقام پر۔

"ننھے بھائی کیا کر رہے ہو؟"

اس نے دائیں طرف دیکھا، اس کا پہلا با ہمت ہم سفر پیار بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ امنگ از سر نو اس کے اندر پیدا ہو گئی۔

ابھی اس نے کچھ نہیں کہا تھا —— وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کہے۔ اتنے میں اس کا ہم سفر بولا۔

"مجھے افسوس ہے۔ میں تمہارے ساتھ جا نہیں سکتا۔ دیوار کے ساتھ جالا لٹک رہا ہے۔ میں اس میں بہت بری طرح پھنس گیا ہوں۔ نہ جانے کب تک یہاں گرفتار رہوں گا۔ ایک نہ ایک دن ہوا کا جھونکا آئے گا اور مجھے اس قید سے رہائی دلا دے گا۔ جب تک وہ جھونکا آئے میں اس بوجھل غبار سے نہیں نکل سکتا۔"

"کوشش تو کرو"

"کوشش تو کرتا ہی رہوں گا۔ تم تمہاری روشنی کی تلاش میں نکل جاؤ۔ میں بھی کبھی نہ کبھی آؤں گا۔ کبھی نہ کبھی ضرور آؤں گا۔"

"نہیں۔ جب تک تم ساتھ نہیں چلو گے میں یہیں رہوں گا" یہ کہتے ہوئے چھوٹے ذرے کا دل ہمدردی سے لبریز ہو گیا۔

دوسرا ذرہ بولا "اس کا خیال نہ کرو۔ اس وقت فضا کافی پرسکون ہے۔ تمہیں راستے میں زیادہ تکلیف نہیں ہوگی" دوسرے ذرے کے لہجے میں عزم اور ارادے کی مضبوطی جھلک رہی تھی۔

اپنے ہم سفر سے محرومی کے احساس نے اس کے سینے میں درد کی لہریں دوڑا دیں۔ اور اس کے ذہن میں ـــ چبھن سی ہونے لگی۔

"یہیں ٹھہر جاؤں یا روانہ ہو جاؤں —" وہ سوچنے لگا۔ اس وقت واقعی فضا پرسکون تھی اور بلندی پر تاریکی کی پیشانی سے روشنی کی ایک لہر پھوٹ رہی تھی۔ اس کے قدم بے اختیار اٹھنے لگے۔ اس نے اپنے ساتھی کو آخری بار دیکھا اور اوپر پرواز کرنے لگا۔

وہ تاریک فضا میں گرگر کر اڑتا رہا۔ اڑ اڑ کر گرتا رہا۔ کبھی طاقت ور ذروں سے ٹکرا کر بالکل زمین کے قریب پہنچ جاتا۔ اور کبھی مسلسل تگ و دو سے کسی نئی فضا کو چھونے لگتا۔ نئی فضا کے ذرے اسے حقیر اور اجنبی سمجھ کر اسے اپنی دنیا سے نکال دیتے۔ متکبر ذرے اس کا راستہ روک لیتے ——— اس کا مذاق اڑاتے، نہ صرف یہ بلکہ اسے زخمی کر کے نیچے بھی گرا دیتے۔ ہر لمحہ بڑھتی ہوئی مشکلات کو دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو جاتے۔ اس کی ہمت جواب دے جاتی۔ لیکن اس کے دل میں روشنی میں جانے کی جو تمنا بے قرار تھی۔ اس کا شعلہ کسی صورت میں بھی، کسی حال میں بھی نہیں بجھتا تھا۔ یہی وہ شعلہ تھا جس کی حرارت نے اسے ہر لمحہ مصائب کے ہجوم میں سرگرم سفر رکھا تھا اور جو اسے ہر گھڑی ایک حسین، ایک شاداب دنیا کے خواب دکھاتا رہا تھا۔ جب کبھی زخمی ہو کر زمین پر گر پڑتا تو یہ رنگین خواب چپکے سے اس کے ذہن میں جھلملا اٹھتے اور وہ اسی حالت میں اپنے مجروح جسم کے ساتھ اوپر اٹھنے کی کوشش کرنے لگتا۔ تاریکی کی دنیا میں اس کا کوئی ہم سفر نہیں تھا۔ کوئی ہمدرد نہیں تھا۔ سب کے سب اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ اس کو پاگل تصور کرتے تھے۔ تاہم وہ تاریکی میں جذب ہونے کے لئے تیار نہیں تھا — اور نہ اپنے دل سے اپنی عزیز ترین خواہش کو نکال سکتا تھا۔

وہ اڑتا رہا — بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک دن اس کی آنکھیں حیرت انگیز مسرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ کثیف اندھیرے کی حدیں ختم ہو رہی تھیں۔ اور اس کی ننھی ننھی آنکھوں کے آگے دور تک روشنی اور تاریکی کا ایک وسیع پھیلاؤ سا نظر آ رہا تھا جس میں لاکھوں صحت مند ذرے ناچ رہے تھے۔ اس پھیلاؤ اور اس کے درمیان ابھی تاریکی حائل تھی — وہ ٹھہر نہ سکا۔ تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ برابر آگے بڑھتا گیا۔

اب اس پر ایک نیم بے ہوشانہ سی کیفیت طاری تھی۔

وہ کہاں ہے، کس دنیا میں پہنچ گیا ہے۔ کیا وہ سنگین دروازے سے باہر نکل آیا ہے۔ یا ابھی تک اس دم گھٹنے والی تاریک فضا میں ڈگمگا رہا ہے — اسے کچھ سوجھتا نہیں تھا — کچھ دیر کے بعد وہ اپنے نئے ماحول سے آشنا ہونے لگا — اس کے چاروں طرف ایک نئی دنیا بکھری ہوئی تھی — ایک نئی

دنیا جس میں روشنی بھی تھی اور وسعت بھی، جو بڑی شاداب اور بڑی خوب صورت تھی۔ اسے روشن دنیا کے ذرّے بڑے ہمدرد نظر آ رہے تھے، کیونکہ ان کے صحت مند چہروں پر مایوسی اور افسردگی نہیں تھی بلکہ مسکراہٹ کی سرخی پھیلی ہوئی تھی اور اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اس کا استقبال کر رہے ہیں۔ اپنی کامیابی سے سرشار وہ روشنی کے چشمے میں تیرتا رہا ——— یہاں تک کہ وہ تھک گیا ——— اچانک ایک دم تاریکی چھا گئی۔ اس نے حیران ہو کر ایک ذرّے سے پوچھا۔

"روشنی کہاں گئی؟"

نئے ذرّے نے جواب دیا۔

"اب شام ہو گئی ہے۔ کمرے کے باہر وسیع دنیا میں روشنی کا منبع یعنی سورج اپنی کرنوں کو سمیٹ کر رات کے زمیں اتر رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد چاند اور تارے نکلیں گے ——— تھوڑی سی روشنی اندر آ سکے گی ——— وہ خوب صورت اور حیات آفریں روشنی تو باہر ہے ——— باہر کی لامحدود دنیا میں۔"

"میں اسی لامحدود دنیا میں جانا چاہتا ہوں۔" چھوٹا ذرّہ بولا اور اس کا دل دھڑکنے لگا۔

"آگے ہوا کے بڑے تیز اور تند تھپیڑے ہیں جو ہمیں پیچھے دھکیل دیتے ہیں۔ یہ باہر جانا ممکن نہیں۔"

"مگر وہ دیکھو باہر جانے کا راستہ ہے ——— وہ دروازے میں۔" وہ بولا

"راستہ ہے لیکن باہر نکلنا بے حد مشکل ہے۔ وہاں ہوا بہت تیز ہے۔"

"کوئی پروا نہیں ——— میں باہر جاؤں گا ——— میں باہر کی سنہری اور روشن دنیا میں ضرور جاؤں گا ——— ضرور جاؤں گا۔"

اور یہ کہتے ہوئے وہ پھر پرواز کرنے لگا! اوپر ہی اوپر ——— بلند سے بلند تر فضا میں۔

بے آباد جزیرے

احمد شریف

کوچی پہنچ کر سب سے پہلے راماشی سے ملاقات ہوئی۔

ہمیں اس جزیرے پر اُترے تیسرا روز تھا۔ بارش موسلا دھار برس رہی تھی۔ میں اپنی ہٹ میں پلنگ کی پٹی پر پاؤں رکھے، ٹانگیں پسارے کرسی پر نیم دراز اُونگھ رہا تھا کہ راماشی اس طرح میری کرسی کے قریب آ گری جیسے کسی نے اسے دروازے میں کھڑی کر کے دھکا دیا ہو۔ میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ہڈسن چوکھٹ سے کندھا ٹکائے کھڑا تھا۔ آتشدان میں بھڑکتے شعلوں کا عکس اس کی سرخی مائل بلوری آنکھوں میں جھلملا رہا تھا۔ وہ مجھے حیران دیکھ کر مسکرایا اور کہنے لگا۔

"اِٹ از فور یو کیپٹن۔"

پھر راماشی سے مخاطب ہو کر تحکمانہ لہجے میں جاپانی میں کوئی بات کہی۔ وہ تڑپ کر اُٹھی اور جلدی جلدی میرے بوٹوں کے تسمے کھولنے لگی۔ ہڈسن اسے اشاروں پر ناچتے پا کر ہنسا اور لڑکھڑاتا ہوا اپنی ہٹ کی طرف چلا گیا۔ وہ کانپ رہی تھی۔ میرے بوٹ اتار کر وہ فرش پر بیٹھ گئی اور اپنی فراک کے دامن سے صاف کرنے لگی۔

میں نے اس کے سراپا پر نظر ڈالی۔ وہ سڈول جسم اور زردی مائل رنگت والی قبول صورت لڑکی تھی۔ صورت اُجڑی اُجڑی تھی۔ خدوخال کا تناسب بکھرا ہوا تھا۔ میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر قریب کھینچ لیا۔ وہ بلا حیل و حجت گردن جھکا کر کرسی کے ساتھ ٹک کر بیٹھ گئی۔

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب ہیروشیما اور ناگاساکی جل کر راکھ ہو چکے تھے ان کے کھنڈروں تلے جاپان کی عظمت دفن ہو کر رہ گئی تھی اور فاتح فوجیں اس ملک پر اپنا قبضہ مکمل کرنے آئی تھیں۔

ہڈسن کی بدولت پچھلے تین روز میں کئی جاپانی لڑکیاں فوجی افسروں کے تصرف میں لائی جا چکی تھیں۔ وہ ایسی لڑکیوں کو تلاش کرنے اور ان کے کس بل نکالنے کا ماہر تھا۔

آتش دان میں لکڑیاں چٹخیں تو لمحہ بھر کو سناٹا ٹوٹ گیا۔ میں نے ٹھوڑی پکڑ کر راماشی کا چہرہ اُوپر اٹھایا۔ اس کی پلکوں پہ لرزتے آنسو رخساروں پر ڈھلک آئے اور وہ کُرسی کے بازو پہ سر رکھ کر رونے لگی۔ وہ روتی رہی اور میں اس کے بکھرے ہوئے بالوں کو انگلیوں کی کنگھی بنا کر سنوارتا رہا۔

اس کے طرزِ عمل میں کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ بڈسن کے ہتھے چڑھ کر جو بھی لڑکی آتی پہلے پہل وہ طوفان کی زد پر آئی ہوئی نازک شاخ کی طرح لرزتی۔ نوگرفتار پنچھی کی طرح پھڑپھڑاتی اور پھر اس ماحول میں اس طرح رچ بس جاتی جیسے اسی ماحول کا ایک حصہ ہو۔ نیا ماحول ان لڑکیوں کو ایسا راس آتا کہ وہ رات گئے تک وہیں اٹھلاتی پھرتیں۔ مترنم قہقہے گونجتے رہتے اور سپیدۂ سحر کے قریب وہ مچھلی، گوشت اور پھلوں کے بند ڈبے سنبھالے چپکے سے کھسک جاتیں۔ راماشی بھی انہی لڑکیوں میں سے ایک تھی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے سر اُٹھا کر سُرخ سُرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھیکی سی مسکراہٹ چہرے پہ لا کر صاف ستھری انگریزی میں بولی۔

"آئی ایم سوری کیپٹن۔"

اور اُٹھ کر اس طرح کام میں لگ گئی جیسے اپنے ہی گھر چلی آئی ہو۔

جن حالات میں وہ وہاں لائی گئی تھی وہ بڑے افسوسناک اور تکلیف دہ تھے۔ پھر بھی اس کا آنا غنیمت تھا۔ وطن سے دور اگر میں تنہا اور اُداس تھا۔ ماحول پر افسردگی ٹوٹ کر چھائی ہوئی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ میرے اور اُس کے درمیان اجنبیت کے فاصلے جلدی سے سمٹ جائیں پھر وہ کھلکھلا کر ہنسے اور موتیوں کی لڑی ٹوٹ کر بکھر جائے۔ بہٹ کے نیم تاریک ماحول میں میٹھی میٹھی سرگوشیاں اُبھریں اور رسیلے لبوں کا رس شہد بن کر ٹپکے۔ راماشی کے گُداز اور لچکیلے جسم کا خیال آتے ہی پلنگ سرسوں کے پھولوں سے لبالب بھر گیا۔

میں رات کے حسین تصور باندھے بیٹھا تھا کہ وہ چپکے سے آئی اور کُرسی سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے کُولہوں کا بیضوی اُبھار کُرسی کے بازو پہ پھیل گیا۔ میرا جی چاہا اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر گود میں بٹھا لوں کہ میری نظر سے اس کے رُخساروں پہ پھیلی گیلی گیلی لکیروں پر پڑی۔ تصورات کا آئینہ گِر کر چُور چُور ہو گیا۔

وہ چلی گئی اور رات اور بھی ویران ہوگئی۔

اگلے روز وہ آئی اور پھر روزانہ آتی رہی۔ میں جب بھی اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرتا مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے لاتعداد بگولے اپنے دامنوں میں زرد پتوں کے ہجوم لیے ویران قبرستانوں میں چکراتے پھر رہے

ہوں ۔ وہ اس آسیب زدہ مکان کی طرح پُراسرار دکھائی دیتی جس کی کھڑکیاں اور دروازے مُدّت سے بند پڑے ہوں اس کی موجودگی میں ماحول دم سادھ لیتا کربناک سناٹا چھا جاتا ۔ہٹ میں اس کے قدموں کی چاپ اس طرح اُبھرتی جیسے وقت دھیرے دھیرے کراہ رہا ہو اور پھر سناٹے پر سناٹے کی ایک تہ اور چڑھ جاتی ۔

اس پر موسم بڑا گندا اور واہیات تھا ۔ دن بھر دُھند چھائی رہتی ۔راتوں کو سرد ہوائیں چھت کی ٹائیلوں میں مُنہ چھپا کر رُوتی رہتیں ایسے میں راماشی کی وجہ سے اعصاب پر خواہ مخواہ عورت سوار ہو جاتی ۔سچی بات ہے میں اس سے جان چھڑانے کی تجویزیں سوچنے لگا ۔

اس روز صُبح سے برف گر رہی تھی ۔میں جس وقت مَیں (ESSEX) میں داخل ہوا بڈسن بار کے کاؤنٹر پر جھکا پی رہا تھا ۔میں نے دروازے میں رُک کر کپڑوں پر سے برف جھاڑی ۔وہ میرے لمبے بُوٹوں کا اُوپر سے نیچے تک جائزہ لے کر بولا ۔

"گھوڑ سواری سیکھ رہے ہو !"

"سواری کے لیے گھوڑا کہاں ہے ؟"

میں نے اُلٹا اُسی سے سوال کیا اور کاؤنٹر سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا ۔اُس نے مجھے آنکھ ماری اور ہنس کر بولا ۔

"گھوڑی تو ہے ۔" پھر مُڑ کر بارمین سے کہنے لگا "ایک پیگ وہسکی چھوٹا والا ۔"

میں نے اس کا شانہ ہلا کر اپنی طرف متوجہ کر کے کہا ۔

"راماشی کو کسی اور کے ساتھ منتقی کر دو ۔"

"کیوں ؟"

کیا ضرورت ہے آخر ان لڑکیوں کی ؟"

میں نے بیزاری سے کہا ۔ وہ منہ کھول کر میری صُورت تکنے لگا ۔بارمین نے گلاس میری طرف سرکا دیا ۔میں گلاس ہاتھ میں لے کر اس سے کھیلنے لگا وہ کھلکھلا کر ہنسا اور کہنے لگا ۔

"مائی ڈیر کیپٹن ۔ناک ۔"

اس نے اپنی ناک کی پھننگ چٹکی میں لے کر مروڑی ۔ اس کی سُرخ ناک اور بھی سُرخ ہو گئی ۔پھر وہ میری طرف جُھک کر آپ ہی آپ اپنی بات کی وضاحت کرنے لگا ۔

"لڑکیاں قوم کی ناک ہوتی ہیں ۔جب وہ راتیں غیر مردوں کے ساتھ بسر کریں تو ناک کٹ جاتی ہے ۔"

اُس نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر میرے ہاتھ سے گلاس لیا اور ایک ہی گھونٹ میں وہسکی کا چھوٹا پیگ حلق سے

آ ملا لیا۔ اور پھر زور سے میرا کندھا تھپتھپا کر ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔

میں ہٹ میں واپس آیا تو راماشی جا چکی تھی۔ میں کمبل اوڑھ کر بوٹوں سمیت پلنگ پر لیٹ گیا۔ پتہ نہیں کیوں ہڈسن کی سرخ ناک میری آنکھوں میں گھسنے لگی۔ اچانک میرے سرہانے کوئی درخت کے گیلے تنے پر زور زور سے کلہاڑے چلانے لگا۔ میں کمبل پرے پھینک کر جلدی سے اُٹھا۔ ہٹ سنسان پڑی تھی۔ باہر نکل کر دیکھا تو حدِ نظر تک برف کی چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ ہٹس کا بے ترتیب سلسلہ سیاہ دھبّوں کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ میرے ہیڈ کوارٹرز میں بچپن قدم کے فاصلے پر ہڈسن کی ہٹ تھی۔ میں اس طرف لپکا۔

ہٹ میں گھستے ہی سب سے پہلے میری نظر ہڈسن پر پڑی وہ کمان کی صورت پرلی طرف مُنہ کیے فرش پر پڑا تھا۔ اس کے پیروں میں راماشی کھڑی تھی۔ اس کا فراک تار تار ہو کر شانوں پر جھول رہا تھا۔ اس کی گول گول چھاتیوں پر لمبی خراشیں تھیں۔ ان خراشوں سے خون رس رہا تھا۔ اس کی نگاہیں ہڈسن پر مرکوز تھیں

میں نے ہڈسن کا کندھا پکڑ کر اسے اپنی جانب کروٹ دی۔ اس کی آنکھوں اور مُنہ کے درمیان ایک بھیانک سوراخ مُنہ پھاڑے مجھے گھور رہا تھا گولی ناک کو توڑتی ہوئی حلق میں اُتر گئی تھی۔ اُس نے ہچکی لی اور راماشی کے فراک کی دھجیاں اس کی مُٹھیوں میں دب کر رہ گئیں۔ راماشی ابھی تک بے حِس و حرکت کھڑی تھی۔ میں نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے ریوالور چھینا اور رومال سے صاف کر کے ہڈسن کے پہلو میں ڈال دیا۔ اس کی مٹھیوں سے راماشی کے فراک کی دھجیاں نکالیں اپنے اور راماشی کے قدموں کے نشانات مٹائے اور اسے اپنی ہٹ میں لے آیا۔

راماشی کمبل اوڑھے پلنگ پر بیٹھی تھی۔ اور میں اس کے سامنے بیٹھا سوچ رہا تھا —— ناک کشمیری کا کا ہے۔ کٹنے پر آئے تو پل بھر میں کٹ جائے —— میں اسے جیپ میں بٹھا کر اس کے گھر چھوڑ آیا۔

فاتح فوجوں کے جنگل میں آگ لگ گئی اور جب جاپانی لڑکیوں کا ریوڑ کمانڈر کے روبرو پیش کیا گیا تو خلافِ توقع راماشی کے چہرے پر گلاب سے کھلے ہوئے تھے کمانڈر نے اُس سے پُوچھا۔

"کیپٹن ہڈسن کو مارا؟"

راماشی نے اتنے زور سے نفی میں سر ہلایا کہ اُس کے بالوں کی جھالر پیشانی پر بکھر گئی۔ میں کمانڈر کی طرف جھکا اور نظریں نیچی کر کے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

کل شام یہ لڑکی میرے ساتھ تھی۔

کمانڈر نے مُسکرا کر معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور دُوسری لڑکی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میں ہٹ کی طرف آتے ہوئے اپنے اندر والے مجنوں کی بوالعجبیوں پہ دل ہی دل میں ہنسا۔ میں اس اجنبی لڑکی کو بھلا کیوں موت کے مُنہ سے بچاتا پھر رہا تھا۔ میرا اس کے ساتھ کیا رشتہ تھا: ــــ میں تو اس ملک میں جاپانی قوم کے تابُوت میں آخری کیل ٹھونکنے آیا تھا۔

ہٹ میں داخل ہُوا تو اتاشی میری منتظر تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ بھاگی ہوئی آئی اور میرے گلے میں بازو حمائل کر کے جھول گئی۔ میں اسے کلاوے میں لے کر پلنگ پہ چت لیٹ گیا۔ میرے سینے پہ ریت کے گدگدے ٹیلے ذرا دیر کو دبے اور ہوا کا دوسرا ریلا انہیں پھر سنوار گیا۔ وہ ٹانگیں سکیڑ کر مجھ پہ سوار ہو کر بیٹھ گئی اور اُس نے دونوں ہاتھوں کا بوجھ میرے سینے پہ ڈالتے ہوئے جُھک کر میری آنکھوں میں جھانک کر پُوچھا۔

"تم دیوتا ہو؟"

"نہیں۔ میں نے اُسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اپنے پہلو میں لٹا لیا اور اس کی جانب کروٹ لیتے ہوئے کہا: میں اُلّو کا پٹھا ہوں۔"

"اُوں۔" وُہ نچلا ہونٹ لٹکا کر کسمسائی اور پھر نظریں جھکا کر بولی: "کل امی آپ کو شکریہ تک دیکھنے آئی تھیں پر آپ ٹھہرے ہی نہیں۔"

"تم نے ٹھہرنے کے لیے تھوڑا ہی کہا تھا؟"

"مجھے خیال ہی نہ رہا۔" اُس نے بھولپن سے کہا: "پھر امّی نے جونہی مجھے دیکھا لپٹا کر زار و قطار رونے لگیں۔ ان کے دل میں تو اسی روز سے چور تھا جب ہڈسن مجھے چھاپہ مار کر گرفتار کر کے لایا تھا۔ امّی کا خیال تھا مجھے رات سے پہلے پہلے گولی مار دی جائے گی اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی۔"

جاپانی لڑکیوں کو رام کرنے کا اور ان سے بلاتامّل اپنی بات منوانے کے لئے ہڈسن اسی طرح ان لڑکیوں کو ان کے گھروں سے گرفتار کر کے لایا کرتا تھا۔ میں نے تشویش سے پُوچھا۔

"گرفتاری کے بعد تمہارا کیا خیال تھا؟"

"میرا خیال ــــ" اُس نے بات کرتے کرتے رُک کر میری طرف دیکھا اور کہنے لگی: "میرا خیال تھا میں رات کی رات میں کہیں کی نہ رہوں گی۔"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اس لڑکی کو صدیوں سے جانتا ہوں ــــ میں نے اس کے سر کے نیچے رکھے ہوئے بازو کا حلقہ تنگ کر کے اسے سینے سے لگا لیا۔ بے ہنگم دھڑکنوں کے شور سے دل کے کواڑ بجنے لگے۔ اس نے اپنے

اور میرے درمیان دونوں مٹھیوں کی دیوار حائل کر کے ایک دم سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

"تم ان لوگوں کے ساتھ یہاں کیوں آئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"میں تمہیں بھگا لے جانے آیا ہوں۔"

وہ تڑپ کر اُٹھی اور کہنے لگی۔

"تو پھر بھگا لے چلو۔ یہاں میرا دم گھٹ رہا ہے ـــــ ابھی بھگا لے چلو۔"

میں اسے بھگا کر اس کے گھر لے گیا۔ اور وہیں اس کے پاپا سے عجیب سی ملاقات ہوئی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ میں اس کی کال کوٹھڑی میں جا گھسا۔

راماشی مجھے ایک کمرے میں بٹھا کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ میرا خیال تھا اس کا گھر جاپانیوں کے روایتی گھر کی طرح ہوگا۔ مگر وہاں نہ فرش پر چٹائیاں بچھی تھیں نہ کمرے کے وسط میں نیچی تپائی پر بلوری کٹوروں سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ میں نے سوچا جس طرح ہماری تہذیب کا گاؤ تکیہ اور چاندنی دیوان خانے سے اُٹھ کر کوٹھڑی میں پہنچ گئے ہیں اسی طرح جاپانی تہذیب بھی بوریا بستر لپیٹ کر کسی اندھیرے کمرے میں دُبکی پڑی ہوگی۔ میں متجسس سا اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔

اس کمرے سے ملا ہوا ایک اور کمرہ تھا۔ درمیانی دروازہ بند تھا۔ میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ کہیں سے روشنی کا گزر نہ تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ جب آنکھیں اندھیرے سے قدرے مانوس ہوئیں تو میں نے دیکھا کونے میں ایک اُدھیڑ عمر آدمی سر نیہوڑائے کرسی پر بیٹھا دیوار کے ساتھ رکھا ہوا پالنا جھول رہا ہے۔ وہ میری آمد سے بے نیاز پالنا جھلاتا رہا۔ اس برف خانے میں میرا دم گھٹنے لگا۔ میں نے یونہی کھڑکی کا پردہ ذرا سا سرکا دیا۔ روشنی کا ایک قطرہ اس طرح اندھیرے میں آن گرا جیسے پردے سے لگ کر کھڑا ٹھٹک گیا ہو۔ روشنی دیکھ کر وہ اُدھیڑ عمر آدمی کرسی پر اُچھلا اور چلّانے لگا۔ راماشی نہ جانے کہاں سے میری طرف لپکی اور کہنے لگی۔

"پردہ گرا دو ساشا کو لو لگ جائے گی۔"

وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے آئی مجھے گرید سی لگی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"ساشا کون ہے؟"

اس نے آنکھیں نیم وا کر کے بغور میری طرف دیکھا اور کہنے لگی۔

" میرا بیٹا "

ساتھ ہی نڈھال ہو کر دھپ سے صوفے پر گر گئی۔ اس کا زرد چہرہ گہرا زرد ہو گیا۔ مجھے دھچکا سا لگا۔ بڑی عورت سے دل لگا بیٹھنے پر شرمسار ہو کر میں نے سر جھکا لیا۔ کمرہ کسی اندھے کنوئیں کی طرح بھائیں بھائیں کرنے لگا اور پھر اس اندھے کنوئیں سے راماشی کی آواز آئی۔

ہماری ایک چھوٹی سی دُنیا تھی جہاں میں، ماراکو اور ہمارا ساشا رہتے تھے۔ ماراکو ہیروشیما کے مقامی ہسپتال میں ڈاکٹر تھا۔ پھر ہماری بدلی یوکوہاما ہو گئی۔ یوکوہاما جانے سے پہلے میں ایک دن کے لئے امی اور پاپا سے ملنے یہاں چلی آئی جس روز میں یہاں پہنچی اسی روز ہیروشیما پر بجلی گری اور میں بھسم ہو کر رہ گئی۔

" پتہ نہیں میں کب تک گرداب میں پھنسی غوطے کھاتی رہی ـــــ پاپا، ساشا اور ماراکو ڈھونڈنے گئے اور جب وہ واپس آئے تو ان کی آنکھوں میں سر بریدہ ہیولے دست و گریبان تھے۔ وہ بے حال سے دروازے کے چوکھٹے میں جڑے کے جڑے رہ گئے۔ ان کا منحنی سا وجود اور بھی سکڑ گیا۔ میں ان کی طرف بھاگی اور ماں ہوتے ہوئے پتہ نہیں کیسے مُنہ پھاڑ کر پوچھا۔

"پاپا، ساشا مر گیا؟"

" اُنہوں نے مجھے گود میں لے لیا اور سینے سے لگا کر بولے :

" بیٹی ساشا نہیں مر سکتا۔ اسے کوئی نہیں مار سکتا :

" پھر اُنہوں نے چھتی پر سے وہ پالنا اُتارا جس میں امی مجھے بچپن میں لٹا کر جھلایا کرتی تھیں اور اب ـــــ اب پاپا اس اندھیرے کمرے میں بیٹھے اس پالنے کو جھلاتے رہتے ہیں :

راماشی کی آنکھیں ابھی تک ماضی کی راکھ میں دفن یادوں کے ذخیرے کو کرید رہی تھیں۔ میں نے اس کے پاس بیٹھ کر کہا

"راماشی :

وہ اس بچے کی طرح چونکی جس نے ابھی ابھی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو۔ میں نے اس کے شانوں کے گرد بازو ڈال کر کہا۔

"راماشی، ساشا کبھی نہیں مر سکتا :

اس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور میرے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ ہمارے درمیان اجنبیت کے فاصلے لمحہ بھر میں سمٹ گئے

راماشی میرے خیالوں میں بس گئی۔

ایک رات ہم تینی بچھائے پلنگ پر خاموش لیٹے تھے۔ رادھا کھڑکی سے جھانکتے چودھویں کے چاند کو دیکھ رہی تھی اور میں احاطہ جھیلوں میں جھلملاتے چاند کو تک رہا تھا۔ سرد ہوائیں ہٹ کی چھت پر ٹاسلوں میں چھپے گنگنا رہی تھیں۔ اس نے میری طرف کروٹ لی اور پوچھنے لگی۔

تمہارے دیس کا چاند بھی ایسا ہی ہے؟"

میں نے کہا۔

" میرے دیس میں تو چاند کی کھیپ ہوتی ہے۔"

"کھیپ !!!"

وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے کہا۔

" اور کیا ۔ میرے دیس میں جب گاؤں کی گوریاں شفاف پیشانیوں پر جھومر سجائے ریخن میں بیٹھ کر چرخے کاتتی ہیں تو آسمان کا چاند بدلی میں چھپ جاتا ہے۔"

وہ سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر اس نے مستفسرانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

" تمہارے دیس کی لڑکیاں بہت خوبصورت ہیں؟"

میں اس کے ذہن میں کھد بدا تے وسوسوں کو بھانپ کر دل ہی دل میں مُسکرایا اور جذباتی بن کر کہا۔

"مکئی کی روٹی اور سرسوں کا ساگ کھانے والی لڑکیاں خوبصورت نہیں ہوں گی تو کیا بدصورت ہوں گی!

۔ ان کے چہروں پر تو چناروں کی آگ کا پر تو رقص کرتا ہے۔ ان کی لمبی پلکوں کی گھنیری چھاؤں میں تھکے ہارے مسافر بیٹھ کر سستاتے ہیں اور جب وہ چلتی ہیں تو دھرتی ان کے قدموں میں بچھ جاتی ہے۔"

وہ مُرجھا گئی اور کہنے لگی۔

" میرے چہرے پر تو سرسوں پھُولی ہوتی ہے۔ ایک بھولے بھٹکے مسافر نے میری پلکوں کے سایے میں دو گھڑی کو ڈیرا ڈالا تھا۔ بیچارہ اس سایے میں جل کر راکھ ہو گیا۔"

وہ اس وقت چاندنی کا دوپٹہ اوڑھے، پاؤں لٹکائے پٹی پر بیٹھی تھی۔ پلکوں کی جھالر پر دو موتی جھلملا رہے تھے میں چپکے سے اُٹھا اُس کے پیروں میں فرش پر آلتی پالتی ماری اور دونوں ہاتھ باندھ کر کسی پجاری کی طرح سر جھکا لیا۔ میرے جی میں آئی اس سے کہوں ۔ تو تو اپسرا کی بیٹی ہے لیکن وہ جلدی سے اُٹھی اور میرے ہاتھ تھام کر میری گود میں لیٹ گئی اور کہنے لگی۔

"مجھے اپنے دیس لے چلو۔ میں وہاں ترنجن میں بیٹھ کر چرخہ کاتوں گی۔"

اس کی آواز میں پہاڑی جھرنوں کا سنگیت تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے اس کی بات کا یقین نہ آیا۔

فتح کا سہرا دراصل ابراہیم کے بیٹوں کے سر تھا۔ جب اس سہرے کی نمائش گلی گلی ہونے لگی تو ہم اتنے دنوں سے اس علاقے میں گولہ بارود کے ذخیروں کو ٹھکانے دکھانے اور جاپانی فوج کے مُردے پر سَو درے مارنے کی جو کافری کارروائیاں کر رہے تھے ان کو عملی جامہ پہنانے کا کام اُنہوں نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا تو ہماری حیثیت براتیوں کی سی ہو گئی اور پھر براتیوں کی ٹولیاں ایک ایک کر کے واپس ہونے لگیں۔

بڈسن کی لائی ہوئی جاپانی لڑکیاں پرانے ڈیرے چھوڑ کر نئے ڈیروں کی طرف چل دیں۔ پرانے ڈیرے ویران ہو گئے۔

کوچی میں وہ میری آخری رات تھی۔ راماشی اور میں دو بے آباد جزیروں کی طرح پڑے تھے اور ہمارے درمیان ابھی سے کھاری پانیوں کی دیوار حائل ہوتی جا رہی تھی۔ میں اس سے بہت سی اَن کہی باتیں کہنا چاہتا تھا۔ لیکن اس پنچھی کی طرح حیران تھا جس کے آشیانے کے چار تنکے آندھی اُڑائے لئے جا رہی ہو۔ جب خاموشی ناقابلِ برداشت ہو گئی تو میں نے جھنجھلا کر اسے جھنجھوڑ ڈالا اور اسے سامنے بٹھا کر پوچھا۔

"مجھ سے شادی کرو گی۔"

وہ شرما گئی۔ اس کے رُخسار گلابی ہو گئے ہیں۔ میں نے اس کے قریب ہو کر کہا۔

"میں چاہتا ہوں تمہاری مانگ میں سیندور دیکھ کر میرے گھر والے بن کہے سمجھ جائیں کہ میں دُلہن لے کر آیا ہوں۔ چلو ابھی کسی پگوڈے میں چل کر شادی رچا لیں۔"

اُس نے مُسکرا کر میری آنکھوں میں دیکھا اور مان گئی لیکن جب چلنے کے لئے تیار ہوئے تو وہ دروازے میں رُک کر کھڑی ہو گئی۔ اور اُداس لہجے میں بولی۔

یہاں کی شادی کا اب کیا اعتبار! —— جہاں شام کی شادی صبح کو ٹوٹ جائے —— تم مجھے ساتھ لے چلو۔ بس جانتی ہوں سورج نکلتے ہی تمہارا جہاز روانہ ہو گا —— میں آپ ہی پہنچ جاؤں گی۔"

خیالات کی آندھی نہ جانے اُسے کیسی کیسی بھول بھلیوں میں اُڑائے لیے پھر رہی تھی۔ میں کہنے ہی والا تھا کہ میں تمہیں دل میں چھپا کر لے جاؤں گا کہ وہ جلدی سے مُڑی اور چلی گئی۔

اس رات کے پچھلے پہر میرے ساتھیوں نے چوری چوری وہ کیبن دُلہن کی طرح سجایا جس میں راماشی سفر کرنے والی

تھی۔ وہ اپنے وعدے کے مطابق علی الصبح آ گئی۔ اس کے چہرے پر دلہنوں کا سا نکھار تھا۔ سرخ فراک کا عکس چہرے پر جھلک رہا تھا۔ چمکیلی آنکھوں میں بجلیاں کوند رہی تھیں اور گلابی ہونٹوں سے رس چھلک رہا تھا۔ وہ مجھے بے محابا اپنی طرف دیکھتے پا کر شرما گئی اور دلمنگ سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے پاس باریک ڈوری کی ایک ریل تھی وہ ڈوری کا ایک سرا پانی میں ڈبو کر کھیلنے لگی۔

دھندلکے میں جاپان کے جزیرے سوئے ہوئے تھے مجھے یوں ہی خیال آیا کہ میں نے چار ماہ کا طویل عرصہ کوچی کے ایک ہٹ میں بند پڑے پڑے گزار دیا۔ اتنا بھی نہ ہوا کہ وہ اجڑا دیار گھوم پھر کر دیکھ لیتا میں نے دامانی سے کہا

"اگر ایک دن کے لیے روانگی ملتوی ہو جائے تو ہم ہیروشیما ہو آئیں۔"

اس کی آنکھوں میں دھوئیں کا ایک بادل سا اٹھا اور دیکھتے دیکھتے پھیل گیا۔ اس سے پہلے کہ بادل برستا وہ آنکھیں جھپکا کر بولی۔

"تم نے پاپا کو تو دیکھا ہی ہے۔ انہی کو ہیروشیما سمجھ لو۔"

اور ہوا کے رخ پر کھڑی ہو کر لمبے لمبے سانس لینے لگی اس کی مضطرب حالت دیکھ کر مجھے اپنی حماقت پر افسوس ہوا۔ اتنے میں لنگر اٹھایا جانے لگا۔ وہ ڈیک پر گہما گہمی دیکھ کر چونکی۔ اس نے جلدی سے ڈوری کا ایک سرا مجھے پکڑایا اور گنگ وے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

"میرے زخم ابھی بہت گہرے ہیں۔ ذرا مندمل ہو جائیں میں خود ہی تمہارے دیس آ جاؤں گی۔"

پھر گینگ وے پر رک کر کہنے لگی۔

"ڈوری چھوڑ نہ دینا۔ میں ساحل پر کھڑی ڈور چھوڑتی جاؤں گی۔ آنکھوں سے اوجھل ہو کر بھی تھوڑی دیر تعلق قائم رہے گا۔"

میں ڈوری کا سرا پکڑے رہا۔ وہ ڈوری چھوڑتی رہی۔ رفتہ رفتہ ساحل دور ہوتا گیا اور پھر ـــــ پھر ساحل نظروں سے اوجھل ہو گیا اور ڈوری میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

زنانِ مصر اور زلیخا

اختر جمال

یوسف اور زلیخا کی کہانی مذہبی کتابوں میں تو رمز اور کنائے میں بیان ہوئی ہے لیکن بہت سے شاعروں اور ادیبوں نے اس قصہ کو کہانی کی صورت میں نظم و نثر میں لکھا ہے مگر وہ سب چیزیں مرد کے نقطۂ نظر کی ترجمان ہیں جس میں ہر چیز کا الزام انجام کار عورت پر عائد کیا جاتا ہے۔ اس کہانی میں ان رمز و علامات کو نئے انداز سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ (اختر جمالی)

مصر کی سب خوبصورت اور معزز عورتوں نے کہا حاشا! یہ انسان نہیں کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔ اور انہوں نے یوسف کو دیکھ کر مارے حیرت کے اپنے انگوٹھے کاٹ لئے اور ان کے انگوٹھوں سے خون رسنے لگا۔ زلیخا نے کہا وہ ایک جیتا جاگتا آدمی ہے جو کھاتا پیتا اور سوتا ہے وہ فرشتہ نہیں۔ فرشتوں سے بڑا ہے۔ میں چاہتی ہوں تم سب اسے سجدہ کرو اس طرح تمہارے انگوٹھوں سے خون بہنا بند ہو جائے گا اور تمہارے زخم بھر جائیں گے۔

زلیخا بشر تھی اور بشر تو شک رشک اور حسد کا پتلا ہے۔ اس لئے زلیخا سوچ میں پڑ گئی کہ زنانِ مصر کی حیرت کی وجہ یوسف کا حسن ہے یا اسے یہاں دیکھنے کی حیرت میں خوف شامل ہے۔ زلیخا نے سوچا کہ آخر اس نے بھی تو یوسف کو دیکھ کر اپنے ہوش و حواس برقرار رکھے ہیں پھر یہ عورتیں ہوش و حواس کیوں کھو بیٹھیں عزیز مصر اور سارے دربار نے بھی یوسف کا حسن دیکھا تھا پھر آخر شہر کی معزز بیگمات نے اپنے انگوٹھے کیوں کاٹ لئے۔ کیا وہ یوسف سے ڈرتی ہیں۔؟ کیا وہ ان کے رازوں کا امین ہے اور اس لمحہ زلیخا بد گمانی میں مبتلا ہو گئی اس نے سوچا کہ یوسف ان عورتوں کو دیکھ کر گھبرا کیوں گیا تھا وہ حیران اور پریشان سا جلدی سے وہاں سے نکل گیا تھا۔ اگر کھڑا رہتا۔ ٹھہر جاتا تو شاید پھر وہ انگوٹھے نہ کاٹتیں کیا یوسف ان عورتوں کو پہلے سے جانتا تھا۔ اس رمز کو جاننے کے لئے زلیخا مچل اٹھی آخر انگوٹھے کاٹے جانے میں کیا مزہ ہے؟ پھر اس نے سوچا اب وہ یوسف کو لائے گی۔ اور ان سب عورتوں کو سجدے کا حکم دے گی دیکھیں وہ اسے سجدہ کرتی ہیں یا نہیں ــــ!

زلیخا دوڑی دوڑی یوسف کے پیچھے پیچھے گئی اور بھاگتے ہوئے یوسف کا دامن پکڑ کر بولی ٹھہرو۔ وہ ایک لمحہ کو رُکا۔
زلیخا نے کہا: "ذرا میرے ساتھ اندر آؤ۔"

یوسف حیران پریشان گھبرایا ہوا تھا۔ وہ زلیخا کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ اس نے سوچا وہ ان سب عورتوں سے کیسے پیچھا چھڑائے اس نے دعا کی کہ خدا مجھے ان عورتوں کے شر سے محفوظ رکھے

زلیخا کی نیت کا حال خدا ہی جانتا تھا وہ اتنی معصومیت سے اس کا دامن پکڑ سے اسے اندر بلا رہی تھی مگر یوسف زلیخا کو بھی مصر کی دوسری معزز عورتوں کی طرح سمجھا اور بھاگ کھڑا ہوا۔

تب زلیخا نے بھاگتے ہوئے یوسف کا دامن زور سے پکڑ لیا۔ یوسف تیزی سے دروازے کی طرف بھاگا دامن کی دھجی پھٹ کر زلیخا کے ہاتھ میں رہ گئی زلیخا اندر آئی تو اس نے دیکھا کہ مصر کی معزز بیگمات اپنے انگوٹھے پکڑے درد سے تڑپ رہی تھیں۔ زلیخا نے دامن کی وہ دھجی پھاڑ پھاڑ کر سب عورتوں کو بانٹ دی اور کہا کہ لو اپنے انگوٹھوں پر پٹی باندھ لو۔" عورتوں نے انگوٹھوں پر پٹیاں باندھ لیں تو خون بہنا بند ہو گیا اور ان کے انگوٹھے چمک اٹھے وہ پٹی روشن ہو گئی۔ اس لئے کہ یوسف کے دامن کی دھجی تو بس روشنی کی ایک لکیر تھی۔

زلیخا نے مسکرا کر ان عورتوں سے کہا: "اگر تم انگوٹھے کی جگہ ہاتھ کاٹ دیتیں تو تمہارا پورا ہاتھ روشن ہو جاتا۔"
پھر زلیخا نے باری باری سب عورتوں کو گلے لگایا اور وہ اپنے روشن انگوٹھوں کو دیکھتی ہوئی خوشی خوشی رخصت ہوئیں۔

جب کاہن اعظم کو بتایا گیا کہ مصر کی معزز عورتوں کے انگوٹھوں سے روشنی کی شعاعیں نکلتی ہیں تو کاہن اعظم نے کہا وہ سب عصمت مآب عورتیں ہیں اور ان کے ساتھ مقدس روشنی ہے۔ یہ سن کر مصر کے شریف اور بڑے آدمی اپنی اپنی عورتوں پر فخر کرنے لگے اور ان عورتوں کو دلوداسیوں سے بھی بڑا مرتبہ دیا گیا تھا ہر طرف ان کی عصمت اور بزرگی کی دھوم مچ گئی۔

عزیز مصر نے زلیخا سے کہا کہ مصر کی سب عصمت مآب اور پاک دامن عورتوں کے انگوٹھے روشن ہو گئے ہیں تم اپنا انگوٹھا دکھاؤ۔" زلیخا نے مسکرا کر ہاتھ بڑھایا تو اس کا انگوٹھا روشن نہیں تھا وہ تو ایک معمولی ہاتھ تھا۔

تب عزیز مصر نے دکھ سے کہا: "میں تمہیں ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ آج مصر کے سب مردوں کے سامنے میرا سر جھک گیا۔"
کاہن اعظم نے جب سنا کہ زلیخا کا ہاتھ ایک معمولی عورت کا ہاتھ ہے۔ اور اس کے انگوٹھے سے روشنی کی شعاعیں نہیں نکلتیں تو اس نے کہا: "افسوس عزیز مصر کی بیوی ایسی ہو۔"

ادھر جب لوگوں نے یوسف کا پھٹا ہوا کرتا دیکھا تو زلیخا کے مجرم بننے میں کسی کو شک نہ رہا۔ بزرگوں نے کہا کہ

دی کر کرتا پیچھے سے پھٹا ہے اس لئے زلیخا مجرم ہے۔

زلیخا کا دل دکھ سے بھر گیا اس نے سوچا کر یوسف کے دل میں کوئی چور تھا۔ آخر وہ بھاگا کیوں کھڑا نہ رہا۔ اس کے ساتھ اندر کیوں نہ آیا نہ وہ بھاگتا نہ کرتا پھٹتا مگر وہ کسی سے کیا کہتی وہ مجرم بنی خاموش کھڑی رہی۔

زلیخا کا جی چاہا کہ وہ ان سب بزرگوں کو یہ راز بتا دے کہ اگر وہ یوسف کا دامن نہ پھاڑتی تو آن سب چوتوں کے انگوٹھے روشن نہ ہوتے مگر وہ خاموش رہی اسے اپنی چھوٹی سی نیکی کا ڈھنڈورا پیٹنا اچھا نہ لگا۔ یہ کم ظرفی تھی اور لوگ نیت نہیں دیکھتے وہ ظاہر عمل دیکھتے ہیں اور اس کا نام انہوں نے انصاف رکھ لیا ہے لیکن زلیخا کو دکھ اس بات کا تھا کہ یوسف بھی اسے نہیں سمجھا اور وہ اسے غلط سمجھا۔ وہ تو سب کو اس کے سامنے سجدہ کرانا چاہتی تھی۔

زلیخا چپ رہی وہ کسی سے کیا کہتی کوئی اس کی بات سمجھنے والا نہ تھا۔

زلیخا پر تہمت لگ گئی حالانکہ اس کا انگوٹھا صحیح سالم تھا۔ شاید اس کا جرم یہی تھا کہ اس نے انگوٹھا نہیں کاٹا تھا اور یوسف کو دیکھ کر بھی اپنے ہوش و حواس برقرار رکھے تھے۔

عزیز مصر نے زلیخا کی روشن آنکھوں میں دیکھے بغیر نفرت سے منہ موڑ لیا اور بولا "تم نے بری نظر سے غیر کی طرف دیکھا ہے۔" زلیخا نے کہا "مجھے کوئی غیر نظر ہی نہیں آتا" پھر اس نے عزیز مصر اور سب بزرگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور اپنا سر بلند رکھا۔

پھر وہ سب یوسف کو سامنے لائے اور اس کا پیچھے سے پھٹا ہوا کرتا دکھایا گیا۔ یوسف نے زلیخا کی طرف دیکھا زلیخا مسکرائی۔ یوسف اپنا سر اونچا اٹھائے چل رہا تھا۔

عزیز مصر نے زلیخا سے کہا "اب تم کیا کہتی ہو؟"

زلیخا مسکرا کر بولی "بے شک یہ سچا ہے" اور اپنا سر جھکا لیا۔ زلیخا دل سے یوسف کی صداقت پر ایمان لے آئی تھی۔ اور وہ یوسف کے وہاں سے بھاگنے کا رمز سمجھ گئی تھی۔

عزیز مصر نے کہا "تو مان گئی کہ تو نے بری نگاہ سے غیر کو دیکھا ہے"

زلیخا نے پھر وہی بات دہرائی "میں نے آج تک کسی غیر کو نہیں دیکھا مجھے غیر نظر ہی نہیں آتا۔ میری آنکھیں تو بس آپ کو دیکھتی ہیں۔"

عزیز مصر نے کہا "لیکن میں تو یہاں ہوں"

زلیخا نے مسکرا کر یوسف کی طرف دیکھا اور بولی "میں یہاں ہوں"

یوسف اس کی بات سمجھ گیا اور اس کا سر جھک گیا۔ اس نے کہا "مجھے جیل خانے جانا منظور ہے"۔ زلیخا نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا لیا اور مسکرانے لگی۔

زلیخا اپنے محل میں آ کر سوچنے لگی کہ قافلے والے جب یوسف کو مصر لے کر آئے تو راستے میں انہوں نے جگہ جگہ پڑاؤ ڈالا ہوگا کاش وہ گھوم پھر کر دیکھ سکتی کہ اور کہاں کہاں کن کن عورتوں نے مارے حیرت کے انگوٹھے کاٹے تھے۔ زلیخا کا جی چاہا کہ وہ ایک انعام مقرر کرے تاکہ سب عورتیں اسے اپنے کٹے ہوئے انگوٹھے دکھانے آئیں اور انعام لے لیں۔ پھر اس نے سوچا کہ انعام کے لالچ میں تو ہر ایک اپنا انگوٹھا کاٹ کر آ جائیں گی۔ اور یہ کام زلیخا کے مرتبہ اور شان کے خلاف تھا کہ وہ سارے جہاں کی عورتوں کے انگوٹھے دیکھتی پھرے اور پھر اس نے سوچا آخر یہ جان کر کیا کرے گی۔ اس کی بلا سے۔ ارے جہاں کی عورتیں اپنے انگوٹھے کاٹ ڈالیں۔ جیت اس وقت یوسف کی ہوتی اگر زلیخا بھی اپنا انگوٹھا کاٹ لیتی۔ مگر اس کا انگوٹھا سلامت ہے۔ اس لئے جیت اس کی ہوئی ــــ اور انصاف کے دن تو یوسف بھی اسے پہچان ہی لے گا ــ! اور وہ انصاف کے دن کا انتظار کرنے لگی۔

جیلخانے کا محافظ تنگ اور تاریک تہہ خانے کے حجرہ میں بند کرنے یوسف کو لے کر چلا مگر جوں جوں تہہ خانے میں اترا جاتا تھا اس کی آنکھیں چندھیائی جاتی تھیں اس نے سوچا سورج آسمان پہ نکلتا ہے یا وہ زمین کی گہرائیوں میں کہیں دفن ہے اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ سورج اس کے ساتھ چل رہا ہے اس لئے کہ اس کی آنکھوں پہ پردے پڑے ہوئے تھے۔ اسے جیلخانے کا داروغہ بنے ہوئے سالہا سال ہو گئے تھے۔ روشنی سے لا کر تاریکی میں بند کرنا اس کا کام تھا مگر آج پہلی مرتبہ اسے نیا کام دیا گیا تھا۔ روشنی کو قید کرنے کا کام۔

داروغہ نے تہہ خانے کے آخری تنگ اور تاریک حجرے کا دروازہ کھول کر یوسف کو اس میں بند کر دیا اور جب کوٹھڑی میں بڑا سا آہنی تالہ ڈال کر وہ مڑا تو گھبرا کر پھر دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کی درز سے روشنی کی شعاعیں نکل رہی تھیں اور وہ شعاعیں لوہے کے تالے کے آر پار نظر آ رہی تھیں۔ داروغہ حواس باختہ ہو کر وہاں سے چلا واپسی میں وہ قدم قدم پہ ٹھوکر کھاتا تھا۔ اور گرتا تھا اسے تعجب تھا کہ جس اندھیرے حجرے میں وہ پل بھر میں داخل ہوا تھا اس حجرے سے واپسی میں وقت اتنا لمبا کیوں ہو گیا ایسا لگ رہا تھا کہ ساری عمر اندھیرے غاروں میں دھکے کھاتا رہے گا۔ اور راستہ نہیں ملے گا۔ دروازہ نہیں آئے گا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ واپس جائے اور یوسف کے قدموں پر گر کر اس سے معافی مانگ لے مگر پھر عزیز مصر کے خوف سے وہ اندھیرے میں راستہ ٹٹول ٹٹول کر چلتا رہا۔

جب وہ قید خانے سے باہر نکلا تو رات کا وقت تھا۔ اس نے سوچا خدا جانے ایک رات گزری ہے یا اس عمر

میں کئی راتیں گزر چکی ہیں۔ اس لئے کہ اس کی داڑھی کے کالے بال سفید ہو گئے تھے۔

اندھیری رات میں مصر کے بالاخانوں میں دیئے روشن نظر آئے تو اس نے لوگوں سے پوچھا کہ کیا آج کوئی تہوار ہے۔ مصر کی سب عورتوں نے چراغاں کیوں کیا ہے؟

لوگوں نے اسے بتایا کہ آج رات مصر میں اتنی تاریکی ہو گئی تھی جیسے کنعان کا چاند نہیں مصر کا چاند چھپ گیا۔ عزیز مصر نے اندھیرے سے گھبرا کر چراغاں کا حکم دیا۔ پھر بھی تاریکی دور نہ ہوئی تو مصر کی وہ سب پاک دامن عورتیں اپنے اپنے بالاخانوں پر ہاتھ اٹھا کر کھڑی ہو گئیں جن کے انگوٹھے روشن تھے اور یہ جو چراغوں کی لوئیں نظر آ رہی ہیں یہ مصر کی بزرگ اور نیک عورتوں کے انگوٹھے چمک رہے ہیں۔

زلیخا نے اس رات عجیب خواب دیکھا۔ مگر اس نے اپنے خواب کا کسی سے ذکر نہیں کیا۔ اور سوچا آج کی رات مقدر کو نیند آ رہی ہے۔ مگر وہ ضرور جاگے گا۔ تاریکی میں سارا مصر سو رہا تھا۔ روشن انگوٹھوں والی عورتیں بھی اپنی خوابگاہوں میں واپس چلی گئی تھیں اور گہری نیند میں تھیں تقدیر کا فرشتہ بھی سو گیا تھا۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا قلم اور کاغذ سوتے میں بھی اس کے پاس تھے وہ نیند کی غفلت میں کچھ لکھ رہا تھا زلیخا نے چپکے سے تقدیر کے فرشتے کے ہاتھ سے قلم لے لیا اور کہا "اپنی کہانی میں خود لکھوں گی"۔ سارا مصر سو رہا تھا۔ زلیخا جاگ رہی تھی۔

زلیخا نے وہ خواب بھی سوتے ہوئے نہیں جاگتے ہوئے دیکھا تھا اور وہ عجیب الجھن میں تھی کہ یہ عالم بیداری ہے یا عالم خواب اور آپ سے آپ اس کا سر ان دیکھے خدا کے سامنے جھک گیا۔ اس نے جھک کر سجدے میں ان دیکھے خدا سے اقرار کیا نہ میں ہوں نہ یوسف ہے بس تو ہے۔ اور یوسف تو تیرے اجالے کی کرن لایا تھا اور جو کچھ میں نے عزیز مصر کے سامنے کہا تھا وہ تیرا ہی حکم تھا تو روز قیامت گواہ رہنا۔" پھر زلیخا نے سجدے سے سر اٹھا لیا اور سوچا اب میرا کسی سے کوئی واسطہ نہیں ہے نہ یوسف سے اور عزیز مصر سے ــــ؟ اور پھر زلیخا کے دل پر سے بوجھ ہٹ گیا اس کی روح سرور کے کیف میں ڈوب گئی۔ اسے گہری نیند آ گئی۔

جب زلیخا کی آنکھ کھلی تو اس کے سیاہ بال سفید ہو چکے تھے اور اس کے چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں اس کے گلابی ہونٹوں کی پنکھڑیاں مرجھا گئی تھیں اس کا خوبصورت جسم کمان کی طرح خم ہو چلا تھا۔ مصر کی وہ سب عورتیں جو زلیخا کی ہم سن تھیں اپنے روشن انگوٹھوں کو دیکھ دیکھ کر خوشی سے اتنی مگن تھیں کہ غم اور بڑھاپا ان کے قریب سے بھی نہ گزرا تھا۔ ان کے بال کالے تھے اور ہونٹوں کی کلیاں تر و تازہ اس لئے کہ انہیں سچی مسرت اور عزت حاصل تھی۔

وہ مصر کی سب سے محترم عورتیں تھیں۔ مگر ان سب کے مرد عزیز مصر کی طرح بوڑھے ہو گئے تھے۔

ایک دن ان عورتوں نے زلیخا پر ترس کھا کر کہا: "اگر تم نے اپنا انگوٹھا کاٹ لیا ہوتا تو تم بھی آج جوان ہوتیں اور یوسف قید ہوتا۔ ہم سب کی لونڈیاں اور غلام آزاد ہیں۔ مگر تم نے ایک انہونی بات کی ہے اور اس کی سزا بھگت رہی ہو۔"

زلیخا بولی: "اگر میں اپنا انگوٹھا کاٹ لیتی تو دامن کون پھاڑتا اور پھر تسائد تمہارے زخم بھی مندمل نہ ہوتے۔" یہ سن کر انہوں نے سر جھکا لیا اور خاموش ہو گئیں۔

زلیخا ان کی باتوں پر مسکرانے لگی وہ ان عورتوں کو کیا بتاتی کہ انہوں نے تو صرف انگوٹھے کاٹے تھے مگر جب زلیخا نے عزیز مصر سے یہ کہا تھا کہ میں نے آج تک کسی غیر کو نہیں دیکھا تو اس لمحہ اس نے اپنا سر کاٹ کر ہتھیلی پر رکھ لیا تھا۔ اور جب اس نے یوسف سے کہا تھا کہ "میں بیمار ہوں" تو اس کے جسم پر عزور کا سر نہیں تھا۔ اس کی انا ختم ہو چکی تھی۔ وہ کہیں بھی نہیں تھی۔ وہ ایک لمحہ میں وہ سارا سفر طے کر چکی تھی وہ سفر جس کو طے کرنے کے لئے مجنوں نے ساری زندگی دشت کی خاک چھانی تھی۔ فرہاد نے نہر کھودی تھی۔ اور یوسف نے جیلخانے کی صعوبت گوارا کی وہ سارا سفر زلیخا نے پلک جھپکاتے میں طے کر لیا تھا۔ عرفان کے اس لمحہ میں جب اس نے اپنا سر کاٹ کر ہتھیلی پر رکھا تھا۔ اس کا سارا وجود روشنی بن گیا تھا مگر یہ سب باتیں وہ کسی کو نہیں سمجھا سکتی تھی وہ خاموش رہی۔ زلیخا نے اپنی سہیلیوں کو جب اپنے بڑھاپے پر ترس کھاتے دیکھا تو کہا: "یہ بھی کتنی اچھی بات ہے کہ میں تمہیں اس بوڑھے جسم کی بدولت نظر آ رہی ہوں، میں تو خود کو نظر بھی نہیں آتی۔ بس وہی ہے۔"

اس کی ایک سہیلی ہنس کر بولی "کون؟ یوسف؟"

زلیخا نے کہا: "تم یہ باتیں نہیں سمجھ سکتی ہو اس لئے تم اسے یوسف کہہ لو تو کوئی حرج نہیں ہے۔"

پھر زلیخا انہیں اپنے ساتھ لائی اور کہا: "دیکھو یہ الماریاں ــــ ان میں وہ سب لباس ٹنگے ہوئے ہیں جو ازل سے ابد تک کے ہیں۔ میں جو لباس چاہوں پہن سکتی ہوں۔ دیکھو دلہنوں کے خوبصورت لباس۔ اگر تم جسے میرا جسم سمجھ کر میرے بڑھاپے پہ ترس کھا رہی ہو وہ تو میرا لباس ہے۔" پھر اس نے انہیں وہ سب لباس پہن کر دکھائے۔ کبھی وہ سیتا بن گئی کبھی درو پدی، کبھی لیلیٰ کبھی شیریں پھر وہ ہنس کر بولی زندگی کے اس رواں دواں سمندر میں سے آخر میں تمہیں لباس کہاں تک نکال نکال کر دکھاؤں۔ یہ ہیر ہے یہ سوہنی ہے۔ یہ قلو پطرہ ہے یہ انارکلی ہے اور یہ نور جہاں ہے ــــ اور یہ سب سے خوبصورت لباس یہ جوگیا رنگ کی ساری اور منکوں کی مالا ــــ یہ وہ جوگن ہے جس کا نام میرا تھا اور جس کے بول قیامت تک زندہ رہیں گے۔ پھر اس نے سب الماریاں بند کر دیں مصر کی سب عورتیں حیران پریشان تھیں جیسے کسی سحر میں ہوں۔ وہ کبھی آنکھیں ملتی تھیں اور کبھی کھولتی تھیں آخری الماری باقی رہ گئی تھی۔ زلیخا نے کہا میں اسے نہیں کھول سکتی اس میں عالم مثال کے لباس ہیں۔ وہ سب لباس جنہیں محبت نے جنم دیا ہے یہ وہ سب خیال ہیں جو کل حقیقت بنیں گے۔

عورتوں نے کہا "یہ لباس کیسے ہیں۔؟"

زلیخا نے کہا: "عالم مثال میں نہ جسم ہے نہ خیال بس وہ لباس تو صرف ایک حکم ہے۔"

ایک عورت نے پوچھا "حکم کیا ہے؟"

زلیخا بولی: "وہ روح ہے۔"

زلیخا نے کہا۔ "تم سب موت سے ڈرتی ہو بڑھاپے سے خوف کھاتی ہو اور سدا جوان رہنے کی آرزو کرتی ہو۔ اب یہ لباس دیکھ کر تمہارا خوف دور ہوا یا نہیں؟"

عورت نے کہا: "ہاں اب ہمارے دلوں سے موت کا خوف جاتا رہا ہے۔"

زلیخا بولی: "موت کا دکھ اور خوف تو بانجھ زمین کا دکھ اور خوف ہے وہ زمین جس پر پھل اور پھول آتے ہیں اسے موت کہاں" پھر وہ مسکرانے لگی ایک عورت بولی "ہمیں موت کے بارے میں بتاؤ۔ موت کیا ہے" زلیخا نے کہا: "جسم سے جسم کا ملاپ موت ہے فنا ہے اور تم جسے فراق کہتی ہو وہ زندگی ہے۔ روح کا روح سے ملاپ ہوتا ہے۔"

ایک عورت نے کہا "کیا روح کا ملاپ زندگی میں ممکن ہے۔"

زلیخا بولی ہاں ممکن ہے مگر اس وقت جب تم جیتے جی جسم سے باہر نکل سکو اور یہ وہ راز ہے جو صرف خضر کو معلوم ہے اور وہ کسی کو نہیں بتاتا۔ آؤ میں تمہیں آب بقا کا راز بتاؤں تاکہ تم حیات جاوید پالو۔"

ایک عورت نے کہا۔ "حیات جاوید کیا ہے؟"

زلیخا ہنس پڑی " وہ ایک لمحہ ہے دید کا ایک لمحہ! دیکھ لینا اور پہچان لینا۔ اگر حباب کے لامتناہی سمندر میں وہ ایک لمحہ تمہیں حاصل ہو گیا تو تم جام جہاں نما کی مالک ہو۔"

ایک عورت نے پوچھا "جام جہاں نما کیا ہے؟"

زلیخا بولی وہ تمہارا دل ہے اس آئینہ کو جتنی جلا دے سکو گی اتنی ہی دور دیکھ سکو گی۔ ماضی۔ حال۔ مستقبل ایک لکیر کے سب روشن نقطے نظر آئیں گے پھر تم وقت کی قید میں نہیں ہوگی۔ وقت تمہاری قید میں ہوگا

ایک عورت نے کہا" اس آئینے کو کیسے صاف کریں؟"

زلیخا نے کہا: "دیکھو تم سب مٹی کے کوزوں کی پروا کرنا چھوڑ دو۔ ہستی کے بازار میں ان کوزوں کی کمی نہیں جو چیز پیالے میں ہے وہ قیمتی ہے۔ وہ شراب ہی آب حیات ہے۔ وہ روشنی ہے ـــــ وہ تمہاری روح ہے اور یہی روح کی غذا ہے!

ان عورتوں نے کہا اب ہم تمہاری باتیں سمجھ گئے ہم آج اپنے روشن انگوٹھوں کا حال اپنے شوہروں کو بتا دیں گے۔

یوسف سچا ہے۔ اور عزیز مصر کے سامنے تمہاری بے گناہی بھی ثابت ہو جائے گی۔ زلیخا نے محبت سے انہیں گلے لگایا اور بولی "تمہارا راز میرا راز ہے اگر تم نے یوسف کو چاہا اور پسند کیا تو میں خوش ہوں۔ اس لئے کہ یوسف مجھ سے الگ نہیں۔ نہ میں یوسف سے جدا ہوں۔ تم نے اسے چاہا تو مجھے چاہا ـــــ اور میری بے گناہی اور سب پہ تو ثابت ہے عزیز مصر کے ساتھ میں نے زندگی گذاری ہے وہ مجھے جانتا ہے تم سب جانتی ہو ــــ مصر کے سب لوگ جانتے ہیں مگر میری بے گناہی یوسف پر انصاف کے روز ثابت ہوگی جب اسے میری نیت کا حال معلوم ہوگا۔"

اس رات ان سب معزز اور پاک دامن عورتوں نے اپنے اپنے خاوندوں کو اپنے انگوٹھے زخمی ہونے کا حال سنایا اور کہا یوسف بھی سچا ہے اور زلیخا بھی سچی ہے اور پاکدامن ہے۔" ان سب کے انگوٹھوں کی روشنی یکایک غائب ہو گئی تو ان کے مردوں نے کہا" کاش تم نے اپنی زبانوں پر تالا ہی رکھا ہوتا تو اچھا تھا۔"

عورتوں نے مردوں سے کہا کہ" وہ روشنی اپنے مقام پر واپس آگئی ہے۔ اور اب وہ ہمارے دلوں میں ہے۔"

جب انہوں نے زلیخا کی باتیں اپنے مردوں کو سنائیں تو وہ بولے اگر مصر کے حاکموں نے زلیخا کی باتیں سن لیں تو وہ اسے بھی جیل خانے میں ڈلوادیں گے یا اس سے بدتر کوئی سزا دیں گے۔ عورت ناقص العقل ہوتی ہے اس کی بات مان کر تم نے انگوٹھوں کی مقدس روشنی کھو دی وہ جو بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہی ہے اس سے پوچھو کہ آج تک کوئی عورت پیغمبر یا اوتار ہوئی ہے؟ عورتیں یہ سن کر چپ ہوگئیں۔

جب وہ عورتیں زلیخا کے پاس آئیں تو انہوں نے اپنے مردوں کی باتیں سنائیں زلیخا ان کی باتیں مسکرا مسکرا کر سنتی رہی پھر بولی عورت نے پیغمبر اور اوتار ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اس لئے کہ دعویٰ کرنا عورت کو زیب نہیں دیتا۔ سورج دنیا سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس روشنی ہے وہ تو سب کو روشنی دیتا ہے عورت پیغمبر اور اوتار پیدا کرتی ہے۔"

پھر ان عورتوں نے کہا:" وہ سب کہتے ہیں عورت کی عقل ناقص ہے۔"

زلیخا بولی:" یہ سچ کہتے ہیں عورت عقل میں ناقص ہے اور عشق میں کامل ہے۔ مرد عقل میں کامل بنتا ہے مگر وہ عشق میں ناقص ہے۔ اور جو عشق میں کامل ہوا اسے نظر آتا ہے حقیقت کا عرفان دیا ہے نہ کہ شنید! مردوں کا علم ظاہر کا ہے اور عورتوں کا علم باطن کا ہے۔ ظاہر کو باطن کا علم نہیں اس لئے وہ عورت کو ناقص العقل کہتے ہیں مگر باطن کو ظاہر کا حال معلوم ہے اس لئے عورت کوئی دعویٰ نہیں کرتی نہ کسی بات کا بُرا مانتی ہے وہ ہنس کر چپ ہو جاتی ہے۔"

ان مردوں نے جب یہ سنا کہ زلیخا ان کی باتوں پر ہنس کر چپ ہو جاتی ہے تو وہ کھسیانے ہو گئے اور الٹا اپنی تقدیر کو رونے لگے کہ انہوں نے روشن انگوٹھوں والی عورتوں سے شادی کرنے کی بجائے معمولی عورتوں سے شادی کیوں نہ

کی جوانی کی ہر بات یاد آجاتی وہ پڑا ماتیں اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر ان کے پیچھے چلا کرتیں۔

عزیزِ مصر نے اس رات ایک خواب دیکھا۔ اور دوسرے دن اپنے مصاحبوں کے آگے بیان کیا اور پھر وہ غلام جو اسے شراب پلانے پر مامور تھا دو زانو ہو کر بولا کہ اسے خوابوں کی تعبیر بتانے والے کا پتہ معلوم ہے اور اس نے یوسف کا حال بیان کیا عزیزِ مصر نے یوسف کی رہائی کا حکم دیا اور سالہا سال بعد وہ خوابوں کا حال جاننے والے اور ان کی تعبیر بتانے والا جیل خانے سے باہر آیا وہ جیل خانے جا کر وقت کی دھوپ چھاؤں سے محفوظ تھا۔ وہاں وقت ٹھہر گیا تھا حسن، صحت، جوانی سب چیزیں وقت کے ساتھ ٹھہر گئی تھیں اور یوسف وہی یوسف تھا۔

مگر زلیخا وہ زلیخا نہیں تھی۔ زلیخا تو سفر میں تھی اور جس طرح پھل پک کر درخت سے لٹک جاتا ہے اس طرح وہ جیتے جی جسم کی قید میں سے نکل آئی تھی فنا کی منزل سے گذر کر بقا کی اس منزل میں تھی جہاں سب لباس اس کی الماریوں میں بند تھے مگر اسے اپنا بوڑھا جھریوں والا لباس پسند تھا۔ اگر وہ لباس بدل لیتی تو عزیزِ مصر اور دوسرے لوگ اسے نہ پہچانتے اور یوسف کے جیل خانے سے آنے تک وہ اس لباس میں رہنا چاہتی تھی تاکہ یوسف کا امتحان لے سکے اور دیکھ سکے کہ یوسف اسے پہچانتا ہے یا نہیں۔

جب یوسف زلیخا کے سامنے آیا تو وہ اسے نہیں پہچانا۔ وہ بیگانوں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے سے خاموش گذر گئے۔

پھر قحط سالی کا دور آیا تو عزیزِ مصر کے خواب کی تعبیر لوگوں نے حرف بہ حرف پوری ہوتی دیکھ لی۔ عزیزِ مصر نے یوسف کو اپنے تخت کا وارث بنایا کیونکہ وہی انہیں قحط بیماری اور اندھیرے سے نجات دلانے والا تھا اور اسے یوسف پیمبر و سر تھا اور مصر کے لوگ اسے اپنا نجات دہندہ سمجھتے تھے۔

اور جب یعقوب کی آنکھیں روشن ہوئیں اور اس نے یوسف کو اس کے خواب کا مطلب سمجھایا تو سب کے سر اس کے سامنے جھک گئے۔

سب کے خواب سچ بن کر ظاہر ہوئے مگر زلیخا نے اپنے خواب کا کسی سے ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے خواب کی تعبیر جاننا چاہتی تھی اور خوابوں کی تعبیر بتانے والا یوسف تھا جو اسے پہچانتا نہ تھا۔ اس لئے اپنے خوابوں کی تعبیر پوچھنے جانا زلیخا کو کچھ اچھا نہ لگا پھر اس نے سوچا کہ اس کے خواب کی تعبیر بھی اسی طرح ایک دن سامنے آئے گی جس طرح سب کے خوابوں کی تعبیر سامنے آئی ہے اور اس دن اسے یوسف پہچان لے گا۔

کچھ عرصہ بعد یوسف نے اپنے محل میں دعوت کی جس میں سب معزز لوگ مدعو تھے ان دعوت میں وہ عورتیں بھی تھیں جن کے

انگوٹھوں کا ایک زمانے میں بڑا چرچا تھا۔ ان کے خاوند بھی ساتھ تھے اور اس دعوت میں یوسف نے عزیز مصر کی بیوہ کو بھی بلایا تھا۔

جب زلیخا ان سب عورتوں کے درمیان بیٹھی تو یوسف کی اس پر نظر پڑی اور وہ سوچ میں پڑ گیا۔

زلیخا نے فیصلہ کر لیا کہ وہ یوسف کو آج یاد دلائے گی کہ وہ کون ہے اور ایک لمحہ کے لئے زلیخا نے وہ لباس پہن لیا جسے اتار کر اس نے مصر کی ملکہ کا لباس پہنا تھا وہ لباس کنعان کی اس دوشیزہ کا تھا جو یوسف کے ساتھ لڑکپن میں بھیڑیں اور بکریاں چرایا کرتی تھی اور جب ایک دفعہ اس نے یوسف کے بھائیوں کو کنوئیں میں دھکا دے کر اسے گراتے دیکھا تو اسے نکالنے دوڑ پڑی اس کے بھائی جا چکے تھے وہ بیقراری کے عالم میں کنوئیں میں کود گئی۔ اور جب وہاں اس نے یوسف کو زندہ سلامت چودھویں کے چاند کی طرح چمکتے دیکھا تو اسے اتنی خوشی ہوئی اس خوشی کی تاب نہ لا کر اس نے اپنی جان دے دی۔ یا پھر یہ ہوا کہ یوسف کے پاس جا کر اس نے دوسرا جسم بیکار سمجھ کر پھینک دیا ہو۔

یوسف نے اس لمحہ زلیخا کو پہچان لیا۔ قید خانے کا پورا عرصہ گذار کر یوسف وہ راز سمجھا جو زلیخا عزیز مصر اور سب مردوں کی موجودگی میں سمجھانا چاہتی تھی جب زلیخا نے کہا تھا کہ میں یہاں ہوں تو یوسف نے سوچا تھا کہ زلیخا نے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے مگر آج جب اس نے زلیخا کو کنعان کی دوشیزہ کے پرانے لباس میں دیکھا جو کنوئیں میں رہ گیا تھا تو وہ اس لمحہ اس جملے کا مطلب سمجھ گیا کہ "میں یہاں ہوں۔"

جب حقیقت بے نقاب ہوئی تو کنوئیں سے نکال کر مصر کے بازار میں لایا جانا۔ سب عورتوں کے انگوٹھے کاٹنا اور زلیخا کا دامن پکڑنا سب باتیں اس کی سمجھ میں آ گئیں زلیخا کا وہ لباس بہت خوبصورت تھا اور مصر کی سب معزز عورتوں کے ملبوسات بہت خوبصورت تھے اور اس لئے یوسف نے ان کے شر سے بچنے کی دعا کی تھی۔ یوسف نے سوچا کہ کاش زلیخا اتنی تو رمز اور اشارے میں بات نہ کرتی اور وہ بتا دیتی کہ وہ کون ہے تو پھر مصر کے تخت پر بیٹھنے کے بعد وہ سالہا سال غم نہ کرتا کہ وہ مصر کا بادشاہ ہونے کے بجائے کنعان کا ایک فقیر ہوتا۔ اس نے سوچا کنوئیں سے عزیز مصر کے محل تک اسے جو چیز لائی تھی وہ کنعان کی مٹی کی خوشبو تھی جس میں اس کی روح مقید تھی اور وہ سارے عرصہ اپنی روح کو تلاش کرتا رہا۔ اب اگر مصر کی عورتوں نے اپنے انگوٹھے کاٹ لئے تو اس میں اس کا کیا قصور تھا۔

جب زلیخا نے دیکھا کہ اسے یوسف نے پہچان لیا تو غم کا بوجھ اس کی روح سے ہٹ گیا اور اس کا دل خوشی سے بھر گیا۔ اس کا رواں رواں کھل اٹھا۔

مصر کے لوگوں نے جب اس لمحہ زلیخا کو پھول کی طرح ہنستے دیکھا تو وہ بولے کہ یوسف کو دیکھ کر زلیخا خوشی سے جوان ہو گئی ہے یہ بات سن کر یوسف بھی مسکرانے لگا اور زلیخا بھی مسکرانے لگی۔ اس لئے اپنی حقیقت وہ

خود جانتی تھی یا پھر یوسف جانتا تھا۔

یوسف بیقرار ہو کر مسند سے اترا اور چاہا کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے مسند پر اپنے برابر جگہ دے۔ مگر زلیخا محبت اور وقت کے رمز سے آشنا تھی وہ یوسف کو وہ لباس کیسے دے دیتی جو عزیز مصر کی ملکیت تھا۔

یوسف نے ہاتھ بڑھا کر لمحہ کو اپنی گرفت میں لینا چاہا۔ سورج اور چاند ٹھہر گئے لمحہ اس کی گرفت میں آ گیا اس نے زلیخا کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر پکڑ کر فوراً ہی چھوڑ دیا۔

یوسف اگر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسی طرح کھڑا رہتا تو وقت کا وہ لمحہ ہمیشہ کے لئے ٹھہر جاتا اور سورج اور چاند تو سفر کرنے کے لئے ہیں یوسف کو وہ ایک لمحہ مصر کی بادشاہت سے زیادہ قیمتی معلوم ہوا جب اس نے وقت کو گرفت میں لے لیا تھا۔

اور جب یوسف نے زلیخا کا ہاتھ پکڑا تو زلیخا اپنے خواب کی تعبیر جان گئی زلیخا نے دیکھا کہ وہ تو صرف روشنی تھا جسم نہیں تھا اور یوسف نے زلیخا کا ہاتھ پکڑ کر محسوس کر لیا تھا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی ہاتھ نہیں ہے اور اسی لئے اس نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہی چھوڑ دیا تھا لمحہ کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا تھا۔ چاند اور سورج کو سفر کرنے دیا۔

سب لوگ حیران اور پریشان کبھی یوسف کو دیکھ رہے تھے اور کبھی زلیخا کو اور ان کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔

اور پھر ان سب کی حیرت دور کرنے کو یوسف نے اپنے چھوٹے بھائی سے کہا کہ وہ پھٹا پرانا کرتا لے آئے جسے آنکھوں پر رکھتے ہی اس کے باپ کی آنکھیں روشن ہو گئی تھیں۔

جب یوسف کا چھوٹا بھائی وہ کرتا لے آیا تو سب نے دیکھا یہ وہی کرتا تھا جس کا دامن پیچھے سے پھٹا ہوا تھا۔

سب کے سامنے یوسف نے وہ پرانا پھٹا ہوا کرتا پہنا تو سب کی آنکھیں چندھیا گئیں وہاں یوسف کے بجائے انہیں نور کا ایک ہالہ نظر آیا تب یہ رمز ان کی سمجھ میں آ گیا کہ سالہا سال پہلے یوسف نے اپنے باپ کو جو پھٹا پرانا کرتا بھیجا تھا تو اسے روشنی بھیجی تھی۔ زلیخا نے اپنا سر جھکا لیا اور یوسف سے بولی تو سچا ہے میں ہی نادان تھی کاش میں نے یہ کرتا نہ پھاڑا ہوتا۔

یوسف نے مسکرا کر کہا اگر تو وہ کرتا نہ پھاڑتی تو روشنی کرتے ہی میں رہتی تو نے وہ کرتا پھاڑا تو روشنی ہر طرف پھیل گئی جب تک میں اپنے جسم کی قید میں تھا روشنی بھی قید تھی۔" پھر اس نے سب کو مخاطب کر کے کہا "ہم جب تک اپنی قید سے باہر نہ نکلیں خود بھی تاریکی میں رہتے ہیں اور جب اپنی قید سے باہر آ جاتے ہیں تو سب کو روشنی میں

لے آتے ہیں۔"

اور اس لمحہ مصر کے لوگوں نے روشنی سے چکا چوند میں چندھیائی ہوئی آنکھیں مل مل کر دیکھی تو وہاں نہ یوسف تھا اور نہ زلیخا تھی بس ہر طرف روشنی ہی روشنی تھی۔

گُڈریا

اشفاق احمد

سردیوں کی ایک منجمد اور تاریک رات کو بھابا نے میرا لحاف اٹھا کر مجھے جھنجھوڑا اور آہستہ سے کہا: "اٹھو، ٹی ٹی آگیا ہے"۔ میں گرم گرم لحاف کی گود میں بڑے آرام سے سویا ہوا تھا اور اس وقت اگر کوئی مجھے اٹھا کر سلیمانی ٹوپی دینے کا وعدہ بھی کرتا تو بھی میں نہ اُٹھتا۔ لیکن ٹی ٹی کا نام سن کر میں چارپائی پر آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا اور کوٹھڑی میں اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑانے لگا۔ کمرے میں دھونسی ہوئی چمنی والی لمبوتری لالٹین جل رہی تھی اور اس کے پاس بھابا سر جھکائے سحری کھا رہے تھے۔ میں نے پاؤں چارپائی سے اتارتے ہوئے پوچھا: "کہاں ہے ٹی ٹی؟" تو انہوں نے اسی طرح سر جھکائے جواب دیا: "نیچے تو اترو، آنکھیں تو کھولو، سب کچھ آپ سے آپ نظر آجائے گا۔"

میں نیچے اترا۔ آنکھیں کھولیں۔ دھونسی ہوئی چمنی کے آگے ہاتھ کر کے بھابا کو دیکھا مگر ٹی ٹی نظر نہ آیا۔ چارپائی کے نیچے ہم دونوں کا مشترکہ ٹرنک پڑا تھا۔ اس کے پاس بیٹ اور وکٹیں بکھری ہوئی تھیں، اور ان سے ذرا فاصلے پر بستر سے گر جانے والی کتابیں اور کاپیاں الٹی سیدھی لیٹی تھیں۔ لیکن ٹی ٹی کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر ہولے سے پوچھا۔ "کہاں ہے بھابا؟" اور بھابا اسی طرح سحری کھاتے رہے۔ انہوں نے دہی کا کٹورا میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لو سحری کھاؤ۔ صبح صبح چپکے چپکے روزہ رکھ لینا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔"

بچپن میں ہر چھوٹے بچے کی طرح مجھے بھی روزہ رکھنے کی بڑی تمنا ہوا کرتی تھی لیکن گھر والے سحری کے وقت جگاتے نہیں تھے۔ بھابا سے کئی مرتبہ درخواست کی تھی پر وہ بھی گھر والوں کا ساتھ دیتے رہتے۔ ہر صبح میں اُٹھتے ہی ان سے خوب جھگڑتا، گالیاں سناتا اور بد دعائیں دیتا۔ اس پر بھی وہ برہم نہ ہوتے اور مسکرانے لگتے تو انہیں بچو بچو کہہ کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرتا لیکن وہ اسی طرح مسکراتے رہتے اور میرا روزہ جوں کا توں رہ جاتا۔

آج انہوں نے کمال مہربانی سے مجھے اپنے آپ اٹھا دیا تھا اور اپنی سحری پہ دعوت دے رہے تھے لیکن ٹی ٹی کا نام سن کر سحری کھانے اور روزہ رکھنے میں لطف نہ رہا تھا۔ میری نگاہیں چاروں طرف اسے ڈھونڈ رہی

کھنس اور میرا جی اس سے لپٹ کر پیار کرنے کو چاہتا تھا۔ اگر بھیا سے بار بار پوچھتا تو وہ بار بار مجھے ستانے، مجھے اس کے پاس نہ لے جاتے اور وہ رات اسے دیکھے بغیر گذر جاتی۔ میں نے جلدی جلدی سحری کھانا شروع کر دی اور بھیا سے پہلے فارغ ہو گیا۔ ہاتھ پراٹھوں سے چکنے ہو گئے تھے وہ میں نے قمیض سے پونچھے اور بوٹیوں کے ریشے جو دانتوں میں پھنس گئے انہیں ایسے ہی رہنے دیا۔ بھیا نے بڑے اطمینان سے سحری ختم کی گرم پانی سے ہاتھ دھوئے۔ منجن سے دانت صاف کئے اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں نے مخلصانہ رائے دیتے ہوئے کہا "ٹی ٹی کو دیکھنے چلیں؟" تو وہ ہنس پڑے اور دیر تک کرسی پر آگے پیچھے جھولنے کے بعد بولے "میں تو یونہی کہہ رہا تھا۔ ایسی اندھیری رات میں بھلا کون اسے لاتا اور کس طرح ہمارے یہاں پہنچاتا۔"

یہ بات سن کر میں جھلا گیا اور مُکا تان کر بولا "بجو بکواسی، مجھے اٹھایا کیوں تھا۔" پھر بھیا اسی طرح جھولتے رہے۔ میں ان کی اس حرکت پر باؤلے کتے کی طرح جھپٹا اور انہیں گردن سے پکڑ کر جھٹکے دینے لگا۔ وہ ہنستے رہے گدھا گدھا کہتے رہے اور اپنا آپ چھڑوانے رہے۔ میں نے ان کے بال پکڑ کر سر کو زور زور کے جھکورے دیئے تو ان کے آنسو نکل آئے اور وہ اسی طرح ہنستے ہوئے گانے لگے "ایک لڑکے کو پکایا تھا اور اونٹوں ساتھ لگایا تھا۔" میں اس بدتمیزی کی تاب نہ لا سکا۔ ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر کے بالوں کو اس زور سے کھینچا کہ وہ کرسی سے اُٹھ کر کبڑے کبڑے کھڑے ہو گئے اور ان کی ہنسی خود بخود معدوم ہو گئی۔ انہوں نے میری کلائیاں پکڑ کر ہاتھ چھڑواتے ہوئے کہا "چلو اب جانے دو۔"

میں غصے سے بپھرا کھڑا تھا اور اس نحیف و نزار بامذاق کو دیکھ رہا تھا جسے ہم سب بھیا کہتے تھے اور جو ہمیں واقعی اچھا بھی لگتا تھا۔ بال چھڑوا کر بھیا نے لالٹین اٹھائی اور کوٹھڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا "آؤ۔"

کچا صحن گذر کر ہم برآمدے سے ہوتے ہوئے بھوسے والی کوٹھڑی کے پاس جا نکلے۔ بھیا نے لیمپ دہلیز پر رکھ کر کواڑ کھولے۔ اندر سے گرم گرم بھوسے کا ایک بھبکا آیا اور باہر کی خنک فضا تیز گرم سی ہو گئی۔ بھیا نے لالٹین اٹھا کر ہولے سے سیٹی بجائی اور دروازے کی اوٹ سے سفید رنگ کا ایک موٹا تازہ کتا برآمد ہوا۔ اس کی آنکھیں نگینوں کی طرح چمک رہی تھیں اور اس کے کان اٹھاسی کا ہندسہ بنے کھڑے تھے۔ اس نے تیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور دم ہلانے لگا۔

میں سب کچھ بھول گیا اور بھیا کا بازو ہلا کر پوچھنے لگا "بھیا گل ٹریا ہے؟" بھیا نے محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور سر ہلا کر بولے "دراصل یہ گل ٹریا ہی ہے۔" مجھے ان کی یہ بات بالکل ناگوار نہ گذری اور میں جھک کر

ٹی ٹی کو دیکھنے لگا۔ اس کے گلے میں ریلوے بکنگ کی پرچی لٹک رہی تھی اور اس کی گردن اور چہرے سے معصومیت کے بہت سے "نیچے چھپے ہوئے تھے۔ میں نے بھیا کا ہاتھ پکڑ کر بڑے پیار سے بلایا اور کہا صبح ہوگی تو ہم اسے سیر کرانے لے جائیں گے اور بیلے میں چھوڑ دیں گے۔ یہ ہمارے لئے خرگوش پکڑ کر لائے گا اور ہم ان سے کھیلا کریں گے۔" بھیا اسی طرح کھڑے میری باتیں سنتے رہے۔ پھر انہوں نے لالٹین اٹھا کر دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں صبح ہوگی تو ضرور چلیں گے۔ اب اسے سونے دو۔"

بستر میں لیٹ کر میں جی ہی جی میں چچا امان کا شکریہ ادا کرنے لگا۔ جنہوں نے وعدے کے مطابق کوہاٹ جاتے ہی ٹی ٹی بھیج دیا تھا۔ جب تک وہ ہمارے یہاں رہے روزانہ ٹی ٹی کے قصے سناتے رہے۔ اس کی ماں کی اچانک موت کا تذکرہ کرتے رہے اور اس کے بھائیوں کی بیہودگیوں اور گستاخیوں پر روشنی ڈالتے رہے۔ ہم ان کے پیچھے پڑ گئے کہ ٹی ٹی ہمیں بھجوا دیجئے۔ ہم سب بھائی بہن باری باری اسے اپنی ایک وقت کی روٹی اسے ڈالتے رہیں گے۔ چچا تو مان گئے۔ مگر ابا جی نے اجازت نہ دی۔ وہ کہتے تھے کہ ہمارے گھر میں تو آدمیوں کو کوئی نہیں پوچھتا کتے کا دھیان کون رکھے گا؟ ہم سب رونے لگے۔ ہاتھ جوڑے منتیں کیں اور انہیں یقین دلایا کہ اگر ٹی ٹی کو کبھی کوئی تکلیف ہوئی تو وہ ہمیں گھر سے نکال دیں۔ ابا جی کا دل پسیج گیا اور انہوں نے یہ شرط پیش کی کہ اگر بھیا اس کی غور و پرداخت کا ذمہ لیں تو البتہ وہ ٹی ٹی منگوانے کی اجازت دے سکتے ہیں۔ بھیا نے حامی بھر لی اور ہم اس وقت سے ہر گھڑی ٹی ٹی کا انتظار کرنے لگے۔

بھیا مجھ سے اتنے بڑے نہیں تھے ہمارے عمروں میں مشکل سے پانچ سال کا فرق تھا لیکن وہ چونکہ ہم سب سے بڑے تھے۔ اس لئے میں اور میرے دونوں چھوٹے بھائی بہن انہیں بھیا کہا کرتے تھے۔ اس زمانے میں برسرِ اقتدار سیاسی جماعت نے اقلیتی فرقوں پر بڑے مظالم توڑنے شروع کر دیئے تھے اور ان دراز دستیوں کی لپیٹ میں ملک کی قومی زبان بھی آ گئی تھی۔ اردو کے حامیوں نے بلا لحاظ صوبہ و ریاست گھروں میں اردو بولنا شروع کر دی تھی اور یہ اسی سیاسی دباؤ کا اثر تھا کہ ہمارے گھر میں بڑے بھائی کو بھیا کہا جانے لگا۔ بھیا ہم سب بہن بھائیوں سے مختلف تھے۔ دبلے پتلے زردی مائل سفید رنگت کے بڑے خوش اطوار صاحبزادے تھے۔ بات بات میں لطیفے پیدا کرتے۔ قدم قدم پر نئی شرارتیں سمجھاتے اور ہنسی ہنسی میں ہمیں پٹوا دیتے۔ لیکن ان کے ارادے بُرے نہ تھے۔ خود ہی ہمیں بھُس میں چنگاری ڈالنے کے طریقے بتاتے اور آپ ہی اُسے بجھانے پر آمادہ ہو جاتے۔ ابا جی سے پٹ پٹا کر ہم ان کی خوب مرمت کیا کرتے۔ وہ ہم سے مار کھاتے جاتے اور ہنستے رہتے۔ ہم نے کبھی انہیں منہ تھتھناتے یا روتے نہ دیکھا تھا۔ نحیف الجثہ ہونے کے باوجود

بڑے عزم کے آدمی تھے جس بات کا ارادہ کر لیا اسے پورا کر کے چھوڑا لیکن ان سب خوبیوں کے باوجود ان میں ایک کمزوری بھی تھی۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ سمجھدار اور محتاط تھے۔ ان کی عقلمندی اور سمجھداری نے انہیں ابا جی کا مشیر بنا دیا تھا اور ابا جی ہر معاملے میں ان کا مشورہ طلب کرتے رہتے تھے۔ اس مرتبہ اگر وہ حامی نہ بھرتے تو ابا جی ٹی ٹی منگوانے کی اجازت کبھی نہ دیتے۔

میں جی ہی جی میں بھیا امان کا شکریہ ادا کر رہا تھا اور بھیا، دھواں دیتی ہوئی چمنی والی لالٹین کے پاس پڑھنے میں مصروف تھے کبھی کبھار وہ کتاب سے نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھتے اور میں آنکھیں بند کر لیتا۔ نہ جانے ٹی ٹی کے بارے میں میں کب تک کیا سوچتا رہا کہ مجھے نیند آگئی۔

اگلے دن صبح ہم دودھ میں مسلی ہوئی روٹی کا کٹورا بھر کر ٹی ٹی کے سامنے لے گئے اور اس کے ٹیبل مینرز کا نظارہ کرنے لگے۔ پل بھر میں اس نے کٹورہ خالی کر دیا اور کچھ اور ہے؟ جیسی نگاہوں سے ہمیں تکنے لگا۔ ہم نے اپنا سارا مواد اور لا کر اسے ڈالا اور چشم زدن میں وہ بھی ختم کر دیا گیا بھیا نے اس کے جسم سے ایک ایک تنکا چنا اور اس کی پیٹھ تھپک کر بولے "اچھا بھئی شام کو تمہاری اصل راشن کا بندوبست کریں گے" پھر انہوں نے کٹورا اٹھایا نل کے نیچے جا کر دھویا اور پھر لا کر ٹی ٹی کے پاس رکھ دیا۔ اس دن ہم سب سکول ذرا دیر سے پہنچے اور جب تک چھٹی نہ ہو گئی۔ اپنے اپنے ڈسکوں پر نشست کے انداز بدلتے رہے۔ ہر ایک کے ذہن میں ٹی ٹی کی صورت گھوم رہی تھی وہ لیٹا ہو گا اور اس کے کھنچے ہوئے کان ڈھیلے پڑ گئے ہوں گے۔ وہ بیٹھا ہو گا اور زبان نکالے ہانپے جا رہا ہو گا۔ وہ کھڑا ہو گا اور اس کی دم ادھر اُدھر جھول رہی ہو گی۔ کسی نے بھی اپنا سبق دھیان سے نہ سنا اور چھٹی ملتے ہی اپنے اپنے کمروں سے سیدھے گھر کو بھاگے۔ بھیا وہاں پہلے سے بیٹھے تھے اور ٹی ٹی کے نیچے بوریاں بچھا رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ مل کر بوریاں ٹھیک کروانے لگا اور پہلی مرتبہ ٹی ٹی کو تھپک کر دیکھا۔

شام کے وقت ہم ٹی ٹی کو سیر کے لئے لے کر نکلے۔ بیلے میں جا کر ہم نے اسے کھلا چھوڑ دیا اور وہ جھاڑیوں میں اِدھر اُدھر سونگھ کر دیوانہ وار آگے پیچھے بھاگنے لگا۔ بھیا زنجیر گھماتے۔ زور کی سیٹی بجاتے اس کا نام لے کر پکارتے اور وہ ہمارے پاؤں میں آ کر لوٹنے لگتا۔ تھوڑی دیر تک کوں کوں کر کے آواز نکالتا اور پھر بھاگ جاتا۔ میں نے خوفزدہ ہو کر کہا: "بھیا اگر یہ ہم کو چھوڑ کر بھاگ گیا تو؟"

بھیا مسکراتے اور زمین پر زنجیر کی کنڈلی بٹھاتے ہوئے بولے:۔

کتنا بڑا وفادار جانور ہے۔ اپنے مالک کو چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ نہیں جاتا۔ اور کوئی زبردستی لے جانا بھی چاہے

تو اس کو پھاڑ کھاتا ہے۔"

"اور آگے لے جانے والے کے پاس لاٹھی ہو تو؟" میں نے پوچھا

بھیا نے کہا: "لاٹھی چھوڑ بندوق ہو پھر بھی یہ اس کے ساتھ نہ جائے گا یہ تو بس جس کے گھر رہتا ہے اسی سے پیار کرتا ہے۔"

میں نے کہا: "سارے کتے ویسے ہوتے ہیں کہ صرف گل ٹریا؟"

انہوں نے زنجیر سے کھیلتے ہوئے کہا: "سارے!"

میرا جی چاہا ساری دنیا کے کتوں کو گود میں اٹھا کر ان کا منہ چوم لوں!

دوسرے روز عید تھی۔ رنگ برنگے کپڑوں کے چاؤ میں اور عیدی کی کھنک میں دن بھر ٹی ٹی کے پاس نہ جا سکا بازار میں کباب اور پکوڑے کھاتا پھرا اور دوستوں کے ساتھ اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ شام کے وقت جب میں گھر گیا تو بھیا ٹی ٹی کو لے کر سیر کے لئے نکل گئے تھے۔ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد میں پھر نکل آیا مجھے میٹھی گولیوں والی دکان یاد آ گئی تھی جہاں سیب کے بٹنوں جتنی پیسے کی بتیس گولیاں ملتی تھیں۔ دن بھر کی رقم میں سے صرف ایک آنہ باقی رہ گیا تھا اور میں تمام پونجی کا اکٹھا سٹاک خریدنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ قصبے سے باہر چنگی کے قریب صرف تیلو رام کی دکان پر ایسی گولیاں ملتی تھیں میں جلدی جلدی قدم اٹھاتا اس کی دکان پر پہنچ گیا۔ اس کی گولیوں والی بوتل کی طرف اشارہ کیا اور خود سٹول پر بیٹھ گیا۔ ابھی اس نے ستر گولیاں ہی گنی تھیں کہ بھیا ٹی ٹی کی زنجیر ہاتھ میں لٹکائے دکان پر آ گئے۔ ان کے بال نتھنوں میں اٹے ہوئے تھے اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں انہوں نے میری کلائی پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا: "ٹی ٹی بھاگ گیا۔ میں نے بیلے میں لے جا کر زنجیر کھولی تو وہ ہوا ہو گیا۔"

میں سٹول سے بجلی کی سی تیزی سے اچھلا اور تیلو رام کو گولیاں گنتے چھوڑ کر بھیا کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ پہلے تو ہم تیز تیز قدم اٹھا کر چلے۔ پھر اچانک بھاگنے لگے۔ ہر راہگیر سے ٹی ٹی کے بارے میں پوچھا۔ اس کا جواب سنا اور پھر بھاگنا شروع کر دیا۔ بیلے میں پہنچ کر میں نے اور بھیا نے زور زور سے آوازیں دیں۔ سیٹیاں بجائیں لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ ہم نے بیلے کا کونہ کونہ چھان مارا مگر ٹی ٹی کا پتہ نہ چلا۔ میں اور بھیا تھک ہار کر بیلے کی اونچی ڈھیری پر بیٹھ گئے اور میں نے ان کی طرف منہ کئے بغیر ہولے سے کہا۔ "آپ نے اسے کھلا ہی کیوں چھوڑا؟"

بھیا نے بڑی سنجیدگی سے کہا: "یہ کل بھی تو چھوڑا تھا، اس وقت تو نہ بھاگا آج پتہ نہیں . . . ."

میں نے بات کاٹ کر کہا: "کل تو وہ نیا نیا آیا تھا، بیلے کا راستہ معلوم نہ تھا۔ بھاگتا کیسے؟"

بھیا نے کہا وہ بھاگا نہیں، اسے کوئی پکڑ کر لے گیا ہے۔"

میں نے تنگ آ کر کہا: "کل تو آپ کہتے تھے کتے کسی اور کے ساتھ جاتے نہیں اور کوئی لے جانے لگے تو اسے پھاڑ کھاتے ہیں۔"

بھیا نے کہا: "ہاں میں تو اب بھی یہی کہتا ہوں۔ کوئی آدمی اس کا منہ باندھ کر لے گیا ہے۔ جونہی کھولے گا ڈی ڈی اس کی گردن پکڑ لے گا۔"

میں نے سنی ان سنی کر کے کہا: "آپ کیا سمجھتے تھے اس کے چچا نے ہم چھوٹوں کے لئے بھیجا تھا۔ آپ خواہ مخواہ مالک بن کے بیٹھ گئے۔"

پھر میں لسورنے لگا: "آپ کو تو ہم اچھے نہیں لگتے۔ پھر ہمارا کتا کیوں لگتا بھلا۔ آپ نے جان بوجھ کر اسے بھگا دیا ہے۔ آپ نے اپنے حصہ کی روٹی نہ دینے کے لئے اسے بھگایا ہے آپ کے حصہ کی . . . آپ کے . . . حصے کی روٹی . . . . . روٹی میں دے دیتا . . . . . میں . . . . . " پھر میں سسکیاں بھرنے لگا اور بھیا نے مجھے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ میں نے ان سے علیحدہ ہوتے ہوئے کہا: "ہمارا کتا گنوا کر ہم سے کیوں پیار کرتے ہیں آپ جہاں ہمارا ڈی ڈی بھیجا ہے مجھے بھی وہیں بھیج دو۔ جس کے پاس اس کو بھیجا ہے مجھ کو بھی بھیج آؤ۔" پھر میں بھیا کی گرفت سے آزاد ہو کر ان کے پاؤں پر جھک گیا اور رو رو کر کہنے لگا: "لو چاہے جتنا مرضی مار لو جتنا مرضی پیٹ لو۔ ڈی ڈی کو گنوا کر بھی خوش نہیں ہوا تو مجھے پیٹ کر خوش ہو جاؤ . . . . . لو چاہے مجھے مار مار کر مار ہی ڈالو . . . . چاہے . . . . . لو"

میں ان کے پاؤں گھسیٹتا چلا گیا اور ایسے واہی تباہی بکتا رہا۔ بھیا نے نہ تو میری کمر میں اپنا بازو ڈالا اور نہ میری تھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر مجھے سہارا دیا۔ جب میں نے سر اٹھایا تو بھیا سامنے شیشم کی اونچی ڈالیوں پر نگاہیں گاڑے بیٹھے تھے اور ان کی آنکھوں سے موتیوں ایسے شفاف آنسو ڈھلک رہے تھے۔

اگلے دن سے ڈی ڈی کی باقاعدہ تلاش شروع ہو گئی صبح اسکول پہنچتے ہی ہم دونوں بھائی اپنے اپنے بستے ڈسک فیلوز کے سپرد کر دیتے اور ڈی ڈی کی تلاش میں نکل جاتے۔ بیلے کے ارد گرد تین تین چار چار میل کا رقبہ ہم نے انچ انچ چھان مارا۔ ہر راہ چلتے، ہل چلاتے، اونٹ لادے جانے والے سے ڈی ڈی کی بابت پوچھتے مگر کوئی اتہ پتہ اس کا معلوم نہ ہوا۔ لالٹین کے گرد بیٹھ کر ہم رات بھر اسی کا تذکرہ کرتے رہتے۔ اس کی صفات بیان کرتے سو جاتے اور اسی کا نام لے کر اٹھتے۔

بیلے کے ارد گرد تلاش کرنے کے بعد ہم نے گرد و نواح کے گاؤں کا دورہ کرنے کی ٹھانی۔ دوسرے سپر میں بھیا

امرت کا لڑکے کی بائیسکل لے آئے مجھے کیرئیر پر بٹھایا اور خود چلانے لگے۔ کچے پکے راستے کچھ سائیکل پر طے کئے کچھ پیدل ندیاں نالے بڑی مشکل سے عبور کئے اور جب ہم پہلے گاؤں میں داخل ہوئے تو فارم کے قریب ہمیں ایک نوجوان جاٹ ملا اور جسے ہم نے کئی مرتبہ قصبے میں دیکھا تھا ہمیں دیکھ کر وہ ٹھٹکا اور مسکرا کر پوچھنے لگا: "شہری چڑیوں کی جوڑی ادھر کیسے بھول گئی۔"

بھیا نے سائیکل سے اتر کر کہا: "ہمارا کتا گم ہو گیا ہے اور ہم اس کی تلاش میں یہاں آئے ہیں۔"

میں نے جلدی سے کہا: "گل ٹریا تھا یکڑے کانوں والا گل ٹریا۔ دو دن ہمارے پاس رہا اس کے بعد ہیلے سے کوئی چرا کر لے گیا۔"

وہ شرارت سے مسکرایا اور ہماری طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"میرے پاس تو کالا ڈبو ہے وہ چاہو تو لے سکتے ہو۔"

بھیا کچھ سہم گئے۔ میں کچھ بولنے والا تھا کہ انہوں نے میری آستین پکڑ کر کھینچا اور گھبراہٹ میں گویا مجھے گھسیٹتے ہوئے لے چلے۔

گاؤں کے اندر پہنچ کر ہم نے نمبردار کا گھر دریافت کیا۔ اس سے پوچھا تو اس نے تلخی سے کہا: "یہ دھانوالی ہے کانجی ہاؤس نہیں اور اگر تم اس گاؤں کے لوگوں کو چور سمجھتے ہو تو جا کر پولیس میں رپٹ دے دو" ہم اپنا سا منہ لے کر واپس آ گئے لیکن ہمارے حوصلے نہ ٹوٹے اور ہم نے تلاش اسی طرح سے جاری رکھی۔ ہر گاؤں میں مختلف قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مگر ہم بھی نہ چھوڑتے اور ہر گھر میں جھانک کر دیکھ لیتے۔ کئی مرتبہ ہمیں سائیکل نہ مل سکی تو ہم نے کئی کئی کوس کی مسافت پیدل طے کی۔ اگر بھیا کبھی مایوس ہو جاتے تو میں ان کا حوصلہ بڑھاتا اور کہتا۔ "ایک مرتبہ پتہ چل جائے کہ ٹی ٹی ہے کس کے پاس۔ پھر چاہے وہ لاٹ صاحب کا بچہ ہو ______ یا وائسرائے ہو۔ ہم اپنا ٹی ٹی نہ چھوڑیں گے لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ اس کا پتہ ہی نہیں چلتا۔"

پھر میں کہتا: "بھیا آدمی نہ سہی۔ اس گاؤں کا ہی پتہ چل جائے جہاں ہمارا ٹی ٹی ہے۔ پھر دیکھنا کیا ہوتا ہے۔"

بھیا میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے تو میں کہتا: "اس گاؤں کو میں آگ لگا دوں گا۔ اپنی کلاس ساتھ لا کر فصلیں اجاڑ دوں گا۔ اس پہ بھی انہوں نے ٹی ٹی نہ دیا تو افضل کے اباجی سے کہہ کر تھانے پکڑوا دوں گا۔" اور بھیا ٹھنڈی سانس لے کر کہتے ______ "مشکل تو یہی ہے کہ اس کا پتہ نہیں چلتا۔"

ایک رات ہم ایسی ہی باتیں کر رہے تھے کہ بھیا نے کہا: "جس گاؤں میں ہم پہلے روز گئے تھے۔ میرا خیال ہے ٹی ٹی

دہیں ہے۔"

میں چونکتا ہو کر بیٹھ گیا اور بھیا سے پوچھنے لگا: "آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ آپ نے ٹی ٹی کو وہاں دیکھا تھا۔"

"دیکھا تو نہیں تھا۔" بھیا نے کہا: "مگر وہ آدمی جو گاؤں سے باہر ہمیں فارم کے پاس ملا تھا۔ چور معلوم ہوتا تھا۔ تمہیں پتہ ہے وہ ہمیں مذاق کر رہا تھا۔ میرا جی کہتا ہے اس نے ٹی ٹی کو چھپا رکھا ہے اور شام کے وقت اسے سیر کرانے کے لئے باہر نکالتا ہے۔"

میں نے کہا "ہاں وہ چور ہی لگتا تھا۔ چوری چھپانے کے لئے بار بار مسکراتا تھا۔ میرا بھی جی کہتا ہے ٹی ٹی اسی کے پاس ہے۔"

رات بھر ہم اسی قسم کی باتیں کرتے سو گئے اور اگلے دن شام کو ابا جی کی الماری سے پستول نکال کر پیادہ اس گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ سورج غروب ہونے سے پہلے ہم نے اپنے آپ کو فارم کے ایک محفوظ کونے میں چھپا لیا اور گاؤں سے آنے والے راستے پر اپنی نگاہیں جما دیں۔ لوگ آ جا رہے تھے لیکن ان میں وہ کالا ڈبو نہیں تھا جس کی مسکراہٹ اس کے چور ہونے کی غمازی کرتی تھی۔ بڑی دیر تک ہم اسی طرح بیٹھے رہے۔ میں نے پستول بھیا کے ہاتھ سے لے لیا اور انہیں کہا کہ وہ ہر آنے والے کو غور سے دیکھتے رہیں۔ جونہی وہ آدمی ٹی ٹی لے کر ادھر سے گذرے مجھے ٹہوکا دے کر ہشیار کر دیں اس کے بعد میں جانوں اور میرا کام۔ گو اس سے پہلے میں نے پستول کبھی نہ چلایا تھا اور نہ ایسا کرنے کی ہمت ہوئی تھی مگر مگر اس دن مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میں صرف اسی کام کے لئے پیدا ہوا ہوں اور کام صرف مجھی سے انجام کو پہنچ سکے گا۔ ہم رات تک اس بد ذات چور کا انتظار کرتے رہے پر وہ برآمد نہ ہوا۔ شاید اس کو ہمارے ارادے کا علم ہو گیا تھا اور وہ ہم سے ڈرنے لگا تھا۔

کتنی رات گذر جانے کے بعد ہم گھر پہنچے۔ بھیا جان کو ہولے سے آواز دے کر دروازہ کھلوایا اور پستول واپس الماری میں رکھ کر اپنے اپنے بستروں میں دبک گئے۔ ہر رات سکیمیں بنائیں اور دن کے وقت ان پر عمل بھی ہوتا رہا مگر ٹی ٹی نہ ملنا تھا نہ ملا۔ آخر ایک رات ہم نے دو رکعت نفل ادا کر کے یہ دعا مانگی کہ اللہ میاں اگر وہ زندہ ہے تو صبح تک آپ سے آپ ہمارے پاس پہنچ جائے اور اگر مر گیا ہے تو یہ سارا ثواب اس کی روح کو پہنچے۔ دعا کرنے کے بعد ہم اپنے اپنے سینوں پر پھونکیں مار کر سو گئے۔ کئی صبحیں آئیں اور گذر گئیں مگر ٹی ٹی نہ آیا۔ محلے میں دن رات بہت سے کتے بھونکتے رہے مگر کسی میں بھی ٹی ٹی کی کھوں گرچ پیدا نہ ہو سکی۔

اور آج کئی سالوں کے بعد یہ سارا واقعہ میرے ذہن میں پھر تازہ ہو گیا ہے۔ اس وقت میں چچا ابا کے گھر تیسری منزل

کی چھت پر بیٹھا ہوں اور نیچے پھولوں سے لدی پھندی ایک کار سرخ و سبز جھنڈیوں تلے کھڑی ہے۔ اس کے
ارد گرد بہت سے بچے زرق برق لباس پہنے اچھل کود رہے ہیں۔ ڈوبتا ہوا سورج برو کیڈ کی اچکن میں سنہری کرنیں
سن رہا ہے اور اچکن والا بڑی بے صبری سے سگریٹ کے کش لگائے جاتا ہے مجھے معلوم ہے کہ جس چھت پر میں کھڑا ہوں
عین اس کے نیچے چھوٹے سے کمرے میں بھیا اپنی منحنی سی ٹانگیں میز پر رکھے کرسی میں دراز ہیں ان کے بائیں پاؤں پر ٹخنے
کے نیچے مخملی پھوڑے کا ایک پرانا نشان ہے جو مسکراتے ہوئے بچے کا چھوٹا سا چہرہ لگتا ہے۔ بھیا اپنے بالوں کو
پنسل سے کریدر ہے ہیں۔ ایک کتاب ان کی گود میں کھلی پڑی ہے۔ اور وہ بھی میری طرح کھڑکی سے نیچے جھانک رہے
ہیں جہاں پھولوں سے لدی پھندی کار کے پاس برو کیڈ کی اچکن پہنے ایک سیاہ فام نوجوان کھڑا ہے۔ جو لڑکی اس کار
میں سوار کرانے کے لئے لائی جا رہی ہے بھیا نے اس کے بارے میں کبھی کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ لیکن مجھے ان کی ڈائری
کا ایک ورق یاد آ رہا ہے۔ ان کی الماری کھلی رہ گئی تھی وہ اپنے طلبا کو تاریخی عمارات کی سیر کرانے لے گئے تھے۔
اور شام سے پہلے نہ لوٹ سکتے تھے۔ میں نے ان کی ڈائری نکال کر جلدی جلدی پڑھنا شروع کر دی شکستہ انگریزی
میں انہوں نے ایک ایک تاریخ میں کاپی کے متعدد صفحات سیاہ کر رکھے تھے۔ انہوں نے لکھا تھا ــــــ "دن بڑا سہانا
ہے، ہم صبح کیرم کھیلتے رہے مجھے اچھے اچھے لطیفے سنا کر خوب ہنساتی رہی۔ پھر میں "انڈیلیٹ" کے مختلف
اقتباسات اسے سناتا رہا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام رکھا تھا اور میرے چھلے کو میری انگلی میں گھمائے جاتی
تھی۔ میں نے پڑھنا بند کر کے کہا" زیور عورتوں کی جان ہوتا ہے دیکھو تم کس محبت اور شوق سے چھلے کو گھما رہی ہو اور
تمہیں شاید اس کا علم بھی نہیں کہ تم کیا کر رہی ہو۔ اس نے بُرا مان کر ہاتھ فوراً روک لیا اور میری طرف مڑ کر بولی تم سمجھتے ہو
میں ہر انگلی کے چھلے کو اس طرح گھماؤں گی کیوں کہ میں عورت ہوں اور عورت کو زیور عزیز ہوتا ہے؟" میں نے ڈرتے ہوئے
کہا، "ہاں" ت نے کہا: "خیر ہم ایسے کنگال بھی نہیں۔ میں نے ایسے بہت سے چھلے دیکھے ہیں لیکن انہیں اس طرح
پھرانے کی تمنا کبھی میرے دل میں پیدا نہیں ہوئی۔ پھر وہ ذرا رک کر بولی" اگر اس انگلی میں گھاس کا چھلا بھی ہوتا تو بھی میں اسی
شوق سے گھماتی" آگے بھیا نے لکھا تھا "آج مجھے یوں لگتا ہے جیسے کائنات کی سب سے معزز ہستی ہوں۔ جاندار وں
میں سب سے محترم ہوں میرا جی اپنی عزت آپ کرنے کو چاہتا ہے اور مجھے چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے ایسے لگتا ہے جیسے
حضوری کے تمام آداب مجھ میں سمٹ آئے ہوں۔ ت دوسری لڑکیوں سے کس قدر مختلف ہے۔ اسے دنیوی مال و منال
اور جاہ جلال کا ذرا بھی تو پاس نہیں"۔

میں چھت پر سے نیچے جھانک رہا ہوں اور بھیا بھی کھڑکی میں سے اسی گرد و کا نظارہ کر رہے ہیں جس پر میری نگاہیں

لگی ہوئی ہیں۔ ست مُرخ رنگ کی مسالہ ٹکی اوڑھنی اوڑھے عورتوں کے جلو میں کھڑی ہے برد گنڈی اچکن والا پھولوں کی لڑیاں ایک طرف ہٹا کر کار کا دروازہ کھول ہے اور گل ثریا بڑے حجاب اور بڑی لچک کے ساتھ اندر داخل ہو رہی ہے اس نے سر جھکا کر کار میں ایسے قدم رکھا جیسے وہ بھیا کو جانتی ہی نہیں۔ آج میرے پاس میرا اپنا پستول ہے لیکن دخل نہیں سکتا۔ اس وقت میری آنکھوں کے سامنے کالا ڈبو گل ثریا کو لئے جا رہا ہے اور میں اپنے پیارے بھیا کی مدد نہیں کر سکتا وہ بھیا جو آج بھی ہم سے اتنا ہی پیار کرتے ہیں جتنا بچپن میں کیا کرتے تھے۔ وہ جو کمرے میں ہنزبرٹ ٹانگیں رکھے یہ سب دیکھ رہے ہیں اور جن کے ٹخنے کے نیچے مغلئی موڑے کا ایسا مسکراتا نشان ہے جسے خواہ مخواہ چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ ابھی کار چلے گی اور بھیا کے پاس ایک ڈائری رہ جائے گی جیسے ڈی ٹی کے گم ہو جانے پر ہمارے پاس اس کی زنجیر رہ گئی تھی۔

سو گڑیاں

الطاف فاطمہ

تب وہ دن بھر کی تھکی ماری دبے پاؤں اس کوٹھڑی کی طرف بڑھتی، جہاں دن بھر اور رات گئے تک کام خدمت میں مصروف رہنے کے بعد آرام کرتی، اور پھر ایک بار ادھر ادھر نظر ڈالنے کے بعد کہ آس پاس کوئی جاگتا یا دیکھتا تو نہیں، وہ کوٹھڑی کے کواڑ بند کر لیتی، طاق پر سے ڈبہ اٹھاتی، اور کھول کر کوٹھڑی کے بیچوں بیچ دھر دیتی، اور پھر یکے بعد دیگرے گڑیاں نکل نکل کر اپنے اپنے کار سے لگ جاتیں۔ پہلے سقہ آتا، اور پانی چھڑک جاتا۔ پھر حاکروب آتا، اور جھاڑو لگا جاتا۔ فراش فرش بچھاتا۔ مسند تکیہ لگاتا، محفل سج جاتی، سب سو گڑیاں زرق برق لباسوں میں نمودار ہوتیں، اور رقص و سرود، ناؤ نوش کی محفل گرم ہوتی۔ تمام رات یوں گزرتی، اور صبح کا ستارہ ڈوبنے سے پہلے سو گڑیاں بے دم ہو کر گر پڑتیں۔ محفل درہم برہم ہوتی، اور جو جہاں ہوتا، وہیں رہ جاتا۔

تب وہ بی بی سرد آہ بھرتی۔ گڑیوں کو سمیٹ کر ڈبے میں رکھتی، اور کہتی:

"جو بی بی تھی، لونڈی بنی، جو لونڈی تھی سو بی بی بنی۔"

تو بس میں یہ کہانی یہیں تک سن پاتا تھا کہ بے سدھ ہو جاتا تھا۔ ہر رات میں نے اس امید پہ یہ کہانی سننے کی ضد کی۔ کبھی تو سو گڑیوں کے انجام تک کہانی پہنچے ہی گی، اور ہر رات میں اس بی بی کے اس فقرے تک پہنچتے پہنچتے قصہ کہانی اور پریوں کے اصل دیس یعنی خواب کی دنیا میں پہنچ جاتا۔

اور اب ذہن میں اتنی دیکھی اور ان دیکھی، سنی اور ان سنی کہانیاں گڈمڈ ہیں کہ میں خود یہ تمیز نہیں کر پاتا کہ ان میں سے کون سی کہانیاں میں نے سنی ہیں، اور کون سی دیکھی ہیں۔ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ میرے اندر اب حقیقتیں بھی کہانی بن کر آتی ہیں، اور اب نہیں کہہ سکتا کہ آگے جو بات میں بیان کروں گا وہ کس کہانی، کس داستان کا حصہ ہے۔ یہ کہانی اگر مجھے کسی نے نہیں سنائی، تو پھر یہ میرے اندر کہاں سے آئی ہے۔ اور یہ قصہ

میرے اندر کچھ اس انداز میں سر اٹھاتا ہے۔

"وہ کہ اس ریگستان میں وحشت نوردی کرتا تھا۔ بھوک لگتی تھی تو کھجور کے چند دانے نوش فرماتا، اور چھاگل سے چند گھونٹ پانی لے کر حلق تر کرتا، اور پھر آسمان کی طرف منہ اٹھا کر دیکھتا ہی چلا جاتا کہ ایسے ویرانوں میں آسمان اور بھی نیلا اور پُراسرار نظر آتا ہے .... پھر یوں ہوا کہ ایک صبح وہ یونہی فرش ریگ پر پاؤں پھیلائے بیٹھا تھا کہ پچھم یعنی مغرب کی جانب سے ایک آہنی چڑیا پرواز کرتی ہوئی اس طرف آئی، اور حدِ نظر کے اس طرف ٹھہر گئی۔ پھر ایک مرد سفید فام گندم گوں بالوں اور کنجی آنکھوں والا اس کی طرف تیز قدموں چلتا ہوا آیا...

اور اس کی پھیلی ہوئی ٹانگ کو اپنی چھڑی سے چھو کر یوں گویا ہوا۔

اے جوانِ رعنا۔ یوں ٹانگ پسار کر بے فکری سے بیٹھا ہے۔ اُٹھ کر تیری دولت اس ریگ زار کے قلب میں موجیں مار رہی ہے اٹھ کر تیری جبیں ستارۂ ہوش مندی ... نہیں میں بھولا۔ ستارۂ مراد مندی سے دمک رہی ہے۔ اے حاتم! مژدہ ہو کہ تو دونوں ہاتھوں سے دولت لٹائے گا، اور اپنے کاسۂ فلسوں کی کھڑ کھڑ آواز کا تماشہ کرے گا۔

تب وہ جوان نہایت حقارت سے یوں گویا ہوا کہ تیری تمام باتوں سے جھوٹ اور مکر کی بُو آتی ہے۔ اوّل تو یہ کہ یہ عاجز عمر کے اس دور کو طے کر چکا ہے اجبکہ اس کو جوانِ رعنا کے لقب سے مخاطب کیا جائے۔ دوم یہ کہ تو نے مجھے حاتم کے نام سے پکارا کہ حاتم نام ایک شخص ہو گزرا ہے۔ بہت پہلے قبیلۂ طے میں کہ اس کی داد و دہش کا چرچا سارے مشرق میں ہے کہاں حاتم طائی، کہاں یہ عاجز دبے نوا، تب وہ سفید فام اس کی حقارت پر بڑے صبر سے مسکرایا، اور گویا ہوا مردِ دانا کی بات کو مان۔ چون و چرا سے کام نہ لے۔ تیرے حصّے کی دولت اور رعنائی کو ڈھونڈنا میرا کام ہے، اور تیرا کام فقط اس کو دونوں ہاتھوں سے لٹانا اور اس درجہ پھینکنا ہے کہ حاتم طائی کو بھی شرما دے تو مجھے فقط اتنی اجازت دے کہ میں تیری دولت کی تلاش میں کنوؤں میں بانس ڈالوں، اور ان کو اچھی طرح کھنگالوں۔"

تو بس یہ کچھ اسی قسم کا نقشہ تھا جو کچھ دن سے میرے تحتِ شعور یا نہ معلوم کون سے شعور میں بھٹک رہا تھا۔ مگر ان دنوں کہ جب میں ابھی کالج میں زیرِ تعلیم تھا، اور گریجویشن کی تیاری کر رہا تھا میرے خیال میں کبھی نہ آتا تھا۔ اور پھر جب میں نے امتحان میں تھرڈ ڈویژن لی۔ جب بھی ذہن کے کسی گوشے سے کبھی اس گوشے نے سر نہ اٹھایا، تو خیر اس وقت کی بات اور تھی، اور میرے وہم و گماں میں بھی نہ تھا کہ میری یہ تھرڈ ڈویژن اونٹ

کے گلے کی بلّی بن جائے گی۔ پھر پے درپے مجھ پر یہ انکشافات ہوئے کہ کلرکی کی جس پوسٹ کے لئے میں نے درخواست خود ٹائپ کی تھی، اس کے لئے پانچ سو فرسٹ، بارہ سو سیکنڈ اور ہزاروں تھرڈ ڈویژن والے خواہاں تھے۔ چنانچہ اس پوسٹ کو اس لئے ابالش کر دیا گیا کہ جب ایک انار سو بیماریوں کی چارہ گری نہیں کر سکتا، تو اس کو دریا برد کر دینا ہی مناسب ہے۔ کلرکی کی اس نایاب پوسٹ کے علاوہ میں نے بحری، برّی اور فضائی افواج کی بھرتی کے دفاتر سے بھی ہر قسم کے فارم حاصل کر کے پُر کئے تھے کہ سنا تھا کہ یہاں بھرتی کا بازار گرم اور نفری کی مانگ شدید ہوتی ہے۔ مگر وائے ناکامی اور ان دفاتر کے یکے بعد دیگرے کئی انٹرویو دینے کے بعد مجھ پر چند ضروری انکشافات ہوئے، یعنی یہ کہ میری نظر حد سے زیادہ کمزور ہے، اس لئے کم پاور والے بلب میں رات گئے تک غلط رُخ بیٹھ کر پڑھنے کی بناء پر میری عینک کے شیشوں کے نمبر نفی کی جانب زیادہ مائل ہیں۔ پھر یہ کہ میرا قد کاٹھ چھوٹا نکلتا، یا پھر ضرورت سے زیادہ لمبا نکلتا۔ اسی طرح میرا وزن بھی غیر معتدل پایا گیا، اور ان کے علاوہ جو میں نے پرائیویٹ انٹرویو دیئے، ان کے نتائج حسب ذیل رہے:

۱ : اس پوسٹ پر سلیکشن تو پہلے ہی ہو چکا تھا، اور یہ اشتہار تو فقط یہ جائزہ لینے کے لئے دیا گیا تھا کہ ملک میں بے روزگاری کے اعداد و شمار کیا ہیں۔

۲ ۔ آپ کو دھکا دے کر اس دروازے میں داخل کرنے والا کوئی نہ تھا۔

۳ ۔ عرصے تک بیمار رہنے کی بناء پر آپ کے اعصاب مشتقل یا پھر مضمحل ہو چکے ہیں، اور ایسی صورت میں ہم آپ کو ملک و قوم کی خدمت کا اہل نہیں سمجھتے۔

خلاصہ یہ کہ ہمیں افسوس ہے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ افسوس تو مجھے بھی تھا کہ اب مجھ میں سوتیلے چچا کی وہ چبھتی ہوئی نظریں برداشت کرنے کی قوت بھی گھٹتی جا رہی تھی۔ وہ مجھ پر اس لئے ڈالتے تھے کہ میرے دونوں ٹیوشنوں کی مجموعی آمدنی صرف تیس روپے بنتی تھی، اور یہ کہ مکان کا سارا کرایہ ان ہی کو دینا پڑتا تھا۔ ہم نے بجلی کے بل بھی ایک مدت سے ادا نہیں کئے تھے، اور سب سے زیادہ یہ کہ جب ہم ماں بیٹا ان ہی کی چھت تلے بیٹھ کر بغیر بگھری دال سے تندوری روٹیاں کھاتے تھے، تو ان کے وقار کو صدمہ پہنچتا تھا۔ چنانچہ وہ میرے دل سے بہی خواہ تھے، اور یہ ان کی دلی آرزو تھی کہ میرے کھانے میں کم سے کم ذائقہ اگر ہی شامل ہو۔

تو یہ ٹھیک ہی تھا کہ وہ ان دنوں میری ماں پر بُری طرح گرجتے برستے تھے کہ اپنے ساتھ لڑکے کا دماغ

بھی عمر نس سٹی پر پہنچا رہی ہے ، اور جو یہ سوچو کہ میرے لڑکے کی برابری کرو ، تو میرے لڑکے کی بات اور ہے
میں نے ان پر احسان کیا تھا۔ بس احسان ہی سمجھو۔ وہ احسان کی تفصیلات میں جانے سے انکاری تھے۔
تو انہوں نے یہ گرما گرمی جن دنوں دکھائی ، ان دنوں شہر میں ایک عجیب و غریب ہوٹل کھلنے کا چرچا تھا ،
کہ اس کے متعلق جو بھی بات سنی ، ایسی کہ یقین نہ آئے۔ ایسے جیسے احمقوں کی خیالی جنت کی بات ، اور چچا نے
اپی یا میری اس جنت کا ذکر کئی دن اس طرح لگاتار کیا کہ مجھے ان کی اور اپنی دونوں ہی کی دماغی صحت پر شک
ہونے لگا ۔ اور پھر ایک دن وہ آیا کہ وہ میری ماں پر پچھلے تمام دنوں سے زیادہ بڑھ چڑھ کر گرجے برسے ، اور
پھر انہوں نے ان کو دھمکی دی کہ عدم تعاون کی صورت میں ان کا آخری فعل یہ ہوگا کہ وہ ہمارا سامان اٹھا کر گلی
میں پھینک دیں گے۔

چنانچہ پھر خشک ہونٹوں ، سوکھی آنکھوں اور تھرتھراتے جسم کے ساتھ ماں نے عہد کیا کہ وہ جس بات میں
ان کا تعاون مانگتے ہیں ، وہ ان کو ملے گا۔ البتہ بات تو پتہ چلے کہ کیا ہے۔

چنانچہ وہ بات یہ پتہ چلی کہ بھرتی ہونے کے بعد میں اپنا چھوٹا سا ٹرنک اٹھا کر تیز گام کی تلاش میں اسٹیشن
کی جانب روانہ ہوا ، تاکہ بڑے شہر جاکر اس بڑے ہوٹل میں ویٹر اور ٹبلر کی باقاعدہ تربیت لینے اور بحیثیت
اپرنٹس کام کرنے کے بعد یہاں واپس آکر اپنے اس معزز عہدے کا چارج سنبھالوں کہ ایک تھرڈ ڈویژن میں پاس
گریجویٹ تو اس تنخواہ کا تصور خواب و خیال میں بھی نہیں کر سکتا۔

تب میں نے اس شہر کی جاگتی جگاتی راتوں میں بارہا سونے گڑیوں کی کہانی کو نہیں معلوم کہ سنا دیکھا یا سوچا
تھا ، اور میرا خیال تھا کہ یہ سونے گڑیاں اور ان کا خیال مجھے فقط اسی شہر کی روشن راتوں میں ستاتا ہے ، جس کی
سڑکیں اور شاہراہیں دن کو نسبتاً خاموش اور چپ چاپ نظر آتی ہیں۔

میں اس نئی زندگی میں خاصا فٹ ہو گیا تھا ، اس لئے کہ اب وہ سیٹ پر سے گھسی ہوئی پتلون میں نے
ایک سائل کو دے دی تھی ، اور مارکیٹ کی دوکانوں میں بھی سے بنے والی کئی پتلونیں اب میری اپنی ملکیت تھیں ، اور
پھر یہ کہ ٹریننگ اور کام کے دوران ہم کو عجیب و غریب قطع کی اور رنگوں کی یونیفارم پہننے کو ملتی تھیں ، جن میں ہمارے
رنگ روپ تو خاصے چمک جاتے تھے۔ لیکن ان کو پہن کر ہم میں سے اکثر کو اپنے اسکول اور کالج کے دنوں میں
مسخروں اور احمقوں کے وہ بہروپ اور لباس یاد آجاتے تھے ، جن کو پہن کر ہم کالج اسٹیج پر دندناتے پھرتے
تھے ، اور ناظرین پر اپنے ٹیلنٹ (TALENT) کی دھاک بٹھایا کرتے۔ چند خر دماغ لڑکے ہمارے تربیتی

گروپ میں ایسے بھی شامل تھے جو اس رنگا رنگ یونیفارم کو نہ پہننے اور محض سفید قمیض پتلون میں سروس کرنے پر مصر ہوئے۔ یہ ایک اچھا خاصا ہنگامہ رہا، تاوقتیکہ ان کے ہاتھوں میں برخواستگی کے پروانے نہ تھما دیئے گئے۔ ہم سبوں نے ان کو حیرت کی نظر سے دیکھا کہ وہ اپنی مارکیٹ سے خریدی پتلونوں کے بنڈل سمیت اس وسیع و عریض شہر کی سڑکوں پر دھکے کھانے روانہ ہو گئے۔

چنانچہ ایک دن ایسا بھی آیا کہ میں چند سو روپوں کے علاوہ کٹ پیس کے کئی اچھے ٹکڑوں اور احمد کے حلوے سمیت پھر اپنے شہر واپس آیا، اور دوسرے دن اپنی والدہ سمیت اس موجودہ فلیٹ یعنی دو کمروں میں منتقل ہو گیا۔

اس فلیٹ کے فرش صاف ہیں، اور اس میں ایک نئے بنے ہوئے قسمت خانے میں کئی طرح کی کھانے کی چیزیں رکھی مل جاتی ہیں۔ دیوار میں جو الماریاں ہیں، اس میں پانچ کے کپڑے یعنی میرے اپنے خریدے اور سلوائے ہوئے لباس موجود ہیں۔ مگر اب قصہ یہ ہے کہ اب فرزانہ مجھ سے نہیں ملتی۔ پہلے وہ چچا کے گھر آتی تھی تو میں اس کے ڈر سے اپنے پرانے جوتے اور خستہ کوٹ چھپاتا پھرتا تھا، اور اب تو میرے دو جوڑے جوتے سامنے ہی شو ریک پر رکھے رہتے ہیں، اور میرا اوور کوٹ سامنے کھونٹی پر ٹنگا ہوا ہے۔

مگر فرزانہ بدستور ناراض ہے۔

وہ مجھے ملتی تو میں اس سے کہتا، آؤ میں تمہیں سون گڑیوں کی کہانی سناؤں۔ مگر یہ کچھ ایسا چلتا پھرتا وقت ہے کہ کون کسی کی سنتا ہے، اور کون سننے کے قابل بات بولتا ہے۔ اور اب تو مجھے اتنی بھی تمیز نہیں کہ کون سی کہانی سنی تھی، کون سی دیکھی تھی، اور کون سی خود سوچی تھی۔

زندگی کی روا روی میں ساری کہانیاں گڈمڈ ہو رہی ہیں، اور ہم صبح سے رات تک مختلف شفٹوں کی شکل میں رنگ برنگی مسخری وردیوں میں بے تحاشا کھانوں سے لبریز ظروف سے لدی پھندی میزوں کے ارد گرد منڈلاتے، اور کھانے والوں کو چندھیاتے رہتے ہیں، جو اس نگر میں رہتے ہیں کہ کس طرح اپنے دس روپے فی کس کو زیادہ سے زیادہ وصول کریں۔

ہم یہاں کھانے والوں کو چندھائیں، یا پھر ان کے سامانوں اور مقفل کمروں کے رکھ رکھاؤ کا خیال رکھیں، جو ادھر سوئمنگ پول کے ادھر ادھر رنگ برنگی کرسیوں پر کم لباسی اور بے فکری کے ساتھ دھوپ میں پڑے [illegible] ہو رہے ہیں، یعنی اپنے آپ کو بھورا کر رہے ہیں، مگر کیوں؟ گندم گوں بالوں، کنجی آنکھوں

والے سفید فام کس خبط میں مبتلا ہیں؟ میں نے ابھی ابھی سوچا تھا، اور ساتھ ہی میرے ذہن میں وہ کہانی ابھری ہے۔ میں اور میرے ساتھی جو ہر وقت اس خوف میں مبتلا ہیں کہ کبھی کہیں ان میزوں پر آ کر وہ لوگ نہ بیٹھ جائیں، جو ہمارے ہم جماعت، ہم پیالہ و ہم نوالہ ہوا کرتے تھے، تو پھر اس خیال سے بچنے کے لئے ہم خوب سوچتے ہیں، حتیٰ کہ چیزیں جو ہمیں پکڑائی جاتی ہیں، ہمارے ہاتھوں سے پھسل پھسل جاتی ہیں

تو چنانچہ پھر وہ کہانی یوں گندھ ہوئی کہ ان دنوں میں حاتمِ دوراں کی آمد آمد کا غلغلہ بلند ہوا کہ اس کو کسی مرد دانا نے مژدہ دیا تھا اور دولت کو دونوں ہاتھوں سے لٹانے کی تلقین کی تھی۔ پھر اس کا شکار یہ ٹھہرا کہ سردیاں گرم مشرقی علاقوں کے سیر و شکار میں گزرتیں، اور گرمیاں ارضِ مغرب کے نشاط خانوں میں اور باقی وقت اسی ویرانے میں شکرے سے چڑیوں کے شکار میں گزر جاتا، لیکن اس کے ارد گرد لوگ جمع رہتے کہ وہ اہلِ طمع کا تماشہ کرے

چنانچہ وہ جوانِ رعنا کہ اپنی عمر کے چالیس سے اوپر کئی سال گزار چکا تھا، آیا، اور بڑی شان سے آ، پھر اس نے اہلِ طمع کا تماشہ کیا، اور ہم نے اس کا اور سب کا تماشہ کیا کہ اس دور کے حاتم کا دستور بھی نیا تھا۔

کہ جس کے پاس ہے، اس کو دیا جائے گا۔

چنانچہ جس کے پاس تھا، انہوں نے اس کے گرد حلقے کو تنگ کیا، اور پھر اس حلقے میں سون گڑیوں کا عمل دخل ہوا کہ نئے حاتم کے ارد گرد حلقہ ڈالنے والوں اور مصاحبین کو محفلِ طرب بھی جمانا تھی۔

چنانچہ سون گڑیوں کی کہانی میرے ذہن میں یوں گندھ ہوئی کہ اب آدھی رات کو کوئی بی بی ڈیرہ نہ کھولتی۔ بلکہ یوں ہوتا کہ آدھا پہر دن گزرنے کے بعد ہم از سرِ نو میزیں سجاتے۔ پھول دانوں کے پھول بدلتے مشروبات کے دور تیار کرتے، اور تب وہ مردِ حاتم اور اس کے ساتھی نیچے آتے، اور سون گڑیاں از خود نظر فریب اور دلربا لباسوں میں آ کر اس کے ارد گرد گھیرا ڈال لیتیں، اور اس حلقے کے باہر ایک اور گھیرا تیار ہوتا کہ وہ اہلِ غرض اور اہلِ طمع اور مردِ حاتم کے ساتھی سون گڑیوں کے ساتھ ہنگامہ و ناؤ نوش تیار کرتے، اور اچھا وقت گزارتے اور اچھا ہاتھ مارتے۔ یہ سب کچھ ہوتا، مگر مردِ حاتم اس سب کے عین وسط میں ایک ننھے سے نیوکلس کے مانند تنہا اپنے گرد عملِ ضرب کو تیزی سے معروفِ کار دیکھتا، تماشہ کرتا، اور مسکراتا۔ کہ اس کا کام اور مقصد ہنگامہ ناؤ نوش برپا کرانا تھا، بلکہ اہلِ غرض کا تماشہ کرنا تھا، اور سون گڑیوں کی بے بضاعتی پر مسکراتا تھا کہ وہ اہلِ غرض اور اس کے مصاحبین کے درمیان وسیلہ بن کر اپنے آپ میں بہت بالا تھیں۔

کہانی جب یوں گندھ ہوتی، تو میں اپنے ساتھی کو کہ میں اور وہ مردِ حاتم کی شب و روز خدمت پر

ماہر ہونے سے کہتا۔

دوست میں تم کو ان گڑیوں کی کہانی نہیں سنا سکتا، جو آدھی رات کو ٹین کی صندوقچی سے نکل کر محفلِ طرب جماتی تھیں۔ اب تم ان سون گڑیوں کو دیکھو کہ دن کے اجالے اور شام کے جھٹ پٹے میں بے محابا محفلیں برپا کرتی ہیں اور کسی کو ضرورت نہیں محسوس ہوتی کہ اِدھر اُدھر دیکھ کر اطمینان کرے کہ کوئی دیکھتا تو نہیں، اور یوں میرے ذہن میں ان سنی کہانی ابھرتی کہ مجھے اعتراف ہے کہ داؤ و دہش کے اس سلسلے میں میرا بھی حصّہ رہا۔ اور میری ساری جیبیں بہت گرم رہنے لگیں۔ تب ہم نے ایک اور فلیٹ بدلا، اور میں نے اور میری ماں نے سوتیلے چچا سے یوں ترکِ تعلق کیا کہ مبادا وہ اپنے اس احسان کے بدلے چکانے ہمارے پاس آجائیں، جو انھوں نے آخری مرتبہ وہ ہنگامہ کر کے مجھے یہاں فٹ کروا کر کیا تھا۔

بلکہ فرزانہ کا معاملہ قدرے پیچیدہ تھا کہ ہمارے نئے فلیٹ میں پہنچنے کے بعد اس کے رویّے میں نرمی آگئی تھی، اور اس نے بار بار یہ کہنا چھوڑ دیا تھا "مگر تمہاری عزت کیا ہے۔"

اب تو کئی بار وہ خود مجھ سے ملنے آئی تھی، مگر قصّہ یہ ہے کہ میں نے سون گڑیوں کی کہانی "چشم دید" طور پر دیکھی اور ان کی قوتوں اور بالادستی کا نظارہ کیا۔ اب مجھے صبح کا ستارہ ڈوبنے سے پہلے ٹین کی پٹاری کو بند کرتے کرتے۔

جو رنڈی تھی، سو بیوی بنی۔ جو بیوی تھی، وہ باندی بنی۔

کہنے والی خاتون سے کیا دلیسی ہوسکتی تھی۔ چنانچہ میرا اور میرے تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے والے تمام دوستوں کا فیصلہ یہی تھا کہ اس ڈگری اور ایسی احمق خاتون کہ بیوی سے لونڈی بن جائے، کے مقابلے میں سون گڑیاں بدرجہا بہتر ثابت ہوتی ہیں۔

مگر یہ رموز فرزانہ جیسی لڑکیوں کی سمجھ میں کب آسکتے ہیں کہ صبح صبح کالی نقاب منہ پر ڈال کر اور داہنے ہاتھ میں نوٹس کی کاپی اٹھا کر وہ اپنے مستقبل کے اجالوں کی تلاش میں بسوں کے دھکّے اور کنڈکٹروں کی گھرکیاں کھانے گھر سے نکل پڑتی ہیں۔

جب کہ سون گڑیاں۔

خیر سون گڑیوں کی بات اور ہے۔ میں ایسی ہی ایک پٹاری کی تلاش میں ہوں کہ جس میں ایک یا کئی سو گڑیاں بند ہوں

کچّی مٹی کا بند

انور سدید

وہ رات ہم سب پر بھاری تھی۔

دریائے جہلم کے طاس میں گزشتہ تین روز سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ زمین کے گہرے پاتال میں سوئی ہوئی پلکھو ندی جاگ اٹھی تھی اور چوٹ لگی ناگن کی طرح شونکارے مارتی اور عام راستہ بدلتی اس مقام تک آ پہنچی تھی جہاں بمباں والی نہر کی آوڑی تیس ہزار پر پانی کے اخراج کے لئے سائیفن بن رہا تھا۔ پلکھو میں اچانک جوش آ جانے سے خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ حفاظتی بند ٹوٹ جائے گا، پانی سائیفن کے نشیب میں گرنے لگے گا اور تعمیر کے لئے لاکھوں کی مشینری اور سامان تباہ ہو جائے گا۔ سائیفن کے عین سامنے مرغ اڑان پر بھنڈیارا گاؤں تھا جس کے کچّے پکّے مکان پلکھو ندی کی گزرگاہ پر تھے۔ میرا ایس۔ ڈی۔ او اپنی نئی بیگم کے ساتھ ریسٹ ہاؤس میں سویا پڑا تھا اور میں موقعے کا افسر تھا۔

وہ رات مجھ پر سب سے زیادہ بھاری تھی۔

دن ڈھلے تک بھنڈیارا۔ گلیارہ اور کوٹلی کی طرف کا دربند مضبوطی سے باندھ دیا گیا تھا اور لب پلکھو ندی کا رخ بمن وال کی طرف موڑنے کے لئے کوشش کی جا رہی تھی۔ رات لمحہ بہ لمحہ نیچے اتر رہی تھی۔ مٹی کی اونچی مچانوں پر چراغ جل رہے تھے اور مزدور مٹی کی ٹوکریاں بھر کر دھڑا دھڑ بند کے اوپر پھینک رہے تھے۔ ندی کا پانی ہر لمحہ اونچا ہو رہا تھا لیکن بند باندھنے میں بھی سینکڑوں بوڑھے اور جوان لگے ہوئے تھے اور کام کی رفتار کچھ کم تسلی بخش نہیں تھی۔ بند کی اونچائی اور پانی کی سطح کے درمیان میری ترقی اٹکی ہوئی تھی۔ نیچے نشیب میں لاکھوں کی مشینری تھی اور سامنے بھنڈیارہ گاؤں جسے بچانا میرا فرض تھا۔

آدھی رات اِدھر اور آدھی اُدھر تھی جب اچانک ندی کا پانی ایک سطح پر آ کر رک گیا۔ مزدوروں کی آنکھوں میں خوشی کی چمک پیدا ہوئی۔ دم لینے سے زیادہ انہیں حقّے کی طلب ستا رہی تھی۔

اچانک پرلی طرف سے ٹائم کیپر دوڑتا ہوا آیا۔

میری شریانوں میں خون یکدم رک گیا۔ شاید ملکھو نے رُخ بدل کر گلیارہ کے محفوظ بند پر حملہ کر دیا تھا۔

"صاب جی... ...صاب جی!" حاکا ہکلانے لگا۔

"جلدی بھی بک کیا بات ہے؟" میں قریباً آگ بگولہ ہو رہا تھا۔

"جی رمضانا..... وہ جی رمضانا..... چلا گیا ہے!"

"کہاں چلا گیا ہے"؟

"جی وہ بھاگ گیا ہے"!

میرے لئے یہ اطلاع بڑی حیرت ناک تھی۔

رمضان میرے ملازم کا نام تھا۔ وہ میراثی کام کرتا تھا۔ بارہ چودہ سال کا تھا جب اس کا قرضدار باپ چھ سو روپے پیشگی لے کر اسے خرکاروں کے پاس محنت مزدوری کے لئے چھوڑ گیا تھا۔ خرکاروں کے پاس اسے بیس روپے تنخواہ۔ تین ٹائم کالے گڑ کی چائے اور دو ٹائم روٹی ملتی تھی اس کے علاوہ ہر آٹھویں روز مزدوروں کے ساتھ جوا کھیلنے کی سہولت بھی حاصل تھی۔ حقہ نسوار مفت ملتے تھے۔ قرضے کا سود دو روپے سینکڑہ ماہوار تھا جو ہر ماہ بارہ روپے بنتا۔

لیکن جوئے میں ہر مرتبہ رقم ہارنے کی وجہ سے قرض کم ہونے کی بجائے بڑھ رہا تھا۔ رمضانا جب خاکی جان ٹھیکیدار کے پاس آیا تو قرض نو سو روپے ہو گیا تھا اور وہ سابقہ پیشگی ادا کر کے چھ جگہ فروخت ہو چکا تھا۔ رمضانے کا رنگ گورا۔ لبیں صاف اور نقش تیکھے تھے۔ آواز نئے نوٹ کی طرح کڑکتی اور کڑاکے دار۔ گھر سے بھاگے ہوئے مزدوروں میں وہ بہت مقبول تھا۔ جب وہ مٹی میں بیلچہ چلاتے چلاتے کان پر ہاتھ رکھ کر معراج نامہ گاتا تو مزدور شاباشے شاباشے۔ لوشے لوشے پکارتے اور گدھے تیزی سے چلانے لگتے۔ رمضانے کی آواز کا لہرا جاگ اٹھتا اور وہ لہک لہک کر بول اٹھاتا۔

گھوڑے بنھ طبیلڑے اسیں چڑھے براقیں
لائیاں کھریاں چندلوں۔ چنگھیاڑے تارے
دوزخ دیگاں کھڑکدیاں۔ خوشبوئیں کھلارے
راساں رشماں کھچدے دھائے ست افلاکیں

ایک دفعہ ہمارا ایک افسر دورے پر آیا تو وہ اسی طرح اونچی تان میں گا رہا تھا۔

اگوں بدّل نوری سُھتاں ۔ کجھ نظر نہ آوے
اگوں چُھل ہوائیں عرش دیاں ساہ ٹٹ داجاوے

افسر کی اپنی لڑکی تعلیم کے لئے اسٹیٹس میں گئی تو وہاں کسی امریکی سے شادی رچا بیٹھی ۔ پچھلے دنوں اس کا خط آیا تھا کہ وہ اپنے امریکی خاوند کے ساتھ وطن واپس آرہی ہے ۔ رمضاناں جب اس شعر پہ پہنچا تو صاحب کا دل بھر آیا ۔

اَن طبیلہ بھالیا نہ ساج نہ گھوڑے
اُدھل گئیاں مگر دیو ہن داج دے جوڑے

" اور اس نے پوچھا " یہ لڑکا کون ہے ؟"
میں نے کہا " پنجابی ہے ۔ خرکاروں کے پاس کام کرتا ہے !"
" کڈنیپڈ ر (KIDNAPPED) ؟ صاحب نے سوالیہ نظروں سے پوچھا ۔
" چھ سال سے باپ کا قرض اتار رہا ہے ۔ گھر آنے جانے پہ پابندی ہے !"
" اس کا گلا بڑا اسریلا ہے ۔ خوب گاتا ہے !"
شاید افسر کا دل پسیج گیا تھا ۔ جاتے جاتے بولا " شکل سے شریف گھرانے کا معلوم ہوتا ہے ۔ خرکار اس کا حلیہ بگاڑ دیں گے ۔
کسی طرح اس کی خلاصی کرا دو ۔"

چنانچہ رمضاناں کو اپنی ضمانت پر میں خاکی جان ٹھیکیدار سے رہا کرا لایا ۔ اب وہ سائیفن پر میرا کھانا پکاتا تھا اور میری غیر حاضری میں آئے گئے کی دیکھ بھال کرتا تھا ۔ تنخواہ چالیس روپے اور روٹی کپڑا مفت ۔ دو سال کے عرصے میں اس نے سارا قرض اتار لیا تھا اور تھوڑی سی پونجی بھی جمع کر لی تھی جسے وہ کوٹلی کے ڈاک خانے میں جمع کرا دیتا ۔ پاس بک اس کے ٹین کے بکس میں محفوظ تھی ۔

میرے پاس ملازمت پا کر جیسے رمضاناں کی مجروح انا کو تسکین مل گئی ۔ اوور سیئر کا نوکر بھی پورا افسر ہوتا ہے ۔ ایس ڈی ۔ او ، ایکسین سے براہ راست گفتگو کر سکتا ہے ۔ میٹ ، مستری اور بیلدار سب اس سے خوف کھاتے ہیں ۔ چھوٹے موٹے ٹھیکیداروں کے کاغذ افسر کے آگے پیچھے کرنے کی سہولت بھی حاصل ہوتی ہے ۔ بِل ملنے پر اسے بھی دو چار روپے کا طمع لالچ لگا رہتا ہے ۔ اب خاکی جان ٹھیکیدار آتا تو وہ اسے رمضان خان

کہہ کر بلاتا اور رمضانا اسے کرسی کی بجائے بیٹھنے کے لئے موڑھا یا چارپائی دیتا۔ پیٹ بھر روٹی ملنے سے اس کا دھواں سا رنگ نکھر کر نقرئی ہو گیا تھا۔ گال بھر گئے تھے اور ان پر ہلکی ہلکی سرخی آ گئی۔ مسیں بھیگ کر سیاہی مائل مونچھیں اُگ آئیں اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے اِک جوان رعنا بن گیا تھا۔

ان دو سالوں میں رمضانا نے میری بڑی خدمت کی تھی بلکہ مجھے گھر بار کی فکر سے بے نیاز کر دیا تھا۔ میں آدھی تنخواہ گھر بھیج کر باقی اس کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ وہ مہینہ بھر پائی پائی سوچ کر خرچ کرتا اور اس کا باقاعدہ حساب رکھتا۔ دو آنی کی بجائے اِکنی خرچ کرتا اور مہینے کا پس انداز میرے اکاؤنٹ میں جمع کرا آتا۔ کفایت شعار اتنا کہ گھی۔ مرغی اور انڈوں کی خریداری کے لئے اطراف و جوانب کے دیہاتوں میں چلا جاتا اور جہاں سے دو پیسے سستی ملتی خرید لاتا۔ گاؤں کی عورتیں اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتیں۔ وہ ان کی چیزوں کا نقد کا مستقل گاہک تھا۔ فصل کے موقع پر گندم۔ چاول۔ گڑ۔ شکر وغیرہ سال بھر کی ضرورت کے لئے خرید لیتا اور مجھے روزروز کی خریداری سے نجات مل جاتی۔

مہمانوں کی تواضع کا بھی اسے بڑا سلیقہ تھا۔ وہ ہر مہمان کے مقام اور مرتبے کو پہچانتا تھا۔ کوئی افسر آتا تو اس کی تواضع لیمن سوڈے سے کرتا، کھانے کا وقت ہوتا تو مرغ۔ بٹیرے یا تیتر وغیرہ تیار کر لیتا۔ کوٹ پتلون پہنے کوئی اجنبی آ جاتا تو اس کی تواضع شکنجبین وغیرہ سے کرتا۔ غریب غربے کے لئے لسی کا مٹکا اور ٹھنڈے پانی کا گھڑا ہر وقت تیار رکھتا۔ سچی بات یہ ہے کہ رمضانے کی وجہ سے مجھے بہت آرام مل رہا تھا۔ وہ نوکر کم اور گھر کا مالک زیادہ تھا۔ زمین میں اس کی جڑیں گہری اتارنے کے لئے میں سوچ رہا تھا کہ کسی ہیڈ مستری کی موزوں سی لڑکی کا پتہ ملے تو اس کی شادی کر ڈالوں۔ میرے اس ارادے کا رمضان کو بھی علم تھا اور وہ اس روزِ سعید کے لئے مناسب طور پر تیاری کر رہا تھا۔ سائیفن پر قبائلی لنڈی کوتل کا مال لے کر آتے تو وہ ان سے سوسی۔ ساٹن اور کریپ وغیرہ سستے داموں خرید کر رکھ لیتا۔ اس کا ٹین کا بکس ایسے خوبصورت کپڑوں سے بھر گیا تھا۔ حاکم ہیڈ سے رمضان کا یارانہ گہرا تھا۔ میں نے اکثر ان دونوں کو اکٹھے بیٹھا ہوا دیکھا تھا۔ کام ختم کر کے وہ اسی کے ساتھ گپ شپ لگاتا اور رات گئے تک اسے ہیر وارث شاہ اور یوسف زلیخا اور سوہنی مہینوال سنا رہتا۔ حاکما کتاب سے ہیر کے بول پڑھتا اور وہ اپنی سُریلی آواز میں انہیں گاتا۔ کئی دفعہ مزدور اور راہگیر جمع ہو جاتے اور وہ دونوں ان سے داد وصول کر کے بہت خوش ہوتے۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ ایک دفعہ اس نے حاکم کو مستری بنا دینے کی سفارش بھی کی لیکن میں نے بالکل ان سُنی کر دی۔

رمضان کا یوں اچانک اور بن بتائے چلا جانا میرے لئے اچنبھا تھا۔
میں نے غصّے سے کہا۔" دُر فِٹے منہ، پوری بات بتا۔ کہاں بھاگ گیا ہے؟"
جی وہ فلکو کو بھی لے گیا ہے!" حاکے کی آواز لرز رہی تھی۔
"فلکو کون ہے؟"
"جی میری بھانجی ہے"!
یہ کہہ کر اُس نے پگڑی کا پلّو آنکھوں پر رکھا اور زار زار رونے لگا۔
میں سہم سا گیا!
رمضان نے گاؤں کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ یہ گاؤں سنبل ذات کے جاٹوں کا تھا جو ذرا سی بات پر مرنے مارنے کو تیار ہو جاتے۔ ان کی خاندانی دشمنی مشہور تھی۔ قتل اور لڑائی کے مقدمے نسل در نسل چلتے تھے۔
مجھے رمضانے کی جان خطرے میں نظر آ رہی تھی!
اتنے میں کسی نے آ کر بتایا کہ بلکھو کا پانی پھر چڑھنے لگا ہے اور بند کا شرقی حصہ طوفانی لہروں کی زد میں ہے۔
رمضانے کی خبر مزدوروں میں پھیل گئی اور وہ ٹوکریاں پھینک پھانک کر میرے گرد جمع ہو گئے۔ اندھیری رات میں بھی ان کا غصّہ آنکھوں میں چمک رہا تھا اور ان کے کندھوں پر کسیاں تھیں جن کے پھل چراغوں کی روشنی میں جگمگا رہے تھے۔
دونوں محاذوں پر خطرہ سخت تھا
میں نے تیزی سے کہا۔
"بے غیرتو! منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ بلکھو ندی اور رمضانا دونوں سانپ ہیں۔ ایک نے ہمارے گھر پر حملہ کیا ہے۔ دوسرے نے گھر کی عزت پر۔ آگے بڑھو اور دونوں کا سر کچل دو۔" بظاہر میں سخت غصّے میں نظر آ رہا تھا۔
"نگا ماں۔ خانوں۔ فریدے اور بلاقی تم فوراً گھوڑے پکڑو۔ پکی سڑک اور اسٹیشن تک ہر ناکے پہ پہرہ لگا دو۔ سؤر دا پتّر۔ ابھی راستے میں ہی ہو گا۔ تم لوگ اسے پکڑو۔ ہم سب بلکھو کو سنبھالتے ہیں۔"
پھر میں نے غلام محمد سے سرگوشی کی۔
"دیکھ غلام محمد! رمضانے کو کچھ نہ کہنا۔ پکڑ کر سیدھا میرے پاس لانا۔ میں خود اس کی بوٹی بوٹی کروں گا۔"

تک حسام:

رمضانے کو بچانے کی اس سے بہتر کوئی ترکیب نہیں تھی۔

مزدور مطمئن ہو گئے۔ سب نے مل کر زور کا نعرہ لگایا اور بلکھو سے نپٹنے کے لئے پھر جی جان سے مٹی ڈھونے لگے۔ میں نے لپک کر رمضانے کا کمرہ دیکھا۔ ٹین کا صندوق کھلا پڑا تھا۔ سارے کپڑے غائب تھے لیکن پاس بک وہیں پڑی تھی۔ آخری اندراج ایک روز پہلے کا تھا۔ کل دو ستر روپے نکلوائے گئے تھے۔ باقی نو روپے ستر پیسے تھے جو اتنے عرصے کا سود تھا۔

بلکھو ندی صبح صادق تک پھونکارے مارتی رہی

ابھی تک رمضان کی کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ میرا سانس گردن میں اٹک گیا اور بے خوابی نے میرا جوڑ جوڑ ہلا دیا۔ شہر کی طرف جانے والی سڑکوں پر ناکہ بندی ہو گئی تھی۔ اسٹیشن پر بھی آدمی پہنچ چکے تھے۔ فرار کی سب راہیں بند تھیں۔

بڑی دیر کے بعد فریدیہ خبر لایا کہ ساتویں میل پر اس نے ایک لڑکی اور لڑکے کو شارع عام پر جاتے دیکھا لیکن وہ فلکو اور رمضان نہیں تھے۔ وہ تو کسی کالج کے طالب علم معلوم ہوتے تھے بالکل ٹیڈی۔

میرا ماتھا ٹھنکا۔ وہ رمضانا ہی تھا۔ وہ کبھی کبھی میری پرانی پتلون پہن کر افسری کا شوق بھی پورا کیا کرتا تھا۔ وہ لڑکی بھی نئے کپڑوں میں فلکو ہی تھی۔ میں نے تین سائیکل سوار اور دوڑا دیئے کہ وہ انہیں راستے ہی میں جا لیں۔ گاؤں سے خبر آئی کہ فلکو کی ماں کا دل بیٹھ رہا ہے اور وہ انگشتِ شہادت بلند کئے چپ سادھے، پتھرائی آنکھوں سے آسمان کو تک رہی ہے۔ میں نے سوچا۔

" آہ بے چاری ماں! جسے بیٹی کی منہ زور جوانی دغا دے گئی "

اب تیسری جہت میں بھی قدم بڑھ رہا تھا

میں نے فوراً فیلڈ ہسپتال کے کمپونڈر کو بلایا اور فلکو کی ماں کا دل بحال کرنے کے لئے کورامین دینے کا حکم دے کر حلکے کو اس کی نگہداشت پر معمور کر دیا۔

بلکھو ندی کے ساتھ لڑائی اب عروجی دور میں داخل ہو گئی تھی۔

پانی کی سطح اتنی بلند تھی کہ بند بچانے کے لئے پیچھے کی طرف ڈھلوان پر مٹی ڈالنا ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے نازک صورتِ حال کی خبر تار کے ذریعے افسرانِ بالا کو کر دی۔ ایس۔ ڈی۔ او کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اور

ریسٹ ہاؤس سے اس کے آنے کی توقع کم تھی۔ رات بھر کے تھکے ہارے مزدور منہ اٹھا اٹھا کر صبح کی نئی کنک کا انتظار کر رہے تھے۔

اچانک اسٹیشن کی طرف سے دو گھوڑ سوار دھول اڑاتے فاصلے کم کرتے دکھائی دیئے۔ میں نے اپنے آپ کو کوئی خبر سننے کے لئے ذہنی طور پر تیار کر لیا۔

گرد چھٹی۔ سامنے خانوں اور جمو نظر آئے۔ ان کے ساتھ رمضانا اور فلکو تھے جسے انہوں نے پاس پہنچ کر سیمنٹ کی بوری کی طرح زمین پر پٹک دیا۔ رمضان کسی ہوئی پتلون اور ٹیڑی ان کی بو شرٹ میں واقعی کالج کا لڑکا معلوم ہوتا تھا اور فلکو ـــــ وہ معصوم سی مونالیزا ـــــ جس کے لبوں پر جوانی کی پہلی مسکان بیدار ہو رہی تھی۔ لیکن اب ان دونوں کے چہروں پر دھول تھی اور آنکھوں میں خوف!

میں نے خوشی سے فلکو کی ماں کو بتایا۔

"بی بی مبارک ہو۔ تمہاری بائیں مل گئی ہیں!"

اس نے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ گردن نیچے ڈال دی۔ اس کی انگشتِ شہادت اب بھی آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھی اور وہ چپ سادھے ہوئے تھی۔

شاید اسے میری بات کا یقین نہیں آیا تھا!

سب لوگ رمضانا اور فلکو کے گرد جمع ہو گئے۔

میں نے صورت حال کو اپنے قابو میں لینے کے لئے زنانہ رمضانے کو تھپڑ جڑنے شروع کر دیئے۔ سارا قصور اسی کا تھا۔ وہ خاموشی سے مار کھا رہا تھا اور بھیگی بلی بنا مجمع سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ خانوں آگے بڑھا اور میرا ہاتھ روکتے ہوئے بولا۔

"صاحب جی اس غریب کو ہی نہ مارو۔ اس بھوتنی سے بھی پوچھو۔ یہ کیوں ساتھ گئی تھی؟"

یہ بات ٹھیک تھی۔ میرا لہجہ نرم پڑ گیا۔

"ہاں تم بتاؤ۔ تم کیوں گئی تھیں؟"

فلکو بغل میں پوٹلی تھامے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ خانوں نے آگے بڑھ کر اسے ٹھوکا دیا۔

"اب روتی ہے۔ بتاتی کیوں نہیں؟"

فلکو سسکیاں بھرنے لگی تو خانوں نے اسے زور کا لپڑ دیا۔

"خنزیرنی سچ سچ بتا ورنہ جان سے مار دوں گا۔"

جونہی لیڈر پڑا اشانو کی تیز بھیانک چیخ کانوں کو چھیدتی ہوئی ہوا میں پھیل گئی۔

اسی لمحے ہسپتال کی طرف سے اس کی ماں دوڑتی ہوئی آئی اور فلکو سے لپٹ کر اس پر اپنا آنچل ڈال دیا۔

"لوگو میری گڈری دھی کو کچھ نہ کہو۔

مجھے مارو۔ مجھے مارو۔ اسے میں نے بھیجا تھا!"

فلکو کی ماں وہیں ڈھیر ہو گئی۔

سائیفن کا بند ٹوٹ گیا تھا اور بیکھو ندی کا منہ زور پانی تیزی سے گاؤں کی طرف بڑھ رہا تھا۔

چراغِ لالہ

جمیلہ ہاشمی

آفندی کا خط زمانوں کے بعد آیا تھا وہ امریکہ میں کسی جگہ تھا اور واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

تم اب میری طرف سے ناامید ہو جاؤ کہ میں واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ جب تک میں تمہارے پاس تھا کسی نہ کسی طور پریشان رہتا تھا۔ میری تعلیم ڈگریاں بھلا کس کام کی تھیں، ہمیشہ جونیئر سینئر کا جھگڑا۔ ہندوستانی پاکستانی کا جھگڑا شمالی جنوبی کا کھکھیڑا۔ تعلقات اور رسائی کا مقابلہ اور چھپے ہوئے ذرائع کا استعمال کرنے کی اہلیت اور نااہلی۔ آپ باہر کیا کر سکتے ہیں اور اندر کیا کر سکتے ہیں۔ یہ دوسری زندگی بسر کرنے کی ہمت کبھی انسان میں ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی۔ گو رہنے سہنے کے انداز چند برسوں میں بہت بدل گئے ہیں اور مگر ہر گام پہ نئے اور پرانے کی ٹکر ہوتی رہتی ہے۔ آدمی کی ساری طاقت اس میں صرف ہو جاتی ہے کہ اپنے حقوق کی حفاظت کس طرح سے کرے اور زندگی کس طرح سے بسر کرے۔ میرا خیال ہے تم بھی میرے اس فیصلے کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھو گے۔ میں یہاں جس ادارے میں کام کرتا ہوں اس نے میری تنخواہ میں تقریباً پچاس فیصد اضافہ کر دیا ہے اور یہ بہت بڑی ترقی ہے۔ تم کو معلوم ہو کہ تم بھی کسی نہ کسی طور ایسے آدمی ہو جس کی ضرورت ہے اور جس کے بغیر گزارہ نہیں ہو سکتا تو یہ اہمیت آدمی کے کام کرنے کی صلاحیت کو بے پناہ جلا بخشتی ہے (میں تم کو یہ سب یوں لکھ رہا ہوں گویا تم کوئی غیر ہو اور یہ سب باتیں جانتے نہیں ہو)

مریم کا کیا حال ہے؟

جانے مجھے کیوں اکثر یوں محسوس ہوا ہے کہ مریم میں عجیب و غریب صلاحیتیں ہیں اور وہ تمہارے باقی بچوں سے مختلف ہے، پتہ نہیں میں نے ایسا کیوں سوچا تھا؟ ہو سکتا ہے میرے یہ خیالات اس کے لئے اس لئے ہوں کہ تم بھی اسے سب سے زیادہ چاہتے ہو اور اس پہ فخر کرتے ہوئے لگتے ہو۔ اولاد میں انسان اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈتا ہے اور خاص طور پہ مشرق میں جیسے درخت کی شاخیں ہوں۔ پھول کا پھل بنے اور پھل کی مٹھاس آدمی اپنے اندر اتارتی

محسوس کرنا چاہیے۔ اصل میں زندگی کے ساتھ مشرقی وابستگی کچھ ضرورت سے زیادہ ہی ہوتی ہے؟

تم کہو گے یہ میری غیر جذباتیت ہے میں ابھی تک کنوارا ہوں میں نے ان سارے جذبوں کو محسوس نہیں کیا؟ ٹھیک ہے مگر آخر اس میں رکھا کیا ہے؟ ایک گھر اور اس کے اندر تمہارا انتظار کرتی بیوی جس کی آدھی سے زیادہ زندگی انتظار میں گزر جاتی ہے اس آزادی کا قائل ہوں۔!

تم نے اپنے پچھلے خط میں لکھا ہے شاید اب اس آب و ہوا میں رس بس گیا ہوں۔ آپ چاہیں تو یہاں سب کچھ ہے اور چاہیں تو کچھ بھی نہیں۔

بیگم مدحت حسین آج کل یہاں آئی ہوئی ہیں اور ان کی نہایت مہربانی ہے کہ انہوں نے مجھے پہچان لیا کیونکہ تم حیران ہو گے کہ وہ وائٹ ہاؤس کے خاص الخاص مہمانوں میں شمار کی جاتی ہیں اور کسی والیٔ ریاست سے کم ان کی دیکھ بھال نہیں ہوتی نوجوان خواتین کا ایک اچھا خاصا گروہ ان کے ہمراہ ہے۔ میں نے کسی تقریب کی تصویریں اخبار میں دیکھی تھیں اور وہاں سے معلوم کر کے ان سے ملنے گیا تھا۔ اتفاق کہہ لیجئے یہ بھی بہت محبت سے ملیں۔ یہاں ان کے طور طریقے اور رنگ ڈھنگ ہیں نہایت ذہین، بہت تیز اور بڑی تیز لڑکیاں ہیں جو یہاں ان کی ساتھی ہیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے پہلی بار لگا کہ ہماری خواتین کسی طور بھی امریکی عورتوں سے کم نہیں ہیں۔ نادیہ رحمان کو تو جانتے ہو نا جس نے کلاسیکل ڈانس میں نام پیدا کیا تھا اور جس کے شوہر نے محض اس کے اس شوق سے چڑ کر اسے طلاق دیدی تھی اور عطیہ فیضی جو فیشن ماڈل تھی پھر کسی نواب کی منکوحہ تھی پھر اس نے کسی بڑے فوجی کو پھانسا تھا۔ تیسری بار کسی آرٹسٹ کی بیوی بنی تھی۔ یار یہ سب باتیں ایک طرف مگر تمہیں یہ ماننا پڑے گا کہ اس میں کوئی کشش ہے یہی بے نام نامعلوم جو عجیب طرح بے چین کرتی ہے اپنے دیس کی بات نرالی تھی مگر یہاں امریکی مرد اس کے دیوانے لگتے ہیں۔ میں نے بہت دنوں یہ تجزیہ کرنے کی کوشش کی کہ یہ ساری کشش کہاں سے آتی ہے اور آخر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس کا باتیں کرنے کا انداز آدمی کو ہتھیار پھینکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ بڑی بڑی آنکھوں کی بے بسی تم محسوس کرو تو جی چاہتا ہے اپنے سارے ذرائع لگا کر ان کی بے بسی کو سکھ میں تبدیل کیا جائے۔ اس کمزور اور لاغر سے بازو کو تھام کر اسے تسلی دی جائے۔ (مگر یہ مت سمجھنے لگنا کہ میں اس بازو کو تھام لوں گا۔ اس لئے کہ ملکی اور غیر ملکی سب اس کی ان اداؤں پر فدا ہیں)

ابھی بیگم مدحت حسین کے گروہ میں کی ایک فرد ہے دلوانی، جوشیلی، پُرعزم اور اپنے علم سے بخوبی آگاہ۔ تم تو اسے بہت اچھی طرح جانتے ہو! وہ ہر کسی سے اپنا کام نکلوانا خوب جانتی ہے۔ ارے بھئی عاصم والا قصہ اب تو کم از کم تمہیں یاد آ ہی گیا ہو گا۔ محفلوں میں پی کر بڑی بڑی گھمبیر باتیں کرتی ہے۔ اسے اپنے لمبے ریشمی بالوں پر بہت ناز ہے گھٹنوں

تک پہنچنے باتوں کو بامحاورہ سے سہلانی وہ سب بڑے بڑے لوگوں کا اپنے عشق میں مبتلا ہونے کا اکثر ذکر کرتی ہے سگریٹ پینی دھوئیں کے چھلے بناتی وہ بڑی بے نیاز ہے اپنے لباس کی طرف سے، بے پرواہ جنس کا ذکر اکثر کرتی ہے میں نے ایک بار کہا تھا: "اگر آپ جنس سے اتنی کراہت محسوس کرتی ہیں تو مت ذکر کیجئے اس کا۔"

"کیا کہا آپ نے وہ جیسے سوتے میں سے اٹھ کر بیٹھ گئی ہو۔ میں جنس کا ذکر کرتی ہوں میں جو مجسم جنس کے خلاف ہوں۔ مرد عورتوں میں کیا ڈھونڈتے ہیں مجھے سمجھ نہیں آتی، عورتیں مردوں میں کیا تلاش کرتی ہیں مجھے پتہ نہیں چلتا میں زندگی کو کسی اور ہی زاویئے سے دیکھتی ہوں آفندی صاحب۔" اور مجھے جان چھڑانی مشکل ہوگئی۔

پھر وہ شاعرہ ہے تھی وہی جو مشاعروں میں ایک ادا سے غزل پڑھتی تھی، جھکی ہوئی نگاہیں اور باہوش ادائیں یہاں، مردوں کا ایک پورا ہجوم ہے ان کا سبھی طرح کے لوگ جوانی کی شاعری کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور انہیں بھی کچھ ایسے لوگ بھی جو شاعری کو بکواس سمجھتے ہیں مگر انہیں بہرحال کام کی ضرور جانتے ہیں قدر کرتے ہیں حاضر رہتے ہیں کبھی آہیں بھرتے ہیں اور خود بھی شاعر بنے پھرتے ہیں ایک دن یہاں کا ایک دوست میرے پاس آیا مجھے کہیں سے پرانے شاعروں کے شعر چرا کر ایک غزل بنا دو، تو کہیں بھی لگے، خیالات کے اعتبار سے روانی ردا بیت میں ہو۔ کہاں تم جانو یہاں کس کے پاس ہوتی ہیں اور شعر تو مجھے کبھی یاد۔ ہوئے مگر میں نے ایک بڈھے یہاں کے بہت پرانے بیسے والے سے ایک کتاب ڈھونڈ نکالی۔ اور اچھی خاصی غزل ترتیب دے دی۔ رفتہ رفتہ مجھے اپنی صلاحیتوں پر خود ہی حیرت ہونے لگی ہے یہ تو شعر چرا کر خیالات سامنے رکھ کر اگر شعر بنانے لگوں تو سکوں کی طرح میرا خزانہ کبھی نہ خالی ہو۔ وہ صاحب غزل پڑھ کر بہت محظوظ ہوئے ان کا کام بہت بن گیا اور جہاں وہ صاحبہ جاتیں انہیں بھی سامنا رہا ہوتا دو ایک بار تو اس کام کو کھیل سمجھ کر میں نے کر دیا مگر آخر تا بکے۔ اب وہ دوست خود ہی جوڑ توڑ اور گھڑنے سنوارنے میں لگے رہتے ہیں۔ کیا پتہ کسی دن پورے شاعر ہی بن جائیں۔ کبھی کبھار یوں بھی ہوتا ہے کہ آدمی بس یونہی کھیل سمجھ کر ایک کام شروع کرتا ہے جو اس کا پیشہ ٹھہرتا ہے۔

شاعری جو جزو پیغمبری ہے اس کی بات تو الگ ہے مگر جس شاعری سے نہ کسی کو جگانا مقصود ہو اور نہ سلانا وہ تو میرے خیال میں آسان ہونی چاہیئے۔ اپنے سامنے سب کچھ ہے رنگ اور نور، جلوے خوبصورتیاں سب کچھ، مگر اس تصویر کے پیچھے کیا ہے یہ جاننے کا کام جوکھم کا ہے کبھی کبھار میں سوچا کرتا ہوں الاول کے گیتوں میں اتنا سوز کیوں ہوتا ہے اتنی تڑپ جلنے کی ایک کیفیت تب آدمی اندر سے آسودہ حال ہوگا اسے جلنے کی کیا خبر ہوگی۔ مگر شاید میں ذرا بہکا ہوا ہوں میرے سامنے اندر کا مسئلہ بھی ہے دوسرے پڑھنے والے تک اسے پہنچانے سمجھانے کا سوال بھی ہے۔ مگر نئی شاعری نئی

زندگی اس کے تقاضے اتنے محدود ہیں۔ جب شاعرہ غزل پڑھتی ہے۔ سماں جھومنے کا ہوتا ہے۔ فضا پہ ایک کیف کی سی حالت ہوتی ہے اور ہر آدمی سوچتا ہے۔ یہ سب کیا تھا۔ مگر یہاں کے ساتھ یہ بات کوئی خاص نہیں۔ اور پھر میں تو بیگم مدحت حسین کا احسان مند ہوں اس فضا میں وہ قوس قزح کے سارے رنگوں کے ساتھ وارد ہوئی ہیں! ابھی ان کا ارادہ یہاں قیام کا ہے۔

کس قدر شاہانہ ٹھاٹھ سے وہ رہتی ہیں۔ یہاں کے سب سے مہنگے علاقے میں ان کا قیام ہے۔ تنیبی بھی ان کے ساتھ ہے۔

تم شاید اسے نہیں جانتے روشن آنکھیں جو بھوری ہیں اور رنگ گندمی جیسے سنہری فصلوں کا ہوتا ہے ویسی ہی چمک جیسے ہوا کے چلنے پر کھیتوں کے اوپر ڈولتی ہے ہوٹل کی سیڑھیوں پر ایک سے دوسرے کمرے میں لپک جھپک جاتے ہوئے وہ یوں گنگناتی ہے جیسے ہوا اپنے سریلے بے لفظوں کے گیت گاتی ہو۔ ایک عمدہ تراش کا کسی باریک کپڑے کا لبادہ سا پہنے رہتی ہے جس کے پھول اس کے رخساروں کے ہم رنگ ہوتے ہیں۔ بیگم مدحت حسین کہتی ہیں میں نے اسے بیٹی بنایا ہے مگر بیٹیوں بہنوں کے اس جھگڑے میں وہ خود سب سے زیادہ جوان اور زندہ دل لگتی ہے۔ تمہیں یاد ہوگا آج سے دس پندرہ سال پہلے ایک تصویر بکا کرتی تھی جس میں ایک بجرہ ہوتا تھا جس میں نہایت حسین عورت لیٹی ہوئی۔ اس کے برابر میں قریب قریب ننھے پانی میں تیرتی ہوئی جل پریاں جو کم عمر اور الھڑ لگتی ہیں وہ بھی حسین ہوتی ہیں مگر لیٹی ہوئی پری کا حسن جیسے چودھویں کا چاند ہو مکمل اور گدرایا ہوا۔ جیسے شباب کے آخر میں۔ جیسے سب پک جائے تو اس پر چمک ہوتی ہے پکار پکار کر اپنے مکمل ہونے کا اعلان کرتی ہوئی۔ بیگم مدحت کو وہ سارے زاویے آزمانے کے طریقے آتے ہیں جہاں سے کوئی نہ خطا نہیں ہوتا۔ اور شکاری شکار کو زد پہ لاکر مارتا ہے۔ پھر وہ کنجوس نہیں ہے بڑی شاہ دلی سے خیرات مانگتی ہے لینے والے کو تہی دامنی کی شکایت ہو تو ہو۔

اور یہ سارا بہار کا موسم ہر کاب لئے وہ آج کل یہاں آئی ہیں کہتی ہیں "کلچرل ڈیلی گیشن کے ہمراہ ہوں بہتی گنگا میں ہاتھ دھونا چاہو تو دھو لو کوئی کام کروانا ہو کسی جگہ بہتر نوکری کی ضرورت ہو غرضیکہ ایسے سارے کام جو ڑکے ہوئے ہوں تم بلا کھٹکے مجھ سے کہہ سکتے ہو میں تمہاری بہی خواہ ہوں" بھلا میں ان سے کیا کہوں مہربانی کا شکریہ۔ ہاں میں ان کے کام آنا چاہتا ہوں خدمت کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ میں عطیہ فیضی کی آنکھوں کی بے بسی کم کرنے میں ان کی مدد کروں۔

تم سے اور بہت سی باتیں پوچھنے کو جی چاہتا ہے مگر میں یہاں پر ایک بھگتی کیرتن کی جماعت بلا نا غہ دیکھنے جاتا ہوں مشرق اور مغرب کی سب کھڑکیاں کھلی رکھ کر میں اس ہوا کو محسوس کرنا چاہتا ہوں اور ساتھ ہی ان کی اور اپنی طاقت بھی آزمانا

چاہتا ہوں۔

تمہیں معلوم ہے سرکاری مذہب کسی کو وہ آسودگی اور راحت نہیں بخشتا تا! اور پھر یہاں کے اکثر لوگ دہریئے ہیں، ناستک وہ خدا کو مانتے ہی نہیں۔ خدا کو نہ ماننے میں وہ کہتے ہیں ایک راحت ہے۔ بوجھ اتر جاتا ہے جب آدمی یہ سوچے کہ تمہارے ہر قول و فعل کا محاسبہ کیا جائے گا۔ تمہیں جواب دہی کرنا پڑے گی تو وہ سوچتا ہے آخر کیوں؟ وہ اپنے آپ کو آزاد محسوس کرنے کے لئے سب سے پہلے خدا سے باغی ہونا پسند کرتا ہے۔ یہ سارا معاشرہ باغی ہے اور اس سرزمین پر کیسے ضرورت ہے کہ اپنی طاقتیں آزمائے اس لئے بھگتی کیرتن سے گانے ناچنے سے شانتی حاصل کرنے کو لوگ جمع ہوتے ہیں۔

اچھا لگتا ہے لوگ ہاتھ جوڑے آنکھیں بند کئے دُعا مانگ رہے ہیں۔ آپ کے اندر کیا ہے اس سے کسی کو غرض نہیں۔

دعا کرنے کے بعد اگر آپ جیب کترے ہیں تو بھی وہی سکون محسوس کریں گے جو احکام صادر کرنے والا با اثر آدمی۔ اس سن آسانی کے زمانے میں ان کی ساری ضرورتیں اسی قسم کا مذہب پوری کر سکتا ہے۔ ہمارے ہاں کڑی ریاضت ہے مجاہدہ ہے پوری زندگی ایک ایک لمحہ تم اس طرح گزارو کہ تمہیں اس کے سامنے جوابدہ ہونا ہے۔ لوگ اپنے خدا کو الماری میں بند کر کے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ستاروں پر کمندیں ڈالنے والے جس طرح ہر شے زیر نگیں کرنے کے درپے ہیں اسی طرح انہوں نے خدا اور اس کے ساتھ اپنے تعلق کو نہایت بالکل ذاتی مسئلہ بنا یا ہے۔

خدا کے ساتھ آدمی کا تعلق اس کا ذاتی مسئلہ ہے یا نہیں سارے مذہب اس کو حل کرنا چاہتے ہیں کوئی اپنے طور پر کوئی کیرتن کی محفلوں میں شریک ہو کر کوئی فری مین بن کر کوئی دہریہ بن کر۔

آدمی پتہ نہیں کیا تلاش کرتا ہے؟

بس تو تم سے یہی سوال کرنے چلی تھا۔ جیسے جیسے آدمی کا فہم و ادراک سنجیدہ اور مستقل ہوتا ہے وہ پوچھتا ہے ہر ایک شے کا آسان حل چاہتا ہے اُسے کڑی ریاضت اور محنت کی ایک خاص طرز پسند نہیں آتی جیسے کوئی چیل آسمان کے نیچے اڑتے اڑتے یکا یک ساتوں آسمانوں کے کل راز جاننا چاہے یا کوئی پتنگا شمع کی حقیقت سے واقف ہونے کی کوشش کرے۔ اور پھر چیل گھبرا کر آسمان کے ہونے نہ ہونے پر ہی بحث شروع کر دے اور پتنگا شمع سے انکار کر دے۔ یہ سارا معاشرہ یہاں وہاں سستی جنت کی تلاش میں ہے۔ وہ حشیش کھا کر مدہوش ہونا اور بھگتی کیرتن سُن کر اپنا آپ بھولنا چاہتے ہیں اور بس میں جو بھگتی کیرتن میں جاتا ہوں پتہ نہیں میری مزاج کی حس کو کیسے تسکین ملتی ہے مگر بس کونسا ایسا مذہبی آدمی ہوں! ہم نے مذہب بیچا ہے جانے کیا کیا کچھ اس نیلام پر چڑھا ہے؟

اور اس کے باوجود انسانیت ہمیشہ مذہب کے نام پر اپنا آپ نچھاور کرتی آتی ہے! ہم۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی ہے میں ذرا سن لوں ۔

کتنی حیران کن بات ہے فون عطیہ نفیسی کا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ اگر شام فارغ ہوں تو بیگم مدحت حسین کے ساتھ کھانا کھاؤں۔ اس دور افتادہ ملک میں اتنا اپنا پن۔ حالانکہ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ میں وطن واپس نہیں آؤں گا پھر بھی جی چاہتا ہے تا ہماری بھی کوئی پہچان ہو۔ ہم گم نہ ہوں۔ ہماری کوئی عزت ہو ہمیں بھی چاہا جائے۔ ہاں سچ مچ اب جبکہ میں یہ خط ختم کر رہا ہوں۔ جی چاہتا ہے کوئی ہمیں بھی چاہتا کوئی ہمارے لئے پریشان ہوتا۔ اگر خواہش گھوڑے ہوتیں تو!

اچھا خدا حافظ بھائی سے سلام کہنا بچوں کو دعا اور جھاگ اڑاتی لہروں والے سمندر کو ان فضاؤں کو اور ہواؤں کو میرا آداب کہنا۔

بھورے

خدیجہ مستور

محمد بھورے ولد محمد بوٹے کے دماغ میں کوئی خلل پیدا ہو گیا ہے۔ یہ سب کا متفقہ فیصلہ تھا مگر مس لال خاں ہاؤس سرجن کا خیال تھا کہ ان کے دماغ میں کوئی خلل نہیں ہے کیونکہ وہ بقائمی ہوش و حواس تمام کام انجام دیتا ہے۔ اگر گھنٹے کی آواز سے اس پر بے چینی طاری ہو جاتی ہے تو یہ کوئی جذباتی معاملہ ہے۔

محمد بھورے سے اس معاملے میں تقریباً سبھی نے پوچھ گچھ کی مگر جواب میں اس نے ہمیشہ دانت نکال دیئے اور اس طرح ہنس جیسے سب کو چڑا رہا ہو۔ مس لال خاں نے اس معاملے میں بھورے سے بڑی رازداری کے ساتھ معلومات حاصل کرنی چاہیں مگر وہ ان کی ہمدردی اور خلوص کو بھی بڑی بے اعتنائی سے ٹال کر صرف تنہا رہ گیا۔ آخر کار مس لال خاں کا بھی خیال بدل گیا اور انہیں بھی ماننا پڑا کہ یہ خلل ہے مگر محض لمحاتی، جو گھنٹے کی آواز سے پیدا ہوتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے اس لئے بھورے بے ضرر سا انسان ہے اور اسے اپنی ملازمت پر موجود رہنا چاہیئے۔

محمد بھورے اپنی ملازمت پر موجود رہا مگر یہ کسی کو نہ معلوم ہو سکا کہ یہ ایک کہانی ہے جو بھورے کسی کو نہیں بتانا چاہتا اور وہ اس کہانی کے ایک بڑے ہی مسرت انگیز انجام کا منتظر ہے۔ یہ کہانی اس طرح ہے کہ :—

سیتا پور کا مہاجر محمد بھورے اس زنانہ امراض کے اسپتال میں آٹھ سال سے کام کر رہا تھا۔ اس کی ڈیوٹی اسپتال کے اس ٹیلی فون پر لگی ہوئی تھی جو ہاؤس سرجنوں اور ٹریننگ حاصل کرنے والی لڑکیوں کے لئے وقف تھا۔ دوسرا ٹیلی فون جو دوسری طرف تھا، مریضوں اور ان کے سرپرستوں کے لئے وقف تھا۔ دونی ڈبے میں ڈال کر جس کا جی چاہے فون کر لے۔ اس دوسری طرف ہر وقت جھگڑا سا مچا رہتا۔ اس کے باوجود ٹیلی فون کا چپڑاسی پرائیویٹ کمروں کے مریضوں کو پیغام بھی پہنچا دیتا اور مریض خوش ہو کر اسے انعام بھی دے دیا کرتے۔ اس طرح خاصی آمدنی ہو جاتی مگر بھورے اس آمدنی اور اس ٹیلی فون، دونوں سے توبہ کرتا تھا۔ اس نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ اس

کی ڈیوٹی دوسرے ٹیلی فون پر تبدیل کر دی جائے۔ وہاں پر قریبی لیبر روم سے آتی ہوئی چیخیں صاف سنائی دیتیں۔ سب بدحواس سے نظر آتے مگر یہاں اس طرف بڑی بڑی محرابوں والے برآمدے میں ہر طرف سکون طاری رہتا۔ سامنے وسیع لان کے درختوں پر چڑیاں چہکا کرتیں۔ گرمیوں میں لُو کے گرم جھونکے بھی برآمدے تک آتے آتے ٹھنڈے ہو جاتے۔ سردیوں میں چمکیلی دھوپ گھنٹہ دو گھنٹے برآمدے میں لوٹتی رہتی، اور برسات میں جب چھم چھم بارش ہوتی تو کبھی کبھی بوچھار برآمدے کی محرابوں سے داخل ہو کر بھورے کے قدموں کو بھگو جاتی۔ یہاں کے سناٹے کے اور بھی بہت سے فائدے تھے۔ یہاں وہ آزادی سے جواں آیاؤں اور بوڑھی آیاؤں کی لڑکیوں سے عشق لڑا لیتا تھا۔ اتوار اتوار فلموں کے میٹنی شو دیکھنے کی وجہ سے اس کو عشق کرنے کے ہزاروں طریقے معلوم ہو گئے تھے۔ تنخواہ کا آدھا حصہ تحفوں میں خرچ کرنے کے بعد بھی بھورے کی زندگی بڑے مزے سے گزر رہی تھی اس کی زندگی میں صرف اس چیز کی کمی تھی کہ اس کی محبوبائیں فلمی ہیروئنوں کی طرح نہ تو اس سے محبت کرتی تھیں اور نہ باوفا تھیں بلکہ دلہنوں کی طرح بے وفا اور ہرجائی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اور بہت سوں سے بھی تحفے وصول کر لیتی ہیں، وہ اپنی محبوباؤں کو جی جان سے بدمعاش سمجھتا تھا۔ اسی لئے اس نے اب تک شادی نہ کی تھی اور نہ اسے شادی کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ مہاجر بننے کے بعد شادی کا تصوّر اس کے ذہن میں دھندلا کر رہ گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب بندر بارش میں بھیگتا ہے تو اسے گھر بنانے کا خیال آتا ہے مگر بھورے انسان تھا اور بارش سے سر بچا سکتا تھا اس لئے اسے گھر بنانے کی کیوں فکر ہوتی۔ ویسے بھورے کو شادی سے نفرت بھی نہ تھی البتہ شادی کرنے کے لئے جس قسم کی پاک دامن اور محبت کرنے والی بی بی کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے اب تک نظر نہ آئی تھی۔ اس لئے وہ زندگی سے خوش اور مطمئن تھا۔ مقدور بھر عیش کر رہا تھا۔ ملازمت میں بھی کوئی تکلیف نہ تھی سارا دن میلی پرانی آرام کرسی پر پڑا فون ریسیو کرتا یا مجر گایا کرتا۔ جب وہ سیتا پور میں تھا تو راتوں کو اپنی ٹولی کے ساتھ تھالی بجا کر ماہیے گایا کرتا تھا۔ اس کے ساتھی اس کی سپاٹ آواز کی تعریف کرتے تھے۔ یہ وہی تعریف تھی جس نے آج تک اس کا پیچھا نہ چھوڑا تھا۔ نئے فلمی گانوں سے اسے بڑی نفرت تھی وجہ یہ تھی کہ بڑی کوشش کے باوجود وہ ان ٹیڑھے میڑھے فلمی گانوں کی دھن نہ اُتار سکا تھا۔ ان دھنوں کی نقل کرتے ہوئے اس کی آواز جواب دے جاتی اس لیے اسے اپنے وہی پرانے گانے جی جان سے پیارے تھے۔ سیتا پور چھوڑے دس سال ہو گئے تھے۔ مگر وہ ان گیتوں کا ایک آدھ بول ہی بھول سکا تھا۔

لاہور میں بھورے بالکل اکیلا تھا۔ ماں باپ سیتا پور ہی میں مر چکے تھے اور خالہ جس نے اسے پالا تھا سیتا پور

ہی میں وہ گئی تھی۔ خالہ نے اس کے صرف ایک خط کا جواب دیا تھا۔ اس کے بعد بھورے نے کئی خط لکھے مگر کوئی جواب نہ آیا تو اس نے سمجھ لیا کہ بیچاری بوڑھی مر کھپ گئی ہوگی۔ دکھ پالو تو جوان ہو ہو کر ستاتے ہیں مگر پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دو تو فرصت مل جاتی ہے۔ بھورے بھی کچھ اسی طبیعت کا آدمی تھا لیکن جب سے اس کو یہ محبت کا روگ لگا تو دنیا ہی بدل گئی۔ آیائیں اور اس کالی لوکٹ نرس کی لونڈیا اس کے سامنے مٹک مٹک کر تھک گئیں پر بھورے نے ان کو کوئی تحفہ نہ دیا۔ ایسا جی اچاٹ ہوا کہ پھر نفیسہ بھی ان پر محبت کی نظر نہ ڈالی۔ رات اس کے کوارٹر میں آنے کا مژدہ سنا کر ٹپکا ئیں تو وہ جیسے بہرہ بن جاتا۔ اس طرح چار بیبیوں کے لئے آخر کو ان چھیچھے پھرتا رہتا۔ وہ سب بھی اسے پاگل سمجھ کر چھوڑ گئیں۔

پہلی بار جب اس نے ظہورن کو بے دردی سے دھتکارا تھا تو بظاہر اسے محسوس نہ ہوا تھا مگر جب وہ تھکے تھکے قدم ڈالتی اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی تو ذرا ہی دیر بعد بھورے کو ایسا لگا کہ ایک پھانس ہے جو دل کے پاس کھٹک رہی ہے۔

بھورے نے جی بہلانے کے لئے الاپنا شروع کیا۔

نہ تم سے دل کو لگاتے نہ غیر کہلاتے
گلوں میں بیٹھتے گلزار کی ہوا کھاتے

ہُوں ـــ ہُوں ـــ ہُوں ـــ ہُوں ـــ ارے ہاں مفت ہوئے بدنام سنور یا تیرے لئے۔ پھر وہ لمبی سانس لے کر میلی پرانی آرام کی کرسی پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ آج جنے ساری فون کرنے والیاں کہاں مر گئیں۔ اس نے اپنی سیکنڈ ہینڈ گھڑی کی طرف دیکھا۔ دس بج گئے ابھی تو کلاس بھی نہ ختم ہوئی ہوں گی ـــ تم کو تو مسٹر بھورے یوں ہی جلدی مچی رہتی ہے ابھی وقت ہی کیا ہے۔ وہ پاجیوں کی طرح مسکرایا۔ نیچی کرسی پر بیٹھ کر ادھر پہ ہاتھ مارنا بھورے کے بس میں نہ تھا مگر نظروں پہ کون اد بچ بیچ کی چھاپ لگا سکتا ہے۔ فون کرنے والیوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں مزے لوٹ لیا کرتا۔

فون کرنے والے بہت سے چہرے اس کے سامنے ناچ گئے۔ اس نے مسرت سے آنکھیں بند کر کے کرسی پر لیٹنے کے انداز سے پاؤں پھیلا دئے مگر لمحے بعد پھر وہی اکتاہٹ اور افسردگی اس کے دل میں گھمسان کا رن ڈالنے لگیں۔ آج تو کسی خیال سے بھی اسے پہلی جیسی خوشی نہ مل رہی تھی۔ وہ پھر گانے لگا۔

ہوائیں کوچے سے ہر طرح کی ترے آئیں ۔ سزائیں دل کے لگانے کی سینکڑوں پائیں

ہاں ہاں ـــــــ ہوں ہوں ـــــــ

مفت ہوئے بدنام سنوریا تیرے لئے

تیسرا مصرع بیتتے ہوئے برسوں نے ذہن سے نکال پھینکا تھا۔

چلی گئی تو کیا ہوگیا ؟ ایسی ایسی بہت پھرتی ہیں۔ مسٹر بھورے تم کو کیا کمی ہے ؟ مایوسی کے دن میں اس نے مسرت کا جھنڈا لہرانا چاہا اور پھر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس سائڈ پہ سالی کیسی خاموشی رہتی ہے۔ آج بھورے کو یہ جگہ بُری معلوم ہونے لگی۔ اس نے سوچا کہ وہ ادھر ہوتا، اس طرف کے ٹیلی فون پر اس کی ڈیوٹی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ ہر وقت آنے جانے والوں کا شور، عورتوں کے چیخنے چلانے کی آواز، سالے سارے خیال دیال بھاگ کھڑے ہوتے ہیں، دماغ میں تو جیسے بھر جاتا ہے۔ انسان کی ذات سے نفرت ہوجاتی ہے اور یہ عورت ذات کیسی ڈھیٹ ہوتی ہے۔ بچہ جنتے ہوئے کتنا شور مچاتی ہے۔ چیخ چیخ کر کان کھا لیتی ہے جنم جنم کے لئے بچہ پیدا کرنے سے توبہ کرتی ہے اور پھر سال کے اندر پیٹ پھلائے اسی اسپتال میں آتی نظر پڑتی ہے۔ کیسا عجب سا لگتا ہے۔

اور پھر جانے کہاں سے ایک خیال بھورے کے دماغ میں آگھسا۔ جو میں نے ظہوریا سے شادی کر لی ہوتی تو ایک وہ بھی یہاں آتی۔ میں ساری رات لیبر روم کے دروازے پر کھڑا اس کی چیخیں سنتا رہتا۔ جنے سنتا کہ بھاگ کھڑا ہوتا ! چیخوں سے تو دل دُکھتا ہے۔ بھورے نے لمبی ٹھنڈی سانس بھری۔ جنے کہاں چلی گئی ہو۔ اس عورت ذات کا دل تو دیکھو، اتنی بڑی دُنیا بنا دی اور اس کی کوئی عزت نہیں، کیسا دھتکار دیا تم نے بھورے۔

زور سے گھنٹہ بجنے کی آواز آئی۔ وہ سمجھ گیا کہ کوئی اور مریضہ آگئی ہے یہی طرف کے گیٹ کا چوکیدار سامنے کے لان سے ہوتا اس کی طرف آ رہا تھا۔ بھورے اُچک کر کھڑا ہوگیا۔ "کہئے سے آرہے ہو بادشاہو" اس نے ہنس کر ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے وقت بے وقت کے لئے پنجابی کے تھوڑے سے لفظ سیکھ لئے تھے جو وہ اپنی زبان کے ساتھ ملا کر استعمال کر لیا کرتا۔ "آؤ دوسو نیٹے ہو جائیں سگرٹ کے" بھورے نے جیب سے بگلا سگرٹ کی ڈبیا نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔

"یار تیرے تو مزے ہیں، ٹھاٹھ سے بیٹھا رہتا ہے" چوکیدار نے سگریٹ کا دُھواں اڑاتے ہوئے کہا "میرے پھاٹک سے ابھی ایک عورت کی لاش گئی ہے۔ بس جی خراب ہوگیا۔ ادھر وہ گئی ادھر دوسری آگئی بچہ جننے۔"

"ہاں" بھورے نے بجھی سی آواز میں کہا، اسے ایک دم خیال آیا کہ جب وہ پیدا ہوا تھا تو اس کی ماں بھی مرگئی

تھی۔ یہ بات اس کی خالہ نے اسے بتائی تھی۔

یار یہ عورت ذات کیسی جیالو ہوتی ہے۔" بھورے نے لمبی ٹھنڈی سانس بھری۔" لوگ تو یونہی بھی اس عورت ذات کے پیٹ میں بچہ ڈال دیتے ہیں۔ کتنا دکھ جھیلتی ہے یہ عورت۔" بھورے کا جی بھر رہا تھا۔ اسے پھر ظہورن یاد آ رہی تھی۔

"جیالو، اُونے رہنے دے، یہ عورت ذات بچہ نہ پیدا کرے تو جانو اس پر ساری دُنیا کا دُکھ پھٹ پڑتا ہے اپنی خوشی سے کرتی ہے، پھر اتنی گندی ہوتی ہے یہ عورت ذات۔" چوکیدار نے نفرت سے شانے سکوڑے اور جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر سرگوشی کے انداز سے بولا۔" ہیڑ کی پوری بوتل لے آیا ہوں۔ دل کرے تو رات میرے کوارٹر میں آجا، تجھے بھی چاند ستارے دکھا دوں

بھورے صرف ہنس کر رہ گیا۔ اس وقت اسے چوکیدار کی کوئی بات اچھی نہ لگی تھی۔ اس وقت تو اسے اپنی ماں یاد آرہی تھی۔ بھلا ماں کس طرح گندی ہو سکتی ہے اور پھر یہ پینے پلانے کی بات۔ اس نے ایک دن پی تو تھی مگر ذرا سی پی کر گھوم گیا تھا۔ اسی دن مس زیدی آگئی تھیں۔ وہ کرسی سے بھی نہ کھڑا ہوا اور بیٹھا گاتا رہا تھا "کیسے تیرا ذار ہو سیدھا نوکر لو تیر کو" مس زیدی نے اسے بڑے زور سے ڈانٹا تھا۔" تم کو کیا ہو گیا ہے۔ تمہاری رپورٹ ہوگی"

"دارو پلانے دی اپنے یار نے مائی ڈیر مس صاحب" نشے کی حالت میں وہ اردو انگریزی اور پنجابی کے سارے الفاظ بھول گیا تھا اور صرف اپنی مادری زبان یاد رہ گئی تھی۔ مس زیدی کو ایک دم ہنسی آگئی تھی تو وہ گڑگڑا کر رونے لگا تھا۔

"آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا۔ تم تو بہت اچھے ہو بھورے" مس زیدی فون کر کے چلی گئیں تو بھورے اسی فکر میں دم بخود پڑا رہا تھا کہ کہیں اس کی شکایت نہ ہو جائے مگر مس زیدی نے شکایت کرنے کے بجائے خوب قہقہے لگائے تھے اور سب کو بتایا کہ بھورے پی کر ان کے تیر سیدھے کر رہا تھا۔

ادھر اُدھر کی باتوں کو یاد کرتے کرتے بھورے نے تھک کر سامنے دیکھنا شروع کر دیا۔ اوپر کی سیڑھیوں پہ کھٹ کھٹ ہو رہی تھی وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس آواز سے وہ سمجھ جاتا کہ کوئی فون کرنے آرہا ہے۔ برآمدے کے اوپر والی منزل پہ بہت سے کمرے تھے جہاں طالب علم اور ہاؤس سرجن لڑکیاں رہتی تھیں۔ وہ ان سب کے نام اور ہسٹریاں تک جانتا تھا۔ کون کسے فون کرتا ہے۔ کون کس کا دوست ہے۔ کون محبت میں کامیاب ہو گیا ہے اور کون ناکام۔ رات کس نے آنسو بہائے تھے۔ کس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں، کون سکون سے سویا تھا۔ کس کا ملنے والا آیا تھا۔ کون سی

فلم دیکھی تھی۔ شادی کا کب ارادہ ہے۔

مس لال خاں مسکراتی ہوئی فون کے پاس آئیں تو بھورے کھڑا ہو گیا۔ ہلو، ناصر لعل رہے ہو، ہوں ہوں نہیں بھئی، ہاں نے یں مر گئی تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ اچھا کل ضرور آنا، خدا حافظ۔

مس لال خاں کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں آپ ہی آپ مندی جا رہی تھیں۔

مس لال خاں کے جانے کے بعد بھورے نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ سب یہی کرتے ہیں، سب ایک جیسے ہوتے ہیں بھورے۔ ظہورِ یا کب آئے گی؟ وہ آئے گی تو وہ اسے سینے سے لگا لے گا —— ارے! وہ اپنے اس خیال پر چونک پڑا۔ بھلا اسے یہ خیال آیا ہی کیوں وہ تو خواہ مخواہ اسے یاد کر رہا ہے۔

دکھی آپا کی لڑکی بڑے ٹھسّے سے اس کی طرف آ رہی تھی۔ بھورے نے شوق سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ لجاتی ہوئی اس کے پاس کھڑی ہو گئی۔ بھورے نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔

"ابھی بازار نہیں گئے، کب لاؤ گے میرا کپڑا؟" وہ اترا رہی تھی۔

بھورے نے اس کے بھرے بھرے جسم پر کئی چٹکیاں لے لیں —— "لا دوں گا ڈیئر۔"

برآمدے کے پرلی طرف کوئی آ رہا تھا۔ لڑکی جیسے بڑی مصروفیت کے ساتھ جلدی سے آگے بڑھ گئی اور بھورے کو محسوس ہوا کہ اس کی طبیعت خدا کمل گئی ہے۔

سکون کی ایک سانس لے کر وہ کرسی پر پھیل کر لیٹ گیا۔ دوپہر ہو چکی تھی۔ اس نے سوچا کہ کل آپا کی لونڈیا کو کچھ نہ کچھ ضرور لا دے گا۔ اسے اپنی انگلیوں میں چٹکیوں کی لذت محسوس ہو رہی تھی۔

ایک بار پھر گھنٹے کی تیز آواز گونجی تو اتنی مشکل سے پیدا کی ہوئی لذت ایکدم رفوچکر ہو گئی۔ اس کا جی دُکھ گیا۔ اسی طرح تو ظہوریا بھی آتی ہو گی۔ اکیلی چپ سی رہتی ہو گی اور کوئی دور دور پوچھنے والا نہ ہوتا ہو گا۔

اس کی نظر برآمدے کے اس ستون کی طرف اٹھ گئی جو اس کے ٹیلی فون سے تھوڑی دُور تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس وقت بھی ظہورن وہاں لیٹی ہے ——

وہ برسات کی ایک دوپہر تھی۔ اس دن ہوا بند تھی اور مارے امس کے جی گھٹا جا رہا تھا۔ بھورے اپنی کرسی پر بیزار پڑا اونگھ رہا تھا۔ اس وقت اسے محسوس ہوا کہ کوئی دبے قدموں اس کے پاس سے گزر گیا ہے۔ اس نے آنکھ کھول دی۔ چوڑی چوڑی نیلی دھاری کی قمیض اور مردانہ سا پاجامہ پہنے جنرل وارڈ کی کوئی مریضہ ستون کے پاس دری کا ٹکڑا بچھا رہی تھی۔ وہ تو سمجھا تھا کہ کوئی اس کی اپنی ہو گی اور ذرا دیر وقت مزے سے گزر جائے گا۔ اس نے بڑی

بے اعتنائی سے مُنہ پھیر کر دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ جنرل وارڈ کی زچائیں گرمی سے گھبرا کر ادھر آجاتیں۔ کھلی فضا اور سناٹے میں ذرا دیر غفلت کی نیند سو کر چلی جاتیں۔

بادلوں کے ہلکے ہلکے ٹکڑے آسمان پر اس طرح پھیلے ہوئے تھے جیسے راہ میں دُھول اڑ رہی ہو۔ سامنے لان میں بڑھی ہوئی گھاس پر ایک بد بد جانے کیا چگ رہا تھا اور بڑے اونچے پر کوئی چیل پر پھیلائے اُڑی جا رہی تھی۔ اس وقت بھورے نے اُکتا کر آنکھ کھول دی۔ ساری قمیض پسینے سے تر ہو رہی تھی اور وہ عورت بھی اب اُٹھ کر برآمدے کے ستون سے سر ٹیکے بیٹھی جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ بادلوں کے دو چار چھوٹے چھوٹے سیاہ ٹکڑے کہیں دُور سے سفر کرتے ہوئے سامنے آ گئے تھے۔

عورت ہولے ہولے گانے لگی۔

بنوا تلے ڈولا رکھ دے مسافر آئی ساون کی بہار رے

بھورے نے چونک کر ادھر دیکھا اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ عورت اسے سنانے کے لئے گا رہی ہے۔

اپنے محل میں گڑیاں کھیلت تھی سیاں نے بھیجے کہار رے۔

عورت کی آواز ذرا سی اونچی ہو گئی مگر اس کا سر اسی طرح برآمدے کے ستون سے ٹکا ہوا تھا۔ ویسے تو بھورے کو اسپتال میں آ کر بچے پیدا کرنے والی عورتوں سے ذرا دلچسپی نہ تھی مگر آج جانے کیوں اس عورت کا وجود اس کے لئے کشش کا باعث ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ عورت ہو گی مزے دار مگر سی سے اُچک اُچک کر دیکھنے کے باوجود اسے اس کا چہرہ نظر نہ پڑا۔ ستون اس کے چہرے کی آڑ کر رہا تھا۔

بھورے شرارت سے کھنکارا اس وقت وہ بھول گیا تھا کہ اس حرکت پر اس کی شکایت بھی ہو سکتی ہے۔ اسے یقین تھا کہ عورت صرف اسے سنانے کے لئے گا رہی ہے۔ آخر ادھر بھی تو عورتیں تھیں کراہتی کراہتی آتیں اور لیٹتے ہی آنکھیں بند کر لیتیں۔ گانے کوئی نہ بیٹھتا۔

کھنکار نے کی آواز پر عورت یوں چُپ ہو گئی جیسے سچ مچ ڈولے میں سوار ہو کر سیاں کے گھر چلی گئی ہو۔ چند منٹ تک وہ یوں ہی سر ٹیکے خاموش بیٹھی رہی۔ پھر دری کا ٹکڑا سمیٹ کر کھڑی ہو گئی۔

جب وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بھورے کے پاس سے گزرنے لگی تو اس نے بڑی نفرت سے بھورے کی طرف دیکھا اور پھر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ "ارے تو سیتا پور کا بھورے ناہیں ہے ؟

"اور تو ظہورن ہے نا ؟"

دونوں کی نظروں میں اضطراب تھا۔ عورت نے شرما کر دوپٹہ ماتھے تک کھینچ لیا اور نظریں جھکا لیں۔ بھورے کرسی سے اُچھلا اور پھر بیٹھ گیا۔ کلیجے پر چوٹ سی لگی۔

وقت نے پلٹ کر دیکھا۔ بھورے کی خالہ نے ظہورن کی پیدائش پر ٹھیکرے میں پیسہ ڈال کر دیا تھا۔ اس طرح ظہورن ساری برادری کی نظروں میں بھورے کی ہو گئی تھی اور جب ظہورن بارہ سال کی ہوئی تھی تو بھورے کو دیکھ دیکھ کر شرمانے لگی تھی۔ وہ اپنی بھیگتی ہوئی مسوں پر ہاتھ پھیر کر سخت احمقوں کی طرح ہنستا تھا۔ پھر جب ظہورن چودہ پندرہ برس کی ہو گئی تھی تو اپنے ساتھ کھیلنے والی لڑکیوں سے پیغام بھجواتی تھی کہ ظہورن تیرا انتظار کر رہی ہے۔ ڈولا لے کر کب آئے گا۔ بھورے محنت مزدوری کر کر کے کوڑی کوڑی بچا رہا تھا کہ گھر آباد کر لے۔ خالہ کے لئے خدمت کرنے کو کوئی آ جائے اور پھر یہ کہ ظہورن اسے اچھی بھی لگنے لگی تھی۔ اسی زمانے میں ملک آزاد ہو گیا۔ بھورے لاکھوں کمانے کے لئے لاہور آ گیا اور کئی سال دھکے کھانے کے بعد اسپتال میں نوکر ہو گیا۔ لاہور کی رنگین زندگی اور تنہا شخص۔ ظہورن تو خواب کی طرح یاد رہ گئی تھی اور سیتاپور، ۔۔۔ بھلا کیا رکھا تھا۔ سیتاپور میں سارا دن سڑکوں پر دھول اڑا کرتی۔ راہ گیر درختوں تلے گٹھڑیاں، سرہانے رکھ کر سوتے رہتے اور درختوں پر بیٹھے ہوئے بندر اس تاک میں دیدے گھماتے رہتے کہ کیا اُچک لے جائیں۔ بابو لوگوں کے تھوڑے سے بنگلے، پرانی وضع کے دو چار مندر، لڑکیوں کا ایک کالج جہاں رات گئے تک کیرتن کی آواز آتی رہتی۔ بھلا کون یاد رکھتا ہے اس سیتاپور کو؟

مگر اب جبکہ ظہورن اس کے سامنے کھڑی تھی تو اس کے دل پر چوٹ سی لگی۔ ظہورن کسی دوسرے کی ہو گئی۔ وہ جیسے بھورے کی خالہ نے ایک آنہ ٹھیکرے میں ڈال کر بھورے کے لئے خرید لیا تھا اور اب اُس کے ایک آنے کے بدلے میں اس سے وفاداری نہ پا کر دکھ سے تلملا اُٹھا تھا۔ اس اسپتال میں آنے کے بھلا کیا مطلب ہیں۔ یہی نا کہ بچہ پیدا کرنا ہوتا ہے یا پھر کسی زنانے مرض کا علاج۔

”کیسے آنا ہوا اسپتال میں؟“ بھورے نے تصدیق کرنی چاہی۔

مگر ظہورن کچھ نہ بولی۔ سر جھکائے ساکت کھڑی رہی، پھر نظریں اُٹھا کر بھورے کو بڑی دُکھی دُکھی نظروں سے دیکھ کر لان کی طرف دیکھنے لگی جہاں ایک پیاسی ٹٹیری شور مچاتی اُڑی جا رہی تھی۔

”مینہ برسے گا، ٹٹیری چہک رہی ہے۔“ ظہورن نے دھیرے سے کہا۔

”ہوں!“ بھورے کو اپنے دُکھ میں اچانک کمی کا احساس ہونے لگا۔ کیا کہتی تھی خالہ۔ ٹکے کی ہنڈیا گئی، کتے کی ذات پہچانی۔

چاچا چاچی کہاں ہیں؟ سب کیسے ہیں؟ بھورے نے دُنیا کی باتیں کرنا شروع کر دیں مگر ظہورن کی میلی میلی آنکھوں میں ایک دم آنسو آ گئے۔ وہ بھورے کے قدموں کے پاس نیچے فرش پہ پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔ ایسی تھکی حال نظر آ رہی تھی جیسے کوسوں دور سے چل کر آ رہی ہو، بھوکی پیاسی، پیروں میں چھالے ــــــ "اماں آتے جیتے میں مر گئی۔ دو سال ہوئے کہ بابا بھی ٹرک تلے آ کر اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اس دوسرے بڑے اسپتال میں تین دن تھا۔" اس نے دوپٹے کے پلو سے آنسو خشک کر لیے

بھورے نے نظریں جھکا لیں۔ ظہورن کو اس حال میں دیکھ کر اسے بھی افسوس ہو رہا تھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر کچھ نہ کہہ سکا۔

صد ماں گزر گئیں مگر ان دائمی جدائیوں کے دکھوں کو ہلکا کرنے کے لئے آج تک کوئی لفظ ایجاد نہ ہو سکا۔

زینوں پر لوہے کی بیل کھٹ کھٹ کر رہی تھی۔ بھورے سنبھل کر کرسی پہ بیٹھ گیا۔

مس رضیہ فون کرنے آ رہی تھیں۔ وہ کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ ظہورن سر جھکائے اسی طرح بیٹھی رہی۔

"کون ہے یہ؟" مس رضیہ نے رسیور اُٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"اپنے سیتاپور کی ہے مس صاحب۔" بھورے نے کہا۔ ظہورن نے نظریں جھکا لیں۔ "یہ سہر کی جندگی کچھ نہیں ہوتی، سیتاپور میں سارے لوگ جانتے تھے کہ ظہورن بھورے کی کیا لگتی ہے۔" ظہورن نے ٹھنڈی سانس بھری۔

مس رضیہ فون کر کے چلی گئیں تو بھورے پھر بیٹھ گیا۔ اس نے ظہورن کی طرف دیکھا جو بڑی معصومیت سے چہرہ نہ جانے کس طرح اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ دھیرے دھیرے کہنے لگی "جب سے کھالہ کے پاس لاہور آیا تھا بس اسی روز سے میں بابو سے کہنے لگی تھی کہ تو بھی لاہور چل۔ تیرے بنا سیتاپور جنگل لگتا تھا۔ تو بہت یاد آتا تھا۔ اماں نے سادی کے جو کپڑے بنوائے تھے وہ اب تک کلیجے سے لگا کر رکھ چھوڑے ہیں۔ کبھی تن کو نہیں لگائے، بابو نے تجھے اس لاہور میں سب جگہ تلاش کیا پر تو نہ ملا۔ بڑے سہروں میں کتنا آدمی لبتا ہے پر اماں کو بنت دے کہا کرتی تھی کہ جی سے ڈھونڈو تو کھدا بھی مل جاتا ہے۔ سچ کہتی تھی اماں" وہ مسکرانے لگی۔

"چھوڑ دان باتوں کو اب، پرائی ہو کر ایسی باتیں کیوں کرتی ہے؟" بھورے جھلا اُٹھا۔ یہ عورت ذات بھی بڑی ... ہوتی ہے۔ اب نخرے کر رہی ہے۔

"یہ تو کہہ رہا ہے؟" ظہورن نے جانے کیسی سرشاری سے آنکھیں بند کر لیں۔ "میں تو جی جان سے تیری ہوں بھورے" ری جان سے کانپنے لگی۔ پہلے بیمار چہرے پر ہلکی سی سُرخی رینگ گئی اور بھورے نے اپنے سیتاپور میں دیکھا کہ ایک

چمپئی رنگ کی لڑکی سرخ اوڑھنی اوڑھے کواڑوں کی اوٹ سے اس کو تاک رہی ہے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لے۔

اس نے پوری آنکھیں کھول کر ظہورن کو دیکھا۔ یہ جی جان کو لے کر کیا کرنا ہے۔ اب ایسی باتیں یاد کرنے سے کیا فائدہ ہوگا ــ "تم اسپتال کیوں آئی ہو؟" اس نے پھر اچانک سوال کیا۔

ظہورن نے آنکھیں کھول دیں اور ادھر اُدھر دیکھنے لگی ــ "دیکھو اب تو بادل گھر کر آ گئے ہیں۔"

"اصلی بات کیوں چھپاتی ہے۔ کہہ دے نا کہ جب میں نہیں ملا تو تیرے باپ نے دوسرے کے ہاتھ پکڑا دیا، ایکڑ سوں والے نخرے نہ مار اب۔" اسے غصہ آ گیا تھا۔

"واہ رے" ــ اس نے غرور سے سر اونچا کر لیا ــ جہورن ایسی نہیں کہ ایک کے بعد دوسرا خصم کر لے۔ میری شادی تو تیرے ساتھ ہو چکی تھی۔ تیری کھاطر اپنا دیس چھوڑا، ماں باپ چھوٹے، ماں یہاں نہ آتی تو ہیجہ کیوں ہوتا، بابو ٹرک ملے کیوں آتا" ــ وہ روٹھی ــ یہ سب تو جبر دستی ہے، بابو کے بعد کون دیتا روٹی، کوٹھوں میں کام کر کے پیٹ بھرتی تھی، پر بھورے یہ سہری بابو بڑے کھراب ہوتے ہیں۔ ہر سال اس اسپتال میں آ کر بچے جنتی ہوں۔ مر مر کر جنتی ہوں۔ بابو صاحب اپنے کسی ہیرے کھانسامے کو میرا سوہر لکھا جاتے ہیں۔ اس بار وہ کھانسامہ کہتا تھا کہ جہورن ایسے کب تک چلے گا میرے ساتھ دو بول پڑھا لے۔ تجھے لے کر دور بھاگ جاؤں گا۔ پر میں ایسا کر سکتی تھی؟" ــ وہ سسکیاں بھرنے لگی اور پھر ڈوبتی ہوئی آواز میں بولنے لگی ــ "اب تو مل گیا ہے بھورے اب میں کہیں نہ جاؤں گی، دیکھو برتن مانجھ مانجھ کر ہاتھ گھس گئے۔" اس نے بے بسی سے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے اس کی ہتھیلیوں میں مشقت کے گھٹے پڑے ہوئے تھے اس نے اپنا سر گھٹنے پر ٹیک لیا اور گھٹی گھٹی سسکیاں بھرنے لگی۔

بھورے چپ چاپ بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ جیسے وہ کوئی راہ چلتا اجنبی تھا۔ ساری لگاوٹ اور حسد رفوچکر ہو چکا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس ظہورن سے اب اس کا کیا واسطہ ہو سکتا ہے۔ یہاں تو جانے کتنی اس کے پیچھے پھرتی ہیں۔ اس کی کون سی خواہش ہے جو پوری نہیں ہو جاتی۔ اس نے تو یہ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کوئی ایسی ویسی عورت اس کی بیوی بن جاتی مگر اب یہ ظہورن جانے کتنے حرامی بچے جن کر اسے بیتی باتیں یاد دلانے آئی ہے۔

رونے رونے ظہورن نے خود ہی چپ ہو کر آنسو پونچھ لیے۔ شاید وہ انتظار کر رہی ہوگی کہ اب بھورے اسے چپ کرائے گا۔ اب اپنے لٹھیں رومال سے آنسو پونچھے گا، اب اسے تسلی دے گا۔

آنسو پونچھ کر وہ اسے ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی اور بھورے اس سے نظریں بچا رہا تھا۔ بھلا ظہورن بھورے کی بیوی

بن سکتی ہے! بھورے جس کی اس برآمدے اور ٹیلی فون پر حکمرانی ہے۔ ذرا کبھی ظہورن دیکھی تو، وہ کس شان سے رسیور اٹھا کر ہلو کہتا ہے اور کتنی لڑکیاں اس کے پیچھے پھرتی ہیں۔

"تو پھر تو اسی خانساماں سے شادی کر لے ظہورن" بھورے نے بڑی ہمدردی سے مشورہ دیا۔ "میں نے تجھ سے شادی کی تو لوگ کیا کہیں گے" وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگا

"ارے۔ تو کیہ رہا ہے ؟" اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے بھورے کو دیکھا اور پھر کھڑی ہو گئی "جا رے میرا نام جھورن ہے۔

میری سادی جو ہونی تھی سو ہو گئی۔ میں تیری جیسی نہیں ہوں۔ باد ہ لے لے جو دوسری سادی کر دل ——"

اس نے بڑے غرور سے سر جھٹکا —— "جھورن جندگی بھر تیرے نام پہ بیٹھی رہے گی اور دوسروں کے بچے اسی اسپتال میں آکر پیدا کرے گی۔ یہ سب کسمت کے کھیل ہیں رے"۔

وہ ایک بار پھر تڑپ کر رو دی مگر جلدی سے آنسو پونچھ کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس کا کمزور جسم کانپ رہا تھا۔ "اماں کو اللہ جنت نصیب کرے، کہتی تھی کہ جھورن ڈھونڈے سے تو کھدا بھی مل جاتا ہے۔ جانے لوگ ایسی کہاوتیں کیوں بناتے ہیں" اس نے مایوسی سے سر جھکا دیا۔ ایک لمحے تک یوں ہی کھڑی رہی۔ پھر اس نے بھورے کو ایسی نظروں سے دیکھا کہ اسے اپنا کلیجہ ہلتا ہوا محسوس ہونے لگا مگر جب وہ کچھ کہنا چاہتا تھا تو ظہورن بڑی تیزی سے اپنے جھانکڑ جیسے جسم کو لہراتی برآمدے کے اس سرے پر جا چکی تھی۔

بھورے دیر تک برآمدے کے اس موڑ کو دیکھتا رہا جہاں ظہورن کھو گئی تھی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو جیسے چونک پڑا۔

"مس زیدی آج چھٹی پہ ہیں، جی، کہیں گئی ہیں یہاں نہیں ہیں" بھورے نے پہلی بار اپنی ڈیوٹی سے بے ایمانی کی پھر وہ ظہورن کو ٹھکرانے والا پہلا دن یوں ہی اچاٹ اچاٹ سا گزر گیا۔ وہ لاکھ گاتا رہا۔

نہ تم سے دل کو لگاتے، نہ غیر کہلاتے
گلوں میں بیٹھتے، گلزار کی ہوا کھاتے

پھر بھی اس کا دل بجھا بجھا رہا۔ شام ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد وہ جیسے خود بخود کھنچتا ہوا جنرل وارڈ کی طرف چلا گیا۔ آیا نے اسے بتایا کہ اس نام کی عورت تو گھنٹہ پہلے چھٹی لے کر چلی گئی۔

چلی گئی تو کیا ہو گیا؟ وہ بھلا اسے پوچھنے آیا ہی کیوں تھا؟ بھورے نے اپنے آپ سے پوچھا اور پھر واپس ہوتے

ہونے اس نے لہک کر گانا چاہا مگر گا نہ سکا۔ اس پر ایک دم مایوسی کا دورہ سا پڑنے لگا۔ ادھر اُدھر پھرنے کے بجائے اپنی کوٹھری میں جا کر بے سدھ سا پڑ رہا۔

جب اندھیرا پڑنے لگا تو سیتا پور کی ظہورن سرخ اوڑھنی اوڑھ کر کوٹھری کے ادھ کھلے دروازوں سے تانک جھانک کرنے لگی۔ بھورے بلبلا کر اٹھا اور زنجیر چڑھا کر اپنے حساب ایک بار پھر ظہورن کو دھتکار دیا۔

باہر بڑے زور سے بارش ہو رہی تھی۔ کوئی ہولے ہولے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ بھورے کو یہ بھی وہم لگا۔ اس نے اپنے آپ کو دو چار موٹی موٹی گالیاں دیں اور کروٹ لے کر مُنہ چھپا لیا۔ وہ یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ کئی دن پہلے اس نے جمادارنی کی سب سے چھوٹی ساتویں بیٹی کو اپنی کوٹھری میں آنے کی دعوت دی تھی اور اب وہ باہر کھڑی اپنے اکلوتے بوسیدہ جوڑے کو نچوڑ نچوڑ کر بیتابی سے دروازے پیٹ رہی تھی۔ ظالم بارش کا ایک ایک قطرہ روپے کی طرح کھنک کر اسے چڑا رہا تھا۔

بھیگتے بھیگتے تھک کر جب ساتویں بیٹی واپس لوٹ رہی تھی تو مارے دُکھ کے رو رو کر بھورے کو کوس رہی تھی ـــــ مرجانے لاش اُٹھے، ایک روپیہ دینے کا وعدہ کر کے مکر گیا۔

اور پھر یوں ہوا کہ پہلے دن اور پہلی رات والی کیفیت بھورے کے دل و دماغ پر نقش ہوتی چلی گئی۔ اس نے ظہورن کو جھنجھلا جھنجھلا کر لاکھوں بار دھتکارا۔ جمادارنی کی ساتویں بیٹی کو ایک کے بدلے میں تین روپے دے ڈالے۔ کالی لوکٹ نرس کی لونڈیا کو جمپر کا ایک کپڑا بھی لا دیا۔ فرصت کے وقت خوب لہک لہک کر اپنے محبوب گانے بھی گاتا رہا مگر کہتے ہیں کہ بھتر کا لکھا ہوا نہیں مٹتا۔ ظہورن کی محبت پتھر کی تحریر بنتی گئی ـــــ بھورے میں تیری ہوں، یاد رکھ لے جو دوسری شادی کروں، تیرے نام پہ بیٹھی رہوں گی اور دوسروں کے بچے اسی اسپتال میں آ کر پیدا کرتی رہوں گی

پھر ـــــ برسات بیت گئی۔ سردیاں آ کر گزر گئیں۔ بہار منہ موڑ گئی اور جب گرمیاں آ گئیں تو بھورے نے انگلیوں پر پورے مہینے گنے۔

اس دن جب گیٹ کے چوکیدار نے کسی حاملہ عورت کی آمد پر گھنٹہ بجایا تو بھورے بے تابی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ برآمدے کے قریبی موڑ کو کاٹ کر وہ ادھر پہنچ گیا جہاں آیائیں پہیوں والے اسٹریچر کو گھسیٹتی ہوئی لاتیں اور مریضہ کو اس پر ڈال کر لے جاتیں۔

دن میں کئی بار گھنٹہ بجتا۔ جانے کون کون آتا مگر ظہورن نہ آئی۔ بھورے نے سوچا، ایسے کاموں میں دیر دیر

تو ہو ہی جاتی ہے ۔ واپس آکر وہ بڑی امنگ سے گاتا ۔

بچھڑے ہوئے ملیں گے پھر خالق نے گر ملا دیا

مئی جون کی گرمیاں گزر گئیں مگر بھورے کے انتظار میں کوئی فرق نہ آیا۔ مس لال خاں اپنے عاشق سے بے وفائی کر کے، کسی دوسرے سے شادی رچا کر اسپتال چھوڑ گئی تھیں۔ مس زیدی کو دوسرے اسپتال میں زیادہ بہتر جگہ مل گئی تھی۔ بہت سی پرانی لڑکیاں چلی گئیں، بہت سی نئی آگئیں۔ جنرل وارڈ کی بھنگن کی سب سے چھوٹی ساتویں بیٹی جانے کس کے ساتھ بھاگ گئی تھی مگر بھورے کو ان باتوں سے کوئی مطلب نہ تھا۔ اس نے جانے کتنی بہت سی چیزیں ظہورن کے لئے کوٹھری میں جمع کر رکھی تھیں جن میں ایک سُرخ جوڑا بھی تھا ۔

آج بادل چھا رہے تھے ۔ پیاسی مٹی تپتی ہوئی اُڑی جا رہی تھی۔ ظہورن دری کا ٹکڑا اٹھائے بھورے کے سامنے سے گزر کر ستون کے پاس جا رہی تھی۔ بھورے نے آنکھیں ملیں ــــــ کب آئے گی ظہورن یا ؟ کب آئے گی ــــــ اس نے ایک بار پھر انگلیوں پر دن گنے۔ پورے بارہ مہینے ہو رہے تھے۔

بھلا بھورے کو کیسے معلوم ہوتا کہ ایک مہینے پہلے سرخ کھدر کی چادر سے منہ چھپائے جو عورت تانگے پر آئی تھی اور جسے آیاؤں نے بڑی مشکل سے لاد کر اسٹریچر پر ڈالا تھا، وہ ظہورن تھی جس نے اپنا نام کمبزن لکھایا تھا اور جو خون کی انتہائی کمی کی وجہ سے مر گئی تھی اور صاحب کا نامزد شوہر ظہورن کی لاش کو طالب علم لڑکوں کے لئے چھوڑ کر چلا گیا تھا ۔

پورے بارہ مہینے۔ بھورے نے سوچا کہ اب وہ ضرور آتی ہوگی ــــــ آج نہیں تو کل آجائے گی۔ اس نے بڑے سکون سے پاؤں پھیلا دیئے اور لہک کر گانے لگا۔

بچھڑے ہوئے ملیں گے پھر خالق نے گر ملا دیا

گودی، خشکی گھوڑے پر سوار تھی

رحمان شاہ عزیز

منور جہاز خشک گودی میں کھڑا تھا۔ دو ماہ کی طویل، مفصل اور مکمل مرمت رنگ و روغن اور ٹیپ ٹاپ کے بعد پانی میں دوبارہ اتارے جانے کے لئے تیار۔

نمبرون جو جہاز پر کپتان کے بعد سب سے سینئر افسر تھا اس وقت نہایت ہشاش بشاش اور چاق و چوبند نظر آرہا تھا۔ وہ ایک جہازی کو اپنے ساتھ لئے، جہاز کے مختلف حصوں کی جانچ پڑتال میں مصروف تھا۔ وارڈ نمبر۲ روم میں تین افسر تاش کی گڈی سامنے میز پر رکھے نمبرون کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ شام کو ڈنر سے پہلے ان کے لئے اور کچھ کرنے کو تھا ہی نہیں اور جہاز بالکل خالی تھا۔ نمبرون اور ان تین افسروں کے علاوہ صرف چند جہازی تھے جنہیں رات کے وقت گارڈ ڈیوٹی کے لئے تعینات کیا گیا تھا۔ کپتان سمیت باقی تمام عملہ شہر میں ان کے لئے مہیا کی ہوئی رہائش گاہوں کو جا چکا تھا۔ یوں تو جہاز ایک اچھے خاصے بستے شہر کی مانند ہوتا ہے لیکن اس وقت جب کہ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے خشک گودی میں اس کی حالت اس اجڑی ہوئی سنسان بستی کی سی تھی جس کے باشندے کسی وبا پھیلنے کی وجہ سے اپنا اپنا گھر بار چھوڑ کر بھاگ گئے ہوں۔ خشک گودی کا منظر کسی غیر ویران بستی کا سا تھا۔ دن کو یہاں بڑی رونق اور چہل پہل تھی۔ کام پر جٹے ہوئے ہزاروں مزدوروں کی آوازیں، فیکٹریوں کی چیخ چلہاڑ، ہتھوڑوں کی ٹھک ٹھک، ویلڈنگ، کٹنگ اور ڈینٹنگ کا زور و شور، ساتھ ہی دہارت پر چلتی ہوئی موٹر گاڑیوں، ٹرینوں، انجنوں اور کرینوں کا بے پناہ شور، جو کام کے ختم ہوتے ہی ایک دم بند ہو گیا تھا اور دن بھر کا وہ سارا خروش اور ہنگامہ شام کی خاموش اور اداس فضا میں معلق ہو کر رہ گیا تھا۔

جب نمبرون دروازہ کھول کر وارڈ روم میں داخل ہوا تو تینوں افسر بیک آواز بولے "دروازہ جلدی سے بند کیجئے۔ پلیز۔ اُف! کس قدر سرد ہوا آرہی ہے اس طرف سے!" فروری کے شروع میں ایسی سردی شاذ و نادر

ہی ہوا کرتی ہے۔ مبرون جس نے اس وقت اوورکوٹ پہنا ہوا تھا، دروازہ بند کرتے ہوئے بولا "یہ کوئٹہ کی ہوا ہے کم بخت، جس نے ہر چیز کو خشک اور یخ بستہ کر دیا ہے۔"

"اچھا تو پھر ہو جائے بازی؟" ایک افسر نے تاش اٹھا کر پھینٹتے ہوئے مبرون سے کہا۔

"ابھی نہیں۔ ابھی فرصت کہاں!" مبرون نے جواب دیا "ابھی تو مجھے کیپٹن کو اطلاع دینی ہے، ٹیلیفون پر جہاز کی تازہ ترین صورتِ حال کے بارے میں۔ اور آپ جانتے ہی ہیں کہ یہاں سے فون کرنے کے لئے وہاں پر جانا بھی تو ایک مہم ہے!"

"اسٹیوورڈ!" اس نے کھڑے کھڑے آواز دی۔

"یس سر!" اسٹیورڈ خالی ٹرے ہاتھ میں لئے حاضر ہوا۔

"اچھا بھئی، کیا آپ میں سے کوئی شخص میرے ساتھ ڈرنک میں شریک ہوگا؟" اس نے تینوں افسروں کی جانب دیکھ کر کہا۔

"شکریہ، شکریہ مبرون! آپ شوق فرمایئے۔ ہمارے گلاس پہلے ہی سے فل ہیں۔"

"ایک چھوٹا پیگ برانڈی۔ ہینیسی برانڈی ہو یا کونیئک۔" اس نے اسٹیورڈ کو آرڈر دیا۔

"برانڈی سوڈے کے ساتھ، سر!"

"نو۔ نو۔ نیٹ۔ بس تھوڑا سا پانی ساتھ الگ لے آنا۔"

اسٹیورڈ نے برانڈی کا پیگ پیش کیا۔ مبرون نے اس میں تھوڑا سا پانی ملایا۔ پھر گلاس اٹھا کر چیریو کہتے ہوئے پورا گلاس غٹا غٹ چڑھا گیا اور سامنے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

"چلئے تو ہم کٹ تھروٹ ہی کھیلتے ہیں جب تک وہ واپس آئے۔" افسروں میں سے ایک نے کہا۔ انہیں معلوم تھا کہ خشک گودی میں کھڑے ہوئے جہاز میں سے فون کرنا بھی ایک مرحلہ ہوتا ہے۔ فون جہاز پر نہیں بلکہ ہارف پر بنے ہوئے ٹیلیفون بوتھ میں لگا ہوا تھا اور وہاں تک پہنچنے کے لئے آدمی کو جہاز کے اونچے لیڈر پر سے پہلے گودی کے فرش پر اترنا اور پھر وہاں کی سیڑھی پر چڑھ کر اوپر جانا ہوتا ہے۔

مبرون جب واپس آیا تو وہ سردی سے کانپ رہا تھا لیکن پہلے سے کچھ زیادہ ہی خوش نظر آرہا تھا۔ اس نے آتے ہی اپنے لئے ایک اور ڈرنک کا آرڈر دیا۔

"فون تو نہ ہو سکا۔ انگیج تھا۔" اس نے بتایا۔ "کچھ دیر بعد پھر کوشش کروں گا۔ لیکن یار! بس کیا بتاؤں؟"

"کیا ہوا، نبرون؟"

"کیا سردی بہت زیادہ ہے باہر؟"

"سردی تو غضب کی ہے۔ تیز اور ٹھنڈی ہوا سیٹیاں بجاتی ہوئی چل رہی ہے اور وہاں رت پہ مکمل خاموشی اور بے رونقی مسلط ہے۔ لیکن ایک معمولی سا واقعہ پیش آیا جو مجھے بڑا دلچسپ معلوم ہوا۔"

"بہت خوب، ذرا ہم بھی سنیں!"

"عشق! عشق!" نبرون نے پہلے ہاتھ سینے پر رکھا پھر اسے ہوا میں لہراتے ہوئے اپنے تیزی سے سفید ہوتے ہوئے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔

"اچھا!" تینوں نے بیک وقت حیرت کا اظہار کیا۔

"عشق کی باتیں ہو رہی تھیں۔" نبرون نے گلاس میں سے برانڈی کا گھونٹ بھرتے ہوئے بتایا۔ ہوا یہ کہ سردی سے بچنے کے لئے نائٹ واچ مینوں نے اِدھر اُدھر سے سوکھی ہوئی لکڑیاں اکٹھی کر کے ٹیلی فون بوتھ کی اوٹ میں دھونی رمائی تھی اور بوڑھا چوکیدار انہیں کہانی سنا رہا تھا۔ گوری مشکی گھوڑے پر سوار تھی، وہ کہہ رہا تھا.....

عشق عشق ہی ہوتا ہے۔ واچ مینوں میں سے ایک نے کہا تھا۔ دوسرے واچ مین نے اس کی تائید کی۔ ٹیلیفون ایکسچینج تھا۔ لگاتار ٹوں ٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ میرے کان بوڑھے چوکیدار کی آواز پر لگ گئے۔ دوسری جنگ عظیم کا اختتام، وہ کہہ رہا تھا۔ حکومت برطانیہ عین عروج پر تھی۔ وہ جو بڑا چوک تھا..... اب تو وہاں کچھ بھی نہیں..... وہ چوک جو مال پر فلشین ہوٹل اور آرمی اسٹیڈیم کے درمیان ہے، وہاں وہ عالی شان بت ہوا کرتا تھا۔ برطانیہ کی ملکہ وکٹوریہ کا..... اس کے آس پاس دکھائی دیا کرتی تھی، وہ اکثر صبح سویرے نکلتی تھی وہ رائیڈنگ کے لئے اپنے مشکی گھوڑے پر سوار۔ وہ اس کی الہڑ جوانی، اللہ کا دیا ہوا بے پناہ حسن اور طبعی شوخی۔ عمر ہو گی کوئی سترہ اٹھارہ برس کی اس سوہنی میم کی، کسی کرنل کی بیٹی تھی وہ، اور عشق اس کو لڑکپن ہی سے ہو گیا تھا اکبر خان سے وہ جو کرنل کا بیٹ مین تھا۔ تھا وہ بھی بڑا خوبصورت گبرو جوان۔ میرپور کے آس پاس کے علاقے کا جوان مرد تھا وہ..... سنا یہی ہے۔ نمبر برابر انگیج مل رہا تھا۔ میں نے انکوائری کو رنگ کر کے شکایت لکھوائی۔ اس نے کہا تھوڑی دیر بعد پھر رنگ کیجیے۔ میں بوتھ میں کھڑے کھڑے ٹھٹھر رہا تھا۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس نے برانڈی کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔

"ہاں صاحب، عشق تو عشق ہی ہوتا ہے۔" افسروں میں سے ایک نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"اور گوری کا عشق کالے آدمی سے!" دوسرے نے کہا۔

"ہاں یار، اور یہ مشکی گھوڑے کی بھی خوب رہی" تیسرے نے کہا۔ تینوں کے لہجے میں طنز تھا اور وہ دبی ہنسی ہنس رہے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ممبرون سانولے رنگ اور گھوڑے جیسے گھٹیلے بدن کا آدمی تھا اور وہ ایڈنا سے اس کی محبت کے راز سے بھی آشنا تھے۔

اپنا گلاس ختم کرکے ہونٹوں سے وہسل بجاتا ہوا جب وہ دوبارہ فون کرنے کے لئے وارڈ روم سے باہر نکل گیا تو وہ تینوں کھل کر ہنسے۔

"یار، ایڈنا کو واقعی اس سے عشق تھا" ایک بولا۔

"مشکی گھوڑے سے؟" دوسرے نے کہا۔

"اور وہ واقعی اس پر سوار تھی" تیسرے نے وثوق سے کہا "کل جہاز خشک گودی میں سے نکل کر پانی میں اترے گا۔ ایک ہفتہ کھلے سمندر میں TRIALS ہوں گے اور پھر جہاز یورپ کو روانہ ہو جائے گا۔"

یکایک ان میں سے ایک نے جو کہ انجینئر (E.O) تھا دوسرے الیکٹریکل افسر (L.O) اور سپلائی افسر (S.O) کو بتایا کہ ممبرون کو اگر کیپٹن کا نمبر مل بھی گیا تو اسے واپس آکر دوبارہ فون پر جانا پڑے گا۔

"وہ کیوں؟" دوسروں نے پوچھا۔ E.O نے بتایا کہ کیپٹن یقیناً اس سے انجن روم کی رپورٹ کے بارے میں پوچھے گا اور وہ رپورٹ میرے پاس ہے "ممبرون نے مجھ سے مانگی ہی نہیں" اس نے اپنے شانوں کو جھٹکا۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور ممبرون داخل ہوا۔ اس مرتبہ وہ کچھ گھبرایا ہوا تھا۔

"بھئی E.O! وہ انجن روم کی رپورٹ تو آپ نے مجھے دی ہی نہیں۔ کیپٹن سننا چاہتا تھا۔ ذرا جلدی سے لے آئیے۔ پلیز! پندرہ منٹ کے بعد میں پھر جا کر رنگ کروں گا" E.O اٹھ کر چلا گیا۔

"اچھا۔ تو ممبرون، اس کا کیا ہوا جو مشکی گھوڑے پر سوار تھی۔ کچھ سنا اور آگے؟" S.O نے دریافت کیا ممبرون کے چہرے پر مسکراہٹ عود کر آئی۔

"ہاں۔ ہاں" اس نے کہا۔ بوڑھا چوکیدار آگ کو لکڑی سے چھیڑ کر بھڑکاتے ہوئے کہانی بیان کر رہا تھا کہہ رہا تھا کہ سن سینتالیس کے شروع میں کراچی کی بندرگاہ کی برتھ نمبر ۲ پر وہ پسنجر شپ کھڑا تھا جس پر برطانوی

فوج کی آخری بٹالین اس ملک کو چھوڑ کر واپس انگلستان جانے کے لئے سوار ہو چکی تھی۔ فوج کے علاوہ باقی تمام برطانوی باشندے جن میں عورتیں اور بچے بھی تھے اسی جہاز پر سوار ہو چکے تھے۔ میں اس وقت ان دلخراش چیخوں اور دلگداز آہ و زاری کی آواز سنائی دی جس سے جہازوں کی پوری گودی لرز گئی تھی۔ وہ سوگوار چیخیں اس گوری دوشیزہ کی تھیں جو اکبر خان کو اپنا دل دے چکی تھی اور اب وطن جانے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھی۔ اسے زبردستی لے جایا جا رہا تھا۔ کیونکہ یہ اوپر بہت اوپر سے آیا ہوا حکم تھا۔ اکبر خان جہاز سے باہر وہارف پکھڑا چپکے چپکے آنسو بہا رہا تھا۔ پھر جب جہاز نے لنگر اٹھایا تب جیسی نسوانی آواز دلوں کو چیرتی ہوئی نکل گئی "دل نہ چھوڑنا اکبر خان۔ میرے پیارے اکبر خان..... میں واپس آؤں گی۔ ضرور واپس آؤں گی....." ٹیلیفون پر کیپٹن کا نمبر مل گیا اور اس نے سب سے پہلے انجن روم کی رپورٹ کے بارے میں پوچھا اور وہی میرے پاس نہیں تھی۔"

وہ رپورٹ لے کر پھر باہر نکل گیا۔

E. O. نے D.O. کو مخاطب کر کے کہا "سن سینتالیس کے شروع کی بات ہے آپ کو تو یاد ہوگا کیونکہ ہم سب پرانے افسر ہیں۔ وہ شاندار پارٹی جو انگریز افسروں کے آخری BATCH کو الوداع کہنے کے لئے میس میں منعقد ہوئی تھی۔

ہاں ہاں۔ خوب یاد ہے۔ قریب قریب ہر انگریز افسر اس ملک کو چھوڑ کر جانے پر ملول اور ناشاد تھا اور نعرے پر نعرہ سنائی دے رہا تھا۔ DIVIDE AND QUIT "QUIT INDIA"

"اور یاد ہے کہ کمانڈر کرٹس کیا کہا کرتا تھا؟"

"خوب یاد ہے۔ کمانڈر کرٹس میرا انسٹرکٹر تھا۔ اس نے برملا اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر انڈیا برطانوی راج کے طفیل ترقی کی جو منازل طے کر چکا ہے ان کے پیش نظر وہ ایشیا کی سب سے بڑی طاقت بن کر ابھرے گا۔"

"لیکن یار ایشیائی مقبوضات ہوں یا افریقی، ایڈ منسٹریشن ہمیشہ خشکی گھوڑے پر سوار رہی۔" پھر دونوں کو چپ سی لگ گئی۔ باہر سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔

اس مرتبہ جب نمبردن فون کر کے واپس آیا تو اس کی حالت ایک دم بدلی ہوئی تھی وہ چپ چاپ وارڈ روم میں آ کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر غم کے آثار دیکھ کر E.O. نے کہا "ہاں تو وہ کہانی نمبردن" پھر

آگے کیا ہوا ہے"

"اوہ۔ وہ کہانی۔" منبرون نے جواب دیا۔ "بمبئی میں اب کی مرتبہ اسے پوری طرح سن نہیں سکا۔ آخر میں دم دھونی کی دم توڑتی ہوئی راکھ کو کریدتے ہوئے چوکیدار نے کہا تھا۔ "وہ آئی اور کافی مال و دولت ساتھ لے کر انگلستان سے واپس آئی۔ وہ چاہتی تھی کہ اکبر خان اس سے شادی کرے۔ مگر اب وہ آزاد ہو چکا تھا اور اس کی شادی بھی گاؤں کی ایک لڑکی سے ہو چکی تھی۔ اس لئے شاید وہ مجبور تھا۔"

"سر! ڈنر تیار ہے۔" اسٹیورڈ نے آکر اطلاع دی اور وہ چاروں اٹھ کر کھانے کی میز پر چلے گئے۔ منبرون نے کھانا بہت کم اور خلافِ معمول خاموشی سے کھایا۔

دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی۔ ڈیبیج رائیڈر روٹی اتار کر وارڈ روم میں داخل ہوا۔ چند سگنل اور ایک کافی ڈیفنشل لیٹر منبرون کو دے کر وہ واپس چلا گیا۔ منبرون نے لیٹر اور سگنل دیکھ کر دوسرے افسروں کے حوالے کر دیئے۔ لیٹر میں لکھا تھا۔ "جہاز مزید ایک ہفتہ خشک گودی میں رہے گا۔ اس کے انجن کی مرمت پر خصوصی توجہ دی جائے گی۔ یہ جہاز آئندہ کبھی یورپ کے کروز پر نہیں جائے گا۔ منبرون جونی الوقت ہے وہ اسی جہاز پر تعینات رہے گا اور جہاز کی نقل و حرکت آئندہ صرف خلیج فارس اور جزیرہ نمائے عرب کی بندرگاہوں تک محدود رہے گی۔"

منبرون اپنے کیبن میں جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن جانے سے پہلے اس نے اسٹیورڈ کو بلا کر برملا آرڈر دیا۔ "شراب کا بار تاحکمِ ثانی بند رہے گا۔"

تیرھواں آدمی

رضیہ فصیح احمد

یقین آنے والی بات نہیں، مگر یہ حقیقت ہے کہ ایک زمانے میں اس شہر گمنام کی بسوں میں ایک آدمی بھی کھڑا نہ ہوتا تھا۔ سب بیٹھ کر سفر کرتے تھے۔ مسافروں میں کبھی دنگا فساد نہ ہوا تھا۔ مسافروں اور کنڈکٹر میں کبھی تو تو میں میں نہ ہوئی تھی۔ مسافروں، ڈرائیوروں اور کنڈکٹروں کا رشتہ ایسا تھا جیسا کہ ایک اچھے شہر میں شہریوں کا ہونا چاہیئے۔

مگر پھر یہ ہوا کہ بڑھتی ہوئی آبادی کے اس شہر میں رفتہ رفتہ بسیں کم ہوتی گئیں، مسافر بڑھنے لگے اور سواریوں کی کمی کا مسئلہ شروع ہوا۔ لوگ دفتروں سے دس پندرہ منٹ لیٹ ہونے لگے تو تشویش کا آغاز ہوا۔ شہریوں کی زبانوں پر عام شکایات، اخباروں میں خطوط اور محکمے کے نام آنے والی عرضیوں کے بعد ایک بلند سطح کی کانفرنس بٹھائی گئی جس میں بسوں کی کمی اور مسافروں کی تکالیف کا مسئلہ سامنے لایا گیا۔ عام خیال تھا کہ ضرورت واقعی ہے، مسئلہ سنگین ہے اور اس کا فوری حل ہر حال میں دریافت ہونا چاہیئے۔ چنانچہ کئی سو بسوں کی درآمد کی تجویز فوری طور پر منظور ہونے ہی والی تھی کہ ایک ماہر حسابیات جو آدھے زمین سے اوپر اور آدھے زمین کے اندر تھے، بول اٹھے۔

"صاحب! اگر اجازت ہو تو میں کچھ عرض کروں۔"

"فرمایئے۔" صاحب صدر نے کہا۔

"جناب والا! حساب کی رو سے اتنے لوگ بسوں میں سفر کرتے ہیں اور بسیں اتنی ہیں۔ چنانچہ اگر ہر بس میں فقط آٹھ آدمیوں کو کھڑے ہونے کی اجازت دی جائے تو بات بن سکتی ہے۔ ہر پندرہ منٹ بعد ایک بس چلتی ہے اور ہر بس میں آٹھ آدمی زیادہ سفر کر سکتے ہیں تو حساب کی رو سے کوئی بھی آدمی بس سٹینڈ پر انتظار نہ کرے گا اور اس طرح ہمارا..... زرمبادلہ..... قیمتی زرمبادلہ جو کسی پیداواری قوت میں اضافہ کرنے والی مشین پر خرچ کیا جا سکتا ہے بچ جائے گا..... یہ میری چھوٹی سی ذاتی رائے ہے۔" واہ، واہ، تو آپ پہلے کیوں

نہ ہوسکے۔ اس میں تو کچھ جان نظر آتی ہے۔ صاحب کرسی نے کہا:

ہر ایسی تجویز جس میں زرِ مبادلہ بچتا یا صرف اس کی ذات پر خرچ ہوتا ہو حکومت کے ہر افسر کو بڑی جاندار نظر آتی ہے۔

جب اس تجویز کو دوبارہ صاحبِ کرسی نے اپنے الفاظ میں کمیٹی کے سامنے پیش کیا تو جن لوگوں کو یہ پہلے مردہ نظر آتی تھی انہیں بھی اس میں جان پڑتی نظر آئی اور تھوڑی ہی دیر کی بحث و تمحیص کے بعد مردہ زندہ ہو گیا۔ سب نے اس تجویز پر صاد کر دیا۔ زرِ مبادلہ کی بچت کی فوری خوشی میں بھاری چائے پی گئی اور ضروری کارروا کے بعد یہ حکمنامہ جاری کر دیا گیا کہ بحکم سرکار شہر گمنام کی ہر بس میں آٹھ آدمیوں کو کھڑے ہونے کی اجازت ہے۔ کنڈکٹر کا فرض ہے کہ وہ آٹھ سے زیادہ آدمی بس میں کھڑے نہ ہونے دے کہ وہ امنِ عامہ کے لئے خطرہ اور حادثے کا سبب ہو سکتے ہیں۔

دوسرا دن وہ پہلا تاریخی دن تھا جس میں شہر گمنام میں لوگ بسوں میں کھڑے ہوئے اور جب کنڈکٹر نے گنا وہ آٹھ سے زیادہ تھے۔ نو ..... دس ..... گیارہ یا بارہ۔ اور جب کنڈکٹر نے آخری آدمی سے اترنے کو کہا تو کوئی بھی نہ اترا۔ کسی نے کہا کہ وہ پہلے چڑھا تھا آخری آدمی کوئی اور تھا۔ کسی نے کہا وہ بوڑھا اور کمزور ہے اس لئے اسے پہلے جانے کی اجازت ہونی چاہیئے۔ نوجوان نے جواب میں کہا تو کیا وہ اپنی جوانی کی سزا بھگتے اور بس اسٹینڈ پہ کھڑا کھڑا بوڑھا ہو جائے۔ پہلے ہی دن آخری آدمی کی تلاش نہ ہو سکی نہ یہ طے پا سکا کہ کس عمر اور سائز کا بچہ آٹھواں آدمی شمار کیا جا سکے گا۔ یہ وہ پہلا دن تھا جب بوڑھوں نے جوانوں کے سر سے شفقت کا ہاتھ اٹھایا اور جوانوں کے دلوں میں بوڑھوں کا لحاظ ختم ہوا۔ مسافروں کی آنکھوں سے ایک دوسرے کی مروت اٹھ گئی۔

اس دن تقریباً ہر اخبار میں بسوں میں کھڑے ہونے والوں کی تصویریں شائع ہوئیں اور یہ خبر چھپی کہ شہر گمنام میں ہر جگہ آٹھ سے زیادہ آدمی کھڑے ہوئے جس پر آپس میں جھگڑا ہوا۔ تب کانفرنس دوبارہ طلب کی گئی اور بڑے صاحب نے کہا کہ مسئلہ حل تو ہوا مگر پوری طرح حل نہیں ہوا تب اس ماہر حسابیات نے کہ آدھا زمین کے اوپر اور آدھا زمین کے اندر تھا کہا۔

"آپ نے غور کیا کہ ہر جگہ کھڑے ہونے والوں کی تعداد گیارہ اور بارہ کے درمیان تھی۔ چار ہی مسافروں کی تو بات ہے۔ اگر ان چار مسافروں کو کھڑے ہونے کی اجازت دے دی جائے تو مسئلہ خود بخود حل ہو گیا۔"

چنانچہ دوسرے دن سے بارہ مسافروں کو کھڑے ہونے کی اجازت دے دی گئی اور تاحال اس شہرِ گمنام میں ایک بس میں بارہ مسافروں کو کھڑے ہونے کی اجازت ہے۔ تیرھواں آدمی وہ آخری آدمی ہے جسے بس میں گھسنے کی اجازت نہیں ہے مگر اس کی تلاش آج تک نہ ہو سکی۔ تیرھواں آدمی قانوناً مجرم ہے اور کنڈکٹر کو حق ہے کہ گردن پکڑ کر اسے نیچے اتار دے مگر ہر شخص کہتا ہے کہ وہ تیرھواں آدمی نہیں ہے اور اب تو مدت ہوئی یہ پوچھنا اور دیکھنا بھی چھوڑ دیا گیا ہے کہ تیرھواں آدمی کبھی کوئی تھا بھی۔ بس میں جو آدمی مسافروں کی تعداد چیک کرنے آتا ہے اسے بس میں گھسنے تک کی جگہ نہیں ملتی اور ویسے بھی اب کھڑے ہونے والوں کی تعداد گن لینا آسان بات نہیں ہے۔ اس لئے چیکنگ کرنے والا باہر ہی سے لوٹ جاتا ہے جیسے تیرھواں آدمی وہ خود ہی ہو۔

اپنا نذرانہ وہ باہر ہی سے لے لیتا ہے اور حکومت سے اس کی تنخواہ ماہ بماہ آج بھی مل رہی ہے تاہم شہرِ گمنام میں نئی بسوں کی درآمد کا سوال کبھی نہیں اٹھتا۔ جب اٹھتا ہے یہی سوال اٹھتا ہے کہ آیا مسافروں کو بس کی چھت، اس کے بریک، ونڈ اسکرین یا اسٹیئرنگ وہیل پہ بیٹھنے یا کھڑے ہونے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔

ماں بیٹا

سلیم اختر

"کیا کہا؟ پندرہ پیسے فی حرف؟"

"ہاں"، اس لڑکے نے بیزاری سے جواب دیا۔ لڑکے نے ایک میلی بنیان اور گندی نیکر پہن رکھی تھی، اگست کا حبس اس کے میلے جسم پر لکیریں بناتا بہہ رہا تھا۔ وہ ہاتھ میں چھینی پکڑے منتظر تھا کہ یہ جائے تو وہ کام میں لگے۔ سامنے نقل سنگِ مرمر کی سل دھری تھی۔

"میرے خیال میں تمہیں غلطی لگی ہے۔" اس نے پُر امید لہجہ میں کہا۔ "پندرہ پیسے فی لفظ ہوگا۔"

لڑکا سمجھ گیا تھا کہ یہ کام اور اس کا خرچ اس گاہک کی اوقات سے زیادہ ہے لہٰذا اس نے جواب دینے کی ضرورت بھی نہ محسوس کی اور سل کو سیدھی کر کے بیٹھ گیا۔

حبس سے جو حال ہوا اس کے بدن میں جیسے بیزاری کی چنگاریاں بھر رہی ہوں۔ وہ بڑی مشکل سے دفتر سے ایک گھنٹہ کی چھٹی لے کر آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ فٹافٹ بات طے ہو جائے گی مگر یہ بدبودار لڑکا نہایت نامعقول تھا۔ اس کے ریٹ بھی نامعقول تھے اور اس کا رویہ ریٹ سے بھی زیادہ۔

"دکان کا مالک کہاں ہے؟" اب اسے لڑکے پر غصہ آ رہا تھا جو اس کے وجود سے یوں لاتعلق تھا گویا وہ ایک معزز گاہک کے برعکس مسجد کی تعمیر کے لئے چندہ مانگنے آیا تھا۔

"مالک گیا ہے۔" وہ اسی غصہ دلانے والی لاپرواہی سے بولا۔

"پندرہ پیسے لفظ نہیں لگاتے؟"

لڑکے نے جواب دینے کی ضرورت بھی نہ محسوس کی تو یہ دل ہی دل میں اسے گالیاں نکالتا ہوا چلا۔ یوں محسوس ہوا گویا سب نے اسے لوٹنے کا ایکا کر رکھا ہے۔ پندرہ پیسے فی حرف سے کم تو کسی نے کیا بتانا تھا۔ سترہ۔ بیس بلکہ پچیس پیسے تک جانے والے بھی تھے۔ البتہ سب اس لڑکے ایسے بدتمیز نہ تھے۔ آٹھ دس دکانیں گھوم جانے کے بعد

اسے احساس ہوا کہ آج بات نہ بنے گی۔ اس کی جیب میں پیسے تھوڑے تھے اور حبس بہت زیادہ۔ سرکاری عمارات کے سنگِ بنیاد، بن کھلے مرجھا گئے غنچے۔ باعصمت بیویاں، مکانوں کی منزل کے نشان، مسجد کا نام، تمہید سب پتھر کی سِل بنے ان دکانوں میں موجود تھے۔ گلگلے سنگِ مرمر پر سیاہ چمکیلے حروف۔ آیات اور کلمات۔ حسرت ناک اشعار دل کا درد۔ غم کی پکار۔ محبت کا اظہار سب کچھ پندرہ پیسے فی حرف کے حساب سے پتھر بن چکا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا پتھروں کے یہ سوداگر اسے لوٹنے کو مل بیٹھے ہیں۔ دس انچ چوڑے بارہ انچ لمبے نقلی سنگِ مرمر کی سلیٹ پندرہ میں اور بعض صورتوں میں ۲۵ روپوں تک گئی تھی اور اس پر مستزاد پندرہ پیسے فی حرف۔ یہ تو گورکنوں اور لٹھا بیچنے والوں سے بھی بڑھ گئے تھے۔ دفتر واپس آ کر اس نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ مرقد۔ نفیسہ خاتون زوجہ کرم الدین۔ تاریخ انتقال ۱۵ جولائی ۱۹۷۱، عمر ۴۵ برس، آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے۔ غمگسار بیٹا عبداللہ خاں عفی عنہ۔ یہ سب لکھ کر جب ان کے حروف کا ٹوٹل کیا اور انہیں پندرہ پیسوں سے ضرب دے کر سو پر تقسیم کر کے نتیجہ روپوں کے خرچ کی صورت میں نکالا تو سینہ سے بے اختیار ٹھنڈی سانس نکل گئی۔

عبداللہ خاں کے لئے ۱۵ جولائی ۱۹۷۱ تک اس دنیا میں صرف دو ہی پیارے تھے۔ ایک ماں اور دوسری بیوی مگر ۱۵ جولائی کے بعد صرف بیوی رہ گئی۔ بیوی واقعی اسے بے حد پیاری تھی۔ ماں کے انتقال سے پہلے تو خیر وہ تھی ہی لیکن ماں کے انتقال کے بعد بیوی نے جس طرح اس کی دلجوئی کی اس نے اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کا دلدادہ شوہر بنا دیا تھا۔ عبداللہ کا باپ بچپن میں مر گیا تھا۔ دو بیٹیاں، ایک بیٹا اور دو کمروں کا ایک چھوٹا سا مکان، یہ اثاثہ مرحوم نے چھوڑا تھا۔ نفیسہ خاتون چاہتی تو خاندان کے کسی رنڈوے کے ساتھ گھر بسا سکتی تھی مگر اس نے اولاد پرستی کو ترجیح دی تھی۔ تسمہ پیشم جیسے بھی گزری بیٹیوں کو پڑھایا لکھایا دونوں پڑھ کر استانیاں بن گئیں انہوں نے گھر بھی سنبھالا، عبداللہ کو بھی پڑھایا اور اپنے لئے جہیز بھی بنایا۔ دونوں سسرال سدھاریں تو ماں بیٹا اکیلے رہ گئے۔ عبداللہ اپنی ماں کا بڑا فرمانبردار بیٹا تھا اس کی زندگی کا سیارہ صرف ایک محور پر گردش کرتا تھا اور وہ تھا ماں۔ دفتر سے گھر آتا تو ماں کے ساتھ کام میں ہاتھ بٹاتا۔ اتوار کو فرش دھوتا، کپڑے دھوتا۔ الغرض! سلائی کڑھائی کے علاوہ وہ گھر کے ہر کام میں طاق تھا۔ ساں کر اچھے اچھے کپڑے لا کر دیتا۔

"ارے پگلے! یہ اتنے بڑے بڑے سرخ پھولوں والا سوٹ پہن کر میں کیا کروں گی؟"

"ماں دیکھنا تو سہی یہ کتنا اچھا لگے گا۔"

وہ ہنس کر کہتی "یہ میری عمر ہے ایسے رنگ پہننے کی بھلا؟"

"ارے ماں آج کل تو لڑکے یہ رنگ پہن رہے ہیں اب تو وہ بات ہی ختم ہو گئی کہ کون سا رنگ پہنے اور کون سا رنگ نہ پہنے۔ اب تو سب مرد، عورتیں لال نیلے پیلے رنگوں میں پھرتے ہیں۔"

"پھر بھی۔ میری عمر میں یہ اچھا نہیں لگتا۔"

"عمر کی کیا بات ہے ماں، تمہاری چھب تو لڑکیوں سے بڑھ کر ہے۔"

بیٹے کی یہ تعریف بیوہ ہیں بیوی بیدار کر دیتی۔ اسے مرحوم خاوند یاد آجاتا جو اس طرح اس کے لئے شوخ رنگوں کے کپڑے لاتا تھا۔ وہ غریب سہی مگر محبت کرنے میں بڑا دریا دل تھا۔ بیٹا عادتوں اور صورت میں باپ بنتا جا رہا تھا اور کبھی کبھی تو وہ اسے دیکھ کر اچانک چونک سی جاتی۔ خاص طور سے اس وقت جب اسے بیٹے کی نظریں اپنے تعاقب میں محسوس ہوتیں "تم یوں گھور گھور کے کیا دیکھ رہے ہو؟"

"ماں تم اچھی لگتی ہو۔"

یہ اچانک تعریف چہرے پر سرخی لے آتی "ہٹ شیطان!"

"سچ ماں" وہ اٹھلا کر بولتا "یہ نیلا سوٹ تو بہت ہی بچ رہا ہے۔"

وہ اس تعریف سے خوش بھی ہوتی اور چڑتی بھی "یہ تو ہر وقت کپڑوں کو کیوں دیکھتا رہتا ہے۔ تو نے تو کپڑے بدلنے محال کر دیئے ہیں۔"

"واہ بھئی اچھی رہی۔ ایک تو کپڑوں کی تعریف کرو اور دوسرے باتیں سنو۔ اچھا تو اس نیلے سوٹ میں بہت بری لگ رہی ہو۔ اسے اتار کر دوسرا بدل لو۔

"کون سا؟" وہ جیسے بے خیالی میں پوچھتی۔

"وہی جس کی پیلی زمین پر لال اور سبز پھول ہیں۔" وہ آنکھیں نچا کر جواب دیتا۔ وہ ہنس کر کہتی "تجھ سے نپٹنا بہت مشکل ہے۔"

وہ ماں کی محبت میں یوں ملفوف تھا کہ اسے کبھی پیچھے دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ محلے کی کتنی لڑکیاں جوان ہیں یا برادری میں کیسی کیسی رشتہ دار موجود ہیں۔ اس جیسا شریف کما ؤ اور تابعدار نوجوان کئی ماؤں کی آنکھوں کا تارا بن جاتا ہے۔ چنانچہ محلے کی بوڑھیاں اس کی مثالیں دیتیں اور بزرگ رشتہ دار واری صدقے جاتے۔ مگر عبداللہ خان ان باتوں سے بے نیاز تھا نظریں جھکائے گلی میں سے گزرتا اور صدق دل سے سب کو

ماں بہن سمجھتا۔ اس نے کبھی شادی کی ضرورت محسوس نہ کی کہ اس نے کبھی خود کو جوان محسوس نہ کیا۔

"چھوڑو ماں یہ کیا ہر وقت شادی شادی کرتی ہو۔"

"شادی نہ کروگے تو پھر کیا کروگے؟"

"کیا مطلب پھر کیا کروگے۔ ماں! آخر اب میں کیا کر رہا ہوں۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"تو پھر۔"

"اب جوان ہو اور اچھے رشتے مل رہے ہیں۔ کل کلاں یہ پیاری گھسیٹس تو میں کہاں سے لڑکیاں لاؤں گی۔

وہ ہنستا۔ "ماں لڑکیاں جب چاہو لے لو۔ اس ملک میں بڑی لڑکیوں کی اکثریت ہے اور اچھے لڑکوں کا کال ہے۔"

وہ اس سے ایک دھپ لگاتی۔ "اس اچھے لڑکے کی تُو بھی تو دیکھو۔"

"ایسی خاص بُری بھی نہیں۔"

کبھی تو بات یوں مذاق میں ٹلتی اور کبھی یوں رُخ مڑتا۔

"آخر تمہیں اعتراض کیا ہے۔" وہ سنجیدگی سے پوچھتی۔

وہ کسی شاگرد کو سمجھانے کے انداز میں جواب دیتا۔ "ماں اب گھر میں کتنا امن اور سکون ہے کیوں اپنے ہاتھوں سے سب کچھ کا ستیاناس کرتی ہو۔"

"کیا مطلب تیرا؟"

مطلب صاف ہے۔ کبھی ساس بہو کی بنی ہے کیا! پھر بے کار میں پچ پچ پالنے کا فائدہ۔"

"بہو سے وہ سائیں تنگ ہوتی ہیں جو اسے اپنا دشمن سمجھتی ہیں لیکن اگر میں اسے محبت اور پیار دوں گی تو وہ کیوں مجھ سے نفرت کرے گی۔"

اس لئے کہ یہ رشتہ ہی نفرت کا ہے۔"

"کیسے"

"بہو یہ سمجھتی ہے کہ گھر میں دو ٹیمیں ہیں۔ ایک اس کی اور دوسری ساس کی۔ ان دونوں میں لڑائی یعنی خاوند جیتنے کے لئے میچ ہو رہا ہے۔"

”کیا بے تکی بات کی تو نے؟“

”ماں بے تکی بات نہیں۔ بہت بڑی حقیقت ہے۔“

حقیقت تو وہ تھی یہی تھی لیکن اس وقت تک جب تک اس نے شگفتہ کو نہ دیکھا تھا۔ شگفتہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو صرف نے اور پھر بچے پیدا کرنے کے لیے ہی بنی ہیں۔ چوڑے شانے ابھرے ابھرے کولہے اور بھری بھری چھاتیاں جن سے دودھ چھلکنے اس ہو۔ چنانچہ عبداللہ کو بھی اور کچھ رسومی ادویوں اس کے بہر کی صورت میں بالآخر ماں کی آرزوؤں کے پھول کھل اٹھے۔ بے دھیان کھڑے کسی شخص کو اٹھا کر تالاب میں پھینک دیا جائے تو حیرت زدہ وہ ڈبکیاں کھاتا ہے لیکن جلد ہی سنبھل نا شروع کر دیتا ہے اور پھر اس سے لطف اندوز بھی ہوتا ہے۔ کچھ ایسا ہی تجربہ شگفتہ سے شادی بھی۔ شگفتہ کی محبت ن کے لئے ایک ایسا ہی تالاب ثابت ہوئی۔ نیم گرم پانی کا تالاب جس کی وسعت نامعلوم۔ عبداللہ خان نے جب اپنے او رحیرت پر غلبہ پا لیا تو وہ ایسا تیراک ثابت ہوا کہ غوطے لگاتا نہ تھکتا۔

ماں، بیٹا، بہو کی ازلی تکون کے تینوں زاویے کیسے درست تھے محلے والیاں اس راز کو نہ سمجھ پائیں۔ بجز اس کے کہ خفیہ خوش قسمت تھی۔ پہلے تابعدار بیٹا ملا اور پھر تابعدار بہو۔ ساس اور بہو دونوں دن بھر کے کام میں جتی رہتیں۔ شگفتہ کے ے حالی گھر کو بھر دیا۔ یوں محسوس ہوتا گویا ساس بہو میں عبداللہ کی محبت اور توجہ حاصل کرنے کے لئے ایک غیر مرئی جاری تھا۔ اگر اس مقابلے سے گھر میں کسی قسم کا تناؤ پیدا کیا تو عبداللہ کو اس کا احساس نہ ہو سکا۔ نہ اسے ترازو لے کر بانٹ کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ان دونوں نے کبھی ایک دوسرے کی شکایت نہ کی۔ لیکن اب عبداللہ کو بیوی سے ماں کو شوخ رنگ کے کپڑوں میں دیکھ کر شرم سی محسوس ہوتی۔ ادھر ماں تھی کہ روز بروز زیادہ سے زیادہ بننے نے میں لگی رہتی۔ شگفتہ سالن پکا کر فارغ ہوتی تو وہ اٹھ کر بہت سا گھی ڈال کر حلوہ بنا لیتی۔ عبداللہ دونوں چیزیں مل ور وفاداری بشرط استواری کے اصول پر دونوں کی تعریف کرتا۔

فضا میں دو رنگین غبارے بلند سے بلند تر ہونے کی جستجو میں تھے لیکن ایک کی گیس نے تو بہر حال ختم ہونا ہی تھا۔

”ماں یہ تم ہر وقت سرخ جوڑا کیوں پہنے پھرتی ہو؟“ بات منہ سے نکالنے کے بعد عبداللہ کو احساس ہوا کہ اسے یہ نہ کہنا چاہیے دراصل دونوں ہی رنگوں کے اس پیچ سے وہ اکتا چکا تھا۔ ماں کا چہرہ سرخ ہوا۔ پھر زرد اور سیاہ۔ وہ خاموشی سے کمرہ اور بیوگی کے ابتدائی ایام کے میلے کپڑے پہن لئے۔ یہ اس نے خاوند کی یاد میں سنبھال رکھے تھے لیکن وقت انہیں نہ آہستہ نئے کپڑوں کی تہوں کے نیچے کرتا گیا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ ان کے وجود کو فراموش کر بیٹھی۔ لیکن زندگی ر آج اسے پھر ان کپڑوں کے پاس لے آیا تھا۔ اس کی زندگی کی قوس اپنے دائرہ کی تکمیل کر چکی تھی۔

شگفتہ کو اس نے قبر پختہ کرانے اور کتبے کے خرچ کا تخمینہ بتایا تو وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔ ماں کے کفن دفن، قُل، رات کے ختم اور ایسے ہی دیگر مذہبی اخراجات پر خاصا خرچ آ چکا تھا۔ ادھر کئی رشتہ دار دسویں تک گھر رہے۔ ماں تو عبداللہ کی مری تھی۔ رشتہ داروں کو تو اچھا کھانا چاہیئے تھا۔ جب نقدی ختم ہو کر پرائز بانڈ بیچنے بت آئی تو شگفتہ نے بولنا شروع کیا اور ابھی چالیسویں کا سب سے بڑا خرچ باقی تھا۔ برادری کے لئے دیگیں ی صاحب کے لئے جوڑا۔ قبر پر بیٹھ کر تلاوت کرنے والے کے لئے پیسے اور اسی طرح کے بیسیوں چھوٹے اخراجات

ماں کو علاقہ کے چھوٹے قبرستان میں دفن کیا گیا تھا۔ یہ شاملات کی زمین تھی جو پہلے جوہڑ ہوتی تھی پھر گوجر زمینیں بیچ کر زیادہ بہتر علاقوں میں چلے گئے تو یہ جوہڑ خشک ہو گیا اور پھر کسی نے وہاں پہلی قبر بنا دی اور چالیس پچاس قبروں کا چھوٹا سا قبرستان بن گیا۔ لیکن قبریں بنانے والوں نے جوہڑ کا نشیب پُر کرنے کی ت محسوس نہ کی۔ چنانچہ ہر بارش میں پانی جمع ہو جاتا تھا اس لئے وہاں صرف پختہ قبریں بچ سکتی تھیں اور اسی عبداللہ اب تین چار سو کا اور خرچ کرنے کو تیار تھا۔

"دیکھیں یوں کرتے ہیں" شگفتہ نے صلاح دی "چالیسواں ہو لے پھر دو تین ماہ میں پیسے بچا کر بنوالیں گے"

لیکن یہ معاملہ ٹلتا گیا۔ تین ماہ بعد اس کی سالی کی شادی آ گئی وہاں خاصہ خرچ ہو گیا، پھر اس کے سالے رمن کی ضرورت پڑ گئی اسے پیسے دینے پڑے، پھر شگفتہ بیمار ہو گئی۔ پھر سال بعد اسے دوبئی جانے کا موقعہ ملا۔ اس سلسلہ میں خاصا قرضہ لیا جسے اس کی بھیجی ہوئی رقم سے شگفتہ نے اتارا۔ پھر شگفتہ نے پیسے جمع کر کے پہلا مکان بیچ کر ایک نیا مکان خرید لیا اور جب وہ کئی سال بعد بہت کچھ کما کر لوٹا تو اسے نشیب میں ماں کی کچی خیال آیا۔ جب وہ اپنے پہلے محلہ میں واپس آیا تو وہ جگہ پہچانی نہ جاتی تھی۔ کسی وزیر کے رشتہ دار نے قبرستان پر تعمیر کر دی تھیں۔ جہاں سودا لینے والوں کی خوب بھیڑ تھی۔ ماں کی قبر کا نام و نشان تک باقی نہ تھا۔

میگی

فرخندہ لودھی

اواخر اپریل کی چمکدار دوپہر تھی۔

امین تھوڑی دیر کے لئے دفتر سے اٹھ آیا تھا۔ کھانے کا وقت ہونے کے باعث بازار میں چہل پہل کم تھی ہڑک پر لوگ نہیں تھے شور تھا۔ جتنے ہوٹل اور ریسٹوران تھے۔ سب کے ریڈیو سیٹ مختلف سٹیشنوں کے پروگرام سنا رہے تھے۔ پھر دھوپ کی ہر لحظہ بڑھتی تمازت۔ وہ بازار کے اس سرے سے اس سرے تک۔ بغیر کسی مقصد کے چلتا رہا یوں ہی بے کار — ایک ہوٹل میں گھس گیا کھانے پر لوگ اس طرح ٹوٹے پڑے تھے گویا دنیا میں اس سے اہم کام کوئی نہیں۔ مگر وہ ویٹر کو اپنے پیچھے چلتا چھوڑ کر فوراً باہر آ گیا۔

پنواڑی کی دکان کے بڑے آئینے میں اس نے اپنی صورت کو غور سے دیکھا — پٹ سن جیسی پیلی چمک دار مونچھیں اور آنکھوں کی چھدری پلکیں چہرے پر بیزاری — امین مڑنے ہی کو تھا کہ پنواڑی نے آواز دی۔

"صاحب! گلوری۔

اچھا خاصا۔ لگا ہوا گاہک، مڑا جاتا تھا۔ امین رک گیا۔

"چلو۔ دے دو۔"

وہ حسب معمول مسکرا نہیں رہا تھا اس نے منہ کھول دیا جیسے کوئی کڑوی کسیلی دوا کھانے پر مجبور ہو۔ بوڑھے پنواڑی نے مسکراتے ہوئے ہاتھ روک لیا

"دیکھئے صاحب! یوں نہیں۔ مسکرا کے کھائیے"

یگانگت اور لہجے کے التزام کو سن کر امین ہنسی نہ روک سکا۔

"ہاں — یوں۔"

پنواڑی نے نفاست سے گلوری امین کے منہ میں رکھ دی اور اس کی مجبوری آنکھوں میں جھانکا۔

کیا بات ہے صاحب! جی تو اچھا ہے۔

بنواڑی کے رویے میں ہمدردی تھی۔ امین کو اداس دیکھ کر اس کا دل ہول گیا تھا۔

میں بالکل ٹھیک ہوں بڑے میاں۔ شکریہ ـــــ تم مجھے ہمیشہ بڑے فن کار نظر آتے ہو۔ نہ معلوم کیوں؟

امین نے ادھر کی بات ادھر جوڑی۔ وہ موضوع بدلنا چاہتا تھا۔

”تم ہمیشہ زیادہ پیسے لیتے ہو۔ پان کے دام لیتے ہو یا فن کے؟“ امین بڑے میاں کو پیسے دیتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ اسے بنواڑی کے پان کھلانے کی یہ ادا ہمیشہ عجیب لگی اور اچھی بھی اس ادا کی اصل کہاں ہے؟ وہ ہمیشہ سوچتا

”ارے واہ بابو! فن کی قیمت کون دے سکتا ہے؟ یہ اصل مال ہوتا ہے۔ اس کے بھاؤ اس زمانے میں نہیں لگتے“ بڑے میاں صافی سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اترا رہے تھے۔ امین نے جیب سے سگرٹ نکالی۔ سلگتے ہوئے رسے کے سرے سے سلگائی اور چل دیا۔

رولدو بنواڑی شہر کا سب سے عجیب پان سگرٹ والا تھا۔ وہ پان کے پتے کے ساتھ اپنا مخصوص مشرقی فلسفہ بگھارتا۔ اپنے گاہک کے ساتھ کھل کر باتیں کرتا۔ نئی روشنی کے بابو لوگ دل لگی کے لئے اس کے پاس رکتا اور باتیں سنا پسند کرتے تھے۔ وہ پان میں تازہ مکھن کی انگلی لگا کر گلوری بناتا تھا اور اس کی گفتگو مکھن سے کہیں زیادہ نرم اور طراوٹ بخش ہوتی ـــــ ”میاں! مکھن خشکی دور کرتا ہے مگر آہستہ آہستہ سب کچھ رخصت ہو جائے گا۔ سارے لوگ ہر شے میں ملاوٹ کرنے لگے ہیں ـــــ اور پھر پان ـــــ کھانے والے رہ کتنے گئے ہیں۔“

رولدو کو بدلتے ہوئے حالات سے گلہ تھا۔ امین نے ایک روز اسے سمجھایا بھی تھا کہ یہ تجرباتی دور ہے۔ ملاوٹ اور امتزاج کے نتیجے کے طور پر جو کچھ ہمیں حاصل ہوتا ہے اس سے ہماری تخلیق کی حس کو تسکین ملتی ہے اور ہم علم اور جدیدیت سے ہمکنار ہو کر اپنی ذات سے قطعی مطمئن ہوں نہ ہوں ہمیں گونہ تسلی ضرور ہو جاتی ہے کہ ہم نے کچھ تو کیا جو اس سے پہلے نہیں تھا اور رولدو بھی تو پان میں مکھن لگاتا ہے۔ یہ اور اس قسم کی معقول وجوہات سن کر رولدو لاجواب ہو گیا تھا اور امین کی قدر کرنے لگا تھا۔ اب وہ اکثر فارغ وقت میں تبادلۂ خیالات کرتے۔

آج امین کا دل کام میں نہ لگا اور بنواڑی سے دو باتیں کرنے کو بھی نہ چاہا۔ وہ اداس تھا بس اس کے حواس پر جیسے بڑے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے جو یکایک چھوٹتے جاتے تھے۔ اندراج کے رجسٹر کے صفحوں پہ چاندی کا نازک ناکت تڑپتا رہا اور کام ادھورا چھوڑ کر چلا آیا ـــــ اس کا ذہن بری طرح گڈمڈ ہو رہا تھا ـــــ وہ جا رہی تھی۔

میگی جارہی تھی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمیشے کی آخری بار بھی ــــ تب میں کوئی بسیرہ نہ تھا ــــ اور وہ تھا اور کئی مہینوں کا ناگود معدہ چھوٹ رہا تھا۔

میگ! میگ! محبت کرنا گناہ تو نہیں کسی بھی شریعت میں کسی قانون میں پھر تم کیوں جارہی ہو؟ ــ اچانک ــ یوں ــــ اس طرح ــــ امن پاگل ہو جاتا، سوچتا جارہا تھا ــــ پھر وہ واپس ہوا اور ٹنک سے سو روپے ایڈوانس لے کر سونا بازار کی طرف چلا گیا

اسے میگی کو کوئی نہ کوئی تحفہ لوٹانا تھا ــــ اس سے پہلے دیئے گئے تمام تحفوں سے بڑھیا شمیر کی کسی تاریخ کو بڑے بازار میں سے گزرتے ہوئے، اس سے میگی کی ملاقات ہوئی تھی ــ ایسے ہی اچانک جیسے وہ اب جارہی تھی ــــ اپنا یورپیا لسٹر کمر پر لادے چھوٹے سے قد کی اجنبی لڑکی ــــ سرمہ بیچنے والے کو سمجھانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی ــــ اکیلی

سرمے والا میم صاحب میم صاحب کی رٹ لگائے جارہا تھا امن اتی تمل کا کام چھوڑ کر ذرا ٹانگیں سیدھی کرنے کی غرض سے بازار میں چلا آیا۔ شام کو نوجوان لڑکے طبقے کی طرح سکھ سوئی آنکھوں کو سینکنے وہ اکثر بڑے بازار میں اس سرے سے اُس سرے تک گھوما کرتا۔ لیکن اس وقت دوپہر تھی میگی کو ان ٹرھ دکاندار کے سامنے الجھتے دیکھ کر امن کی رگ حمیت حرکت کی۔ اسے انگریزی آتی تھی۔ اگرچہ وہ بی۔ اے تک کم گو اور تیسرے درجے کا طالب علم رہا تھا پھر کیف وہ کوشش تو کر سکتا تھا۔ امن ادھر اُدھر نظر دوڑا کر جھینپتا ہوا آگے بڑھا۔ میگی دھات کی بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی چمکدار سرمے دانیاں ہاتھوں میں پکڑے کھڑی تھی اور سرمے والے کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ سلائیاں تم رکھ لو اور نچلے حصے مجھے دو میں گلدان بناؤں گی اتنی لمبی بات میگی کو کہنی آتی تھی نہ ٹرھ پڑھے کے پلے پڑتی تھی۔ ہاں وہ آٹھ گنا دام لینے کی فکر میں تھا اور کہہ رہا تھا۔

'میم صاحب، مال بہت گڈ۔ بہت اچھا ــــ آپ کو ولایت میں نہ ملے گا' پردیسی گاہک چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے میں مصروف تھا کہ امن نے اپنی خدمات پیش کیں اور سودا سستے داموں طے ہو گیا۔ میگی نے تشکر آمیز انداز سے امن کو دیکھا۔ وہ مسکرایا اور سر کی جنبش سے اپنے کارنامے کی داد وصول کی ــــ اجنبیت کی دیوار سے پہلی اینٹ کھسک گئی۔

میگی نے اسے بتایا کہ وہ سیاح ہے اور اس بڑے شہر میں نووارد تو امن اس کو اس کی قیام گاہ تک پہنچانے پر بھی آمادہ ہو گیا۔ میگی سے تھیلا اور کھانے کا ڈبہ پکڑ کر وہ اس کے ساتھ باتیں کرتا ہوا فخر محسوس کر رہا تھا ــــ اسے خیال گزرا کہ انگریزی بولنے سے کتراتا اس کا وہ COMPLEX تھا۔ جو میگی سے گفتگو کے دوران کم سے کم ہوتا جارہا ہے۔

منزل تک پہنچتے وہ ایک دوسرے کو اس حد تک جان چکے تھے جتنا دو یا تین ہم سفر اجنبی، طویل سفر کے بعد جان جاتے ہیں اور کسی ایسی ہیجانی ضرورت کو ذہن میں رکھ کر نتے بھی بدل لیتے ہیں۔

میگی، شوقیہ سیاحت کرنے والی پارٹی کی رکن تھی۔ امین کو یہ معلوم کر کے بہت مسرت ہوئی۔ راستے میں ایک آدھ بار امین تانگہ وغیرہ لینے کے لئے رُکا۔ مگر میگی نے یہ کہہ کر روک دیا کہ وہ جگہیں دیکھنے آئی ہے روندنے نہیں۔

اور امین کے لئے یہی غنیمت تھا کہ وہ ایک گوری نسل کی اجنبی لڑکی کے ساتھ شانہ بشانہ چلتے ہوئے بولے جا تا تھا ۔۔۔ اور کم مائیگی کا احساس قطعاً نہ تھا۔

امین دو چار روز کے بعد میگی سے ملاقات کرنے گیا وہ خندہ پیشانی سے ملی۔ شام کے وقت سڑک پر ٹہلتے ہوئے میگی نے اس کی غلط فہمی دور کر دی کہ وہ انگریز ہرگز نہیں بلکہ ویلش ہے اور ویلش اپنے آپ کو انگریز کہلوانے میں دُکھ محسوس کرتے ہیں اور وہ انگریزوں سے ایسے ہی نفرت کرتے ہیں جیسے کوئی محکوم قوم اپنے حاکم سے ۔۔۔ وہ زخم جو انگریزوں نے سینکڑوں سال پہلے ویلش، قوم کی آزادی سلب کر کے ان کی قوم کے دل پر لگایا تھا آج بھی ہرا ہے۔

میگی کو اگر کوئی انگریز کہتا تو وہ ناک سکوڑ کر اپنی پوزیشن واضح کرنے کی کوشش کرتی۔

پاکستان میں ورود کے بعد امین پہلا شخص تھا جس پر وہ پورا اعتماد کر سکی ۔۔۔ یہ بھوری آنکھوں اور سنہری بالوں والا نوجوان دل سے اداس اور تھکا ہوا سا ہے۔ اور یہ اپنے ملک کے ایک طبقہ کا نمائندہ ہے۔ چند ملاقاتوں کے بعد میگی اس نتیجہ پر پہنچی تھی ۔۔ اب وہ ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی نہ تھے۔

امین کی معیت میں میگی شہر اور اس کے گرد و نواح کے قابل ذکر مقامات دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی خاص طور پر جدید شہر کی شان بان دیکھتے ہوئے چیخ چیخ کر اپنے آپ کو سمجھا رہی تھی کہ پاکستان دنیا کا امیر ترین ملک ہے۔ زیورات اور زرق برق لباس میں لپٹی ہوئی ۔۔۔ یہاں کی ہر عورت رانی ہے ۔۔۔ وہ جس کا ذکر کہانیوں میں سنا تھا اور تخیل نے اس کی تجسیم کی تھی اب وہ اسے چھو کر دیکھ سکتی تھی۔ باتیں کر سکتی تھی۔

میگی عجیب فطرت کی سیاح تھی۔ تصویریں لیتی نہ نوٹ ۔۔۔ بس گھومے جاتی اور خوش ہوتی رہتی سیاحت کے بارے میں اس کا اپنا ذاتی نظریہ تھا کہ وہ واقعات اور مقامات جو نہایت حسین اور اثر انگیز ہوتے ہیں ذہن سے کبھی محو نہیں ہوتے ۔۔۔ پھر وہ اپنی خوشی کے لئے دنیا دیکھنے نکلی ہے۔ کتاب دیکھنے کے لئے نہیں۔

یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ میگی زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھی ۔۔۔ سادہ سا سچا دل ۔ عام انسانوں کے سے طور اطوار ۔ بس وہ انسان تھی۔

اس سیلانی لڑکی سے مل کر خود امین کو یوں لگتا جیسے اس نے ساری دنیا دیکھ لی ہے ۔۔۔ انسان سب جگہ ایک سے ہوتے ہیں ۔۔ فرق حیوانوں میں ہوتا ہوگا ۔۔۔ میگی کا بھی یہی خیال تھا۔

رفتہ رفتہ امین کے لاشعور میں مبہم سا خیال جاگزیں ہو رہا تھا کہ اس لڑکی نے دیس دیس، بستی بستی جو خاک چھانی ہے تو اس سے ملنے کے لئے تو نہیں! میگی روشن دماغ قوم کی بیٹی ہے تو کیا ؟ محبت کی کہانی کہیں پرانی ہنیں۔

میگی کے پیار کا نشہ امین کو ہولے ہولے چڑھتا تھا ۔ ایسے ہی جیسے بے جان رسی پر کوئی سر سبز بیل چڑھتی چلی جائے اور رسی کا وجود برگ و گل کے نیچے دب جائے۔

اس نشے کا اندازہ امین کو اس وقت ہوا جب میگی نے موسم بدلتے ہی یکبارگی اعلان کر دیا کہ وہ جا رہی ہے ۔ اس کی اگلی منزل تاج محل ہے ۔ میری نگر ہے ۔۔۔ وہ انڈیا جائے گی ۔۔۔ امین کی محبت کا تاج محل ٹوٹ کر ڈھیر ہو گیا ۔

تاج محل محض ایک مزار ہے جس میں ماضی کی ایک خوبصورت کہانی دفن ہے ۔ کیا دل محبت کا مزار نہیں بن سکتا ۔ کیا اس میں حسین لمحے کی لاش سنبھالے رکھنے کی گنجائش نہیں ۔۔۔ میگی کے فیصلے کے کئی دن بعد وہ اتنا ہی سوچ سکا ۔ کیا ہوا جو وہ یوں چھوڑ کر چلی جائے گی ۔ اور یہ بھی دکھ کی بات نہیں کہ دیس کی کسی لڑکی نے اُسے در خور اعتنا نہیں سمجھا ۔۔۔ امین شکل و صورت اور آمدنی کے لحاظ سے معمولی تھا ۔

امین کے لئے یہ بات بڑی حیران کن تھی کہ وہ ایک پردیسی عورت کو دل دے بیٹھا ۔۔ کالے کوسوں سے آنے والا رنگ رنگیلا پنچھی ۔۔ میگی ۔۔۔ جس کی آنکھوں میں خلوص دیکھ کر وہ دیوانہ وار چیخ اٹھا تھا ۔

میں تمہارے لئے کوئی تشبیہ نہیں تراش سکتا ۔ تم اتنی زندہ ہو کہ کسی بے جان چیز کا نام لیا تمہاری توہین ہوگا ۔۔۔ ہاں میں یہ کہوں کہ سمندر تمہاری آنکھوں کی مثال ہے اور پھول ۔۔۔

کبھی کبھی امین جھنجھلا جاتا ۔ روایت سے بغاوت کر کے وہ مطمئن بھی نہ تھا ۔ وہ ساری اقدار جو مشرقی عشق کا خاصا تھیں ۔۔۔ ملیا میٹ ہوئی جاتی تھیں ۔

" پردیسی پیا سنگ نبھا جو شانی کے انت میں پچھتائی "

ایسے گانے اور دوہے یاد کر کے امین کا دل چھوٹنے لگتا ۔ بھلا وہ سنجیدہ کیوں ہو گیا ۔ کہیں اس ملک

سے باہر گیا ہوتا اور کوئی مہم کر لاتا تو کوئی بات بھی تھی۔ اب یہاں گھر بیٹھے بٹھائے کوئی دل اڑا کے لے بھاگے۔!
وہ اپنے آپ کو کوستا۔
توہین ہے سراسر توہین۔ اس نے مشرقی مرد کے پلّے کچھ نہیں چھوڑا۔ امین نے میگی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ میگی نے اسے ایسے ہی تھام لیا جیسے ایک ملک دوسرے ملک کو تھام لے۔ پر اب امین کی نگاہیں بدل گئی تھیں — ان کا بان میگی کے مضبوط دل پر بھی لگا۔

بہت گھوم چکنے کے بعد وہ شاہی قلعہ کے سرسبز لان میں سستا رہے تھے۔ ٹھنڈی گھاس پر اوندھا لیٹے لیٹے امین کی نظریں میگی کے تھکے ہوئے چھوٹے سے گلابی چہرے پر کچھ یوں پڑیں جیسے اُسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔

پتلے رنگین ہونٹ کے اوپر پسینے کی شبنمی بوندیں — امین کا جی چاہا اس چمک کو اپنی انگلی کی پور میں اچک لے اور اس نکھری کو چھیڑے جو شبنم میں نہا کر حسین تر ہو گئی ہے۔

میگی، امین کی موجودگی سے بے خبر دُور ڈھلے ہوئے نیلے آسمان پر اُڑتی ہوئی چیلوں کو تکے جاتی تھی دربار خاص کی محرابوں میں جنگلی کبوتروں کے جوڑے غٹرغوں کرتے پر پھڑپھڑا رہے تھے۔ ان کے پر سیاہی مائل نیلے تھے۔ آسمان کا رنگ نیلا تھا۔ میگی کی آنکھیں نیلی تھیں — آغاز سرما کی سبوری نیلی شام قلعے کے کھنڈرات کی اوٹ میں اتر آئی تھی — اداسی، تنہائی، فاصلہ، نیلگوں گہرا — اور اس لمحے گہرے نیلے سمندروں میں ڈوب گیا۔

"لامحدودیت کا اگر کوئی رنگ ہو سکتا ہے تو وہ نیلا ہوگا — شعلہ، سمندر اور آسمان —" امین سوچ رہا تھا۔
"یا پھر یہ ایک اصل کا پَرتو ہے کہ ہر اتھاہ میں جھلکتا ہے"
"میگ —"

امین نے سکوت کے سمندر میں کنکری پھینکی۔ انگوٹھے کی پور کو میگی کے ہونٹوں پر نرمی سے پھیرا اور چپ رہا۔ میگی نے دنیا دیکھی تھی اس ٹھہراؤ کی تہ میں متلاطم لہروں کو جانتی تھی جواباً دھیرے سے مسکرائی اور اپنا چھوٹا سا ہاتھ امین کی طرف بڑھایا۔

"میگ! میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ میگ!"

شروع شروع میں وہ میگی کو اُس کے پورے نام مارگریٹ پارسن کہہ کر پکارتا تھا دوستی ہوئی تو میگی کہنے لگا اور اب میگ میگ کہے جاتا تھا۔ سچی محبت کے اظہار کے الفاظ کبھی استعمال شدہ نہیں ہوتے۔ نئے لفظوں

سے کہانی نئی بن جاتی ہے جس کی تقسیم کبھی نئی نہیں ہوتی۔

اس شام وہ دیر تک بازاروں میں پھرتے رہے۔ میگی نے بہت سی چیزیں خریدیں جو خالص مشرقی تھیں وہ امن کو بتاتی رہی کہ جب وہ گھر واپس جائے گی تو ان کی ماں ان سب چیزوں کو دلواروں اور کارنس پر سجائے گی اور تمام قصبہ نمائش دیکھنے آئے گا وہ ہمیشہ ملک ملک کے تحائف لے کر گھر لوٹتی ہے البتہ وہ جرمنی سے کچھ نہ لا سکی تھی۔ یہ جرمنی میں اقتصادی اور سیاسی بحران کے دن تھے۔ اور ٹرکی میں کسٹم ڈیوٹی پر کھڑے نوجوان آفیسر نے اسے آنکھ ماری تھی اور گذرتے ہوئے کندھے پر چٹکی کاٹ کر گیا تھا۔ اور یروشلم میں اسے اور اس کے ساتھیوں کو جاسوسی کے شبہ میں دھر لیا گیا تھا اور وہ رات بھر سردی میں ٹھٹھرا کئے تھے۔ کیوں کہ ان کے بستر تلاشی کی غرض سے چھین لئے گئے تھے ۔۔۔ اور اس قسم کے بہت سے واقعات سنا کر وہ امن کو خواب میں جھنجھوڑتی رہی۔

میگی کی اقامت گاہ تک پہنچتے پہنچتے پورنماشی کا چاند افق سے کئی سیڑھیاں اونچا چڑھ آیا تھا۔

چودھویں کا چاند ہو

امن نے بے خیالی میں ٹھوں گنگنائی

۔۔۔ رخصت ہونے سے پہلے میگی نے اصرار کر کے پورا گانا سنا وہ امن کے خلوص کا تجزیہ نہ کر پائی تھی مغربی مرد کے اظہار محبت کی دھیمی دھیمی سی سوندھی سوندھی آنچ جو راکھ نہیں کرتی سلگاتی ہے ۔۔۔ اس نے اس آنچ میں اپنے آپ کو پگھلتا ہوا محسوس کیا

رات کو اپنے بستر پر لیٹی ہوئی وہ اپنے ہاں کے مردوں کا مقابلہ امن سے کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچی کہ یہاں آغوش محبت یوں ہولے ہولے کھلتی ہے جیسے کوئی غنچہ کھلتا ہو۔

غنچہ

اچھی تشبیہ ہے۔ وہ آپ ہی آپ مسکرائی۔ امین کی یاد اور بدن کی باس اس کے حواس پر مسلط تھی۔

تھوڑی دیر پہلے امین سے سنتے ہوئے گانے کے بول کیا ایک لفظ بھی اس کے حافظے میں نہیں تھا۔ ہاں لے اچھی تھی اور پورے چاند کا ذکر تھا اور جوش جنوں میں امین نے اس کا منہ اونچا کر کے کہا تھا ۔۔۔ تم بھی پورے چاند جتنی حسین ہو ۔۔۔ یہ سن کر میگی اترانے کی بجائے زوردار قہقہہ لگا کر ہنسی۔

" GOD FORBID HOW REDICULOUS پورے چاند جتنا گول اور چپٹا چہرہ ۔۔۔ "

امین کو غصہ آ گیا۔ اور اس نے میگی کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔

"الوکی پٹھی ۔۔"

پھر ترجمہ کیا۔ میگی کھِل اٹھی۔

"ہاں یہ اچھی تشبیہ ہے"

اب کے امین کو اس کی بے وقوفی پہ ہنسی آئی۔ میگی اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر جھپی۔

"ہاں ہاں۔ ہم اہلِ مغرب الو کو دانائی اور دور اندیشی کی علامت سمجھتے ہیں۔"

پھر وہ دونوں بغلگیر ہو کر قہقہے لگاتے رہے اور یوں ایک فاصلہ اور بُعد جو باتوں سے اچانک پیدا ہو چلا تھا کم سے کم ہو گیا۔

تاریخی مقامات کی سیر کے بعد میگی امین کو بار بار کہتی تھی کہ تمہاری قوم بلاشبہ عظیم ہے۔ چھوٹی اینٹوں سے لے کر بلند میناروں تک۔ سب تمہاری عظمتِ رفتہ کی گواہی دیتے ہیں اور یہ سب کچھ پختہ ہیں۔

امین کے ذہن پہ میگی کی تمام گفتگو میں سے صرف ایک بات چسپاں ہو کر رہ گئی۔

"عظیم قوم تھی۔"

پل بھر کی ساری رواداری اور محبت جو وہ سات سمندر پار کی حوا سے رکھتا تھا۔ دب کر رہ گئے اور وہ چلا کر بولا۔

"ہم اب بھی بیٹھے نہیں۔ تاریخ کو نئے رنگ سے دہراتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہم نے اس حقیقت کو اب محسوس کیا کہ یہ دنیا فانی اور آنی جانی ہے۔ پکی عمارتیں بنانا فضول ہے۔ خالص ذاتی گھروں کی بات دوسری ہے۔ ان میں بیوی بچوں کو دن رات رہنا ہوتا ہے۔ ان کی آسائش کا خیال تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔

وہ بولتا چلا گیا۔ میگی نے ایک جھرجھری لی اور امین کی طرف ہمہ تن متوجہ ہوئی۔ مگر اب وہ خاموش تھا۔ گویا اس کے پاس باتیں ختم ہو گئیں۔ سارے دلائل ہاتھ سے جاتے رہے۔ میگی نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ امین نے اس پہ آنکھیں رکھ دیں۔۔۔

جھیل کے پتوں کے پیچھے پہلی تاریخوں کا پہلا چاند جھٹ پٹ نکلے جاتا تھا۔۔۔ وہ کالی جینز میں پھنسی ہوئی ٹانگیں پسارے ہاتھوں کے سہارے لان پہ بیٹھی تھی۔ اس کے گلے میں لٹکتے ہوئے چاندی کے لاکٹ کی چین کو چاندنی چور کرنیں چمکا رہی تھیں۔

تمہارے دیس میں حسن ہے۔ ہر طرف بکھرا ہوا۔ پریشان۔ یہ بکھراؤ دیکھنے والے کو مدہوش کر دیتا ہے۔ نہ معلوم

مجھے ایسا کیوں لگتا ہوا کہ تم سب مدہوش ہو۔امین!"

امین جھبکی طنز پہ ہنسی ہنسا۔

یہ لاکٹ اس کے پہلے بار کی نشانی ہوگا۔ وہ سوچ رہا تھا۔

امین تم نے ٹینی سن کی LOTUS EATERS پڑھی ہے۔بس تم لوٹس ایٹرز ہو۔

امن کے اعصاب کھینچ گئے۔ اسے تاؤ آرہا تھا۔ وہ اس کے جذبات مجروح کرنے کے موڈ میں کیوں تھی۔ خلوص معیشت اور سیاست سے کہیں بلند تر چیز ہے۔ یہ اپنی اور اس کی ذات کے بارے میں کیوں نہیں سوچتی اس کے متعلق کیوں نہیں کہتی۔عورت باہمی رشتے اور ذات سے الگ ہوکر سوچنے لگے تو دبال جان بن جاتی ہے۔

امین چڑ کر میگی کی باتوں کا جواب دیتا تھا۔ میگی نے آخری جھٹکی لی۔

"محبت کے درمیان کوئی دیوار حائل نہیں ہوتی۔مگر اس کی بقا ذہنی پختگی چاہتی ہے۔"

امن بے نیازی سے بیٹھا درختوں کے پیچھے چاند کو ہولے ہولے اترتے دیکھ رہا تھا۔فضا خاموش تھی۔ شہر کے بڑے گھڑیال نے دس بجائے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

امین میگی سے ناراض ہرگز نہ تھا۔بس اسے شکایت تھی تو اتنی کہ وہ اس کی ذات سے آگے بڑھ کر کیوں سوچتی ہے۔امن نے اپنے یہاں کی عورتوں کا صرف ایک مرکزِ خیال دیکھا تھا۔ مرد۔ خواہ شوہر ہو یا محبوب۔ بہت کیا تو تصوف میں پناہیں لینے لگیں۔ وہ اپنے آپ کو بہر طور بھینسائے رکھتی ہیں۔آب وہوا کا اثر ہے یا مٹی کا؟ وہ اس حکر سے نکلنا پسند نہیں کرتیں۔

ڈوبتے چاند کی دھندلی چاندنی میں وہ میگی کی آنکھوں میں نہ جھانک سکا اور بظاہر ترش لہجے میں بولا۔

"میگ!ہم دوستی سے سوا ہیں۔ جانتی ہو!"

وہ میگی پر جھکا اور میگی نے اپنی پیشانی اس کے ہونٹوں کے قریب کر دی۔ کسی گنجان درخت میں پرندوں کے پر پھڑپھڑانے کی آواز آئی۔ امین چل دیا۔

قیام گاہ کے باغ کی چوڑی سڑک پر اسے خوشبو نے گھیر لیا جو میگی کے بالوں کی نہیں تھی۔ چاند کی کرنوں کے ساتھ کھلنے والے مردا کے سپید پھولوں کی تھی۔ قیام گاہ سے ملحق گرجا گھر کے قبرستان میں الو بول رہا تھا۔امین کو چڑیلوں، بھتنوں اور آوارہ روحوں کے خیال کے ساتھ میگی کی بات یاد آئی۔اس نے لاحول پڑھتے ہوئے ایک بار پھر وہی گالی دی۔

الوکی بیٹی ۔

دوسرے روز میگی بنک میں آئی تو امین کا چہرہ روٹھے ہوئے بچے کی طرح سوجا ہوا تھا میگی کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا اور منہ دوسری طرف پھیر کر لوگوں کے ساتھ انہماک سے گفتگو کرنے لگا۔ میگی نے آہستہ آہستہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پکارا ـــــ

دفتر آتے ہی میگی کو ٹیلی فون کرنا امین کا معمول تھا۔ صبح نہ ہو سکا تو دوپہر کو۔ بنک کے اوقات کار ختم ہونے تک تین چار بار ضرور ٹیلی فون پہ بات کرتا ۔ مگر آج ۔ ؟ میگی یہی معلوم کرنے آئی تھی۔

امین نے مڑ کر اپنے پیچھے کھڑی میگی کو دیکھا اور کوشش کے باوجود مسکراہٹ کو نہ دبا سکا۔ کھسیانی ہنسی چہرے پر پھیلی آنکھوں میں ندامت اور اعتراف جرم بن کر تیری ۔ پھر ایک ادھورے قہقہے کے ساتھ اڑ گئی۔

چند ثانیے کے بعد وہ بڑے بازار میں گھوم رہے تھے۔ میگی نے امین کے کندھے کو تھپتھپایا اور کہا۔

" تمہیں دوستی رکھنے کا سلیقہ آتا ہے ـــ اور ہاں آج مجھے وہی چاند والا گانا۔ رومن رسم الخط میں لکھ دو نا! میں اسے رٹنے کی کوشش کروں گی " وہ نہایت سنجیدہ نظر آتی تھی۔

میرے جذبات کی سنجیدگی کو کب سمجھوگی میگ ! وہ بڑبڑایا۔

میگی چلتے چلتے لڑکھڑا گئی اور اس نے اپنا سارا بوجھ امین پر ڈال دیا۔

کافی ہاؤس میں بیٹھی وہ دلچسپی سے ہر طرف دیکھ رہی تھی اور چپ تھی۔ پاکستانی گڑیاں اور ماڈل پیکٹوں میں بند میز کے ایک کونے پر رکھے تھے۔

" امین! یہ خوشی کی بات نہیں کہ دنیا کے تمام انسان ایک کنبے کی صورت اختیار کئے جاتے ہیں؟ ـــ تہذیبی اور تمدنی انفرادیت غیر پختہ ذہن کی باتیں ہیں ـــ بچوں کی سی "

میگی اپنے طور پر اپنی سوچ سے مسرور اور مسحور امین کی آنکھوں میں تصدیق اور تسلیم و رضا تلاش کر رہی تھی ـــ وہ کچھ توقف کے بعد بولا کہ اس نے اس قسم کی باتوں کے متعلق کبھی غور نہیں کیا۔

بنک کاری نے سوچنے کی صلاحیت سلب کر لی تھی۔ امین اب صرف اس قدر جانتا تھا کہ اس رقم پر اتنا سود لگے گا اور اس آسامی کو اس حد تک قرضہ دیا جا سکتا ہے ـــ اور معیاری زندگی بلند کرنے کے لئے صرف روپیہ چاہیئے ۔ یوں جتنے وقت میں دولت کی روپہلی نہر نکلے تو زندگی۔ ورنہ کتے کا سا جینا مقدر ـــ تجربے نے اسے یہ سب کچھ تو سکھا دیا تھا۔ مگر وہ ٹیکنیک نہیں جانتا تھا جو کارِ معاری زندگی میں نہایت ضروری ہوتے ہیں۔

سامنے کی میز پہ ادیب اور شاعر نما دو شخص کسی زبردست سیاسی سماجی الجھن میں تھے اور زور زور سے بول رہے تھے۔ وہ بار بار خالی پیالوں کو بجاتے اور بیرے کو بلاتے۔ کبھی ماچس کے لئے کبھی دو عدد سگرٹ اور گلاس بھر پانی کے لئے ۔۔۔ پر اُن کی بحث کسی نتیجے پہ پہنچتی تو کوئی بات بھی تھی ۔۔۔ اچانک ان میں ایک گھونسا ہوا میں اچھال کر چیخا۔

"میں برٹرنڈرسل کے خیالات کی پرزور حمایت کرتا ہوں۔ خدا کی قسم! اگر خدا نہ ہوتا تو وہ خدا ہوتا۔" (نعوذ باللہ)

"لعنت ہو تم پہ ۔۔۔"

دوسرے نے بھی اتنی بلند آواز سے جواب دیا۔

قریب تھا کہ وہ برتن اٹھا کر ایک دوسرے کے سر میں دے مارتے لیکن ریسٹوران کے ماحول سے مرعوب پیچ و تاب کھاتے بیٹھے رہے۔ میگی کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ امین نے اسے تسلی دی اور سمجھایا کہ وہ لڑ ہرگز نہیں رہے۔ ادب پیدا کر رہے ہیں ۔۔۔ نیا ادب مشاہدے مطالعے اور ذہنی اپج سے زیادہ بحث و تمحیص کا مرہون ہے۔

میگی ہلکے ہلکے قہقہے لگاتی، مخصوص ٹھہرے ہوئے انداز میں دیکھا کی۔ یہ بہت تیزی سے سوچنے والی عورت تھی۔ اتنا تیز کہ امین اکثر پیچھے رہ جاتا اور وہ ایسی باتیں کہہ جاتی جن کے متعلق وہ کئی دن بعد سوچتا اور جھنجھلاتا۔

کافی ہاؤس سے نکل کر سڑک پہ چلتے ہوئے وہ امین کو بتانے لگی کہ پوری دنیا TEEN AGERPROBLEM سے دوچار ہے۔ کوئی ذہنی طور پہ، کوئی مادی پہ۔

امین نے میگی کو تنبولی کی دکان سے پان کھلوایا۔ پتے کو چبا کر میگی کے چہرے پہ مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ جیسے اس نے کچھ دریافت کر لیا ہو ۔۔۔ نیا اور انوکھا ۔۔۔ اس تجربے کے ادراک سے اس کی روح مسرور تھی۔ امین کا ہاتھ بھینچتے ہوئے وہ زور سے چلائی۔

"یہ مشرقی ہے۔ خالص مشرقی ۔۔۔ اوہ وہ خوشبو"

گویا پان کا ذائقہ اس کے لئے کڑوا تھا۔

اس کے بعد وہ جب بھی اس طرف سے گزرتے میگی، رولدو کے ہاتھ سے پان ضرور کھاتی ۔۔۔ رولدو دونوں کو اپنی طرف آتا دیکھتا تو گلوری پہلے ہی سے تیار کر لیتا۔ میم صاحب کے منہ میں گلوری رکھنے کے بعد وہ سُرخرو ہو کر اعتماد بھرے انداز سے دیکھتا اور نہایت سلیقے سے جڑا ٹکتا جیسے کسی ملک کا سفیر اپنے قومی کلچرل شو کے لئے تماشائیوں کے سامنے اطلاعات سے بھرپور تقریر کرے میگی کے پلے کچھ بھی نہ پڑتا اور وہ رولدو کو خوش کرنے کے لئے ہونٹوں

کرتی رہتی ـــــ رولدو کے من میں کئی بار یہ سکیم آئی کہ وہ میگی سے سرٹیفکیٹ لے کر دکان میں لگائے جس میں لکھا ہو۔

"وہ میم صاحب ہوتے ہوئے بھی بڑے میاں سے متاثر ہوئی ہے اور خاص طور پر اُن کے پان سے۔ قوام کی تو بات ہی کیا؟ اور ان کا پان کھلانے کا انداز ـــــ واللہ! دنیا دیکھی، کہیں نہیں دیکھا" رولدو نے امین کے سامنے اپنی تجویز پیش کی مگر امین نے اتنا کہا۔

"اس سے کیا ہوتا ہے ـــــ"

اور چل دیا۔ اسے کیا معلوم اس سرٹیفکیٹ سے کاروبار کتنا چمک اٹھے گا۔ یہ سرٹیفکیٹ ذرا تسلّے بل جڑوا کر دیوار پر ٹانگ دیا جائے تو دیکھو ساری ماڈرن سوسائٹی ادھر کھینچی چلی آئے اور ایک بار پھر وہ زمانہ لوٹ آئے کہ عطر بیز شاموں میں پان کی خوشبوئیں مہکتی پھرے جیسے دلی کے چاندنی چوک کی کنواریاں جن کی موجودگی اور چڑھتے جوبن کے احساس سے اہلِ دل سرشار رہتے تھے۔ ایک باس چڑھی رہتی تھی اک آس بندھی رہتی تھی۔ کام کینے کہانے اور بیچ بچاؤ کرنے سے چلتا ہے نہیں تو پیسے چڑھا دو۔ چٹکیوں میں چھوڑ پلک جھپکنے تک میں کام چلا لو۔ پر امین یار تو بات ہی موڑ گئے ـــــ اس سے کیا ہوتا ہے؟" یہ بھی کوئی جواب تھا۔ رولدو کو انگریزی آتی ہوتی تو وہ خود ہی میگی سے بات کر لیتا۔

ایک روز رولدو اشاروں کنایوں سے مافی الضمیر بیان کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ میگی نے امین سے تفصیل سنی تو وہ بڑے زور سے ہنسی اور ٹوٹی ہوئی اردو میں کہا۔

"پان والا! ٹم بچہ ـــــ ہمیں ایجر بجیّہ ملنے"

بڑے میاں بڑی معصومیت کے ساتھ مسکراتے ہوئے میگی کی طرف تکے جاتے تھے ـــــ میگی کو انتہائی پیار آیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بڑھ کر رولدو کے جھریوں بھرے گال چوم لے۔

آنکھوں کی زبان کتنی سادہ ہے ـــــ میگی نے سوچا اور خوشی کی لہر اس کے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ اور تم کتنے پیارے بوڑھے ہو۔ تمام دنیا کے بوڑھے اور بچے ایک سے ہوتے ہیں۔ جوانی کو جانے کیا ہو جاتا ہے؟ اس کے بے شمار رنگ ہیں اور اس کے آہنگ کو بقا نہیں ـــــ"

میگی نے اپنا ہاتھ امین کے ہاتھ میں تھما دیا۔ بڑے میاں کو شب بخیر کہتے ہوئے وہ چل دیئے۔ امین اس کے ساتھ گھسٹتا ہوا جا رہا تھا ـــــ میگی کا ہاتھ خنک تھا اور لرزاں۔ اس کی شفاف آنکھوں میں موٹروں کی روشنیاں جھلملا

"ہمارے ملک کا سنجیدہ تجربہ کار طبقہ محسوس کرے محو کریوں کے مسائل سے پریشان ہے اور تم سب ابھی اس عمر میں ہو۔ اس عمر میں جو ایک ایک خواہش کے احیا کے لئے تڑپتا ہے ۔ اجتماعی شعور سے نابلد انفرادی مسرتوں کا متلاشی ذہن ۔۔"

وہ بولتی گئی امین نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ الگ الگ چل رہے تھے ۔

" امین! میں لنڈن میں سال بھر تک PROBATION OFFICER کے طور پر کام کرتی رہی ہوں ۔۔ اس مسئلے کا مطالعہ میں نے خوب کیا ہے ۔۔ امین ۔۔ امین ۔۔ تم بھی کچھ بولو"

اس نے امین کو جھنجھوڑا ۔

میں کیا بولوں! میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں ۔ میں تمہارے ساتھ صرف تمہاری باتیں کرسکتا ہوں ۔ وہ تم ناپسند نہیں کرتیں خالص اورنٹیل اور اور یجنل باتیں میں کہاں سے لاؤں! ادھر کچھ عرصہ سے ہمارے پاس کچھ بھی نہیں رہا ۔ اور ۔ اور ۔"

امین کو مایوسی اور کم مائیگی کے احساس نے دبا لیا ۔ میگی نے پیار سے اس کا ہاتھ دوبارہ پکڑ لیا ۔ اب وہ دونوں خاموش تھے ۔

امین باتیں کرنے کرنے یاس اور نا امیدی کے اندھیرے میں غرق ہو جاتا ہے ایسے موقعے پر میگی نے دل میں ایک خاص قسم کا جذبہ ابھرتا کہ وہ اس تھکے ہوئے بھاری سر کو اپنے سینے پر رکھ لیا ۔۔ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو دکھ میں دیکھ کر کرب اور الجھن محسوس کرے وہ الجھ سی جاتی ۔ امین کی بھوری آنکھوں میں جھانکتی ۔ خلوص، محبت اور یگانگی کی ڈوری چلتی وقت ان کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ اور سینکڑوں صدیوں کا تہذیبی بُعد سمٹ کر سانس کی رد سے بھی کم رہ جاتا ۔

میں لبستی لبستی گھومتی چلی آئی ہوں ۔ امین! شاید تمہارے لئے "

میگی رُک رُک کر کہتی

" تم کبھی نہ جانا ۔۔"

امین کہتا ۔

" اچھا ۔۔"

میگی لفظ اچھا بکھی ادا کرلیتی تھی اور اس کا خیال تھا کہ وہ اس کی ادائیگی میں ایک ذائقہ محسوس کرتی ہے

جو ناقابلِ بیان ہے۔ اس کا ارادہ تھا کہ پاکستان میں رہنے کی صورت میں وہ یہاں کی زبان پر کچھ ریسرچ کرے گی۔ اس مقصد کے لئے میگی نے پڑھے لکھے لوگوں سے مشورے بھی کئے۔ لوگ مدد کے لئے فوراً آمادہ ہو گئے ۔ بالآخر بات ٹوٹی تو یہاں کہ ہماری لسانیات کا مکمل علم حاصل کرنے کے لئے ولایت جانا پڑے گا — تو میگی ایک ہی بار گھبرا گئی۔

سردیوں کا موسم بھی بیت گیا۔ سرد ممالک سے آئے ہوئے سیاح موسمی پنچھیوں کی طرح گھروں کو لوٹ رہے تھے یا پہاڑی علاقوں کا رُخ کر رہے تھے۔ جہاں کی آب و ہوا سازگار ہو۔ میگی کو امین کے خلوص اور محبت نے باندھ رکھا تھا۔ امین کا خیال تھا کہ میگی اگر یہ موسم گرما جھیل گئی تو وہ اسے شادی کا پیغام دے دے گا۔ یوں جلدبازی کرنا ویسے بھی اوچھا پن ہے۔

میگی کی وجہ سے امین سب کی نظروں میں آ گیا تھا اب بنک کے مینجر صاحب اس کے ساتھ بے تکلفی سے ملنے۔ دو ایک بار تو انہوں نے امین کو میگی کے ساتھ ہوٹل میں مدعو بھی کیا۔ اس کے شریکِ کار اُس سے حسد کرنے۔ کبھی میگی دفتر کے اوقات میں امین سے ملنے آتی تو دفتر کے مصروف کار عملے میں جو مخصوص بھنبھناہٹ ہوتی ہے۔ دم توڑ دیتی پھر کوئی فقرہ جڑتا۔ میگی کہاں سمجھ سکتی تھی۔ ہاں وہ نگاہوں کی زبان سمجھتی تھی۔

جب کوئی آنکھ جھوٹ بولتی تو میگی کو نہایت غصہ آتا وہ اس جھوٹ کو تربیت اور ماحول پر محمول کرتی۔ امین بھی کبھی کبھی دل کی بات چھپا جاتا۔ لیکن جھوٹ اس کے چہرے پر صبح کاذب کی طرح ابھرتا۔ عارضی اور دھندلا ایسی کیفیت اس وقت طاری ہوتی جب وہ میگی کی طرف پورے خلوص سے مائل ہوتا — ایک سوال آنکھوں میں اُبھرتا — وہ چپ رہتا اور میگی تڑپ کر رہ جاتی۔

تم کچھ پوچھنے والے تھے" ایک روز میگی نے پوچھ ہی لیا۔

"ہاں میں ہر روز پوچھنا چاہتا ہوں"

اس نے میگی کے سینے پر لٹکتے ہوئے دل کی شکل کے لاکٹ کو چھیڑا۔ رقابت کی آنچ اس وقت تیز تھی اور میگی کی طرف سے بدظنی کا گمان پختہ تر۔ میگی کتنی بُری تھی کہ پہلے محبوب کی نشانی کو سینے پر لٹکائے ایک اور رومان لڑا رہی تھی — جوانی کے موسم میں مذہب اور خدا سے کہیں زیادہ محبوب کی لو لگی رہتی ہے۔ میگی کے بتانے کے باوجود کہ وہ اپنے بوائے فرینڈ کو چھوڑ چکی ہے اگرچہ اس کے دیس میں وہ اب بھی اس کی راہ دیکھ رہا ہوگا۔ کیونکہ اس نے قول دے رکھا تھا کہ جب تک میگی شادی نہیں کر لیتی وہ اس کی طرف سے مایوس نہیں ہو سکتا۔ امین کا یقین اکثر ڈانواں ڈول ہوتا رہتا۔

کل ہی جب اس نے اپنی واپسی کا ارادہ ظاہر کیا تو امین چپ چاپ لوٹ آیا۔ میگی اپنی طرف سے بڑا فلسفیانہ فقرہ کہہ کر سبکدوش ہو رہی تھی۔

"میں مشرق میں روشنی کی تلاش میں آئی تھی کہ سورج ادھر سے نکلتا ہے مگر تم سب روشنی کے لئے مغرب کو منہ اٹھائے ہوئے ہو۔" امین نے اس کے نظریئے اور فلسفے پر کڑھنے کے بعد ایک ہی رقیبانہ فیصلہ کیا کہ پہلے عاشق نے تو اسے چاندی کا ذلیل سا تحفہ دیا لیکن وہ اسے سونے کا دے گا۔ پاکستانی دوست کا ہاتھ کسی صورت میں تو بالا رہے ۔۔ اسی مقصد کے لئے وہ تیز چلتا سونا بازار کو جا رہا تھا ۔۔ ردلروشنواڑی کی باتوں اور آئینے نے دل میں خواہ مخواہ مزید اُبل چل پیدا کر دی تھی۔ امین کا جی شام کے دھندلکے میں پہلے تارے کی مانند تنہا اور لرزاں تھا۔

بعد میں میگی نے انڈیا جانے کے بجائے اپنے وطن واپس جانے کا پروگرام بنا لیا۔ روانگی سے چند روز قبل وہ بے حد مصروف رہی۔ ملنا ملانا۔ الوداعی پارٹیاں ۔۔ پاکستان میں قیام کی آخری شام امین نے اپنے لئے وقف کرنا چاہی۔

"کل ملو گی؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں ۔۔ کل سنڈے ہے اور میں پاکستان میں آخری نماز پڑھنا چاہتی ہوں۔"

"اور شام کو ۔۔"

"شام کو آرام کروں گی۔"

میگی کے لہجے میں عزم کی جھلک تھی۔ جدا ہونے وقت امین اسے یہ بھی نہ کہہ سکا کہ میں تمہیں تحفہ دینا چاہتا ہوں ۔۔ ایک خاص تقریب کے ساتھ ۔۔" اسے غصہ تھا۔ ناکامی۔ ندامت۔ رقابت اور دل کا خلا۔ راستہ بھر وہ سوچا کیا۔

گرجا جانا بہت ضروری تھا ۔۔ مذہب کیا ہے، ایک نسبت کا نام اور محبت فطری جذبہ ۔۔ ہاں فطرت کو تربیت کے تابع رہنا چاہیئے ۔۔ لیکن میگی کو مجھ سے محبت کیا تھی؟ ۔۔ جانے کیا تھا۔ فطرت ۔۔ فطری جذبہ کچھ بھی نہیں۔ اور میگی کبھی بھی نہیں ۔۔ اور میگی کبھی کچھ فیصلہ کرتی ہے۔ کبھی کچھ ۔۔ کمینی ہے۔

اوائل جون کی صبح نہایت چمکیلی تھی۔ اونچی دیواروں اور درختوں پر پہلی دھوپ پھیلی تھی۔ گرم ہوا کے جھکڑ سویرے ہی سے چل رہے تھے۔ امین دفتر جانے کے بجائے نہا دھو کر میگی سے ملنے گیا تو پتہ چلا کہ وہ کسی کہاں صبح کے ناشتے پہ مدعو ہے اور وہاں سے آتے ہی ہوائی اڈے پہ چلی جائے گی۔ وہ نوکر کے

پاس ایک نوٹ چھوڑ گئی تھی کہ امین ہوائی اڈے پہ ذرا جلدی پہنچ جائے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔ وہ جل کر رہ گیا ۔۔ یہ صبح وہ اس کے ساتھ بھی تو گذار سکتی تھی ۔ اس قماش کی عورتیں دولت مندوں کو ترجیح دیتی ہیں۔ یہ بات تھی تو میگی اس مرد کا اتنی نفرت سے کیوں ذکر کر رہی تھی جو ایک شام کو اس کے پیچھے پیچھے ہاسٹل میں پہنچ گیا تھا۔ چوکیدار نے سوچا تھا کہ میم صاحب کا کوئی ملنے والا ہوگا۔ اس لئے روکا نہیں ۔۔ روشنی میں اجنبی کا چہرہ بغور دیکھ کر وہ ٹھٹکی تو مرد سینکڑوں روپوں کے نوٹ اس کے سامنے گنتے ہوئے شستہ انگریزی میں کہنے لگا ۔

تمہیں پاکستان کی چیزیں پسند ہیں۔ تمہیں پاکستانی لوگ پسند ہیں ۔۔ میں تمہیں نئے نئے لباس اور زیورات سے لاد دوں گا۔ میرے ساتھ چلو۔ بھوکے کلرکوں کے ساتھ کیوں پھرتی ہو۔

میگی غصے اور نفرت سے چیخی ۔ چوکیدار کے چوکنا ہونے سے پہلے اجنبی اپنی راہ لے چکا تھا۔

اور نئے سال کی بے تکلف پارٹی میں ڈھلتی عمر کے مرد نے میگی کے ساتھ ناچتے ہوئے ایک ثانیے میں' پرپوزل' دے ڈالا" میں تمہیں مہارانی بنا کر رکھوں گا۔

میگی تھک کر بیٹھ گئی ۔ وہ نئے سال کو خوش آمدید کہنے کے لئے ناچ رہی تھی اور لوگ اسے نئی زندگی کا پیغام دے رہے تھے ایسی اونچی سطح کی مارٹیاں میگی نے اپنے ملک میں کہاں دیکھی ہوں گی۔ اسی لئے ہر بات آ کر امین کو اور اپنی ہمجولیوں کو سناتی اور کہتی اگر میرا باپ یہاں آ کر دیکھے تو وہ مجھے پہچان نہ سکے۔ اسے کیا معلوم کہ اس کی بیٹی یہاں آ کر اونچی سوسائٹی کی خاتون بن گئی ہے۔

اصل میں وہ یہاں کی گلیاں اور عوام دیکھنے آئی تھی ۔ مگر بلکوں پہ بٹھالی گئی ۔ وہ انسان تھی آنسو تو نہ تھی کہ پلکوں کی بالکونیوں سے اتر کر نیچے چلی جاتی ۔ جہاں زندگی اندھی اور لولی لنگڑی ہے امین نے بھی اندرون شہر دکھانے کی جسارت نہ کی ۔ مبادا وہ دل برداشتہ ہو جائے ۔ مگر اب وہ جا رہی تھی ۔ وہ چاہتا تھا اس کے بارے میں کم سے کم سوچے ۔

سہ پہر کو ہوائی جہاز کی روانگی تھی اور ابھی دن کا ایک بجا تھا۔ ٹیلی فون کیا تو پتہ چلا کہ وہ ریزیڈنس پر واپس آ چکی ہے ۔ امین بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پہنچا ۔ میگی کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

" میگ تم سچ مچ جا رہی ہو۔"

ہاں ۔۔

"تم تو سری نگر جا رہی تھیں"

"پھر سہی —"

"میگ — !!!"

میگی نظریں نہ ملاتی تھی اور لوگوں سے ملے ہوئے چھوٹے چھوٹے تحائف بن کھولے ،بن دیکھے پرس میں بھر
ہی تھی — ابین نے جیب میں پڑی ہوئی ڈ سا کو انگلیوں سے کئی بار چھوا۔

میگ میں تمہیں یاد آؤں گا؟"

"اوہ —"

وہ تھکن کا بہانہ کر کے بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور رنگت سُرخ ہو رہی تھی ۔میگی کا چھوٹا
گلابی ہاتھ ابین کے بالوں میں چھپ گیا۔ ابن نے اسے قریب تر کر لیا۔

باہر کھڑکی کے پاس کھڑا چپڑاسی کہہ رہا تھا۔

"دیر ہو چلی مس صاحب ٹیکسی آ گئی —"

میگی نے عجلت سے اپنی تصویر ابن کی بڑھائی۔ اس پر پتے اور دستخطوں کے علاوہ لکھا تھا۔

"ابین کے لئے — محبت کے ساتھ"

ابن ایک بار پھر مسکرا دیا۔

ہوائی اڈے پر میگی کے ملنے والوں میں سے کوئی بھی نہ پہنچا تھا۔ وہ کونے میں پڑے ایک صوفے پر بیٹھے
ب دوسرے کو دیکھ بھی نہ رہے تھے۔ زندگی میں بعض ایسے مقام بھی آتے ہیں جب بھرے ہوئے پیانے
ے کچھ نہیں چھلکتا — کوئی شکوہ کوئی شکایت۔

ضبط ایک مہر۔

ایک بوجھ — کہ جس کے نیچے دب کر سب کچھ دم توڑ دیتا ہے۔

وٹینگ روم میں بڑی رونق تھی — اناؤنسر کی آواز پر کوئی توجہ نہ دیتا تھا "کراچی جانے والے مسافر جہاز
ب پہنچ جائیں"

میگی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب وہ پریشان نہ تھی۔ ابن نے عجلت سے ڈبا کھول کر سونے کا سادہ چھلا
لا جو عیسائی دولھا نکاح کے بعد اپنی دُلہن پہناتا ہے۔ وہ میگی کے ہاتھ بڑھانے کا منتظر تھا۔ میگی کی رنگت

بھیگی پڑ گئی — امین نے بڑھ کر اس کا بایاں ہاتھ پکڑ لیا اور چھنگلیا کے ساتھ والی انگلی میں پہنانے لگا تو میگی نے ہاتھ کھینچ لیا۔

"نہیں —"

"اس سے زیادہ کی خواہش نہ کروں گا۔"

"میں اس انگلی میں نہیں پہنوں گی —"

امین کے دل پر ایک قیامت گزر گئی۔ وہ پاگلوں کی طرح بکنے لگا۔

"مجھے پہلے ہی پتہ تھا۔ میں پہلے ہی جانتا تھا — یہ لاکٹ — میگی تم —" قریب تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے کہ میگی نے لاکٹ کی ڈبیا کھولی اور امین کی ہتھیلی پر الٹ دی — اس میں مٹی کی ایک ڈلی تھی اور گھاس کی چند پتیاں۔

"میں جا رہی ہوں۔ وہاں جا کر بھر لوں گی۔ یہ تم لے لو — یہ میرے دیس کی مٹی ہے اور میرے دیس کی گھاس۔ میرے محبوب"

امین نے دیکھا کہ وہ تیزی سے مسافروں کے گزرنے کے خاص راستے کی طرف لپک رہی ہے — اچانک وہ مڑی اور امین کو ہاتھ ہلا کر سلام کیا۔ مگر امین کشمکش دپیچ میں تھا کہ وہ اس لڑکی کو الوداع کہے یا گالی دے! —

پھر اس کا سر اپنے آپ جھک گیا۔ جیسے سجدہ کر رہا ہو۔

دھرتی کا سرطان

لطیفؔ کاشمیری

پھولوں کے درمیان مسکراتے ہوئے پیارے پیارے بچوں نے ایک بار کہا تھا: "آہا! یہ کتنی پیاری جگہ ہے یہاں سے تو جانے کو جی ہی نہیں چاہتا ابو! بس جی چاہتا ہے یہیں اچھلتے کودتے صبح سے شام کر دیں" پھر وہ چہلیں کرتے اور چوکڑیاں بھرتے باغیچے کے ایک کُنج سے دوسرے کنج کی سمت لپکنے اور لڑھکنے لگے۔ ان کی اُچھل کود سے پھولوں کی لہلہاتی شاخیں جھوم جھوم گئیں اور ان کے سواگت کے لئے بار بار آگے جھک کر پیچھے کو ہٹنے لگیں۔ تب یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بچوں اور پھولوں میں تمام قدریں مشترک ہوں۔ شرمانے لجانے سے لے کر حسنِ فطرت کی نمائندگی تک۔ ان میں کوئی غیریت اور حدِ فاصل نہ ہو۔

وہ بھی کیا سہانے دن تھے۔ بہار کی آمد آمد تھی۔ باغوں کے ہرے ہرے پیڑوں پہ نیا نیا بور آیا تھا۔ ہر طرف کلیاں چٹک رہی تھیں۔ پھول مسکرا رہے تھے۔ پرندے اپنی اپنی لے میں چہچہا رہے تھے اور ارد گرد خوشیوں اور خوشبوؤں کا ایک رقصِ ناتمام جاری تھا۔ میرے دل میں بھی عزم و عمل کی ایک ننھی سی قندیل روشن تھی۔ دست و بازو میں اتنی توانائی تھی کہ میں اپنے باغیچے ہی کو نہیں بلکہ دوسروں کے باغ باغیچوں کو بھی سنوار اور نکھار سکتا تھا۔ خونِ جگر سے ان کی آبیاری کر سکتا تھا اور انہیں ایک آسیب زدہ تاریک بیابان سے ہنستے مہکتے گلستانوں میں تبدیل کر سکتا تھا۔ مگر نہ جانے کیسے اور کس مرحلے پر میرے دل میں خوبصورتی سے پیار کرنے والا اور ہر وقت فروزاں رہنے والا حسیں جذبہ بجھ سا گیا۔ ایک بار میری آنکھ کیا جھپکی کہ جیسے ایک عہد بیت گیا۔ پھر مجھے یونہی آنکھیں موندے اونگھتے رہنے کا روگ سا لگ گیا۔

اب میں کتنے ہی برسوں سے آنکھیں جھپکائے خواب اور بیداری کے سنگم پر جھول رہا ہوں۔ بس ہاتھ پر ہاتھ دھرے اونگھتا رہتا ہوں، جیسے کوئی افیونی افیون کی پینک میں نیستی اور ہستی کے مابین معلق ہو۔

میں ایک باغباں تھا مگر غفلت کے دوران میں نے بیکار جھاڑ بوٹیوں کو تلف کرنا نہیں چاہا۔ میرے اسی

ذرا سے تساہل سے زمین کی قوتِ نمو جو پھولوں کی نشو و نما میں مدد دے سکتی تھی، بیکار طفیلی پودوں کی نذر ہونے لگی پھر میری کاہلی پر ماتم کرنے کے لئے باغیچے کے عین وسط میں تھوہر کے ایک پودے نے ناگ پھنی کی طرح سر اٹھایا پھر تھوہر کی فوج ظفر موج برابر اُگنے اور نشو و نما پانے لگی جس نے آہستہ آہستہ باغیچے کی ساری کیاریوں کو اپنے فولادی شکنجے اور زہریلے محاصرے میں لے لیا۔

اس لمحے مجھے بچوں نے کہا تھا "مالی بابا! دیر نہ کرو اپنی کھرپی یا درانتی سنبھالو اور تھوہر کو باغیچے پر غالب آنے سے روک دو۔"

"نہیں ننھے منّے پیارے فرشتو!"، میں نے انہیں ٹوک دیا۔ "تھوہر بھی تو خدا کی ایک نباتاتی مخلوق ہے۔ یہ بھی ایک اکھڑ سا جنگلی پھول ہی تو ہے۔ بظاہر بھدا سا ہے مگر دیکھو تو سر پر سجیلا تاج پہنے پھولوں کے درمیان کتنا بھلا لگتا ہے۔ یہ تو بھیڑ بکریوں کا داخلہ روکنے کے لئے بھی ایک حفاظتی پشتے کا کام دیتا ہے۔"

اس وقت پج پچ میری سوچوں سے نخلستان جھلس کر رہ گئے تھے اور میری ساری خود آگاہی اور خود اعتمادی ریت کی فصیل بن کر ڈھ گئی تھی۔ ایک بے بنیاد سے گمان اور بے معلوم سے خوف نے میرے آگے پیچھے دیواریں سی اٹھا دی تھیں۔ اسی لئے میں اور بھی تھکن اور کسلمندی کا شکار ہو کر رہ گیا۔ میرے گراں ڈیل اعضا کی ساری توانائی ایک دہشت زدہ فضا میں سلب ہو کر رہ گئی۔

میں کہ ایک باغیچے کا عجب رکھوالا تھا۔ بے انداز عزم اور حوصلے کا نشان تھا۔ قوت و توانائی کا ایک سرچشمہ تھا مگر آج میرے بچے مجھے یوں درماندہ و خستہ اور پامال دیکھ کر منہ میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں۔ ایک پوری نسل کا ماتم کرنے لگتے ہیں، میرے بے بضاعتی اور بے اعتمادی پر وہ ششدر رہ جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ان کی حیرت زدہ صورتیں ایک مجسم سوال کا روپ دھار لیتی ہیں۔

"مالی بابا! آپ تو کبھی ایسے بے عمل، بے یقین اور بے حس نہ تھے۔ آپ کو آخر ہو کیا گیا ہے؟ ایک پُراسرار سی چپ اور سنگدلانہ بے تعلقی نے تو آپ کی رہی سہی زندگی کی رمق بھی چھین لی ہے۔"

ہاں، میں انہیں کیا جواب دے سکتا ہوں؟ میں اپنی احمقانہ سوچوں کا ماتم کروں یا اسے گلستان کی تقدیر کہوں۔ مگر نہیں تقدیر تو شاید تدبیر کے اشاروں کی منتظر رہا کرتی ہے۔ کہتے ہیں دنیا میں جب بھی کہیں پھول اگانے والے ہاتھ کپکپانے یا مرجھانے کا کام دینے لگتے ہیں تو باغوں میں چنبیلی اور گلاب کھلنے کی بجائے طفیلی جھاڑ جھنکار اور تھوہر اُگنے لگتے ہیں۔ پھر باغ کا نقشہ ہی بدل جاتا ہے اور ایک ویرانی اور جانگسل سکوت سا چھا جاتا ہے۔

میرے بچے جو اسی باغ میں ہنستے کھیلتے جوان ہوئے ہیں اس بات پر اکثر کڑھتے ہیں کہ اب درختوں کی پھننگوں پر بیٹھے پرندوں کی چہکار سنائی نہیں دیتی جیسے وہ اصلی نہ ہوں، حنوط شدہ پرندے ہوں، جنہیں ٹوٹے کے سہارے ٹہنیوں سے باندھ دیا گیا ہو۔

ایک روز تو غضب ہو گیا۔ وہ کہنے لگے۔

"بابا! یہ قبرستان جیسی ویرانی اور اداسی تو ہم سے دیکھی نہیں جاتی۔ یہاں تو ہر طرف ٹُنڈ مُنڈ پیڑوں اور منڈیروں پر اُلّو بیٹھے ہوئے ملتے ہیں۔ شکستہ کیاریوں پر ٹوٹی ہوئی قبروں کا گمان ہوتا ہے۔ مٹیالی روشوں پر دھول سی اُڑتی ہے۔ توبہ اللہ۔ یہاں کس قدر حبس ہے۔ یہاں سے تو ہمیشہ کے لئے چلے جانے کو جی چاہتا ہے۔"

کچھ سائنسی مذاق رکھنے والا ایک دوسرا بچہ کہنے لگا۔

"شاید اس زمین کی مٹی میں کسی کیمیائی جزو کی کمی واقع ہو گئی ہے۔ یا پھر اس کی نہروں میں کہیں زہریلا مواد جمع ہو گیا ہے جس نے زمین کی شریانوں میں اتر کر اخوت و محبت کے سارے رشتے کاٹ دیئے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس گلستاں کو پرانے وقتوں کے ایک بیابان میں تبدیل کر دیا ہے۔" میں اپنے بیٹوں کی باتیں، کھردرے حقائق سے عبارت باتیں، جہالت آمیز سکون کے ساتھ سنتا ہوں اور سر جھکا لیتا ہوں۔

درست ہے کہ گلستاں کے اکثر پھول، تھوہر کے تلب نما پتوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ تیز نوکیلے اور زہریلے کناروں والے خاردار پتے ـــــ جو کسی کوڑھی کے جسم کی طرح اندر اور باہر سے زہریلے مواد سے لبریز ہوں، ان پھولوں سے ساتھ ساتھ بچوں کے کملائے ہوئے زرد چہرے، غمگین اور متفکر صورتیں میری نظروں تلے گھوم گھوم جاتی ہیں اور میں سوچنے لگتا ہوں۔ میرے گلستاں سے بہار اب کترا کر کیوں گزرنے لگی ہے۔ اب ہر سمت کانٹے ہی کانٹے کیوں ہیں۔ زہریلی نفرتوں اور بُغض و عناد کی دلدل میں انسانیت کا زخمی ڈھانچا دُور دُور تک دھنس گیا ہے۔ ہر سمت موہوم سی عفونت ہے جیسے کہیں کوئی مردہ جانور گل سڑ رہا ہو۔ ہر طرف اڑتی ہوئی دھول ہے اور پھولوں کی نازک پنکھڑیوں پر چھا جانے والے تھوہر کے پھن ہیں، شاید یہ میرے گلستاں کا مقدر نہیں۔

میں تو اپنے من کو ٹٹولتا ہوں تو سارا قصور مجھے اپنا ہی نظر آتا ہے۔ یہ سب یقیناً میری اپنی ہی کج فہمی کا کیا دھرا ہے۔ جب اس پھلواری میں تھوہر کے پہلے ناگ نے پھن اٹھایا تو میں نے اسے اکھیڑ پھینکنے کی کچھ زیادہ ضرورت نہیں سمجھی۔ پھر دوسرے اور تیسرے ناگ نے پھن پھیلا دیئے جن کی جڑیں زمین میں دُور دور تک پھیلتی چلی گئیں پھر شاخوں کی صلیبوں پر لٹکے پھولوں کی پتیاں ریزہ ریزہ ہو کر خاک میں ملنے لگیں۔ پھول اپنی ہی چتا کی آگ میں سلگنے

گئے اور ان کی جلی ہوئی پتیوں کی باس دھرتی کے دوسرے کنارے تک پھیل گئی۔

ابھی کل ہی میرے بچے پوچھ رہے تھے "بابا ہمارے اردگرد اتنا گمبھیر اندھیارا اور اندھیرا کیوں ہے۔ ہم اپنے
ی کی نظر میں اتنے ہیٹے کیوں ہیں؟ ہم اپنے سائے تک سے خوفزدہ کیوں رہتے ہیں؟ ہم مالک ہوتے
اتنے بے بس سے کیوں ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہری ہری روشوں اور گھنے پیڑوں کے ساتھ ساتھ
ہر چیز گروی رکھ دی گئی ہو؟"

یہ سچ ہے کہ میں پرانی نسل کا نمائندہ ہوں اور اپنے نوخیز بچوں کی جوان سوچوں سے کبھی کبھی بڑا خوفزدہ
ہوں۔ انہیں مطمئن کرنے کے لئے میرے پاس کوئی دلیل اور منطق نہیں ہوتی۔ چنانچہ وہ خود ہی
الوں کی اداس چاندنی اور ہاتھوں کی کپکپاہٹ میں اپنے سوالوں کے جواب پا لیتے ہیں۔ وہ میری
ی نقاہت اور ہاتھوں کے رعشہ کا سبب جانتے ہیں۔ اسی لئے مجھ سے گھر کے پُراسرار قبضے اور
ہ نجات کی بابت کچھ پوچھتے ہیں تو میں بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ سجدے میں چلا جاتا ہوں
بہ پاکر رقت بھری دعاؤں کے در کھول لیتا ہوں۔

یا مالک! اپنے حبیب کے صدقے ـــــ میری اس پھلواری کو بلائے ناگہانی سے نجات دے۔ یا خدا
دبہرہ اگنے دے تاکہ گلاب مصلوب نہ ہوں۔"

مڑی دو گھڑی کے لئے جب میں سجدے سے سر اٹھاتا ہوں تو اپنی الہامی کتب سے مقدس آیات
تے ہوئے اپنے اجاڑ در و بام پر پھونکتا ہوں کہ کسی طرح یہ بلائے ناگہانی ٹل جائے۔ دھرتی کے
سے استے شقا مل جائے اور وہ صدیوں پرانے ایک بیاباں سے جدید تر کے ایک گلستاں میں
ئے۔ میں مستقبل سے مایوس قطعاً نہیں ہوں، پھر بھی میں کتنا مضمحل اور تھکا تھکا سا لگتا ہوں
بچوں کو جب بے بسی کے اس بھنور سے نکلنے کا کوئی رستہ نہیں ملتا تو میرا دل لہو کے آنسو رونے
ہ۔ اب تو ان خزاں زدہ لمحوں میں بے برگ و بار شاخوں کے درمیان رینگتا ہوا سناٹا میری
لے کو ڈسنے چلا آتا ہے ـــــ میں سوچتا ہوں کیا یہ یخ بستہ سناٹا ہمیشہ رہے گا؟ کیا تو ہر
ذہیلے سرے پھولوں کے سینے یونہی چھلنی کرتے رہیں گے؟ اور مہکتے گلاب یونہی شاخوں پر مصلوب
رہیں گے؟

بس اپنی سوچوں کے صحراؤں میں دیر تک بھٹکتا رہتا ہوں۔ مگر ہر طرف بے جان سہاروں کے

سراب ملتے ہیں۔ کہیں امید کا نخلستان نظر نہیں آتا تو میں تھک ہار کر نقلِ مکانی کی تدبیریں کرنے لگتا ہوں اور یہ بھول جاتا ہوں کہ تھوہر اور گلاب کا وجود تو قدرتی ہے۔ یہ اندھیرے اجالے کی طرح ازلی ہے۔ ان کی جنگ ابدی ہے زمین پر جب بھی کہیں بھی کسی باغباں کی آنکھ جھپکتی ہے اور وہ اپنی کھرپی کا اور نوارے کا استعمال بھول جاتا ہے درو درانتی کو سرہانے رکھ کر سو جاتا ہے تو دھرتی پر طفیلی گھاس پھوس اور تھوہر یلغار سی کر دیتے ہیں۔

آج ہی سورج طلوع ہونے پر جب میری آنکھ کھلی تو میرے سرہانے سے میری درانتی غائب تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا، میرے نوکر بچے کے ہاتھوں میں درانتی کے دندانے کہکشاں کی مانند دمک رہے تھے سورج کی روشنی میں چمکتی درانتی اپنے بچے کے ہاتھوں میں لہراتی دیکھ کر میری برسوں کی بجھی بجھی آنکھوں میں پہلی سی ایک چمک لہرا گئی مگر کون جانے اس کا دل مایوسی کی تاریک گپھاؤں میں ابھی مقید ہے یا ایک نئے عزم اور یقین سے منور ہو چکا ہے۔

جانے وہ اس درانتی سے اپنا ہی گلا کاٹ لے گا یا تھوہر کو اس کی جڑوں سمیت اکھیڑ کر دھرتی پر لاکھوں گلاب اگائے گا۔

کون جانے ــــــ کون جانے

انصاف

مسعود مفتی

تھوڑی دیر تک مقدمے کا فیصلہ سنایا جانا تھا

ملزم ہتھکڑی میں دونوں ہاتھ جکڑے ہوئے امید و بیم کی حالت میں خاموش تھا۔ اس کا باپ یہاں اور چند دوسرے رشتہ دار ذرا فاصلے پر تھے۔ عدالت کے باہر گاؤں کے چند اور لوگ بھی منتظر تھے۔

جج عدالت سے ملحقہ کمرے میں سر پکڑے سوچ رہا تھا ـــــ مقدمے کی فائل اس کے سامنے پڑی تھی۔

یہ عجیب مقدمہ تھا۔

ملزم پچیس سال نوجوان تھا، اور کراچی میں سرکاری ملازم تھا۔ اس کے خلاف الزام یہ تھا کہ اس نے اپنے ایک سال بچے کو قتل کر دیا تھا۔ وہ قتل سے انکاری تھا مگر باقی تمام حالات تسلیم کرتا تھا جو استغاثہ کی کہانی میں پیش کئے گئے تھے۔

دو سال پہلے اس کی شادی اپنی چچا زاد بہن سے ہوئی، اور بڑے عجیب حالات میں ـــ بیوی کی ماں چند سال پہلے مر گئی تھی۔ وہاں کی نگرانی نہ ہونے کی وجہ سے لڑکی بہک گئی۔ کالج آتے جاتے کسی کے ساتھ تعلقات ہو گئے تھا اور باپ کو تب پتہ چلا، جب حاملہ ہو چکی تھی۔ اس نے علاج وغیرہ کرانے کی کوشش کی مگر فائدہ نہ ہوا ـــــ لڑکی نے انتہائی سختی کے باوجود اپنے آشنا کا نام نہ بتایا۔ تب وہ اپنے چھوٹے بھائی کے پاس آیا، جو ملزم کا باپ تھا۔

بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کو باپ کی طرح پالا تھا، کیونکہ چھوٹے کے بچپن میں ہی والدین کا انتقال ہو گیا تھا اور اس کی ساری تعلیم و تربیت بڑے بھائی نے کی تھی۔ ملازمت دلائی اور شادی کرائی۔ وہ بھی اسے بالکل باپ کی طرح سمجھتا تھا۔

بڑے بھائی نے چھوٹے کے پاؤں پکڑ لئے۔ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا، اور سارا واقعہ کہہ سنایا۔ خاندان

کی عزت، گھر کی عزت، بڑے بھائی کی عزت ــــ چھوٹا اٹھ بڑا اٹھا، بھتیجی پر غصہ آیا، بڑے بھائی پر ترس آیا، اور اپنی ساری عمر کی احسان مندی اس کے دل و دماغ میں سمٹ آئی۔

سب نے مل کر فیصلہ کیا کہ ملزم چند دنوں میں چھٹی پر آ رہا ہے اس کی شادی چچا زاد بہن سے کر دی جائے۔

شادی پوری دھوم دھام سے ہوئی۔

اگلی صبح تک ملزم کو پتہ چل چکا تھا کہ اس کی بیوی حاملہ ہے۔ اس کے احتجاج پر والدین اور چچا نے ساری بات سمجھائی۔ مگر وہ سخت ناراضگی کی حالت میں بیوی کو چھوڑ کر کراچی چلا گیا ــــ بزرگوں نے سوچا، خود ہی کچھ دن بعد سمجھ جائے گا۔

چار ماہ بعد اسے اطلاع دی گئی کہ اس کی بیوی کے ہاں لڑکا ہوا ہے ــــ اس نے چھپانے کی کوشش کی مگر دفتر میں کسی کو اپنے رشتہ دار کی معرفت پتہ چلا، اور بات ہر طرف پھیل گئی۔ اس سے اٹھتے بیٹھتے مذاق ہونے لگا۔ اور اس نے احساسِ کمتری میں سب لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔

باپ اور چچا نے کئی دفعہ کوشش کی کہ وہ اپنی بیوی کو بسا لے، مگر وہ نہ مانا۔ کئی دوسرے رشتہ داروں نے بھی کوشش کی۔ مگر وہ طلاق پر بضد رہا۔

آخر بیوی نے اسے پے در پے خطوط لکھنے شروع کئے۔ ماضی کی معافی چاہی۔ زندگی بھر خدمت کا یقین دلایا۔ طلاق کی حالت میں بھیانک مستقبل کا نقشہ کھینچا کہ طوائف بننے کے سوا چارہ نہیں ہو گا۔ بیوی نہ رہی تو کیا، چچا زاد کا رشتہ تو رہے گا، اور جس کی چچا زاد طوائف ہو، اس کی کیا عزت ہو گی۔

بالآخر وہ دل میں فیصلہ کر کے گھر آیا۔ دو چار دن گھر میں ٹھہرا، پھر سسرال گیا تاکہ بیوی کو لے آئے، وہاں اس کی خوب آؤ بھگت کی گئی اور چچا نے از سر نو لڑکی کو رخصت کیا۔ اور انہیں بس پر چڑھانے خود آیا۔

بس نے اسی میل کا فاصلہ طے کر کے پانچ گھنٹے بعد گھر پہنچنا تھا۔ مگر وہ راستہ میں ہی اتر گئے کیونکہ وہ بیوی کو چند عزیزوں سے ملوانا چاہتا تھا۔ بچے کو گود میں لئے وہ بیوی کے ساتھ ساتھ کھیت میں پگڈنڈی پر چل رہا تھا ــــ ایک جگہ وہ پیشاب کرنے رکا، اور بیوی آگے چلتی گئی۔

اس نے بچے کو پگڈنڈی پر لٹایا۔ ایک اینٹ نیچے رکھی، اور دوسری سے دو تین بھرپور ہاتھ مار کر اس کی پسلیاں توڑ دیں ــــ

پھر وہ اطمینان سے بیوی کے پاس گیا، اور کہنے لگا آج سے ہم نئی زندگی شروع کریں گے، ماضی ختم مستقبل شروع، تم طوائف نہ بنو گی۔ میں لوگوں کی ہنسی کا نشانہ نہ بنوں گا۔

اور وہ بس میں بیٹھ کر گھر پہنچ گئے۔

پیچھے گاؤں والوں نے کھیت کے اوپر کوؤں کا جمگھٹا دیکھا، تو فصل میں جھانکا ــــ وہاں بچے کی لاش تھی ـــــ ملزم کی بیوی نے بھی ایک خط پولیس کو لکھ دیا۔ دونوں شہادتیں مل گئیں۔ ملزم گرفتار ہوا، اور مقدمہ شروع ہو گیا۔

ملزم سارے واقعات تسلیم کرتا تھا، سوائے قتل کے، مگر بچے کے قتل یا گمشدگی کے متعلق کوئی جواز نہ دے سکتا تھا ـــــ کسی قسم کے شک کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ اس نے قتل کیا ہے۔ اور جرم مکمل طور پر ثابت ہو چکا تھا

اس مقدمہ میں شہادتیں بھی عجیب طرح کی تھیں۔

بیوی نے ملزم کے خلاف شہادت دی تھی، اور قتل کی ساری تفصیلات بتائیں۔ اسے بچے کے مرنے کا بہت افسوس تھا، جو "کسی" کی نشانی تھی، "کسی" کا نام بتانے سے اس نے صاف انکار کر دیا۔ صرف اتنا کہا کہ میری خاندانی روایات اور ہماری معاشرتی اقدار مجھے اس شخص سے شادی کی اجازت نہیں دیتیں، تو میں کیوں اس کا نام اچھالوں۔ خصوصاً جبکہ میں اس سے پیار کرتی ہوں۔

ملزم کی ماں عدالت میں پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی کہ خدا کے لیے مجھ سے میرے بیٹے کے خلاف شہادت نہ لو، میں کس طرح خود پھانسی کا پھندا اس کے گلے میں ڈالوں۔

ملزم کا چچا اس کے خلاف پیش ہوا۔

ملزم کا باپ کبھی بیٹے کی حمایت پر اتر آتا، اور کبھی بھائی کی ـــــ شہادت کے دوران اسے دو دفعہ اعصابی تشنج کا دورہ پڑا۔

باقی رشتہ دار بٹے ہوئے تھے، اپنی اپنی برادری کی مصلحتوں کی بنا پر۔

جج ایک انتہائی شریف اور ذہین انسان تھا۔ وہ کئی دنوں سے اس مقدمے میں الجھا ہوا تھا۔ وہ انصاف کرنا چاہتا تھا مگر جو چیز اسے ایک دفعہ انصاف لگتی، وہ دوسری نظر میں ظلم لگتی، ایک سالہ بچے کے قتل کو وہ بہت بڑا سانحہ مانتا تھا ـــــ مگر اس سانحہ کا ذمہ دار کون تھا؟

ملزم بے قصور لگتا ہے ـــــ وہ حالات کی زد میں آ گیا تھا۔ ایسے حالات جو اس کے اپنے پیدا کردہ

نہ تھے۔ شادی اس کی مرضی کے بغیر ہوئی۔ بیوی کی حالت کا اسے علم نہ تھا اگر وہ حالات سے سمجھوتہ کر لیتا تو دنیا اسے بے غیرت کہتی۔ طعنے اس کے چاروں طرف گھومتے، اور وہ زمانے بھر میں تکو بن جاتا ــــ اگر وہ طلاق دینا چاہتا، تو اس کے اپنے والدین سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ چچا اور دوسرے عزیزوں کا دباؤ اس کے علاوہ تھا۔ اس کی طبیعت میں سرکشی اور بغاوت نہ تھی، یہ طبیعت بھی خدا کی ودیعت کردہ تھی، اور اس کی اپنی بنائی ہوئی نہ تھی۔ اس لئے وہ یہاں بھی بے بس تھا ــــ آخری صورت بچے کے قتل کی تھی۔ لیکن اس طرح وہ قانون کی گرفت میں آجاتا۔ گویا ملزم کے لئے نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن، والا معاملہ تھا ــــ وہ سزا کا نہیں، بلکہ ہمدردی اور ترس کا مستحق تھا۔

تو پھر اس سانحے کی ذمہ داری لڑکی پر تھی! ــــ جس نے پہلے بد اخلاقی کی، اور بعد میں اپنے شوہر کے خلاف شہادت دی۔ مگر اس سارے ڈرامے میں لڑکی کا اپنا دخل کتنا ہے؟ ــــ اس کی ماں مرگئی تھی۔ ماں کی موت اس کے اپنے اختیار سے باہر تھی۔ مگر نتیجہ اسے بھگتنا پڑا کیونکہ اسے زمانے کی اونچ نیچ سمجھانے والا کوئی نہ رہا۔ فطرت منہ زور جوانی بن کر اس پر چھائی ہوئی تھی ــــ حادثہ یہ ہوا کہ وہ کسی سے پیار کرنے لگ گئی۔ مگر پیار کے باوجود وہ گھر کی روایات اور معاشرتی اقدار کی وجہ سے شادی نہ کر سکتی تھی ــــ اور پیار بھی ایسا، کہ اس نے اس کا نام چھپانے کے لئے ہر اذیت برداشت کی۔ اور اپنے خاوند کے خلاف شہادت دی ــــ ہمارا، بلکہ ساری دنیا کا ادب ایسے پیار کو آسمان پر چڑھاتا ہے۔ شاعر اس کے قصیدے گاتے ہیں اور ناولوں اور فلموں کے قاری ایسی ہیروئن کے لئے اپنے دل میں گہری ہمدردی رکھتے ہیں۔ جو کسی سے ٹوٹ کر پیار کرتی ہے، مگر رسم و رواج کی وجہ سے شادی نہ کر سکتی ہو۔ ہم سب کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہوتی ہیں لیکن جو چیز دلوں میں جائز سمجھی جاتی ہے، اسے کھل کر جائز کیوں نہیں کہا جاتا!

تو کیا لڑکی واقعی قصور وار تھی؟ ــــ جج کا جواب نفی میں تھا۔

تو پھر کیا ملزم کا باپ قصور وار تھا؟ جس نے جانتے بوجھتے ہوئے بیٹے کو آگ میں جھونکا۔ اس کا سودا ایسے کیا جیسے کسی بھیڑ بکری کا کرتے ہیں.... اس کے احساسات، جذبات، امنگوں اور اخلاقی ضابطے کا کوئی خیال نہ کیا۔ وہ یقیناً اس ڈرامے میں سب سے گھناؤنا کردار ہے ــــ مگر جب اسے دوسری طرف سے دیکھتا تو یہ بات غلط نظر آتی۔ وہ اسی جذبے کے تحت کام کر رہا تھا۔ جس پر ہمیشہ تحسین ہوتی ہے۔ احسان مندی کا جذبہ ــ وہ اپنے بڑے بھائی کا باپ کی طرح احسان مند تھا۔ وہ اسے مصیبت میں دیکھ کر یہ نہ بھول سکا کہ اس نے اس کے لئے

کتنی مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ خود فاقے کرکے اسے پڑھایا ہے، اور اپنے سے بہتر عہدے تک پہنچایا ہے ——— وہ کیسے اتنا احسان فراموش بن سکتا تھا ——— اس کا جذبہ یقیناً قابلِ داد تھا۔

تو کیا چچا قصوروار تھا؟ جس نے اپنی لڑکی کا عیب چھپانے کے لئے اپنے بھتیجے کو قربانی پر چڑھا دیا، جو خود غرضی کا مرتکب تھا، اور اپنے فائدے کی خاطر دوسرے کا نقصان بھول گیا ——— لیکن وہ بھی کیا کرتا! وہ باپ تھا۔ یہ اس کی اپنی ذات کا معاملہ نہ تھا، ایک لڑکی کی زندگی کا سوال تھا، جسے اس وقت دھتکارنا لازمی تباہی کا باعث بنتا۔ ابھی وہ ایک دفعہ بھٹکی تھی۔ پھر مستقل بہک جاتی۔ کون شخص یہ پسند کرے گا کہ اپنے ہاتھوں اپنی لڑکی کو رنڈی کے کوٹھے پر بٹھا دے۔

تو پھر کوئی بھی قصوروار نہ تھا! ——— سب اپنی اپنی جگہ قابلِ ترس تھے ——— حالات کے تراشیدہ ——— مجبور اور بے بس ——— اس طوفان کے زبردست ریلے میں ڈبکیاں کھانے والے تنکے جس کے پانی نہ معلوم کہاں کہاں سے آ کر اکٹھے ہوئے تھے، کوئی بوند آسمان سے گری ——— کوئی نالی گلی میں چھلکی، کوئی برف چوٹی پر پگھلی، اور کوئی سوتا زمین سے پھوٹا ——— یہ سب مل کر حالات کا ریلہ بنے، جس میں بچہ بہہ گیا ———

مگر اس میں بچے کا کیا قصور تھا؟ ——— وہ بالکل ایسا ہی بچہ تھا، جیسا کسی سہاگن کا! ——— چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں، دبی دبی گلکاریاں، معصوم مسکراہٹ ——— وہ جینے کا حق لے کر آیا تھا۔ اسے ان اقدار کا علم نہ تھا، جن کی وجہ سے اس کی ہستی قابلِ قبول نہ تھی ——— اگر وہ حرامی تھا، تو یہ بھی قصور دوسروں کا تھا۔ اس کا اپنا کوئی دخل نہ تھا ——— وہ کیوں مارا جائے!

سوچ سوچ کر جج کا سر گھوم جاتا، اور وہ کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکتا۔ اگر وہ ملزم کو بری کرتا ہے، تو یہ منصبی بددیانتی ہے کہ ایک ثابت شدہ قاتل کو چھوڑتا ہے ——— اگر اسے سزا دیتا ہے تو اس کا اپنا ضمیر مطمئن نہیں ہوتا، کہ وہ ایک بے بس اور مجبور نوجوان لڑکے کو اس لئے سزا دیتا ہے کہ اس نے سوسائٹی کے مقررکردہ غیرت کے معیار کو اپنایا تھا ——— جو سوسائٹی اصول شکنی پر سزا دینے کا حق رکھتی ہے، اسے اصول پرستی پر تحسین بھی تو کہنی چاہیئے ———!

وقت گزرتا گیا ——— اور جج سوچتا رہا ———

فیصلے کا دن آن پہنچا۔

جب وہ عدالت میں آن کر بیٹھا، تو مکمل سکوت تھا ——— فقط ملزم کے دل کی دھڑکن تیز تھی۔

جج کافی دیر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر بولا ـــــ

"حضرات! میں یہ مقدمہ دوسرے جج کو منتقل کرتا ہوں، اس کا فیصلہ وہ سنائے گا"

اور خود قلم لے کر لکھنے لگا ـــــ

"یہ مقدمہ زندگی کی صحیح تصویر ہے ـــــ وہ سارے عناصر جو زندگی میں پائے جاتے ہیں، یہاں مشتے از خروارے کے طور پر موجود ہیں۔ اقتدار کی آمریت، انسانی فطرت کی طغیانیاں، افراد کی طبیعت کی تیور، حالات کی بوالعجبیاں، اسباب اور نتائج کے گورکھ دھندے، افراد کے باہمی ٹکراؤ سے نکلنے والی چنگاریاں، خود غرضی اور خود فراموشی، یاس اور امید، سکون اور ہیجان، محبت اور نفرت ـــــ یہ زندگی ہے۔ اس کی تہہ در تہہ سرنگوں میں کہیں بگولے ہیں تو کہیں نسیم سحر، کہیں مدھر موسیقی ہے تو کہیں گڑگڑاتے زلزلے، کہیں چمک ہے تو کہیں ظلمت۔ زندگی کی چال بے ڈھنگی، اس کے انداز نرالے، اس کی گرفت مضبوط اور اس کا وار بھرپور ہوتا ہے۔ اس کے پہلو، فتنے آتش بازی کے اناروں کی طرح ہر دم نئے رنگ اور نئے انداز میں پھوٹتے ہیں۔

"یہ زندگی خدا کا مذاق ہے ـــــ انسان کے ہاتھوں انسان کی گت بنتے دیکھ کر یزداں ہنستا ہے اور اس میں اور گورکھ دھندہ ڈالتا ہے۔ ایسی زندگی کے بارے میں انصاف ناممکن ہے ـــــ انصاف محض ایک واہمہ اور تصور ہے، جو اس زندگی میں کہیں بھی ممکن نہیں۔

"میں یقیناً قانون کے مطابق فیصلہ دے سکتا ہوں، مگر دنیا کا کوئی قانون ایسا نہیں جو اس الجھی ہوئی پیچیدہ زندگی کے سب پہلوؤں پر حاوی ہو، اور صحیح انصاف کر سکے ـــــ اس لئے میں اپنے آپ کو مزید دھوکا نہیں دینا چاہتا کہ میں انصاف کر سکتا ہوں۔"

"یہ فائل کسی اور جج کے سپرد کی جائے۔ کیونکہ میں اپنے عہدے سے استعفیٰ دے رہا ہوں جو علیحدہ ارسال کیا جائے گا۔ میں اپنی زندگی ان لوگوں کی وکالت کے لئے وقف کرنا چاہتا ہوں، جو قانون کی نظر میں مجرم ہوں۔ مگر دراصل زندگی کے ہاتھوں مظلوم ہوں ـــــ میرا جہاد، قانون اور زندگی، دونوں کے خلاف ہے۔"

خلاء

مسیز نادر ریاض

افتخار الدین بستر مرگ پر تھا در اصل پچھلے کئی ماہ سے وہ اسی حالت میں تھا۔ موت کے سائے لحظہ بہ لحظہ گہرے ہوتے چلے جا رہے تھے، موت اس گھرانے کا مقدر بن گئی تھی، ایک جوان بہن، دو چھوٹے بھائی اور اب افتخار۔ جو اس عظیم گھرانے کا آخری چراغ تھا، ٹمٹماتا ہوا بس بجھنے کے لئے ہوا کے کسی بھی نا محسوس جھونکے کا منتظر!

موت کا یہ انتہائی کرب ناک لمحہ اس کی بیوی شہوار کے لئے انتہائی مسرت کا لمحہ بننے والا تھا، یہ گھڑی جو پل بھر کے بام گرا ابدی خوشبو کی ضامن ہو سکتی تھی، عارضی فراق اور ازلی وصال کی گھڑی۔ پچھلے گیارہ برس سے وہ اس گھڑی کی منتظر تھی، وہ اور حمید! حمید جو اس کا رشتے کا بھائی کم، آئیڈیل زیادہ تھا، حمید ایک قد آور، وجیہہ اور مخلص انسان تھا کم گو سہی، مگر زندہ دل۔ بچپن میں وہ دونوں ایک ساتھ کھیلے تھے۔ جوانی کی عمر کو پہنچنے سے بہت پہلے وہ جان گئے تھے کہ وہ مستقبل میں میاں بیوی بننے والے ہیں، یہ خیال دونوں کے لئے کس قدر لذت آگیں، تشفی کن، کتنا زندگی بخش تھا۔

آج تک کسی نے مکمل خواب نہیں دیکھا۔ شہوار اور حمید کی زندگی کی یہ حقیقت پہلے تو خواب بنی اور پھر بکھر گئی، شہوار کے باپ نے ایک دن نادر شاہی حکم صادر کیا کہ شہوار کی شادی افتخار سے ہوگی، یہ خبر جتنی افسوسناک تھی اتنی ہی حیران کن بھی تھی۔ یہ افتخار کون تھا؟ تمام گھر والوں کے ہونٹوں پر یہی سوال تھا۔

افتخار میرے نئے بزنس پارٹنر کا لڑکا ہے نہایت نیک اور پکا نمازی، شہوار کے ابا نے وضاحت کی۔ اس کا اپنا لاکھوں کا کاروبار ہے اور انہوں نے ذرا رک کر کہا، حمید والوں سے کوئی پکی بات بھی تو نہ ہوئی تھی۔ اور پھر حمید کے بارے میں جاننے والوں نے اچھی خبریں بھی تو نہیں دیں، مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ شراب بھی پینے لگا ہے اس نے دلیلوں سے ثابت کرنا چاہا، گھر کے لوگ حمید کو اچھی طرح جانتے تھے سب کے چہرے متغیر ہو گئے اس لئے کہ حمید شہوار کی سگی خالہ کا لڑکا بھی تو تھا۔ مگر شہوار کے ابا کے سامنے بات کرنے کی مجال کسے تھی؟ سب خاموش ہو گئے اور شہوار نے باپ کے جبر کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔

افتخار کو دیکھ کر شہوار سخت مایوس ہوئی، وہ ایک ناتواں سا شخص تھا اس کے کندھے جھکے ہوئے تھے، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پیلی رنگت، چھوٹا سا قد، اس کی آواز میں نسائیت تھی اور اس کی شخصیت کے گوشے میں بھرپور زندگی کی بے حد کمی تھی، اس کی چال میں بد اعتمادی تھی اس کی باتوں میں بیزاری اور اس کے چہرے پر گہری اداسی!

اس کے مقابلے میں وہ خود ایک صحت مند اور پر وقار شخصیت کی مالک تھی، دراز قد، بھرا بھرا جسم گورا رنگ جس میں سرخی نمایاں تھی۔ زندگی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی اسے دیکھ کر کسی ابلتے ہوئے چشمے یا بلندی پر سے گرتی ہوئی کسی آبشار کا احساس ہوتا، نیاگرا ایسی آبشار کا!

وہ جب شہوار کو اپنے بازوؤں میں بھینچتا تو شہوار کو محسوس ہوتا جیسے وہ بید مجنوں کی طرح کانپ رہا ہو افتخار کا دل ایسے وقت میں کسی انجانے خوف کسی اندیشے کسی بے اعتمادی کے احساس سے دھڑک رہا ہوتا۔ اسکے ناتواں بازوؤں میں وہ قوت مفقود ہوتی اور شہوار کو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ کسی برف پوش چوٹی پر بیٹھی ہو سردی سے ٹھٹھر رہی ہو ایسے میں اسے حمید کا خیال آتا تو یوں لگتا جیسے یخ بستہ ہواؤں سے بھاگ کر کسی آتشدان کے پاس آ بیٹھی ہو۔

وہ سوچتی "دونوں میں کیا فرق ہے؟ سرد رات اور گرم دن کا فرق، موت اور زندگی کا فرق!

حمید سے شہوار کو عشق تھا شادی کے بعد اس میں اور شدت پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے وجود کے ساتھ ساتھ قلب و جان۔ ذہن و روح۔ تخیل اور سوچ ہر شے وصال یار کے لئے دیوانہ وار تڑپ رہی تھی۔ یہ عشق جو پل دو پل کا جذباتی ابال نہیں بلکہ برسوں کی رفاقت سوچ اور تمناؤں کے بعد جنم لیتا ہے اس میں ایک والہانہ پن وارفتگی شوق اور جذبۂ قیس مشتعل تھا۔ حمید اسکی منزل تھا اس کا سکون و قرار تھا۔

اور افتخار محض غبار راہ جو تہہ در تہہ اسکی ڈھلی ہوئی جوانی پہ جمتی چلی جا رہی تھی۔ شادی کے پہلے ہی روز شہوار نے اسے ناپسند کیا تھا اور رفتہ رفتہ یہ ناپسندیگی نفرت میں بدلتی چلی گئی تھی۔ اسکے نزدیک شوہر کا تصور ایک مرد کا تھا محض کسی ہستی کا نہیں۔ افتخار تھا مگر مرد نہیں تھا۔ وہ زندگی کی نفی تھا! اس کے ساتھ بھرپور زندگی گزارنا ممکن نہ تھا۔ یا اسکی زندگی کا ایک بہت بڑا حادثہ تھا۔ وہ بھڑک اٹھی تھی مگر پھر اس نے اپنے جذبات پہ قابو پا لیا تھا۔ حمید نے اسے سمجھا دیا تھا۔ "افتخار ایک بیمار مزاج انسان ہے چند دنوں کا مہمان۔ وہ آخر کتنی دیر اور زندہ رہے گا۔ ہمیں آخر طبعی موت کا انتظار کرنا چاہیئے۔"

اور وہ دونوں گردش لیل و نہار کے منتظر رہے اور اس اذیت ناک انتظار میں زندگی کے قیمتی دو سال گزرتے چلے گئے۔ پورے دس سال جوانی ڈھلنے لگی۔ اپنے محبوب کے سر پر سفید بالوں کی لٹ کو دیکھ کر شہوار بڑی مایوسی سے کہنے لگی۔

"آخر ہم کب تک اپنی خوشیوں کو ملتوی کرتے رہیں گے؟"

اور افتخار نے بڑے تشویشناک لہجے میں کہا۔" بڑا سخت جان نکلا ۔"
اور انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ مضبوطی سے تھامتے ہوئے کہا
"جلو زندہ رہیں، سب کچھ بھول کر، سب کچھ بھلا کر "

شہوار نے اپنا نہایت قیمتی سوٹ نکالا۔ سنگھار کیا۔ خوشبوؤں میں بسی اور یوں گھر سے نکلی جیسے کوئی قیدی عمر قید پوری کر کے زنداں سے نکلتا ہے۔ پھر یہاں کا ہر روز کا وطیرہ ہو گیا۔ افتخار کے والد بزنس کے سلسلہ میں عام طور پر ملک سے باہر رہتے۔ گھر میں نوکر چاکر تھے۔ انہی کے سہارے افتخار کو چھوڑ کر وہ دونوں پکنک منانے فلمیں دیکھنے اور راتوں کو دیر سے گھر لوٹتے۔ شہوار کے پاس دولت کی کمی نہ تھی اور وہ یہ دولت رات دن حمید پر نچھاور کرتی رہتی ۔

ایک دن اسے اپنے ڈیڈی کا خط ملا جو انہوں نے پہلی مرتبہ اپنی بیٹی کو لکھا تھا۔ شاید افتخار نے اسکی شکایت کی تھی۔ خط کو پڑھنے کے بعد اس نے اسے پرزے پرزے کرتے ہوئے کہا۔" ڈیڈی تم نے اپنی مرضی پوری کر لی۔ میں بھی تمہاری بیٹی ہوں ۔ اب میری باری ہے۔ میں اب اپنی مرضی پوری کروں گی۔" وہ کہتے ہوئے وہ والہانہ ہنسنے لگی اور پھر اسکی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں اور وہ بے تحاشا رونے لگی مگر تھوڑی دیر بعد پھر سے قہقہے لگانے لگی۔ حمید نے تشویشناک نگاہوں سے اسے دیکھا اور سوچنے لگا۔ اسے کیا ہو گیا ہے"؟

وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکا گو وہ دیر تک مترحم نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا اور وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ اسکے خیال میں اس دیوانگی کا صرف ایک ہی علاج تھا وہ یہ کہ افتخار اسکی زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکل جائے۔ افتخار جس نے آرزوؤں، امنگوں اور خوشیوں اور امیدوں کو سخت مجروح کیا تھا۔ اسکی موت اب کسقدر ضروری ہو گئی تھی مگر وہ تو جیسے اٹک ہی گیا تھا حالانکہ ڈاکٹر نے چند ماہ پہلے صاف صاف بتا دیا تھا کہ اس کا مرض اب جس مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔ وہاں اب دواؤں سے زیادہ دعاؤں کی ضرورت ہے۔ افتخار کو کینسر تھا ۔

اور اب وہ وقت بہت قریب تھا بہت ہی قریب۔ اذیت کا طویل زمانہ ختم ہونے کو تھا۔ مسلسل گیارہ برس تک وہ غم و غصہ نفرت اور انتقام کی آگ میں جلتی رہی تھی۔ مسلسل گیارہ برس سے وہ تڑپتی رہی تھی اکیلی! کوئی پرسان حال نہ تھا۔ دو بڑی بہنیں تھیں۔ جو انگلستان میں اپنے شوہروں کے پاس مقیم۔ ایک چھوٹا بھائی تھا جو بچپن ہی میں اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ ماں کو اپنا دکھڑا سنا کر اور غمزدہ بنانا نہ چاہتی تھی۔ باپ کو کیا سناتی کہ وہ تو خود اس المیے کا مصنف تھا۔ ایک صرف حمید تھا جو اسے تسلیاں دیتا۔ دلاسے دیتا۔ آنے والے پرمسرت دنوں کے سپنے دکھاتا گو وہ بھی بزدل تھا کہ وہ افتخار کو زہر دے کر مار دینے کے لئے کسی صورت آمادہ نہ ہوتا۔ کبھی تو وہ اس سے بھی سخت بیزار ہو جاتی اور مایوسی کے عالم میں اس کا ہاتھ تھام کر کہتی ۔

"وہ شاید کبھی نہیں آئے گا۔"

وہ حسب معمول اسے دلاسہ دیتا تو وہ اپنا سر اس کے چوڑے چکلے سینے پر رکھ دیتی تو اسے ایک عجیب سی پُراسرار سی آسودگی کا احساس ہوتا۔ آخر وہ ایک مرد کا سینہ تھا۔ اور وہ سوچتی کاش یوں ہی رہتا۔

اسکی آرزوؤں کی تکمیل میں اب صرف چند لمحوں کا فاصلہ تھا مگر جیسے یہ لمحے صدیوں میں ڈھلتے جا رہے تھے۔ افتخار کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ گو وہ ابھی تک زندہ تھا ہمیشہ کی طرح زندگی سے خالی مگر زندہ۔ اس شک کا اسکی آنکھوں میں لعلت ابھی تک تھی اس لئے کہ اس کا دل ابھی تک حرکت کر رہا تھا۔ اس لئے کہ اسکی زبان میں بات کرنے کی سکت ابھی تک تھی۔ یہ سوچتے ہوئے شہلا کو محسوس ہوا کہ جیسے وہ خود جانکنی کی حالت سے گزر رہی ہو۔ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کا حلق کسی ریگستان کی طرح خشک ہو گیا۔

"مجھے اس کمرے سے باہر لے چلو۔" اس نے چپکے سے حمید سے کہا۔

مریض کے کمرے سے دونوں ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ اس نے سکون کا لمبا سانس لیا جیسے کسی رسوائی اور ذلت سے بچ نکلی ہو۔ اسے آج افتخار سے خوف آ رہا تھا۔ اس کا دل اندیشوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ مستقبل کے اندیشے۔ افتخار اسے اپنی چھوٹی چھوٹی نیم وا آنکھوں سے بڑی دیر تک دیکھتا رہا تھا اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ نگاہیں شعلے بن کر اس کے وجود میں اتر رہی ہوں اسے اپنا جسم جلتا ہوا بھی محسوس ہوا تھا۔

وہ اسکی نگاہوں کی تاب نہ لا سکی۔ پھر جیسے کوئی آواز اس کے اندر سے آئی۔

"افتخار الدین مر دہ ہے" میرے لئے وہ زندہ ہی کب تھا؟ اس نے سوچا اور ڈرائنگ روم کے صوفے پر نیم جان سی گر پڑی۔ حمید اسے تسلی دینے لگا، سمجھانے لگا۔ تمہیں اس کمرے سے نہیں آنا چاہیئے تھا۔ خواہ دکھاوے ہی کے لئے ہوتا۔ مگر نہیں وہیں رہنا چاہیئے تھا۔

اُس نے اسکی بات شاید سنی ہی نہیں۔ وہ انعلطیت ہی۔ شاید اسکی پلکوں کے کنارے آنسوؤں سے بھیگ رہے تھے پھر جیسے وہ اپنے آپ سے کہنے لگی۔ گیارہ برس سے وہ ایک مردہ سے بے کھڑی تھی بے حس و حرکت ایک پل کے لئے بھی وہ حمید سے اپنی توجہ نہ ہٹا سکی تھی۔ حمید جو زندگی کا مظہر تھا اور وہ زندگی کی طلبگار۔ اس کا گھر ایک سرد خانہ تھا جس میں اسکی آرزوئیں نموت چلی جا رہی تھیں۔ گیارہ برسوں سے اسکی زندگی پر موت کے سائے منڈلا رہے ہیں۔ اسے حرارت کی ضرورت تھی حرارت جو زندگی دیتی ہے۔

سامنے دیوار پر لٹکے ہوئے کلاک نے گیارہ بجائے تو وہ چونک اٹھی۔ یہ کلاک افتخار کو بے حد پسند تھا۔ ڈائیل لودینٹ ولم

کے درمیان ایک خوبصورت سے گھونسلے سے ایک کوئل سر باہر نکالتی اور اپنے مترنم سے اور مدھر آواز میں کوکتی۔

افتخار یہ آواز سنکر کہا کرتا کتنی دلسوز ہے یہ آواز دلسوز مگر زندگی بخش! گیارہ بج رہے تھے۔ شہوار نے اندازہ لگایا۔ افتخار کو موت سے جنگ لڑتے تین گھنٹے ہو گئے تھے۔

گھڑیاں کی سوئیاں گردش کر رہی تھیں۔ دوسرے کمرے سے افتخار کے دل کی دھڑکن اسی طرح سنائی دے رہی تھی صاف واضح جیسے دور سے نقارے کی آواز آ رہی ہو۔ شہوار کے دل میں ایک عجیب سا خوف سرایت کر گیا اسے یوں لگا جیسا اس منحوس کلاک کی بے رحم سوئیاں خنجر بن کر فضا میں لہرا رہی ہوں اور جیسا ہی یہ تیز دھار خنجر اسکے سینے اور پیٹ میں پیوست ہو جائیں گے خوفزدہ سی وہ کلاک کی طرف لرزتی انگلیوں سے اشارہ کرکے بڑبڑانے لگی۔

"حمید" اس کلاک کو زمین پر پٹخ دو۔ ریزہ ریزہ کر دو اسے۔ افتخار الدین کی روح اسمیں بند ہے! افتخار الدین جو ایک لیلوی جن ہے اسوقت تک نہیں مرے گا جب تک اس کلاک کے اندر سوئیاں متحرک ہیں۔ جب تک کوئل کی کوک زندہ ہے جب تک اس گھونسلے کا ایک تنکا بھی باقی ہے اسوقت تک افتخار نہیں مر سکتا۔ نہیں مر سکتا۔

وہ صوفے پر ابھی تک اسی حالت میں پڑی تھی۔ اسوقت وہ گہرے نیلے رنگ کے لباس میں ملبوس تھی۔ اسکے لبوں پر اسکی پسندیدہ نارنجی رنگ کی لپ اسٹک تھی۔ آنسوؤں سے کاجل اسکی آنکھوں میں سیاہ بادلوں کیطرح پھیل گیا تھا۔ وہ اب جوان نہ رہی تھی مگر اس سے پہلے وہ کبھی اتنی خوبصورت نہیں لگی تھی حمید نے بے اختیار ہو کر اسکی پیشانی کو بوسہ دیا تو وہ کراہنے لگی ہلکے ہلکے حمید کو اسکے چہرے پر کسی گہرے رنگ کی پرچھائیں نظر آئیں۔ غم جو کسی محرومی، کسی بڑے خلاء سے جنم لیتا ہے۔

شہوار نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ بڑی مضبوطی سے اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے ساری کائنات میں صرف ایک حقیقت ہے حمید صرف ایک وجود ہے۔ حمید اسکے علاوہ ہر شے فسانہ۔ جھوٹ۔ فریب۔ ڈیڈی سے لیکر افتخار تک ہر ہستی عدم کی پہنائیوں میں گم ہے۔ ہر چیز جادۂ فنا پر رواں دواں ہے۔

پھر ایک اور طوفان اٹھا اچانک جس نے اسے سر سے لیکر پاؤں تک ہلا کے رکھ دیا۔ جیسے بھونچال آگیا ہو اس نے اس بھونچال کے جھٹکے اپنے اندر محسوس کئے۔ ایک دو تین۔ اس کا ہر موئے بدن ہمہ تن گوش ہو گیا۔ چار پانچ یہ محض ایک احساس ہی نہ تھا وہم بھی نہ تھا ایک ازلی حقیقت تھی۔ جیسے زمین۔ پہاڑ۔ سمندر۔ مشرق۔ مغرب اور اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اسکے اندر سورج طلوع ہو رہا ہو اور وہ اس سورج کی تپش۔ تمازت۔ حرارت سے پسینے میں نہا گئی۔

شہوار کی پیشانی پر پسینے کی لکیریں دیکھ کر حمید گھبرا گیا۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے پوچھا۔

کیا بات ہے شہوار، تم ٹھیک تو ہو نا!

شہوار نے لاپرواہی اور بے نیازی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کسی حقیر چیز کو دیکھتے ہیں اور کچھ کہے بغیر اٹھ کھڑی ہوئی۔ کمرہ چھوڑنے سے پہلے وہ رک گئی۔ اس کے چہرے پر گہری سوچ کے نشان تھے۔ اس نے پیچھے مڑ کے اپنے ماضی کی طرف دیکھا اور اسی راہ پر کھوئی کھوئی سی چلنے لگی۔ اپنے چاروں طرف دیکھتے ہوئے وہ اس لمحے کو ڈھونڈنے لگی جو اچانک ایک حادثہ بن گیا تھا مگر جس کی اسے آج تک خبر نہ ہوئی تھی۔ وہ قیمتی اور تاریخی لمحہ جو اسکے ماضی کے ویرانے میں ایک نیم روشن چراغ کی طرح ٹمٹما رہا تھا۔ نفرت اور بے خبری کی لہر میں لپٹا ہوا۔ اس رات افتخار کے ماں باپ کسی دوسرے شہر گئے ہوئے تھے اور گھر کے نوکر چاکر بھی اپنا اپنا کام ختم کر کے جا چکے تھے۔ گھر میں وہ دونوں تھے۔ افتخار غصے میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس کا یہ روپ اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ اسے حمید سے ملنے پر سختی سے منع کر رہا تھا۔ وہ تمہارا خالہ زاد بھائی نہیں تمہارا عاشق ہے۔ تمہارا مجنوں ہے۔ میں سب کچھ جانتا ہوں۔

اسکی نسوانی آواز کی جگہ گرجدار آواز نے لے لی تھی۔ جو طویل و عریض کوٹھی میں گونج رہی تھی۔ وہ اسوقت غصے اور حسد کی آگ میں جل رہا تھا۔ اسکا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ کمرے میں بڑی تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے برسوں کا منجمد خون اسکی رگوں میں کھولنے لگا ہو۔ شہوار نے کچھ کہنے کے لئے زبان کھولنا چاہی تو اس نے بڑے زور سے اسکے گالوں پہ تھپڑ رسید کیا۔ دوسرا اور پھر تیسرا ہر بار ضرب کی قوت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بھونچکا سی رہ گئی اور ایک پل کے لئے فیصلہ نہ کر سکی کہ وہ افتخار ہے یا کوئی جن۔ اسکے گال سرخ ہو گئے اور وہ درد سے بلبلا اٹھی۔ ایک بار اس کا جی چاہا کہ اسکے بال نوچ ڈالے اسکے ضعیف جسم کو مروڑ دے مگر وہ تو شاید آج آسمان کی بلندیوں اور افق کی وسعتوں تک پھیل گیا تھا۔ اپنے میں مقابلے کی ہمت نہ پا کر وہ خوفزدہ سی ہو کر اسکے سینے سے چمٹ گئی تھی۔ افتخار کا سینہ تو آج جیسے کشادہ چوڑا اور مضبوط ہو گیا تھا جو اسکے بازوؤں کی گرفت میں نہ آ رہا تھا۔ وہ پھیل گیا تھا یا پھر وہ سکڑ گئی تھی۔ اس کا ذہن کچھ بھی سوچنے سے قاصر تھا۔ اسوقت وہ صرف یہ محسوس کر رہی تھی کہ خود سپردگی کا یہ لمحہ عافیت اور قرار کا لمحہ ہے۔ پر اسرار۔ پر کیف اور پر سکون۔

اس واقعہ کے بعد افتخار اپنی بیماری کی آخری منزل میں داخل ہو گیا۔ وہ جانتا تھا اب وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس نے ہر چیز سے منہ موڑ لیا۔ اس نے بات چیت بہت کم کر دی۔ شہوار نے اسکے قریب ہونا چاہا مگر اسے اپنے قریب پا کر افتخار کے چہرے پر کوئی تاثر پیدا نہ ہوا خوشی اور نہ غم کا۔ محبت اور نہ نفرت کا۔ اس میاں نے ایک مرتبہ اپنی زبان کھولی صرف اتنا کہنے کے لئے کہ اسکے مرنے کے بعد اس گھر میں ہمیشہ کے لئے گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جائے گا مگر وہ اس کا کیا جواب دے سکتی تھی۔

ان دنوں حمید بھی آ گیا۔ شہوار خلاف معمول کچھ خاموش تھی۔ خاموش اور غمزدہ۔ حمید سمجھتا تھا موت کے سائے منڈلا رہے تھے لہذا اسکا غمزدہ ہونا فطری تھا۔ وہ مطمئن تھا اسلئے کہ اسے یقین تھا کہ یہ غم بھی عارضی ہے اور یہ خوشی بھی۔ دائمی چیز وہ خوشی ہے جو افتخار کی

مرت کے بعد جنم لے گی، مگر وہ بڑے واضح طور سے شہوار کے رویے میں نمایاں فرق محسوس کر رہا ہے۔ جیسے ایک مہمان سمجھ کر وضعداری سی نبھا رہی ہو، اس نے اس کے جذبات میں اشتعال پیدا کرنے کے لئے مزید ایندھن مہیا کرنا چاہا مگر وقت اور احساس کا ایک ریلا آیا، جو سب کچھ اپنے ساتھ بہا کے لے گیا، حمید کو بھی! حمید اس کے سامنے ایک تنکے کی طرح اس سیلاب کی موجوں میں بہتا چلا جا رہا تھا۔

اس کے جسم میں پھر حرکت ہونے لگی، واضح اور بھرپور، وہ تیزی سے افتخار کے کمرے کی طرف دوڑی تاکہ اسے وہ جاں فزا نوید دے سکے جسے سننے کے لئے شاید وہ پچھلے تین مہینوں سے نبرد آزما تھا، وہ اسے بتا سکے کہ اس کے گھر میں گھٹا ٹوپ اندھیرا نہیں ہوگا۔

دہلیز پہ قدم رکھا ہی تھا کہ کمرے سے رونے کی آوازیں آنے لگیں اور پھر طوفان امڈ پڑا، ان میں سب سے بلند چیخیں شہوار کی تھیں۔

دو دن سے اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھمے تھے۔ حمید نے موقع پا کر اسے دلاسہ دینا چاہا۔

"صبر کرو شہوار۔ جدائی اور دکھ کی لمبی رات اب بیت چکی ہے۔"

شہوار کی آنکھوں میں اشک ایک دم تھم گئے، وہ اوندھے منہ لیٹی تھی، یہ آواز سن کر وہ تن کر بیٹھ گئی اور اس کی طرف خونخوار نگاہوں سے دیکھ کر کہنے لگی۔

مسز افتخار کہو، حمید!

وہ سمجھا شاید وہ مذاق کر رہی ہو، "اچھا تو مسز افتخار..."

مگر وہ اپنی بات مکمل نہ کر سکا، شہوار کے چہرے پہ چٹان کی سی سختی تھی، معنی خیز اور پُر جلال سختی! اسے محسوس ہوا جیسے شہوار کی بات میں قطعیت ہو، یقین ہو، وہ سوچ میں ڈوب گیا، اس کے چہرے پہ فکر کی دھول جم گئی، پھر وہ مایوس ہو گیا، شہوار کی زندگی کا خلا شاید پُر ہو گیا تھا۔

گلشن کا کاروبار

نسیم درانی

اور پھر جب یوسف نے ایک دن کراچی جانے کا اعلان کر ہی دیا تو جاننے والوں کو یوں لگا گویا اس کے خوابوں کے آتش فشاں نے لاوا اگل دیا ہو۔ کراچی جانے کے خیال نے ایک عرصے سے اس کے دل میں ہلچل مچا رکھی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے کراچی کا تصور اس کے ذہن میں چھایا رہتا۔ بات بے بات کراچی کا ذکر چھیڑ دینا اس کا معمول تھا سو جب اس نے یہ اعلان کیا تو کسی کو بھی حیرت نہیں ہوئی۔ کراچی اس کے خوابوں اور تمناؤں کا آتش فشاں تھا وہ اس شہر کا اس وقت بھی عاشق تھا جب اس نے اس کو دیکھا بھی نہ تھا لیکن گذشتہ سال جب وہ ایک ضروری کام سے کراچی آیا تھا تو اس کا عشق جنون کی حد کو پہنچ گیا۔ یہاں کی رنگینیاں، گہما گہمی، رونق اور دولت کی ریل پیل دیکھ کر اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ دولت کمانے کا اسے حد درجہ جنون تھا لیکن کراچی میں بہتی ہوئی دولت دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ اب تک وہ گاؤں میں جھک ہی مارتا رہا ہے۔ اور جب وہ یہاں سے واپس گیا تو اس ارادے سے کہ واپس یہیں آنا ہے۔ وہ گاؤں تو واپس آیا لیکن ایک اجنبی کی طرح۔ گاؤں کا پرسکون ماحول، کچی پگڈنڈیاں، ہرے بھرے کھیت، گھنے درخت، نہروں میں بہتا ہوا ٹھنڈا شفاف پانی، کنوؤں کی تانیں، گھنے درختوں کے نیچے، کولسیال کھیلتے ہوئے بچے، کبڈی کھیلتے ہوئے نوجوان یہ سب اس کو غیر دلکش، نہایت کم مایہ اور بے قیمت۔ رہ رہ کر کراچی کا خیال اس کے دل پر کچوکے لگاتا۔ گاؤں کی سادہ زندگی کے روزمرہ کے کاموں سے اس کی دلچسپی کم ہو گئی اور وہ اب صرف خواب دیکھتا اور کراچی جا کر تجارت کرنے اور ڈھیر سی دولت کمانے کے منصوبے بنایا کرتا۔

اس کی معقول وجہ بھی تھی کہ وہ کراچی کی دولت کو ایسی کان سمجھتا تھا جہاں ہر شخص کو دولت سمیٹنے کی آزادی تھی۔ اس کے کئی دوست احباب اور واقف کار ایسے تھے جو کراچی گئے تو دیہات سے جانے والوں کی طرح خالی ہاتھ گئے مگر جب واپس آئے تو دونوں ہاتھوں سے سونا اچھالتے ہوئے۔ ایک سے ایک نئی چیز لاتے، ایک سے ایک کپڑا پہنتے۔ پھر چہرے اور رنگ تھالیں تو اس کے شوق کو اور مہمیز لگاتیں۔ گاؤں کے سب سے آوارہ اور لفنگے لڑکے تھے دونوں پھر ایک دن کراچی گئے۔ واپس آئے تو دونوں کار میں آئے تھے اب ان کے کئی ٹرک چل رہے تھے۔ اور گاؤں میں سب سے اونچی اور اچھی کو

کا انعامی بونڈ میں انعام نکلنے کو وہ کراچی جاتے ہی کا کرشمہ سمجھتا تھا پھر فیضو مسکی نے اس انعامی رقم کو کاروبار میں لگا کر دو گنا تگنا اور چوگنا کر لیا تھا اور اسی گاؤں میں جہاں در در کے ٹکڑوں سے پلا تھا اب اس کا طوطی بول رہا تھا۔

یہ وہ تمام باتیں تھیں جن کی بنا پر کراچی کے بارے میں یوسف یوں محسوس کرتا جیسے کراچی کوئی شہر نہیں دولت کا ایسا باغ ہے جہاں روپیہ درختوں سے پھلوں کی مانند پیدا ہوتا ہے ۔۔۔ یا کبھی اسے یوں لگتا جیسے کراچی ایک شہر نہیں الہ دین کے چراغ کا دیو ہے۔

"کیا چاہیے؟"

"دولت"

"اور ۔"

"کوٹھی"

"اور"

"کار"

"اور کچھ"

"بنک بیلنس"

"بس"

"ایک بیوی بھی"

"ہاہاہا ۔ !!! سب حاضر ہو جائے گا۔ سب حاضر ہے"

سو یہ تھا کراچی کے بارے میں یوسف کا تصور۔ کاروباری ذہنیت اس نے ورثے میں پائی تھی اور میٹرک کرنے کے بعد اب وہ بھی بھائیوں کی طرح باپ کے کاروبار میں شریک ہو گیا تھا۔ اگرچہ اس کے باپ کا کاروبار خاصا پھیلا ہوا تھا لیکن یوسف نے کراچی اور اس کی مناسبت سے کاروبار کا جو معیار اپنے ذہن میں قائم کیا تھا اس سے کہیں زیادہ پست تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس کا معیار اسے بار بار کراچی چلنے پر اکساتا تا کہ وہاں جا کر اپنا کاروبار کرے اور دولت کا ڈھیر لگائے لیکن اس کے ارادے میں سب سے بڑی رکاوٹ خود یوسف کا باپ [illegible] تھا جس میں ایک بوڑھا لالہ خود بھی شریک تھا۔

اور پھر یوں ہوا کہ اچانک یوسف کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ باپ کے انتقال کے بعد بھائیوں میں کچھ عرصے تو

اتفاق ہوا۔ بھائیوں کے درمیان جس نے اپنا کاشت رکھ دیا۔ کاروبار اور جائیداد کا بٹوارہ ہوا۔ اور وہ اپنے حصے کا نقد روپیہ لے کر علیحدہ ہو گیا۔

اس دن اس کے چہرے پر بہت عرصے بعد مسرت اور شادمانی کی لہریں رقصاں تھیں اور اسی دن اس کے حوالیوں کا آتش فشاں بھی پھٹ پڑا اور اس نے گاؤں چھوڑنے کا اعلان کر دیا۔

بھائیوں سے تو اس کی پہلے ہی ٹھنی ہوئی تھی لہذا ان کی جانب سے تو کوئی ردعمل نہ ہوا البتہ اس کی ماں بہت مغموم ہوئی پر وہ یوسف کی ضد سے واقف تھی لہذا چپ رہ گئی لیکن اپنا آخری فریضہ پورا کرنا مناسب سمجھا اور برادری کی حسین لڑکی سے یوسف کے باپ نے اپنی زندگی میں نسبت ٹھہرا دی تھی۔ شادی کر دی۔

اور پھر یوسف ایک ہفتہ کی بیاہی بیوی زبیدہ کو ساتھ لے کر کراچی آ گیا۔ چند روز ایک ہوٹل میں گزارنے کے بعد ناظم آباد میں دو کمروں کا ایک مکان کرایہ پر لیا۔ گھر کے کام کاج کے لئے ایک بوڑھی ملازمہ رکھی۔ گاؤں کی کھلی فضاؤں میں پلی بڑھی زبیدہ کو کراچی کا یہ تنگ اور نیم تاریک مکان پسند نہیں آیا لیکن یوسف نے اس مکان کو گوارہ اور قیمت جان کر زبیدہ کو جلد ہی کسی اور مکان میں منتقل ہو جانے کی تسلی دی۔

گھر کا انتظام کرنے کے بعد یوسف نے کاروبار شروع کرنے کی طرف توجہ دی۔ کراچی میں وہ ایسا کاروبار چاہتا تھا جس کے خواب وہ برسوں سے دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ ایسا کاروبار جس میں راتوں رات سونے اور چاندی کے ڈھیر لگ جائیں۔ اس سلسلے میں اس کی ملاقات مختلف لوگوں سے ہوئی مختلف مشورے اسے دیئے گئے مگر کسی تجویز پر اس کا دل نہیں ٹھکا۔ ان کاموں میں جب وہ منافع کی شرح کا حساب کرتا تو یہ شرح اس کے خیال میں اس شرح سے بہت کم ہوتی جس کے اس نے خواب دیکھے تھے۔

بہرحال اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا اس لئے وہ وحید کے مشورے پر خلیج فارس کی ریاستوں کو سبزی پھل وغیرہ بھیجنے کے کاروبار میں اس کا شریک ہو گیا۔ ایک ماہ بعد وحید نے دس ہزار کا نقصان بتایا جس میں سے پانچ ہزار اس کے حصے میں آتے تھے۔ دولت کمانے کے شوق میں پہلے مرحلے میں پانچ ہزار روپے کی یہ چوٹ خاصی بڑی تھی۔ اس نے اس کاروبار سے توبہ کی اور عاقل سے ملاقات کی جو اسے اس سے پہلے پٹرول پمپ لگانے کا مشورہ دے چکا تھا۔ پٹرول پمپ کے لئے زمین خریدی گئی رقم کی ادائیگی ہوئی اور اس کے ساتھ ہی عاقل غائب ہو گیا۔ پتہ چلا جو زمین اس نے خریدی تھی اس پر پہلے ہی دو پارٹیوں میں سودے بازی ہو چکی تھی۔

ایک دن اسے پتہ چلا کہ شیرا اور جبیرے کراچی آئے ہوئے ہیں۔ یوسف نے ان کا پتہ چلایا۔ اور ان سے ملاقات

کی اپنا اعبا یاں کیا، خیرا اور جیب نے اس کی خوب آؤ بھگت کی۔ اور اسے دولت کمانے کا راز بتایا اور اپنا شریک کر لیا ایک ہفتے بعد ان سے ملاقات ہوئی یوسف نے ان سے منافع کی رقم مانگی تو انہوں نے بتایا کہ ان کا ٹرک معہ چرس اور افیون کے پکڑا گیا ہے اس سلسلے میں انہوں نے ایک اخبار بھی دکھایا جس میں ایک ٹرک کے پکڑے جانے کی خبر درج تھی۔

یہ نقصانات اٹھانے کے بعد اس نے اپنی پونجی کا جائزہ لیا تو اسے معلوم ہوا کہ اب اس کے پاس صرف پانچ ہزار روپے باقی ہیں۔ یہ دن یوسف کے لئے انتہائی پریشان کن تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے کیا نہ کرے ایسے ہی تشویشناک ایام میں اس کی ملاقات فضل سے ہو گئی۔ فضل ۴۵ سال کا ادھیڑ عمر کا شخص تھا شکل و صورت سے بڑا ہی بد ہیبت نظر آتا۔ پر گفتگو کچھ اس طرح لچھے دار کرتا کہ انسان سے ایک لمحے کے لئے اس کی شکل و صورت محو ہو جاتی اس کا کراچی میں اپنا کاروبار تھا کما کرتا تھا۔ کہاں تھا یہ شاید کسی کو علم نہ تھا لیکن ہر نئے کاروباری آدمی سے پارٹنر شپ یا کمیشن کا خواہش مند رہتا۔

پھر یوسف اور فضل کے منصوبے زیر غور آنے۔ فضل نے چند ہی روز میں یوسف کو اس طرح شیشے میں اتار لیا کہ یوسف اس کے خلوص پر ایمان لے آیا۔ فضل نے جب یوسف کا زیادہ سے زیادہ اور جلد سے جلد دولت کمانے کا عندیہ پایا تو اس نے ایک بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور فوراً ہی یوسف کے سامنے ایک نیا منصوبہ پیش کر دیا۔ یوسف ایک لمحہ کو سناٹے میں آ گیا مگر فضل کی لچھے دار باتیں پھوار کی طرح اس کے ذہن اور دل کو تر الود کرتی رہیں۔ اور وہ اس سناٹے اور سکتے کی کیفیت سے لوٹ آیا

"مگر بھائی فضل ـــ"

"اگر مگر کچھ نہیں۔ تم جلد سے جلد روپیہ کمانا چاہتے ہو۔ میں نے تمہیں اس کا گر بتایا ہے میں ایک بات بتاؤں میاں یوسف، میرا یہ پروگرام معمولی نوعیت کا نہیں۔ اس میں آدمی راتوں رات امیر بن جاتا ہے صرف ذرا سے گر کی بات ہوتی ہے:

"بھائی فضل یہ تو سوچو کہ یہ کاروبار"

تم تو احمق ہو ... نرے دیہاتی ... فضل جانتا تھا کہ یہ دو لفظ یوسف کے لئے تازیانے سے کم نہیں پھر اس نے فالص کاروباری انداز میں کہا۔ جوا سڑک پر کھیلا جائے یا گھر میں کھیلا جائے تو جرم ہے، کلب میں کھیلا جائے تو فیشن ہے شراب سر عام پی جائے یا غریب آدمی پیئے تو انتہائی رکیک حرکت ہے۔ شراب خانوں میں پی جائے یا امیر آدمی پیئے تو وہ

[illegible]

قلب دیگر ہے یہ ہیں اس دنیا کے اصول جس میں اب تم آتے ہو۔"

فضل کی باتیں یوسف کے جی کو تو لگتی تھیں پھر اس کا منصوبہ اپنی جگہ مکمل تھا اس نے تصور میں دیکھا کہ اس نے نوٹ بنانے کی مشین لگا لی ہے اور اس میں دھڑا دھڑ مختلف قسم کے نوٹ چھپ رہے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی ایک عجیب قسم کا خوف بھی تھا بالکل اس طرح جیسے نوٹ میں واٹر مارک اور چاندی کا تار ہوتا ہے۔

اس روز یوسف تمام رات جاگتا رہا۔ اور سگرٹ پھونک پھونک کر فضل کے نئے منصوبے پر غور کرتا رہا۔ اس منصوبے میں نقصان کا کوئی احتمال نہ تھا اور منافع سامنے کی بات تھی۔ ایسا تھا گویا کاروبار نہیں بلکہ لکشمی دیوی پال لی ہوں۔

زبیدہ سے اس کی بے چینی چھپی نہ رہی۔ زبیدہ نے اس سے بار بار پوچھا مگر اس نے ہر مرتبہ کچھ نہ کچھ بہانہ بنا کر اُسے ٹال دیا۔ آخر بڑی دیر اس کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد اس نے فضل کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کر لیا۔

دوسری صبح یوسف اپنے بستر سے بڑا ہی خوش و خرم اٹھا اور جلدی جلدی تیار ہونے لگا تاکہ فضل کو جا کر اپنے فیصلے سے آگاہ کر سکے اس نے مشینیں لگانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اس کے بعد منصوبے کی دیگر تفصیلات پر غور و خوض شروع ہوا۔ فضل اس کاروبار میں پندرہ فیصد منافع کا حق دار ٹھہرا۔ پھر اس منصوبے پر عمل درآمد شروع ہوا۔ ہاؤسنگ سوسائٹی میں پانچ کمروں کی ایک کوٹھی کرائے پر لی گئی۔ ہر کمرے کے ساتھ باتھ۔ خوبصورت لان گیراج اور سرونٹ کوارٹر۔ اور کرایہ بھی معقول پھر فضل کے مشورے سے کوٹھی کی دیکھ بھال کے لئے پچھتر پچھتر روپے کے دو ملازم اور ساٹھ روپے پر ایک بڑھیا رکھی گئی۔

ابتدائی انتظامات مکمل ہو گئے۔ اب صرف مشینوں کی درآمد باقی تھی۔ سو یوسف نے ایک دن زبیدہ سے ہفتے بھر کی مہلت لی۔ زبیدہ ان عورتوں میں سے تھی جو شوہر کی رضا میں راضی رہتی ہیں پھر یوسف تو کاروبار کے سلسلے میں باہر جا رہا تھا تو وہ کیونکر اس کے پیر کی بیڑی بن سکتی تھی۔

سو یوسف فضل کے ساتھ چلا گیا۔

ایک ایک کر کے دن گزرتے رہے۔

آٹھویں دن یوسف نہیں آیا بلکہ اس کا خط آیا جس میں اس نے کاروباری مصروفیات کا ذکر کیا تھا اور پانچ چھ دن بعد آنے کے لئے لکھا۔

غرض سولہویں دن فضل اور یوسف پھر اس کوٹھی میں نظر آ رہے تھے۔ بڑی چہل پہل اور رونق تھی مال کے

ساتھ تین مشینیں تھیں۔ مگر یوسف وہ کچھ پریشان سا تھا۔ چہرے پر ہوائیاں سی اُڑ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا گویا کوئی چیز اندر ہی اندر اسے مضطرب کر رہی ہے۔ آخر اس سے نہ رہا گیا اور وہ وہاں سے سیدھا اپنے گھر پہنچا۔

زبیدہ اس کی منتظر تھی دونوں بڑی گرمجوشی سے ملے اور رات گئے مختلف قسم کی باتیں کرتے رہے۔ ان باتوں میں نئی کامیابیوں نئی امیدوں اور نئی آسائشوں کی ہلکی ہلکی مسرتیں گھلی ہوئی تھیں۔

کاروبار شروع ہوا فضل کے تجربے نے قدم قدم پر یوسف کی رہنمائی کی فضل کے کہنے کے مطابق اب اس کا کام صرف روپے گننا رہ گیا تھا پھر فضل نے اس کارخانے میں کئی دوسرے لوازمات کا اضافہ کیا ایک کمرہ باس کے طور پر مخصوص کر لیا گیا اس اضافے سے بھی کارخانے کی آمدنی میں خاصا اضافہ ہوا۔ دن گزرتے رہے۔ یوسف نوٹ گنتا رہا۔ ایک ماہ بعد ہی یوسف کو احساس ہوا گویا DEMAND کے مقابلے میں SUPPLY بہت کم ہے اس کا کاروبار عام کاروبار تو تھا نہیں، جو معاشیات کے اس کلیے کا تابع ہوتا کہ DEMAND زیادہ ہوا اور SUPPLY کم تو قیمتیں بڑھ جاتی ہیں اس کے کاروبار کی نوعیت تو یہ تھی کہ SUPPLY جتنی زیادہ ہوگی۔ نفع اتنا ہی زیادہ ہوگا۔

یوسف نے اس مسئلہ پر فضل سے گفتگو کی اور اسے بھی اپنا ہم خیال پایا۔ طے ہوا کہ SUPPLY میں سو فیصد اضافے کے لئے تین مشینیں اور درآمد کی جائیں۔

فضل کو مشینوں کے لئے گئے ہوئے تین ہفتے سے اوپر ہو گئے تھے اور اس نے خط میں لکھا تھا کہ اب تک دونکوں کا سودا پٹ سکا ہے تیسرا دو تین دن میں طے ہو جائے گا رقم پر جھگڑا ہے بہرحال ایک ہفتے کے اندر اندر ضرور پہنچ جاؤں گا

مگر یوسف کی پریشانی کا سبب یہ نہ تھا کہ فضل کی واپسی میں دیر ہو رہی تھی۔ پریشانی کی بات تو یہ تھی کہ تینوں مشینیں سات دن سے ٹھپ ہو گئی تھیں ان میں مختلف نوعیت کی پیچیدہ اور پوشیدہ خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں اس نے بہت کوشش کی کہ یہ خرابیاں جلد از جلد دور ہو جائیں۔ مگر بے سود۔

آمدنی ختم ہو چکی تھی۔ جو رقم تھی وہ فضل لے کر گیا ہوا تھا جو کچھ اس کے پاس تھا اس میں سے سو روپے یومیہ کے حساب سے تو علاقے والوں کو جا رہی تھی پھر اوپر کے اخراجات علیحدہ۔ ان تمام مصیبتوں نے یوسف کے گھر اور کارخانے کا ایک ساتھ راستہ دیکھ لیا تھا۔ ان تمام الجھنوں اور پریشانیوں نے یوسف کو پاگل بنا دیا۔ رات گئے گھر لوٹتا۔ گھر کے کاموں سے اسے اب ذرا دلچسپی نہ تھی۔ زبیدہ نے کئی بار مجبورانہ انداز میں تذکرہ کیا بھی لیکن وہ ہمیشہ ٹال جاتا۔ نیا شہر، نیا کاروبار اور تنہا ہونے کا عذر پیش کر دیا اور زبیدہ چپ ہو گئی تھی۔

اور اب اسے نئی پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔ چار ہزار کی رقم کی بات تھی۔ یہ رقم معمولی رقم نہ تھی سیٹھ ولی بھائی عبدالکریم سے اس نے دو ہزار روپیہ ایڈوانس بھی اسی امید پر لے لیا تھا کہ فضل اپنے وعدے کے مطابق ایک ہفتے کے اندر آ جائے گا۔ اور اس رقم سے اس نے کوٹھی کا کرایہ اور نوکروں کی تنخواہیں ادا کر دی تھیں لیکن فضل نے لکھا تھا کہ اسے کم از کم ایک ہفتہ اور لگے گا اور سیٹھ ولی بھائی عبدالکریم نے آج اسے فون پر بتایا تھا کہ وہ چار پانچ روز بعد فارن جانے والا ہے۔ اس موقع پر اگر فضل ہوتا تو وہ صورت حال شاید سنبھال بھی لیتا لیکن یوسف جو اس میدان میں اناڑی اور ناتجربہ کار تھا۔ اس کے لئے اس نئی صورت حال سے نمٹنا آسان کام نہ تھا

تینوں مشینیں قدرے بہتر ہو گئی تھیں اور کام آہستہ آہستہ معمول پر واپس آ رہا تھا لیکن سیٹھ ولی بھائی والا معاملہ گمبھیر تھا۔ ان کو سیکنڈ ہینڈ مال درکار نہیں تھا۔ نیا ایک دم فرسٹ کلاس مال کی ضرورت تھی وہ کیا کرے کیا نہ کرے چار ہزار روپے کی رقم — اسے یوں لگ رہا تھا اگر یہ رقم اس کے ہاتھ سے نکل گئی تو وہ کبھی اس نقصان کو پورا نہیں کر سکے گا اور آج پھر سیٹھ ولی بھائی کا فون آیا تھا۔

"اجی ابھی تم لفڑے بازی نہیں کرو۔"

"سیٹھ صاحب فارن سے واپسی پر"

"نہیں نہیں بابا۔ چھوڑو۔ ابھی ہمارا ایڈوانس ہمارے کو واپس کر دو۔"

اس نے سیٹھ ولی بھائی سے وعدہ کر لیا اور پھر اسی روز ٹرنک کال پر فضل سے رابطہ قائم کیا۔ تمام صورت حال سے اسے آگاہ کیا اور ہدایت دی کہ وہ دونوں تھانوں کو لے کر فوراً ہوائی جہاز سے کراچی پہنچے۔ تیسرے ٹک کی خریداری کے لئے بعد میں دیکھا جائے گا۔ فضل نے اسے یقین دلایا اور یوسف کو قدرے اطمینان ہو گیا۔

اس رات جب یوسف گھر آیا تو زبیدہ جاگ رہی تھی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ زبیدہ نے اتنی اتنی رات تک خود جاگتے رہنے اور اس کے انتظار کی کوفت اٹھانے کی شکایت کی تو یوسف پھر حسب عادت ہوں ہاں کر کے رہ گیا زبیدہ چڑ سی گئی اور تب اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا یوسف اب میں اس گھر میں نہیں رہوں گی اس محلے کے لوگ اور مکان کی مالکن بہت خراب ہیں۔" پھر اس نے بتایا کہ مکان کی مالکن کا ان سے خوب جھگڑا ہوا ہے

مگر کیوں ہوا ہے تمہارا جھگڑا۔ یوسف نے پوچھا

ہوتا کیا اس کمینی نے الزام لگایا تھا مجھ پر، یوسف تو خود بتا تیرے بنا مجھے یہ گھر کیا کاٹ کھانے کو نہیں دوڑتا ہوگا۔ گلی میں بچے کھیلتے پھرتے ہیں میں کھڑکی سے یا دروازے میں کھڑے ہو کر انہیں دیکھتی ہوں اور یوں

دل بہلاتی ہوں تو کیا بُرا کرتی ہوں اور اس بد ذات سے ماں سے نہ معلوم کیا اُلٹی سیدھی باتیں جوڑ دی ہیں کمبخت مرافہ ــــ یوسف اب میں یہاں نہیں رہوں گی"

یوسف نے ایک دم چونک کر زبیدہ کی طرف دیکھا۔

یہ چہرہ اتنی بار دیکھا ہوا تھا۔ یہ چہرہ اس کی اپنی بیوی زبیدہ کا چہرہ تھا لیکن آج یہ چہرہ اسے بہت عجیب سا لگا پھول کی طرح تر و تازہ خوب صورت حسین اور لازوال حسن کا شاہکار۔

تو یہ زبیدہ ہے اس نے سوچا۔ اس نے آج تک زبیدہ کو ان نظروں سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کے سامنے زبیدہ کا چہرہ تھا۔ وہ اس چہرے کا موازنہ کر رہا تھا سوبیں، ہزاروں میں لاکھوں میں ایک تھا۔ وہ چہرہ اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔

"ارے یوسف کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ تم ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔ میں اب یہاں نہیں رہوں گی۔ بس ٹھیک ہے تمہیں بلاوجہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں"

یوسف اب بھی کچھ نہ بولا۔ وہ زبیدہ کا چہرہ تکتا رہا۔

"اچھا میں ذرا ابھی آتا ہوں"۔

یوسف ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

"مگر اس وقت کہاں جا رہے ہو"

"فضل کو فون کر آؤں کہ ہوائی جہاز سے نہ آئے۔ بلاوجہ اتنے پیسے فالتو خرچ ہوں گے"

"اور میں نے جو کہا اس کا کوئی جواب نہیں دیا تم نے"۔ زبیدہ نے کہا۔

یوسف نے ایک بار پھر زبیدہ کا اُوپر سے نیچے تک بھرپور جائزہ لیا اور پھر پریشان پریشان سی زبیدہ کو بڑے ہی پیار سے سینے سے لگاتے ہوئے بولا۔

"ہاں کل سے اب تم یہاں نہیں رہو گی۔ ہم سو سائٹی چلے جائیں گے"۔

عاقبت

هاجرہ مسرور

"لے بابا دیکھ ایک اور موٹر آرہی ہے۔" رہٹ پہ بیٹھے ہوئے خانو کی چابک بیل کی پسلیوں میں گڑی کی گڑی رہ گئی اور رہٹ کے چکر کے ساتھ اس کی گردن مڑتی ہی چلی گئی۔

سبزی ترکاری کی بڑی بڑی کیاریوں میں پانی کی نالیاں درست کرنے والے بوڑھے نے آنکھیں مچمچا کر سڑک کی طرف دیکھا اور زور سے بولا۔ "ہاں اب بڈھا مر رہا ہے نا۔ پہلے تو برسوں کوئی نہ آتا۔ اب موٹروں پر موٹریں بھر بھر کر آ رہی ہیں، حصے بخرے جو کرنا ہیں — ہاآ — یہ آل اولاد بھی بڑی بے ایمان چیز ہے۔"

کالے رنگ کی بڑی سی کار دھول میں اَٹی ہچکولے کھاتی قریب سے گزری تو خانو اور اس کے بابا نے ماتھے پر ہتھیلی سامنے کر کے اپنے سا ب بے حد اٹیوڈیٹ سلام کیا۔

"سنا ہے شہر میں مالک کے سب بچے ننگے سر پھرتے ہیں اور بیبیاں برقع بھی نہیں اوڑھتیں۔" خانو نے للچا کر موٹر کو دیکھا جس میں پہلے آنے والی موٹروں کی طرح شیشوں پہ رنگین پردے چڑھے ہوئے تھے۔

اس موٹر اس کائی زدہ حویلی کے احاطے میں داخل ہو رہی تھی جس کا طرز تعمیر اس سارے ماحول میں بڑا اجنبی سا لگتا تھا۔

"لو جی آخر کو بڑے لونے بھی پہنچ ہی گئے۔" بوڑھے ریٹائرڈ فوجی رمضان علی نے کھاٹ پر سے اٹھ کر سلیوٹ مارا اور پھر اباؤٹ ٹرن ہو گیا تاکہ موٹر میں آنیوالی جسیاں زنان خانے کی ڈیوڑھی میں داخل ہو جائیں۔ رمضان علی بہ یک وقت اس حویلی والے کی زمینوں کا منتظم بھی تھا اور حویلی کا چوکیدار بھی۔ جب وہ موٹر کے دروازے بند ہونے کی آواز کے ساتھ مڑا تو دیکھا جمیل میاں اپنا ڈاکٹروں والا بیگ اٹھائے سیدھے ڈیوڑھی کی طرف جا رہے ہیں۔

"پہلے ادھر آجاؤ بیٹا۔" مردانہ بیٹھک سے ابا جان کی رعب دار آواز ابھری تو وہ بادل ناخواستہ ادھر ہی مڑ گئے۔ اونچے کٹاؤ دار محرابی برآمدے سے گزر کر وہ لمبے سے سہ درے کمرے میں داخل ہوئے جس کے ہرے رنگ کے دانے دار شیشوں سے مزین دروازے بند تھے اور کمرے میں ٹھنڈا اداس اندھیرا تھا جو دھوپ سے آتے ہوئے جمیل کی

نظروں میں کچھ زیادہ ہی گہرا تھا درمیان میں اونچی نقشین آبنوسی میز تھی ۔ وہ اس سے ٹکراتے ٹکراتے سنبھلے اور پھر اپنا بیگ اسی پر رکھ دیا مگر اس کے ہینڈل پر سے ہاتھ نہ اٹھایا۔

کمرے میں ڈاکٹر جمیل کے ابا کے علاوہ دونوں چچا، پھوپھا اور کئی پھوپی زاد اور چچازاد موجود تھے ۔۔ وہ سب الگ الگ شہروں سے آئے تھے۔ اس لئے ایک دوسرے سے آگے بڑھ کر ملے اور سلام دعا کی۔

"راستہ بہت خراب ہو گیا پچھلی برسات میں۔ ہم تو بہت پریشان ہوئے۔ تمہاری موٹر کے ٹائر تو پنکچر نہیں ہوئے جمیل میاں ۔۔ ؟" پھوپا نے پوچھا۔

"جی۔ نہیں لو کیا حال ہے دادا میاں کا؟" جمیل نے سوال کیا۔

سب کے چہروں پہ مایوسی کا سایہ لہرا گیا۔

"جمیل بیٹا تم پہلے منہ ہاتھ دھو لو اور چائے پی لو" بڑے چچا نے بڑی شفقت سے کہا۔

"جی میں تو پہلے دادا میاں کو دیکھ آؤں ۔۔ اجازت ہے؟" جمیل نے بیگ ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ ڈاکٹر صاحب ابھی تو اُن کے پاس سے اُٹھ کر ادھر آئے ہیں" جمیل کے ابا نے اطمینان دلانا چاہا تو جمیل نے اتنے بہت سے چہروں میں ان ڈاکٹر صاحب کا چہرہ تلاش کرنا شروع کیا اور وہ کونے میں چھپر کھٹ رگاؤ تکیے کے سہارے بیٹھا نظر آگیا ۔۔ مطمئن، پرسکون چائے کے ہر گھونٹ پر اپنی سفید مونچھیں سنوارتا چہرہ۔

"جب دادا میاں کا حال اتنا خراب ہے تو پھر ڈاکٹر کو ہر وقت ان کے پاس ہونا چاہیئے" جمیل نے کہنا شروع کیا مگر بات تیزی سے کٹ گئی۔

"جی جناب ۔۔ آپ نہیں سمجھتے کچھ۔ میں بیس سال سے ان کا علاج کر رہا ہوں۔ وہ اس وقت ۔۔ میرا مطلب ہے کہ وہ اپنی حالت کو خوب سمجھ رہے ہیں۔ اس لئے اپنے پاس ڈاکٹر کی موجودگی پسند نہیں کرتے۔" قصباتی ڈاکٹر صاحب نے ہاتھ اور گردن کے اشاروں کے اضافے کے ساتھ جمیل کو بات سمجھانا چاہی۔

"میں سمجھ گیا ڈاکٹر صاحب!" جمیل اپنا بیگ لے کر کمرے سے نکلنے لگے۔

"ادھو بیٹے تم بات نہیں سمجھے۔ ڈاکٹر صاحب صحیح سمجھتے ہیں۔ ٹھہرو۔" جمیل کے ابا اپنی ہلکی سی جھکی کمر کو تان کر آگے بڑھے اور اپنے فرض شناس بیٹے کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر برآمدے میں نکل آئے۔ "بیٹا اب میں لڑکوں بالوں کے سامنے کیا کہوں تم سے۔" جمیل کے ابا نے کھسر پھسر کی۔ "دیکھو اس وقت اگر تمہارے دادا میاں کے پاس ڈاکٹر صاحب بیٹھے رہیں تو تمہاری دادی پردے کی وجہ سے اُن کے پاس سے ہٹ جائیں گی۔ اور تم جانو جو ایک عمر ایک دوسرے سے جڑ بیٹھ گھنٹے

کو کبھی جدا نہ ہوئے ہوں۔ وہ آخری وقت ہیں یہ کیسے برداشت کریں گے کہ اماں جان ان کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جائیں۔ تم نئے زمانے کے لوگ ان کی محبت کو کیا سمجھو گے ارے آج صبح سے تو ان کی آنکھیں بس تمہاری دادی پر ہی جمی ہیں جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں اور نہ کہہ سکتے ہوں۔ میں ابھی سب کو ان کے کمرے میں جانے سے منع کر آیا ہوں۔" اور یہ سب کہتے کہتے جمیل کے ابا کی آواز بھرا گئی۔

"جی۔ جی میں سمجھ گیا ابا جان۔ میں تو بس ایک منٹ کو انہیں دیکھوں گا شاید کوئی نیا علاج سمجھ میں آجائے ــ میرے سامنے سے تو دادی کو نہیں ہٹنا پڑے گا۔ بس ایک نظر دیکھ آؤں ــ جمیل نے سر جھکا کر درخواست کی۔

"اچھا جاؤ بیٹا ــــ" اور ابا نے جمیل کا کندھا چھوڑ کر بیٹھک کا رخ کیا۔

آنگن میں باورچی خانے کی دیوار کے باہر تنور گرم تھا۔ تازہ خمیری روٹیوں کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ جمیل کی نظر مائی رانی پر گئی جو سر پہ دوپٹے کو پگڑی کی طرح لپیٹے سینکی ہوئی روٹیاں سلاخوں کی مدد سے اکھیڑ کر ٹوکری میں جمع کر رہی تھی۔

"سلام مائی رانی" جمیل نے زور سے کھنکھار کر آواز لگائی تاکہ زنان خانے میں بھری ہوئی چچیوں پھوپھیوں کے علاوہ ان کی بیٹیاں، نواسیاں اور پوتیاں تک خبردار ہو جائیں اور سر ڈھک لیں۔ جمیل کو اس وقت بھی اپنی دادی کی یہ بات یاد تھی کہ حویلی میں آؤ تو یہاں کے طور طریقے برتو ورنہ گھر میں کام کرنے والی عورتیں بھی باہر جا کر باتیں بناتی ہیں۔

مائی رانی کی بختو نے جلدی سے گھونگھٹ نکال لیا اور مائی رانی تو جیسے تنور میں اوندھے اوندھے بچی۔ جمیل نے دیکھا بڑے برآمدے میں سوائے چند بچوں کے کوئی نہ تھا ــــ وہ آگے بڑھے تو پیچھے سے مائی رانی سلاخیں پھینک ان کے پیچھے دوڑی اور آٹے سے بھرے ہاتھ بے اختیار جمیل کے کندھوں پہ پھیرنے لگی "صدقے تیرے تو آ گیا۔ اب مالک کی دوا دارو ٹھیک طرح ہوگی ــــ مالک بڑے کمرے میں ہے ــ" مائی رانی نے بڑی رقت کے ساتھ کہا اور فوراً ہی تنور کی طرف لوٹ گئی کیونکہ اس نے روٹی جلنے کی بو سونگھ لی تھی۔

مائی رانی کے ہاتھ تنور اور آٹے سے الجھ رہے تھے مگر ذہن اپنے مالک کے گرد بھنبیری کی طرح چکرا رہا تھا اسے یاد نہ تھا کہ اس سے پہلے کبھی اتنی بڑی تعداد میں مالک کی آل اولاد حویلی میں اکٹھا ہوئی ہو۔ کوئی پچاس ساٹھ سال ہوتے ہوں گے جب مالک نے اس علاقے میں مربعے خریدے اور یہ حویلی بنوائی۔

تبھی ایک دن اس کے خاوند نے کہا تھا "نیک بخت مالک ہے تو باہر کا لیکن لگتا نیک ہے! اس کے بال بچے آرہے ہیں۔ حویلی میں چل کر روٹی پانی کا بندوبست کر دے ــــ" اور پھر پندرہ سال کی رانی نے موٹی موٹی روٹیاں پکاتے ہوئے گھونگھٹ کی اوٹ سے دیکھا تھا کہ لمبے سفید برقعے اور ایک بیٹے اور بیٹی کے ساتھ مالکن نئی حویلی میں داخل ہوئی

اور جب مالکن نے برقع اتارا تو یوں لگا جیسے آنگن میں چاند اتر آیا ہو۔ عجیب عجیب سی خوشبو فضا میں پھیل گئی تھی۔ اس دن سے لاڈی نے مائی رانی بننے تک اسی باورچی خانے میں کیسے کیسے عجیب ناموں کے کھانے پکانا سیکھے — خدا نے مالک اور مالکن کی اولادیں برکت دی۔ زمین میں برکت دی — پھر ایک ایک کر کے سب حویلی سے چلے گئے مگر مالک اور مالکن کہیں نہ گئے۔ سوائے نذر نیاز کے موقعوں کے برسوں سے شاید ہی کبھی تنور گرم کرنا پڑا ہو۔ مائی رانی کتنے بہت سے دنوں سے دونوں وقت توے پر چار چھ پھلکے پکا لیتی جو مالک اور مالکن کے لئے بہت ہوتے۔ آہستہ آہستہ پھلکوں کی تعداد کم ہوتی گئی اور اب پچھلے جمعے سے وہ چند پھلکے بھی نہ بچے۔ مالک بیمار ہے تو پھلکوں کی کیا ضرورت ہے؟ مالکن کہتی ہیں۔ اللہ جانے مالک کے لئے جو یخنی بنتی ہے۔ اس میں سے مالکن دو گھونٹ پیتی بھی ہیں یا نہیں۔ ان آٹھ دنوں میں مالکن کا رنگ لٹھے کی طرح سفید ہو گیا۔ پھر بھی کیسا رکھ رکھاؤ ہے مالکن کا — گھر میں بچے آتے ہیں اس لئے روز فجر کے وقت ہی بتا دیتی ہیں کہ آج یہ پکا لو۔ مالک کے بیمار پڑنے ہی درخت میں جھولا ڈلوا دیا کہ ننھے بچے بہلے رہیں گے ورنہ اپنی ماؤں کو تنگ کریں گے — جانے انہیں کیسے معلوم ہوا کہ مالک کی اس بیماری پہ ساری آل اولاد اکٹھا ضرور ہو گی۔ اور آج! — آج تو سب سے عجیب بات ہوئی۔ سویرے ہی بولیں: "رانی آج آٹا زیادہ گوندھنا — ہاں۔ اللہ نے مالکن کا دل کیسا پہنچے ہوئے فقیروں جیسا بنایا ہے — ورنہ سبھی نے کہا تھا کہ جمیل میاں نہیں آ سکیں گے۔ انہیں فرصت کہاں اپنے مریضوں سے اور اب وہ آ گئے اتنے دور سے —

مائی رانی نے کراچی شہر کی دوری کا اندازہ کرنے کے لئے نیلے آسمان کی طرف نظریں اٹھائیں تو حویلی کی چمنی پر ایک چیل کو بیٹھے دیکھا: "شوہ — شوہ —" مائی رانی نے گرم سلاخ لہرا کر چیل کو دھمکایا — مگر وہ نہ اڑی۔

"ارے اس منحوس چیل کے دیدے پھوٹ گئے ہیں۔ ابھی ذرا دیر پہلے تو صدقے کا کالا بکرا بوٹی بوٹی ہو کر تمہارے پیٹوں میں چلا گیا اور اب کس فکر میں ہو — شوہ —" مائی رانی بڑبڑا کر چیل کو قائل کرنے لگی۔

"اماں روٹی تنور سے نکال۔ کیا اب کوئلہ بنائے گی؟" بختو نے آٹے کے پیڑے بناتے ہوئے جھنجھلا کر کہا۔

مائی رانی چابی کے کھلونے کی طرح جھک جھک کر تیزی سے تنور سے روٹیاں برآمد کرتی ہوئی بڑبڑائی: "بختو تو ہی اٹھ کر اڑا دے اس کم بخت کو۔ اسی کے تلے تو مالک پڑا ہے — مجھے تو وہم ہوتا ہے — مالک کے بال بچے اس وقت کی روٹی تو کھا لیں۔ پھر تو اللہ کی مرضی — آخر ہم نے اُن کا نمک کھایا ہے۔"

مائی رانی نے اپنی جھکتی ہوئی آنکھیں اپنے گھٹنوں پہ پونچھیں اور پانی میں ہاتھ بھگو کر دھپا دھپ تنور میں روٹیوں کی نئی کھیپ جڑنا شروع کر دی مگر بختو آٹے کے پیڑے بنانے میں اتنی مصروف تھی کہ اس منحوس چیل کو صرف گھورنے پر اکتفا

کرسکی جو ابھی تک چنی پر اڑا جا رہی تھی۔

"میرے بیاہ پر بھی کچھ تو دیا تھا مالکن نے۔۔۔ آج تک نہیں سنا کسی زمیندار نے اپنے کمیوں کو بیاہ پہ سونا بھی دیا ہو۔ کیسے بھاری کنگن تھے۔۔۔ اُن پر کام بھی ایسا تھا کہ دور دور کے گاؤں والے دیکھنے آئے تھے وہ کنگن۔" بخنو ٹھنڈی سانس بھر کر دھیرے دھیرے کہنے لگی۔

"ہاں تو تو کنگن لے کر سسرال چلی گئی تھی۔ ادھر برلے مربعوں والے رانا صاحب مالک سے جھگڑنے آئے تھے، موڑھ میں بیٹھ کر۔ بولے تم کمیوں کی عادت بگاڑ رہے ہو۔ تم پشتنی جاگیردار ہوتے تو ایسا نہ کرتے آج سونا دو گے کل یہ حویلی مانگنے آجائیں گے۔۔۔ ارے کیا کیا بتاؤں۔۔۔"

"ارے اماں ہزار دفعہ یہ قصہ سنا چکی ہو۔ ابھی چھوڑو بھی۔" بخنو آہستہ سے بولی۔

"اچھا تو رے یہ نہیں سنا ہوگا تو نے۔۔۔ رانا صاحب کی بات مالکن کے کان میں پڑی تو سجدے میں گر گر روتی تھیں اور کہتیں: "اللہ نے سب کو بنایا۔ کوئی اونچا نہیں۔ کوئی نیچا نہیں۔ کوئی اچھا نہیں کوئی برا نہیں۔" مائی رانی نے اپنے حساب کنگنوں کے سلسلے میں ایک اور انکشاف کیا۔

"چھوڑ اماں اب وہ کنگن ہی کہاں رہ گئے میرے پاس بیچ کھائے اس کے باپ نے۔" بخنو نے اپنے ہاتھ ہلا کر آٹے کی مڑوڑیاں چھڑاتے ہوئے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کی طرف شکایت آمیز نظروں سے دیکھا جو صحن میں بکھرے ہوئے سوکھے زرد پتے اکٹھا کر رہا تھا۔ اسی لمحے ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور ننھے کا کرتہ گھٹنوں سے اٹھ کر بادبان کی طرح اس کے جھکے ہوئے سر پر تن گیا۔ اسے اپنے انہماک میں اپنے نچلے دھڑ کی برہنگی کا احساس بھی نہ ہوا مگر بخنو دوڑی ننھے کا کرتہ قابو میں کیا اور ان بچوں کی طرف دیکھا جو برآمدے میں تختوں کے چوکے پر بیٹھے ننھے پہ ہنس رہے تھے۔

"کچھا کہاں پھینک آیا۔" بخنو نے زور سے کہا اور ہولے سے اپنے بیٹے کی پیٹھ پر ایک دھپ لگائی۔ اس کے بعد اس کے کرتے کے دونوں دامن ملا کر گرہ لگا دی۔۔۔ بخنو کو حویلی میں آتے ہوئے بچوں کی وجہ سے جھجک ہوئی تھی ورنہ مالکن تو لڑکے ذات کے ننگے کھلے کی پرواہ بھی نہ کرتیں مگر ہاں جب وہ اپنی نوزائیدہ بچی کو لے کر مالکن کو سلام کرنے آئی تھی تو انہوں نے دو پوتڑے سی کر دیئے تھے اور کہا تھا: "اے بخنو بیٹی لڑکی ذات کی شرم تو رکھا کرو۔"

مگر اس ننگے اور ڈھکے کے قصے سے بخنو کا بیٹا پریشان نہ تھا اور نہ اس کچھے کی اسے پرواہ تھی جو اس نے کبھی پہنا بھی نہ تھا وہ تو سوکھے زرد پتوں کی تازہ بوچھار سے پریشان تھا جو ہوا کے رخ پر آنگن میں لوٹتے پوٹتے حویلی کے بڑے برآمدے کا رخ کر رہے تھے۔ اور ساری محنت چوپٹ ہو چکی تھی۔۔۔ اس گھر میں کام کرنے والے سبھی لوگ جانتے تھے

کہ جہاں مالکن کو آنگن میں لگے دونوں درختوں سے محبت ہے وہیں سوکھے پتوں سے حد درجہ نفرت ہے۔

اُدھر جمیل کے اعصاب آگ میں گرے خشک پتے کی طرح چرمرا رہے تھے کیونکہ وہ ابھی تک دادا کے کمرے میں نہ پہنچ سکے تھے۔ وہ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس لیے انہیں بڑی چچی کے حکم پر انہیں ملے ہوئے کمرے میں خاندان کی بیبیوں کے سامنے بیٹھنا پڑ رہا تھا۔

"اے جمیل بیٹے تم آ ہی گئے۔ آخر ڈاکٹر پر اپنے خاندان والوں کا بھی فرض ہوتا ہے۔" بڑی چچی نے جیسے وہ تار یاد دلایا جو انہوں نے اپنے میاں کی بیماری پر راولپنڈی سے بھیجا تھا ـــ اور جس کے جواب میں جمیل صرف ٹیلی فون پر اپنے بڑے چچا کا حال احوال پوچھ کر رہ گئے تھے ـــ جمیل کا جی چاہا اٹھ کر باہر ٹہلنے لگیں جب تک دادا کے کمرے کا دروازہ کھلے۔ مگر بڑی چچی یہاں صرف جمیل کو طعنہ دینے تو آئی نہ تھیں۔ ان کی بیٹی ابھی زچہ خانے میں تھی مگر وہ اپنی بے ضرر سی ساس اور انصاف پسند سسر کے پاس اس موقع پر جیسے کھنچی چلی آئی تھیں۔ "اللہ میاں جمیل کے ہاتھوں ان کے دادا کو شفا دے گا۔" بڑی چچی نے مہندی سے رنگے بالوں پر دوپٹہ جماتے ہوئے کہا۔

"موت تو برحق ہے بھابی۔ ہاں انسان اپنی سی کوشش کرتا ہے۔" بڑی پھوپی نے اپنا سفید بالوں والا سر جھکا کر لمبی سانس لی۔

"اور پھر دیکھئے ابا جان تو گھنٹوں اسی آنگن میں اماں جان کے ساتھ واک (WALK) کرتے نہ تھکتے تھے اس عمر میں، اور اب جیسے سارا دھڑ بیکار ہو گیا ـــ" جمیل کی چھوٹی پھوپی جو جمیل کی ہم عمر تھیں اس المیے پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں ـــ وہ ایک دور دراز کے ضلع کے گرلز اسکول کی ہیڈ مسٹریس تھیں اور انسپکٹریس کے دورے کی خبر گرم تھی مگر وہ اپنی فرشتے جیسی اماں جان کو آنے والے صدمے میں تنہا کیسے چھوڑ سکتی تھیں۔

"ارے چھوٹی پھوپی آپ تو پڑھی لکھی ہیں جی کو سنبھالئے۔" جمیل کی بیوی نے چھوٹی پھوپی کو گلے لگا لیا مگر چھوٹی پھوپی اس ہمدردی پر اور بھی آنسو بہانے لگیں۔

"ہائے میری اماں کا کیا ہوگا۔ وہ ابا کے بغیر کیسے جئیں گی اکیلی۔" وہ دھیرے دھیرے فریاد کرنے لگیں۔

"ہاں آ۔ ساری زندگی ہم نے تو یہی دیکھا کہ ہماری اماں جان نے اس گھر میں داخل ہونے کے بعد باہر قدم نہ نکالا۔ خاندان میں کسی کے بیاہ کا موقع آتا تو اپنے ہاتھ سے لکھ بھیجتیں۔ جی چاہے تو اس حویلی میں برات اتار دیا یہاں سے بارات لے جاؤ۔ تمہیں اختیار ہے۔ اب میں کہاں گھر سے نکلوں کسی کے گھر زچگی ہونے والی ہوتی تو لکھتیں آنا چاہو تو یہیں آ جاؤ۔ تمہیں کوئی فکر نہ کرنا پڑے گی ـــ اب بھی جس کا جیسا جی چاہے کرے۔ نہ کبھی کسی سے کوئی گلہ نہ شکوہ ـــ"

جمیل کی بڑی پھوپی بولیں۔

• مگر سب کا حق بھی تو ہبنھا دیتی ہیں ہمیں بیٹھے بیٹھے۔ شادیوں پر اپنے ہاتھ سے سیئے ٹنکے جوڑے پیدائش پر ننھے ننھے کرتے ٹوپیاں "جمیل کی چھوٹی چچی نے یاد دلایا۔

ارے دنیا کہتی ہے ساس سسر جان پر سوار رہتے ہیں۔ سچ ہمارے ساس سسر نے تو ہمارے گھر میں جھانکا بھی نہیں اور جو ہم یہاں کبھی آتے تو ہمیں مہمان بنا کر بٹھا دیا جاتا۔ اللہ صحت دے میرے سسر کو ہم جانے لگتے تو چاول گندم کی بوریاں ساتھ کر دیتے ۔۔ ہم سے تو کبھی کچھ مانگا ہی نہیں حالانکہ ماں باپ کا اپنے بیٹوں پر بڑا حق ہوتا ہے۔"

جمیل کی بڑی چچی نے یوں کہا جیسے اپنے گناہوں کی تلافی کر رہی ہوں

میں نے کئی بار کہا اماں جان لاہور چلیئے۔ اتنا بڑا شہر ہے۔ اتنا خوبصورت، روشنیوں سے جگمگاتا۔ دیکھ کر حیران رہ جائیں گی آپ ۔۔ تو ہنس کر یہی کہتیں۔ ہاں بڑا اچھا ہوگا۔ اپنا اور میرا رنگ روپ دیکھو۔ نہ بابا میں تو یہاں کی کھلی ہوا سے نہ جاؤں گی "

بڑی پھوپی نے بولنا شروع کیا تو چھوٹی پھوپی دوپٹے سے آنکھیں اور ناک پونچھتے ہوئے بول پڑیں ۔۔ "اور میں ضد کرتی کہ چل کر میرا اسکول دیکھیئے کیسی بادشاہت کرتی ہوں۔ تو ہمیشہ جواب ملتا۔ اللہ مبارک کرے تمہارے باوا کو کس پر چھوڑ کر جاؤں اور جب اباجان کو ساتھ لے چلنے کی بات ہوتی تو کہہ دیتیں یہاں کا خیال کون کرے گا؟ ایک دفعہ میں نے بگڑ کر کہا تھا۔ آپ دونوں تو سارس کا جوڑا ہیں ۔۔ اس پر اماں خوب ہنسی تھیں ۔۔ اور اب ۔۔ "چھوٹی پھوپی اپنی دکھی ماں کی ہنسی یاد کر کے پھر سسکیاں بھرنے لگیں کیونکہ سارس کے جوڑے کی کہانی کسے نہیں معلوم کہتے ہیں ایک مر جائے تو دوسرا بھی بے کھائے پیئے یوں ہی کھڑے کھڑے مر جاتا ہے۔

جمیل کے اندر بیزاری کا جوالا مکھی کھول رہا تھا۔ وہ اپنے دادا دادی کی محبت کا احترام کرتے تھے انہیں تو ہمیشہ سے یہ بات معلوم تھی کہ دادا دادی تو اپنے بچوں کے رشتے ناطوں کے لئے بھی گاؤں سے نہیں نکلے۔ بیٹے تعلیم کے لئے باہر نکلے۔ نوکریاں کیں اور وہیں مل ملاقاتوں میں رشتے ناطے طے ہو گئے۔ اس کے بعد بیٹیاں اپنی بھابیوں کے ذریعے بیاہی گئیں ۔۔ اب وہ ان داستانوں کو سننے تو اتنی دور سے یہاں نہیں آئے تھے۔ وہ ڈاکٹر تھے اور اس وقت تو جلد سے جلد مریض کو دیکھنا چاہتے تھے اور ان کی نظریں دادا والے کمرے کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔

پھر وہ پراسرار دروازہ کھٹ سے کھل گیا اور جمیل اپنا بیگ اٹھائے تیزی سے اس کمرے میں چلے گئے۔

سب بہوؤں اور بیٹیوں نے دیکھا کہ حویلی کی مالکن ہاتھ میں بیڈ پین (BED PAN) لئے نکلیں اور دور کونے

میں بنی ہوئی دیوار کی اوٹ میں چلی گئیں۔ کسی کی جرأت نہ تھی کہ ان کے ہاتھ سے برتن لے لیتا کیونکہ سب کو معلوم تھا کہ شوہر کی خدمت میں وہ کسی کو شمہ برابر بھی حصے دار نہ بنائیں گی۔ ان کا نیلا دوپٹہ، سفید کرتہ اور گلابی پاجامہ ہوا کے تیز جھونکوں میں پیچھے کی طرف اڑ رہا تھا۔

اگر جمیل کی بیٹی نعیمہ سلطان عرف نومی انہیں یوں ہوا کے مقابل جاتے دیکھتی تو شاید اب سے پانچ سال پہلے کی طرح چلا اٹھتی "آپ پری ہیں، آپ پری ہیں" مگر وہ بے چاری تو اس وقت چھوٹے کمرے میں سارے کنبے کے بچوں کو بہلائے رکھنے کی ڈیوٹی انجام دے رہی تھی۔ اور درحقیقت خود کو بہلا رہی تھی۔ اس نے بچوں کے کھلونوں میں سے اٹھا کر وہ ننھی سی اپنی آنکھ سے لگا رکھی تھی جس کے اندر شیشے کے چند معمولی ٹکڑے ہوتے ہیں مگر جو دیکھنے والے کی نظروں کے سامنے رنگوں کی بڑی خوبصورت ترتیب پیش کرتے ہیں۔ جو ذرا سی حرکت سے بدلتی جاتی ہے۔ اس سے پانچ سال پہلے وہ یہاں اپنے ڈیڈی اور ممی کے ساتھ آئی تھی تو آٹھ سال کی تھی۔ ڈیڈی مزید تعلیم کے لئے لندن جانے والے تھے۔ اچانک چھوٹے دادا کا خط آیا کہ جانے سے پہلے حویلی ضرور جاؤ اور خاندان کی سب سے بزرگ ہستیوں کی دعائیں لے کر سمندر پار کا ارادہ کرو — اس زمانے میں نومی کے ڈیڈی کے پاس ممی کے جہیز والی کار تھی اور وہ اب اتنی قابل اعتبار نہ تھی کہ اس پر لمبا سفر کیا جاتا۔ اس لئے ریل، بس اور پھر تانگے کا سفر کر کے وہ حویلی تک پہنچے تھے۔ اس کی ممی بے چاری تانگے کے برقعے میں بولائی جا رہی تھیں۔ اور ڈیڈی کبھی ہنستے کبھی جھنجھلاتے۔ اس کے ذہن میں یہ سب باتیں دھندلا سی گئی تھیں مگر وہ اس حویلی میں رہنے والی اپنی پردادی کو کبھی نہ بھول سکی۔ اسے یاد تھا پہلے تو انہوں نے نومی کو خوب چوما تھا اور پھر فراک میں اس کی ننگی ٹانگیں دیکھ کر جھٹ اپنی بقچی سنبھال کر بیٹھ گئی تھیں نومی کے دیکھتے دیکھتے چھوٹی سی شلوار اور ننھا سا دوپٹہ تیار ہو گیا۔ یہ کپڑے پہن کر وہ کس قدر خوش ہوئی تھی اور اپنی پردادی سے جھٹ کر رہ گئی تھی جواب میں وہ انہیں خوش کرنا چاہتی تھی اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیسے خوش کرے — اس کے پاس ایک چھوٹا سا ٹرانسسٹر تھا۔ مگر ڈیڈی نے راستے میں ہی سختی سے منع کیا تھا کہ حویلی میں اسے ہاتھ نہ لگائے کہیں گانا وانا لگ گیا تو دادا دادی سخت ناراض ہوں گے۔ یہ سن کر نومی نے اپنے ڈیڈی پر سوالات کی بوچھار کر دی تھی۔

"کیا وہ فلم بھی نہیں دیکھتے؟"

"نہیں۔"

"کیا ٹی۔ وی بھی نہیں؟"

"نہیں۔"

"اوہ۔ پھر وہ کیا کرتے ہیں ڈیڈی۔ بور ہوتے ہوں گے نا!"

تب ڈیڈی نے اسے ایک دم ڈانٹ دیا تھا اور کہا تھا کہ خبروں کے وقت وہ خود ٹرانسسٹر آن کریں گے مگر نومی تو اپنی آنمی بیاری سی پردادی کو خوش کرنا چاہتی تھی "سرپرائز" دینا چاہتی تھی۔ ڈیڈی باہر لپنے دادا کے پاس تھے اور ممی سفر کی تکان اتارنے کو سو رہی تھیں۔ نومی نے ممی کے سوٹ کیس سے اپنا ٹرانسسٹر نکال لیا۔ اور گاؤ تکیے کے نیچے چھپا کر مدھم سی آواز میں لگا دیا تھا۔ پھر خود پردادی کی گود میں سر رکھ کر انہیں دیکھنے لگی۔۔۔ اور پھر اس نے تعجب سے دیکھا۔۔۔ راگ نے ان کے چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت پیدا کر دی۔ ان کے ہاتھ میں چھالیہ اور سروتہ جوں کے توں رہ گئے۔ اور پھر چند لمحے بعد وہ بولا کر تیزی سے آنگن میں نکل آئی تھیں۔

"سنو بٹیا۔۔۔ کہیں ریکارڈ باجہ بج رہا ہے" انہوں نے جیسے خواب میں کہا اور آسمان پر درخت کی پھننگ پر اس بے حد مدھم لے میں بجائے جانے والے باجے کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔۔۔ تب نومی نے کھلکھلا کر وہ باجہ گاؤ تکیے کے نیچے سے نکال کر اپنی پردادی کو دکھا دیا تھا اور اُن کی بڑی بڑی بادامی آنکھیں ایک دم خوف سے اور بڑی ہو گئیں "بٹیا اس شیطانی چرخے کو چھپا دو۔۔۔ اسے حویلی میں کیوں لائیں، تمہارے دادا کو معلوم ہوا تو ناراض ہوں گے۔۔۔"

اور نومی کو اپنے پردادا ایک دم بُرے لگنے لگے تھے۔ اسے تو بس اپنی پردادی لندن میں بھی یاد آتی رہیں۔ اور اب وہ دوسری بار یہاں اپنے پردادا کی بیماری کی خبر پا کر آئی تھی۔۔۔ اس اولڈ فیشن جوڑے کی عجیب و غریب محبت کے سلسلے میں سب لوگ کتنی باتیں کر رہے تھے۔۔۔ مگر نومی کو صرف اپنی پردادی کو دوبارہ دیکھنے کی خواہش تھی جو ابھی تک پوری نہ ہوئی تھی۔

جب نومی چھوٹے کمرے سے بچوں کے غول میں نکلی تو تختوں کے چوکے پر زرد رنگ کا چھپا ہوا دسترخوان پھیلا ہوا تھا اور مائی رانی چینی کی گہری گہری پھولدار پلیٹیں رکھ رہی تھی۔۔۔ باورچی خانے سے مرغی کے قورمے کی خوشبو اڑ رہی تھی اور پتیلے پر چمچہ بار بار بج اٹھتا تھا۔ بچے خالی پلیٹوں کے گرد جمع ہو گئے مگر مائی رانی کھانا لانے کے بجائے رک رک کر ڈر ڈر کر کہہ رہی تھی "آج فجر کو میری آنکھ کھلی تو دیکھا ہمیشہ کی طرح مالک اور مالکن نماز پڑھ رہے ہیں۔۔۔ ایک ہی محراب تلے۔۔۔ مائی رانی نے ہاتھ سے پانچ محرابوں والے برآمدے کی درمیانی محراب کی طرف اشارہ کیا۔ سب نے دہل کر اس محراب کی طرف دیکھا۔۔۔" پھر وہ ادھر آئی تو کوئی نہ تھا۔ تھوڑی دیر میں مالکن کمرے سے نکلیں اور آج کے کھانے کی تیاری کا حکم دے کر چلی گئیں۔۔۔" مائی رانی ایک دم رونے لگی۔

"میں نے تو عمر بھر دیکھا۔ مالک اور مالکن نے سدا ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔۔۔ سدا اکٹھا اس آنگن میں ٹہلے مگر نماز کی چوکی تو الگ الگ تھی۔۔۔ ارے میری آنکھیں اندھی ہو جائیں آج فجر کو میں نے یہ کیا دیکھا۔۔۔ ارے میری مالکن کیسے جئے گی

مالک کے بغیر ——" اور پھر مائی رانی نے بی بیوں کے چہروں پہ غم کے گہرے بادل دیکھ کر اپنے ماتھے پہ ہاتھ مارا اور یہ کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئیں۔ "ارے میری تو مت ماری گئی۔ مردانے میں کھانا گیا نہیں اور یہاں دسترخوان بچھا دیا —— مالکن کو پتہ چلا تو کیا کہیں گی۔"

بی بیوں نے بڑے خوف سے برآمدے کی اس درمیانی محراب کو دیکھا جہاں آج فجر کے وقت مائی رانی کی آنکھوں نے مالک اور مالکن کو اکٹھا نماز پڑھتے دیکھا تھا۔ اکٹھا نماز پڑھنے کے پیچھے کیا اشارہ ہے اسے سمجھنے کی کوشش ہونے لگی اور چھوٹی پھوپی نے نوبیں رونا شروع کر دیا۔

نومی اس سارے مسئلے سے بور ہو کر آنگن میں نکل آئی۔ اس نے آنگن میں لگے ہوئے ان دونوں اونچے اونچے درختوں کو چھوا جن کی گھنی گھنی شاخیں نیچے جھک کے ٹہنیوں کو چھوتی رہی تھیں اور جن میں سے ایک پر آج بھی جھولا پڑا ہوا تھا —— اس جھولے پر شاید اس حویلی سے تعلق رکھنے والے ہر شخص نے اپنے بچپن میں پینگیں بڑھائی ہوں گی —— نومی جب اس سے پہلے یہاں آئی تھی تو اس جھولے پر بیٹھی تھی مگر اسکول میں جھولے سے گرنے کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے جھولے سے ڈر گئی تھی اس لئے چپ چاپ بیٹھی رہی۔ دوپہر کے اس سناٹے میں پردادی نے نومی سے بڑی رسانیت سے پوچھا تھا —— "ارے بیٹا پینگ نہیں بڑھاتیں؟"

"نہیں ——" نومی اپنے خوف کا اظہار ان پر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"لو میں تمہیں سکھاؤں۔" تب وہ جھولے میں بیٹھ گئی تھیں۔ انہوں نے لمبے لمبے پینگ بڑھائے کر ان کا نیلا دوپٹہ، سفید کرتہ اور گلابی پاجامہ ہوا میں پرندوں کے پروں کی طرح پھیلنے اور سمٹنے لگا۔ ان کی بڑی بڑی بادامی آنکھیں چمک رہی تھیں، گلابی رنگ پر سرخی کی چھوٹ تھی اور بے دانتوں کا منہ خوشی سے کھلا ہوا تھا۔

"پردادی آپ پری ہیں۔ آپ سچ مچ پری ہیں۔ میں آپ کو پری کی تصویر دکھاؤں۔ میری کتاب میں ہے ——" نومی خوشی سے چلانے لگی تو انہوں نے زمین پہ پاؤں رگڑ کر جھولا ایک دم روک لیا تھا اور کہا تھا: "بیٹا کسی سے کہنا مت کہ بڑی دادی جھولا جھول رہی تھیں۔"

اس بات کو پانچ سال گزر گئے پر راز نومی کے دل میں تھا۔

درخت پر سے چند سوکھے پتے ٹوٹ کر نومی کے ارد گرد پھیل گئے۔ مگر نومی کے ذہن میں تو پانچ سال پہلے والی پردادی کی باتیں نرم نرم کونپلوں کی طرح پھوٹی پڑ رہی تھیں —— اسے حویلی میں آئے گھنٹہ بھر ہوا تھا اور وہ اب تک اپنی پریوں جیسی پردادی کو دیکھ بھی نہ سکی تھی۔ وہ جھولے پر بیٹھ گئی اور بچپن والی دوربین سے جی بہلانے لگی —— پھر اس نے دیکھا مائی رانی برآمدے کی اسی پراسرار محراب سے گزر کر کھانے کا تھال اندر کمرے کی طرف لے جا رہی ہے

جس کے بعد آج فجر کو پردادا اور پردادی نے اکٹھا نماز پڑھی تھی۔ جبکہ دادا آٹھ دن سے بستر سے اُٹھ بھی نہیں سکے تھے ـــ پھر نومی نے دیکھا اس کے ڈیڈی اپنا بیگ اٹھائے اسی محراب سے گذر کر ڈیوڑھی کی طرف جا رہے ہیں۔ ان کا سر جھکا ہوا ہے اور خاندان کی ساری عورتیں منہ لٹکائے دسترخوان کے گرد جمع ہیں۔

"نومی تم یہاں ہو؟ کھانے پہ چلو۔ پھر جانے کب کھانا ملے گا۔ تمہارے پردادا کی حالت خراب ہے ـــ" ممی اپنے بغیر آستینوں کے بلاؤز کو ساری سے خوب اچھی طرح چھپا کر سر ڈھکے اس کے پاس آگئیں۔

"اونہوں۔ میں نہیں کھاؤں گی وہاں ـــ" نومی نے دھیرے سے کہا۔

"کیوں نہیں کھاؤ گی۔ بعد میں بھوکی مرو گی۔" ممی نے اس کا بازو پکڑا۔

"نہیں ممی میں باورچی خانے میں بیٹھ کر کھا لوں گی۔ مجھے سب کے ساتھ کھاتے شرم آتی ہے ـــ" نومی نے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا تو جاؤ بختو سے کھانا لے لو۔" اور ممی کھانے پہ چلی گئیں۔

نومی نے فرمانبردار بچوں کی طرح اُٹھ کر باورچی خانے میں جھانکا۔ وہاں اس وقت کوئی نہ تھا اور پھر وہ ایک دم اس کمرے کی طرف دبے پاؤں چلی گئی جس میں اس کی پرلوں جیسی دادی ابھی تک چھپی ہوئی تھیں۔ اس نے آہستہ سے دروازے کا پٹ کھولا اور اندر چلی گئی۔

دھوپ سے آکر اسے اندھیرے کمرے میں کچھ نظر نہ آرہا تھا۔ پھر اس نے پلکیں جھپکا جھپکا کر دیکھا تو اسے مونڈھے پر بیٹھی ہوئی پردادی کی ننھی ہوئی لیسٹ نظر آئی۔ ان کا نازک سفید ہاتھ پردادا کے کالے ماتھے پہ رکھا اور زیادہ سفید نظر آرہا تھا۔ پردادی گنگنا کر سورۂ یٰسین کی تلاوت کر رہی تھیں۔ پردادا اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہے تھے اور ان کی آنکھیں دادی پر جمی ہوئی تھیں۔

نومی دبے پاؤں اور آگے بڑھ گئی مگر کسی کو کمرے میں اس کی موجودگی کا احساس نہ ہوا۔ پردادا کے ہونٹ حرکت کر رہے تھے۔ وہ ٹوٹے ٹوٹے لہجے میں کہہ رہے تھے: "میرے کفن کا کیا ہوگا؟ ـــ میرے کفن کا ـــ؟"

"ارے تم بار بار بھول جاتے ہو ـــ یار بار بتاتی ہوں ـــ کفن تو ہم دونوں کے، آب زم زم میں دھلے موجود ہیں ـــ سنا تم نے؟ آب زم زم میں دھلے کفن رکھے ہیں ـــ اطمینان رکھو ـــ سنا تم نے!" پردادی نے ان کے کان کے پاس جھک کر زور سے کہا۔ ان کی آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔

پھر نومی نے دیکھا پردادا کی آنکھیں ایک دم زیادہ پھیل گئیں۔ انہوں نے نفی کے لئے اپنا سر تکیے پر مسلسل ہلانا شروع

کر دیا۔

"تم اطمینان رکھو — سنا تم نے —" پر دادی نے میرا اطمینان دلایا اور وہ رونے لگیں۔

نومی کا جی چاہا کہ وہ ان سے لپٹ جائے مگر پر دادا ویسے ہی ٹوٹے ٹوٹے لفظوں میں بول رہے تھے: "تم نے سب کچھ تو دیا مجھے۔ یہ حویلی زمین بچے —"

"میں بھی تمہاری تھی — مہ بھی تو گنو —" پردادی نے ایک دم پرسکون آواز میں ان کے کان کے قریب جھک کر کہا۔

"میں نے تمہارے لئے اپنا سب کچھ چھوڑ دیا — دنیا سے منہ چھپا کر رہا — اپنے ماں باپ بہن بھائی — سب چھوڑ دیئے" دادا کی لال لال زبان ہونٹوں پر عجب انداز سے حرکت کر رہی تھی۔

"میں نے بھی تمہارے لئے دنیا چھوڑی — دولت — شہرت — کہو — کہو کیا تمہارے دل میں ہے — بولو" پردادی کی سسکیوں میں ٹوٹتی آواز نومی بڑی حیرانی سے سن رہی تھی۔

اب انہوں نے پردادا کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ ان کی تھرتھراتی کلائیوں میں شیشے کی چوڑیاں آپ ہی آپ کھنک رہی تھیں۔

"میرا کفن جمیل سے منگوانا۔ اپنے پیسے سے خرید کر مجھے نہ دینا۔ میری عاقبت خراب نہ ہو میرا پارہ جان — میرا پارہ جان —" پردادا آنکھیں بند کر کے اسی انداز سے بڑبڑا رہے تھے۔

اور گھبرائی ہوئی نومی کے ہاتھ سے بچوں والی دوربین کچھ اس زخ سے زمین پر گری کہ اس کے اندر قید رنگا رنگ چوڑیوں کے ٹکڑے بکھر گئے مگر نہ پردادا چونکے نہ پردادی۔

نومی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور جو بات سمجھ میں آئی وہ اتنی تھی کہ اس کی پریوں جیسی پردادی چکرا کر زمین پر خشک پتے کی طرح گر گئیں — اس کے بعد چیخیں مارتی ہوئی نومی اپنی پردادی سے لپٹ گئی۔

سب آئے تو نومی کے پردادا نیند کے انجکشن کی وجہ سے غافل سو رہے تھے اور نومی کی پردادی مر چکی تھی۔

شہرِ ناپُرساں

آغا سہیل

اُس نے لاپرواہی سے سگریٹ کا دھواں بکھیرتے ہوئے کہا۔" انھیں گرفتار کر لو۔ جو لمحے لہریں بن کر تمہارے گرد منڈلا رہے ہیں مگر ــــــ، تم ایسا نہیں کر سکو گے، بلکہ لمحات کے اس گرداب میں خود پھنس کر کسی کمزور تنکے کی طرح بہہ جاؤ گے"۔ خالد نے ریستوران میں کم ہوتے ہوئے گاہکوں اور بیشتر خالی میزوں اور کرسیوں پہ نگاہ ڈالی اور جواباً کہا" اس معاشرے کے مسائل ایک چکنے گولے کی طرح ہیں جو تمہارے ہاتھ میں آتے آتے پھسل جاتا ہے، لڑھک جاتا ہے اور لڑھکتا ہی چلا جاتا ہے۔ ہر شخص جھپٹ رہا ہے مگر ــــــ مگر"

انور نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا اور اس طرح آنکھیں بند کئے کئے جواب دیا جیسے وہ مہاتما گوتم بدھ ہو اور اپنے اندر کی روشنی کو پا گیا ہو اور اس روشنی کی لکیر کو باہر لے کر برآمد ہو رہا ہو" سنو" ہم سب حرام خور، بدمعاش کمینے اور ذلیل ہیں"۔

خالد نے کہا، ہم بدنفس خبیث اور انتہائی اوچھے ہیں۔

انور بولا ہاں ــــــ اور جب میں یہ بات کہہ رہا ہوں تو یقین کرو کہ میرا مطلب یہی ہے جو میں کہہ رہا ہوں آئی ایم ٹیلنگ دی ہاٹ آئی مین" یعنی میں کہ انور ہوں، ایک کمینہ بدمعاش چور اور خبیث انسان ہوں، آئی مسٹ کنفس فرسٹ آف آل اباؤٹ مائی سیلف، مجھے اپنی کمینگی دوسرے کے کندھے پر نہیں ڈالنا چاہیئے"۔

خالد نے کہا" ایگزیکٹلی، ہیر لائز دا پوائنٹ،

انور نے پھر کسی نسانت مہاتما کے مانند کہا، ایکسکیوز می، لٹ می فنش مائی پوائنٹ"۔

خالد بولا ییس ییس پلیز کیری آن ــــــ"

انور نے کہا۔ ہماری کمینگی یہ ہے کہ ہم خواہ زندگی کے کسی شعبے سے تعلق رکھتے ہوں، اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کرتے ــــــ یقیناً اس کے اسباب ہیں، اسباب معاشرتی عمرانی تاریخی سبھی کچھ ہو سکتے ہیں"۔

خالد بولا، "صرف اقتصادی ــــ اور صرف اقتصادی"

انور نے کہا، "ہاں ہاں اقتصادی بھی مگر کیا ہم خود ایک سبب نہیں ہیں؟ مثلاً میں ایک استاد ہوں۔ قوم مجھ سے سوال کرتی ہے کہ اس ملک کا ہر شہری ہر طالب علم پر تئیس تئیس روپیہ خرچ کر رہا ہے اس خرچ کے عوض قوم کو صفر کے برابر بھی فائدہ حاصل نہیں ہو رہا ہے میں آسانی سے یہ کہہ دیتا ہوں کہ صاحب پہلے تو ہر جماعت میں بیس پچیس طالب علم ہوتے تھے اب تو ایک سو دس ایک سو بیس بیس ہوتے ہیں استاد اپنے شاگردوں کے چہرے بھی نہیں پہچانتا کہ طالب علم رخصت ہو جاتا ہے وہ جماعتوں کے بجائے کینٹینوں ریسٹورنٹوں اور یونین کے دفتروں میں جو کچھ سیکھتا ہے وہی لے کر معاشرے میں گھس جاتا ہے اور دیمک کی طرح اس معاشرے کو چاٹنا شروع کر دیتا ہے مگر میں یہ کیوں نہیں کہتا کہ میں خود جماعتوں میں نہیں جاتا اور دفتروں میں بیٹھ کر گپیں ہانکتا ہوں۔ سیاست بگھارتا ہوں افسران بالا کی جوتیاں سیدھی کرتا ہوں۔ ان کی ہاں میں ہاں ملاتا ہوں"

خالد نے کہا یہی بنیادی بات ہے کہ ہم ایک غلط نظام میں جکڑے ہوئے ہیں ہمارا کوئی فعل ارادی اور اختیاری نہیں رہا ہے جبری مصلحتوں کا شکار ہیں ہم ڈرتے ہیں ہم سچی بات جانتے ہوئے بھی منافقت کرتے ہیں۔ ریاکاری سے کام لیتے ہیں دراصل معاشرہ بہت سے تہہ در تہہ حلقوں میں بٹا ہوا ہے اور ہر ہر حلقے میں ہزاروں اژدہے منہ کھولے بیٹھے ہیں اور ہم ان کے منہ سے بچ نکلنے کی فکر نے ہم کو ڈرپوک مصلحت بین اور منافق بنا دیا ہے ہم سچی بات جانتے پہچانتے ہوئے بھی کہہ نہیں سکتے کیونکہ ہم افراد سے ڈرتے ہیں کہ افراد درندے ہیں اور انسان ترقی معکوس کے عمل میں مبتلا ہے تاریخ اپنی ابتدا کو دہرا رہی ہے کہ جب انسان انسان کی درندگی سے خائف تھا کیونکہ معاشرے میں جمہوری عمل نہیں تھا اب بھی معاشرے میں جمہوری عمل نہیں ہے۔ ہم شخصیت پرست ہیں اور شخصیتوں سے ڈرتے ہیں، ہم اصول پرست نہیں ہیں اور نہ اصولوں کا احترام کرتے ہیں اور ــــ اور خیر چھوڑو۔

شاید میں نے تقریر کر ڈالی، کیا خیال ہے؟"

انور نے ہلکا سا قہقہہ لگایا، "غالباً ہم دونوں تقریریں کرنے لگے ہیں، آؤ چائے کی طرف متوجہ ہوں۔" ریستوران کی اس منزل میں سناٹا ہو گیا تھا صرف انور اور خالد موجود رہ گئے تھے مگر اس منزل کے نیچے سے موسیقی کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں اور اکا دکا جوڑے اب بھی نچلی منزل میں اتر اتر کر چلے جا رہے تھے۔ جہاں رقص و سرود کا بازار گرم ہوگا۔ اوپر کی منزل کی طرف بھی لوگ اکا دکا چلے آ رہے تھے مگر رات بھیگ چلی تھی مگر نہ جانے کہاں کہاں سے لوگ چلے ہی آ رہے تھے نیچے کی اس منزل میں بھی ویٹر نے صرف چند بتیاں جلتی چھوڑ دی تھیں بقیہ حصے میں اندھیرا کر دیا تھا۔ سڑک بھی اب نظر نہیں آ رہی تھی۔ بڑی بڑی شیشے کی دیواروں پر پردے کھینچ دیئے گئے تھے انور چائے بنانے میں اور خالد پاؤں کے پنجوں سے فرش

پر ہچکیاں دینے میں مصروف تھے۔ معاً خالد نے کہا۔ "یوں لگتا ہے کہ یہ فرش لکڑی کا نہیں ربڑ کا بنا ہوا ہے؟"

انور نے پوچھا، "وہ کیسے؟"

"کیوں کہ ٹھک ٹھک کی آواز نہیں آتی، پنجے دھنس جاتے ہیں مخملیں قالین میں"

"ڈرو اس مقام سے کہ جہاں تمہارے پاؤں زمین پہ نہ ہوں" انور نے راکھ دان میں سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا

معاً دونوں کی نظریں اُٹھیں ایک دوسرے کی نگاہوں سے ٹکرائیں اور دونوں کے مابین جیسے کسی بے آواز بات کا تبادلہ ہوا، پھر دونوں خود بخود مسکرا دیئے۔ خالد نے کہا "سچ پوچھوں مجھے ڈر لگ رہا ہے"

"کس سے؟" انور نے پوچھا"

"اپنے آپ سے" اُس نے چائے کے کپ کو ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا، "میں جو اپنے آپ پر منکشف ہو چکا ہوں۔ دھیرے دھیرے دھوپ بن کر شہر میں پھیلتا جا رہا ہوں ____ اپنی برہنگی سے ڈر رہا ہوں۔ لوگ مجھے دیکھتے ہیں اپنی نگاہوں کی کمندیں پھینک کر میرے اندر اترجاتے ہیں ان کی نگاہوں میں سورج کی تیز کرنوں کی سی شدت اور حدت ہے اور اس تمازت کی آگہی سے میرا سارا وجود لرز جاتا ہے"

انور نے کہا: "پھر بھی لوگ کتنے بے حس ہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ ہمارے درمیان افہام و تفہیم کی ایک بے آواز زبان موجود ہے ہم اس دور میں قطعاً نا گفتہ نہیں ہیں پھر بھی میرے مخالف فرد یعنی میرے مخاطب پر ردِ عمل کیوں نہیں ہوتا۔

خالد بولا "ہوتا ہے مگر منافقت کے دبیز پردے کے پیچھے"

دونوں نے اپنے اپنے کپ اٹھائے اور لبوں سے لگا کر چسکیاں لینا شروع کر دیں۔ معاً انور نے کہا، "تم نے سامنے بھی دیکھا"

"کیوں کیا ہے سامنے، شیشے کی دیوار پر پردہ پڑا ہوا ہے اور بس"

"مگر پردے کے پیچھے کیا ہے؟"

"شیشے کی دیوار اور اس کے پیچھے سڑک"

"نہیں دیوار اور پردے کے درمیان کوئی ہے"

"ہوگا کوئی ویٹر وغیرہ شاید پردے کی سلوٹیں درست کرنے گیا ہو۔

"ہرگز نہیں، اس کا چہرہ بہت ڈراؤنا ہے کئی بار وہ ہمیں دیکھ چکا ہے"

"تمہارا وہم ہوگا شاید تم اونگھ گئے ہوگے"

"قطعاً نہیں جناب میں پوری طرح ہوشیار ہوں اور دیر سے یہی تماشہ دیکھ رہا ہوں"

مگر کون ہو سکتا ہے وہ اور ہمیں کیوں چھپ چھپ کر دیکھ رہا ہے، ہم تو شہر کے کوئی اہم آدمی بھی نہیں ہیں،
میرا مطلب ہے کہ ہم سیاسی آدمی تو ہیں نہیں،
مگر ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا؟"
"کچھ بھی ہو۔ وہاں ضرور کوئی چھپا بیٹھا ہے اور ہمیں تک رہا ہے۔"
یار تھکنے دو، چھوڑو، کسی اور موضوع پر بات کرو"
مگر وہ ہے کون؟"
"وہم بس کہہ دیا وہم کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟"
ہاں یہ ہمارے اندر کے اندیشے بھی ہو سکتے ہیں جو کوئی نہ کوئی شکل اختیار کر لیتے ہیں، خیر چھوڑو۔ تم کیا سوچ رہے ہو؟"
یار میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ملک میں پہلے ہی بہت بے روزگاری ہے، اب جو بیرون ملک گئے ہوئے لوگ لوٹ لوٹ کر آ رہے ہیں تو ملک کا اور کیا بنے گا۔ بے روزگاری اور کتنے بڑے پیمانے پر بڑھے گی اور پھر ......"
پھر وہی مسائل مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا، یہ مسائل سیاستدانوں کے لئے چھوڑ دو، ہم سیاستدان نہیں ہیں۔"
"مگر ہم اس ملک کے دانشور تو ہیں"
"بقلم خود"
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ ہم کو آپ کو دانشور مانتا ہی کون ہے؟
بیوروکریسی نے سیاستدانوں اور دانشوروں کو اپنے دام میں ایسا الجھایا ہے کہ سیاست بھی انہی کی چلتی ہے اور دانشوری بھی، یہ بادشاہ گر لوگ ہیں ان سے ڈرو۔"
اور دونوں بظاہر ڈر کر جلدی جلدی چائے ختم کرنے لگے۔ پھر انور نے کہا۔
"سنو باہر چلنے سے پہلے ذرا بال روم پر ایک اچٹتی سی نگاہ نہ ڈال لیں۔"
خالد نے یوں شانے اچکائے جیسے کہہ رہا ہو کوئی مضائقہ نہیں، چنانچہ دونوں کے دونوں کاؤنٹر چپل دے کر نیچے پہنچ گئے جہاں کسی تیز موسیقی کی لے پر رقص ہو رہا تھا اور نوجوان جسم لہرا رہے تھے خوشبوؤں کی لپٹیں اڑ رہی تھیں رنگ برنگے

لباس اپنی بہار دکھا رہے تھے اور شوخ جذبات کے تیز اور تند دھاروں پہ نوجوان بہہ رہے تھے۔ یہاں کسی کو ملکی قومی یا بین الاقوامی مسائل کی قطعاً کوئی فکر نہ تھی چہروں پہ کوئی تردّد نہ تھا اور نہ چہروں پہ کل کی فکر کے سائے تھے ہر چہرہ بشاش تھا۔ ہر جسم خوشیوں میں ڈوبا ہوا ہر ہر جسم کے ایک ایک اعضاء سے طمانیت اور آسودگی ابلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی ایک خوبصورت نوجوان لڑکی لہراتی بل کھاتی موج آب کی طرح بہتی ہوئی آئی اور کسی سبک رو کشتی کی طرح انور کو اپنے بازوؤں میں لیے ہوئے چلی گئی۔ دوسری طرف سے ایک موٹی مگر خوبصورت ادھیڑ عمر کی عورت کسی ڈبل ڈیکر بس کی مانند ڈولتی ہوئی آئی اور خالد کو کسی بکرے کے مانند کولی میں بھر کر لے گئی۔ اور لیے مدلے روشنی کے زاویوں موسیقی کی تیز دھنوں اور اڑتی ہوئی خوشبوؤں کی لپٹوں میں جسم لٹو کی طرح گھوم رہے تھے۔ بھنبگی کی طرح ناچ رہے تھے اور مدہوش سے ہوتے جا رہے تھے بے سدھ اور مگن تھوڑی دیر کے بعد رقص کا جیسے ہی ایک راؤنڈ مکمل ہوا انور اور خالد اس بھیڑ بھڑکے سے نکلے اور چپکے سے باہر نکل کر کھلی ہوا میں آ گئے۔ سڑک پر سناٹا تھا ٹریفک نہ ہونے کے برابر دور درختوں کے جھنڈ سے پیلا پیلا چاند ابھر رہا تھا جو بے حد مضمحل اور سر مردہ سا دکھائی دیتا تھا۔ انور بولا تو یہ لڑکی تھی کہ قیامت یوں لگتا تھا کہ دیکھو کو ریشم سے ڈھک دیا گیا ہو، اُف میرے اللہ کیا یہ ہمارے ہی ملک کے لوگ ہیں، جنہیں اپنے جسم کے آگے کچھ نظر ہی نہیں آتا۔

میرے حصے میں دائی مگر قیمتی کاسمیٹکس کا لوٹ آیا تھا۔ مگر کیا کہوں مجھے چکر گھنی بنا دیا ظالم نے وہ مضبوط گرفت تھی اس کے ہاتھوں کی میری کمر کے چاروں طرف کو جیسے مجھے شکنجے میں کس دیا ہو۔"

اور ڈیر خالد، یہ ہمارے ہی ملک کے کسی طبقے کی نیک بیبیاں ہیں۔"

مگر یہ طبقہ ہے کون سے۔ ہمارے ملک کی ننانوے فیصد بیبیاں کھیتوں اور کھلیانوں میں مشقت کرتی ہیں گھروں میں بچوں کو سنبھالتی ہیں شوہروں بھائیوں اور بہنوں کی نگہداشت کرتی ہیں۔ اکا دکا فیکٹریوں دفتروں اسکولوں کالجوں اور اسپتالوں وغیرہ میں بھی کام کرتی ہیں کچھ سیاست میں حصہ لیتی ہیں اور سوشل اداروں میں سر کھپاتی ہیں۔ مگر یہ بیبیاں کون ہیں؟

یہ وہی ہیں کہ جن کے شوہر بیٹے اور بھائی دولت تو اس غریب ملک سے بٹورتے ہیں اور یورپ اور امریکہ کے ملکوں میں پانی کی طرح بہاتے ہیں سامان تعیش خریدتے اور عیش کرتے ہیں سارے کالے دھندے چلاتے ہیں سیاستدانوں کو جیب جاتے ہیں ترمیم لیتے ہیں اور اپنی مرضی کا قانون بنوا کر اپنے حقوق کا تحفظ کرا لیتے ہیں اور جن کے پاس وقت اور روپے پیسے کی فراوانی ہوتی ہے چنانچہ جسم کی آسودگی اور طمانیت ان کا بھی اور ان کی عورتوں کا بھی واحد مسئلہ ہوتا ہے —— اور یہی وہ طبقہ ہے جو محنت کشوں کا استحصال کرتا ہے اور اور ——"

اور ہمارے ہنر مندوں اور دانشوروں کی وہ ٹولیاں جو ان کے پیدا کردہ حالات اور مسائل سے دل برداشتہ ہو کر

باہر چلی جاتی ہیں ان سے ہمارا ملک اور بھی غریب ہوجاتا ہے۔ یہی نہیں یہ تو اس مہذب دنیا کے بردہ فروش ہیں، سستے داموں پر مزدوروں کو دوسرے ملکوں میں دساور کر کے زرمبادلہ کماتے ہیں اور یہ پیسہ بھی ملک میں نہیں آنے پاتا بالا ہی بالا یورپ کے بنکوں میں جمع ہوجاتا ہے۔

"یار میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ کینیڈا چلا جاؤں۔"

"کیوں آخر تم کو کیا ہوگیا ہے۔ اچھے بھلے تو یہاں ہو۔"

"ٹورنٹو میں اپنا بھائی صبیح ہے نا، وہ مجھے ویزا بھجوا دے گا، انیا لسرکر دے گا، مزے سے جا رہیں گے،" ے غم زدہ نے غم کالا ــــ کہ ہر قسم کا کوئی ٹینشن تو نہیں ہوگا۔"

ٹینشن وہاں بھی ہوگا۔"

"وہ کیسے"

"کالے اور سفید کا ٹینشن"

"پھر بھی یار یہ تو نہیں ہوگا جو یہاں ہے۔"

"ٹھیک ہے یہاں حالات اچھے نہیں، مگر ہے تو یہ اپنا ہی ملک۔"

"دیکھو، یہ سڑک جس پر ہم تم کھڑے ہیں پتہ ہے اس سڑک پر میں کب سے چل رہا ہوں ــــ پورے چالیس سال سے، یعنی جب سے میں نے چلنا سیکھا اور یہ سڑک میری ہمراز اور دمساز ہے۔"

"یار اس سڑک سے بھلا ان باتوں کا کیا رشتہ"

"ہے رشتہ"

"وہ کیسے"

وہ ایسے کہ چالیس سال مسلسل میں اس پہ پیدل چل رہا ہوں، جبکہ کتنے پیدل چلنے والے گاڑیوں پہ چلنے لگے جہاز پر اڑنے لگے سینکڑوں ایسے ہیں کہ سال میں کتنی ہی گاڑیاں بدل دیتے ہیں اور اس سڑک پہ دندناتے پھرتے ہیں اور میں ہوں کہ اسی طرح چالیس سال سے رینگ رہا ہوں اور دس بیس سال تک اس پہ گھسٹتے گھسٹتے میں قبر میں پہنچ جاؤں گا، اور مجھے گاڑی نصیب نہیں ہوگی۔"

یہ بھلا کیا بات ہوئی گاڑی کونسا بڑا مسئلہ ہے جس کی خاطر تم وطن چھوڑ دو گے۔"

"مسئلہ تھا نہیں بنا دیا گیا ہے۔ معاشرے میں عزت کا نشان ہے ــــ اور پھر ذرا سوچو میں ایک کوالیفائڈ

آدمی ہوں، دانشور ہوں، کچھ کتابوں کا مصنف بھی ہوں۔ مگر میری عزت؟ ـــــ

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں۔
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

خیر کچھ بھی کہو، مجھے تمہارے اس فیصلے میں خاصا بچپنا نظر آتا ہے۔"

آتا ہو گا ــــ مگر میں بھی انسان ہوں تھوڑا سا آرام اور تھوڑی سی عزت چاہتا ہوں، اس دنیا میں دوبارہ نہیں آنا ہے۔ کیا کروں۔

اچانک دونوں پر خاموشی نے حملہ کر دیا جیسے وہ اپنے اندر ڈوب گئے ہوں، جیسے وہ اپنے باطنی وجود سے مخاطب ہوں اور ایک دوسرے کی رفاقت سے تھک گئے ہیں۔ انور نے معاً موضوع بدلنے اور خاموشی کے بوجھ کو اتارنے کے لئے خالد سے کہا: "چاند کیسے چپ چاپ سفر کر رہا ہے اور ازل سے اب تک سفر ہی کی حالت میں ہے۔"

"کیوں وہ تنہا ہے۔"

ہم سب اپنے اندر تنہا ہیں۔"

" یہ ہم کیوں تنہا رہ گئے ہیں ــــ کیا ہر معاشرہ کا انسان اسی طرح تنہائی کے زہر کو پی رہا ہے۔"

نہیں جب معاشرے کے تانے بانے ٹوٹ جاتے ہیں اور معاشرے کے سفر کی مقصدیت ختم ہو جاتی ہے کچھ اجارہ لوگوں کے اشارے پر معاشرے کے افراد حرکت کرنے لگتے ہیں اور معاشرے کا رس نچوڑ کر اپنا گلاس بھر لیتے ہیں تو باقی افراد معاشرہ کے حصے میں صرف پھوک رہ جاتا ہے اور معاشرے کے حرکات میں ع۷۷ ۵۷ ۱۸ نہیں ہر پانے تو تنہا رہ جاتے ہیں اور جب معاشرے کے افراد تنہا رہنے لگتے ہیں تو زندگی بے مقصد فضول اور بے معنی نظر آنے لگتی ہے"

" تو رہبر وغیرہ بھی۔

ہاں ہاں اپنے معاشرے کی روح سے کٹے ہوئے ہیں یہ لوگ۔ یہ بیمار ہیں یہ کہا جاتا ہے نا لیکن حقیقتاً بیمار نہیں ہیں ان کا معاشرہ بیمار ہے یہ تو اس معاشرے کا ناسور ہیں۔"

تم ٹھیک کہتے ہو، شائد ہمیں ماہرین عمرانیات کی خدمات حاصل کر کے اپنے معاشرے کا علاج ڈھونڈنا چاہیئے۔

" علاج تو ڈھونڈا جا چکا ہے، ہر زمانے میں ڈھونڈھ گیا اور پایا گیا، مگر اس پر عملدرآمد کہاں ہوتا ہے۔ کیا میں

علاج ڈھونڈنے والے موسیٰ کا نام لوں، ابراہیم کا نام لوں گوتم اور سقراط کا نام لوں محمدؐ کا نام لوں حسینؑ کا نام لوں اور ــــ اور

ہاں کتنے معراج الدولہ ٹیپو۔ لکشمی بائی۔ حضرت محل اور بخت خان ہوتے ہیں۔ ہماری تاریخ ہیں"

اور ہر ایک کا راستہ روکا ہے فرعون نے نمرود نے ابوجہل و نمرود اور صادق و جعفر نے "

"ہنہ"

"تو وہ آدمی ؟"

"کون" ؟

"وہی جو ریستوران میں پردے کے پیچھے نظر آیا تھا،

کون تھا وہ ؟"

"اُف بھئی"

"سوچنا پڑے گا، بہت گمبھیر مسئلہ ہے"

تاریخ کے موڑ پر ہوں نہ ہوں البتہ اپنے راستے کے اہم موڑ پر ضرور کھڑے ہوتے ہیں"

دونوں نے غور کیا تو وہ باتیں کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچ چکے تھے جہاں سے دو راستے مختلف سمت میں مڑتے تھے ایک شمال میں ایک جنوب میں اور رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی، دونوں نے گھڑیوں پر نظر ڈالی مصافحہ کیا اور ایک دوسرے سے رخصت ہو کر مختلف سمتوں میں چل پڑے۔ کچھ ہی دیر کے بعد ایک نے مڑ کر پیچھے دیکھا اور ٹھہر گیا اور جب اُسے یقین ہو گیا کہ دوسرا مخالف سمت کے کھلار میں اتر کر دور جا چکا ہو گا تو وہ مڑا اور ایک اور سمت میں چلنا شروع کیا۔ درختوں کے کنجوں میں اسے ایک سایہ سا نظر آیا، اُس نے اس سائے کا تعاقب کیا لیکن دھیرے دھیرے آہستہ آہستہ کہ اُسے پیروں کی چاپ سنائی نہ دے، پھر اُس نے دیکھا کہ سایہ حرکت کرتا ہوا سڑک پر واپس آ گیا اُس نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کئے اور پھر لمبا لمبا سڑک پر لیٹ گیا اور سسک سسک کر رونے لگا۔ رونے والے تک پہنچ کر اُس نے اس کا چہرہ اٹھایا، اور حیرت سے کہا، تم :

وہ بولا ہاں یہ میں ہوں، میں ابھی تک واپس نہیں گیا تھا، سڑک کی چھاتی کے نیچے اس کے دھڑکتے ہوئے دل کی کراہیں سن رہا تھا بہت زخم ہیں صدیوں اور قرنوں سے زخم سہ رہی ہے بیچاری سڑک۔ مگر تم تو واپس چلے گئے تھے

"میں میں" وہ ہکلایا، "دراصل میں سمجھا کہ وہ جو سایہ ریستوران میں نظر آیا تھا۔ کہیں تم وہ ہی تو نہیں ہو"

پُل اور نقلی چوکیدار

اکرام اللہ

ایک پُل ،ایک بہت ہی بڑا پُل ،اتنا بڑا کہ اس کا اگلا اور پچھلا دونوں سرے ناپید ہیں، کہیں انتہا سے شروع ہو کر انتہا میں دب جاتے ہیں۔ اس کے دونوں کناروں سے اوپر کو اٹھتے ہوئے بڑے موٹے موٹے گارڈروں جیسے سنہرے ستون آسمان کی بلندیوں کو چیرتے ہوئے کہیں دور خلاؤں میں نکل گئے ہیں۔ یہ ستون اتنے چوڑے ہیں کہ اگر کوئی آدمی ایک ستون کو اپنے پھیلے ہوئے بازوؤں کے حلقے میں لینے کی کوشش کریں تو بمشکل اس کا احاطہ کر سکیں۔ یہ ستون تھوڑی اونچائی تک ایک ایک دوسرے کی طرف جھکتے ہوئے بڑھتے ہیں پھر ضرب کا نشان بناتے ہوئے آگے نکل جاتے ہیں اور اوپر جا کر پھر دوسرے ستونوں سے ضرب کے نشانات بناتے ہیں۔ اس طرح ضرب کے اتنے بے شمار نشانات بنتے چلے جاتے ہیں کہ ایک جال سا بن جاتا ہے۔ ان گنت ستونوں میں پھوٹتی ہوئی روشنی نے نہ صرف پُل کو نور میں نہلایا ہوا ہے بلکہ ان ابھرے ہوئے، اوپر ہی اوپر اٹھتے ہوئے ستونوں کے ساتھ ساتھ روشنیاں بھی آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئی ہیں۔ پُل پر انسان ہی انسان ہیں اور ایک ہی سمت میں بڑی مضحکہ خیز رفتار سے چلے جا رہے ہیں۔ وہ تیز چلنے سے بھی زیادہ تیز ہیں مگر دوڑ نہیں رہے۔ ان کے کپڑے اُڑ اُڑ کر دیوانہ وار ان سے لپٹ رہے ہیں۔ قریب سے دیکھنے پر ان کے چہرے لاشوں کی طرح زرد نظر آتے ہیں۔ ان کے بکھرے، الجھے، بے ترتیب بال کسی پرندے کے اجاڑ گھونسلے کی طرح ہیں اور سینگوں کی صورت اوپر کو اٹھے ہوئے ہیں۔ ان کے چہروں کے نقوش اس طرح ترچھے مڑے ہیں جیسے کسی ایسے دبیز شیشے میں سے دکھائی دے رہے ہوں جس کی ساخت میں نقص کی وجہ سے لہریں سی پڑ گئی ہوں۔ ان کے چہروں کی جلد پگھلی ہوئی موم سے بنی ہوئی معلوم ہوتی ہے جو کسی نے بے ترتیبی سے انڈیل دی ہو اور جو ابھی پوری طرح جمی نہ ہو۔ ان کی رفتار کی شدت سے اس جمتی ہوئی موم میں ہلکی ہلکی لہریں آہستہ آہستہ بنتی اور دھیرے دھیرے بگڑتی رہتی ہیں جس کی بدولت ان کے مائع چہروں پر ہونٹ، ناک، کان، گال اور چہرے کا ہر رشتہ مستقلاً تغیر پذیر

رہتا ہے۔

انسانوں کے اس بہتے ہوئے ریلے میں آگے پیچھے اِدھر اُدھر کچھ لوگ بکھرے ہوئے ہیں جنہوں نے بہت لمبے لمبے بانس اٹھائے ہوئے ہیں۔ کچھ بانس تو اتنے اونچے ہیں کہ مغرب کے کئی نشانوں سے بھی آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ ان بانسوں کے اوپر نقلی چوکیدار بندھے تیز ہوا میں جھولتے رہتے ہیں اور بانس اٹھانے والے پوری طاقت سے انہیں اوندھے منہ گرنے سے بچائے رکھتے ہیں۔ ہر پتلے کے کم از کم دو چہرے ہیں۔ کئی پتلے تو ایسے ہیں جن کے آٹھ آٹھ دس دس چہرے ہیں اور ہر چہرے پر ایک الگ تاثر طاری ہے۔ ان سب پتلوں کا ایک چہرہ جو تقریباً سب میں مشترک ہے، بڑا خوفناک ہے۔ گہرے جامنی رنگ کی جلد، غیض و غضب میں اُبلی پڑی آنکھیں، چھاتی تک لٹکتی ہوئی خون ٹپکاتی سرخ زبان، اوپر کے کھلے ہوئے جبڑے میں دو لمبے لمبے دانت جو خنجر کی طرح خم کھاتے ہوئے زبان پہ آگے ٹکے ہوئے ہیں۔ شانوں تک لمبی لٹیں اور ہر لٹ کے آخر میں زبان نکالے ایک سانپ۔ ان نقلی چوکیداروں کے کاٹھ کے پتلے سیدھے پھیلے ہوئے بازوؤں پر الفی نما قمیض پھڑپھڑاتے رہتے ہیں لیکن چہروں پر دہی ایک تاثر منجمد رہتا ہے۔ ہر بانس اٹھانے والا اپنا نقلی چوکیدار دوسروں سے بلند رکھنے کی فکر میں بازو کو پورا بلند کئے پنجوں کے بل چلتا ہے۔ یہ بانس والے نقلی چوکیدار لئے جس طرف بھی نکل جاتے ہیں لوگ سہم کر تھر تھر کانپتے جھک جاتے ہیں۔ جہاں یہ دیکھتے ہیں کہ کسی گروہ پر خوف دہراس کا مطلوبہ اثر پیدا نہیں ہو سکا تو ایک ہاتھ سے بانس کو سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے جیب کی گہرائیوں میں سے نقلی چوکیدار کی جامنی رنگ والی تصویر نکال کے اپنے چہروں پہ گھڑی بھر کے لئے چپکا لیتے ہیں۔ جب لوگوں کی خوف سے گھگھی بندھ جاتی ہے تو جیب سے دوسری تصویر نکال کر چہرے پہ لگا لیتے ہیں جس میں نقلی چوکیدار کا کدو کی طرح گنجا سر ہے اور ٹماٹر کی طرح سرخ گال ہنستے ہنستے پھٹا جاتے ہیں۔ سنہرے ستون جہاں جہاں مغرب کے نشانات بناتے ہیں وہاں سنہری کھو پڑیوں والے لوگ کہنیوں کے سہارے لیٹے ہیں اور ایسے بے ترتیب بالوں کے بغیر انڈے کی طرح صاف سنہرے سر ہتھیلیوں پہ نہایت اطمینان سے ٹکائے اوپر آسمانوں کی جانب نگاہیں گاڑے کچھ سمجھنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ یہ اگر چاہیں تو بانس اور بانسوں پہ ٹکے ہوئے نقلی چوکیدار اچک لیں اور انہیں توڑ مروڑ کے پھینک دیں مگر یہ اس طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔ لیکن کوئی نقلی چوکیدار اگر بالکل ہی سامنے آ کے منہ چڑانے لگے تو بازو لمبا کر کے ہاتھ کی پشت سے اسے چہرے کے سامنے سے ہٹا دیتے ہیں۔ نیچے ہجوم بہتا رہتا ہے۔

تیس پینتیس برس کا ایک مرد پُل کے کنارے لگے ہوئے لوہے کے جنگلے کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا

ہے۔کنارے کے ساتھ ہی اتھاہ تاریکیاں اور گھپ اندھیرے ہیں۔ اتنا روشن اتنا منور پل جس کے موٹے موٹے سنہرے ستون آسمانوں کو چیرتے ہوئے اجالے پھیلاتے چلے جاتے ہیں لیکن کناروں سے باہر ایک ننھی سی کرن بھی نہیں پہنچا سکا۔ شاید روشنی مجبور ہے کہ جب تک کسی مادی چیز سے نہ ٹکرائے کوئی تاثر پیدا نہیں کر سکتی اس کے چہرے کی جلد نہ تو پگھلی ہوئی موم کی طرح ہے اور نہ ہی اس کے نقوش ترچھے مڑے ہیں۔ لیکن اس کی پوری شخصیت پہ ایک گھمبیرتا طاری ہے جیسے پوری توجہ اور تن دہی سے کوئی نہایت ادق مسئلہ سمجھنے اور حل کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس سے سوگز آگے ایک عورت اسی طرح جنگلے سے ٹیک لگائے کھڑی ہے۔ پھر ایک مرد کھڑا ہے پھر ایک عورت کھڑی ہے۔ پورے پل پہ ایک انتہا سے دوسری انتہا تک اسی طرح مرد اور عورتیں کھڑی ہیں۔ پل پہ انسانوں کا سیلاب اپنی دھن میں چلا جا رہا ہے۔ جنگلے سے ٹیک لگائے کھڑے لوگوں میں دفعتاً ایک ہی لے اور ایک ہی تال میں حرکت پیدا ہوتی ہے جیسے وہ کسی بیلے کے کردار ہوں اور ایک ہی ڈانس نمبر ناچ رہے ہوں۔ ہاتھوں کی ایک متفقہ حرکت سے وہ سب بکھرے ہوئے الجھے ہوئے بے ترتیب بالوں کے پفوں کو ٹوپیوں کی مانند اتار کر زمین پہ رکھ دیتے ہیں جیسے وہ بال کبھی ان کے جسموں کا حصہ ہی نہ تھے دوسری متفقہ حرکت کرتے ہیں اور قمیضیں اتار کے جنگلے پہ رکھ دیتے ہیں۔ پھر ہر کوئی کہنی تک اپنا دائیاں بازو جما کے رکھتا ہے۔ ایک لمبی گہری سانس بھرتا ہے اور متوازی بار پہ جمنا سٹک کے انداز میں جنگلہ پھلانگ کے اتھاہ تاریکیوں اور گھپ اندھیروں میں کود جاتا ہے۔ کوئی شڑاپ کی آواز نہیں آتی کوئی چھینٹے نہیں ابھرتے۔ کوئی بلبلہ پیدا نہیں ہوتا۔ لوگ مجنونانہ چال میں پل پر بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ جنگلے کے ساتھ فوراً ہی اور لوگ ٹیک دگا کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر وہی ایک لے اٹھتی ہے۔ پھر وہی ایک تال ابھرتی ہے۔ نقلی چوکیدار بانسوں پر پھدکتے رہتے ہیں۔ سنہرے سرسو چتے رہتے ہیں۔

پھٹے پرانے جیتھڑے پہنے ایک جوان ایک بڑی پیاری سی معصوم صورت پانچ سالہ بچی کا بازو مضبوطی سے پکڑے چلا جا رہا ہے۔ بچی کے کندھے پہ بستہ لٹک رہا ہے اس کے چہرے کی جلد صاف ہے اور نقوش اپنی اپنی جگہ پہ قائم ہیں۔ وہ اس کے تیز رفتار قدموں سے قدم ملائے رکھنے کی کوشش میں بھاگی چلی جا رہی ہے اس کے ننھے ننھے پاؤں اس تیز رفتاری کی تاب نہ لاتے ہوئے رپٹ جاتے ہیں تو وہ اپنے باپ کے ہاتھ کے سہارے جھولتی ہوئی بہت دور تک چلی جاتی ہے۔ باپ دفعتاً بچی کا ہاتھ چھوڑ کے جنگلے کی طرف چل پڑتا ہے۔ یکدم اس کے چہرے کی جلد صاف ہو جاتی ہے اور نقوش معمول پر آ جاتے ہیں۔

"ابا ابا تم کہاں جا رہے ہو؟"

"جنگل کے پار"

"اچھا! کب واپس آؤ گے؟"

"کبھی نہیں۔ کیا تمہیں میری ضرورت ہو گی؟"

"نہیں نہیں۔ یہاں کون کس کے لیئے ضروری ہے"

"نقلی چوکیداروں کے آگے جھکنا نہ بھولنا وہ ہم سب کے لئے بہت ضروری ہیں"

"اچھا"

ایک پھولے گالوں اور عمدہ لباس والا راہگیر چھڑی گھماتا چلا جا رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں چھڑی بہت تیزی سے چکر کھا رہی ہے اس کے بالوں کے پٹ سے دو تین انچ اوپر گول لوٹی اتنی رفتار سے گھوم رہی ہے کہ پہلی نظر میں ساکت معلوم ہوتی ہے۔ اُس گھومتی ہوئی چوبی کے کنارے سے اگر کسی کا ہاتھ چھو جائے تو کٹ کے دور جا پڑے۔ وہ پکار کے کہتا ہے "کو دو۔ کو دو۔ یہ تبا سے بغیر کسی یتیم خانے میں زیادہ آرام سے رہ سکتی ہے۔ بڑا آیا" پھر ہنستا ہوا داد طلب نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔ اس کی بات پہ پاس والے کئی منہ اور بچی کا منہ ہنسنے کے انداز میں کھلتے ہیں۔ چڑیوں کے بوٹ چوگا لینے کے لئے منہ کھولتے ہیں تو ان کے منہ ان کے جسموں کی مناسبت سے کئی گنا بڑے نظر آتے ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ان کا گہرا منہ اور معدہ ایک ہیں بلکہ ان کی پوری شخصیت ایک پیٹ نظر آتی ہے۔ اس طرح بہت گہرے غاروں جیسے منہ پوری گہرائی تک بالکل سیاہ ہیں۔ گویا کناروں سے باہر پھیلی ہوئی تاریکی پیٹ بھر کے پھانک گئے ہوں اور ان کی پوری شخصیتیں محض پیٹ ہوں۔ ان کے کھلے منہ اور بند آنکھیں کافی دیر تک ہنسنے کے پوز پہ قائم رہتے ہیں۔ مگر کوئی آواز نہیں ابھرتی اور پھر مگر مچھ کے جبڑوں کی طرح کھٹاک سے بند ہو جاتے ہیں۔ ایک لے، ایک تال۔ چیونٹیوں کی طرح پھیلے ہوئے لوگ اپنی رفتار پر چلتے رہتے ہیں۔ بچی کے چہرے کے نقوش وہی مائیٔ صورت اور اس کے ننھے پاؤں وہی مجنونانہ چال اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک بڑی موٹی بوڑھی سی عورت بھاری بوجھ تلے دبے خچر کی طرح ہانپتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔ اس کا دایاں بازو کندھے سے غائب ہے اور اس کے بائیں ہاتھ میں چھوٹی سی چھڑی ہے اور دو جوان عورتوں کو آگے لگائے بھیڑوں کی طرح ہانک رہی ہے

وہ تینوں جب بچی کے قریب پہنچتی ہیں تو موٹی عورت پھولی سانس سنبھالتے ہوئے پوچھتی ہے "ارے تم اکیلی ہو۔ تمہارا رکھوالا کدھر ہے؟ کل پہ بچے اور جوان عورتیں بغیر رکھوالوں کے نہیں گھوما کرتے۔"

میرا تو کوئی رکھوالا نہیں ایک باپ تھا وہ بغیر کچھ پیچھے چھوڑے اُدھر کو دگیا (بنا دلی سی روتی شکل بناتی ہے) ہائے اگر وہ پیچھے بہت سا مال چھوڑ جاتا تو کتنا مزا آتا۔ (تصور میں محسوس کرتی ہے جیسے واقعی بہت سے مال کی وارث۔ بن گئی ہو اور ایک چمکدار سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل جاتی ہے)

"پیچھے اگر مال نہیں چھوڑا گیا تو کیا ہوا۔ تمہارا آخر کوئی باپ تو تھا۔ اب تمہیں نقلی چوکیدار آنکھیں تو نہیں دکھا سکتے۔ لوگ تمہارا مذاق تو نہیں اڑا سکتے۔ ان بیچاریوں کا تو کوئی باپ ہی نہیں تھا۔ ہر وقت نقلی چوکیداروں سے چھپتی پھرتی ہیں کیسی لڑکیو!"

دونوں جوان عورتیں جس طرح خاموش کھڑی تھیں کھڑی رہتی ہیں۔ صرف ان کے ماتھوں پر لہریں نمایاں ہو جاتی ہیں اور پگھلی موم جیسی جلدیں دھنس دو دو روشن آنکھیں بیقراری سے ایک مرتبہ ادھر اُدھر گھومتی ہیں کہ کوئی بانس والا تو قریب نہیں ہے۔

"میرا باپ کہہ گیا تھا نقلی چوکیداروں کا احترام کرنا۔ میں دو دن سے ٹماٹر جیسے گالوں والے سے کھانا مانگ رہی ہوں۔ وہ اپنے سفید سفید دانت نکوسے آنکھیں موندے ہنستا رہا ہے۔ یہ نقلی چوکیدار کیا کر سکتے ہیں؟"

"ہشش..... ششش.... ششش۔ آہستہ بولو۔ کوئی سن لے گا تو آفت آ جائے گی۔ یہ نقلی چوکیدار ہم جیسوں کے لئے مصیبت کھڑی کر سکتے ہیں، کھانا نہیں دے سکتے۔"

"دو جوان عورتوں میں سے ایک دفعتاً پُل کے جنگلے کی جانب چل پڑتی ہے۔ دوسری پوچھتی ہے "دادی! کیوں؟"

وہ مڑ کے جواب دیتی ہے "نہیں نہیں معلوم۔ مجھے پُرانا آتشک ہے۔"

"اچھا اچھا..... لیکن سنو احتیاط کرنا، کہیں ادھر دوسری طرف کی مخلوق کو بیمار نہ کر دینا۔" سب منہ خاموش سیاہ ہنسی کے لئے کھلتے ہیں۔

بچی کے توسیں اُبھر آتی ہیں۔ کولیے گول اور گداز ہو جاتے ہیں۔ موٹی عورت ایک تھیلے میں سے ڈگڈگی نکالتی ہے اور [illegible] بجانا شروع کر دیتی ہے اور ہانک لگاتی ہے ـــــــ "دیکھو دیکھو۔ تازہ ککڑی کی

کی مانند نرم و نازک ۔"

بچی اپنے سر پر تیزی سے ڈگڈگی بجاتے ہوئے ہاتھ کو گردن اونچی کر کے دیکھتی ہے جیسے چڑیا پانی پی رہی ہو۔ جوان عورت اسے بتاتی ہے: "یہ ڈگڈگی تو اب یونہی ہر روز بجتی رہے گی ۔ گھبراؤ نہیں کچھ ایسی مشکل نہیں ۔ ہر عورت کے لئے یہ ایک بہت سیدھا سادھا سا کام ہے جیسے سانس لینا، باتیں کرنا ۔"

لوگ حلقہ بنا کے کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ ان میں سے کئی آدمی بار بار چونک کے ادھر اُدھر دیکھتے ہیں موٹی عورت ان کی گھبراہٹ بھانپ لیتی ہے: "ڈرو نہیں ۔ اطمینان سے کھڑے رہو ۔ یہاں کوئی نقلی چوکیدار نہیں آسکتا ۔ میں نے سب سے معاملہ طے کر رکھا ہے ۔"

ایک موٹی سی تو ند جو بچی کو کھا جانے والی نظروں سے تک رہی ہے پوچھتی ہے: "وہ چڑھی مونچھوں اور لمبے ڈنڈے والا نقلی چوکیدار جس کے سر کے پیچھے ترازو لٹک رہی ہوتی ہے کہیں وہ ......"

موٹی اس کی بات کاٹتے ہوئے بڑی حقارت سے کہتی ہے: "بہت نیرے کی ۔ اس سے ڈرنا ہے تو مال نکال وہ تو میرے گھر کا آدمی ہے ۔ میں نے اس کے ترازو کے دونوں پلڑوں میں برابر کا سونا ڈال رکھا ہے"

جوان عورت بچی پر پڑنے والی حریصانہ نظروں کو اپنے ہونٹوں پہ زہر خند پھیلائے بڑے حسد سے تک رہی ہے ۔ تو ند جیب میں ہاتھ ڈالتی ہے ۔ ضرب کے نشان میں لپٹا ہوا ایک سنہری کھوپڑی والا چند پرچیاں نیچے ان حلقہ بنائے کھڑے لوگوں پہ پھینکتا ہے ۔ ہوا میں لہراتی ڈولتی پرچیاں ان پہ برف کے گالوں کی طرح گرتی ہیں ۔ ایک پرچی موٹی عورت کے پاؤں میں آگرتی ہے ۔ وہ لحظہ بھر کے لئے ڈگڈگی روک کے پرچی اٹھاتی ہے اس پہ لکھا ہوتا ہے "بری بات ۔" وہ گردن اٹھا کے سنہری کھوپڑی والے کی جانب دیکھتی ہے ۔ پھر اپنے تھرتھراتے پیٹ پر سے کپڑا اٹھا کے دانتوں میں پکڑ لیتی ہے اور اس پہ زور زور سے ہاتھ مارتی ہے ۔ پھر پھونک مار کے پرچی سنہرے سر والے کی جانب اڑا دیتی ہے ۔ اس کی نقل میں سب لوگ پرچیاں پھونک مار کے اسی جانب کو اڑا دیتے ہیں ۔ تمام کی تمام پرچیاں واپس سنہری کھوپڑی والے کے پاس پہنچ جاتی ہیں ۔ وہ نیچے دیکھنا بند کر کے پھر خلاؤں میں گھورنا شروع کر دیتا ہے ۔ مجمع جنونانہ انداز میں چلتا رہتا ہے ۔ نقلی چوکیدار اپنے اپنے بانسوں پر پھدکتے رہتے ہیں ۔ ڈگڈگی بجتی رہتی ہے ۔ ٹانگ ٹکتی رہتی ہے ۔

ایک دھماکے کی آواز ہوتی ہے اور ایک شخص کی کھوپڑی میں سے بھاپ کا کئی سو فٹ بلند فوارہ شوں شاں

کا بے پناہ شور مچاتا ہوا اُبل پڑتا ہے۔ اس کی گردن میں تناؤ پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ بھاپ کے بادل اس کی کھوپڑی کے سوراخ میں سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے اُمڈ اُمڈ کے نکلے چلے آ رہے ہیں۔ اس کی گردن تنتے تنتے اب اس قدر تن چکی ہے کہ اس کی ٹھوڑی اس کے سینے میں گڑ گئی ہے اس کے نتھنوں اور منہ سے شعلے نکل رہے ہیں۔ اِدھر اُدھر کے لوگوں کو کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ وہ حیرت زدہ بھاپ کے پھیلتے ہوئے بادل کو دیکھ رہے ہیں جس میں پہلے دُھواں اگلتی چمنیاں نمودار ہوتی ہیں پھر کوٹھیوں بنگلوں کی قطاریں پھر رنگا رنگ کاریں، پھر ایک چہرہ، نسوانی چہرہ، ہنستا مسکراتا ہوا چہرہ، سرخ ساڑھی کا پلو سر پر جائے شرماتا لجاتا ہوا پیارا پیارا چہرہ نظر آتا ہے وہ شخص اس قدر شدت سے لرزتا ہے جس طرح طیارہ رن وے پر دوڑ شروع کرنے سے پہلے ایک بار لرزتا ہے۔ کچھ من چلے بڑے بڑے پتھر لا کے اس کی راہ میں ڈال دیتے ہیں۔ کچھ لکڑی کی گیلیوں سے اس کی راہ میں بند مارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کئی بانس والے اس کے ارد گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ ان کے چہروں پر ہر قسم کے خوفناک نقلی چوکیداروں کی تصویریں چپکی ہوئی ہیں۔ لوگ دہشت زدہ ہو کے جھک جاتے ہیں۔ یہ حملہ آور جنگلی سور کی طرح آگے بڑھ کے ان کے چہروں سے تصویریں نوچ کے اپنے جسم پہ چپکا لیتا ہے اور اپنی پشت، بازوؤں، ٹانگوں پر جہاں جگہ ملتی ہے چپکاتا چلا جاتا ہے۔ لوگ دہشت زدہ جھکے رہتے ہیں۔ بانس والے اپنی دال گلتی نہ دیکھ کر کھسیانی ہنسی ہنسنا شروع کر دیتے ہیں اور پھر ٹماٹر جیسے گالوں والے نقلی چوکیدار کی تصویریں نکال کر اپنے چہروں پر چپکاتے ہوئے اس کی راہ چھوڑ کے اِدھر اُدھر کھسک جاتے ہیں راستے کے پتھر لڑھکتے ہوئے دور جا گرتے ہیں اور بند ٹوٹ جاتے ہیں۔ وہ اپنی ناک کی سیدھ میں ایک دم چھوٹ پڑتا ہے۔ سینکڑوں آدمی اس کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔ ہزاروں آدمی اس کے پاؤں تلے کچلے جاتے ہیں۔ کئی ماں باپ اپنی بچیوں کے ہاتھ چھوڑ کے جنگلے کے ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک لے، ایک تال۔ بے پناہ ہجوم کلبلاتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

پُل پر ان گنت مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ مردوں کا بایاں بازو عورتوں کے دائیں بازو کے ساتھ اس طرح جکڑا ہوا ہے کہ دونوں بازو ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل کے ایک ہی بازو کا تصور پیش کرتے ہیں۔ ان جوڑوں میں کئی عورتیں مردوں کو اور کئی مرد عورتوں کو اپنے ساتھ گھسیٹتے ہوئے لئے جا رہے ہیں۔ گھسٹنے والا ساتھی واویلا مچا رہا ہے۔ اپنے اجاڑ گھونسلے جیسے بال نوچتا ہے۔ ہر کسی کو مخاطب کر کے اپنی داستانِ درد سنانا چاہتا ہے مگر ان کی آہ و فغاں پر کوئی کان نہیں دھرتا۔ جوڑوں کی اس قابلِ رحم حالت

کے باوجود ننھے جوڑوں کے جھنڈ کے جھنڈ بانس والوں کے پاس جاتے ہیں۔ مرد دائیں ہاتھ سے اور عورت بائیں ہاتھ سے بانس کو تھام کر اپنا اپنا دوسرا بازو بانس والے کی جانب بڑھا دیتے ہیں۔ بانس والا پہلے جیب سے ایک ایسے نقلی چوکیدار کی تصویر نکال کے منہ پہ چپکاتا ہے جس کے کان گدھے کی طرح لمبے ہیں اور چہرہ دہکتی ہوئی آگ کی طرح سرخ ہے۔ اس کے چہرے پہ شرارت بھری مسکراہٹ پھیلی ہوئی ہے۔ آنکھ مارنے کے انداز میں ایک آنکھ اس طرح میچی ہوئی ہے جیسے شیطان نے فرشتوں کی طرف دیکھ کے اس وقت میچی ہوگی جب آدم نے حوا کے کہنے پر گندم کا پہلا دانہ چکھا تھا۔ دو زانو جوڑوں کے بازوؤں کو بانس والا رسی بٹنے کے طریق پہ بٹتا ہے۔ جب وہ بٹ کر یک جان ہوجاتے ہیں تو انہیں چھوڑ دیتا ہے۔ چہرے سے تصویر اتار کر جیب میں ڈالتا ہوا اپنی راہ لیتا ہے اور جوڑا ہجوم میں شامل ہوجاتا ہے۔ کچھ لوگ پل بھر کے لئے تالی بجاتے ہیں اور چل دیتے ہیں کچھ جوڑے ایک دوسرے سے بیزار منہ دوسری طرف پھیرے چپ چاپ چلے جاتے ہیں۔ کوئی اچھل کود نہیں کرتے۔ کوئی ہنگامہ نہیں مچاتے لیکن ہر ساتھی دوسری جنس کے گزرنے والوں میں سے کسی کسی کو ہاتھ کی اوٹ بنا کر اپنے ساتھی سے منہ چھپاتے ہوئے ایک آدھ مچلتی ہوئی مسکراہٹ پھینک کے اس کا دل للچاتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ ایک مرد کی پیٹھ پر ایک بہت بڑا مٹکا بندھا ہوا ہے۔ وہ اس قدر بوجھل ہے کہ اس کی پتلی پتلی ٹانگیں اس کے بوجھ تلے مستقل کانپتی رہتی ہیں اور ہر ہر قدم پہ اس کے پاؤں لڑکھڑا جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ بندھی ہوئی عورت بھی اس کی لڑکھڑاہٹ کے ساتھ طوفان میں پھنسی کشتی کی طرح ڈولتی ہے۔ عورت کی پیٹھ پہ دو بچیاں سوار ہیں۔ وہ فارغ ہاتھ سے انہیں بھی سنبھالنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ ڈولتے ڈولتے عورت اس سے کہتی ہے "یہ مٹکا اتار دو، یہ بوجھ بہت بھاری ہے۔ کون زیادہ دیر تک مٹکے کو اٹھائے پھر سکتا ہے۔ خود بھی گر پڑو گے اور ہمیں بھی گرا دو گے"۔

وہ بھڑک کے کہتا ہے "کیوں نہیں اٹھا سکتا؟" پھر وہ بدن کو ایک جھٹکا دیتا ہے اور مٹکے میں سے کچھ پانی اس کے سر پر آن گرتا ہے جس سے اس کے پھنوں کی صورت میں اٹھتے ہوئے بال گیلے ہو کے اس کے سر کے ساتھ چپک جاتے ہیں اور اس کے چہرے پر ایک احمقانہ مسکراہٹ پھیل جاتی ہے اور اپنے گردوپیش سے لاتعلق ہو کر یونہی سامنے گھورنا شروع کر دیتا ہے اور لڑکھڑاہٹ شدید تر ہوجاتی ہے۔ عورت کی چیخ و پکار کوئی نہیں سنتا۔ جب وہ ذرا سنبھلتا ہے تو عورت کہتی ہے "تم تو اس کے بوجھ تلے دب کے ادھ موئے ہو جاؤ گے لیکن ہماری کتنی بدنامی ہوگی۔ خدا کے لئے یہ مٹکا اتار دو"۔

"یعنی میں کچھ نہیں ہوں؟ میری ہستی کوئی چیز نہیں ہے؟ اور اگر ہے تو صرف اتنی کہ یہ تمہارے لئے کتنی نیک نامی اور کتنی بدنامی کا باعث بنتی ہے؟"

"اور نہیں تو کیا تم سمجھتے ہو کہ کوئی ہستی دوسروں کے لئے اس سے زیادہ معنی بھی رکھتی ہے۔ اگر نقلی چوکیداروں کا خوف نہ ہوتا اور جگ ہنسائی کا ڈر نہ ہوتا تو میں کبھی کی بازو چھوڑ چکی ہوتی۔ حالانکہ ہم ایک دوسرے کے لئے قطعی اجنبی ہیں، اس کے باوجود میں تمہارے ساتھ کیوں ڈولتی پھرتی ہوں؟"

"مجھے یقین تھا کہ تم ایک نہ ایک دن اس ازلی سچائی کو ضرور پا لوگی۔ میں یہ سب کچھ اپنی زبان سے کہہ کے تمہیں رنجیدہ نہ کرنا چاہتا تھا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ زندگی میں پہلی بار ہم کسی بات پر متفق تو ہوئے ہیں۔ افوہ میں کتنا تنہا ہوں۔ اتنا تنہا کہ میرے کانوں میں خاموشیاں شائیں شائیں کرتی ہیں۔ ہم اتنے تنہا کیوں نہ ہوں؟ ہم ایک دوسرے سے قطعی اجنبی کیوں نہ رہیں؟ جب کہ ہماری روحیں اور جسم آپس میں اجنبی ہیں اور ایک دوسرے سے قطعی الگ الگ ہیں۔ ان کی ابتدا مختلف، ان کی انتہا مختلف۔ ہم سب تنہا ہیں۔ ہم سب ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں۔ ہم سب کیوں اپنے اپنے مٹکے نہیں اٹھا لیتے۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم تنہائی کی چبھن تو ذرا کند ہو جاتی ہے۔ آؤ ہم الگ الگ ہو جائیں۔ اگرچہ ہم دونوں کو اپنی بقایا عمروں کے لئے ایک ایک بازو سے محروم ہونا پڑے گا۔ لیکن قیمت کچھ ایسی زیادہ نہیں۔ زور لگاؤ۔"

دونوں خوب زور لگاتے ہیں۔ کئی بانسوں والے نقلی چوکیداروں کے چہرے لگا کے ان کے اردگرد موجود ہوتے ہیں۔ لوگ دور کھڑے ہنستے رہتے ہیں مگر وہ ان سب سے بے پرواہ زور لگاتے رہتے ہیں اور آخر الگ ہو جاتے ہیں لیکن ان کا ایک ایک بازو کندھے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اکھڑ جاتا ہے۔ مرد زور سے مٹکا ہلاتا ہے اس کا تمام بدن پانی میں شرابور ہو جاتا ہے۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا کچھ دور جاتا ہے اور پھر جنگلے کی جانب مڑ جاتا ہے عورت دونوں بچیوں کو کھڑا کر کے ان کے سر پر ڈگڈگی بجانا شروع کر دیتی ہے اور ہانک لگاتی ہے "تازہ ککڑیوں کی مانند نرم و نازک۔"

ہجوم چلتا رہتا ہے۔ نقلی چوکیدار بانسوں پر پھدکتے رہتے ہیں۔ سنہرے سر سوچتے رہتے ہیں۔ ڈگڈگی بجتی رہتی ہے اور ہانک لگتی رہتی ہے "تازہ ککڑیوں کی مانند نرم و نازک ــــ تازہ ککڑیوں کی مانند نرم و نازک۔"

زرد کتا

انتظار حسین

ایک چیز لومڑی کا بچہ ایسی اس کے منہ سے نکل پڑی۔ اس نے اسے دیکھا اور پاؤں کے نیچے ڈال کر روندنے لگا مگر وہ جتنا روندتا تھا اتنا وہ بچہ بڑا ہوتا جاتا تھا۔

جب آپ یہ واقعہ بیان فرما چکے تو میں نے سوال کیا: یا شیخ لومڑی کے بچہ کی رمز کیا ہے اور اس کے روندے جانے سے بڑے ہونے میں کیا بھید مخفی ہے؟ تب شیخ عثمان کبوتر نے ارشاد فرمایا کہ لومڑی کا بچہ تیرا نفس امارہ ہے تیرا نفس امارہ جتنا روندا جائے گا موٹا ہوگا۔ میں نے عرض کیا:

یا شیخ اجازت ہے؟

فرمایا: اجازت ملی۔ اور پھر وہ اڑ کر املی کے پیڑ پہ جا بیٹھے۔ میں نے وضو کیا اور قلمدان اور کاغذ لے کر بیٹھا، اے ناظرین! یہ ذکر میں بائیں ہاتھ سے قلمبند کرتا ہوں کہ میرا دایاں ہاتھ دشمن سے مل گیا۔ اور وہ لکھنا چاہتا ہے جس سے میں پناہ مانگتا ہوں اور شیخ ہاتھ سے پناہ مانگتے تھے۔ اور اسے کہ آدمی کا رفیق و مددگار ہے، آدمی کا دشمن کہتے تھے۔ میں نے ایک روز یہ بیان سن کر عرض کیا۔

یا شیخ تفسیر کی جائے۔ تب آپ نے شیخ ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ سنایا جو درج ذیل کرتا ہوں۔

شیخ ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ کے گھر میں تیسرا فاقہ تھا۔ ان کی زوجہ سے ضبط نہ ہو سکا اور انہوں نے شکایت کی تب شیخ ابوسعید باہر نکلے اور سوال کیا۔ سوال پر جو انہوں نے پایا وہ لے کر اٹھتے تھے کہ کوتوالی والوں نے انہیں جیب تراشی کے جرم میں گرفتار کر لیا اور سزا کے طور پر ایک ہاتھ قلم کر دیا۔ آپ وہ ترشا ہوا ہاتھ اٹھا کر گھر لے آئے۔ اسے سامنے رکھ کر رویا کرتے تھے کہ اے ہاتھ تو نے طمع کی اور تو نے سوال کیا۔ سو تو نے اپنا انجام دیکھا۔

یہ قصہ سن کر میں عرض پرداز ہوا یا شیخ اجازت ہے؟ اس پر آپ خاموش ہوئے۔ پھر فرمایا۔

اے ابوالقاسم خضری، لفظ تکریم ہیں اور لکھنا عبادت ہے۔ پس وضو کر کے دو زانو بیٹھ اور جیسا بیتا ویسا رقم کر

آپ نے کلام پاک کی یہ آیت تلاوت کی:

پس افسوس ہے ان کے لئے بوجہ اس کے جو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا اور افسوس ہے ان کے لئے بوجہ اس کے جو کچھ وہ اس سے کماتے ہیں۔

اور یہ آیت پڑھ کر آپ ملول ہوئے۔ میں نے سوال کیا۔ یا شیخ یہ آیت آپ نے کیوں پڑھی؟ اور پڑھ کر ملول کس باعث ہوئے؟ اس پر آپ نے آہ سرد بھری اور احمد حجری کا قصہ سنایا جو من و عن نقل کرتا ہوں۔

احمد حجری اپنے وقت کے بزرگ شاعر تھے مگر ایک دفعہ ایسا ہوا کہ شہر میں شاعر بہت ہو گئے۔ امتیاز ناقص و کامل مٹ گیا اور ہر شاعر خاقانی اور انوری بننے لگا۔ قصیدہ لکھنے لگا۔ احمد حجری نے یہ حال دیکھ شعر گوئی ترک کی اور شراب بیچنی شروع کر دی۔ ایک گدھا خریدا کر شراب کے گھڑے اس پر لاد کر بازار جاتے تھے اور انہیں فروخت کرتے تھے۔ لوگوں نے بہت انگلیاں اٹھائیں کہ احمد گمراہ ہوا۔ کلام پاکیزہ سے گزر کر شراب کا سوداگر ہوا۔ انہوں نے لوگوں کے کہنے پر مطلق کان نہ دھرا اور اپنے مشغلے سے لگے رہے۔ مگر ایک روز ایسا ہوا کہ گدھا ایک موڑ پر آ کر اڑ گیا۔ انہوں نے اسے چابک رسید کیا تو اس گدھے نے انہیں مڑ کر دیکھا اور ایک شعر پڑھا۔ جس میں تجنیس لفظی استعمال ہوئی تھی اور مضمون یہ تھا کہ میں دوراہے پر کھڑا ہوں۔ احمد کہتا ہے چل، احد کہتا ہے مت چل۔ احمد حجری نے یہ سن کر اپنا گریبان پھاڑ ڈالا اور آہ کھینچ کر کہا کہ اس زمانے کا برا ہو کہ گدھے کلام کرنے لگے اور احمد حجری کی زبان کو تالا لگ گیا۔ پھر انہوں نے گدھے کو آزاد کر کے شہر کی سمت ہنکا دیا اور خود بیابانوں میں نکل گئے۔ وہاں عالم دیوانگی میں درختوں کو خطاب کر کے شعر کہتے تھے اور ناخن سے پتھروں پر کندہ کرتے تھے۔

یہ واقعہ سنا کر شیخ خاموش ہو گئے اور دیر تک سر نیوڑھائے بیٹھے رہے۔ پھر میں نے عرض کیا۔ یا شیخ آیا درخت کلام سماعت کرتے ہیں۔ درآنحالیکہ وہ بے جان ہیں۔ آپ نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا، پھر فرمایا۔ زبان کلام کے بغیر نہیں رہتی۔ کلام سامع کے بغیر نہیں رہتا۔ کلام کا سامع آدمی ہے پر آدمی کی سماعت جاتی رہے تو جو سامعہ سے محروم ہیں انہیں سامعہ مل جاتا ہے کہ کلام سامع کے بغیر نہیں رہتا۔ پھر شیخ نے سید علی الجزائری کا قصہ بیان فرمایا۔ ملاحظہ ہو۔

سید علی الجزائری اپنے زمانے کے نامی گرامی شعلہ نفس خطیب تھے پر ایک زمانہ ایسا آیا کہ انہوں نے خطاب کرنا یکسر ترک کر دیا اور زبان کو تالا دے لیا۔ تب لوگوں میں بے چینی ہوئی۔ بے چینی بڑھی تو لوگ ان کی خدمت میں عرض پرداز ہوئے کہ خدارا خطاب فرمائیے۔ انہوں نے فرمایا کہ اچھا ہمارا منبر قبرستان میں رکھا جائے۔ اس نرالی ہدایت پر لوگ متعجب ہوئے۔ خیر منبر قبرستان میں رکھ دیا گیا۔ وہ قبرستان میں گئے اور منبر پر چڑھ کر ایک بلیغ خطبہ دیا۔ اس کا عجب اثر ہوا کہ قبروں سے درود کی صدا بلند ہوئی۔ تب سید علی الجزائری نے آبادی کی طرف رخ کر کے گلوگیر آواز میں کہا۔ اے شہر تجھ پر خدا کی رحمت ہو۔

تیرے جیسے لوگ بہرے ہوگئے اور تیرے مردوں کو سماعت مل گئی۔ یہ فرما کر وہ اس قدر روئے کہ داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ اور اس کے بعد انہوں نے بستی سے کنارہ کیا اور قبرستان میں رہنے لگے، جہاں وہ مردوں کو خطبہ دیا کرتے تھے۔

یہ قصہ سن کر میں نے استفسار کیا، یا شیخ زندوں کی سماعت کب ختم ہوتی ہے۔ اور مردوں کو کب کان ملتے ہیں؟

اس پر آپ نے ٹھنڈا سانس بھرا اور فرمایا۔

یہ اسرارِ الٰہی ہیں۔ بندوں کو راز فاش کرنے کا اذن نہیں۔ پھر وہ پھڑپھڑا کر اڑے اور املی کے درخت پر جا بیٹھے۔ جاننا چاہیے کہ شیخ عثمان کبوتر پرندوں کی طرح اڑا کرتے تھے اور اس گھر میں ایک املی کا پیڑ تھا کہ جاڑے، گرمی، برسات شیخ اسی کے سائے میں مشغول ذکر رہتے۔ چھت کے نیچے بیٹھنے سے حذر تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ ایک چھت کے نیچے دم گھٹا جاتا ہے، دوسری چھت برداشت کرنے کے لئے کہاں سے تاب لائیں! یہ سن کر سید رضی پر وجد طاری ہوا اور اس نے اپنا گھر منہدم کر دیا اور ٹاٹ پہن کر املی کے نیچے آ پڑا۔ سید رضی، ابومسلم بغدادی، شیخ حمزہ، ابوجعفر شیرازی، حبیب بن یحییٰ ترمذی اور یہ بندہ حقیر شیخ کے مریدانِ فقیر تھے۔ میرے سوا باقی پانچوں مردانِ باصفا تھے اور فقر و قلندری ان کا مسلک تھا۔ شیخ حمزہ تجرد کی زندگی بسر کرتے تھے اور بے چھت کے مکان میں رہتے تھے۔ وہ شیخ کی تعلیم سے متاثر تھے اور کہتے تھے کہ چھت کے نیچے رہنا شرک ہے۔ چھت ایک ہے کہ وحدہٗ لاشریک ہے ساں سے۔ بندوں کو زیب نہیں کہ چھت کے مقابل چھت پاٹیں۔ ابومسلم بغدادی صاحب مرتبہ باپ کا بیٹا تھا۔ پھر گھر چھوڑ کر باپ سے ترکِ تعلق کر کے یہاں آ بیٹھا تھا اور کہا کرتا تھا کہ مرتبہ حقیقت کا حجاب ہے۔ ابوجعفر شیرازی نے ایک روز ذکر میں اپنا لباس تار تار کر دیا اور چٹائی کو نذرِ آتش کر دیا۔ اس نے کہا کہ چٹائی مٹی اور مٹی کے درمیان فاصلہ ہے اور لباس مٹی کو مٹی پر فوقیت دیتا ہے۔ اور اس روز سے وہ ننگ دھڑنگ خاک پر بسیرا کرتا تھا۔ اور ہمارے شیخ، کہ خاک ان کی مسند اور اینٹ ان کا تکیہ تھی۔ املی کے تنے کے سہارے بیٹھتے تھے اور اس عالمِ سفلی سے بلند ہو گئے تھے۔ ذکر کرتے کرتے اڑتے، کبھی دیوار پر کبھی املی پر جا بیٹھتے کبھی اونچا اڑ جاتے اور فضا میں کھو جاتے۔ میں نے ایک روز استفسار کیا۔

یا شیخ قوتِ پرواز آپ کو کیسے حاصل ہوئی؟ فرمایا۔

عثمان نے طمعِ دنیا سے منہ موڑ لیا اور پستی سے اوپر اٹھ گیا۔ عرض کیا، یا شیخ طمعِ دنیا کیا ہے؟

فرمایا: طمعِ دنیا تیرا نفس ہے۔ عرض کیا: نفس کیا ہے؟ اس پر آپ نے یہ قصہ سنایا۔

شیخ ابوالعباس اشقانی ایک روز گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا ایک زرد کتا ان کے بستر میں سو رہا ہے۔ انہوں نے قیاس کیا کہ شاید محلہ کا کوئی کتا اندر گھس آیا ہے۔ انہوں نے اسے نکالنے کا ارادہ کیا مگر وہ ان کے دامن میں گھس

کر غائب ہو گیا

ہی یسن کو عرض پرداز ہوا۔

یا شیخ زردی کیا ہے؟ فرمایا:

زردی تیرا نفس ہے۔ میں نے پوچھا۔ یا شیخ نفس کیا ہے؟ فرمایا۔

نفس طمع دنیا ہے۔ میں نے سوال کیا۔ یا شیخ طمع دنیا کیا ہے؟ فرمایا۔

طمع دنیا پستی ہے۔ میں نے استفسار کیا۔ یا شیخ پستی کیا ہے؟ فرمایا۔

پستی علم کا فقدان ہے۔ میں ملتجی ہوا۔ یا شیخ علم کا فقدان کیا ہے؟ فرمایا:

دانش مندوں کی ہنسات۔ میں نے کہا۔ یا شیخ تفسیر کی جائے۔ آپ نے تفسیر بصورت حکایت فرمائی کو نقل کرتا ہوں۔

پرانے زمانے میں ایک بادشاہ بہت سخی مشہور تھا۔ ایک روز اس کے دربار میں ایک شخص کہ دانش مند جانا جاتا تھا، حاضر ہو کر عرض پرداز ہوا کہ جہاں پناہ دانش مندوں کی بھی قدر چاہیئے۔ بادشاہ نے اسے خلعت اور ساٹھ اشرفیاں دے کر بعد عزت رخصت کیا۔ اس خبر نے اشتہار پایا۔ ایک دوسرے شخص نے، کہ وہ اپنے آپ کو دانشمند جانتا تھا، دربار کا رخ کیا اور بامراد پھرا۔ پھر تیسرا شخص، کہ اپنے آپ کو ابنِ دانش کے زمرہ میں شمار کرتا تھا، دربار کی طرف چلا اور خلعت لے کر واپس آیا۔ پھر تو ایک تانتا بندھ گیا۔ جو جو اپنے آپ کو دانش مند گردانتے تھے جوق در جوق دربار میں پہنچتے تھے اور انعام لے کر واپس آتے تھے۔

اس بادشاہ کا وزیر بہت عاقل تھا۔ دانش مندوں کی یہ ریل پیل دیکھ کر اس نے ایک روز سرِ دربار ٹھنڈا سانس بھرا۔ بادشاہ نے اس پر نظر کی اور پوچھا کہ تو نے ٹھنڈا سانس کس باعث بھرا؟ اس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔

جہاں پناہ اجان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔

فرمایا! امان ملی۔ تو تب اس نے عرض کیا: خداوند نعمت تیری سلطنت دانشمندوں سے خالی ہے۔

بادشاہ نے کہا۔ کمال تعجب ہے۔ تو روزانہ دانشمندوں کو یہاں آتے اور انعام پاتے دیکھتا ہے اور پھر بھی ایسا کہتا ہے۔

عاقل وزیر تب یوں گویا ہوا کہ اے آقائے ولی نعمت گدھوں اور دانش مندوں کی ایک مثال ہے کہ جہاں سب گدھے ہو جائیں وہاں کوئی گدھا نہیں ہوتا اور جہاں سب دانش مند بن جائیں وہاں کوئی دانش مند نہیں رہتا۔

یہ حکایت سننے کے بعد میں نے سوال کیا: ایسا کب ہوتا ہے کہ سب دانش مند بن جائیں اور کوئی دانش مند

نہ رہے؛ فرمایا، جب عالم اپنا علم چھپائے۔ سوال کیا کہ یا شیخ! عالم اپنا علم کب چھپاتا ہے؟ فرمایا۔ جب جاہل عالم اور عالم جاہل قرار پائیں۔ سوال کیا کہ جاہل عالم اور عالم جاہل کب قرار پاتے ہیں۔ جواب میں آپ نے ایک حکایت بیان فرمائی جو اس طرح ہے۔

ایک نامور عالم کو تنگ دستی نے بہت ستایا تو اس نے اپنے شہر سے دوسرے شہر ہجرت کی۔ اس دوسرے شہر میں ایک بزرگ رہتے تھے۔ انہوں نے اکابرین شہر کو خبر دی کہ فلاں دن، فلاں گھڑی ایک عالم اس شہر میں وارد ہوگا۔ اس کی توضیع کرنا اور خود سفر پر روانہ ہوگئے۔ اکابرین شہر مقررہ وقت پر بندرگاہ پہنچے۔ اسی وقت ایک جہاز آ کر رکا۔ اس میں وہی عالم سفر کر رہا تھا۔ مگر ایک موچی بھی اس کا ہمسفر بن گیا تھا وہ موچی حرام خور اور کاہل مزاج تھا۔ اس نے اس عالم کو سیدھا سادا دیکھ کر اپنا سامان ان پر لاد دیا اور چھڑی چھانٹ ہوگیا۔ جب جہاز سے دونوں اترے تو ایک ٹاٹ کے کرتے میں ملبوس کفش سازی کے سامان سے لدا پھندا تھا، اس پر کسی نے توجہ نہ دی اور دوسرے کو عزت و احترام سے اتارا اور ہمراہ لے گئے۔

وہ بزرگ جب سفر سے واپس آئے تو دیکھا کہ سڑک کے کنارے ایک شخص، جس کے چہرے پر علم و دانش کا نور عیاں ہے، جوتیاں گانٹھ رہا ہے۔ آگے گئے تو دیکھا کہ اکابرین و عمائدین کی ایک مجلس آراستہ ہے اور ایک بے بصیرت مسائل بیان کر رہا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ بزرگ سر سے پاؤں تک کانپ گئے اور بولے۔

اے شہر تیرا برا ہو، تو نے عالموں کو موچی اور موچیوں کو عالم بنا دیا۔ پھر خود کفش سازی کا سامان خریدا اور اس عالم سے قریب ایک کوچے میں جوتیاں گانٹھنے بیٹھ گئے۔

یہ حکایت میں نے سنی اور سوال کیا۔ یا شیخ عالم کی پہچان کیا ہے؟

فرمایا! اس میں طمع نہ ہو۔

عرض کیا: طمع دنیا کب پیدا ہوتی ہے؟

فرمایا، جب علم گھٹ جائے۔

عرض کیا؛ علم کب گھٹتا ہے؟

فرمایا۔ جب درویش سوال کرے، شاعر غرض رکھے، دیوانہ ہوش مند ہو جائے، عالم تاجر بن جائے، دانشمند منافع کمائے۔ عین اسی وقت ایک شخص صحن میں یہ شعر پڑھتا ہوا گزرا؛

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

آپ نے اسے پکار کر کہا۔

اے فلانے یہ شعر پھر پڑھو، اس نے وہ شعر پھر پڑھا۔ پھر آپ پر مراقبے کا عالم طاری ہوگیا اور جب آپ نے سر اٹھایا تو یہ حکایت بیان فرمائی۔

ایک شہر میں ایک منعم تھا۔ اس کی سخاوت کی بہت دھوم تھی۔ اس شہر میں ایک درویش، ایک شاعر، ایک عالم اور ایک دانشمند رہتا تھا۔ درویش پر ایک ایسا وقت آیا کہ اس پر تین دن فاقے میں گزر گئے۔ تب وہ منعم کے پاس جاکر سوالی ہوا اور منعم نے اس کا دامن بھر دیا۔ عالم کی بیوی نے درویش کو خوش حال دیکھا تو شوہر کو طعنے دینے شروع کئے کہ تمہارے علم کی کیا قیمت ہے! تم سے تو وہ درویش اچھا ہے کہ منعم نے اس کا دامن دولت سے بھر دیا ہے۔ تب عالم نے منعم سے سوال کیا اور منعم نے اسے بھی بہت انعام و اکرام دیا۔ دانش مند ان دنوں بہت مقروض تھا۔ اس نے درویش اور منعم کو امیر کے در سے کامراں آتے دیکھا تو وہ بھی وہاں جا پہنچا اور اپنی حاجت بیان کی۔ منعم نے اسے خلعت بخشی اور عزت سے رخصت کیا۔ شاعر نے یہ سنا تو زمانے کا بیت شاکی ہوا کہ سخن کی قدر دنیا سے اٹھ گئی اور اس نے منعم کے پاس جا کر اپنا کلام سنایا اور انعام کا طالب ہوا۔ منعم اس کا کلام سن کر خوش ہوا اور اس کا منہ موتیوں سے بھر دیا۔

درویش کو جو مل گیا تھا اسے اس نے عزیز جانا کہ پھر فاقوں کی نوبت نہ آئے اور بخل کرنا شروع کر دیا۔ عالم نے اسی دولت سے کچھ پس انداز کرکے کچھ اونٹ اور تھوڑا سا اسباب خریدا اور سوداگروں کے ہمراہ اصفہان، کہ نصف جہان ہے، روانہ ہوا۔ اس سفر میں اسے منافع ہوا۔ تب اس نے مزید اونٹ اور مزید سامان خریدا اور خراسان کا سفر کیا۔ دانش مند نے قرض لینے اور ادا کرنے میں بڑا تجربہ حاصل کیا اور اپنا روپیہ سود پر چلانا شروع کر دیا۔ شاعر بہت کاہل نکلا، اس نے بس اتنا کیا کہ چند اشعار اور لکھ لیے، کچھ تہنیتی، کچھ شکایتی اور اسے مزید انعام مل گیا اور یوں درویش، عالم، دانش مند اور سوداگر چاروں تونگر ہو گئے۔ مگر اس کے بعد ایسا ہوا کہ درویش کی درویشانہ شان، عالم کا علم، دانشمند کی دانش اور شاعر کے کلام کی سرمستی جاتی رہی۔

شیخ نے یہ حکایت سنا کر توقف کیا۔ پھر فرمایا: حضرت شیخ سعدی نے بھی صحیح فرمایا اور میں شیخ عثمان کبوتر بھی صحیح کہتا ہوں کہ دمشق میں عشق فراموشی دونوں صورت ہوا ہے۔ پھر وہ دیر تک اس شعر کو گنگناتے رہے اور اس روز اس کے بعد کوئی بات نہیں کی۔ معلوم ہو کہ ہمارے شیخ کی طبیعت میں گداز تھا اور دل درد سے معمور۔ شعر سنتے تھے تو کیفیت

پیدا ہو جاتی تھی۔ جب بہت متاثر ہوتے تو رقت فرماتے اور گریبان چاک کر ڈالتے تھے۔ آخری شعر جو آپ نے سماعت فرمایا اس کا ذکر رقم کرتا ہوں۔

اس روز رات سے آپ پر اضطراب کا عالم تھا شب بیداری آپ کا شیوہ تھا پر اس شب آپ نے گھڑی بھر بھی آرام نہیں فرمایا۔ میں نے گزارش کی تو فرمایا کہ مسافروں کو نیند کہاں؟ اور پھر تسبیح و تہلیل میں مستغرق ہو گئے۔ ابھی تڑکا تھا اور آپ فجر کا فریضہ ادا کر چکے تھے کہ ایک فقیر پر سوز لحن میں یہ شعر پڑھتا ہوا گزرا۔

آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز

وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

آپ پر رقت طاری ہو گئی فرمایا اے فلانے یہ شعر پھر پڑھ۔ اس نے وہ شعر پھر پڑھا۔ آپ نے گریبان چاک کر ڈالا۔ فرمایا۔ اے فلانے یہ شعر پھر پڑھ۔ فقیر نے شعر پھر پڑھا۔ آپ کا جی بھر آیا۔ دکھ بھری آواز میں بولے: افسوس ہے ان ہاتھوں پر بوجہ اس کے جو انہوں نے مانگا۔ افسوس ہے ان ہاتھوں پر بوجہ اس کے جو انہوں نے پایا۔ اور آپ نے اپنے ہاتھ پر نظر فرمائی اور گویا ہوئے کہ اے میرے ہاتھ، گواہ رہنا کہ شیخ عثمان کبوتر نے تمہیں رسوائی سے محفوظ رکھا۔ وہ فقیر کہ ہم نے اس سے پہلے بھی دیکھا تھا نہ سنا تھا، اندر آ گیا اور شیخ سے مخاطب ہوا کہ اے عثمان اب مرنا چاہیے کہ ہاتھ سوالی ہو گئے۔ آپ نے یہ سن کر گریہ کیا اور فرمایا۔ میں مر گیا۔ اور پھر آپ نے اینٹ پر سر رکھا اور چادر تان کر ساکت ہو گئے۔

آپ نے اینٹ پر سر رکھ کر چادر تان لی اور آپ ساکت ہو گئے اور وہ فقیر جدھر سے آیا تھا ادھر چلا گیا اور میں بالیں پر متشوش بیٹھا رہا۔ پھر مجھے لگا کہ چادر کے اندر کوئی شے پھڑکتی ہے۔ میں نے چادر کا کونہ اٹھایا۔ دفعتاً چادر کے اندر سے ایک سفید کبوتر پھڑک کر نکلا اور دم کے دم میں بلند ہو کر آسمان میں گم ہو گیا اور جب نے چادر کا کونہ اٹھا کر شیخ کے چہرہ مبارک پر نظر ڈالی۔ اس چہرۂ مبارک پر اس آن عجب تجلی تھی۔ لگتا تھا کہ آپ خواب فرما رہے ہیں۔ تب مجھ پر رقت طاری ہوئی اور میں نے بے زاری کی کہ میں غش کر گیا۔

شیخ کے وصال شریف کا مجھ پر عجب اثر ہوا کہ میں اپنے حجرے میں بند ہو کر بیٹھ رہا۔ دنیا سے جی بھر گیا اور ہم جنسوں سے مل بیٹھنے کی آرزو مٹ گئی۔ جانے میں کتنے دن حجرہ نشین رہا۔ ایک شب شیخ اللہ ان کی قبر نور سے بھرے خواب میں تشریف لائے۔ آپ نے اوپر نظر فرمائی اور میں نے دیکھا کہ حجرے کی چھت کھل گئی ہے اور آسمان دکھائی دے رہا ہے۔ اس خواب کو میں نے ہدایت جانا اور دوسرے دن حجرے سے باہر نکل آیا۔

جانے میں کتنے دن حجرہ نشین رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ دنیا ہی بدل گئی ہے۔ بازار سے گزرا تو وہ رونق دیکھی کہ

پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ ہزاری بزاری دکانیں صاف شفاف صراف کے برابر صراف۔ سینکڑوں کا سودا دم کے دم میں ہوتا ہے۔ سوداگروں کی خدائی ہے۔ دولت کی گنگا بہتی ہے میں نے آنکھیں مل کر دیکھا کہ یارب یہ عالم بیداری ہے یا خواب دیکھتا ہوں؟ کس شہر میں آ گیا ہوں؟ تب میں نے سوچا کہ بر بھائیوں سے ملنا چاہیئے۔ حقیقت حال معلوم کرنا چاہیئے۔ میں نے پہلے خانہ برباد سید رضی کا پتہ لیا۔ ڈھونڈتا ڈھونڈتا شہر کے ایک خوشبو کوچے میں پہنچا اور ایک قصر کھڑا دیکھا۔ لوگوں نے کہا کہ سید رضی کا دولت کدہ یہی ہے۔ میں نے اس قصر کو دیکھا اور چلا کر کہا کہ خدا کی قسم اے لوگو، تم نے مجھ سے جھوٹ کہا۔ سید رضی گھر نہیں بنا سکتا اور میں آگے بڑھ گیا۔ پھر میں نے ابومسلم بغدادی کا پتہ لیا۔ ایک شخص نے مجھے قاضی شہر کی محل سرائے کے سامنے جا کھڑا کیا اور کہا کہ ابومسلم بغدادی کا مسکن یہی ہے۔ میں نے اس محل سرائے کو دیکھا۔ اپنے تئیں حیران ہوا کہ ابومسلم بغدادی نے مرتبہ لے لیا۔ میں آگے بڑھ گیا اور شیخ حمزہ کا پتہ لیا۔ شیخ حمزہ کا پتہ لیتے لیتے میں نے خود کو پھر ایک حویلی کے روبرو کھڑا پایا اور میں نے کہا کہ خدا کی قسم شیخ حمزہ نے چھت پاٹ لی۔ وہ مجھ سے دور ہو گیا۔ میں آگے بڑھا اور ابوجعفر شیرازی کا پتہ پوچھا۔ تب ایک شخص نے مجھے ایک جوہری کی دکان پر لے جا کھڑا کر دیا۔ جہاں قالین پر گاؤ تکیہ سے کمر لگا کر ریشمی پوشاک میں ملبوس ابوجعفر شیرازی بیٹھا تھا اور ایک طفل خوب رو اسے پنکھا کرتا تھا۔ تب میں نے چلا کر کہا: اے ابوجعفر! مٹی مٹی سے ممتاز ہو گئی اور میں جواب کا انتظار کیے بغیر مڑا اور وہاں سے آ گیا۔ راستہ میں میں نے دیکھا کہ سید رضی ریشمی پوشاک میں ملبوس، غلاموں کے جلو میں بصد تمکنت سامنے سے چلا جاتا ہے اور دامن صبر میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے بڑھ کر اس کی عبا کے بھاری دامن کو اٹھایا اور کہا کہ اے بزرگ خاندان کی یادگار، اے سید السادات تو نے ٹاٹ چھوڑ کر ریشم اوڑھ لیا! اس پر وہ محجوب ہوا اور میں وہاں سے روتا ہوا اپنے حجرے کی سمت چلا اور میں حجرہ میں آ کر تا دیر رویا اور کہا کہ خدا کی قسم میں اکیلا رہ گیا ہوں۔

دوسرے دن میں نے شیخ کے مزار شریف پر حاضری دی۔ وہاں میں نے حبیب بن یحییٰ ترمذی کو گلیم پوش اور بوریا نشین پایا۔ میں اس کے پاس بیٹھا اور کہا کہ اے حبیب تو نے دیکھا کہ دنیا کس طرح بدلی ہے اور رفقاء نے شیخ کی تعلیمات کو کیا فراموش کیا ہے اور کس طرح اپنے مسلک سے پھرے ہیں۔ وہ یہ سن کر افسوس کے آثار چہرے پر لایا اور آہ سرد بھر کر بولا کہ بے شک دنیا بدل گئی اور رفقاء نے شیخ کی تعلیمات کو فراموش کر دیا اور اپنے مسلک سے پھر گئے۔ اور میں نے کہا کہ ہلاکت ہو بندہ دینار کو اور ہلاکت ہو بندہ درہم کو۔

اسی روز شام کو ابومسلم بغدادی کا قاصد مجھے بلانے آیا کہ چل تیرا پرانا رفیق بلاتا ہے۔ اور میں وہاں گیا تو میں

نے حبیب بن یحییٰ ترمذی کو اس کی صحبت میں بیٹھا پایا اور ابو مسلم بغدادی نے پیشانی پر شکن ڈال کے کہا کہ اے ابو القاسم خضری تو ہمیں شیخ کی تعلیمات سے منحرف بتاتا ہے اور ہلاکت ہلاکت کے نعرے لگاتا ہے۔ اس پر میں نے حبیب بن یحییٰ پر غصہ کی نظر ڈالی اور پھر ابو مسلم بغدادی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا کہ ابو مسلم کیا تو مجھے وہ کہنے سے منع کرے گا جو رسول نے کہا اور جسے شیخ نے ورد کیا اور پھر میں نے پوری حدیث پڑھی۔

ہلاکت ہو بندۂ دینار کو اور ہلاکت ہو بندۂ درہم کو اور ہلاکت ہو بندۂ گلیم سیاہ کو اور پھٹے لباس کے بندے کو۔

اسی اثناء میں دسترخوان بچھا اور اس پر انواع و الوان کے کھانے چنے گئے ابو مسلم بغدادی نے کہا۔

اے رفیق کھانا تناول کر۔ میں نے ٹھنڈا پانی پینے پر قناعت کی اور کہا۔

اے ابو مسلم بغدادی، دنیا دل ہے اور ہم اک میں روزہ دار ہیں۔ ابو مسلم بغدادی یہ سن کر رو دیا اور بولا۔

سچ کہا تو نے اے ابو القاسم، اور پھر کھانا تناول کیا۔ اور حبیب بن یحییٰ ترمذی بھی یہ سن کر رو دیا اور حبیب بن یحییٰ ترمذی نے بھی پیٹ بھر کر کھایا۔ جب دسترخوان تہہ ہوا تو کنیزوں کے جلو میں ایک رقاصہ آئی۔ میں اسے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ابو مسلم بغدادی نے اصرار کیا کہ اے رفیق ٹھہر۔ میں نے کہا کہ اے ابو مسلم بغدادی دنیا دل ہے اور ہم روزہ دار ہیں اور میں وہاں سے چلا آیا اور اس چھنال کے پیروں کی دھمک اور گھنگھروؤں کی جھنکار نے میرا تعاقب کیا۔ پھر میں نے کانوں میں انگلیاں لے لیں اور بڑھے چلا گیا۔

جب میں نے حجرے میں قدم رکھا تو دفعتاً ایک لجلجی شے تڑپ کر میرے حلق سے نکل اور منہ سے باہر نکل آئی۔ میں نے چراغ روشن کیا اور حجرے کا کونہ کونہ دیکھا مگر کچھ نہ دکھائی دیا اور میں نے کہا بے شک یہ میرا وہم تھا اور میں چٹائی پہ پہنچ کر سو رہا۔

دوسرے روز میں اٹھ کر پہلے حبیب بن یحییٰ ترمذی کی طرف گیا اور میں نے دیکھا کہ اس کے بوریا پر ایک زرد کتا سو رہا ہے۔ میں نے کہا: اے یحییٰ کے بیٹے تو نے اپنے تئیں نفس کے حوالے کر دیا اور منافق ہو گیا۔ اس پر وہ رو دیا اور کہا کہ خدا کی قسم میں تیرے ساتھیوں میں سے ہوں اور رفقاء کے پاس مسلک شیخ یاد دلانے جاتا ہوں۔ تب میں نے شیخ کی قبر پر کہا کہ خدا اس کو نور سے بھر دے، عقیدت مندوں کو زر و سیم چڑھاتے دیکھا اور میں نے کہا:

اے یحییٰ کے بیٹے تیرا برا ہو تو نے شیخ کو وصال کے بعد اہل زر بنا دیا۔ اس زر و سیم کا تو کیا کرتا ہے؟ حبیب بن ترمذی پھر رو دیا اور کہا کہ خدا کی قسم یہ زر و سیم سید رضی، ابو جعفر شیرازی، ابو مسلم بغدادی، شیخ حمزہ اور میرے درمیان مساوی تقسیم ہوتا ہے اور میں اپنا حصہ مساکین میں تقسیم کر دیتا ہوں اور بوریا کو اپنی تقدیر جانتا ہوں۔

میں وہاں سے اٹھ کر آگے چلا اور میں نے سید رضی کے قصر کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ اس کے پھاٹک میں

ایک بڑا سا زرد کتا کھڑا ہے اور میں نے اس زرد کتے کو شیخ حمزہ کی حویلی کے سامنے کھڑا پایا اور ابو جعفر شیرازی کی مسند پر محو خواب پایا اور ابو مسلم بغدادی کی محل سرا میں دم اٹھائے کھڑے دیکھا اور میں نے کہا: یا شیخ تیرے مرید زرد کتے کی پناہ میں چلے گئے اور میں اس رات پھر ابو مسلم بغدادی کی محل سرا میں گیا اور میں نے اپنے تئیں سوال کیا۔ اے ابوالقاسم تو یہاں کیوں آیا ہے؟ اور ابوالقاسم نے مجھ سے کہا کہ ابو مسلم بغدادی کو مسلک شیخ کی دعوت دینے کے لئے۔

اس رات بھی میں نے حبیب بن یحییٰ ترمذی کو ابو مسلم بغدادی کے دستر خوان پر موجود پایا۔ ابو مسلم بغدادی نے مجھ سے کہا اے رفیق کھانا تناول کر اور میں نے ٹھنڈے پانی پر قناعت کی اور کہا کہ اے ابو مسلم دنیا دن ہے اور ہم اس میں روزہ دار ہیں۔ اس پر مسلم بغدادی رویا اور بولا۔ سچ کہا تو نے اے رفیق، اور پھر کھانا تناول کیا اور حبیب بن یحییٰ ترمذی بھی رویا اور حبیب بن یحییٰ ترمذی نے بھی پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ پھر جب زن رقاصہ آئی تب میں نے یہی کیا اور اٹھ کھڑا ہوا اس زن رقاصہ کے پیروں کی تھاپ اور گھنگھروؤں کی جھنکار نے کچھ دور تک میرا تعاقب کیا۔ مگر پھر میں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں اور آگے بڑھ گیا۔

تیسرے دن میں نے پھر شہر کا گشت کیا اور جو منظر پچھلے دو دن دیکھتا آ رہا تھا اس میں سرمو فرق نہ دیکھا اور شب کو میں نے پھر اپنے تئیں ابو مسلم بغدادی کے در پر کھڑا پایا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں ابو مسلم بغدادی کو شیخ کی تعلیمات یاد دلانے آیا ہوں۔ سو میں نے اپنے تئیں کوئی سوال نہیں کیا اور اندر چلا گیا۔ آج پھر حبیب بن یحییٰ ترمذی دستر خوان پر موجود تھا۔ ابو مسلم بغدادی نے کہا اے رفیق کھانا تناول کر، اور مجھے آج تیسرا فاقہ تھا اور دستر خوان پر سجا اور غذاؤں کے مزعفر بھی تھا جو ایک زمانے میں مجھے بہت مرغوب تھا۔ میں نے ایک نوالہ مزعفر کا لے کر ہاتھ کھینچ لیا اور ٹھنڈا پانی پیا اور کہا:۔

دنیا دن ہے اور ہم اس میں روزہ دار ہیں

آج یہ فقرہ سن کر ابو مسلم بغدادی نے رونے کے بجائے اطمینان کا سانس لیا اور کہا: اے رفیق تو نے سچ کہا۔ پھر زن رقاصہ آئی اور میں نے اسے ایک نظر دیکھا۔ چہرہ لال بھبوکا، آنکھیں مے کی پیالیاں، کچیں سخت اور رانیں بھری ہوئی، پیٹ صندل کی تختی، ناف گول پیالہ ایسی، اور لباس اس نے ایسا باریک لباس پہنا تھا کہ صندل کی تختی اور گول پیالہ اور کسے ہوئے سینے ساری سب نمایاں تھیں۔ اور مجھے لگا کہ میں نے چکھتے مزعفر کا ایک اور نوالہ لے لیا ہے اور میرے پوروؤں میں کپکپی ہونے لگی اور میرے ہاتھ میرے اختیار سے باہر ہونے لگے۔ تب مجھے ہاتھوں کے بارے میں شیخ کا ارشاد یاد آیا۔ میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا کہ آج ابو مسلم بغدادی نے کھانے پر اصرار نہ کیا اور آج اس رنڈی کے پیروں کی تھاپ اور گھنگھروؤں کی جھنکار نے ایک شیریں کیفیت کے ساتھ میرا دور تک تعاقب کیا۔

جب میں گھر پہنچا اور حجرے میں قدم رکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے بوریے پر ایک زرد کتا سو رہا ہے۔ میں تو اسے دیکھ کر نقش کالحجر بن گیا اور مجھے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ آنے لگا۔ پھر میں نے اسے مارا پر وہ بھاگنے کی بجائے میرے دامن میں آ کر گم ہو گیا۔ تب مجھے اندیشوں اور وسوسوں نے گھیرا۔ میری آنکھوں کی نیند غائب اور دل کا چین رخصت ہو گیا۔ اور میں نے زاری کی۔ اے میرے معبود مجھ پر رحم کر کہ میرا دل الائشوں میں مبتلا ہوا اور زرد کتا میرے اندر سما گیا۔ میں نے زاری کی اور میں نے دعا کی۔ پر میرے جی کو قرار نہ آیا۔ یک بارگی مجھے ابوعلی رودباری رضی اللہ عنہٗ یاد آئے کہ کچھ مدت وسوسہ کی بیماری میں مبتلا رہے تھے۔ ایک دن وہ صبح تڑکے تڑکے دریا پر گئے اور سورج نکلنے تک وہاں رہے۔ اس عرصہ میں ان کا دل اندوہگیں ہوا۔ انہوں نے عرض کیا: اے بار خدایا آرام دے۔ دریا میں سے ہاتف نے آواز دی کہ آرام علم میں ہے اور میں نے خود سے کہا کہ اے ابوالقاسم خضری یہاں سے چل کہ یہاں تیرے باہر اور اندر زرد کتے پیدا ہو گئے اور تیرا آرام چھن گیا۔

میں نے اپنے حجرے پر آخری نظر ڈالی اور منطق اور فقہ کی ان نادر کتب کو، جو برسوں کی ریاضت سے جمع کی تھیں، وہیں چھوڑا، ملفوظات شیخ بغل میں دبا، شہر سے نکل گیا۔ شہر سے نکلتے نکلتے زمین نے میرے پیر پکڑ لئے اور مجھے شیخ کی خوشبو مجلسیں بے طرح یاد آ گئیں اور اس زمین نے، جسے میں نے پاک اور مقدس جانا تھا۔ مجھے بہت پکڑا اور ان گلیوں نے، جنہوں نے شیخ کے قدموں کو بوسہ دیا تھا، مجھے بہت پکارا اور میں ان کی پکار سن کر رویا اور بکا کی کہ یا شیخ تیرا شہر جھنوں میں چھپ گیا۔ اور آسمان دور ہو گیا اور تیرے رفیقان گرنیہ پا تجھ سے پھر گئے۔ انہوں نے لاشریک چھت کے مقابل اپنی اپنی چھتیں پاٹ لیں اور مٹی اور مٹی میں فصل پیدا کر دیا اور زرد کتے نے عزت پائی اور اشرف الخلق مٹی بن گیا اور مجھ پر تیرا شہر تنگ ہو گیا۔ میں نے تیرا شہر چھوڑ دیا۔ یہ کہہ کر میں نے دل مضبوط کیا اور چل پڑا۔

میں چلتے چلتے دور نکل گیا۔ یہاں تک کہ میرا دم پھول گیا اور میرے پیروں میں چھالے پڑ گئے۔ مگر پھر ایسا ہوا کہ اچانک میرے حلق سے کوئی چیز زور کر کے باہر آ گئی اور پیروں پر گر گئی۔ میں نے اپنے پیروں پر نظر کی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک لومڑی کا بچہ میرے قدموں پر لوٹتا ہے۔ تب میں نے اسے پیروں سے روند کر کچل دینا چاہا پر وہ لومڑی کا بچہ پھول کر موٹا ہو گیا۔ تب میں نے اسے پھر قدموں سے روندا اور وہ موٹا ہو گیا اور موٹا ہوتے ہوتے زرد کتا بن گیا۔ تب میں نے پوری قوت سے زرد کتے کو ٹھوکر ماری اور اسے قدموں سے خوب روندا اور روندتا ہوا آگے نکل گیا۔ اور میں نے کہا کہ خدا کی قسم میں نے اپنے زرد کتے کو روند ڈالا اور میں چلتا ہی گیا تاآنکہ میرے چھالے چھل کر پھوڑا بن گئے اور میرے پیروں کی انگلیاں پھٹ گئیں اور تلوے لہو لہان ہو گئے۔ مگر پھر ایسا ہوا کہ زرد کتا، جسے میں روند کر آیا تھا، جانے کدھر سے پھر نکل آیا اور میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ میں اس سے لڑا اور اسے واں سے بہت ہٹایا پر وہ راہ سے سر مو نہ ہٹا، حتیٰ کہ میں

ٹھنڈ گیا اور ٹھٹھک کر گھٹ گیا اور وہ زرد کتا پھول کر بڑا ہو گیا۔ تب میں نے بارگاہ رب العزت میں فریاد کی کہ اے پالنے والے آدمی گھٹ گیا اور زرد کتا بڑا ہو گیا اور میں نے اسے قدموں میں روندنا چاہا پر وہ میرے دامن میں لپٹ کر غائب ہو گیا اور میں نے اپنی چھلی ہوئی انگلیوں اور لہولہان تلوؤں اور پھوڑا پھالوں پر نظر کی اور اپنے حال پر رویا اور کہا کہ کاش میں نے شیخ کے شہر سے ہجرت نہ کی ہوتی۔ تب میرا دھیان اور طرف گیا میں نے مہکتے مزعفر کا خیال کیا اور صندل کی تختی اور گول پیالے والی کا تصور باندھا اور شیخ کے مزار پر زرد سیم کی بارش پر قیاس دوڑایا۔ اور میں نے سوچا کہ بے شک شیخ کے مرید شیخ کی تعلیمات سے منحرف ہو گئے۔ اور حبیب بن یحییٰ ترمذی نے مخالفت کی راہ اختیار کی اور بے شک شیخ کی ملفوظات میرے تصرف میں ہیں، مناسب ہے کہ بیت مستقر واپس چل کر ملفوظات پر نظر ثانی کروں اور انہیں مرغوب خلائق اور پسند خاطر احباب بنا کر ان کی اشاعت کی تدبیر کروں اور شیخ کا تذکرہ اس طرح لکھوں کہ معتقدوں کو پسند آئے اور طبیعت پر کسی کی میل نہ آئے۔ پر مجھے اس آن اچانک شیخ کا ارشاد یاد آیا کہ ہاتھ آدمی کے دشمن ہیں اور میں نے سوچا کہ میرے ہاتھ مجھ سے دشمنی کرنے لگے اور اسی رات جب میں نے سونے کی نیت باندھی تو میں نے دیکھا کہ زرد کتا پھر نمودار ہو گیا ہے اور میری چٹائی پر سو رہا ہے۔ تب میں نے زرد کتے کو مارا اور اسے اپنی چٹائی سے اٹھانے کے لئے اس سے سرد آزما ہوا۔ اور میں اور زرد کتا رات بھر لڑتے رہے کبھی میں اسے قدموں میں روند ڈالتا اور وہ چھوٹا اور میں بڑا ہو جاتا اور کبھی وہ اٹھ کھڑا ہوتا اور میں چھوٹا اور وہ بڑا ہو جاتا۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور اس کا زور گھٹنے لگا اور وہ میرے دامن میں چھپ کر غائب ہو گیا

تب سے اب تک میری اور زرد کتے کی لڑائی چلی آتی ہے۔ اس مجاہدہ کی فرعیں بہت اور باریکیاں بے شمار ہیں جنہیں میں نظر انداز کرتا ہوں کہ رسالہ لمبا نہ ہو جائے۔ کبھی زرد کتا مجھ پر اور کبھی میں زرد کتے پر غالب آ جاتا ہوں۔ کبھی میں بڑا ہوتا ہوں اور وہ میرے قدموں میں پس کر لومڑی کا بچہ ایسا رہ جاتا ہے کبھی وہ بڑا ہوتا چلا جاتا ہے اور میں گھٹتا چلا جاتا ہوں اور مجھے مہکتے ہوئے مزعفر اور صندل کی تختی اور گول پیالے کا خیال ستانے لگتا ہے اور زرد کتا کہتا ہے کہ جب سب زرد کتے بن جائیں تو آدمی بنے رہنا کتے سے بدتر ہوتا ہے۔ اور میں فریاد کرتا ہوں کہ اے پالنے والے میں کب تک درختوں کے سائے میں بنی آدم سے دور دور پھروں اور کچے پکے پھلوں اور موٹے ٹاٹ کی گدڑی پر گزارہ کروں اور میرے قدم شہر کی طرف اٹھنے لگتے ہیں۔ پر مجھے شیخ کا ارشاد یاد آ جاتا ہے کہ واپس ہونے ہوئے قدم سالک کے دشمن ہیں اور میں پھر اپنے قدموں کو سزا دیتا ہوں اور شہر کی طرف پشت کر کے اتنا چلتا ہوں کہ میرے تلوے لہولہان ہو جاتے ہیں۔ اور پھر ہاتھوں کو سزا دیتا ہوں [illegible] سے بہتر کنکر چنتا ہوں۔ اے رب العزت میں نے اپنے دشمنوں کو اتنی سزا دی کہ

میرے تلوے لہو لہان ہو گئے اور میرے پورے کنکر چنتے چنتے پھوڑا بن گئے اور میری چمڑی دھوپ میں کالی پڑ گئی اور میری ہڈیاں پگھلنے لگیں۔ اے رب العزت میری نیندیں جل گئیں اور میرے دن ملیا میٹ ہو گئے۔ دنیا میرے لیے تپتا دن بن گئی اور میں روزہ دار ٹھہرا اور روزہ دن بدن لمبا ہوتا جاتا ہے۔ اس روز سے میں لاغر ہو گیا مگر زرد کتا توانا ہے اور روز رات کو میری چٹائی پر آرام کرتا ہے۔ میرا آرام رخصت ہو گیا اور میری چٹائی غیر کے قبضہ میں چلی گئی اور زرد کتا بڑا اور آدمی حقیر ہو گیا۔ اور اس وقت میں نے ابو علی رودباری رضی اللہ عنہ کو پھر یاد کیا اور دریا کے کنارے دوزانو بیٹھ گیا۔ میرا دل اندر سے بھرا ہوا تھا اور میں نے بکا کی کہ بارالہا آرام دے، آرام دے۔ میں نے رات بھر بکا کی اور دریا کی طرف دیکھا کیا اور رات بھر غبار آلود تیز ہوا زرد رو پیڑوں کے درمیان چلا اور رات بھر درختوں سے پتے گرا کیے۔ میں نے دریا سے نظر ہٹا کر اپنے گرد میں اٹے جسم کو دیکھا، اپنے ارد گرد زرد پتوں کی ڈھیریاں دیکھیں اور میں نے کہا کہ یہ میری خواہشیں اور ارمان ہیں۔ خدا کی قسم میں الائشوں سے پاک ہوا اور پت جھڑ کا برہنہ درخت بن گیا۔ پر جب تڑکا ہوا تو مجھے اپنے پوروں میں میٹھا میٹھا رس گھلتا محسوس ہوا، جیسے وہ صندل کی تختی سے چھو گئے ہیں، جیسے انہوں نے گول سنہری پیالے اور نرم نرم چاندی سی ساقوں کو مس کیا ہے، جیسے انگلیاں سونے چاندی میں کھیل رہی ہیں اور ان کے درمیان درہم و دینار کھنک رہے ہیں۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور دھندلکے میں یہ دہشت بھرا منظر دیکھا کہ زرد کتا دم اٹھائے اس طور کھڑا ہے کہ اس کی پچھلی ٹانگیں شہر میں ہیں اور اگلی ٹانگیں میری چٹائی پر اور اس کے گیلے گرم نتھنے میرے داہنے ہاتھ کی انگلیوں کو چھو رہے ہیں۔ میں نے اپنے داہنے ہاتھ کو یوں دیکھا جیسے وہ ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں کی مثال کٹا ہوا مجھ سے الگ پڑا ہے اور میں نے اسے خطاب کر کے کہا کہ اے میرے ہاتھ، اے میرے رفیق تو دشمن سے مل گیا اور میں نے آنکھیں بند کر لیں اور گڑگڑا کر ایک بار پھر دعا کی: بارالہا آرام دے، آرام دے۔

اُجلا انسان، میلی رُوحیں

افسرؔ آذر

اس نے ایک مرتبہ پھر انسانوں کے اس سیلاب کو دیکھا جو سڑک پر مسلسل اُمڈ رہا تھا۔

ہر شخص کے چہرے پر اس کو آسودگی اور اطمینان کی لہریں نظر آئیں۔ ہر شخص کے چہرے پر، جن میں شام کے اخبار بیچنے والے لڑکے تھے، فٹ پاتھ پر معمولی اشیاء بیچنے والے دکاندار تھے، وہ بوڑھا تھا جس کے چہرے کے نقوش بڑھاپے کی جھرّیوں نے چھپا لئے تھے اور جو اپنی گدلائی ہوئی آنکھوں کے سامنے پان سگریٹ کا چھوٹا سا خوانچہ لئے بیٹھا تھا۔ وہ ٹوٹا پھوٹا بھکاری تھا جو اپنے بدن کو زمین پر گھسیٹ گھسیٹ کر آگے بڑھاتا تھا۔ وہ پاگل عورت تھی جو سڑک پر چلتے ہوئے لوگوں کو گالیاں دے رہی تھی۔ صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس وہ جوان لڑکے اور لڑکیاں تھیں، جن کے دل و دماغ میں ہر روز نئی محبتوں کے جوالا مکھی پھٹتے رہتے تھے اور ہر روز ایک نئی محبت کی تلاش میں رہتے ہوئے ان کی روحوں میں بے چینی اور اضطراب کروٹیں لیتے رہتے تھے۔

اور جب اس کا یہ احساس کہ ہر شخص آسودہ اور مطمئن ہے، شدید تر ہوتا گیا تو ایک دم اسے اپنے وجود کا خیال آیا اور پھر صرف تنہائی کا احساس ہی اس کے ذہن پر باقی رہ گیا۔ دنیا میں وہی اکیلا ایسا ہے جس کو یہ آسودگی اور اطمینان میسّر نہیں ہیں۔ بنچ پر بیٹھے ہوئے اس نے ایک مرتبہ پھر اپنے آس پاس نظریں دوڑائیں لیکن اطمینان اور آسودگی کی لہر نے جو ہر شخص کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی اسے پھر شدید احساسِ تنہائی میں مبتلا کر دیا۔

لیکن سب سے بڑی مصیبت تو اس کے لئے شرافت اور پاکیزگی کے وہ تاثرات تھے جو اس کو لوگوں کے چہروں پر نظر آ رہے تھے!

وہ صرف ایک آدمی چاہتا تھا۔ صرف ایک! جس کے چہرے پر شرافت اور پاکیزگی کی علامات نہ ہوں۔ لیکن اس کے سامنے تو معصوم، پاکباز اور فرشتہ صفت لوگوں کا گروہ تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا گویا وہ زمین کو چھوڑ کر جہاں ہر طرف دھوکہ ریا اور کمینگی پائی جاتی ہے، فرشتوں کی دنیا میں نکل آیا ہے جہاں روحوں میں نفاست اور پاکیزگی گھلی ہوئی ہے۔ اس خیال

کے سامنے اس کو پھر احساسِ تنہائی نے آ دبوچا۔ فرشتوں کی آسمانی دنیا میں ایک زمینی انسان کا وجود۔ غلاظت سے بھری ہوئی روح کے ساتھ اس کا اپنا وجود۔

پھر اس کی آنکھوں میں ایک سیاہ دھبہ جم گیا۔ جس میں اس کا اپنا وجود مقید تھا۔ اس کے چاروں طرف دوڑتی بھاگتی زندگی کے مختلف روپ تھے۔ ہر شخص کا اپنا ایک جاذب نظر رنگ تھا۔ ہر شے خوبصورت رنگوں کے حسین امتزاج کا مظہر تھی۔ اس رنگ برنگی قوس وقزح کے حسین اور دلپذیر رنگوں کی دنیا میں ایک سیاہ دھبہ اکیلا اور تنہا اس رنگ برنگے ماحول کے درمیان بے چارگی سے بے حس و حرکت مہمان ناپسندیدہ کی طرح پڑا ہوا۔ پھر اچانک وہ رنگوں کی اس دنیا سے نکل آیا۔

انتہائی غلیظ، انتہائی مکروہ میل کی چادر میں لپٹا ہوا ننگا جسم لئے ایک جٹا کٹ فقیر ایک آنکھ سے اندھا کریہہ آواز میں بھیک مانگ رہا تھا۔ "اللہ ہی دے گا۔" لیکن اس کریہہ آواز میں بھی اس کو عجیب سی پاکیزگی کا احساس ہوا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی ٹانگوں سے اٹھا اور وہ اکنی جس کو بڑی دیر مٹھی میں مسلنے کی وجہ سے اس کے ہاتھ پسیج گئے تھے۔ اس فقیر کو دے دی۔

یہ اکنی اس کو کسی شخص نے بھکاری سمجھ کر دی تھی۔ جس کے چہرے پر بڑے بڑے بال بکھرے ہوئے تھے۔ گلے میں سُرخ رُومال بدن پہ گہرے رنگوں کی چار خانے کی قمیض، کھلا ہوا گریبان جس میں سے پیلے رنگ کا بنیان جھانک رہا تھا جس پر کیوپڈ کی تصویر چھپی تھی۔ اور ٹانگوں میں گہرے نیلے رنگوں کی پتلون جس کے پائنچے چڑھے ہوئے تھے۔

نہ معلوم فٹ پاتھ سے وہ کیا چیز خرید رہا تھا۔ اس نے اس طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ اس کی نظر تو دس دس کے نوٹوں پر جم کر رہ گئی تھی جو اس نے پتلون کی ایک جیب سے نکالے تھے اور جس میں سے ایک نوٹ دکاندار کو دیا تھا۔ یہ شخص اس کے معیار پہ پورا اترا تھا۔ اس دکان سے جب وہ ایک بنڈل بغل میں دبا کر آگے بڑھا تو اس کے قدم لاشعوری طور پہ اس کے پیچھے اٹھنے لگے۔

اس شخص کی چال میں لاابالی پن تھا جب کبھی کوئی لڑکی سامنے سے آتی تو وہ ہونٹوں کو سکیڑ کر سیٹی بجاتا۔ اور جب لڑکی اس کے قریب سے گزر جاتی تو وہ دو ایک مرتبہ پیچھے مڑ مڑ کر شاید اپنی سیٹی کے اثر کو دیکھتا۔ لیکن ہر مرتبہ اس کو مایوسی ہوئی کسی بھی لڑکی نے اس کی ہمت افزائی نہیں کی تھی۔ اس کی سیٹی کی آواز کو کسی نے بھی پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔

"یہی ٹھیک ہے۔" اس نے دل میں سوچا۔ وہ ایسے ہی شخص کی تلاش میں تھا اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ اس شخص نے ایک جوان پٹھان لڑکی کو جو ہر راہ گیر سے بھیک مانگتی تھی ایک روپیہ دیا تھا اور کچھ دیر تک اس سے نہ معلوم کیا کیا باتیں کرتا رہا تھا اور اتنی دیر تک وہ اس سے تھوڑے فاصلے پر کھڑا اس کا انتظار کرتا رہا۔

یہ شخص اس معیار پر پورا اُترا تھا جو اس نے اپنے نزدیک کسی بدمعاش کے لئے قائم کیا تھا اس کی چال اس کے اطوار، عادات،

لباس اور وہ عامیانہ پن جو اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا: "یہی ٹھیک ہے۔" اس نے پھر اپنے دل میں سوچا اور تیزی سے بڑھ کر اپنے اور اس کے درمیان فاصلے کو طے کر لیا۔

"بابو۔" اس نے کہا۔ وہ شخص ٹھہر گیا: "بابو ــ" اس کے علاوہ وہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ اس جملہ کو نہ دہرا سکا جو اس نے بڑی مشکل سے تلاش کیا تھا: "بابو ــ میری بیوی ہے ــ" اور پھر سوچنے لگا۔ باوجود لاکھ کوشش کے وہ ایک جملہ، وہ چند الفاظ اس کے منہ سے نہ نکل سکے جو اس نے بڑی محنت سے منتخب کئے تھے پھر وہ خجالت سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔

اس شخص نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مایوسیاں اور بھوک سمٹ آئی تھیں اور شاید اسی احساس سے اس شخص نے اس کے ہاتھ پر ایک آنہ رکھ دیا اور آگے بڑھ گیا۔

"ایک آنہ۔ بیوی کی قیمت مگر وہ تو ــ وہ تو۔" اس نے بے ربطگی سے سوچا "تو یہ بھی شریف نکلا۔" اور گہری سرد سانس ہواؤں میں بکھر گئی۔

یہی ایک آنہ تھا جو اس غلیظ میلے کچیلے فقیر کو دے دیا تھا: "اللہ ہی دے گا ــ" کی صدا جاگتے دوڑتی دنیا کی پُر شور آواز میں معدوم ہو گئی تھی۔ آدمیوں سے پُر، اس پُر شور ماحول میں بھی اس کو تنہائی کا احساس تھا۔ تنہائی، اکیلا پن، سناٹا جو اس کے گرد پھیل گیا تھا۔ سناٹا جس میں اس کو کوئی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔

بہر حال مطلوبہ آدمی، باوجود کوشش کے ابھی تک اس کو نہ ملا تھا۔ طویل تلاش اور جستجو میں ناکام ہونے کے بعد پانچ بجے سے وہ پتھر کی اسی بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ دوپہر کی تمام دھوپ اس کے سر پر گزری تھی۔ اور جب اس کے پیروں نے بالکل ہی جواب دے دیا، اور پیٹ میں دوزخ کے دہانے کھل گئے تو وہ لڑکھڑا کر اسی بینچ پر گر گیا تھا۔ حالانکہ اس وقت بینچ پر دھوپ تھی اور چند ہی قدم کے فاصلے پر دوسرا بینچ پیڑ کے سائے میں خالی پڑی تھی لیکن اس کی ٹانگوں کی قوت ختم ہو چکی تھی۔ وہ لڑکھڑا کر اسی تپتی ہوئی بینچ پر تپش کی وجہ سے دو تین مرتبہ پہلو بدل کر ساکن ہو گیا تھا۔

اور اب ہر طرف بجلی کی روشنی تھی سورج نہ معلوم کب کا ڈوب چکا تھا اور سڑک پر چراغاں ہو رہا تھا۔

پھر اس کو یاد آیا ابھی اسے آدمی تلاش کرنا ہے۔ ابھی تو اس کو وہ جملہ کہنا ہے جو وہ اس شریف آدمی سے نہ کہہ سکا تھا جس نے اس کو ایک آنہ دیا تھا۔ یہ جملہ اس نے کتنی تحقیق و تجسس کے بعد معلوم کیا تھا جس کا انتخاب کرنے میں اس کو کتنی مصیبت محسوس ہوئی تھی۔ پھر اچانک یہ جملہ اس کے ذہن میں یوں اتر گیا گویا وحی۔ اور پھر اس کو نروان حاصل ہوا۔ لیکن اس نروان نے اس کی روح کو شکستی نہ دی۔ بلکہ اس کے دل کی تاریکیوں اور ذہن کے گوشوں میں جالوں کا جھگھٹا ہو گیا۔

دوسرا مرحلہ اور بھی کربناک تھا۔

اس جملہ کو کسی اور شخص سے کہنے کے لئے خود کو تیار کرنے تک وہ کتنی روحانی اور ذہنی اذیتوں اور تکلیفوں سے گزرا تھا وہ خود ہی جان سکتا تھا۔ اس کی روح اس کا دماغ اس کا وجود۔ اس کے تصورات جھلس رہے تھے اور اب وہ ساکن و ساکت اور خاموش بیٹھا تھا — مضطرب اور بے چین انسانوں کے اس سیلاب سے علیحدہ جو چاروں طرف سے امڈ رہا تھا۔ آج دنیا میں سب شریف تھے، سب فرشتے تھے۔ جن کی روح گناہوں سے پاک تھی۔ جن کے چہروں پر تقدس اور پاکیزگی کی ضیا تھی۔ اور آنکھوں میں عظمت و وقار کا جلال اور وہ خود کیا تھا؟ ذلیل، مکروہ اور گناہ گار۔ نہ اس کی روح میں پاکیزگی تھی نہ جسم میں کوئی احساس نہ تصور میں نہ تخیل میں۔

پھر اس نے اس پہلو پر دوسرے زاویوں سے سوچنا شروع کیا۔

یہی تو فرشتے ہیں، یہی تو وہ پاکباز ہیں جنہوں نے آج اس حد تک مجبور کر دیا ہے۔ ہونہہ سب کمینے ہیں۔ سب شریف بنتے ہیں — سب۔ اور پھر اس کے دل کی گہرائیوں سے ایک غلیظ گالی ان فرشتہ صورت انسانوں کے لئے نکلی لیکن نہ معلوم کیوں اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئی۔

لیکن اس طور سوچنے کے باوجود بھی اس کو کسی آدمی کا انتخاب کرنا آسان نہ ہوا۔ ہر شخص جو اس کے قریب کھڑا ہوتا یا گزرتا تو وہ اس کو بہت غور سے دیکھتا اور مایوس ہو جاتا اور جب کوئی دوسرا آدمی اس کی نظر کے اس انداز کو تعجب اور حیرانی سے دیکھتا تو وہ خجل اور شرمندہ سا ہو جاتا۔

"تو سالا یہ بھی شریف ہے؟" وہ سوچتا اور پھر کسی دوسرے آدمی کو تاکنے لگتا۔ اس کے انداز میں کسی ناحشر کی نظروں کا سا انداز تھا۔ ایک مریضانہ جذبہ جو ابھی تک محض جذبہ ہی تھا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر صبح سے گزری ہوئی باتیں دل میں دہرائیں جن کو وہ کئی مرتبہ دل میں دہرا چکا تھا اور ہر مرتبہ اس نے روح کے لئے ایک نیا جہنم بنایا تھا — ہر مرتبہ اس کے ذہن پر زہریلے بچھو یلغار کرتے۔ بھوک کے باوجود اس کا چہرہ آگ میں جھلس رہا تھا۔ سرخ ہو رہا تھا، پھر یہ سرخی مدہم پڑتی گئی۔ ایک تاریک سا سایہ اس کے چہرے پر پھیل گیا جس طرح جلتے ہوئے انگاروں پر بتدریج راکھ کی تہہ جم جاتی ہے۔

پھر اس نے اپنے پیٹ سے آواز اٹھتی محسوس کی۔ آج پیٹ بھی باتیں کر رہا تھا اس نے قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر اپنے پیٹ کو سہلایا جو کمر سے لگ چکا تھا، مگر وہ خاموش نہ ہوا۔ بھوکے بچے کی طرح بلکتا ہی رہا۔ چیختا ہی رہا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا بلکتے ہوئے بچے کی چیخیں اس کے لئے ناقابل برداشت تھیں۔

شہر کی بارونق سڑک پر فٹ پاتھ کے کنارے وہ کھڑا ہوا تھا کہ کسی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اس نے مڑ

کر دیکھا۔ اس کا ایک دوست جو مل میں اس کے ساتھ کام کرتا تھا کھڑا تھا۔ اور اچانک وہ ماضی میں کھو گیا۔ جب طویل بیماری کے بعد وہ مل میں کام پر گیا تو اس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ مینیجر نے کہا تھا کہ تمہاری صحت اس قابل نہیں کہ ہم تمہیں دوبارہ کام پر رکھ سکیں۔ اس نے بہت منت سماجت کی تھی۔ بہت کچھ یقین دلایا تھا کہ وہ کام کر سکتا ہے لیکن کان بہرے ہو چکے تھے پھر وہ وہیں بیٹھ گیا تھا ــ اور جب ملازمت اور اچھی کارکردگی کا سرٹیفکیٹ اسے دیا گیا تو وہ چونکا۔ اس نے پھر کچھ کہنا چاہا لیکن احساس کی شدت سے زبان گنگ ہو گئی تھی۔ اس کے ذہن میں صرف ایک ہی خیال تھا: اب وہ بے کار ہو گیا ہے' اب وہ بے کار ہو گیا ہے پھر اس کی صحت ہر جگہ آڑے آئی۔ وہ صرف ایک ہی کام کر سکتا تھا مختلف ملوں میں اس نے اسی کام کے لئے کوشش کی لیکن اس صحت کو کیا کرتا جو طویل بیماری نے اس سے چھین لی تھی اس کھال کو کیا کرتا جو ہڈیوں سے چمٹ گئی تھی، ان پسلیوں کو کیا کرتا جو اس تنگ کے کانپ ٹھڈے معلوم ہونے تھے جس کا کاغذ گل گیا ہو، ان آنکھوں کو کیا کرتا: جو سیاہ حلقوں میں دھنسی ہوئی تھیں، ان گالوں کو کیا کرتا جن میں اتنے گہرے گڑھے تھے کہ ہر طرف ایک ایک انڈا آسانی سے سما سکتا تھا، ان نسوں کو کیا کرتا جن میں بجائے خون کے محض سانس کی وجہ سے دھڑکن معلوم ہوتی تھی! جب کہ مِل خون چاہتی ہے گوشت چاہتی ہے محض ہڈیاں، محض سانس محض کانپ ٹھڈے تو وہ کچرا ہیں جو روزانہ بھنگی جھاڑو سے جمع کر کے باہر کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیتا ہے۔

اس کا دوست کہہ رہا تھا "یار اب تو کھانسی نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ہر دم کھوں کھوں۔ مینیجر نے کہا ہے کہ اسپتال جا کر دکھاؤں۔ وہ نہیں چاہتا کہ ٹی۔ بی کے جراثیم دوسرے مزدوروں میں پھیلیں۔ مگر تم یہ بتاؤ کہ یہ جراثیم مجھ میں کیسے داخل ہوئے۔ میں تو مل میں سب سے زیادہ صحت مند تھا۔ ان سے کہو کہ مل میں وہ مشینیں لگائیں جو روئی کے اڑتے ہوئے ریشوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں تو کان پر جوں نہیں رینگتی۔ بھیا روئی کا ریشہ تو پہننے کے لئے ہوتا ہے! کھانے کے لئے نہیں اور جب تم انہیں سانس کے ذریعہ کھاؤ گے تو یہ پھیپھڑوں کے گرد جالا نہیں بنے گی تو اور کیا کرے گی۔"

وہ چپ چاپ سنتا رہا۔ تنہائی کا احساس کچھ کم ہو گیا تھا۔ "تو کیا اب وہ تمہیں بھی علیحدہ کر دیں گے؟"

دیکھو! کیا پتہ کیا ہو۔"

"ہاں تمہیں نوکری بھی ملی یا نہیں؟"

"نہیں حالانکہ مجھے دق نہیں ہے لیکن کمزوری ــ" پھر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کا دوست سڑک کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا تھا۔

مل میں جہاں وہ کسی زمانے میں ملازم تھا وہ تمام دن لوگوں کی باتیں سنتا جن میں شدید جنسی بھوک کے علاوہ کچھ نہ

ہوتا۔ آوارہ عورتوں کے قصے وہ یوں مزے لے لے کر بیان کرنے گویا کوئی لذیذ چیز کھا رہے ہوں۔ اس ماحول کی اسی فضا کو سوچ کر اس نے سمجھا تھا کہ ایسے لوگ اس کو آسانی سے مل جائیں گے لیکن اب تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔ ایسے لوگ تو غائب ہی ہو گئے تھے۔ اپنی اس بے چارگی پر وہ اس وقت رونا چاہتا تھا لیکن معدے کی آگ نے آنسوؤں کے سوتوں کو خشک کر دیا تھا۔

ایک مرتبہ پھر اس نے سر کو جھٹکا۔ نفی کے انداز میں سر کو ہلایا "نہیں نہیں! میں یہ نہیں کر سکتا۔ مجھ سے یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں یہ نہیں کر سکوں گا۔" سر کو تیزی سے جھٹکنے کی وجہ سے سر میں دھماکے سے ہونے لگے کچھ زور زور سے چیخنے لگا وہ ایک مرتبہ پھر دوزخ میں جل رہا تھا۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا سڑک میں گم ہو گیا۔ ایک آدمی کی تلاش میں جس سے وہ یہ کہہ سکے۔

"صاحب مال چاہئے ایکدم فسٹ کلاس"۔ یہ جملہ وہ شریف آدمی سے نہ کہہ سکا تھا

پھر رات کے سائے گہرے ہو گئے۔ سڑکیں خاموش ہو گئیں۔ انسانوں کا سیلاب کہیں گم ہو گیا۔ آسمان سے تیزی سے شبنم گرنے لگی اس خنک نمی میں اس کو یوں محسوس ہوا گویا تارے اور بھی نکھر گئے ہیں۔ ان کی روشنی اور بھی تیز ہو گئی ہے۔ حالات تبدیل ہونے کے ساتھ ماحول کتنی تیزی سے بدل جاتا ہے۔ اس نے سوچا فضا میں اس کو آسودگی اور اطمینان کی لہروں کی دائیں اُبھرتی محسوس ہوئیں۔ اس کا دل مطمئن تھا، ذہن آسودہ اور روح پر نور کی بارشیں ہو رہی تھیں۔

جب وہ اپنے مکان میں داخل ہوا تو کمرے میں پیلی پیلی اُداس سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

"دروازہ بند کر دو"۔ اس نے بیوی سے کہا۔

"کیوں کوئی اور نہیں ہے؟" بیوی نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔

اس کے سر پہ گویا ایک ہتھوڑا پڑا "نہیں کوئی اور نہیں ہے"۔ اس نے جواب دیا اس کی بیوی دروازہ بند کرنے چلی گئی اور وہ ایک مرتبہ پھر صبح کی باتیں دل میں دہراتا رہا۔ صبح جب وہ دونوں اٹھے تھے تو ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر انہیں معلوم ہوا کہ رات بھر بھوک کی شدت سے وہ نہیں سو سکے ہیں۔ آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ باوجود لاکھ کوشش کے اس کو نوکری نہیں ملی تھی۔ باوجود لاکھ خوشامد کے اس کو قرض نہ ملا تھا۔ دکان سے سودا ادھار نہ ملا تھا۔ تو مجبور ہو کر اس نے بیوی کے سامنے ایک نہایت گھناؤنی تدبیر رکھی تھی اس کی بیوی نے بھی کوئی مخالفت نہ کی۔ شاید وہ بھی اسی پہلو پر سوچ رہی تھی۔ اُس نے صرف اتنا کہا تھا۔

"لیکن آدمی؟"

"وہ میں لایا کروں گا۔ یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل آیا تھا۔

اس کی بیوی دروازہ بند کر چکی تھی۔ اس نے تیزی سے کہا "خدا نے ہمیں بچا لیا۔ مجھے نوکری مل گئی ہے لو یہ کھانا میں نے بھی ابھی تک نہیں کھایا۔ بھلا میں تمہارے بغیر کھا سکتا تھا" پھر اس نے بیوی کو زور سے بھینچ لیا۔ وہ کچھ نہ بولی آہستگی سے اس کے ہاتھ اپنے جسم سے علیحدہ کر دیئے۔ اس کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی! ایسی مردنی جو فاقہ کی زردی سے بالکل علیحدہ تھی۔ وہ پلنگ پر گر پڑی اور سسکیوں اور آہوں کے درمیان اٹکتے ہوئے ہذیانی انداز میں کہا۔

"مگر — مگر — ہم نہیں بچ سکے۔ میں نے کھانے کا انتظام کر لیا تھا۔"

اس کو اچانک یوں محسوس ہوا گویا وہ پھر پستیوں میں آ گرا ہے۔ سیاہ دھبے نے پھیل کر اس کے وجود کو ڈھانپ لیا۔ ایک گمبھیر احساسِ تنہائی۔ وہی کرب و اذیت۔

موجود کی ایک بلال رات

ذکاء الرحمٰن

پھیلی ہوئی ان گنت اور بکھری ہوئی بے اَنت اور پڑی ہوئی لا تعداد رُدحیتی اشیا میں سے ایک رُدحیتی شے ہوں، اور بے نشان ہوتے بغیر بے نام ہوں اور ایک ہوتے بغیر کئی ہوں اور کئی ہوتے بغیر ایک ہوں، اور میں اُن گنت اور بے اَنت اور لا تعداد اور بے نشان بے نام اور ایک اور کئی، آفاق کی منزل سے لُٹ کر نکلی ہوئی، تلاش میں نکلی ہوئی ہوں۔

کوئی چہرہ نبی جیسا، یا کوئی لمحہ نزول جیسا، یا کوئی نزول کپکپاہٹ جیسا، یا کوئی کپکپاہٹ کالی چادر میں لپٹی ہوئی جیسی یا کوئی زمین یثرب جیسی، یا کوئی جنگ بدر جیسی یا کوئی صدا انصار جیسی یا کوئی دحی اقرار جیسی یا کوئی نعرہ منصور جیسا، یا کوئی خُدا خُدا جیسا، یا کوئی متقابل ابلیس جیسا، یا کوئی خیال انسان جیسا، یا کوئی غلام آقا جیسا یا کوئی بشر جہانداروں جیسا یا کوئی سرمایہ بے مائیگی جیسا، یا کوئی افلاس قارون جیسا، یا کوئی طبقہ سب طبقوں جیسا، یا سب طبقے ایک طبقے جیسے یا کوئی سابق اول جیسا، یا کوئی اوّل سابق جیسا۔

آفاق کی منزل سے لُٹ کر نکلی ہوئی تلاش میں نکلی ہوئی ہوں۔

تلاش میں نکلی ہوئی ایک رُدحیتی شے ہوں۔

مجھے میری تلاش کا حاصل دو ــــ مجھے میری تلاش کا حاصل دو ــــ مجھے میری تلاش کا حاصل دو ــــ

تم جمع کے صیغے اور تم تثنیہ کے صیغے اور تم واحد کے صیغے، تم میری صدا سُن کر خاموش ہو؟ تم میری صدا سن کر کیوں خاموش ہو؟ ــــ تم جمع کے صیغے اور تم تثنیہ کے صیغے اور تم واحد کے صیغے ــــ تو لو! تم خاموش رہو، میں اب احد کے صیغے میں صدا لگا رہی ہوں:

مجھے میری تلاش کا حاصل دے ــــ مجھے میری تلاش کا حاصل دے ــــ مجھے میری تلاش کا حاصل دے ــــ

آفاق کی منزل سے لُٹ کر نکلی ہوئی، تلاش میں نکلی ہوئی ہوں۔

تلاش میں نکلی ہوئی ایک رُدحیتی شے ہوں ــــ ان گنت اور بے انت اور لا تعداد اور بے نشان بے نام اور ایک اور کئی۔

احد کا صیغہ، اپنے احد کے صیغے میں بھیجتا ہے مجھ کو اور وہ احد کا صیغہ غار کے بے کواڑ دروازے پر مجھ سے کہتا ہے:
تلاش کا حاصل چاہتے ہو تو روح کے بدن میں آؤ، اور ان گنتی سے گنتی میں آؤ اور بے انت سے انت میں آؤ اور لاتعداد سے تعداد میں آؤ، اور بے نشانی سے نشان میں آؤ اور بے نامی سے نام میں آؤ۔ اور موضوع سے معروض میں آؤ اور بے وحی کتاب لکھو تو اس وحی لگن سے لکھو کہ بیٹی کا مرنا بھول جاؤ اور بیش قدمی کرو تو اس یقین سے کرو کہ جنگل کے جنگل اور پہاڑ کے پہاڑ اور دریا کے دریا اور دلدلیں کی دلدلیں تمہارے لئے چھ ہزار میل لمبا راستہ تراشتی چلی جائیں اور اپنے آفاق کی جنگ لڑو تو اس بے مایہ شاعری سے لڑو جو آواز سے تیز اڑنے والے جیٹ طیاروں کو مار گراتی ہے اور انسانی محبت کی ریاضی کے تحفظ کے لئے کھڑے ہو تو یوں کھڑے ہو کہ تمہارا اسی سالہ بڑھاپا پسِ دیوارِ زنداں بھی انسانی محبت کی ریاضی کا عدد چیختا رہے — تم سبتول میں سجا ہوا دکھ ہو اور دھوں میں اترا ہوا غم ہو اور آنکھوں میں رچا ہوا کرب ہو — یہی تمہارے نام ہیں اور یہی تمہارا نام ہے — جاؤ اب اپنی تلاش کا حاصل تلاش کرو۔

میں اتنے یہ نام لے کر اور اپنا یہ نام لے کر چل پڑتی ہوں۔

لاموجود اور موجود کی چیکنگ پوسٹ پر میری چیکنگ ہوتی ہے اور پھر پاسپورٹ دینے والا مجھے یہ پاسپورٹ دیتا ہے کہ اس روحیتی شے کے سینے میں حوصلہ ہے اور جگرے میں سکت ہے، لہٰذا اس روحیتی سے کو تذکیر کا جسم پہنا کر جانے دیا جائے۔ اس کو جانے دیا جائے کہ یہ عشق کے الوہی صفر سے جلاوطن کیا ہوا عدد نہیں ہے اور یہ لا انتہا کی لامتناہی ریاضی سے واقف ہے جس میں ایک عذابِ عشق دو ثوابِ عشق کے برابر ہوتا ہے اور دو ثوابِ عشق تین ثوابِ عشق کے مساوی ہوتے ہیں اینڈ سو آن اینڈ سو فورتھ — اس کو جانے دیا جائے کہ یہ جب لاموجود سے موجود میں داخل ہوگا تو موجود کی گلیوں میں گریباں چاک نکلے گا — گریباں چاک نکلے گا اور کبھی کنارے وجود پر اترنے والے چاند سے باتیں کرے گا اور کبھی دشت کے غزالوں سے ویرانوں میں کھوئے ہوؤں کا پتہ پوچھے گا، اور کبھی مکان کو ایک ٹھوکر سے زماں کر دے گا، اور کبھی زماں کو چوم کر لازماں بنا لے گا اور کبھی انا کی دار پر اپنا لہو اپنے چہرے پر ملے گا اور کبھی انکسار کی خاک پر ابوذر کی شباہت دے گا — اس کو جانے دیا جائے — اس کو جانے دیا جائے —

پس میں اپنا نام اور اپنا پاسپورٹ لے کر موجود کی معروضی حدود میں داخل ہو جاتا ہوں اور بے شک کہ موجود کی معروضی حدود ایک دبیز پرتوں والی اور گہری گھاٹیوں والی رات کی پر ہول لپیٹ میں ہیں اور اس دبیز پرتوں والی اور گہری گھاٹیوں والی رات کی پرہول لپیٹ پر فلوریسینٹ ٹیوبز کی گوری لائٹس حکمراں ہیں — میں موجود کی شب دار اور معروضی حدود کے ٹورزم ڈیپارٹمنٹ کے بک اسٹور سے ایک سیاحتی کتابچہ خریدتا ہوں اور سائیٹ سی انگ پر روانہ ہو جاتا ہوں۔

سمندر شہر کی یہ کولتار، چوڑی سڑک جس کے فٹ پاتھ پر میں چل رہا ہوں ٹریفک سے بھری ہوئی ہے اور یہ سارا ٹریفک شب رنگ انسانوں پر مشتمل ہے اور فلورسینٹ ٹیوبز کے روبوز ان شب رنگ انسانوں کو مشینوں کی طرح ڈرائیو کر رہے ہیں — شب رنگ انسانوں کے سر ان فلورسینٹ ٹیوبز کے روبوز کے اسٹیئرنگ وہیلز ہیں اور بازو گیئرز ہیں اور آنکھیں ہیڈ لائیٹس ہیں اور ٹانگیں پہیے ہیں اور سینے نمبر پلیٹس ہیں — فلورسینٹ ٹیوبز کے روبوز، ان شب رنگ انسانی مشینوں پر سوار اپنے اپنے ڈیپارٹمنٹل سٹورز کی طرف اور اپنے اپنے مینوفیکچرنگ پلانٹس کی طرف اور اپنے اپنے ایڈمنسٹریٹو آفسز کی طرف جا رہے ہیں — اور یہ ایک بے ستارہ رات ہے اور بے چاندرات ہے — اور میں اس بے ستارہ اور بے چاندرات میں سمندر شہر کی اس کولتار، چوڑی سڑک پر چلتا ہوا، اُس آڈیٹوریم کی طرف جا رہا ہوں، جہاں سیاحتی کتابچے کی معلومات کے مطابق ایک کلچرل شو، ہر لمحہ جاری رہتا ہے۔

آڈیٹوریم کا کلچرل شو ایک ڈانس ڈرامے پر مشتمل ہے:

دھم دھمادم، دھم — دھم دھمادم، دھم — شب رنگ انسانوں کا ایک گروہ، ڈھول کی سست رفتار تال پر کاہل رقص کرتا ہوا اسٹیج پر آتا ہے اور شب رنگ انسانوں کے اس گروہ کا ہر فرد، اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو روٹی کے لقمے کی صورت لپیٹ کر اپنے منہ کی طرف لے جا رہا ہے۔ اچانک تیز آواز اور تیز رفتار موسیقی کا طوفان آتا ہے اور اسٹیج کا مغربی گوشہ فلورسینٹ لائٹس سے جگمگا اٹھتا ہے اور پھر فلورسینٹ لائٹس کی کچھ ٹیوبز تیز آواز اور تیز رفتار موسیقی کی دُھن پر ہنگامہ پرور ناچ ناچتی ہوئی نمودار ہوتی ہیں اور ان ٹیوبز کے سروں پر روٹیوں کا ڈھیر ہے — شب رنگ انسانوں کا گروہ، وحشی چیخوں کے ساتھ روٹیوں کی طرف لپکتا ہے لیکن اپنے سروں پر روٹیوں کا ڈھیر اٹھائے فلورسینٹ لائٹس کی ٹیوبز ہنگامہ پرور ناچ ناچتی ہوئی شب رنگ انسانوں کے گروہ سے اس طرح گریزاں رہتی ہیں کہ شب رنگ انسان، ان کے سروں سے روٹیاں اٹھانے میں ناکام رہتے ہیں —

ابھی یہ ڈانس اور ڈرامہ آگے چلے گا لیکن میری دلچسپی ختم ہو چکی ہے اور اس ڈرامے کا اختتام میری سمجھ میں آ چکا ہے — بے شک کہ سمندر شہر کی کولتار، چوڑی سڑک کا منظر، اس ڈانس ڈرامے کا منظر، اس ڈانس ڈرامے کا اختتام تھا — میں آڈیٹوریم سے باہر آ جاتا ہوں، اور دوبارہ بے ستارہ اور بے چاندرات میں چلنے لگتا ہوں اور کوشش کرتا کہ اس رات سے باہر نکل جاؤں، لیکن اب یہ ناممکن ہے — بے ستارہ اور بے چاندرات مجھ سے کہتی ہے کہ اب یہ ناممکن ہے اس لئے کہ تم مجھ میں منظر منظر اور چہرہ چہرہ تقسیم ہو چکے ہو:

وہ جو دھی مگن سے بے وحی کتاب لکھ رہا ہے، وہ بھی تم ہو — اور وہ جنگلوں اور پہاڑوں اور دریاؤں میں گھومتا

میل لمبا راستہ تراش رہا ہے، وہ بھی تم ہو — اور وہ جو اپنی بے مایہ شاعری سے اپنے وقار کی جنگ لڑ رہا ہے، وہ بھی تم ہو — اور وہ جو پسِ دیوارِ زنداں اپنے اسّی سالہ بڑھاپے کے ساتھ انسانی محبت کی ریاضی کا عدد جیت رہا ہے وہ بھی تم ہو — اور جو کنارِ وجود پر اترنے والے چاند سے باتیں کر رہا ہے، وہ بھی تم ہو — اور وہ جو دشت کے غزالوں سے کھوئے ہوؤں کا پتہ پوچھ رہا ہے، وہ بھی تم ہو — اور جو انا کی دار پر اپنی خدائی کا اعلان کر کے لہولہو رہا ہے، وہ بھی تم ہو — اور وہ جو انکساری کی خاک پر فقر کی گلیم پہنے بیٹھا ہے، وہ بھی تم ہو — اور وہ جو فلورسینٹ ٹیوبز سے مشینوں کی طرح ڈرائیو ہو رہے ہیں، وہ بھی تم ہو۔

یہ بھی ہیں اور وہ بھی ہیں۔ اِدھر بھی ہیں اُدھر بھی ہیں — میں خود سے کیسے نکل سکتا ہوں اور اگر نکل بھی جاؤں تو کہاں جاؤں گا — اور اگر کہیں چلا بھی جاؤں تو کیا کروں گا — ؟ — میں کہ بزنس ایڈمنسٹریشن اور چارٹرڈ اکاؤنٹینسی سے واقف ہوں۔

اب صرف ایک ہی چارہ کار باقی رہ گیا ہے کہ اس بے ستارہ اور بے چاند رات میں منظر منظر اور چہرہ چہرہ تقسیم شدہ خود کو جمع کروں اور اس جمع کمائی سے فلورسینٹ لائٹس کے انگاروں پر لیٹی ہوئی اس رات کو آزاد کرواؤں تاکہ اس کے حلق سے سچائی کے اعلان کا مترنم چاند طلوع ہو اور اس کے کالے بالوں میں ستارے اُتر آئیں — ایک ستارہ بنی کے چہرے جیسا، اور وہ ایک ستارہ لمحۂ نزول کی کیکیاہٹ جیسا، اور ایک ستارہ یثرب کی زمین جیسا اور ایک ستارہ غلام آقاؤں جیسا اور ایک ستارہ خاک بسر جہانداروں جیسا اور ایک ستارہ سب ستاروں جیسا اور سب ستارے ایک ستارے جیسے —

سَون مُکھی

شمسؔ نعمانؔ

یہ ایک چھوٹے سے پتھر کی چھوٹی سی کہانی ہے۔

اور یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ پتھروں اور ستاروں سے منسوب کہانیاں یہاں اکثر بشارتوں اور معجزوں کو جنم دیتی ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ بشارتوں اور معجزوں کی زبان سمجھنے والے شاید اس کہانی کو نسل در نسل یاد رکھیں

یہ کہانی اس وادی کی کہانی ہے جہاں سرخ پہاڑوں کی نہوں میں ایک جانب نمک تہ در تہ میلوں دور تک پھیلتا چلا گیا ہے اور اس کی دوسری جانب انہی سرخ اور سرخی مائل مٹیالے پہاڑوں کے داس میں سے لوگ صدیوں سے کدالوں اور بیلچوں کی مدد سے کوئلہ نکالتے چلے آرہے ہیں۔

کوئلے کی انہی کانوں میں راجہ مستان خان کی وہ کان سب سے نمایاں ہے جس کی شکل ناف کے سوراخ سے مشابہت رکھتی ہے۔ اس چھوٹے سے پتھر نے بھی اسی کان کی کوکھ میں جنم لیا۔

اور ناف کے سوراخ کی بھی ایک الگ کہانی ہے جو کپل وستو کے شہزادے سدھارتھ سے منسوب ہے۔ سالا کہ ناف کے سوراخ کی کہانی اس سرمئی رنگت کے پتھر کی کہانی سے کہیں زیادہ مقدس ہے۔

راجہ مستان خان جولیاں کے کھنڈرات میں گوتم کے کٹے ہوئے سر والے بُت کے سامنے گم سم کھڑا تھا کہ گائیڈ نے اس کی شہادت کی انگلی پکڑ کر اس بُت کے سوراخ میں ڈال دی۔

"یہ سوراخ بیماریوں سے نجات کے لئے ہے"، گائیڈ نے بُت کے ناف کی جانب بڑی معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولنا شروع کیا۔

"بھکشو اس ناف کے سوراخ میں انگلی ڈال کر بیماریوں سے نجات کی دُعا مانگا کرتے تھے۔ پھر اچانک ایسا ہوا تھا کہ ــــــ"

راجہ مستان خان کے بدن میں ایک عجیب قسم کا سُرور چھا گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ قدیم دن اور ستاروں سے

ہٹ کر غاروں سے وابستہ کہانیوں میں بھی کس قدر چاشنی اور مٹھاس رچی بسی ہوتی ہے۔

"یہ خواہشوں کا تالاب ہے۔" چند سال پہلے بھی ایک گائیڈ نے نمک کے درودیوار کی تہوں میں لپٹے ہوئے پُراسرار تالاب دکھاتے ہوئے اس سے کہا تھا۔

"اس تالاب میں تین پتھر پھینکو۔ اگر تینوں پتھر پانی میں گر جائیں اور تم اس آواز کو سن لو۔ تو تمہاری ایک خواہش پوری ہو جائے گی۔ تب وہ بوڑھا گائیڈ نمک کے تین پتھر اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بے اختیار مسکرا دیا تھا۔

لیکن اس لمحے راجہ مستان خان کی کوئی خواہش ایسی نہ تھی کہ جس کے لئے وہ تین پتھر تالاب میں پھینکتا۔ وہ صرف مسکرا دیا تھا۔

"اچھی اور خوبصورت کہانی ہے۔" اس نے تینوں پتھر نمک کی دیوار میں بنے ہوئے سوراخ میں پھینکتے ہوئے گائیڈ کو جواب دیا اور آواز کی پرواہ کئے بغیر آگے بڑھ گیا کہ جہاں دیوار ابدی تھی۔ چمکتی دمکتی کہ جیسے ہزاروں ستارے نمک کی اس دیوار میں جڑ دیئے گئے ہوں۔"

"اس دیوار کو زبان سے تین بار چاٹنے والا انسان امر ہو جاتا ہے۔" گائیڈ نے دیوار کے پاس رکتے ہوئے دیوار کی جانب اشارہ کیا۔

"یہ بھی ایک اچھی اور خوبصورت کہانی ہے۔" وہ آگے بڑھ گیا۔

لیکن اب نہ جانے اسے کیا ہوا تھا کہ وہاں سے جانے کو اس کا جی نہ چاہتا تھا۔ پھر یکایک اس کے ذہن میں جیسے بجلی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ وہاں سے بھاگ اٹھا۔

کار کا سپیڈو میٹر۔ رفتار کی سوئیاں۔ پہاڑوں میں بل کھاتی سڑکیں۔ زندگی اور موت سے گھتم گتھا ہوتے ہوئے موڑ سب کچھ آپس میں الجھ رہے تھے اور یوں وہ سورج ڈوبنے سے پہلے اسی کان کے دہانے پر کھڑا تھا (بے شک جاننے والے جان گئے ہوں گے کہ یہ چند سال پہلے کی باتیں ہیں جو اس قصہ کو آگے بڑھاتی ہیں)

"منشی جی! اس کان کے دھانے پر جسیم پتھر کی ایک گول دیوار اس طرح سے چنوا دیں کہ جب کوئی اسے دُور سے دیکھے تو دیکھنے والے کو اس پہ ناف کے سوراخ کا شبہ ہو۔"

"کیا بات ہے راجہ جی!" منشی نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"یہاں کوئی معجزہ ہونے والا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کان میں کہانی جنم لے گی۔"

پھر کان کے باہر جسیم پتھروں کی ایک گول دیوار چن دی گئی اور راجہ مستان خان لمحہ بہ لمحہ کسی معجزہ کے ظہور

میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔

معجزہ تو کوئی نہ ہوا۔ لیکن ڈھوک ـــــ کی زیتون بیگم منور اس کی زندگی میں داخل ہو گئی۔

زیتون بیگم کوئی سیدھی سادھی شرمیلی سی لڑکی نہ تھی ایک قریبی چک کے علی اصغر کی بیوی تھی۔

علی اصغر جو شہر کی کسی فیکٹری میں کام کیا کرتا تھا اور تین تین چار چار ماہ بعد گاؤں آتا تھا تو ٹھنڈی ٹھار زیتون بیگم ڈوبتے سورج کے پنڈے کی مانند سلگ اٹھتی۔ لیکن ایک دم دو دیوم کی چھٹی اور اس پر بھی گھر کے جیسیوں کام زیتون بیگم تپتے تانبے کی مانند جب آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہوتی تو اسے علی اصغر اور اس کے ماحول سے سخت نفرت ہو جاتی زیتون کی جوانی اور اس کی خوبصورتی کی مثال چک اور اس کے آس پاس کی ساتوں ڈھوک میں نہ ملتی تھی۔ پھر ہوا یوں کہ۔

زیتون علی اصغر کے تین بچوں کی ماں تو بن گئی لیکن علی اصغر کے لئے اس کے دل میں ذرہ بھر بھی محبت نہ پیدا ہو سکی۔ محبت ہوتی بھی کیسے۔ ڈھوک کے گھبرو جوان سجاول کی جگہ لیا تو نگا۔ سوکھا مریل کا اکلوتا علی اصغر بھلا کہاں اس کے دل کو بھاتا تھا۔ اگر سجاول کی ماں اپنی بہن کی بیٹی کو اپنے گھر لانے کے لئے ضد نہ کرتی اور سجاول بھی کون سا سچا نکلا وہ بھی تو اپنی ماں کے آگے سر جھکا کر بیٹھ گیا تھا۔

اور یوں اسی دن سے زیتون نے محسوس کیا کہ اس کے دل میں ایک سوراخ سا ہو گیا ہے جو دن بدن پھیلتا ہی چلا گیا۔

علی اصغر بھی عجیب نکلا۔ جنگ کے دوران فوج میں بھرتی ہو کر ایسا گیا کہ پھر نہ لوٹا۔ قید سے واپس آنے والوں میں سے ایک نے بتلایا کہ آخری بار علی اصغر کو آسام کے جنگلوں میں چند جاپانوں کے ساتھ بھاگتے دیکھا۔ پھر کوئی اتہ نہ پتہ۔

چک والے کہتے کہ زیتون بیگم بڑے دل گردے والی زنانی ہے اور یہی دل گردے والی زنانی ایک رات جب اپنی کوٹھڑی میں سوئی ہوئی تھی کہ اچانک اس نے اپنے کندھوں پر ایک بوجھ سا محسوس کیا۔

"میں اکبر ہوں!" ایک بھاری بھرکم بوجھ تلے دبی ہوئی لرزتی زیتون کے کانوں میں کسی نے سرگوشی کی۔

اکبر۔ جو اصغر کا بڑا بھائی تھا۔

اگلی صبح گاؤں والے حیران تھے کہ زیتون آخر تین بچوں کو چھوڑ کر کیسے کیوں چلی گئی۔

اور اب یہی زیتون ماجد ستان خان کی زندگی میں رچی بسی جا رہی تھی۔

راجہ مستان خان کوئی ان پڑھ ۔جاہل یا گنوار نہ تھا۔ علاقے کے چند گنے چنے لوگوں میں اس کا شمار تھا۔ پینتالیس سینتالیس کے سن میں بھی اس کی ہڈیوں اور گوشت میں بڑی جان اور پھرتی تھی۔ اللہ نے سب کچھ دیا تھا۔ زمینیں، کانیں موٹر۔ کوٹھی ۔ گھر گرہستی بیوی۔ تین بیٹے۔ دو بیٹیاں۔ نوکر چاکر۔

لیکن اب ۔اب راجہ جی کو سوائے زیتون کے اور کچھ نہ چاہیئے تھا۔

کل شام ہی کی بات ہے۔

جب اسی کان میں بوڑھا حیدر بخش اپنی کدال سے کوئلہ کھود رہا تھا کہ اچانک ایک پتھر اس کی ہتھیلی پر آسمان سے ٹوٹتے ہوئے ستارے کی مانند آن گرا۔ سرئی رنگ کا چھوٹا سا پتھر جس میں سینکڑوں سنہری ذرات چم چم کر رہے تھے۔ حیدر بخش کدال پھینک کر بھاگتا ہوا باہر آیا اور اس نے پتھر کرم دین کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"منشی جی۔ سون مکھی ۔"

"منشی کرم دین سیانا تھا۔ عمر گزر گئی تھی پتھر کھاتے۔ ایک پل میں آنے والے وقت کی کہانی سمجھ گیا۔ اس نے اپنے اندر جنم لینے والی خوشی کو چھپاتے ہوئے حیدر بخش کو جھڑک دیا۔

"تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے یہ تو کوئلہ ہے۔ کوئلہ۔ اور یہ چمک ۔۔۔ پاگل بڈھے کبھی کبھار کوئلے کے اندر کی گرمی سے پیدا ہو جاتی ہے۔ جا اپنا کام کر۔"

تب اس نے حیدر بخش کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا اور اس کا منہ چڑاتے ہوئے بڑبڑایا۔

"سون مکھی ۔۔۔ ہونہہ۔

حیدر بخش تو خاموشی سے کان میں واپس چلا گیا اور جا کر نواب دین۔ صفدر شاہ۔ رحمت علی اور ظہور حسن کو بتلانے لگا کہ یارو مجھ سے غلطی ہو گئی۔ بھلا سون مکھی ان پہاڑوں میں کہاں ؟

عین اسی لمحے راجہ مستان خان ناشپاتی اور کھاٹ کے باغوں کے بیچوں بیچ بہنے والی امرکنڈ ندی کے کنارے پانی میں پاؤں ڈالے زیتون کے پاس بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا۔

"زیتون ! یہ وقت بھی عجیب کروٹیں لیتا ہے۔"

زیتون بیگم نے اپنا سر اس کی گود میں سے اٹھایا اور ایک پل کے لئے ٹھٹھکی کہ شاید راجہ جی آج پھر اس کے ماضی کی گمشدہ کڑیوں کی تصویریں ابھرتی دیکھ رہے ہیں۔ وہ خاموش رہی اور صرف مسکرا دی پھر اس نے راجہ جی کی آنکھوں میں دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں۔

"راجہ جی ندی سے گزرتے ہوئے پانی کی لہریں نہیں گنا کرتے۔"

اچانک اسی پیار بھرے لمحے میں درختوں سے چند پرندے پھڑپھڑاتے ہوئے اُڑے اور راجہ جی نے باغ میں آنے والے کے قدموں کی چاپ خود سُن لی۔

"یہاں سوائے منشی کرم دین کے اور کوئی نہیں آسکتا زیتون۔ یہ راجہ ستان خان کا باغ ہے۔ سمجھو"

"آؤ راجہ جی" راجہ جی اٹھ کھڑے ہوئے اور زیتون سہم کر ندی کے کنارے جھک کر بیٹھ گئی۔ لیکن آنے والے کے قدم کچھ دُور پرے تکارٹ کے جھنڈ کے پاس ہی رک گئے تھے۔

"ادھر آئیے سرکار۔ ایک بڑی خبر ہے۔"

راجہ زیتون کو چھوڑ کر جھنڈ کی جانب تیزی سے بڑھے۔ اتنی ہی تیزی سے ان کا دل دھڑکا تھا۔

"راجہ جی! سونا نکلی"۔ منشی جی نے راجہ ستان خان کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر پتھر رکھتے ہوئے کہا۔

"ابھی ابھی بڑی کان میں سے یہ پتھر ملا ہے۔ سونا۔ کھرا سونا۔ سرکار"

"زیتون!"۔ راجہ جی خوشی سے اچھل پڑے اور انہوں نے زیتون کو آواز دینا چاہی کہ منشی جی نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"عورت کے پیٹ میں بات نہیں رہتی سرکار" راجہ جی منشی کی بات سمجھ گئے۔

"میں یہ کہتا تھا منشی جی ایک دن ضرور کوئی معجزہ ہوگا۔ منشی ابھی واپس جاؤ اور جا کر مزدوروں سے کہو کہ یہ پتھر منحوس ہے۔ پچھلے سال جو کان بیٹھی تھی اس میں سے بھی یہی پتھر نکلا تھا۔ کام بند کرا دو۔ مزدوروں کو ہراساں کردو۔ خوف زدہ کردو۔ اس قدر خوف زدہ کردو اس کان کی جانب رخ کرنے کی بجائے اس سے میلوں دور بھاگیں۔" راجہ ستان خان ایک ہی سانس میں بولے جا رہا تھا۔

"اور آج رات۔ تم اور میں۔ اس پتھر کی تلاش میں کان میں گزاریں گے۔ جاؤ منشی جی دیر نہ کرو۔ آج کی رات صرف تم اور میں۔ سمجھے"۔

اور منشی کرم دین تیزی سے ایک سائے کی مانند جھنڈ میں غائب ہو گیا۔

زیتون مسکرانے لگی۔

یہ اسی رات کا ذکر ہے راجہ ستان خان کدال سے کوئلہ کی دیواروں میں دراڑیں ڈالتا رہا۔ اس کی انگلیاں طارچ کی روشنی میں ایک ایک سیاہ پتھر ایک ایک ذرے کو ٹٹولتی رہیں۔

لیکن منشی کرم دین باہر بیٹھا ہوا اس ہولناک رات کے پُراسرار سناٹے سے بے حد سہما ہوا تھا۔ دیوقامت پہاڑوں کی گود میں اتری ہوئی رات، پُراسرار اور خوفناک رات منشی جی نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔

تب کان سے اندر کدال کی آواز مدھم پڑنے لگی۔ پھر اچانک کدال کی آواز خاموش ہو گئی۔ منشی کرم دین کا دل جیسے کوئی ڈائن چاٹ گئی ہو۔ وہ رینگتا ہوا کان میں داخل ہوا تو راجہ مستان خان کی لاش دیکھ کر اس کی چیخ اس کے گلے میں اٹک گئی۔ اور وہ چھوٹا سا پتھر، ٹارچ کی روشنی میں راجہ جی کے کھلے ہاتھ کی انگلیوں میں اٹکا ہوا چم چم کر رہا تھا

اور آج صبح جب لوگ راجہ مستان خان کا جنازہ اٹھا رہے تھے تو چک شمالی کے لوگ حیران تھے کہ زیتون بیگم میکے سے سسرال کیوں واپس آ گئی ہے۔

زرد پہاڑ

غلام الثقلین نقوی

اس چوک پہ پہنچتے ہی لمحہ دو دھاروں میں بٹ گیا!

دھارے الٹی سمت میں بہنے لگے۔ وہ ہیولیٰ جو ازل سے اس کے ذہن کے اُفق پر مرتسم تھا یک دم جدا ہوا اور زرد پہاڑ بن گیا۔ ایک دھارا زرد پہاڑ سے دور ہٹتا گیا۔ دوسرا دھارا اسے زرد پہاڑ کی طرف کھینچنے لگا اور ہجوم چوک پر رُکا کھڑا تھا کیونکہ لال بتی اس کا راستہ روکے ہوئے تھی۔

ناگاہ زرد پہاڑ کی چوٹی سے ایک ندا آئی "یا اخی! یا اخی!"

سڑک کے پار سے ایک لمبا سائرن ہوا۔ سبز بتی جلی اور ہجوم بے تاب ہو کر چوک کو عبور کرنے لگا۔ تب دو دھارے اچانک مل گئے۔ زرد پہاڑ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ دھوپ میں ڈھلے ہوئے زرد پتھروں کے سوا اب کچھ نظر نہ آتا تھا۔

"دیکھتے نہیں آپ، لال سگنل ہو گیا ہے۔"

وہ اس تہدید پر عین چوراہے میں رُک گیا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے سڑک کے پار کا منظر دیکھا۔ اونچی اونچی چھتوں والی ہیبت ناک عمارتوں نے ہجوم کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔ گڑ ڈڑ.... گڑ ڈڑ۔ مشینوں کے گھومتے ہوئے پہیوں کی آواز اس کے کانوں میں آئی تو اس نے کہا اگر میں نے چوک عبور نہ کیا تو پھاٹک بند ہو جائے گا اور میں ادھر رہ جاؤں گا۔"

"جب سبز سگنل ہوا، آپ فٹ پاتھ پر کھڑے رہے اور لال سگنل پر آپ نے چوک کو عبور کرنا چاہا۔ اپنی جان کی پرواہ نہیں تو کم از کم ٹریفک میں تو خلل نہ ڈالیے۔"

"یہ کوئی پاگل ہے۔"

"شکل تو ایسا معلوم نہیں ہوتا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ خلا میں گھور رہا ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ کسی نظر نہ آنے والی چیز کو دیکھ رہا ہے۔"

"رات بھر جاگا ہوگا۔ اب عین چوراہے میں اسے نیند آ گئی ہوگی۔"

"جی نہیں۔ وہ جاگ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ اس کی نظریں دُور افق پر لگی تھیں۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ کم از کم مجھے تو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا جسم اس دنیا میں ہو۔

اس کی روح اس دنیا میں نہ ہو۔"

وہ ایک بیمار سی لڑکی تھی۔ وہ چوک سے اس طرف اسے فٹ پاتھ پر اکثر نظر آیا کرتی تھی۔ وہ ہجوم سے الگ تھلگ نظر آتی۔ وہ سر جھکا کر کھڑی رہتی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ننھا سا بریف کیس ہوتا۔ ہجوم کا ہر شخص اس پر ایک نظر سرور ڈالتا تھا۔ وہ ان نظروں سے یوں بچتی جیسے یہ زہر میں بجھے ہوئے تیر ہوں۔ پر دیکھنے والا بھی مجبور تھا۔ اس کے زرد و زرد چہرے پر ایسی کیفیت تھی جو ہر نظر کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ ایک جستجو، ایک جائزے کے لئے کیونکہ یہ چہرہ ہزاروں میں سے منفرد تھا اور چہروں کے ہجوم میں کوئی کوئی چہرہ ایسا ابھرتا ہے جو تجسّس بھری نظروں کو اپنی طرف کھینچ سکتا ہے۔

پھر ایک دن جب لمحے کا دھارا دو حصوں میں بٹنے والا تھا وہ فٹ پاتھ پر اس کے قریب آ کر رُک گئی۔ چوک پر ہجوم بے تاب کھڑا تھا۔ لمحہ دو حصوں میں بٹ گیا۔ زرد پہاڑ فضا کا سینہ چیر کر ابھرا۔ اس کی ہر دیوار آسمان سے لگ گئی۔

اتنے میں ایک آواز اس پہاڑ کی طرف سے آئی "یا اخی! یا اخی!"

ہر ایک نے یہی سمجھا کہ "کوہ ندا" سے اس کی طلبی ہوئی ہے۔ چوک کی سبز بتی روشن ہوئی تو ہجوم زرد پہاڑ کی سربفلک چوٹیوں کی طرف رواں دواں ہوگیا۔ لیکن اس کے قدم زمین سے چپٹے رہے۔ جب تک کوہ ندا سے طلبی نہ ہو، اس کے قدم زمین سے آزاد نہیں ہو سکتے تھے۔ ہجوم نے چوک کو عبور کیا تو زرد پہاڑ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ ابھی لمحہ گزرا نہیں تھا کہ کھٹ سے سُرخ بتی روشن ہوگئی۔ اس نے ایک قدم بڑھانا چاہا تو زرد چہرے والی بیمار سی لڑکی نے کہا "رُک جائیے۔"

"وہ رُک گیا۔"

"معاف کیجئے۔ ابھی سبز بتی روشن ہوگی۔ پھر ہم دونوں چوک کو عبور کریں گے"

اس لڑکی نے جھکی جھکی آنکھیں اٹھا کر اس کے چہرے کا اڑتا سا جائزہ لیا۔

یہ خواب آلود پیار سی آنکھیں تھیں۔ پر ان سے ہمدردی اور شفقت کی جو پھوار برسی تھی اس نے اس کی روح کو دھو کر صاف و منزہ کر دیا تھا۔

ان دونوں نے پہلو بہ پہلو چوک کو عبور کیا۔ اس نقطے پر جہاں ان کے رستے جدا ہوتے تھے اس نے پوچھنا چاہا: "کیا آپ بھی زرد پہاڑ سے آنے والی ندا کو سنتی ہیں۔ کیا آپ کو زرد پہاڑ کا راز معلوم ہے؟"

پھر اس نے سوچا۔ "مجھے یہ راز اپنے طور پر معلوم ہونا چاہیئے"

وہ لڑکی خاموشی سے اپنی راہ پر چلی گئی۔

"یہ لڑکی کون ہے یار؟"

"مجھے تو معلوم نہیں"

"فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے تو کسی کو نہیں دیکھتی"

"بیمار بیمار سی معلوم ہوتی ہے"

"مجھے حق بیمار میں بڑی کشش محسوس ہوتی ہے۔ وہ بڑی بڑی آنکھیں کتنی اداس ہیں! یہی ان کی کشش کا راز ہے"

"پھر کرو پیچھا اس کا! کبھی تو اسے دفتر سے دیر ہوگی یا گھر جانے کی جلدی ہوگی۔ کار پر لفٹ کی پیش کش کر دینا"

"نہیں..... وہ بدک جائے گی۔ یوں وہ کسی فیکٹری میں ٹائپسٹ ہوگی۔ کبھی پتہ چل ہی جائے گا۔ وہ ان کے ساتھ دوسرا کون تھا؟"

"کل والا فلسفی..... پہچان نہیں سکے تم؟"

"کبھی کسی ٹریفک کے حادثے کا شکار ہو جائے گا"

"تمہیں اس سے کیا؟"

"ہاں مجھے اس سے کیا؟"

"بیٹھے جاگ رہی ہو؟"

"جی ہاں! اباجان"

"آج چھت پر سے چلو گی مجھے؟"

"آپ بیمار ہیں۔ اتنی سیڑھیاں چڑھ کر آپ تھک جائیں گے۔"

"مدت سے میں نے کوہِ ندا کو آفتاب کی سُرخ کرنوں سے جنم لیتے نہیں دیکھا۔"

"کوہِ ندا"؟ اس کی کٹورا سی آنکھیں جن میں بیماری کی زردی جھلملا رہی تھی، حیران ہو گئیں۔

"کوہِ ندا وہ ہے جس کے قلعے کی ہر دیوار آسمان سے لگ رہی ہے اور اس سے خود بخود آواز آتی ہے۔ کچھ لوگ اسے "دن کا زرد پہاڑ" کہتے ہیں۔ میں وقت کا حاتم ہوں پر ابھی تک اس کا راز نہیں پا سکا۔"

"اباجان! یہ آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔"

"زرد پہاڑ سے کبھی کبھار کسی کی طلبی ہوتی ہے۔ آواز سب سنتے ہیں۔ پر ہم اس کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ وہ اکیلا اس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر غائب ہو جاتا ہے۔ اُدھر کا حال کسی کو معلوم نہیں بیٹی! مجھے چھت پر لے چلو گی؟ شاید وقت کے اس حاتم کو آج کوہِ ندا سے بلاوا آ جائے۔"

بیمار جوانی نے بڑھاپے کا ہاتھ پکڑا کیونکہ وہی اس کا واحد سہارا تھی۔ بیمار آنکھوں کے کنول شبنم سے لبریز تھے۔ چھت پر صبح کا دُھندلا اُجالا تھا۔ مشرق کا دامن لرزا۔ ایک آتشیں تیر چلا اور مشرق کے دامن میں آگ لگ گئی۔ تب سورج نکلا۔ بڑھاپے کے ہونٹ کانپے "مجھے نیچے لے چلو بیٹی! ابھی میری طلبی نہیں ہوئی۔"

بیمار جوانی بڑھاپے کا ہاتھ پکڑ کر اسے نیچے اتار لائی۔

"بیٹی! تو جب شام کو آتی ہے تو تھک کر چوُر ہوتی ہے۔ پھر بھی تجھے کھانا پکانا پڑتا ہے۔ چھوٹے بھائیوں کی دیکھ بھال کرنی ہوتی ہے۔ تیری تنخواہ سے دو وقت کی روٹی مشکل سے چلتی ہے۔ تو میرے بڑھاپے کو کب تک سہارا دیتی رہے گی ـــ مجھے اپنے حال پر چھوڑ دو۔ اپنی تنخواہ کا وہ حصہ جو تم میرے بیمار بڑھاپے کی نذر کر دیتی ہو اسے اپنے پر صرف کرو۔"

"نہیں ابا۔"

"آپ پھر ڈر گئی ہیں۔" اس نے پوچھا۔

"جی رش بہت زیادہ تھا۔ میں نے چاہا کہ ہجوم گزر جائے تو چوک عبور کروں۔"

"کوہِ ندا سے آنے والی آواز کو آپ نے بھی سُنا؟"

"کوہِ ندا"

وہ لڑکی حیران ہو کر اُسے دیکھنے لگی۔

"جی ہاں! دن کا زرد پہاڑ۔ وہ ابھی افق کے کناروں سے اُبھرا تھا"

"دن کا زرد پہاڑ"؟ لڑکی نے حیرت سے دوہرا کر پوچھا۔

"میں اس لمحے اسے ہر روز ابھرتا ہوا دیکھتا ہوں"

آپ نے وہ آواز سنی؟

میں ہر روز وہ آواز سنتا ہوں۔ ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ وہ آواز اس کے لئے ہے۔ جبھی تو سارا ہجوم اس کی طرف لپک اٹھتا ہے۔ اب کون جانے کہ اتنے بڑے شہر میں وہ آواز کس کے لئے تھی اور کس کے لئے آئی تھی اور کون اس کی چوٹی پر پہنچ کر دوسری طرف گیا تھا۔ ہجوم اس پہاڑ کے تلے پہنچتا ہے تو پہاڑ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے"

"اور آپ؟"

"میں نے جب بھی آواز سنی، لال بتی نے میرا راستہ روک لیا۔ ایک دن آئے گا کہ میں لال بتی کی پرواہ نہیں کروں گا۔ اُدھر کی طلب دھیرے دھیرے میرے خون میں رچ بس رہی ہے"

"وہ پہاڑ مجھے تو نظر نہیں آتا"

"آپ اسے ہر روز دیکھتی ہیں پر وہ آپ کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے"

"میں نہیں سمجھی"

"میں بھی نہیں جانتا۔ ایک لمحہ دو دھاروں میں بٹ جاتا ہے۔ ایک دھارا کوہِ ندا سے اُلٹی سمت میں چلتا ہے۔ دوسرا اس کی سمت سے بہتا ہے، وہ لمحہ آئے گا تو....."

ایک کار ان کے قریب آکر فٹ پاتھ سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

"خاتون! آپ کس فلسفی سے الجھ گئیں؟" ایک انتہائی مہذب آواز نے کہا۔

"آپ کون ہیں؟"

میں راہ گیر ہوں۔ اس فلسفی کو روز فٹ پاتھ پر دیکھتا ہوں۔ یہ دوسروں کو گمراہ کرتا ہے۔

"مجھے میرے حال پر چھوڑیئے۔ شکریہ"

میں دیکھتا ہوں کہ آپ بیمار ہیں۔ پھر بھی آپ کام کرنے پر مجبور ہیں۔ آپ کی انگلیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ٹائپ کرتی ہیں۔ ٹائپ کرنے سے پھیپھڑے کمزور ہوتے ہیں۔ یوں بھی آپ اچھی خوراک نہ ملنے کی وجہ سے خون کی کمی میں مبتلا ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ......

"مجھے آپ کا مشورہ درکار نہیں۔ شکریہ۔"

"پھر بھی کبھی ضرورت محسوس ہو تو میں اس سامنے کے کونے میں ہر روز کار کھڑی کرکے آپ کا پانچ منٹ تک انتظار کیا کروں گا۔ میں مشورہ دینے میں صبر سے کام لینے کا عادی ہوں۔"

اس لڑکی نے دونوں کان بند کرکے کہا۔ "نہیں..... نہیں..... مجھے آپ کا مشورہ درکار نہیں۔"

"یہ کون تھا؟" اس نے لڑکی سے پوچھا۔

"ایک راہگیر۔"

"معلوم ہوتا ہے اسے ابھی زرد پہاڑ کا نظارہ نصیب نہیں ہوا۔"

"سبز بتی ہو گئی ہے!"

"ابا جان! زرد پہاڑ کے اس طرف کیا ہے؟" اس نے اچانک سوال کیا۔

"میں اس راز سے واقف نہیں ہوں بیٹی!"

"اس دن آپ کہہ رہے تھے کہ آپ وقت کے حاتم ہیں۔"

"ہاں! میں وقت کا حاتم ہوں۔ ہر شخص وقت کا حاتم ہے پر جب تک اس کی 'ذات دگر' کی کوہ ندا سے طلبی نہ ہو، وہ اس کے راز سے واقف نہیں ہو سکتا۔"

"وہ 'ذات دگر' کون سی ہے؟"

"مجھے اس کا شعور نہیں ہے۔"

"کسی کو اس کا شعور ہوا؟"

کہتے ہیں کہ یمن کے ایک شہزادے حاتم کو ہوا۔ وہ کوہ ندا کی تلاش میں اس کے دامن تک پہنچا تو اسے اپنی 'ذات دگر' مل گئی۔ داستانوں میں یوں آیا ہے، "غرض چھ مہینے حاتم کو اس شہر میں گزر گئے اور اس عرصے میں اس طرح سے پندرہ آدمی اس پہاڑ کی طرف گئے اور پھر نہ پھرے۔ اتفاقاً ایک شخص حاتم نامی وہاں تھا، حاتم میں اور اس میں نہایت دوستی تھی اور محبت اخلاص کی ہو گئی تھی۔ اس ڈھب سے وے دونوں دن رات ایک

جگہ رہتے تھے ... "

" پھر کیا ہوا؟"

اس حاتم کو جو اس کی ذات دگر تھا، کوہِ ندا کے قلعے سے بلاوا آیا۔ وہ چوٹی کی طرف لپکا۔ تب حاتم اپنے جی میں کہنے لگا کہ یہ بھی اس طرف چلا جائے گا، افسوس ہے کہ مجھ کو اس سے محبت و الفت بہت سی ہو گئی تھی اب یہ بھی جدا ہوتا ہے، میں اس کو ہر گز نہ چھوڑوں گا۔ اس بات کو ٹھہرا کر کمر کس کر باندھی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر پہاڑ کی طرف دوڑا۔ دونوں گرتے پڑتے پہاڑ کے اوپر جا پہنچے۔"

اس کے باپ نے رُک کر اس پر نظر ڈالی بیمار لڑکی کی آنکھوں کے کنول حیرت کی جھیل میں ڈوب ڈوب کر اُبھر رہے تھے۔

" پھر کیا ہوا؟" لڑکی نے پوچھا۔

بوڑھے باپ کو اس کی آواز بڑی پُر اسرار سی محسوس ہوئی۔ کسی انجانے سفر پر روانہ ہونے والے مسافر کی آواز جس کی نظروں کے سامنے عجائبات کی کوئی کھڑکی ذرا سی وا ہو گئی ہو۔

" جوں ہی وہ نزدیک قلعے کے گئے، ایک کھڑکی دکھائی دی۔ یہ دونوں پٹے لپٹائے اس کے اندر چلے گئے۔ لوگوں کی نظروں سے غائب ہوئے۔ کھڑکی سے آگے، محلہ خوشنما تھا، ایک سبزہ زار نظر پڑا کہ گویا فرش زمردی چاروں طرف بچھا ہے، پر تھوڑی سی زمین اس میں خالی تھی۔ وہ جوان اس پر پاؤں رکھنے لگا۔ پاؤں رکھتے ہی چھت گر پڑا زمین تڑق گئی۔ وہ جوان اس میں سما گیا۔ ویوں ہی وہ جگہ سبز ہو گئی۔"

" حاتم کی ذاتِ دگر کو سبزہ زار میں جگہ مل گئی تو حاتم کا کیا بنا؟" لڑکی نے پوچھا۔

اب اس کی آواز میں فلسفۂ زندگی کے آسمان سے نازل ہونے والی ایک ننھی منی کرن لرز رہی تھی۔ بوڑھا باپ بولا "حاتم وہاں سے چل کر ایک پہاڑ بلند عظیم الشان کے نیچے جا پہنچا۔ جس پتھر کو اٹھا کر دیکھا، اس کے نیچے لہو ہی پایا۔ بارہ دن کے بعد اس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا۔ ایک میدان کفِ دست دکھائی دیا کہ وہاں کی خاک اور جانور، چرندے پرندے بیر بہوٹی سے لال ہو رہے ہیں۔ چھ کوس اور چلا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک دریا لہو کا لہریں لے رہا ہے گھبرایا کہ اس دریا سے کیونکر پار ہوں گا۔"

" اس نے دریا پار کر لیا؟" لڑکی نے پوچھا۔

" بات دراصل یہ ہے کہ ذاتِ دگر کی رہنمائی سے محروم ہو کر انسان پھر زرد پہاڑ کے اس طرف آ جاتا ہے۔

اس طرف جہاں کف دست میدان ہیں۔ لہو کے دریا لہریں لیتے ہیں، سراغ راہ نہیں ملتا۔ آب و دانے کا نشان بھی نہیں پایا جاتا۔ کوئی سایہ دار درخت بھی نہیں کہ جس کی چھاؤں تلے انسان چند لمحوں کے لئے سستا لے۔"

لڑکی کے زرد چہرے پر امید کی جو کرن ٹمٹماتی تھی بجھ گئی۔

بیٹی! جب کوہ ندا سے طلب ہوگی تو میں سبزہ زار کی تمنا میں چوٹی کو عبور کر جاؤں گا۔ پھر وہ راز میرے ساتھ دفن ہو جائے گا کیونکہ اس وقت میں نہ رہوں گا۔ البتہ میں زرد پہاڑ کے اس طرف کے راز سے پورا پورا آگاہ ہوں۔"

"اس طرف کا راز کیا ہے؟"

اس طرف مشغلوں کا شور ہے۔ بیستوں کی باس ہے۔ خونخوار بیماریوں کا تعفن ہے۔ سڑتے ہوئے جسم اور مضمحل اعضاء ہیں، باسی ہونٹ اور مسلے ہوئے پھول ہیں۔ کرم خوردہ لاشیں ..."

"ابا جان"! وہ انگلیوں میں انگلیاں دے کر چیخی۔ ..."

"میں بڑا ظالم ہوں۔ میں نے زرد پہاڑ کے راز سے تجھے کیوں آگاہ کیا؟ میرا کرم خوردہ بڑھاپا جوانی پر رحم کیوں نہ کھا سکا؟ میں نے کیا کیا؟ میں نے وقت کا حاتم بن کر کوہ ندا کے اسرار سے پردہ کیوں اٹھایا۔ اس انجانی منزل کی طرف ہر ایک کو اپنے اپنے شعور کے مطابق خود بڑھنا چاہیئے تھا۔"

اور دوسرے دن جب پو پھٹی اور صبح ہوئی تو اس پیاری سی لڑکی کے سامنے زرد پہاڑ سینہ تانے آ کھڑا ہوا، اس کے کنول نین صبح کی اداس شبنم کی بجائے زرد دھوپ کے کوڑیالے خون سے لبریز ہو گئے۔

"بیٹی! میں محسوس کر رہا ہوں کہ بیچھے بلاوا آنے والا ہے۔"

"ایسا نہ کہیئے ابا جان!"

ہجوم زرد پہاڑ سے آنے والی ندا کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ دونوں فٹ پاتھ پر اکٹھے ہو گئے۔

"آیئے! چوک کو عبور کر جائیں۔" لڑکی نے کہا۔

ایک قدم آگے بڑھ کر اس نے چونکی ہوئی آواز میں کہا "ٹھہریئے۔"

وہ ٹھہر گئی۔

اس نے پوچھا آپ کی آنکھوں کی وہ پیاری سی اداسی کیا ہوئی؟

"مجھے نہیں معلوم۔"

"میں نے ابھی ابھی آپ کی آنکھوں میں خوف کے کوڑیالے سانپ کو کنڈلی مارے بیٹھا ہوا دیکھا تھا۔ کیا میرا واہمہ تھا؟"

"نہیں۔"

"تو گویا آپ نے بھی زرد پہاڑ کا نظارہ کر لیا ہے؟"

اس لڑکی کے لب بات کرنے کے لئے کھلے ہی تھے کہ ندا آئی "یا اخی! یا اخی۔"

ہجوم زرد پہاڑ کی طرف لپکا لڑکی کے ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔

اس نے سہم کر نوجوان کا ہاتھ تھام لیا اور پوچھا "یہ ندا کس کے لئے تھی؟"

"میں نہیں جانتا۔ اتنے بڑے ہجوم میں سے میں اسے کیسے پہچان سکوں؟"

"میں نے اس ندا کی کپکپاہٹ میں ایک ہیولے کو دیکھا وہ ہجوم میں کھڑا تھا۔ جب ندا آئی تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ زرد پہاڑ کی طرف لپکا۔ وہ کون تھا؟"

"میں نے اسے نہیں دیکھا۔ کوئی وقت کا ماتم ہو گا۔"

"اب میں اسے پہچان گئی ہوں۔"

"وہ کون تھا؟"

"وہی جو مدتوں سے زرد پہاڑ کی چوٹی کے اس طرف جانے کے لئے بے تاب تھا۔ آج صبح صبح اس نے مجھ سے کہا تھا، بیٹی! میں محسوس کر رہا ہوں آج جب مجھے کو وہ ندا سے بلاوا آنے والا ہے۔"

"پھر تو یہ ندا اُسی کے لئے تھی؟"

جی ہاں! آج میں چوک کو عبور نہیں کروں گی۔ آپ جائیے!

وہ لڑکی فٹ پاتھ پر مڑ گئی۔ لال بتی کے بعد ہری بتی آ ہوئی۔ اسے چوراہے کو عبور کرنے کا اذن مل گیا تھا لیکن اس کے قدم آگے نہ بڑھ سکے۔

وہ لڑکی کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

"خاتون! آپ بہت پریشان ہیں۔"

وہ خاموش رہی۔

"آپ بہت جلدی میں ... رہ ..."

"نہیں" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"مجھے خدمت کا موقع دیجئے۔ دیکھئے میری کار حاضر ہے۔ دھوپ تیز ہے اور آپ کا گھر یہاں سے دُور ہے۔"

"دُور تو ہے . . " اس کے جلتے ہوئے تلووں سے آواز آئی۔

"پھر آئیے نا میری کار میں۔ میں آپ کو گھر تک پہنچا دوں۔"

"ذرا رُک جائیے۔" ایک آواز نے اُسے دُور سے پکارا۔

"اس فلسفی کی بات نہ سُنیئے خاتونِ مکرم۔ یہ آپ کو باتوں میں الجھائے گا۔ یہ آپ کو منزل پر نہیں پہنچنے دے گا۔ آپ تھکی ہوئی ہیں۔ فٹ پاتھ تپ رہا ہے۔ آپ کے تلوے جل رہے ہیں۔"

"ذرا رُک جائیے۔ میں آپ کا ساتھ دوں گا۔ اس سفر میں آپ کو ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔ ابھی ابھی ایک لق و دق میدان آئے گا جہاں نہ سبزہ ہے نہ سایہ۔ پھر لہو کا لہریں لیتا ہوا دریا۔" نوجوان بولا۔

"میری کار بہت تیز رفتار ہے۔ میں اسے سو میل کی سپیڈ پر بھی چلا سکتا ہوں۔ ایک منٹ کے اندر اندر . . . . ."

لڑکی فٹ پاتھ پر رک گئی۔

"آپ کی کار لہو کے دریا کو عبور کرے گی؟" لڑکی نے بڑے سکون سے پوچھا۔

"جی! . . . . کیا کہا آپ نے؟"

"زرد پہاڑ کی چوٹی سے اس طرف لہو کا دریا ہے۔"

"میں کسی زرد پہاڑ سے آگاہ نہیں ہوں۔"

"میں نے ٹھیک کہا تھا نا! ابھی اسے زرد پہاڑ کا نظارہ نصیب نہیں ہوا۔"

"چپ رہو فلسفی کہیں کے۔ اس لڑکی کو بہکا رہے ہو۔ خاتون! اس کے فریب میں نہ آیئے گا۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ آپ بہت دُکھی ہیں۔ میں دوسروں کے دکھوں کو فوراً پہچان لیتا ہوں۔ مجھ پر اعتماد کیجئے۔ میں آپ کو سُکھ دے سکتا ہوں۔"

"لیکن لہو کا دریا؟"

"لہو کا دریا؟ کون سا لہو کا دریا؟ آپ پر اس فلسفی کا جادو چل گیا ہے۔ یہاں کوئی لہو کا دریا نہیں

میرے گھر تک جو سڑک جاتی ہے، وہ سیدھی اور صاف ہے۔ اس کے دونوں طرف یوکلپٹس کا سایہ ہے۔ میرے پاس ایئر کنڈیشنڈ کوٹھی ہے۔ لان بڑا سرسبز ہے۔ میرے ڈرائنگ روم میں بڑی خوب صورت تصویریں ہیں۔ ہر تھکا ہوا مسافر، ہر دکھی روح یہاں آ کر آرام و سکون سے آشنا ہو جاتی ہے۔"

"لیکن میری منزل زرد پہاڑ سے اس طرف ہے۔ وہاں لہو کا دریا لہریں لیتا ہے۔ کیا آپ میرا وہاں تک ساتھ دیں گے؟"

"میں..... نہیں تو..... پاگل لڑکی! تو نے میرا بڑا وقت ضائع کیا۔ یہ پہلی بار ہے کہ میں نے اپنی ہمدردیوں کو یوں پامال ہوتے دیکھا ہے۔ جاؤ، لہو کے دریا میں ڈوب مرو۔ میں..... میں....." اس نے غصہ میں آ کر کار سٹارٹ کی تو وہ ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

اور لڑکی کی اداس اور خوف زدہ آنکھیں دیے کی طرح ٹمٹا گئیں۔ تب اداس آنکھوں نے اس کی طرف دیکھا جو وقت کا حاتم تھا اور کوہ ندا کا راز پانے کے لئے اس کا ساتھ دینے کو تیار تھا۔ کوہ ندا جہاں سے ابھی وقت کے حاتم کا بلاوا آیا تھا اور زرد پہاڑ کی چوٹی کو عبور کر گیا تھا۔ کوہ ندا سے اس طرف سبزہ زار تھا جس کے ایک خالی قطعے میں وہ سما گیا تھا اور اس پر زمرد میں سبزہ اگ آیا تھا اور اس کے آگے لہو کا دریا..... لڑکی کانپ گئی۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ وہ آگے بڑھا۔ اس نے لڑکی کا ہاتھ تھام لینا چاہا تھا کہ لمحہ دو دھاروں میں بٹ گیا۔

زرد پہاڑ فضا کا سینہ چیر کر بلند ہوا۔

وہ ٹھٹک گیا۔ اس نے کہا "ہم آج سے اپنا سفر شروع کر دیں گے۔ انجانی منزل کی طرف۔ آپ میرا ساتھ دیں گی نا؟"

لڑکی نے چند لمحوں تک کوئی جواب نہ دیا تو اس نے یاس بھری آواز میں کہا "یہ سفر ہر ایک کو اکیلے میں طے کرنا ہوتا ہے۔"

"نہیں....." لڑکی نے دھیمی آواز میں کہا۔

"نہیں....." اس نے لڑکی کی بات کو دہرایا۔

"یہ سفر اکیلے میں طے نہیں ہو گا۔ اس کے لئے ذاتِ دیگر کی رہنمائی درکار ہے۔"

"ذاتِ دیگر" اس نے لڑکی کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

اداس چہرہ آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہوا۔ زرد دھوپ کا اسرار گہرا ہو گیا۔ پھر اسے یوں لگا جیسے وہ فٹ پاتھ پر اکیلا ہو اور لڑکی کا سراپا اس کی روح میں سما گیا ہو۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔

وہ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ دیئے زرد پہاڑ کے دامن میں کھڑے تھے!

ساعت کا پھیلاؤ

کہکشاں ملک

میں یہ نہیں بتاؤں گی کہ اس خبر کا (SOURCE) کیا تھا۔ بس اتنا ہی کافی ہے کہ باخبر حلقے کی اطلاع تھی اور جس سے فائدہ اٹھانا میری اپنی صوابدید پر منحصر تھا۔ میں بڑے اضطراب میں مبتلا تھی۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ تیاری کے لئے بہت تھوڑا وقت ملا تھا۔ دوسرے وقت کے لئے صرف اتنی اطلاع کہ جب دو تہائی رات گزر جانے سے یہ واضح نہیں ہو پاتا تھا کہ اس دو تہائی کے بعد کون سی ساعت کون سے سیکنڈ یا منٹ میں اس کوچ کا نقارہ بجے گا۔ چنانچہ سب سے پہلے مجھے اپنے گوشوارے مکمل کرنے کی سوجھی۔ چالیس سے اوپر چار سال اور ہر روز و شب کے لمحات کو اگر گنا جائے تو کہاں تک پھیل جاتے ہیں۔ اب ان کو مختلف مدوں میں پوری اور صحیح جمع، ضرب، تقسیم کے ساتھ لکھتے چلے جانا تو بہت ہی مشکل تھا۔ لیکن کوشش [illegible] تھی۔ کاغذ قلم لے کر لکھنے بیٹھی تو سخت مایوس ہوئی۔ جتنا جمع کرتی تھی تقسیم کرنے پر صفر رہ جاتا تھا۔ پھر ضرب کے لئے کسی ہندسے سے مدد طلب کرتی تھی۔ تو وہ ضرب کردہ عدد جلد ہی تقسیم کی زد میں آجاتا تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ ان گوشواروں میں کمپیوٹر سے زیادہ دیانت کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ بددیانت میری انگلیاں از خود دکھا رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ وہ میری انگلیاں ہی نہیں ہیں۔ کوئی جابر اور اصول پرست انکم ٹیکس آفیسر ہیں۔ اس تیزی اور سرعت سے تقسیم کر کے مجھے خالی کر دیتی تھیں کہ مجھے پھر کسی کونے کھدرے میں جا کر بھاگ دوڑ کرنے اور نئے ہندسے ڈھونڈنے کی سکت نہ رہتی تھی۔ مثلاً میں نے بڑی شان سے وہ نمبر دکھائے جو میں نے ماں کا رول ادا کر کے حاصل کئے تھے لیکن معلوم ہوا اس رول کو ادا کرنے میں میرا عمل خلوص کی بھٹی میں کندن بن کر نہیں نکلا تھا۔ میں تو حادثاً ماں بن گئی تھی اور دنیا کے خوف سے کہ ہمسائیوں کی نیند خراب نہ ہو۔ آسٹر ملک کے ڈبے خریدتی تھی۔ اپنے آپ کو ماں کہلوانے کے شوق میں یہ تو چاہتی تھی کہ دنیا میرے قدموں تلے جنت تلاش کرے مگر یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس ماں بنانے والی طاقت نے مجھے اس نعمت کو دے کر مجھے کس شکر کا پابند کر

دیا ہے ۔کیا میں نے کبھی شکر کیا تھا؟ نہیں تو بس تقسیم کی قینچی سے یہ عدد بھی منفی ہو گیا۔ لیکن اب تو میرے پاس کچھ نہیں۔ میں مایوس ہو گئی تھی۔ میرے پاس کیا ہے۔ میں کس پونجی سے ٹکٹ خرید سکتی ہوں۔ قریب تھا کہ عالمِ یاس میں میں اس کورس کا ارادہ ترک کر دیتی۔ کہ شوق آڑے آ گیا شوق بھی کتنی بھرپاور ہے۔ یہ اس کی تحریک تھی ترغیب تھی کہ میں نے بلا ٹکٹ سفر کا سوچ لیا۔ اب مجھے ایک پریشانی سے چھٹکارا تھا کہ صحیح وقت پر موجودگی کے لئے خود کو تیار کرنے کا مرحلہ تھا میں نے سوچا۔ الارم لگا لوں اپنے سرہانے ٹائم پیس رکھ لوں۔ مگر پھر ہنسی آ گئی۔

کیا خلائی مسافر اپنے کندھے پر امام ضامن بندھوانا پسند کرتے ہیں۔ الارم کا اس ساعت کی خبر سے کیا کام جس کا کوئی نام نہیں۔ جو بیک وقت سب ساعتوں پر محیط ہے اور پھر بھی ایک ہی ساعت ہے کاش اس ساعت کے پھیلاؤ میں داخلے کے وقت مجھے اطلاع ہو جائے۔ میں نے ساری رات جاگنے کا فیصلہ کر لیا اور ٹکٹکی باندھ کر ستاروں کے مٹی کے دیوں ایسی لو دینے والے جھرمٹوں کو دیکھنے لگی۔ اور مجھے یوں لگا کہ ستارے نہیں کئی تصویریں ہیں۔ کبھو کسی دیہاتی لڑکی کے بالے کی مانند جس میں موتیے کے پھول پرو دئے ہوں معلوم دیتے تھے۔ کوئی بڑا سا سوالیہ انداز بنے لگتے تھے۔ کوئی حیرت کناں، لرزاں اور معیشت کے بوجھ سے دبے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ کہیں ایسا تھا کہ میں نے بیجوں کا چھٹا گرا دیا ہو۔ اور یہ بیج بغیر کسی ترتیب کے چھٹے کے چھینٹے کی شکل میں پھوٹ نکلے ہوں۔ پھوٹے بیج بھی یوں ہی دودھیا رنگ والے ہوتے ہیں۔ کوئی ستارہ اکیلا ہی دور کسی خود سر بچے کی آنکھ سے ٹپکے ہوئے موٹے سے آنسو کی مانند معلوم دے رہا تھا جو آنسو ہونے ہوتے بھی اپنی انفرادیت منوا رہا ہوتا ہے لیکن اس تاروں کی جالی تلے کچھ ہلچل سی ہوئی۔ لگتا تھا کام رکا نہیں۔ یہ تو پھیلاؤ ہے۔ اس کے نیچے عمل کا سمندر جاری و ساری ہے۔ حرکت نغمہ اور سفر کی کیسٹ سانس لے رہی تھی۔ اور ان سانسوں کے زیر و بم میرے کان واضح طور پر سن رہے تھے۔ پھر مجھے نیند آ گئی

میں سو گئی تھی۔ لیکن ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ دل سسی کی مانند اچھل اچھل حلق میں آ رہا تھا۔ جس کے پنوں کو اسے بے خبری کی نیند سلا کر پنوں کے بھائی بند لے گئے تھے اس لحظہ مجھے اس کی بیچارگی، افسردگی اور یاسیت کا بے طرح خیال آیا۔ میں دیوانہ وار نیچے بھاگی۔ بتی جلائی وقت دیکھا۔ اندازہ کیا۔ ابھی تو ایک تہائی رات گزری تھی۔ دور اڈے پر لاہور لاہور جانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ ابھی پنوں کو اس کے بھائی بند اونٹ کے کجاوے سے باندھ کر نہیں لے گئے تھے۔ ابھی وہ سسی کی دسترس میں تھا۔ میں پھر

اوپر آگئی۔ اب ستاروں کا رنگ پھیکا لگ رہا تھا۔ انہوں نے اپنے چہروں کی رنگت میں تبدیلی کرلی تھی۔ اپنی سمتیں بدل ڈالی تھیں۔ اب تو اس ٹینٹ کی کیفیت پیش کر رہے تھے۔ جس کی چھت تلے پہلے برات کھانا کھاتی ہے پھر دلہن کے آنے والے مہمان اور پھر گھر کے افراد اور کمی کاری جب کھانے کی میزوں پر سالن اور روٹیوں سے چچوڑی ہوئی ہڈیاں اور آدھی کھائی آدھی پھینکی فرنی کی بساندسی پھیلی ہوتی ہے۔ گویا محفل نے اپنا پروگرام پیش کرنے کے بعد میک اپ اتارنا شروع کیا تھا۔ اب دوسری سٹیج کے پروگرام والے اپنی تیاریاں کر رہے تھے۔ رات کی دوسری تنہائی کے شروع میں ستاروں کی شفقت اور ان پر اضمحلال اور تھکن سی طاری تھی۔ اب شبنم جلنے کی تیاری ہو رہی تھی ہوائیں آسمان کی زمین سے قریب والی پرت میں کورے مٹکے کی سوندھی خوشبو میں بسی شبنم کے شفاف موتی تیار کر رہی تھیں۔ اس عمل سے اردگرد کی فضا میں خنکی رچ بس گئی تھی۔

میں ایک بار پھر اس خنکی کی لوری کی گرفت میں آگئی میں سو گئی تھی۔

لیکن پاؤں کے تلوے میں کسی نے تنکے سے کھجلی سی کی۔ ہو سکتا ہے مچھر ہو۔ مگر مچھر نے خوب پیغام رسانی کی تھی پیچ پچ رات کا دوسرا تنہائی گزر چکا تھا۔

سامنے والا میدان قافلے کے کوچ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ کھٹا کھٹ لدی پھندی بسیں اپنے مقام کی جانب رواں دواں تھیں۔ کنڈیکٹر مسافروں کے سامان مستعدی کا ماہرانہ چابکدستی سے چھت پر پھینک رہے تھے ترپالیں ڈال رہے تھے۔ سواریاں لاد رہے تھے بلکہ کئی لوگوں کو اٹھا اٹھا کر سیٹوں پر بٹھا رہے تھے۔ ڈرائیوروں نے انجن سٹارٹ کر دیئے تھے چاروں طرف شور و غوغا اور اپنی اپنی بس کا نمبر دیکھنے کی جلدی تھی۔ کوئی بھی کسی کو اپنے سے آگے بس میں بٹھانے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ میں ہانپ ہانپ کر کبھی ایک بس اور کبھی دوسری بس کی جانب بھاگ رہی ہوں۔ ہارن بج رہے تھے سواریاں ہاتھ ہلا ہلا کر چلی جا رہی تھیں۔ میدان خالی ہو رہا تھا۔ جلی ہوئی چوبیں اور اکھڑی ہوئی طنابیں نظر آ رہی تھیں۔ میرا دل ہول محسوس کر رہا تھا۔ بلا ٹکٹ سفر کرنا مشکل ہے

میں اک ٹوٹی طناب کے پاس زمین پر ڈھیر ہو گئی۔ دیکھتے دیکھتے ہی میدان خالی ہو رہا تھا پھر کیا ہوا سب سے آخر ایک بس رہ گئی تھی اس کا کنڈیکٹر چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا ہے کوئی مسافر جو بلا ٹکٹ ہے۔ وہ آئے بیٹھ جائے اس کا ٹکٹ ادھار پر بن سکتا ہے۔

اس آخری بس کی آخری سیٹ پر میں ادھار پر ٹکٹ لئے بیٹھ چکی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ ساری بسیں ایسے پہاڑوں کے قریب کھڑی ہو گئیں۔ جو دھنکی ہوئی رنگ برنگی پشم

معلوم ہو رہے تھے۔ زمین کی سطح اتنی نرم تھی کہ اگر سب کے وجود بے وزن نہ ہوتے تو فوراً انہیں دھنسا
چھوڑ دیتی۔ نرمی کے علاوہ یہ سطح اتنی ٹرانسپیرنٹ تھی کہ تحت الثریٰ تک کی اشیاء نظر آ رہی تھیں۔
سارے مسافر اپنے گوشوارے اور ٹکٹ جو انہوں نے پیسے خرچ کر کے حاصل کئے تھے۔ اور وہ چیک
چیک جن کے وہ مالک بنا دیئے گئے تھے لئے ہوئے ایک عجب سے شہر کی شہر پناہ کے صدر دروازے کی جانب بڑھ
رہے تھے۔ ان کے چہروں پر طمانیت تھی، روشنی تھی۔ صدر دروازہ بہت اونچا اور دائیں بائیں کہیں اور چھوٹے
چھوٹے دروازے لگے تھے۔ فصیلوں پر حفاظتی دستے ننگے آلات لئے پل پل کی نگرانی میں مستعد نظر آ رہے تھے۔
کسی چور دروازے کا امکان نہ تھا۔ جتنے دروازے تھے اتنا ہی عملہ اس کی پڑتال کر رہا تھا۔ کاغذات ایک میز سے
دوسری میز پر کمپیوٹروں کی رفتار میں پہنچ رہے تھے۔ مہم سی لگ رہی تھی۔ انٹری پاس دیا جا رہا تھا۔ آٹومیٹک
دروازے کھل رہے تھے۔ اور مسافر مسکراتے ہوئے اندر جا رہے تھے۔

پر میں تو آخری بس کی آخری مسافر تھی۔ اور وہ بھی ادھار ٹکٹ کے سہارے۔
مجھے تو کسی نے بس سے اترنے کا بھی کہنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ میں بس میں بیٹھی تھی۔
بس کے شیشے میں خود کار کیمرہ فٹ تھا۔ اور ونڈ سکرین پر پورا منظر منعکس ہو کر مجھے نظر آ رہا تھا۔ میں
دیکھ رہی تھی۔ کاغذات کی جانچ پڑتال اتنی سرعت مگر اتنے انصاف سے ہو رہی تھی کہ کسی نے اعتراض کرنے
کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ کچھ ایسے بھی تھے جو آتے تو پسندیدہ دروازے کے سامنے تھے۔ مگر اپنی پڑتال کے
بعد انہیں کسی اور دروازے کی جانب جانے کا اشارہ ملتا تھا۔ ان مسافروں میں صرف انسان نہ تھے۔ وہ
ستارے بھی تھے۔ جو رات کے پہلے تہائی حصے میں مجھے بالا۔ جو مراد اور آنسو دکھائی دیتے تھے مگر اپنے کندھوں
پر اپنا سامان اٹھائے سر جھکائے اپنے مخصوص دروازے سے گزر رہے تھے

ساری بسیں خالی ہو چکی تھیں۔ ڈرائیور اور کنڈیکٹر ان کی چھتوں پر اپنے اپنے بستر کھول کر لیٹ
رہے تھے۔ میری بس کا ڈرائیور بھی جب اپنی بس کا دروازہ بند کرنے کو آگے بڑھا تو مجھے دیکھ کر گھبرا گیا۔
ارے آپ یہاں ہیں۔ وہ رہا ادھار ٹکٹ والا کا دروازہ۔ آپ وہاں چلی جائیے۔ اب ہمارے آرام
کا وقت ہے۔
میں بوجھل قدموں کے ساتھ اپنی مطلوبہ کھڑکی کے سامنے کھڑی تھی۔ ساتھ میں دروازے سے
ملانے والی ریلنگ تھی۔

اپنے کاغذات دکھاؤ۔

میں نے اپنی جیب سے مڑے تڑے چند کاغذ نکالے۔ مجھے معلوم تھا ان میں بھی حاصل ضرب تقسیم کی زد میں آکر صفر ہی رہ گیا ہے

یہ کیا ــــــ چیکر نے قدرے حیرت سے میری جانب دیکھا۔

عرق ندامت سے میری پیشانی بھیگ گئی تھی۔ اور دوپٹے پر ٹپ ٹپ بوندیں گر رہی تھیں۔ میرا سر جھکا ہوا تھا مگر دروازے کے آگے پڑی زنجیر ہلنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔

کچھ دیکھنے سے پہلے ہی دروازہ بند ہو گیا۔ چیکر کہہ رہا تھا۔

مجھے افسوس ہے خاتون، محض ان بوندوں کے بیوپار سے آپ منافع حاصل نہیں کر سکتیں۔ آپ کے کاغذات ناکافی ہیں۔

اور اس نے میرے ہاتھ میں وہی تڑے مڑے کاغذ تھما دیئے۔

میں ان کاغذات کو اپنی مٹھی میں بھینچ رہی تھی کہ ساتھ ہمسایوں میں گوالے کی دودھ پیتی بچی نے سوتے میں چیخ ماری۔

میں نے آنکھیں کھولیں۔

اجالا پھیل رہا تھا۔ غالباً رات کا آخری تہائی حصہ اپنا طومار لپیٹ رہا تھا۔

طیراً ابابیل

مسعود اشعر

ابابیل کی ایک قسم ایسی بھی ہوتی ہے جو سمندر کی لہروں پر اپنا گھونسلہ بناتی ہے۔ کتنا ولولہ خیز تصور ہے۔ اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ وہ سب اسی طرح بستر کو گھیرے کھڑے تھے اور اسے گھور رہے تھے۔ وہ سرہانے کی طرف بیٹھا تھا۔ اس کے دائیں جانب جو شخص کھڑا تھا وہ اس کے چچا سے ملتا جلتا تھا۔ بستر کے دوسری طرف اس کے بھائی کی شکل کا آدمی کھڑا تھا۔ پائنتی جو لوگ کھڑے تھے وہ ان سب کو الگ الگ تو نہیں پہچانتا تھا لیکن اتنا اسے یقین تھا کہ وہ سب اس کے رشتہ دار ہیں۔ وہ سب اسے گھور رہے تھے

ابابیل زمین پر نہیں بیٹھ سکتی اور اگر ایک بار بیٹھ جائے تو پھر اڑنا بھول جاتی ہے۔ وہ پھر شروع سے یٰسین پڑھنے لگا۔ وہ کب سے بیٹھا یٰسین پڑھ رہا تھا اور بار بار بھول جاتا تھا۔ مکمل ہی نہیں کر چکتا تھا۔ اور وہ سب اس انتظار میں تھے کہ وہ کب سورۃ مکمل کرتا ہے۔ اس نے گھورتی ہوئی نظروں کی حدت اپنے چہرہ پر محسوس کی اور تیزی سے ہونٹ ہلانے لگا لیکن جب وہ لِتُنذِرَ قَوْماً مَّا أُنذِرَ آبَاؤُهُمْ پر پہنچا تو اسے خیال آیا کہ آخر وہ سورۃ یٰسین کیوں پڑھ رہا ہے؟ یہ لوگ اسے یٰسین پڑھنے پر کیوں مجبور کر رہے ہیں؟ یہ خیال آتے ہی وہ پھر اگلی آیت بھول گیا اور اس نے پھر آنکھیں اٹھا کر بستر کے گرد کھڑے لوگوں کو دیکھا۔ اب وہ سب آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کر رہے تھے جیسے کوئی نہایت اہم مسئلہ زیرِ غور ہو۔ جیسے وہ اسے بھول چکے ہوں۔

"وہ کہاں ہے؟"

اس کا جی چاہا ان سے پوچھے اور یہ بھی معلوم کرے کہ ڈاکٹر کیوں نہیں ملتا؟ مگر جیسے یک لخت ان سب کو پتہ چل گیا کہ وہ آیت بھول گیا ہے اور سورۃ یٰسین پڑھنے کی بجائے ڈاکٹر کے بارے میں سوچ رہا ہے اور ان کی آنکھیں پھر اس پر آگ برسانے لگیں۔ پھر اس نے خوف سے ایک جھرجھری لی اور زور زور سے یٰسین پھر شروع کر دی۔

"تمہارا نام ؟"

"جی۔ احمد۔"

"تم جو کچھ کہو گے اپنے ایمان سے کہو گے ؟"

"جی ...."

وہ شخص جسے ہنسنے سے تکلیف ہوتی ہے جب اچھے بنا رہا تھا ......

ہمارے محلے کی مسجد کی چھت بہت پرانی ہو گئی تھی۔ اس کی کڑیوں میں بڑے بڑے کھکھ پڑ گئے تھے اور ان میں ابابیلوں نے گھونسلے بنا لئے تھے۔ یہ سارے گھونسلے ابابیلوں کی بیٹ اور پروں سے بھرتے ہوتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ کھونٹ بیٹ سے ہی بنائے گئے ہوں اور منا بھائی کہتے تھے کہ ابابیل زمین پر نہیں بیٹھتی اور اسے چڑیوں کو ڈرانے والے ایکوں سے بھی نہیں ڈرایا جا سکتا۔

سب لوگوں کو اس بات پر ہنسی آ گئی مگر وہ شخص جس کا چہرہ ان سب سے زیادہ سہما تھا اچانک اپنے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر دہرا ہو گیا۔ اس کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔

"شی .... ہنسو مت! انہیں معلوم نہیں ہنسنے سے ان کے سینے میں درد ہونے لگتا ہے۔"

"اچھا! یہ بیماری ہے؟" اب احمد سفید ہو گیا۔ عجیب بیماری ہے۔ خدا رحم کرے۔

اس شخص کو ہنسنے سے تکلیف ہوتی ہے اس لئے وہ دوسروں کو بھی ہنستا نہیں دیکھ سکتا کیونکہ اس کے سامنے اگر کوئی ہنسے گا تو لامحالہ اسے بھی ہنسی آ جائے گی۔ اسی لئے وہ کھیتوں میں کھڑے کرنے کے لئے نئے نئے اپکے بناتا رہتا ہے اور اپنی پیدا کی ہوئی تاریکی میں اپنے پروجیکٹر پر بلو فلمیں چلا کر اپنے آپ کو دیکھتا رہتا ہے۔

جب اپنے ننگا ہو جانے کا خوف پیدا ہو جائے تو دوسروں کو ننگا دیکھنے کی خواہش بڑھ جاتی ہے۔

(YOUR FLY IS OPEN, SIR)

اسے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ اس نے اوپر دیکھا تو وہ لوگ تھر تھر کانپ رہے تھے اور ان کی کپکپی آہستہ آہستہ اس کے جسم میں بھی سرایت کر رہی تھی۔ اس نے اپنے دل کی دھڑکن روک کر ہنسنے کی کوشش کی۔ باہر ایک شور مچا ہوا تھا جیسے ساری چڑیاں ایک ہی پیڑ پر جمع ہو گئی ہوں اور میں چیں سے آسمان سر پر اٹھا رکھا ہو۔

صبح ہو گئی ہے سب جاگ اٹھے ہیں اور چوک کے درخت پر اکٹھے ہو رہے ہیں۔ اب وہ سب اکٹھے ہو گئے ہیں ان کے منہ کھلے ہیں اور ہاتھ ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ وہ کچھ کہہ رہے ہیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہے

تب اور سامنے گھونسلے میں چڑیا کے بچے چیختے چیختے تھک گئے ہیں۔ چیختے چیختے ان کے سارے جسم پیلی پیلی چونچوں میں تبدیل ہوگئے ہیں۔ اب ان کے چھوٹے چھوٹے پھڑپھڑاتے پر نظر نہیں آتے صرف چونچیں نظر آرہی ہیں جو حلق تک کھلی ہیں۔

"آخر وہ کہاں ہے؟ اور ہم یہاں کیوں جمع ہیں؟"

وہ سب لوگ نہایت سنجیدہ شکلیں بنائے بستر کے گرد کھڑے تھے اور ایک ہی آہنگ کے ساتھ ان کا ایک ایک عضو لرز رہا تھا۔ اس نے اپنی ٹھنڈی بے جان انگلیوں کو مٹھی میں زور سے بند کیا اور سوچا کہ ان سب کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے؟ کیا یہ لوگ واقعی اس کے رشتے دار ہیں؟ پھر اس نے اپنے لباس پر ایک نظر ڈالی اور ڈر گیا۔

"تمہارا نام؟"

"جی حسن"

"تم جو کچھ کہو گے خدا کو حاضر ناظر جان کر کہو گے؟"

"جس وقت کھیتوں میں سب سے پہلا اچکا کھڑا کیا گیا اس وقت تم۔۔۔۔"

ان کا نام تو تھا دولھا خان مگر وہ اتنے دبلے پتلے تھے کہ ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آتے تھے اسی لئے لوگ انہیں دولھا بجا نکڑ کہا کرتے تھے اور جاڑوں میں جب وہ لمبا سا پرانا نوجی براؤن کوٹ پہنتے اور اونی ٹوپا اوڑھتے تو اچکا نظر آتے۔ (لیکن انہیں کسی نے کھیتوں میں نصب نہیں کیا تھا)۔ نماز استسقا کے بعد جب انہوں نے گڑگڑا کر بارش کی دعا مانگی تھی تو ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی اور سفید داڑھی سے جیسے پانی کی تلی بندھ گئی تھی اور شہر سے باہر کا وہ وسیع میدان ان کے جسم کی ہڈیوں کے ساتھ لرزنے لگا تھا۔ حسن کو نماز استسقا یاد آئی اور اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر ہتھیلیاں نیچے کی جانب کر دیں اور ہاتھوں کی پشت پر ابھری ہوئی رگیں دیکھنے لگا۔ اسے یہ یاد نہیں آرہا تھا کہ نماز استسقا کے بعد جب لوگ شہر لوٹے تھے تو بادل گھر کر آئے تھے یا نہیں؟ اور نماز کے کتنے گھنٹے یا کتنے دن بعد بارش ہوئی تھی۔؟

اس نے باہر سے آنے والی آوازوں کو غور سے سنا اور سڑک پر پڑنے والی قدموں کی دھمک کو اپنے سینے پر محسوس کیا اور خوش ہوا کہ لوگ پھر نماز استسقا کے لئے شہر سے باہر بڑے میدان کی طرف چل پڑے ہیں۔ وہاں پھر الٹے ہاتھ کرکے دعا مانگی جائے گی اور جب یہ لوگ شہر لوٹیں گے تو بادل گھر کر آئیں گے اور کالی گھٹا ایسی ٹوٹ کر برسے گی کہ کھیتوں میں کھڑے سارے اچکے بھی بہہ جائیں گے۔ مگر پھر اس کے دل میں شک پیدا ہوا۔ کیا ایسا ہو جائے گا؟ کیا واقعی ایسی بارش ہو جائے گی

اور اس خیال سے اسے پھر ڈر لگا اور پھر اسے دولھا خان جھانگڑ یاد آئے۔ تو کیا ان میں کوئی دولھا خان بھی ہے؟ اس شک پر اسے اپنے آپ سے نفرت ہوئی۔ آخر وہ ایسا کیوں سوچتا ہے؟ یہ وسوسے اس کے دل میں کیوں پیدا ہوتے ہیں؟
اور پھر اچانک اس کی نظر پھر اپنے کپڑوں پر پڑ گئی اور وہ جلدی جلدی یٰسین پڑھنے لگا

"ہوں۔ تو تمہارا نام محمد ہے؟"

"جی — !"

"تم اپنے ایمان سے کہو کہ جب اسے ننگا ہو جانے کا خوف . . ."

ننگا ہو جانے کا خوف تو ایک طرف۔ صرف ہسری طر CONTINOUS MUCHNESS OF THE SAMENESS سے خوش ہوا تھا مگر وہ بھی کتنی دیر کے لئے؟ اسی لئے لوگ اکھٹے ہو کر شہر سے باہر جاتے ہیں پھر شہر لوٹ آتے ہیں اور دوبارہ شہر سے باہر جانے کی تیاریاں شروع کر دیتے ہیں اور وہ شخص جو اپنے آپ کو برہنگی سے بچانے کے لئے بلو فلمیں دیکھتا رہتا ہے سنسان سڑک پر ایک لڑکی کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ لڑکی اس سے بچنے کے لئے کپڑوں کی ایک دکان میں گھس جاتی ہے۔ شوکیسوں میں بے شمار رنگ برنگے لباس لٹک رہے ہیں۔ وہ لڑکی اپنے آپ کو چھپانے کے لئے بالکل عریاں ہو جاتی ہے پھر ایک ایک لباس پہن کر دیکھتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس کی نظروں سے کس طرح پوشیدہ کر سکتی ہے۔ وہ ایک لباس پہنتی ہے گھوم پھر کر آئینہ میں دیکھتی ہے۔ شک کرتی ہے اور اسے اتار کر دوسرا لباس تبدیل کرنے لگتی ہے۔ جب کسی لباس میں بھی وہ اپنے آپ کو نہیں چھپا سکتی تو بالکل برہنہ ہو کر ایک شوکیس میں کھڑی ہو جاتی ہے۔ پھر اچانک پردہ پر منظر بدلتا ہے اور اب اس لڑکی کی جگہ وہ شخص بالکل ننگا کھڑا ہے جو اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ اب وہ لباس بدل بدل کر اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کرتا نظر آتا ہے لیکن اب یہ لباس وہ پرانے اوور کوٹ اور وہ پھٹی پتلونیں ہیں جو کھیتوں میں کھڑے کئے جانے والے اجکوں کو پہنائی جاتی ہیں۔

محمد نے بستر کے گرد کھڑے لوگوں کے چہرے پڑھنے کی کوشش کی اسے یقین تھا کہ انہیں سب کچھ معلوم ہے بلکہ انہیں یہ بھی علم ہے کہ اس کے دماغ میں کیا طوفان مچا ہوا ہے۔ لیکن وہ سر جھکائے ایسے کھڑے تھے جیسے انہیں کچھ بھی معلوم نہ ہو پھر اسے یاد آیا کہ اب تو وہ شخص ابا بیلوں کے لئے کیڑے مکوڑوں کا بندوبست بھی کرنے لگا ہے اور اسے ہنسی آگئی۔

"جب کوئی شخص اپنی بیوی کو تحفے دینے لگے تو سمجھ لو وہ بوڑھا ہو گیا!"

وہ بہت دیر تک دل میں ہنستا رہا اور اس ہجوم کے ساتھ چلتا رہا جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ ٹھیک راستے پر جا رہا ہے اس نے شیشی کو زور سے مٹھی میں دبایا اور سوچا کہ اب کے لوگوں کا ریلا آیا تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی

دکان پر پہنچ جاؤں گا اور اس بار دروازے کو ہی لوٹوں گا۔ مگر جب تیز رفتار آوازوں کے ہجوم نے اسے چاروں طرف گھیر لیا تو اس کے پیروں نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ جتنا وہ قدم آگے بڑھاتا اتنا ہی پیچھے ہٹ جاتا۔ عجب خواب کی سی کیفیت تھی۔ اس نے آنکھیں مل کر چاروں طرف دیکھا اور سانس روک کر اپنے آپ کو ہجوم کے حوالے کر دیا لیکن ایک بار جب آوازوں کی رفتار بہت تیز ہو گئی اور اسے یقین ہو گیا کہ اب وہ سڑک پار ہی کر جائے گا تو ایک دم اس کی نظر اپنے پیروں پر پڑی اور وہیں ٹھٹھرا ہو گیا۔ اس کے پیروں میں اس کے اپنے جوتے نہیں تھے۔ واپس جانے کے لئے ایک گلی میں مڑا اور ایک دروازہ میں چھپ گیا۔

(کہیں ابابیل زمین پر تو نہیں بیٹھ گئی ؟)

وہ جس دروازہ میں چھپا تھا وہ ایک بہت بڑی ڈیوڑھی تھی۔ بھاگتے بھاگتے یا پیچھے ہٹتے ہٹتے اس کے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ اس نے ہمت کر کے اپنے حلق سے آواز نکالی مگر اندر سے کوئی نہیں نکلا۔ پھر اسے شبہ ہوا کہ جب اس نے منہ کھولا تھا تو اس کے حلق سے آواز بھی نکلی تھی یا وہ محض اس کا وہم تھا۔ پھر اس نے پوری طاقت سے چیخ ماری اور زمین پر زور زور سے پاؤں پٹخنے لگا۔ ایک بچہ باہر نکلا اور خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"میری ماں بیمار ہیں۔ تھوڑا سا پانی ......"

پھر اس کی آواز نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

وہ بچہ کھڑا اسے ٹکر ٹکر دیکھتا رہا۔ جیسے وہ اس کی بات ہی نہ سمجھ سکا ہو یا اس انتظار میں ہو کہ وہ کوئی بات کرے۔ اس نے زور سے کھنکارا۔ شاید میری آواز نہیں نکل رہی ہے ؟ پھر اس نے دونوں ہاتھوں کی روک بنا کر اشارہ کیا اور وہ بچہ چیخ مار کر اندر بھاگ گیا۔

تو کیا اب بچوں کو بھی پتہ چل گیا ہے کہ میں نے کس کے کپڑے پہن رکھے ہیں اور سب لوگ مجھ سے ہی لیبلین پڑھواتے ہیں ؟ پھر اس کی زبان لڑکھڑائی اور اس نے گھبرا کر ان لوگوں کو دیکھا جنہوں نے اس سے رشتہ داروں کی شکل تیار رکھی تھی۔

"کیا نام ہے تمہارا ؟"

"حامد — جناب"

"تم قسم کھا کر ......"

"جی میں قسم کھا کر کہتا ہوں ...."

سڑک پر سے آنے والی آوازوں میں سے ایک ایک آواز اس نے علیحدہ علیحدہ سننے کی کوشش کی لیکن وہ سب گڈ مڈ تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کون کیا کہہ رہا ہے۔ وہ یسین پڑھنا بھول کر بہت دیر تک سر اٹھا رہا کہ کچھ تو سمجھ میں آجائے۔ پھر اس نے ایک جھرجھری لی۔ کیا دنیا کی ہر بات ہماری سمجھ میں آجاتی ہے؟ کیا ایسا نہیں ہے کہ جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ اس کے مقابلہ میں رتی برابر بھی نہیں، جو ہم نہیں جانتے ہ (یہ کس نے کہا تھا!) یہ کیا ضروری ہے کہ ہر آدمی کی بات سمجھی بھی جائے۔ کیا یہ حقیقت کافی نہیں ہے کہ وہ شور تو مچا رہے ہیں ؟

وہ بچہ جس نے چیخ ماری تھی دراصل اس سے نہیں اس کے لباس سے ڈر گیا تھا اس نے اپنے کپڑوں کو دیکھا اور اس عورت کی نظریں اس کے حلق میں پھنس گئیں جو اس کے لئے گلاس میں پانی لئے کھڑی تھی۔ وہ اسے مشکوک نظروں سے گھور رہی تھی مگر میں نے کیا قصور کیا ہے ؟ اگر وہ شخص ہر روز نئے نئے اچکے بناتا ہے اور خود بھی ویسے ہی لباس پہنتا ہے تو اس میں میرا کیا جرم ہے ؟ یہ درست ہے کہ وہ ان آوازوں کے ہجوم کے ساتھ نہیں جاتا مگر ان آوازوں سے خوشی تو حاصل کرتا ہے لیکن وہ عورت جو شاید اس کی ماں ہے اس سے خوش نہیں ہے وہ ہمیشہ اس پر شبہ کرتی ہے۔

ایک وقت میں اتنے بہت سے اور اتنے مختلف واقعات پیش آجاتے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس واقعہ کے بارے میں کیا رائے قائم کی جائے اور پھر ہجوم میں موجود آدمی آپ کو تو نہیں دیکھ سکتا۔ دوسرے لوگ اسے دیکھتے ہیں اور دوسرے لوگ بھی اسے اس حد تک دیکھتے ہیں جتنا وہ دیکھنا چاہتے ہیں یا وہ شخص خود جس حد تک اپنے آپ کو دکھاتا ہے۔ حامد نے سوچا ایک تو میں وہ ہوں جو ہوں یا جو میں سمجھتا ہوں کہ ہوں ——— دوسرے وہ ہوں جو لوگوں نے بنا دیا ہے۔ اس لئے اگر وہ لوگ مجھ سے یسین پڑھنے کو کہتے ہیں تو میں مجبور ہوں کہ ان کا کہا مانوں۔

تو کیا میں "SUSPENDED ANIMATION" میں ہوں؟ کیا ہم سب نے جاڑوں جاڑوں اپنی زندگی معطل کر دی ہے؟ اور اس شخص کو جسے ہنسی سے خوف آتا ہے یہ آزادی دے دی ہے کہ جی بھر کر نئے نئے اچکے بنائے اور کھیتوں کے علاوہ گلی کوچوں میں بھی نصب کر دے۔ مگر یہ کتنے طویل جاڑے ہیں۔

حامد نے اس دبیز کاغذ پر ہاتھ پھیرا جس پر ناخن سے اس شخص کی تصویر ابھری ہوئی تھی۔ اگر اس کاغذ پر ابھرے ہوئے اس شخص کے نقوش صاف بھی کئے جائیں تب بھی ہلکا سا خاکہ ضرور رہ جائے گا کاغذ بالکل صاف نہیں

ہو سکتا۔ ہاں ایک بات ہو سکتی ہے۔ اس نے کاغذ کو غور سے دیکھا۔ اس کاغذ کو ہی پھاڑ ڈالا جائے! اس تصور سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس کاغذ پر کچھ اور نقوش ابھار ے جائیں مثلاً پھول کے، مثلاً گلدستے کے باغیچے کے یا پہاڑ میدان اور دریا کے اس طرح اس شخص کے نقوش یقیناً نیچے دب جائیں گے۔

اس خیال سے اسے خوشی ہوئی اور اس نے باہر سے آنے والی آوازوں کو سنا اور آنکھیں بند کر کے منہ کھول دیا برسوں کی اس معطل زندگی میں اس کے منہ میں ایک کھیل بھی تو اڑ کر نہیں گئی تھی۔

منا بھائی نے یہ بھی بتایا تھا کہ جب کسی شہر میں دبا پھیلے تو ابابیلیں وہاں سے پہلے ہی غائب ہو جاتی ہیں۔ تو گویا اس شہر میں کوئی دبا نہیں پھیل رہی ہے کہ اتنی بہت سی ابابیلیں نظر آ رہی ہیں۔ تمام سڑکوں پر تمام گلیوں میں اور تمام کھیتوں پر ابابیلوں کا ہجوم ہے اور وہ غلطی سے بھی زمین پر نہیں بیٹھتیں، اوپر ہی اوپر اڑ رہی ہیں ہیں اور اس شخص کے لیے جو نئی نئی شکلوں والے اچکے بناتا ہے اور جو اب گھبرا کر چڑیوں کو دانے بھی ڈالنے لگا ہے یہ ابابیلیں مصیبت بن گئی ہیں۔ ابابیلوں کو تو اچکوں سے نہیں ڈرایا جا سکتا؟ وہ تو سمندر کی لہروں پر بھی اپنا گھونسلہ بنالیتی ہے۔

اور اس شخص نے جس کا نام احمد بھی تھا حسن بھی، اور محمد بھی اور حامد بھی، ہوا میں ہاتھ لہرانے والے ہجوم کے ساتھ چلتے چلتے محسوس کیا کہ اب اس کے جوتے اس کے پاؤں نہیں پکڑتے اور اب خواب کی سی وہ کیفیت بھی ختم ہو چکی ہے۔ جب آگے بڑھنے والے قدم اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں سرکتے تھے پھر اس نے ایک لمبا ڈگ بھرا اور دبکرا کر، ہجوم کے آگے چلنے والے چند آدمیوں نے کوئی چیز بڑی احتیاط کے ساتھ اٹھا رکھی ہے اور پیچھے چلنے والا ہر شخص آگے بڑھ کر پنجوں کے بل کھڑا ہو کر اس چیز کو دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہر شخص کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو رہا ہے لیکن اس غصہ میں خوشی کا عنصر بھی شامل ہے جیسے وہ پراسرار شے جو اُن کے آگے جا رہی ہے ان کی نجات کا سبب بنے گی اور وہ آرام سے اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں گے۔ اس نے سوچا کہ میں بھی تو دیکھوں آخر وہ کیا چیز ہے؟ اور ہجوم کو چیرتا ہوا آگے بڑھنے لگا لیکن جب وہ ان لوگوں کے نزدیک پہنچا جنہوں نے وہ پُراسرار شے اٹھا رکھی تھی تو اس وقت تک وہ سب اس عمارت کے پاس تک پہنچ گئے تھے جس کی چھت پر سب سے زیادہ ڈراؤنا اچکا نصب تھا اور جہاں وہ شخص بیٹھا تھا جس کے سینے میں ہنسنے سے درد ہونے لگتا ہے۔

اب عجیب صورت حال تھی اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ سارے لوگ جنہوں نے ہجوم کی شکل اختیار کر رکھی تھی بہت

بچے رہ گئے تھے۔ صرف ان کے ہوا میں لہراتے ہوئے ہاتھ اور بند مٹھیاں نظر آ رہی تھیں۔ ان کے منہ چڑیا کے بچوں کی طرح کھلے تھے مگر ان سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی یا جو آواز نکل رہی تھی وہ توپ کی دھمک کے سوا اور کوئی تاثر نہیں دے رہی تھی۔ اب اس نے چند آدمیوں کے چہروں پر غور کیا اور حیران رہ گیا یہ تو وہی لوگ تھے جنہوں نے اس کے رشتے داروں کی شکل بنا رکھی ہے اور اسے بیمار ماں کے بستر کے پاس بٹھا کر یٰسین پڑھنے پر مجبور کرتے رہتے ہیں۔ اس نے گھبرا کر ہاتھ لہرانے والے ہجوم کی طرف دیکھا جو بہت دور رہ گیا تھا اور چاہا کہ بھاگ کر وہ بھی ان سے جا ملے لیکن اس وقت تک وہ اپنے رشتہ داروں کی شکل والے لوگوں کے ساتھ عمارت کے اندر داخل ہو چکا تھا۔ پھر اس نے وہ پراسرار شے دیکھی اور ڈر گیا۔ تو کیا یہ لوگ ہمیشہ کے لئے اس شخص کا خاتمہ کر دیں گے۔ کیا اسے مار ڈالیں گے! اس نے اُن لوگوں کی طرف دیکھا ان کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور غصہ میں ان کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ اس نے اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر دل کی دھڑکن کو محسوس کیا اور سوچا کہ اب دھماکے سے میرے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے اور سارا فرش اچکوں کے خون سے لت پت ہو جائے گا اور ہم سب اپنے سرخ چہرے لے کر پیچھے آنے والے ہجوم کی طرف جائیں گے اور اپنے آپ کو ان میں گم کر دیں گے پھر اس نے اپنے سامنے اس شخص کو کھڑا دیکھا اور قریب تھا کہ وہ جھپٹ کر سامنے لگا اچکا نوچ کر پھینک دے کہ اس کے ساتھیوں کے چہرے ایک دم سفید پڑ گئے اور انہوں نے وہ پراسرار شے جس سے وہ اچکے بنانے والے کا جادو توڑنے آئے تھے آگے بڑھ کر اسی کے حوالہ کر دی۔

"لو، ہمیں مار ڈالو۔"

اور خود دھڑام سے فرش پر گر گئے۔ اب میرا کیا ہو گا؟ وہ ڈرا۔ میں اپنا یہ حشر نہیں ہونے دوں گا! اور وہ وہاں سے بھاگا مگر جب چوک میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ تمام عمارتوں پر اور تمام کھیتوں میں نئے کپڑوں والے اچکے کھڑے کر دیئے گئے ہیں اور آسمان پر ایک بھی ابابیل نظر نہیں آتی۔

نئی بشارت کا نوحہ

منصور قیصر

جب تیسرا درویش بھی اپنا خواب سنا چکا تو چاروں کچھ دیر کے لئے پھر پتھر کی مورتیاں بن گئے۔ البتہ ان کی آنکھوں میں سرخ روشنی چمک رہی تھی۔ پھر انہوں نے پلکیں جھپک کر غیر ارادی طور پر پہلے زمین کی طرف اور پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ رات کے سیاہ اندھیرے منجمد ہو چکے تھے۔ آسمان پر لرزاں ستاروں کے خیمے ابھی گڑے ہوئے تھے۔ بیگلوں ہوا نے سانس روک رکھی تھی اور پُر اسرار فضا کو جیسے کسی نے حنوط کر دیا تھا۔

چوتھے درویش کے ہونٹوں میں پھڑپھڑاہٹ ہوئی اور وہ گویا ہوا "دوستو! کیا بات ہے؟ تمہارے خوابوں کی کرچیوں سے سکوتِ شب زخمی نہیں ہوا۔ رات کی آنکھوں میں پوچھنے کے کوئی آثار بھی نہیں ہیں اور ہمارے لئے یہ بھی مشکل ہے کہ ہم خاموشی کی چادریں اوڑھ کر صبح صادق کا انتظار کریں۔

پہلا درویش بولا "ابھی تو تمہاری باری باقی ہے۔ میں دم توڑتے ہوئے الاؤ میں خشک لکڑیاں ڈالتا ہوں۔ تم اپنے خوشبودار خوابوں کی گٹھڑی کھولو۔"

چوتھا درویش ایک لمبی آہ بھر کر بولا "مگر المیہ یہ ہے کہ میرے خوابوں کی خوشبو کو دیمک چاٹ چکی ہے لہٰذا میں نے خوابوں کے دریچے بند کر دیئے ہیں۔ آخر ہم کب تک خوش کن خوابوں کی بیساکھیوں کے سہارے زندہ رہیں گے۔ ایک نہ ایک دن تو ہمیں سچائی کا زہرآب پینا ہی ہے۔"

دوسرے نے ذرا طنزاً مسکرا کر کہا "اچھے درویش ہو کہ تم نے وجدان کے دریچے بند کر رکھے ہیں۔ آخر تم بھی اس بات کا اعتراف کیوں نہیں کرتے کہ ہمارے ہاتھوں میں اپنے آپ کو سرزنش کرنے کے لئے جو چابک تھے وہ ہم نے دوسروں پر برسانے شروع کر دیئے ہیں۔"

پہلا درویش بولا "اگر پانچواں بھی ہمارے ساتھ رہتا تو یہ طویل اکتا دینے والی اجنبی رات ہم اپنی خواب کہانیوں کی درانتیوں سے کاٹ دیتے۔ میری سمجھ میں تو ابھی تک نہیں آیا کہ وہ ہم سے روٹھ کر کیوں چلا گیا۔"

دوسرے درویش نے پہلے کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے جواب دیا" پانچواں درویش ہم سے صرف اس لئے روٹھ کر چلا گیا کہ مرشد نے خرقوں کا جو ترکہ چھوڑا تھا وہ ہم چاروں نے آپس میں ہی بانٹ لیا۔ جب پانچویں نے اپنا حصہ طلب کیا تو ہم نے اسے ایسا خرقہ پیش کیا جو پانی کو جذب نہیں کر سکتا تھا۔

تیسرا درویش جو بہت دیر سے پتھرایا ہوا تھا، بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگا" چھوڑو کیا قصہ لے بیٹھے ہو۔ جو بچھڑ گیا سو بچھڑ گیا۔ تمہیں کئی بار مرشد کا قول یاد دلا چکا ہوں کہ ماضی میں دفن ہونے والے لمحوں کی قبریں مت کھودو کہ لاریب یوں محض تعفن پھیلتا ہے اور پھر یہ کہ پانچواں تو اب خود ہی اپنا مرشد بن گیا ہے۔"

دوسرے نے کچھ سبکی محسوس کی اور گویا ہوا" دوستو! ہم نے مرشد کے خرقے پہن کر کون سا تیر مار لیا ہے؟ سلوک توکل، قناعت اور شناخت کی کون سی منزل طے کر لی ہے؟ آخر ہم مرشد کے نام کو کب تک پناہ گاہ کے طور پر استعمال کرتے رہیں گے؟"

پہلا درویش، جس نے دم توڑتے ہوئے الاؤ میں چوبِ خشک سے نئی روح پھونک دی تھی، جھنجلا کر بولا۔ بھائیو! کن بکھیڑوں میں پڑ گئے ہو۔ کیوں اختلافات کے فتنوں کو چنگاری دکھا رہے ہو۔ یہ سچ ہے کہ اپنی کوتاہیوں کا احساس کرنا خود شناسی کی پہلی منزل ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ سیاہ اندھیروں سے ڈسنے والی رات کی ابھی پہلی منزل ہی گزری ہے۔ ہمیں پو پھٹنے تک بیدار رہنا ہوگا۔ یہ بھی مت بھولو کہ ہم میں سے جس کی آنکھ بھی لگ گئی اسے تاک میں بیٹھا ہوا بھیڑیا پھاڑ جائے گا۔"

بھیڑیا کا نام سن کر چاروں پھر کچھ دیر تک پتھر کی مورتیاں بن گئے۔ جب خاموشی کو اکتاہٹ کا زخم لگنے لگا تو چوتھے درویش نے ایک فلک شگاف نعرہ لگایا جس کی بازگشت دور پہاڑیوں میں سے سنائی دی۔ تینوں کو یہ بہت ناگوار گزرا۔ وہ اس پر شکروں کی طرح جھپٹنے ہی والے تھے کہ چوتھا بولا" صبر کرو کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ درویش ہوتے ہوئے بھی تم تاک میں بیٹھے ہوئے بھیڑیئے سے ڈر گئے حالانکہ ہم سب کے اندر خوف کا ایک ایک بھیڑیا چھپا بیٹھا ہے جو منافقت کا گوشت کھاتا رہتا ہے۔"

اس کی بات سن کر تینوں نے گردنیں اپنے گریبانوں میں ڈال لیں۔ چوتھا بولا" اچھا اب دوزانو ہو کر بیٹھ جاؤ میں تمہیں اپنا ایک ایسا ادھورا خواب سنانے لگا ہوں جو میں عنقریب دیکھنے والا ہوں۔"

پہلے نے دوزانو بیٹھتے ہوئے تعجب سے پوچھا" تو کیا تم نے ابھی تک خواب نہیں دیکھا ہے؟"

"نہیں،" چوتھا بولا" خواب ابھی تک مجھے دیکھتا رہا ہے۔" پھر وہ گویا ہوا" صاحبو! خواب کچھ یوں ہے کہ میں

مرشد کے حکم پر ایک بستی میں داخل ہوتا ہوں کہ اہلِ بستی کے دلوں میں اللہ کی محبت کی پنیری لگاؤں کہ کیا دیکھتا ہوں کہ بستی والے، کیا چھوٹے کیا بڑے، اپنے اپنے مکانوں سے نکل کر بستی سے باہر ایک وسیع میدان میں جمع ہو رہے ہیں ان سب نے اپنے کندھوں پر پھاوڑے، بیلچے اور کدالیں اٹھا رکھی ہیں۔ وہ یوں خاموش ہیں جیسے کسی نے ان کے لبوں کو سی دیا ہو۔ صرف ان کی آنکھوں سے تاسف کا تیزاب ٹپک رہا ہے۔ اس ہجوم میں سے ایک شخص پر میری نظر پڑتی ہے جو مجھے سب سے زیادہ بزرگ معلوم ہوتا ہے۔ پوچھتا ہوں "اے بزرگ! تم اپنے ان رچے بسے مکانوں کو چھوڑ کر اس میدان میں کیوں جمع ہو رہے ہو؟" بوڑھا تعجب سے میری جانب دیکھتے ہوئے جواب دیتا ہے "اجنبی دکھائی دیتے ہو ورنہ یہ سوال نہ کرتے۔" میں اثبات میں سر ہلا کر کہتا ہوں "آپ نے درست فرمایا۔ مجھے تو مرشد نے بھیجا ہے کہ میں بستی والوں کے دلوں میں اللہ کی محبت کی پنیری لگاؤں۔" بوڑھا بڑے سپاٹ لہجے میں میری طرف دیکھے بغیر کہتا ہے "یہ پنیری تو ہم نے تین دہائی پہلے اپنے دلوں میں لگائی تھی مگر وہ پودے تناور درخت نہ بن سکے کیونکہ ہمارے دلوں کو سیم اور تھور لگ گئی ہے۔" میں پھر اپنا سوال دہراتا ہوں "مگر مکانوں کو کیوں چھوڑ رہے ہو؟" بوڑھا ذرا جھنجھلا کر بولتا ہے "تمہیں نظر نہیں آ رہا کہ مکانوں کی بنیادوں میں ریت بھر گئی ہے یہ کسی وقت بھی ہم پر گر سکتے ہیں۔" صاحبو! پھر میں دیکھتا ہوں کہ تمام بستی والے، کیا چھوٹے کیا بڑے ہنستے کھیلتے ناچتے گاتے اور ایک دوسرے سے چہلیں کرتے اس میدان میں اپنی قبریں کھودنے لگتے ہیں کسی کے چہرے پر کوئی ملال نہیں، جیسے وہ اسی دن کا انتظار کر رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاتا ہوں کہ وہاں محض تماشائی بن کر کھڑے رہنا بڑا معیوب نظر آتا تھا۔ دوسروں کی طرح میں بھی اپنے لیے بڑی کشادہ قبر کھود لیتا ہوں پھر دیکھتا ہوں کہ ہر ایک کیا چھوٹا کیا بڑا، اپنی گردنوں میں لٹکی ہوئی سنگِ مرمر کی لوحیں اُتار رہا ہے جو انہوں نے اپنی قمیصوں کے اندر چھپا رکھی تھیں۔ ان لوحوں پر ہر ایک کا نام، اس کی عمر اور اس کی ماں کا نام بڑے خوشنما طریقے سے کندہ تھا۔ ہاں یاد آیا۔ ہر لوح پر اس بستی کا نام بھی لکھا تھا۔ وہ بوڑھا شہادت کی انگلی اٹھا کر میری گردن کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ میں اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھتا ہوں وہاں لوح کی بجائے ایک طوق لٹک رہا ہے جس پر سیاہی مائل خون کی پپڑیاں جمی ہوئی ہیں۔ ان سب کی دیکھا دیکھی میں بھی اپنی قبر پر وہ طوق نصب کر دیتا ہوں۔ دوستو! پھر میں کیا دیکھتا ہوں کہ بستی کے سب لوگ کیا بڑے کیا چھوٹے نہایت فخر سے ایک دوسرے کو اپنی اپنی قبر پر نصب شدہ لوح دکھاتے ہیں وہ انتہائی پُر انبساط لہجے میں بلند آہنگ سے آپس میں باتیں بھی کر رہے ہیں لیکن میرے پلے کچھ نہیں پڑ رہا یہ بات نہیں کہ وہ کوئی غیر زبان بول رہے تھے۔ میں ان کی زبان کو اچھی طرح فہمید کرتا ہوں مگر خدا جانے کیا بات

ہے کہ ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ میرے کانوں تک پہنچتے ہی اپنا مفہوم کھو دیتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے خشک پتوں پر ریت گر رہی ہو۔ جب دن کے جالے بکھر جاتے ہیں اور نیند میں جھولتا ہوا سورج دور سمندر کی گود میں سر رکھ کر سو جاتا ہے تو تمام بستی والے کیا چھوٹے کیا بڑے خوشی خوشی ایک دوسرے کو الوداع کہتے ہوئے اپنی اپنی قبر میں گھس جاتے ہیں۔ میں بھی ان کے نقشِ قدم پر چلتا ہوں۔ پھر میں کیا دیکھتا ہوں کہ نئے سورج کی آنکھ سے گرم دھوپ بہہ رہی ہے۔ تمام بستی والے کیا چھوٹے کیا بڑے کھانے پینے اور آسائش کی دیگر چیزیں اٹھائے بڑی شاہراہ پر جمع ہو گئے ہیں۔ وہاں شاید کوئی کارواں سرائے ہے۔ تھوڑی دیر بعد شاہراہ کے دونوں اطراف سے قافلے آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ قافلے والے ان سے اشیائے خورد و نوش خریدتے اور معاوضے میں رنگا رنگ کی نقدی اور بدیسی چیزیں دیتے ہیں۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ بعض قافلے والے اس کارواں سرائے کے باہر اپنے خیمے گاڑ دیتے ہیں اور بستی والوں کی جوان اور خوبصورت عورتوں کو خیموں میں لے جاتے ہیں اور تھوڑی دیر بعد پرکٹی مرغیوں کی طرح انہیں باہر پھینک دیتے ہیں۔ البتہ ان کی چادروں میں ان گنت تحائف بھرے ہوتے ہیں۔ پھر کیا دیکھتا ہوں کہ شام ڈھلتے ہی سب بستی والے کیا بڑے کیا چھوٹے، پھر قبروں کے پاس لوٹ آتے ہیں مگر وہ اپنی اپنی قبر کو تلاش نہیں کر سکتے جیسے انہیں اپنی چیزوں کی پہچان نہ رہی ہو۔ جو بھی جس قبر میں اتر کر دیکھتا ہے وہ اسے قبول نہیں کرتی۔ اس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ پھر کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ہر کوئی دوسرے سے پوچھتا ہے کہ میری قبر کون سی ہے۔ کوئی بھی اپنے نام کی لوح نہیں پڑھ سکتا۔ ہر کوئی سارے دن کی مشقت سے تھکا ماندا اور جھنجھلایا ہوا ہے جیسے مینڈک لمبی لمبی زبانیں اسے چاٹ رہی ہوں۔ پھر وہ سب میرے گرد حلقہ بنا لیتے ہیں اور پوچھنے لگتے ہیں کہ "تمہاری قبر کہاں ہے؟" میں انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہوں "وہ ہے جس پر لوح کی بجائے ایسا طوق نصب ہے جس پر سیاہی مائل خون کی پپڑیاں جمی ہوئی ہیں۔" پھر وہ بے قرار ہو کر پوچھنے لگتے ہیں "ہمارے نام کیا ہیں؟ کیا ہمارے کوئی نام بھی تھے؟" میں جواب دیتا ہوں "لاریب تمہارے نام تھے کہ تم نے اپنی لوحوں پر کندہ کئے تھے تاہم مجھے معلوم نہیں کہ تمہارے نام کیا ہیں کہ میں نے تم سے تمہارے نام نہیں پوچھے تھے۔ ممکن ہے اب تم سب کا ایک ہی اسم ہو۔ کوئی اسم اعظم۔" پھر میں دیکھتا ہوں کہ وہ سب کے سب مایوس ہو گئے ہیں اور قبروں کے سرہانے ٹیک لگا کر کھلے آسمان تلے بیٹھ کر ایک دوسرے سے اپنا نام پوچھ رہے ہیں۔"

"پھر کیا ہوا؟" پہلے درویش نے یوں مضطرب ہو کر پوچھا جیسے وہ کہانی کا نقطۂ عروج معلوم کرنا چاہتا ہو۔

چوتھے درویش نے مشرق کی طرف نظریں جمائے ہوئے جواب دیا "پھر کیا ہونا تھا۔ جب فجر کو کانوں میں آواز پڑتی ہے کہ آؤ فلاح کی طرف ـــــ تو میری آنکھ کھل جاتی ہے اور یوں خواب ادھورا رہ جاتا ہے۔"

پھر چاروں درویشوں نے اسم اعظم کی تختیوں کو خرقوں سے باہر نکال کر گردنوں میں نمایاں طور پر لٹکا لیا لیکن اندھیرے کی وجہ سے انہیں یہ نظر نہیں آرہا تھا کہ ان تختیوں پر اسم اعظم مٹ چکا تھا اور وہاں سیاہی مائل خون کی پپڑیاں جمی ہوئی تھیں

پی۔بی۔ایل ۵۳۶

منیر احمد شیخ

نیا شہر اجنبی لڑکی کی طرح اُسے اپنی طرف کھینچتا تھا۔ اجنبی لڑکی اور نیا شہر وہ جادو نگری تھی جس میں راستہ بھولنا اُسے بھلا لگتا تھا۔ راستہ بھولے اُسے بہت مدت ہو رہی تھی۔ ناک کی سیدھ چلتی ہوئی سڑکوں اور گلیوں میں چل چل کے وہ تنگ آ گیا تھا۔ یہ بھی کیا مصیبت ہے کہ شہر کی تمام سڑکیں سیدھی اور ایک دوسرے کے متوازی دوڑتی چلی جا رہی ہیں۔ ہر قدم پر منزل کی نشاندہی کا اعلان ہے اور وہ سڑکیں جو ان متوازی سڑکوں کو قطع کرتی ہیں وہ بڑے سے قائمے زاویے بناتی ہیں۔ کسی چوک میں کھڑے ہو جائیے اور راستوں کا آغاز اور انجام دیکھ لیجئے۔ وہ زندگی کی اس سیدھ سے بے حد اُکتا گیا تھا۔ وہ بستی کہاں ہے جہاں آدمی راستہ بھول جایا کرتا تھا۔ راستہ بھولنے کے بعد اُس کے اندر تحیر اور پھر تحیر میں سے دریافت کا عمل شروع ہوتا تھا۔ دریافت کے عمل میں اُسے وہ انجانی اور چھوٹی چھوٹی خوشیاں نصیب ہوتی تھیں جو سیدھے منزل کی طرف جاتے ہوئے راستوں میں کبھی نہیں ملتیں۔ سیدھی سڑک پر چلتے ہوئے آدمی پر اُسے سکوٹر اور بس کا شبہ ہوتا کہ جن میں پٹرول بھر کر گیئر لگا دیا جائے تو وہ آپ سے آپ دوڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ چلتے چلتے اپنی ٹانگوں پر ہاتھ لگا کے یہ جاننے کی کوشش کرتا کہ وہ کون سے گیئر GEAR میں ہے۔ سڑک پر جب کوئی موڑ آتا ہے تو وہ اپنی رفتار سست کر دیتا اور ٹانگوں پر ہاتھ لگاتا۔ "اب فرسٹ گیئر چل رہا ہے" فرسٹ گیئر کے شور سے اُسے وحشت ہونے لگتی تو وہ کبھی کبھی ایک آدھ موڑ تیزی سے کاٹتا اور خوش ہوتا کہ اُس نے تیسرے گیئر میں موڑ کاٹ لیا ہے اور اس کی تیز رفتاری سے وہ شور اور گڑگڑ پیدا نہیں ہوئی جو فرسٹ گیئر لگانے سے پیدا ہوتی ہے اور جس سے اُسے سخت وحشت ہوتی۔ سیدھی سڑک اور فرسٹ گیئر دونوں سے اُس کی جان عذاب میں تھی۔ اُس نے کئی دفعہ گڑگڑا کر دعا کی کہ اللہ میاں تو نے ساری سڑکیں سیدھی کر دی ہیں تو مجھے بھی آدمی کی جگہ سکوٹر بنا دیا ہوتا! اپنی ذات اور سکوٹر کی مماثلت کے کیا اُس نے بہت سے پہلو تلاش کر رکھے تھے۔ سکوٹر کے پہیوں پر اُسے ہمیشہ اپنی ٹانگوں کا شبہ ہوا۔ اس کی پٹرول کی ٹینکی پر کئی دفعہ اس

نے اس خیال سے ہاتھ رکھا۔ جیسے وہ اپنے معدے کو دبا کے دیکھ رہا ہے کہ اس میں خالی ہوا تو نہیں بھری ہوئی۔ اُس کی روشنی تیز تھی۔ اُسے ہمیشہ یہ گمان ہوا جیسے کوئی احساسِ جرم کا مارا ہوا شخص تاریکی میں چھپ کے اپنی سیاہیوں پہ تیز نظر ڈال رہا ہو۔ سکوٹر، کار اور بسوں کی تیز لکیر سی روشنی سے وہ غضب آلود ہو جایا کرتا۔ راستہ چلتے چلتے جب کبھی وہ تیز روشنی کی زد میں آجاتا تو اُسے یوں لگتا جیسے کسی نے سرِ راہ اُس کے کپڑے اتار دیے ہیں اور وہ ننگا دھڑنگا اپنی جسمانی کمزوریوں کے ساتھ سب کو نظر آ رہا ہے۔ تیز روشنی اپنے جسم پر پڑتے ہی وہ کار، سکوٹر اور بس چلانے والے کو ایک غلیظ سی گالی دیتا کہ وہ اندھیرے میں بیٹھے ہوئے اُسے ننگا کر کے دیکھ رہے ہیں۔ خطِ مستقیم اس کے ذہن اور اعصاب پر اس بری طرح سوار تھا کہ جہاں کہیں کاغذ کتاب پہ وہ سیدھی سطریں دیکھتا انہیں کاٹنا شروع کر دیتا۔ لکیروں والے رائٹنگ پیڈ پہ اس نے کبھی کسی کو خط نہیں لکھا تھا کہ ایسے پیڈ کو دیکھتے ہی اُس پہ کچھ لکھنے کا سوال ہی آپ سے آپ ختم ہو جاتا۔ زمین پہ جب کبھی وہ انگلی یا تنکے سے کوئی خط کھینچتا، تو وہ ہمیشہ ٹیڑھا میڑھا اور بل کھاتا ہوا ہوتا۔ جسمانی طور پہ سیدھی لڑکی سے اُسے سخت نفرت تھی۔ لیکن جذباتی طور پر بھی اور سیدھی لڑکی سے اُسے پیار کی حد تک دلچسپی ہوتی تھی کہ ایسی لڑکی کو وہ جیسے چاہے ٹیڑھا کر سکتا ہے اور اُس میں بل پیدا کر سکتا ہے۔ سانپ جیسے بل، پہاڑی ندی کے سے بل، پھلوں سے لدی ہوئی شاخوں کے بل، گلے میں ڈالی ہوئی باہوں کے خم اور جھکی ہوئی گہری پلکوں کے سایوں کی گولائی۔

نئے شہر میں سیدھی سپاٹ سڑکیں تھیں اور ترچھی سوچ، یہ ترچھی سوچ اس شہر کے رہنے والوں کو اس طرح کاٹتی چلی جاتی تھی کہ اُن کے الگ الگ حصے ہو گئے تھے۔ درجہ سوم اور درجہ چہارم کے ملازمین ای ٹائپ کے کوارٹروں میں رہتے تھے۔ ای ٹائپ کے کوارٹر جہاں ختم ہوتے تھے وہاں ایک سیدھی سڑک دیوار کی طرح گزرتی تھی اور اس دیوار سے آگے ڈی ٹائپ کے مکان شروع ہوتے تھے۔ درجہ دوم کے ملازمین ڈی ٹائپ میں رہتے تھے اور ای ٹائپ والوں کو دیکھتے تھے اور اپنے سے حقیر جانتے تھے۔ ڈی ٹائپ والے ای ٹائپ والوں کی طرح مسلسل اس فکر میں غلطاں رہتے تھے کہ ان کی تنخواہ کب اتنی بڑھے گی کہ وہ سی یا بی ٹائپ کے مکانوں میں چلے جائیں گے۔ مکانوں اور ٹائپ کا قصہ یہ تھا کہ تنخواہ کے مطابق ہر شخص کا درجہ متعین تھا اور وہ اپنے درجے میں بیٹھ کر اُوپر کے درجے کی طرف دیکھتا رہتا کہ سالانہ ترقی کے متواتر کتنے سال بیتیں وہ اس قابل ہو گا کہ اپنے سے بڑے والوں سے آگے نکل جائے! یہاں سے اعلیٰ درجے کے ٹائپ میں رہ کر اُن کی طرف حقارت سے دیکھ سکے۔ مختلف درجوں کے درمیان سیدھی سپاٹ سڑکیں حقارت کی لکیریں تھیں کہ جن کو پاٹنے کی فکر اُس شہر کے ہر باسی کو لگی رہتی۔ یہ لکیریں یوں تو مکانوں کے باہر سے گزرتی تھیں۔ لیکن جب کبھی نچلے ٹائپ کے بچے کھیلتے کھیلتے اوپر والے درجے

کے ٹائپ جیسے گھروں کی طرف جانے اور اُوپر والے ٹائپ کے لوگ اپنے بچوں کو منع کرتے کہ وہ گھر سے باہر نچلے اور گھٹیا ٹائپ کے بچوں سے نہ کھیلیں تو نفرت اور حقارت کی یہ لکیریں گھروں کے صحنوں، برآمدوں اور کمروں میں سے ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی گزرنے لگتیں۔ نچلے ٹائپ میں رہنے والی مائیں شام کے وقت اپنے بچوں کو خاص ہدایت کرتیں کہ وہ اپنے محلے ہی میں کھیلیں، اس سے اگلے محلے میں نہ جائیں وہاں صاحب لوگ رہتے ہیں۔ مکانوں اور محلوں کی اپنی کوئی شخصیت نہ تھی۔ نہ کوئی گھر بیری کے بوٹے سے پہچانا جاتا اور نہ کسی گھر میں آسیب تھا کہ جس پہ برسوں تالا پڑا رہتا ہے اور بچے اور بوڑھیاں وہاں سے پرے ہو کر گزرتے ہیں اور نہ کوئی ایسی تھی کہ جس میں بادشاہ اور فقیر اپنے تخت اور تکیئے پر اپنے حال میں مست پڑے ہیں اور بادشاہ چل کے فقیر کے تکیئے پر آتا ہے۔

شخصیت نہ مکانوں کی تھی نہ مخلوق کی۔ کوئی اپنی صفت سے نہیں پہچانا جاتا تھا، پہچان صرف ذات پات کے حوالے سے ہوتی تھی۔ ذاتیں کہ جن کو نفرت کی سیدھی سڑکیں کاٹتی چلی جاتی تھیں اور جن پر چلتے ہوئے آدمی اپنے معدے کو دبا کے دیکھتا تھا کہ اس میں کتنے گیلن پٹرول بھرا ہوا ہے۔ پٹرول پمپ جگہ جگہ تعمیر ہو گئے تھے، چوڑی چکلی کشادہ سڑکوں والے، جن میں سے پٹرول جب باہر آتا تھا تو سوئی بھی ساتھ ہی گھومتی تھی اور بتلاتی تھی کہ اتنے گیلن پٹرول باہر نکل گیا ہے۔ نئے شہر میں چلتے چلتے جب اُسے سخت بھوک لگی تو وہ ایک پٹرول پمپ کی مشین کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور اس کی نالی منہ میں ڈال کر پٹرول پمپ والے کو حکم دیا "آدھی گیلن"۔

پٹرول پمپ والے نے اس کو گالی دی اور پٹرول بھرنے والی نالی اس کے منہ سے کھینچ کر ساتھ آکر کھڑی ہونے والی موٹر کی ٹینکی میں ڈال دی اور سوئی تیزی سے گھومنے لگی۔ اُسے پٹرول والے پر سخت غصہ آیا اور جب موٹر پٹرول بھروا کر چل پڑی تو اُس نے زمین پر سے ایک کچا ڈھیلا اٹھا کر اُسے مارا۔ مگر موٹر آگے نکل چکی تھی کچے ڈھیلے کی مٹی ذرا سی اُڑی اور پھر زمین پر بکھر گئی۔ اُس نے اپنا سر پکڑ کر اپنے آپ کو سمیٹنے کی کوشش کی۔ سیدھی سڑکیں، موٹریں، سکوٹر پٹرول، گھومنے والی سوئی — نفرت اور حقارت، آدھی گیلن، دو گیلن۔ اُسے یوں لگا جیسے اُس نے بہت سا پٹرول پی لیا ہے۔ اور اس کے منہ کا ذائقہ خراب ہو گیا ہے اور اُس کے پیٹ میں نفرت بھر گئی ہے۔ اُس نے اپنے حلق میں انگلی ڈال کر قے کرنے کی کوشش کی کہ اس کا جی بہت متلانے لگا تھا۔ اُسے قے بالکل نہیں ہوئی۔ لیکن اس کا پیٹ بوجھل تھا اور پٹرول پمپ پہ موٹریں اور سکوٹر پٹرول بھرواتے چلے جا رہے تھے۔

"لعنت"۔ اُس نے اپنے بارے میں سوچتے ہوئے یہ لفظ دو چار مرتبہ منہ سے نکالا۔ اُس نے سوچا کہ میں آدمی ہوں یا جانور۔ لیکن پھر فوراً ہی اصلاح کر دی نہیں آدھا یا سکوٹر۔ اُس نے پانچ لاکھ مرتبہ اپنے آپ پر لعنت بھیجی اور

اپنے خیالات کی گرد کو ذہن سے ہٹانے کے لئے نئے شہر کے ایک نئے کیفے میں داخل ہوگیا تاکہ وہ چائے کی پیالی سے ان خیالات کے دھارے کو بدلنے کی کوشش کرے ۔ اُس نے چائے کا آرڈر دیا اور سگریٹ سلگائی۔ سگریٹ کے کش میں اُسے پٹرول کی بو آئی تو اُس نے سوچا شاید تمباکو کو پٹرول کی چھینٹ دے دی گئی ہے۔ اُس کی طبیعت پھر گھبرائی۔ چائے کا پہلا گھونٹ پیتے ہی اُس کی زبان سے وہی ذائقہ چپٹ گیا جو پٹرول کی نالی منہ میں ڈالتے پر محسوس ہوا تھا اُس نے چائے وہیں رکھ دی اور سگریٹ کو پاؤں سے مسل کر آرام سے بیٹھ گیا۔ نئے شہر کے لوگ محوِ گفتگو تھے۔ پچھلی ٹیبل والے ایک نئے شخص کا تعارف ایک دوسرے سے کروا رہے تھے۔

"ان سے ملیے۔ محمد حسین صاحب! بی ٹائپ میں رہتے ہیں۔" پاس بیٹھے ہوئے ڈی ٹائپ والوں نے مسرت اور عقیدت کے ملے جلے جذبات سے بی ٹائپ والے کی طرف دیکھا اور اُسے بڑی عزت سے پوچھا کہ وہ چائے کے ساتھ کیا کھانا پسند فرمائیں گے۔ بی ٹائپ والے نے کہا وہ صرف چائے پیئے گا اور وہ بھی بغیر شکر کے۔ ایک ڈی ٹائپ والے نے قہوہ اس کی پیالی میں انڈیلا اور بے دھیانی میں چمچہ اس کی پیالی میں ہلانا شروع کر دیا۔ بی ٹائپ والے نے اس کا ہاتھ روکا، اور کہا ہلائیے مت، اس میں شکر نہیں ہے۔ ڈی ٹائپ والے نے خفت کے احساس کے ساتھ چمچہ پیالی میں سے نکالا اور شکر سے بھر کر اپنے منہ میں انڈیل لیا اور اُسے چبانے لگا۔

سامنے والی میز پہ ایک نیا نیا بنگالی جوڑا آ کے بیٹھا تھا۔ لڑکی بے حد شرمیلی تھی اِدھر اُدھر لوگوں کو چوری چوری دیکھتی۔ چائے کی پیالی اٹھانے سے پہلے وہ دیکھتی کہ اُسے کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ ہنستے وقت وہ ساڑھی کا پلو منہ پہ رکھ لیتی اس کا بلاؤز اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ شوہر اس کے ننگے پیٹ اور کمر کو دیکھ دیکھ کر نروس ہو رہا تھا۔ اُس نے آنکھوں سے اشارے کر کر کے اپنی بیوی کو بتانے کی بڑی کوشش کی کہ وہ بلاؤز نیچے کرے۔ لیکن وہ اُس کے اشاروں کو سمجھنے کی بجائے اِدھر اُدھر چوری چوری لوگوں کو دیکھتی تھی کہ کہیں وہ سارے اُسے چائے پیتے تو نہیں دیکھ رہے۔ اس کا شوہر جب مزید نروس ہوگیا تو اُس نے انگلی کے اشارے سے ننگے پیٹ اور کمر کو ڈھانپنے کے لئے کہا۔ بنگالی لڑکی نے اُس کی انگلی جھٹک دی اور غصے سے کہا کہ وہ ہر وقت انگلیوں سے اُسے اشارے کرتا رہتا ہے اور یہ بہت بری عادت ہے۔ شوہر مزید نروس ہوگیا اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں کی نظریں اُس کی بیوی کے بلاؤز کو اُوپر کھسکائے جا رہی ہیں اور اگر اس نے ہاتھ سے بلاؤز نیچے نہ کیا تو اس کا بلاؤز کھل جائے گا۔ اور سارا ہوٹل اس کے سینے کی بہار لوٹے گا۔ شوہر نے اپنا ہاتھ بلاؤز کی طرف بڑھایا تو ایک میز سے آواز آئی۔

"ہوٹل میں تو صبر کرو۔"

شوہر نے گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا اور اُس میز کی طرف دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی۔ ایک لوئر ڈویژن کلرک پورا بتیسی نکالے ہنس رہا تھا۔ اُس کے دانت پان سے سُرخ تھے اور وہ جلدی جلدی میں سگریٹ پی رہا تھا اور ہر مرتبہ ناک میں سے دھواں نکالتا تھا۔ بنگالی شوہر اُس کے سرخ دانت دیکھ کر غصے سے کانپنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ پٹرول چھینک کر اُسے آگ لگا دے لیکن پٹرول اُس پاس نہیں تھا۔ اُس نے جلدی میں بیرے کو آواز دی بل لاؤ اور جب بل آیا تو اُس نے کھٹ سے پیسے میز پر پھینکے اور ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ باہر نکلتے ہی اُس نے بیوی کے بلاؤز کو اس زور سے نیچے کھینچا کہ وہ چیخ اُٹھی کہ اس کا شوہر پاگل تو نہیں ہو گیا۔ شوہر پاگل تو نہیں ہوا تھا اس نے بیوی کو جھڑکتے ہوئے کہا تمہیں شرم نہیں آتی۔ ہوٹل میں بیرے دفتر کا کلرک تمہارا سارا جسم دیکھ رہا تھا۔ دفتر کا کلرک اگرچہ نچلے درجے کے مکانوں میں رہتا تھا لیکن وہ ہوٹل میں اس لئے آیا تھا کہ وہاں اے اور بی ٹائپ میں رہنے والے افسران اپنی بیویوں کے ساتھ چائے پینے کو آ جاتے تھے۔ اور وہ اُن کے برابر کے میز پہ سامنے بیٹھ کر اپنے آپ کو یقین دلاتا کہ وہ نچلے ٹائپ کے مکانوں میں رہتا ہے لیکن ہوٹل میں تو وہ اپنے افسروں کے مقابل بیٹھ سکتا ہے۔ اور اگر کوئی افسر اپنی بیوی کے مختصر سے بلاؤز پر نروس ہو سکتا ہے تو وہ ہمت کر کے فقرہ بھی کس سکتا ہے۔ اس دن جب وہ ایک افسر کو نروس ہوتے دیکھ کے ہنستا تو اُسے بڑا اطمینان نصیب ہوا جیسے وہ تمام فائلیں جو اُسکے میز پر کئی دن گرتی رہتی ہیں اُس نے اٹھا کر افسر کے میز پر واپس دے ماری ہیں۔ اُس نے جاتے جاتے کے بعد اُس روز بیرے کو چار آنے کے بجائے آٹھ آنے ٹپ کے اور اُٹھتے ہوئے بیرے سے کہا۔ جاؤ عش کرو۔ بیرا آٹھ آنے جیب میں ڈال کر عیش کرنے کے لئے مڑا تو کلرک ہوٹل سے باہر نکل گیا۔

نئے شہر میں مکانوں اور محلوں کی طرح ان میں رہنے والوں کی بھی کوئی شخصیت نہیں تھی۔ ایک ہی ٹائپ کے مکانوں میں رہنے والے سب ایک جیسے تھے۔ اپنے مکانوں کی طرح کہ سب کا ایک دروازہ ہے۔ سب کے تین کمرے ہیں۔ سب کا ایک سا صحن ہے مکانوں کی طرح ان کے بھی نمبر تھے۔ ۲۱۴ اے ۳۱۵ بی ۱۸۲ سی ۲۱۰ ڈی ۵۸۵ ای۔ ہر شخص اپنے گلے میں اپنی نمبر پلیٹ لگا کے چلتا تھا۔ نمبر پلیٹ اگرچہ قمیض کے اندر جسم سے لگی ہوئی تھی لیکن ہر شخص کا چہرہ اُس کے نمبر کی چغلی کھاتا تھا۔ چہرہ اور نام تو اکثر دھوکا دیتے ہیں۔ کچھ اور عارضی رنگ کی طرح۔ مگر نمبر پلیٹ بڑی پکی چیز ہوتی ہے۔ نمبر تقدیر کا چکر ہے۔ کہ آدمی دو تین چار کرتے کرتے قبر میں پہنچ جاتا ہے۔ اور اُسے اپنے ٹائپ کے قبرستان میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ آدمی زمین کے نیچے ہو یا زمین کے اوپر، جو نمبر اُس کے گلے میں پڑ گیا ہے وہ اسے ایک ایک خاص خانے میں مقید کر دیتا ہے۔ شیرازی کبوتر ایسے کبوتروں میں نہیں ملتے اور ایسے شیرازیوں میں۔

اور وہ جو ہوٹل میں خاموش بیٹھا اپنے نمبر کو الٹ پلٹ کے دیکھ رہا تھا، حیران تھا کہ وہ کس آدم کی اولاد ہے۔

وہ دس بچوں کا باپ ہے مگر اُسے اِسی ٹائپ کے ایک چھوٹے سے مکان میں اس لئے رہنا پڑتا ہے کہ اس کی تنخواہ زیادہ نہیں۔ اور وہ جو دو ہزار روپیہ مہینہ کما رہا ہے اُس کے دو بچے ہیں مگر وہ سات کمروں اور بڑے بڑے لانوں والی کوٹھی میں براجمان ہے اور اُس کے دو نیکے بجائیں بجائیں کرتے ہوئے کمروں میں یوں ہی گھوم رہے ہیں۔ زہر بھری خاموشی کمروں کے اندر بھری پڑی ہے۔ گھر کے افراد دور دور صوفوں پہ بیٹھے باتیں کرتے ہیں۔ جیسے قریب آنے سے انہیں ڈر لگتا ہو اُس نے اپنے گلے میں بندھی ہوئی نمبر پلیٹ کو گھمایا اور قمیض کے اندر ڈال کر ہوٹل سے باہر چلا آیا۔ اس کا سر شدید درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ سیدھی سڑک پر چلتے چلتے اس کا جی چاہا کہ آج وہ راستہ بھول جائے اور چلتے چلتے ایسی جگہ پر پہنچ جائے، جہاں مکانوں اور آدمیوں کی شکلیں ایک جیسی نہ ہوں جہاں مکانوں کے کوئی نمبر نہ ہوں، جہاں آدمیوں کے کوئی نمبر نہ ہوں، جہاں سڑکوں کے کوئی نمبر نہ ہوں، جہاں اے، بی، سی، ڈی اور ای کی ذاتیں نہ ہوں۔ جہاں آدمی، آدمی ہو، سکوٹر نہ ہو — جہاں مکان اپنے مکینوں سے پہچانے جائیں۔

"لعنت"

— اس کے منہ سے پھر یہ لفظ نکلا، سیدھی سڑک پہ راستہ بھولنے کی خواہش پوری نہ ہو رہی تھی! اسے شدید گھٹن ہونے لگی کہ وہ جب بھی راہ پہ نکلے گا ناک کی سیدھ ہی میں چلے گا اور چلتا ہی رہے گا۔ یہ بھی کیا لعنت ہے۔ اُس نے پھر اپنے آپ پہ ملامت کی۔ وہ سڑک کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ اُس کی نگاہوں کے سامنے ایک جیسے سینکڑوں مکانوں کی قطاریں دھوپ میں زمین پہ یوں بکھری پڑی تھیں جیسے دھوبی نے کپڑے سکھانے کے لئے ڈال رکھے ہوں۔ سیدھی سڑکیں، بے نام لوگ، بے نام گھر، ایک سکوٹر اس کے سامنے سڑک پہ سے گذرا۔ اُس نے پٹرول کے دھوئیں کو اپنے نتھنوں میں محسوس کیا۔ پھر زور سے اُسے سینے کے اندر کھینچا۔ اپنا سینہ پٹرول کے دھوئیں سے بھرنے کے بعد اُس نے فرسٹ گیئر لگایا اور سکوٹر کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگا۔

چشمِ تماشا

نجم الحسن رضوی

اور جب وہ دروازے ہم پر بند ہو گئے تو ہم نے زمین اوڑھ لی اور اپنے ہاتھوں میں گیہوں کی بالیاں اٹھائے دریا کے ساتھ چل پڑے۔ یہ سفر بڑا طویل ٹھہرا اور سورج ہمارے کندھوں پر سوار ہمارے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا گیا میرے ساتھی نے اپنے سر پر گھر کی چھت اٹھا رکھی تھی لیکن جب بھی ہم دونوں اس سے ذرا دیر کو پشت ٹکا کر اپنی آنکھوں پر جمتی ہوئی نیند کی پھپھوند صاف کرنے کی کوشش کرتے۔ اچانک فضا میں لمبی پلکوں والے بے شمار پرندے ٹڈی دل کی طرح نمودار ہوتے اور اپنی نوکیلی چونچوں سے ہماری چھت کو اس طرح چھلنی کر دیتے کہ ہم انجیر کے پتوں میں بھی برہنہ ہو جاتے۔ کبھی کبھی میرا ساتھی جھنجھلا کے ان کے پیچھے دوڑ پڑتا اور پھر جب وہ واپس لوٹتا تو کبھی اس کے ہاتھوں اور کبھی اس کی پیشانی سے خون ٹپک رہا ہوتا۔

وہ مجھے اپنی محبتوں کے شہر میں قلعہ بند رکھنے کے لئے برسہا برس تک نیزوں کی دیواریں کھڑی کرتا رہا۔ لیکن ایک رات جب میں اس کے بدن کے مخملیں لحاف میں سمٹی ہوئی تھی یک بیک ہمارے سرہانے ایک دیو پیکر اژدھے نے سر ابھارا جو سمندر کی طرف سے آیا تھا، اس کی شکل گھوڑے کی تھی اور اس کے نتھنوں سے تبر نکلتے تھے۔ اس نے اپنی چوبی ٹاپوں سے ہماری چھت کے پرخچے اڑا دیئے۔

میرا ساتھی چھت کی تلاش میں چاروں طرف دوڑتا پھرا اور وہ اتنا دوڑا اور اتنا بھاگا کہ دیوانہ کہلایا۔ پھر جب دیوانگی کے عالم میں اس سے کہا گیا کہ وہ پہاڑ سے اپنے گھر کی چھت تراش لے تو وہ تیشہ اٹھا کے پہاڑ کی سمت دوڑ پڑا۔ اسی طرح جب ایک مرتبہ میرے اور اس کے درمیان پانی حدِ فاصل ٹھہرا تو میں نے گھڑے سے گھوڑے کا کام لیا یہاں تک کہ وہ ہماری رفاقت کی پہچان بن گیا لیکن ایک دن مجھے ایسا بھی یاد ہے جب مجھے عزت والوں کی خوشنودی کے لئے سنگی دیوار کا نقاب اوڑھنا پڑا تھا اس لئے کہ انہیں یہ اندیشہ تھا کہ میرا ساتھی میری آرزو کا گرز لے کر سونے کے اس پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر دے گا جسے دیوتاؤں نے ہم دونوں کے درمیان

حائل کیا تھا۔

پھر ایک دن جب ہم دونوں سورج کی تھکی ہوئی کرن سے ٹیک لگا کے سفر کی لذت کو اپنے بدن کے مرتبان میں ذخیرہ کر رہے تھے، میں نے کہا یونس اب تو سب بلائیں تمام ہو چکیں کیوں نہ ہم ایک ہو جائیں، اکائی ہماری اصل ہے اور ہر شے اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے!

وہ ہنسا۔ کہنے لگا۔ اصل بات یہ ہے جانم کہ مجھے دنیا میں کسی چیز سے ڈر نہیں لگتا مگر اپنے والدِ گرامی کی بھیا مونچھ سے، جس کی نوک پر ان کے وقار کی کائنات قائم ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ ہمیں یکجا دیکھ کے ان کے وقار کو کوئی خطرہ نہ لاحق ہو جائے۔ ویسے بھی میرا سانولی لڑکیوں سے ملنا جلنا انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ وہ کہتے ہیں کہ بہو ایسی ہونی چاہیئے جو چندے آفتاب چندے ماہتاب ہو تاکہ اس کے دم سے گھر بھر میں اجالا ہو جائے، لگتا ہے کہ وہ اپنی بہو کے ذریعے بجلی کی بچت کرنا چاہتے ہیں۔

میں نے کہا۔ ہمارے بڑوں کی باتیں کیسی عجیب ہیں پتہ ہے میری ماں کیا کہتی ہیں، وہ فرماتی ہیں کہ لڑکے کی بڈی اچھی ہونی چاہیئے کیونکہ اگر اس کی بڈی اچھی ہو تو آنے والی نسلوں پر نیکی خوش نصیبی اور سلامتی بنلا آسمان بن کے اترتی ہے۔ اب تم بتاؤ کہ میں تو ہوں طلائی خاندان سے اور تمہارا تعلق ہے نقرئی نسل سے پھر میری ماں کیونکر ہماری یکجائی برداشت کریں گی!

اس نے کہا، مگر یہ بھی تو سوچو کہ تم صرف حوا ہو اور میں آدم تو پھر وہ کون ہے جو ہمارے درمیاں سرحدیں کھڑی کر رہا ہے!

پھر ایک شام ہم دونوں بیٹھے تھے کہ اس نے کہا، سنو میری شاعری میں تمہارا دل دھڑکتا ہے، تمہاری آنکھیں بولتی ہیں اور تمہاری سانسیں مہکتی ہیں۔ میں نے کہا، مجھے یقین ہے بلکہ شاید اس کا اوروں کو بھی یقین ہے جبھی تو ہماری تنہائی کی دیواریں چھلنی کی جا رہی ہیں اور چھت کی جگہ وسیع روشندان قائم ہے اور جب ہم باہر نکلتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہماری تصویریں تو سب شہر والوں کے ہاتھوں میں تھمی ہیں اور ان کی سرگوشیوں میں ہمارے ناموں کی تکرار سنائی دیتی ہے۔

اس دن وہ عورت کے حقوق پر زوردار تقریر کر کے آیا تو میں نے اسے عقیدت کے پھول پیش کیے۔ میں نے کہا۔ تم مجھے اس لیے پسند ہو کہ تم میں سچائی کے اظہار کی جرات ہے۔ تمہارا چہرہ مجھے ان عظیم لوگوں کی یاد دلاتا ہے جنہیں جھوٹ بولنا نہیں آتا تھا۔

اس نے کہا، سنو جب آج میری تقریر کے دوران تم بے تحاشہ تالیاں پیٹ رہی تھیں تو بہت سی آنکھیں تمہارا جائزہ لے رہی تھیں اور جب میں تقریر کر کے واپس آ رہا تھا تو راستے میں بہت سے آنکھوں والے ملے اور کہنے لگے، تمہاری تقریر نے اسے بہت متاثر کیا ہے جسے تم متاثر کرنا چاہتے تھے، مبارک ہو، امید ہے کہ تمہارا سفر اچھا گزرے گا!

کون سا سفر؟

'زندگی کا سفر!' انہوں نے جواب دیا۔

میں نے کہا شاید تمہیں پتہ نہ ہو کہ لمبی پلکوں والے پرندے اب بھی ہمارے چاروں طرف منڈلاتے ہیں اور سامنے والی کھڑکیوں اور دروازوں کے پیچھے پرے جمائے بیٹھے ہیں۔

پھر بڑی آپا کمرے میں داخل ہوئیں اور کہنے لگیں، 'بھئی بہت رات ہو گئی ہے اب اپنے کمروں میں سو جاؤ'

میں نے کہا، 'جی صبح یہ شخص جا رہا ہے لمبے سفر پر، ذرا جی بھر کے باتیں تو کر لوں'

'نہ نہ بی بی' انہوں نے سرگوشی کی، کافی رات ہو گئی ہے، گھر والے کیا کہیں گے، وہ تمہارا منگیتر ہے تو کیا ہوا، تمہیں اس کے ساتھ زیادہ دیر تک اکیلے نہیں رہنا چاہیئے'

'کیوں؟' میں نے سوال کیا۔

بڑی آپا بولیں، بس کہہ جو دیا، لکڑی آگ کے قریب ہو تو کوئی اسے جلنے سے نہیں روک سکتا!

'مگر ہم کوئی بچے تو نہیں؟'

'یہ اور خطرناک بات ہے جان، آخر تم سمجھتی کیوں نہیں، شیطان کو کبھی INEFFICIENT نہیں سمجھنا چاہیئے!'

اور پھر جب ایک دن ہماری چھت کو دیواریں نصیب ہوئیں تو میں اور میرا ساتھی بہت ہی خوش ہوئے۔ وہ کہنے لگا۔ بھئی خوب جگہ ہے، صاف ستھری، روشن اور رومانٹک۔ بس اب یہیں رہیں گے، لیکن وہ دیواریں بھی بھوسے کی نکلیں جن میں چوہے پھدکتے پھر رہے تھے۔

نظریں ہمارے وجود کو چاٹ رہی تھیں اور ہماری پرسکون تنہائی کو آواز کا گھن لگ چکا تھا۔ میں نے اپنے چاروں طرف مکھیوں کو بھنبھناتے ہوئے پایا۔

'ارے کون ہے یہ؟'

'پتہ نہیں'

'اور وہ کون ہے؟ اس کا خاوند یا اس کا چاہنے والا؟'

'آخر یہ آئے کہاں سے ہیں؟'

'ذرا دیکھو تو کیسے مگن رہتے ہیں ایک دوسرے میں؟'

'بھئی مجھے تو یہ معاملہ کچھ ۔۔۔؟'

میں سوچتی ہوں کہ شاید میرے بدن سے ایک انوکھی خوشبو پھوٹتی ہے کہ میں چاہے جہاں رہوں وہ مجھ سے دور نہیں رہ سکتا۔ اس دنیا میں بھی جو ایک عجیب دنیا ہے، ایسی دنیا جو رشتوں سے پہلے وجود میں آئی۔ یہاں کسی کا کوئی ماضی، کوئی مستقبل نہیں، یہ دنیا صرف اور صرف حال سے منسلک ہے اور ایسا حال جس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا کہ یہ حال ہے۔ سب سمجھتے ہیں کہ شاید یہی ماضی ہے، یہی مستقبل ہے۔ میں اس دنیا میں سورج کی حیثیت رکھتی ہوں۔ یہ دنیا میرے وجود سے گرم اور روشن ہے۔ اگر میں سامنے نہ آؤں تو یہ دنیا اندھیری رہے، یہاں دن نہیں نکلتا، میں طلوع ہوتی ہوں۔ یہ دنیا ہجر کی دنیا ہے۔ وصال کی دنیا ہے، روزِ ہجر اور روزِ وصال، روزِ جدائی اور روزِ ملاپ۔ اگرچہ یہاں رنگ و روپ ہی سب کچھ ہے مگر یہاں کا رنگ ڈھنگ اور ہے۔ وہ میرے طلائی چہرے اور نقرئی آواز سے خوش ہوتا ہے۔ ہاں خوش ہوتا ہے جبھی تو وہ یہاں آتا ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ اگر میں کا نسی کا چہرہ لگا لوں تو بھی وہ یہاں آئے گا کیوں کہ یہاں چہرے اتنے اہم ہیں، یہاں رنگ بھی کام نہیں آتا۔ یہاں نسل سے بھی کسی کو غرض نہیں۔ یہاں عورت کا صرف ایک نام ہے ایک رنگ اور ایک نسل۔ اسے تو یہاں میری خوشبو کھینچ کے لاتی ہے۔ پھر آج جب وہ دندناتا میری سیڑھیوں پر چڑھتا آ گیا تو میں اپنے طلائی چہرے کو کھڑکی میں سجائے کھڑی تھی۔ اس نے آتے ہی بے تکلفی سے میرے چہرے کے روشن چراغ کو بجھا دیا اور مجھے ان دیواروں کے پیچھے لے گیا جہاں چہروں کے نقوش مٹ جاتے ہیں اور پھر تابناک پیشانیوں اور مسکراتے ہونٹوں پر ایسی تیز خوشبو پھیل جاتی ہے جو عموماً عبادت گاہوں میں پائی جاتی ہے۔ اس خوشبو کی معیت میں ہم دونوں اپنے وجود کے نشانوں سے آگے بڑھ کے ایسے جہانوں کی طرف نکل گئے۔ جہاں زمین اور آسمان روئی کی طرح دھنکے ہوتے تھے اور فضا نیلگوں تھی اور ایک ایسے درخت نے ہم پر سایہ کر رکھا تھا جس کی شاخوں سے کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔

اسی وقت دستک ہوئی، بہت تیز دستک ۔۔۔ پھر بوکھلائی ہوئی آوازیں ابھریں 'سو سو باہر قانون کے محافظ آ گئے ہیں۔' میں نے اس کی طرف دیکھا، اب کیا ہو گا؟'

وہ مسکرایا۔ جو گنہگاروں کا ہوتا ہے۔ کیا تو نے غور نہیں کیا کہ ہم ننگے ہیں۔ پس خود کو انجیر کے پتوں کے سپرد کرو، بے شک ہم نے وہ پھل کھایا جس کی بابت میں منع کیا گیا تھا کہ نہ کھانا!

اس وقت باہر بہت ہنگامہ تھا، محافظوں کی سیٹیاں گونج رہی تھیں اور ہمیں وہاں سے نکلنا تھا کیونکہ اوپر سے فرمان آچکا تھا کہ بس اب زمین پر اتر پڑو۔ اے آدم و حوّا! ہم نے اپنے پیچھے دروازوں کے بند ہونے کی آواز سنی۔

دستک

یونس جاوید

شاید پھر دستک ہوئی تھی۔

تین مرتبہ ایسا ہو چکا تھا اور میں جانتا تھا کہ دستک دینے والا کون ہے۔ میری بیوی تو اس دستک سے ارچک تھی۔ پتہ نہیں۔ قصور میرا تھا یا نہیں مگر وہ یہی سمجھتی تھی کہ میں قصوروار ہوں۔

پہلی مرتبہ — ہاں پہلی مرتبہ — مگر یہ تو کئی روز پہلے کی بات ہے۔ وہ مجھے گلی میں ایک تھڑے پر بیٹھا نظر آیا تھا۔ شاید پاگل تھا —— لیکن میں نے اس کے بارے میں زیادہ سوچا نہیں تھا —— میرے گزرنے پر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر چلنے لگا، بالکل میرے پیچھے پیچھے۔ مکان کے دروازے تک۔

"کیا ہے ؟" میں رک گیا۔ وہ خاموش رہا۔ میں اندر آگیا اور دروازہ بند کر دیا۔ اس کے فوراً بعد میں نے دستک سنی —— یہ پہلی دستک تھی۔ میں نے بیوی کو آواز دی۔

"کون ہے ؟" اس نے پوچھا۔ جواب دینے کے بجائے میں نے کھڑکی کھولی۔ وہ سامنے کھڑا تھا۔

"مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے" وہ بڑبڑایا۔

"تو پھر ؟" مجھے بُرا لگا وہ اس وقت۔

"میں زخم زخم ہوں" وہ اس لہجے میں بولا۔

"کیا کہہ رہا ہے یہ ؟" بیوی پوچھ رہی تھی۔ پھر وہ خود ہی بولی "شہر میں جاؤ نا —— ڈسپنسری میں ——"

"سارا شہر نمک کا ہے" اس کے لہجے میں ذرا بھی تبدیلی نہیں تھی۔

"سارا شہر نمک کا ہے !" بیوی نے دہرا دیا "تمہارے پلے کچھ پڑا ؟ — مجھے تو پاگل لگتا ہے یہ"

"ہاں شاید" رک کر میں نے اس سے پوچھا، کیا چاہیے تمہیں؟

"حرارت ـــــ مجھے حرارت چاہیئے" اس کے لفظ یہی تھے ـــــ ہاں یہی تھے ـــــ

"حرارت چاہیئے"؟ عجیب سا لگا مجھے۔

"جی ہاں" وہ مصر تھا۔

"تو میں کیا کروں" میں چڑ گیا تھا ـــــ "دھوپ میں بیٹھو جا کر"

"کوئی گرم کپڑا" ـــــ وہ رک گیا۔

"میں سمجھ گیا"۔ میں نے کہا ـــــ "مگر اس وقت کچھ نہیں ہو سکتا۔ کل آنا"۔ میں نے لمحہ بھر میں دیکھ لیا تھا کہ وہ سچا ہے۔ اس نے صرف ایک قمیض پہن رکھی تھی۔ میلی ـــــ پھٹی ہوئی ـــــ آستینوں تک لیر لیر۔ کلائیوں کی نیلی رگیں پھول رہی تھیں اور جلد کا رنگ پتہ نہیں کیا تھا ـــــ میں نے کھٹ سے کھڑکی بند کر دی۔ واقعی سردی بہت تھی۔ کھڑے کھڑے میرے گھٹنے تک سُن ہو گئے تھے۔

بحال ہونے کے بعد میں نے بیوی سے کہا "واقعی بہت سردی ہے۔ کوئی کپڑا وپڑا تلاش کر دینا"

اس نے جیسے میری بات سُنی ہی نہیں۔ اٹھ کر باہر نکل گئی۔

میں نے سوچا یہ کام میں خود ہی کیوں نہ کر لوں۔ میں نے تلاش شروع کر دی۔ مگر عجیب الجھن تھی۔ ہر کوٹ کے ساتھ کوئی نہ کوئی یاد وابستہ تھی۔ ٹائی کی شکل میں ـــــ اور ٹائیاں مجھے بہت پسند ہیں۔ عیسٰی کی صلیب کا نشان ـــــ ہو سکتا ہے قبل از مسیح بھی ان کا رواج ہو ـــــ مگر میری مشکل یہ تھی کہ ہر ٹائی میرے کسی نہ کسی دوست ـــــ بے حد عزیز دوست کی طرف سے گفٹ تھی اور کسی نہ کسی کوٹ سے میچ تھی۔ لہذا کوئی بھی کوٹ نہ ملا۔

اصل میں کوئی پھٹا پرانا کوٹ تھا ہی نہیں۔

بس۔ یہی میرا قصور تھا۔

بیوی کہتی تھی کہ اگر اس شخص سے وعدہ نہ کیا ہوتا تو وہ اس طرح بار بار دستک دے کر تنگ تو نہ کرتا۔ مگر یہ کوئی دلیل تھی بھلا؟ ہم دن میں کتنے وعدے کرتے ہیں، توڑتے ہیں، ہر لمحے کے ساتھ ہماری حیثیت بدل جاتی ہے۔ ابھی پاس تھے ابھی ماتحت ہو گئے۔ کبھی شوہر، کبھی باپ۔ ہر لمحے بات تو بدلنا ہی پڑتی ہے۔ ایٹی کیٹس اور مینرز تو یہی ہیں۔

مگر وہ مجھے قصور وار ٹھہراتی تھی۔ بیویاں عموماً جھگڑالو ہوتی ہیں۔

"تم جھگڑالو ہو" میں نے چلا کر کہا۔ شادی کے بعد تم پہ روپ اور مجھ پر قرض چڑھا ہے اور تم ہو کہ ——"

اب کے چوتھی دستک تھی —— ! بیوی گھٹ کر رہ گئی۔

"کون ہے ؟" جانتے ہوئے بھی پوچھنا ضروری تھا۔

"میں ہوں" آواز وہی تھی۔

"کہہ دیا نا پھر کسی وقت آنا ——" میں نے پیچھا چھڑانا چاہا۔

"مجھے اندر آنے دیجئے —— باہر بہت ٹھنڈ ہے"

"اندر آنے دوں ؟ —— میں نے کھڑکی کھول کر کہا" کمال ہے —— جان نہ پہچان اندر آنے دو —— کون جانتا ہے تمہیں اس محلے میں ؟"

"آپ جانتے ہیں مجھے" وہ بولا

"میں ؟" مجھے حیرت ہوئی —— "میں تو نہیں جانتا —— تم ہو کون ؟"

"آدمی"، وہ بہت آہستہ بولا تھا۔

"آدمیوں والے کام بھی تو کرو ——" میرا سارا غصہ کھڑکی بند کرنے میں نکل گیا تھا ——

"احمق" بیوی بڑبڑائی۔

"کم بخت" میں نے دانت پیسے۔

مگر اس نے پھر دستک دے دی۔

"کیا ہے ؟" میں جھلا گیا تھا —— وہ کچھ نہ بولا —— صرف تکے گیا۔ میری طرف —— گم صم —— میں نے ماچس باہر پھینک دی "اٹھاؤ" میں نے کہا —— تنکے وِنکے جمع کرکے آگ جلا لو ——"

"تنکے ؟" وہ اس ایک لفظ پہ رک گیا تھا —— وہ کھڑا رہا —— میں نے بھی کھڑکی بند نہیں کی۔ وہ پاگل لگ رہا تھا۔

"جاؤ نا اب —— مجھے سونے دو۔ دیکھو سنو ——" میں نے کھڑکی انگلی سے اسے دھمکایا "اب اگر دستک دی نا —— سمجھے ؟ تو نمٹ لوں گا تم سے اچھی طرح"

وہ گئی تو نہیں مگر اس نے رُخ پھیر لیا۔ بڑا ہی ڈھیٹ تھا۔ سکون غارت کر دیا تھا اس نے —
" ہر ایرے غیر کو منہ لگاتے ہو نا —" بیوی غرائی — بخدا وہ غرائی تھی —"میں ہوتی تو —"
تم ہوتیں تو کیا کر لیتیں؟" مجھے غصہ آ گیا تھا —" میں جانتا ہوں تمہیں — کس مسئلے میں SHARE
کرنے کے بجائے تم سارا ملبہ مجھ پر لاد دیتی ہو۔"
"کس نے کہا تھا گدھوں والی حرکتیں کرو؟" وہ اپنی عادت سے مجبور تھی۔
دیکھو حد سے نہ بڑھو — حد میں رہو —" میں چلایا —" چلو نکلو یہاں سے —"
" ہاں ہاں" اس نے لمبی "ہاں" میں سب کچھ کہہ دیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں حد کے سرے پر آ گیا ہوں۔
"چائے پیو گے؟" لمحہ بھر توقف کے بعد اس نے میری کمزوری مجھے یاد دلا دی۔
"لے آؤ" میں نے لاپرواہی سے کہا۔
وہ چائے لینے کے بہانے چلی گئی — اپنی انا بچانے گئی۔ مگر چائے نہ لائی حتیٰ کہ میرے ہاتھ سردی
سے سُن ہو گئے — انگلیاں برف تھیں۔ جھکتی نہ تھیں۔ میں نے جلدی سے ہیٹر آن کر دیا۔ چند لمحوں میں
ہاتھ پاؤں، انگلیاں، گھٹنے، ٹخنے، پگھل سے گئے۔ مجھے گرمی لگنے لگی۔
اب کیا کیا جائے؟
میں نے روشندان کھولنے کی کوشش کی۔ ہیٹر گیس کا تھا اور روشندان کھول دینا ہی مناسب تھا۔
بلکہ ضروری تھا — مگر وہ کھل نہیں رہا تھا۔ بڑی کوشش کے بعد بھی وہ نہ کھلا۔ شاید برسوں بند رہنے
کی وجہ سے اس میں زنگ لگ گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ زوردار ٹھوکروں سے کھل جائے گا۔ مگر مجھے
سخت نیند آ رہی تھی۔ اترتی نیند کا نشہ سرد رگ رگ خون میں پھیل رہا تھا اور اس وقت ہر قسم کی ٹھوکر لگانے
کی سکت کو چاٹ رہا تھا۔
" نہ سہی" میں نے سوچا میں ہیٹر بند کر دیتا ہوں۔"
میں نے ہیٹر بند کر دیا — ٹمپریچر نارمل ہونے لگا مگر کچی گیس سے کمرہ بھر گیا تھا۔ یقیناً ہیٹر میں کچھ خرابی
تھی۔ دَم گھٹ رہا تھا۔
میں نے دروازہ کھول دیا — مگر گیس کے ساتھ حرارت بھی نکل گئی — کمرہ پھر ٹھنڈا ہو گیا۔ پھر
بھی میں نے سونے کی کوشش کی اور سو گیا۔ گہری نیند۔

پھر ایک زور دار دستک نے مجھے جگا دیا۔
سورج کی کرن بند روشندان سے اندر آ رہی تھی۔
دستک دوبارہ ہوئی۔ مگر یہ اس طرح کی دستک نہ تھی دبی دبی سی۔ کوئی زور زور سے دروازہ پیٹ رہا تھا۔ مجھے الجھن ہونے لگی۔
"کون ہے" میں نے کھڑکی کھول کر پوچھا۔
"ہم ہیں جی" آواز آئی ــــ میں نے باہر جھانکا۔ کچھ لوگ دروازے پہ جمع تھے۔ وہ پہچانے نہیں جا رہے تھے۔ وہ کون تھے! پتہ نہیں کون تھے! پتہ نہیں کون تھے۔ صبح ہی صبح کسی کے دروازے کو یوں پیٹتے ہیں بھلا، مجھے بہت برا لگ رہا تھا۔
"حاجی افضل معلوم ہوتا ہے" بیوی نے چائے بناتے ہوئے دور سے بتایا۔
"کون ہے وہ؟" میں واقعی نہیں جانتا تھا۔
"محلے دار ہیں ـ" وہ بولی "دس بارہ سال سے پڑوسی ہیں اپنے"
"واقعی؟" مجھے ندامت ہونے لگی۔
"ہاں ہاں" اس نے یقینی انداز میں کہا۔
میں نے باہر کا دروازہ کھول دیا۔
"زحمت کے لئے معافی چاہتے ہیں" ان میں سے ایک نے کہا "دراصل مسئلہ ہی کچھ ایسا تھا۔"
"اندر تشریف لے آیئے ــــ" مجھے اپنی کیٹس بہت عزیز ہیں۔
"جی نہیں۔ بس کھڑے کھڑے ــــ" رک کر اس نے بات بڑھائی "وہ درویش تھا نا اپنا۔
"کون درویش؟"
"وہ جی، وہ پروفیسر تھا پہلے" دوسرے نے ٹکڑا لگایا۔
"وہ پاگل؟ وہ پروفیسر تھا؟" میں نے ہکلا کر پوچھا۔
"اوہ جی اب تو بس ایسے ہی تھا" تیسرا بھی بول پڑا۔
"قصہ کیا ہے؟" میں بے صبر ہو رہا تھا۔
وہ رات مر گیا جی ــــ سردی سے ــــ اس آدمی نے سنجات بھرا سانس بھر کر کہا "کفن دفن کیلئے"

"جی ہاں — تجہیز و تکفین ۔" دوسرا اتنا ہی کہہ پایا۔

میں سمجھ گیا۔" میں نے کہا۔ میں واقعی سمجھ گیا تھا ۔" آپ کو پیسے چاہئیں نا؟ کتنے؟

"جو توفیق ہو دے دیجئے۔"

"آپ کی ضرورت کیا ہے؟"

سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر لیڈر نما آدمی بولا۔" کچھ رقم جمع بھی ہو چکی ہے۔"

"کم کتنے ہیں؟" میں نے بات کاٹ دی میں ابھی اور سونا چاہتا تھا — ہاں کچھ دیر اور —

"کم؟" وہ سوچنے لگا۔"کم۔ لگ بھگ ڈیڑھ سو۔"

میں اندر لپکا —

بیوی دروازے کے پیچھے سے سب کچھ سن رہی تھی — بولی — کچھ زیادہ ہی دے دیجئے۔ حیثیت کو ٹھیس نہیں لگنی چاہیئے۔

میں نے اپنی جیب سے روپے نکالے — تو اس نے اپنا پلو بھی کھول دیا۔" سو کا ایک نوٹ ہے میری طرف سے۔"

میں نے دیکھا وہ بے حد سنجیدہ تھی اور دکھی بھی۔

"کوشش کیجئے — وہ بولی —" کہ لاش زیادہ دیر تک سڑتی نہ رہے —" اور رک کر اس نے کہا —" یہ کمبل بھی — سنا ہے میت کو بھی سردی لگتی ہے —"

"ہاں —" میں نے تائید کی۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔"

محلے داروں سے — میں نے کہا۔" کوشش کیجئے — لاش زیادہ دیر تک سڑتی نہ رہے — ثواب کا کام ہے ۔" میں نے روپے ان کی جھولی میں ڈال دیئے

واپس آکر میں نے سونے کی کوشش کی مگر نیند اڑ چکی تھی۔ وہ آدمی ذہن سے نکل ہی نہیں رہا تھا۔

"اچھا ہوا — مر گیا — بے چارہ — بیوی بولی — روز سردی میں ٹھٹھرتا تھا۔"

"ہاں" میں نے اطمینان کا سانس لے کر جواب دیا —" کم از کم دستک تو نہ دے گا نا —

"اور کیا — روز دروازہ پیٹتا تھا —" یہ بڑبڑاہٹ میری بیوی کی تھی،

سلمیٰ اور ہوا

احمد ہمیش

ابھی اس کرہ میں رات اور دن کا سفر جاری ہے۔ یہ واضح ہے۔ مٹی اور پانی کی تمام کوتاہیوں سے ہٹ کر زمین پر ایک ایسا مکان باقی ہے، جس کے اوپر سے ہوا سوچ سمجھ کے گزرتی ہے۔ یہ واضح نہیں۔ کیوں کہ ہوا کو یہ معلوم ہے کہ اس مکان میں ایک انتہائی اہم وجود رہتا ہے جو کسی چیز سے مرعوب نہیں۔ یہ واضح ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ کبھی دن کی سمت آنے والی کچھ منتخب شعاعیں ان کے سر سے جڑ جاتی ہیں۔ کبھی رات ان کے گرد چکراتی ہے۔ ان کے نام کے سارے حروف خالی ہیں: س ل م ا۔ ان کے مابین ہوا آ جاتی ہے ان کی تیز اور جلالی آواز۔ یہ یقین ہے کہ ہوا ان کو چیلنج نہیں کر سکتی۔

یہ کون ہیں؟ — یہ وہ ہیں، جو زندہ دلی سے زندہ ہیں۔

وہ کہتی ہیں کہ — دراصل ہوا ہی موت ہے۔

ہوا کا مطلب، لوگ زمین پر بالواسطہ زندگی سے لیتے ہیں۔ اگر دوسرے سیاروں میں جاندار آبادیاں ہیں تو وہاں کون سی ہوا چلتی ہے! مزید دریافتوں کا انتظار کب تک کریں؟

فی الحال جو ہوا زمین پر چلتی ہے وہ بالکل فراڈ ہے۔ وہ روز اپنی کوری پلیٹ میں کوری ابتلا کو لئے روشندان سے باہر نکل جاتی ہے۔ دہرلئے ہوئے آدمی، نباتات، پرندے اور مویشی، اس کے پالتو ہیں۔ ماما کہ ماں کے حیاتی نقشے سے نکل کر بچہ، گوشت کا لوتھڑا ہوا ہیں پھیلتا ہے ہوا اسے پھیلا پھیلا کر عمر کے کرافٹ پر اچھالتی ہے۔ گزشت تجربوں سے آگاہ ہوتا ہے۔ جب کرافٹ ٹوٹتا ہے تو اسے مٹی اور پانی میں کون تحلیل کرتا ہے کس نے مرتے ہوئے آدمی سے پوچھا ہے! یا مرتے ہوئے نباتات یا پرندے یا مویشی۔ کس نے پوچھا ہے؟ یہ وہ ہیں، جو اپنے مکان کے بلے صحن میں بچھے ہوئے بلے تخت پر بیٹھی ہیں۔ تخت پر سفید چادر۔ زعفران اور سفید کاغذ — وہ قرآن کی آیتیں پڑھ رہی ہیں۔ ان کے مکان کے باہر

ورتوں کا رونا سنائی دے رہا ہے۔ یہ اطلاع سن کر وہ باہر گلی میں آتی ہیں کہ وہاں بوڑھا کشن مر رہا ہے
س کے گلے سے خرخراہٹ نکل رہی ہے۔ عورتوں کے رونے سے مرنے کی اذیت میں اضافہ ہوتا ہے۔

وہ مرتے ہوئے بوڑھے کے پاس آتی ہیں۔ اس کے سر پہ ہاتھ رکھتی ہیں اس کے گلے سے نکلتی خرخراہٹ
چانک ختم جاتی ہے۔ عورتیں رونا بند کر دیتی ہیں۔ محض ایک بوڑھے کو مارنے کے لئے دیر سے جو ناٹک کر
رہی تھیں، اس پر سکوت حاوی ہو گیا۔

گلی سے ملی ہوئی گلیوں اور ان سے ملی ہوئی سڑکوں پر کرفیو ہے۔ جنوب میں مدیوم کا کلرک اپنی حد تک
رجسٹر میں پورے خطہ کی موت درج کر چکا ہے۔ یہ ہوا ہے۔ اس طرح نعروں اور فائر کے درمیان کروڑوں
پراسرار اجتماعی بستیاں بسنے کے۔ لئے اجتماعی علیحدگی مانگتی ہیں۔ اسی حساب سے اس مانگ کے کروڑوں
ٹکڑے سفاکی سے علیحدہ کر دیئے جاتے ہیں اور کیا چاہیئے۔ علیحدگی مانگنے والے پھر بھی جی رہے ہوتے ہیں
یہ ہوا ہے۔ اس کا ارتقاء آج تک کی تاریخ دستاویز میں محض کرفیو ہے۔ لیکن بوڑھے کشن کا واقعہ اس لئے
علیحدہ ہے کہ وہ تنہا مرنے کے معنی میں علیحدہ ہو رہا ہے۔ اس کا عقیدہ، کرفیو نہیں بلکہ علیحدہ ہونے کی تمنا جاں کنی
ہے اسے دیکھنے کے لئے کوئی اپنے مکان سے نکل کر گلی میں نہیں جا سکتا۔ سب کرفیو سے ڈرتے ہیں۔

یہ وہ ہیں، جو اپنی تمام خود مختار جراتوں سے گلی میں گیئں۔ کیونکہ قرآن میں کہیں بھی کرفیو کا ذکر نہیں۔ لہٰذا
وہ ایک بوڑھے پر موت آسان کر کے پھر اپنے مکان میں واپس آ گیئں۔

ترلوچن

اسد محمد خاں

جو کچھ ہوا، اس سے پہلے یہاں انسانی بستیاں موجود تھیں، اور جانور اور درخت اور دریا اور پہاڑ سبھی تھے۔ ایک تواتر کے ساتھ موسم آتے رہتے تھے، چیزیں اگتی تھیں، بڑھتی، پھیلتی اور پرانی ہوتی تھیں، اور درمیان سے مرجھا کر جھڑ جاتی تھیں، کبھی کبھی کوئی قہقہہ مار کر ہنس بھی دیا کرتا تھا۔ مجموعی طور پر سب ٹھیک ہی تھا۔ عین الحق یہ سب کچھ ختم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اگر کرنا گتے کا مورت اس کی پیٹی کھول کر چیزوں کی وہ فہرست نہ پڑھ لے جاتا، جو اس نے اتنی دلسوزی سے تیار کی تھی، تو عین الحق ہرگز ہرگز وہ نہ کرتا، جو اس نے کیا۔

اس نے جو کچھ کیا، وہ وقتی اشتعال اور مایوسی کے تحت کیا تھا، مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے کہ اب تو کچھ تھا ہی نہیں، جسے پھر سے ترتیب دیا جاتا، سب ختم ہو چکا تھا۔

اور جو کچھ ہوا، وہ پلک جھپکتے میں ہو گیا۔ پیٹی خالی دیکھ کر اس نے اپلوک، پرلوک اور دیولوک تینوں کی ڈوریاں اپنی انگشت شہادت پر لپیٹ کر مٹھی بند کی، ایک ذرا کندھا جھکا کر جھٹکے سے انہیں اپنی پشت پر لیا، سیدھے ہاتھ کی مٹھی پر مٹھی کس کر الا اللہ کہا، اور ہوا میں جیسے کدال چلاتے ہوئے تینوں لوک زمین پر دے مارے۔

یہاں تک بھی ٹھیک تھا۔ بات کچھ ایسی زیادہ بگڑی نہیں تھی۔ لیکن اس کے بعد تو عین الحق نے غضب ہی کر دیا۔ وہ پورے قامت سے تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے جھٹکے سے اسٹکنگ پلاسٹر کا وہ ٹکڑا اپنی پیشانی سے نوچ پھینکا، جسے پابندی سے وہ نماز کے گٹے والی جگہ پر چپکا لیا کرتا تھا۔ پھر اس نے سر جھکایا، زمین کی طرف دیکھا، اور تمام کمال قہاری میں اپنی تیسری آنکھ کھول دی، اور تینوں لوک جلا کر خاک کر دیئے

سو اب دھوئیں اور راکھ کے سوا کچھ نہیں تھا، جسے پھر سے ترتیب دیا جاتا، سب ختم ہو چکا تھا، اور الحق جانتا تھا کہ دھوئیں اور راکھ کو ترتیب نہیں دیا جا سکتا، یہ خاتمہ ہے

یہ سب کچھ اسی بلی سے شروع ہوا تھا ایک دن گلی سے گذرتے ہوئے اس نے اچانک اس بلی کو دیکھا اور اسے فہرست بنانے کا خیال آگیا۔ وہ بلی اس قدر زخمی اور اتنی میلی اور جگہ جگہ سے اتنی نچی کھچی تھی کہ یہ ساری باتیں کاغذ پر لکھے بغیر یاد نہیں رکھی جاسکتی تھیں۔ اس نے سوچا، فہرست بنانا اچھا رہے گا۔ وہ اب تک چیزوں کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھتا آرہا تھا، لیکن چیزیں اتنی بہت سی ہوگئی تھیں، اور برابر بڑھتی جارہی تھیں، اور ان کی تفصیل اتنی طولانی ہوتی جارہی تھی کہ اب ذہن میں محفوظ رکھنا ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ ڈرتا تھا کہ کہیں بھولنا شروع نہ کردے۔ اس لئے اس نے ایک بہت بڑے کاغذ پر سات سو چھیاسی لکھا، اور نمبر اشیاء اور نام اشیاء اور ان کے کوائف اور کارہائے مجوزہ اور تاریخ عملدرآمد کے خانے بنائے، اور ان خانوں میں اس نے سب چیزیں درج کرنا شروع کردیں، تاریخ عملدرآمد کا خانہ ابھی خالی رکھا، اس لئے کہ پہلے وہ چیزوں کو اور ان کی تفصیل کو حافظے سے کاغذ پر منتقل کرلینا چاہتا تھا۔ یہ بہت ضروری تھا۔ باقی عملدرآمد میں دیر ہی کتنی لگتی۔ فہرست مکمل ہونے کے بعد وہ کسی بھی دن اور کسی بھی وقت کارہائے مجوزہ کے خانے میں لکھی ہوئی باتوں پر عمل درآمد کرکے معاملے نمٹا سکتا تھا۔

تو اس نے سب سے پہلے نمبر شمار ایک پر بلی کو درج کیا، اور اس کے کوائف لکھے، اور کارہائے مجوزہ میں درج کیا کہ اسے نئی کھال وغیرہ دینی ہے، اور تاریخ عملدرآمد کا خانہ خالی چھوڑ دیا۔ دوسرے نمبر پر عین الحق نے ہیڈ کانسٹبل سلامت میر خاں کی بیوہ رقیہ بیگم کا مسئلہ درج کیا، وہ اسی بلاک کے ایک لاولد مکان میں تنہا رہتی تھی۔ اسے عرق النساء کی شکایت تھی، اور دکھ اور تنہائی میں اس کا چہرہ لٹک گیا تھا۔ یہاں کارہائے مجوزہ کے خانے میں اس نے طے کیا کہ رقیہ بیگم کو عرق النساء سے چھٹکارا دینا ہے، اور ایک لے پالک کے بیٹے بیٹیوں سے اس گھر کا صحن آباد کرنا ہے۔ رقیہ بیگم کے بعد اس نے بھورے خان کولڈ ڈرنک اینڈ سگریٹ کارنر کو درج کیا، جو بہتر برس کا تھکا ماندہ امرد پرست تھا، اس کا گھر بار نہیں تھا۔ دوکان کے تھڑے پر ہی سو رہتا تھا، اسے خوبصورت لڑکوں کو دوکان پر بٹھانے اور اسلامی تاریخی ناول پڑھوا کر سننے کا شوق تھا۔ پریشانی کی بات یہ تھی کہ لڑکے بھاگ بھاگ جاتے تھے، اور وہ انہیں یاد کرکے روتا تھا، اور فتح بریٹ کتنے ہی دن ملتوی رہتی تھی۔ عین الحق نے بھورے خاں کولڈ ڈرنک اینڈ سگریٹ کارنر کو درج کیا، اور اس کے کوائف لکھے، اور کارہائے مجوزہ میں یہ لکھا کہ ایک خوبصورت اور باوفا لڑکا ہمہ وقت موجود رہے، تاکہ بھورے خان دکھ اور جدائی میں دوہرا نہ ہو جائے، اس لئے کہ بہتر برس بہت ہوتے ہیں۔ پھر اس نے مزار سے آئے ہوئے شہزماں موچی اور

اس کے بیک نفس بھائیوں کو درج کیا، جو فجر سے پہلے اُٹھ کر شیر زمان کی چارپائی پر اکڑوں بیٹھ جاتے تھے، اور اسے سے ایک ایک کر قرآن پڑھا کرتے تھے ان سب کی بیویاں ملک میں تھیں، اور وہ دن بھر شیر زمان کی ہدایات کے مطابق سونے لگا تھے اور ٹیپ ریکارڈر پر سلطان میاں قوال کی گائی ہوئی قوالیاں سنتے تھے عین الحق نے ان کے کوائف لکھے، اور کارہائے تجویز میں درج کیا کہ ان سب کا ان کی بیویوں سے ملاپ کرانا ہے، اور لکھا کہ شیر زمان کی لواسیر خونی رنج کری ہے، کیونکہ وہ بچوں اور قلیل آمدنی والے کمزور لوگوں سے بھی نرمی سے بات کرتا ہے پھر عین الحق نے عقاب کے سے تجسس والی مائی نوراں مسی کو درج کیا، جس کے پنجے بھی عقاب کے تھے، اور عین الحق نے اس کے کوائف لکھے، اور کارہائے تجویز میں لکھا کہ مائی نوراں مسی کو نئی ریڑھ کی ہڈی دینی ہے، اور بلاک نمبر دو سے بلاک نمبر آٹھ تک مکانوں کی عقبی گلی میں وافر مقدار میں پلاسٹک کے ٹکڑے، ہڈیاں اور ردی کاغذ مہیا کرنا ہے، جو عرصہ بارہ سال تک برائے رہیں اکس لئے کہ نوراں کا ناسور اسے اس سے زیادہ کی مہلت نہیں دے گا۔ عین الحق نے دفع ناسور از زندگی لکھ کر کاٹ دیا، کیونکہ اس طرح بعض گھروں سے ملنے والا خصوصی الاؤنس بند ہونے کا احتمال تھا، اور یہ بات کسی عنوان بھی نوراں مسی کے لئے مناسب نہ تھی، پھر بلاک نمبر دو سے بلاک نمبر آٹھ تک آتے ہوئے، پارک سے متصل بدکامنی کے پیڑ کے نیچے پہنچ کر عین الحق نے دیکھا کہ تنور والے گھاؤ والے بدکامنی کے نوعمر تنے سے اپنا مینڈھا باندھ باندھ کر اس کی نرم چھال کو ادھیڑ دیا ہے، تو عین الحق نے ادھڑی ہوئی چھال کے نم دائرے سے، اپنی انگلیوں کے پورے مس کئے، اور بدکامنی کے پیڑ سے وعدہ کیا، اور پیڑ کے کوائف درج کئے، پھر کارہائے تجویز میں لکھا کہ بدکامنی کا زخم بھرنا ہے، اور تا ابت قلب کے لئے نئی کونپلیں بھی دینی ہیں، پھر اس نے پولی ٹکنک والے سہیل کو درج کیا، جسے بیرون ملک بھیجنا تھا، اور عبدالقدیر قادری اور عترت حسین زیدی کو درج کیا، جنہیں ترقیاں دینی تھیں، اور عین الحق کی مصروفیات بڑھتی چلی گئیں اس نے برتن قناتوں والے ننگے کو درج کیا، جو گھر والی کی فحش بدعنوانیوں کے سبب ٹوٹ گیا تھا، اور پورا پورا سے ہلاک ہو رہا تھا، تو عین الحق نے یہ لکھا کہ اس بی بی کے نظام میں مناسب تبدیلیاں کر کے اسے ننگے کی اطاعت میں بحال کرنا ہے، اور عین الحق نے موٹر سائیکل والے لڑکے کو درج کیا، جو صبح و شام چکر لگاتا تھا، اور بلاک نمبر تین میں وہ بچی اسے خاطر میں نہ لاتی تھی، تو عین الحق نے اسے اداسی سے موٹر سائیکل پر چکر لگاتے ہوئے دیکھا، اور نرم سرگوشیوں میں وعدہ کیا کہ سب انتظام کر دیا جائے گا، اور اس نے گنتو گمانڈر کی بیمار مرغی کو درج کیا، اور اس طرح چیزوں کی فہرست طولانی ہوتی چلی گئی۔

وہ چراغ جلے بیٹھتا، تو کہیں رات ڈھلے دن بھر کے اندراجات مکمل کر پاتا، اور اب یہ ہونے لگا کہ دو نمبر یا تین

نمبر بلاک سے آٹھ نمبر تک آتے آتے کبھی ایک آدھ چیز بھول جاتا، اور اسے دوبارہ موقع پر پہنچ کر اندراجات مکمل کرنے پڑتے۔ اور اسی جھنجھٹ میں چار نمبر بلاک کی حمیرا کا لوکیبا درج ہونے سے رہ گیا، اور جب اس اندراج کی ضرورت پڑی، تو بلاک نمبر چار کے اختتام پر عین الحق ظاہر ہوا۔ وہ سڑک کی طرف سے گلی میں مڑا، اور اس نے دیکھا کہ مسعد التور کا چھوٹا والا گہوارہ بھولوں میں رکھا ہوا ہے۔ عین الحق پیلا پڑ گیا اس نے لرزتے کانپتے ہوئے دوپہر کے سناٹے سے پوچھا کہ کیا حمیرا ؟ وہ گہوارے کے ساتھ ساتھ رینگتا ہوا چھ نمبر بلاک کی طرف آیا، اور گہوارے کو چھو کر اس نے سرگوشی میں سوال کیا کہ کیا حمیرا؟ اور خجالت کے آنسوؤں میں بھیگتے ہوئے اس نے گہوارے کا بازو تھام لیا، اور ساتھ ساتھ چلنے لگا، اور بولتے ہوئے اپنی صفائی میں کہا چلا کہ بی بی میں بھول گیا تھا! بٹیا میں بھول گیا تھا! اماں میں بھول گیا تھا! اور آٹھ نمبر بلاک کی حد پر اس نے گہوارے کا بازو چھوڑ دیا۔ پھر عین الحق نے ایک چیخ کی بازگشت میں بلاک نمبر ۲ کی طرف سعی کی، اور پکارتا چلا کہ میں بھول گیا تھا! پھر باقی دن اور ساری رات وہ اسی چیخ کی بازگشت میں رہا وہ بلاک نمبر دو سے بلاک آٹھ تک اور بلاک آٹھ سے بلاک دو تک گونج کی طرح سنسناتا رہا، اور جو کچھ درج ہونے سے رہ گیا تھا۔ دیوانہ وار اپنی یادداشت میں محفوظ کرتا گیا۔ ایک ایک مکان پر سے گزرتے ہوئے اس نے اپنے حافظے میں سب چیزوں اور سب لوگوں کی حاجت مندیاں اور تمام چھوٹے بڑے دکھ محفوظ کئے، اور طے کیا کہ مرغ کی بانگ سے پہلے اسے فہرست میں درج کرلے گا، اور جب مرغ بانگ دے رہے ہوں گے، تو عمل درآمد کرے گا۔

ایک پہر رات باقی تھی کہ وہ اپنے کمرے میں آیا، اور یہ دیکھا کہ کمرے کا تالا ٹوٹا ہوا ہے، اور اس کی پیٹی اوندھی پڑی ہے، کوئی کتے کا شوت اس کی فہرست چرا لے گیا تھا۔

پیٹی سالم دیکھ کر عین الحق نے حیرانی میں چھ طرفوں پر نظر ڈالی، اور مایوسی میں سر ہلایا، اور گمان سے بالاتر ہوا، اور تب ہی عین الحق نے اطوک، پروک اور دیولوک تینوں کی ڈوریاں اپنی انگشت شہادت پر لپیٹ کر مٹھی بند کی۔ ایک ذرا کندھا جھکا کر جھٹکے سے انہیں اپنی پشت پر لیا، اور مٹھیاں کس کر ہوا میں کدال چلاتے ہوئے تینوں لوک زمین پر دے مارے۔ پھر وہ پورے قامت سے تن کر کھڑا ہو گیا، اور جھٹکے سے اپنی پیشانی کا پلاسٹر نوچ پھینکا۔ پھر عین الحق نے سر جھکا کر زمین کی طرف دیکھا، اور تمام و کمال تیاری میں اپنی تیسری آنکھ کھول دی، اور تینوں لوک جلا کر خاک کر دیئے۔

تیسری ہجرت

اعجاز راہی

تب ایک آواز اونچے اونچے ٹیلوں سے ٹکراتی ہوئی صحراؤں، مرغزاروں میں پھیل گئی۔

"لوگو! گمراہی کا سایہ انسانیت کے لئے خطرہ ہے۔ اندھیرے کی زد میں آئے ہوئے اس شہر کو چھوڑ دو۔"

لوگوں نے یہ آواز سنی اور اسے رحمت کی آواز قرار دیا پھر اپنے رستے بستے گھروں کو چھوڑ کر نئے شہر کی طرف چل پڑے، دوسرے شہر کے رہنے والے آدھے راستے تک انہیں لینے آئے اور اپنا آدھا جسم کاٹ کر ان کے حوالے کر دیا۔ تب دھیرے دھیرے، روشنی پھیلی، اور شہر نور میں نہا گئے روشنی پھیلتی گئی اور وقت چپکے سے انگنت سیڑھیاں چڑھ گیا۔

پھر نہ جانے کیا ہوا بدلیاں چھانے لگیں۔ ان کی روشنی پھیکی اور بے نور ہو گئی۔ ہر طرف زور دار آندھیاں چلنے لگیں تا کہ روشنی بکھر جائے اور نور میں نہائے شہر کملا جائیں، اندھیرے بند کمروں اور تاریک غاروں سے نکلنے کی پھر کوشش کرنے لگے۔

اچانک روشنی کی لو پھڑ پھڑائی۔ لوگوں نے تالیاں بجائیں کہ اب روشنی بجھی اور اب اندھیرا ابرا کہ وہ سب اندھیرا چاہتے تھے۔ وہ بھی جو اپنی قندیلیں ساتھ لائے تھے۔ اور وہ بھی جو روشنی اور نور سے تہی دامن تھے تب شہر والوں نے فیصلہ کیا کہ روشنی کو بجھنے دیا جائے گا۔

موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے ایک شخص نے آواز دی۔

"لوگو! اندھیروں کا ظلم مظلوم انسانیت کے لئے خطرہ ہے۔ اندھیروں میں گھرے ہوئے ان شہروں کو چھوڑ دو۔"

لوگوں نے آواز سنی اور اسے حقیقت کی آواز قرار دیا۔ اور اپنے رستے بستے گھروں کو چھوڑ کر نئے شہروں کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب وہ نئے شہروں میں داخل ہوئے تو ان کے استقبال کے لئے کوئی نہیں آیا۔ انہوں نے اجڑے گھروں کے تالے توڑ دیئے اور اندر داخل ہو گئے۔ اجڑے مکان آسیب زدہ تھے یہ آسیب نئے آنے والوں کے

کا مدصوں پر سوار ہو گئے۔ اور ان کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے تاکہ وہ سچائی کو نہ دیکھ سکیں۔ وہ آنکھیں بند کئے اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ شہر کے باسیوں نے جب انہیں اندھیروں میں بھٹکتے دیکھا تو اپنے منہ دوسری طرف کرلئے کہ وہ پہلے ہی آسیب زدہ تھے اور ان کی آنکھیں بند تھیں۔ نئے لوگوں نے ہواؤں کو گالیاں دیں اور پھیلے ہوئے ہاتھ سے ہر شے سمیٹ لینی چاہی۔ جن کے بارے میں وہ جانتے تھے جن کے بارے میں وہ نہیں جانتے تھے۔ آسیب کا اثر بڑھنے لگا۔ حتیٰ کہ ہر شخص خود ایک آسیب بن گیا۔

تب میں نے آنکھیں کھولیں۔ خود کو اندھیرے کے غلیظ گڑھے میں پڑا پایا۔ غلیظ گڑھا زمین پر نہیں تھا آسمان پر بھی نہیں تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ مجھے معلوم ہوا میں اٹھ نہیں سکتا کہ چاروں طرف پھیلے اندھیرے کی دیواریں مجھے قید کئے ہوئے ہیں میں نے سر اٹھا کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن ایک گمبھیر اندھیرا چاروں طرف سے آنکھیں پھاڑے مجھے گھور رہا تھا۔ تب رشید نے جس کی آنکھیں خوفزدہ تھیں۔ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے آہستگی سے کہا

"خوف کے آسیب تمہارے وجود کے لئے خطرہ ہیں، اندھیرے میں گھرے ہوئے اس مکان کو چھوڑ دو"۔

میں نے اس کی بات کو سنا۔ حیرت کی آواز قرار دیا اور اسے مجبورا نظروں سے دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔

"میری ٹانگیں سے خون کا آخری قطرہ تک نچڑ چکا ہے۔ میری ٹانگیں بے جان ہیں، میری آنکھیں بے نور ہیں مجھے بیساکھیاں لا دو۔ مجھے بصارت لا دو"۔

اس نے میری بات سن کر قہقہہ لگایا۔

"تم غلط کہتے ہو۔ تمہاری ٹانگیں بے جان نہیں۔ تم چل سکتے ہو۔ تمہاری آنکھیں بے نور نہیں۔ تم دیکھ سکتے ہو۔ اٹھنے کی کوشش کرو"۔

میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ دیواریں مجھے سہارا دینے کو آگے بڑھیں میں اٹھنے لگا۔ دیواریں کانپ گئیں۔ میں گر پڑا، دیواریں اندھیرے کی تھیں، گمنام اندھیرے کی

میں نے آنکھیں جھپکیں مجھے معلوم ہوا، میری آنکھیں بے نور نہیں۔ میں اندھیرے کے کالے سمندر میں گرا ہوا ہوں۔ میں نے ٹانگوں کو چھوا۔ مجھے معلوم ہوا، میری ٹانگیں بے جان نہیں۔ وقت کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہیں۔ میں انہیں آزاد کرا سکتا ہوں۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھا اور سوئچ آن کر دیا۔ یک دم اندھیرے کا سکوت ٹوٹ گیا اور پھر ہر شے زرد روشنی کی زد

میں آ گئی لیکن ایک چپ۔ ایک عجیب سناٹا کمرے میں گردش کرتا رہا۔ میں نے کمرے سے باہر جھانکا۔ باہر گھور اندھیرے کی حکمرانی تھی۔ میں آنکھیں پھاڑے اندھیرے کو گھورتا رہا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے باہر تاریکی اور خاموشی کے سمندر میں طوفان اٹھا ہوا ہے۔ تاریکی اور خاموشی کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی سرکش لہریں ہر شے کو اپنی زد میں لینے کی کوشش کر رہی ہیں۔ مجھے یوں لگا جیسے کچھ ہی دیر میں یہ اندھا سیلاب کمرے میں داخل ہو کر ننگی روشنی میں نہائی ہوئی ہر شے کو دبوچ لے گا۔

"میں اندھیرے کے آسیبوں کو کمرے میں داخل نہیں ہونے دوں گا۔" میں نے فیصلہ کیا۔

دوسرے کمرے سے لالے کی آواز ابھی تک سنائی دے رہی تھی۔ "اتنا غیرت مند ہے تو مکان خالی کیوں نہیں کرتا۔"

"غیرت مند ——— ہونہہ!"

بجائی نے ساری فضا کو زہر آلود کر دیا۔ یکایک ہوا خاموش ٹھاٹھیں مارتے ہوئے کالے سمندر سے ٹکرا گئی۔ ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ درو دیوار لرز گئے۔ ذہن سنسنا کر رہ گیا۔ اچانک کانپتے ہوئے درو دیوار سے ایک آواز ٹکرانے لگی۔

"یہ اندھیرے تمہیں دبوچ لیں گے۔ تمہاری بے نام ذات کو پیس کر رکھ دیں گے۔ اندھیرے میں گھرے ہوئے اس مکان کو چھوڑ دو۔"

میرے ذہن میں ارتعاش سا پیدا ہو گیا۔ خاموشی کا سکوت ٹوٹنے لگا۔ میں نے فیصلہ کیا اندھیروں کو کمرے میں داخل نہیں ہونے دوں گا۔

میں نے دوسری چارپائی کی طرف دیکھا۔ جہاں میری بیوی اور ننھی منی رفعت بے خبر سو رہی تھیں۔ انہیں اتنے بڑے حادثے کی کوئی خبر نہیں تھی۔ میں نے غور سے ان کے چہروں کو دیکھا۔ کمزور روشنی کی ساری پیلاہٹ ان کے چہروں پر ناچ رہی تھی۔

"میں ابھی اس مکان کو چھوڑ دوں گا"

میں نے گھڑی دیکھی، بارہ بج رہے تھے۔

"کہاں جاؤں گا۔ کیسے جاؤں گا۔ میں جا بھی سکوں گا ——؟"

مدافعت کی لہریں تاریکی کا وجود ختم کرنے کی بجائے آسیب زدہ مکان کے پرانے دروازے کی دہلیز پر سر پٹخ پٹخ کر دم توڑنے لگیں۔ میری نظریں سنگار میز کے بڑے آئینہ پر جا پڑیں۔ میں اسے گھورنے لگا۔

آئینہ میں سہما ہوا ایک شخص خوفزدہ نظروں سے اندھیرے کو گھور رہا تھا۔ میں نے سوچا۔

"شاید سائے بھی اندھیرے سے ڈرتے ہیں۔"

میں کھڑا ہو گیا۔ سایہ بھی کھڑا ہو گیا۔ میں دروازے کی طرف بڑھا۔ سایہ مجھ سے دور ہونے لگا۔ میں اور آگے بڑھا۔ سایہ غائب ہو گیا۔

"فکر نہ کرو۔ خود بخود تمام پرابلم سالو ہو جائیں گے"

اسی لمحہ سرور کا سہما ہوا فکر مند چہرے میرے سامنے آ گیا اور میں بتی بجھا کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

"نیا مکان ملا۔"

"مل ہی جائے گا۔"

"نہیں۔ کبھی نہیں۔ ہم سب پرانے مکانوں کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہم سب کی رگوں میں پرانے مکانوں کا زہر دوڑ رہا ہے۔ ہم یہ مکان کبھی نہیں چھوڑ سکتے۔"

ایک مانوس آواز نے مجھ سے کہا۔

"پرانا مکان! ——— ہاں پرانے مکان کا زہر ہمارے جسموں میں سرایت کر رہا ہے۔ لیکن میں تو پرانا مکان چھوڑ دینا چاہتا ہوں۔ ایک دن ہم سب پرانے مکانوں کو چھوڑ دیں گے۔

میں نے جواب دیا۔

"نہیں۔ تمہیں نیا مکان کبھی نہیں ملے گا۔ تم بزدل ہو۔ پرانے مکان کے عادی ہو چکے ہو اسے چھوڑنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔"

"نیا مکان۔ ہاں نیا مکان۔"

فکر مند چہرے نے لمبی سسکاری بھری۔ معاً ہم نے ایک دوسرے کی طرف گھور کر دیکھا کہ ہم تینوں اپنی اپنی ذات کے لامتناہی اندھیرے کی چار دیواری میں قید تھے؛

گائے

انور سجاد

ایک روز انہوں نے مل کر فیصلہ کیا تھا کہ اب گائے کو بوچڑ خانے میں دے ہی دیا جائے۔

اب اس کا دھیلا نہیں ملنا۔

ان میں سے ایک نے کہا تھا۔

ان مٹھی بھر ہڈیوں کو کون خریدے گا۔

لیکن بابا مجھے اب بھی یقین ہے۔ اگر اس کا علاج باقاعدگی سے۔

تم چپ رہو جی۔ بڑے آئے عقل والے۔

نکا چپ کر کے ایک طرف ہو گیا تھا اور بابا اپنی داڑھی میں عقل کو کریدتا ہوا اس کے بڑوں کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھ گیا تھا۔

میں جب زبان ہلاتا ہوں تو یہ بوچڑ بن جاتے ہیں جس روز سے میں نے انہی کو پہچانا ہے، اسی روز سے چنگبری کو بھی جانا ہے اور جس دن سے یہ لوگ اسے بوچڑ خانے لے جانے کی سوچ رہے ہیں اس دن سے میں ہر لمحہ یتیم ہوتا ہوں یتیم ہوتا ہوں میں کیا کروں یہ سب مجھ پر ہنستے ہیں کہ میں اس کی اتنی خدمت کیوں کرتا ہوں ان ہڈیوں سے اتنا پیار کیوں کرتا ہوں، کیوں کرتا ہوں۔

آپ اسے بوچڑ خانے کے بجائے ہسپتال کیوں نہیں بھیج دیتے

نکے سے رہا نہیں جاتا تھا۔

تم نہیں سمجھتے یہ ٹھیک نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاج پر پیسہ خواہ مخواہ کیوں برباد کیا جائے۔

میں نا سمجھ ہوں ابھی تو کل ہی ماں نے دھاگے میں پندرھویں گرہ لگائی ہے۔

آپ علاج کرا کے دیکھیں تو سہی۔

بڑوں کی باتوں میں دخل نہ دیا کرو۔

میرا جی چاہتا ہے کہ میں آپ سب کو بوجھڑ خلنے دے آؤں۔

پھر سب نے مل کر گائے کی زنجیر پکڑی تھی۔ لیکن جیسے گائے کو بھی سب کچھ معلوم تھا وہ اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہلی تھی۔ انہوں نے مار مار کے اس کا بھرکس نکال دیا تھا۔ نکا ایک طرف کھڑا پتھرائی ہوئی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

شاباش میری چنگبری میری گائے میری گئو ماتا، ہلنا نہیں تم نہیں جانتیں یہ لوگ تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہیں۔ جانا نہیں ہلنا نہیں ورنہ، ورنہ نہیں تو۔

گائے اپنی جگہ پہ اڑی۔ مڑ مڑ کے اس کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ ذرا ہٹ کر گائے کا بچھڑا کھونٹے کے ساتھ رسّی سے بندھا بے تعلق بیٹھا تھا۔ ہڈیوں پہ لاٹھیوں کی بوچھاڑ اسے نہیں سنائی دیتی تھی۔ نکّے کے کان بھی بند ہو رہے تھے، رفتہ رفتہ۔

سارے بزرگ ہانپتے ہوئے پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ پھر فیصلہ ہوا تھا کہ اگر یہ اب چل بھی پڑے تو ممکن ہے راستے میں کھیا ہو جائے اس لئے بہتر یہی ہے کہ اسے ٹرک میں ڈال کر لے جایا جائے۔ ٹرک میں تو اسے اٹھا کر بھی لادا جا سکتا ہے۔

اگلے روز ٹرک بھی آ گیا تھا۔

ٹرک کی آواز پر گائے نے مڑ کے دیکھا تھا۔ آنکھیں جھپکی تھیں اور کھرلی میں منہ ڈال دیا تھا جہاں نکا چارہ ڈال کے ابھی ابھی ٹرک کو دیکھنے گیا تھا۔

آپ لوگ اسے واقعی۔

اسے یقین نہیں آتا تھا

نہیں تو ہم مذاق کر رہے ہیں کیا؟

ایک نے کہا تھا۔

بابا، یہ گائے مجھے دے دو، میں اسے۔

حکیم کی اولاد

دوسرے نے کہا تھا۔

بابا اس کے بغیر ہیں۔

مجنوں کا بچہ۔

تیسرے نے کہا تھا۔

چوتھا، پانچواں سارے بزرگ، سارے بزرگ سالے ایک سے ہیں اور بابا جو اپنی داڑھی کو عقل کا
گڑھ سمجھتا ہے جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔

بیٹے ٹرک والے کو دس روپے دے کر بھی ہم بہت فائدے میں رہیں گے۔

او۔ کمبخت سوداگر مجھ سے لو روپے، مجھ سے یہ لو لیکن میری مٹھی میں اس وقت تو ہوا ہے جب،
جب میں بڑا ہو جاؤں گا۔

ہا ہا ہا۔

جب، جب میں کمانے لگوں گا۔

ہا ہا ہا۔

تب، تب تک تو چتکبری کی ہڈیوں کا سرمہ بن گیا ہو گا۔ میں، میں کیا کروں۔

ان میں سے ایک، گائے کو لانے کے لئے کھولی کی طرف گیا تھا۔ ننّا بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا، یونہی
دیکھنے کے لئے۔ بڑھے نے اس کی زنجیر کھولی تھی۔ گائے نے کھولی میں منہ مار کے دانتوں میں پٹھے
دبائے تھے اور لڑکے ننّے کو دیکھا تھا اور جانے کے لئے کھر اٹھایا تھا۔

منہ، منہ، منہ۔

ننّا چیخا تھا۔

بکو مت۔

گائے کھڑی ہو گئی تھی۔

ہے۔ ہے۔ ہے

بڑھے نے زور لگایا تھا۔

نہ چتکبری۔ نہ، نہ

چپ بھی کرو گے یا کھینچوں تمہاری زبان۔

ننھے نے زبان کو قید کر دیا تھا۔ بڑے نے پھر زنجیر کو جھٹکا دیا تھا۔

چلو میم صاحب ! ٹرک والا تبارے باپ کا نوکر نہیں جو سارا دن کھڑا رہے۔

گائے کی آنکھیں باہر کو نکل آئی تھیں۔ زبان، قید میں پھڑ پھڑا کے رہ گئی تھی۔ لیکن وہ مشتِ استخواں وہیں کی وہیں تھی۔ ننھا مسکرایا۔ پھر خود آپ ہی اداس ہو گیا تھا۔

یہ تو یہ تو بک بھی چکی ہے اسے جانا ہی ہو گا مجھے اب بھی یقین ہے کہ اگر تھوڑی سی رقم لگا کے اس کا علاج باقاعدگی سے کیا جائے تو تو لیکن میں ان بزرگوں کا کیا کروں کاش میں حکیم ہی ہوتا اس بھڑ بڑے کو شرم نہیں آتی ماں کے جسم پر نیل پڑے ہیں اور یہ باہر کھڑا الو کے پٹھوں کی طرح دیکھے جا رہا ہے۔

زبان پھڑ پھڑا کے رہ گئی تھی۔

پھر ان میں سے ایک کو بڑی اچھی سوجھی تھی۔ اس نے گائے کی دُم پکڑ کر اسے تین چار بل دیئے تھے۔ وہ پیٹھ کے درد سے دور بھاگی تھی۔ اس نے ننھے کی طرف دیکھ کر قہقہہ لگایا تھا۔ پیٹھ کا درد گائے کو ہانکتا ہوا بالکل ٹرک کے پاس لے آیا تھا۔ ننھے کا دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔

در فٹے منہ، لعنت لکھ لعنت۔

ٹرک والے نے گائے کے چڑھنے کے لئے ٹرک سے زمین پر تختہ لگا دیا تھا۔ گائے نے تختے پر کھُر رکھا۔

نہ چڑھنا۔

اس کی زبان کاٹ لو۔ یہ گائے کو ورغلاتا ہے،

ڈراتا ہے

ننھا پھر منہ بند کر کے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ گائے نے تختے کو دیکھا، پھر ننھے کی طرف۔

در فٹے منہ، لعنت لکھ لعنت۔

ننھے کا سر شرم سے جھک گیا تھا۔

اس کے علاوہ میں اور کیا کر سکتا ہوں، کیا کر سکتا ہوں۔

وہ ابھی تک نہیں ڈری تھی۔ پھر اس نے مشکوک نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ کر بڑے زور سے پھنکار ماری تھی۔

میری چیخیں بجری جاتی ہے، جانتی ہے کہ وہ تختے پہ قدم رکھ کر ٹرک میں چلی جائے گی لیکن وہ یہ نہیں جانتی کیوں، کیوں وہ چڑھنا نہیں چاہتی۔

ان سب نے مل کر اس کی پیٹھ پہ لاٹھیاں برسائی تھیں، گائے کی ٹانگیں متحرک تھیں لیکن وہ اپنی جگہ سے قطعی نہیں ہلی تھی۔ جب انہوں نے مل کر دوسرا وار کیا تو وہ تکلیف سے دور بھاگنے کو تھی کہ بابا کی داڑھی میں عقل نے جوش مارا تھا اور اس نے جا کر اس کے منہ پہ لاٹھی ماری تھی۔ گائے پھر تختے کی طرف منہ کر کے سیدھی ہو گئی تھی۔ بابا نے ہانپتے ہوئے کہا تھا۔

آؤ پیٹو۔

اور ان سب نے مل کر پھر لاٹھیوں کا مینہ برسایا تھا۔

ننگا دور کھڑا تھا۔ بالکل بے تعلق بے حس۔

یوں بات نہیں بنے گی۔

ایک نے اپنے سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا تھا۔

تو پھر؟

وہ ٹرک کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑے سوچ ہی رہے تھے کہ جانے گائے کو کیا سوجھی تھی، پلٹ کر یکدم بھاگ اٹھی تھی اور دھول اڑاتی ننگے کے قریب سے بالکل اجنبیوں کی طرح گزر گئی تھی۔

ننگا۔ جسم کا مفلوج حصہ۔

دیکھو، دیکھو، وہ تو بائیں طرف۔

ایک چونکا تھا۔

قدرتی بات ہے۔

بابا نے اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

گائے اپنے بچھڑے کو چاٹ رہی تھی۔ بابا کی آنکھیں مکار سی مسکراہٹ سے چمک اٹھیں۔

اس بچھڑے کو یہاں سے آؤ — یہ چال تو ہمیں کل ہی چل جانی چاہیئے تھی۔ ٹرک کے پیسے بھی بچ جاتے۔

ننگا — مفلوج وجود۔

ان میں سے ایک نے بچھڑے کی رسّی پکڑلی تھی۔ ننّھے کی زبان لرز رہی تھی۔ گائے کچھ سوچتی قدم اٹھاتی، رکتی چلتی بچھڑے کے پیچھے پیچھے اس کے قریب سے گزری تھی تو آہستہ سے ننّھے کی زبان سے گالی پھسلی تھی۔ بچھڑا، تختے پر چڑھ کے پھُنوسیاں مارتا ہوا ٹرک میں چلا گیا تھا۔ گائے تختے کے پاس جاکے پھر رکی تھی۔ بڑی حیرانی سے بچھڑے کو دیکھ کر آہستہ آہستہ گردن موڑ کے ننّھے کو دیکھا تھا۔ ایک نے فوراً بغل سے پٹھوں کا گٹھا نکال کر گائے کے آگے کر دیا تھا۔ اس نے چند ڈنٹھل دانتوں میں لے لئے اور پھر کچھ سوچ کر زمین پر گرا دیئے تھے اور اگلا کھُر تختے پر رکھ دیا تھا، پھر دوسرا کھُر۔

خدا معلوم ننّھے کو کیا ہوا تھا۔ یک دم اس کے سارے جسم میں تازہ تازہ گرم گرم لہو کا سیلاب آگیا تھا۔ اس کے کان سرخ ہو گئے اور دماغ بے طرح بجنے لگا تھا۔ وہ بھاگا بھاگا گھر میں گیا تھا اور بابا کی دونالی بندوق اتار کے اس میں کارتوس بھرے تھے۔ اس جنون میں بھاگتا ہوا باہر آگیا تھا اور کاندھے پر بندوق رکھ کر نشانہ باندھا تھا۔

اس نے کھلی آنکھ سے دیکھا۔ بچھڑا ٹرک سے باہر گائے کے گرائے ہوئے پٹھوں میں منہ مار رہا تھا۔ ٹرک میں بندھی گائے باہر منہ نکال کر بچھڑے کو دیکھ رہی تھی۔ ان میں سے ایک گائے کو لے جانے کے لئے ٹرک میں بیٹھا تھا اور بابا ایک ہاتھ سے اپنی داڑھی میں خلال کو سہلاتا ہوا باہر کھڑے ڈرائیور سے ہاتھ ملا رہا تھا۔

پھر مجھے پتہ نہیں کیا ہوا۔ ننّھے نے کسے نشانہ بنایا۔ گائے کو، بچھڑے کو، ڈرائیور کو، بابا کو، اپنے آپ کو، یا وہ ابھی تک نشانہ باندھے کھڑا ہے۔

کوئی وہاں جاکے دیکھے اور آکے مجھے بتائے کہ پھر کیا ہوا۔ مجھے تو صرف اتنا پتہ ہے کہ ایک روز انہوں نے مل کر فیصلہ کیا تھا کہ۔

پیار کہانی

خالدہ حسین

وہ آدھی رات ہی رہی ہوگی کہ جب اس کے ریشمی ہاتھوں کا لمس میری پیشانی پر شیریں سیال نشہ بن کر بہنے لگا۔ میں گہری نیند سے بمشکل بیدار ہوا۔ چند لمحے اس شیریں لمس کے سحر کو پیشانی کے راستے تمام جسم میں سن سن اترتے محسوس کرتا رہا۔ پھر کہیں ڈوب جانے، نہ ہونے کے خوف سے ہولا کے اٹھ بیٹھا۔ وہ میرے سرہانے بیٹھی تھی۔

ہاں وہ میرے سرہانے بیٹھی تھی اور اس کے چاندنی ایسے ہاتھ، نرم، گداز، میری پیشانی کو دھیرے دھیرے سہلاتے تھے اور اس کے جسم کی گرم خوشبو سے کمرہ مہک اٹھا تھا۔ میری کنپٹیاں دھڑ دھڑ جل اٹھیں اور آنکھوں میں بخار سا چڑھ آیا۔

"اٹھو!" اس نے جادو بھری آواز میں سرگوشی کی۔ یوں کہ پھر میرا سر چکرا گیا۔

"اٹھو!" اس نے چہرہ میرے قریب جھکاتے ہوئے کہا۔

"یاد ہے اپنا وعدہ؟" میں نے بیڈ لیمپ کی مدھم روشنی میں اس کے چہرے کو دیکھا جو خوبصورت نہیں تھا مگر آدھی رات کے سحر میں وہ تمام دنیا۔ پورے امکانات کو سمیٹتا ہوا نظر آتا تھا اور میں اس آدھی رات کے سحر سے بہت خائف تھا۔ اس کا اندیشہ ہر دم میرے خون میں دھڑکتا رہتا۔ یہ خوف کہ ابھی آدھی رات آئے گی اور وہ مجھے یوں جگا کر پوچھے گی "اپنا وعدہ یاد ہے؟" وعدہ جو میں نے کبھی اس سے نہیں کیا تھا۔ جو اس نے خود ہی تصور کر لیا تھا اور اس کا بوجھ مجھ پر ڈال دیا تھا۔ اور جب بھی میں اس کے وجود کے سیال نشے میں بہہ جانے کو ہوتا، وہ مجھ سے پوچھتی۔ اسی وعدے کے متعلق۔

"اٹھو تو پھر چلیں" وہ اپنی گوری گداز باہیں میری طرف پھیلاتی۔

"دیکھو۔ تم نہیں جانتیں" میں تفریباً ٹوٹتے ہوئے، ریزہ ریزہ بکھرتے ہوئے کہتا۔ وہ خاموش میرے پاس آن بیٹھتی۔ اس کی میٹھی گرم خوشبو میں میں نیم بے ہوش سا ہو جاتا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ کہتی

"تم جانتے ہو؟ تمہیں یاد ہے؟ سب سے پہلے جب ہم ملے تھے تو تم نے کہا تھا ’’ہاں میں تمہارے ساتھ چلوں گا‘‘ کہا تھا نا؟ —— دیکھو بس اب تو تھوڑا سا فاصلہ رہ گیا ہے اب میں تمہیں پریشان نہ کروں گی۔ سچ کہتی ہوں، مجھے راستہ اچھی طرح معلوم ہے۔

"لیکن! —— یہاں ہم کتنے امن سے، خوشی اور چین سے ہیں، یہ تو سوچو۔ اور جب بھی میں بہت خوش ہوتا ہوں اور جانتا ہوں کہ تم بس میرے لئے ہو، تم اٹھ کر چل دیتی ہو۔ میں اس روز روز کی مسافری سے تنگ آ گیا ہوں خدا کے لئے کچھ تو سوچو۔ تمہیں میرا سکھ چین نہیں بھاتا کیا؟"

اس پر وہ ایک دم چونک جاتی۔ اس کی چمکتی آنکھیں آنسوؤں سے اور بھی چمک اٹھتیں۔

"یہ تم نے کیسے کہہ دیا؟" وہ میرا سر نرمی سے اپنی گود میں رکھ لیتی۔ اس کے جسم کی خوشبو بھری آنچ میرے حواس معطل کرنے لگتی۔

"یہ تم نے کیسے کہہ دیا؟ —— کیا میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں بتایا کہ تم تو اس دنیا کے ساتھ میرا ناطہ ہو، ورنہ میں ریزہ ریزہ اڑتی پھروں۔ جس طرح زمین کی کشش ختم ہو جائے یا جسم کا وزن مر جائے —— تو تم میرے وجود کا وزن ہو۔ اور صرف اسی لئے میں تمہارے ساتھ یہ سفر کر رہی ہوں۔"

"سنو، میری بات سنو۔ تمہیں کچھ پتہ و تہ تو ہے نہیں۔ جانا کہاں ہے؟ کدھر سے جانا ہے؟ اور آج کل راستے ایسے خطرناک ہیں، جگہ جگہ سڑکیں ٹوٹی ہیں۔ پل ناقابلِ اعتبار۔ نہ کوئی جگہ کا نام پتہ دیتی ہو۔ میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

"دیکھو! —— مجھے سب معلوم ہے اب کے میں تمہیں بالکل نہیں ستاؤں گی۔ بس سیدھی سڑک ہے۔ بائیں ہاتھ پر جب آبادی شروع ہو جائے تو ذرا آدھا میل آگے چل کر ایک بستی ہے۔ وہی ہے بس —— بالکل —— اب اٹھو۔"

یہ آدھی رات کا سفر میری سمجھ میں ذرا بھی نہ آیا۔ مگر میں تو جیسے کسی مقناطیس سے کھنچا چلا جاتا تھا۔ مجھے اپنے وہ سب دوست احباب بہت یاد آئے جو آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے عورت کے جادو سے بچنے کی تنبیہ کیا کرتے تھے۔ اشاروں کنایوں سے سمجھاتے تھے کہ میاں! عورت کے سامنے ذرا دل مضبوط اور ہوش و حواس قائم رکھنے پڑتے ہیں۔ لیکن میں بے قائمیٔ ہوش و حواس اس کے ساتھ ساتھ ہو لیتا تھا کیونکہ اس کی بہت سی باتیں سمجھ میں نہ آنے پر بھی دل کو بھاتی تھیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ میرے ان بھلا چاہنے والوں نے نہ تو اس کا وہ جادو بھرا لہجہ سنا تھا، نہ میٹھے خوشبو اُڑاتے بول۔ جب وہ اپنی خوبصورت باہیں میری جانب بڑھاتی تو جی چاہتا دنیا کا ہر

ان ہونا کام اس کی خاطر کر گزروں۔ یہ ان جانا، بے منزلا سفر تو کوئی حقیقت نہ رکھتا تھا۔

اور لب کے تو واقعی اس کے بتائے ہوئے تمام نشانات بھی درست ہی نکلے۔ سڑک ٹوٹی پھوٹی تھی تو کوئی بات نہیں۔ گاڑی کون سی نئی تھی کہ اس کے ٹوٹنے پھوٹنے کا خطرہ ہوتا۔ ہاں یہ خدشہ تھا کہ کہیں راستے میں رک نہ گئی تو ایک مصیبت ہوگی۔ جب بھی کہیں گہرا گڑھا آتا تو وہ ایک دھچکے کے ساتھ میری گود میں آن گرتی۔ میرا جی چاہتا ڈرائیونگ بند کر دوں، رک جاؤں۔ مگر پھر وہ مسکرا کے، سنبھل کے ہو بیٹھتی۔ آج اس کی آنکھوں میں عجب سرور بھری محویت تھی ہلکی ہلکی خنکی کے باوجود اس کی پیشانی اور ہونٹوں کے اوپر پسینے کی نمی آجاتی اور وہ رومال سے چہرہ پونچھ جاتی۔

"وہ دیکھو!۔ وہ دائیں ہاتھ! اس پہاڑی پر وہ جھونپڑی ہے نا؟ اور اس میں روشنی بھی ہے۔ یہ تو پکی نشانی ہے۔" اس نے عجب سی سرگوشی کے عالم میں کہا۔

"ہاں بھئی ہے تو سہی۔ مگر ابھی آگے آگے دیکھو کیا ہوتا ہے۔ لو یہ سگریٹ سلگاؤ۔"

اس نے سگریٹ سلگا کر میرے ہونٹوں میں دبا دیا۔ ہوا خاصی خنک ہو چلی تھی۔

"سردی ہے بھئی!" میں نے جھرجھری لی تو اس نے اپنی نازک سی جھلملاتی شال میرے کاندھوں پر ڈال دی اور کچھ دیر میرے شانے کے ساتھ سر لگائے بیٹھی رہی۔ اس کے لمس میں ایک عجب طرح کی الوداعی کیفیت تھی۔ میں نے جھک کر دیکھا تو اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔

"کیوں بھئی یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" وہ ایک دم مسکرا دی۔ "میں سوچ رہی تھی تم میرے وجود کا وزن ہو۔ اس دنیا کے ساتھ میرا ناطہ۔ اسی لئے جب میں پُر نہ پُر نہ ہونے لگتی ہوں، تم سے چمٹ جاتی ہوں مگر ــــ مگر آخر تو کچھ پُر نہ پُر نہ ہونا ہی ہے۔" وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔

"کچھ ضروری نہیں محترمہ!" میں نے ہنسی میں بات ٹالنا چاہی۔

"ہاں بہت ضروری ہے۔ دراصل تو یہ سب کچھ اسی عمل کی تیاری ہے۔ ہر کام، ہر بات، ہر فعل۔ کیونکہ ہر شخص خود اپنے سامنے بلاوا وہ ہے ــ اور جو ہے سو ہے، اور اس کے علاوہ بھی جو کچھ ہے سو ہے۔ لہٰذا تمام امکانات تمام ہو جاتے ہیں۔ ہر شے اٹل ہے۔"

"اب تم زیادہ ہی بہکی جا رہی ہو۔ لو سگریٹ سلگاؤ۔"

"وہ دیکھو! وہ کچی آبادی آگئی ہے نا ــ ذرا آگے جا کر دائیں ہاتھ کو وہ دروازہ ہے۔" وہ سنبھل کر ہو بیٹھی۔

"واہ بھئی! ــــ اب کے تو تم نے کمال ہی کر دیا۔" اس نے اپنے ننھے ہاتھوں میں میرا ہاتھ پیار سے سہلایا۔ ایک جھرجھری میرے تمام جسم میں دوڑ گئی ــــ دبی دبی سی دہشت آمیز جھرجھری۔

"مگر تم مجھے یہاں لائی کیوں ہو؟" میں جیسے ایک دم ہوش میں آگیا۔

"میں صرف تمہیں نہیں لائی ــ ہم دونوں آئے ہیں۔ اگر تم نہ آتے تو میں کب آسکتی تھی۔ میں تو تمہارے طفیل یہاں تک پہنچی ہوں۔"

"عجب بے معنی بات ہے بھئی ــــ یہ تم مجھے لفظوں کے چکر میں نہ الجھایا کرو۔ میں تو سیدھا سا آدمی ہوں۔"

"لفظوں سے آزاد ہونے کو تو یہاں تک آنا پڑا ہے!" ایک اداس مسکراہٹ اس کے چہرے پر آگئی۔

"وہ دیکھو دروازہ! ــــ بس ادھر رک جاؤ۔"

میں نے گاڑی روک دی اور سر سیٹ کے ساتھ لگا کر ذرا آنکھیں بند کر لیں۔

"کھٹ کھٹ!" وہ شاید لوہے کا زنگ خوردہ دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی، جس کے دونوں طرف سے اونچی اونچی فصیل نما ایک چار دیواری شروع ہوتی تھی۔ میں نے تھکن کے مارے غور سے دیکھا بھی نہیں۔ چرر ــــ چرر ــ دروازہ اپنے قدیم قبضوں پر گھوم کر ذرا سا کھلا ــ پھر اس کے اور کسی اور کے بولنے کی آواز آئی۔

"ہاں! ــ یہ رہا میرا شناختی کارڈ۔ میں ٹھیک وقت پر ہی پہنچی ہوں۔ وہ ــــ وہ میرا ساتھی ہے یہ اس کا کارڈ دیکھو۔"

تھوڑی دیر میں دروازہ آدھا کھول دیا گیا۔ وہ تھکے قدموں میــــری طرف آئی۔

"اب آگے پیدل کا راستہ ہے، گاڑی بند کر دو۔ اس طرف کے شیشے میں چڑھاتی ہوں۔"

گاڑی اچھی طرح بند کر کے میں اس کے ساتھ ساتھ اس ادھ کھلے دروازے کے اندر داخل ہوا۔

کچھ تھوڑا سا ویران، خاک اُڑاتا میدان چھوڑ کر سامنے بوسیدہ سی عمارت کھڑی تھی۔ کچھ لوگ نہایت مشغول خاموشی سے اِدھر اُدھر چل پھر رہے تھے گویا کسی بڑے کام کی تیاری میں مصروف ہوں۔ قریب جانے پر ایک دروازے پر "دفتر" لکھا نظر آیا۔

"میں ابھی آئی۔" وہ یہ کہہ کر اندر داخل ہو گئی۔

اب مجھے تھکن کے مارے نیند آ رہی تھی۔ ابھی صبح ہونے میں خاصی دیر تھی۔ عمارت کے باہر دو کھمبوں پر زرد زرد بلب جل رہے تھے۔ میں اس کے انتظار میں ایک درخت کے ساتھ سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔

اچانک ہی وہ سب لوگ جو ادھر اُدھر چلتے پھرتے مصروف نظر آتے تھے، سامنے ایک جگہ پر جمع ہونا شروع ہو گئے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اچھا خاصا انبوہ ہو گیا۔ میں بھی ذرا قریب سے دیکھنے کی خاطر آگے چل دیا۔ دیکھا تو سامنے ایک چھوٹا سا چبوترہ ہے کہ سبھی لوگ اس کی جانب باندھے کھڑے تھے۔ پھر سب کے سروں کو دائیں جانب جنبش ہوئی۔ ہاں! میری نظریں دھوکہ نہیں کھا سکتیں۔ وہ — وہی تھی! جو چپ چاپ نظریں جھکائے چبوترے کی طرف آ رہی تھی۔

تب میری نظر چبوترے پر گڑے ہوئے اس چوکھٹے اور اس کے ساتھ لٹکے موٹے رسّے کے پھندے پر پڑی۔

نہیں! —" چیخ میرے حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ مگر وہ چبوترے پر پہنچ چکی تھی۔ دونوں طرف سے دو آدمیوں نے اس کو تختے پر لا کھڑا کیا — نہیں نہیں نہیں — میں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

"مگر کیوں؟ کیوں؟ —" میرے حلق سے زخمی کراہ نکلی اور میں اندھا دھند ہجوم کو چیرتا آگے بڑھا۔ بڑھتا گیا۔ وہ جو ایک چھوٹا سا ہجوم تھا نہ معلوم کیسے جنگلوں سے زیادہ گھنا ہوتا گیا۔ میں باہوں سے راستہ چیرتا آگے بڑھتا گیا — مگر کب تک؟ معلوم نہیں اس چبوترے تک کتنے برسوں کا سفر تھا۔ جب میں وہاں اس کے قریب پہنچا تو تمام تماشائی جا چکے تھے۔ میں نے اس کے سرد جسم کو باہوں پر اٹھا لیا۔ اس کے لمبے لمبے بال کھل کر میرے بازوؤں سے نیچے تک گر رہے تھے۔ میں نے اس کے زرد، نیلے پڑتے چہرے کی جانب نگاہ کی، ان دھندلی ادھ کھلی آنکھوں کی جانب جو ستارہ سی دمکا کرتی تھیں مگر اب ایک میلا، دھند میں لپٹا شیشہ تھیں

"یہ تم کہاں آ گئی تھیں؟" میں؟ — نہیں۔ نہ معلوم کون میری کن پٹیوں میں دھڑکتے لہو اور آنکھوں کی جلن اور شہ رگ سے رواں لاوے میں دھک دھک پوچھتا تھا، بولتا تھا — "یہ تم کہاں آ گئی تھیں؟" تب ایک دم خون میری رگوں میں جم گیا۔ میری نظر اس کے ہونٹوں سے چپک کر رہ گئی — وہ ہل رہے تھے، کچھ کہتے تھے۔ میرے پتھر ہوتے سر میں اتنی سکت کہاں کہ میں جھکتا اور اس کے چہرے سے قریب تر ہو جاتا اور سنتا کہ وہ متحرک لب کیا کہتے ہیں۔ میرے ہاتھ، پاؤں، بازو سب میرا ساتھ چھوڑ گئے۔ دہشت زدہ میں نے اسے وہیں چبوترے پر لٹا دیا اور چاروں سمت نظر دوڑائی۔ وہاں تو کوئی نہ تھا جس کو میں پکارتا اور پوچھتا کہ اے لوگو! بولو یہ زندوں میں ہے یا نہیں — کیا میں اسے اٹھا لوں؟

مگر لق و دق ویرانے میں، میں تنہا تھا اور میری پکار کا کوئی جواب نہ تھا۔ اسی لیے ان ہلتے ہونٹوں کو اسی طرح متحرک چھوڑ کر میں چلا آیا — چلا آیا اور اب تک حیران ہوں۔ سوچتا ہوں وہ زندوں میں ہے یا نہیں؟ کیا مجھے اسے اٹھا لانا چاہیئے؟

ڈوبتی پہچان

رشید امجد

سورج جب قبرستان کے گھنے درختوں سے الجھتا رینگ رینگ کر اپنے بل میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مستری نے قبر کا کام مکمل کر لیا۔

پچھلے کئی مہینوں سے اس کی خواہش تھی کہ ماں کی قبر پکی کرائے لیکن خالی جیبیں اس خیال کو تھپتھپا کر آنے والے دن کی جھولی میں ڈال دیتیں، وہ اندر اندر ہی سلگ سلگ کر خیالوں ہی خیالوں میں کبھی اینٹیں کبھی سیمنٹ، کبھی ریت خریدتا، نام کی خوبصورت سی سل بنواتا اور سونے سے پہلے اس خیال کو پوری توجہ سے آنے والے دن کی جیب میں ڈال دیتا۔ بہت دن ہوئے اس کے ڈرائینگ روم میں ایک تصویر تھی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ اس کی ماں کی تصویر ہے، لیکن کچھ کا کہنا تھا کہ یہ کوئی خیالی تصویر ہے.... تصویر میں ایک عورت غم میں گندھی مسکراہٹ ہونٹوں پہ سجائے خالی منظر کو گھور رہی تھی۔ خالی یوں کہ منظر میں جو وادی تھی۔ وہ اپنے دریاؤں کے باوجود دست بدعا تھی۔ وہ اس تصویر کے بارے میں جاننے کا شوق تو رکھتا تھا اور یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس تصویر کی وادی اتنے سارے دریاؤں کے باوجود کسی بنجر دھند میں لپٹی ہوئی ہے۔ دریاؤں کا پانی سوکھ کیوں گیا ہے اور زمین کے ہاتھ خالی کیوں ہوتے جا رہے ہیں؟ لیکن اس کے لئے اس نے کبھی لمبی چوڑی چھان بین نہیں کی۔ ایک دو بار ماں سے پوچھا مگر وہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکی۔ بلکہ الٹا اس سے پوچھ بیٹھی کہ وہ تصویر کے بارے میں اتنا متجسس کیوں ہے۔

جب کبھی وہ ڈرائینگ روم میں اکیلا ہوتا تصویر اس کے سامنے آکھڑی ہوتی وہ اس کے خطوط میں شناسائی کی سدھتی تلاش کرتا۔ بہت پہلے جب وہ چھوٹا تھا اس نے اپنے باپ سے بھی یہی سوال کیا تھا۔ باپ نے جواب دینے کے بجائے الٹا اسے تیز نظروں سے گھورا اور کہا...."تم اپنی پڑھائی میں دلچسپی نہیں لے رہے۔"

جس دن اس کا باپ فوت ہوا تصویر بلک بلک کر روئی۔ لیکن اس وقت اسے اپنا ہوش نہیں تھا وہ خود بلک بلک کر رو رہا تھا۔ بعد میں دوسرے تیسرے دن جب لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے تو اس نے ماں کو بتایا کہ تصویر بھی روئی تھی۔

ماں ہنس پڑی۔۔ ۔۔: پگلے کہیں تصویریں بھی روتی ہیں "ماں کی ہنسی گہرے غم میں گندھی ہوئی تھی۔ اسے یقین نہیں آیا۔ وہ کچھ کہے بغیر ڈرائینگ روم میں چلا آیا اور تصویر کے سامنے کھڑا ہو کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ آنکھیں صاف دھلی ہوئی تھیں اسے شبہ سا ہوا کہ ان میں نمی تیر رہی ہے اور منظر اپنی وادی سمیت بھوک کی دھند میں لپٹا اپنی پہچان کھو رہا ہے۔ وہ خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا اور غور سے تصویر کو دیکھنے لگا۔ ایک عورت ہونٹوں پر غم میں گندھی مسکراہٹ سجائے سامنے کے منظر کو دیکھ رہی تھی۔ وادی جس کی راہیں خشک ہوئی جا رہی تھیں اور ہونٹوں پر نفرتوں کی پپڑیاں جم رہی تھیں۔ وہ اونگھ گیا۔

اس کی ماں مر رہی تھی اور تصویر بلک بلک کر رو رہی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر جاگ اٹھا جس دن برسات کی پہلی جھڑی لگی وہ ساری رات کروٹیں لیتا رہا۔ بار بار خیال آتا کہ پانی قبر میں گھس گیا ہے اور ماں سردی سے ٹھٹھرتی دیوار سے لگی اسے آوازیں دے رہی ہے۔ صبح ہوتے ہی وہ بارش میں بھیگتا قبرستان آیا۔ قبر ٹھیک ٹھاک تھی لیکن اسے شبہ رہا کہ پانی کہیں نہ کہیں سے رس رس کر اندر جا رہا ہے وہ گورکن کی کوٹھڑی میں پہنچا وہ چائے پی رہا تھا۔ اس کی بات سن کر اس نے مشکوک نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور بولا ۔۔۔۔۔۔ "فکر نہ کرو پانی اندر نہیں جا سکتا۔"

"پھر بھی کسی اور طرف سے ۔۔۔۔ میرا مطلب ہے نیچے ہی نیچے کہیں سے۔" گورکن دو تین لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر کہنے لگا۔۔۔۔ "اچھا بارش بند ہو جائے تو میں تھوڑی سی مٹی اور ڈال دوں گا۔" وہ اطمینان سے سر ہلاتا واپس آ گیا۔ اگلے دن بارش پھر ہوئی اور زور و شور سے ہوئی۔ وہ بھیگتا بھیگتا صبح سویرے قبرستان آیا۔ بہت سی قبریں بیٹھ گئی تھیں۔ مگر اس کی ماں کی قبر اس طرح تھی۔ پھر بھی اسے شبہ رہا کہ وہ بیٹھ رہی ہے گورکن اس کی بات سن کر بولا ۔۔۔ "تو پھر پکی کرا لو۔" ماں "یہ ٹھیک ہے۔" واپس آتے ہوئے اس نے اپنے آپ سے کہا۔ لیکن قبر پکی کرانے کے لئے اس کے پاس پیسے جمع نہ ہو سکے۔ بارشیں روز ہوتیں وہ قبرستان جاتا ہر روز کچھ اور قبریں بیٹھ جاتیں۔ اس کی ماں کی قبر بھی خاصی نیچی ہو گئی۔ تاہم ابھی اس کی شکل و صورت قائم تھی۔ ساری رات اسے یہی احساس رہتا کہ پانی بوند بوند اندر جا رہا ہے اور اس کی ماں سردی سے ٹھٹھری دیوار سے لگی اسے آوازیں دے رہی ہے تصویر نے بھی چپ سادھ رکھی تھی۔ غم میں گندھی مسکراہٹ پتھر ہو گئی تھی۔ شاید اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا یا ہے۔ لیکن پیچھے تو گہرا اندھیرا ہے اور آگے دھند ہی دھند۔۔۔ دھند۔ اس دھند میں سنبھل سنبھل کر قدم قدم چلتا، وہ گھوم پھر کر اس غم آلود مسکراہٹ کی چار دیواری میں لوٹ آتا۔ کبھی تو یہ مسکراہٹ غم کی قید سے آزاد ہوگی۔ وہ سوچتا اور ہر صبح تصویر کی دہلیز پہ آ کھڑا ہوتا لیکن مسکراہٹ اس طرح غم آلود، سامنے کا منظر اداس۔ وادی کے بلکتے بھوکے چہرے ویران مسکراہٹ غم آلود منظر کا چہرہ اداس، فرورتیں نوکیلے ناخنوں سے اس کے جسم کو مسلسل ادھیڑ رہی تھیں۔ تھکی انگلیوں سے جینے کی موہوم امیدوں کو ٹٹولتا وہ بے دم ہو گیا اور سوچنے لگا اگر تصویر بیچ ڈالے تو ڈھیر سارے روپے مل سکتے ہیں۔ ایک

دوست نے ایک بار کہا تھا۔ "اس تصویر کو کوئی بھی غیر ملکی مہنگے داموں خرید لے گا" تصویر بیچنے کا خیال شاید اسی دن پیدا ہو گیا تھا۔ یہ اور بات کہ اس وقت اسے یہ بات اتنی بری لگی کہ وہ اس دوست سے بیچ بیچ لڑ پڑا مسکراہٹ غم آلود، سامنے کا منظر دھندلا۔ غرور توڑ کے ہاتھ لمبے اور لمبے ہوتے چلے گئے اس نے ایک دن چپکے سے تصویر بیچ ڈالی۔

ڈھیر سارے پیسے ملے تو خالی ہاتھ سمٹ گئے اور آسائشیں خود بخود اس کی دسترس میں چلی آئیں۔ دن کی سختی میں نرمی آ گئی ... لیکن رات کو تصویر کی خالی جگہ اس کی ماں آ کھڑی ہوتی اور غم آلود مسکراہٹ کے ساتھ بڑی حسرت سے اسے دیکھتی رہتی۔ اس نے سوچا اس کی وجہ کا خالی ہونا ہے سو اس نے وہاں کیلنڈر لٹکا لیا۔ کیلنڈر لگنے سے دن اور مہینے اس کی مٹھی میں آ گئے۔ ماں اب خواب میں آنے لگی وہی غم آلود مسکراہٹ اور حسرت بھری نظریں اس نے سوچا شاید ماں قبر میں خوش نہیں۔ قبر پکی کروانے کا خیال پھیل کر اس کے پورے وجود پر چھا گیا۔ قبر پکی کرانے کا کام اگلے دن شروع ہو گیا۔ دو مستریوں نے تمام تک کام کر لیا۔ نام کی تختی بھی لگ گئی۔ اس رات وہ عجیب طرح کی نیند سویا۔ خواب میں اس نے دیکھا وہ بہت بڑے کمرے میں دوڑ رہا ہے۔ دھند گہری ہو گئی ہے اور دیواریں، فرش، چھت، سب اس دھند میں گم ہوتے جا رہے ہیں۔ صبح سویرے اس نے اگربتیوں کا پیکٹ لیا اور قبرستان کی طرف چل پڑا۔ قبر پر اگربتیاں لگا کر جب اس نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو اچانک ایک شبہ نے سر ابھار کر اس کے ہاتھوں کو ڈس لیا۔ اسے احساس ہوا کہ یہ تو اس کی ماں کی قبر نہیں ہے۔ اس کی ماں کی قبر تو ساتھ والی ہے جو اس طرح کچی ہے۔ یہ غلطی کس سے ہوئی، اس سے یا مستریوں سے یقیناً یہ مستریوں کی غلطی ہے وہ انہیں قبر دکھا کر چلا گیا تھا۔ انہوں نے غلطی سے ساتھ والی قبر پکی کر دی ..... اب کیا ہو ..... کیا ہو؟

سارا دن ماں بوند بوند اس کی آنکھوں کے کٹوروں میں اترتی رہی۔ دوسرے دن مستری ساتھ والی قبر پکی کر رہے تھے۔ شام کو اس نے غور سے قبر کا جائزہ لیا ..... ہاں یہ اس کی ماں ہی کی قبر ہے۔ اگلی صبح اگربتیاں جلا کر جب وہ دعا مانگ کر واپس مڑنے لگا تو شک رینگ رینگ کر پھر اس کے ذہن میں اتر آیا۔ یہ قبر بھی اس کی ماں کی نہیں اس نے غور سے دونوں پکی قبروں کو دیکھا۔ دونوں میں سے کوئی بھی اس کی ماں کی قبر نہیں ہے وہ تو ان سے اگلی ہے۔ شک اور یقین کی اس دھند میں تیسری، چوتھی اور پھر پانچویں اور چھٹی قبر بھی پکی ہو گئی لیکن اسے یہی شبہ رہا کہ ان میں سے کوئی بھی قبر اس کی ماں کی نہیں۔

اب ہر رات وہ خواب دیکھتا کہ قبر کی چھت بیٹھ رہی ہے۔ پانی بوند بوند رس رہا ہے اور ماں سردی سے ٹھٹھر رہی ہے تصویر کے منظر میں اداس میلے کبوتر اتر رہے ہیں۔ ان کی اڑان میں شکست اور تھکاوٹ ہے۔ چہرے جل رہے ہیں اور خوف جھولا پر دستک دے رہا ہے جسم بکھر رہے ہیں ریزہ ریزہ ـــــ ریزہ ریزہ

اس نے وہ ساری قطار پکی کروا دی۔ لیکن اب اسے یہ شبہ ہوا کہ اس کی ماں کی قبر اس قطار میں ہے ہی نہیں، وہ تو اگلی قطار

یں ہے اب دوسری قطاروں کی قبروں کے پکے ہونے کا کام شروع ہوا۔ ہر روز ایک قبر پکی ہوتی اگلی صبح اگربتیاں جلا کر دعا مانگتے۔ اسے خیال آتا کہ یہ اس کی ماں کی قبر نہیں ہے وہ اس سے اگلی قبر پکا کرنے کا کام شروع کراتا۔ مطمئن ہو کر گھر جاتا۔ خواب میں تصویر کی غم آلود مسکراہٹ والی عورت، اُداس سوچ میں رہن رکھا منظر اپنی پرتیں کھولتا۔ اس کے ہونٹ ہلتے مگر آواز سنائی نہ دیتی۔ بھوک سے بلکتی وادی میں ٹھٹھرتے چہرے، اُداس غم آلود مسکراہٹ، بوند بوند رستا پانی ـــ سوالیہ نشان ـــ سوالیہ نشان ـــ

ادھورے الجھے ہوئے نشان - دوسری کے بعد تیسری اور چوتھی قطار کی قبریں پکی ہوتی گئیں۔ لیکن اس کی ماں کی قبر اسی طرح کچی رہی۔ رات کو خواب میں تصویر کی غم آلود مسکراہٹ۔ قبر کی بیٹھی چھت، بوند بوند رستا پانی اور سردی سے ٹھٹھرتی ماں، دھندلاتے دھندلاتے اداس خالی منظر میں گم ہو جاتے۔ جس دن قبرستان کی آخری قبر بھی پکی ہو گئی۔ اس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ اور ساری پکی قبروں کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے اپنے آپ سے کہا... "ان میں سے کوئی ایک قبر میری ماں کی بھی ہے مجھے معلوم نہیں مگر وہ پکی تو ہو گئی ہے نا ـــ"

اگلی صبح سورج ابھی مشرق کی چلمن سے جھانکنے کی تیاریاں ہی کر رہا تھا کہ اس نے بیوی اور بچوں کو جگایا اور کہا کہ وہ سب اس کے ساتھ ماں کی قبر پر فاتحہ پڑھنے چلیں۔ قبرستان پہنچ کر اس نے بیوی بچوں سے کہا کہ وہ سب قبروں پر اگربتیاں اور پھول لگا دیں۔ اس کی بیوی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا "بھئی یہ سب میری ماں کے پڑوسی ہیں۔" اور دل ہی دل میں اس نے اپنے آپ سے کہا.. "سچی بات ہے مجھے معلوم ہی نہیں کہ ان میں سے میری ماں کی قبر ہے کونسی۔"

قبروں پر اگربتیاں لگیں تو سارا قبرستان خوشبو سے مہک اٹھا۔ انہوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے دعا مانگ کر سب نے ہاتھ نیچے کر لئے لیکن اس کے ہاتھ خلا میں ہی پتھر ہو گئے۔ اسے یاد آیا۔ یہ تو وہ قبرستان ہی نہیں جس میں اس نے اپنی ماں کو دفن کیا تھا تو اس کی قبر ابھی تک کچی ہے..... تصویر میں ایک عورت غم میں گندھی مسکراہٹ کے ساتھ خالی منظر کو دیکھ رہی ہے ـــ قبر کی چھت دھیرے دھیرے بیٹھ رہی ہے۔ پانی بوند بوند رس رہا ہے اور ماں دیوار سے لگی ٹھٹھر رہی ہے۔ جھکے ڈھیلے شانوں کے ساتھ سب سے پیچھے آتے ہوئے اس نے آپ سے کہا... "میں دوسرے قبرستان کی ایک ایک قبر پکی کروا دوں گا۔"

اسے خیال آیا اس شہر میں تو کئی قبرستان ہیں" کوئی بات نہیں" وہ بڑبڑایا... "میں اس شہر کے سارے قبرستانوں کی ایک ایک قبر پکی کرا دوں گا۔" اطمینان کے پرندے نے ایک لمحے کے لئے رنگ برنگے پر پھڑپھڑائے اور دوسرے لمحے خالی منظر میں گم ہو گیا ... اسے خیال آیا ـــ "کیا معلوم یہ وہ شہر ہی نہ ہو جہاں اس کی ماں دفن ہے۔"

تتلی کا جنم

سمیع آہوجہ

میں اس پہاڑی کی ڈھلوان سے دور نقطوں میں ٹمٹماتی ہریالی پر نظروں کی کمند پھینک کر اس کے سینے میں اترتا ہوں۔ کھجوروں کے چند درخت اور مٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے نما گھروندے اور ان کے عقب میں دندناتے ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ، دیوہیکل ٹرکوں کی غراہٹ اور ان کے پس پردہ دھول کا بھنور ——

ان ہریالی میں نہائی پہاڑیوں سے نیچے، دور دور وہ، جہاں آسمان اور زمین ایک دوسرے کی محبت میں سرشار گلے ملتے ہیں —— وہاں ——

ہلکی مٹیالی فضائیں جہاں دھوپ کی کرنیں ریت اور مٹی ملی سرخی میں جذب نہیں ہو پاتیں اور ہر لمحہ برچھیاں چمکاتی ہیں —— وہاں۔

اسی دھیمے رفتار دریا کے ساتھ بہتے چلو —— وہاں۔

وہاں، میرا گاؤں ہے۔ چھوٹا سا گاؤں، مگر اب۔؟

مگر اب ——؟؟

دھول اڑاتی زلزلے دار ہوا میں عین گاؤں کی دوسری سمت بارڈ وائر اور سمنٹڈ پولز کے محاصرے میں، لمبی طویل آمنے سامنے بیرکس، پھولوں کی کیاریوں میں گھرا سرسبز میدان اور زمین کے سینے کو ایک ہی رفتار سے کوٹتے قدم۔ سیمنٹڈ بنکر سے میڈیم رینج توپوں اور مشین گنوں کے دہانے عین دریا کے رخ پر اور چکی کے دو پاٹوں میں پستا، ٹوٹتا بکھرتا گاؤں، عین وسط میں۔

میں نے پلٹ کر دھول کے بگولوں میں لپٹے گاؤں کو دیکھا۔ گھٹی گھٹی سسکیوں کے چابک برس پڑے۔

ہاں میں اس کا ہی گاؤں تھا۔ مگر اب مٹی کا ڈھیر ہوں۔ ہا ہا ہا ہا، ہو ہو ہو ہو، کیا کھنڈر کے سناٹے میں گاؤں بستے ہیں۔ کیا تمہیں میرے ہاتھوں اور چہرے کے داغ کچوکے نہیں دیتے۔ ہا ہا ہا ہا، چیچک پھوٹ پڑی ہے اور

میرے پیٹ کو دیکھو۔ یہ بڑے بڑے غار نما شگاف ۔

سرد آہوں کی مانند پھٹتے ہی میرے جسم کے چیتھڑے اڑتے چلے گئے۔

ہاں میں بہت ہی ہرا بھرا تھا۔ تمہاری نظروں کا جہاں تک گزر ہو سکے، جہاں تک کرنوں سے تصادم نہیں ہوتا۔ وہاں، ہاں، وہاں ں ں ں تک ہریالی تھی، میرا سینہ سونا اگلتا تھا ۔ اور اب ۔؟ اور اب ۔؟؟

میری نظریں تو سے گولوں سے بنے غاروں میں اتریں اور گولیوں سے چھدے، ٹوٹے در و دیوار پر بھٹکنے لگیں۔ کچھ دیر ویران بھول بھلیوں میں بھٹکتے، میرا دل مسلسل دھڑکنے لگا۔ چاروں طرف گمبھیر سناٹا اور گھپ اندھیرا۔ اور تاریکی میں عزاق، چپٹتی بو ۔ میں اس اذیت ناک تنہائی سے ہراساں بے تحاشا بھاگنے لگا۔ مگر راستہ ۔؟ اب یہاں راستے کہاں ۔ میل ہا میل ٹوٹی سڑکیں، مٹی ریت کا غبار، الزامات کے بے بنیاد نشتر ۔ دیکھتے نہیں، سارا گاؤں خالی پڑا ہے ۔ اب ان دس گھرانوں کو کیا گاؤں کہو گے ۔ ہاں تم نے اسے کچھ کہنا ہی ہے تو سال خوردہ درختوں کی جلی کھجوریں کہہ لو ۔ جلی گٹھلیاں ۔ ہاں تم کھجوریں تو کھاؤ گے ہی نا ۔

ہاں ہاں لے لو ۔ بڑی ہی میٹھی ہیں ۔ ہاں ہاں ۔ لو بھی ۔ ہماری فیاضی کے دستر خوان صدیوں پر پھیلے ہیں ۔

ہاں یہ سچ کہتا ہے ۔ صدیوں کی اس فیاضی ہی کا تو یہ صلہ ہے ۔ یہ فیاضی کہتے ہیں اور میں بے وقوفی، حماقت، ہا ہا ہا ہا ۔

اور میں چاروں طرف سے اُبلتے حملہ آور قہقہوں سے دہشت زدہ، چاروں سمتوں میں نظروں کے بل دوڑتا ہوں مگر کسی بھی سانس کی آہٹ نہ پاکر مجبوراً سامنے پھیلی آنکھوں کے گڑھوں میں کود گیا ۔

اہلاً و سہلاً، اہلاً و سہلاً، اہلاً و سہلاً

پہلے ایک آواز، پھر کئی آوازیں اور پھر لوٹتے در و دیوار کا گنبد، گونجتا شور مچاتا رسہ بن کر لٹک جاتا ہے ۔ رسے کا پھندا دائرہ نگاہوں کو اپنی گرفت میں جکڑے جھولتا پنڈولم ۔ احساس کا حلقہ تنگ ہوتے ہوتے گلے میں اتر آتا ہے ۔ اور یکلخت ہی شکنجے کا شدید دباؤ ۔ آواز بھی نہیں نکل رہی ۔ آنکھیں حلقوں سے ابل ابل کر چیخ رہی ہیں اور جسم بڑی بے چارگی سے دونوں پاؤں جھٹک رہا ہے ۔

جسم کی نس نس سے پھوٹتی قوت، ہاتھوں میں مرتکز ۔

رسے پر انگلیوں کی گرفت

اور میں اپنے آپ کو چھڑانے کی سعی میں دھن ۔ ترکٹ ۔ تن ۔ نا ۔ دھی ۔ نا نا ناچ رہا ہوں ۔

بھوں بھوں بھوں بھوں بھوں بھوں۔
اور کتوں کا ایک لشکر آنے والے سائے پر لپکتا ہے۔
ہاں اب تو یہ گاؤں کے آباد کار ہیں۔
نہیں، یہ بھی تمہارے ہی دستر خوانوں کی وسعت پر پلتے ہیں۔
اہلاً وسہلاً
یہ جنگلی گلاب میری بیٹی نے لگایا ہے۔

ناک میں خوشبو کا ریلہ آتے ہی پیاسی آنکھوں نے ہریالی کو منہ لگا لیا۔ مگر پھسلن اتنی تند تھی کہ لمحات سے شب و روز کی اتھاہ میں اترتا چلا گیا اور شب و روز سالوں سے صدیوں کے بطن میں پھیل گئے۔ میرے چاروں طرف وسیع و عالیشان محلات در و بام میں خوشبوؤں کے ٹلنے کھل گئے۔ قیمتی قالینوں پر جھومتے ساغر، جھاڑ اور فانوس کی تیز روشنیوں میں پیرہن، ارغوانی رنگ میں غرق، خواب آلود لالچی آنکھیں۔

غوطہ زن ــــ!

کہاں ــــ؟

اُدھر تم بھی دیکھو۔ ان مخمور دانتوں سے اٹھتے دھوئیں کو چیر کر دیکھو۔ دف اور نفیری کی دھنوں میں اترو۔ اور ان رقاصاں، ہوش ربا، نیم برہنہ چکنے جسموں پر تم بھی جا چپکو۔ آؤ، جلدی آؤ ــ سارے پنجے یکدم گڑو دینا۔ ہاں۔

لیکن نظریں ساری آوازوں سے رشتہ توڑ کر سیاہی جسموں پر جھپٹ پڑیں اور فوراً ہی شدید پھسلن سے دوچار ہوئیں، اور تعاقب میں گھوڑوں کی تیز ٹاپوں، تلواروں کی جھنکار اور شور و غل کا طوفان ٹوٹ رہا تھا۔

لینا پکڑنا، جانے نہ پائے، اس کی یہ مجال
اس کے کانوں میں سیسہ پگھلا سیسہ ڈالو۔
اس کی آنکھوں کو عقابوں کے حوالے کر دو۔ ہاتھی اس کا جسم روندے گا۔ تاکہ پھر کوئی محلسرا کی طرف قدم نہ اٹھا سکے۔ سب کو عبرت ہو جائے۔

آنکھوں نے پوری قوت سے زقند بھری اور ہریالی پر آ بیٹھیں۔

ابو، ابو، یہ دیکھو میری سنڈی نے کیا پہن لیا۔ اور دوسری ابھی دو چار دن اور رہے گی۔ ابو، دیکھنا نا

اب چند ہی دنوں میں پھولوں پر رنگوں کی بہار منڈلانے لگے گی۔

اچھا لڑکی عزت کہا۔

یہ سپید رنگ تیرے ہی لئے تو ہیں۔ میرا کیا ہے۔

ہا ہا ہا ہا ، ہاں تم تو کھنڈر ہو چکے ہو اب ۔۔ ؟

ہاں ہاں ، میں کھنڈر ہوں ۔ مگر اس ملبے سے اٹھنے والے گھر نہیں دیکھے تم نے ۔ ؟؟

ابو ، ابو ، سنو نا ابو ، یہ تم گلاب کی بیلوں کو کیوں گھورنے لگ گئے ہو۔

اچھا بھئی کہو بھی ۔۔

ابو ، وہ جو میری نئی استانی آئی ہے نا ، وہی بڑی ٹیچر۔

اچھا اچھا ، وہ لومڑی کی آنکھوں والی ۔۔۔

یکدم چھوٹے سے دہانے سے جلترنگ کی تانیں ابل پڑیں۔

ہاں ابو ، وہ کہتی ہے کہ تتلیاں فارموں سے لینی چاہئیں ، سفید رنگ کی ہوتی ہیں ۔ اور پھر انہیں چھوٹا سا گملہ لگا کر پنجرے میں بند رکھو ۔ پر ابو میرا دل نہیں مانتا ، تتلیاں تو رنگ برنگی ہوں اور بیلوں پر اڑتی پھریں۔ تب ہی اچھی لگتی ہیں ۔ ہیں نا ابو۔۔۔

ہاں تو ٹھیک کہتی ہے ۔ مگر اُسے نہ کہہ دینا ۔ ورنہ ۔۔۔

پدرم سلطان بود ، پدرم سلطان بود۔

اور لشکر دروازے پر ٹوٹ پڑا ۔

ایسے لگتا ہے کہ یہ توڑ پھوڑ کے بھوکے ہمیں بھی کھا جائیں گے ۔

نہیں یہ دن ، ان پر بڑے بھاری ہیں۔

پچھواڑے کے باغ سے ایک دھاڑ ابھری اور غراتی بھونکتی آوازیں دور ہوتی ہوئی فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہیں ۔

اچھا ، تیرے دونوں بھائی کہاں ہیں ۔

چھوٹا تو پال پر الٹی سیدھی چھلانگیں لگا رہا ہے اور بڑے بھیا ، وہ ، وہ ۔۔ پہاڑی کی طرف اس کے بازو کی ٹہنی جھولنے لگی۔

تھی، ہونٹوں پر شہادت کی انگلی آ بیٹھی۔ اور اس کے دونوں بازوؤں کو ہاتھوں میں سمیٹ کر اس کی آنکھوں کو جکڑ لیا۔

یہ کسی کو بھی کبھی مت بتانا، اچھا۔ جاؤ اب کھیلو۔

اور وہ وحشی اونٹوں کی بلبلاہٹ میں جھاگ اچھالتے میری طرف لپکا۔

دیکھا تم نے، یہ لڑکا کسی کی سنتا ہی نہیں۔ عمر کی تانت جسموں کو کمان میں ڈھال رہی ہے اور یہ غصیلی آگ میں کود رہا ہے۔ اس کا کیا جائے گا۔ درخت تو میرے سیاہ ہوں گے۔

اور شعلوں میں چٹختے درختوں کی بو میرے گرد اپنے دائرے بننے لگی۔

نہیں دھارا جیسے بہتا ہے، بہنے دو۔ چٹانیں خود راستہ چھوڑ دیں گی۔

ہاں تم بھی ٹھیک کہتے ہو۔

کھجوروں کی فصل کو اپنے عرصوں میں ہی محفوظ کرنا ٹھیک ہے۔ شاید کبھی ہزاروں قدم یہاں سے گذریں تو راستہ نہ بھولیں۔

نہیں یہ تو یادوں کا سنگِ میل ہے اور اب کے اگر بادِ مخالف پھر پلٹی تو، تو شاید، تو شاید یہ نشان بھی مٹ ——

نہیں نہیں نہیں، مردار خوروں سے بھلا زندوں کا کیا رشتہ، مر گئے تو پھر کیا۔

گونجتی دھاڑ کے فولادی پنجے نے کندھے پر لٹکی، جھولتی کلاشنکوف کو تھپتھپاتے، پہاڑی پر متحرک دس نقطوں سے نظریں سمیٹیں اور خاردار تاروں اور سیمنٹ کے کھمبوں پر جال پھینک دیا۔ ہم مر کر بھی زندوں میں رہیں گے سورج کی دم توڑتی سرخ شعاعوں میں دس ہیولوں کی تھرتھراہٹ میں گیارہویں لوشالی ہوئی تو قدم دریا کے رخ بہنے لگے اس نے اسے آواز دینی چاہی مگر میں نے اندر ہی سے اس کی خواہش کو دبوچ لیا۔ بیتاب محبت نے اس کے خاموش لبوں کو کھول دیا۔ کھلا ہوا غار، سفید موتی، آنکھوں میں جھلملاتے تارے، مدہم بھرائی آواز۔

فی امان اللہ۔

اور بے اختیار پیالہ پر دوڑتے، ہاتھوں کی کلاشنکوف سے گولیاں برساتے، چھوٹے لڑکے کو اپنی باہوں میں سمیٹ لیا۔

یہ تم کیا کر رہے ہو؟

مشق کر رہا ہوں، دشمن پر ٹوٹ پڑنے کی مشق۔ یہ میرے ساتھی ہیں۔

اور اس کی انگلیاں کھجوروں کے بلبے تنوں کی طرف دائروں میں گھوم گئیں۔ لہلہاتے جھومتے درختوں میں، سرمئی شام اور رقصاں، روانایاں بجاتی کھل کھلا کر ہنس دیں۔

ہاں ہاں، تم آگے بڑھتے رہو۔ ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں۔

لہلہاتے جھومتے درختوں میں اور بھی سرشاری آگئی۔

ہاں، تم ہمیں، ہماری ہی صورتوں میں دیکھنا چاہتے ہو۔ مشق سے ہی تو ہم نے ہواؤں کے ساتھ کھیلنا سیکھا ہے

آؤ بیٹے، اب رات سر پر کھڑی ہے۔ جانے تمہارا بھائی کب لوٹے گا۔

ابو، آپ بھی ان کے ساتھ شامل ہو جائیں تو یہ فکر یں آپ کو کبھی نہ ستائیں۔

ہاں ہاں تم کیوں نہیں ہو جاتے شامل۔

کیا میرے ہونے سے کچھ فرق پڑے گا۔

فرق —؟

فرق —؟؟

اور زمین دھماکوں سے لرزنے لگی۔ میری آنکھیں آواز کے تعاقب میں دوڑنے لگیں۔ خاردار تاروں، سیمنٹ کے کھمبوں اور بنکر کے سیاہ ٹیلے سے آگ کا طوفان اُبل پڑا تھا۔ شعلوں کی خونخوار زبانیں ہر شے کو چاٹ رہی تھیں۔ دروتیہ بیرکس کے سامنے دوڑتے قدم، چیخ و پکار، خوف و ہراس کے سیلاب میں بہے جا رہے تھے۔ نہ صرف اس کے گھر کے دروازے کھلے بلکہ ہر مکان کے دروازے پر ہراساں اور سوالیہ نظریں شعلوں اور ایک دوسرے کے آدمیوں کو ٹٹول رہی تھیں۔

ابو، دیکھا، بھیا کا۔

چپ، چپ، ایسی باتیں نہیں کرتے۔ چلو گھر چلیں۔

اسے دیکھتے ہی دھیمی دھیمی بھنبھناہٹ پھیلی۔ لیکن اس کا دروازہ بند ہوتے ہی بقایا دروازے بھی چپ چاپ ایک دوسرے سے چھٹ گئے۔

ہوں، تو تم ویرانوں سے خوف زدہ ہو۔

نہیں نہیں

لیکن پھر تم نے جواب نہیں دیا۔

تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔

کیا تم نہیں جانتے۔

مگر، مگر میری بیوی، میرے بچے۔ ؟!؟

ان کا کیا ہوگا۔

کیا ہوگا۔ کیا ہوا کرتا ہے، اور اب کیا ہوگا جب وہ آجائیں گے۔ تو۔

تو تو۔ وہ، نہیں نہیں، یہ میرے جیتے جی کیسے ہو سکتا ہے۔

ہو سکتا ہے۔

اس نے حقے کی نے کو ہونٹوں میں دبا لیا۔ نظریں دیے کی مدھم لو میں تینوں پلنگوں پر کمبلوں میں دبکے جسموں پر باری باری دوڑیں اور پھر ان کی سپر بن کر جم گئیں۔ خیالوں کی اندھی ڈائین پھنکارتی نمودار ہوئی اور اس کے گلے میں دانت گڑو دیئے۔

اس کا مٹھی میں بھنچا، کھنچتا دل۔

اس نے کرب و بیچارگی سے دونوں ہاتھوں سے گلا ملتے ہوئے، تھوک سے حلق میں پھیلے کانٹوں کو توڑا اور ٹانگیں سمیٹ کر آلتی پالتی مارتے کمبل میں اپنے آپ کو سمیٹا۔ سرد آہ اس کے ہونٹوں سے آزاد ہو کر کمرے میں پھیلی سانسوں کی گرمی میں گھل گئی۔

درد میں ڈوبی ایک اور کراہ، اور پھر کئی ایک سرد یخ بستہ حسرتیں۔

اَن گنت روپ بہروپ بھرتی ڈائنوں سے لڑتے لڑتے، مرغوں کی اذان کے ساتھ وہ بستر سے اترا اور غسل خانے میں گھس گیا۔ تام چینی کے مگ سے پلاسٹک کے لوٹے میں گرتے پانی نے شور مچایا۔

تو تم نے کیا سوچا۔

سر کا مسح کرتے ہوئے وہ بڑبڑایا۔

ہاں ہاں، میں جاؤں گا۔ تم یہی چاہتے ہو نا۔

اور تم نہیں چاہتے۔

چاہتا ہوں مگر میری بچی، میری بیوی۔

اور زمین میں بڑے زور کی کپکپاہٹ ابھری۔ گڑگڑاہٹ اور دھماکے صبح کی گنگناتی خاموشی کو تار تار کرتے

چلے گئے۔ اس کی بیوی اور بچے دوڑتے ہوئے باہر نکلے تو وہ بھی ان کے عقب میں لپک پڑا۔ دوسرے لوگوں کے گھروں کے باسی بھی دروازوں سے جھانک رہے تھے۔ صبح کی دودھیا روشنی میں گھلتے ہلکے نیلگوں اندھیرے میں شعلے اگلتے بھاری بھرکم ٹینک گاؤں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ایک دھماکہ مین صحن سے اٹھا اور مکان کی چھت دوسرے لمحہ میں ہی نیچے آ رہی۔ گرد و غبار کے ہجوم میں ان کے چہرے گم ہو گئے۔

دوڑو، دوڑو، دریا کی طرف بھاگ نکلو۔

ابو، ابو، میری تتلی۔

ارے پگلی، چھوڑ اسے۔

مگر اس کے الفاظ ابھی ہونٹوں سے پھوٹے ہی تھے کہ وہ پلٹ کر گھر کی طرف بھاگنے لگی اور اس کے پیچھے باہیں پھیلائے، اس کو پکارتی اس کی ماں۔

بیٹی۔ اس نے پہلا قدم ان کی طرف اٹھایا ہی تھا کہ یکدم آنکھوں میں ترمرے سے پھیل گئے۔

ایک دھماکہ

اور گوشت کے چھوٹے بڑے پارچے، بارود کی بو، مٹی کے غبار اور ملبے کے ڈھیر میں غرق ہو گئے۔

میری بچی۔

سعدیہ۔

اور اس کی آواز ہچکیوں میں ڈوب گئی۔

ابو، ابو، ٹینک ادھر ہی آ رہے ہیں۔ سب لوگ چلے گئے۔

وہ اس کے جھنجھوڑنے پر لوٹ آیا۔ گرد و نواح میں نظریں گھومیں۔ دوسرے لوگ کھجوروں کا باغ بھی پار کر چکے تھے۔ اس نے جھک کر ریت اور مٹی کی مٹھی بھری اور اسے چومتے، آنکھوں سے لگاتے، انگلیوں اور ہتھیلی کی جھری میں پسیجتے مٹھی کھول دی اور دوڑتے ہوئے قدم باغ کے فاصلوں کو سمیٹنے لگے۔

ابو ابو، میں نے رات خواب دیکھا۔

اور اس نے اسے دوڑتے ہوئے گود میں بھر لیا۔ کیا۔ خواب۔ ؟ کیسا خواب ؟؟؟

ابو، میں نے دیکھا کہ آپ مجھے اس کے پاس لے جا رہے ہیں۔

اس کے پاس۔ ؟

ہاں، آپ نے کہا تھا کہ اس نے امانت واپس مانگی ہے۔

امانت — ؟!

ہاں۔

ہوں۔

میں نے اسے اس کی گود سے اتارا اور دونوں ہاتھوں کی کٹوریوں میں اس کا چہرہ بھر کر اس کی چمکتی آنکھوں میں اتر گیا۔ مگر خیرہ کرتی شعاعوں کی کوئی انتہا ہی نہ تھی، اور میں اس کی انگلی پکڑ کر پہاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ اور وہ دوڑ دوڑ کر میرے ساتھ چل رہا تھا۔ پہاڑی کے قدموں میں پہنچ کر اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ شعلوں کے دہکتے الاؤ پر شور و غل کا طوفان پھیل رہا تھا۔

میں نے آنسو بھری آنکھوں کو زور سے بھینچ لیا اور منہ دوسری طرف پھیر کر انگوٹھے سے گالوں پر پھسلتی خون کی بوندیں کو صاف کیا اور اسے پھر گود میں بھر لیا۔

گرد و غبار میں پلٹے، تیز تیز قدموں میں ننھے ننھے جلترنگ کے بھنور زنجیریں ڈال رہے تھے۔

ڈوبتی، دم توڑتی آواز —

ابو دیکھو میری تتلی، دیکھو نا ابو، کتنی خوبصورت ہے۔ رنگ تو دیکھو کتنے چمکدار ہیں۔

سیاہ پروں پر سرخ لہریں، ایک منٹ بھی اسے چین نہیں۔ ایک ایک پھول پتے پر منڈلاتی پھرتی ہے۔

دیکھو نا ابو، دیکھو نا ابو —

دیکھو نا ابو —

نہیں نہیں، اب مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔

میں اس پہاڑی کی ڈھلوان سے دور، لپکتے شعلوں اور دھاکوں سے پھٹتے ہوئے لیوں پر پھیکی کھنڈ کاٹ دیتا ہوں۔ اور میرے قدم —

اور میرے ساتھ ساتھ دوڑ دوڑ کر چلتا میرا بچہ —

راستے بند ہیں

محمد منشا یاد

وہ میلہ دیکھنے آیا ہوا ہے اور اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں

میں اس سے پوچھتا ہوں۔

"جب تمہاری جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں تھی تو تم میلہ دیکھنے کیوں آئے ہو؟"

وہ پہلے روتا اور ہنستا ہے اور کہتا ہے

"میں میلے میں نہیں آیا ـــــ میلہ خود میرے چاروں طرف لگ گیا ہے اور میں اس میں گھر گیا ہوں۔ میں نے باہر نکلنے کی کئی بار کوشش کی ہے مگر مجھے راستہ سجھائی نہیں دیا۔"

مجھے اس کی بات پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی اس لئے میں پریشان ہو جاتا ہوں کیونکہ میں اس کی نگہداشت پر مامور ہوں۔ مجھے پتہ نہیں مجھے اس کی نگہداشت پر کس نے مامور کیا ہے؟ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ مجھے ہر وقت اس کے ساتھ رہنا اور اسے بھٹکنے سے بچانا ہے۔

میلہ زوروں پر ہے۔

چاروں طرف انسان ہی انسان نظر آتے ہیں جتنے لوگ میلے سے جاتے ہیں اس سے کئی گنا زیادہ آ جاتے ہیں۔ سڑکوں پر ہر طرف تانگے، بیل گاڑیاں، بسیں، ٹرک، کاریں اور موٹر سائیکلیں ایک دوسری سے آگے نکلنے کی ناکام کوشش کرتی۔ ہارن بجاتی، دھواں اڑاتی نظر آتی ہیں۔ ہارن بجا بجا کر ڈرائیوروں کے اور مسلسل گھنٹیاں بجا بجا کر سائیکل سواروں کے ہاتھ تھک گئے ہیں۔ پیدل چلنے والوں کے چہرے دھول سے اٹے ہوئے ہیں اور کپڑوں پر گرد جمی ہے لیکن میلے کے شور نے ان کے تھکے ہوئے نڈھال جسموں میں نئی روح پھونک دی ہے۔ میلے کی فضا کو دھوئیں، گرد اور شور وغل کے بادلوں نے ڈھانپ رکھا ہے۔ بڑے بڑے لاؤڈ سپیکروں پر انسانی آوازیں گرجتی اور چنگھاڑتی ہیں۔ جھولوں کی چیخیں۔ ڈھولوں کی گمکاریں، مداریوں کی بانسریوں کی کوکیں

اور خوانچہ فروشوں کی صدائیں ایک دوسری میں خلط ملط ہو رہی ہیں۔ ان سینکڑوں قسم کی آوازوں کے شور میں اسے سوڈا واٹر کی بوتل کھلنے کی "ٹک" جیسی آواز سب سے اچھی لگتی ہے وہ اسے کسی سُریلے نغمے کی طرح سنتا اور جانتا ہے میں نے کئی بار چلّا چلّا کر اسے آگے بڑھنے کے لئے کہا ہے مگر وہ سوڈا واٹر کی بوتلوں کی دکان کے سامنے پتھر ہو گیا ہے۔ میرے لئے عجیب مشکل ہے۔ کاش میں اس سے علیحدہ ہو سکتا، اُسے اس کے حال پر چھوڑ کر جا سکتا میں اس کی کمینی حرکتوں سے عاجز آ گیا ہوں۔ عجیب ندیدہ آدمی ہے۔ صبح وہ کتنی ہی دیر تک اسی بھٹی کے قریب کھڑا جلتا رہا جس پر پوریاں تلی جا رہی تھیں اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں، وہ بار بار جیب میں ہاتھ ڈالتا پھر خالی ہاتھ کو یوں گھورتا جیسے اس کی ہتھیلی پر گرم گرم پُوری رکھی ہو۔ عجیب واہیات انسان ہے۔ کھانا کھاتے ہوئے آدمی کے سامنے اکڑوں بیٹھے کتے کی آنکھ میں بھی اتنا ندیدہ پن نہیں ہوتا، جتنا حلوا پوری کھاتے اور نالو دھ پیتے لوگوں کو دیکھ کر اس کی نگاہوں سے جھلکنے لگتا ہے۔

وہ میلہ دیکھنے آیا ہے۔

اور میلے میں دیکھنے کی سینکڑوں چیزیں ہیں۔ تھیٹر کے مسخرے، ناچتی گاتی عورتیں، سرکس کے جانوروں کے کرتب، موت کے کنوئیں میں چلتی موٹر سائیکل اور چلانے والے کی گود میں بیٹھی ہوئی لیڈی، اوپر نیچے جاتے جھولے۔ فلم کی تاکی پر دو گانے گاتے ہوئے عاشق و معشوق اور مداری کے توتے چلاتے طوطے لیکن اسے ان میں سے کسی چیز سے دلچسپی نہیں حالانکہ سرکس کے باہر فلمی ریکارڈوں کی دُھنوں پر ناچتے مسخروں کو دیکھنے پر تو خرچ بھی کچھ نہیں آتا مگر اسے صرف کھانے پینے کی چیزوں سے دلچسپی ہے۔ اسے پھلوں، مٹھائیوں، فالودوں، آئس کریموں، سوڈا واٹر کی بوتلوں اور سیخوں میں پروئے ہوئے مرغوں کو دیکھنا۔ گھورنا اور ان کی خوشبو سونگھنا اچھا لگتا ہے اور حالانکہ دونوں وقت پیر صاحب کے ڈیرے پر اُسے بھنڈارے کی دال روٹی مل جاتی ہے لیکن اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔ رات وہ مجھے دیر تک ان مٹھائیوں، پھلوں اور چیزوں کے نام گنواتا رہا جو اس نے کبھی نہیں چکھی تھیں۔ یہ فہرست اتنی طویل تھی کہ میں اُکتا گیا اور اسے مشورہ دیا کہ وہ صرف ان چیزوں کے نام بتائے جن کے ذائقے سے وہ آشنا تھا۔ لیکن وہ رضامند نہ ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ لذیذ چیزوں کے ذکر سے حاصل ہونے والی لذت سے محروم ہونا نہیں چاہتا۔

میلے میں اس کی جان پہچان کے اور لوگ بھی ہیں۔

اہلی بخش نمبردار کا لڑکا عاشق ہے جو اپنے یار دوستوں کے ہمراہ اپنے یکے پر آیا ہے اور اس کے ڈیرے

پر ہر وقت مجرا ہوتا رہتا ہے اور شراب کی بوتلیں خالی ہوتی رہتی ہیں۔ طوائفیں سرخی پوڈر لگائے اور دانتوں سے کپڑے ہوئے نوٹ چن چن کر تھک جاتی ہیں اس نے کئی بار ارادہ کیا ہے کہ وہ عاشق کے ڈیرے پر چلا جائے۔ لیکن میں نے اسے منع کر دیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ وہاں دن رات چلمیں بھرتا رہے۔ پھر سردار محمد تھانیدار ہے اسے اعتباری آدمیوں کی ضرورت بھی ہے لیکن میں نے اسے سردار محمد کے پاس جانے سے بھی منع کر دیا ہے۔ علیا نائی اپنے حال میں مست ہے۔ وہ میلے میں خالی ہاتھ نہیں آیا اپنے ساتھ ریچھ بھی لیتا آیا ہے۔ اس کا جب جی چاہتا ہے ریچھ کو نچانے لگتا ہے اور جب جی چاہتا ہے تھیٹر دیکھنے چلا جاتا ہے۔ تھیٹر دیکھتے ہوئے بھی وہ قریب بیٹھے ہوئے لوگوں کے ناخن تراشتا رہتا ہے۔ صرف مہرو سانسی ایک ایسا آدمی ہے جو اسے دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور خوشی کے اظہار کے لئے جب بھی سامنے آتا ہے دانت نکالتا ہے یا پھر کالو ہے جو اسے دیکھتے ہی دُم ہلانے لگتا ہے حالانکہ اس نے زندگی بھر اُسے سوکھی روٹی کا ٹکڑا تک نہیں ڈالا۔

اسے مہرو سانسی اچھا لگتا ہے شاید اس لئے کہ مہرو گندی چیزیں سہی ہر طرح کی کھانے پینے کی چیزوں کے ذائقوں سے آشنا ہے۔ پچھلی بار تو اس نے حد ہی کر دی تھی۔ رات کو جب اچانک آندھی آگئی تو کالو کے ساتھ پناہ لینے کے لئے ایک تخت پوش کے نیچے گھس گیا، تخت پوش کے نیچے قلاقند سے بھری کڑاہی رکھی تھی جسے اس نے اور کالو نے خالی کر دیا۔ اس دن مہرو کو باہر نکل کر دو بار گلے میں انگلی ڈال کر قے کرنا پڑی تھی۔ اگر کالو کی دُم اس کے پاؤں کے نیچے نہ آجاتی تو ایک آدھ بار اور رستے کر کے وہ گلاب جامنوں کا بھی صفایا کر دیتا۔ اسے مہرو اور کالو پر رشک آتا تھا اگر میں اس کے ہمراہ نہ ہوتا یا اس سے بے پرواہ ہو کر سو یا رہتا تو وہ یقیناً بھٹک جاتا چلمیں بھرتا دلالی کرتا یا پھر کسی تخت پوش کے نیچے گھس کر قلاقند یا گلاب جامنیں کھا رہا ہوتا۔ اس نے کئی بار ارادہ کیا ہے کہ کسی حلوائی کی دکان یا کسی ہوٹل میں گھس کر جی بھر کے کھائے اور خود کو دکاندار یا پولیس کے حوالے کر دے۔ لیکن میں نے ہر لمحہ اسے ایسی حرکتوں سے باز رکھا ہے۔

میلے کا آج تیسرا روز ہے۔

اور میں نہایت مشکل میں ہوں۔

وہ بغاوت پر آمادہ ہے۔

مجھے اس کے تیور بگڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سوڈا واٹر کی بوتل کھلنے کی ٹک جیسی آواز

سن کر اس کی تشفی نہیں ہوتی۔

وہ حلوہ پوری، قلاقند اور بالوشاہی کے ذکر سے مطمئن نہیں ہوتا۔

بھنے ہوئے گوشت اور روسٹ مرغ کی خوشبو سے اس کا جی نہیں بہلتا اور وہ پھلوں کے نام گنوا کر لذت حاصل کرنے پر قناعت نہیں کرنا چاہتا۔

میں نے اسے بہت سمجھایا ہے۔ لعن طعن اور ملامت کی ہے لیکن وہ مصر ہے کہ وہ ہر قیمت پر ان سب چیزوں کو چکھ کر دیکھنا چاہتا ہے جن کے ذائقے سے وہ نا آشنا ہے گزشتہ رات ہم دونوں دیر تک لڑتے جھگڑتے رہے ہیں۔ میں نے اسے صاف صاف بتا دیا ہے کہ اگر وہ باز نہ آیا تو مجھے زندہ نہ دیکھے گا لیکن اس کا کہنا ہے کہ اگر اس نے اپنی خواہش کا گلا گھونٹ دیا تو گھٹ کر مر جائے گا۔

میں عجیب الجھن میں ہوں۔ شاید وہ وقت آگیا ہے۔ جب ہمیں فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہم دونوں میں سے کسے زندہ رہنا چاہیئے۔

میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔

لیکن میں اسے بھی زندہ، خوش اور مطمئن دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں اس کی توجہ ہٹانے کی کوشش کرتا ہوں اور اسے مداری کے کرتب، مجنوں کے ... اور مسخروں کے ناچ دکھانا چاہتا ہوں لیکن وہ قیمہ کریلے، بھنے ہوئے گوشت، روسٹ مرغ اور قلاقند کے ذائقوں کے لئے قتل و غارت پر اتر آیا ہے۔

وہ کہتا ہے "جب یہ سب چیزیں موجود ہیں تو میں ان کے ذائقوں سے محروم کیوں ہوں۔"

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں اسے کیسے سمجھاؤں ... بھٹکنے سے کیسے بچاؤں؟ میلے کا آخری اور چوتھا روز ہے۔

رات مجھے ایک نہایت اچھوتا خیال سوجھا ہے اور میں نے بڑی مشکل سے یہ بات اس کے ذہن نشین کرائی ہے کہ اصل میں سب انسان ایک ہی انسان کا پرتو ہیں یا اصل میں انسان ایک ہی ہے جو مختلف شکلوں میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ کہیں وہ قلاقند کھا رہا ہے۔ کہیں ناخن تراش رہا ہے۔ کہیں روسٹ مرغ اڑا تا ہے اور کہیں بھنڈارے کی دال روٹی پر اکتفا کرتا ہے۔ اس لئے جو کچھ بھی دنیا میں ہو رہا ہے یا کھایا پیا جا رہا ہے اس کی لذت انسان کی مشترکہ لذت ہے چنانچہ جب وہ کسی کو حلوہ پوری کھاتے دیکھتا ہے تو اسے محسوس کرنا چاہیئے کہ خود حلوہ پوری کھا رہا ہے اور اس لذت میں برابر کا حصہ دار ہے۔

مجھے اس کی یہ عادت بے حد پسند آئی ہے کہ جب اس کے ذہن میں کوئی بات بٹھا دی جائے تو وہ اس سے سر مُو اِدھر اُدھر نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس نے جلد ہی میری اس انوکھی تجویز پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے۔

"ٹک" بوتل کھلنے کی آواز آتی ہے۔

ایک پتلا دُبلا آدمی بوتل منہ سے لگاتا ہے۔ وہ اپنی جگہ کھڑا مسکرا کر میری طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔

"واہ وا   کیا ٹھنڈی ٹھار اور مزے دار بوتل ہے۔" پھر آستین سے منہ پونچھ کر کہتا ہے مزا آ گیا۔" سیخ کبابوں کی خوشبو لپکتی ہوئی آتی ہے اور اس کے قدم رک لیتی ہے۔

وہ منہ کھولے بغیر تکوں کو دانتوں سے کاٹتا چباتا ہے۔ پھر ان کی لذت محسوس کرتے ہوئے کہتا ہے

"ذرا سخت ہیں مگر گوشت سخت ہی ہو تو مزا دیتا ہے۔"

میں اطمینان کا سانس لیتا ہوں۔

اس کی نظریں بالوشاہی کے تھال پر ہیں۔ وہ دکان سے کچھ فاصلے پر کھڑے کھڑے بالوشاہی کھانا شروع کر دیتا ہے۔ کھاتے کھاتے اس کا منہ تھک جاتا ہے۔ پیٹ پھول جاتا ہے مگر بالوشاہی ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ میں کہتا ہوں "اور کھاؤ۔"

"نہیں بس۔" وہ ڈکار لیتے ہوئے جواب دیتا ہے۔ پاپڑ دیکھ کر میں کہتا ہوں۔

"منہ سلونا کرو گے؟"

"ہاں۔۔۔"

پاپڑ اس کے دانتوں تلے کڑکڑاتے ہیں۔

"کیسے ہیں؟"

"بہت اچھے ہیں بس ذرا مصالحہ تیز ہے۔"

"اور کیا پسند کرو گے؟"

"میں نے آج تک سیب نہیں چکھا۔"

میں اسے پھلوں کی دکان کے سامنے لے جاتا ہوں اور سیبوں کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہوں۔

"یہ سیب ہیں تم جتنے چاہو کھا سکتے ہو۔"

وہ ایک سیب نگاہوں سے اٹھاتا ہے، دانتوں سے کاٹتا ہے اور کہتا ہے

"یہ تو ناشپاتی ہے۔"

"یہ ناشپاتی نہیں سیب ہے تم اسے سیب کی طرح محسوس کر کے کھاؤ۔"

وہ پھر دانتوں سے کاٹتا ہے اور کہتا ہے "یہ امرود ہے۔"

"یہ امرود نہیں سیب ہے۔"

وہ پھر کوشش کرتا ہے پھر کہتا ہے

"یہ آڑو ہے" ——

"یہ آڑو نہیں ہے" ——

مجھے غصہ آجاتا ہے۔

"تم اُلو کے پٹھے ہو" ——

وہ مجھے اداس نظروں سے دیکھتا ہے پھر روہانسا ہو کر کہتا ہے:-

"مجھے کیا پتہ سیب کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے میں نے کبھی کھایا ہی نہیں۔"

"اچھا چھوڑو" ——

میں کہتا ہوں۔

"اب آگے چلتے ہیں۔"

ہم باری باری ایک دوسرے کی انگلی پکڑے چلنے لگتے ہیں۔ ایک جگہ بہت سے لوگ جمع ہیں۔

"کیا بات ہے بھائی؟" ——

وہ پوچھتا ہے۔

"حادثہ ہو گیا۔ آدمی ٹرک کے نیچے آ کر کچلا گیا" ——

وہ پریشان ہو کر میری طرف دیکھتا ہے

پھر کہتا ہے ——

ٹرک —— میرے اوپر سے ٹرک گزر رہا ہے!" ——

"نہیں ۔۔۔ میں چلاتا ہوں ۔۔۔۔۔۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہوں وہ دھڑام سے نیچے گر جاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ٹھنڈا ہو جاتا ہے ۔۔۔۔۔۔

ریت کنارا

مظہر الاسلام

پچھلے پانچ منٹ سے میں ریت کے چھوٹے سے ڈھیر کے سامنے کھڑا ہوں اور اپنے آپ میں پرے گزرنے کا حوصلہ پیدا کر رہا ہوں صبح جب میں گھر سے دفتر جانے کے لئے نکلا تھا تو ریت کا ڈھیر یہاں نہیں تھا لیکن واپسی پر گھر سے کوئی بیس تیس قدم پہلے میری راہ روک کر کھڑا ہو گیا ہے مجھے دھڑکا ہے کہ میں ریت کے اس ڈھیر کو عبور نہیں کر سکوں گا گھر میں ننھی مینا میرا انتظار کر رہی ہو گی اور میری بیوی اسے گود میں لئے ہر آہٹ پر کہتی ہو گی "بابا آ گئے" ماں نے روٹی بنانے سے پہلے توا چولہے پر رکھ دیا ہو گا۔ لیکن ریت کے اس ڈھیر کا کیا کروں۔ دیکھنے والے تو مجھ پر ہنسیں گے کہ اتنے چھوٹے سے ڈھیر کو بچے بھی ایک قدم میں عبور کر سکتے ہیں۔ لیکن میں اس خوف سے اس پر قدم نہیں رکھتا کہ مجھے ریت کا ڈھیر پار کرتے کرتے کئی ماہ لگ جائیں گے اور جب میں گھر پہنچوں گا تو بڑھاپا میرے اندر گھر بنا چکا ہو گا کسی کو کیا بتاؤں کہ ریت چاہے مٹھی بھر ہی کیوں نہ ہو میرا مسئلہ ہے۔ ریت ایک ایسی سرحد ہے جس پر وہ ہر وقت کھڑی رہتی ہے۔

اچانک کوئی چیز میرے اندر زور زور سے سر پٹخنے لگی۔ میں نے بے چینی اور گھبراہٹ میں تیزی سے قدم اٹھایا اور ریت کے ڈھیر پر رکھ دیا ہے اب میں ریت پر چل رہا ہوں اور وہی ہوا ہے جس کا مجھے ڈر تھا۔ سفر ختم ہونے کو نہیں آ رہا دور دور تک صحرا پھیلا ہوا ہے ریت کے ٹیلے ایک دوسرے کی گود میں سر رکھے ہوئے اونگھ رہے ہیں کڑاچیاں ننھی ننھی جھاڑیوں پر جھکی ہوئی ہیں۔ بھیڑوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی آوازیں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے میرے کانوں کی دہلیز پر کھیل کھیل رہی ہیں۔ وہ میرا کندھا تھپتھپا کر کہتی ہے۔

"تم بہت دیر سے آئے ہو تمہارے قدموں کی چاپ تو کئی برسوں سے سنائی دے رہی ہے"

پانی کا گھڑا اٹھانے کے لئے وہ تیزی سے گھومی اس کا گھگھرا گولائی میں لہرایا تو مجھے ساری کائنات گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا "ریت پر تو قدموں کی چاپ سنائی ہی نہیں دیتی" وہ کھلکھلا کر ہنسی اور ہنستی ہی چلی گئی اس کا گداز سینہ بری طرح پھڑکنے لگا۔ زیورات اچھل اچھل کر کبھی ادھر گرتے کبھی ادھر۔ ہنسی تھمی تو وہ بولی۔

"تو نہیں سمجھ سکتا کوئی کسی کے جسم پر چلے تو کیا اسے بھی پتہ نہیں چلے گا؟" دوسرا گھڑا کولہے پر جما کر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگی۔

سامنے گھاس پھونس کی جھونپڑیاں یوں لگ رہی تھیں جیسے بہت سی بوڑھی عورتیں ایک ساتھ چھڑیاں ٹیکتی آ رہی ہوں۔ وہ اپنی جھونپڑی میں رہتی ہے اسے ٹھیک سے یاد نہیں کہ وہ کب پیدا ہوئی۔ صرف اتنا پتا ہے کہ وہ یہیں پیدا ہوئی۔ جب قافلے پانی کی تلاش میں ایک ٹوبے سے دوسرے ٹوبے کی طرف ہجرت کرتے ہیں تو وہ بھی ان کے ساتھ رہتی ہے۔ ڈھور ڈنگر سراب دیکھ کر اس کی طرف لپکتے ہیں تو وہ انہیں ہانک کر لے جاتی ہے۔ سورج ریت پر اترتا ہے تو اس کا بدن بھی تپنے لگتا ہے اور جب بارش برستی ہے تو اس کے سینے میں ٹھنڈ پڑ جاتی ہے۔

آج کل وہ اپنے باپ اور بھائی کے ساتھ رہتی ہے اور میں سوچتا ہوں اللہ تعالیٰ نے خوب صورت اور اصلی چیزیں تو صحراؤں اور دور دراز جگہوں پر چھپا رکھی ہیں۔ جہاں سے آسمان کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں لگتا ہے جیسے آسمان کے ساتھ والا محلہ ہو۔ اسی لئے تو یہاں رہنے والوں کی زندگی آزمائشوں سے اٹی پڑی ہے۔ پانی صرف ان تالاب نما گڑھوں میں ہوتا ہے جسے وہ ٹوبہ پکارتے ہیں۔ مجھے تو یہ ٹوبے صحرا کے وہ ہاتھ لگتے ہیں جو دعا کی صورت میں پانی کے لئے آسمان کی طرف کھلے رہ گئے ہوں اور یہاں کا ذرہ ذرہ آسمان کے قرب کی گرمی سے جیتا اور سانس لیتا ہے۔

اس کے باپ سے میری ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ اونٹ، گایوں اور بھیڑوں کا ریوڑ ہانکتا شام پڑے گھر لوٹ رہا تھا۔ سارے دن کی تھکن اور خواری نے مجھے نڈھال کر رکھا تھا۔ میں نے اس سے پانی مانگا تو وہ مجھے اپنے ساتھ جھونپڑی میں لے گیا اور بیٹی کو آواز دی "پردیسی کے لئے کھیر لاؤ۔" میں نے چونک کر کہا "بابا کھیر نہیں مجھے پیاس لگی ہے" اس نے چھوٹا سا قہقہہ لگایا جس کی کھنک جنت کے دروازے کھلنے کی چرچراہٹ جیسی تھی اس نے دودھ سے بھرا تانبے کا لمبا گلاس میری طرف بڑھایا اور بولا "پی تو سہی سچری سوئی ہوئی گلے کا کھیر ہے ایک دم پیاس بجھ جائیگی" شفقت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ میں نے گلاس منہ سے لگا لیا مجھے لگا جیسے اس نے دودھ سے بھری مشک کا منہ میرے منہ سے لگا دیا ہو۔ شام گلے سے بچھڑی ہوئی بھیڑ کی طرح صحرا میں بھٹکتی پھر رہی تھی، سارا دن چرنے کے بعد بستی کی طرف لوٹنے والے جانوروں کی گردنوں میں پڑی ہوئی ٹلیوں کی آواز آہستہ آہستہ جھونپڑیوں کے قریب آتی جا رہی تھی۔ سانولی اور سڈول عورتیں گھنگھروں کی پٹاری میں جسموں کے بھید چھپائے ہوئے آنے والوں کے لئے پیج لگانے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ اس نے بھی بہت سی ٹہنیاں لا کر جھونپڑی کے بیچ ڈھیر کر دیں۔ اس کے باپ نے مجھے رات قیام کی دعوت دی تو میں نے جھٹ سے قبول کر لی کیونکہ مجھے علم تھا کہ اس وقت صحرا شام کی آغوش میں سر رکھے سو رہا ہوگا اور راستہ تلاش کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ ایسے میں

چھوٹے بڑے ٹیلے اجنبی لوگوں کے راستے میں پڑ کر سو رہتے ہیں۔ اور شکلوں میں اس حد تک ایک جیسے ہوتے ہیں کہ میلوں کی مسافت کے بعد بھی یہی لگتا ہے جیسے وہیں کے وہیں کھڑے ہیں۔

مچ لگا ہوا تھا اور گرد خلاسیوں پر اس کا باپ اور بھائی باری باری حقہ گڑگڑا رہے تھے یہ خلاسیاں رلیوں جیسی تھیں جنہیں ابھی ابھی میری مہمان نوازی کے طور پر بچھاتے ہوئے اس نے بتایا تھا کہ وہ اس نے خود اونٹ کے بالوں سے بُنی ہیں مچ پر رقص کرتے انگارے ہماری جھولیوں میں گر رہے تھے۔ سرخ روشنی ہمارے چہروں پر دھمال ڈال رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایسی مستی اور گہما گہمی تھی جو خدا کے چہرے پر اس وقت ہوگی جب وہ کائنات تخلیق کر رہا تھا۔ اس کی ناک پر بڑا سا سنہری لیو یا پوری تاریکیوں کے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ اس کا باپ کوئی کہانی سنا رہا تھا جیسے صرف میرا جسم سن رہا تھا اس لئے مجھے کچھ معلوم نہیں کہ وہ کہانی کہاں سے شروع ہوئی اور کیسے آگے بڑھی۔ میں تو کسی اور کہانی کے چکر میں تھا جسے اللہ نے کہنا شروع کیا اور اس تک آ کر چپ ہو گیا۔ اب چاروں طرف چپ تھی، چیختی، چنگھاڑتی چپ۔ دور شام خیالات کی بھیڑیں ہانکتی ہوئی ٹیلے سے اتر رہی تھی۔ ہلکی ہلکی ٹن ٹن بارش کی بوندوں کی طرح دل کے صحرا پر گر رہی تھی ہاں کبھی کبھی ہزاروں میل سے حقہ گڑگڑانے کی آواز آتی تھی۔ میں نے لحاف سر تک کھینچ لیا۔

صبح جب میری آنکھ کھلی تو وہ چاٹی میں ہاتھ ڈالے مکھن نتھار رہی تھی۔ میری طرف دیکھتے ہی وہ جلدی سے اٹھی اور مکھن کے پیڑے سمیت جانے کیا کیا میرے سامنے رکھ دیا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے اس جھونپڑی میں آئے مجھے ایک دن نہیں ہزاروں سال ہو چکے ہیں۔ اس کے پاؤں میں پڑی چھانجھروں کی آواز ساری جھونپڑی میں پھدکتی پھر رہی تھی۔ اس کا باپ اور بھائی جانوروں کو لے جا چکے تھے لیکن اس نے مجھے بتایا کہ وہ اونٹ اس نے روک لیئے ہیں۔ جن پر وہ مجھے پیر بابا کے مزار پر سلام کرانے لے جائے گی۔ لیکن اس سے پہلے اسے ٹوبے پر سے پانی بھر کر لانا ہوگا۔ میں نے کیمرہ صاف کیا۔ ٹیپ ریکارڈر کی بیٹری چیک کی اور نوٹ بک پر نئی تاریخ لکھ کر اس کے ساتھ ٹوبے کی طرف چلنے لگا۔ جب وہ پانی بھر رہی تھی تو میں نے اس کی تصویر لینے کے لئے کیمرے کا رخ اس کی طرف کر کے اسے فوکس کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے یوں لگا جیسے کیمرے کا تیز اس کی شبیہ کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ عورتیں قطار اندر قطار سر پہ گھڑے اٹھائے گنگھرے لہراتی ٹوبے کی طرف آ رہی تھیں میں انہیں کیمرے کی آنکھ پر ٹرل رہا تھا کہ اتنے میں اس نے گیلا ہاتھ میرے چہرے پر چھڑکا۔ میرے اندر کمینی اور گھٹیا سی خود غرض سوچ نے سر اٹھایا کہ میرے کیمرے کو پانی کے قطروں سے نقصان پہنچے گا۔ لیکن میں نے بہت جلد اس پر قابو پا لیا اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ساری عورتیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے تک رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں مجھے بری طرح چبھ رہی تھیں وہ تو ایسے تھی جیسے اسے میرے علاوہ کوئی دکھ ہی نہ رہا ہو۔

جب اس نے اونٹ پر بیٹھنے کے لئے کہا تو مجھے ہچکچاہٹ سی محسوس ہوئی میں نے اس سے کہا "سنا ہے اونٹ بڑا کینہ پرور ہوتا ہے۔" اس نے پاکوڑا کستے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں یہ ٹھیک ہے لیکن کبھی نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی سواری کی تھی"۔

اونٹ ریت کے سینے پر قدم رکھتے چلے جا رہے تھے۔ اس کی ڈاچی آگے آگے تھی اور اس نے میرے اونٹ کی رسی تھام رکھی تھی۔ اونٹ پر بیٹھ کر میں ایک نئی دنیا میں آگیا تھا۔ مجھ پر صوفیوں کے قول نازل ہونے لگے۔

بس ملا مارتہ ملا بولڑیاں

اساں ازلوں ستھرے شاہی ہو

مسجد، مندر، وید کتاباں

اسی اپنے آپ تے اترے ہو

اونٹ کی رفتار میرے گرد لپٹ رہی تھی اور میری ہنسی گیلے کپڑے کی طرح نچڑ رہی تھی اور میرا وجود بری طرح کھو رہا تھا مجھے ڈر تھا کہ تھوڑی دیر میں جب وہ پیچھے پلٹ کر دیکھے گی تو اونٹ خالی ہوگا اور میرا وجود پوری طرح کھو کر ریت میں مل چکا ہوگا۔ لیکن اس نے آواز دے کر مجھے بچا لیا۔ "وہ دیکھو ہرن" میں نے دیکھا ہرن چوکڑیاں بھرتا ہوا آنکھوں کی گرفت سے نکل گیا۔ اس سے پہلے میں نے ہرن چڑیا گھر میں دیکھا تھا۔ لیکن اس ہرن کو دیکھ کر مجھے عجیب سا لگ رہا تھا۔ معاً میرے جسم کی لرزتی ہوئی عمارت میں اس کی آواز گونجی "تم نے خواجہ فرید کا ٹوبہ دیکھا ہے"۔ میرے اندر کچھ ہوا۔ "خواجہ فرید۔ وہ ———— ہو"

میڈا عشق وی توں میڈا یار وی توں

میڈا کعبہ قبلہ مسجد منبر

مصحف تے قرآن وی توں

وہ بولی ————

میڈے خوشیاں دا اسباب وی توں

میڈے سولاں دا سامان وی توں

میڈا ملک میر تے مارو تھلڑا

روہی چولستان وی توں۔

اور پھر ہم چپ ہو گئے۔ لمبی اور گہری چپ۔ اس نے جیب کے والیٹ سے نکل کر کہا: "پتہ ہے خواجہ فرید نے مائی جنت کی ڈاچیاں چرائی تھیں" وہ بولتی جا رہی تھی اور میں بے بسی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "مائی جنت وہ سامنے ادھر والے ٹوبہ پر رہتی تھی" اونٹ بھی ہم دونوں کی باتوں میں کھوئے مسلسل اور پنی تلی چال چلتے ڈھلک ڈھلک کر آگے بڑھ رہے تھے ریت پر ان کے قدموں کے نشان پہلے سے موجود نشانات میں گڈمڈ ہو رہے تھے دائیں طرف ایک سرخ رنگ کا جھنڈا ریت میں سے ابھر رہا تھا میں نے اس سے پوچھا "یہ کیا ہے؟"

بولی "یہی تو پیر بابا کا مزار ہے" میں نے اس کی طرف دیکھ کر سوچا یہاں تو ریت کا ہر ذرہ پیر بابا کا مزار ہے، حتیٰ کہ تو بھی۔ پھر عجلت سے اپنی سوچ کو دباتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا "پیر بابا کا عرس کب ہوتا ہے!"

"جیٹھ کی پانچ اور چھ کو ساری روہی کے لوگ اکٹھے ہوتے ہیں"

"بابا صاحب یہیں کے تھے یا باہر سے آئے تھے؟"

یہ تو آج تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکا۔ اللہ کے بندے کسی ایک علاقے کے نہیں ہوتے۔ تم یہاں سلام کرو تمہاری سب مرادیں پوری ہو جائیں گی" وہ بے تکان بولتی جا رہی تھی۔ اس کی آواز کا ایک سرا میرے گلے سے اور دوسرا مزار کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ بڑھتا جا رہا تھا اور کوئی مزار والا سرا پکڑ کر آہستہ آہستہ اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ میں نے اس سے پیر بابا کے بارے میں کئی سوالات کئے لیکن وہ سرشاری میں بری طرح بھیگی ہوئی تھی۔ ہر سوال اس کی آنکھوں میں ڈوب کر اپنی حیثیت کھو رہا تھا۔ ہمارے درمیان ایک بار پھر گہری خاموشی چھا گئی مجھے اپنا وجود اس خالی کشتی کی طرح محسوس ہوا جسے انجانی سوچ تلندر اور سرشاری کی ہوا یا دبانوں سے ڈھکیلتی ہوئی نامعلوم سمت کو بہائے لئے جا رہی ہو۔ یہ سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب ہم واپس آ رہے تھے اور جھونپڑیوں سے کچھ ہی دور ایک خوب صورت پرندہ پھڑ پھڑا کر ہمارے قریب سے اڑا۔ "بہت خوب صورت پرندہ ہے" میں نے بے اختیار کہا۔

"تلور ہے یہاں اس سے بھی خوب صورت پرندے ہیں کشمیرا، بلبیرا مگر........"

"مگر کیا؟"

اس نے حقارت اور افسوس بھرے لہجے میں کہا: "ان کی قیمت لگی ہوئی ہے یہ سب پرندے بکے ہوئے ہیں بہت سے غیر ملکی انہیں شکار کرنے یہاں آتے ہیں۔ جب ان کے باز ان پرندوں پر جھپٹتے ہیں تو میرا دل لرزنے لگتا ہے میں اپنی آنکھیں بھینچ لیتی ہوں تمہارے سامنے ایسا ہو تو تم بھی گھبرا کر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لو" اس کے چہرے کی کیفیت مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی تھی پھر بھی جانے کیوں میرے منہ سے نکل گیا "اور علورس!"

"لعنت ہے۔"

"مگر میں نے بہت سی کہانیاں سنی ہیں۔"

"سنی ہوں گی جب بابا ناڑھ میں سے شہر گیا تھا تو اس نے بتایا تھا کہ کوئی اونچانیاں ٹلوں والیاں"

میں ٹکٹکی باندھ کر اسے تک رہا تھا میری سوچ کے اندر پاؤں بھول رہے تھے زبان تو ایسے تھی جیسے میں نے ابھی بولنا سیکھا ہی نہیں۔

"دھیان سے اونٹ بیٹھنے لگا ہے" آواز پر میں نے چونک کر دیکھا اونٹ جھونپڑی کے قریب کھڑا تھا اور وہ اس کی نکیل نیچے کی طرف کھینچ کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کر رہی تھی دن ابھی ابھی نہاتی ہوئی جوان عورت کی طرح تازہ اور نکھرا نکھرا سا تھا۔ میں نے اپنی مرضی کے خلاف جانے کی اجازت چاہی اور اس سے کہا کہ اپنے باپ اور بھائی کا میری طرف سے شکریہ ادا کر دے پہلے تو وہ کچھ نہیں بولی پر تھا آنکھیں گھما کر میری طرف تکتی رہی جیسے اس کی آنکھ میں ریت کا کوئی ذرہ رڑک رہا تھا پھر بولی "جاؤ تم سرکاری نوکر ہو۔ کتنا اچھا ہوتا کہ تم اپنی بھیڑیں چراتے اور اللہ کے قریب رہتے کیا یہ سب تمہیں اچھا نہیں لگتا؟"

"کیوں نہیں" میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"سرکار کی نوکری کب سے کر رہے ہو؟"

"کچھ یاد نہیں، میں پیدا ہوا تو میرا باپ سرکار کا نوکر تھا، میری ماں نے مجھے بتایا کہ میرا دادا بھی سرکار کا نوکر تھا۔"

باتیں کرتے کرتے ہم بہت آگے نکل آئے اس نے میرا بیگ کندھے پر لٹکا رکھا تھا لیکن اس کا پورا بوجھ میرے کاندھے پر تھا وہ بڑے اطمینان سے قدم سے قدم ملا کر چل رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے وہ یونہی باتیں کرتے کرتے میرے ساتھ چل جائے گی اتنے میں اذان کی آواز آئی، میں نے اس سے کہا "مجھے مسجد کہیں نظر نہیں آئی" اس نے پلٹ کر آواز کی سیدھ میں اشارہ کیا۔

"تم نماز پڑھتی ہو؟" میں نے اسے سر سے پیر تک دیکھا۔ وہ تو خود ایک عبادت گاہ تھی۔ جس میں میں نے عبادت کرنے کی نیت کی تھی ——

بھیڑوں کے ننھے منے بچے ایک دوسرے سے جسم رگڑتے، اچھلتے، کودتے ہمارے قریب سے گزر گئے۔ اونٹ گاڑیوں، بھیڑوں اور رانٹوں کے قدموں کے نشان ریت میں گم ہوئی کہانیوں کے کردار سے ہوئے تھے ان میں

ہمارے قدموں کے نشان بھی شامل ہو رہے تھے۔ کچھ پرندے جھاڑیوں سے نمودار ہوئے اور تھوڑی دیر تک ریت کے ساتھ ساتھ اڑنے کے بعد فضا میں بلند ہو گئے۔ میں نے دیکھا وہ ان میں سے ایک تھی جو جانے کب سے اپنے آپ کو اپنے پیروں سے باندھ کر اڑ رہی تھی۔ پھر ایک دھماکہ ہوا جیسے کوئی پرندہ گولی کھا کر پھڑپھڑاتا ہوا لہو بکھیرتا گرا ہو۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ ساکت کھڑی تھی۔

"کیا ہوا رک کیوں گئی؟"

"میں یہاں سے آگے نہیں جا سکتی"

"کیوں؟"

"دیکھتے نہیں یہاں ریت ختم ہو گئی ہے۔" میں نے اس کے پیروں کی طرف دیکھا جو ریت میں چھپے ہوئے تھے اور ریت انہیں پیچھے کی طرف دھکیل رہی تھی۔ وہ بولی "میں ریت سے نکل جاؤں تو لگتا ہے اپنے آپ سے نکل گئی ہوں دم گھٹنے لگتا ہے محسوس ہوتا ہے جیسے ..... " اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے بیگ کو درست کر کے کندھے پر جمایا۔ آنکھوں آنکھوں میں ہم نے ڈھیروں باتیں کیں جو زبان کی گرفت میں آنی ناممکن تھیں۔ وہ کھڑی رہی اور میں چل پڑا مجھ میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ مڑ کر دیکھوں۔ لیکن ابھی کوئی بیس تیس قدم گیا ہوں گا کہ اس کی آواز سنائی دی "تم ایک چیز بھول گئے ہو۔" میں نے پلٹ کر دیکھا وہ ریت پر چمکتی ہوئی چیز کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ "او میری گھڑی"۔ میں کلائی پر نگاہ ڈال کر بڑبڑایا اور اس کی طرف بڑھنے لگا۔ گھڑی لے کر میں اپنے آپ کو سنبھالتا اور لڑکھڑاتے قدموں کو سہارا دیتا پھر چل پڑا۔ لیکن بیس تیس قدم ہی چلا ہوں گا کہ اس نے مجھے پھر پکارا۔ میں نے سوچا یقیناً کوئی قلم یا ٹیپ رہ گئی ہوگی۔ تیز تیز قدم اٹھاتا میں پھر واپس آیا تو وہ بولی "خود تلاش کر لو، تم بہت بھلکڑ ہو۔" میں ارد گرد ریت پر ڈھونڈنے لگا اور کچھ دیر بعد تنگ آ کر اس کی طرف پلٹتے ہوئے بولا۔ "بتاتی کیوں نہیں کیا رہ گیا ہے؟"

مگر وہ تو ریت کا ڈھیر بن چکی تھی عام چھوٹے بڑے ڈھیروں کی طرح، جو آسمان کے اس سرے سے تک پھیلے ہوئے تھے اور ریت کی روح کے سانسوں کی آواز میرے گرد منڈلا رہی تھی۔

جلتی بُجھتی رات

احمد جاوید

پاؤں میں چکر تھا ـــــ سو رات دن کی خبر نہ تھی۔ خبر تب ہوئی جب زندگی میں ایک رات ایسی بھی آئی جو آئی اور ٹھہر گئی ـــــ میں زانوؤں میں سر دیئے سوتا تھا، سویا رہا ـــــ حالتِ خواب مجھ پہ طاری تھی، طاری رہی ـــــ بہت ہاتھ پاؤں مارے، بڑا سر پٹخا ـــــ مگر میں اندھیرے کا اسیر گویا ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، پاؤں میں بیڑیاں پہنے بیٹھا رہا۔

حالتِ خواب تو حالتِ جبر ہے ـــــ کہ اس حالتِ جبر سے کوئی ہاتھ بڑھا کے نکالے تو نکالے، خود میں اتنی سکت کہاں ـــــ

تو میں حالتِ جبر میں تھا اور کچھ بھی میرے اختیار میں نہ تھا ـــــ میں سدھ بدھ بسرا گیا ـــــ سب بھول بھال گیا ـــــ کہ کون ہوں، کہاں ہوں ـــــ کہ اچانک کہیں سے ایک روشنی کی کرن آئی تو انکشاف ہوا کہ میں ایک غریب الدیار ـــــ شہر میں ایسا اجنبی ہوا اپنے حال، ماضی اور مستقبل سے ناآشنا ـــــ مگر پاؤں کی تھکن کہتی کہ کوئی سفر تو تھا جسے طے کر کے یہاں پہنچا ـــــ تو وہ مسافتیں کیا مسافتیں تھیں ـــــ وہ راستے کیا راستے تھے ـــــ وہ منزلیں کہاں ہیں اور میں کہاں ہوں، وہی کہ جو سفر کا باعث تھیں ـــــ میں ملگجے اندھیرے سے پوچھتا ہوں ـــــ میں کون ہوں ـــــ میں کہاں ہوں ـــــ تو آوازوں کی چنگاریاں اڑتی ہیں، جھلملاتی ہیں اور راکھ بن بن کے بکھرتی چلی جاتی ہیں ـــــ کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

میں اپنے ہونے کا ثبوت مانگتا ہوں مگر روشنی کی وہ ایک کرن کہ جو تھی ـــــ وہ بھی کہیں روپوش ہوتی ہے ـــــ کہیں لوٹ جاتی ہے۔ اب چاروں طرف اندھیرا ہے اور آوازوں کی چنگاریاں ـــــ

تو میں اٹھتا ہوں ـــــ اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارتا ہوں ـــــ مگر خود ہی سے ٹکراتا پھرتا ہوں۔ جب تھک ہار کے بیٹھ جاتا ہوں تو اچانک روشنی پھر ہوتی ہے۔

روشنی بھر ہوتی ہے مگر کرنیں ایسی چکا چوند بھرتی ہیں کہ آنکھوں کی پتلیاں لرزتی ہیں اور کچھ بھی دیکھنے سے ڈرتی ہیں ـــــ میں آنکھوں پر ہاتھ دھرتا ہوں ـــــ جب خود کو دیکھنے کے قابل پاتا ہوں تو ہاتھ اٹھاتا ہوں مگر اس وقت تک آوازیں اپنی صورتیں سمیٹ کر کہیں گوشہ گیر ہو چکی ہوتی ہیں ـــــ میں خود کو جب ایک بار پھر تنہا پاتا ہوں تو پھر سے اپنے قدم اٹھاتا ہوں اور آواز لگاتا جاتا ہوں "میں کہاں ہوں ـــــ میں کن کے درمیان ہوں ـــــ" کہ اتنے میں کوئی مجھ سے آٹکراتا ہے۔ پہلے تو مجھے گراتا ہے پھر خود گرے ہوئے کو اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھاتا ہے مگر میرے زخم نہیں گنتا اور اپنے زخم دکھاتا چلا جاتا ہے۔ میں اس کے زخموں پر ہاتھ دھرتا ہوں اور اپنے دُکھتے بدن پہ سسکاری بھرتا ہوں۔ جب وہ خطاب نہیں کرتا تو میں آغاز کرتا ہوں۔

"اجنبی! سنو میں اجنبی ہوں ـــــ"

وہ لب کھولتا ہے ـــــ "کون اجنبی نہیں ہے۔"

"میرا مطلب ہے میں اس شہر سے آشنا نہیں مجھے کوئی راستہ دکھاؤ۔"

"میں اس شہر سے آشنا ہوں مگر راستہ نہیں دکھا سکتا کہ دیکھنے کا تعلق تو روشنی سے ہے' وہ کہاں سے لاؤں ـــــ"

ہاں وہ روشنی کہاں سے لاتا کہ وہ تو ایک بار پھر ہماری دسترس سے باہر تھی اور ہر طرف اندھیرا تھا ـــــ میں اُس سے کہتا ہوں۔ "جو جانتے ہو ـــــ وہ تو کہو۔"

وہ جواب دیتا ہے۔ "جو جانتا ہوں ـــ وہی تو نہیں کہہ سکتا۔"

"تو پھر یہاں سے آشنائی کا دعویٰ کیوں کرتے ہو۔"

وہ اپنی دُکھتی رگ سے میرا ہاتھ ہٹاتا ہے اور چڑ کر کہتا ہے ـــــ "کوئی شک نہیں میرے دعوے میں کہ میں آشنا ہوں اس شہر کی ایک ایک گلی' ایک ایک کونے سے ـــــ سنا تھا بھی دیکھا ہے' آوازیں بھی سُنی ہیں ـــــ وہ دیکھا ہے کہ دیکھے کا یقین نہیں ـــــ ڈرتا ہوں کہ تم سنو گے تو کیا یقین کرو گے ـــــ عزیز! اس کی گلیوں سے گزرو گے تو پل پل ٹھوکر کھاؤ گے اور ہر پل ٹکراؤ گے۔ ایسا سناٹا کہ خود اپنے قدموں کی چاپ سُنتا ہوں اور ہول کھاتا ہوں ـــــ ایسا شور......"

"ہاں میں نے سُنا ہے وہ شور ـــــ ایسا شور......؟"

رمت کاٹو میری بات اور اب غور سے سنو ـــــ کہ تم نے بہت سُنا ہوگا اور میں نے بہت دیکھا ہے اندھوں کو دیکھا کہ ٹھوکر نہیں کھاتے ـــــ بہروں کو دیکھا کہ سب سنتے ہیں اور سر دھنتے ہیں ـــــ گونگے بھی دیکھے کہ لب نہیں کھولتے مگر بولتے ہیں ـــــ اور ایسے ایسے جفادری کہ قتل ہو جاتے ہیں مگر مرتے نہیں ـــــ دیکھنے اور سننے کا فرق جانو تو آگے کچھ کہوں۔"

ہوں اس پہلے روز کا قصہ جب سورج کی پہلی کرن کے ساتھ اچانک مجھ پر منکشف ہوتا ہے جیسا کہ تم پر آج ہوا ـــــ کہ میں کوئی ایسا اجنبی ہوں کہ جسے یہاں کوئی نہیں جانتا ـــــ کوئی نہیں جانتا مجھے اور میرے جاننے والوں کو کہ میں ان سب میں الگ، سب سے جدا ہوں۔ سوچتا ہوں کون ایسی جگہ ہے جہاں کا کہ میں باسی ہوں اور کون ایسی مسافتیں ہیں کہ جنہیں طے کرکے یہاں تک پہنچا ہوں جیسا کہ تم بھی کہتے ہو ـــــ نہ کسی کی آنکھوں میں شناسائی کی جھلک ہی پائی، نہ چہروں کے خدوخال ہی پہچانے گئے ـــ میں بلند آواز میں پوچھتا ہوں۔ "کیا کوئی مجھے جانتا ہے"۔ صدا آتی ہے "نہیں نہیں ہم تجھے نہیں جانتے ـــــ" پھر ان آوازوں سے فضا بھرتی چلی جاتی ہے ـــــ میں بھی صدا لگاتا جاتا ہوں اور ٹھوکریں کھاتا جاتا ہوں ـ

سو صدا لگانے اور ٹھوکریں کھانے کی داستان تو طولانی ہے ـــــ مگر سنو صرف اُس وقت ـــ جو شاید تم پر اس شہر کے اسرار کھول سکے ۔

تو ہم سفر میں تھے کہ وہ رات عجب انداز میں ہمارے سروں پر مسلط ہوئی ۔ ہمیں سحر کا کھوج لگانا تھا کہ رات پل پل ڈھلتی تھی ـــــ مگر آسمان بدستور تاریکی میں ڈوبا تھا۔ روشنی کہیں نام کو نہ تھی۔ عرصہ گزرا۔ بارے کہیں آسمان پہ کرنیں ہویدا ہوئیں تو گمان ہوا کہ سپیدۂ سحر ہوا۔ مگر پھر کھلا کہ یہ تو محض وہم ہے اور جب انتظار نے طول کھینچا تو وہم پھیلنے لگا اور گمان سمٹتا گیا تو تب لوگوں نے لمبی تان کر سونے میں عافیت جانی اور سر نیہوڑا کر گھروں کو چلے ـــــ تو میں گھر کی سمت رواں تھا کہ اندھیرے میں اچانک ہلچل مچی اور کرنوں کی پھڑپھڑاہٹ چمکی تو میں نے چونک کر آسمان کو دیکھا کہ اچانک مجھ پہ حیرت کا پہاڑ ٹوٹا اور میں نے سر تھام لیا کہ سورج تو میرے سر پہ کھڑا تھا ـــ یہ سفر کیسا تھا جو وہ آسمان کے وسط تک اندھیرے میں طے کر آیا تھا۔ میں نے پلٹنا چاہا مگر وہ جو سوا نیزے پر تھا جسم جھلساتا تھا اور آگ لگاتا تھا ـــــ سو گھر کی طرف میں نے قدم تیز کئے کہ اگر میسر ہو تو گھروں کا سایہ بڑا غنیمت ہے۔

مگر اُس وقت ـــــ عین اُس وقت جب گھر کی دہلیز قدم چھُونے کو مچلتی دکھائی پڑتی تھی ـــــ کچھ ایسا ہوا کہ سوُرج کھڑے کھڑے کھلا گیا ـــــ اور ہر سُو اندھیرا چھا گیا ـــــ اب میں تھا اور اندھیرے کا سمندر۔ میں نے سوچا یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ کبھی یوُں بھی ہوا کہ شام سے پہلے ہی کہیں آسمان کے بیچوں بیچ دوپہر کا عالم رات کے پچھلے پہر کی صورت دھار لے، جیسا کہ تم بھی سوچتے ہو ـــــ تو میں اندھیرے میں تھا، مجھے کچھ سجھائی نہ دیتا تھا ـــــ میں ٹٹولتا ہوا آگے بڑھنے لگا مگر صحیح سمت کا اندازہ نہ کر سکا اور بھٹکنے لگا کہ اتنے میں سوُرج پھر چمکنے لگا ـــــ اور میں نے خود کو اپنے گھر سے پرے کسی اور دروازے پر کھڑے دیکھا۔ حیران ہوا اور واپسی کا قصد کیا کہ سوُرج پھر بجھا ـــــ میں اندھوں کی طرح چلنے لگا ـــــ چلتا رہا ـــــ اور سورج جلتا رہا بجھتا رہا ـــــ تو اب یہی آنکھ مچولی تھی کہ اپنا دروازہ دیکھتا ہوں اور آگے بڑھتا ہوں کہ اچانک تاریکی چھا جاتی ہے ـــــ ٹٹول کر رستک دیتا ہوں ـــــ روشنی ہوتی ہے ـــــ کسی اور کے دروازے پہ کھڑا ہوتا ہوں۔ کسی اور چہرے پہ نظر پڑتی ہے ـــــ پلٹ کر آتا ہوں پھر تاریکی میں ڈوب جاتا ہوں ـــــ اور یوُں آنے جانے میں تم جانو میں کتنا وقت گنواتا ہوں اور ہر دروازہ بند پاتا ہوں سو کھلتا ہے کہ میں شہر کی ایسی گلیوں میں گم ہوں جہاں مجھے کوئی نہیں جانتا ـــــ اور جس کسی سے کہتا ہوں میں تجھے جانتا ہوں، وہ میری بات پہ ہنستا ہے، نہیں مانتا۔

سو یوں تھا کہ جس کا ہاتھ اندھیرے میں کسی سے چھوٹا، اجالے میں کسی اور کے ہاتھ میں تھا۔ تو میں کسی ہاتھ کو ٹٹولتا تھا جو مجھے تھامے ـــــ مگر اجنبی گلیوں میں ہاتھ کو ہاتھ ہی تو سجھائی نہیں دیتا تھا۔ جب گھر کا راستہ گم ہوا تو نفسا نفسی کے اس عالم میں میں نے صدائیں لگائیں اور ٹھوکریں کھائیں کہ ہر لب پہ بس ایک ہی جواب دھرا تھا۔ "نہیں ہم تجھے نہیں جانتے۔" سو میں پشیمان ہوا اور پریشان ہوا۔ اب میری التجا یہ تھی کہ کوئی ہے جو ازراہِ ہمدردی ہی سہی مجھے اپنے ساتھ لیتا چلے ـــــ مگر میری یہ بات اس صبح کے مانند تھی کہ جو ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے ـــــ سو کون ایسا تھا جو آگے بڑھتا۔ نہیں کوئی نہیں تھا۔

ہاں تو جب کوئی اپنے پیچھے نہ آنے دے تو خود اپنے پیچھے آنا پڑتا ہے۔ سو میں نے سورج کی طرف سے منہ پھیرا اور اپنے پیچھے چلا کہ اب میرا سایہ ہی میرے آگے تھا۔ مگر اُس شہر میں جہاں سورج پل پل جلتا، پل پل بجھتا تھا۔ اندھیرے نے مجھ سے میرا سایہ بھی جُدا کیا، مجھے تنہا کیا۔

تو اب کوئی راستہ نہ تھا کہ میں ایک بار پھر اندھیرے میں بیٹھا روتا تھا اور خود سے کہتا تھا کہ یہاں نہ ملا کوئی بھی ایسا کہ جو بن مول ہی خریدتا ـــــ نہ چڑھاتا اپنے کندھوں پہ مجھے، میرے ہی کندھوں پہ اپنا بوجھ لادتا ـــــ نہ ملا کوئی نہ ملا ـــــ یہ کہا اور حیران ہوا کہ بارے میری یہ بات سنی گئی ـــ جی ہاں سُنی گئی کہ نجانے اس میں کیا مصلحت تھی کہ ایک بھلے بھانس نے میری اس بات پہ خوشی و مسرت کا اظہار کیا ـــــ سنتے ہو خوشی و مسرت کا اظہار کیا اور مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا ـــــ اپنا بوجھ میرے کاندھوں پہ لاد دیا اور کہا کہ چلے آؤ میرے پیچھے پیچھے کہ ابھی سے تم کام پر ہو اور تمہارا کام یہ ہے کہ تم فقط میرے سائے پہ نظر رکھو کہ کہیں وہ مجھ سے آگے نہ نکل جائے ـــــ تو مجھے حیرت ہوئی اور میں نے اس سے کہا "بھلے بھانس! سُورج کی طرف چلوگے تو سایہ تمہارے پیچھے رہے گا، جو رُخ پھیروگے تو وہ آگے نکل جائے گا، اتنا دھیان تو تمہیں بھی ہوگا ـــــ" "تمہارا کام میری باتوں کو سُننا اور عمل کرنا ہے۔" اُس کا جواب تھا۔ "دخل دینا نہیں ـــــ" سو کچھ بھی دخل نہ تھا مجھے سیاہ و سفید میں ـــــ اور میں نے ویسا ہی عمل کرنے کی ٹھانی کہ جیسا اُس نے مجھ سے کہا۔ اور جب روشنی ہوئی تو ہم نے اپنا اپنا کام شروع کیا مگر جاری نہ رکھ سکے کہ سُورج ایک بار پھر ڈھلے بغیر بجھ گیا اور ہم اندھیرے میں گھر گئے مگر چلتے رہے کہ وہ عجلت میں تھا ـــــ ہم عجلت میں تھے مگر وقت کو کوئی عجلت نہ تھی، وہ اپنی رفتار سے چلا ـــــ سو سورج ایک بار پھر جلا تو منکشف ہوا کہ جس شخص نے مجھے بن مول لیا تھا میں اُس کی بجائے کسی اور کے پیچھے چلا جا رہا تھا۔

وسُن بھی رہے ہو یا نہیں :

(میں نے اثبات میں اس کا ہاتھ اور مضبوطی سے تھاما)

ہاں تو پھر ایسا ہوتا رہا کہ روشنی جب جب جلتی، جب جب بجھتی، میرے آگے والے بھی بدلتے کسی اور شکل میں ڈھلتے ـــــ سو میں ہر بار ایک نئی سمت رواں تھا کہ میری تو پہلے ہی کوئی سمت نہ تھی مگر میرے آگے چلنے والوں کا بھی کوئی آگا نہ تھا، پیچھا نہ تھا ـــــ یوں لگتا جیسے کوئی ایک ہی شخص ہر بار صورت بدل کے آتا ہے اور ایک نئی سمت لے جاتا ہے اور ہر بار ایک نئی داستان سناتا ہے ـــــ سب کو آشنائی کا دعویٰ ـــــ مگر سب اجنبی ـــــ کسی کا کوئی گھر نہیں دروازہ نہیں، منزل نہیں، راستہ نہیں ـــــ سو سب اجنبی تھے۔

تو اجنبی! میں بہت دن سے اجنبیوں کے درمیان ہوں ــــ کہ یہ میرا مقسوم تھا جیسا کہ اب تمہارا بھی ہے۔ مجھے دوسروں کے پیچھے چلنا تھا، چلتا رہا کہ اب تم میرے پیچھے چلتے ہو ــــ میرا اپنا کوئی گھر نہ تھا، راستہ نہ تھا ــــ سو مجھے منزلوں سے واسطہ نہ تھا ــــ کبھی ایک کا ہاتھ تھاما، کبھی دوسرے کا ــــ دل ہر چند پشیمانی سے ہاتھ ملتا رہا۔

وہ چپ ہوا اور آہ بھری تو میں نے یاد دلایا۔

"مگر تمہیں دعویٰ ہے یہاں سے آشنائی کا ــــ مجھے راستہ دکھاؤ۔"

"وہ تو ہے مگر راستہ نہیں دکھا سکتا کہ راستے کا تعلق تو روشنی سے ہے، وہ کہاں سے لاؤں۔ کہ کسی نے ہمارے گرد دیواروں کا حصار کھینچ رکھا ہے اور اوپر بہت اوپر چھت تان دی ہے۔ کہیں درمیان میں اس چھت کے اندر ایک روزن ہے جس کے کواڑ ہواؤں سے کھلتے ہیں۔ جب کھلتے ہیں روشنی ہوتی ہے، جب نہیں کھلتے اندھیرا رہتا ہے ــــ وہی روزن، بس وہی روزن تو روشنی کا ذریعہ ہے، باہر کا راستہ ہے ــــ جو ہماری پہنچ سے باہر ہے....."

"سب پہنچ میں ہیں کیا زمین، کیا آسمان ــــ" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

تو وہ ہنسا۔ "ہم حالتِ جبر میں ہیں اور ہمارے اختیار میں کچھ بھی نہیں۔"

مجھے طیش نے بے حال کیا تو اٹھا۔ آسمان کی طرف دیکھا اور اس روزن تک پہنچنے اور باہر نکلنے کی سعی کرنے لگا ــــ بہت دیر اس کوشش میں صرف ہوئی۔ پھر جیسے کسی نے خود ہی میری ہتھکڑیاں کاٹ دیں ــــ بیڑیاں اتار دیں ــــ تو حالتِ جبر سے چھٹکارا ملا خواب سے نجات ہوئی تو میں نے دیکھا کہ اوپر چھت نہیں، روزن نہیں ــــ آسمان ہے اور بادل، وقفے وقفے سے بجلی چمکتی ہے، کہیں گرتی ہے، کسی کو راکھ کرتی ہے ــــ میں شہر کی گلیوں میں آوارہ گھومتے گھومتے کسی گھر کی دہلیز کے آگے پاؤں پسارے سوتا ہوں۔

حیران ہوتا ہوں ــــ پھر دھیان آتا ہے، گرج چمک نے میری آنکھ کھولی ــــ میں اٹھتا ہوں۔ اس کی لالٹین اٹھاتا ہوں اور گری ہوئی لاٹھی سنبھال ہنکارے بھرنے لگتا ہوں ــــ جاگتے رہو ــــ جاگتے رہو ــــ مگر وہ نہیں جاگتا ــــ وہ کہ جس کی یہ لاٹھی اور لالٹین ہے۔

گمشدہ مسافروں کی گاڑی

احمد داؤدؔ

گاڑی کسی وقت بھی اسٹیشن پر پہنچ سکتی ہے۔ تب مسافروں کا ہجوم منتظر لوگوں کی آنکھوں کو تسکین بخشے گا۔

منتظر آنکھیں سلاخوں سے باہر پھیلی بے ترتیب چھتوں کو ٹٹولتی ہیں۔ اندھیری رات میں دود ھیا دھواں تیز سیٹی اور کتوں کی پکار آنے والے مسافروں کا ہراول دستہ ہے

منتظر آنکھیں، سلاخوں کی قیدی ہیں اور کھلی کھڑکی سے آتی ہوا انہیں سلاتی ہے۔ امید بندھاتی ہے گلیاں سنسان، چوروں سے بے نیاز کہ چور زمانے بیتے قرونِ وسطیٰ کے اندھیرے میں تحلیل ہو گئے ہیں۔ اب چوروں کا دور نہیں کہ گھر خالی ہیں دلوں کی طرح۔ اجاڑ مکانس اور لفظوں کی تاثیر سے بے نیاز کتابوں کی طرح ـــــ صرف انتظار کرتی آنکھیں ہیں جو اسٹیشن پہ آنے والی گاڑی کی راہ میں پھیلی ہیں۔

وہ آنے والے مسافروں کا منتظر ہے۔

بدوضع بڑے بڑے بکسے اٹھائے پگڑیوں والے، چکنے بالوں میں گرد پھنسائے ڈبوں میں چلم پیتے، نسوار کھاتے مسافر ـــ سوٹ میں ملبوس شہری، خوب صورت بریف کیس اٹھائے کلائی سے بندھی نفیس گھڑی سے وقت دیکھتے بے وقت مسافر، ٹائی کی شکن درست کرتے ہوئے بابو نیند میں مندھی آنکھیں اور تھکے جسم والی عورتیں جگراتے سے چور بچیاں ملاپ اور جدائی کے کردار آنے والے مسافر ہیں، جن کی راہ میں بچہ کھڑکی سے لگا ـــــ، سلاخوں سے پرے دیکھ رہا ہے۔

وہ سب اس کے پراسرار شہر کے باسی ہیں ـــــ!

اسٹیشن کافی دور ہے صرف اس نحیف بتیاں کسی بچھڑے ہوئے انجن کی چھک چھک یا کبھی کبھی سو دا بیچنے والی کی آواز رات سیاہ گلیشیر سے نمودار ہوتی ہے۔ تب منتظر آنکھوں کے سامنے جگنو چمکتے ہیں۔ وہ انہیں

بجڑنے کے لئے ہاتھ بڑھاتا ہے اور آگے سلاخیں ہیں، جن سے باہر اس کی کھلی ہتھیلیوں کے کناروں
ے رات پھسل پھسل جاتی ہے۔ سنسان گلی میں ہوا کا بولتا پھیرا آیا ہے، وہ آنے والے مسافروں سے توجہ
ٹا کر گلی میں جھانکتا ہے، دن بھر بچوں کے قدموں تلے روندھی گلی سسکیاں بھر رہی ہے۔ چاروں طرف
کباڑ بکھرے پڑے نقشے۔ پھٹا ہوا فٹ بال ٹوٹی ٹاکیاں کانچ کی گولیاں بٹوے، پلاسٹک کے ٹوٹے برتن
ور اخبار کے تازہ ضمیمے ہوا کی رسی سے بندھے گلی میں کھڑکھڑاتے ہیں۔ وہ ان کے دائرے میں جھومڑ ڈالتا، ایک
رے سے دوسرے سرے تک جاتا ہے ــــ سلاخوں سے جکڑی آنکھیں۔ ان باغوں کی تلاش میں جب
یہاں اس کا بچپن گذرا ـــــ!

"کھلے میدان اور باغوں کے درخت کہاں گئے؟"

"میدانوں میں پلازہ اور مارکیٹیں بن گئی ہیں۔ اور درخت فرنیچر کے کام . . ؟"

"بکومت صحیح جواب دو؟"

یہ تابکاری اثرات کا کیا دھرا ہے؟"

ہوا میں تابکار پھیل رہا ہے کھلی کھڑکی سے باہر نکلے ہاتھ کی کمزور ڈھلوانوں پر نیٹرون جھول رہا ہے،
سی لمحے بھی دھماکہ ہو سکتا ہے۔ اور مسافروں کو لانے والی گاڑی خالی آئے گی۔

"سنا ہے کہ نیٹرون بم سے آدمی ختم ہو جاتا ہے باقی سب شے سلامت رہتی ہے؟"

"آدمی کے علاوہ باقی شے کیا ہے؟"

"باقی کانچ کی گولیاں بٹوے، ٹوٹی ٹاکیاں، اخباروں کے ایڈیشن؟"

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں بھلا اتنی آسانی سے نیٹرون کیسے استعمال کیا جا سکتا ہے؟"

اچھا ــــ "کوئی اور بات کرو۔"

اور بات تو آنے والے مسافر ہی کریں گے۔ اپنے گاؤں کی باتیں، گندم کی فصل کیسی رہی؟ دھتو لوہار کی
موتی نے کس کا کھیت خراب کیا۔ گاؤں میں کوئی ہیر پیدا ہوئی کہ نہیں۔

"کہتے ہیں کہ جب کبھی کہیں ہیر کا ظہور ہوتا ہے تو ایک وارث شاہ جنم لیتا ہے؟"

"ارے یار ــــــ اب تو ہیر جوانی سے پہلے ہی ریپ کر دی جاتی ہے؟" اور وارث شاہ فلم کے گانے
لکھتا ہے یا ہوٹلوں پہ پکھیاں مار کے چائے بناتا ہے۔

"واقعی"

"ہاں ہاں"

"تیری تو مت ماری گئی ہے کوئی اور بات کر د۔"

"کوئی اور بات تو آنے والے مسافر کریں گے۔"

سوٹ میں ملبوس خوب صورت چمکیلے چمڑے والے بریف کیس اٹھائے نفیس گھڑیوں سے ٹائم دیکھتے بانکے فائلوں کے بوجھ تلے دبے بابو، پروموشن ڈیمورشن کے تیدی پنشن خورے بوڑھے ہوتی بچیوں کے بابل دن بھر کی خبروں سے خوفزدہ مسافر، نیند سے مرندھی آنکھوں والے بچے، اپاتی بھڑتی عورتیں اپنے بچپن، اپنے بڑوں کی باتیں سنائیں گی مگر کب ۔۔۔۔۔ ؟ گاڑی کب آئے گی ؟

سلاخوں سے باہر جھیلی آنکھیں گاڑی کی تیز سیٹی پہ الارہ کھاتیں دھوئیں کے نرم ستونوں سے بغل گیر ہوتیں پٹڑیوں پہ بکھر جاتی ہیں ۔

"ارے یار یہ تو مال گاڑی کی سیٹی ہے چلو واپس۔"

آنکھیں واپس سلاخوں کے اندر کرے میں بیٹھے منتظر بسنتر کی پیشانی تلے دبک جاتی ہیں۔

"ادہر ۔۔۔۔۔ یہ مال گاڑی سارا مال کہاں لے جاتی ہے آج کل تو لوگ کم سفر کرتے ہیں اور مال زیادہ سفر کرتا ہے۔"

بھئی مال باہر بھی تو جاتا ہے تجارت بھی کرتی ہوتی ہے نا دوسرے ملکوں سے۔

"واپس یہ ڈبے خالی آتے ہیں؟"

"نہیں یار ۔۔۔۔۔ سوئیاں اور ٹینک لانے ہیں۔"

"گندم اور کپاہ دے کر؟"

"بالکل ۔۔۔۔۔ یار جمائیاں مت لو یہ سٹیشن ہے، تمہارا گھر نہیں، پولیس والے شبہ میں دھر لیں گے۔"

"یار گاڑی کب آئے گی میں تو بور ہو گیا ہوں۔"

"بس چپ چاپ بیٹھو ۔۔۔۔۔ آجائے گی۔"

سیٹی کی گونج اور اسٹیشن کے بکھرے میلے فرش سے اٹھتی بائوں کی سیلن برانڈر کی بھاپ کے جلو میں اس تک آتی ہے۔ سلاخوں پہ زنگ لگاتی ہے۔ وہ ہاتھ اندر کر کے تھکی آنکھوں کو سہلاتا ہے اور بڑبڑاتا ہے ۔۔۔۔۔

"لوگ" یہ لوگ آہستہ آہستہ دبی زبان میں گفتگو کیوں نہیں کرتے ان کی باتوں کے شور سے آنے والے مسافر تنگ ہوں گے۔

اس نے گہری سانس لے کر اسٹیشن کی طرف گھورا۔

"یار گاڑی کب آئے گی؟"

"تمہارے کسی مہمان نے آنا ہے؟"

"مہمان سے بھی زیادہ۔" ماں اور بھابھی آرہی ہیں۔ مگر تم؟"

"میرے بھی اپنے آرہے ہیں۔ مسافر سارے ہی اپنے ہوتے ہیں، ارے ساڑھے چار بج گئے۔ چلو بابو سے پتہ کرتے ہیں گاڑی کا۔"

سلاخوں کے باہر پھیلی بے ترتیب چھتیں دور پرے اسٹیشن کی بتیاں اور نیچے گلی میں ردی چیزوں کی بکھری ڈھیریاں نالیوں کے کنارے پڑی گندگی اور سحری کا ابھرتا ستارہ آنے والے مسافروں کا ہراول دستہ ہے۔ منڈیوں کے مزدور، ریڑھیوں اور دودھ والوں کی آوازیں اذان کی صدا اور کسی پرندے کی حمد، آنے والے وقت کا آئینہ ہیں۔

"اف اللہ کتنی خاموشی ہے۔"

"گاڑی جانے کے بعد اسٹیشن قبرستان کی طرح خاموش ہو جاتا ہے۔"

"لیکن گاڑی تو ابھی آئی ہی نہیں .... بابو کیا کہتا ہے۔"

"اسے خود پتہ نہیں....... اس کا اپنا بیٹا آرہا ہے۔"

"گاڑی تو کئی گھنٹے لیٹ ہے۔"

"اب تو صبح ہو رہی ہے ــــ انتظار کریں یا چلیں؟"

"انتظار....... میں تو کئی دن سے آرہا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"ہاں"

"میں خود....... کئی دن....... کئی رات ... یا کبھی ہم ...... ؟"

"چپ رہو...... کل پھر آجائیں گے"

سلاخوں سے باہر پھیلی چھتوں پر بے اثر زخمی سحر کی دھیمی سرخی پر پھیلاتی ہے، پرندوں کے واویلے جاگتے شہر کے طشت پر لوگوں کی حرکتوں کا شور، گلیاں آباد ہونے لگتی ہیں۔ اسٹیشن سے آوازوں کا ریوڑ اس کی جانب بڑھتا ہے، اسٹیشن پہ گاڑی کھڑی ہے...... اندر سے سامان پھینکا جا رہا ہے۔ تکیے، حقے، جوتیاں، ڈائجسٹ، بستربند اور پانی کی خالی صراحیاں۔

مگر پانی پینے والے کہاں ہیں؟

'پانی پینے والے کہاں ہیں۔؟'

"یار سنا ہے کہ نیٹرون کے استعمال سے آدمی ختم ہو جاتا ہے، باقی مرنے سلامت

وہ سلاخوں کے خلا سے باہیں نکال کر ہتھیلیاں ملتا ہے۔

منتظر آنکھیں بکھلے بازو اور فریادی ہتھیلیاں مسافروں کی تلاش میں ہیں

موقع کا گواہ

اسلم یوسف

وہ اس موقع کا سب سے اہم گواہ تھا لیکن یہ گواہی اس کے ہونٹوں پر پیاس کی طرح جم کے رہ گئی تھی۔ سارا دن سورج کے ساتھ پگھلنے کے باوجود اسے یہ پتہ نہ چل سکا کہ اس کی تاریخ کس روز ہے۔ کڑوے کسیلے تپتے ہوئے گرم دن کے آخری گھونٹ بھرتے ہوئے وہ ایک بار پھر گزرے ہوئے دن کو چٹکی چٹکی سمیٹنے لگا کہ شاید کسی چٹکی میں الجھی ہوئی تاریخ کی گرہ کھل جائے۔

اس نے چارپائی پہ بے آرامی سے ایک دو کروٹیں بدلیں اور پھر چونک کر اٹھ بیٹھا۔ کچھ سوچ کر وہ چارپائی سے اٹھا اور بے آواز قدموں سے چلتا ہوا دروازے سے باہر نکلا۔ کنوئیں سے لوٹا نکال کر منہ پہ پانی کے چھینٹے مارے اور چادر سے منہ پونچھتا ہوا جانوروں کے طویلے کی طرف چل پڑا۔ رات کا بچا کھچا چارہ اٹھا کر اس نے بیلوں کے آگے ڈالا پھر صحن سے ہو کر اندر والی کوٹھڑی میں گیا اور لالٹین کی نیچی بتی کی روشنی میں دانوں کی بوریاں اٹھا اٹھا کے بیل گاڑی پہ لادنے لگا۔ اس کے بیٹے کی آنکھ کھل گئی اور نیند میں تیرتی ہوئی آواز میں بولا۔

"کیا کر رہا ہے ابا......"

"شہر جا رہا ہوں۔ دانے بیچنے......" لالٹین کی روشنی سے بھی نیچی آواز میں وہ بولا۔

"آدھی رات کو......"

صبح ہونے والی ہے...... وہ دھیرے سے بولا "اور مجھے کئی دوسرے کام بھی نپٹانے ہیں۔" مگر سارے دن میں وہ ایک بھی کام نہ نپٹا سکا۔ بیوی کے لئے چادر خریدی نہ بیٹے کے لئے واسکٹ۔ اپنی ٹوپی یاد رہی نہ بیلوں کے گلے کی مالا۔ گواہی کی تاریخ ان سب سے زیادہ ضروری تھی۔ بیٹے کا مستقبل، بیوی کی ہنسی اور بیلوں کی گھنٹیوں کی ٹن ٹن سب اس مقدمے کے فیصلے کی آس سے بندھے ہوئے تھے جس کی گواہی کا پتھر وہ اٹھائے پھر رہا تھا اور اسے کچھ پتہ نہ چل رہا تھا کہ یہ پتھر کس دن کے شیشے پر پھینکنا ہے۔

وہ اس لحاظ سے خوش قسمت تھا کہ گاؤں بھر میں اس کے جیسی زرخیز زمین کسی اور کے پاس نہ تھی۔ زرخیز زمین اور زرخیز عورت دونوں ہی مقدر سے ملتی ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ کسان کے پاس عورت زرخیز ہو نہ ہو زمین ضرور زرخیز ہونی چاہیئے۔ شاید وہ دعا قبول ہونے کا وقت تھا کہ گاؤں بھر میں اسی کے کھیت سب سے ہریالے رہتے۔ لیکن جب سے اس گواہی کی پھانس اس کے دل میں اٹک گئی تھی سینے کی ساری شادابی ہولے ہولے خشک ہوتی جا رہی تھی۔

گاؤں کی کچی سڑک سے ہو کر جب وہ اینٹوں والی پختہ سڑک پر پہنچا تو سر اٹھا کر اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ صبح ہونے میں دیر تھی اور ہواؤں میں رات کا خمار ابھی باقی تھا۔ لہلہاتی ہوئی کھیتیوں پر پاؤں سمیٹتے ہوئے اندھیرے کی خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ وہ نیند کے پیالے میں بچی کچی شراب کے نشے میں اونگھتا ہوا رات کے دروازے پر صبح کی مدھم دستک سن کر چونکتا بولیوں سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اچانک وہ سر سے پیر تک روشنی میں نہا گیا۔ سامنے سے آتی ہوئی بس کی روشنیاں عین اس کے قریب آ کر روشن ہو گئی تھیں اور بس اس کے اوپر چڑھی چلی آ رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر بیلوں کی باگیں کھینچیں اور ان کا رخ موڑ کے بیل گاڑی کو بچانے کی کوشش کی۔ بس نے سامنے پہنچ کر تیزی سے موڑ کاٹا اور زن زن کرتی ہوئی بالکل پاس سے گزر گئی۔ خوف کے غبار میں آنکھیں جھپکاتے بیل سڑک سے نیچے اتر گئے۔ وہ اب چڑھی ہوئی سانسوں میں ڈولتا اور دل کی بے قاعدہ دھڑکنوں کے ساتھ ڈگمگاتا بیل گاڑی سے نیچے اترا اور ایک درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ کندھے سے صافہ اتار کے اس نے منہ پر پھیرا اور اپنے آپ پر قابو پا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ بیلوں کو تھپتھپاتے ہوئے وہ جاتی ہوئی بس کو دور تک دیکھتا رہا۔ پریشان پرندے درختوں کے اوپر منڈلا کر پھر اپنے گھونسلوں میں بیٹھنے لگے۔ شہر کی بڑی سڑک ابھی دو میل دور تھی اور اب کسی اور بس کے آنے کا خطرہ بھی نہ تھا۔ اس سڑک پر صبح سویرے یہی ایک بس آتی تھی۔ ہلکی ہلکی روشنی پھیل رہی تھی مگر دیہاتوں کے گرد ابھی دھوئیں کا گھیرا باقی تھا۔ اس کا سر بیلوں کی گھنٹیوں کی آواز پر ہولے ہولے جھومنے لگا اور پرندوں کی چہکاریں اس کے سینے میں سانس کے میٹھے میٹھے نغمے گنگنانے لگیں۔ دور ہریالی کی چادر کا کونہ اٹھا کر سورج نے جھانکا۔ اس نے شرارت سے ایک آنکھ بند کی تو کھیت شرمیلی لال گلابی روشنی میں نہا گئے۔

شہر کی بڑی سڑک سے ہو کے وہ کچہری روڈ پر پہنچا اور کچہری کے سامنے سے گزرتے ہوئے اسے اچانک خیال آیا کہ اس کی گواہی کی تاریخ بھی تو اب آنے والی ہے مگر جب اس نے تاریخ یاد کرنے

کی کوشش کی تو ذہن پر غبار سا پھیلنے لگا۔ اس نے حافظے کی سلیٹ پر کئی ہندسے لکھ لکھ کر مٹائے اور مٹا مٹا کے لکھے مگر سارے ہندسے اُسے ایک سے لگے سب دن ایک طرح کے، سب تاریخیں ایک جیسی: نہ کسی تاریخ کی کوئی پہچان اسے یاد آئی نہ کسی دن کی اپنی شکل۔ کچہری روڈ پر چلتے چلتے وہ لاری اڈے جیسا موڑ پیچھے چھوڑ گیا۔ وہیں سے تو غلہ منڈی کو راستہ جاتا تھا۔ وہ گزرے ہوئے راستے سے پھر گزرا۔ منڈی میں داخل ہوا تو شور کے بھنور اس کی طرف دوڑے۔ خالی دکانوں میں بیٹھے بیوپاری اس کی طرف یوں لپکے جیسے رات بھر کے بھوکے مرغ مرغیاں صبح کے وقت ڈربے کا دروازہ کھلنے پر باہر پڑے دانے پر جھپٹتے ہیں۔ اس نے بولی دینے کے لیے منہ کھولا مگر لفظ اس کی زبان پر خشک ہو گئے۔ کوئی بھی بولی دے کر اپنا نرخ بتانے کو تیار نظر نہ آیا۔ منڈی کا یہ رنگ اس کے لئے نیا تھا۔ سب بیوپاریوں نے اپنے اپنے ہاتھ قمیضوں کے نیچے چھپا لئے تھے اور اس کے ہاتھوں کا انتظار کر رہے تھے لیکن وہ اپنی فصلیں کپڑے کے نیچے چھپے ہوئے ہاتھوں سے نہیں کاٹ سکتا تھا۔ اس نے بیل گاڑی موڑنے کی کوشش کی پر منڈی میں آیا ہوا اناج بھلا کبھی واپس گیا ہے۔ بیوپاریوں کے کارندے بیل گاڑی پر ٹوٹ پڑے اور جب وہ بیل گاڑی موڑ کے منڈی سے باہر نکلا تو بیلوں کا بوجھ ہلکا ہو چکا تھا مگر اس کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ لاری اڈے والے موڑ سے ہو کر وہ کچہری روڈ پہ آیا۔ ڈوبتی ہوئی سانسوں اور تھکی ہوئی آنکھوں سے اس نے ایک بار پھر کچہری کی عمارت دیکھی تو ایک لمحے کو رُک گیا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ گواہی کی تاریخ اب آنے ہی والی ہے۔ مقدمے کا فیصلہ ہونے والا ہے مگر کس روز ــــ؟ یہ اسے علم نہیں تھا۔ کہیں گواہی کی تاریخ گزر ہی نہ گئی ہو۔ ڈرا پھر اور ڈر گیا۔ اس نے بیل گاڑی سڑک سے نیچے اتاری اور اسے وہیں چھوڑ کے کچہری کے اندر گیا۔ پیشکار کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ میری گواہی آج ہے وہ دوڑ کے اس طرف گیا۔ لیکن وہ کوئی دوسرا مقدمہ تھا اور کسی دوسرے کی گواہی۔ ایک گواہ بھگت گیا تو دوسرا اندر داخل ہوا، دوسرے کے بعد تیسرا۔ اسے یوں لگا جیسے سب گواہ ایک جیسے ہوں یا ایک ہی آدمی بار بار کپڑے بدل کر گواہی دینے جا رہا ہو۔ وہ گھبرا گیا۔ دنوں کے ساتھ ساتھ کہیں لوگ بھی اپنی پہچان تو نہیں کھو بیٹھے۔ پانچواں لباس پہنے ہوئے پہلے گواہ نے اسے پریشان دیکھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"پیشی کرانے آئے ہو ــــ؟"

"نہیں۔ میں گواہی دینے آیا ہوں۔"

"ہاں ہاں، وہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔ ہو پیشہ ور گواہ، ہو گے یا دسہ ساعت۔"

"میں موقعہ کا گواہ ہوں۔"

"بیوقوف"! وہ ناراض ہو کر بولا۔ مقدمے کے فیصلے کے لئے ایسے گواہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اور وہ پھر لباس بدلنے چلا گیا۔ کہیں یہ میرے کپڑے پہن کے میری گواہی بھی نہ دے آئے۔ مگر اس کا لباس اس کے بدن پر تھا اور وہ خود وہاں موجود اپنی گواہی کے لئے کسی اور کو نہیں جانے دے گا۔ پر اس کی گواہی ہو گی کب؟

وہ منشی کے پاس گیا۔ بھلا اسے کیا پتہ وہاں روزانہ سینکڑوں گواہیاں ہوتی تھیں اور بیسیوں فیصلے، قتل کے مقدمے، اغوا، ڈکیتی، زنا، دھوکے بازی کے مقدمے، لیکن اس کا مقدمہ ان سب سے اہم اور سب سے ضروری تھا اور اس کی گواہی فیصلہ کن۔ وہ چھوٹے بابو کے پاس گیا پھر اس سے بڑے بابو کے پاس۔ وکیل کے پاس۔ جج کے پاس۔ لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کی گواہی کس روز ہے اور وہ کس مقدمے کی بات کر رہا ہے۔

غلہ منڈی میں بیوپاری اس کے دانوں کا بٹوارہ کرنے میں مصروف ہیں۔ باہر کچہری روڈ کے کنارے دھوپ بیلوں کے سروں پر چمک رہی ہے اور درختوں کے سائے ان کے قدموں میں سمٹ رہے ہیں خالی بیل گاڑی کی رکھوالی کرتے کرتے بیلوں کی گردنیں گھنٹیاں بجا بجا کر تھک گئی ہیں۔ کچہری کے اندر وہ ایک ستون سے ساتھ ٹیک لگائے یہ تہیہ کئے کھڑا ہے کہ اب وہ اپنی گواہی دے کر ہی یہاں سے جائے گا مگر اسے کچھ پتہ نہیں کہ اس کی گواہی کب ہو گی اور وہ کتنے دن، کتنے مہینے، کتنے سال ستون کے ساتھ ستون بنا کھڑا رہے گا۔

زندہ لوگوں کا قبرستان

رُخسانہ صولتؔ

کھلی ہوئی کھڑکی کی جالی سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کمرے کے اندر آ رہے تھے اور میرے جسم میں سنسنی پیدا کر رہے تھے۔ میں نے ایک جھرجھری لی اور کروٹ بدل کر سختی سے آنکھیں موند لیں۔ لیکن نیند تو شاید میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی میرے دماغ میں تُند ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ ذہن میں الاؤ دہک رہے تھے۔ میرے جسم کا انگ انگ اس طرح دکھ رہا تھا جیسے میں برسوں میں پیدل چلتی آ رہی ہوں اور میرے پاؤں میں آبلے پھوٹ گئے ہوں۔

اچانک میری چارپائی زور سے ہلی۔ شاید ماں کو اندھیرے میں ٹھوکر کھانی پڑی ہو۔ اوہ ماں — تو بھی کیا سوچتی ہو گی۔ یہ دن بھی دیکھنے تھے۔ اس زندگی میں قسمت اتنی مہربان کیوں ہو رہی ہے ماں —؟

اس سوال کا جواب مجھے تو بھی نہیں دے سکتی۔ اس لئے کہ تو خود بھی اس سوال کا جواب نہ پا سکی۔ ہم کریں بھی کیا؟ غریب لوگوں کو تو آنکھیں سختی سے بھینچ کر یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ سورج کی تیز روشنی اپنی چمک اور حدت کھو چکی ہے۔ اب تو گہری تاریک رات ہے اور یہ رات جانے کتنی لمبی ہو۔ کتنی طویل "۔ رات تو دنیا بھر میں گناہ، ظلم، جبر اور آمریت کا سمبل ہے۔"

"ماں تم کیوں ٹھوکریں کھا رہی ہو — پانی کے لئے مجھے آواز دے لیتی تھی۔ میں نے قدرے اونچی آواز میں کہا اور میری آواز بھی شاید سیل زدہ دیواروں سے چپک گئی تھی۔ آواز کی بازگشت کو بھی بوسیدہ چھت نے نگل لیا تھا۔

میں نے جانے کیا سوچ کر وقت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ غالباً رات کا نصف سے زیادہ حصہ گزر چکا تھا۔ دور کہیں گیدڑ اپنی بے سُری آوازوں میں تنہائی کا راگ الاپ رہے تھے۔ مگر

رات کے اس ہولناک سناٹے میں مجھے ان کی آواز بڑی دلکش اور سُریلی لگ رہی تھی۔ شاید اس بھری دنیا کے قبرستان میں مجھے ان آوازوں میں ہی زندگی کا احساس ہو رہا تھا۔

زندہ لوگوں کے قبرستان میں کتنا شور تھا۔ ہر کوئی اپنے سائے سے بے خبر، بے پرواہ آگے آگے بھاگ جانے کی فکر میں گم نظر آتا تھا اور اسی بھاگ دوڑ میں سڑک پر بکھرے ہوئے سانسوں کے ٹکڑے وزنی وزنی پیروں تلے روندے جاتے اور سُرخ سُرخ خون کی بوندیں بہت جلد اپنا رنگ بدل ڈالتیں۔ تاکہ ان پر کسی کی نظر نہ پڑے۔

ہم بھی اسی کچلے ہوئے گروہ سے نکلتے ہیں۔ ہمارے چہرے اپنی انفرادیت کھو چکے ہیں۔ تبھی تو ماں ― تو سب سے کہتی ہے ― "کہ یہ بچیاں ننگے سر ہیں۔ ان کو تیز نظروں سے نہ دیکھو۔"

ماں میں تمہاری نظر میں نادان اور معصوم بچی ہوں۔ مگر میں اتنا ضرور کہوں گی کہ تو نے جس غلط بات کا پروپیگنڈہ کیا۔ وہ مناسب نہیں تھا۔ میں نے ہمیشہ تجھے اپنے سر پر سایہ کئے دیکھا اور اسی احساس کے تحت میں نے جلتی، دہکتی ریت پر پیر رکھ دیئے۔

"ماں ― ! وقت کتنا خوبصورت دھوکہ ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے زندگی ایک عظیم بھیانک مذاق ہے۔" اور ہم سب ان دونوں کے درمیان بانوری چکوری کی طرح سر پٹختے رہتے ہیں۔ جبھی تو آج چلتے چلتے تھک کر گر پڑی ہے اور دُکھ سے میرا سر پھٹنے لگا ہے۔

آج جانے مجھے کیوں سب باتیں یاد آ رہی ہیں اور بڑی شدت کے ساتھ میں ان کی تلخیوں کو محسوس کر رہی ہوں۔ میں اپنے آپ کو بہت حقیقت پسند سمجھتی ہوں اور فضول باتوں کو دہرا کر یا ان کے سوچنے پر اپنی قوت کو ضائع کرنا ہرگز پسند نہیں کرتی۔ مجھے آج دوپہر کا واقعہ یاد آ گیا۔ رات اور دوپہر میں زیادہ فاصلہ نہیں اور مجھے یوں لگتا ہے جیسے اب بھی وہی تیز۔ اور جلتی ہوئی دوپہر ہے اس کی گرمی اور تپش کو اس ماحول کی ٹھنڈک بھی دور نہیں کر رہی۔

آفس میں کام کرتے کرتے میری انگلیاں تھم گیئں اور مجھے متلی کا احساس ہونے لگا۔ دماغ میں ایک کوندا سا لپکا۔

آج جیب میں صرف بس کا کرایہ ہے :

"ماں کی دوائی کہاں سے آئے گی ۔؟"
"آٹا بھی ختم ہے ۔؟"
"خرچ کا کیا ہوگا ۔؟"

ساجدہ راہ دیکھ رہی ہوگی ۔ اس کی آنکھوں میں امید کے جلتے دیئے میں کس طرح بجھتے دیکھوں گی ۔ وہ مجھے تسلیاں دے رہی ہوگی ۔ بالکل اسی طرح تو ہمیں بچپن میں جھوٹی تسلیاں دیا کرتی تھی ۔ خوبصورت جھوٹے سے بنگلے میں کھیلنے کے خواب دکھایا کرتی تھی ۔ تو کہتی تھی نا ماں ۔ میری بچیاں تو ماں باپ کا نام روشن کریں گی اور پھر ہمارے دکھ درد میں ڈوبے دن ختم ہو جائیں گے ۔

مگر ماں ! کاش آج بھی تو ہمیں یونہی تسلیاں دیتی تو شاید ہم اس خواب کے سہارے ہی اپنے دکھ بھول جاتے ۔ دراصل ماں یہ خرابی بھی تو نے پیدا کی ۔ تو نے تو ہمیں خواب دیکھنے کی بری عادت ڈال دی ۔ لیکن شاید ایسا نہ ہو سکے ۔

"مجھے یہ احساس اور بھی کچوکے لگاتا ہے کہ ہمارے ذرا سے اشارے پر تو اپنے دودھ سے بھرے گھڑے ہمارے گڑوں میں انڈیل دیتی تھی اور میں آج مرتی ہوئی ماں کے منہ میں دودھ کی چند بوندیں بھی نہ ٹپکا سکوں گی ۔" اس خیال کے آتے ہی ٹپ ٹپ میری آنکھوں سے آنسو گرنے لگے ۔

وہ سامنے والی میز پر بیٹھا تھا ایک دم چونک کر اٹھا اور گہری نظروں سے مجھے دیکھتا رہا ۔ "میری ماں ! میں تمہیں دنیا کے سب مردوں سے پُرخلوص اور سچا دوست سمجھتی تھی ۔ تم اپنی یہ کیفیت مجھ سے کیوں چھپاتی ہو ۔"

"کہہ دو نا ۔ تمہیں کیا دکھ ہے ؟"

وہ پوچھتا رہا ۔۔۔ اور میں نے گیلی گیلی آنکھوں سے اُسے دیکھا ۔ اس نے میری جھولی میں بہت سے نوٹ ڈال دیئے ۔ میں نے ایک نظر اسے ، اور ایک نظر جھولی میں پڑے ہوئے نوٹوں کو دیکھا اور پھر اس سے سوال کر ڈالا ۔

"قرضے کی شرائط ۔؟"

وہ ہنسا اور دھیمی دھیمی سی ہنسی میری روح کو کچلا گئی ۔ اس کی آنکھیں بول رہی تھیں ۔ میری جوان اور کھلی آنکھوں نے اس کی بات سن لی تھی ۔ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا ۔

"میں اپنے سر کی چادر خریدنا چاہتی تھی۔ مگر نہیں۔"

"تم خود مفلس ہو۔ اور ابھی نادان۔"

"تم سودے کا لین دین اپنے اصل نام کے ساتھ نہیں کر سکتے۔"

"پھر میں کیوں! مہنگی منڈی کا رخ کروں۔"

اور میں نے سارے نوٹ اس کے چہرے کی طرف اچھال دیئے، اور ایک موٹی سی گالی اسے تحفتاً دے دی۔

اور سلجے کسی ٹھنڈے یخ جھونکے چیختے چلاتے آئے۔ اور میری روح سے لپٹ کر بین کرنے لگے۔ مجھے ان کے لمس سے ماں کے جسم کی ٹھنڈک کا احساس ہونے لگا۔

آنکھوں کے دیدبان

زاہدہ حنا

رات کی آنکھیں نمناک ہیں، اور ان آنکھوں کی نمی شبنم بن کر شیشے کی دیوار پر لکیریں کھینچ رہی ہے۔ یہ لکیریں آپس میں گڈمڈ ہو کر کہیں کشتیاں بن گئی ہیں، اور کہیں آبی پرندے ـــ کشتیوں اور آبی پرندوں کے اس ہجوم میں کہیں کہیں سمندر جھلک رہا ہے۔ یہ سمندر شفاف دیوار کے اس پار دور تک سویا ہوا ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ سوتا ہوا سمندر کروٹ بدل کر اپنی کہنیوں کے سہارے اٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ آج کی رات بھی ایک ایسی ہی رات ہے۔ آج شام ہی سے سمندر اپنی کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن نہ جانے کیا چیز اس کے پاؤں کی زنجیر بن گئی ہے۔ میں بہت دیر سے یہاں بیٹھی سمندر کو دیکھ رہی ہوں، اور آج پر ہی کیا موقوف ہے، میں تو ہر شام یہاں آ بیٹھتی ہوں، اور اسے دیکھتی رہتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ دن ضرور آئے گا، جب وہ تمام زنجیریں توڑ کر اٹھ بیٹھے گا، اور میرے پاس چلا آئے گا۔ میں ایک ایسی ہی رات کا نہ جانے کتنی راتوں سے انتظار کر رہی ہوں۔ یہ راتیں جو پھیل کر صدیاں بن گئی ہیں، اور سمٹی ہیں، تو عذاب کا ایک جہنمی لمحہ ـــ

سمندر میں دور بہت دور لکڑی سے بنے ہوئے جہازوں پر جو روشنی ہے، وہ میری آنکھوں کے الاؤ ہیں، جن میں انتظار کے تناور درختوں کی بریدہ شاخیں جل رہی ہیں۔ میں یہ بات جان گئی ہوں کہ میری آنکھیں یہاں ہیں، اور روشن الاؤ ہیں۔ سمندروں کی لہروں میں اور ستاروں کے قلب میں، اور میری یہ تمام آنکھیں جو ان گنت ہیں مجھے شیشے کی اس دیوار کے پیچھے دیکھ رہی ہیں۔

تم نے کبھی انتظار کو انتظار کے مقابل دیکھا ہے؟ اگر نہیں دیکھا، تو مجھے دیکھو، میری آنکھوں کو دیکھو، جن میں تمہیں اپنی آنکھیں نظر آئیں گی ـــ لیکن اگر یہ تمہاری آنکھیں ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر میری آنکھیں کہاں ہیں؟ یہ فیصلہ کون کرے گا؟ یہ فیصلہ میں کروں گی یا سمندر؟ میری آنکھوں کے ہونے نہ ہونے کا فیصلہ ریت کے ذرّے کریں گے، یا ہوا کے جھونکے؟ یا پھر رات کے وہ آنسو جو کشتیوں اور آبی پرندوں کی شکل میں شیشے کی دیوار پر بہہ رہے ہیں، یہ فیصلہ

آخر کون کرے گا؟

میں تمہیں بتاتی ہوں کہ یہ فیصلہ کوئی نہیں کرے گا، اس لئے کہ یہاں کون ہے، جو دوسروں کے لئے حکم بن سکے۔ یہاں کی ہر شے خود ہی مدعی ہے، خود ہی مدعا علیہ، اور خود ہی منصف —— وجود کی عدالت تنہائی کی عدالت ہے، اور جب کوئی حتمی اور آخری فیصلہ سننے کے لئے میں حجرۂ ذات میں جھانکتی ہوں، تو دیکھتی ہوں کہ سفید محرابوں اور گنبد نما چھت والے اس حجرے میں انسانوں کا ہجوم ہے، اور اس ہجوم کے شانوں سے شانے ملائے خداوندوں اور دیوتاؤں کے پرے ہیں، اور سب سے آگے اور سب سے الگ خداوند خدا ہے، جو دیوتاؤں کے کہنے کے مطابق محرک اوّل ہے، اور انہی کے کہنے کے مطابق خود حرکت نہیں کرتا۔

ذہن مجھ سے ہم کلام ہوتا ہے، اور میں جان لیتی ہوں کہ یہ تنہائی کی عدالت ہے۔ یہ جان کر مجھے بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے، میں اور مجھ ایسے دوسرے کتنے عیار ہیں کہ تنہائی کی عدالت میں بھی ہجوم ہیں، اور حرکت میں ہیں۔ اور دوسری طرف خداوند خدا ہے، جسے فرض کیا گیا، پھر اپنے آپ پر فضیلت دی گئی، اور محرک اوّل قرار دے کر حرکت سے محروم کیا گیا، اور اس طرح اسے یکسر تنہا کر دیا گیا۔ شاید میں اور مجھ ایسے دوسرے لوگ ایذارسانی کی انتہاؤں کو پہنچے ہوئے ہیں۔

حجرۂ ذات کے فرش پر لمحوں کا ایندھن دہک رہا ہے، اور اس کا پرتو وجود کی دیواروں پر عجب اسراریت آمیز نقوش بناتا اور بگاڑتا ہے۔ دھویں کی چادر ہے، اور اس پر مدھم سی روشنی کی تحریر ہے۔ روشنی کی یہ تحریر ان شکلوں کو واضح کرتی ہے، جو اس گنبد نما چھت میں آویزاں ہے۔ ان شکلوں کو پہننے والوں میں سے کچھ الٹے لٹک رہے ہیں، اور کچھ سیدھے، کچھ نے فرشتوں سے پر مستعار لئے ہیں، اور طاقتِ پرواز کی تلاش میں ہیں، اور ہاں وہاں بعض دراز داڑھیوں والے بھی ہیں، اور جو اپنے ہاتھوں میں دانائی کے موتی لئے بیٹھے ہیں، اور انہیں لوحِ گل پر ٹانکتے چلے جاتے ہیں۔ لمحوں کے دہکتے ہوئے ایندھن کا پرتو ان شکلوں کو کبھی اجاگر کرتا ہے، اور کبھی تمام مناظر دھندلا جاتے ہیں، لیکن خداوند خدا کا وجود ان سب سے الگ ہے، ہر منظر سے جدا —— اس لمحے مجھے یونانی یاد آتے ہیں کہ وہ مجھ سے اور میرے لوگوں سے زیادہ خدادوست تھے، وہ اپنے دیوتاؤں اور دیویوں کو اپنی ہی خامیوں اور اپنی ہی خوبیوں کے سانچے میں ڈھالتے تھے، اور انہیں تنہا نہیں چھوڑتے تھے۔

میں خداوند خدا کے چہرے پر تنہائی کی اذیت ناک تحریر دیکھتی ہوں، اور اس کے اردگرد پھیلے ہوئے مہیب اور تنہا سناٹے کی گونج سنتی ہوں، تو میرا جی چاہتا ہے کہ اس کے سامنے ایک آئینہ رکھ دوں، اور اس طرح وہ

جس نے کبھی اپنا چہرہ نہیں دیکھا، اس آئینے میں اپنا چہرہ دیکھے، اور اسے اپنی دوسراہٹ سمجھے، اور دوسراہٹ سے باتیں کرے۔ لیکن جب میں اس کے سامنے آئینہ رکھنا چاہتی ہوں، تو دیکھتی ہوں کہ حجرۂ خاک سراب ہے، اور اس کی گنبد نما چھت پر بنی ہوئی اشکال بھی محض خیال کا پھیلایا ہوا جال ہیں، اور حقیقت تو کچھ یوں ہے کہ میرے سامنے شیشے کی دیوار ہے، اور اس کے پار سمندر ہے، اور تاروں بھرا آسمان ہے، اور ریت کے ان گنت ذرّے ہیں، اور میری پشت پر پتھر کی دیوار ہے، جو ریت کے ان گنت ذرّوں کو سمندر کے پانی سے گوندھ کر بنائی گئی ہے، اور جس پر ستاروں جیسی خنک روشنی دینے والا دودھیا بلب روشن ہے۔ پتھر کی اس دیوار میں ایک طاق ہے، اس طاق میں ایک گھڑی رکھی ہے، جس کے ڈائل کا رنگ سیاہ ہے، جس کے ہندسے سنہری رنگ کے ہیں، اور ان ہندسوں کا بوسہ لینے والی سوئیاں بھی سنہری ہیں۔

میں یہاں بیٹھ کر سمندر کا انتظار کرتی ہوں، تو حرکت کرتی ہوئی یہ سوئیاں سرگوشی کرتی ہیں۔ ان سرگوشیوں نے بھی مجھے بتایا ہے کہ فراق، وصال کی دوسری جہت ہے، اور کائنات میں انتظار کہیں نہیں ہے، اور یہ بھی کہ وقت لامحدود ہے، اور اس کے ساتھ ہی محدود بھی۔ کیونکہ وہ کائنات کی مانند ایک دائرہ ہے، جو کہیں سے شروع نہیں ہوتا، اور نہ کہیں ختم ہوتا ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم وقت کو خطِ مستقیم میں سفر کرنے والی غیر محسوس اور نامعلوم شے سمجھتے ہیں، اور ہم یہ نہیں سمجھتے کہ وقت گردش میں ہے، اور اس گردش نے ایک دائرے کو جنم دیا ہے، اور دائرہ جب مکمل ہو جاتا ہے، تو پھر اس کے بارے میں کون بتا سکتا ہے کہ اس کا نقطۂ آغاز کہاں ہے، اور انجام کہاں ـــــ وقت بھی کبھی نہیں گزرتا، ہمیشہ لوٹ آتا ہے، کیونکہ گردش کرنے والی چیز اپنے آغاز کی طرف لوٹتی ہے، اور کتنی عجیب بات ہے کہ آغاز ہی انجام بھی ہے۔ اس لئے یہ کہنا بھی غلط ہے کہ وقت اپنے آغاز کی طرف لوٹتا ہے۔ بس یوں سمجھو کہ وقت گردش میں ہے، اور ہم سب اس گردش کا ایک حصّہ ہیں۔ جو وقت ہم پر سے پہلے گزر چکا ہے، اس کا کوئی حصّہ یا ذرّہ اپنے آپ کو دہراتا ہے۔ لیکن ہم کچھ نہیں جانتے، کچھ نہیں سمجھتے۔ وقت کائنات کے دائرے میں گردش کرنے والی دھول ہے، جو ہمارے سروں پر گرتی ہے، تو بڑھاپا بن جاتی ہے، اور ہمارے بدن سے لپٹتی ہے، تو ہم مٹی میں مل جاتے ہیں۔ وقت خاک ہے اور باد ہے، وقت خدا ہے، اور کائنات ہے، وقت سب کچھ ہے، اور کچھ بھی نہیں ہے۔

میں وقت کو شکل دینا چاہتی ہوں، اس کی تجسیم چاہتی ہوں، اور جب یہ خواہش مجھے ہلاک کرنے لگتی ہے تو میں کائنات کے تمام رنگ اپنی ہتھیلی پر سجا لیتی ہوں، اور مشتری کی انگلی سے وقت کے خد و خال کھینچنا چاہتی

ہوں، لیکن وقت کی فراخی، وسعت اور اس کی ازلیت اور ابدیت میری آنکھوں کی پتلیوں پہ اپنی کوئی شبیہ اپنی کوئی تصویر نہیں بننے دیتی۔ میں سوچتی ہوں کہ وقت کا تصور کس طرح قائم کروں کہ گویائی اس کے نقش و نگار بیان نہیں کر سکتی، اور بینائی اس کے دیدار سے قاصر ہے۔ بس یوں ہے کہ وقت کو الفاظ کے ذریعہ بیان کرنے کی کوشش بیکار ہے، اور اس سے منسوب کی جانے والی تمام اشکال جھوٹی ہیں، بے سروپا ہیں ؎

خاک برفرق و سرِ تمثیلِ من

وقت نے کائنات میں عجب بساط بچھائی ہے، اس کے کھیل کا انداز نرالا ہے، اس کے مہروں کا کوئی رنگ نہیں، ان کی کوئی شکل نہیں، اور اس کا کوئی حریف نہیں۔ وہ خود اپنا مقابل ہے، اور اس کی غیر مرئی انگلیاں کائنات کے بساط کے مہروں کو گردش میں لاتی ہیں، کبھی وہ اپنے آپ سے جیت جاتا ہے، اور کبھی اپنے آپ کو آن کی آن میں شہ مات دے دیتا ہے۔ یہ بھی اس کے کھیل کا ایک حصہ ہے کہ میں اب اپنے سامنے لیں بیٹھی ہوں، جیسے آئینہ آئینے کا سامنا کرے۔ میں سامنے والے اپنے وجود کو چھوتی ہوں، لیکن وہاں کچھ بھی نہیں ہے، سب کچھ خواب در خواب ہے، اور سراب اندر سراب —— خلا ہے، کائنات بھی معدوم ہے، اور سمندر کی لہریں جو مجھے نظر آ رہی ہیں، وہ بھی کہیں نہیں ہیں۔ میری آنکھیں جن چیزوں کو دیکھ رہی ہیں، میرے ہاتھ انہیں چھونے پہ قادر نہیں۔ میں ہی کائنات ہوں اور میں ہی رنگ، میں ہی آگ ہوں، اور میں ہی راکھ۔ میں کبھی اپنے آپ کو سمندر کہہ کر یاد کرتی ہوں، اور کبھی اپنی ذات کو بادبان یا صحرا کے نام سے پکارتی ہوں۔ کائنات کے دائرے میں صرف میری ہی آواز گونجتی ہے، لیکن پھر یوں بھی ہے کہ میری آواز جو کائنات پہ محیط ہے، سمٹ کر کبھی سانس کی سرسراہٹ ہے، اور کبھی تیز ہوا کی سنسناہٹ۔

بادبانوں کے دامن میں تیز ہوا کی سنسناہٹ بھر جائے، تو جہاز لنگر اٹھاتے ہیں، اور اپنے اپنے سفر پہ روانہ ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ اپنے وجود کو ایک آنکھ والے سائیکلوپس کے جزیرے کی طرف دھکیلتے ہیں، اور بہت سے بادبان ایسے بھی ہوتے ہیں، جو ایک ہزار جہازوں پہ ایستادہ ہو کر دس سالہ جنگ کی طرف سفر کرتے ہیں، اور یہی بادبان جب سوگ کا لبادہ اتارنا بھول جائیں، تو سمندر کا نام بدل جاتا ہے۔

مجھے ان بادبانوں سے خوف محسوس ہوتا ہے۔ میں ان کے رحم و کرم پر کہیں کا سفر کرنا نہیں چاہتی۔ ان بادبانوں نے انسانوں کو بہت دکھ دیئے ہیں، بہت رسوا کیا ہے، لیکن یہ بھی ہے کہ ان سے مفر نہیں۔

مفر تو اس بات سے بھی نہیں کہ میں جو اپنے روبرو تھی، ایک بار پھر گم ہو گئی ہوں، اور حصارِ ذات

میں آگئی ہوں۔ جانے والے اپنے اپنے تیر، تبر، تلواریں اور تیغے لے کر واپس جا چکے ہیں، شاید انھوں نے سپر ڈال دی، لیکن اب جبکہ ان کے خیمے اور ان کے جہاز مجھے نظر نہیں آرہے، مجھے اس ٹروجن ہارس سے ڈر لگ رہا ہے جسے میں اپنے ہاتھوں حصار کے اندر لائی ہوں۔ وجود کی شہر پناہ پر آنکھوں کے دیدبان پہرا دیتے ہیں، لیکن جب سحر ہوگی، اور شہر پناہ میں بنے ہوئے دروازے کھول دیئے جائیں گے، اور قلعۂ ذات پر نگہبانی کے لئے معمور انا کا دیوتا اونگھ جائے گا، تو وجود کہاں پناہ چاہے گا؟

مجھے کائنات کی قلمرو نہیں چاہیئے، میں تو منتظر آنکھوں والی لڑکی ہوں، اور مجھے سمندر کا انتظار ہے، لیکن وہ مجھ تک نہیں آتا۔ وہ اپنی کہنیوں کے بل اٹھ کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہے، اور پھر تھک کر لیٹ جاتا ہے میں سوچتی ہوں کہ اٹھوں اور اس کی طرف سفر کروں۔ لیکن جب میں اس کی طرف چلنا چاہتی ہوں، تو میرے پیر نہیں اٹھتے، اور تب مجھے یاد آتا ہے کہ میرا نچلا دھڑ تو گردباد کا ہے، اور مجھے شفاف دیواروں والے اس حصار میں مقید کر دیا گیا ہے۔ باہر دروازے پر میری سیاہ آنکھیں پہرا دیتی ہیں، اور ان کی چمک میرے اعصاب کو جیسے سلا دیتی ہے، اور تب میں سوچتی ہوں کہ مجھے اس وقت کا انتظار کرنا چاہیئے، جب سمندر کی تھکن اتر جائے، اور وہ میرے پاس چلا آئے۔

تو میری روداد کچھ یوں ہے کہ میں ہر رات اپنے گردباد کے قدموں سے اٹھ کر یہاں اس شفاف دیوار تک آئی ہوں، اور سمندر کو دیکھتی ہوں۔ میں حصار ذات سے باہر کیسے آؤں کہ میری آنکھیں میرے دیدبان ہیں۔

بے زمیں، بے آسماں

علی حیدر ملک

اُس بے درو دیوار سیفخانے میں وہ چاروں ایک دوسرے سے بے خبر اور بالکل تنہا اپنے اپنے عذاب کی میعاد پوری کر رہے تھے۔ کوئی کسی سے آشنا نہ تھا اور سب کے سب اپنے ہونے کی گواہی اپنے سامنے خود ہی دے رہے تھے۔ جب اپنی گواہی آپ ہی دیتے دیتے اپنے ہونے میں شبہ پیدا ہونے لگا تو ایک نے زوردار چیخ بلند کی تاکہ کوئی دوسرا اس کے ہونے کی شہادت دے سکے۔ دوسرے نے اس کی چیخ سن کر مسرت بھری آواز میں کہا "ہاں! میں ہوں"

"ہاں! میں ہوں"

"ہاں! میں ہوں"

تیسرے اور چوتھے نے بھی نعرہ لگایا۔

اندھیرے میں پہلے کے چہرے پر خوشی کی لکیریں ابھریں مگر پھر فوراً ہی خوشی کی یہ لکیریں تردّد کے جال میں بدل گئیں "میں نے ایک دو تین بار میں ہوں کی تکرار سنی ہے۔ کہیں یہ میری اپنی آواز کی بازگشت یا اجنبی آوازوں کا سراب تو نہیں؟ اگر نہیں تو یہاں جو موجود ہو اپنی آواز پھر دہرائے"

"میں ہوں"

"میں ہوں"

"میں ہوں"

تینوں نے یکے بعد دیگرے پھر آواز لگائی۔

"صرف میں ہوں کہنا تو کافی نہیں۔ اپنے اپنے نام اور پہچان بھی بتاؤ تاکہ میں تمہارے ہونے

کی گواہی دے سکوں۔"

"میری پہچان نے موت کا ذائقہ چکھ لیا ہے اور اب مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ میں میں ہوں۔" چوتھے نے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ تمہارے لفظ سچے ہیں، میں اس کی تصدیق کرتا ہوں۔" تیسرا بولا۔

"اپنے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔" دوسرے نے صدا دی۔

"تو تم سب بھی میری ہی طرح اپنی پہچان کھو چکے ہو اور اب بے نام زندگی گزار رہے ہو۔" پہلے نے تاسف بھرے لہجے میں کہا اور

پھر خاموش ہو گیا۔ لمحوں یا شاید صدیوں بعد جب خاموشی زہر کی طرح اس کے رگ و پے میں سرایت کرنے لگی تو وہ درد سے بے چین ہو کر بولا: "مگر ہمارا کوئی نہ کوئی نام تو ہونا ہی چاہیے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم اپنے نام خود ہی تجویز کریں۔"

"مشکل یہ ہے کہ ہر نام کسی چیز یا رشتے کا نشان ہے جب کہ اشیاء کی شباہت اور رشتوں کی تقدیس بھی گم ہو گئی ہے۔ ایسے میں کوئی نام تجویز کرنا بالکل لاحاصل ہے۔" دوسرے نے کہا۔

"وہ تو ہے لیکن۔" تیسرے نے ادھورے جملے سے اپنا مقصد بیان کیا۔

"یہ تو ظاہر ہے کہ ہم اس سیہ خانے میں کسی نہ کسی جرم کی سزا کاٹ رہے ہیں اور اس اعتبار سے قیدی ہیں۔ کیا یہ مناسب نہیں کہ ہم ایک دوسرے کو قیدی ہی کہہ کر پکاریں۔" چوتھے نے تجویز پیش کی۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ یہی ہمارا نام بھی ہے اور پہچان بھی۔" سبھوں نے اس کی تائید کی۔

آواز کی روشنی ڈوبی تو سیاروں کی طرح پھر ایک دوسرے سے دور ہو گئے۔ دور اور تنہا۔

"نام کا مسئلہ تو حل ہو گیا۔ اب ہمیں اپنا تعارف کرانا چاہیے اور تعارف کراتے وقت یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ہم قیدی ہیں اور یہی ہماری پہچان ہے۔ سو باری باری ہم میں سے ہر کوئی یہ بتائے کہ وہ کس جرم کی سزا میں یہاں بھیجا گیا ہے۔" قیدی نمبر ایک نے آواز کا پل طے کر کے دوسروں کے قریب آنے کی کوشش کی۔

"ہاں! یہ ٹھیک ہے۔" سبھوں نے لبیک کہا۔

"تو پھر سب سے پہلے میں ہی اپنا تعارف کراتا ہوں۔" پہلے قیدی نے کہا۔ دوسرے قیدیوں نے اپنے کان کھڑے کر لیے اور اندھیرے میں بلاوجہ اپنی آنکھیں پھاڑ لیں۔

"اپنا تعارف بہت مختصر ہے۔ میں پیدا ہوا تو ہر طرف خوشیوں کے شادیانے بجائے گئے۔ مٹھائیاں تقسیم کی گئیں۔ بچپن اور لڑکپن ناز و نعم سے گزرا۔ مگر جب جوان ہوا تو اچانک ایک دن یہ راز کھلا کہ میری ماں اپنی نہیں سوتیلی ہے۔ سوتیلی ماں نے مجھے بڑی اذیتیں دیں اور بالآخر مار پیٹ کر یہاں پھنکوا دیا جہاں سے تم میری آواز سن رہے ہو۔"

"تمہاری اپنی ماں کیا ہوئی؟"، دوسرے قیدی نے سوال کیا۔

"میری اپنی ماں؟"، قیدی نمبر ایک چونکا اور پھر ذرا توقف کے بعد افسردگی کے ساتھ بولا۔" مجھے اپنی ماں کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ کبھی میری کوئی اپنی ماں بھی تھی۔"

"چ چ۔ چ چ۔ چ چ" باقی تینوں قیدیوں نے قیدی نمبر ایک کے حال پر افسوس کا اظہار کیا

"اب میں اپنا احوال بیان کرتا ہوں" قیدی نمبر دو نے کہنا شروع کیا۔" میں جس ملک کا رہنے والا ہوں وہاں لوگوں نے سچ کو جھوٹ بنا دیا تھا اور جھوٹ کو سچ۔ جھوٹ بولنے والوں کو بڑی بڑی جاگیروں اور خطابات سے نوازا جاتا اور سچ بولنے والوں کو سولی پر چڑھا دیا جاتا تھا" وہ چند ثانیے کو رکا پھر بولا۔" تم نے بادشاہ کو ننگا کہنے والا قصہ تو سنا ہی ہوگا اس لئے اب تمہیں صرف یہ بتاتا ہے کہ جس شخص نے بھرے بازار میں بادشاہ کو ننگا کہا تھا وہ میں تھا۔ اور یہاں اسی جرم میں قید ہوں"

" بادشاہ ننگا ہونے کے ساتھ ساتھ اندھا بھی تھا کیا؟"، قیدی نمبر تین نے پوچھا۔

" یہ تو نہیں بتا سکتا لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ پورا ملک یقینی طور پر اندھا تھا" قیدی نمبر دو نے جواب دیا۔

"چ چ۔ چ چ۔ چ چ" باقی قیدیوں نے قیدی نمبر دو کے ساتھ اس ملک کی حالت پر بھی اظہار افسوس کیا۔

"میرے شہر کا حال بھی اس ملک سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا" اب قیدی نمبر ۳ گویا ہوا۔" میرے شہر میں حق و باطل کی جنگ ہو رہی تھی اور لوگ رفتہ رفتہ حق کو چھوڑ کر باطل کے ساتھ ہوتے جا رہے تھے کیونکہ وہاں کے مرد اپنی بزدلی کے باعث نامرد ہو گئے تھے اور عورتیں اپنی بنجر کوکھ کے نوحے سے بے خبر کتوں اور بلیوں سے دل بہلانے لگی تھیں۔ میں نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو لوگوں کو بہت برا بھلا کہا اور حق کی سربلندی کے لئے عملی جدوجہد میں شریک ہو گیا اور اس کے نتیجے میں آج اس سیہ خانے میں سڑ رہا ہوں"

کیا تم سقراط کے ساتھ تھے؟"، قیدی نمبر چار نے دریافت کیا۔

"نہیں"

"تو کیا یسوع کے ساتھ ؟"

"نہیں"

"حسینؑ کے ؟"

"تو پھر تم کس کے ساتھ تھے ؟"

"کسی کے بھی نہیں ۔ یا شاید سبھوں کے ساتھ "

"ہچ ۔۔۔ ہچ ۔۔۔ ہچ ۔۔۔" باقی قیدیوں نے قیدی نمبر ۳ کے علاوہ نہ جانے کس کس کے ساتھ ہمدردی ظاہر کی۔

"جہاں میں تھا وہاں کا امیر اپنی تاج پوشی سے پہلے رعایا سے خوب خوب وعدے کرتا اور انہیں پہاڑیوں سے بھی زیادہ قوت کا مالک بنا کر متحد رہنے کی تلقین کرتا تھا" قیدی نمبر ۴ نے اپنا تعارف شروع کیا "لیکن رسم تاج پوشی کے بعد اپنے تمام وعدے بھلا دیتا اور رعایا میں پھوٹ ڈال کر ان میں سے ایک ایک فرد کے الگ الگ کوڑے لگواتا اور ان کی بہو بیٹیوں کی ان کی نظروں کے سامنے بے حرمتی کرتا تھا لوگ پریشان تھے مگر کچھ کر نہ سکتے تھے کیونکہ وہ بٹے ہوئے تھے اور اس کمزوری کے ساتھ امیر کی طاقت کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ میں نے حالات سے تنگ آکر رعایا میں تنظیم کی تحریک شروع کر دی تاکہ متحد ہو کر امیر کے ظلم کا مقابلہ کیا جا سکے۔ امیر کو اس کی خبر ہو گئی اور اس نے مجھے اس جرم کی پاداش میں یہاں ڈلوا دیا جہاں میں اب تک پڑا ہوں "

"کیا رعایا میں سے اور لوگوں کو اس کا احساس نہ تھا" قیدی نمبر ایک نے سوال کیا۔

"احساس تو سبھی کو تھا لیکن کچھ کرنا ان کے بس میں نہ تھا کیونکہ وہ حرف کی قوت سے ناآشنا تھے اور پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے دن بھر کی محنت کے بعد تھک کر چور ہو جاتے تھے "

ہچ ۔ ہچ ۔ ہچ "باقی قیدیوں نے اظہار ملال کے بعد خاموشی اختیار کی تو پورا سیہ خانہ جیسے ماتم کدہ ہو گیا۔

"مطلب یہ بتاؤ" قیدی نمبر ایک پھر گویا ہوا "تمہیں کیونکر معلوم ہوا کہ تمہیں کیا کرنا چاہیئے اور کیا نہیں ۔ تمہارا کوئی ہادی تھا جو تمہیں سب باتیں بتاتا تھا ؟"

"ہاں" سبھوں نے ایک ساتھ آواز کا پرچم لہرایا۔

"وہ کون تھا، کیسا تھا اور اب کہاں ہوگا؟"

"یہ تو ہمیں معلوم نہیں۔ ہم نے صرف اس کی آواز سنی تھی جو نہ جانے کدھر سے آکر سیدھی ہمارے سینے میں اتر گئی تھی۔" سب نے باری باری ایک ہی بات دہرائی۔

"تو کیا لالائی کی طرح یہاں بیٹھے رہنے سے یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم اسی کو تلاش کریں۔ وہی شاید ہمیں اس سیاہی کے عذاب سے نجات دلائے اور آگے کسی روشن لکیر کا پتہ دے۔"

"ہاں تمہارا خیال بالکل صحیح ہے۔ ہمیں اسی کو تلاش کرنا چاہیئے۔" سب نے بیک آواز قیدی نمبر ایک کی رائے سے اتفاق کیا۔

پھر وہ دھیرے دھیرے رینگتے ہوئے سیہ خانے سے نکلے اور اس مقام پر آگئے جہاں نہ دکھائی دینے والی روشنی کے چھوٹے چھوٹے دھبوں نے تاریکی کے مہیب جسم پر کوڑھ کا سماں پیدا کر دیا تھا۔

قیدی نمبر چار وہاں سے الٹے پاؤں اس راستے پر چلا گیا جدھر سے وہ آیا تھا۔ قیدی نمبر تین نے آگے کی طرف قدم بڑھائے اور ان دیکھے راستے پر چل پڑا۔ قیدی نمبر ۲ وہیں کھڑا رہا جہاں کہ وہ تھا اور جس جگہ دونوں راستے ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے۔

لیکن ان سب کے بعد قیدی نمبر ایک کدھر گیا اور کس بے سمت اندھی گلی میں سر پھوڑتا پھر رہا ہے کسی کو معلوم نہیں۔

سرطان

قمر عباس ندیم

کہیں غیر شعوری طور پر میں سچ مچ خوف زدہ تو نہیں!

ہسپتال میں کام کرتے ہوئے جہاں ہر طرف کہانیاں بکھری رہتی ہیں۔ سچی کہانیاں۔ وہاں کہانیاں لکھنے کی تحریک کیوں نہیں ہوتی!

میں نے اپنے ذہن کو ٹٹولا اور میں ڈر گیا۔

میں نے مصمم ارادے سے قلم اٹھایا۔ کیا لکھوں!

اس بڑھیا کی کہانی جو کچھ دن پہلے اپنے نواسے بچے کو تعویذوں میں لپیٹ کر ہسپتال لائی تھی جس کے جسم میں صرف ہڈیاں اور کھال باقی تھی۔ پیٹ نکلا ہوا تھا اور آنکھیں پھٹی پڑی تھیں۔ اور جس کو دودھ پلانے کا مشورہ سن کر بڑھیا ڈاکٹروں کی ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی اور روتے ہچکیاں لیتے ہوئے "مجھے نوکر رکھ لو، مجھے نوکر رکھ لو ڈاکٹر صاحب" کی گردان کرنے لگی تھی۔

یا اس لڑکی کی کہانی لکھوں جس کو اس کا بھکاری باپ شہزادی کہتا تھا۔ اور بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے ہوئے کہتا تھا میری شہزادی بھیک نہیں مانگے گی۔ اور شہزادی نے پہلی بار ہاتھ پھیلا کر باپ کی لاش قبرستان تک پہنچانے کے لئے پیسے مانگے تھے۔

کچھ نرسوں کے بارے میں جن کے نام پر عام آدمیوں کے ذہن میں ایک جذبات سے عاری بے زبان لڑکی کی تصویر ابھرتی ہے جو مریضوں کی خدمت یا ڈاکٹروں سے فلرٹ کے علاوہ کچھ نہیں کرتی۔

یا ان لوگوں کا افسانہ جو اپنا خون بیچ کر پیٹ پالتے ہیں۔

مگر یہ کہانیاں تو صرف ہسپتال کی کہانیاں نہیں ہیں، یہ تو عام کہانیاں ہیں جنہیں روز روز۔ روز ہر جگہ ہر جگہ آپ نے دیکھا ہے پڑھا ہے یا سنا ہے۔

پھر میں کیا لکھوں!

کوشش سے میرے ذہن میں کہانی کا خاکہ کبھی نہیں ابھرتا۔ میں اپنا ارادہ ملتوی کر دیتا ہوں۔ ساڑھے چار بج رہے ہیں۔ مریضوں سے ملاقات کا وقت ختم ہو رہا ہے۔ مجھے چائے پی کر وارڈ کے معمولات میں مشغول ہو جانا چاہیے۔ میں ڈیوٹی روم سے باہر نکل آتا ہوں اور عالیہ کو آواز دیتا ہوں۔

عالیہ میرے وارڈ کی اسٹاف نرس ہے، اور چائے بہت اچھی بناتی ہے۔ جی ہاں، یہی لڑکی عالیہ ہے جو ۲۴ نمبر کے پاس سے آ رہی ہے۔ مغرور سی، دبلی پتلی۔ وہ شاید میرے پاس آئے گی۔ نہیں وہ سوئیپر کو آواز دے رہی ہے، شاید ۲۴ نمبر کو پاٹ کی ضرورت ہے، ۲۴ نمبر کے کسی اٹینڈنٹ نے یقیناً عالیہ سے سوئیپر کی شکایت کی ہو گی۔

اس مریض کے آجانے سے عالیہ کو چائے بنانے کی فرصت بھی نہیں ملتی۔ ۲۴ نمبر کے عزیز و اقارب ہر وقت مریض کے چاروں طرف گھیرا ڈالے بیٹھے رہتے ہیں، اور ہم سب کو کسی نہ کسی کام میں مصروف رکھتے ہیں۔ یہ مریض ہم سب کے اعصاب پر سوار ہو گیا ہے، اور عموماً یہی ہماری گفتگو کا موضوع رہتا ہے۔

۴۸ سال کا یہ کمزور جسم والا مریض اس وارڈ میں پندرہ دن سے پڑا ہے، یہ یقیناً اپنے خاندان کی مقبول شخصیت ہے، کیونکہ اس کے تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں، اس کی بیوی، ساٹھ سال کے لگ بھگ ضعیف ماں اور نہ جانے اور کون کون، ہر وقت اس کے پاس رہنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہسپتال کے عملے سے کسی نہ کسی بات پر الجھتے رہتے ہیں۔ بظاہر اس مریض میں کوئی خاص بات نہیں ہے، چہرہ عام فاقہ کش لوگوں کے چہرے کی طرح، اندر کو دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں، سیاہی مائل رنگت اور چہرے پر مایوسی جو وقت گزرنے کے ساتھ گہری ہوتی جا رہی ہے۔

کبھی کبھی مایوسی کے سمندر سے سر نکال کر وہ پوچھتا ہے: "میں ٹھیک ہو جاؤں گا؟" اور ہمارا ایک ہی تسلی بخش جواب سن کر پھر ڈبکیاں لینے لگتا ہے۔

اس مریض میں بظاہر کوئی خاص بات نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود اس کے تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں۔ بیوی اور ضعیف ماں جن کا وہ واحد کفیل ہے، اس سے بے انتہا محبت کرتے ہیں اور ہر وقت مریض کے لیے فکر مند رہتے ہیں۔

"آج اس کا ٹمپریچر صرف دو بار لیا گیا ہے۔"

"آج اسے سوئیپر نے پاٹ نہیں دیا۔"

"آج اس کے بستر کی چادر نہیں بدلی گئی۔"

ہر لحظہ ہر وقت اس کے اٹینڈنٹ میرے سامنے کھڑے رہتے ہیں۔

"محبت بڑی چیز ہے" میں سوچتا ہوں۔ اور مریض کے چہرے پر اپنے عزیز و اقارب کی توجہ کے سبب جو امید کی چمک پیدا ہوتی ہے اسے غور سے دیکھتا ہوں۔

جب محبت کرنے والوں کی موجودگی کا احساس ہو تو حوصلہ کس قدر بلند ہو جاتا ہے۔

"ندیم صاحب" ابا کب تک ٹھیک ہو جائیں گے؟" ۲۲ نمبر کا لڑکا سوال کر رہا ہے۔ "بہت جلد" میں تسلی آمیز لہجے میں کہتا ہوں۔

یہ ۲۲ نمبر کا سب سے بڑا لڑکا انور ہے۔ اس کے باقی دو بھائی ابھی بہت چھوٹے ہیں۔ انور اٹھارہ انیس سال کی عمر کا لڑکا ہے۔ میرا دوست بن گیا ہے اور اسی لئے مجھے ڈاکٹر کے بجائے نام سے مخاطب کرتا ہے۔ انور ایک کارخانہ میں کام سیکھ رہا ہے۔ مکینک بننا چاہتا ہے یعنی اس کا باپ اسے مکینک بنانا چاہتا ہے اور صرف اس لڑکے کی ٹریننگ کی تکمیل کی خاطر اکیلا ہی دس افراد کے اس کنبے کو اپنے کمزور جسم سے گھسیٹ رہا ہے۔ "میرا باپ ٹھیک کیوں نہیں ہوتا؟"

ہیپاٹائٹس کے اس مریض کو یرقان کی وجہ سے داخل کیا گیا ہے، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں کی پیلاہٹ، اس کے چہرے کی مایوسی اور اس کے لواحقین کی بے تابی بڑھتی جا رہی ہے۔

انور میرے سامنے آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑا ہے۔ "سوئپر نہیں سنتا۔ میرے باپ کا بستر کب سے خراب پڑا ہے۔ اگر میرے پاس دو روپے ہوتے اور میں اس کی جیب گرم کر سکتا تو وہ میری ضرور سنتا آپ اسے سمجھائیے۔"

اس کے آنسو مجھے متاثر کرتے ہیں۔ میں سوئپر کو بلا کر ڈانٹتا ہوں۔ اسے نکلوا دینے کی دھمکی دیتا ہوں۔

سوئپر میری طرف دیکھ کر مسکراتا ہے۔ جیسے کہہ رہا ہو اس میں آپ کا کیا قصور اس دنیا میں تو ایسا ہوتا ہی ہے یہاں تو ہر طرف سیڑھیاں ہیں۔ اور اس وارڈ میں بھی ایک سیڑھی ہے۔ سب سے نیچے سوئپر، پھر وارڈ بوائے، نرس ایڈ، اسٹوڈنٹ نرس، سسٹر، سسٹر، ہاؤس آفیسر، رجسٹرار اور پروفیسر اور جو جہاں ہے، وہ وہاں ہی رہے گا اور جو اوپر ہے وہ نیچے والے کو روند کر ہی اوپر جائے گا، تمہارے جوتے اگر میرے سر کے قریب رہتے ہیں تو اس میں تمہارا کیا قصور؟

انور بہت پریشان ہے۔ "میں کیا کروں" وہ پوچھتا ہے مجھ سے یا شاید اپنے آپ سے۔ اس کے گھر میں اب بیچنے کو کوئی چیز بھی باقی نہیں ہے اور اس کا کوٹ میلا ہو گیا ہے اور پھٹ گیا ہے اور اس کا باپ ٹھیک نہیں ہوتا، اور اس کے کام سیکھنے کی مدت ختم نہیں ہوتی۔

"مجھے وارڈ بوائے کی نوکری دلا دیجئے۔" وہ ایک دم لہجہ بدل کر کہتا ہے۔

"نہیں نہیں! میں اسے ہی تو بتا رہا ہوں تکلیف کے چند دن اور گزار لو، کام سیکھ کر تمہیں اچھی نوکری مل جائے گی۔"

"مگر ۔۔" وہ نظریں جھکا لیتا ہے، اور خاموش ہو جاتا ہے اور تھوڑی دیر بعد نظریں اٹھاتا ہے تو اس کی آنکھوں میں ایک سوال کا مفہوم تیر رہا ہوتا ہے "مگر" وہ مایوسی سے ڈوبے ہوئے لہجے میں کہتا ہے "آپ ٹھیک کیوں نہیں ہو جاتے ٹھیک کیوں نہیں ہوتے ۔۔؟"

میں سوچتا ہوں ہم دونوں کی زندگی کا انجن خراب ہو گیا ہے اور ڈبے پٹڑی پر کھڑے ہیں، مسافروں کو آگے جانا ہے۔ اب انجن بدلنا ہی پڑے گا یہ ڈبے یوں بیکار تو نہیں کھڑے رہیں گے۔ اب تمہاری ہی باری ہے!

"کیا سوچ رہے ہیں ۔۔؟" وہ پوچھتا ہے۔

"کچھ نہیں، میں کل بڑے ڈاکٹر سے بات کروں گا اور دیکھو فکر نہ کرو، تمہارے ابا ٹھیک ہو جائیں گے۔"

ڈیوٹی روم کے باہر وہ بے تابی سے ٹہل رہا تھا، میرے باہر آتے ہی وہ میری طرف لپکا۔

"تمہارے ابا کی حالت پہلے سے بہتر نہیں ہے، میں جانتا ہوں، کل میں نے بڑے ڈاکٹر سے بات کی تھی، شاید آپریشن سے وہ ٹھیک ہو جائیں۔"

اللہ دتا نے ان دو شستہ جملوں سے نظریں چرانے کو کہا تھا، جو اللہ کی طرف پر امید نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"مجھے تمہاری پریشانی کا احساس ہے، آپریشن بڑا نہیں ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ صرف کوئی معمولی سی پتھری ہو، تم کچھ اور مت سوچو۔ آپریشن معمولی ہے۔ مگر تمہیں خون کی دو بوتلوں کا انتظام کرنا ہوگا۔ اتنی دوائیں بھی ہوں گی ۔۔"

اس نے بے چینی سے ہاتھ ملتے ہوئے مجھے بے بسی سے دیکھا۔ "ایک سو ساٹھ روپے؟" وہ تقریباً گڑگڑانے لگا۔ "پیسے میرے پاس کہاں ہیں ۔۔؟"

"مجبوری ہے کچھ تو کرنا ہوگا۔ اگر خون کا انتظام نہیں ہوا، تو آپریشن نہیں ہو سکے گا۔"

"مگر۔ مگر ایک سو ساٹھ روپے میں کہاں سے لاؤں ۔۔" اس نے کوٹ کی خالی جیبوں میں ہاتھ ٹٹولتے ہوئے!

میں جانتا تھا پیسہ اس کے پاس نہیں ہے، اس کی جیبیں خالی ہیں، اس کی آنکھوں میں مستقبل کی ذمہ داریوں کا خوف میں نے پڑھ لیا تھا۔ اسکے اور اس کی نظروں جیسے کے چہرے پر بھی ہیں مجھے نظر آ رہی تھیں میں نے اسے نہیں بتایا کہ ہسپتال میں آج کل مفت خون کا انتظام نہیں ہوتا، مجھے وحشت ہونے لگی ۔۔! میں نے سلسلہ بند کر لیا۔

"تو پھر مریض کے یہاں رہنے سے بھی کوئی فائدہ نہیں۔ بڑے ڈاکٹر نے مجھ سے اس کی منتقلی کا ذکر کیا تھا

میں نے اسی لہجے میں یہ بات دہرا دی۔

"نہیں، نہیں! کچھ دن ٹھہر جائیے۔ بڑے ڈاکٹر سے کہیے کچھ دن ٹھہر جائیں۔" وہ فوراً باہر جانے والا ہے مگر تنخواہ دور جانے کے بعد کا پیریڈ اور دس دن خاموش گزار کر ملا۔ وہ پھر واپس آ گیا۔ "وہ آپریشن سے ٹھیک ہو جائیں گے؟" اس نے غیر یقینی لہجے میں پوچھا۔

دوسرے دن وہ سیدھا میرے کمرے میں آ گیا۔ "ابا ٹھیک ہو جائیں گے نا؟" اس نے آتے ہی پوچھا۔

پیسے نکالتے ہوئے اس نے میری طرف عجیب مشکوک نظروں سے دیکھا۔

روپیہ محنت سے حاصل کئے ہوئے روپے وہ پوری تسلی کر لینا چاہتا تھا۔

روپے نکال کر اس نے میرے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ "بڑی مشکل سے ملے ہیں۔" اس نے کہا "ابا کو ٹھیک ہو جانا چاہیئے۔" ڈاکٹر صاحب انہیں بچا لیجئے میری ٹریننگ میں صرف تین مہینے باقی رہ گئے ہیں۔"

جب میں وہاں سے اٹھ رہا تھا تو وہ اپنی ماں کو تسلی دے رہا تھا۔ "ڈاکٹر کہتے ہیں وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔"

میں آپریشن تھیٹر سے باہر نکلا۔ دل پر ایک بوجھ سا لئے ہوئے۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس سے نظریں ملا سکتا۔ انور میری طرف بڑھا اور میں نے جلدی سے ڈرائنگ روم میں گھس کر دروازہ بند کر لیا۔

آپ چاہے زبان سے کچھ نہ کہیں لیکن مریض کے لواحقین تھیٹر سے نکلتے ہوئے ڈاکٹروں کے چہروں کے تاثرات پڑھ لیتے ہیں۔

انہیں بھی شاید احساس ہو گیا تھا، جب میں باہر نکلا تو وہ سب رو رہے تھے۔ بین کر رہے تھے لیکن نہ جانے کیوں مجھے ان کے رونے میں وہ شدت نظر نہ آئی۔ جس شدت سے وہ پہلے اس کی تیمارداری کرتے تھے انہیں شاید احساس ہو گیا تھا۔

انہیں واقعی احساس ہو گیا تھا، آج ۲۴ نمبر کے بستر کے چاروں طرف بہت سے اٹینڈنٹ نہیں ہیں، صرف اس کی بیوی ساتھ والی بینچ پر گم سم بیٹھی ہے۔

انور ہر بار آیا اس کے چہرے پر خلافِ معمول آج کوئی چونکا دینے والا تاثر نہیں تھا، انور کو دیکھ کر اس کی ماں اچانک رو پڑی۔ "ان کی تو حالت اور خراب ہو گئی ہے ڈاکٹر۔"

"ہاں۔!" میں انور کو ایک طرف لے جا کر سمجھاتا ہوں۔ انسان کی بے ثباتی اور مجبوری کی بات کرتا ہوں۔ اور ہمت کر کے اسے بتانا چاہتا ہوں، حالانکہ مجھے احساس ہے کہ مجھے یہ بات نہیں کہنا چاہیئے، میں دل پر جبر کر کے اسے بتاتا ہوں کہ آپریشن سے معلوم ہوا ہے کہ اس کے باپ کو جگر کا سرطان ہے اور اس کا کوئی علاج نہیں ہے، اور اس کے بچنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

یہ کہہ کر میں دوسری طرف دیکھنے لگتا ہوں، وہ میری آنکھوں میں غور سے دیکھتا ہے، امید کی کوئی ہلکی سی رمق بھی اسے نظر نہیں آتی۔! وہ ایک لمحہ کھڑا رہتا ہے، اور پھر اسی خاموشی سے اٹھ کر چلا جاتا ہے۔

مجھے یقین نہیں آتا، وہ صرف خاموش ہو گیا اس کے انداز میں یہ وقار یہ فلسفیانہ اعتماد کہاں سے آ گیا، وہ رویا کیوں نہیں۔ اس وقت نہ جانے کیوں میرا دل چاہا تھا کہ وہ روتا، چیختا، گڑگڑاتا، میرا گریبان پکڑ کر کہتا۔ میں تم سے اپنے باپ کو لوں گا۔" لیکن وہ بس خاموشی سے اٹھ کر چل دیا، اور مریض کے پاس جانے کے بجائے باہر نکل گیا۔

انور چلا گیا تھا اور ایک دن گزر گیا اور پھر دوسرا اور تیسرا۔ ۲۲ نمبر بستر پر پڑا کراہ رہا تھا۔ اور اس کے قریب کوئی نہیں تھا۔ اور کوئی بار بار اس کے متعلق سوال نہیں کر رہا تھا۔ اچانک وارڈ میں خاموشی چھا گئی تھی اس سکون سے میرا دم گھٹنے لگا۔ آخر میں نے مجبوراً وارڈ بوائے کو اس کے گھر بھیج کر اسے بلایا —— وہ خاموشی سے میری کرسی کے قریب بینچ پر بیٹھ گیا۔ افسوس کرنے لگا کہ وہ وارڈ میں نہیں آ سکا اس نے ایک جگہ چپڑاسی کی نوکری کر لی ہے۔ اسے ایک سو بیس روپے مل رہے ہیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ خون کے پیسے اس نے ایک جگہ سے ایک ماہ کے وعدہ پر قرض لئے تھے، یہ قرض ایک ساتھ ادا نہیں ہو جائے گا وہ اسے قسط وار ادا کرے گا۔

وہ نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا لیکن اس نے اپنے باپ کے متعلق کوئی بات نہیں کی، تنگ آ کر میں نے اسے مریض کے پاس بیٹھنے کا مشورہ دیا۔ وہ اٹھ کر چلا گیا اور بستر کے ساتھ والی بینچ پر جا کر بیٹھ گیا اور اونگھنے لگا اور پھر چادر تان کر سو گیا۔

---

۲۲ نمبر کا مریض اپنی غلاظتوں میں لیٹا پڑا ہے، اور پانی مانگ رہا ہے اس کا پیار کرنے والا لڑکا ساڑھے چھ بجے صبح اٹھ کر نوکری پر چلا گیا ہے۔

یہ کیسی تبدیلی ہے یہ کیسی حقیقتیں ہیں۔ جو فطری عوق کے رشتوں پر اپنے بھیانک سائے ڈال رہی ہیں۔ تو یہ

ہی پیپل کے درخت پر سرمئی سناٹا بڑھتا جا رہا ہے۔ اور درخت پر چڑیاں شاید دن میں آخری بار بول رہی ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی میرے کان میں کہہ رہا ہے، "۳۲/LITZ/UT: یوٹیلیٹی" اور پھر چاروں طرف سے یہی آوازیں آنے لگی ہیں: "یوٹیلیٹی۔ یوٹیلیٹی"!!

میں حالیہ کے سامنے کھڑا ہوں، اب اسے میرے لئے چائے بنانے مجھ سے باتیں کرنے کی فرصت مل گئی ہے، وہ مسکرا رہی ہے، وارڈ کے اس بسورتے ماحول میں یہ مسکراہٹ کیسی عجیب لگتی ہے۔ میں اس کے چہرے پر جگمگاتی مسکراہٹ کو بغور دیکھ رہا ہوں۔

"سر ۳۲ نمبر کی حالت ٹھیک نہیں ہے" نرس ایڈا آکر بتاتی ہے۔

ہم دونوں بھاگتے ہیں، اس کی حالت واقعی ٹھیک نہیں ہے اس کے چہرے پر موت کی زردی چھپ رہی ہے اور آنکھیں اعتبار سے خالی ہو چکی ہیں، اس کی سانس اکھڑ رہی ہے اور نبضیں ڈوب رہی ہیں۔

"آکسیجن" میں چلاتا ہوں ـــ اور اس لمحہ بستر کے ساتھ بنچ پر لیٹے ہوئے انور کو دیکھتا ہوں ــــ وہ چادر اوڑھے ہوئے بے خبر سو رہا ہے!

میں انور کے چہرے سے چادر ہٹاتا ہوں۔ کتنا سکون ہے اس کے چہرے پر۔ شاید وہ کوئی خوب صورت خواب دیکھ رہا ہے "اٹھو! میں اسے جگاتا ہوں" اٹھو" وہ جھنجھلا کر میری طرف دیکھتا ہے "سونے دیں میں اوور ٹائم کر کے آرہا ہوں"

"انور! انور تمہارا باپ مر رہا ہے"

میں مریض کے ڈرپ لگا رہا ہوں۔ اس دوران انور پھر سو گیا ہے۔ میں لڑ رہا ہوں مگر ہاری ہوئی لڑائی، ایک گھنٹہ، دو گھنٹے پھر میں آکسیجن بند کر دیتا ہوں، اس وقت ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں۔ میں اس کا چہرہ چادر سے ڈھانپ دیتا ہوں۔ جواب ڈراؤنا ہو گیا ہے، اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اس کی نگاہوں کے سامنے سارا دنیا ہے اور وہ مرتے ہوئے کہہ رہا ہے، یوٹیلیٹی، یوٹیلیٹی،

۳۲ نمبر مر گیا ہے اور اس کے بستر کے قریب بنچ پر اس کا لڑکا بے خبر سو رہا ہے جو اس سے محبت کرتا ہے اور اس کے لئے فکرمند رہتا تھا۔ اور جو ـ!

میں اسے جھنجھوڑ کر اٹھاتا ہوں۔

وہ اٹھتا ہے، آنکھیں ملتے ہوئے پوچھتا ہے۔ "کیا وقت ہوا ہے؟"

وہ میرے چہرے پر غم کے جذبات پڑھ لیتا ہے!

"کیا ہوا۔" وہ پوچھتا ہے۔

"تمہارا باپ مر گیا۔" میں غم اور غصہ کے ملے جلے جذبات چھپاتے ہوئے اسے بتاتا ہوں۔

اسے تعجب نہیں ہوا۔ جیسے میں نے کوئی بڑی بات نہیں کہی۔ بس تھوڑی دیر کے لئے وہ زرد ہو گیا۔ وہ غم تھا یا مستقبل کی ذمہ داریوں کا خوف! میں فیصلہ نہیں کر پایا۔ اس نے اپنی جیب سے ٹٹول کر کے ٹوٹا پیکٹ نکالا ایک سگریٹ سلگائی کچھ بھی نہیں کہا، خاموشی سے بیسن کی طرف گیا اور چہرے پر پانی کے چھپکے مارنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد وہ میرے سامنے کھڑا تھا، اور بڑی متوازن بڑی غیر جذباتی آواز میں کہہ رہا تھا۔ "ان کو خون کی صرف ایک بوتل چڑھی تھی، دوسری بوتل کے اسی روپیہ باقی ہوں گے، وہ کس طرح ملیں گے۔"

میں اس کے انداز پر بے قابو ہو گیا۔ میرا دل چاہا خوب زور سے چیخوں! وہ خاموش کھڑا تھا اور اس کے باپ کی اَدھ کھلی نگاہیں، اعتبار سے خالی نگاہیں، ہمارے چہروں پر سوالیہ انداز میں جمی ہوئی تھیں۔

"بھول جاؤ۔" میں نے دل میں کہا۔ بھول جاؤ، ابھی ہماری دنیا ایسی ہی دنیا ہے، جو اعتبار سے خالی ہے ابھی رشتے ماں، باپ، بہن اور بھائی کے رشتے یوٹیلٹی کی ترازو میں تلتے ہیں، یہ رشتے ہیں بھی کہاں یہ ہماری ضرورتیں اب تم ضروری نہیں رہے، جذبات، خالی خولی جذبات، کوئی کب تک چاٹتا ہے، دوسرا انجن تیار ہے وہ ان ڈبوں کو جن کے مسافروں کو آگے جانا ہے لے کر آگے بڑھ جائے گا اور تمہیں پٹری سے ہٹا دیا جائے گا، آؤ اب ہم شنٹوں کو کینسل کرا لیں۔!

"موت کا سبب کیا لکھوں سر؟"

"سرطان" میں نے کوٹ پہنتے ہوئے کہا، اور مریض کی نگاہوں سے پیچھا چھڑا کر چلا آیا۔

ہوا

محمود احمد قاضیؔ

مبشر اپنی بیوی فاطمہ کے ساتھ سڑک کے اس طرف کھڑا ہو گیا ——

کاریں، بسیں اور موٹر رکشا تیز رفتاری سے سڑک پر سے گذر رہے تھے —— انہیں بہت دیر تک سڑک کے خالی ہونے کا انتظار کرنا پڑا —— فاطمہ مبشر کے پیچھے تقریباً چھپی ہوئی کھڑی تھی —— وہ بار بار پیشانی پر سے پسینے کے قطرے پونچھنے کے لئے اپنی سبز رنگ کی سوتی ساڑھی کا پلو استعمال کر رہی تھی۔ —— اسے یوں سڑک پر کھڑا رہنا کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا —— اس وقت تو خیر وہ اپنے شوہر کے جسم کی حفاظتی دیوار تلے کھڑی تھی ——

اگر اسے یہاں اکیلے کھڑا ہونا پڑتا تو شاید شرم سے اس کا دم ہی نکل جاتا وہ اتنی قدامت پسند بھی نہ تھی مگر مبشر کے بغیر گھر سے نکلنا اس کے لئے ناقابل قیاس تھا ——

ٹریفک کی زوں زوں کا شور کانوں کے پردے پھاڑ رہا تھا اور مبشر اپنے اکلوتے بچے ٹیپو کا ہاتھ پکڑے کچھ اُکھڑا اُکھڑا اور پریشان سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے کنپٹی پر بکھر جانے والے بالوں کو ہاتھ سے سنوارا اور سڑک خالی دیکھ کر بولا ——

"جلدی سے نکل چلو ——"

فاطمہ اس کے ساتھ چپک کر تیزی سے سڑک پار کرنے لگی —— سڑک کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر وہ کچھ دیر تک ہانپتے رہے، پھر سانس بحال ہوتے ہی ان کے قدم کوٹھی کی طرف اٹھنے لگے —— گیٹ پر پہنچ کر وہ رُک گئے —— چوکیدار وہاں کھڑا تھا۔

"اُدر خو چہ کدھر آتی ہے ——؟"

"خان —— ہم وہاں لان میں کچھ دیر کے لئے بیٹھنا چاہتے ہیں —— مبشر بولا!

چوکیدار نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا۔ اور انکار میں گردن ہلا کر بولا ــــ
" یہ کوٹھی ہے، مسافر خانہ نہیں ــــ ستانا ہے تو کہیں اور جا کر بیٹھو۔"
مبشر نے بڑی لجاجت سے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا ــــ
" بھائی یہ بچہ ضد کر رہا ہے ــــ کہتا ہے میں کچھ دیر کے لئے اس لان میں بیٹھوں گا ــــ کیونکہ یہاں ہوا ہے"
" صاحب اپنے بچے کو سمجھاؤ کہ ہوا تو ہر جگہ ہے ــــ"
نہیں ہمارے گھر میں ہوا نہیں ہے ــــ اسی لئے میرا دل وہاں بہت گھبراتا ہے میں ــــ میں تھوڑی دیر یہاں بیٹھوں گا، پھر چلا جاؤں گا ــــ" ٹیپو بول پڑا۔
" ہم ایسا نہیں کر سکتا بھائی ــــ سیٹھ کو معلوم ہوا تو ہمارا شامت آ جائے گا ــــ خو چہ جاؤ، جاؤ بھائی ــــ سیٹھ کا آنے کا ٹیم ہو رہا ہے ــــ"
مبشر نے فاطمہ کی طرف دیکھا ــــ فاطمہ نے شکست خوردہ انداز میں سر جھکا لیا ــــ
مبشر واپس جانے کے لئے مڑا ــــ لیکن ٹیپو اندر جانے کے لئے ضد کرنے لگا۔ مبشر روتے ہوئے ٹیپو کو گود میں اٹھا کر سڑک کے کنارے چلنے لگا ــــ سورج اب عین سر پر آ گیا تھا۔ گرمی ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی ــــ فاطمہ کا بلاؤز پسینے سے تر تھا ــــ اور مبشر کے بازوؤں کے ننگے حصوں پر پسینے کے قطرے کسی مجبور کی آنکھ سے ٹپکے ہوئے آنسوؤں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔
مبشر شادی سے پہلے کچی آبادی میں دو کمروں کے کوارٹر میں اپنے والدین اور دو چھوٹے بھائیوں کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ مگر جب اس کی شادی ہوئی تو گھر میں جگہ کی تنگی کی وجہ سے اس کو دوسری جگہ اٹھ جانا پڑا ــــ یہاں وہ ایک چھ منزلہ عمارت کی پانچویں منزل پر دو کمروں کے فلیٹ میں رہ رہا تھا ــــ وہ واپڈا میں بسلسلہ اکاؤنٹنٹ ملازم تھا ــــ اسے ساڑھے پانچ سو روپے تنخواہ ملتی تھی۔ جس میں سے وہ ڈھائی سو روپیہ اس فلیٹ کا کرایہ ادا کرتا تھا ــــ اور باقی میں اپنی بیوی کے سگھڑاپے کی بدولت پُر سکون زندگی بسر کر رہا تھا ــــ مگر چند دن پیشتر اس کی گھریلو زندگی کا سکون اس وقت برباد ہونا شروع ہوا، جب شام کے وقت اس کے بیٹے ٹیپو نے کھڑکی کے جنگلے کے ساتھ

لگ کر کہا ــــ!

" پاپا وہ سامنے کوٹھی کے اندر گھاس ہی گھاس ہے اسے کیا کہتے ہیں"

مبشر نے ٹیپو کے گال کو چوم کر کہا ــــ!

" بیٹے وہ لان ہے"

" تو ــــ یہ ہمارے پاس کیوں نہیں ــــ"

مبشر اس بات کا کیا جواب دیتا ــــ بس ٹکر ٹکر اپنے بیٹے کی طرف دیکھتا رہا۔

اس کا بچہ پھر بولا ــــ

دیکھو پاپا ــــ وہاں لان میں کتنے پھول ہیں ــــ اور بہت سے درخت بھی ہیں اور پتے زور زور سے ہل رہے ہیں ۔"

ہاں بیٹے وہاں ہوا جو ہے "

" تو پھر ہمارے گھر ہوا کیوں نہیں"

جب ــــ بیٹے ہوا یہاں بھی تو ہے ۔

نہیں پاپا ــــ یہاں ہوا کہاں ہے ــــ مجھے وہاں لے چلیں نا اس لان میں جہاں ہوا ہے ــــ "

پھر وہ لان کی طرف اشارہ کر کے بولا ــــ!

وہ دیکھیں پاپا ــــ وہ لڑکی تتلی کو پکڑنے کے لئے بھاگ رہی ہے ــــ"

ٹیپو دیر تک ایسی ہی باتیں کرتا رہا ــــ اور مبشر کے گرد بے بسی اور پریشانی کے ہیولے ناچنے لگے ــــ وہ سوچنے لگا ــــ یہ بچے بعض اوقات کیسی باتیں کرتے ہیں ــــ ٹیپو کو اس چیز کے متعلق نہیں سوچنا چاہیئے جو اس کے باپ کی دسترس میں نہیں ــــ اب میں اس لان کی ہوا کہاں سے لاؤں ــــ خریدنے سے مل نہیں سکتی ــــ چھیننے سے چھینی نہیں جا سکتی ــــ خواہش کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتی ــــ یہ تو میری سوچ کی بانہوں میں بھی قید نہیں ہو سکتی ــــ کیونکہ یہ ہوا ہے ، اور ہوا ــــ بس ہوا ہے ــــ اور یہ میرا بچہ ــــ اس کے بچے کا اصرار اس کی سوچ کے پاؤں بار بار اکھیڑتا رہا ــــ وہ اور تو کچھ نہیں کر سکتا تھا ــــ بس لڑکھڑا کر گر سکتا تھا ــــ مگر

کر پھر اٹھ سکتا تھا ـــ اور اٹھ کر پھر گر سکتا تھا ـــ اور ـــ

اس نے ٹیپو کو کھلونے لا کر دیئے ـــ مٹھائی لا کر دی ـــ فرش پر ہاتھ اور گھٹنے ٹیک کر اس کے لئے گھوڑا بنا ـــ منہ سے گکڑوں کوں کی آوازیں نکالیں ـــ فاطمہ نے ٹیپو کو کھیر پکا کر کھلانے کا وعدہ کیا ـــ کیونکہ وہ کھیر شوق سے کھاتا تھا ـــ اسے ایک نقلی پستول بھی لا کر دینے کا وعدہ کیا گیا ـــ مگر بے سود ـــ ٹیپو بدستور لان پر جانے کے لئے مچلتا رہا ـــ مگر بہرحال بچہ تھا ـــ رو رو کر تھک گیا تو سو گیا ـــ

مبشر اور فاطمہ نے اطمینان کا سانس لیا ـــ مگر آج ان کے چہروں کی زندہ مسکراہٹ ٹیپو کی ضد کے خنجر کی کاٹ سے لہو لہو ہو رہی تھی ـــ اس رات ان سے پیٹ بھر کر کھانا بھی نہ کھایا گیا ـــ

دوسرے دن مبشر حسب معمول آفس چلا گیا ـــ فاطمہ گھر کے کام کاج میں لگ گئی ـــ اور ٹیپو کھڑکی کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا ـــ وہ کوٹھی کے لان کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا ـــ شام کو مبشر گھر آیا تو ٹیپو اس وقت بھی وہیں جنگلے کے پاس بیٹھا تھا ـــ فاطمہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کو سب کچھ بتا دیا ـــ مبشر کی پریشانی اور بڑھ گئی ـــ رات کو جب دونوں میاں بیوی سونے کے لئے لیٹنے لگے تو یہ دیکھ کر ان کے دل سینے میں زور سے دھڑ دھڑ کرنے لگے ـــ کہ ٹیپو گھر میں نہیں تھا۔ مبشر تیزی سے سیڑھیوں سے اترتا ہوا سڑک پر آیا اور ٹیپو کو ادھر اُدھر تلاش کرنے لگا رات کے گیارہ بجے جب تھک ہار کر ناکام گھر کو واپس لوٹا تو اچانک اس کو خیال آیا۔

"کیوں نہ اس کوٹھی میں دیکھا جائے ـــ جس کے لان کو دیکھ کر ٹیپو دو دن سے مچل رہا ہے" مبشر نے چوکیدار سے کہہ کر جب اس کوٹھی کا پھاٹک کھلوایا ـــ تو تھوڑی سی تلاش کے بعد ٹیپو اسے لان کے ایک کونے میں پھولوں کی ایک کیاری کے پاس سویا ہوا ملا ـــ !

اس دن کے بعد یہ ہونے لگا ـــ کہ ٹیپو اپنے ماں باپ کی نظروں سے بچ کر کسی نہ کسی طرح اس لان تک پہنچنے کی کوشش ضرور کرتا ـــ جب اس پر سختی کی گئی تو وہ زرد پڑ گیا ـــ اس طرح اس کی صحت گرنے لگی ـــ مبشر نے اسے ایک ڈاکٹر کو دکھایا ـــ تو ڈاکٹر نے اس سے پوچھا ـــ !

"بیٹے کیا بات ہے تمہیں ـــ کیا تکلیف ہے ؟"

ٹیپو نے جواب دیا ـــ !

مجھے کوئی تکلیف نہیں ——— مجھے تو ہوا چاہیئے —— ہوا!"

ہوا —— ! ڈاکٹر نے حیران ہو کر کہا ———

"ہاں ہوا ———"

"جو اس لان میں ہے ——— جہاں ہر طرف گھاس ہے، پھول ہیں، درخت ہیں ——— اور جہاں تتلیوں کے پیچھے بھاگنے والی ایک لڑکی ہے ——— جو بڑا خوبصورت فراک پہنتی ہے —— جس کے سر کے بال ایک ربن میں بندھے ہوئے ہیں ———"

ڈاکٹر نے مبشر کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا ——— مبشر نے سر جھکا لیا۔ اور ٹیپو کو لے کر گھر آ گیا

مبشر نے ایک بار چڑ کر فاطمہ سے کہا

"یہ ٹیپو ایسا کیوں سوچتا ہے"

فاطمہ نے کہا ———!

اسے روکنا ہمارے بس میں نہیں ——— ضروری تو نہیں کہ جن چیزوں کے متعلق ہم نہیں سوچتے یا ہم نے نہیں سوچا ——— ان کے بارے میں ٹیپو بھی نہ سوچے ——— ہم اسے سوچنے سے تو نہیں روک سکتے ——— اسے سوچنے دو ——" اتنا کہہ کر وہ رو پڑی۔

اب مبشر نے تنگ آ کر بیرونی کھڑکی کے پٹ ہمیشہ کے لئے بند کر دیئے ہیں کیونکہ وہ یہی کر سکتا ہے ———!

مگر ٹیپو اب بھی بند کھڑکی کے ساتھ لگا کہا کرتا ہے

مجھے ہوا چاہیئے ——— مجھے ہوا چاہیئے ———!!!

زمین جاگتی ہے

مرزا حامد بیگ

اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے اور ہر طرف سناٹا ہے۔

"سن رہے ہو، کنوئیں میں سے چلتے پانی کی آواز آ رہی ہے، جیسے دریا بہتا ہو۔"

"لیکن کبھی ایسا دیکھا نہ سنا۔"

"ہاں کبھی نہیں۔"

دونوں ایک بار پھر اندھے کنوئیں کی منڈیر سے کان لگا دیتے ہیں۔

"وہ ابھی راستے میں ہوں گے۔"

ہاں اگر بہت جلدی بھی پہنچیں تو آدھی رات سے پہلے کیا پہنچیں گے۔"

وہ سیدھے ہو کر آمنے سامنے بیٹھ جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ اُن کی آنکھ میں سانپ کی آنکھیں ہیں۔

تو کیا تمہیں یقین ہے، انہیں دو ایسے آدمی مل جائیں گے، میرا مطلب ہے جن پر بھروسہ کیا جا سکے اور جو بعد میں الجھیں نہیں۔ دوسرے نے بات مکمل کر دی۔

"ہاں جو بعد میں الجھیں نہیں، مجھے تو مشکل نظر آتا ہے۔"

"اور اتنی لمبی رسی ————" وہ بات کو نامکمل چھوڑ دیتا ہے۔

"ہاں رسی ———— لیکن ہم، میرا مطلب ہے "

وہ آنکھ جھپکتا ہے۔

پھر دونوں تیزی سے آنکھیں جھپکتے ہیں۔

"کیا رسی اور آدمیوں کے بغیر اس میں نہیں اترا جا سکتا؟"

وہ تو یہی کہتے تھے، پر ہم نے خود ہی تو کہا تھا کہ ایسا ممکن نہیں۔
"اور وہ رسّی اور آدمی لینے چل پڑے۔"
دونوں ہنستے ہیں۔ پہلے کے قہقہے میں دوسرے کی آواز دب جاتی ہے اور اس کے بعد دوسرے کا قہقہہ بہت بلند ہے۔ پھر یکدم دونوں سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔
"تو پھر؟" دوسرا پہلے کی طرف دیکھتا ہے۔
"لیکن یہ ہے بہت گہرا، دن کے وقت بھی پانی نظر نہیں آتا۔"
کنوئیں میں جھانک کر کنکر اچھالتا ہے، اور دونوں ایک بار پھر منڈیر سے کان لگا دیتے ہیں۔
"حیرت ہے۔"
"بس یہی تو بات ہے، جس پر دل میں ہول اٹھتا ہے۔"
"شاید گہرائی زیادہ ہونے کی وجہ سے آواز نہیں آتی۔"
"گہرائی زیادہ ہو تو آواز زیادہ آتی ہے، چھوٹا سا کنکر بھی گھُن سے بولتا ہے۔"
تو پھر کیا بات ہے؟
"یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔"
دونوں خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔ کنوئیں سے مدہم آواز رُک رُک کر آرہی ہے، جیسے پانی چل رہا ہو۔
"میرا خیال ہے یہ آواز پانی کی نہیں ہے۔" پہلے نے ایک بار پھر بات چلائی۔
"پانی نہیں ہے تو بس آنا جانا ہی ہوگا۔"
"اور اگر پانی ہوا؟"
"تو کنکر پتھر آواز کیوں نہیں دیتے۔
دوسرے کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔
آواز مسلسل آرہی ہے۔
"پھر؟" دوسرا پہلے کی طرف دیکھتا ہے۔
پہلا کوئی جواب نہیں دیتا اور کنوئیں میں اُترنے لگتا ہے۔
"تم بھی آؤ، ذرا احتیاط سے، کنواں بہت پرانا ہے، پاؤں پھسل پھسل جاتا ہے۔"

"لیکن" ــــ دوسرا اُترنے میں تامل کرتا ہے۔

پہلا اب کنوئیں میں پھیلی سیاہی کا حصہ بن چکا ہے، اوپر سے دیکھنے پر نظر نہیں آتا۔

"چلے آؤ" ــــ پہلے کی آواز کنوئیں میں گونجتی ہے۔

"وہ آ گئے تو ــــ" دوسرا بات مکمل نہیں کرتا۔

"وہ آ گئے تو ــــ وہ آ گئے تو؟" آواز کی گونج ساری کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

دوسرا جو اس کائنات کا ایک حصہ ہے، محض ایک نقطہ ــــ وہیں مبہوت کھڑا ہے۔

پہلا نیچے اترتا چلا جاتا ہے۔ بوسیدہ اینٹیں جگہ جگہ سے اکھڑ چکی ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ پیر جما کر رکھ رہا ہے۔

اب کنوئیں میں سناٹا ہے اور صرف اس کے نیچے اترنے کی مدہم سرسراہٹ سنائی دیتی ہے۔

"پانی ــــ چلنا ــــ بند ــــ ہوگیا۔" کنواں اس کی آواز پر گونج اٹھتا ہے۔

یکایک وہی آواز ایک بار پھر شروع ہو جاتی ہے۔ پانی چلنے کی آواز، جس میں پہلے کی آواز کی گونج شامل ہے۔ کچھ پتہ نہیں وہ کیا کہہ رہا ہے۔

جب دوبارہ سناٹا چھا گیا تو دوسرے نے اُسے پکارا ــــ جواب میں اس کو اپنی آواز کی گونج سنائی دیتی ہے۔ وہ اسے پکارتا چلا جاتا ہے، لیکن کوئی جواب نہیں آتا۔

رات بھیگ چکی ہے۔ اب ان کے واپس لوٹنے کا وقت قریب ہے اور پانی چلنا بند ہوگیا ہے۔

پھر وہ بھی تیزی سے نیچے اترتا چلا جاتا ہے

کنوئیں میں بہت نیچے دھول ہی دھول ہے۔ اس کا دم گھٹتا ہے۔

کچھ دیر بعد دوسرے کے پاؤں جیسے زمین سے ٹکراتے ہیں اور اس کے ہاتھوں میں پہلے کا ہاتھ آ جاتا ہے، اوپر کو اٹھا ہوا۔ کنوئیں کی تہہ میں چاروں اطراف میں دھول مٹی ہے، درمیان میں صرف اس کا ہاتھ ہے جو کہنیوں تک بھربھری مٹی میں دبا ہے۔

اب کنوئیں میں مکمل خاموشی ہے، دوسرا اوپر آنے کی سکت نہیں رکھتا، اور جیسے پانی کی آواز ایک بار پھر آنے لگتی ہے۔

باہر ویسا ہی سناٹا ہے۔ وہ واپس آ رہے ہیں۔

اب وہ دو نہیں چار ہیں ــــــ چاروں دیر تک انہیں تلاش کرتے ہیں۔ کنوئیں میں جھانکتے ہیں۔
تیسرے اور چوتھے کی نظریں ٹکراتی ہیں، پانچواں، چھٹا ان دونوں کی طرف دیکھ رہے ہیں۔
"بات دراصل یہ ہے کہ ہم چار آدمی کچھ نہیں کر سکتے۔" تیسرا ان سے مخاطب ہوتا ہے۔
"ہمارے پاس رسی تو ہے ہی، بس دو اور آدمیوں کی ضرورت ہو گی۔ ہم میں سے دو کو نیچے اترنا ہو گا اور باقی چار باہر رہیں گے۔"

چوتھا بات کو مکمل کر دیتا ہے ــــــ

پانچواں اور چھٹا یک زبان ہو کر، "جو چیز اوپر لانی ہے خاصی بھاری ہو گی۔"
وہ چپ رہتے ہیں، پھر تیسرا جیسے بات ختم کر دیتا ہے۔
"سنا تو یہی تھا، یوں بھی سونے کا وزن زیادہ ہوتا ہے۔"
اب پانچواں اور چھٹا دو قابلِ اعتبار آدمیوں کی تلاش میں شہر کی طرف جا رہے ہیں۔

رات دھیرے دھیرے بیت رہی ہے۔
"سن رہے ہو، کنوئیں میں سے چلتے پانی کی آواز آ رہی ہے، جیسے دریا بہتا ہو۔"
"لیکن کبھی ایسا دیکھا نہ سنا۔"
"ہاں کبھی نہیں۔"
دونوں کنوئیں کی منڈیر سے کان لگا دیتے ہیں۔
"وہ ابھی راستے میں ہوں گے۔"
"ہاں اگر بہت جلد بھی پہنچیں تو صبح۔"
وہ سیدھے ہو کر آمنے سامنے بیٹھ جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں ــــــ اُن کی آنکھوں میں سانپ لہریئے لیتا ہے۔

سیاہ آنکھ میں تصویر

مستنصر حسین تارڑ

لازرو کی لاش کئی روز تک مقدس پہاڑی کی چوٹی پر گڑی صلیب سے جھولتی رہی۔
انہوں نے اسے صلیب پر میخوں سے گاڑنے کی بجائے ایک رسہ لٹکا کر پھانسی دی تھی۔ میخیں مہنگی ہوتی ہیں۔ ایک مرتبہ گاڑ دی جائیں تو آسانی سے اکھڑتی نہیں۔ ضائع ہو جاتی ہیں۔ رسہ سستا ہوتا ہے۔ پھانسی دینے کے لئے کوئی اور مجرم نہ بھی ملے تو اس کے ساتھ ڈول باندھ کر کنوئیں میں سے پانی نکالا جا سکتا ہے۔

اس کی مردہ آنکھیں کھلی تھیں۔

گردن ایک ایسے زاویے پر ڈھلکی ہوئی تھی۔ دور سے لگتا جیسے وہ ہنستے ہنستے ایک دم ترچھا ہو کر ساکت ہو گیا ہو...... جیسے کسی "وِچ ڈاکٹر" نے چیتھڑوں سے بنے ہوئے گڈے کو رسے سے باندھ کر لٹکا دیا ہو......

اور وہ بے اختیار جھولتا رہے۔

اس کی مردہ آنکھیں کھلی تھیں۔

خانہ بدوشوں کے غاروں کے دہانے ششدر، حیرت زدہ کھلے تھے۔ جیسے ہابیل کے قتل پر پہاڑ کا منہ کھل گیا۔ زبان باہر لٹک گئی تھی۔ سنگلاخ سینے میں سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔

مقدس پہاڑی کے دامن تک البیسین کا مورش محلہ دھوپ میں سفید ہو رہا تھا۔ تہ در تہ میں دریائے حدرہ کے پانی تھے۔ سامنے جبل سبیکہ پر سرخ پتھر کا معجزہ، قصر الحمراء گرمی میں چمک رہا تھا...... مگر لازرو ان سب سے لاتعلق مردہ آنکھیں کھولے جھولتا رہا۔

شارع چابنیر کے پگھلے ہوئے کولتار پر ابھی تک شراب کے خالی ڈرم، ریت کی بوریاں اور گھریلو فرنیچر بکھرا پڑا تھا...... لیکن کہیں خون کے دھبے تھے سوکھے ہوئے۔ جیسے کسی بڑھیا کے لپ سٹک زدہ ہونٹوں پر پپڑیاں ابھرتی ہیں۔ یہاں بیری کیڈ تھا۔ البیسین کے باسیوں نے کئی روز تک فرانکو کی قاہر افواج کا مقابلہ کیا۔

ہاں تک کہ وہ پورے غرناطہ سے کٹ کر استقامت کا ایک جزیرہ بن گئے۔ فاشسٹوں نے دریائے حدرہ میں
ے سانس لینے والے پانی کے پائپ کاٹ دیئے تھے، اور جب متعدد بچوں کے پیاسے مر جانے کے باوجود لہزن
نے ہتھیار نہ ڈالے تو البیسن پر ہوائی جہازوں سے بم برسائے گئے۔۔۔۔۔ بیری کیڈلوی تو اس کے ساتھ ہی
روں کی سفیدی کی ہوئی چمکتی دیواروں پر مکینوں کے خون اور گوشت کے چیتھڑے یوں برسے کہ ان
گہرے ہلکے اور شوخ سرخ رنگوں کی تصویریں ابھر آئیں۔ جنہیں آنے والی نسلوں نے مٹانے کی کوشش کی۔۔۔
ن پر قلعی کے کئی پوچے پھیرے مگر ان کے رنگ اور گہرے۔۔۔۔ مزید شوخ ہوتے چلے گئے۔ الحمرا کے
جھول تھے، غرناطہ کے میونسپل قبرستان میں روزانہ سینکڑوں افراد آزادی سے سانس لینے کی خواہش کی
داش میں اپنے جسم میں داخل ہونے والے سیسے کے بوجھ سے سرنگوں ہوتے رہے۔ شہر سے چند میل کے فاصلے
پر عرب عہد کے ایک پرفضا تالاب کے کنارے بھی فاشسٹوں نے آزاد خون کو منجمد کیا اور پھر اسے ایک
جتماعی قبر میں بلڈوزروں سے دھکیل دیا۔ ان سینکڑوں لاشوں میں گارسیا لورکا کا مردہ جسم بھی تھا۔ بل
ڈوزر کے سرد بلیڈ لورکا کے سرد تر جسم میں کھبنے پر بھی نہ جان سکے کہ یہ ایک شاعر کا بدن ہے کہ اس کے مرنے
پر سوگواروں نے کہا تھا، گارسیا لورکا مر گیا اب غرناطہ بغیر دل کے ہے۔

لارنزو کی سیاہ مرجھاتی ہوئی سکڑتی آنکھوں کے سامنے اس کا محلہ البیسن سناٹے کے سمندر میں دیکھے
ہوئے ایک ویران جزیرے کی مانند آہستہ آہستہ جھول رہا تھا۔۔۔ قدیم موریش حویلیاں سنسان پڑی تھیں اور ان
کے خاموش فواروں کے سوکھے ہوئے تالابوں میں بچوں کی لاشیں منہ کھولے دھوپ میں اکڑ رہی تھیں مکانوں
کے دروازے کھلے تھے اور مکینوں کے پھٹے ہوئے جسم چوکھٹوں پر اوندھے پڑے تھے۔ سوکھی ہوئی نالیوں کی پیاس
کے لئے گاڑھا خون ناکافی تھا کہ مکانوں میں سے نکلتے ہی وہ سرخ چیچھڑوں میں بدل چکا تھا۔ ہر سو خاموشی
تھی صرف مقدس پہاڑی پر کلیسا کا گھڑیال فتح کی خوشی میں جھول رہا تھا اور اس کی گونج البیسن کی فضاؤں
میں بھوکے گدھ کی طرح تیر رہی تھیں۔ لارنزو کی لاش کئی روز تک مقدس پہاڑی کی چوٹی پر گڑی صلیب
سے جھولتی رہی۔

لارنزو کو ہسپانوی خانہ جنگی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اسے نہ تو ڈی۔۔۔۔ سے کوئی خاص انس تھا اور نہ ہی
وہ فرانکو کے بارے میں اچھے یا برے جذبات رکھتا تھا۔ اسے تو نیشنلسٹ اور ری پبلکن کے الفاظ ادا کرنے میں
بھی دشواری پیش آتی تھی۔۔۔۔ وہ سیدھا سادا خانہ بدوش تھا۔ موسم گرما میں ملک کے طول و عرض میں

منعقد ہونے والی گھوڑوں کی منڈیوں میں جاکر دہقانوں کو عمدہ نسل کے گھوڑے خریدنے میں مدد دیتا، مشوروں کی فیس وصول کرتا اور فرصت کے لمحات میں انہی دہقانوں کی جیبیں کاٹتا۔ سردیوں میں وہ اپنے مختصر غار میں بیٹھ کر بے تحاشا وینو پیتا اور شام کو اپنی بیوی اور بیٹی کو عصمت فروشی کے لئے بھیج کر خود مزید وینو پیتا اور بالآخر مدہوش ہو کر سو رہتا۔ کہنے کو تو اس کے ہاں دس بچوں نے جنم لیا مگر وہ ہر بچے کی پیدائش پر اس کا ناک نقشہ دیکھ کر پہلے اطمینان کر لیتا کہ نومولود اسی کا ہے۔ اگر خدوخال میں اس کی سیاہ آنکھوں اور خنجر کی نوک ایسی ناک کا کوئی شائبہ نظر نہ آتا تو وہ اسے بلاتکلف کسی اور خانہ بدوش کو تحفۃً دے دیتا.... لڑکے جیبیں کاٹنے کے لئے موزوں تھے، اور لڑکیاں ظاہر ہے عصمت فروشی کے لئے..... یوں اس کے پاس اس چھان پھٹک کے بعد صرف دو بیٹے آرتورو اور آندریس اور ایک بیٹی آوے لا بچی تھی۔ خانہ بدوشوں میں اس کی شرافت کا چرچا تھا کہ وہ بچوں کو اغوا کرنے کا بےحد مخالف تھا اور جوانی کے ابتدائی ایام کے سوا اس نے آج تک کسی کو قتل نہیں کیا تھا..... زندگی بےحد پرسکون اور خوشگوار تھی مگر ایک روز جب وہ اپنے غار میں وینو کے نشے میں دھت لیٹا گٹار پر فلیمنکو کی دھن بےحد اورٹ پٹانگ طریقے سے بجا رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس اداس دھن کے پس منظر میں کوئی ہولے ہولے پٹاخے چھوڑ رہا ہے۔ پہلے تو وہ اسے خمار آلود ذہن میں کلبلاتے خون کا کرشمہ سمجھا مگر جب آوازیں بلند ہوتی چلی گئیں۔ تو وہ گٹار کی ٹیک لگا کر اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا باہر آگیا۔ تیز دھوپ اس کی سرخ آنکھوں میں باندریلو کی برچھیوں کی طرح کھب گئی۔ البیسین کے چند مکانوں کی سفید دیواروں کو دھواں چاٹ رہا تھا۔ گولیوں کی آواز بھی ادھر سے ہی تیرتی آرہی تھی۔ وہ غصے میں بڑبڑاتا ہوا غار میں واپس آگیا اور کچے فرش پر اوندھا لیٹا سرخنکی کو سونگھتا ہوا اونگھنے لگا۔ اس کے دونوں بیٹے جو نزدیکی قصبے لوشہ میں ہونے والے ایک گھوڑوں کے میلے میں گئے ہوئے تھے شام کو لوٹے تو ان کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ پاپا غرناطہ میں فرانکو کے فوجی داخل ہو گئے ہیں البیسین کے باسیوں نے شارع چاپنیریہ پر بیریکیڈ کھڑا کر کے ان کا مقابلہ شروع کر دیا ہے..... ہم بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچے ہیں

لارنزو نے سر میں بھٹتے درد سے گرم ریزوں کو ماتھے پر چپت لگا کر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور بیزاری سے بولا "یہ سپانیولوں کی آپس کی لڑائی ہے ہم خانہ بدوشوں کا اس سے کیا تعلق جتنے زیادہ مریں اتنا ہی بہتر ہے۔ لاشوں کی جیبیں کاٹنا نسبتاً آسان کام ہے۔"

تھوڑی دیر بعد آوے لا غار میں داخل ہوئی تو وہ بھی نچڑے ہوئے کپڑوں کی طرح سفید اور سلوٹوں سے

بھرپور تھی۔" دیکھو پاپا انہوں نے میرے کپڑے بھی پھاڑ دیئے"

لارنزو کو رہ رہ کر البسین کے باسیوں پر غصہ آ رہا تھا کہ یقینی شکست کا سامنا کرنے کے باوجود وہ اتنی ڈھٹائی سے بیری کیڈ کا دفاع کیوں کر رہے تھے۔ اور یوں وہ سارا دن غار کی تنہائی میں شراب سے لطف اندوز ہونے کی بجائے فلیپز کے کڑوے سگریٹ پھونکتا رہتا کہ تمام اہل خانہ نے خانہ جنگی شروع ہونے کے بعد غار سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔

ایک روز وہ تنگ آ کر اپنے پرشور غار میں سے باہر نکلا اور البسین کے گلی کوچوں میں بے مقصد گھومنے لگا چند روز پیشتر کے چیختے چلاتے پُرہجوم اور زندہ البسین کی بجائے اس کے سامنے ایک مردہ محلے کے سناٹے تھے، صرف کبھی کبھار کسی بچے کے رونے کی گھٹی گھٹی آواز آتی اور بند ہو جاتی جیسے کسی نے منہ پر ہاتھ کا پھٹر رکھ دیا ہو۔ ویرانی کے علاوہ اسے جس چیز نے حیرت زدہ کیا سوکھے ہوئے فوارے اور خشک نالیاں تھیں جو عربوں کے زمانے سے آج تک کبھی خشک نہیں ہوئی تھیں۔

"پانی کیوں نہیں چل رہا؟" اس نے سوچا اور کندھے اچکا کر واپس غار کی جانب چل دیا۔

"پانی کیوں نہیں چل رہا؟" اس نے بے دھیانی میں چھت کی طرف دیکھا جس کے ساتھ اس کا شراب کا مشکیزہ لٹک رہا تھا۔

"انہوں نے بند کر دیا ہے" آرتورو نے آہستہ سے کہا۔

"تم لوگ کیا پیتے ہو۔" اس نے مشکیزہ اتار کر ایک طویل گھونٹ بھرا۔

"کچھ بھی نہیں۔" ان سب نے بے دلی سے جواب دیا۔ "پچھلے کئی روز سے پانی بند ہے۔ فوجیوں نے حدرہ سے پانی کھینچنے والے پائپ کاٹ دیئے ہیں۔" آندریس نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا "البسین کے رہنے والے پیاسے ہیں۔ وہ اپنے باغوں میں سے پودے اکھاڑ کر ان کی جڑیں چوس رہے ہیں۔ بیری کیڈ پر لڑنے والے نیم بیہوشی کے عالم میں ہیں۔ عورتوں کی چھاتیاں سوکھ گئی ہیں۔ بچوں کی زبانیں ان کے منہ سے باہر لٹک رہی ہیں۔ مردہ سانپوں کی طرح۔"

"بچوں کی زبانیں؟" لارنزو لڑکھڑا گیا۔ "لیکن یہ تو ظلم ہے۔ ان کو تو پانی دینا چاہیئے۔ بچے نیشنلسٹ یا ری پبلکن نہیں ہوتے۔۔۔۔ وہ تو صرف۔۔۔"

"ہمارا دماغ کیوں چاٹتے ہو، فرانکو سے جا کر پوچھو،" اس کی بیوی چیخی "کم از کم جب تک تمہارے درجن بھر مشکیزے خالی نہیں ہوتے تم پیاسے نہیں مرو گے"۔

"لیکن تو ظلم ہے......" لارنزو المکمل سے پھولتی زبان بار بار لبوں پر پھیر کر بڑبڑاتا رہا۔

اس شب لارنزو نے دو خالی مشکیزے کاندھے پر کسے اور منفرد پہاڑی پر اگے ہوئے تھوہر اور ناگ پھنی کے پودوں تلے پوشیدہ اس قدیم غار میں اترا جس کا علم پورے غرناطہ میں صرف اسے ہی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ موروں کے زمانے میں متعدد زیر زمین راستے البیسین کو دریا کے پار الحمرا کے سرخ ایوانوں سے ملاتے تھے۔ صدیوں کا بوجھ ان خفیہ راستوں پر بھی پڑا اور آہستہ آہستہ ان کے خالی پیٹ مٹی سے بھر گئے۔ عالم نوخیزی میں جب لارنزو نے اپنے ایک رقیب کو جسم پر ہنخیں گاڑ کر اسی کے دروازے پر مصلوب کیا تھا کہ وہ کسی پناہ گاہ کی تلاش میں ایک ایسے راستے کو دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ زمین دوز راستہ اگرچہ بے حد مخدوش حالت میں تھا مگر لارنزو کا لچکیلا جسم اس میں سے ایک سیاہ ناگ کی طرح رینگتا بل کھاتا دریائے حدرہ تک پہنچ جاتا۔ وہ کئی ماہ تک اس سرنگ میں روپوش رہا۔ بعد میں یہ خفیہ پناہ گاہ اس کی محرم بن گئی۔ بیوی سے ڈانٹ پڑتی تو وہ چپ چاپ اس میں اتر کر پہروں کڑھتا رہتا۔ جسموں کے استعمال کے لئے بھی اس نے یہی جگہ مخصوص کر رکھی تھی۔ کبھی کبھار وہ تنہائی کا خواہش مند ہوتا تو شراب کا مشکیزہ کندھے پر ڈال کر اس میں غائب ہو جاتا مگر اس شب اس کے کندھے پر صرف خالی مشکیزے تھے۔

رات گئے جب لارنزو اپنے غار میں واپس آیا تو اس کا نم آلود جسم مٹی سے یوں لتھڑا ہوا تھا جیسے وہ قبر میں سے نکل کر آیا ہو۔ اس نے مشکیزوں کو بمشکل کاندھے سے اتارا اور زمین پر لیٹ گیا "آر تورو ...... تم سب لوگ ایک ایک گھونٹ بھر لو..... ہم خانہ بدوشوں ہسپانویوں کی نسبت زیادہ سخت جان واقع ہوئے ہیں..... باقی پانی البیسین میں لے جاؤ اور پیاسے بچوں کے حلق تر کر دو کہ بچے نیشنلسٹ یا ری پبلکن نہیں ہوتے۔

اگلے روز تک لارنزو کا یہی معمول رہا...... اور بالآخر فضائی حملے کی تاب نہ لاتے ہوئے بیری کیڈ ٹوٹ گیا۔ فرانکو کے فوجی البیسین میں داخل ہو گئے۔

غار سے نکلنے سے پیشتر اس کے تینوں بچوں نے ایک مرتبہ پھر اس کی منت کی... "پاپا وہ سب کو

قتل کر رہے ہیں..... ہم سیرالنوادا کی پہاڑیوں میں روپوش ہونے کے لئے جارہے ہیں تم بھی ساتھ چلو...... پاپا؟"

لارنزو کی آنکھوں سے پھوٹی ہوئی زبان بمشکل حرکت میں آئی "تم بزدل ہو..... وہ ہمیں کچھ نہیں کہیں گے..... یہ ہسپانویوں کی آپس کی لڑائی ہے۔ ہم خانہ بدوشوں کا اس سے کیا تعلق؟"

لارنزو کو ملٹری ٹریبونل کے سامنے پیش کیا گیا۔

"یہ شخص بیری کیڈ پر لڑنے والے کمیونسٹوں کو پانی سپلائی کرتا رہا ہے"۔

لارنزو کی لاش کئی دن تک مقدس پہاڑی کی چوٹی پر گڑی صلیب سے جھولتی رہی۔

سیرالنوادا پہاڑیوں کی پتھریلی عافیت میں اتر کر ان تینوں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ مقدس پہاڑی کے سفید جسم پر گڑی صلیب سے لٹکا ہوا ایک پتلے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

ہسپانیہ ایک وسیع ملک ہے۔ صحرائی وسعتوں، برف پوش پہاڑوں اور گرد آلود میدانوں کا ملک۔

ان تینوں نے ان تینوں جغرافیائی حالتوں میں کئی ماہ تک روپوشی کا سفر کیا۔

ایک تپتی ہوئی جھلسا دینے والی دوپہر نے انہیں دریائے حدرہ کے کنارے آباد قدیم قصبے ثوریا میں دیکھا۔ دریا کا خنک پانی ان کے جھلسے ہوئے نیم سیاہ بدنوں میں جذب ہوا تو انہوں نے اپنے گرد نگاہ ڈالی۔ ..... پسینے سے نچڑتا ایک خاموش ہجوم مقامی بل رنگ کی جانب قدم گھسیٹ رہا تھا۔ وہ تینوں ان گرم جسموں کے الاؤ میں گم ہو گئے۔

کھنڈر نما بل رنگ کا نصف حصہ سائے میں سستا رہا تھا اور بقیہ نصف حصے کو دھوپ کے جلتے لب چوس رہے تھے۔ اکھاڑے کے درمیان میں ایک سیاہ بل کا بھاری بھرکم دھبہ لرز رہا تھا..... اور اس کا کمر خمیدہ مالک ہاتھ فضا میں چھوڑے شور مچا رہا تھا "آئیے اور اس براد تیول کے ساتھ دو دو ہاتھ کیجئے۔ پانچ منٹ کے کھیل کے لئے صرف دس پیسے"۔

دیہاتی نوجوان بوسیدہ پتلونیں اڑسے، غرور سے اپنے جنگلی گھاس بالوں پر ہاتھ پھیرتے اکھاڑے میں داخل ہوتے اور دس پیسے مالک کی دائیں لپکاتی ہتھیلی پر رکھ کر پانچ منٹ کے لئے بل کے آگے پیچھے ہو ہو کر کے دوڑتے، اپنی بہادری جتا کر ہانپتے ہوئے واپس اپنی نشستوں پر آ بیٹھتے۔ بڑے لڑکے آر آر روتے

سیاہ آنکھیں بیچ کر بل کو غور سے دیکھا۔ "آندریس!" اس نے بھائی کے کندھے پر ہاتھ کا گدہ بٹھاتے ہوئے کہا۔ "فراکو کیسا ہے؟"

آندریس کی آنکھوں سے سیاہ حیرت پھوٹی اور بہہ نکلی "مجھے کیا معلوم آرتورو، میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔"

"میں نے دیکھا تو نہیں لیکن جانتی ہوں۔" آوے لانے گلے میں ہاتھ کی کپی اتاری اور پسینے سے تر بتر چھاتیوں کو پونچھا۔ "وہ اس موت کی طرح سیاہ ہے جس میں اس نے ہمارے پاپا کے جسم کو ڈبو دیا ہے۔"

آرتورو کی نشست پر اس کا بوجھ ختم ہو گیا وہ اٹھا۔ پہچان کا لمحہ آن پہنچا تھا۔ "ہم خانہ بدوشوں میں روایت ہے کہ اگر انتقام لینے کے لئے دشمن نہ مل سکے تو اس کی خصلت کے کسی اور شخص کو موت کے گھاٹ اتار دو۔"

"اسی لمحے اس کے شانوں کے ساتھ دو سر نمودار ہوئے جو آندریس اور آوے لا کے تھے ..... "آرتورو تم نہیں جا سکتے ..... سیاہ بل بے حد طاقتور ہے۔" لیکن تین سروں کی اس قطار میں سے ایک سر نے حرکت کی اور بل رنگ کے درمیان جا کھڑا ہوا۔

آرتورو نے دس پیسیتے ہتھیلی کی رال پر چپکائے اور سیاہ بل کے سامنے گردن ٹیڑھی کر کے کھڑا ہو گیا --- بل کی چمکتی آنکھوں میں ایک پتلا جھول رہا تھا --- لارنزو کی لاش کئی روز تک مقدس پہاڑی کی چوٹی پر گڑی صلیب سے جھولتی رہی۔

"ہے تورو۔" آرتورو نے ریت پر تھوکا اور نفرت کا لعاب منہ سے پونچھ کر بل کو شش کارا۔ بل کی سیاہ آنکھوں میں ایک پتلا جھول رہا تھا۔ میں نے بستیوں کو ویران کیا ہے۔ بچوں کو پیاسا مارا ہے۔ نصف ہسپانیہ کو ہلاک کر ڈالا ہے۔ یہ خانہ بدوش گرہ کٹ کا بچہ میرے مقابلے پر ..... ہم خانہ بدوشوں میں روایت ہے کہ اگر انتقام لینے کے لئے دشمن ....

آرتورو تپتی ریت پر پھیلا اپنے جسم میں اترے ہوئے دو سینگوں کو تھامے بل کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا ..... اس کی مردہ آنکھیں کھلی تھیں اور ... بل کی سیاہ آنکھوں میں ایک پتلا جھول رہا تھا۔

اس شب آندریس اور آوے لا نے دریائے مدرہ کی ریت میں اپنے بھائی کا سرد جسم دفن کیا۔ "ہمیں قسم ہے خانہ بدوشوں کے تمام دیوی دیوتاؤں کی ..... ہم جب تک سیاہ بل کو ہلاک نہ کر دیں گے ایک دوسرے کو ناموں کی بجائے حرامی سور کہہ کر پکاریں گے۔

ہسپانیہ ایک وسیع ملک ہے۔ صحرائی دستوں، برف پوش پہاڑوں اور گرد آلود میدانوں کا ملک۔

ان دونوں نے ان تینوں جغرافیائی حالتوں میں کئی برس تک سفر کیا۔ اس سفر کی سمت کا تعین سیاہ بل کے سموں کے نشان تھے۔ بل کے مالک کا بوڑھا ذہن جانتا تھا کہ دو نیم سیاہ جسم بدلتی رتوں میں ان کا تعاقب کر رہے ہیں۔ گرم۔ سرد، نم آلود موسموں میں وہ اپنی روزی کے واحد وسیلے کی حفاظت کرتا، ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہ ہوتا۔۔۔۔ آندریس اور آوسے لا کے لباسوں میں اڑسے ہوئے خنجر کئی بار زنگ آلود ہوئے مگر انہیں ہسپانیہ کی دھرتی سے رگڑ رگڑ کر پھر سے تیز کر لیا جاتا۔۔۔۔ کون جانے کب!۔۔۔۔

قشتالیہ کے وسیع ریگزاروں میں پہاڑی عقابوں نے نیچے دیکھا۔۔۔ کانٹے دار جھاڑیوں اور بگولوں کے درمیان ایک بوڑھا ایک سیاہ دھبے پر ہاتھ رکھے یوں چل رہا ہے جیسے وہ کسی بل کا بھاری اور کھردرا جثہ نہ ہو بلکہ صابن کی ایک گیلی ٹکیہ ہو جو ذرا سی غفلت سے اس کے ہاتھوں سے پھسل جائے گی۔ اور کچھ فاصلے پر دو جسم جن کی چار سیاہ آنکھیں صرف ایک کالے دھبے پر جمی رہنے کیلئے کھلی تھیں۔

موڑدوں کے ایک پہاڑی حصار کے کھنڈروں میں رہنے والے ایک الو نے آنکھیں گھمائیں اور ٹوٹے ہوئے جھروکے میں سے اس سڑک کو دیکھا جس پر زیتون کے باغ امڈے چلے آ رہے تھے۔۔۔۔ اور سڑک پر۔۔۔۔ ایک بوڑھا مگر اب بہت بوڑھا۔۔۔۔ ایک سیاہ بل مگر اب چمکیلے جسم کی بجائے ماند پڑتی ہوئی کھال، اور کچھ فاصلے پر۔۔۔۔ چار آنکھیں۔۔۔۔ منتظر!۔

وہ اپنے سفر کے دوران وادی غرناطہ میں سے بھی ایک مرتبہ گزرے۔ مقدس پہاڑی پر گڑی صلیب برسات کی بوچھاڑوں اور گرما کی حدتوں سے شکستہ ہو کر گرنے کو تھی۔۔۔ جھلسنے والا پیلا آب غائب تھا مگر۔۔۔۔ آندریس اور آوسے لا کے لئے نہیں کہ وہ اسے بل کی آنکھوں میں جھرلتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

ان دونوں نے ان تینوں جغرافیائی حالتوں میں سات برس تک سفر کیا۔ ایک جانور، ایک انسان

۔۔۔۔ دو نیم سیاہ جسم۔

بالآخر بل بوڑھا ہو گیا۔۔۔۔ وہ جو پہلے اس کے ظلم سے خائف تھے اب زیر لب احتجاج کرنے لگے اس کی دہشت اور طاقت کو دھرتی نے دھیرے دھیرے ختم کر دیا۔۔۔۔ بل بوڑھا ہوا تو ناکارہ ہو گیا کہ اب اس کے ساتھ کھیلنے پر کوئی بھی آمادہ نہ ہوتا۔۔۔۔ ایسے بیکار جسم کا اور کیا مصرف ہو سکتا ہے سوائے اس کے کہ اسے کسی بوچڑ خانے میں فروخت کر دیا جائے۔

کمر خمیدہ بوڑھا بوچڑ خانے کے جس دروازے میں سے پستیوں سے بھری جیبیں لے کر نکلا۔ اسی

دروازے میں کچھ دیر بعد آندریس اور آدے لا کے جسم واخل ہوئے انہوں نے اپنے خنجر آج صبح ہی تیز کئے تھے۔

بل کو اس کے بڑھاپے نے بوچڑ خانے کے کچے فرش پر بے سدھ لٹا رکھا تھا۔ ان دونوں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔۔۔ان میں ظلم کی تصویر ابھی تک واضح اور متحرک تھی کہ اس کے رنگ کبھی ماند نہیں پڑتے۔

بوچڑ خانے کا مالک ان کے قریب آیا لیکن زیادہ قریب نہیں کہ خنجر آج ہی تیز کئے گئے تھے: "تم کس نیت سے یہاں آئے ہو؟"

"یہ سیاہ بل ہمارے پاپا کا قاتل ہے۔۔۔اس کے سینگ ہمارے بھائی کے جسم میں لٹو کی طرح گھومے تھے۔۔۔ہم صرف اسے اپنے ہاتھوں سے مارنے کی اجازت چاہتے ہیں۔"

بوچڑ خانے کے مالک کو اسی شام یہی کام خاصی تگ و دو کے بعد خود سرانجام دینا تھا۔ بھلا اسے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

"تمہیں اجازت ہے۔" اس نے کہا اور چلا گیا۔

آدے لا گھٹنوں کے بل یوں بیٹھ گئی جیسے وہ کسی کلیسا میں عبادت کرنے والی ہو۔۔۔اس نے اپنا خنجر سیاہ بل کی پھولی ہوئی شہ رگ پر رکھا اور اس کی آنکھوں میں اپنے پاپا کی تصویر دیکھی۔۔۔شہ رگ میں سے بوڑھا بدبودار خون ایک آبشار بن کر ابلا۔۔۔اور آدے لا کے سینے پر پھیل گیا۔ آدے لا نے گریبان میں ہاتھ ڈالکر اپنا لباس چاک کر ڈالا۔۔۔اس کی چھاتیوں نے آگے بڑھ کر اپنے مسام کھولے اور ابلتے خون کو چوس کر پیاس بجھائی۔۔۔پھر آندریس اسی طرح گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اس نے بل کی ڈھلکی ہوئی گردن کو دونوں ہاتھوں میں پکڑا اور اسکی آنکھوں میں جھانکا۔۔۔بل کی مردہ آنکھوں میں اب بھی ایک پتلا دکھائی دے رہا تھا لیکن ساکت اور معدوم ہوتا ہوا۔۔۔خنجر کی نوک نے سیاہ آنکھ میں کھب کر اسے اپنے مسکن سے یوں ادھیڑا جیسے انار کے دانے کو ناخن سے الگ کر نکالا جاتا ہے۔۔۔سات برسوں سے زندہ جھولتے ہوئے پتلے کی شبیہ اوجھل ہو گئی۔ دوسری آنکھ کو بھی خنجر نے جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔۔۔پھر ان دونوں نے آنکھوں کے خالی گڑھوں میں گزرے وقت کی بیتے سفر کی تمام نفرت سمیٹ کر تھوکا۔۔۔سا آخری وار بل کے پیٹ پر ہوا۔ ان دونوں نے جب اس کا نیم سیاہ کلیجہ ہاتھوں میں لیا تو وہ ابھی تک تھرتھرا رہا تھا۔۔۔وہ بوچڑ خانے سے باہر آ گئے۔۔۔ویران نگر دنا لوہ گلی کے درمیان میں انہوں نے ایک الاؤ روشن کیا اس پر بل کا سیاہ پڑتا ہوا کلیجہ بھونا اور پھر اسے حلق سے اتار کر اپنے وطن کی طرف ایک روشن دوپہر کی جانب لوٹ گئے۔

درخت سے لٹکا ہوا آدمی

مشتاق قمر

بس اس کا پاؤں پھسل گیا ـــــ

لیکن یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ پاؤں پھسلتے ہی اس کے ہاتھ میں درخت کی شاخ آگئی۔

وہ محسوس کر رہا تھا جیسے نہ تو اس کا پاؤں پھسلا نہ ہی اتفاقیہ طور پر درخت کی شاخ اس کے ہاتھ میں آئی تھی ـــــ وہ ازل سے یوں ہی درخت کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔ اس کا دادا پردادا .... اس کے قبیلے کا ہر آدمی اسی طرح درخت کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔ وہ سب یہیں درخت کے ساتھ لٹکے لٹکے پیدا ہوئے تھے۔ یہیں انہوں نے اپنی زندگیاں بتائیں اور یہیں سے وہ ....

یہ ایک درخت تھا جس کی شاخیں بوجھ کی معمولی سی زیادتی سے بھی چٹخ جاتی ہیں اور جو پہاڑی کے آخری کنارے پر اگا ہوا تھا۔ اس کے نیچے ایک چٹان تھی اور چٹان سے نیچے پاتال تک گہری کھائی۔ کھائی کے دونوں کنارے بےحد خطرناک تھے۔ لوگ آتے اور کناروں سے کترا کر گزر جاتے۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے دور نیچے پاتال کی گہرائی میں کھائی کی تاریکی آنکھ کو دیکھا تھا۔

بدن کا سارا لہو اس کے بازوؤں میں سمٹ آیا۔

گرد و پیش میں دور دور تک کوئی بھی نہ تھا۔

بس چیڑھ کے درختوں سے لپٹی ہوئی سنسان ویرانی تھی۔

چند جنگلی جانور جو اسے دیکھتے ہی بدک کر جنگل کی پھیلی باہوں میں گم ہو گئے۔

وہ پھانسی پانے والے شخص کی طرح آسانی سے ٹوٹ جانے والے درخت کی شاخ سے لٹکا ہوا تھا۔

اس کے نیچے چٹان تھی ـــــ اور چٹان سے نیچے ـــ بہت نیچے ـــــ پاتال کی خوفناک آنکھ میں گم ہوتی کھائی کی گہرائی!

اچانک اسے شاخ چٹخنے کی آواز سنائی دی ـــ
جیسے کسی نے ہولے سے سسکی بھری ہو ـــ
آواز کہیں اس کے اپنے اندر کی گہرائی سے بلند ہوئی تھی ـــ باریک ـــ موہوم سی آواز ـــ
لیکن اس نے اسے سنا نہیں دیکھا تھا ـــ آواز کے گلے میں ایک بڑا سا ڈھول تھا اور وہ دونوں ہاتھوں سے ڈھول پیٹتی، اس کے اندر اندھی گہرائی کے زینے پھلانگتی بڑی تیزی سے فراز کی جانب اُٹھ رہی تھی۔

تو اندر سے وہ آثارِ قدیمہ کے کسی مینار کی طرح تھا جس کی بل کھاتی سیڑھیوں کو عبور کر کے چوٹی تک پہنچنا ہر سیاح اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے ـــ
پاتال کی تارا سی آنکھ میں گم ہوتی کھائی کی گہرائی کی طرح اس نے آج پہلی بار اپنے اندر جھانکا تھا۔
اس کا تن بدن لرز کر رہ گیا۔
گرد و پیش میں دور دور تک کوئی بھی نہ تھا۔
چیڑھ کے درختوں سے لپٹی ہوئی سنسان ویرانی میں ہتھیار ڈالنے سے قبل اس نے زندگی کے ہر لمحہ کھسکتے دامن کو آخری بار مضبوطی سے گرفت میں لینے کی کوشش کی۔
"کوئی ہے ـــ" وہ زور زور سے چیخا ـــ "بچاؤ ـــ بچاؤ ـــ مجھے اندھی گہرائیوں میں ڈوبنے سے بچاؤ ـــ"
اس کے منہ سے نکلے ہوئے سارے الفاظ ایک ایک کر کے ایک خوب صورت کوئل میں مجسم ہو گئے اور کوئل کوکتی ہوئی گھنے جنگل کی بھول بھلیوں سے باہر نکلنے کی سر توڑ کوشش کرنے لگی۔
پھر زور زور سے ڈھول پیٹتی آواز کے ساتھ چند باہر کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔
سارا گاؤں اس سے چند گز کے فاصلے پر جمع ہو گیا۔
سارے چہرے جانے پہچانے تھے۔
ان کے ہاتھوں میں بجلی کے کوندے تھے ـــ
آنکھوں میں مایوسی کی برف!
اس کے بچنے کی اب نہیں بس ایک ہی صورت دکھائی دی۔ کسی طرح وہ درخت کی جانب کھسکتے ہوئے چٹان

کے درمیان تک پہنچ کر چٹان پر کود جائے اس کا توازن نہ بگڑا تو چٹان پر سے اسے اٹھانا مشکل نہ ہوگا۔

وہ آہستہ آہستہ چٹان کی طرف کھسکنے لگا۔۔۔

اس کے اندر شاخ کے چٹخنے کی ڈھول پیٹتی آواز میں اضافہ ہونے لگا۔۔۔ وہ اب پہلے سے کہیں زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ نیفے پھلانگتی اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔

باہر کھڑے لوگ طرح طرح سے اس کی ہمت بندھانے لگے۔

بابا رحیم سب سے پہلے بولا۔۔۔ "میں تمہیں اپنے قرض سے سبکدوش کرتا ہوں۔"

"میں نے تمہارے خلاف جو مقدمہ دائر کر رکھا ہے اس سے دستبردار ہوتا ہوں۔۔۔" اکبر نے حوصلہ افزائی کے فنڈ میں اپنا چندہ ڈالا۔

"تم نے جس زمین کے بارے میں حق شفع کر رکھا ہے وہ ساری زمین ہم تمہیں لوٹا دیں گے۔۔۔" چند آوازیں ایک ساتھ گونجیں۔۔۔

"تمہارے سارے درخت میں نے کاٹے تھے۔۔۔ میں ان کا پورا پورا معاوضہ ادا کر دوں گا۔۔۔"

"ہم آج شام تمہارے بچ جانے کی خوشی میں ایک بہت بڑا جشن منعقد کریں گے۔۔۔"

اور پھر باہر کی آوازیں بھی اندر کی آواز کی طرح اسے صاف صاف دکھائی دینے لگیں۔۔۔

سامنے کریم تھا۔ اس کا چچا۔ اس کے ساتھ اس کے دو چچازاد بھائی تھے۔

وہ دونوں اس سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے۔

ان سے آگے اختر تھا۔ وہ دونوں ہم جماعت تھے۔۔۔ بچپن سے ہی ان کا بڑا یارانہ تھا۔

اختر کے پاس اس کی ماں کھڑی تھیں۔ سال کے چہرے پر پھیلی مایوسی کی گرد اپنے خونخوار پنجوں سے آہستہ آہستہ اس کا منہ نوچ رہی تھی۔ اس نے چیخ کر ماں کو گدھ کے خطرے سے خبردار کرنے کی کوشش بھی کی مگر آواز اس کے حلق سے باہر نہ نکل سکی۔

ماں کے ساتھ ہی چچی بھی تھی۔ وہ چچی کم اور رانی کی ماں زیادہ لگ رہی تھی۔

رانی اپنی ماں کا ہاتھ پکڑے بڑی بے چین نظر آ رہی تھی۔۔۔ رانی کی بے چینی نے اس کے اونگھتے بازوؤں کو بھرپور جھٹکے کے ساتھ بیدار کر دیا۔

اسے رانی سے بے پناہ محبت تھی۔۔۔

وہ جب ملک سے باہر گیا تھا تو رانی کہیں بھی نہیں تھی۔ وہ بہت سا پیسہ کما کر گاؤں واپس آیا تو سارے گاؤں میں بس رانی ہی رانی تھی۔

پھر آہستہ آہستہ بالکل انجانے طور پر، وہ ساری کی ساری اُس کے اندر سرائت کر گئی۔ باہر صرف اس کی پرچھائیں رہ گئی ـــــ پنگھٹ پر۔ آنگن میں ـــــ کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر ـــــ ہر جگہ اور ہر کہیں صرف اُس کی پرچھائیں ہی تھی۔

لوگ اُس کی پرچھائیں ہی دیکھتے۔ اس سے بات کرتے ـــــ اس سے ملتے۔ وہ دونوں خوش تھے کہ وہ بڑی کامیابی کے ساتھ سب کو دھوکہ دے رہے تھے۔

پھر ایک دن گاؤں کے سب سے پرانے درخت کی کنواری چھاؤں میں بیٹھتے ہوئے اس نے رانی سے شکوہ کیا ـــــ

"تم کہاں چلی گئی تھیں ؟"

رانی بولی ـــــ "میں یہیں تھی تم ہی، کہیں چلے گئے تھے ـــــ"

"پھر تم مجھے تلاش کرنے کیوں نہ آئیں ؟"

وہ ہنسی ـــــ

وہ بھی ہنسا ـــــ

رانی اُس کی تلاش میں نہیں آئی تو اُس نے اچھا ہی کیا تھا ـــــ

"تم نے اچھا ہی کیا ہے ـــــ" وہ بولا ـــــ "شہروں کی گلیاں بہت گندی ہیں۔ تم آتیں تو تمہارا بدن میلا ہو جاتا ـــــ"

"دھول تو یہاں بھی اُڑتی ہے ـــــ" رانی پھر ہنسی۔

"لیکن گاؤں کی دھول اور شہر کی گرد میں بڑا فرق ہے ـــــ گاؤں کی دھول صرف چہروں پر اٹک جاتی ہے۔ شہروں کی گردن میں اتر جاتی ہے ـــــ"

پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ کچھ نہ کچھ ضرور ہوا تھا آج صبح ہی ـــــ لیکن اسے بالکل یاد نہیں آ رہا تھا۔ رانی کے ساتھ ہی تانی ریشمے کھڑی تھی۔ مایوسی اس کے چہرے پر بھی بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ صبح کیا ہوا تھا ؟ کچھ نہ کچھ ہوا تھا۔ ہاں ـــــ اسے یک لخت یاد آ گیا۔

تائی ریشمے آئی تھی۔ اس نے پتہ نہیں کیا کہا تھا۔ کوئی ایسی بات کہی تھی جس سے بھونچال آ گیا تھا۔

اچھا۔ اچھا۔ اسے یاد آ گیا۔ وہ اسے اور اس کی ماں کو اپنے بیٹے کی منگنی پر دعوت دینے آئی تھی۔ کل اس کے بیٹے جہانگیر کی منگنی ہو رہی تھی۔ رانی کے ساتھ ــــــــــــ وہ یہ بات سن کر ہنس دیا تھا ـــ رانی تو اس کے اندر تھی باہر تو صرف رانی کی پرچھائیں تھی۔ بھلا پرچھائیں کے ساتھ کیسے منگنی ہو سکتی ہے۔

تو وہ سارے گاؤں کی طرح تائی ریشمے کو بھی دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

پھر اس نے دیکھا

جہانگیر تائی ریشمے کے عقب میں کھسکتا ہوا بالکل رانی کے قریب آن کھڑا ہو گیا ـــ اس نے چپکے سے دوسروں کی نگاہیں بچاتے ہوئے رانی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا وہ ایک بار پھر ہنسا ـــ بے وقوف بلے خبر ہی نہیں رانی تو میرے اندر ہے۔ وہ رانی کی پرچھائیں پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ بھلا کوئی پرچھائیں کو بھی کبھی گرفت میں لے سکا ہے! بے وقوف آ

لیکن رانی کا ہاتھ پوری طرح اس کے ہاتھ میں تھا ـــ پرسکون۔ نشے میں ڈوبا ہوا۔ بے شعور۔ اندر کی ڈھول پیٹتی آواز اب نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ شاید اس نے اندر کے سارے زینے طے کر لئے تھے اور اب آنکھوں سے اوپر ذہن میں جا پہنچی تھی۔

اس نے جلدی جلدی اپنے اندر جھانکا ـــ

وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

رانی نہیں تھی ـــ اس کی پرچھائیں بھی نہیں تھی۔

متروک مسجد کے ٹوٹے ہوئے مینار کے سارے زینے سنسان پڑے تھے۔

وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی بھی نہیں تھا۔

ذہن میں ڈھول پیٹنے کی آواز بڑی شدت کے ساتھ بلند ہونے لگی۔

بہت سے لوگ مل کر دھمال ڈال رہے تھے۔ چٹاخ تڑاخ کی آوازیں تھیں۔

پتھر برس رہے تھے۔ بجھے ہوئے الاؤ کا دھواں تھا۔

سارا پیش منظر دھندلا گیا تھا۔

زوردار چٹاخ کی آواز۔

ڈھول پر سسکتی ہوئی آخری ضرب۔

اور وہ ٹوٹی ہوئی شاخ سمیت چٹان پر آن گرا۔

چند پتھر لڑھکے

ٹوٹی ہوئی شاخ۔ پتھر اور وہ اپنے اندر کے ویران معبد سمیت پاتال کی تاریک اس آنکھ میں گم ہوتی کھائی میں تیزی کے ساتھ لڑھکنے لگا۔

کنارے پر کھڑے لوگوں کو کچھ دیر تک ڈوبتی آوازوں کا ماتمی گیت سنائی دیتا رہا پھر گیت کے بین ڈوبتے ڈوبتے بالکل ڈوب گئے۔

کنارے پر کھڑے لوگ چیڑھ کے درختوں سے لپٹی ہوئی سنسان ویرانی کی سرنگ میں ایک ایک کرکے داخل ہو گئے۔

دور دن اور رات کی سرحد پر پھڑپھڑاتی کونج کوکتے کوکتے اچانک خاموش ہو گئی۔

گرد و پیش میں دور دور تک کچھ بھی نہ رہا ــــ ٭

بے نام گلیوں اور محلوں کا نوحہ

مشرف احمد

وہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے۔ بیٹھے ہوئے تھے۔ اور گفتگو کر رہے تھے۔ پھر ان میں سے
ب جو کافی دیر سے بولے جا رہا تھا یکایک خاموش ہو گیا۔ دوسرے نے حیرت سے اس کے خاموش
رے کو دیکھا۔ پھر پہلے والا یوں گویا ہوا۔

"یار تم کس محلے میں رہتے ہو۔ محلے کی کس گلی میں تمہارا مکان ہے"۔

دوسرا اس عجیب سے سوال پر حیرت زدہ ہو گیا۔ اور پوچھا "کیوں دوست تم یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہو
تو کسی اجنبی آدمی کو پوچھنا چاہیئے تھا۔ جو پہلی بار مجھ سے ملاقات کرنے میرے گھر آنا چاہتا ہو۔ تم تو
بیسوں بار میرے گھر آ چکے ہو۔ پھر تم نے ایسا سوال کیوں کیا؟"

اگر تمہارا کوئی گھر ہے تو وہ کسی محلے میں بھی ہو گا۔ خیر یہ تو بعد کی بات ہے۔ ہاں اگر تم یہ سوال مجھ
ے کرتے تو میرے لیے اس میں حیرانی کی کوئی بات نہ ہوتی۔ بلکہ شاید اس مسئلے کو سلجھانے کی کوئی تدبیر کرتا"۔

"میں تمہاری بات سمجھ نہیں پایا۔" دوسرے نے کہا "کیا اس سوال سے کوئی مسئلہ وابستہ ہے۔ یار
یسے تو تم ہمیشہ عجیب و غریب باتیں کرتے ہو۔ مگر آج تو تمہاری باتیں بالکل سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں"۔

پہلے والا بولا "بہت دنوں سے یہ بات مجھے تنگ کر رہی ہے۔ مگر میں لوگوں سے باتیں کرتے ہوئے
ڈرتا ہوں۔ شاید تم میری بات سمجھ سکو۔ پھر اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور اپنی بات بتانے
لگا۔ "دوست مسئلہ یہ ہے کہ ہم تم دونوں میں سے کوئی بھی کسی ایسے محلے یا گلی میں نہیں رہتے جن کا کوئی
ام ہو۔ اور لاکھوں ہی لوگ ہماری طرح کسی ایسی گلی یا محلے میں نہیں رہتے"۔

"اچھا اچھا۔" دوسرے نے اظہار پسندیدگی کرتے ہوئے کہا۔ "گلیوں، محلوں اور کوچوں کے حوالے
ے تم ہم بہت سی اچھی اور خوب صورت یادیں تازہ کر سکتے ہیں۔ میں تمہاری بات کی تہہ تک پہنچ گیا

ہوں، مگر گزشتہ بیس برس میں اپنی عمر کے ایک خاص حصے تک تو تمہیں بتا سکتا ہوں کہ میں کن کن محلوں اور گلیوں میں رہا ہوں اور وہ گلیاں اور کوچے کون کون سے اشخاص کے نام سے منسوب تھیں۔ اور یہ افراد کون تھے! ان میں سے بعض کے بارے میں تو ہم تفصیلی طور پر بات بھی کر سکتے ہیں۔"

یہ بات سن کر پہلے والے کے اداس اور پژمردہ چہرے پر مسرت و شادابی عود کر آئی۔ اس کی کھوئی کھوئی اداس آنکھیں زندہ ہو گئیں، جیسے اس کے سوالوں کے جواب نے اس میں زندگی کی حرارت پیدا کر دی ہے۔

دوسرا گفتگو کرتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوا، اپنے ماضی کی یادوں کو یکجا کرنے کے لئے تو پہلے نے اضطراب کے لہجے میں کہا۔۔۔ "کہے جاؤ دوست، اپنی بات کہے جاؤ۔ تمہاری آوازوں میں انسانوں کا شہر، ماضی بول رہا ہے۔ تم ہی صرف تم ہی نہیں اور دوسرے لوگ، بہت سارے لوگ بول رہے ہیں"

"مثلاً میں تمہیں یہ بتا سکتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی کا ایک لمبا عرصہ کوچہ گل حسن کے ایک مکان میں گزارا ہے۔ اس شہر میں جتنے کوچے تھے، جتنی گلیاں تھیں ان سب کے کوئی نہ کوئی نام ضرور تھے۔ کسی فرد کے نام پر، کسی جگہ ذاتوں، قومیتوں اور برادریوں کے ناموں سے یہ گلیاں کوچے منسوب تھے۔ ٹیڑھی میڑھی گلیوں، پرانی وضع کے مکانوں میں زندگیاں گزارنے والے وہ لوگ آسودہ حال نہیں تھے۔ مگر مطمئن تھے۔ شاید اب بھی مطمئن ہوں۔ اب بھی میں اپنے پیچھے چھوڑ کر آنے والے ان گلیوں محلوں میں آباد لوگوں کی زندگیوں پر رشک محسوس کرتا ہوں۔ وہ ایسی گلیوں میں آباد ہیں جن کا کوئی نام ہے۔ ان گلیوں کے شروع میں دیواروں پر نام کی تختیاں آویزاں ہیں، یا پھر وہ گلیاں اپنے ناموں سے اتنی معروف ہو چکی ہیں کہ ان کی اپنی انفرادیت اور اپنی اپنی شناخت قائم ہو چکی ہیں۔ میں تمہیں بتاؤں یہ مولوی گل حسن جن کے نام سے کوچہ منسوب تھا، کون تھے! یہ مرزا غالب کے ہم عصر تھے۔ غالب کے چند خطوط بھی ان کے نام لکھے ہوئے ملتے ہیں۔

"تو گویا اس پرانے شہر میں جس کی سکونت تم ترک کر چکے ہو" پہلے آدمی نے سوال کیا۔ "اگر کوئی شخص تم سے تمہارے مکان کا پتہ پوچھتا تو کیا بتاتے! یہی نا کہ تم کوچہ گل حسن میں رہتے ہو۔ کوچہ گل حسن شاہی بازار کی پتلی سی لمبی سڑک کے دائیں جانب واقع ہے۔ وہ یہاں آ کر کسی سے بھی دریافت کرے ——
اب اس شہر میں رہتے ہوئے تم۔۔۔۔" اس نے پوچھا۔

دوسرے نے اس کا فقرہ پورا ہونے سے پہلے ہی کاٹ دیا۔ اور بولا "اب زندگی میں یہ پہچان اور یہ

اعتماد باقی نہیں رہا۔ تو پتہ تو اب بھی بتانا ہی پڑے گا۔ مگر اس میں وہ لذت نہیں ملتی۔ یقین جانو مجھے بھی یہ سوال عرصے سے پریشان کر رہا تھا۔ مگر تم جانتے ہو کہ ایسی باتیں کرنے والوں پر کوئی نہ کوئی لیبل چسپاں کر دیا جاتا ہے۔ یہ اصطلاحوں کا دور ہے میں اپنے قریب ترین دوستوں سے بھی اپنے جذبات کا اظہار کرنے کی خود میں ہمت نہیں پاتا تھا۔ مگر آج تمہارے سوال نے۔۔۔۔۔"

"تم مجھے اپنا ایک ایسا دوست فرض کر لو جو پہلی بار تمہارے گھر آنا چاہتا ہے تم اسے کس طرح اپنا پتہ بتاؤ گے؟"

"بس یہی کہ آخری اسٹاپ پر اتر جائے۔ دائیں جانب ایک پرائیویٹ ہسپتال ہے۔ اس سے ملحق ایک وسیع و عریض میدان ہے اس میدان اور ہسپتال کے ساتھ ساتھ مکانوں کی جو قطاریں چلی جا رہی ہیں۔ اس میں چھٹی یا ساتویں قطار میں میرا گھر ہے اب تم کہو گے کہ یہ چھٹی اور ساتویں قطار کے کیا معنی۔ کیوں میں صحیح قطار نہیں بتا سکتا۔ تو وجہ یہ ہے کہ میں اس معاملے میں ہمیشہ تذبذب کا شکار ہو جاتا ہوں۔ بارہا میں نے ہسپتال کی چار دیواری کے ساتھ شروع ہونے والے مکانوں کی قطاریں گن کر یہ یاد کرنے کی کوشش کی ہے کہ میرا مکان کون سی قطار میں آتا ہے۔ مگر میں پھر بدل جاتا ہوں۔ نہ جانے مجھے پتہ بھی صحیح یاد ہے یا نہیں۔ ہاں اگر اس گلی کا کچھ نام ہوتا تو میں بلا تامل وہ نام بتا سکتا تھا۔"

"یہ کیسی عجیب سی بات ہے! ہم ایسی آبادیوں کی گلیوں میں رہتے ہیں جن کے کوئی نام نہیں ہیں۔ ماضی میں ہم کتنی گلیوں، محلوں، کوچوں اور کٹڑوں کا نام جانتے ہیں، ان کے تذکروں سے، ان میں بسنے والے لوگوں کے ذکر بہت سی کتابوں میں ہمیں مل جاتے ہیں۔ الغرض معاشروں اور قوموں میں مشاہیر کی تعداد کچھ اتنی زیادہ نہیں ہوتی۔ سال کے ناموں پر بھی گلیاں، محلوں اور سڑکوں کے نام رکھے جاتے رہے ہیں۔ ایسے چھوٹے چھوٹے غیر معروف لوگ بھی ہمارے ارد گرد موجود رہتے ہیں جن کی خوبیاں بڑوں اور مشہور لوگوں کی طرح معاشرے کے لئے مفید ہوتی ہیں۔ مگر ان کے نام تو تاریخ میں نہیں۔ ان گلیوں اور کوچوں کے باسیوں کے ذہنوں میں رہتے ہیں جہاں انہوں نے زندگیاں گزاری تھیں۔"

اس بات پر مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ دوسرے نے کہا "جب میں کوچہ گل حسن میں رہتا تھا تو ایک بار وہاں شدید آندھی آئی تھی اور بارش ہوئی تھی۔ جس کے سبب گلی میں واقع ایک گمنام بزرگ زمین بوس ہو گیا تھا۔ اور اس کے گرنے سے گلی کے درمیان سے گزرنے والا بجلی کا تار زمین پر آ گرا تھا

رات کا وقت تھا۔

مختصر آمدنیوں پر زندگی گزارنے والے افراد کے اس محلے میں اس شہر کے لوگوں کی طرح کوئی ٹیلی فون نہ تھا کہ بروقت اطلاع دے دی جاتی آدمی دوڑائے گئے مگر اس رات پورا شہر ہی اس بری طرح متاثر تھا کہ بجلی والے اس گلی میں نہ آسکے۔ اندھیرے میں کسی بھی راہگیر کو خوفناک حادثہ پیش آسکتا تھا۔ راہگیروں، مسافروں میں کسی کو اس تار کے بارے میں کیسے پتہ چل سکتا تھا جس میں سے برقی رو دوڑ رہی تھی۔ میرا بڑا بھائی اس زمانے میں ایک اور شہر میں رہتا تھا اور ہمیشہ رات کی آخری ساعتوں کی ٹرین سے آتا تھا۔ اب مسافروں اور راہگیر کا تو آنا جانا لگا ہی رہتا ہے۔ صبح منہ اندھیرے دودھ والے دودھ پہنچانے آتے تھے۔ تو اس رات محلے کے ایک بزرگ نے ساری رات لالٹین جلا کر کرسی پر بیٹھے بیٹھے آنے جانے والوں کی خاطر صبح کر دی۔ ایسا فیصلہ کرتے ہوئے اس نے تمام تر ذمہ داری اپنے اوپر لے لی تھی۔ نہ کسی سے مشورہ کیا۔ نہ اس رات میں وقت بانٹنے کی کسی سے درخواست کی۔ صبح جب لوگ محلے کی مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے نکلے تو انہوں نے دیکھا کہ اس مرد بزرگ نے ساری رات جاگ کر کاٹ دی تھی۔“

کیسی عجیب سی بات ہے، مگر اس آدمی کا نام تاریخ میں کسی بھی حوالے سے نہیں آسکتا لیکن میں تم سے حلفیہ کہتا ہوں کہ اپنی جدید قومی تاریخ کے بہت سے نامور لوگوں سے زیادہ میں اس آدمی کا احترام کرتا ہوں۔ اس کی کاوشش کا نقش تادم مرگ میرے دل پر رہے گا۔ . . . اب وہ مر چکا ہے، اگر اب کوچہ گل حسن کا نام بدل کر اس کے نام پر رکھ دیا جاتا تو یہ دونوں کے ساتھ ہی ناانصافی ہوتی اب اس چھوٹے شہر میں بھی کہیں نئی گلیاں اور کوچے بنتے تو شاید ان میں سے کسی ایک کا نام اس کے نام پر رکھ دیا جاتا۔ مگر اب چھوٹے شہروں میں بھی ماڈل ٹاؤن، سیٹلائٹ ٹاؤن اور اسی طرح کی اور کالونیاں آباد ہونے لگی ہیں۔ محلے ختم ہوتے جا رہے ہیں، ان نئی بستیوں میں نہ تو محلے ہیں نہ ہی محلوں کے نام رکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ وہاں بھی صرف قطاریں ہیں۔ . . . . . قطاریں۔ . . . .“

ان دونوں کو ایک گہرے اور طویل سناٹے نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا یوں لگتا تھا ان کے جسم تو وہاں موجود ہیں اور ان کی روحیں ان گلیوں کوچوں میں چکر لگا رہی ہیں جو وہ کہیں چھوٹے شہروں میں رہ گئی تھیں۔ تب پہلے نے دوسرے سے کہا۔

”یار اب واپسی تو ممکن نہیں ہے اب تو اسی شہر میں رہنا ہے جس کی بڑی بڑی شاہراہوں کے

نام تو ضرور ہیں مگر اس کی کالونیوں کی گلیوں کا، جن میں لاکھوں اچھے بُرے انسان رہتے ہیں کوئی نام نہیں ہے۔ یہ بے چہرہ گلیاں ہیں۔ ان کی کوئی شناخت نہ اب ہے نہ آئندہ آنے والے زمانوں میں کوئی حوالہ ملے گا۔"

"اس شہر کی ہزاروں گلیوں کے نام رکھوانے میں تو شاید ہم عمر بھر کامیاب نہ ہو پائیں۔ لیکن اگر صرف ان گلیوں کے ہی نام رکھوانے کی کوشش کریں جس میں ہم تم رہتے ہیں تو شاید لوگ ہماری بات ہمدردی سے سن لیں اور ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں ممکن ہے ہم انہیں قائل کر سکیں کہ انسانوں کی طرح گلیوں کوچوں کے نام رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ آخر وہ بھی کبھی نہ کبھی ایسے گلی کوچوں میں تو ضرور رہے ہوں گے جن کا کوئی نہ کوئی نام ہوگا۔ اگر ایسا ہوا تو ہم بے نام گلیوں اور کوچوں کے اس شہر میں ایک نام والی گلی بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ پھر اس کی دیکھا دیکھی شاید بعد میں اور لوگ بھی اس مسئلے پر سوچنے لگیں۔"

دونوں کو یہ تجویز پسند آئی۔

پہلے نے دوسرے کو اپنے ہاں چھٹی والے دن مدعو کر لیا۔ اس اثنا میں پہلے نے اپنے گلی کے ساکنوں کو اپنے یہاں چائے پر بلا لیا۔ جمع ہونے والے بہت سے لوگ برسوں سے اس گلی میں مقیم تھے۔ مگر وہ پہلی بار ایک دوسرے سے مل رہے تھے۔ کیونکہ وہ اپنی ضرورت کے تحت صبح سویرے گھروں سے نکل جاتے اور شام گئے رات کے وقت واپس آتے۔ وہ ہمسائیگی کی محبت اور اس جذبے سے تقریباً لاتعلق ہو چکے تھے۔ ان کی زندگیوں کی مسرتوں کے معنی یا تو دفتروں اور بازاروں میں جدوجہد تھی یا گھروں میں بند ہو کر بیوی بچوں کے درمیان ٹیلی ویژن دیکھنا تھا۔ ان گھروں میں مدتوں سے کوئی اجتماعی مسرت نہیں آئی تھی۔ ایسی مسرت جو گلی کوچوں میں ہمسایوں کے درمیان نسل در نسل خوشبو کی طرح ہر سو پھیلی رہتی تھی۔

آنے والے لوگ سمجھ رہے تھے کہ شاید گھر میں کوئی تقریب ہے۔ نجانے وہ سب لوگ یکجا ہو گئے تھے۔ ممکن ہے ان کی طویل تنہائیوں نے انہیں کسی ایسی دعوت میں یکجا ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔ مگر جب انہوں نے اپنے میزبان کی تجویز سنی تو مہمانوں کو اندازہ ہوا کہ ان کے ساتھ سنگین مذاق کیا گیا ہے۔ کچھ لوگ تو اس عجیب و غریب تجویز پر برافروختہ ہوئے۔ ان میں سے ایک نے چائے کی پیالی کو زور سے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"سارا وقت برباد کر دیا۔ میرے پاس اس بکواس کو سننے کا وقت نہیں ہے۔ میں چلتا ہوں بزنس

پارٹی آج میرے گھر پر لنچ پہ آنے والی ہے۔" یہ کہہ کر وہ بلا اجازت چلا گیا۔

باقی لوگوں کو شاید میزبان کی بات کچھ زیادہ ناگوار نہ گزری تھی۔ وہ بیٹھے ہوئے اطمینان سے چائے پیتے رہے یا ممکن ہے مدتوں کے بعد عام انداز سے چلی ہوئی ایک تجویز ان کی ذہنی فرحت کا باعث ہوئی۔

وہ اپنے میزبان کی باتیں سنتے رہے۔ درمیان میں میزبان کا دوست۔ اس بات کی تائید کرتا یا مزید وضاحت! انہیں رفتہ رفتہ یوں محسوس ہونے لگا گویا وہ بہت زیادہ درماندہ اور مضمحل تھے۔ ان کے مکانوں کے کمروں میں شدید گھٹن اور حبس تھا اور ہوا کے ایک جھونکے نے اس حبس کو دور کر دیا ہے، میزبان کی باتوں میں انہیں دلچسپی سی ہوتی جا رہی تھی۔

مہمانوں کا ردعمل جب خوشگواری میں بدل گیا تو ان دونوں دوستوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا انہیں اندازہ ہوا کہ وہ بھی جدید انسان ہونے کے باوجود انہی کی طرح قدیم انسان تھے۔ اور انہوں نے اپنی گفتگو سے مہمانوں میں وہ تار چھیڑ دیا تھا جس سے ماضی کی لَے بلند ہوتی ہے۔

"ہم اپنی اس گلی کا آخر نام کیا رکھیں گے" مہمانوں میں سے ایک آدمی نے سوال کیا۔

بہت دیر تک وہ مشاہیر کے ناموں پر غور کرتے رہے جو نام بھی آتے ان میں سے اکثر کے ناموں پر پہلے ہی بڑی بڑی سڑکیں منسوب تھیں کچھ ایسے نام تھے جن پر نفرت و محبت کے ملے جلے جذبات تھے۔

"کمال ہے بھئی کوئی نام نہیں مل رہا ہے؟" ایک اور شخص نے کہا۔

"مہمانِ گرامی، میں ایک نام تجویز کر سکتا ہوں۔ اگر آپ قبول فرمائیں تو۔۔۔۔" میزبان نے کہا۔

ابھی بہت سے مشاہیر کے نام اس سلسلے میں لئے گئے میں سمجھتا ہوں کہ مشاہیر کے نام زندہ رکھنے کے لئے تو تاریخ موجود ہے۔ ہمارے شہروں کی بہت سی گلیوں، کوچوں کے نام مشاہیر کے ناموں پر نہیں رکھے گئے تھے بلکہ وہ تو عام سے دنیاوی اعتبار سے چھوٹے چھوٹے لوگ تھے جن کی خوبیوں کو ان کے ہمسایوں نے محسوس کیا اور ان کے ناموں پر اپنی محبت اور پسندیدگی کے اظہار کے طور پر اپنی گلیاں اور کوچے منسوب کر دیئے تھے۔ اگر آپ لوگ اتفاق کریں تو میں ایک نام تجویز کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر میزبان تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔

مہمانوں میں کسی نے یکبارگی کہا "فرمایئے، شاید پسند آجائے؟"

میزبان نے بولنا شروع کیا۔ "میں یہ بھی واضح کرتا چلوں کہ جس آدمی کا نام میں تجویز کرنا چاہتا

ہوں اس سے میری کوئی قرابت داری یا دوستی نہیں تھی۔ میں اس بات کی صداقت کے لئے حلف اٹھا سکتا ہوں۔ دنیاوی اعتبار سے بھی وہ کوئی بڑا آدمی نہ تھا پندرہ برس پہلے کی بات ہے کہ میرے چھوٹے سے شہر کے کوچے گل حسن میں بجلی کے تار ٹوٹ کر گر پڑے تھے۔ شدید سردی کی رات تھی کوچے کا ایک بوڑھا آدمی آنے جانے والوں کو خطرے سے آگاہ کرنے کے لئے تمام رات لالٹین روشن کئے باہر گلی میں بیٹھا رہا تھا۔ اگر اس کے نام پر ہم اپنی گلی ......"

" میاں کیا بات کر رہے ہو، ایک آدمی نے جس کے چہرے سے چالاکی اور خود غرضی عیاں تھی۔ بات کاٹتے ہوئے کہا" کیا گڑے مردے اکھیڑنے لگے ہو۔ اگر اس آدمی کے احسان کا انتہائی پاس تھا تو پھر اسی گلی کو اس کے نام سے منسوب کرنا چاہیے تھے۔"

" ایسا نہیں کیا جا سکتا تھا ...." میزبان نے جواب دیا۔ وہ گلی کسی اور نام سے منسوب تھی، اور اب اس کا نام بدلنا اس آدمی سے بے انصافی ہوتی جس کو مرے ہوئے ایک صدی سے اوپر ہونے کو آئی ہے۔ بہرحال آپ لوگ اگر کوئی اور نام رکھنا چاہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" میزبان نے کہا "گلی کا کوئی نام البتہ ضرور رکھ لیں"۔

ان لوگوں کے درمیان کسی بھی نام پر اتفاق نہ ہو سکا۔ جاتے ہوئے اسی آدمی نے جس کے چہرے سے خود غرضی اور بے مروتی عیاں تھی۔ اسے اپنے دفتر میں آکر ملاقات کرنے کو کہا۔

جب وہ دونوں اس کے دفتر پہنچے تو وہ نہایت اخلاق سے پیش آیا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اس آدمی نے یہ تجویز پیش کی کہ گلی کا نام اس کے والد کے نام پر رکھ دیا جائے کیونکہ نام کو متفقہ طور پر ہی طے ہونا تھا اس سبب سے اس آدمی نے ان کے ذمے یہ کام بھی لگایا کہ وہ محلے کے باقی لوگوں سے فرداً فرداً مل کر انہیں آمادہ کر لیں۔

انہوں نے واپس آکر گلی کے ایک آدمی سے بات کی اور گلی کا نام اس چالاک آدمی کے باپ کے نام پر رکھنے کی تجویز پیش کی۔ یہ سن کر وہ آدمی آگ بگولا ہو گیا۔ اور بولا" نہیں جناب اس سے تو ہماری گلی بے نام ہی اچھی۔ میں اس خاندان کو جانتا ہوں۔ حلال خور کا بیٹا ہے پاکستان بن گیا ایسے لوگوں کو دن لگ گئے۔ اب بڑا بزنس مین بنا پھرتا ہے۔"

ان دونوں کو بڑی مایوسی ہوئی۔ وہ اس گلی کے جن جن لوگوں سے انفرادی طور پر ملے، وہ باقی

دوسرے لوگوں سے نالاں تھے۔ اور اپنے اپنے باپ دادا کے ناموں پر اس گلی کا نام رکھوانا چاہتے تھے۔
عجیب مصیبت ہے یار۔ شاید اسی بنا پر وہ قومی یا ملّی مشاہیر کے نام پر گلی کا نام رکھنا پسند نہیں کرتے اور اپنے آباؤ اجداد میں سے کوئی نام رکھنا چاہتے ہیں۔ مگر سب لوگ ایک دوسرے کو ناپسند کرتے ہیں اور نفرت کرتے ہیں اور ہر ایک دوسرے کے آبا میں کیڑے نکال رہا ہے" پہلے نے دوسرے سے کہا۔

دوسرے نے جواب دیا" مجھے تو اس سے بھی زیادہ ایک اور بات پر حیرت ہو رہی ہے۔ لوگوں کی مصروف زندگیوں کو دیکھتے ہوئے میں اب تک یہی سمجھتا رہا ہوں کہ اس بڑے شہر میں جہاں بھانت بھانت کے لوگ آکر جمع ہو گئے ہیں وہ ایک دوسرے سے بالکل آگاہی نہیں رکھتے ہوں گے۔ میرے نزدیک ان بیچاروں کی زندگی قابل افسوس تھی کہ ایک طویل عرصے تک ایک ہی جگہ رہنے کے باوجود وہ اپنے اردگرد کے لوگوں کو نہیں جانتے۔ مگر اب اندازہ ہوا کہ یہ لوگ تو نہ صرف خود بلکہ ایک دوسرے کے آباؤ اجداد تک کے عیوب کو جانتے ہیں۔ اور بھیڑیوں کے اس غول کی طرح ہیں جو ایک دوسرے کے خوف سے آنکھیں نہیں جھپکاتے اور گرگ آشتی کے عذاب میں مبتلا رہتے ہیں۔

ان دونوں کی کوششیں رائیگاں ہو گئی تھیں۔ اس بے نام گلی میں واقع لوگ اپنے اپنے گھروں میں مطمئن تھے کہ انہوں نے گلی کا نام کسی دوسرے کے نام پر نہیں رکھنے دیا تھا۔

ان دونوں کے لئے زندگی ماضی میں ہی تھی۔ وہ پرانی زندگی اور پرانے رویوں کے متلاشی تھے۔ جو اب لمحہ بہ لمحہ تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں واپس نہیں آئیں گے۔ انہوں نے اس ناکامی کے بعد پھر کبھی اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ آج وہ پھر اسی ہوٹل میں تھے اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف۔ باہر تاریک رات سڑکوں پر پھیل گئی تھی۔ ان کی زندگیاں کوچوں اور گلیوں کا نوحہ تھیں۔

ہوٹل سے اٹھ کر دونوں بس اسٹاپ تک آئے اور اپنی اپنی بس میں سوار ہو گئے جہاں سے انہیں بے نام بے چہرہ گلیوں میں اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک آنا جانا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ان کی گلیوں کا کوئی نام نہ تھا۔ وہ اس کرب سے آگاہ تھے۔ وہ صرف قطاریں تھیں۔ ۔ ۔ ۔ چھٹی قطار۔ ۔ ۔ ۔ ساتویں قطار۔

دسمبر

انور سدید

دسمبر مجھے سب مہینوں سے عزیز ہے۔

دسمبر مجھے سب مہینوں سے عزیز ہے تو اس کی کچھ وجوہات بھی ہیں۔ مثلاً یہی دیکھئے کہ جنوری اور فروری کے مہینے نسوانی ناموں سے عبارت ہیں لیکن دسمبر کے نام میں مردانہ پن موجود ہے۔ پھر اس کی آمد کسی مسکین طبع "آداب عرض" قسم کے مہینے کی طرح نہیں ہوتی کہ کوئی نوٹس ہی نہ لے بلکہ یہ پورے تزک و احتشام اور وجاہتِ مردانہ کے ساتھ آتا ہے اور لوگوں سے اپنا قیام فاتحانہ شان سے تسلیم کرواتا ہے۔ کمزور ہڈی کے لوگ تو اس کی پہلی یلغار پر ہی اس کے آگے سپر ڈال دیتے ہیں اور اپنی جان کی سلامتی کے لئے کمبلوں، رضائیوں اور صدریوں میں قلعہ بند ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ دسمبر کی فتوحات کو خندہ پیشانی سے قبول نہیں کرتے بلکہ پہلے اپنے گھر کی مشرقی کھڑکی کا صرف ایک پٹ کھول کر اس کی جارحانہ قوتوں کا جائزہ لیتے ہیں اور جب خورشید خاور کی لرزتی ہوئی نوخیز کرنوں کو دسمبر کے قدموں تلے سسکتا ہوا یا دبیز دھند میں مدغم ہوتا ہوا دیکھتے ہیں تو لرزتے دانتوں اور کپکپاتے ہونٹوں سے پناہ بخدا کہتے ہوئے آتش دان میں گھس جانے میں ہی عافیت محسوس کرتے ہیں۔ یہی وہ لمحہ ہے جب دسمبر اپنی یلغار تیز کر دیتا ہے اور زورِ جنگ اور قوتِ مدافعت پر ہمیشہ نازاں رہنے والوں کے لئے ہتھیار ڈال دینے کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہتا۔

میرے بعض دوستوں کا خیال ہے کہ دسمبر کی مردانگی اور بعض دوسرے مہینوں کی نسوانیت محض میرا مفروضہ ہے۔ ان کی دانست میں مہینہ نہ مرد ہوتا ہے نہ عورت بلکہ یہ صرف مہینہ ہوتا ہے جس میں تیس صبحیں اور تیس شامیں ہوتی ہیں اور جس کی پہلی تاریخ کو تنخواہ ملتی ہے۔ ان کا خیال یہ بھی ہے کہ دسمبر مجھے بالخصوص اس لئے عزیز ہے کہ اس کی پہلی تاریخ کو میری سالگرہ پڑتی ہے چنانچہ میرے دوست پہلی

تاریخ کا جشن منانے کے لئے مجھے ہمیشہ اکساتے رہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے دوستوں نے میونسپل کمیٹی کے کسی سالخوردہ رجسٹر سے میری ولادت کی صحیح ترین تاریخ برآمد کرلی ہے۔ لیکن ان کی یہ عظیم الشان دریافت ابھی تک مجھے اپنی سالگرہ کا جشن منانے پر مائل نہیں کرسکی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں اپنی سالگرہ پر دوسروں کے کام و دہن کی تواضع کا سخت مخالف ہوں۔ یوں بھی سالگرہ پر خوشی کا کیا مطلب ؟ سالگرہ تو نقصانِ عظیم کا دن ہے۔ یہ پیچھے مڑکر دیکھنے اور اپنی شکستوں کا جائزہ لینے کا دن ہے۔ سالگرہ کے دن میں ہمیشہ یہ محسوس کرتا ہوں جیسے میری جیب کٹ گئی ہو یا جیسے میں وقت کے کسی بہت بڑے پہاڑ پر کھڑا ہوں۔ یہ پہاڑ زمانے کی یخ بستگی اور حالات کی سرد لہروں کی زد میں ہے۔ ٹھنڈی ہوا کا ایک تیز جھونکا اور حالات کی ایک ایک سرد لہر اس پہاڑ کی حرارتِ طبعی کو ہر لحظہ متغیر کررہی ہے اور اس کے جسم سے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر نیچے پھینک رہی ہے۔ میں جب بچہ تھا تو یہ پہاڑ آسمان سے باتیں کررہا تھا میں اس کی سب سے اونچی چوٹی پر بیٹھا ملکوتی لے رہا تھا۔ حدِ نظر تک فطرت کی بوقلموں نیرنگیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ نیچے سبزہ تھا اور اوپر روشن سنہری دھوپ لیکن آج جب میرے پاؤں تلے سے چالیس سال کے لمحے ریت کی طرح سرک گئے ہیں تو سبزے کا رنگ بھولسلا ہوگیا ہے، سنہری دھوپ کی چمک ماند پڑگئی ہے۔ گھر کے نون مرچ نے میرے اعصاب کی کمان کو کس رکھا ہے۔ میرے کندھوں پر ایک عدد بیوی اور چار بچوں کا بوجھ ہے۔ وقت کی ہر ساعت میری آزادی پر شب خون مار کر مجھے لہولہان کررہی ہے اور اونچا پہاڑ آہستہ آہستہ زمین کی سطح کے ساتھ ملتا جارہا ہے اور کچھ پتہ نہیں کہ یہ کب زمین کے اندر سما جائے۔

ممکن ہے سُود وزیاں سے عاری میرے خود فراموش دوست سالگرہ کے بارے میں میرے ان عجیب وغریب خیالات سے واقف نہ ہوں لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ میں دسمبر کو اپنی سالگرہ کی نسبت سے نہیں بلکہ اس کی مردانگی کی بنا پر عزیز جانتا ہوں اور میں اس کے خوفناک حملوں سے تو خائف بالکل نہیں ہوتا۔ میں تو اس کا انتظار ایک دوست کی طرح کرتا ہوں اور اس کی آمد سے کچھ عرصہ قبل ہی اس کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہوجاتا ہوں۔ اپنے گھر کا سارا کاٹھ کباڑ باہر نکال پھینکتا ہوں، کمروں کو جھاڑتا پھونکتا ہوں، دیواروں کو نئی سفیدی اور دروازوں کو خوبصورت رنگوں سے آراستہ کرتا ہوں، کرسیوں کی جھولتی ہوئی نشستیں اور صوفے کے پچکے ہوئے سپرنگوں کی مرمت کرائی

جاتی ہے، فرمیوں میں چپکی ہوئی تصویروں کو نئے سرے سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ قالین اور دریاں دھو دھلا کر اُجلی کر دی جاتی ہیں۔ ان سب کو نئی ترتیب اور نئے زاویوں سے سجانے میں میری بیوی میرا ہاتھ بٹاتی ہے یا شاید میں اس کا ہاتھ بٹاتا ہوں۔ درحقیقت یہ ہماری انتہائی مصروفیت کے دن ہوتے ہیں، اتنی مصروفیت کے کہ ہم دونوں کو آپس میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر بڑے بڑے اختلافات پیدا کرنے اور پھر کئی کئی دنوں تک ایک دوسرے سے روٹھے رہنے کا موقع بھی نہیں ملتا۔

کمروں کو حیاتِ نو دینے چکنے کے بعد میں اپنی کایا کلپ کرتا ہوں۔ ململ کا ہوادار کرتہ اور پاپلین کے کشادہ تہمد کو تہ کر کے صندوق کے کسی نچلے محفوظ کونے میں رکھ دیتا ہوں اور الماری کے کسی تاریک کونے سے پچھلے جاڑوں کا گرم سوٹ نکال کر ڈرائی کلینر کے پاس بھیج دیتا ہوں۔ کوٹ کی استری تازہ اور پتلون کی کریز پختہ ہو تو پرانا سوٹ بھی نیا لگتا ہے۔

میں ان دنوں ملبوسات پر پوری توجہ صرف کرتا ہوں اور انہیں اپنی طبع کے مطابق درست کروانے کے لئے ڈرائی کلینر سے جھگڑا مول لینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ البتہ ٹائی میں گرہ دینا میرے بس کی بات نہیں۔ یوں تو مشق ہر کام میں مہارت کی کنجی ہے لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ٹائی میں گرہ دینے کی مشق کی طرف پوری توجہ نہیں دی۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ کوئی مشکل کام ہے۔ مشکل کام کرنا تو میری ہابی ہے اور اس کے لئے تو میں سر دھڑ کی بازی بھی لگا سکتا ہوں۔ ٹائی میں خوبصورت گرہ دینا اور اسے زیبائی کے ساتھ صحیح جگہ پر اٹکانا ایک فن ہے۔ میرے دوست نون صاحب اس فن میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں اور میں اُن خوش قسمت لوگوں میں سے ہوں جنہیں نون صاحب کا بھرپور تعاون حاصل ہے۔

نون صاحب تازہ دُھلی ہوئی ٹائیوں کو اُٹھا کر دیکھتے ہیں۔ فرداً فرداً ہر ایک کی تعریف بقدرِ حسن و زیبائی کرتے ہیں اور پھر ہر ٹائی میں کسی حسین لڑکی کے دہانِ لب کی طرح تنگ سی گرہ ڈال کر الماری کے دائیں پٹ کے ساتھ یوں لٹکا دیتے ہیں کہ دہانِ لب ہر لحظہ آپ کو خوش آمدید کہنے کے لئے بیقرار نظر آتا ہے۔ نون صاحب کی اس ادا نے اب تک مجھے گرہ دینے کا فن سیکھنے نہیں دیا۔ وہ جس نفاست سے ٹائی میں گرہ ڈالتے ہیں اس سے میری بے عنوان سی شخصیت بھی چمک اٹھتی ہے اور میں اپنے آپ کو دسمبر کی ملاقات کے لئے مستعد پانے لگتا ہوں۔

دسمبر آتا ہے تو کسی مہمان کی طرح کال بیل (CALL BELL) کو دبا کر اپنی آمد کا اعلان نہیں کرتا

بلکہ ایک مشریر بچے کی طرح پائیں باغ کی دیواریں پھاند کر پہلے گھر کے صحن میں آتا ہے۔ پھر برآمدے میں پلاسٹک سے بنی ہوئی کرسی پر اکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ میری بیوی اس کے مخصوص قدموں کی چاپ پہچانتی ہے وہ جلدی سے آتش دان میں آگ جلا کر کرسیوں کو اس کے گرد نصف دائرے میں ڈال دیتی ہے۔ درمیان میں ایک چھوٹی سی میز رکھ دیتی ہے۔ اس میز پر بھاپ اگلتی نو بیاہتا لیڈی پیشن ٹی کوزی کا گھونگھٹ اوڑھے ہمہ تن اشتیاق بنی منتظر ہوتی ہے۔ سامنے چاندی کی چھوٹی چھوٹی کٹوریوں میں پستہ، بادام اور کشمش آ جاتے ہیں۔ ہم سب افرادِ خانہ جو گزشتہ گرمیوں میں جزو اجزواً اکائیوں میں بٹ گئے ہیں اب ایک دوسرے کے اتنے قریب آجاتے ہیں جیسے کٹی ہوئی پھانکیں دوبارہ تربوز میں سما جائیں۔ دروازہ آہستگی سے کھلتا ہے۔ دسمبر کمرے میں آگیا ہے۔ بیوی آتشدان کے کوئلوں کو انگیخت دینے لگتی ہے، بچے سمٹ کر میرے اور قریب آجاتے ہیں اور دسمبر ہمارے وسط میں کسی بے تکلف دوست کی طرح بیٹھ جاتا ہے اسے ذرا سی اجنبیت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ وہ ہمارے ساتھ یوں گھل مل جاتا ہے جیسے وہ ہمارا اٹوٹ انگ ہے اور تین سو دنوں کی غیر حاضری اور موسموں کی کانا پھوسی نے اس رشتے میں مغائرت اور غلط فہمی کی کوئی خلیج حائل نہیں کی۔

دسمبر انسانی تہذیب کے ارتقا کی علامت ہے لیکن جون انسان کے اولین حیوانی دور کا مظہر ہے جون میں انسان کلچر سے قطعاً محروم ہو جاتا ہے۔ تہذیب کے سارے آداب بھول جاتا ہے اور بدن کا فطری لباس زیبِ تن کر کے ہڈیوں کے چٹخنے کی پرواہ کئے بغیر اپنے بالوں بھرے جسم کو زمین کی خوشبودار مٹی میں روندنے کے لئے بیقرار ہو جاتا ہے۔ اس مہینے میں انسان ایک بار پھر آدم کی طرح اکیلا ہو جاتا ہے تہذیب کے جملہ لوازم پر تین حرف بھیج کر کھلے آسمان کو اپنا مسکن بناتا ہے اور ستاروں کی چھاؤں تلے بیوی بچوں سے بے نیاز تنہائی کی گپھا میں ڈوب جاتا ہے۔ مردم بیزاری کے اس لمحہ میں بیوی اگر پنکھا لے کر قریب آنے کی کوشش کرے بھی تو بڑی بے رحمی سے دھتکار دی جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جون کا ہی وہ مہینہ تھا جس نے گوتم کو گھر سے نکل کر بھاگنے کی ترغیب دی تھی۔ جون کی طرح ستمبر کا مہینہ بھی دسمبر کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ستمبر جون کی طرح مردم بیزار تو نہیں لیکن کم آمیز ضرور ہے۔ جون تو دور ہی سے آداب عرض کرنے پر اکتفا کر لیتا ہے مگر ستمبر ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا۔ پھر بھی اس میں وہ محبت بھری حرارت کہاں جو دسمبر کے حصے میں آئی ہے۔ دسمبر آداب عرض

سے بے نیاز، مصافحہ کرنے کی نیم گرم کیفیت سے متنفر، بازوؤں کو پھیلائے آتا ہے اور بے تکلف آپ سے بغلگیر ہو جاتا ہے۔ تب آپ اپنے جسم اور رُوح کی گرمی سے لوگوں کا سواگت کرنے لگتے ہیں اور اس سواگت میں ان کے جسموں کی حرارت سے فیض یاب بھی ہو جاتے ہیں۔ مجھے دسمبر کی یہی ادا پسند ہے کہ وہ مجتمع کرتا ہے، ٹکڑے ٹکڑے نہیں کرتا۔ محبت کرتا ہے، نفرت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ پردہ پوشی کرتا ہے تشہیر نہیں کرتا اور پھر اس سب کے علاوہ کافی کے گرم گرم گھونٹ، کوئلوں کی حرارت بخش تمازت اور چلغوزوں کے سنہری ڈھیر، کیا بات ہے دسمبر کی۔

میز اور کرسی

تقی حسین خسروؔ

میز کو لازم کہیے یا کرسی کو ملزوم، میز اور کرسی کے کچھ ناگزیر سے تعلق پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ جہاں کرسی ہوتی ہے وہاں میز ضرور ہوتی ہے اور اسی طرح جہاں میز ہوتی ہے وہاں کرسی کا ہونا لازمی ہے۔ آپ شاید ہی کسی ایسے فرنیچر بنانے والے کی نشاندہی کر سکیں گے جو میز تو بناتا ہے مگر کرسی نہیں بناتا۔ یا کرسی تو بناتا ہے میز نہیں بناتا۔ البتہ چار کرسیوں کے درمیان ایک میز کا ہونا ان لوگوں کے لئے لمحۂ فکریہ بن سکتا ہے جو آزادیٔ نسواں کے علمبردار اور کثرتِ ازدواج کے شدید مخالف ہیں۔ ویسے چار کرسیوں کے درمیان پڑی ہوئی میز نہیں معلوم کیوں کچھ جان سے بیزاری محسوس ہوتی ہے۔ میں یہاں میز اور کرسی کے تعلق سے تذکیر اور تانیث کا جھگڑا نہیں چھیڑوں گا۔ کیوں کہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ چار کرسیوں کے بیچ گھری ہوئی میز ہمارے اس قدیم معاشرے کی یادگار ہو جب مرد نہیں عورت خاندان کی کرسیٔ صدارت پر متمکن ہوتی تھی اور جب یار لوگ "آزادیٔ مرداں" کی مہم چلایا کرتے تھے۔

کرسی اور میز سے متعلق بیک وقت سوچنے کا تعلق بڑی عمر سے بھی ہو سکتا ہے میں خوب اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ میں اس معاملے میں مجبور ہوں جہاں کہیں مجھے کوئی کرسی بغیر میز کے نظر آتی ہے تو میں تڑپ اٹھتا ہوں اور یہی حال میرا اس وقت بھی ہوتا ہے جب میں کسی میز کو بغیر کرسی کے دیکھتا ہوں۔ پھر گویا میں دیوانہ وار اس غیر موجود کرسی یا میز کو تلاش کر کے وجود میں لے آتا ہوں جس کے وجود میں آجانے سے کرسی اور میز کی ازلی جوڑی مکمل ہو جاتی ہے۔ اپنے اس روحانی مشن کی کامیابی پر مجھے کچھ ایسا ذہنی سکون ملتا ہے کہ جس کے اظہار کی طاقت میری تقریر میں ہے نہ تحریر میں۔ البتہ میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ یہ کچھ اسی قسم کا اظہارِ آسودگی ہے جو ہمارے بزرگوں سے

حصے میں آتا ہے۔ ہم خاندان کی کسی اَن بیاہی لڑکی یا اَن بیاہے لڑکے کو دیکھ کر تڑپ اٹھتے ہیں اور پھر اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتے جب تک وہ ان کا بیڑہ غرق نہیں کر دیتے۔ سچ پوچھئے تو آدم کی تخلیق سے حوا کی تخلیق تک کا فاصلہ بھی کچھ اسی قسم کی تڑپ سے عبارت نظر آتا ہے جو خدا کی بزرگی نے آدمؑ کو اکیلا دیکھ کر محسوس کی تھی۔ پھر جب آدمؑ کی بائیں پسلی سے حوا نمودار ہوئیں اور آدمؑ و حواؑ کی جوڑی مکمل ہو گئی تو خدائے بزرگ و برتر نے اطمینان کا سانس لیا کہ اب آدمؑ اکیلے نہیں رہے۔ لیکن کاش! خدا کی بزرگی نے یہ سوچا ہوتا کہ حوا کی تخلیق سے پہلے آدمؑ کا اکیلا پن کیسا۔ حوا نے شریکِ حیات بن کر آدمؑ کو اکیلا کیا اور حوا کی بیٹیوں نے ہمیں۔ یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا لیکن اس سے ایک بات ضرور ثابت ہو گئی کہ میرا یہ میز اور کرسی سے متعلق بیک وقت سوچنا میرے خلیفۃ اللہ ہونے کا ایک ناقابلِ انکار ثبوت ہی ہے۔ مگر خدا کے لئے آپ مجھ سے یہ نہ پوچھئے کہ پہلے کرسی وجود میں آئی تھی یا میز۔

انسانی معاشرے میں کرسی اور میز کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ کرسی نشینی (اس میں میز کا ناگزیر تصور شامل ہے) ہمیشہ عزت و شرف بلکہ رعب و دبدبے کا باعث سمجھی جاتی رہی ہے۔ ماضی کے کرسی نشینوں کے شخصی کارنامے یک جا کئے گئے تو ایک مستقل مضمون، تاریخ وجود میں آیا۔ اس کے یک جا کرنے والے کو مورخ اور جاننے والے کو تاریخ دان کا نام دیا گیا۔ بعض پڑھا کو قسم کے لوگوں نے اس مضمون کو پڑھ کر خود کرسی نشینی کی سعادت حاصل کی۔ آج کے کرسی نشینوں کے کارنامے کل تاریخ کہلائے اور ان کو پڑھ کر کل کے لوگوں نے کرسی نشینی کی عزت حاصل کی۔ اس طرح کرسی نشینی کا سلسلہ حلقہ در حلقہ کسی سنہری زنجیر کی طرح دراز ہمارے معاشرے کی ابتداء سے انتہا تک (واللہ عالم) پھیلا ہوا نظر آتا ہے بلکہ یوں کہنا زیادہ درست ہوگا کہ کرسی (یہاں ایک بار اور میں آپ کو یاد دلا دوں کہ اس میں میز کا ناگزیر تصور شامل ہے) کو ہم نے ہمیشہ ہی کرسی نشینی پر مقدم جانا ہے۔ شہنشاہوں کی شہنشاہیت کو ہم نے کبھی بھی اس وقت تک تسلیم نہیں کیا جب تک انہیں تختِ شاہی پر جلوہ افروز نہ دیکھ لیا۔ تختِ شاہی جو کرسی ہی کی شکل کا ہوتا ہے آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی جج کی ججی، چیئرمین کی چیئرمینی یا اسپیکر کی اسپیکری اور صدر کی صدارت کرسی ہی کی مرہونِ منت ہے اور ہر کرسی کے آگے ایک میز ضرور ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم میں سے ننانوے فیصد حضرات کی زندگی کا نصب العین کرسی کا حصول ہوتا ہے۔ کرسی ہمیشہ ہی سے ہمارے ذہنوں سے اور ہمارے اعصاب پر عورت سے زیادہ چھائی رہی ہے (خواتین سے معافی کے ساتھ) کرسی ہی نے باپ کو بیٹے سے اور بیٹے سے باپ کو قتل کرایا۔ کرسی ہی نے بھائی کو بھائی کا قاتل بنایا۔ کرسی ہی نے ملکوں اور قوموں

میں جنگیں کرائیں مگر کرسی ہی نے ہمیں عدل اور انصاف دیا۔ جج کی کرسی اور میز ہم نے دیکھی ہے۔ اسی طرح اسپیکر، چیئرمین اور صدر کی کرسیاں اور میزیں بھی ہم نے دیکھی ہیں اور اس سے ہم بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں کہ خدائے بزرگ و برتر کی کرسی (اور اس کے آگے پڑی میز) کیسی ہوگی۔ اور پھر ذرا کرسی اور میز کی پہنچ سے متعلق سوچئے کہ جہاں ہمارا وہم گمان بھی نہیں پہنچ سکتا۔ وہاں کرسی اور میز بہت پہلے سے موجود ہیں۔

گھر اور دفتر ہماری زندگی کے دو بالکل ہی مختلف دائرۂ عمل ہیں لیکن ہر دو جگہوں پر کرسی اور میز کو ہماری زندگیوں میں دخل حاصل ہے یہ اور بات ہے کہ دفتر عبارت ہی کرسیوں اور میزوں سے ہوتا ہے۔ ویسے گھر پر بھی کرسی اور میز کی مختلف قسمیں آپ کا چاروں جانب سے جیسے گھیراؤ کئے رہتی ہیں۔ بھوک لگے تو ڈائننگ ٹیبل اور اس کے گرد پڑی کرسیوں سے مفر نہیں۔ لکھنا چاہئے تو رائیٹنگ ٹیبل اور اس کی کرسی ضرور استعمال کیجئے۔ ڈرائنگ روم کا رخ کیجئے تو وہاں بھی بھانت بھانت کی کرسیاں اور میزیں آپ کا راستہ روکے کھڑی ہوتی ہیں۔ بیگم کی ڈریسنگ ٹیبل علیحدہ ہے کہ اس کے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہونے سے میں نے ہمیشہ ہی گریز کیا ہے۔ شاید میں اپنا آپ سامنا کرنے سے ڈرتا ہوں۔ لیکن سچ پوچھئے تو میرے گھر پر صرف ایک میز بغیر روغن کی ہوئی ہے اور دو کرسیاں ہیں جن کے جگہ جگہ سے ٹوٹے ہوئے پلاسٹک کے تاروں نے ہمیشہ ہی میری ذہنی الجھنوں میں اضافہ کیا ہے لیکن اس سے بھی زیادہ میز ایک اور دو کا تناسب میرے لئے پریشانی کا باعث ہے اور میں اس فکر میں ہوں کہ کہیں سے کوئی ڈھنگ کی میز مل جائے تو کرسی اور میز کی ازلی جوڑی مساوات کی بنیاد پر بناؤں لیکن نہیں معلوم کب وہ وقت آتا ہے۔

شاخِ زیتون

جمیلؔ آذرؔ

میں علی الصبح نسیم سحری کی لطیف خنک لہروں کے جھنڈ میں سے گزرتا ہوا شہر کے باہر زراعتی فارم پر پہنچ جاتا ہوں یہاں خاموش دُور دُور تک پھیلے سبز پیلے اور مٹیالے کھیت اپنے وسیع دامن پھیلائے میرا خندہ روئی سے استقبال کرتے ہیں کہ جیسے انہیں میرا پہلے ہی سے انتظار تھا۔ میں ان پر مسرت بھری نگاہیں ڈالتا ہوا ایک گوشے میں لگے زیتون کے قطار در قطار پیڑوں کے جھنڈ میں داخل ہو جاتا ہوں، اور باہر کی دنیا سے اپنا رابطہ منقطع کرکے زیتون کی سبز رنگ دنیا میں گم ہو جاتا ہوں۔

آپ شاید یہ خیال کریں کہ میں سحر خیز ہوں، اور سیر کرنے کا عادی ہوں۔ نہیں یہ بات نہیں۔ الحمدللہ نہ تو میں بیمار ہوں، اور نہ ہی کسی ڈاکٹر کے مفت مشورہ پر عمل کرتے ہوئے صبح سویرے اُٹھ کر سیر کرنے کی فضول عادت میں مبتلا ہوں۔ بھلا آج کل کے مادی اور صنعتی دور میں اور شہر میں رہ کر سیر کرنے کا وقت کس شریف آدمی کے پاس ہے۔ ایک وقت تھا، جب واقعی لوگ صبح نور کے تڑکے اٹھ کر سیر کے لئے کسی پارک میں، کسی باغ میں کسی نہر یا دریا کے کنارے جاتے، ورزش کرتے اور جسم بناتے۔ مگر آج کل تو ہم دن بھر کی مشقت جھیل کر رات کے بارہ بجے تک ٹیلی ویژن پر تھرل اور سسپنس سے بھرپور ڈرامے دیکھ کر اس قدر تھک ہار کر سو جاتے ہیں، کہ صبح اٹھ کر سیر کرنا تو کجا دفتر، سکول، کالج اور کام کاج پہ پہنچنا ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ ویسے بھی یہاں ہمارے شہروں میں پارک ویران ہیں، اور باغوں کا دور دُور تک نام و نشان نہیں ملتا۔ اب تو صرف سڑکیں ہی سڑکیں اور عمارتیں ہی عمارتیں رہ گئی ہیں، جیسے لوگوں کو صرف ایک ہی شوق ہو گیا ہو، نہیں شوق نہیں جنون ہو گیا ہو کہ عمارتیں بناؤ، پلازے بناؤ، اور خوب روپے بناؤ، گویا "نقطۂ پرکارِ حق" روپیہ ہی تو ہے۔ ویسے بھی ہم اور سیر دو متضاد چیزیں ہیں۔ میرا تعلق تو دراصل زیتون کے پیڑوں کے اس جھنڈ سے ہے، جن کی ناقابل بیان کشش مجھے بسترِ راحت سے اٹھنے پر مجبور کر دیتی ہے، اور میں ان کے پُراسرار افسوں کے زیرِ اثر کشاں کشاں ان کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہوں۔ اپنے آپ کو

زیتون کے درختوں کے مابین پارک میں ایک عجیب نامعلوم سی روحانی خوشی کے لمس سے آشنا ہوتا ہوں میری سوچ کی زبان ان سے ہم کلام ہوتی ہے۔ میری روح کے سُر تال ان کی روح کے جل ترنگ سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے ان کا اور میرا ساتھ بہت ہی قدیم ہے۔ ازل سے ابد تک ہماری روحیں ایک دوسرے کے ساتھ ناقابل بیان زبان میں سرگوشی کرتی ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو جانتے اور پہچانتے ہیں۔ ہاں یہ وہی درخت ہے، جس کا ذکر آسمانی کتابوں میں ملتا ہے، جس کا تعلق خلد بریں سے ہے، جس کی نسبت طور سینا سے ہے، جس کی قسم خدائے ذوالجلال نے کھائی، جس کے تسکین بخش سائے میں پیغمبروں نے استراحت فرمائی، جس کی نرم ملائم شاخوں پر بادشاہوں نے اپنے سر کے تاج سجائے، جس سے مذہبی پیشواؤں نے اپنی عبادت گاہوں کو منور کیا۔ جس سے کاہنوں نے نت نئے جادو جگائے، جس کے روغن سے انسانوں کے جسموں نے جلا اور توانائی پائی، جس کا ذکر شاعروں نے اپنے کلام میں کیا، جس کی توصیف ادیبوں نے کی، اور تصویریں مصوروں نے بنائیں، جس سے لوگوں نے اپنے گھروں کو مزین کیا، جسے ہر نسل انسانی نے پیار اور احترام سے دیکھا، جس کی شاخیں امن و آشتی کی علامت بن کر ہماری دنیا میں سایہ فگن ہوئیں۔ اس کی لازوال تاریخی عظمت کا سحر مجھے اپنی رفعت بخش آغوش میں لے لیتا ہے

میں حال کے لمحۂ پریشاں سے آزاد ہو کر اپنے باطن کی وسعتوں میں محوِ خرام ہونے لگتا ہوں، اور تنہائی کے کانٹے میرے وجود سے نکل کر منتشر ہو جاتے ہیں۔

زیتون کے درخت میں بے پناہ مقناطیسی کشش ہے۔ یہ آپ کو اپنی طرف اس طرح کھینچتا ہے، جیسے پھول کی خوشبو بھونرے کو، چاند کی کرنیں چکور کو اور شمع کی لَو پتنگے کو کھینچتی ہے۔ یہ درخت اپنی ہیئت اور خوش قامتی میں عام درختوں سے بالکل مختلف ہے۔ یہ ایک پاکیزہ دلہن کی طرح حسین ہے، جسے دیکھ کر آپ بے اختیار حیرت و استعجاب میں ڈوب جاتے ہیں۔ یہ اپنا حسنِ تناسب رکھتا ہے۔ اس کی بھری بھری سانس تنے کی تھوڑی سی بلندی کے ساتھ ہی اپنی مضبوط منفرد حیثیت سے کسی رقاصہ کی طرح بل کھاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس کی شاخوں کا پھیلاؤ افقی بھی ہے اور عمودی بھی۔ اس کے چینی و شہرائن کی آنکھوں جیسے ننھے ننھے پتوں کا رنگ گہری سبز جھیل کے پانی کی طرح چمکتا ہے۔ پتوں کے دوسری طرف کا رنگ ایسا ہے، جیسے کسی نے سبزے پر نقرئی افشاں چھڑک دی ہے، جو ذرا سی روشنی میں جھلملا اٹھتے ہیں۔ سورج کی سنہری کرنوں میں تمام پیڑ میں ایک زرتار کا جال سا پھیل جاتا ہے۔ اس کا یہ رنگ روپ دیکھ کر یوں لگتا ہے، جیسے یہ درخت سمندر کے پاتال میں اگا تھا، جسے طور سینا کی وادی نے خاص اپنے لئے پسند کر

ا پر اب بھی سمندری مخلوق اپنا بسیرا کئے ہوئے ہے۔ اس کے تنے کی متناسب بلندی کی وجہ سے آپ
و چھو سکتے ہیں۔ اس کی مدور لچکیلی شاخوں پر بلا خوف و خطر چل سکتے ہیں، بلکہ بھاگ سکتے ہیں قلابازیاں
جھول سکتے ہیں۔ یہ آپ کو دوستی محبت اور ذاتی رشتوں کی فضا مہیا کرتا ہے۔ اس کی معیت میں آپ کو
ساس نہیں ہوتا، آپ پوری آزادی کے ساتھ اس کی سنگت میں رہ سکتے ہیں۔ یہاں کسی آسیب یا
نہیں ہوتا۔ یہ تو کوثر و تسنیم میں دھلا ہوا پیڑ ہے۔ پاکیزہ و اطہر ایک معبد ہے، جہاں آپ کو سکون ملتا
بائے امن ہے، جہاں شانتی ہی شانتی ہے۔

پیڑ میں بلا کا ملکوتی حسن ہے، جو اعتدال و توازن میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔ کھجور صحرائی درخت ہے، جس
ا ہوتا ہے، جس پر چڑھنا دشوار کام ہے، اور چڑھ کر گرنے کا خطرہ ہر وقت لگا رہتا ہے۔ جبکہ اس پر
ر آسان ہے، کیونکہ یہ تو ہر وقت بازو پھیلائے آپ کو زینے مہیا کرتا ہے، اور اس کی شاخیں آپ کو
ظ بخشتی ہے، جس پر سے گرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دیو دار کوہستانی درخت ہے، جس کے تصور سے
ہے۔ برگد کا پیڑ جنگل سے تعلق رکھتا ہے، جس کے تلے بیٹھ کر آپ تپسیا کر سکتے ہیں، اور گیان دھیان سے
ا کر سکتے ہیں، مگر جس پر چڑھ کر آپ کو اپنی ذات کے گم ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے، لیکن زیتون کا
سمندر کا درخت ہے، جس کی رفاقت میں آپ گہرے نیلگوں سمندروں میں پہنچ جاتے ہیں۔ مونگوں اور موتیوں
ن کو بھرتے ہیں۔ یہ درخت آپ کو فردوس بریں کی حوروں سے ہمکلام کراتا ہے۔ یہ تو دور سے نزدیک
ر ملائم لچکدار شاخوں اور نقرئی سبز پتوں کی جھلاہٹ سے آپ کو بے پایاں شعور حسن و صداقت عطا
یہ درخت ہر موسم میں ہر آن میں، دھوپ میں اور چھاؤں میں، بہار میں نت نئے جلوؤں سے اپنے
ن کو آشکارا کرتا ہے، اور آپ کے دل کو لگاتار سرشار کر دیتا ہے۔

ں جب علی الصبح دھندلکے کی ردا اوڑھ کر زیتون کے درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوتا ہوں، تو اس
بے معنویت کی دنیا سے نکل کر معنویت کی فضا میں داخل ہو جاتا ہوں۔ بے کیف اور اکتا دینے والے
نکل کر طور سینا کی پرکیف وادی میں سبک خرامی کرتا ہوں۔ تفکر و اضطراب کے بستر سے اٹھ کر سبز
پانیوں میں غسل کرتا ہوں۔ تر و تازہ ہونے تک کے عالم سے نجات پا کر ہونے کی حالت میں پہنچ جاتا ہوں۔
ب زرد و تمازت کے ان گنت تیروں کی یلغار خنک، دھندلاہٹ کی ردا کو تار تار کر دیتی
میں اپنے جسم پر لاتعداد سوئیوں کو چبھتا ہوا محسوس کرنے لگتا ہوں۔ سڑکوں اور

بھاگتی کاروں، ویگنوں اور بسوں کا دھواں چھوڑتا شور مجھے کار جہاں کی طرف بلاتا ہے، اور میں رتیتن کی سبز پوشش دلہن کو الوداع کہتا ہوا "نہ ہونے" کی دُنیا میں لوٹ آتا ہوں۔

لمحے

داؤد رہبر

کون کہہ سکتا ہے کہ گزرا ہوا وقت اچھا ہے یا آنے والا۔ مگر گزرے ہوئے وقت میں ایک خوبی تو یہ ہے کہ وہ گزر چکا۔ آنے والے وقت میں اگر کوئی خوبی ہے تو وہ یہی کہ وہ گزر جائے گا۔ اس وقت کیا بجا ہے؟ میری گھڑی اچکن کی جیب میں ہے، کون اُٹھے گا وقت دیکھنے! چلیے آٹھ بجے ہی۔ اگر نو بجے ہیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ ہندسوں سے کیا ہوگا۔ وقت کوئی گھڑی سے تو چلتا نہیں۔ وہ تو چلتا جاتا ہے خواہ گھڑی رک جائے۔ اگر آج کوئی کہہ دے یہ سال ۲۰۰۵ ہے میں تو کوئی حرج نہیں سمجھتا آخر مسیح تین سال پہلے پیدا ہو جاتا تو کیا فرق پڑتا۔ یکی تیس سال پہلے آجاتی؟ اب مسیح کو گزرے دو ہزار سال ہونے کو آئے ہیں دنیا نے آخر مسیح سے کتنا فائدہ اٹھایا ہے۔

مگر وقت بھاگتے ہوئے کتے کی طرح نظر کیوں نہیں آتا۔ بھاگتا ہوا کتا خود بھی تو شاید وقت ہے۔ اس کا ہر قدم حرکت کرتا ہوا وقت ہے۔ وقت میں حرکت کیسی ہے وہ خاموش ہے یا کل نہیں ہوتا۔ وقت اس کو ٹھہر جانا چاہیئے تاکہ ہم اسے دیکھیں یہ نظر نہیں آئے گا۔ ہوا بھی نظر نہیں آتی۔ مگر کبھی کبھی جھونکے تو آتے ہیں اور پودے ہلنے لگتے ہیں۔ کھیت سر جھکا لیتا ہے اور آندھی آتی ہے تو مٹی اڑتی ہے وقت کی چال بجلی سے بھی زیادہ تیز ہے۔ پھر بھی خاموش ہے کہیں وقت ٹھہرا تو نہیں، شاید ہم چل رہے ہیں۔ بجلی سے بھی زیادہ تیز۔ ہر خیال ایک گزرا ہوا خیال بن جاتا ہے۔ وہ خیال پھر آتا ہے لیکن وہ ایک نیا خیال ہوتا ہے۔ نئے روپ میں۔

یہ کیسا دن تھا جو آندھی کی طرح گزر گیا۔ یہ خوشی کا دن تھا تو خوشی میں وقت تیز ہو جاتا ہے حالانکہ دنیا کی گھڑیاں تیز ہو جاتی ہیں۔ میری خوشی کے لیے کائنات میرا کتنا خیال رکھتی ہے۔ میرے لیے سب گھڑیاں تیز ہو گئیں اور سورج بھی جلدی جلدی آسمان کے ٹکڑے کر گیا۔ یہ وہ سکیوں آہستہ ہو گئی۔ شاید وقت تھک گیا ہے اور گھڑیاں بھی تھک گئی ہیں۔ کل تو یہ گھڑیاں بہت سست تھیں۔ شام ہونے کو نہ آتی تھی۔ لوگ کہتے ہیں

دونوں دن تو گھنٹوں کے بجتے گھڑیاں بھی عجیب خبریں دیتی ہیں۔

یہ گزرا ہوا کل ہے۔ ایک یاد ہے اور آج یا ہنسی ہے یا آنسو۔ اور کل۔ آنے والا ہر حال میں ایک امید، یقین کی حد تک ضرور آئے گا۔ آج لاہور میں کتنے آدمی مرے۔ ان کے لئے کل نہیں آئے گا مگر کیوں نہیں بہتے ہوئے خون پر نیلے بدن پر سانس کے بغیر کل آئے گا۔ آخر امیٹوں پر بھی کل آتا ہے اور برسات کے بعد ان پر کائی بھی ہوتی ہے۔

آج پھر دھوپ نکلی۔ کل بھی نکلی تھی۔ اسی طرح گرم۔ شفقت سے بھری تھپکیاں دیتی ہوئی مگر یہ کل والی دھوپ نہ تھی۔ وہ دھوپ مر چکی۔ یہ نئی دھوپ تھی۔ ہر لمحہ نئی دھوپ ہر لمحہ نئی گرمی، ہر لمحہ گیا ہے۔ یہ تسبیح کے دانوں کی طرح وقت تو گزرتے تارے کی لکیر ہے ہر نقطے پر ٹھہرا ہوا، پھر بھی رواں۔ لمحہ کیا وقت کے چہرے پر ایک خال! ایک نقطہ! بے جہات، بے طول بے عرض مگر نقطہ کتنا ہی باریک ہو بالکل موہوم نہیں ہو سکتا۔

آج میں خاصی دیر دھوپ میں لیٹا رہا۔ نیلے آسمان کو دیکھتا رہا۔ کتنا بے حس و حرکت آسمان تھا۔ جیسے وقت سے بے خبر ہو۔ کاش وہ چیلوں کا گھومتا ہوا جھنڈ حائل نہ ہو جاتا۔ ورنہ میں بھی وقت کو بھول جاتا۔ ذرا دیر کے لئے چیلیں ادھر سے ادھر جا رہی تھیں اور اوپر سے نیچے آ رہی تھیں۔ گھڑی کی سوئی کی طرح وقت کٹ رہا تھا اور پھر دھوپ معلوم ہوئی چیلیں بھی ہوئیں تو وقت واپس آ گیا تھا۔ اتنی دیر دھوپ برداشت نہیں ہوتی۔ دس منٹ ہی میں گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔ وقت طویل آسائش کا متحمل نہیں اور لذت کی چوٹی سے نیچے اترنا ہی پڑتا ہے۔ تو پھر آنے والا وقت بہتر ہے جس میں مسرت ایک پکتا ہوا رسیلا پھل بن کر نظر آتی ہے اور گزرا ہوا عیش گلا سڑا چھلکا بن کر کوڑے کی نالی میں جا گرتا ہے مگر مستقبل کے امید و بیم تو کبھی کبھی گھلا ڈالتے ہیں اور ماضی کی مصیبت مسکراہٹ کے ساتھ یاد آتی ہے۔ دونوں گوارا ہیں۔ اگر حال خوشگوار ہے۔

عمر کا آدھا وقت تو نیند میں گزر جاتا ہے۔ پھر خواب دکھائی دیتے ہیں۔ گزرا ہوا وقت ان میں لوٹ آتا ہے۔ نارفتہ وقت بھی پہلے سے گزر جاتا ہے اور میں پھر جاگ اٹھتا ہوں۔ خواب کا دامن بھی جاتا رہا۔ وہ ایجاد کب ہو گی جس سے صدیوں پہلے کا وقت واپس بلا لیا جائے اور بھولی ہوئی محبتیں، پھر لوٹتے ہوئے راگ بن جائیں گی۔ وہ وقت پھر آ گیا تو اپنے دکھ بھی تو ساتھ لائے گا۔ یہ نئی محبتیں اور نئے دکھ، یہ سب پرانے ہی تو ہیں۔ اگلوں سے چھین کر بعد والوں کو دیئے گئے ہیں۔

پرانا وقت واپس کیسے بلایا جاسکتا ہے، حال کے ٹلے کہاں جائیں گے۔ وقت پانی کی طرح ہے جس میں اور پانی انڈیل دیں تو پھر یک جان ہو جاتا ہے۔ نیا وقت پرانے وقت کو کبھی نہ آنے دے گا اسے ٹکڑے کرے گا۔ شاید اس طرح ہم وقت کی آواز سن پائیں جیسے روئی کے نرم بادل ٹکرا کر شیروں کی طرح گرجا کرتے ہیں اور آنے والا وقت اسے سب معلوم ہے کہاں کہاں جنگ ہونے والی ہے، کس کی جیت ہوگی۔ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ یہ کتے جو رات کے سناٹے میں اس خود اعتمادی سے بھونک رہے ہیں، چپ ہو کر رہ جائیں اگر وقت انہیں بتا دے کہ آدمیوں میں کس طرح کی جنگ ہونے والی ہے۔

اب کیا بجا ہے؟ مگر وہ "اب" تو گھڑی دیکھتے دیکھتے کب کا گزر چکا۔

ہل چلانا

سلیم آغا قزلباش

گرمیوں کی چھٹیوں کی خبر سنتے ہی اہلِ شہر کے مردہ دلوں میں خوشی کی ایک لہر سی اٹھتی ہے جو سارے جسم میں سرایت کر جاتی ہے اور وہ مختلف مقامات پر موسم گرما کی تعطیلات گزارنے کا پروگرام مرتب کرنے لگتے ہیں، لیکن میں ہمیشہ کی طرح "ہل" کو کھیت میں چلتا ہوا دیکھنے کے لئے اپنے گاؤں کی راہ لیتا ہوں۔

اُس چھوٹے سے سٹیشن پر قدم رکھتے ہی جو میرے گاؤں سے صرف چند میل کے فاصلے پر ہے، مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں نے جنت ارضی میں قدم رکھ دیا ہے۔ میری بے چین نگاہیں تانگے کی تلاش میں ارد گرد کا طواف کرتی ہیں اور جب مجھے دور سے کوئی بھولا بھٹکا "تانگہ" نظر آتا ہے تو میں جان لیتا ہوں کہ میری منزل بنفسِ نفیس مجھے خوش آمدید کہنے کے لئے میری جانب چلی آرہی ہے۔ تانگے پر سوار ہوتے ہی میں اس نگری کی جانب روانہ ہو جاتا ہوں جس کی مٹی کی خوشبو میرے جسم کے ذرّے ذرّے میں رچ بسی ہے۔

صبح کاذب کے بعد اور طلوعِ آفتاب سے پہلے میری آنکھ اپنے آپ کھل جاتی ہے تو مجھے سب سے پہلے بیلوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی مترنم آواز سنائی دیتی ہے جس کے پیچھے پیچھے گاؤں کے "ہالی" کندھوں پر ہلیں رکھے ہاتھوں میں حقے پکڑے لوک گیت گنگناتے، کھیتوں کی جانب جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ میں جب انہیں جاتے ہوئے دیکھتا ہوں تو فوراً کپڑے تبدیل کر کے ہاتھ میں چھڑی لے کر ان کے پیچھے چل پڑتا ہوں۔ کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے مجھے اپنے بچپن کے استاد جی کی نصیحت یاد آجاتی ہے جس کا وِرد وہ جماعت کے تمام طلباء کے سامنے بلاناغہ کیا کرتے تھے

سویرے ہی اٹھے گا جو آدمی رہے گا وہ دن بھر ہنسی اور خوشی

اس لمحے تو ہم ان کی اس نصیحت کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتے تھے مگر جب سے میں نے "ہل" کے تعاقب میں کھیتوں کا طواف شروع کیا ہے تو مجھے استاد جی کی اس گرانقدر نصیحت کی صداقت پر یقین آگیا ہے

ہالی اپنے کھیتوں میں "ہل" رکھ کر ایک جگہ بیٹھ کر حقّے کے کش لگانے لگتے ہیں، مجھے اپنی جانب آتا دیکھ کر ان کے چہرے پر تبسّم پھیل جاتا ہے۔ ان میں سے کوئی اپنی میلی چادر زمین پر بچھا کر مجھے اس پر بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہے مگر میں ہمیشہ کی طرح سر کو نفی میں ہلا دیتا ہوں کیونکہ مجھے یہ بات بھلی معلوم نہیں ہوتی کہ وہ تو زمین پر بیٹھیں اور میں خود چادر پر آرام سے بیٹھ جاؤں۔

شروع شروع میں جب میں روزانہ کھیتوں میں جا کر گھنٹوں کے حساب سے "ہل" کو کھیتوں میں اٹھکیلیاں کرتے دیکھنے لگا تو ایک روز ایک دیہاتی نے مسکرا کر مجھ سے پوچھا "یار تینوں ہور کوئی کم نئیں، جیہڑا توں اتھے روز گھنٹیاں بدی کھلوتا رہنا ایں؟" (دوست تمہیں اور کوئی کام نہیں جو تم یہاں گھنٹوں کے حساب سے کھڑے رہتے ہو) تو مجھے بڑی شرمندگی کا احساس ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں اسکی نظر میں ایک ایسا کاہل اور کام چور ہوں جو اور کوئی کام نہیں کرتا اور محض تماشا دیکھنے کھیتوں تک آ جاتا ہے۔ بعد ازاں میں نے اس کی غلط فہمی دور کر دی اور اسے بتایا کہ مجھے کھیتوں میں "ہل" چلتے ہوئے بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ میری بات سن کر وہ اپنے پیلے پیلے دانت نکال کر ہنسنے لگا اور پھر ہنستا ہی چلا گیا۔ اس کے بعد گاؤں میں کئی روز تک چہ میگوئیاں ہوتی رہیں کہ شہری بابو کا دماغ چل گیا ہے مگر پھر مزاح سنجیدگی پر غالب آ گیا اور انہوں نے میرا نام "ہالی بابو" رکھ دیا اور پھر میں جدھر سے بھی گزرتا وہ مجھے اسی نام سے پکارتے لیکن میں انکے اس مذاق کو بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتا۔ بات بھی درست تھی "ہل" میں میری اس غیر معمولی دلچسپی کو دیکھ کر وہ اور کیا کہتے۔ مگر دوسری طرف میرا موقف بھی غلط نہیں تھا کیونکہ مجھے "ہل" میں ہمیشہ وفاداری نظر آئی ہے۔ یہ بالکل سیدھا سادا لکڑی کا بنا ہوتا ہے اس میں کوئی پیچیدگی نہیں ہوتی اور یہ ہر حال میں اپنے مالک کا ساتھ دیتا ہے۔ مالک کے شانہ بشانہ کھیت میں کام کرتا ہے۔ دھرتی کا سینہ چیر کر اس میں سے چاندی اور سونا نکالتا ہے اس سے زیادہ وفاداری اور کیا ہو سکتی ہے۔

جب سے ٹریکٹر نے "ہل" کے منصب کو ہتھیانے کی کوشش کی ہے مجھے مشین سے خدا واسطے کا بیر ہو گیا ہے۔ میں کھیتوں میں جا کر ٹریکٹر کو ہل چلاتا ہوا نہیں دیکھ سکتا کیونکہ اس میں پیار اور محبت کا فقدان ہے اسکی بجائے رعونت اور غرور کی فراوانی ہے۔

ٹریکٹر تو کسی جنگلی جانور کی طرح غراتا اپنے نوکیلے پنجوں سے دھرتی کا سینہ ادھیڑتا چلا جاتا ہے لیکن جن کھیتوں میں بیل کے ذریعے "ہل" چل رہا ہو وہاں مجھے یوں لگتا ہے جیسے ماں بچے کے پیر سے کانٹا نکال رہی ہے یا اسے تھپک تھپک کر سلا رہی ہے بے شک مشینوں کے ذریعے کام کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے وقت کم صرف ہوتا ہے اور پیداوار میں بھی اضافہ ہوتا ہے مگر ٹریکٹر کی اونچی سیٹ پر بیٹھ کر انسان زمین کے لمس سے محروم ہو گیا ہے۔ دولت کی ہوس اور آبادی کے اضافے نے انسان کو یہ سب کچھ کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ ہے کہ یہ بدہیئت مشینیں "ہل" کو مٹانے میں ناکام رہی ہیں۔

مختلف اشیاء جو انسانی زندگی میں آج معیشیات کا درجہ رکھتی ہیں کل ضروریات میں تبدیل ہو سکتی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ تمام اشیاء انسان کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہتیں بلکہ گزرتے ہوئے زمانہ کے ساتھ ساتھ پرانی ہو کر ضائع ہو جاتی ہیں یا اپنی ہیئت تبدیل کر لیتی ہیں لیکن کسان کا "ہل"، نہ صرف زمانے کے حوادث کا مقابلہ کرنے میں کامیاب رہا ہے بلکہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی بھی رونما نہیں ہوئی اور یہ ہمیشہ کی طرح آج بھی کسان کے قدموں سے قدم ملا کر زندگی کے طویل سفر میں اس کا ہر دم ساتھ دے رہا ہے۔

گرمیوں کی سہانی راتوں کو میں جب کبھی اپنے گھر کی بالائی منزل پر چارپائی بچھا کر سوتا ہوں تو آدھی رات کے قریب میری آنکھ خود بخود کھل جاتی ہے اور مجھے پچھلی رات کا لاغر چاند اُس ضعیف کسان کی طرح دکھائی دیتا ہے جو اپنے ریشہ بازووں میں ہل سنبھالے ادھ ننگے جسم پر سیاہ بادلوں کی چادر لپیٹے آسمان کے کھیتوں میں بیج بکھیرنے کے بعد بے ستارہ ہو اور آسمان پر ننھے ننھے کروڑوں پودے سر باہر نکال کر "پنے" بانی" کو حسرت سے دیکھ رہے ہوں۔

پہلی مرتبہ جب میں نے کھیت میں "ہل" چلایا تو مجھے محسوس ہوا کہ ہم بیل اور "ہل" ایک ہی منزل کی طرف رواں ہیں اور اس سفر میں ہم تینوں دھرتی کے چھپے ہوئے خزانوں کی تلاش میں ہیں۔ "ہل" کی نوک ریت میں دھنسی ہوئی تھی اسے خود بیل آگے کی طرف کھینچ رہے تھے اور میں اسے پیچھے سے دھکیل رہا تھا۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ "ہل" کی نوک "حال" ہے میں ماضی ہوں اور بیلوں کی جوڑی مستقبل ہے۔ ماضی کے بوڑھے چہرے پر تجربات کی جھریاں ہیں اور مستقبل کے چہرے پر صبح صادق کی سفیدی۔ رہا حال تو اس کے چہرے پر تبسم کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ انداز فکر مجھے "ہل" چلانے کے دوران ہی حاصل ہوا ہے اور میں اسے "ہل" ہی کا تحفہ سمجھتا ہوں۔

"ہل" چلاتے ہوئے میں نے پلٹ کر دیکھا تو مجھے بیسیوں پرندے نظر آئے جو "ہل" کے پیچھے پھدک پھدک کر آ رہے تھے اور کھدی ہوئی زمین میں سے اپنے لئے کچھ تلاش کر رہے تھے۔ مجھے اس لمحے یہ احساس شدت سے ہوا کہ مجھ میں اور ان پرندوں میں کوئی فرق نہیں کیونکہ میں بھی تو "ہل" چلا کر خزانوں کی تلاش میں ہوں۔ فرق بس یہ ہے کہ پرندے صرف آج کے رزق پر اکتفا کرتے ہیں اور میں قیامت تک زندہ رہنے کا اہتمام کرتا ہوں پرندے صرف حال کے لمحے پر زندہ ہیں اور میں یا تو ماضی میں بسیرا کرتا ہوں اور یا مستقبل میں محو پرواز رہتا ہوں البتہ ہل چلاتے ہوئے پرندوں کی طرح مجھ پر بھی "حال" طاری ہو جاتا ہے اور پھر یہ لمحہ اتنا روشن ہو جاتا ہے کہ اس میں سے شعاعیں سی نکلنے لگتی ہیں۔

لکھنا

طارق جامی

لکھنا مجھے بالکل پسند نہیں، اس لئے میں بالکل نہیں لکھتا۔ حتیٰ کہ دوستوں کے خطوط اور رشتہ داروں کے اعتراضات کے جواب تک نہیں لکھتا۔ میں اس لئے نہیں لکھتا کہ لکھ نہیں سکتا، بلکہ اس لئے نہیں لکھتا کہ میں لکھنے کو جنونی عمل سمجھتا ہوں۔ اسی طرح مجھے لکھنے والے لوگ بھی ایک آنکھ نہیں بھاتے، جو خواہ مخواہ بیٹھے لکھتے رہتے ہیں۔ آخر ضرورت ہی کیا ہے کہ صاف شفاف کاغذوں کو نیلی کالی روشنائیوں کی ٹیڑھی ترچھی لکیروں سے بھر دیا جائے، اور وقت کی اصل، جوہر اور مغز کو مفت میں ضائع کر دیا جائے۔ سارا سارا دن دفتروں، کارخانوں، سکولوں، کالجوں، سڑکوں، ہوٹلوں حتیٰ کہ فٹ پاتھوں پر جو کچھ ہوتا ہے، اس کا ۸۰ فیصدی لکھنے پر مشتمل ہے۔

دفتروں میں روزانہ صاحب کو بیسیوں خطوط موصول ہوتے ہیں۔ سٹینو کو جوابات لکھوائے جاتے ہیں۔ بیس بیس کاپیاں کی جاتی ہیں۔ پروفنگ میں ایک آدھ غلطی کے سبب از سر نو یہ مرحلہ طے کیا جاتا ہے۔ لیبارٹریوں میں تجربے ہوتے ہیں، تجربے کئے جاتے ہیں۔ رپورٹیں تیار کی جاتی ہیں، پھر ان کی کاپیاں بنائی جاتی ہیں، مختلف اداروں کو ان کے مختلف سربراہوں کو ارسال کی جاتی ہیں۔ وہ سربراہ انہیں سرسری طور پر دیکھتے ہیں، اور ان کی زبان صاف کر کے خوبصورت روغنی کاغذ کی رنگین کھول دیتے ہیں۔ سیاست دانوں کی تقریروں کو رنگین بیانی اور شعلہ سامانی سے سجایا جاتا ہے۔ اخباری نمائندے تفصیلات تیار کرتے ہیں۔ اخبار کی شہ سرخیاں نئے دن کو نئے عنوان دیتی ہیں، اور پھر وہی اخبار شام کی چائے پر بچوں کے جہاز بن جاتے ہیں۔ اخباروں میں چھپی تصویروں کے بڑے کیپشن دوسری صبح گالی کی علامت بن جاتے ہیں۔ سکولوں، کالجوں میں پڑھائی کے دوران استعمال ہونے والی لاکھوں کروڑوں کتابوں کو سائنس دانوں، سیاست دانوں، ادیبوں، شاعروں، فلاسفروں، تاریخ دانوں کی صدہا سال کی کاوشوں کی نذر کر کے جو کچھ پھر کاپیوں پر لکھوایا جاتا ہے، وہ سراسر وقت اور کاغذ کا ضیاع ہے (آج کل وقت اور کاغذ کی قیمت برابر برابر ہے) مجھے ڈاک کے خوبصورت لفافوں پر پتہ بھی لکھنا وحشیانہ عمل لگتا ہے کہ اتنی شفاف سطح کو خواہ مخواہ اوٹ پٹانگ

گلیوں، محلّوں، وارڈوں اور معرفتوں کے کلہاڑوں سے ذبح کیا جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ دنیا بھر کے صاف شفاف کاغذوں اور کاغذ کے لفافوں کو نائیلون کے لفافوں میں بند کر کے صندوقوں میں بھر کے رکھ لوں۔ اور ساری عمر ان پر مٹی کا ایک ذرّہ نہ پڑنے دوں۔ روزانہ صبح نماز کے وقت ان کاغذوں کو کھول کر دیکھوں، اور ان کی چمکیلی سطح کی ساری خوشبو پھیپھڑوں میں مجتمع کر لوں، اور یوں سارا دن خوش مزاجی میں گزار دوں۔ مگر کیا کیا جائے کہ میرے مخلص احباب میری ساری خواہشیں مجروح کرنے پر تلے رہتے ہیں۔ تقریباً ہر ہفتے دو تین روغنی کاغذوں پر جرابوں جیسی سطروں کی تحریریں وصول کرتا ہوں، اور باقی سارا ہفتہ اس دکھ میں گزارتا ہوں کہ کاش صرف یہی ایک حسرت ہی میرے جیتے جی پوری ہو سکتی۔

جب سے جناب ابنِ آدم نے شعور کی زنجیر تھامی ہے، اسی وقت سے لکھتا چلا آ رہا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ لمحۂ شعور سے پہلے وہ کچھ نہیں لکھتا تھا۔ اس دور میں بھی یہ غیر مہذب فعل اس سے مسلسل سرزد ہوتا رہا ہے، مگر اپنی مرضی کے مطابق نہیں، لیکن اب جبکہ یہ تہذیب کے دائروں میں آ چکا ہے، تو اپنی اس بدتمیزی سے واقف ہونے کے باوجود اسے اپنی ذات سے الگ نہیں کر سکا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ تہذیب نے اسے مزید بدتمیز کر دیا ہے، کیونکہ اس سے پہلے انسان کا نشانۂ ستم صرف زمین کا ماتھا، غاروں کی دیوار یا پھر تیسری صورت میں درختوں کی بانہیں تھیں۔ مگر اب جبکہ وہ زمین سے اُٹھ کر غاروں سے نکل کر اور درختوں سے دور ہو کر میزوں پر آ گیا ہے، تو کوئی جگہ یا ایسی چیز نہیں رہتی جس پر اس کی تحریر کے منحنی گذریئے لفظوں کی بیمار بکریاں چراتے نظر نہ آئیں۔

غاروں کے زمانے میں جب بھی پہلی بار انسان نے لکھا تو انگلی سے ریت پر اپنے نقش قدم کی نقل کی۔ پھر کسی درخت کی ٹوٹی ہوئی شاخ نے انگلی کی جگہ لی، اور نقش قدم اٹھ کر جسامت کی سطح تک آ گیا۔ چلئے اس حد تک تو بات ٹھیک ہے، مگر جب پتھر کے زمانے میں پہنچا، تو جہاں اس نے زندگی کے دوسرے سامان اکٹھے کرنے سیکھے، وہاں اشیاء کا نیاں بھی سیکھ لیا، اسی لئے اس نے ہر اچھی چیز کو درختوں کی شاخوں سے کریدنا اور ابھارنا شروع کر دیا، ادھر ذرا سطح ہموار ہوئی، ادھر ہاتھوں میں حرکت آ گئی، اور سطح پر ابھار پیدا ہوتے چلے گئے۔ بیکاری کے اس مسلسل عمل نے اس کی زندگی کے جزو لاینفک کی حیثیت حاصل کر لی۔ زمانہ گزرا، اور انسان پتھروں کو کاٹتا، دھاتوں کو پاٹتا، سائنس چاٹنے کی دنیا میں پہنچا، تو لاشعور نے اوّلین نقش قدم کی یاد دلائی، اور اس نے ایک اور چیز لکھی۔ یوں بدن بھی تحریر کی زد میں آ گیا، اور ماتھے پر نام کے

حروف جذبوں کی اساس بن کر ابھر آئے۔ نام جو مذہب اور رنگ و نسل کا شناختی کارڈ ہے، نفرت جنگ محبت احساس کا اعلان بن کر انسان کے لئے نزدیک آنے اور دور ہونے کا پہلا شجرۂ نسب بن گیا۔ لیکن بیچارہ انسان بھی کیا کرے۔ اس نے بھی تو ہر قدم فطرت سے سیکھا ہے، فطرت نے اسے زندہ رہنا سکھایا ہے، تو باقی عمل بھی تو وہ فطرت کے زیر اثر کرتا ہے۔ فطرت خود اس کی ذمہ دار ہے۔

لکھنا بھی دراصل فطرت ہی کا عمل ہے۔ انسان نے جب آنکھ کھولی، تو اسے ہر طرف کچھ نہ کچھ لکھا دکھائی دیا۔ خوبصورت زمین کے چاروں صفحوں پر اسے درخت، پہاڑ، دریا، سمندر، خشکی، شادابی، رنگتیں، غرض کچھ نہ کچھ تحریر ملا۔ فضا بھی اس بولتا کی سے منزہ نہ تھی۔ بلکہ ہزار قسم کے سیارے اور ستارے اس کے گہوارے میں جھولتے پھرتے تھے۔ پھر ان تحریروں میں مزید تحریریں درج تھیں۔ درختوں پر سال بہ سال چھال اور پتے حرفوں کی طرح سے جھڑتے تھے، دریا کی روانی پر ٹوٹتی بنتی لہریں درج تھیں۔ پھولوں کی پتیوں پر رگیں اور رگوں پر ننھے ننھے دائرے۔ غرض لفظ اور حرف در حرف کا اندراج چہار طرف پھیلا تھا۔ اس صورت حال میں اگر انسان لکھنے کے عمل سے متاثر نہ ہوتا، تو کیا کرتا۔ پھر خود انسانی بدن بھی نام کی تحریر کی زد میں آنے سے پہلے مختلف باریک کہانیوں کا مرقع تھا۔ آنکھ کا ہندسہ بناتی ٹانگیں، دائرہ نما سر، مستقیم باہیں، مخروطی انگلیاں، بیضوی آنکھیں، افقی ناک، مقعر سینے، قوسی کولہے، مستطیل ہتھیلیاں، پھر ہتھیلیوں پر ٹوٹتے بنتے منحنی خط، آگے پیچھے آتی جاتی لکیروں کے دھاگے گویا پورا بدن کتاب کے مضموں کی طرح لفظوں کی لپیٹ میں تھا۔ ایسے میں انسان کا لکھنے کے عمل کی طرف راغب ہونا حیران کن نہیں، بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ کیا ضروری ہے کہ اب بھی وہی کچھ کیا جائے، جو کچھ انسان ہزاروں لاکھوں سال سے کرتا چلا آیا ہے۔ آخر صدیوں سے انسان قتل عام بھی تو کرتا چلا آیا ہے۔ مگر اب اسے غیر انسانی فعل قرار دے کر مہذب بن بیٹھا ہے، تو کیا یہ ممکن نہیں کہ لکھنے پر بھی وہی دفعہ نافذ کر دی جائے۔

لکھنا ویسے بھی نامفید اور بے نتیجہ کام ہے۔ لکھنے سے کہیں زیادہ بہتر بولنا ہے۔ زیادہ بولنا مقبولیت کی چابی ہے۔ چپکنا اس کی دوسری منزل ہے، اور ہر دلعزیزی کا بلند قلعہ ہے۔ مجھے بولنے والے بلکہ زیادہ بولنے والے لوگ بہت پسند ہیں، جو لوگ ہر وقت منہ میں گھنگھنیاں ڈالے رہتے ہیں، انہیں ہم دماغ نہ کہنا حماقت کے مترادف ہے۔ جب اللہ میاں نے ڈیڑھ بالشت کی زبان کو بتیس انار دانوں کے خوش نما کیس میں صرف بولنے کے لئے فٹ کیا ہے، تو پھر کیوں چپ سا جائے۔ دراصل بہت سے لوگ اس خوش فہمی کا شکار ہوتے

ہیں کہ سنجیدگی کے لئے خاموشی پہلی شرط ہے، اور بزعم خویش متین بننے کے عارضے میں مبتلا ہو کر خاموش رہتے ہیں۔ مگر یہ وہ لوگ ہوتے ہیں، جنہیں اپنے اظہار پر اعتماد نہیں ہوتا، جو ہر وقت بلند درجگی کے خود ساختہ اعزاز کی سولی پر لٹکتے رہتے ہیں۔ انہیں بولنے والے غیر شائستہ لوگ اور غیر متین لگتے ہیں۔ یہ ان چیزوں کو بھی سینت سینت کر رکھتے ہیں، جن پر ان کا کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ اس لئے زیادہ پڑھتے ہیں، کم بولتے ہیں، لہٰذا عام طور پر انہیں سماجی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں ملتی۔ جبکہ بولنے والے دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔ بولنا خواہ رو برو ہو۔ فلم، ڈرامے، ریڈیو یا ٹی وی کے حوالے سے ہو، ہر حال میں ایک کارآمد فعل ہے۔ بولنے سے سماجی عمل تیز ہوتا ہے، مساوات کا بول بالا ہوتا ہے، سیاست میں گرمجوشی پیدا ہوتی ہے۔ بولنے سے دوستیاں اور تعلقات بنتے ہیں، اور تعلقات سے چیک بنتے ہیں۔ اوہو، مسئلہ پھر تحریر پر آگیا، کیوں کہ چیک بھی لکھے لکھائے ملتے ہیں، اور تعلقات کے دائروں کے مطابق لکیروں سے پُر ہوتے ہیں۔

میں اکثر خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں نوٹوں کی جگہ صاف شفاف کاغذ لئے پھر رہا ہوں جس دکاندار کو یہ کورے کاغذ دیتا ہوں، وہ ہنسی خوشی مجھے ان کے عوض اشیاء دے دیتا ہے، اور یوں میں خوشی سے دیوانہ ہو کر چاروں طرف دوڑتا پھرتا ہوں، کاش کبھی ایسا ممکن ہوتا کہ ہم نوٹوں اور سکوں کو بھی حرفی ستم کاریوں سے محفوظ کر سکتے۔

گالی دینا

غلام جیلانی اصغرؔ

گالی لینا یا دینا ایک معیوب فعل ہے، عام طور پر شرفاء اس سے اسی طرح پرہیز کرتے ہیں، جیسے کھٹی میٹھی چیزوں سے۔ البتہ کہیں کہیں ادب عالیہ میں اس کے آثار ملتے ہیں۔ لیکن ادب میں گالی کا مقصد محض آرٹسٹک ہوتا ہے۔ اسٹائل میں تھوڑا سا وقار یا وزن پیدا کرنے کے لئے اس کا استعمال جائز سمجھا جاتا ہے، بالکل ایسے ہی جیسے ادب تخلیق کرنے کے لئے چرس یا ایل۔ ایس۔ ڈی کا استعمال جائز بلکہ مستحسن سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً شکسپیئر کے ڈراموں میں جب ایکشن نقطۂ عروج پر پہنچ جاتا ہے، تو گالی اس کے اثر کو دوچند کر دیتی ہے۔ مثالیں اس لئے غیر ضروری ہیں کہ اس طرح اس شریفانہ سی تحریر میں شوکت سبزواری یا قاضی عبدالودود کا تحقیقی رنگ پیدا ہو جانے کا خدشہ ہے۔

گالی کی ابتداء اس وقت ہوئی، جب انسان جنگل کی تہذیب سے نکل کر کھلے میدان میں رہنے لگا جنگل میں گالی دینا مشکل تھا، کیونکہ ہر طرف جنگل ہی جنگل تھا، اور گالی کے لئے مناسب SPACE میسر نہیں تھی۔ یوں بھی تاریکی میں فریق مخالف یا اپنی شریک زندگی کو گالی دینا بزدلی بلکہ غیر دانش مندانہ فعل نظر آتا ہے۔ گالی کی تلخی یا IMPACT کا اس وقت احساس ہوتا ہے، جب فریقین دو بدو ہو کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غیاث اللغات کے سارے حروف تہجی کے پوشیدہ امکانات کا جائزہ لیتے ہیں۔ اوّل اوّل آنکھوں میں ایک غیر معمولی سی چمک پیدا ہوتی ہے۔ پھر ہونٹوں میں ہلکی سی جنبش اور پھر اندر کا ولیسویس VESUVIUS اپنا سارا لاوہ اگل دیتا ہے۔ الفاظ کی سطح پر ابتداء معصوم سے پرندے یا چوپائے سے ہوتی ہے، مثلاً "اُلّو کا .... یا گدھے ....." اس سے آگے گنتے کا مقام آتا ہے۔ یورپ میں عام طور پر گنتے کی مادہ اس کار خیر کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ یورپ کی تہذیب مادری ہے، اور ہمارا نظام پدری۔ اس کے بعد گفتار کے

تمام سربستہ دروازے کھل جاتے ہیں، اور اس مکالمہ میں جسم کے معروف اور غیر معروف حصے برابر کے شریک ہو جاتے ہیں، لیکن گالی میں شوکتِ الفاظ کا عنصر اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب فن کار تجرید سے نکل کر حقیقت کے علاقے میں داخل ہو جاتا ہے۔ فنونِ لطیفہ میں تجرید اور علامت سے ایک نئی DIMENTION پیدا ہوتی ہے، کیونکہ اس طرح فن کار کی حماقت زیرِ زمین چلی جاتی ہے۔ لیکن گالی کا فن بنیادی طور پر حقیقت پسندانہ ہے۔ گالی جب تک افسانے کی سیال سطح پر تیرتی رہتی ہے، اس میں جان پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن جونہی وہ حقیقت سے مس ہوتی ہے، اس میں ایک پراسراری کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ پنجابی فلموں کی گالی اردو زبان کی مجہولی گالیوں سے زیادہ پُر تاثیر محسوس ہوتی ہے۔ اور اس کی کامیابی کی یہ دلیل ہے کہ اب تو اہلِ زبان بھی بقول میر کم کم پنجابی گالیوں سے لطف اندوز ہونے لگے ہیں۔

گالی کا فن یوں تو عالمگیر نوعیت کا ہے، لیکن اس کے استعاراتی یا محاوراتی پیکر پر موسم اور جغرافیائی اثرات غالب آگئے ہیں۔ یورپ کی گالی اتنی آرام دہ ہے کہ وہ پاکستان میں بطور ناشتے کے استعمال ہو سکتی ہے۔ پاکستان کی معصوم سی گالی اگر آسٹریا کو ایکسپورٹ کی جائے، تو وہاں تیسری جنگِ عظیم کے خوش آئندہ امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔ گالی کے ضمن میں روزمرّہ میں بھی بنیادی اختلاف پایا جاتا ہے۔ مثلاً پنجاب میں لوگ گالی لیتے اور دیتے ہیں۔ جبکہ اس پار یار لوگ گالی کھاتے یا بکتے ہیں۔ ولایت میں CALLING NAMES کا روزمرّہ مستعمل ہے۔ الفاظ میں یہ تبدیلی بظاہر تو لسانیت کا مسئلہ ہے، لیکن میرے نزدیک یہ مسئلہ اس سے کہیں زیادہ گہرا اور دوررس ہے اس سے علاقہ یا ملک کے مخصوص مزاج کی نشاندہی ہوتی ہے۔ مثلاً گالی کا لینا یا دینا دراصل ایک کاروباری فعل ہے۔ اس میں فریقین میں افہام و تفہیم کی فضا پائی جاتی ہے۔ دونوں طرف برابری اور برادری کا احساس کارفرما ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ پنجاب میں اپنے سے نیچے آدمی کو گالی دینا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اس طرح تو ایسے کنگلے کو ادھار دینا ہے جو واپس نہ کر سکے گا۔ البتہ اپنے سے اوپر والے کے ساتھ غیب و حضور میں معاملہ ذرا مختلف ہوتا ہے، مثلاً حضور میں محبت، خلوص اور یگانگت کے لہجے میں خشوع و خضوع پیدا کیا جاتا ہے۔ صاحبِ موصوف کی ذات میں ان خوبیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے، جو اس کے سارے خاندان کے کسی فرد میں موجود نہیں ہوتیں، لیکن اس کی غیبت میں اہم تعریف کا سارا مزاج ہی بدل جاتا ہے۔ وہی آدمی جو ایک منٹ پہلے نجیب الطرفین بلکہ مجمع البحرین تھا، یک لخت سکڑ کر دنیا کی غلیظ ترین چیز بن جاتا ہے۔ اگر خود صاحبِ موصوف کو ان جذبات کا علم ہو جائے، تو اسے اپنی کینگی پر یقینِ محکم اور عمل پیہم پیدا ہو جائے۔ محاورہ سے قطع نظر گالی دینے میں ایک

فائدہ بھی ہے۔ آدمی گالی دے کر فارغ ہو جاتا ہے، اور ذہنی طور پر ایک خوشگوار سی آسودگی محسوس کرتا ہے فرائیڈ اور ینگ میں یوں تو خدا واسطے کا بیر ہے۔ لیکن دونوں حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ گالی دینے کے بعد اعصاب کا کھچاؤ دور ہو جاتا ہے۔ روح میں بالیدگی پیدا ہو جاتی ہے، اور دل کی گہرائیوں میں بہجت اور سرور کا عالم ہوتا ہے۔ خواب میں پریاں اور بیداری میں غلمان نظر آتے ہیں، وغیرہ وغیرہ، تجربہ شرط ہے۔ اگر آپ ناشتے کے فوراً بعد ایک دو عمدہ ثقہ سی گالیاں دے دیں، تو آپ تمام دن یوں محسوس کریں گے، جیسے آپ ہلکے پھلکے ہیں، اور ہوا کے دوش پر پرواز کر رہے ہیں۔ معدے کی گرانی یکسر ختم ہو جائے گی، وہ شریک حیات جو گالی سے پہلے بالکل بیوی نظر آتی تھی، گالی کے بعد ایک محبوبۂ روزگار بلکہ برہنہ تلوار بن جائے گی۔ آپ لوگوں سے ہنس ہنس کر ملیں گے۔ ماتحتوں سے آپ کا سلوک برادرانہ حد تک مشفقانہ ہو جائے گا۔ افسر کے سامنے آپ کی دم خود بخود حرکت میں آ جائے گی، اور تمام لوگ اس میں مقامی اور مہاجر دونوں شامل ہیں، آپ کے حسن سلوک کے معترف ہو جائیں گے۔ پنجاب میں جو آپ کو بشاش بشاش مونچھیں، اکڑ و تار پیٹ اور مجھڑ کیں مارتے ہوئے چہرے نظر آتے ہیں، تو دراصل اس کی وجہ منہ نہار کی وہ گالی ہے، جس پر تمام وید اور حکماء زور دیتے ہیں۔

گالی بکنا ایک انتہائی غیر شریفانہ فعل ہے۔ بک بک کرنا یوں بھی مزاج کی برہمی، برافروختگی اور درشتگی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس سے شخصیت کے ہلکے پن کا احساس ہوتا ہے۔ جن لوگوں کے ہاں جذباتی استحکام یا توازن مفقود ہوتا ہے، وہ یونہی بک بک کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جن شخصیتوں میں ٹھہراؤ ہوتا ہے، وہ ایک موٹی سی گالی دے کر فارغ ہو جاتے ہیں۔ گالی بکنے والے لوگ عموماً داخلیت یا نرگسیت کے مریض ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ اقتصادی اور سماجی منصوبے بناتے ہیں۔ علاقائی سازشوں میں شریک ہوتے ہیں، سیاسی جوڑ توڑ کرتے ہیں، ان کی گالی کمزور ہوتی ہے، لیکن شور زیادہ ہوتا ہے۔ آپ چاہیں، تو اوپر والی بحث سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ گالی جتنی سقیم اور کمزور ہوگی، گالی دینے والے کی شخصیت اتنی ہی گھٹی گھٹی ہوگی۔ گالی جتنی باوقار اور پر زور ہوگی، شخصیت میں اتنا ہی وقار اور کشادگی ہوگی۔ چھوٹا آدمی ڈرتے ڈرتے چھوٹی سی گالی دیتا ہے، اور پھر فوراً اپنی ذات کے ڈربے میں چھپ جاتا ہے، لیکن بڑا آدمی موٹی سی گالی کی کمند پھینک کر اسے ڈربے سے باہر کھینچ لاتا ہے۔ چنانچہ بڑا اچھی گالی کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ داخلیت کا آہنی حصار توڑ کر ذات کے نہاں خانے میں داخل ہو جاتی ہے، اور جب باہر نکلتی ہے، تو اس دلہن کی طرح ہوتی ہے، جس نے دو چار دن کے تجرباتی لیکن غیر نامیاتی شرم کے بعد گھونگھٹ اتار پھینکا ہو (ملاحظہ ہو وزیر آغا کی نظم۔ بات)

گالی کھانا جاگیردارانہ نظام کی یادگار ہے، اس سے دربارداری کی بوآتی ہے۔ عام طور پر ظل اللہ کے مصاحب پہلے پلاؤ، شامی کباب اور نرگسی کوفتے کھاتے اور اس کے بعد گالی۔ بادشاہ سمجھتا کہ کھانا کھلانے کے بعد یہ اس کا حق ہے کہ کھانا کھانے والے کو گالی دے، اور کھانا کھانے والے کے لئے گالی خورد و نوش کا جواز بن جاتی ہے اس لئے دربار کے قرب و جوار میں جو شاعری پیدا ہوئی، اس میں گالی کھانے کو ایک مستحسن فعل قرار دیا گیا ہے، غالب کا یہ شعر نسخۂ حمیدیہ میں ملاحظہ ہو:

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

داغ کے ہاں بھی ایسے شعر آپ کو عام ملیں گے۔

گالی کی ساری خوبی اس کی جدت میں ہے۔ ممکن ہے ہابیل و قابیل کے جھگڑے میں ناپسندیدہ الفاظ بھی استعمال کئے گئے ہوں، لیکن وہ صرف ناپسندیدہ تھے، اس لئے نتیجہ قتل ہوا۔ اگر گالی باوقار اور باوزن ہو، تو پھر قتل کرنا حماقت نظر آتا ہے، کیونکہ قتل کرنا تو اپنی کمزوری اور نااہلی کو تسلیم کرنا ہے۔ گالی اختراع کرنے والا فن کار اپنے اندر تخلیق کے اتنے امکانات رکھتا ہے کہ اس کے تخلیقی نظام میں قتل کرنا ایک گھٹیا سا فعل نظر آتا ہے، وہ سکھ جس نے MOREOVER کہہ کر گالی کو چار چاند لگا دیئے تھے، ایک ایسا ہی فن کار تھا۔ اگر وہ چاہتا تو رقیب سفید فام کو قتل بھی کر سکتا تھا، لیکن اس سادہ سے فعل سے اس کی ساری تخلیقی جدت اور اپج ختم ہو جاتی۔ گالی اور شعر میں جدت ایک قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک اچھا شاعر معروف اشیاء میں غیر معروف رشتے تلاش کرتا ہے۔ اسی طرح ایک اچھا دشنام طراز آزاد تلازمۂ خیال سے ایک ایسی فضا پیدا کر دیتا ہے، جس میں تمام حقیقی رشتے غیر حقیقی روپ دھار لیتے ہیں۔ میرے پرائمری کے ایک استاد اس فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے، اور دنیا کے مختلف ملکوں اور جسم کے غیر ضروری حصوں کو ملا کر ایک ایسا اوریجنل PATTERN بناتے تھے کہ ان کی جدت طرازی پہ تمام کلاس لوٹ پوٹ ہو جاتی تھی۔ ایک اچھی اوریجنل گالی اور فرسودہ گالی میں وہی فرق ہے، جو بقول پال ویلری شعر اور نثر میں ہے۔ شعر رقص ہے، اور نثر چہل قدمی۔ شعر مقصود بالذات ہوتا ہے، اور چہل قدمی کھانا ہضم کرنا یا ٹانگوں کو معروف کار رکھنا۔ چنانچہ اوریجنل گالی بھی مقصود بالذات ہے۔ اس کا مقصد دل آزاری نہیں بلکہ ایک فن پارہ تخلیق کرنا ہوتا ہے، جس سے فریقین بلکہ ان کے لواحقین بھی مستفید ہوتے ہیں۔ ایک فرسودہ گالی کا مقصد تو ایک منحوس گھٹیا جذبے کی ترسیل ہے

نتیجہ دل آزاری نہ کہ خوش گفتاری۔ مثلاً جب آپ کسی کو "اُلّو کا ...." کہتے ہیں، تو اس سے آپ کے خبث باطن اور دوسرے آدمی سے نفرت کا اظہار ہوتا ہے۔ گالی کی بُنت میں آپ نے اُلّو اور اپنے شریف مخالف کے درمیان جو رشتہ دریافت کیا ہے، وہ انتہائی فرسودہ اور پیش پا افتادہ ہے۔ حیاتیاتی طور پر یہ رشتہ ناقابل قبول ہے، بلکہ انتہائی فضول ہے۔ لیکن اگر اس کے برعکس اگر آپ اسے اُلّو کا چرخہ کہہ دیں، تو آپ کی نفرت، محبت اور فرسودگی جدّت میں بدل جاتی ہے۔ چرخے کے ذکر سے آپ کے ذہن میں جو عکس AMA ابھرتا ہے، اس میں مہاتما گاندھی کے علاوہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کی پوری داستان آپ کے سامنے آجاتی ہے۔ میں نے اپنی مختصر سی تخلیقی زندگی میں ایسی اوریجنل گالیاں تخلیق کی ہیں کہ اگر میں اپنے پیچھے اور کوئی ادبی یا مالی اثاثہ نہ بھی چھوڑ جاؤں، تو میرے لواحقین اس سرمایہ پر صبر و شکر کر کے زندہ رہ سکتے ہیں۔ بلکہ اگر ان گالیوں کی لسانی تشکیلات پر وہ تحقیق کرتے رہیں، تو جدید اردو ادب میں ان کا منفرد مقام پیدا ہو سکتا ہے۔

گالی کے قومی فوائد کا میں نے ابھی ذکر نہیں کیا۔ جس طرح پردے کے کچھ قومی فائدے ہیں۔ مثلاً آدمی بدصورت عورتیں دیکھنے سے بچ جاتا ہے۔ اسی طرح آدمی گالی دینے سے نیوراتی کیفیات سے بچ جاتا ہے۔ اگر گالیاں عام ہو جائیں تو پاگل خانے کی بنیاد میں خلل پیدا ہو جائے۔ مزید برآں گالی دینے سے جمہوریت کو فروغ ملتا ہے، آمریت صرف اسی دور میں پنپ سکتی ہے، جب گالیوں پر قدغن لگا دی جائے۔ اس لئے ایک اچھے جمہوری نظام میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ اسمبلی کی کارروائی میں نکتہ اعتراض کا آغاز اور انجام گالی پر ہوتا ہے۔ اقتصادی توازن کو برقرار رکھنے کے لئے گالی کا وجود ناگزیر ہے۔ جب مارکیٹ میں قیمتوں میں اضافہ کا رجحان پایا جائے تو آدمی اسی تناسب سے گالیوں میں اضافہ کرتا جائے۔ اس سے قیمت کی زیادتی بھی محسوس نہیں ہوگی، اور نفسیاتی طور پر بلیک مارکیٹ کرنے والوں اور قیمت میں اضافہ کرنے والوں سے انتقام کی ایک شریفانہ صورت بھی نکل آئے گی۔ ظاہر ہے کہ اس عمل سے قیمتوں میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ لیکن جذباتی طور پر تسکین کا ایک گونہ احساس ہوگا۔ یہ وہی احساس ہے، جس کا غالب نے ذکر کیا ہے، ؎

اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

ہارڈ بیڈ

عامل القادری

یہ خبر سنتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے دوست و۔ ق نہیں، مجھے یاروں نے ہارڈ بیڈ پر لٹا دیا ہے۔ مجھے۔ جو ہمیشہ سوفٹ بیڈ کا عادی رہا ہوں، میری کلبدتی کا یہ حال رہا ہے کہ لاہور کی لشکارے مارتی گرمی میں بھی دبیز گدّے کے بغیر پیٹھ سیدھی نہیں ہوتی تھی، نہ جانے کھُرّی چارپائی اور تخت پر لوگ کیسے سوتے ہیں۔

بچپن سے اس وقت تک بستر دبالیں کا تصور آسودگی کے مفہوم سے آشنا رہا ہے، بستر ماں کی آغوش کی طرح آرام اور نرم و گداز ہوتا ہے۔

بستر آزادی سے اور سرشاری کی علامت ہوتا ہے۔ اس پر لیٹنا، کروٹیں بدلنا، اونگھنا، خراٹے بھرنا، سونا، بیدار ہونا، اٹھنا، بیٹھنا، بستر چھوڑنا، یہ سب افعال آزاد تلازمہ اور آزاد ادراک کے تحت سرزد ہوتے ہیں۔ ان میں جبر کا کوئی جزو، کوئی انگ، کوئی رنگ و آہنگ نہیں ہوتا۔ جی چاہا لیٹ گئے، نیند آئی سو گئے۔ دل میں آیا آنکھیں ملتے اٹھ بیٹھے آزادی اور اختیار کا رشتہ بستر سے استوار چلا آتا ہے۔

بستر چوگانِ ہستی کا رازداں بھی ہوتا ہے۔ بچپن میں بستر پر اُچھلنے کودنے اور قلابازیاں لگانے کی لذت کا پوچھنا کیا۔ عنفوانِ شباب کی خوابناک کیفیت، انجانی مستی کی پینگ اور بدن کی رسمساہٹ کا حال کوئی بستر سے پوچھے اور پھر چڑھتی جوانی کی سرشاری اس بھید سے آشنائی کیسے کیسے چنار بدن کی خوشبو اس میں جذب ہے۔

بستر ہجر و وصال کی ساری کیفیتوں کا آئینہ دار ہے اور ساری نا آسودگیوں اور کلفتوں کا جلادیہ، بچپن سے لحد تک کا یار، ہمراز اور ہماری دل کی دھڑکنوں کا رازداں۔ آسودگی کا گہوارہ، سختی، گرانی اور جبر کے تعلق سے ناآشنا، لیکن ناکردہ گناہی کی سزا ایں ابھی ابھی جس ہارڈ بیڈ پر لٹا یا گیا ہوں، یہ کوئی اور شے ہے، اس کا مزہ کچھ اور ہے بستر کے تلازمات سے یکسر خلاف حکم ہے ایک ڈگمگ یہ لیٹے رہو۔ اسی میں عافیت ہے۔ یہ ایک نیا تجربہ ہے۔ زندگی کا ایک نیا استعارہ ہے۔

میں نہیں جانتا کہ کس قسم کے مریض کو ہارڈ بیڈ پر لیٹے رہنے کا مشورہ دیا جاتا ہے، اس کی حقیقت ڈاکٹروں پر ہی منکشف ہونے دیجئے۔ میرا احساس تو یہ ہے کہ ہارڈ بیڈ طریقہ علاج نہیں بذاتہ ایک مرض ہے، وجع مفاصل سے بھی خطرناک، اس کا مبتلا نہ مرتا ہے نہ مارتا ہے۔ بس لیٹا رہتا ہے۔ کشمیر، فلسطین اور اب افغانستان ہارڈ بیڈ پر براجمان نظر آ رہے ہیں اور اطبا پریشان ہیں کہ یہ طریقہ علاج کارگر کیوں نہیں ہوتا۔ چارہ گر خود مریض بنے جا رہے ہیں چارہ گری کی لاج رکھنے کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے مقابلے میں وجع مفاصل نہایت شاہانہ اور خاصا ردمانی مرض ہے۔ اس کی ابتدا کمر میں لوچ پڑنے سے ہوتی ہے جس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ زبان کی لوچ نکل جاتی ہے، کبھی پٹھے بھی اتر جاتے ہیں یا ریڑھ کے تینتیس مہروں میں سے ایک آدھ ادھر ادھر فالتو پرزے کی طرح لڑھک جاتی ہے، یا گھس جاتی ہے اور کبھی زور آزمائی میں اپنے زور سے تڑاخ یا چٹخ جاتی ہے۔ معاف کیجئے، میں نے دونوں الفاظ لکھ دیئے کہ میں اہلِ زبان نہیں ہوں اور نہ زبان دان، درازئ زبان کا حال خلقِ خدا کو معلوم ہے پنبہ در دہاں رہتا ہوں۔ اس کا ایک فائدہ ہے کہ عیب و ہنر چھپا رہتا ہے۔

مردِ مومن کے لئے ہارڈ بیڈ کا یوں بھی تجربہ نیا نہیں ہے۔ تیرہ سو سال سے اس کا بار بار تجربہ ہوتا رہا ہے۔ گویا ہارڈ بیڈ۔ سراسر تخلیقی عمل ہے اور انسانیت کو ارتقاء کی جانب ایک بھرپور جست لگانے کے لئے ہارڈ بیڈ سے گزرنا پڑتا ہے۔ غالباً فلسفۂ تاریخ کا محرر آرنلڈ ٹوئن بی بھی ہارڈ بیڈ پر لیٹا یا لٹایا گیا ہوگا۔ کیونکہ اس کے کلیدی الفاظ ہی "چیلنج" اور "مدافعت" ہیں اور ان دونوں کا تعلق ہارڈ بیڈ سے خاصا استوار ہے کہ ان دونوں کے درمیان سکتے کی مدت ہی ماحصلِ حیات ہوتی ہے اسے ہم تیاری کی مدت بھی کہہ سکتے ہیں اچھی فصل اگانے کے لئے کھیت کو جت کوڑ کر ہموار کیا جاتا ہے اور پھر کھاد دے کر کچھ فاصلہ چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ مٹی میں آکسیجن کے خانے بن جائیں اور اس کے بعد کہیں تخم کاری کی جاتی ہے۔ ہارڈ بیڈ غالباً اسی لمحۂ فرصت کا نام ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ دو۔ (۲) اس لمحۂ فرصت میں ادب کو کونسا تحفہ دیتے ہیں۔ ادب کی تخلیق کے لئے بھی ایسے سکتے (کوما) کی ضرورت ہوتی ہے نہ ہے نصیب کردہ ہارڈ بیڈ پہ لیٹے ہیں۔ اس تصور سے ایجت کی کیفیت پیدا ہوئی اور میں اچھل کر ہارڈ بیڈ سے اپنے روایتی سوفٹ بیڈ پر آگیا۔

اقبال کی ایک تصویر

مشتاق قمر

آپ نے اقبال کے خطبات سے لے کر ارمغانِ حجاز کی آخری رباعی تک اس کا سارا فلسفہ اور فلسفیانہ کلام پڑھا ہوگا اور اس کی بہت سی تصاویر دیکھی ہوں گی۔ لیکن بدقسمتی سے شاعری، فلسفے اور مصوری کے ان اعلیٰ نمونوں میں کہیں بھی آپ کی ملاقات اصل اقبال سے نہیں ہو سکتی۔ اگر آپ اصل اقبال سے ملنے کے متمنی ہیں تو آپ کو کسی شام میرے غریب خانے تک آنے کی زحمت گوارا کرنی پڑے گی جہاں ایک چھوٹے سے ڈرائنگ روم کی عقبی دیوار پر میں نے اقبال کا اصل حوالہ بڑے اہتمام کے ساتھ آویزاں کر رکھا ہے۔ درحقیقت شخصیت بڑی ہو یا چھوٹی، رنگین ہو غیر رنگین اس کی درست پرکھ کے لئے اس کے اصل حوالے کی پہچان انتہائی لازمی ہے اور یہی وہ مشکل مقام ہے جہاں ادب کے نقادوں سے لے کر تاریخ دانوں تک سبھی ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ ایک مورخ کے نزدیک اکبرِ اعظم بہت بڑا فاتح کامیاب حکمران اور اعلیٰ پایہ کا ڈپلومیٹ ہو سکتا ہے اور جب تک میں تاریخ بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں تاریخ کے خلاصوں کا طالب علم رہا ہمیشہ بابر کے مقابلے میں اکبر کو ہی مغلِ اعظم تصور کرتا رہا کہ اس طرح مجھے کلاس روم میں شاباشی اور کمرۂ امتحان میں اچھے نمبر ملنے کی امید ہوتی تھی۔ یوں بھی میرے ذہن نے کبھی بھی بابر کو ایک شفیق، مہربان اور جاں نثار باپ کے سوا کسی دوسری حیثیت سے قبول نہیں کیا۔ اکبر کے مقابلے میں بابر ہمیشہ مجھے پالتو، گھریلو مرد لگا ہے جس کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ تھا لیکن اس کے باوجود وہ کسی انتہائی پراسرار جبلی خواہش کی تکمیل میں بڑی فرمانبرداری کے ساتھ گھریلو ذمہ داریاں ادا کرتا رہا۔ اور غالباً تزک لکھنے کے علاوہ اس کا سب سے بڑا مشغلہ سبزی گوشت ہی لاتا رہا ہوگا۔ بابر کے مقابلے میں اکبرِ اعظم کو میں نے جہانگیر اور انارکلی کے حوالے سے دیکھا اور یہی نا ہے اور اگرچہ بعض مورخ بالواسطہ طور پر جہانگیر اور انارکلی کے علاوہ اکبر پر دوسروں خصوصاً ہندوستان کی نسبتاً چھوٹی اور کمزور ریاستوں کے اندرونی معاملات میں بے جا مداخلت کا الزام بھی لگاتے ہیں لیکن میں اکبر کی اس بزرگانہ حرکت کو قابلِ معافی تصور کرتا ہوں۔ دراصل اکبر کے اس بزرگانہ وطیرہ میں اکبر کی شخصیت کے بجائے دلی اور آگرے کی آب و ہوا کا زیادہ دخل تھا۔ اگر آپ تاریخ ہند و پاک کے

ہونہار طالب علم ہیں اور آپ نے غلاموں پر انحصار کرنے کی بجائے تاریخ کی اصل کتابیں پڑھ رکھی ہیں تو آپ یقیناً اس تاریخی حقیقت سے باخبر ہوں گے کہ دلّی اور آگرے نے ہمیشہ بڑے بھائی کا رول ادا کرنے کی خواہش کی ہے حتیٰ کہ نادر شاہ جیسا سیکولر اور ہر قسم کے دنیاوی رشتوں سے بالاتر شخص بھی دلّی کی حدود میں داخل ہوتے ہی محمد شاہ رنگیلے جیسے ٹروئنٹ بوائے (TRUANT BOY) کے ساتھ پگڑی بدل بھائی کا رشتہ طے کرنے کے لئے بر قرار ہو گیا اور ساتھ ہی بزرگی کا احساس دلانے کے لئے اپنی تیز دھار تلوار سے دلّی کی گردن بھی مار دی۔ دلّی میں مرکز رکھنے والی تمام بادشاہتوں اور جمہوریتوں نے ہمیشہ برِصغیر میں بڑے بھائی کا رول ادا کرنے پر ہی اصرار کیا ہے اور پلیٹ فارم کے طور پر موقع و محل کی مناسبت سے نادر شاہ کے نقشِ قدم پہ چلنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ انگریز جب تک کالی کٹ کے اردگرد منڈلاتے رہے ان کے خواب بڑا بھائی بننے کی خواہش سے پاک رہے لیکن دلّی پہنچتے ہی اس خواب کی تعبیر سب سڈری ایری سسٹم کی صورت میں ظاہر ہوئی جو پگڑی بدل لینے کے نادر شاہی عمل کی ولائتی فارم کے سوا کچھ نہیں۔ جو لوگ برصغیر میں امن اور باہمی مفاہمت و تعاون کے رشتے مضبوط کرنے کے متمنی ہیں۔ انہیں سب سے پہلے دلّی کی موجودہ مرکزی حیثیت برِصغیر کے چند دوسرے شہروں میں تقسیم کرنی پڑے گی۔ یا پھر برصغیر کی دیگر ریاستوں کے ذہن سے۔ سگ باش برادرِ خورد مباش کا جذبہ کھرچنا پڑے گا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اکبر کے نورتن اپنی عقلِ سلیم کے باوجود پایۂ تخت کی آب و ہوا میں رچی بسی اس برادرانہ "خواہش کی نشاندہی کرنے میں ناکام رہے۔ اگر وہ کسی طرح اکبر کو مرکزی قوت تقسیم کر دینے یا کم از کم پایۂ تخت ہی تبدیل کر دینے پر آمادہ کر لیتے تو یقیناً وہ جہانگیر کے ساتھ بڑے بھائی کا رویہ اختیار کرنے کے لئے بابر کی طرح پدرانہ ایثار کی مثال قائم کر جاتا اور تاریخ ہندوستان کے اس سنہری دور میں ثقافتی تہذیبی اور عسکری اسٹیجوں پہ کھیلے جانے والے پُر شکوہ ڈرامہ میں اس کی ہیرومک (HEROIC) شخصیت جلے کٹے ڈائیلاگ سنانے والے ولن میں تبدیل ہو کر نہ رہ جاتی۔

آج کل میں تاریخ کا مطالعہ نئے اصل اور فکری حوالوں سے کر رہا ہوں اور مجھ پر بڑے عجیب و غریب انکشافات ہو رہے ہیں۔ ان نئے حوالوں کی روشنی میں سکندرِ اعظم مجھے اپنے دور کا سب سے بڑا "ہپ ہاکر" لگتا ہے۔ میرے نزدیک اس کی طوفانی چہل قدمی کا مقصد کسی علاقہ پر قبضہ کرنا یا کوئی یونانی نوآبادی اور یونانی دواخانہ قائم کرنا نہیں تھا اور نہ ہی فی الواقع اس سے کوئی ایسی غاصبانہ حرکت سرزد ہوئی۔ جہاں تک ایک لاکھ کے لگ بھگ تربیت یافتہ فوج کا تعلق ہے اس کی ضرورت دینے، پاسپورٹ کی پابندیوں کے باعث بھی پیش آ سکتی ہے۔ خود ہٹلر کو میں نے اس کے ٹینکوں، توپوں اور لڑاکا طیاروں کی گھن گرج کے بجائے اس کی مونچھوں کے حوالے سے دیکھا اور پرکھا ہے کہ یہی اس کا اصل حوالہ بن پاتا ہے

اس قدر آور شخصیت اور اس کے دَور کی ہلچل سے معمور ساری تاریخ اس کی مونچھوں کے دم قدم سے ہی قائم و دائم ہے۔ ہٹلر کی مونچھوں کو کسی اعلیٰ قسم کے اسٹین لیس بلیڈ سے صاف کر دیا جائے (کہ شاید کوئی دوسرا بلیڈ ایسا نہ کر سکے) تو نہ صرف یہ کہ ہٹلر اور ایک عام گلیوں میں گھومنے پھرنے والے آدمی میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہے گا بلکہ اس کے دَور کی ساری تاریخ بھی مشکوک ہو جائے گی۔ کم از کم یورپ اور امریکہ میں ہٹلر پر بنائی جانے والی بے تحاشہ فلموں پر اس کا کچھ اچھا اثر نہیں پڑے گا۔ اپنی مونچھوں کے حوالے سے مجھے ہٹلر ایک ایسا شخص لگا ہے جو بھرپور زندگی بسر کرنے اور باوقار موت مرنے کے گُر سے آشنا تھا۔ اس کے مقابلے میں اس کے سگار کے شہرت یافتہ انگریز حریف کے وطیرے میں مجھے ہمیشہ ایک لومڑی کی سی عیاری نظر آتی ہے۔ وہ زندگی اور موت کسی کے ساتھ بھی انصاف نہ کر سکا۔ اس نے زندگی اور موت کسی کو بھی فراخدلی کے ساتھ قبول نہیں کیا۔ وہ اپنے تمام تر جارحانہ سوّیہ کے باوجود ہمیشہ زندگی کی لڑائی دوسری دفاعی لائن پر لڑتا رہا اور موت کو گلے لگانے کے لئے ہفتوں پس و پیش کرتا رہا۔ دوسری دفاعی لائن پر زندگی کی جنگ لڑنے والے ہر مصلحت کوش جنرل کی طرح وہ شکست و ہزیمت کے اس نادر تجربہ سے محروم رہا جو ایک جنرل کی زندگی کو یونانی عظمت کی جہت عطا کرتا اور ہٹلر کی طرح زندگی سے بھی بڑھ کر فیصلہ کن قدم اٹھانے کی صلاحیت بخشتا ہے۔ شکست تو درکنار اس کی فتح کا نشان بھی بھرپور جنسی علامت ہی دکھائی دیتا ہے۔

اقبال کا ذکر آتے ہی جانے کیوں میرے ذہن میں نپولین سے ہٹلر تک دنیا بھر کی فعال ترین شخصیتیں گھومنے لگتی ہیں۔ اس کا سبب اقبال کے غلط حوالے بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن اقبال کے ذکر سے پہلے ان فعال شخصیتوں کا ذکر بطور تمہید آنا ناگزیر سا لگتا ہے حالانکہ اقبال درویش، مرنجاں مرنج قسم کا انسان تھا اور دنیا کو درہم برہم کر دینے والی ان تاریخی شخصیتوں سے اس کا کسی قسم کا کوئی ناطہ نہیں جڑتا۔ سوائے اس کے کہ وہ بھی ان ہی کی طرح نقادگزیدہ ہے۔ اگر آپ کو اصل اقبال کو دیکھنا ہے تو سب سے پہلے آپ کو اس کے اصل حوالے کا مطالعہ کرنا پڑے گا جو میرے ڈرائنگ روم کی عقبی دیوار پر بڑے اہتمام کے ساتھ آویزاں ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی تصویر ہے جسے میں نے ایک مقامی اخبار کے اقبال نمبر سے کاٹ کر گتّے کے ایک مستطیل ٹکڑے پر چسپاں کر دیا ہے۔ میں نے اصل اقبال کی تلاش میں اس کے فلسفے اور فلسفیانہ کلام کا کونہ کونہ چھان مارا۔ اس کی زندگی بھر کی تصاویر دیکھ ڈالیں حتیٰ کہ اقبال کی وہ تصویر بھی جس میں وہ ترکی ٹوپی پہنے ہاتھ چھڑی لئے مشرقی، مغربی روایات کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ عرصۂ دراز تک میرے زیرِ مطالعہ رہی لیکن ہر کوشش کے اختتام پر مجھے لگتا جیسے میں نے لق و دق صحرا میں اقبال کو گم کر دیا ہے۔ اور

غلط حوالوں کی آندھی نے اس کے ہر نقشِ کفِ پا کو میری نگاہوں سے اوجھل کر دیا ہے۔ پھر ایک دن اچانک بالکل معجزانہ طور پر میری نگاہ اس عام سی تصویر پر پڑ گئی۔ میں نے جلدی سے چونی اخبار فروش کے ہاتھ میں تھمائی اور اخبار لے کر گھر کی جانب بھاگا۔ یہ سارا معاملہ انتہائی رازداری میں طے پا گیا۔ حتیٰ کہ ہاکر کو بھی کانوں کان خبر نہ ہو سکی کہ میں اس کے ساتھ کتنا عظیم سودا کتنے سستے داموں کر رہا ہوں۔

اس تصویر میں اقبال کو ننگے سر کمبل میں لپٹے دکھایا گیا ہے۔ اس تصویر کو دیکھتے ہی اقبال کے بارے میں آپ کے سارے مطالعہ کے خام مواد میں ہلچل سی پڑ جاتی ہے اور پھر انتشار اور ہلچل کے بکھرے موتیوں سے بتدریج ایک شبیہہ سی ابھرنے لگتی ہے جس کی تکمیل کے بعد اقبال بالکل نئے پیش منظر اور پس منظر کے ساتھ آپ کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر دیکھنے لگتا ہے۔ اس تصویر کے تین نمایاں اجزا ہیں۔

اقبال کا ننگا سر، اس کا ایک خاص انداز میں دیکھنا، اور کمبل۔ کچھ عرصہ تک تو یہ تینوں اجزا آپ کی دلچسپی کا موجب رہتے ہیں لیکن اگر آپ شمسی دروں بینی کرنے کے انداز میں غور و فکر کرنے کے عادی ہیں تو کچھ ہی عرصہ بعد باقی دو اجزا تو از خود نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے اور سارا جہانِ مرغ و ماہی ایک دبیز کمبل میں لپٹا دکھائی دینے لگا۔ پھر آپ کو میری طرح اس سیدھے سادے نتیجہ پر پہنچنے کے لئے کسی ٹوٹکا کی ضرورت محسوس نہیں ہو گی کہ کمبل اور صرف کمبل ہی اقبال کا اصل حوالہ بن جاتا ہے۔

تکلف برطرف مجھے ہر رنگ، ونسل کا کمبل پسند ہے بشرطیکہ اس کی معقول لمبائی چوڑائی ہو اور اس میں چادر یا لحاف کی غیر متوازن کیفیت بھی نہ پائی جائے۔ کمبل مشرقی وقار اور عظمت کی بھرپور علامت ہے کہ اس میں خارج کے ساتھ داخل کی قوتیں بھی سرگرم عمل رہتی ہیں۔ ایک اچھے مشرقی انسان کی طرح میں نے ہمیشہ کمبل کی اس متوازن خوبی کو ہی پیشِ نظر رکھا ہے۔ مجھے اقبال کے مشرق کا خارج کو رد نہ کرنے اور داخل کو خندہ پیشانی سے گلے لگانے کا انداز بے حد پسند ہے۔ اقبال نے جہاں چاند ستاروں اور ان سے ماورا جہانوں کی باتیں کی ہیں وہاں اس نے اس مابعد الطبیعاتی جہت کو جذبۂ عشق کے تابع بھی بنا دیا ہے اور یہ مجرد جذبہ اپنے پہلے معانقے سے لے کر آخری ڈبکی تک جس بُری طرح فرد کو اپنی لپیٹ میں لے رکھتا ہے اس کی تجسیمی صورت کا مکمل مشاہدہ کمبل اور صرف کمبل ہی کے آئینہ میں کیا جا سکتا ہے۔ یہاں میں رومیو جیولٹ سے لے کر مرزا صاحباں تک تمام کلاسیکی اور نیم کلاسیکی مستند عشاق کے دریدہ گریبانوں کا حوالہ دیتے ہوئے ہرگز اس امر کا دعویٰ کرنا نہیں چاہتا کہ کمبل ان تمام خواتین و حضرات کا پسندیدہ پہناوا تھا۔ فی الواقع ایسا نہیں تھا۔ اور یہی بات ان کی ناکامی کا باعث بھی بنی۔ ان کا جذبہ خام اور یک طرفہ تھا۔ وہ گریبان چاک کرنے کی اگلی منزل سے

جو کمبل اوڑھنے سے تشکیل پاتی اور سرد مہری کی کپکپاہٹ سے نجات دلاتی ہے، ناآشنا تھے۔ اقبال کا جذبۂ عشق کمبل ہی کی طرح نرم گرم اور تندرو ہے۔ اس کے ہاں زندگی کا تمام تر عمل کمبل کے روحانی اور مادی، جسمانی اور غیر جسمانی، طبیعاتی اور مابعد الطبیعاتی۔ دونوں پہلوؤں سے تکمیل پاتا اور عرصۂ کائنات میں اپنا اظہار کرتا ہے بلکہ میں تو دبی زبان میں یہاں تک کہنے سے بھی گریز نہیں کروں گا کہ اقبال کا جذبۂ عشق محض کمبل اوڑھنے کے شوق میں ہی گریبان چاک کرنے کی منازل طے کرتا ہے۔

اگر آپ کو کبھی کمبل اوڑھنے کا تجربہ ہوا ہے (اور مشرق میں یہ تجربہ ہوا ہے اور مشرق میں یہ تجربہ ناگزیر ہے) تو آپ یقیناً مجھ سے اتفاق کریں گے کہ پہلی نظر میں بالکل غیر ارادی طور پر کمبل میں لپٹے ہوئے شخص پر ایک ایسے قلعہ بند جنرل کا گمان ہوتا ہے جس کے سپاہی عین معرکہ میں تنخواہیں وصول کرتے چلے گئے ہوں اور جو تن تنہا فصیل کا دفاع کرنے میں مشغول ہو۔ جو جارحیت سے نفرت کرتا اور دفاع کے تقدس پر غیر متزلزل ایمان رکھتا ہے جس کے نزدیک زندگی جیو اور جینے دو کی متوازن کیفیت کا نام ہے۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ کمبل اوڑھ کر کیمرے کی آنکھ میں جھانکنے سے قبل اقبال نے کیا سوچا ہوگا لیکن اتنی بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اقبال نے مذکورہ تصویر کھنچوانے کے لئے جس لمحہ کا انتخاب کیا وہ یقیناً ایسا ہی لمحہ تھا کہ اس میں اقبال کے سارے مجرد جذبے ایک انتہائی مکمل اور جامع تجسیمی صورت میں سولائیڈ کے فیتے پر منتقل ہو گئے اگر اقبال کی یہ تصویر ابھی تک آپ کی نگاہوں سے نہیں گزری یا آپ نے اسے دیکھ کر کوئی خاص اثر قبول نہیں کیا تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ کمبل کی گھمبیرتا اور جامعیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک بار پھر اس کے درشن کیجئے۔ بچۂ شاہین سے لے کر آخری رباعی تک اقبال کے سارے کلام کی تفسیر آپ پر بخوبی آشکارا ہو جائے گی۔

لیکن یہ تصویر میرے لئے ایک اور زاویے سے بھی طمانیت کا باعث ہے اور یہ ہے اس کی علامتی قدر و قیمت اس مادی دنیا کی کوئی چیز اپنے تحیر اور وقت کے دائرے کو زیادہ عرصہ تک برقرار نہیں رکھ سکتی کہ اس سے طبعی قوانین — (PHYSICAL LAWS) کی تردید ہوتی ہے خصوصاً ہم مشرق کے رہنے والے بڑے ذوق و شوق سے مابعد الطبیعات کی باتیں کرنے کے باوجود طبعی قوانین کے سامنے کچھ جلد ہی سر تسلیم خم کر دینے اور مزاجِ یار کو گل کھلانے کے مواقع فراہم کرنے کے عادی ہیں۔ اس سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ آئندہ آپ جب بھی اپنا کمبل جھاڑیں گے اقبال کا کوئی شعر، رباعی یا نظم یا نسخہ کلام فرش پر ٹپک پڑے گا اور اقبالیات پر آپ اپنی لائبریری کی تکمیل کے لئے ناشرین سے بے نیاز ہو جائیں گے۔ عرض کرنے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ دنیا کا یہ بڑا قائد اور اقبال یقیناً اتنا ہی بڑا قائد تھا، طبعی قوانین کی دست برد سے

محفوظ رہنے کے لئے آپ اپنے آپ کو ایک مضبوط تندرا اور جاندار علامت کے پیکر میں ڈھال لیتا ہے۔ ہم اس کے فرمودات، کارنامے تاریخ پیدائش اور وفات سبھی کچھ بھول جائیں۔ حتیٰ کہ اسے حوالوں کے رحم و کرم پر ہی کیوں نہ چھوڑ دیں۔ اس کی علامتی حیثیت کو قلب و ذہن کے گوشوں سے نکال لینے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ لائبریری اور ڈرائنگ روم سے اسے باہر نکال پھینکنے کی کوئی سعی بھی مشکور نہیں ہو سکتی۔ اس کا حلقۂ فکر و نظر وقت کے ساتھ ساتھ پھیلتا چلا جاتا ہے اقبال خوش قسمت ہے کہ اس نے علامتی پیکر میں ڈھلنے کے طویل فاصلے اتنے مختصر عرصہ میں طے کر کے وقت کے ابدی جیل میں اپنے لئے نمایاں مقام پیدا کر لیا ہے جب کہ شکسپیئر صدیاں گزر جانے کے باوجود ابھی تک اس سعادت سے محروم ہے۔ ادبی کھنڈرات کی اس عظیم نشانی کو بچانے کے لئے اس کی کھدائی۔ جدید الفاظ کے تیشوں سے کی جا رہی ہے لیکن تابہ کے۔ جلد یا بدیر یہ تجسیم کی ڈائن اسے نگل کر دم لے گی۔ اس کی وجہ سے زکزنل قزلانی کے بقول۔ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اقبال نے اپنے خیالات و افکار کی بنیاد مضبوط اعتقادات پر رکھی ہے۔ وہ اقبال جس کا تعلق گھر بار ہوی (بلکہ بیویوں) بچوں عزیز و اقارب سے تمام ہو چکا ہے لیکن ہمارا اس اقبال سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارا تعلق اس اقبال سے ہے جو آج ہمارے درمیان کمیل جیسی مضبوط و توانا گرم نرم حیات بخش، مشرقی علامت کے روپ میں موجود ہے اور جو لوگ علامتی پیکر میں ڈھل جاتے ہیں۔ ان کی تاریخ وفات کے بجائے تاریخ پیدائش کی صحت کے بارے میں غور و خوض کرنے کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ ان کی تاریخ وفات وقت کے عام کائناتی دائرے سے باہر قوس قزح کے جھلملاتے رنگوں میں کسی نامعلوم نقطے میں پوشیدہ ہوتی ہے جسے عبور کرنا طبعی قوانین کے تابع ارواح کے بس کی بات نہیں۔

اگر آپ اقبال کی مذکورہ تصویر بغور دیکھیں تو اس میں اقبال کم اور کمیل زیادہ دکھائی دے گا۔ اس سے ہرگز مراد مزاح پیدا کرنے کی ناکام یا کامیاب کوشش نہیں بلکہ عرض کرنے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ اس تصویر میں اقبال نے اپنے آپ کو خالص مشرقی روپ میں اجاگر کیا ہے۔ صنعتی معاشرہ پھیل کر کتنا ہی آفاقی کیوں نہ ہو جائے اور آفاقیت کے پھیلتے ہوئے لاوے میں ساری مشرقی اور مغربی اقدار ایک دوسرے میں ضم کیوں نہ ہو جائیں، کمیل مشرقی اندازِ فکر کی توانا علامت کے طور پر ہمیشہ اپنی انفرادیت برقرار رکھے گا اور چونکہ مغرب کے پاس اقبال کے مشرق کی طرح کمبل جیسی خارجی اور داخلی اعتبار سے مستحکم اور متوازن علامت نہیں۔ اس لئے بڑی آسانی سے اس امر کی پیش گوئی کی جا سکتی ہے کہ آنے والے دَور کی باگ ڈور اقبال کی مشرقی تہذیب و ثقافت اور روایت کے ہاتھ ہی میں رہے گی۔ بلکہ مغرب میں ہیپی ازم اور ہرے کرشنا ہرے رام جیسی خالصتاً داخلی تحریکوں کے رواج اور مقبولیت کے پردے میں مغربی اندازِ فکر پر مشرق کے ظاہری اور خارجی کلچر کو کرنے اور داخلی خوبیوں کو گلے لگانے کی روشنی کی برتری کا آغاز ہو چکا ہے۔ لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رُخ ہے یہ تحریکیں

اقبال کے مشرق کی صحیح نمائندگی نہیں کرتیں۔ صرف ایک ہی پرت کا مظاہرہ کرتی ہیں اور وہ بھی غیر صحت مند رجحان کے ساتھ پھر بھی بات تو چل ہی نکلی ہے یوں بھی فطرت کا یہ ایک اٹل اصول ہے کہ ہر ٹھوس اور جامع پیکر چند غلط فہمیوں کے انتشار سے ہی جنم لیتا ہے

میری نگاہیں صاف صاف آنے والی دنیا کے اس منظر کو دیکھ رہی ہیں جب ساری دنیا مادی اور روحانی براعظموں کے خلاف اقبال کے مشرقی کمبل میں قلعہ بند ہو جائے گی۔ کرۂ ارض پر یوٹوپیا کا طلوع ہوگا۔ دنیا متوازن کیفیت سے ہمکنار ہوگی اور موجودہ ہذیانی کیفیت کے ساتھ غالباً زمین کے درجۂ حرارت میں بھی خاصی کمی واقع ہو جائے گی کیونکہ ایک خاص درجۂ حرارت سے زیادہ کمبل کا استعمال بنی نوع انسان کی طبع نازک پر گراں گزر سکتا ہے۔

ناک پکڑنے کا عمل

مشکور حسین یادؔ

میں سخت ناسمجھ واقع ہوا ہوں۔ میری ناسمجھی کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ میں زندگی میں خواہ مخواہ دشواریاں پیدا کرنے کو ایک بیکار سی بات خیال کرتا ہوں حالانکہ زندگی کی ساری چہل پہل انہی بے معنی قسم کی دشواریوں کے دم قدم سے ہے۔ عقلمندوں کا کہنا ہے کہ سیدھے طور پر ناک پکڑنا انسان کا کام نہیں صحیح معنوں میں انسان زیادہ وہی ہے جو گردن کے پیچھے سے ہاتھ لاکر اپنی ناک پکڑتا ہے۔ میں نے ہمیشہ ناک سیدھی طرح پکڑی اور لوگوں نے ہمیشہ میرا مذاق اڑایا۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ لوگوں کے کہنے کے مطابق میں ہاتھ گھما کر اپنی ناک پکڑتا اور اگر ایسا نہیں کر سکتا تھا تو اسے کاٹ ڈالتا۔ لیکن میرے ساتھ یہ مشکل رہی کہ نہ تو میں ہاتھ گھما کر ناک پکڑ سکا اور نہ ہی مجھ میں اپنی ناک کاٹ ڈالنے کی ہمت پیدا ہوئی۔

ایک دن کا ذکر سنیئے میں اسی طرح سیدھے سادے طور پر اپنی ناک پکڑنے میں مصروف تھا کہ اچانک مجھے عشق ہو گیا۔ اب تو میں نے یوں محسوس کیا گویا سادگی سے ناک پکڑنا زندگی کی سب سے بڑی عشرت ہے چنانچہ فرطِ شوق میں بے تاب ہو کر کسی تکلف کے بغیر میں اپنے محبوب کے قریب پہنچا۔ محبوب کو میری اس حرکت پر ہنسی آنے لگی تھی لیکن اس نے فوراً ضبط سے کام لیا۔ وہ گردن کے پیچھے سے ہاتھ لاکر اپنی ناک پکڑتے ہوئے مجھ سے کہنے لگا: "اے تو کون ہے؟" میں نے سیدھی طرح اپنی ناک پکڑ کر جواب دیا: "تمہارا عاشق" بس پھر کیا تھا میرے اس جواب پر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ لوگوں کے ہاتھ گردن سے ہوتے ہوئے ان کی ناکوں کی طرف آ رہے تھے عجیب عالم تھا سب کی آنکھوں اور منہ سے شعلے نکل رہے تھے اور کانوں سے دھواں۔ موقع کی نزاکت کے پیشِ نظر احباب نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اپنا عشق واپس لے لوں۔ چونکہ میں نے عشق کی ابتدا نہایت سادگی اور خلوص سے ساتھ کی تھی اس لئے صاف طور پر کہہ دیا کہ میں عشق کو واپس لینے کے لئے ہرگز تیار نہیں۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ میں اپنی ضد پر پوری طرح قائم ہوں تو مجھے رنگ رنگ مشورے دیئے یعنی واسطے ہیں زندگی کا حقیقی حسن و جمال دیکھنا چاہتے ہو تو ان واسطوں ان پردوں کو درمیان سے اٹھا دو

رِع کردیئے۔ ان مشوروں میں اتنا اثر ضرور تھا کہ میں انہیں بیک نگاہ رد نہ کرسکا۔ مثلاً جب میں نے چاہا
پنے محبوب کے سامنے محبت کا اظہار بے تکلفی سے کرڈالوں تو مجھے لوگوں نے کہا۔ اس طرح محبت کا
ا رکرنا گنوارپن ہے۔ مجھے چاہیئے کہ میں شعر کہنا شروع کردوں۔ چنانچہ میں نے شاعری شروع کردی۔ شعر
کرمیں نے محسوس کیا جیسے میری بات ہمیشہ ادھوری رہتی ہے۔ تکمیل ابلاغ کا وہ وہ پُر لطف احساس جو
بوب سے براہِ راست اظہارِ عشق کرنے میں آیا تھا پھر کبھی حاصل نہ ہوا۔ حالانکہ میں نے محبوب کے استفسار
میں کون ہوں صرف دو لفظ ہی تو زبان سے ادا کیئے تھے "تمہارا عاشق"۔ میں پے در پے شعر کہہ کر شاعر
ر مشہور ہوگیا لیکن میرے عشق پر خاک پڑگئی۔ عمدہ سے عمدہ شاعری کرکے یہی محسوس ہوتا جیسے میں بھی
سرے لوگوں کی طرح ہاتھ گھما کر اپنی ناک پکڑ رہا ہوں۔ مجھے اپنے اس احساس پر سخت اذیت ہوتی۔ میں نے
ب سے چیخنا شروع کردیا۔ چونکہ میری آہ وزاری میں بے تکلفی اور خلوص تھا اس لئے مجھے اس طرح آہیں بھرنے
ے یک گونہ طمانیت حاصل ہوئی لیکن ابھی دو چار آہیں ہی کھینچ پایا تھا کہ دوستوں نے پھر مشورے دینے شروع
دیئے۔ "دیکھو بھائی! اس طرح آہیں بھروگے تو بیکار جان سے ہاتھ دھو بیٹھوگے اور تمہارے محبوب کو خبر تک
ہوگی۔" میں نے پوچھا۔ "تو پھر یارو! بتاؤ میں کیا کروں؟" انہوں نے کہا اگر آہیں بھرنا بہت ہی ضروری سمجھتے ہو تو بہتر یہ
ہے کہ گانا شروع کردو۔ تمہاری آہیں جب نغموں میں ڈھلیں گی، دنیا والے عش عش کر اٹھیں گے۔ تمہارا محبوب بھی تمہارے نغمے سن کر
رقص کرنے لگے گا۔" میں نے اپنی آہوں کو سُروں میں ڈھالنا شروع کردیا۔ میں ایک موسیقار مشہور ہوگیا لیکن موسیقار بن
کر بھی یہی محسوس ہوا جیسے میں آوازوں کے زیر و بم میں گم ہوکر رہ گیا ہوں اور میری صدائے دردناک میرے محبوب کے
کانوں تک بالکل نہیں پہنچ رہی ہے۔ اس ناکامی کے احساس کی بدولت میری آنکھوں سے خون کے آنسو برسنا شروع
ہوگئے۔ دوستوں نے دیکھا تو پریشان ہوکر کہا۔ اُف یہ کیا غضب کررہے ہو۔ خون کو اس طرح ضائع کرنا کہاں کی عقلمندی
ہے؟" میں نے جواب دیا "خدا کے لئے مجھے پریشان نہ کرو۔ اس طرح خون کے آنسو بہانے میں بڑا لطف آرہا ہے۔ یہ بھی یقین
ہو چلا ہے کہ ان آنسوؤں سے میرا محبوب ضرور متاثر ہوگا۔" دوستوں نے پھر قہقہے لگائے مجھے سمجھایا "پاگل نہ
بنو۔ خون ہی بہانا مقصود ہے تو برش ہاتھ میں سنبھالو اور مصور بن جاؤ۔" اس مشورے کے مطابق میں ایک مصور
بن گیا۔ بے شمار تصویریں بناڈالیں لیکن پھر بھی یہی احساس رہا جیسے میں جو کچھ کررہا ہوں سب تصنع اور بناوٹ
ہے۔ دل سے مسلسل آواز آرہی تھی۔ وصل محبوب کا واحد طریقہ عشق کا والہانہ پن ہے فن، آواز، رنگ اور سنگ
میں نے جس قدر شعر کہے تھے سب پھاڑ ڈالے جتنی تصویریں بنائی تھیں انہیں نذرِ آتش کردیا۔ موسیقی کا جس قدر ساز و سامان

پکڑ آیا تھا اسے توڑ پھوڑ کر باہر پھینک مارا۔ اب مجھے ایک خاص انداز کی لطافت فضا میں اڑا کے لئے جا رہی تھی میں بہت محظوظ ہو رہا تھا کہ میرے احباب پھر سمجھانے کیلئے آگئے "دوست تم نرے چغد ہو کیسے اچھے شعر کہتے تھے کیا عمدہ راگ الاپتے تھے کیسے غضب کی تصویریں بناتے تھے ظالم! یہ تم نے کیا کیا؟ آخر اپنی صلاحیتوں کو خاک میں ملانے پر کیوں تُل گئے ہو؟ میں نے غصے میں جواب دیا "ذرا سوچو تو سہی، لفظ، رنگ، آواز یہ میرا مقصدِ حیات ہیں؟ تم لوگوں کی خواہش ہے کہ میں لفظوں، رنگوں اور آوازوں کے زنداں میں قید ہو کر رہ جاؤں۔ تم مجھے شعبدہ باز بنانا چاہتے ہو؟ تمہاری تمنا ہے کہ میں حقائق کے سچے حسن و جمال سے محروم ہو جاؤں۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں مجھے میرے حال پر چھوڑ دو" یہ سن کر میرے ناصح دوست میرے پاس سے اٹھ کر چلے گئے۔ ان کا خیال تھا میں پاگل ہو گیا ہوں۔ مجھے فنونِ لطیفہ کی اہمیت سے انکار نہیں میرا تو ایمان ہے کہ فن معرضِ وجود میں آیا ہی اسی لئے ہے کہ وہ انسان کو سیدھی طرح ناک پکڑنے کے حیات افروز احساس سے پوری طرح آگاہی بخش سکے البتہ مقصد بن جانے سے فن کی کشش کو سخت نقصان پہنچایا

آدمی زندگی میں خواہ مخواہ دشواریاں کیوں پیدا کرتا ہے؟ شاید اسلئے کہ اس میں زندگی کی آسانیوں سے بہرہ ور ہونے کی تاب نہیں انسانی زندگی ایک شفاف ندی کی مانند ہے پھر ہم اسے گدلا کیوں کرتے ہیں؟ یقیناً ہمیں اس میں اپنی صورت نظر آجاتی ہے جسے دیکھ کر ہم بے اختیار ڈر جاتے ہیں۔ اپنی شبیہ کا خوف نہ صرف ہمیں اس ندی میں اوندھے منہ گرا دیتا ہے بلکہ اپنے ساتھ ہم دوسروں کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔ سادہ زندگی ایک آئینہ ہے اس میں آدمی اپنے آپ کو اچھی طرح دیکھ سکتا ہے لیکن پہلی جھلک خواہ کسی نوعیت کی ہو اسے متوحش ضرور کرتی ہے۔ اکثر لوگ اپنی پہلی جھلک نہیں دیکھ پاتے اور پھر محرومی کا یہ سلسلہ بہت دور تک چل نکلتا ہے۔

قصہ دراصل یہ ہے کہ انسان بننے کی کوشش میں آدمی اپنی ناک سیدھی طرح نہیں پکڑتا۔ اسکا خیال ہے سیدھی طرح ناک پکڑ لی تو وہ نرا آدمی رہ جائیگا اور اُسے انسان بننے کی سعادت نصیب نہیں ہو سکے گی حالانکہ انسان بننے کی پہلی کڑی شرط یہی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو آدمی سمجھے ہاتھ گھما کر ناک پکڑنے میں یہ قباحت ہے کہ اس عمل میں آدمی اپنے آپ کو آدمی سمجھنا بھول جاتا ہے۔ بغور دیکھا جائے تو یہ پوری انسانیت کی تگ و دو کا المیہ ہے۔ آدمی انسان بننے کی کوشش میں اپنی آدمیت کو پے در پے فراموش کرتا رہتا ہے جس کے نتیجے میں انسان بننا تو درکنار اس کی آدمیت بھی اپنی صحیح شکل میں برقرار نہیں رہتی۔ سچ پوچھیے تو ابھی تک آدمی نے اپنی آدمیت اور انسانیت کو فروغ دینے کی بجائے اپنے جانورپن کو زیادہ بنایا اور سنوارا ہے۔ اس کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اسے تا حال سیدھی طرح ناک پکڑنی نہیں آئی۔ زندگی کی بے شمار سہولتیں ازل سے لے کر آج تک اس کا منہ اسی طرح تک رہی ہیں۔

نوٹ:- مجھے اعتراف ہے کہ اس مضمون میں کوشش کے باوجود میں ایک بار بھی اپنی ناک سیدھی طرح نہیں پکڑ سکا۔ میرے دوست مسعود محمود کا کہنا ہے "شکور بھائی! سیدھی یا الٹی طرح ناک پکڑنے کا سوال تو وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں ناک ہو" معلوم نہیں موصوف کا اشارہ میری اجتماعی زندگی کی طرف ہے یا انفرادی۔ ویسے نظریں نیچی کر کے دیکھتا ہوں تو اپنی ناک کچھ جھکی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

پدرم فقیر بُود

نظیر صدیقی

یہ بات میں اپنے بارے میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں اپنے بارے میں کہہ بھی نہیں سکتا کیونکہ میں تو ایک خوشحال باپ کا بدحال بیٹا ہوں۔ دراصل پدرم فقیر بُود والا فقرہ میں نے دوسروں کو کہتے سنا ہے۔ وہ بھی ازراہِ اعتراف نہیں بلکہ ازراہ افتخار۔ آپ کہیں گے ایسا ہو نہیں سکتا۔ افتخار کے طور پر تو آدمی پدرم سلطان بُود کہتا ہے۔ پدرم سلطان بود کے فقرے میں افتخار کا پہلو کیا معنی؟

سچ پوچھئے تو یہ اعتراض عقل کی کمی سے زیادہ مشاہدے کی کمی پر مبنی ہے۔ یہ ممکن ہے آپ نے کسی کو پدرم فقیر بود کا فقرہ افتخار کے طور پر کہتے نہ سنا ہو۔ لیکن آپ نے یہ ضرور دیکھا ہوگا کہ ہر آدمی اپنے باپ کے سلطان ہونے ہی پر فخر نہیں کرتا بلکہ اور بہت سی چیزوں پر فخر کرتا ہے جن میں باپ کا فقیر ہونا بھی شامل ہے۔ یہیں سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ فخر کا جذبہ جتنا عالمگیر ہے فخر کا مسئلہ اتنا ہی پیچیدہ ہے۔

اس مسئلے کی پیچیدگی اس بات میں پوشیدہ ہے کہ آج تک انسان یہ طے نہ کر سکا کہ فی الحقیقت ہمیں کن چیزوں پر فخر کرنا چاہیئے اور کن چیزوں پر نہیں۔ اس معاملے میں کسی فیصلے تک نہ پہنچنے ہی کا نتیجہ ہے کہ دو آدمی دو متضاد چیزوں پر فخر کرتے پائے جاتے ہیں۔ اگر ایک کو اس بات پر فخر ہے کہ اس کا باپ سلطان تھا تو دوسرے کو اس پر فخر ہے کہ اس کا باپ فقیر تھا۔ اگر ایک کو اس پر فخر ہے کہ وہ اپنے منہ میں چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہوا تھا تو دوسرے کو اس پر فخر ہے کہ وہ گدڑی کا لال ہے۔ اگر ایک کو اس پر فخر ہے کہ وہ محنت و مشقت کی زندگی سے کوسوں دور ہے تو دوسرے کو اس پر فخر ہے کہ اس نے ہمیشہ محنت و مشقت کی روٹی کھائی ہے۔ اگر ایک کو اس پر فخر ہے کہ اس نے کبھی فرسٹ کلاس سے نیچے کے درجے میں سفر نہیں کیا تو دوسرے کو اس پر ناز ہے کہ اس نے کبھی تھرڈ کلاس سے اوپر کے درجے میں سفر کرنے کی خواہش تک نہیں کی۔ اگر کسی کو جان لینے پر فخر ہے تو کسی کو جان دینے پر ناز ہے۔ اگر کسی کو مال مست ہونے پر فخر ہے تو کسی کو حال مست ہونے پر ناز ہے

ذہن کہ فخر کا کوئی معیار نہیں ۔ جو شخص جس چیز پر فخر کرنا چاہے فخر کر سکتا ہے ۔

اس بے اصولی کے نتائج خطرناک ہوں یا نہ ہوں دلچسپ ضرور ہیں ۔ مثلاً آپ جانتے ہیں کہ ایک ادیب کے لئے صحیح زبان لکھنا باعثِ فخر ہے نہ کہ غلط زبان لکھنا ۔ لیکن چونکہ فخر کرنے کے لئے اصول کی پابندی ضروری نہیں ۔ اس لئے ایک طرف ہمارے یہاں اہلِ زبان صحیح زبان لکھنے پر فخر کرتے ہیں تو دوسری طرف غیر اہلِ زبان غلط زبان لکھنے پر فخر کرتے نظر آتے ہیں ۔ جہاں اہلِ زبان مصنفین اپنی غلطیوں کو کاتب کی کوتاہی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں وہاں غیر اہلِ زبان مصنفین کاتب کی غلطیوں کو بھی اپنے نام سے منسوب کرنے میں تامل نہیں کرتے مثلاً کنہیالال کپور اپنی کتاب " چنگ و رباب ،، کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں کہ " اس کتاب میں زبان کی متعدد غلطیاں بھی ہوں گی جن کی تمام تر ذمہ داری کاتب پر نہیں مصنف پر عائد ہوتی ہے "

فخر کے معاملے میں یہ بے اصولی کسی ایک طبقے سے مخصوص نہیں ۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں متضاد قماش کے لوگ متضاد چیزوں پر فخر نہ کرتے ہوں ۔ جہاں ایک متقی اور پرہیزگار کو اس پر فخر ہے کہ ؎

دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

وہاں ایک عاصی اور گناہگار کو اس پر ناز ہے کہ ؎

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

سیاست کی دنیا میں بھی ایسی مثالیں نایاب نہیں ۔ جب سر ظفر اللہ خان پاکستان کے وزیرِ خارجہ کی حیثیت سے یو ۔ این ۔ او کے اجلاس میں کاشمیر کے مسئلے پر چھ چھ گھنٹے مسلسل تقریر کرتے تھے تو کم از کم پاکستانیوں کے دل خوشی سے پھولے دسماتے تھے کہ ہمارا نمائندہ اتنی طویل تقریر کر سکتا ہے ۔ دوسری طرف جب ہندوستانی نمائندہ سر بینیگل راؤ سر ظفر اللہ خان کے چھ گھنٹے کی تقریر کا جواب دس منٹ میں دیتا تھا تو ہندوستانیوں کے دلوں میں فخر آمیز مسرت پیدا ہوتی تھی کہ ہمارا نمائندہ کتنی مختصر تقریر کرنے پر قادر ہے ۔ اب جب کہ یو ۔ این ۔ او کے اجلاس میں کرشنا مینن سر ظفر اللہ سے تین گنی زیادہ طویل تقریر کرتے ہیں تو ہندوستانیوں کو اس بات پر بھی فخر ہے کہ ان کا نمائندہ طویل تقریر کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتا اور اگر پاکستان کا نمائندہ سر بینیگل راؤ کی طرح مختصر تقریر کرنے لگے تو ہم پاکستانی شاید اس کی اختصار پسندی یا سکوت پسندی پر بھی فخر کرنے سے باز نہیں آئیں گے ۔

پتا نہیں میرا یہ خیال صحیح ہے کہ نہیں لیکن یہ خیال آئے دن میرے ذہن میں آتا رہتا ہے کہ فخر کا جذبہ انسان کے ان بنیادی جذبات میں سے ہے جن کی تسکین کے لئے وہ کوئی نہ کوئی صورت ضرور نکال لیتا ہے۔ چنانچہ مجھے بارہا یہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے کہ جن لوگوں کی زندگی قابلِ فخر کارناموں سے خالی ہے ان کی کوئی بات فخر سے خالی نہیں ہوتی مثلاً بعض آدمیوں کو اس قسم کی باتوں پر بھی فخر ہوتا ہے کہ انہوں نے فلاں ادیب کی آنکھیں دیکھی ہیں یا فلاں لیڈر کی ڈانٹ سنی ہے یا فلاں عالم کی جوتیاں سیدھی کر چکے ہیں۔ بعض اپنی عقل پر فخر کرتے ہیں اور جن کی عقل فخر کئے جانے کے قابل نہیں ہوتی وہ اپنی نسل پر فخر کر کے اپنی خودی کو تسکین دے لیتے ہیں۔

ہر قسم کی کمزوری یا کمال پر بے سوچے سمجھے فخر کرنا صرف عام لوگوں کا شیوہ نہیں بلکہ غالب جیسے فلسفی شاعر تک کا فیصلہ ہے کہ

جس طرح کا بھی کسی میں ہو کمال اچھا ہے

لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ بات کہتے وقت اس کے نتائج تک غالب کی نظر نہیں پہنچی ہر قسم کے کمال کو اچھا یعنی قابلِ فخر قرار دینے ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ خیر و شر کی ساری قدریں گڈ مڈ ہو کر رہ گئی ہیں اور خیر و شر کی باہمی آویزش ختم ہونے میں نہیں آتی۔ کتنی عجیب بات ہے کہ جس دور میں برطانیہ کو اپنی جمہوریت اور روس کو اپنی اشتراکیت پر فخر ہو اسی دور میں جرمنی اور اٹلی اپنی فاشیت پر ناز کریں۔ حالانکہ فاشیت وہ چیز ہے جس پر کسی قوم یا ملک کو نازاں ہونے کی بجائے نادم ہونا چاہیئے۔ نادم ہونے کی جگہ نازاں ہونے کا نتیجہ دوسری جنگ عظیم جیسے المیے کی صورت میں نکلا۔ لیکن انسان کی بدبختی ملاحظہ ہو کہ اس المیے کے بعد بھی فخر کا کوئی آفاقی معیار قائم نہ ہو سکا البتہ فخر کا مرکز ضرور بدل گیا۔ یعنی اب دنیا کی بڑی قوموں یا بڑے ملکوں کو اپنی جمہوریت یا اشتراکیت پر اتنا فخر نہیں ہے جتنا خطرناک سے خطرناک آلاتِ حرب کی ایجاد پر۔ چنانچہ اگر ایک قوم کو اس پر فخر ہے کہ اس نے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم ایجاد کر لیا ہے تو دوسری کو اس پر فخر ہے کہ وہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم سے بھی زیادہ تباہ کن بموں کی ایجاد میں مصروف ہے۔ اس

صورتِ حال کو دیکھ کر ایک واقعہ مجھے اکثر یاد آتا ہے جو لطیفے سے کم نہیں ۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ دو آدمیوں کے درمیان مالِ غنیمت کی تقسیم کے معاملے میں اختلاف رائے ہوگیا۔ اس پر ایک شخص بالکل مرنے مارنے پر تُل گیا۔ مرنے پر کم مارنے پر زیادہ ۔ جب دوسرے نے یہ رنگ دیکھا تو اس نے بھی آستینیں چڑھالیں اور اپنے فریق یا حریف کو للکارتے ہوئے کہا "بیٹا ہمت ہے تو آجا ۔ ہم تجھ سے کم حرامی نہیں ہیں" ظاہر ہے کہ جس دنیا کے انسانوں کو حرامی پن ہونے پر فخر ہو سکتا ہے وہاں انصاف ہمیشہ خطرے میں رہے گا ۔ لیکن میرے نزدیک آج کی دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ جنگ کا انسداد یا امن کا اہتمام نہیں بلکہ فخر کے صحیح اور حقیقی معیار کا تعین کرنا ہے ۔

اس کی وجہ سے اگر ایک ملک کو اس پر فخر ہے کہ ہم نے ہائیڈروجن بم تیار کر لیا ہے تو دوسرے کو اس پر ناز ہے کہ ہم بھی اس کارِ خیر میں تم سے پیچھے نہیں ۔ اگر ساری دنیا اس پر متفق ہو جائے کہ انسانیت کو فائدہ پہنچانے والی چیزوں پر فخر کرنا چاہیئے اور نقصان پہنچانے والی چیزوں پر شرمندہ ہونا چاہیئے تو مجھے یقین ہے کہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بنانے والے اپنی اپنی ایجادوں پر شرمندہ ہوتے اور محسوس کرتے کہ ان کی ہلاکت آفریں ایجادوں پر فخر کرنا ایسا ہی ہے جیسے یہ کہنا کہ "بیٹا ہم تجھ سے کم حرامی نہیں ہیں"۔

ٹھنڈا برف ہات!

وزیر آغا

اس روز میں صبح ہی سے ان کھیتوں میں گھوم رہا تھا جن میں گندم کی نئی قسم پادان کاشت کی گئی تھی۔ مجھے یہ قسم بہت اچھی لگی تھی۔ اس کے پودوں نے گندم کی عام اقسام کی بہ نسبت زیادہ شاخیں نکالی تھیں۔ خوشوں کی لمبائی بھی مناسب تھی۔ میں خوش تھا کہ امسال شاید گندم کی کمی پوری ہو جائے۔ پھر اچانک سڑک پر ایک جیپ آکر رکی۔ اور زراعت کے چند ماہرین جیپ سے نکل کر میری طرف آگئے۔

نجانے ہم کتنی دیر کھیت کی مینڈھ پر کھڑے پادان کے بارے میں باتیں کرتے رہے کہ ہمیں وقت کی گزران کا احساس تک نہ ہو سکا۔ ہمیں پتہ بھی نہ چلا کہ کب سورج غروب ہوا، کب شام اپنے سرخ عروسی لباس میں ڈولی سے اتری، کب اس کا سہاگ اجڑا، اور کب اس کی سرمئی آنکھوں میں ایک موٹا سا تابدار آنسو جگمگا اٹھا۔ میں نے چونک کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کھیتوں نے کالی عبا اوڑھ لی تھی، اور رات کے رخسار بھیگ سے گئے تھے۔ میں نے بہ عجلت مہمانوں سے اجازت طلب کی، اور اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا، جو وہاں سے تقریباً ڈیڑھ کوس کے فاصلے پر تھا۔ وہ لوگ جیپ میں بیٹھ کر پختہ سڑک کی طرف چلے گئے۔ چند لمحوں تک مجھے جیپ کی سرخ بتی نظر آتی رہی۔ پھر یہ بتی بھی غائب ہو گئی۔

اب مکمل اندھیرا تھا، اور تنہائی میں چھڑی گھماتا تیز تیز گاؤں کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر چلتا رہا، اور پھر اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کسی شے نے اپنا ٹھنڈا برف ہاتھ میری گردن کی پشت پر رکھ دیا ہے۔ میں نے چونک کر اپنے پیچھے کی طرف دیکھا۔ اندھیرے میں ملفوف درخت کپڑے فقیروں کی طرح قطار اندر قطار کھڑے مجھے گھور رہے تھے۔ اور گندم کے کھیت گھنی اور لمبی سیاہ جٹاؤں کی طرح ایک دوسرے سے الجھے ہوئے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ میری گردن پر ٹھنڈے ہاتھ کا لمس کھیت میں پیدا ہونے والی کسی ایسی سرسراہٹ کے باعث ہو جس کی اطلاع میرے جسم کو میرے دماغ سے بہت پہلے ہو گئی تھی۔ ویسے میرے دماغ کو دنیا و مافیہا سے یوں

بے خبر نہیں ہونا چاہیے تھا کیونکہ رات کے وقت یہ علاقہ ہرگز محفوظ نہیں تھا۔ جنگلی جانوروں نے اس علاقے میں خاصا اودھم مچا رکھا تھا، اور ابھی چند ہی روز پہلے ایک جنگلی سؤر نے ایک کسان کو بری طرح زخمی کر دیا تھا پھر گرمی کی آمد بھی تھی، جس کے باعث سانپ بھی نکلنا شروع ہو گئے تھے۔ اندھیرے میں پیدل چلتے ہوئے کسی بھی وقت سانپ پر پاؤں آ سکتا تھا۔ لہٰذا جب جسم کے ساتھ ساتھ میرا دماغ بھی جاگ اٹھا، اور خطرات سے پوری طرح آگاہ ہو گیا، تو میں نے پاؤں زمین پر زور زور سے مار کر چلنا شروع کر دیا، اور چھڑی سے زمین کو ٹھکرانے بھی لگا۔ مگر اس حرکت سے فی الفور دو نتائج برآمد ہو گئے۔ ایک تو یہ کہ کھیتوں میں جگہ جگہ سرسراہٹ سی ہونے لگی، اور ایک بار تو کوئی شے تیزی سے میرا راستہ بھی کاٹ گئی، دوسرا یہ کہ میرے اپنے قدموں کی چاپ میرا تعاقب کرنے لگی، اور اس چاپ کو سن کر سردی کی ایک لہر سی میری گردن پر سے پھسلتی ہوئی میرے سارے جسم پر رینگنے لگی۔ اس وقت تو میں اس کیفیت کا تجزیہ نہ کر سکا، مگر اب سوچتا ہوں کہ خوف مجھ پر شاید باہر سے حملہ آور نہیں ہوا تھا، بلکہ میرے اندر سے باہر آیا تھا، اور اندر سے نکلنے والا یہ خوف نسل کی زیریں منازل سے آیا تھا۔ یہ اس زمانے کی یادگار تھا، جب انسان کو لباس کی ڈھال، چھت کا سایہ، خود کار ہتھیاروں کی کمک اور شخصیت کا زرہ بکتر نصیب نہیں تھا۔ ان دنوں وہ ہر اعتبار سے برہنہ تھا اور اپنے آپ سے براہ راست متعارف! مگر پھر لوہے کے لبادوں نے اسے پوری طرح ڈھانپ لیا۔ اور وہ شخصیت کی کال کوٹھری میں دبک کر بیٹھ رہا۔ مگر اس روز اندھیرے اور سناٹے اور تنہائی کے سفر میں جب خوف میرے اندر سے باہر کو لپکا، تو اس کے ساتھ ہی یہ قدیم انسان بھی باہر نکل آیا۔ یا شاید یوں ہوا کہ جن بوتل میں قید تھا۔ جب خوف کی پہلی ضرب سے یہ بوتل چکنا چور ہو گئی، تو جن آزاد ہو گیا۔ اب دونوں ازلی و ابدی دشمن ایک دوسرے کے روبرو تھے۔ دونوں کے درمیان تہذیب اور شخصیت کی کوئی دیوار حائل نہ تھی۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا تھا کہ میرے ہاتھ میں چھڑی نہیں، بلکہ نیزہ ہے، اور میرے جسم پر لباس نہیں، بلکہ ایک موٹی کالی کھال ہے۔ اب میں قدیم زمانے کا ایک وحشی تھا۔ خوف کے وجود کو پوری طرح پہچانتا تھا۔ میں نے اس سے قبل اپنی ذات میں چھپے ہوئے اس وحشی کو کبھی نہ دیکھا تھا، بلکہ میں تو اس کے وجود تک سے آشنا نہ تھا، مگر اب کہ وہ میرے روبرو آ گیا تھا، تو مجھے اس سے معانقہ کر کے بے حد خوشی ہوئی۔ یہ میرا کالی روپ تھا — غیر مہذب، کھردرا، سفاک اور خونخوار روپ، مگر ایک اژدھی قوت کی علامت! وہ تخلیق کا سرچشمہ تھا، سرخ لہو کی ایک تڑپتی ہوئی بوند اور جذبے کی ایک متحرک قاش تھا۔ بس یہ ہوا تھا کہ خوف

نے میرے جسم سے چپکے ہوئے تہذیب کے زرہ بکتر کو توڑ کر اسے آزاد کر دیا تھا۔ اسی وقت مجھے خوف کی افادیت کا پہلی بار احساس ہوا۔ لوگ اسے بزدلی پر محمول کرنا چاہیں، تو یہ بات بھی کچھ ایسی غلط نہیں، مگر حقیقت شاید یہ ہے کہ خوف انسان کو شخصیت کے زندان سے رہائی دلاتا ہے، بعینہٖ جیسے ہتک شخصیت کو پرزے پرزے کر کے انسان کو لمحہ بھر کے لئے آزاد کر دیتی ہے کیسے؟ میں عرض کرتا ہوں کہ کیسے؟

نکتہ یہ ہے کہ ہر فرد کی نظروں میں اس کی اپنی عزت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ وہ اس کی حفاظت کے لئے اپنے گرد انا اور غیرت خودی اور خود پسندی کی دیوار سی کھڑی کر کے اس پر جلی حروف میں لکھ دیتا ہے کہ یہ شارع عام نہیں ہے، اور خلاف ورزی کرنے والے کو تہ تیغ کر دیا جائے گا۔ اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ خلقِ خدا بھی اس کی اسی طرح عزت کرے جیسے کہ وہ خود کر رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کی ساری زندگی اپنی اس "دلکش اور موہنی شخصیت" کے تحفظ میں بسر ہوتی ہے، اور وہ کبھی یہ برداشت تک نہیں کرتا کہ کوئی میلی آنکھ اس کی شخصیت کو داغدار کرنے کی کوشش کرے۔ ایسے میں اگر کوئی اس کی ہتک کرے، مثلاً اگر اسے گالی دے، تو اسے محسوس ہوتا ہے، جیسے وہ خود اپنی نظروں میں ذلیل ہو گیا ہے، ٹوٹ پھوٹ گیا ہے، اور اس کا اُسارا ہوا قلعہ دھڑام سے زمین پر آن گرا ہے، مگر پھر دوسرے ہی لمحہ اسے محسوس ہوتا ہے، جیسے وہ پہلی بار خود کو شخصیت کے آئینے میں سے نہیں، بلکہ براہ راست دیکھ رہا ہو۔ گویا گالی اس کی شخصیت کو تار تار کر کے اسے دعوت دیتی ہے کہ وہ خود کو از سر نو مرتب کرے۔ سوچتا ہوں کیا ایک عالم میں قتل ہونے اور دوسرے میں دوبارہ زندہ ہونے کا یہ عمل پوری کائنات کے تخلیقی عمل سے مشابہہ نہیں؟ درویش یا سنیاسی اس راز کو خوب جانتا ہے۔ جبھی تو وہ اپنی چھوٹی "میں" کو ذلیل کر کے توڑ پھوڑ دیتا ہے، تاکہ غرور اور تمکنت سے دست کش ہو کر بڑی "میں" کے آستان تک پہنچنے کے قابل ہو۔ ویسے بھی بیج کا چھلکا ٹوٹے، تو اس کے اندر کے مغز کو تخلیقی سرگرمی کی اجازت ملتی ہے۔ شخصیت کا بوجھ اترے، تو انسان تخلیق کے قابل ہوتا ہے۔ ورنہ وہ تو ایک ایسا باوقار، عزت مآب اور خود پسند شہری ہے، جس کی قسمت میں موت کے بعد بھی سنگ مرمر کا کتبہ لکھا ہے، وہ مر کر بھی آزاد نہیں ہوتا۔

مگر خیر میں کہہ رہا تھا کہ مجھے اس رات زندگی میں پہلی بار خوف کی کارکردگی کا بھرپور احساس ہوا، اور پہلی بار شخصیت کے ریزہ ریزہ ہونے اور اندر کے قیدی کے باہر آنے کا منظر دکھائی دیا، اور پھر مجھے محسوس ہوا، جیسے میں صدیوں کی نیند سے بیدار ہو کر فطرت کے دائرے میں سمٹ آیا ہوں۔ فطرت میں ہر طرف خوف ہی خوف ہے۔ میں کسی بات پر خوش ہو کر کبھی تالی بجاؤں، تو چڑیاں اور تتلیاں اور گلہریاں دھڑکتے دلوں

دہشت زدہ ہو کر فوراً اپنے جسموں کے ساتھ ہوا ہو جاتی ہیں۔ ایک بار مجھے ایک ننھی سی چڑیا کو اپنے ہاتھ کی مٹھی میں لینے کا اتفاق ہوا تھا۔ مجھے آج تک اس کے دل کی دھڑکن یاد ہے جو میری ہتھیلی سے ٹکریں مار رہی تھی۔ خوف نے بڑے جانوروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے کیڑوں تک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے، اور ان کی زندگیاں ہمہ وقت خوف کی کھنچی ہوئی تلوار کے سایے میں بسر ہوتی ہیں۔ شاید یہی ان کی بیداری اور آزادی کا راز بھی ہے۔ جب زندگی سے خوف منہا ہو جاتا ہے، تو انسان کو نیند آ جاتی ہے۔ کسی زمانے میں بڑے بڑے ڈینوسار شاید اسی لئے نیم غنودگی کی حالت میں رہتے تھے کہ انہیں کسی سے خطرہ نہیں ہوتا تھا۔ مگر پھر یہی نیم غنودگی ان کی اجتماعی موت کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوئی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آج کے مادی تحفظات نے انسان کو بھی تہذیبی اور روحانی غنودگی کی زد پر لا کھڑا کیا ہے، اور اب صرف ایک جیتا جاگتا خوف ہی اسے ابیونیت کے عالم سے بیدار کر سکتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب کسی شخص کی زندگی میں کوئی بحرانی دور آتا ہے، تو وہ لمحہ بھر کے لئے ہڑبڑا کر بیدار ہو جاتا ہے۔ مگر ادھر طوفان گزرا، اور ادھر وہ دوبارہ خوابِ خرگوش میں چلا گیا۔ مگر نہیں، خوابِ خرگوش کیوں کہیں؟ خرگوش تو ہر وقت خوف کی زد میں رہتا ہے۔ کبھی کسی خرگوش کے سینے پر ہاتھ رکھ کر دیکھیں، اس کا دل بھی آپ کے ہاتھ کی دیوار سے دیوانہ وار ٹکریں مارتا ہوا محسوس ہو گا۔ خوف دراصل برقی رو کا وہ جھٹکا ہے، جو فطرت کے رُکتے ہوئے دل کو دوبارہ متحرک کر دیتا ہے۔ مگر ضرورت سے زیادہ تحفظات نے انسان کو اس برقی جھٹکے سے محروم کر دیا ہے۔

بہرحال یہ تمام باتیں تو میں اب سوچ رہا ہوں۔ اس رات میرے لئے ڈیڑھ میل کی مسافت صدیوں کا ایک دہشت انگیز سفر تھا۔ ایک ایسی خطرات سے پُر اوڈیسی جسے شاید پوری طرح بیان کرنا بھی ممکن نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میرا یہ سفر بس چند ہی لمحوں پر محیط رہا۔ جلد مجھے اپنے گاؤں کی روشنیاں نظر آ گئیں، اور جیسے جیسے میں گاؤں کے قریب آتا گیا، کوئی طاقت بتدریج میرے تحفظات مجھے لوٹاتی چلی گئی۔ پہلے نیزے کی جگہ ایک نازک سی سبک انداز چھڑی نے لے لی۔ پھر میرے جسم پر سے موٹی کالی کھال رخصت ہوئی، اور اس کی جگہ لباس نمودار ہو گیا۔ پھر وقار اور خود پسندی کا گھمبیر احساس ایک بھاری عمامے کی طرح میرے سر پہ آن گرا۔ میری چال میں خود نمائی اور نگاہوں میں ہمہ بینی آ گئی، اور دماغ کے شیش محل میں تہذیب کے سارے اثمار ـــ حکمت اور منطق اور فلسفہ اور ادب اور ہزار دوسرے مظاہر مؤدب درباریوں کی طرح باادب باملاحظہ ہوشیار آگے بڑھے، اور اپنی اپنی مسندوں پر براجمان ہو گئے۔ بوتل کی ساری کرچیاں کھٹ سے جڑ گئیں، اور جب میں نے کارک کو مضبوطی سے بند کیا، تو مجھے بوتل کے اندر

قدیم انسان ایک کمر شکستہ قیدی کی طرح تہہ میں بیٹھا ہوا دکھائی دیا، اور پھر وہ نظروں سے بالکل غائب ہو گیا۔ اب میری آواز اعتدال اور لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔ میں نے گھر میں داخل ہوتے ہی اپنے ملازم کو آواز دی، اور جب وہ میری آواز پر اپنے کمرے سے باہر آیا، تو میں نے اسے بتایا کہ وہ بزدل ہے اور اندھیرے کے خوف سے اندر چھپا بیٹھا ہے۔

ہم کہ ٹھہرے اجنبی

ڈاکٹر ایوب مرزا

گرمیوں کی ایک صبح میں پروفیسر سجاد حید رملک کو لے کر سی ڈی اے کی نرسری نظارۂ فطرت کرنے گیا۔ سیر کرتے ہوئے ہم یکایک ایک تالاب کے کنارے پہنچے۔ طلوع آفتاب میں ابھی وقت باقی تھا۔ تالاب میں ایک خوب صورت کھلے کنول نے ہمیں متوجہ کیا۔ عجیب نظارہ تھا۔ خاموش گدلے تالاب میں کھلے آسمان کے نیچے یہ کنول اپنی بہار دکھا رہا تھا یکتا، خوب صورت، خوب رنگ، سنجیدگی اور متانت کا سمبل۔

پروفیسر نے کہا اسے توڑ لیا جائے۔ میں نے پروفیسر کے کان میں سرگوشی کی اور ہم دونوں نرسری سے اسلام آباد کے ایک غیر معروف علاقے میں ایک بنگلے پر جا پہنچے۔ فیض صاحب کو اندر اطلاع بھجوائی کہ ہم BED TEA پینے آئے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد ہم فیض کے کمرے میں تھے۔ بولے بھئی واہ! مگر آپ لوگ اس وقت کہاں آوارہ گردی کر رہے ہیں۔ عرض کیا سیر کو نکلے تھے کہ ایک کنول دیکھا اور آپ یاد آ گئے کہ پاکستان کے ادبی، علمی، سماجی اور ثقافتی تالاب میں جہاں کچھ بھی نہیں ہوتا فیض اس کنول کی طرح تنہا کھڑا ہے "دیکھو اس مت کرو" پھر کہنے لگے بھئی ایک بات تو صحیح ہے یہاں کچھ بھی نہیں ہوتا۔

> یہاں سے شہر کو دیکھو تو ساری خلقت میں
> نہ کوئی صاحب تمکیں، نہ کوئی والئ ہوش

فیض کچھ پریشان نظر آ رہے تھے۔ کہنے لگے فون کرنے والا تھا ایک ضروری مشورہ کرنا ہے میرے ذہن میں بیسیوں خیالات گھوم گئے۔ کہنے لگے بھئی پروفیسر سے کیا پردہ۔ میں نے کہا آپ بلا تکلف فرمائیں ہم راولپنڈی کے بعد اسلام آباد سازش نہیں کریں گے۔ بولے بھئی ایک خاتون ہم پر عاشق ہو گئی ہیں کچھ پلے نہیں پڑتا کیا کروں۔ تم ڈاکٹر ہو، دوست ہو، بتاؤ کیا کروں۔

فیض کے چاہنے والوں کی تعداد بے حساب ہے جھگڑا یہ ہے کہ ان میں حسیناؤں کی تعداد زیادہ ہے یا مردوں کی۔ اگر اپنی روایات سے ہٹ کر نیری ریفرنڈم کرایا جائے تو میرے تخمینے میں خواتین مردوں سے بازی لے جائیں گی۔

اس بے سلسلہ پیر کے مریدوں اور مریدنیوں کی بیعت کا راز فیض کی شخصیت کی کشش، خلوص نیت دردِ دل، عاشقی میں اصولوں کی پابندی۔ ان کا فلسفہ زندگی۔ حُبِ وطن، محبت، مسلسل جدوجہد، پُر رونق اور درخشاں مستقبل، عوام کی سرخروئی اور بالادستی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ان کے مخالفین کی تعداد بھی کچھ کم نہیں یہ اس جدلیاتی کشمکش کا لازمی نتیجہ ہے جس کے ایک سرے پر سچائی، حق گوئی حق پرستی اور عوام کے پیامبر فیض ہیں۔ اور دوسرے سرے پر جھوٹ، فراڈ، باطل پرستی اور نظام زر کے محافظ ہیں۔

پنڈی کلب کے لان میں ایک خاموش شام تھی اور ہم تھے میں اور فیض۔ فیض کی خاموشی سے اکتا کر میں نے انہیں PROVOKE کرنے کے لئے سیاسی مسئلہ چھیڑا۔ وہ ہوں ہاں کرکے ٹال گئے۔ پوچھا صحت کیسی ہے! کہا اچھی ہے میں نے کہا سگریٹ کم کر دیں۔ کہنے لگے سب ڈاکٹر یہی کہتے ہیں۔ ایلس بھی یہی کہتی ہے اور چپ ہو گئے۔ فیض صاحب آپ نے کبھی محبت کی ہے؟ میں نے پوچھا۔ ہاں کی ہے اور کئی بار کی ہے۔ یہ کہہ کر پھر چپ ہو گئے اور مجھے ایلس پر ترس آنے لگا کہ ایسے گم سم آدمی کے ساتھ اس نے ۳۵ برس کیسے گزارے۔ SERIOUS LOVE؟ میں نے پوچھا۔ بولے ہاں ہاں تمہارا مطلب پہلی محبت سے ہے نا۔ محبت پہلی ہی ہوتی ہے۔ اس کے بعد سب کچھ ہیرا پھیری ہے اچھا شعر سن لو۔ پہلے سے شعر آ رہے تھے۔ یہ دفتری کام انسان کے بھیجے سے عقل غائب کر دیتا ہے اور فائل گھسیٹر دیتا ہے شعروں کے بعد ان کی پہلی محبت کا قصہ ہوا۔ میں نے پوچھا اس کا انجام؟ بولے بھئی وہی نا جو کچھ ہوا کرتا ہے اس کی شادی ہو گئی اور ہم نوکر ہو گئے۔

فیض صاحب کی علامہ اقبال سے دو ملاقاتیں ہوئیں ایک دفعہ اپنے والدِ محترم کا خط لے کر فیض علامہ اقبال سے ملے تھے دوسری مرتبہ علامہ مرحوم گورنمنٹ کالج کے مشاعرے کی صدارت کرنے آئے تھے۔ فیض نے بتایا کہ ان دنوں کالج میں دوسروں کا سکہ چل رہا تھا۔ ہم نے اپنی نظم پڑھی مشاعرے کے بعد علامہ اقبال مرحوم نے بلا کر ہمیں بہت شاباش دی۔ آپ کے خیال میں علامہ اقبال کا شاعری میں کیا مرتبہ ہے؟ بولے جہاں تک شاعری میں SENSIBILITY، زبان پر عبور اور

رفانیت کا تعلق ہے ہم تو ان کے خاک پا بھی نہیں۔ علامہ بہت بڑے شاعر ہیں۔ پھر کہنے لگے اگر لامہ سوشلزم کے معاملے میں ذرا سنجیدہ ہو جاتے تو ہمارا کہیں ٹھکانا نہ ہوتا۔ ان کی گفتگو سے میں یہ سمجھا ہوں کہ فیض شاعری کی روایت تسلیم کرتے ہیں۔ میں نے اپنی کم علمی کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا آپ نے غالب سے رنگ تغزل، اقبال سے غنائیت لی ہے اور دونوں میں اپنا سوشلزم مکس کر دیا ہے۔ فیض مسکرائے اور کہا بھئی اس سے کسے انکار ہے یہ فیض کی عظمت کی دلیل ہے اثر نوجوان شعراء مصر ہیں کہ انہوں نے کسی سے کچھ نہیں لیا۔ یہ حضرات غالباً احساس کمتری کے عمیق گڑھے میں پابجولاں پڑے ہیں۔ میر نے کہا تھا ؎

مجنوں اور فرہاد کی خاطر دشتِ جنوں میں ہم نہ گئے
عشق میں ہم کو میرؔ نہایت پاسِ عزت داراں ہے

فیض اپنی عظمت کو پہچانتے ہیں لیکن شاعری کے دشت میں انہیں پاسِ عزت داراں بھی ہے۔ غالب سے یاد آیا کہ ہم نے پوچھا کیا آپ اپنی شاعری کا محاسبہ غالب کی طرح کرتے ہیں۔ غالب نے بہت لکھا مگر دیوان مختصر سا۔ ہاں بھئی جو چیز اپنے معیار پر پوری نہیں اترتی اسے پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا کرتا تھا۔ ایک دن مرزا ظفرالحسن کو ردی کی ٹوکری کے پاس بیٹھا دیکھ کر یہ طریقہ بدلنا پڑا اور اب پرزے جلا دیتا ہوں۔ لہٰذا ان کا جتنا کلام ہم تک پہنچا ہے وہ خود احتسابی کی کٹھالی سے کندن بن کر آتا ہے

فیض کی زندگی میں کئی واقعات اور حادثات ہوئے جنہیں ان کی شخصیت میں بڑی اہمیت حاصل ہے کہنے لگے ایک مرتبہ ہم دہلی I.C.S کا امتحان دینے گئے پرچے عمدہ ہو رہے تھے۔ آخری پرچہ دینے نہیں گئے۔ کیوں نہیں گئے؟ بھئی یہ کسے معلوم۔ بس ایک بڑا سرکاری افسر بنتے بنتے بال بال بچ گئے۔ قریب بیٹھی ہوئی ایلس بولی "IT MUST BE A GIRL"۔

اس کے بعد استادوں نے فلسفہ میں ایم اے کرنے کا مشورہ دیا۔ داخلے کے لئے ۹۰/- روپے درکار تھے۔ وہ فیض کے پاس نہ تھے قریب سے عربی والوں نے آواز لگائی ادھر آجاؤ صرف ۹/- روپے لگیں گے۔ فیض ادھر چلے گئے۔ عربی میں ایم اے کر لیا۔ اس طرح انہوں نے قرآن، حدیث اور عربی

ادب پر مکمل عبور حاصل کر کے اس کے تاثرات اپنے اندر جذب کر لئے احباب جب فیض کا مرید محمد حسین عطا کے بیٹے کا نکاح پڑھاتے ہیں تو ظاہر ہے ٹھیک ہی پڑھاتے ہوں گے۔

پہلی محبت میں دونوں جہان ہارنے کے بعد فیض امرتسر ایم اے او کالج پہنچے۔ ان کی عجب کیفیت تھی۔ محبت کے میدان میں پہلے تجربے کا اہم ترین پہلو تحیر ہوتا ہے اسی تحیر کے عالم گو مگو، میں فیض امرتسر کے شہر میں "گواچ" گئے۔ غور فرمائیں فیض کبھی بیڈمنٹن کھیل رہے ہیں تو کبھی کرکٹ ٹیم کی تشکیل کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر رشید جہاں کی نگاہ دوررس نے اس تنہا لیکچرار کو بھانپ لیا۔ پوچھا معاملہ کیا ہے؟ کسی کام کاج میں تیرا جی نہیں لگتا۔ جب فیض نے تکلف کیا تو بلا تکلف بولیں۔ محبت میں ناکامی؟ اور فیض نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ڈاکٹر صاحبہ نے مشورہ دیا یہ حادثہ تمہاری ذاتِ واحد کا بہت بڑا حادثہ ہو سکتا ہے۔ مگر یا تنا بڑا نہیں کہ زندگی بے معنی ہو جائے انہوں نے فیض کو ایک کتاب مطالعہ کے لئے دی اور پھر ملنے کے لئے کہا۔ بقول فیض انہوں نے اس کتاب کو پڑھا اور ان پر چودہ طبق روشن ہو چکے تھے۔ یہ کتاب COMMUNIST MANIFESTO تھی۔ اور پھر فیض پکار اٹھا۔

ع۔ مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

نیا فیض جنم لے چکا تھا۔ اب فیض نئی منزلوں کا مسافر بن گیا اور پھر ؎

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے، تو سوئے دار چلے

فیض کلاس میں حاضری لے رہے تھے۔ پیچھے سے آواز آئی ذرا ایدھر وی ویکھو سرکار، اساں وی تیساں بھریاں ہوئیاں نیں۔ شرمیلے فیض نے جس کا دل پہلی محبت کی ناکامی سے فگار تھا اور جو مونس و غم خوار تلاش کر رہا تھا آنکھیں اٹھائیں اور کلاس کے بعد اس سے ملنے کو کہا۔ پھر دوستی ہو گئی۔ فیض بہت بڑے شاعر ہو گئے۔ کرنیل ہو گئے اور وہ بدمعاش ہو گیا۔ وقت کی بات ہے۔ راولپنڈی سازش کیس میں فیض جیل چلے گئے اور وہی بدمعاش وہاں موجود۔ فیض کو دیکھ حیران پریشان اوئے تسی ایتھے کی کرن آئے او سرکاراں۔ اسیں تے قاتل تے وارداتی۔ تسی کی واردات کیتی اے! فیض نے کہا کہ ہمیں کیا معلوم۔ پکڑ کر لے آئے ہیں۔ ہم چلے آئے۔ کہتے ہیں ہم نے کوئی سازش کی

ہے۔ بلکہ اس کر وے تیں میں اینہاں دیاں ساریاں چالاں جاندا آں۔ اسے اینہاں نیں خود سازش کیتی اے، تے تہاتوں اندر کر دِتا اے۔ میں اینہاں نوں سمجھ لواں گا۔ اوتے بیچے، اوئے کیہ ساہے الّو دے چپسر خیو۔ دیکھو اَج ساڈا استاد آیا اے۔ اج ساڈے گھر دو لتاں آئیاں نیں۔ جشن مناؤ۔ اَج دے دن نے ہتھ ملاؤ اَج دے دن۔ فیض جیل میں دو لہا بنے ہوئے تھے۔

یوں مرضی ہو کر فیض لاہور آئے اور فاشزم کے خلاف جدوجہد کے لئے فوج میں کرنیل ہو گئے۔ فیض احمد فیض اور کرنیل فیض درحقیقت ایک ہی شخصیت تھی۔ باوردی فیض فاشزم کے خلاف تلوار اور سنگین کی بجائے قلم سے جنگ کر رہے ہیں اور یہاں سے ۲۵۰۰/- روپے ماہانہ کی بجائے پاکستان ٹائمز کے ۱۰۰۰/- روپے اور کار کی جگہ سائیکل قبول کر لی کیونکہ اب وہ کرنیل کی وردی میں جنگ جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔

میری نظر میں فیض ایک منجھے ہوئے سکالر ہیں وہ ایک THEORETICIAN اور ACADEMICIAN کا درجہ رکھتے ہیں۔ صحیح نظریاتی سوشلسٹ ہوتے ہوئے وہ سچے پاکستانی ہیں۔ ان کا بناسپتی سوشلسٹوں سے بالکل سروکار نہیں۔ جو انہیں سیاست کے میدان میں کود جانے کا مشورہ دیتے رہتے ہیں تاکہ گلشن کا کاروبار چلے۔ چند من چلے یاروں نے تو MEMBER OF NATIONAL ASSEMBLY کا الیکشن تک لڑنے کے لئے زور لگایا۔ ستم ظریفی برحق مگر یہاں تو اس نے باقاعدہ پیشے کی شکل اختیار کر لی ہے۔

ہمیں سے اپنی نوا ہم کلام ہوتی رہی
یہ تیغ اپنے لہو میں نیام ہوتی رہی
مقابلِ صفِ اعدا جسے کیا آغاز
وہ جنگ اپنے ہی دل میں تمام ہوتی رہی
کوئی مسیحا نہ ایفائے عہد کو پہنچا
بہت تلاش پسِ قتلِ عام ہوتی رہی

لیکن اس دردناک اور بظاہر دلخراش صورتحال کے باوجود فیض شکست خوردہ نہیں

انہوں نے اندھیروں کی لپیٹ میں ایک روشن مستقبل کے لئے ہمیشہ نوید جد وجہد دی۔ فیض کسی زمانے میں ڈاکیوں کی یونین کے صدر بھی رہے ہیں۔ اور میرے ذہن میں دیہات کی پگڈنڈیوں پر اپنے تھکے ہوئے شل پاؤں گھسیٹتا ہوا چٹھی رساں ابھرا جو چلچلاتی دھوپ اور یخ کر دینے والی سردی میں گھر گھر چٹھیاں بانٹتا ہے۔ میں نے پوچھا۔ فیض صاحب سوشلزم کی چٹھی لانے والا ڈاکیہ کہاں ہے کب آئے گا؟ بولے بھئی کیا کہہ رہے ہو۔ انقلاب لفافے کی صورت نہیں آتا۔ اور یہی ہمارا المیہ ہے اور وہ جو بھئی ہم نے کہا ہے نا ؎

ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

بات کرتے ہوئے فیض اکثر اپنے ہاتھ کو ہوا میں یوں لہراتے ہیں جیسے کوئی معشوق بام پر آ کر اپنی زلفوں کو لہرا رہا ہو۔ معشوق کے ساتھ رہا ہو۔ ٹھیک فٹ بیٹھتا ہے یا نہیں ہو، اس کا جواب استاد فیض کے پاس ہی ہوگا۔

ایک دن فیض نے عالم سرور میں باتیں کرتے ہوئے جو اپنا ہاتھ اٹھایا اور لہرایا تو مجھے ان کی ایک انگلی پر زخم کا نشان نظر آیا۔ کافی دیر اس نشان کو غور سے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ خدا جانے فیض کی یہ انگلی کہاں اور کیسے زخمی ہوئی۔ مجھے کچھ یاد نہیں کہ وہ کیا باتیں کر رہے تھے۔ بولے ! ہاں بھئی کہاں ہو! ہم کہہ رہے ہیں ہم نے چین پر تین نظمیں لکھی ہیں، روس پر تو ایک بھی نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ قرب وجوار میں مسٹر جکیا کہیں نہ تھا ورنہ وہ فیض سے روس پر ضرور چند نظمیں لکھوا لیتا یہ راز، روسیوں پر ابھی آشکارا نہیں ہوا۔ میں نے سنی اَن سنی کر کے کہا، فیض صاحب آپ کی انگلی کو کیا ہوا؟ بولے بھئی کون سی انگلی کو؟ اچھا یہ! ان کی نظریں میرے سر کے اوپر گذرتی ہوئی فضا کی پہنائیوں میں کھو گئیں۔ مسکرائے اور بولے بھئی ہم نے بھی ایک ADVENTURE کیا تھا۔ اس کے بعد توبہ کر لی۔ ہوا یوں کہ میں اپنے بڑے بھائی حاجی طفیل احمد کے ساتھ پہلی مرتبہ ایک امیر لڑکے کی حیثیت سے گاؤں گیا۔ طفیل بھائی عام طور پر حاجی کہلاتے تھے کیونکہ والد صاحب بچپن

میں ان کو اپنے سامنے برخ پر سے گئے تھے۔ بھتی ہم تو خان صاحب ادر سے بچے تھے مگر رشتہ دار تو غریب ہی تھے۔ گاؤں میں سبھی خان بہادر تھوڑا ہی ہوتے ہیں ہماری عجب شان تھی سب ہمیں اپنی محبت اور ایثار کا نذرانہ پیش کر رہے تھے۔ عورتیں خاص طور پر یہ بھی انوکھا تجربہ ہے۔ ہم کہ رئیس زادے ٹھہرے عیش و عشرت، ناز و نعم میں پلے ہوئے رشتہ دار فاقہ مست، تنگ و تاریک، بے نام و نمود مکانوں کے مکیں جن کے پاس تہبند اور جھگے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ برہنہ پا اور سر پہ بوسیدہ، گلی سڑی پھٹی ہوئی پگڑی یا تار تار دوپٹہ جن کے جسموں سے ORIGINAL بُو آ رہی ہو۔ جنہوں نے لکس کا نام تک نہ سنا ہو جو چولھے کی راکھ سے نہ صرف ہانڈیاں اور برتن صاف کرتے ہوں بلکہ اکثر اپنے ہاتھ بھی صاف کرتے ہوں جو SURF - VIM کے نام سے نا آشنا ہوں۔ یہ لوگ امڈے چلے آئے ہوئے۔ ڈرتے ڈرتے ہمارے قریب آ رہے ہیں۔ اپنے دونوں ہاتھ جو محنت سے کھردرے ہو چکے تھے۔ ہماری کنپٹیوں پر رکھ کر ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال رہے ہیں۔ ہمارے ہم عمر لڑکے اور لڑکیاں، زرد پیلے، میلے کچیلے کپڑوں میں لپٹے۔ پاؤں سے ننگے۔ دور سے ہم کو گھورتے تھے اور آپس میں ہنستے تھے، نہ جانے کیا کہتے تھے۔ کس بات پہ ہنستے تھے ہم حیران اور ان کی جھجک اور خوف یکایک فرطِ مسرت میں ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بن گیا۔ ایک عورت نے ایسے ہی عالمِ کیف اور فرطِ محبت میں اتنے زور سے منہ چوما کہ اس کی آواز دور تک سنائی دی اور ہمیں بھی معلوم ہوا کہ کسی نے چوما ہے کسی نے کہا فیض یہ ہماری پھوپھی ہے۔ ہم تو اس انوکھے تجربے سے بالکل بے ہوش ہو گئے۔ پہلی دفعہ زندگی میں احساس ہوا کہ بادشاہ لوگ کیوں بادشاہ ہوتے ہیں اور بادشاہ لوگ ان سادہ لوح غریب، محبت پیار کے پتلے۔ انسانوں کو بالآخر کیوں عوام بنا دیتے ہیں مجھے اس کم عمر ہی میں احساس ہوا کہ شہزادہ اور شہزادی بننا کتنا آسان ہے بس کسی بادشاہ کے نطفے کی ضرورت ہے مگر یہ محبت اور ایثار کے پتلے بننے کے لئے کتنی محنت و کاوش اور قربانی درکار ہے مجھے اپنے باپ کی خان بہادری حقیر محسوس ہونے لگی اور اس سے الجھن پیدا ہونا شروع ہو گئی مجھے عوام اچھے لگنے لگے۔ میں نے کہا فیض صاحب آپ تو بہہ گئے۔ میں نے تو ان کی انگلی کا تذکرہ کیا تھا۔ کہنے لگے سبھی

ناتا ہوں اس بارے میں۔ بس گاؤں میں ہماری پھوپھیوں بی بی عنبرہ نے ہمیں گھیر لیا۔ آپیں بھی وہ بہت اچھی لگیں۔ عورتیں ہر شکل میں ہمیں ہمیشہ اچھی لگتی ہیں۔ عورت بڑی اعلیٰ شے ہے۔ تو گاؤں میں ہم نے پہلی دفعہ چکی دیکھی۔ عجب چیز تھی یہ چکی۔ جس میں باجرے اور گندم کے دانے پیسے جاتے ہیں اور وہ بھی عورت کے ہاتھوں کی قوت سے۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ ہم دونوں بھائی کس قدر انگشت بدنداں تھے اس عمل سے۔ آج یوں سمجھ لو جیسے کوئی ATOM کو SPLIT ہوتے دیکھ لے۔

ایک رات ہم دونوں نے طے کیا کہ ہم چکی چلائیں گے۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ دانے کہاں ڈالتے ہیں۔ بس میں نے ہاتھ میں لئے اور بڑے بھائی نے چکی کا بالائی پڑا اٹھایا۔ میں نے ڈالنے سے پیشتر اس کے کہ ہاتھ ہٹاتا بھائی کے ہاتھ سے پڑ چھوٹ گیا اور ہماری انگلی تہ و بالا ہو گئی CRUSH ہو گئی۔ اور چکی کے پڑوں سے آٹے کی بجائے میرا خون رواں تھا۔ بھائی ڈر گئے ہمیں بھی ڈرایا اور میٹنگ کر کے متفقہ فیصلہ کیا کہ اس خبر کسی کو نہ ہو۔ خاص طور پر خان بہادر کو۔ یہ ابتدا تھی خان بہادر کے خوف کی، میٹنگ کرنے کی اور اجتماعی فیصلے کرنے کی۔ میں نے سوچا فیض کا یہ فیصلہ غلط تھا۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ اجتماعی فیصلے اگر غلط ہوں تو فیض کا پھر رد عمل کیا ہوتا ہے۔ فیض بولے ہم دونوں چپ چاپ اپنے بستر میں چلے گئے۔ میرا خیال ہے کہ بھائی تو صبح کیا ہوگا، کا حساب کتاب کرتے ہوئے۔ اسکیمیں بناتے ہوئے سو گئے۔ میں تو کوئی اسکیم نہ سوچ سکا نہ بنا سکا۔ انگلی کے زخم کا درد شدید تھا اور سارے جسم میں پھیل چکا تھا۔ ساری رات بے خوابی میں گذاری، صبح دم اٹھے تو دیکھا کہ وہ صاف سفید چادر جو ہماری چاچی نے بچھائی تھی۔ خون سے لت پت تھی۔ ساری رات انگلی کے اس زخم سے خون بہتا رہا اور میں درد کو بغیر سی کئے سہتا رہا۔ محبت کرنے والی چاچیاں اور پھوپھیاں جب مجھے جگانے آئیں تو میں جاگ رہا تھا۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔ خون سے آلودہ چادر دیکھ کر ان کو فکر ہوئی کہ ماجرا کیا ہے ہم پکڑے گئے پوچھا کیا ہوا۔ ہم نے من و عن سچ بول دیا۔

میں فیض کے معصومانہ چہرے کا عجیب اضطراب اور سوالیہ انداز میں معائنہ کر رہا تھا۔ میں ڈاکٹر ہوں میرا پیشہ لوگوں کی باتیں سننا اور ان کا معائنہ کر کے نتیجہ نکالنا ہے۔ فیض چپ ہو گئے سگریٹ کے کش لے رہے تھے۔ دوسری طرف زیبا، محمد علی اور دوسرے لوگ نیرہ نور کے نغموں سے محظوظ ہو رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ اس واقعہ کے دور رس اثرات اور نتائج پیدا ہوئے اول

اس لسنی میں فیض نے اپنے اندر قوت برداشت پیدا کرلی اور درد کو دل میں سمیٹ لینے کی بے پایاں قوت سے سرشار ہوگیا۔ دوسرے سچ بولنے کی مشکل ترین فعل کی لذتِ ناآشنا سے ہمکنار ہوگیا۔ پوچھا جب آپ کا معاہدہ تھا کہ سچ نہیں بتانا تو پھر آپ نے اس سے راہ فرار کیوں اختیار کی۔ کہنے لگے ہمیں بھی کیا معلوم بس ہم سے جھوٹ نہیں بولا گیا۔ میں نے کہا فیض صاحب اس عمر میں آپ نے گلیلیو اور سقراط کا نام سنا تھا۔ بولے بھئی سقراط کی بات تو ہماری سمجھ میں آ گئی تھی، لیکن یہ گلیلیو کیوں مان گیا یہ بات اپنی سمجھ سے باہر تھی۔ بس اس وقت ہم سے جھوٹ نہ بولا گیا۔

فیض کی زندگی انہیں دو عناصر سے مرتب ہوئی۔ سچ بولنا اور درد کو اپنے اتھاہ دل میں سمیٹ لینا۔ ساری زندگی یہ شخص سچ بولتا رہا ہے اور ہر درد کو نہایت آسانی اور نفاست سے اپنے دل میں سموتا رہا ہے۔ سوچتا ہوں کہ اس کا دل ہے یا دریا۔

مولوی عبدالحق

شمیمؔ احمدؔ

انجمن ترقی اردو کے عقبی احاطے میں ایک قبر ہے جو برصغیر کی تاریخ کے لئے ایک ایسی امانت ہے جسے واپس لینے کی توفیق رہتی دنیا تک اب کسی کو نہیں ہوگی۔ یہ قبر ایک چیلنج ہے۔ ان ارواح کے وارثوں کے لئے جنہوں نے اپنی تمام مذہبی مغائرت، نسلی افتراق، تہذیب و تمدن کے اختلاف، سیاسی مفادات معاشی تحفظات، وقتی مصالح اور روحانی مخاصمتوں کے باوجود انسانیت کے سبب سے فطری اور سب سے قیمتی جذبے کا اظہار، غیر شعوری طور پر ایک دوسرے کو قبول کرکے کیا تھا۔ جس کا نتیجہ ہمیشہ اتحاد، یگانگت خلوص اور محبت کی شکل میں نکلتا ہے۔ جو انسان کو ہزاروں رنگوں اور بے رنگیوں کے باوجود "آدمیت" کے رشتے میں پروتا ہے۔ اور یہ غیر شعوری ارتباط و اظہارِ آدمیت "زبان" ہے۔ جس میں اَن گنت اَن دیکھے اور نامعلوم دل ایک ساتھ ایک تال و سم، ایک آہنگ میں دھڑکنے لگتے ہیں۔ الفاظ دل ہی تو ہیں جس میں جب انجان جسموں اور پیکروں کی خواہشات، امنگیں، آرزوئیں اور خواب مرئی شکل میں ڈھلتے ہیں تو یہ پتہ بھی نہیں چلتا کہ وہ کب ایک دوسرے کے ہو چکے ہیں۔ اور جو ہاتھ نہ آئیں تو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ کون کس کے لئے مٹ گیا۔ آدمیت کی سب سے پہلی شرط اور پہچان یہی تو ہے کہ وہ اظہار میں آتی ہے۔ سرِ آدم خدا جانے صوفیا، علماء، فلسفیوں اور سائنس دانوں کے لئے کیا ہو۔ میری سنئے تو سرِ آدم "لفظ" ہے جس سے وہ اظہار تک آتا ہے۔ اور اگر نہ آئے تو حادثۂ کون و مکاں ہوتا ہے۔ لیکن "لفظ" کو کبھی کسی نے دین و ایمان نہیں بنایا۔ سوائے اس شخص کے جو انجمن ترقی اردو کے عقبی احاطے میں محوِ خواب ہے۔ مولوی عبدالحق جنہیں بابائے اردو کہنا میرے لئے خوش آئند بات نہیں کیونکہ پوری معلوم انسانی تاریخ میں ایک مثال ایسی

۱؎ بے مولوی صاحب "جنونی" لکھ کر بہت خوش ہوتے

نہیں ملتی جس نے اپنی زندگی کے کم وبیش ساٹھ سال یعنی ایک پوری زندگی "لفظ" کے لئے وقف کر دی ہو۔ اور وہی اس کا دین ہو، وہی اس کا قانون ،اصول اور یہی نہیں بلکہ پوری زندگی ہو۔ لفظ کثرت یعنی زبان کی وحدت ہے اور سب سے بڑا موحد وہی ہوتا ہے جو اس کے لئے سب کچھ قربان کر دے۔

مولوی عبدالحق برصغیر کے سب سے بڑے موحد تھے۔ مسلمان ہوں یا نہ ہوں مگر انہوں نے اپنے لئے جو خدا چنا تھا اس کا انوکھا ہونا یقیناً ثابت ہے۔ مولوی صاحب کی اس انفرادی اور امتیازی شان کے بعد ان کے وہ کارنامے جو ان سے بعض اوقات جائز طور پر اور بعض اوقات ناجائز طور پر منسوخ کر دیئے جاتے ہیں بہت حقیر نظر آتے ہیں۔ ہمیں اپنی آلائشوں، خود پسندی، مفاد پرستی اور مکر و فریب کو بڑے آدمیوں سے دور رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ "بڑائی" چھوٹی نہیں ہوتی۔ وہ ہماری خود غرضی اور ناپاک مصلحتوں کی اعانت کے باوجود "بڑائی" رہے گی۔ اور تمام سازشوں، خباثت اور مخالفت کے باوجود چھوٹی نہیں ہوگی۔ اس لئے ہمیں اگر واقعی اگر کسی کی عظمت ملجاتی ہے تو پھر ہمیں اس کے بارے میں سچ بولنا چاہئے۔ کیونکہ وہ ہمارے جھوٹ کی سزاوار نہیں ہو سکتی۔

مولوی عبدالحق کا شمار ان عظیم شخصیتوں میں ہو سکتا ہے جن میں کئی صلاحیتیں بیک وقت دست وگریباں رہتی ہیں۔ ان میں سے شاذ ہی ایسی ہوتی ہیں جو ہر صلاحیت میں یگانۂ روزگار ہوتی ہیں۔ لیکن بیشتر ایسی ہوتی ہیں جو پھیلنا تو کئی اطراف چاہتی ہیں مگر ان کی مرکزی قوت کا اظہار کسی ایک ہی سمت ہوتا ہے۔ مثلاً سرسید احمد خاں ایک جامع الکمالات شخصیت تھے۔ وہ بیک وقت مدبّر، مصلح، ماہر تعلیم، ادیب، مورخ، منتظم کار اور ماہر قانون تھے۔ لیکن ان کی مرکزی قوت تعلیم پر صرف ہوئی اور باقی حیثیتیں ثانوی ہو گئیں۔ جب کہ سرسید احمد خاں کی عظمت میں ان تمام حیثیتوں کا حصّہ برابر کا تھا۔ اس بات کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ سرسید کا عہد ہند مسلم تہذیب کا ایک زریں عہد تھا۔ اور اس عہد میں عظیم دل و دماغ کی ایک فصل تیار ہوئی تھی۔ جس میں محمد حسین آزاد، مولوی نذیر احمد، اکبر الٰہ آبادی، مولانا شبلی اور مولانا حالی جیسے ادیب و شاعر مولوی ذکا اللہ اور مولوی چراغ علی جیسے نثّار اور امیر علی جیسے مورخ پیدا ہوئے تھے۔ جس کے ایک سرے پر غالب اور دوسرے پر اقبال جیسے شاعر پیدا ہوئے تھے جنہوں نے نابغوں کے اس عہد کی حد بندی کر کے اس زمانے کو ہماری ذہنی تاریخ کا ایک سوالیہ نشان بنا دیا ہے۔ اسی عہد میں مولوی عبدالحق بھی پیدا ہوتے ہیں۔ زمانی اعتبار سے مولوی صاحب

اشمار سرسید کا دوسری پیڑھی میں ہوتا ہے۔ وہ پیڑھی جس میں مولانا سلیمان ندوی، محمود شیرانی۔ ابوالکلام آزاد
لانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں۔ مولانا حبیب الرحمان خاں شیروانی۔ عماد الملک اور مولانا محمد علی
ہر جیسے مشاہیر کا شمار ہوتا ہے۔ ان میں سے بیشتر ایک سے زیادہ حیثیت کے حامل تھے اور ان سب
تعلق کسی نہ کسی طرح علم و ادب سے تھا۔ مگر ان سب کی صلاحیتیں سرسید کے عہد کے سامنے ثانوی حیثیت
ی ہیں۔ سوائے مولانا محمد علی جوہر اور ابوالکلام آزاد کے جنہوں نے خالص سیاست کو اختیار کر لیا تھا۔ اور
س میں ممتاز ترین مقامات حاصل کر لئے تھے۔ سوال یہ ہے کہ ان سب کو اردو ادب میں وہ جگہ کیوں
یں حاصل ہو سکی جو محمد حسین آزاد۔ مولانا حالی اور مولانا شبلی کو حاصل ہے۔ جبکہ ان حضرات سے
قع بجا طور پر کی جا رہی تھی کہ وہ اس روایت کو بہتر سے بہتر معیار تک لے جائیں گے۔ اس کا مقصد
ہیں ہے کہ انہیں لازمی طور پر ان سے بہتر صلاحیتوں کا حامل ہونا چاہیئے تھا۔ مگر جن خیالات
روشناس ہو کر سرسید اور ان کے عہد کی شخصیات نے ایک نشاۃ الثانیہ کی بنیاد رکھی۔ ان ہی
ات سے زیادہ آگہی کی بنیاد پر ان کے جانشینوں سے اعلیٰ کارناموں کی توقع بجا طور پر کی جاتی تھی۔
یہ کیسی عجیب بات ہے کہ دورِ ثانی میں شعراء کو چھوڑ کر کسی شخص نے ایک ایسی کتاب نہیں چھوڑی جسے اس
نقل کارنامہ کہا جا سکے اور اگر کسی نے کوئی کتاب لکھی ہے تو ایسی نہیں کہ اس کو اردو کا عہد آفریں کارنامہ قرار
ا سکے۔ ان کی پوری زندگی کا حاصل چند مضامین ہیں۔ جن کی وقعت سے ہرگز انکار نہیں مگر کیا وہ آزاد،
ل۔ حالی اور نذیر احمد کی مستقل تصانیف کا نعم البدل قرار دیئے جا سکتے ہیں؟ اسی طرح انہوں نے اس
ری شعور کا اظہار بھی کہیں نہیں کیا۔ جس کا تقاضا آزاد، شبلی اور حالی کے مقابلے پر ان حضرات
ا طور پر تھا۔ ان سے پچھلا دور تنقیدی، تاریخی اور علمی ہوتے ہوئے بھی بنیادی طور پر تخلیقی دور تھا۔ اور
ادب کے مذاق کو نہ صرف عام کرتا تھا۔ بلکہ تخلیقی طور پر بھی اثر انداز ہوتا تھا۔ جس کو پیشِ نظر
ئے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ شعر و ادب کا تخلیقی مذاق اس دورِ ثانی میں نہ ہونے کے برابر تھا۔
ل کے لکھنے والوں میں تنقیدی صلاحیت قدرِ اول کی نہیں تھی۔ شاید اسی لئے یہ دور بنیادی طور پر
ی دور تھا۔ تحقیقی دور کوئی بے بضاعت دور نہیں ہوتا بلکہ بنیادی طور پر علمی دور ہوتا ہے۔ جس سے علم و ادب
ماصل کرتے ہیں لیکن ہمیں بڑی مایوسی اس وقت ہوتی ہے جب اس دور میں ہمیں کوئی مستقل تحقیقی کارنامے
ہیں ملتے۔ انفرادی طور پر بڑی سعی و کاوش نظر آنے کے باوجود اس کا نتیجہ عہد ساز تحقیقی کارناموں کا

نہیں ہے۔ اس دور میں یقیناً مذاقِ علمی کو بہت سہارا ملا۔ مگر ایک تو خود تحقیق نئے سراغوں کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ دوسرے ایک بہت ہی اعلیٰ پایہ کا تنقیدی شعور موجود نہ ہو تو پھر اس کی حیثیت کچھ انکشافات سے آگے نہیں بڑھتی جس کی تردید و تائید تحقیق کا ایک عمومی عمل ہے۔ جہاں تک صحیح مذاقِ تحقیق کا سوال ہے وہ بھی کوئی سہل الحصول نسخہ نہیں ہے۔ بعض طبائع علمی نکتہ رسی اور دقیقہ سنجی کے لئے ہی پیدا ہوتے ہیں اس اعتبار سے حافظ شیرانی اور کسی حد تک پنڈت دتاتریہ کیفی کو چھوڑ کر ہمیں اس دور کے بیشتر محقق صرف انکشافات کرتے نظر آتے ہیں۔ بعض لوگوں نے اس دور کو عبوری دور بھی کہا ہے۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ جن چیزوں سے ناقص واقفیت نے نشاۃ الثانیہ کے دورِ اول کو ناقابلِ فراموش دور بنا دیا ہے۔ اس سے دورِ ثانی میں زیادہ واقفیت اور زیادہ صحیح واقفیت کے باوجود نتیجہ کیوں نہیں برآمد ہو سکا جس کی توقع فطری طور پر کی گئی تھی۔ اس اعتبار سے غور کیجئے تو ایک سیدھی سادی بات تو صلاحیت کے سامنے آتی ہے اور چھان پھٹک کر کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعری ادب اور دیگر فنونِ لطیفہ سے وہ صحیح اور فطری رشتہ اور ربط ان لوگوں میں نہیں تھا۔ جو پہلے دور کی بنیادی صفت تھی۔ اس میں تخلیقی صلاحیت کا بھی ایک سوال ابھرتا ہے۔ جس سے دُورِ ثانی کے بڑے نام دور کا واسطہ رکھتے تھے۔

اب اس پس منظر اور حقیقی پہلوؤں کے پیشِ نظر مولوی عبد الحق کی شخصیت پر غور کیا جائے تو ہمیں دو ایک ایسی باتوں کا سراغ ملتا ہے۔ جس سے آشنا ہوئے بغیر ہم اس دور کے مزاج کا پتہ نہیں چلا سکتے۔ یہ صحیح ہے کہ مولوی صاحب نے تقریباً ستر سال علم و ادب سے براہِ راست تعلق رکھنے کے باوجود ایک بھی ایسی مستقل کتاب نہیں چھوڑی ہے جو ادب میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رکھ سکے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انہوں نے شعر اور شاعری پر کوئی ایسی تحریر نہیں چھوڑی جسے ان کے ادبی و شعری نظریات کا حامل قرار دیا جا سکے یا ان کے ایسے مقدموں اور تبصروں میں جو شعرا پر لکھے گئے ہیں ان سے شعری مذاق یا اس کے افہام و تفہیم کا اتنا اندازہ بھی نہیں ہوتا جتنا یادگارِ غالب سے ہوتا ہے۔ اور یہ بھی خیال کوئی زیادہ غلط نہیں ہے کہ انہوں نے زیادہ تر مقدموں میں جس تحقیقی زاویۂ نظر کو پیش کیا ہے وہ اپنی ساری افادیت کے باوجود ایسے ہیں جن میں سے اکثر کی تردید ہو چکی ہے۔ یا ایسے انکشافات پر مبنی ہیں جس کی چھان پھٹک جتنی چاہئے تھی نہیں کی گئی یا ان کی بعض جگہ تکرار کی گئی ہے۔ لیکن یہ اعتراض کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ مولوی صاحب کا اصل تحقیقی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو کی عمر کئی سو سال بڑھا دی۔ خواہ یہ اتفاق ہو مگر مولوی صاحب اگر اردو کو اپنا دین و

ایمان نہ بنا لیتے تو یہ کارنامہ پتہ نہیں اور کتنے عرصہ تک پردۂ خفا میں رہتا۔ مولوی صاحب کا دور بعض اعتبارات سے انتخاب کا دور تھا اس کا سب سے گہرا سراغ مولوی صاحب کی تحریریں اور ان کی شخصیت دیتی ہے۔ دراصل سرسید احمد خاں کے دور میں عمل اور ردّ عمل کی اتنی گہری اور بنیادی تحریکیں ملتی ہیں جنہوں نے اس کے دور کو بہت بڑے "امکانات" کا دور بنا دیا تھا۔ ایسے "امکانات" جن پر برصغیر کی آئندہ تاریخ کا دارومدار تھا، خصوصیت سے سرسید کے جس بنیادی کارنامے کو نظر انداز کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک ناامید اور پژمردہ قوم میں عمل کی روح پھونک دی تھی اور عمل کی طرف یہ دعوت صرف ان کی وعظ و تلقین کا نتیجہ نہیں تھی۔ بلکہ انہوں نے اپنے خیالات اور عمل سے برصغیر کے مسلمانوں کے افکار، خیالات اور ذہنی رویوں پر اتنے غیر متوقع کاری اور بعض اوقات غیر متوازن وار کئے کہ ان کے خلاف ایک موثر ترین تحریک پیدا ہو گئی۔ اور اسی تحریک نے قومی اور معاشرتی سطح پر ایک ہلچل پیدا کر دی۔ سرسید احمد خاں جو کہتے تھے۔ اس پر عمل کرتے تھے۔ ردّ عمل میں بھی لازمی ٹھہرا کہ سرسید احمد خاں کی عملی تردید کی جائے جس کا نتیجہ شاندار اور موثر برآمد ہوا کہ اس دور کی تمام موافق اور مخالف تحریکوں نے مثبت عمل اور مثبت طریقۂ کار اختیار کئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی۔ ندوۃ العلماء، جامعہ ملیہ، دارالعلوم دیوبند جامعۂ عثمانیہ۔ دائرۃ المعارف۔ انجمن ترقی اردو اور لاتعداد اسکولوں کے قیام اور ان کے تمام افادی کارناموں میں ان کے متضاد نظریوں کے باوجود اس عہد کی یہی روح کام کر رہی تھی۔ یہی وہ اصل نکتہ ہے جس نے برصغیر کے مسلمانوں کو بیدار کرنے اور ان میں عملی قوتیں پیدا کرنے میں سب سے زیادہ نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اور اسی روح نے سرسید کے بعد آنے والے دور میں ہر شخص کے سامنے ایک "انتخابی" امکان کی راہ کھول دی۔ ہر شخص کچھ نہ کچھ کر کے دکھانا چاہتا تھا۔ اپنی صلاحیتوں کا عملی ثبوت دینا چاہتا تھا۔ اس دور کے مزاج میں یہ بات ایک ابدی صداقت کی طرح موجزن تھی کہ آدمی وہ ہے جو کچھ کام کر کے دکھائے۔ کام ہی سے اس کا نام باقی رہے گا۔ اس لئے اس دور کا ہر شخص سراپا عمل ہے۔ اور اپنے عمل کے لئے اس نے زندگی کے وسیع تر شعبوں اور وسیع تر قومی خدمات میں کسی خاص راہ اور شعبہ کو انتخاب کر کے اپنی زندگی اس کے لئے وقف کر دی۔ اسی لئے اس دور میں سیاست، تعلیم، مذہب، معاشرت، ادب اور فنونِ لطیفہ ہر شعبے میں بہت بڑے کارکن پیدا ہوئے۔ اور یہی وہ دور ہے جس میں نیا ہندوستان انگڑائی لے کر بیدار ہوا اور زندگی کے تمام شعبوں میں سیلابی کیفیت سے آگے بڑھا۔ مولوی صاحب کی تحریروں کا مطالعہ اگر کیا جائے تو ان کے دور کے اس خاص مزاج کا اندازہ ان کے چند خاص موضوعات اور فقروں سے ہوتا ہے جنہیں انہوں نے بار بار استعمال کیا ہے۔ وہ

اکثر اس بات کو ایک کلیہ کی طرح بیان کرتے ہیں کہ "کاہلی انسان کی فطرت ہے یا انسان فطری طور پر کاہل الطبع واقع ہوا ہے۔ اور اس کے بعد وہ ہر جگہ عمل کی دعوت دیتے ہیں۔ اس لئے مولوی صاحب کو سمجھنے کے لئے اس دور کے اس عام رجحان اور مزاج کو نظر انداز کر کے ہم اس کی روح تک نہیں پہنچ سکتے۔ اور مولوی صاحب تو براہ راست اس تحریک کا نتیجہ تھے جس کو سر سید اور حالی کا اثر کہا جاتا ہے۔ مولوی صاحب کے لئے بھی سب سے پہلے انتخاب کا سوال تھا کہ وہ کس میدان میں اپنی صلاحیتوں کا ثبوت پیش کر سکتے ہیں اور یہ ان کی انفرادیت کا عجیب پہلو ہے کہ انہوں نے کوئی لگا بندھا عام اختیار نہیں کی بلکہ اپنے لئے وہ منزل وہ مقصد اور (goal) کا انتخاب کیا جو اس سے پہلے دنیا کی کسی قوم میں کسی فرد نے انتخاب نہیں کیا تھا۔ انہوں نے ایک زبان کی حفاظت، اس کی اشاعت، اس کی ترویج اور اس کی لسانی اور ادبی خدمات کو علمی وقار ہی نہیں دیا بلکہ اس بات کا بیڑا اٹھایا کہ اس زبان کو عملی طور پر اس طرح فتح یاب کرایا جائے جس طرح قومیں آزادی حاصل کرتی ہیں اور فتوحات انجام دیتی ہیں۔ ان کے لئے صرف ادیب ہونا، محقق ہونا یا تنقید نگار بننا ایک چھوٹی بات تھی۔ انہوں نے اردو کی جنگ مذہبی جنگ کی طرح لڑی ہے۔ آپ اگر ان کے مزاج کے اس پہلو سے آشنا نہیں ہیں تو ان پر اس اعتراض کو من و عن قبول کر لیں گے جو بعض اعتبارات سے صحیح اور قابل غور ہے کہ مولوی صاحب نے اردو کو سیاسی مسئلہ بنا کر اسے نقصان پہنچایا ہے۔ یقیناً ایک نقطۂ نظر سے مولوی صاحب کے اس رویے نے خالص اردو کے نقطۂ نظر سے اسے نقصان بھی پہنچایا ہے جس کا نتیجہ ہندوستان میں اردو سے شدید منافرت کی صورت میں یوں نمودار ہوا کہ اردو وہ زبان ہے جسے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے بہت زور شور سے پیش کیا گیا اور تحریک پاکستان کے تحت سب سے موثر نکات میں شامل رہی ہے۔ پاکستان میں یہ عمل بنگلہ تحریک کی صورت میں نمودار ہوا جس کا نتیجہ دو قومی زبانوں کی صورت میں نکلا۔ یہ اعتراض کرنے والوں کی مراد یہ ہے کہ اردو کو بجائے حکومت اور لیڈروں کے تعاون سے رائج کرنے کی تجاویز کی جگہ اگر صرف انجمن ترقی اردو کے پلیٹ فارم سے یگانگت، محبت اور التجا کی صورت میں پیش کیا جاتا اور جگہ جگہ اردو پڑھانے کی رضاکارانہ خدمات کو بھی نظر میں رکھا جاتا تو شاید یہ نتیجہ برآمد نہ ہوتا۔ مگر یہ اعتراض کرنے والے اس شخص کے ساتھ بہت ہی زیادتی کرتے ہیں جس نے اپنی زندگی کا اعلیٰ اور واحد مقصد اردو کو عملی طور پر رائج کرانا قرار دیا ہو اور اسے اپنا دین و مذہب اور مسلک بنا لیا ہو۔ مولوی صاحب اردو کے پیغمبر ہیں اور اردو کے خلاف ذرا سی تحریک یا گریز کو فطری طور پر برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ان کے لئے کفر اور ارتداد کے برابر تھا۔ مولوی صاحب میں وہ ساری خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ایک تنقید نگار کیلئے

بنیادی صفات ہوتی ہیں۔ وہ بہت کھرے بلکہ کھرتل صاف گو، جری تھے اور بے لاگ رائے دیتے۔ میں کبھی بخل نہیں کرتے مگر ان کی یہ صفات اس سے بلند تر مقصد کے لئے استعمال ہوئی ہیں۔ انہوں نے کبھی اردو کے مخالف کو نہیں بخشا اور اپنی ان صلاحیتوں کا بے محابا استعمال کیا ہے۔

اگر مجموعی طور پر مولوی صاحب کی شخصیت کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں بے اختیار سرسید یاد آجاتے ہیں وہ بھی بحیثیت ادیب مورخ اور بحیثیت مفکر کسی مستقل حیثیت کے مالک نہیں ہیں۔ یہ ساری حیثیتیں ان کے یہاں ثانوی ہیں۔ اسی طرح مولوی صاحب کی بھی ساری صلاحیتیں ثانوی ہو جاتی ہیں اور صرف اردو ہی ان کے قالب کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس اعتبار سے وہ سرسید ثانی نظر آتے ہیں مولوی صاحب سے زیادہ سرسید سے مشابہ کوئی اور شخص اس پوری تحریک میں نظر نہیں آتا بحیثیت ایک ادیب مولوی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی نثر ہے۔ یہ وہ نثر ہے جس کے خواب سرسید اور حالی نے دیکھے تھے۔ اگر سرسید اور حالی کی نثر کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں بے اختیار اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کی نثر ان کی نثر کی تکمیل کرتی ہے جس مزاج اور اسلوب کو سرسید اور حالی نے الگ الگ اختیار کیا تھا مولوی عبدالحق نے اسکو یکجا کر دیا مگر یہ کوئی اختیار کردہ چیز نہیں ہے مولوی صاحب نے سرسید اور حالی کو اپنی ذات میں اتنا جذب کر لیا تھا کہ اس سے مولوی صاحب کے مزاج کی تشکیل ہو گئی تھی اور مولوی صاحب کا اسلوب اسی تشکیل کا اظہار ہے جسکو شعوری طور پر اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے سادہ نثر کو اپنے لئے اصول بنا لینا غیر فطری بات ہے۔ اسلوب شخصیت سے ملکر بنتا ہے اور یہی اسالیب بڑے ادب کی عظمت میں اضافہ کرتے ہیں لیکن اسکو نمونہ بنا لینا یقیناً نقل کے مترادف ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جدید اردو نثر سرسید اور حالی سے زیادہ شبلی کے قریب ہے۔

مولوی صاحب کی عظمت کا اعتراف کرنے کے لئے عموماً ادبیات کے جو زریں اصول دہرائے جاتے ہیں یعنی انہوں نے سب سے پہلے کن کن چیزوں کی بنیاد ڈالی۔ تنقید کو آگے بڑھایا۔ تحقیق کو علمی وقار دیا۔ شعرا کو دریافت کیا۔ کتابیں شائع کیں۔ نایاب نسخے تلاش کئے۔ یہ سب صحیح مگر مولوی صاحب کی ان ادبیات کے باوجود انکی ان خدمات کے پاسنگ بھی نہیں ہے جو انہوں نے اردو کے لئے انجام دی ہیں مولوی عبدالحق کی شخصیت کا مظہر جامعہ عثمانیہ، انجمن ترقی اردو، اردو کالج اور رسالہ اردو ہے جو صرف اس بات کا ثبوت ہیں کہ ایک شخص کی محبت اس کا خلوص اس کا ایمان کیا کیا کچھ کر کے دکھا سکتا ہے۔

مولوی صاحب اس کامل الطبع انسان کی دنیا میں ایک عملی صداقت کا اظہار تھے اور یہ صداقت اردو تھی جسے ہم نے زمانے کے سپرد کر دیا ہے۔ مگر امانت کے طور پر جو اس وقت تک واپس نہیں لی جا سکتی جب تک ہم اپنے اس عہد کو پورا نہ کر لیں جو ہم نے اردو کے ساتھ کیا ہے۔

حفیظِ مکرم

عزیز ملک

تقریب اس مضمون کی یہ ہے کہ اگلے روز محفلِ یاراں میں حضرت ابوالاثر حفیظؔ کے بارے میں گفتگو کے دوران مجھ سے کہا گیا کہ تم ہی ایک شخص ہو جو مدت العمر حفیظؔ کے ہمنوا اور ہمراز رہے۔ بھلا اس کے دارِ فنا سے سوئے بقا رحلت کرنے پر کس پیرایہ میں اپنے خیالات کا اظہار کرو گے۔ بعض دوستوں نے کہا ابھی یہ یقینی اور مبرم مرحلہ آیا نہیں تو اس کا تقاضہ بھی بے وقت کی راگنی ہے۔ بعض نے کہا مناسب ہوگا یہ مضمون ابھی رقم ہو جائے تاکہ حفیظ صاحب بھی اسے پڑھ کر مناسب سمجھیں تو ضروری مشوروں سے مستفید فرمائیں۔ اس طرح ان کے حسبِ دل خواہ مضمون تیار ہو جائے گا اور بوقتِ ضرورت کام آنے کے علاوہ بطورِ سند استعمال ہو سکے گا۔ نیز وہ لوگ جو منتظر ہیں کہ ان کے مرتے ہی دوسرے دن مضمون اخبار میں اشاعت کے لئے دینا ہے ان کی راہ نمائی ہو جائیگی۔

میں نے اس مطالبہ کی معقولیت کے پیشِ نظر برمحل جانا کہ یہ قرض فوری چکا کر حفیظؔ صاحب کا قصہ پاک کر دوں کیونکہ اس عاجز کی اپنی زندگی کا بھی چنداں اعتبار نہیں ہے۔ اس راہ سے نہیں کہ نصیبِ دشمناں مجھے کوئی جان لیوا مرض لاحق ہے بلکہ حادثہ یہ ہو گیا ہے کہ ملک کے اندر ان دنوں آندھیاں چل رہی ہیں، اور بے اطمینانیوں کے جھکڑ وغیرہ ہیں جن کی بدولت جھاڑ جھنکار تو کیا بڑے بڑے تن آور درخت جڑ سے اکھڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ خزاں کے ہنگام جب بادِ سموم چلتی ہے تو شاخوں کی گھنی پلکوں سے زرد پتے کھڑکھڑا کر جھڑتے ہیں اور جب بھی کوئی پتہ کسی شاخ سے گرتا ہے دھیمی آواز میں اپنے صانعِ مطلق کا پتہ دے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس سماجی پت جھڑ میں ہم بھی وہ برگِ بار ہیں جو گلشن کی رونق سے بچھڑنے پر مجبور ہیں۔ لیکن یہ فراق ہرچند وداعِ بہار سہی اپنے اندر ایک پیغام تو رکھتا ہے۔

مگر میں حفیظؔ صاحب کے بارے میں کلام کرنے سے پہلے ایک وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے آباؤ اجداد نیلوفر، بنفشہ اور اسپغول کے بیوپاری تھے۔ انہوں نے کافی کوشش کی کہ میں حکیم یا پنساری بن جاؤں

لیکن لڑکپن ہی سے میرا مزاج عاشقانہ واقع ہوا تھا۔ جوانی تک پہنچتے پہنچتے قلم کاری کی بدعادت میں مبتلا ہو کر طبیب کی جگہ ادیب بن گیا۔ گویا اپنے ہاتھوں زندگی تباہ کرنے والی علت لگالی۔ اب چونکہ میرا آبائی پیشہ نہ تھا اس لئے بڑی مشکل سے اپنا راستہ نکالا۔ بہت سارے ناصحینِ مشفق نے آکر سمجھایا لیکن میں نے خودسری کی وجہ سے ان کی قیمتی نصیحتوں پر کان ہی نہ دھرا۔ الٹا انہیں یہ شعر سنا کر ٹرخا دیا ؎

خضرِ منزل اپنا ہوں، اپنی راہ چلتا ہوں
میرے حال پر دنیا کیا سمجھ کے ہنستی ہے!

مگر اپنی راہ چلتے چلتے ایسے خم و پیچ آئے کہ نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا۔ جس طرح ڈاکخانے کے برآمدہ میں چشمہ لگا کر بیٹھنے والے پرائمری پاس بزرگ برہن کی ماری کسی ناری "دل کا حال تمام" لکھ لکھ کر منشی مشہور ہو جاتے ہیں۔ میں بھی مضمون نگار تو بن گیا البتہ بدقسمتی یہ ہوئی کہ میرے مضامین ایسے اخباروں میں شائع ہوتے رہے، جو اخبار بینوں اور خوشہ چینیوں کے ہاتھوں لگنے سے پہلے ہی تمباکو فروشوں کے یہاں روز کے روز ردی کے بھاؤ تل کر بک جاتے تھے۔ اس افسوسناک اور دل دوز مرحلے پر اکبر الٰہ آبادی کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

بوٹ، ڈاسن نے بنایا، میں نے اک مضمون لکھا
ملک میں مضمون نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

ملک میں میرے مضامین نہ پھیلنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ میری تحریروں کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لئے جن ذہین قاریوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ کم بیش پچاس برس بعد پیدا ہوں گے۔ یا اگر قبل از وقت پیدا ہو بھی گئے تو ان کو نصف صدی تک ساغرِ انتظار کھینچنا پڑے گا۔ ظاہر ہے کہ میں اس وقفے میں فٹ پاتھ پر تو کھڑا نہیں رہ سکتا لہٰذا مجھے اوٹ پٹانگ کچھ نہ کچھ لکھتے رہنا چاہیئے۔ چنانچہ میں خدائے بزرگ و برتر کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے آپ کے سامنے ذاتی محرومی کی داستان یا تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اس ساری تمہید کو محض اس خاطر اٹھا رہا ہوں کہ آپ سے ابوالاثر حفیظ کی بات کہوں۔ اور بات یہ ہوئی کہ میرا ایک مضمون شائع ہو کر حسبِ معمول انسولری بازار پہنچ گیا۔ اب ایک دن حفیظ صاحب وہاں دور تمباکو خریدنے گئے تو حسنِ اتفاق سے مجھ روسیاہ او ناکارہ قلمکار کی پریشان نگاری کا وہ مرقع تمباکو کے صدقے میں ان کے ہاتھ لگ گیا۔

واضح رہے کہ حفیظ جالندھری اوائلِ جوانی میں حقّہ کا شوق نہیں کرتے تھے بلکہ پان نوش فرمایا کرتے —

کیونکہ ان سے کسی زبان داں نے راز کی بات کہہ دی تھی کہ لکھوری کی نے اور لکھو لاپان کا جماتے بغیر نہ تو مشاعرہ پڑھنا ممکن ہے اور نہ اردو زبان ہی آتی ہے۔ یعنی آتی ہے اردو زبان آتے آتے یا پان کھاتے کھاتے۔ مگر جن دنوں حفیظ صاحب ملک جالندھر سے مستقل طور پر لاہور اٹھ آئے اور بالخصوص علامہ اقبال سے رسم و راہ اور بالعموم مولانا ظفر علی خاں سے ملاقاتوں کا آغاز ہوا تو ان بزرگوں کی تقلید میں حقہ نوشی سے شغف پیدا کر کے پان کی عادت ترک کر دی ہوتے ہوتے حقہ کا شوق اس قدر راسخ ہو گیا کہ موسم گرما میں جب آفتاب عالم تاب کی حدت اور شدت کے سبب لوگ برفاب پیتے تو حفیظ صاحب اپنا حقہ گڑگڑاتے۔ اکثر اتفاق ہوا کہ حقہ کی نے منہ سے لگی ہے اور حقہ پر چلم موجود نہیں ہے یا اگر ہوئی بھی تو آگ ندارد۔ جب احباب کو اس انہماک کا علم ہوا تو دور دور سے تحفے تحائف میں حقے آنے لگے۔ چند ہی دنوں میں پنجابی چھوڑے، گردن دراز پشاوری سوٹے، لکھنؤ کے مدارئیے۔ رنگا رنگ گڑگڑیاں۔ شکل پیچواں حیدر آبادی فرشیاں۔ روہیل کھنڈ کی کاغذی چلمیں اور رامپور کے خوشبودار خمیروں کا انبار لگ گیا۔ بقراط کہتا ہے کہ تحفے لینے دینے سے محبت میں اضافہ ہوتا ہے اور حقے تمباکو کا تحفہ تو ایسی گراں بہا جنس ہے کہ گڑگڑ کے صدقے میں تحفہ کا پیش کرنے والا دن میں کئی کئی مرتبہ یاد آتا ہے۔

ہزار کوشش کے باوجود سر رشتۂ مضمون کہاں سے کہاں جا پہنچا ہے میں عرض تو یہ کر رہا تھا کہ اس تمام میراور مضمون جس میں اب تمباکو کی خوشبو رچ بس گئی تھی حفیظ صاحب کی نظر سے گزر گیا۔ حفیظ صاحب میں دو خصوصیات ایسی ہیں جو بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ جناب حفیظ مطبوعہ کاغذوں کی پڑیوں کو حفاظت سے کھول کر ان تمام علمی عبارتوں کا بالاستیعاب مطالعہ کرتے ہیں جن میں ہلدی مرچیں اور ریوڑیاں وغیرہ بازار سے آتی ہیں۔ دوسری قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ مجمع گیروں اور سڑک حکیموں کا لیکچر سننے کے لئے ضرور کھڑے ہوتے ہیں اور دل ہی دل میں سوچتے جاتے ہیں کہ یہ سب بیماریاں جن کا ذکر لیکچر میں ہو رہا ہے بفضلہٖ مجھ کو بھی لاحق ہیں۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ ادھر مشاعرے میں ہزاروں کا اجتماع چشم براہ ہے۔ ادھر حفیظ صاحب ہیں کہ کسی مجمع گیر کے اکھاڑے کی رونق دوبالا کر رہے ہیں۔ جب تک اس کی پُر مغز اور معنی آفریں باتیں ذہن نشین نہیں کر لیتے ملنے کا نام نہیں لیتے یہ ان کا بھی خیال ہے اور بڑی حد تک اس ناچیز کا تجربہ بھی ہے کہ سڑک حکیموں سے اہل قلم کو خاصہ مواد مل جاتا ہے۔

ایک روز کا واقعہ ہے کہ وہ اپنے یار غار کھوسٹ مرحوم کے ساتھ موچی دروازہ کے باہر ایک مشہور خاندانی حکیم کے مجمع کا مزہ تماشہ دیکھ رہے تھے کہ ایکا ایکی کھوسٹ کے کان میں کوئی بات کہی اور مجمع سے نکل کر دو چار گز ادھر فٹ پاتھ پر جا کر بیٹھ گئے اور گردن اٹھا کر سوئے فلک تکنے لگے۔ چند ہی لمحوں میں راہ گیر، پناہ گیر اور فنا گیر ہر طبقے کے لوگ

ان دونوں کو گیانی دھیانی سمجھ کر گرد اگرد جمع ہو گئے۔ مزے کی بات دیکھیے کہ اب ان کی تقلید میں سب لوگ اپنا سا منہ لے کر آسمان کی جانب تکتے اور پھر حیرت زدہ ہو کر ایک دوسرے سے پوچھتے بھائی صاحب، عالم بالا میں کیا ماجرا بپا ہے جسے یہ دونوں حضرات ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے ہیں۔ لیکن کچھ ماجرا ہو تو کوئی بتائے بھی۔ اس اثنا خانزادہ حکیم صاحب کا مجمع ٹوٹ کر ادھر آن لگا۔ جب سب کی آنکھیں آسمان کو تکتے تکتے عاجز آگئیں اور نظر کچھ بھی نہ آیا تو جناب حفیظ اور کھوسٹ چپکے سے اٹھ کر روانہ ہو گئے۔ لوگ دیر تک محوِ حیرت رہے کہ فضائے محیط کی خلاؤں میں کیا شعبدہ کاری تھی جو ہمیں نظر نہیں آئی۔ حالانکہ دیدۂ بینا کو عبرت کا بہت کچھ سامان اس سڑک حکیم کی خشمگیں آنکھوں میں نظر آسکتا تھا جس کی شام بے دام نکل گئی۔

بات پھر دور نکل گئی اور بات دور نکل ہی جایا کرتی ہے۔ میں تحریر کر رہا تھا کہ جب میرا وہ مضمون (تیاکر کی پڑیا والا) حفیظ صاحب نے مطالعہ کیا تو انہیں معلوم کر کے تعجب ہوا کہ علاقہ پوٹھوہار میں جہاں اب تک محض خرکار ہی پیدا ہوتے رہے ایک خدائی خوار قلمکار نے جنم لیا ہے۔ آخر ایک روز کرنا خدا کا یہ ہوا کہ وہ کسی کام سے پنڈی آئے تو سوچا اس شخص سے مل لینے میں مضائقہ نہیں۔ کھوٹا پیسہ بد معاش بیتر اور نکما دوست سب کام کی چیزیں ہیں (داشتہ آید بکار) بھی اسی زمرہ میں آتی ہے۔ چنانچہ غریب خانے کو تلاش کرتے ہوئے پہنچ گئے۔

برنومبر کے آواخر کی ایک ابر آلود سہپہر کا واقعہ ہے۔ میں اپنے غریب خانہ کے مردانے میں اپنا وہ تاریخی دوشالا اوڑھے بیٹھا تھا جو میری شادی خانہ آبادی کی تقریبِ سعید پر مجھے سسرال سے ملا تھا اور اب کثرتِ استعمال اور مرورِ ماہ و سال کی بدولت اس میں جگہ جگہ کھڑکیاں نمودار ہو گئی تھیں۔ اتنے میں کسی نے کنڈی کھڑکائی۔ دستک پا کر باہر نکلا تو چھریرے بدن والے ایک خوش پوش کو پایا۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ انہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے (غالباً فرنگ خیال میں نوٹو دیکھا تھا) کہ انہوں نے بے تکلفانہ مسکراتے ہوئے کہا "میں ابوالاثر حفیظ جالندھری ہوں۔ اور مجھے عزیز ملک صاحب سے ملنا ہے" میں نے معانقہ کے لئے ہاتھ بڑھایا اور چہرے پر اخلاص مندانہ مسکینی بکھیرتے ہوئے دیدہ و دل فرشِ راہ کر کے بیٹھک میں لے آیا۔ یقین جانیئے مجھے اشعار بہت کم یاد رہتے ہیں کیونکہ شعر کے معاملے میں طبعِ غیر موزوں رکھتا ہوں تاہم حافظہ پر زور دے کر مرزا غالب کا ایک مصرعہ دہرایا۔

ع   کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

ننگے پاؤں بھاگم بھاگ اندر گیا اور بیگم سے کہا چائے تیار کرو، حفیظ صاحب جالندھری آئے ہیں۔ بیگم

نے کہا کوئی صاحب اگر جالندھر سے آئے ہیں تو ان سے پوچھنا وہاں گڑ کا کیا بھاؤ ہے۔ میں نے بمشکل ٹالا کہ بھلی
ں اس وقت گزارش کی بات نہ کرو۔ چینی کی چائے بنا کر جلدی بھجوا اور خود سراپا نیاز بن کر حفیظ صاحب کی خدمت
ں حاضر ہوا اور سگریٹ پیش کیا۔ انہوں نے کش لگاتے ہوئے پوچھا " تعجب ہے یار تم ادیب ہو کر حقہ نہیں
پیتے۔ میں نے سرد آہ بھرتے ہوئے عرض کیا معضور مدتوں حقہ ہی گڑگڑایا ہے۔ مگر ایک حادثہ ایسا پیش آیا جس
ے باعث اب حقہ کشی خوابِ شبِ پارینہ ہو گئی ہے۔ اس کا مجھے قلق بھی ہے آپ کبھی میرا فرشی حقہ دیکھیں
ے حد خوش ہوں گے۔ یہ حقہ ایک بزرگ نے جو رشتہ میں میرے چچا ہوتے تھے، دلی دربار کے ایام میں کباڑی
ے خریدا تھا۔ مدت العمر اس سے جدائی گوارا نہ کی فرمایا کرتے حقہ انسان کے لئے رفیقِ حیات کا کام دیتا ہے۔

خود چچا مرحوم کو تنفس، نزلہ، مزمن، سرفہ کہنہ اور دمہ کا عارضہ تھا۔ شاید اسی لئے حقہ کے دلدادہ تھے کیونکہ اس
ے بغیر اخراجِ بلغم میں سہولت کا کوئی اور طریقہ ابھی تک طبابت کی ایجاد میں نہیں آیا۔ مرض الموت میں چچا نے ایک
ز مجھے بلوایا اور بڑی حسرت کے ساتھ فرمایا۔ برخوردار ہمارے خاندان میں تم ہی ایک محقق ہو۔ ورنہ دو، تین پشتوں
ے اپنے خانوادہ میں علم و ادب سے شغف رکھنے والا کوئی جاندار تولد نہیں ہوا۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنا حقہ تمہاری
ر کروں۔ میں نے عقیدت مندی کے ساتھ اپنی سعادت سمجھتے ہوئے آثارِ قدیمہ کی اس یادگار کو قبول کیا اور
ھاتی سے لگا کر روانہ ہوا چلتے چلتے چچا مرحوم نے کہا ایک بات خاص اس حقہ کے وصف میں تم کو بتانا ضروری
ہے کہ گزشتہ ربع صدی سے میں نے اس کا پانی نہیں بدلا ہے اور اب یہ حقہ عمرِ حق کی اس منزل میں ہے
ر اس کے پانی میں اکسیر کا اثر اور مشک کی خوشبو پیدا ہو گئی ہے اور نسیم خلد کی وزو مگر جو تبار رہا۔ اکثر و
بیشتر ایسا ہوا ہے کہ تمباکو گھر میں موجود نہیں اور بازار سے بھی ڈھب کا خمیرہ دستیاب نہیں ہو رہا۔ تو میں بغیر
لکہ جیسوں چلم میں سلفہ جمائے بغیر محض انگا رکھ کر دھواں اڑانے لگتا اور ہجر میں وصال کے مزے لیا کرتا۔
حفیظ صاحب خدا پر یقین رکھئے۔ میں نے جو تجربہ کیا تو بزرگوارِ خلد آشیانی کی بات سچ نکلی۔ خدا تعالیٰ سے
عا ہے کہ اگلے جہان میں چچا مرحوم کو اس حقہ کا نعم البدل عطا ہو۔ جنہوں نے مجھ ایسے ننگِ اسلاف ناکارہ بھتیجے
کو اس گراں بہا امانت کا وارث گردانا۔ میں نے اس تاریخی حقہ کو جان سے زیادہ عزیز رکھا کیونکہ اس میں وہ
مقدس پانی مقید تھا جس سے میرا گھر بار معطر رہتا اور وقت بے وقت خوشبوؤں کے لپٹے اور کستوری کے بھبکے اٹھا
کرتے۔ لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے ؎

گر بنا تا نہ دن جدائی کا
کیا بگڑتا تری خدائی کا

ہوا یہ کہ ایک روز میں بناسپتی گھی کی تلاش میں گھر سے باہر تھا چند مہمان خواتین تشریف لائیں۔ ایک ان میں معتبر بی جمن بلا کی دخان کش تھیں۔ حقّہ کی زیارت کر کے کھلکھلا ہی تو گئیں اور لگے ہاتھوں اس کو تازہ دم کرنے کا اقدام کر بیٹھیں۔ بیگم کو اس وقت پتہ چلا جب فرشی میں ارت دھارے کی جگہ نلکے کا بے حقیقت پانی بھرا جا چکا تھا۔ تبلہ کیا عرض کروں۔ کچھ یارائے سخن نہیں۔

کہہ گئے العراق یارانے
رہ گئے ناتمام افسانے

اب بھی وہ حادثہ یاد آتا ہے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ تب سے حقّہ خاک پیتا۔ ناچار سگریٹ پھونکتا اور سرد آہیں بھرتا ہوں۔ غالباً آپ ہی کا شعر ہے۔ ؎

محبت سرد سرد آہیں محبت گرم گرم آنسو
الٰہی ساری دنیا کو یہی آزار ہو جائے

میری تقریر اس منطقی نتیجے تک بمشکل پہنچی پائی تھی کہ لڑکا چائے لے کر آ گیا۔ ایک طشتری میں برفی اور لڈو لگے تھے۔ میں نے چائے کا پیالہ بھر کر ادب کے ساتھ سامنے رکھا اور طشتری بڑھائی تاکہ حفیظ صاحب بدست خود برفی وغیرہ اٹھالیں۔ چنانچہ انہوں نے برفی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر انگلیوں کے دباؤ سے توڑنے کی کوشش کی مگر بری طرح ناکام رہے۔ لڈو کی سمت متوجہ ہوئے تو وہ بھی سخت جان نکلا۔ اس پر قہقہہ لگاتے ہوئے فرمایا معلوم ہوتا ہے پنڈی میں "بھی" خاصی مضبوط اور پائیدار مٹھائی بنتی ہے اسے دیکھ کر مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ تم سن کر خوش ہو گے۔

میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ فرمانے لگے "بہت زمانہ ہوا میرے پاس قصور کی شیخ برادری کے دو صاحب تشریف لائے اور درخواست کی فلاں تاریخ کو ہماری انجمن اسلامیہ کا جلسہ ہونے والا ہے۔ آپ شرکت فرمائیں اور اسلامی نظمیں سنا کر چندہ وصول کرائیں۔ میں نے وعدہ کر لیا اور مقررہ تاریخ پر روانگی سے پہلے اطلاع بھی کر دی کہ فلاں گاڑی سے آ رہا ہوں۔ سو دو لوگ وقت مل رہے تھے جب گاڑی قصور اسٹیشن پر رکی میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہاں کم و بیش پورا شہر میرے استقبال کی خاطر امڈ آیا تھا۔ پھولوں کے ہاروں

سے لاد کر مجھے ایک چھکڑے پر کھڑا کر کے میرے کسی تصور کے بغیر میرا جلوس نکال دیا اور ریلوے سٹیشن سے بخیر و عافیت پنڈال تک لائے۔ وہاں پہنچتے ہی جلسہ شروع ہو گیا۔ اس دوران کچھ کھایا نہ پیا۔ سٹیج کے قریب میں نے جوتے نکالے اور قرینے کے ساتھ ایک طرف سجا دیئے۔ جلسہ کی کارروائی شروع ہو گئی۔ نعت خوانی اور تلاوت کے بعد سیکرٹری نے انجمن کے بارے میں سالانہ رپورٹ پڑھ کر سنائی اور پھر اعلان کیا کہ انجمن کی مالی حالت چونکہ سقیم ہے اس لئے اب حفیظ صاحب جالندھری آپ کو نظمیں سنائیں گے۔ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے حفیظ صاحب نے فرمایا کہ بھائی عزیز تملک اک زمانے تک مالی زبوں حالی کے اس دور میں میرے خیالاتِ عالی اس نمائش کی انجمنوں کے مال پانی کا موثر ذریعہ سمجھے جاتے تھے۔ بلاشبہ کروڑوں روپے جمع کر کے میں نے ان اصحاب کے حوالے کئے جن کے مکانوں کی لوحِ جبیں پر ہذا من فضلِ ربی لکھا ہوا پاتے ہو۔ الغرض میں نے معصوم عوام سے چندہ اکٹھا کرایا اور اپنی اسلامی نظمیں سنائیں۔ پھر التحیات بیٹھ کر دوسرے مقررین کرا کے مواعیدِ حسنہ سے پورا ہونے کے لئے اختتامِ جلسہ تک سٹیج پر بیٹھا رہا۔ خدا خدا کر کے نصف شب کے وقت جلسہ ختم ہوا۔ لیکن اصل قصہ اس کے بعد شروع ہوتا ہے۔ پنڈال اور سٹیج پر سے لوگ مصافحہ اور معانقہ کر کے یکے بعد دیگرے رخصت ہو گئے۔ مگر میں اپنی جگہ پر قائم رہا۔ زمین جنبد نہ جنبد (الخ) اس انتظار میں کہ شیوخِ قصور یعنی منتظمین جلسہ ابھی مجھے یہاں سے جائے قیام تک لے جانے کا بندوبست کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ کوئی ذی روح میرے علاوہ وہاں باقی نہ رہا۔ دل نے کہا یا اللہ "تخنے جو لگ گئے تھے کن رے کہاں گئے" ناچار سٹیج سے اترا۔ اب دیکھتا ہوں کہ جوتا غائب ہے۔ چنانچہ پاپوش کے بغیر پاؤں پاؤں چلتا پنڈال سے باہر آ گیا ؎

سر سہلاتا شہرِ سخن سے باہر نکلا ہوں

زور پہ ہے مشقِ طفلانہ اب معلوم ہوا

سڑک پر جو کامکان تھا کچھ دور ایک حلوائی کی دکان میں چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ وہ خود تھڑے پر بیٹھا کڑاہی کھرچنے میں مصروف تھا۔ میں نے اسے السلام علیکم کہا تو معلوم ہوا کوئی خوردنی جنس اس کے پاس اس وقت موجود نہیں ہے البتہ دو عدد پیڑے ایک تھالی میں دھرے تھے۔ وہی خرید کئے اور ___ اور کیا بتاؤں وہ جنس پائیدار کس کی صنعت کا بلند پایہ شاہکار تھی۔ اگر دن کا وقت ہوتا تو میں لکڑ بازار جا کر ان کی قاشیں بنواتا اور یہ نغمہ سناتا کہ من قاش فروشِ دلِ صد پارۂ خویشم۔ آخر پنج سیری کے بٹے سے توڑا اور دانتوں سے خوب چبا چبا کر گھونٹ گھونٹ پانی کے ساتھ حلق سے نیچے اتارنے کی کوشش کی۔ اس دوران حلوائی کبھی مجھے دیکھتا اور کبھی کڑاہی کھرچنے میں لگ جاتا

آخر رہا نہ گیا تو پوچھا "کیا آج آپ ہی جلسے میں گا رہے تھے؟" میں نے اقبالِ جرم کیا۔ پھر اس نے میرے ننگے پاؤں پر نگاہیں گاڑ دیں۔ پیشتر اس سے کہ وہ کچھ پوچھتا، میں نے اس کے خیالات کی رو بدلنے کے لئے منتظمین جلسہ کے بارے میں سوال کر دیا۔ اس نے کہا کہ ٹھکانہ تو ان کا معلوم نہیں البتہ عطر پھلیل کا بقچہ اٹھائے کبھی کبھی یہاں سے گزرا کرتے ہیں۔ رات چونکہ کافی بھیگ گئی تھی، وہاں سے روانہ ہو کر ریلوے اسٹیشن کے مسافر خانہ کا رخ کیا اور بقیہ رات اکڑوں بیٹھ کر گزاری۔ اجالا ہوا تو پلیٹ فارم پر گاڑی کے انتظار میں ٹہلنے لگا۔ دو آدمی پاس سے گزرے، ایک نے دوسرے سے کہا "خدا بخشا یہ وہی بابو ہے جس کا کل جلوس نکلا تھا، آج ننگے پاؤں چہل قدمی کر رہا ہے۔" قصہ مختصر یہ کہ پنڈی کی برفی اور لڈو دیکھ کر مجھے "سرِ ما خشپرِ قصور" یاد آ گیا۔

یہ باتیں سنتے سناتے کافی وقفہ ہو گیا تو میں نے عرض کیا حضور خدا کے لئے باتوں میں لگ کر چائے ٹھنڈی نہ کریں۔ اب حفیظ صاحب نے چائے کی چسکی لی تو کچھ سوچ کر چپ ہو گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ بے دلی سے پی رہے ہیں حالانکہ میں نے انتہائی عقیدت اور محبت سے بنوائی تھی۔ پوچھنے لگے یہ چائے کس طرح تیار کی گئی۔ میں نے کہا ہمارے یہاں چائے کی پتی کو پانی میں خوب ابالتے ہیں، جب رنگ نکل آتا ہے تو دودھ اور چینی ملا کر دوبارہ جوشاتے ہیں تا کہ چائے کی پوری مستی مرکب میں تحلیل ہو جائے۔ یہ کیمیاوی ترکیب میرے ابا جی مرحوم کے ایک دوست نے بتائی تھی جو افسر مسکوٹ کا ہیڈ خانساماں تھا۔ اس وقت سے ہمارا اسی ترکیب پر عمل رہا ہے۔ حفیظ صاحب اس نسخہ کو سن کر عش عش کر اٹھے اور کہا سبحان اللہ لائقِ صد تحسین وہ خانساماں رہا ہوگا جس نے اپنا پیشہ ورانہ راز اگل دیا کیونکہ اس ترکیب سے چائے میں پھٹکڑی کا مزہ پیدا ہو جاتا ہے اور خواص پھٹکڑی سے متعلق ایک مستقل کتاب بھی میری نظر سے گزری ہے۔ جس میں ایسے ایسے شافی نسخے فاضل مصنف نے تنہا پھٹکڑی کے نام سے منسوب کر دیئے ہیں کہ گمان ہوتا ہے جس طرح ؎

ساری خدائی ایک طرف
جورو کا بھائی ایک طرف

اسی طرح مجرد پھٹکڑی کی بدولت بہت سے عطائی طبیب بھی ہر مہلک مرض کا کامیاب علاج کرنے پر قادر ہو سکتے ہیں لیکن میں تمہاری معلومات کے لئے ایک شریفانہ ترکیب چائے بنانے کی بتاتا ہوں۔ ذہن میں رکھنا کبھی کام آئے گی۔ اور وہ یہ ہے کہ پہلے پانی کو اوٹائیں جب پانی ابل کر پھول پڑیں تب چائے دانی میں پتی ڈال کر پانی انڈیل دیں۔ کچھ دیر کے بعد چمچے سے چلا کر پیالے میں ڈالیں اور شکر دودھ ملائیں۔

میں نے نسخہ کا شکریہ ادا کیا اور انہیں بتایا کہ میرے اوقات کچھ ایسے تلخ ہیں کہ میں سرِدست یہ تکلفات کرنے سے قاصر ہوں۔ ہاں جب دن پھریں گے اس وقت دیکھا جائے گا۔ ابھی تو صرف راتوں میں کچھ کچھ تبدیلی کے آثار نمودار ہوئے ہیں یعنی ؎

ابرِ رحمت گھرے ہوئے ہیں
کچھ رات کے دن پھرے ہوئے ہیں

حفیظ صاحب میری اور اپنی نان سٹاپ گفتگو سے بہت متاثر ہوئے۔ رخصت ہونے سے پہلے فرمایا۔ عزیزِ من لذتِ گفتار ہی وقت گزاری کا بہترین مشغلہ ہے۔ کسی ہم خیال دوست کا ملنا قحط الرجال کے زمانے جب محال ہو جاتا ہے۔ انسان کس سے اپنا حال کہے اور اس کا دکھڑا سنے۔ میں نے تمہارا مضمون پڑھ کر ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ تم ڈھب کے آدمی ہو۔ ویسے بھی علاقہ پوٹھوہار کا کوئی باشندہ میرا یار زیل نہیں ہے۔ مجھے تمہاری دوستی سے بڑی تقویت ہو گی۔ لاہور آنا ہو تو ضرور ملنا۔ نہ آ سکو تو خط و کتابت کے ذریعے کار و بارِ الفت سے ہمیشہ یاد کرتے رہنا۔ اپنے کمالِ قلم کو نکھارنے کے لیے فلمی رسالوں کا مطالعہ جاری رکھنا۔

شاہد احمد دہلوی

محمد طفیل

شاہد احمد دہلوی اس دنیا میں موجود نہیں۔ اس لئے ان پر مضمون لکھنے کا مزا کیا؟ دوستانہ چہلیں، زندوں ہی کے ساتھ بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ مذہب بھی یہ کہتا ہے کہ مرنے والوں کو اچھے نام سے یاد کرو۔ اس اعتبار سے میں سمجھتا ہوں کہ شاہد صاحب نے مر کر میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔

ارے یہ کون چلا آرہا ہے۔ شاہد صاحب معلوم ہوتے ہیں۔ وہی سانولا رنگ، وہی قدرے چپٹی ناک، وہی آنکھوں پر عینک، وہی سر پر ٹوپی، وہی شیروانی، وہی متوازن قد، وہی چال!

نہیں یہ وہ تو نہیں، مگر کچھ پھبن ویسی ہی تھی۔ ناک نقشہ ویسا تھا۔ طنزیہ مسکراہٹ انہی جیسی تھی۔ وہی ہوتے تو کیا ہی اچھا ہوتا۔

زندگی میں ہزاروں لوگ ملتے ہیں۔ مگر ایسے کم ملتے ہیں جن کی ہم عزت کرتے ہیں۔ شاہد صاحب ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔

زمانہ ۱۹۴۶ء کا ہے۔ بمبئی زبان میں دو اشخاص کے درمیان گفتگو ہو رہی ہے۔ کون کون ہیں یہ، مجھے کچھ معلوم نہیں۔ البتہ یہ یاد ہے کہ میں صرف گفتگو کے سحر کی بنا پر ایک کونے میں کھڑا ہو کر باتیں سننے لگ گیا تھا۔ عجیب و منی باتیں تھیں۔

۱۹۴۸ء میں وہی صاحب مجھے لاہور کے ایک ہوٹل میں ملے کسی نے تعارف کرایا: "یہ شاہد احمد دہلوی ہیں"۔ مجھے فوراً جامع مسجد دلی کے سامنے والی دکان یاد آگئی جس میں یہ حضرت بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ رسالہ 'ساقی' کے مدیر اُس وقت کے بڑے معروف آدمی تھے۔

اتفاق کی بات کہ جس ہوٹل میں جا کر ہم بیٹھا کرتے تھے۔ اُسی میں شاہد صاحب بھی باقاعدگی سے آنے لگے۔ تعلقات صرف سلام دعا تک رہے۔

کچھ عرصے کے بعد، شاہد صاحب پھر اُس ہوٹل میں نظر نہ آنے ۔میں نے ان کے ساتھی سے؛ جو ویسی ہی شیروانی پہنتے تھے پوچھا: "شاہد صاحب نظر نہیں آتے؟"

جواب ملا: "کراچی چلے گئے ہیں۔ اب وہیں سے پرچہ نکالیں گے۔ کیونکہ پنجاب گورنمنٹ نے مسلسل آٹھ ماہ کی جدوجہد کے بعد بھی، انہیں یہاں سے پرچہ نکالنے کی اجازت نہیں دی۔"

۱۹۵۰ء میں، مجھے بھی سُرخاب کا پر لگ گیا۔ یعنی نقوش کی ادارت میرے حصے میں آئی۔ میں نے بھی اُنہیں اپنا رسالہ بھیجا۔ رسید کے طور پر جواب کا خط ملا تھا۔ اس میں انہوں نے کچھ مبالغے ہی کے ساتھ، رسالے کی تعریف کی تھی۔ ہمعصر جب کسی کے لئے کلمۂ خیر کہتا ہے تو اسے کم اہمیت والی بات نہ جانیے۔ کسی کی تعریف کرنے کے لئے شرافت، دیانت اور حوصلہ چاہیئے۔ اس اعتبار سے شاہد صاحب اُونچے انسان تھے۔

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ انہوں نے میری کوئی فرمائش رد کی ہو۔ میں نے انہیں جب بھی پکارا۔ اُنہوں نے ہمیشہ لبیک کہا۔ جتنے مضمون شاہد صاحب کے نقوش میں چھپے ہوں گے اُتنے شاید ہی کسی دوسرے رسالے میں چھپے ہوں۔ لطیفہ یہ کہ انہوں نے اپنے ہی بعض مضمون نقوش سے ساقی میں نقل کیے

ایسے ایثار کی مثال شاذ ملے گی۔ جو اپنی صلاحیتوں کو دوسروں کے لئے مقدم اور اپنے لئے مؤخر جانتے ہوں۔ جب کہ آپ کا ج بہا کاج میں ساری ہی دنیا مُبتلا ہو۔

شاہد صاحب میرے ساتھ بڑا خلوص برتتے تھے۔ بڑی محبت کرتے تھے مگر ایک موقع پر یہ ہوا کہ اُن کا قلم میرے خلاف حرکت میں آگیا چنانچہ وہ وہ فقرے بازی ہوئی اور وہ وہ طعن و تشنیع کے تیر برسائے گئے کہ توبہ ہی بھلی۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ میں دوسروں کو بُرا بھلا کہنے میں اُتنا ماہر نہیں۔ جتنا کہ شاہد صاحب تھے

قصہ یہ تھا کہ انتخابی پرچوں کے خلاف۔ ادبی پرچوں کے مدیرانِ کرام نے ایک جائز قسم کی مہم چلائی تھی۔ جس میں مولانا صلاح الدین احمد ایسے بزرگ بھی شامل تھے اور مجھ ایسے خورد بھی، وہ مہم یہ تھی کہ انتخابی پرچوں کے مدیران، مصنف اور مُدیر سے اجازت لئے بغیر، کسی تخلیق کو اپنے رسالے میں نقل نہ کریں۔ چونکہ ایک پرچے پر شاہد صاحب کا نام چھپتا تھا۔ اس لیے وہ میدان میں کُود پڑے۔ ہم دلیلیں دیتے تھے وہ فقرے بازی کرتے تھے ہم اصول پکارتے تھے۔ وہ ہمیں سمجھاتے تھے۔ میاں! اصول کیسا! یہ دَور جس کی لاٹھی اُس کی بھینس کا ہے۔ غرض وہ اپنی زبان دانی اور فقرے بازی کے بل بوتے پر جھوٹا مقدمہ بھی جیت گئے۔ اُن کے حصے میں "مقصد برآری" آئی۔ ہمارے حصے میں "محض اصول!"

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اتنے بھلے آدمی کا آخر یہ رُخ کیا ہے؟ تھا صاحب یہ بھی اُن کی شخصیت کا ایک رُخ، ادبی خلیفہ تو وہ تھے ہی، تھوڑی سی دریائی میں ہوا سے باتیں کرنے لگ جاتے تھے۔ ویسے بھی معرکہ آرائی کو اُن کے مزاج سے نسبت تھی بھی!

یہ باتیں وہ ہیں کہ جو مَیں نے شاہد صاحب کی زندگی میں بھی اُن سے کہی تھیں۔ میرے نزدیک کسی کا اس دُنیا میں ہونا یا نہ ہونا، صداقتوں کے اظہار کے سلسلے میں روک نہیں بن سکتا۔ شاہد صاحب کے ایسے جتنے بھی معرکے ہوئے۔ وہ ہم "بے زبان" پنجابیوں کے ساتھ، مگر آخر میں وہ اس داغ کو دھو گئے۔ جوش ملیح آبادی کے خلاف نمبر نکال ڈالا۔

یہ طنطنہ ان کا یونہی تو نہ تھا۔ کسی بنیاد پر استوار تھا۔ ۱۹۳۵ء میں رائٹرز گلڈ بنا تو یہ اس کے کرتا دھرتا، ۱۹۳۶ء میں سجاد ظہیر اور اختر حسین رائے پوری کے اشتراک سے انجمن ترقی پسند مصنفین کی دہلی میں شاخ قائم ہوئی تو یہ اس کے سیکرٹری، ۱۹۴۲ء میں کرشن چندر اور واتسین کے ساتھ مل کر، دلی کی ہارڈنگ لائبریری میں آل انڈیا رائٹرز کانفرنس کا انعقاد ہوا تو وہ ان کی توجہ سے ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ ادب میں تجدید کا غلغلہ بلند ہوا تو شاہد صاحب پیش پیش، جو شخص اس حد تک ادبی چودھری ہو۔ وہ کسی کی سُنتے بھی کیوں؟ یہی وجہ تھی کہ وہ اس کے حق دار تھے کہ جدھر سے بھی گذریں۔ لوگ یہی کہیں با ادب با ملاحظہ ہوشیار! پرکھ کا وقت آیا تو بھی ان کے قدم پیچھے نہ ہٹے۔ عصمت چغتائی کی "چوٹیں" اور سعادت حسن منٹو کا "دھواں" شائع کرنے پر لاہور میں مقدمہ چلا۔ دہلی سے تیرہ مرتبہ لاہور آنا پڑا وہ بھی پورے ثبات کے ساتھ، مگر ان کے ماتھے پر تیوری نہ تھی۔ ہٹ کے پکے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ شوربے کو چپاتی چوس نہ سکی۔

۲۲ مئی ۱۹۰۶ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں والدہ کا انتقال ہو گیا۔ والد نے ان کی دیکھ بھال کے لئے یورپین گورنس رکھی۔ جس کی وجہ سے ان کی بنیادی انگریزی اچھی ہو گئی اور یہ بھی کہ اس زبان سے لگاؤ پیدا ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ قلم اُٹھاتے تھے اور انگریزی مضامین کا ترجمہ کر ڈالتے تھے۔ ترجمہ کرنا خالہ جی کا گھر نہیں۔ بڑے بڑے مار کھا گئے۔ مگر انہوں نے درجنوں ہی کتابوں کا ترجمہ کر ڈالا۔ وہ بھی اصل کی روح کو سمجھ کر، اپنی دل نشین اُردو میں، ترجموں میں یا تو عنایت اللہ دہلوی کا لطف آیا یا پھر ان کا، باقیوں نے تو وقت گزارنے کے لئے ترجمے کیے مگر مولوی مدن والی بات پیدا نہ ہوئی۔ یا اگر کسی نے

اچھا ترجمہ کیا بھی، تو وہ بھی ایک آدھ کتاب کا جیسے مولوی ظفر علی خاں نے، عبدالمجید سالک نے ڈاکٹر
سین نے پطرس بخاری نے، یہاں بحث معیار اور مقدار دونوں سے ہے۔

ہاں تو ذکر ان کے بچپن اور ان کی تعلیم کا ہو رہا تھا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم حیدرآباد دکن میں
پھر علی گڑھ میں، میٹرک عربک اسکول دلّی سے کیا۔ لاہور کے ایف سی کالج سے ایف۔ ایس سی کیا۔
مِشن کالج سے بی اے آنرز کی ڈگری لی۔

شاہد صاحب کے بہنوئی، ڈاکٹر اجمل حسین صاحب کنگ ایڈورڈ کالج (لاہور) میں پروفیسر
ان کی خواہش تھی کہ شاہد میاں ڈاکٹر بنیں۔ تھوڑا عرصہ پڑھا بھی، چونکہ یہ بنیادی طور پر بے حد رقیق
تھے۔ اس لئے مُردوں کی چیر پھاڑ سے بھاگے۔ بھاگے بھی ایسے کہ دلّی جا کر دم لیا۔

جن دنوں یہ دہلی کے مشن کالج سے ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے درپے تھے۔ انہی د
انہوں نے اپنا رسالہ "ساقی" جاری کیا۔ غالباً سنہ ۱۹۳۰ء میں، جب سے آخری دم تک، ادب کے سا
اپنا رشتہ نباہا۔ نہ صرف نباہا بلکہ حق ادا کیا۔

رسالہ نکالنے کا تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ "مالی خدائی مار"۔ چنانچہ جیسے جیسے ساقی لوگوں کی
میں جڑ پکڑتا گیا۔ توں توں جمع جتھا ختم ہوتا چلا گیا۔ ایک دن شاہد صاحب کے ماموں (جن کے پاس
کے مالی امور تھے) سید اشتیاق حسین چشتی نے بتایا۔ برخوردار تم نے باوا جان کی اتنی دولت، ا
تک برباد کر دی ہے سنبھل جاؤ۔ ورنہ برا کھاؤ۔

تب شاہد صاحب کے دوستوں کی کابینہ بیٹھی۔ غور و خوض ہوا۔ طے یہ پایا کہ رسالے کے ساتھ پبا
ہاؤس کا بھی کام کیا جانے۔ بڑے بڑے ادیب گھر کے تھے۔ پھر نئے اور اچھے لکھنے والوں سے شاہد
کے مراسم تھے، بلکہ جن نئے لکھنے والوں کا سکہ رواں تھا۔ اُن میں سے بیشتر کو ساقی نے اُجالا تھا
یوں کہیں جا کر رسالے کے سنبھلنے کے آثار پیدا ہوئے۔ کتابیں بھی چھپتی رہیں۔ رسالہ بھی نکلتا
اُن دنوں ترقی پسند ادب کا طوطی بول رہا تھا۔ شاہد صاحب ایسے لٹریچر کے مُربیوں میں سے
لہٰذا خوب کاروبار چمکا۔ ادیبوں کی بھی خدمت ہوئی۔ ادب کی بھی!

پاکستان بنا تو یہ صرف اپنا قلم اٹھا کر اِدھر چلے آئے تھے۔ بنی تو دال روٹی کے چکّر میں، اُسی قلم
گھساتے رہے۔ آخری دم تک، اُسی کی روٹی کھائی۔

سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے جب ادھر پبلشنگ ہاؤس کا کام نہ چلا تو انہوں نے سوچا مستحق ادیبوں کو یا اُن کے ورثا کو کتابوں کے حقوق لوٹا دیے جائیں۔ تاکہ انہیں کچھ مالی آسودگی ہو جائے اور کتابیں بھی بازار میں آجائیں۔

یہ حوصلہ بھی کسی کسی کا ہوتا ہے کہ اپنی خریدی ہوئی چیز کو کوئی یوں بغیر داموں واپس کر دے۔ اس موضوع پر کسی نے ان سے بات کی بھی تھی۔ جواب میں انہوں نے کہا تھا کہ پاکستان آکر مجھے معلوم ہوا ہے کہ غربت کیا چیز ہوتی ہے۔ میرے پاس اور تو کچھ ہے نہیں۔ یہی کتابوں کے حقوق ہیں۔ سوچا یہی ساتھوں کو واپس کر دوں۔

انہیں ادبی ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے تھے۔ جغادری ادیب کے پوتے، پھر بشیر الدین احمد کے صاحبزادے اجن کی ادبی حیثیت نہ صرف مسلّم تھی بلکہ حد درجہ وا جب التعظیم بھی! انہوں نے "واقعات دارالحکومت دہلی" ایک ایسی کتاب تین جلدوں میں، لکھ دی ہے کہ کیا کوئی اس سے بہتر لکھ سکے گا۔ یہ اکیلی کتاب ہی ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ جو بڑی لمبی زندگی پائے گی۔ دلی پر کچھ لکھنے کے لئے اس کتاب کو چھوڑ لینے والا ٹھوکر کھائے گا۔ موتی نہ رول لے گا۔

پھر اسی قسم کی ایک اور کتاب "تاریخ بیجاپور" لکھی۔ اس کا بھی حق ادا کیا۔ مگر یہ کوشش "واقعات دارالحکومت دہلی" سے بالاتر نہیں، فروتر ہے مگر اس فروتر کا بھی مرتبہ یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی کچھ کہنے والا پیدا ہوگا تو اسے لوہے کے چنے چبانے ہوں گے۔ اسی طرح کا ان کا ایک اور کارنامہ "فرامینِ سلاطین" ہے جو مغل بادشاہوں کے فرامین پر مشتمل، ایک قیمتی دستاویز ہے۔

باپ نے (ڈپٹی نذیر احمد نے) مراۃ العروس لکھی تو بیٹے نے (بشیر الدین احمد نے) بھی اُسی طرز پر "اقبال دلہن" لکھی۔ بشیر الدین جو کچھ بھی تھے اپنی جگہ بھاری پتھر تھے مگر ڈپٹی نذیر احمد تو نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ "اقبال دلہن" کو زیادہ شہرت کے پَر نہ لگے۔

بشیر الدین احمد نے اور بھی کئی کتابیں لکھیں۔ چند ایک کے نام لکھتا ہوں۔ میرا موضوع ریسرچ بگھارنا نہیں۔ اس لئے زیادہ گہرا غوطہ لگانے کا ارادہ نہیں مگر پس منظر کے طور پر کچھ عرض کرنا ہی تھا تاکہ شاہد صاحب ، پشت پر ذہانتوں اور کاوشوں کا جو بوجھ لدا ہوا تھا۔ وہ تو نظر آتا۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ بشیر الدین احمد نے اور بھی کتابیں لکھیں ایک خاص خاکے کو ذہن میں رکھ کر محض

معاشرے کی اصلاح کی خاطر ذہنوں کے جلا کی خاطر، بچوں کے لئے جو کتاب لکھی۔ اس کا نام تھا "حرزِ طفلاں"۔ جوانوں کے لئے جو کتاب لکھی۔ وہ تھی "نشاطِ عمر"، بوڑھوں کے لئے جو کچھ لکھا وہ تھا "عصائے پیری" کے نام سے!

اور ہاں یہ بات تو بھول ہی گیا کہ بشیر الدین احمد باپ کی طرح شعر بھی کہتے تھے "دیوانِ بشیر" ان کی منظومات کا مجموعہ ہے۔

اس سلسلے میں ایک لطیفہ بھی ہے۔ جب دیوانِ بشیر چھپ کر آیا تو گھر میں باتیں ہونے لگیں۔ دیوانِ بشیر آ گیا۔ دیوانِ بشیر آ گیا تو ان کی بچی نے شاہد صاحب کی بہن نے کہا "ہمارے ابا دیوانے کیوں ہونے لگے کہنے والا ہی دیوانہ ہو گا"۔

عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ شاہد احمد ڈپٹی نذیر احمد کا پوتا تھا جس نے درجنوں زندہ کتابیں لکھیں۔ جب تک اردو زندہ ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی تحریریں روشنی دیتی ہی رہیں گی۔ لوگ فیض پاتے ہی رہیں گے۔ ان کے بیٹے نے جو کچھ لکھا وہ باپ سے کمتر درجے کی تحریریں ہیں، مگر زندہ وہ بھی رہیں گی کم از کم تاریخی نوعیت کے کام، اصلاحی سلسلے کی تحریریں مار کھا جائیں تو کھا جائیں۔ پوتے نے جو کچھ لکھا۔ وہ نہ باپ کی ٹکر کا ہے اور نہ دادا کی ٹکر کا ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس دور میں، ان کی تحریروں کی قیمت پڑ رہی ہے۔

ستم کی بات یہ بھی ہے کہ شاہد صاحب پر، اس خاندان کی علم و فن والی برتری بھی ختم ہو گئی۔ شاہد صاحب کی اولاد میں مجھے تو کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو قلم تھام کے کہہ دے کہ میں ابھی زندہ ہوں۔

میں نے سنا ہے کہ شاہد صاحب موسیقی کے بھی بڑے استاد تھے۔ مجھے نہ تو اس فن کی شُد بُد اُس وقت تھی اور نہ آج ہے۔ اس لئے میں ان کے مرتبے کو نہیں جان سکتا۔ کچھ عرصہ پہلے لاہور میں فنِ موسیقی پر ایک مذاکرہ ہوا تھا۔ شاہد صاحب کو خاص طور سے کراچی سے بلایا گیا جس سہ پہر کو انہوں نے مقالہ پڑھنا تھا۔ اس کی صبح مجھ سے فرمایا۔ میں مقالہ پڑھ رہا ہوں۔ پاکستان کونسل پہنچنا۔ اُس وقت میں نے اُن کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا تھا۔ جیسے کوئی مظلوم یہ سمجھا رہا ہو۔ میری جان بخش دیجئے۔ مجھے کوئی اور سزا دے دیجئے لیکن موسیقی پر مقالہ نہ سنوایئے مگر وہ نہیں مانے تھے۔ وہاں ایک مقالہ چھوڑ کئی مقالے سننے پڑے مضمون نگار مقالہ پڑھتا تھا۔ سامعین سوالات کرتے تھے (سوالات نہیں اعتراضات)

جن کا جواب دینا پڑتا تھا، شاہد صاحب پہلے تو اعتراضات کے جوابات دیتے رہے پھر قدرے مُرخ رو ہو گئے۔ بعد میں مجھے کہا سب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اکٹھے ہو گئے تھے۔ وہ کیا جانیں موسیقی کس چڑیا کا نام ہے

ان کے اس شوق کے متعلق معلوم یہ ہوا کہ انہوں نے مذاق ہی مذاق میں گانا سیکھا تھا۔ وہ یوں کہ چند دوست بیٹھے تھے۔ ایک دم ترنگ میں آ گئے۔ انصار ناصری نے کہا میں طبلہ بجاتا ہوں۔ شاہد احمد دہلوی نے کہا میں ہارمونیم بجاتا ہوں کسی نے کہا۔ میں گاتا ہوں۔ یوں جوکی پوری ہو گئی۔ سارے گا۔ ما۔ پا۔ دا نی۔ سا شروع، تک دیا، تک دیا جا لو!

کیا معلوم تھا کہ وقتی اُبال رنگ لائے گا۔ جوں جوں مذاق بڑھتا گیا۔ یہ گوئیے بنتے چلے گئے۔ ایک وقت وہ آیا کہ لوگوں نے محسوس کیا کہ شاہد صاحب تو مذاق کی حدیں پھاند کر فنکار بن گئے ہیں۔ تب انہوں نے استاد پکڑا، جو قریب ہی مل گئے۔ چار پیسے ڈولی بر گھر، والی بات ہو گئی۔ جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی۔ وہ بھی پوری ہو گئی۔ خوب خوب ریاض ہُوئے غرض غریب گلے کی خوب شامت آئی۔

شاہد صاحب کی آواز تو اچھی نہ تھی مگر فن سے پوری طرح آگاہ تھے۔ تال سُر کے اُستاد۔ جب پاکستان میں عسرت کی زندگی گزارنی پڑی۔ تو ڈپٹی نذیر احمد کا پوتا، گویا بن گیا۔ پھر تو یہاں تک ہُوا کہ پاکستان کی نمائندگی بیرون ملک بھی جا کر کی پاکستان میوزک اکیڈیمی کے صدر جو تھے۔

موسیقی کے استاد عام طور پر گا کے فن کا مظاہرہ کر سکتے ہیں مگر وہ راگ راگنیوں کو تحریر میں نہیں لا سکتے۔ چونکہ یہ پڑھے لکھے تھے۔ اس لئے بڑے ہی دلنشین انداز میں انہوں نے فن کے بارے میں لکھا بھی، اگر کوئی صاحب ان کے موسیقی پر مضمون اکٹھا کرنا چاہیں گے تو وہ بڑی آسانی کے ساتھ ایک کتاب چھاپ سکیں گے۔ اس فن پر نہ ان کے باپ نے کتاب لکھی نہ دادا نے، بزرگوں پر فضیلت پائی بھی تو کس فن میں؟

موسیقی میں مبتلا ہونے یا اسے آمدنی کا ذریعہ بنانے کی مجبوری وہ حالات تھے۔ جن سے دوچار ہو کر انہیں پاکستان آنا پڑا۔ پاکستان کن حالات میں آنا پڑا۔ وہ بھی انہی کی زبانی سنیے، مرثیوں میں جس طرح مرثیہ انیس کا ہے۔ اُسی طرح فسادات نوحوں میں نوحہ شاہد احمد کا ہے۔ صرف چند سطریں ملاحظہ ہوں۔

" توبہ توبہ! تھو تھو! شیطان کے کان بہرے۔ اب سے

دُور دِلّی پر وہ بیتھری وقت پڑا تو خلق خدا تراہ تراہ پکار اُٹھی

وہ بڑا کھیری مچی کہ مرد، عورت، بچے، بوڑھے سب کھیرے
لکڑی کی طرح کاٹے جانے لگے انسانیت دم توڑ چکی تھی اور فتنہ و
فساد کا شیطان ننگا ہو کر ناچ رہا تھا۔ دلّی کے بازاروں میں جہاں
کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ ہُو کا عالم ہو گیا تھا۔ جہاں لچھمی بَن برساتی
تھی وہاں بھیرؤں ناچ رہا تھا۔"

شاہد صاحب میں دوسروں کی خدمت کا جذبہ بڑا وافر تھا۔ وہ ہر ملنے والے کی خدمت ہی کرنا چاہتے تھے۔ وہ سب کی بھلائی کے لئے سوچتے تھے۔ ایک دو نہیں، درجنوں ہی ملنے والوں کی زندگی سنوار دی۔ مثال کے طور پر فضل حق قریشی دلّی میونسپلٹی میں ملازم تھے۔ معمولی تنخواہ پر انہوں نے قریشی صاحب میں "ادبی جراثیم" دیکھے تو انہیں وہاں سے اُچکا۔ ساقی میں جگہ دے دی۔

تھوڑے سے عرصے بعد جب قریشی صاحب کا مذاقِ ادب سنور گیا تو ان کی مانگ بھی بڑھی۔ آغا اداشی نے انہیں "آج کل" کے لئے چاہا۔ تنخواہ کے بڑھاوے کی چھوٹ دی۔

فضل حق قریشی نے سہمتے ڈرتے، شاہد صاحب سے ذکر کیا، کہ "آغا صاحب مجھے لینا چاہتے ہیں۔ تنخواہ بھی زیادہ دینے کے لئے کہتے ہیں۔ آپ کا کیا حکم ہے؟"

شاہد صاحب نے کہا "میں تو تمہاری ترقی چاہتا تھا۔ اس لئے میونسپلٹی چھڑوائی تھی۔ شوق سے اس پیش کش کو قبول کر لو۔ مجھے خوشی ہوگی۔"

یہ تو ایک قصہ ہے اور نہ جانے ایسے کتنے قصے ہوں گے۔ آوارہ حیدرآبادی، تابش دہلوی، انصار ناصری، اخلاق احمد دہلوی، خمار دہلوی، شمس زبیری یہ سب کے سب اُنہی کے لگائے ہوئے پودے ہیں۔ انہیں شاہد صاحب پر ناز تھا۔ شاہد صاحب کو ان پر ناز تھا۔ اس ضمن میں المیہ یہ ہے کہ اپنے بچوں کے لئے کچھ نہ کیا۔ دس بچے، جن میں تین لڑکے اور سات لڑکیاں، یہ سب کے سب اُس چیز کی بھینٹ چڑھ گئے جسے اگلے وقتوں کے لوگ خودداری کہتے تھے اور آج کل کے لوگ بے وقوفی!

شاہد صاحب وضع دار اتنے تھے کہ زندگی میں جو معمول بنا لیا بس بنا لیا۔ اُس کی ایک مثال یہ بھی ہے۔

شاہد صاحب روزانہ چار پانچ بجے کے درمیان، کتب خانہ علم و ادب (دہلی) میں پہنچ کر رات کے سات آٹھ بجے تک رہا کرتے تھے۔ آندھی آئے یا طوفان، شاہد صاحب پہنچتے ضرور تھے۔ حتیٰ کہ عید بقر

عید کا بھی ناغہ نہ ہوا۔

کتب خانہ میں اور لوگ بھی آیا کرتے تھے۔ چار بجے سے پہلے کتب خانہ، کتب خانہ ہوتا تھا۔ چار بجے کے بعد "ادبی اڈا" بن جاتا تھا۔ باقاعدہ پہنچنے والوں میں انصار ناصری، فضل حق قریشی، ظفر قریشی اخلاق احمد دہلوی، صادق الخیری اور نہال سیوہاروی تھے۔

باہر سے کوئی ادیب آتا تھا تو وہ بھی شام کے وقت کتب خانہ علم و ادب میں پہنچ جایا کرتا تھا کیونکہ اُسے معلوم تھا۔ وہاں ایک ساتھ بہت سے ادیبوں سے ملاقات ہو جائے گی۔ یُوں اُس دکان پر شاہد صاحب کی وجہ سے، ہندوستان بھر کے ادیب اور شاعر اکٹھے ہوتے رہے۔ اپنی کہتے اور دوسروں کی سنتے رہے۔ دلچسپ صحبتیں تھیں وہ! ایک بار مَیں نے شاہد صاحب سے، اُنہی صحبتوں کا ذکر کیا تھا تو انہوں نے مختصراً اتنا کہا تھا ؎

"کلکتے کا جو ذکر کیا تُو نے، ہمنشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

شاہد صاحب شاعروں سے بہت بھاگتے تھے۔ مگر یہ لوگ اُس دن کی طرح آج بھی خوش مذاق لوگوں کا پیچھا کرتے ہیں۔ اپنا کہا سناتے ہیں۔ کوئی خوش دلی سے سُن لے تو، بے دلی سے سُنے تو، سنانے مصر رہتے ہیں۔ اس صورت حال سے بچنے کے لئے، شاہد صاحب نے ایک اصول نافذ کر رکھا تھا۔ اگر کوئی شاعر اپنے شعر سنانا چاہتا ہے تو وہ بے شک سنائے مگر شرط یہ ہے کہ سامعین کو ایک ایک، چائے کا کپ پلائے اور اگر کوئی شاعر اپنے شعر ترنم سے سنانا چاہتا ہے تو وہ چائے کے ساتھ کچھ کھلائے بھی، یہی وجہ تھی کہ کتب خانہ علم و ادب میں کوئی شخص، جرمانہ ادا کیے بغیر شعر نہیں سنا سکتا تھا۔

کبھی کبھی کوئی شاعر، چالاکی سے سادہ چائے منگوا کر، تحت اللفظ پڑھنا شروع کر دیتا تو شاہد صاحب کہتے "اماں یار! تحت اللفظ کیوں پڑھ رہے ہو۔ ہمیں تو بھوک لگی ہے۔ پڑھنا ہے تو ترنم سے پڑھو۔ ورنہ ہماری اشتہا میں اضافہ نہ کرو۔"

شاہد صاحب کے یوں تو کئی ادیبوں اور شاعروں سے مراسم تھے مگر دو کے ساتھ بڑی خصوصیت تھی۔ ایک مولوی عنایت اللہ دہلوی سے، دوسرے عظیم بیگ چغتائی سے!

مولوی عنایت اللہ شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ کے بیٹے تھے۔ مترجم اس بلا کے تھے کہ ہزاروں صفحات

ترجمہ کر ڈالے۔ فاضل اتنے تھے کہ چاہتے تو متعدد طبعزاد کتابیں لکھ ڈالتے، مگر انہوں نے کیے تو صرف ترجمے ہی کیے۔ وہ بھی زیادہ تر شاہد صاحب کے لئے!

عظیم بیگ چغتائی کو بھی شاہد صاحب سے بڑی محبت تھی۔ شاہد صاحب بھی ضرورت کے وقت مالی امداد سے ہاتھ نہ کھینچتے تھے۔ ایک مرتبہ عظیم بیگ بیمار ہوئے۔ شاہد صاحب کو اپنی دل بستگی کے لیے بلایا۔ ان کے پہنچتے ہی وہ اپنی بیماری بھول گئے اور شاہد صاحب کی خوشنودی کے لئے افسانے لکھوانے شروع کر دیے (کیونکہ کمزوری کی وجہ سے خود لکھنے سے معذور تھے) جس دن شاہد صاحب واپس جانے کے لئے کہتے وہ انہیں ایک اور مضمون لکھوا دینے کا لالچ دے دیتے یوں ان کی محبت اور اُن کے "لالچ" کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک پورے چغتائی نمبر کا مواد اکٹھا ہو گیا۔ چنانچہ چھپا ساقی کا "چغتائی نمبر"!

شاہد صاحب جوش صاحب کے خلاف ایک نمبر نکالنا چاہتے تھے۔ میں انہیں منع کرتا تھا مگر وہ مان نہیں رہے تھے۔ اس سلسلے میں میری ان سے خاصی لمبی چوڑی خط و کتابت ہوئی تھی۔ شاہد صاحب مجھ سے بھی جوش صاحب کے بارے میں مضمون چاہتے تھے۔ میں ان سے کہتا تھا۔ میرے مضمون لکھنے کا کیا سوال! آپ بھی جو کچھ کر رہے ہیں۔ زیادتی کر رہے ہیں۔ کیا دودھ کس نے نہیں پیا؟ لہٰذا اس مسئلے پہ "مٹی ڈالیے" مگر شاہد صاحب اس مسئلے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے تھے۔

جب شاہد صاحب کا مضمون کے سلسلے میں اصرار بڑھا تو میں نے اپنی جان چھڑانے کے لیے ان سے کہا "اگر آپ پسند کریں تو بہ سلسلہ جوش، میری اور اپنی خط و کتابت شائع کر دیں" انہوں نے حامی بھر لی۔ میں حیران ہوا۔ حیران اس لئے ہوا تھا کہ اُس خط و کتابت میں شاہد صاحب کا پہلو دبتا تھا۔ پھر میں نے سوچا، شاہد صاحب وہ فقرے اور وہ باتیں حذف کر دیں گے۔ جن میں اُن پہ حرف آتا ہوگا جب وہ نمبر چھپ گیا۔ جس میں وہ خط و کتابت بھی تھی تو میں اور حیران ہوا۔ وہ یوں کہ شاہد صاحب نے اُس میں سے کوئی فقرہ کاٹا نہ تھا۔ ساری خط و کتابت جوں کی توں چھاپی تھی۔ صاحب! یہ حوصلے اور کردار کی بات ہے جو ہر ایک کے نصیب میں نہیں۔

انتقال سے کچھ دن پہلے، انہوں نے مجھے اپنا مضمون مولانا عبدالسلام نیازی پہ بھجوایا تھا۔ توقع نہ تھی

کہ وہ میری درخواست پر، اپنی طویل علالت کی الجھن کی وجہ سے، بچھ لکھ بھی سکیں گے مگر انہوں نے لکھا۔ میں حیران! اس سے یہ اندازہ ہوا تھا کہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ مضمون پڑھا تو وہ بھی قلم گھسیٹ قسم کا نہ تھا۔ اچھا خاصا تھا۔ جواب میں میں نے لکھا تھا کہ ایک بار میں بھی مولانا نیازی کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور میری اُن سے یہ گفتگو ہوئی تھی:

"فارسی جانتے ہو؟"

"جی نہیں!"

"عربی؟"

"جی نہیں!"

"علم منطق اور معقولات و منقولات؟"

"جی نہیں۔"

"پھر یہ کیوں نہیں کہتے کہ اُمّی ہوں۔"

میرے اس خط کے تین چار روز بعد شاہد صاحب کا جواب آیا۔ مولانا نیازی کے علم و فضل کا یہی عالم تھا کہ پڑھے لکھے سے پڑھا لکھا آدمی بھی، مولانا کے سامنے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں بھی کچھ پڑھا ہوا ہوں۔ مولانا ابوالکلام آزاد ایسے آدمی بھی ان کے سامنے زبان کھولتے ہوئے ڈرتے تھے۔ میں آپ کا بڑا ممنون ہوں گا۔ اگر آپ میرے مضمون میں، اپنے یہ فقرے ایزاد کر دیں۔ خواہ اپنے نام سے، خواہ میرے نام سے، کیونکہ مولانا کی شخصیت کے سلسلے میں ان فقروں کا اضافہ ضروری ہے۔

چنانچہ میں نے اپنا نام بتائے بغیر ان کے حکم کی تعمیل کر دی تھی اپنا نام اس لئے ظاہر نہیں کیا تھا کہ مجھے اپنی سُبکی کا احساس ہوتا تھا مگر آج اپنا نام ظاہر کر دیا۔ اس لئے کہ یہ حوصلہ بھی مجھے شاہد صاحب نے دلایا ہے۔

ابھی تک اس ملک میں رائٹرز گلڈ کا وجود ہے۔ عرض کر چکا ہوں کہ اس کے بانیوں میں شاہد صاحب کا بھی نام آتا ہے۔

یاروں نے بہکایا کہ مجھے بھی رائٹرز گلڈ کا ممبر بننا چاہئیے۔ ہر چند کہ میں، اپنی طبیعت کی افتاد اور اس کی "قدرے غیر ضروری سی قناعت" کے باعث، اس امر کی ضرورت نہ سمجھتا تھا مگر ضرورتاً مجھے "ادیب بننا پڑا"۔

وجہ یہ تھی کہ رائٹرز گلڈ کے پلیٹ فارم سے اس نیازمند کے خلاف ہلبلی شروع تھی۔ نیا قضیہ انتخابی پرچوں کے خلاف مہم کا تھا۔

ممبرشپ کے لئے میرا نام، مغربی پاکستان کی مجلس عاملہ نے منظور کر کے کراچی، یعنی مرکز کو بھجوا دیا تھا۔ خدشہ تھا کہ مرکز اسے منظور نہ کرے گا۔ وجوہ ظاہر تھیں۔ پنجاب اور کراچی کا بعد، انتخابی پرچوں سے پرخاش، شاہد صاحب سے تناتنی!

چنانچہ جب میرا نام ممبرشپ کے لیے سامنے آیا تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔

اور بیانہ شور! — "ممبر بنایا جائے۔" "ممبر نہیں بنایا جائے گا۔"

دیکھتے ہی دیکھتے تقریریں شروع ہو گئیں۔ کوئی حق میں، کوئی خلاف جنہوں نے میرے خلاف ہنگامہ کیا۔ ان کے نام بھول چکا ہوں۔ جنہوں نے میرے حق میں کلمۂ خیر کہا۔ اُن میں سید وقار عظیم، قرۃ العین حیدر، قدرت اللہ شہاب اور شاہد احمد دہلوی تھے۔

'جی ہاں! شاہد احمد دہلوی! وہی شاہد احمد دہلوی، جو کچھ عرصہ پہلے میرے خلاف لکھ رہے تھے بپھرے ہوئے قلم سے!

اب میں ایسے "دشمن" کو کہاں سے ڈھونڈ کے لاؤں؟

ادبی رسائل کی حالت، ہمیشہ سے خراب رہی ہے۔ بڑے بڑے معرکے کے پرچے نکلے۔ جن میں زمانہ، مخزن، ادیب، ہمایوں، نیرنگِ خیال، ادبی دنیا اور ساقی! مگر یہ رہے مالی اعتبار سے زیر بار ہی۔ جس کے پاس جتنا سرمایہ ہوتا ہے، وہ اتنا پھونک کے بیٹھ جاتا ہے۔ نہ عوام اتنا ساتھ دیتے ہیں کہ کوئی کہ کوئی رسالہ اپنا خرچ چلا سکے اور نہ حکومت ہی اس "غلط کام" میں ہاتھ ڈالنا چاہتی ہے۔ حکومت فیملی پلاننگ پر کروڑوں روپے خرچ کر سکتی ہے مگر ادبی رسائل کے سلسلے میں، اس کے پاس کسی قسم کی پلاننگ نہیں۔

میں بڑا حیران ہوتا ہوں کہ یہ ادبی رسالوں کے مدیر پاگل ہوتے ہیں یا کیا کہ وہ جانتے بوجھتے گھاٹے کا سودا کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی جدوجہد، اپنی کاوشیں، اپنا روپیہ اور اپنا خونِ جگر یوں اُچھال دیتے ہیں کہ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو اور ہمارا یہ کرتب عوام بھی دیکھتے ہیں۔ تو اس بھی اور حکومت بھی مگر کسی کو ہمدردی پیدا نہیں ہوتی۔

ادبی رسائل کی حالتِ زار پر شاہد صاحب بہت کڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کراچی میں بیٹھ کر ایک اسکیم بنائی کہ ایک آل پاکستان ادبی رسائل کی انجمن بنائی جائے تاکہ رسائل کی حالت کو کسی طرح استوار کیا جائے۔

جلسے ہوئے ریزرولیوشن پاس ہوئے۔ بھاگ دوڑ کی۔ حکومت کی چوکھٹ پر ناک بھی رگڑی، مگر معاملہ وہی ڈھاک کے تین پات، آج تک حکومت نے ادبی رسائل کے لئے کچھ نہیں کیا۔ حالانکہ ہم لوگ وزیرِ تعلیم سے بھی ملے تھے۔ وزیرِ خزانہ سے بھی، اور اُن لوگوں سے بھی، جو غلط کار تھے مگر حکومت کے دربار میں اہمیت رکھتے تھے۔ اگر وہ لوگ کچھ کر گزرتے تو ممکن تھا کہ شاہد صاحب اتنی کس مپرسی کی حالت میں نہ مرتے کیونکہ یہ ہندوستان کے لکھ پتی تھے مگر پاکستان کے "کنگال پتی!"

انجمن کو فعّال بنانے کے لیے، شاہد صاحب نے اتنی جدوجہد کی، جس کی کوئی حد نہیں۔ آٹھ پہر چونسٹھ گھڑی اسی کی فکر۔ اس سلسلے میں شاہد صاحب نے مجھے بھی گھیرا۔ میں کنی کتراتا رہا۔ اس لئے کہ مجھے معلوم تھا کہ کچھ نہ ہوگا۔ اچھے کاموں کی توفیق کسے ہے؟ مگر شاہد صاحب کے خلوص اور اصرار کے سامنے میں نے بھی ہتھیار ڈال دیے تھے۔ کئی سال تک ہم لوگ لکھتے لکھاتے رہے۔ بھاگتے دوڑتے رہے مگر وہی ہُوا جس کا مجھے پہلے دن سے خدشہ تھا۔

ایک واقعہ سنیے!

مجھے شاہد صاحب نے لکھا: "مولانا صلاح الدین احمد کی خدمت میں حاضری دو اور انہیں انجمن کا ممبر بناؤ۔" چنانچہ پہنچا۔

"مولانا! السلام علیکم!"

"آیئے آیئے!"

"کراچی میں فلاں فلاں دوستوں نے مل کر ایک انجمن، انجمن ادبی رسائل کے نام سے بنائی ہے۔ سب دوستوں کی خواہش ہے کہ آپ بھی اس کے ممبر بنیں تاکہ انجمن زیادہ باوقار اور زیادہ مؤثر بن سکے۔"

"انجمن کا دائرہ کار کیا ہوگا؟"

"انجمن اس امر کی کوشش کرے گی کہ آج کل نیوز پرنٹ کی جو نایابی ہے اس کا تدارک کیا جائے۔ ادبی رسائل کو بھی اشتہارات ملیں اور —"

"زکیہ! — میں سمجھ گیا میں آپ کی انجمن کا ممبر نہیں بن سکتا۔"

"کیوں؟"

"اگر مجھے نیوز پرنٹ ملنے لگا، اشتہارات ملنے لگے تو مجھے مجبوراً پرچہ نکالنا پڑے گا اور مجھے پھر گھاٹا ہوگا۔ تو آپ کی انجمن کی مخالفت کروں گا تاکہ نہ ہمیں نیوز پرنٹ ملے نہ ہمیں اشتہارات ملیں اور نہ ہم تباہ ہوں۔"

مولانا کی اس گفتگو میں بیکسی کی جو لہر ہے۔ وہ ادبی رسائل کا مقدر رہے۔

شاہد صاحب خدمتِ خلق کے سلسلے میں ہر لمحہ مستعد رہتے تھے۔ وقت ضائع کرتے تھے۔ روپیہ تھا ہیں ورنہ وہ بھی لٹاتے۔ انجمن ادبی رسائل کے لئے انہوں نے بڑا کام کیا، مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ رائٹرز گلڈ کے بھی مخلص گزاروں میں تھے مگر سنا ہے کہ جب شاہد صاحب کا انتقال ہوا تو رائٹرز گلڈ کے ممبران میں سے کوئی بھی جنازے میں شریک نہ تھا۔ یہ حشر ہوا شاہد صاحب کی اُن کارگزاریوں کا جس میں تنہا ان کی ذات کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اگر حکومت پھر سے تو قوم احسان فراموش، حکومت فیملی پلاننگ میں لگی ہوئی ہے اور قوم ایک دوسرے کی ٹانگ گھسیٹنے میں نہ فرصت اسے ہے نہ اُسے!

اچھا آدمی کتنا اچھا ہے اور بُرا آدمی کتنا بُرا، اس کا حال کچھ سفر میں زیادہ ہی کھلتا ہے۔ مجھے یہ سعادت بھی نصیب ہوئی کہ ہم نے اکٹھے مشرقی پاکستان کا دورہ کیا۔ ہم پانچ افراد تھے۔ شاہد احمد دہلوی، مولانا رازق الخیری، حکیم یوسف حسن، عشرت رحمانی اور یہ خاکسار!

مولانا رازق الخیری سارے سفر میں ہمیں یہی بتاتے رہے کہ میں بڑے کام کا آدمی ہوں۔ میری قدر کرو۔ حکیم یوسف حسن اپنی زندگی کے ایسے واقعات سے دل بہلاتے رہے کہ ہم میں سے بعضوں کو عمرِ رفتہ کو آواز دینے کی ضرورت پڑ گئی۔ عشرت رحمانی صاحب یہ سمجھاتے رہے کہ — تم سب بچے ہو۔ اس ٹولی کا دماغ میں ہوں

ہم میں سے ایک شاہد صاحب ایسے تھے جو اپنی کسی حیثیت پہ نازاں نہ تھے۔ جب یہ سارے ساتھی ڈِین کی لیتے تو شاہد صاحب ہلکا سا قہقہہ لگاتے۔ پھر قہقہہ لگاتے۔ پھر قہقہہ لگاتے۔

انسان کا سفر ازل سے جاری ہے۔ ابد تک جاری رہے گا۔ دنیا میں آکر ہر شخص اپنا اپنا کردار ادا کرکے نیک نامیوں اور حسرتوں کی گود میں سو جاتا ہے۔ اُن میں سے ایک شاہد صاحب بھی تھے۔ ہم اس اعتبار سے خوش قسمت ہیں کہ ہم زیادہ تر ان کی اچھائیوں سے واقف ہیں۔

مولانا صلاح الدین احمد

میرزا ادیبؔ

لاہور شہر کے درمیانی حصّے میں ایک ایسا گنجان علاقہ بھی ہے جس کا نام گمٹی بازار ہے اس علاقے میں ایک چھوٹی سی گلی واقع ہے جس کے ایک سرے پر تو راشن ڈپو ہے اور دوسرے پر چند ایسی دکانیں ہیں جن کے تھڑوں کے اُوپر امرتسر سے آئے ہوئے کاریگر صبح سے لے کر شام تک کپڑوں کی رفوگری کرتے رہتے ہیں۔ اس گلی میں اس سرے سے داخل ہوں تو چند قدم طے کرنے کے بعد ایک کھنڈر نظر آجاتا ہے، ۴۷ء سے پیشتر یہاں ایک پُرانی مگر بڑی باوقار عمارت کھڑی تھی جب فرقہ وارانہ فسادات ہونے تو چونکہ اس وقت اس علاقے میں غیر مسلم آبادی کی اکثریت تھی اس عمارت کو آگ لگادی گئی اور وہ دیواریں جو ایک نہایت شریف النفس، وضع دار اور علم دوست خاندان کی متاعِ ننگ وناموس اٹھائے کھڑی تھیں بڑھتے ہوئے شعلوں کی تاب نہ لاکر زمین پر گر پڑیں۔ اور کچھ مدت کے بعد اس عمارت کی بجائے ایک کھنڈر بن گیا اور آج تک کھنڈر دکھائی دے رہا ہے۔ لاہور کے مختلف حصّوں میں بے شمار مکانوں کو آگ لگائی گئی تھی، مگر آج وہاں عظیم الشان عمارتیں سر اٹھائے کھڑی ہیں۔ لیکن جہاں تک اس کھنڈر کا تعلق ہے۔ یہاں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ البتہ اس کے ایک حصّے کو کارپوریشن نے بچوں کا معمولی سا مکتب بنا دیا ہے، جہاں چھوٹے چھوٹے بچوں کی معصوم آوازیں گونجتی ہوئی اس بات کا احساس دلاتی رہتی ہیں کہ اس عمارت کے مالک کی علم دوستی اس کھنڈر میں بھی ایک سبزہ خود رو بن کر اپنی زندگی کا ثبوت دے رہی ہے۔

میں جب بھی اس کھنڈر کے پاس سے گزرتا ہوں تو مجھے اس کے اندر ایک ایسا چراغ جلتا نظر آتا ہے جس کی لو ہر لمحہ روشنی کا ایک سیلاب اُگلتی رہتی ہے اور اس انداز سے اُگلتی رہتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے اس میں کبھی کمی واقع نہیں ہوگی۔ یہ سیلاب یونہی اُمنڈتا رہا ہے۔ اور مستقبل میں بھی یونہی امنڈتا رہے گا

مولانا تاجور نجیب آبادی مرحوم نے جب ماہنامہ ادبی دنیا کا اجرا کیا تو ادبی حلقوں میں اس کی دھوم مچ

گئی۔ اردو میں اس سے پیشتر اس آن بان شان کا کوئی ادبی رسالہ شائع نہیں ہوتا تھا۔ ایک تو اس کا سائز بڑا، کتابت و طباعت اعلیٰ درجے کی اور پھر اس کے قلمی معاونین میں وہ لوگ شامل تھے جنہیں ہندوستان گیر شہرت حاصل ہو چکی تھی۔

مولانا تاجور کو اردو ادب سے عشق تھا۔ جب بھی انہوں نے اپنے کوئی ادبی رسالہ نکالا۔ آمدنی کے تمام ذرائع اس کے لئے وقف کر دیئے "ادبی دنیا" کے لئے بھی آپ نے یہی کچھ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اور رسالہ ہم قدم نہ رہ سکے۔ باہمی رفاقت کے لئے جس چیز کی ضرورت تھی وہ مولانا کے پاس تھی نہیں اور پرچے کو بند کرنا بھی وہ نہیں چاہتے تھے۔ اس کش مکش نے آخر انہیں مجبور کر دیا کہ ادبی دنیا کو کسی ایسے ادارے کے حوالے کر دیں جو اس کی زندگی کی ضمانت دے سکے اور اس کا ادبی معیار بھی برقرار رکھے چنانچہ انہوں نے اسے ایک ادارے کے سپرد کر دیا۔

مولانا تاجور سے الگ ہو کر ادبی دنیا کا جو شمارہ نکلا اس کے ایڈیٹر منصور علی خان تھے۔ یہ صاحب ہمایوں سے وابستہ رہ چکے تھے اور اونچے پایہ کے مترجم سمجھے جاتے تھے۔

اُس زمانے میں مَیں صرف یہ بات جانتا تھا کہ صلاح الدین احمد صاحب ادبی دنیا کے مالک ہیں اور ایک ایسی ایجنسی کے ناظم ہیں جس کا کام اشتہارات فراہم کرنا اور انہیں تقسیم کرنا ہے۔ اس کے علاوہ میں ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔

ادبی دُنیا نے اُردو ادب بالخصوص اُردو افسانے کی نہایت اہم خدمات انجام دیں اور پھر ایک دن سنا کہ منصور خان صاحب تپ دق میں مبتلا ہو کر انتقال فرما گئے ہیں۔

میرا اندازہ یہ تھا کہ اب ادبی دنیا بند ہو جائے گا اور اگر شائع بھی ہو گا تو محض ایک رسم پوری کرنے کے لئے۔ اور مجھے ذاتی طور پر اس کا بہت افسوس تھا۔

ادبی دنیا نے اشاعت کے تسلسل کو جاری رکھا۔ نہ صرف جاری رکھا بلکہ اپنے ادبی معیار میں بھی مطلق کوئی فرق نہ آنے دیا اور میرے لئے حیرت کی بات یہ تھی کہ منصور صاحب کی بجائے اب صلاح الدین احمد اس کے ایڈیٹر تھے۔

صلاح الدین احمد سے میرے ذہنی رابطے کی یہ پہلی منزل تھی!

ادبی دنیا کا مطالعہ کرتا تھا اور شوق تھا کہ یہ صاحب جن کا نام صلاح الدین احمد ہے اور جو ادبی دنیا کی

حیاتِ نو کے ذمہ دار ہیں۔ اب تک پردہ گمان میں کیوں رہے ہیں ان کی تحریروں میں بڑی شگفتگی اور شگفتگی سے زیادہ پختگی ہے۔ ان کی تحریریں پڑھ کر تو احساس ہوتا ہے کہ یہ مدّتِ مدید سے لکھ رہے ہیں اور ادارتی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا بڑا تجربہ اور سلیقہ رکھتے ہیں اور اسی زمانے میں ایک واقعہ ایسا ہوا کہ میرے دل میں مولانا کی عزت و تکریم دوگنی ہو گئی۔

گفتگو ہو رہی تھی راجندر سنگھ بیدی کے کسی افسانے کے متعلق اور اس گفتگو میں شامل تھے۔ ایک تو خود صاحب افسانہ، دوسرے کرشن چندر اور تیسرے اوپیندر ناتھ اشک تینوں اردو کے ممتاز افسانہ نگار ایک افسانے کے پیچ وخم پر گفتگو کر رہے تھے ان کی گفتگو کافی دیر تک جاری رہی اور آخر فیصلہ یہ ہوا کہ نزاعی معاملے میں مولانا سے رائے پوچھی جائے گی اور اس پر ساری بحث ختم ہو گئی۔

مولانا کون! صلاح الدین احمد! تینوں افسانہ نگاران کی رائے کے سامنے سرِتسلیم خم کر رہے تھے۔

اگر مجھ سے گذشتہ ربع صدی کے خاص الخاص اُردو افسانہ نگاروں کے بارے میں بات چیت کی جائے تو میں کئی افسانہ نگاروں کے نام گنوا دوں گا مگر جہاں تک اُردو افسانے پر تنقید کا تعلق ہے میرے ذہن میں صرف ایک ہی نام آتا ہے اور وہ نام ہے صلاح الدین احمد!

مولانا نے اپنی ساری زندگی میں ایک افسانہ بھی نہیں لکھا لیکن انھوں نے اپنی زندگی میں سینکڑوں افسانوں کی نوک پلک درست کر کے انھیں وہ کچھ بنا دیا جو وہ آج نظر آ رہے ہیں۔

آج کرشن چندر، اوپیندر ناتھ، اشک، ہنس، آغا، عصمت چغتائی۔ راجندر سنگھ بیدی کے نام اُردو کے چوٹی کے افسانہ نگاروں میں لئے جاتے ہیں اس میں شک نہیں کہ ان افسانہ نگاروں میں تخلیقی صلاحیتیں بھرپور انداز میں موجود تھیں۔ لیکن ان صلاحیتوں کو چمکانے، اُبھارنے اور ان سے پورا پورا کام لینے میں جو تاریخی رول مولانا نے ادا کیا ہے وہ کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا۔

جن لوگوں نے مولانا کو اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے دیکھا ہے اور اس وقت دیکھا ہے جب ان کا قلم کسی افسانے کے سنوارنے میں مصروف ہے وہ لازماً اس امر کا اعتراف کریں گے کہ مولانا پیشِ نظر تحریر کا ایک ایک لفظ پڑھتے تھے اور ان کا قلم ایک ایک سطر کے اردگرد سُرخ روشنائی کے نقش و نگار بناتا چلا جاتا تھا یہ جگر کاری، یہ دیدہ ریزی وہی شخص کر سکتا ہے جسے کسی فن سے حقیقی محبت ہو اور جسے اس فن کے خالق سے گہرا اور ناقابلِ شکست رابطہ قائم ہو۔ مولانا کو اردو افسانے سے عشق تھا اور افسانہ نگاروں

سے اتنی محبت کہ اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

شمس آغا حقیقتاً مولانا کی دریافت تھی، شمس آغا اردو کا جواں مرگ افسانہ نگار، ادبی دنیا کا وہ جگنو جو چند لمحوں کے لئے فضاؤں میں چمکا اور پھر نہ جانے کن پراسرار اندھیروں میں غائب ہو گیا۔

یہ شمس آغا جب اچانک روپوش ہو گیا تو مولانا نے اس کے بارے میں لکھا "کیا شمس آغا تم لوٹ کر نہیں آؤ گے؟ اس چھوٹے سے سادہ فقرے میں کتنا کرب بھر دیا گیا ہے اس کا اندازہ ایک دردمند دل ہی کر سکتا ہے۔

مولانا نے ایک طرف تو طبع زاد افسانوں کی ہر طرح ہمت افزائی کی اور دوسری طرف التزاماً دنیا کے کلاسیکی افسانوں کو اردو میں منتقل کرانا شروع کر دیا اس کارروائی کی غرض و غایت یہ تھی کہ ہمارے نوخیز افسانہ نگاروں کو دوسری زبانوں کے بلند پایہ افسانوں کے مطالعے کا موقعہ ملتا رہے اور انہیں معلوم ہوتا رہے کہ ایک اچھے افسانے میں چند انفرادی خصوصیات کے علاوہ بنیادی خوبی کیا ہوتی ہے۔ اس باب میں ان کی سنجیدگی کا یہ عالم تھا کہ اگر انہیں کبھی کوئی غیر مطبوعہ افسانہ نہیں مل سکتا تھا۔ تو کوئی مطبوعہ افسانہ ہی پرچے میں شامل کر لیتے تھے۔

اپنے پرچے میں شریک اشاعت افسانوں پر جس انداز سے وہ اپنی رائے سپرد قلم کرتے تھے اس کی حدود بعض اوقات مبالغے کی سطح کو چھو لیتی تھیں۔ مگر اس سے افسانہ نگار کی ایسی ہمت افزائی ہوتی تھی کہ وہ کچھ مدت ہی میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتا تھا مجھے یاد ہے کہ مولانا نے دیوندر ستیارتھی کا پہلا افسانہ چھاپا تو ایسا زوردار نوٹ لکھا اور اس شرح و بسط کے ساتھ افسانے کے محاسن واضح کیے کہ افسانہ ہر ادبی حلقے میں گویا موضوعِ بحث بن گیا اور ہر اس شخص نے افسانہ پڑھا جسے افسانے سے دلچسپی تھی اور ستیارتھی اپنے پہلے افسانے ہی کے بعد ایک مشہور افسانہ نگار بن گیا۔

لاریب ستیارتھی کا افسانہ اچھا تھا۔ مگر افسانہ نگار کو ایک دم اتنی بلندی تک پہنچا دینا۔ یہ کس کے قلم کا فیض تھا؟

مجھے اپنا ایک خوشگوار تجربہ بھی یاد ہے۔

میں نے مولانا کو دو افسانے دیے۔ ایک تو تھا "دروازہ" دوسرا "زیر سنگ" دوسری ملاقات ہوئی تو مولانا کا چہرہ فرطِ مسرت سے سرخ تھا۔ فرمانے لگے۔

"میرزا صاحب! یہ افسانہ زیر سنگ آپ کی طبع زاد تخلیق ہے کیا؟"

عرض کیا جی ہاں"

کہنے لگے "معاف کیجئے یہ افسانہ اتنا خوب صورت اور اس قدر مکمل ہے کہ اسے طبعزاد کہتے ہوئے ہچکچاہٹ ہوتی ہے"

اور مولانا نے جب یہ افسانہ ادبی دنیا میں "دلِ ناتواں" کے عنوان سے شائع کیا تو جو نوٹ اس کے بارے میں شائع کیا اس میں بھی اس قسم کے خیال کا اظہار کیا گیا تھا۔

مولانا کی سب سے بڑی کوشش یہ ہوتی تھی کہ نئے نئے لوگوں کو میدان میں لائیں۔ ان کی صلاحیتوں کو نمایاں کریں۔ چنانچہ جس شخص میں بھی کوئی تخلیقی صلاحیت بھانپ لیتے تھے۔ اُسے دنیائے ادب میں لائے بغیر چھوڑتے ہی نہیں تھے۔ اصرار کر کے اس سے لکھواتے تھے اور جو کچھ وہ لکھتا تھا گھنٹوں اس پر محنت کرتے تھے اور جب پوری طرح مطمئن ہو جاتے تھے تو وہ تحریر ایک بڑے شاندار نوٹ کے ساتھ ادبی دنیا میں شائع کر دیتے تھے۔

ہمت افزائی ان پر ختم تھی۔ کسی چیز میں کوئی نقص بھی نکال لیتے تھے تو بڑی محبت، بڑی شفقت کے ساتھ، اے حمید صاحب کا ایک خوبصورت اور مؤثر افسانہ "خزاں کا گیت" ادبِ لطیف میں شائع ہوا تھا ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ میں اور حمید صاحب دونوں ادبی دنیا کے دفتر میں پہنچ گئے۔ مولانا نے حمید صاحب کے افسانے کی بے حد تعریف کی اور تعریفی کلمات ہی کے درمیان فرمایا" حمید صاحب! ایک بڑی معمولی سی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آخر ان لڑکوں نے غریب لڑکی پر ظلم کیوں کیا تھا! میں صرف پوچھ رہا ہوں کیونکہ سمجھ نہیں سکا تھا۔ یہ افسانے کا قطعاً نقص نہیں ہے!" اس وقت تو معلوم نہیں حمید صاحب نے کیا کہا۔ باہر آ کر کہنے لگے مولانا پہلے آدمی ہیں جنہوں نے یہ غلطی پکڑی ہے واقعی یہ میرے افسانے کا نقص ہے۔

یہ بات ایک لمحہ توقف کیے بغیر کہی جا سکتی ہے کہ مولانا کو اردو ادب سے والہانہ شیفتگی تھی اپنا کاروبار اس کے لئے تباہ کر دیا، اپنا مکان بیچ دیا، اپنی آمدنی کے جتنے ذرائع تھے سب کے سب ادب کے لئے وقف کر دیے۔ رسالے کی قیمت اس قدر کم رکھی کہ اسے ایک مثال بنا دیا صرف رسالے ہی کی نہیں قیمت کے اعتبار سے اپنے ادارے کی مطبوعات کو بھی اسی سطح پر لے آئے اردو ادب کی خاطر مولانا نے ایثار کی صحیح سپرٹ سے کام لیا تھا اور جتنی قربانی بھی کر سکتے تھے۔ وہ اُنہوں نے اس کے لئے کی اور آخر تک کرتے رہے۔

وہ اس کھنڈر کو دوبارہ شاندار عمارت میں تبدیل کرسکتے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنی جائیداد سے جو کچھ حاصل کیا وہ ادبی دنیا اور "اردو فاؤنڈیشن" کی مطبوعات پر صرف کر دیا اور یہ کھنڈر ــ کھنڈر ہی رہا!
اقبال نے جس بے باکی و حق گوئی کو آئین جواں مرداں کہا ہے مولانا اس کے لئے مثالی نمونہ تھے۔ سچی بات کہنے میں انہوں نے کبھی کسی مصلحت کا خیال نہیں کیا انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں صدر مملکت کی موجودگی میں انہوں نے جس بیباکانہ انداز سے اُردو کی وکالت کی، وہ صرف انہی کا حق تھا۔
اور پھر جب لاہور سے ایک معروف ادبی ادارے نے کتابوں پر انعامات دینے کا فیصلہ کیا اور اس کے لئے منصف مقرر کیے گئے تو مولانا نے ہی انکشاف کیا کہ منصفوں کے تقرر میں اس روایتی اندھے کا کردار ادا کیا گیا ہے جو ریوڑیاں مڑ مڑ اپنوں ہی میں بانٹتا ہے بلکہ اس ادارے کے ڈائرکٹر صاحب بھی منصف بن گئے ہیں۔

مولانا کا یہ اقدام بڑا جراٴت مندانہ تھا اور اس کا نتیجہ وہی ہوا جو عام طور پر ہوا کرتا ہے۔ بعض دوستوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ قناعت اور ایثار کے دعویدار میں نے بہت سے لوگ دیکھے ہیں مگر صحیح معنی میں۔ یہ دونوں چیزیں میں نے جہیں دیکھی ہیں تو وہ صرف مولانا کی ذات تھی۔ قناعت کی یہ صورت کہ ایک ادارے کے لئے صبح کے دو گھنٹے ترجمے کا کام کرتے تھے جس سے انہیں روزانہ دس روپے مل جاتے تھے کہتے تھے میری ذات کے لئے بس یہ رقم کافی ہے باقی سارا وقت اردو کے لئے وقف تھا اور ایثار کا یہ عالم تھا کہ اپنے ادارے سے بیسیوں کتابیں شائع کیں مگر اپنے مضامین کا ایک بھی مجموعہ نہ چھاپا اور نہ کبھی احباب کے انتہائی اصرار کے باوجود ادھر توجہ کی!
جس زمانے میں فرقہ وارانہ فسادات پورے زوروں پر تھے مولانا اپنے خاندان کے ساتھ اپنے گمٹی بازار والے آبائی مکان ہی میں تھے اور ان کا مکان چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہ تھا جب پانی سر سے گذرنے لگا تو سب کچھ چھوڑ کر اپنے بال بچوں کے ساتھ گمٹی بازار کے قریب محلہ ستھاں میں اپنے ایک پرانے دوست کے ہاں آ گئے۔
ایک دن اس مکان کی چھت پر میں ان کے پاس کھڑا تھا اچانک گمٹی بازار کی طرف سے شعلے بلند ہونے لگے۔ ہم دونوں نے بیک وقت ان شعلوں کو دیکھا۔ میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا، لگتا تھا مولانا ہی کے مکان کو آگ لگادی گئی ہے۔ مولانا نے بھی اندازہ لگایا تھا کہ ان کی عمر بھر کی کمائی ان کی

آنکھوں کے سامنے تباہ و برباد ہو رہی ہے۔

میں نے نگاہیں پھیر لیں۔ مولانا اِدھر دیکھتے رہے اور پھر بولے۔

" ظالموں نے میری کتابیں جلا ڈالیں "

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔

اس خاموشی میں میں اِدھر دیکھتا رہا، وہ بھی اُدھر دیکھتے رہے اور شعلے بلند سے بلند تر ہوتے چلے گئے۔

ایک لمحے کے لئے مجھے محسوس ہوا کہ ان کے مکان سے جتنا دھواں نکل رہا ہے مولانا کے چہرے کو چھوتا ہوا چلا جا رہا ہے مگر دوسرے ہی لمحے ان کے چہرے سے دھوئیں کی ساری سیاہی یک قلم ختم ہوئی۔ اپنے اس کھنکتے ہوئے لہجے میں بولے جو ان کے ساتھ مخصوص تھا۔

" آئیے میرزا صاحب! نیچے چلیں۔ ہمارے میزبان نے چائے تیار کرا لی ہوگی!

اور ہم سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگے۔

مولانا صلاح الدین احمد کا مکان جل کر کھنڈر بن چکا تھا۔

گمٹی بازار کی ایک چھوٹی سی گلی میں سے آپ گذریں تو یہ کھنڈر آپ کو ضرور نظر آئے گا۔ آباد مکانوں کے درمیان ایک کھنڈر مگر اس کھنڈر میں یہ روشنی کیسی ہے جو سیلاب کی صورت بہے چلی آ رہی ہے۔ روشنی کہاں سے آئی ہے، یہ روشنی کیسی ہے!

کوئی مجھے بتائے یہ کیسی روشنی ہے!

پاکستانی نثر کے بنیادی رجحانات

فاروق علی

سفر نامہ، صنفی اعتبار سے خاصی پرانی چیز ہے۔ مگر آج کے سفر ناموں کو دیکھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آج کا سیاح پرانا راوی اور محض تماشائی نہیں اس کی آنکھ اور ذہن کے درمیان زندگی کا رشتہ مضبوطی سے قائم ہے اور آنکھ بھی ایسی پھرتیلی اور شاطر جو ہر شوخ اور دھندلے منظر کو سمیٹتی اور محفوظ کرتی چلی جاتی ہے۔ یہی منظر جب بازگشت میں ابھرتے اور پھیلتے ہیں تو چیزیں اور جگہیں زندگی اور کائنات نئے معنی سے روشناس ہوتے چلے جاتے ہیں۔ آنکھ اور ذہن کے اندر اور باہر کی اس ہم سفری نے سفر نامہ کو کہانی اور انشائیہ دونوں سے بہت قریب کر دیا ہے۔ سفر کے مناظر میں ابھرنے والے کردار کبھی تو ایک مربوط کہانی لے کر سامنے آتے ہیں مگر اس کے نقوش دھندلے ہوتے ہیں اور کبھی یہ کردار مختلف کہانیوں کے پیچ ہتھیلیوں پر سجائے آنکھوں کے سامنے سے گزرتے اور پس منظر میں اترتے نظر آتے ہیں۔ دیکھنے والے کا تاریخی شعور اور عصری صوابدید اس میں بعض اوقات ایسی ڈرامائیت پیدا کر دیتی ہیں کہ آنکھ صدیوں اور میلوں کے فاصلے سے ایک لمحے میں گزر کر اس منظر کے کنارے جا کھڑی ہوتی ہے جو دیکھنے والے کی آنکھ میں پھیلتا اور سمٹتا ہے۔ افسانے اور ڈرامے کے ساتھ ساتھ سفر نامے کی طوالت اور کرداروں کی کثرت اسے ناول کی شباہت دیتی دکھائی دیتی ہے مگر یہ اس کا اضافی ذائقہ ہے۔ البتہ بہت سے کرداروں جگہوں اور واقعوں کے درمیان پیدا ہونے والی سیچوایشنز پر دیکھنے والے کا ذہن جو تاثرات پیدا کرتا ہے وہ منطقی ہونے کی صورت میں افسانویت اور لاابالی ہونے کی صورت میں انشائیت کی جھلک دکھاتا ہے۔ انشائیہ انشا سے الگ اپنی پہچان اور سمت تلاش کر چکا ہے۔ مگر آج کے سفر نامے میں ان دونوں کو ساتھ ساتھ دیکھا جاسکتا ہے۔ انشا پردازی میں لکھنے والے کی شخصیت اور اسلوب دونوں مل کر جادو جگاتے ہیں اور انشائیہ میں لکھنے والے کے رویے کا بے روک بہاؤ اور

انفرادی ردعمل رنگ بکھیرتے ہیں۔

دراصل انشائیہ نئی نظم اور نئے افسانے کی طرح اپنی ایک پہچان اور آواز متعین کر چکا ہے پرانے انشاء پرداز کی جگہ آج کے انشائیہ نگار نے لے لی ہے۔ انشائیہ کی بنیادی خصوصیت یہی ہے کہ وہ مقصدیت سے عاری ہے انشائیہ لکھنے والے کی ذہنی آوارہ خرامی منزل اور زادِراہ دونوں سے بے پروا اپنے ہاتھ میں ہاتھ دیئے کر عمل میں آتی ہے مگر اس میں نکتہ آفرینی، جزرسی اور زندگی کی عام سطح سے ہٹا ہوا انفرادی شعور لازمی ہے۔ یہی تمام چیزیں مل کر انشائیہ نگار کو تیسری آنکھ عطا کرتی ہیں اور ہمیں واقعات اور چیزوں کے درمیان چھپے دھندلے رشتے انفرادی اور نئی معنویت کے ساتھ ابھرتے نظر آتے ہیں انشائیہ کو مزاح کی ذیلی شاخ یا مضمون سمجھنا صحیح نہیں۔ انشائیہ کا مزاج نہ مزاح کے مضحک پہلو کا متحمل ہے نہ مضمون کی علمی ثقالت کا۔ اس کی لطافت لکھنے والے سے اس کے ذاتی ردعمل اور تاثر کا تقاضا کرتی ہے مگر اس کا ہدف شدید جذباتیت، ایمائی انتہا یا انبساطی بے تکاپن نہیں، انشائیہ نگار اپنے خیالات و تاثرات کو دو اور دو چار کی شکل میں ترتیب نہیں دیتا اور نہ موضوع کی جیومیٹری میں پرکار کی طرح دائرہ در دائرہ چکر کاٹتا ہے بلکہ عام مروجہ پگڈنڈیوں کو چھوڑ کر رابن ہڈ کی طرح اپنے خیال تجربہ اور شعور کی لچکی شاخیں مقامات بین السطور کے منظر میں شامل ہو جاتا ہے۔ رابن ہڈ کی بے لوثی اور لاابالی پن اس کے مزاج کا خاصہ ہے جو اس کے اندرونی شعور سے از خود پھوٹتا اور چھپتا دکھائی دیتا ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ اپنی لاابالیت کے باوصف انشائیہ کی ذہنی سطح، طنز و تحریف، مزاح و ظرافت، تبلیغ و تدریس سے قطعاً مختلف ہے یہاں جذبہ و تاثر، کسی شدید ردعمل کی دیوار سے سر پھوڑنے کی بجائے تحمل اور اعتدال کی سانس لیتے دکھائی دیتے ہیں۔ خیالات کی تجسیم و تشکیل کو انشائیہ کی آوارہ خرامی اور لاابالیت گاڑھی لکیروں سے بچاتی اور ثقالت کے جلتے رنگوں سے نکال کر اندرونی شعور کے ہلکے رنگوں میں ڈبو دیتی ہے یہی ہلکے رنگ تیسری آنکھ کی گرفت میں آ کر ذہن و نظر کے لئے نیا ذائقہ فراہم کرتے ہیں۔ اس سارے عمل میں لکھنے والے کے رویئے کی بڑی اہمیت ہے۔ موضوع کے لئے اس کے ذہنی رویئے کی اور اظہار کے لئے اس کے اسلوبی رویئے کی۔ یہی رویہ انشائیہ نگار کی پہچان بن کر سامنے آتا ہے۔ رویہ کا عمل ردِعمل تک پہنچتے پہنچتے پہچان کو اُجال کر سامنے لے آتا ہے۔ انشائیہ میں لکھنے والے کی معاشرتی آنکھ کا باریک بین ہونا بہت ضروری ہے یہی ربط انشائیہ کو آج کے ادب کی اصناف میں بڑی اہمیت عطا کرتا ہے۔ آج قاری اسی ربط کے حوالے

سے انشائیہ کے بہت قریب ہے مگر اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ نئے افسانے کے برعکس اس کا انحصار علائم سے زیادہ تمثیلوں پر ہے۔ یہی تمثیلیں انشائیہ کے مزاج کو لاابالی ہونے کے باوجود نیم شعوری سطح پر آجاتی اور جاذب نظر بناتی چلی جاتی ہیں۔ ہمارا ابتدائی افسانہ جب پرانی داستانوں کے حاتم بادگرد کے طلسم سے آزاد ہو کر اپنے سراپا میں ڈھلا تو اُس کی فضا زندگی کے بیرونی مسائل کی دھوپ سے جگمگائی۔ اس دور کے افسانے میں واشگاف حقیقت نگاری اور کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر محوِ خرام رہے۔ مگر جلد ہی افسانے کے پیٹرن اور اس کی فضا میں جمود اور ٹھہراؤ کا احساس ہونے لگا۔ اسی احساس نے افسانے میں نئی سمتوں کی تلاش کی اور کہانی نے بیرونی ماحول کے تضادات کو چھوڑ کر فرد کے اندر کی کہانی کو اپنا موضوع بنا لیا۔ روایت کی دلدل میں لت پت افسانے نے اپنے آپ کو سمیٹ کر اپنے تن کی مٹی چھڑائی اور بیرونی مسائل کی دنیا میں سانس لینے والے کردار کا ہاتھ پکڑ کر کشاں کشاں اس تہ خانے تک لے آیا جس کی سیڑھیاں اترنے کے بعد اسے اپنے اندر کا آدمی دکھائی دیا۔ یہی آدمی کردار کی پہچان کا دوسرا روپ ٹھہرا۔ اب افسانے کے لئے ضروری نہیں رہا کہ اس کا ایک باقاعدہ پلاٹ ہو اور کہانی پلاٹ کے گرد گھوم گھوم کر کرداروں پر طاری ہو۔ آج کہانی ایک کردار پر بیتے ہوئے ایک پل کی کہانی ہے جو اُسی کے اندر اور باہر گھومتی ہے اس میں کوئی کہانی نہ ہوتے ہوئے بھی ایک کہانی بیان ہوتی ہے۔ ایک لمحے کا عرفان اور ردعمل کردار کے اندر کی ٹوٹ پھوٹ اور تعمیر و تخلیق کی تہیں کھولتا ہے یہ تضاد و تطبیق کی کہانی ہے ان دونوں کے درمیان کا نقطہ آویزش کا ہے۔ یہی نقطہ آج کے افسانے کا پلاٹ ہے۔ اسی پلاٹ کے گرد کہانی، کردار اور اُس کے اندر کے آدمی یا پرچھائیں کے متوازی چلتی ہے اس میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کردار سیدھی سمت میں اور پرچھائیں الٹی سمت میں چلتی ہے اور کہانی دونوں کے درمیان ایستادہ دونوں کے قدم باہم گنتی ہے۔ آویزش کی یہ کہانی شعور اور لاشعور، محسوسات اور موجودات، اندر اور باہر، زندگی کے باطن اور خارج کی کہانی ہے۔ جس کے ایک سرے پر فرد کے اپنے اندر کی پہچان ہے اور دوسرے سرے پر کائنات کی پہچان۔ اس کی تہ داری فرد اور کائنات کی ہے اور نہیں ہے سے مخصوص ہے اس سفر میں فرد کی تلاش، یافت و بازیافت، ہونا اور نہ ہونا کہانی کا موضوع بن گیا اور اب آخر میں بہت سی قابلِ تسلیم۔ بیچارگیوں نے بے معنویت کو اپنا لیا۔

آج کا افسانہ علامت سے شروع ہوا لیکن علامت خود ہزارہا سال پہلے کی کہانی کا ایک روپ رہی ہے۔

ستے افسانے میں اس کی باز گشت چہار سمتی ہے ۔ نیا افسانہ نگار چومکھی لڑتا ہے ۔ کہا جا سکتا ہے کہ آج کے افسانہ نگار کی ذمہ داریاں پہلے کے افسانہ نگار سے کہیں زیادہ ہیں ۔ اس میں لکھنے والے کو ایک سے زیادہ معنویتیں، حوالے اور سطحیں سنبھالنا ہوتی ہیں ۔ یہ تلوار کی دھار پر چلنے کا عمل ہے ۔ رقعہ جوڑنے کی دل لگی نہیں یا سپاٹ انداز میں واقعہ بیان کر دینا نہیں اس میں گرفت کی مضبوطی ہی اصل فن ہے ۔ باقی سب ردّیے کا عمل ہے ۔ یہ رویہ اندرونی طور پر کہانی کے خیال کی نوک پلک سنوارتا اور متحرک کرتا ہے اور بیرونی طور پر اظہار و ابلاغ کے پیٹرن قائم کرتا ہے ۔ علامت کو محض جبریت کا نتیجہ قرار دینا خیال خام ہے یہ صحیح ہے کہ جبر کی فضا میں علامت اپنی دوہری تہری سطحوں کے ساتھ لکھنے والے کا خوب بچاؤ کرتی ہے لیکن فن شاید اسی میں ہے کہ علامت کو بچاؤ کے بجائے شعور کی تقسیم اور دائرہ کی وسعتوں کے لئے استعمال کیا جائے ۔ اس قسم کے افسانے سے عام قاری بھی محظوظ ہوگا اور ذہنی بالیدگی کے عمل سے گذرتا ہوا از خود دوہری تہری معنویتوں تک رسائی پا سکے گا مگر جب بات علامت سے نکل کر تجرید تک پہنچ جائے تب افسانہ ایسے قاری کا متقاضی ہو جاتا ہے جو گہرے فنی شعور کا حامل ہو مگر خود معنویتوں کی شیشہ کاری اس میں لکھنے والے سے زیادہ فنکاری کی طالب ہوتی ہے ورنہ ذرا زاویہ بدلا اور چہرے دھندلے ہو گئے یا ٹیڑھے میڑھے ہو گئے بلکہ بعض اوقات تو بے ربطی لکھنے والے سمیت کہانی کے سیٹ کو یا پاتال سے جا لگاتی ہے یا آسمان میں معلق کر دیتی ہے اس طرح کہانی کے پیر زمین میں نہیں رہتے ۔

علامت اور تجرید الگ الگ بھی استعمال ہوتی ہیں اور ساتھ ساتھ بھی مگر دونوں رویّے میں صاف پہچانی جاتی ہیں ۔ علامت میں اشیا اور کرداروں کا مفہوم ماضی کے حوالوں سے مخصوص ہوتا ہے جو نئے ماحول اور نئے معنی سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے لیکن تجرید میں اشیا اور کردار اپنے ہی سیاق و سباق میں اپنا مفہوم تخلیق کرتے ہیں ۔ ایک کی جڑیں ماضی کی زمین میں ہیں دوسرے کی لکھنے والے کے ذہن میں ۔ علامت کی تہ داری تاریخی ہے اور تجریدیت کی شعوری ۔

پانچوں انگلیاں کبھی برابر نہیں ہوتیں ۔ ازل سے مشیت نے ہر فرد کو ایک پہچان دے کر دنیا میں بھیجا ہے مگر پانچ انگلیوں کے درمیان جو فرق و تمیز ہے وہی معاشرہ اور زندگی اور کائنات کے لئے دستور اور قانون کا معیار ہے عام پیمائش سے ذرا کوئی انگلی کم و بیش دکھائی دی اور آنکھ نے

اس کے قامت وتن کو اس پیمانے میں کھنگال کر سب کے سامنے انڈیل دیا۔ زندگی میں فرد کے قول وفعل کا تضاد، معاشرتی عدم تکمیل اور بے ڈھنگا پن، طنز ومزاح کا موضوع ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ زندگی کی تہذیب اور معاشرہ کے انضباط نے دھندلے مناظر سے روشن تصویروں میں ابھرنا شروع کر دیا۔ ہر دور کی تصویر اپنے سے پہلے اور بعد سے مختلف ومسلّم رہی ہے۔ جب کوئی فرد اپنے قول وفعل، وضع قطع اپنی معاشرتی تصویر کی قامت سے مبالغہ کی حد تک الگ ہو جاتا ہے تو آنکھ اس فرق کو سمیٹ کر احساس کی سطح پر پھیلا دیتی ہے۔ محض احساس کا نام مزاح ہے اور احساس کا محرک ہو کر اصلاح وتکمیل کی خواہش کرنا طنز ہے۔ دونوں زندگی کے لئے ناگزیر ہیں۔ لیکن مزاح کی لہر کا دائرہ اکثر محدود ہوتا ہے اور طنز کی مقصدیت اسے اجتماعی سطح پر پھیلا کر بڑا کر دیتی ہے مگر یہ فن اتنا آسان نہیں جتنا دور سے دیکھنے میں محسوس ہوتا ہے۔ لاابالی نقطۂ نظر اور بے فکرے پن سے مزاح پیدا نہیں ہوتا۔ مضحک صورت حال میں نمایاں ہونے والی آڑی ترچھی شکلوں کو مصور کرنے کے لئے گہری سنجیدگی اور تہذیب وترتیب کی ضرورت ہے ورنہ لکھنے والا ذاتیات میں ملوث ہوا اور تصویر کے رنگ اترنا شروع ہوئے۔

طنز ومزاح دونوں کے لئے ذہانت شرط ہے محض حماقت کا بیان بے ذائقہ چیز ہے یعنی زندگی کے عام معمول میں پایا جانے والا بے ڈھنگا پن آپ کے سامنے وقوع پذیر ہوا ہے تو آپ اس پر بے ساختہ ہنس لیں گے لیکن جب اسی کو لکھنے والا اپنے قلم سے آپ کے سامنے لائے گا تو آپ کے ہنسانے کو اسے ایک متحرک تصویر بنانا ہوگی کیونکہ یہ جو کہا گیا ہے کہ سوچنے اور سمجھانے میں بڑا فرق ہے اس میں کوئی شک نہیں دراصل اس کا تعلق لکھنے والے کے اپنے شعور سے بہت گہرا ہے۔ اچھے مزاح کے لئے گہری نظر کے ساتھ ساتھ دردمندی بہت ضروری ہے ورنہ بننے والی تصویریں بے جان اور پیدا ہونے والا تاثر بے سمت رہتا ہے اور مسکراہٹ اوپری سے دکھائی دیتی ہے۔ طنز ومزاح میں پہلے کا تعلق شگفتگی، زندہ دلی، شوخی سے ہے جس میں بذلہ سنجی، رعایت لفظی، تضاد، ایہام، مبالغہ، تمثیل اور لفظیاتی الٹ پھیر سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ مزاح کی عام نوع ہے جو ہمارے ابتدائی ادب کا خاصہ رہی مگر رفتہ رفتہ کرداری مزاح کو کام میں لایا گیا کہانی اور پلاٹ کی شکل میں مزاح کا نیا چہرہ ابھر کر سامنے آیا اس میں مغربی ادب کی خوشہ چینی عام تھی کہیں کہیں اکا دکا مثالیں واقعاتی مزاح کی سامنے آنے لگیں تا آنکہ پچھلی چار دہائیوں میں تینوں قسم کے مزاح کے کامیاب تجربے سامنے آئے۔

مزاح کے مقابل طنز نے زیادہ ترقی کی ابتدائی رکاکت اور فحش بیانی پھبتی اور جگت بازی کی دلدل سے نکل کر لطیف نشتریت کے سرد پانی میں تیرنے لگی۔ اصلاح و مقصدیت کی تلخی فن کی شکر میں لپیٹ کر پیش کرنے والے طنز نگار نے اپنی ذات کو تازیانہ کی زد میں لا کھڑا کیا۔ اس طرح فرد اور پورا معاشرہ طنز کی تابڑ توڑ بارشوں میں بھیگے اور طنز و مزاح کے کائناتی پس منظر سے آشنا ہوئے۔ پرانی فرسودہ تعلیات کی کائی اتری اور نئے معاشرتی شعور نے جوش ہیجان زہرناکی و تلخی کو کھرچ کر مضحک خاکوں کو اصل آب و رنگ میں ظاہر کیا۔ آج اس فن نے اتنی سیڑھیاں چڑھ لی ہیں کہ یہ تمیز کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ پیش نظر فن پارہ میں مقصود ظرافت ہے یا اظہار حقیقت گویا آئینے بدل کر فرد اور معاشرے کے مضحک نقوش ابھارنے کا یہ فن اپنی حدوں کو چھو رہا ہے۔

مراجعت

بانو قدسیہ

عزیز فاطمہ کے بیٹے زاہد اقبال نے جب بارہویں مرتبہ الٹی میٹم دیا تو عزیز فاطمہ کے ہاتھ پاؤں کنوئیں کے پانی کی طرح سرد ہو گئے۔

بیوگی کے پہاڑ سے دن عزیز فاطمہ نے تنگی ترشی میں اس امید پر کاٹے تھے کہ زاہد اقبال جب تعلیم سے فارغ ہو کر بڑے شہر سے قصبے میں لوٹ آئے گا تو ایک بار پھر زندگی کا رہٹ خوشی کا پانی کھینچنے لگے گا۔

ہوا یہ کہ زاہد اقبال نے بی اے کی ڈگری لنڈے کے کوٹ میں تہہ کر کے ڈالی اور ڈگری یافتہ ملزموں کی طرح دھرنا مار کر عین باورچی خانے کی چوکی پر بیٹھ کر ماں کو ایک بار چھوڑ بارہ بار الٹی میٹم دیا کہ وہ خودکشی کرنے لگا ہے شہر سے لوٹنے والے زاہد اقبال کے لچھن دیکھ کر پہلے ہی عزیز فاطمہ ٹھٹھکی تھی۔ ایک تو جبڑوں تک لمبی قلمیں، پھر بغیر چینی یا دودھ کے چائے ـــــ فلمی رسالے پڑھتا تو عزیز فاطمہ کو کچھ کچھ سمجھ بھی آ جاتی کیونکہ محلے بھر کے لڑکے موئی ایکٹرسوں کے عشق میں گرفتار تھے لیکن زاہد اقبال تو موٹے شیشے کی عینک لگا کر رات رات گئے تک سیروں کے حساب تلنے والی کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ تھک جاتا تو آپ ہی کافی بنا کر پی لیتا۔ لیٹتا تو دن کی دھوپ میں بھی تختے کی طرح پڑا رہتا۔

محلے کی عورتیں پہلے کچھ دن تو بدھائی دینے آتی رہیں، پر پھر عزیز فاطمہ کی خاموشی کو بھانپ کر ان کا چکر پھیرا کم ہونے لگا۔ ادھر زاہد اقبال کا تمام تر طریقہ نشست برخاست، بات چیت اس بات پر دلالت کرتا تھا کہ شہر کی کسی لونڈیا کے جال میں پھنس چکا ہے۔ اَلوانٹی کھٹوائی لیے پڑا رہتا۔ شیو بڑھی ہوتی۔ ماں گرم پانی کا ڈونگا روزانہ اسٹول پر رکھتی۔ اور جب سہ پہر ہو جاتی۔ تو بغیر کچھ کہے سنے اسے اٹھا لیتی۔

جب دو دلوں کے درمیان رشتہ تو محبت کا ہو اور گفتگو کی آمد و رفت باقی نہ رہے تو دونوں ایک

دوسرے سے سہمے سہمے اور خوف زدہ نظر آتے ہیں۔ گھر کا نقشہ ایسا ہو جاتا ہے جیسے سرد جنگ جاری ہو۔

عزیزہ فاطمہ زاہد اقبال کے لئے ایک بڑی سانولی سلونی سی لڑکی محلے میں پسند کر چکی تھی۔ اس لڑکی کو بچپن سے اس نے اپنی بہو کے روپ میں دیکھا تھا۔ اب جو اس کے بھانویں زاہد اقبال اپنا دل شہر ہی بھول آیا تھا تو وہ متذبذب پھرتی تھی کہ اپنے خوابوں کو زاہد اقبال کے خوابوں پر ترجیح دے کر سیدھے سبھاؤ بیٹے کی خواہشات کا احترام کر کے اپنی برسوں کی آرزوؤں کو ختم کر ڈالے۔

ادھر زاہد اقبال گھر میں گھستا ادھر وہ ٹرنکوں والی کوٹھری میں گھس کر پرانے سے پرانا صندوق کھول کر بیٹھ رہتی۔ جس وقت اسے پہلا الٹی میٹم ملا وہ اسی کوٹھری میں تھی اور جس روز پانچویں مرتبہ زاہد اقبال نے اپنی زندگی ختم کرنے کی دھمکی دی وہ اسی کمرے میں گھسی پرانے آزاربندوں کی پریاں درست کرنے میں مشغول تھی۔

زاہد اقبال کا چہرہ دیکھ کر اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

بائیس برس کی کمائی سامنے کھڑی تھی اور سپرنگ بورڈ کا وہ کنارہ صاف نظر آرہا تھا جہاں سے ٹینک کا پانی ایک جست بھر دور ہوا کرتا ہے۔

دونوں کے درمیان گفتگو کا دھارا کئی مہینوں سے سوکھا ہوا تھا۔ پہلے زاہد اقبال نے کھانس کر گلا صاف کیا۔ پھر بھی ماں نے سر اٹھا کر پل بھر کو بھی نہ دیکھا تو اس نے دروازے کے ساتھ کندھا لگایا۔ پٹ اس وزن سے کھسکا تو زاہد اقبال بھی پیچھے کی طرف سرکا۔ اس آواز پر بھی ماں نے کچھ نہ کہا۔ تو زاہد اقبال نے بڑی کوشش سے کہا ——

"نئے ازار بند لا دوں گا، اتنی محنت رہنے دے ماں!"

عزیزہ فاطمہ ایسی باتوں کی عادی نہ رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں سے کبھی کسی نے کام پکڑ کر یہ نہ کہا تھا کہ اب سستا لے، کون وقتوں کی کام کاج میں پھنسی ہے۔ یہ جملہ سن کر اس کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ بیوگی کی ساری اندھی محنت، تنہائی کے سارے دکھ، غریبی کی تمام محرومیاں، جد و جہد کی بے سود کوششیں نگاہوں کے سامنے گھوم گئیں ——

"کیا کرے ہیں نئے ازار بند ...... کوئی کوئی تانت نکل گئی ہے بس!"

نہ زاہد اقبال نے کوئی ایسی بات کی تھی، نہ جواب ہی کچھ ایسا دل دہلا دینے والا تھا۔ پر جب انسان کے

دل کی کیفیت پکے ہوئے پھوڑے کی سی ہو تو ہلکی سی چوٹ سے سارا بدن درد کی کان بن جاتا ہے۔ عزیز فاطمہ کے بدرنگ گالوں پر آنسو ایک جھلار کی طرح آ گرے۔ زاہد اقبال جو اس وقت کسی قیدی کی مانند بدحال سا کھڑا تھا، اور بھی بدہئیت نظر آنے لگا۔

"پھر تو کہتی ہے کہ میں تجھ سے بات نہیں کرتا ــــ بول، کیا کہوں تجھ سے۔ تجھ میں برداشت بھی ہو میری بات کی ــــ"

جلدی سے عزیز فاطمہ نے گالوں سے آنسو پونچھے۔ دراصل بیوہ کا اپنے پوت سے رشتہ عجیب سا ہوتا ہے، اس میں شوہر، باپ، دوست، پڑوسی، سب کی میت شامل ہو کر شتہ سی بن جاتی ہے۔ اسی لئے عزیز فاطمہ نے فیصلہ کیا کہ شہر کی لونڈیا ہی سہی کم از کم زاہد اقبال تو خوش ہو جائے گا۔

"شہر میں جس کسی سے وعدہ کر آیا ہے اسی سے شادی کرنے پر خوش تو رہ! ــــ تیرا سہم مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔"

ماں کی بات سن کر پہلے زاہد اقبال آہستہ آہستہ ہنستا رہا۔ پھر کھلکھلا کر ہنسا، اور پھر یوں پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگا کہ عزیز فاطمہ سہم کر جستی ٹرنک سے ڈھکنے کے پیچھے ہو گئی۔

"شادی؟ ــــ کس کی شادی؟ ــــ میری؟ ــــ اری ماں، میں مہاتما بدھ ہوں مہاتما بدھ۔

اس وقت اگر کوئی یشودھرا ہوتی بھی تو میں اسے تیاگ دیتا، تو نئی بیوی سہیڑنے کو کہہ رہی ہے، ــــ خوب سمجھی تو بھی زاہد اقبال کو، ــــ خوب سمجھی بھئی تو بھی!"

عزیز فاطمہ گو اس کی بات نہیں سمجھ پائی تھی، پر جانے کیا بات تھی آتنا شبہ ضرور دور ہو گیا تھا کہ مسئلہ شادی کا نہیں ہے ــــ

"اس عمر میں شادی نہ ہو تو الٹے سیدھے خیال دل کو ستاتے ہیں۔ ہر عمر کا اپنا میوہ ہے زاہد۔ بچے کو کھلونا ــــ مرد کو بیوی چاہیے کھیلنے کو ــــ!"

"اور بڈھے کو ماں؟" ــــ زاہد اقبال نے مسکرا کر پوچھا۔

"یادِ الٰہی ــــ!"

ماں سمجھتی تھی کہ زاہد اقبال کا موڈ ٹھیک ہو رہا ہے۔ پر یہ جملہ سنتے ہی جیسے زاہد اقبال کسی آتش بازی پر سوار سات آسمان کی طرف چل نکلا ــــ

"کس کی یاد ماں! ـــــ اللہ کی؟ ـــــ کون ہے اللہ؟ ـــــ بتا؟ ـــــ کس کو یاد کرتے مر جاتے ہیں غریب؟ ـــــ سارے تیرے اللہ نے تو پھر پیغمبروں کی نہ سنی وہ معمولی آدمی کی کب سنتا ہے!۔
مت میرے سامنے نام لیا کر اس بڑھے کھوسٹ کا، جو بنا بنا کر پھینکتا جاتا ہے انسانوں کو دنیا پہ ـــــ اور پھر نہیں پوچھتا کسی ایک کو بھی۔"

"مت بول کفر کے کلمے۔ توبہ کر ابھی ـــــ!"

"پھر کہتی ہے زاہد اقبال بولتا نہیں، گونگا ہو گیا ہے ـــــ کیا بولوں میں! برداشت کرے گی میری باتیں؟ ـــــ نہ تو کسی کی بات سن سکے نہ تیرا اللہ، ـــــ جا باہر نکل کر دیکھ ذرا ـــــ کتنا غم کھاتے ہیں روز اللہ کے بندے، ـــــ اتنا غم تیرے اللہ کو کھانا پڑے تو وہ چھوٹے سے ذرّے برابر ہو جائے گھس گھس کر، ـــــ اللہ نئے پھرتی ہے بڑا، ـــــ ظالم، بے پروا..... قہار....."

عزیز فاطمہ کو پورا الیقین ہو گیا کہ یہ لڑکا جو بے دینوں کے کالج سے تعلیم حاصل کر کے آیا ہے یقیناً اس کے دماغ کو ان کی تعلیم چڑھ گئی ہے۔ بہت لوگوں نے سمجھایا تھا کہ مشنری کالج میں تعلیم مت دلوانا۔ پر عزیز فاطمہ کو تو شوق تھا کہ بیٹا فر فر انگریزی بولے ـــــ اب وہ کس کے سامنے بیٹھ کر اپنا دکھڑا روتی!

"پاگل ہو گیا ہے زاہد اقبال ـــــ؟"

"پاگل تو بچ جاتے ہیں ماں ـــــ مرتے تو ہم جیسے ہیں۔ پاگلوں پر تو رحمت ہو جاتی ہے ابلیس کی ـــــ چھٹکارا مل جاتا ہے ـــــ اللہ کی بنائی ہوئی کائنات سے..... اندر کے زنگوں میں جینے لگتے ہیں بے چارے۔"

"بک مت ـــــ توبہ استغفار پڑھ ـــــ شکر کر اللہ کا ـــــ!"

زاہد اقبال نے زور کا قہقہہ لگایا ـــــ

"تو شکر کر اللہ کا، جس نے سترہ برس کی عمر میں تیرا شوہر چھین لیا۔ جس نے تیرے دونوں بڑے بیٹے قبروں میں جا سلائے۔ جس نے تجھے آمدنی کا کبھی منہ نہ دکھلایا، جس نے ہر رشتہ دار کو تیرے لئے بچھا ہوا اختر بنایا..... جس نے ساری عمر تیرے لئے ایک محبت کرنے والے دل کا سامان نہ کیا ـــــ تو شکر کر اللہ کا ـــــ تو ہی عقل دشمن ہے اس قدر!"

"میری قسمت میں ایسا لکھا تھا۔ اس میں کچھ بہتری تھی، مصلحت تھی بیٹا! ـــــ مسلمان شاکی

نہیں ہوتا۔۔۔"

زاہد اقبال نے بوٹ کو فرش پر رگڑ کر بڑی خطرناک سی آواز نکالی، جیسے گولی سنسناتی نکل جائے اور پھر بولا۔۔۔ "تو رہ تماشا کی۔۔۔ دوسروں کو تو مجبور نہ کر ایسی زندگی بسر کرنے پہ۔۔۔ شکر سے صبر سے مجھے کیا تعلق۔۔۔؟"

"زاہد بیٹا۔۔۔!"

"تیرے اللہ سے تو اتنا بھی نہ ہوا کہ پیارے محبوب کے بیٹے کو ہی بخش دیتا۔ پھر کہتا ہے تیرا اللہ کہ میں نے یہ دنیا ہی رسولؐ اللہ کے لئے تخلیق کی تھی۔"

"زاہد بیٹا! دراصل مشنری کالجوں میں دینیات پر زور نہیں ہوتا، بچے بے دین ہو جاتے ہیں۔ رسولؐ اللہ آفتاب کی مانند تھے۔ دو آفتاب تو نہیں ہو سکتے نا۔۔۔!"

"رہنے دے ڈھکوسلے، پہلے کیوں دیا تھا دوسرا آفتاب بیٹا۔۔۔ رہنے دے تسلی۔۔۔ حضرت عیسیٰ کی کیا درگت بنوائی۔۔۔ سولی پر چڑھا دیا۔۔۔ اور کیسے کیسے پھٹڑولوں سے محبت جناب عیسیٰ صاحب!۔۔۔ زاہد اقبال نے آسمان کی طرف دیکھ کر زور سے آواز دی۔

عزیز فاطمہ اب ہاتھ جوڑے کھڑی تھی اور منہ ہی منہ میں کہہ رہی تھی۔۔۔ "یا اللہ! یہ نادان ہے، نوجوان ہے۔۔۔ خدا قسم یہ بالکل بے گناہ معصوم ہے، اس کی دینی تعلیم میں جو خامی رہ گئی ہے اس کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ اللہ میاں جی رحیم کریم۔۔۔ یا بخش دے اسے، اس کے کفر کے کلمے بے معنی ہیں اس کی سزا مجھے دے۔۔۔ مجھے دے۔۔۔!"

یوں ماں کو ہاتھ جوڑے دیکھ کر زاہد اقبال آگے بڑھا اور ماں کے ہاتھ پکڑ کر بولا۔۔۔ "دیکھ ماں! میں تجھے قطرہ قطرہ مارنا نہیں چاہتا۔ میں تیرا اللہ نہیں ہوں جو زہر دے اور پھر اصرار کئے جائے کہ قطرہ قطرہ پینا ہوگا۔ میں ایک بار مروں گا، تو ایک بار روئے گی۔۔۔ شاید تو میری لاش دیکھ کر ایسی روئے کہ تیرا بھی انجام بخیر ہو جائے۔ لیکن میں تیرے سامنے سسک سسک کر نہیں مروں گا۔ تجھے قدم قدم پر نہیں ماروں گا، تو اپنا دل مضبوط کر ماں۔۔۔ مجھ سے موت دو ایک قدم دور ہے۔۔۔ بچھڑنے والے بیٹے کو آنسوؤں سے الوداع نہ کہہ، میری خوشی کی خاطر۔۔۔!"

عزیز فاطمہ کو جیسے سکتہ ہو گیا۔ بیٹے کے چہرے پر ایسی کوئی بات نہ تھی، جس سے اس کے ارادے

کا بطلان ہوتا ناک کی دونوں جانب دہن کے اطراف میں دو ایسی منجمد قسم کی لکیریں نظر آرہی تھیں جن سے زاہد اقبال کا مصمم ارادہ ٹپکتا تھا۔ بےچاری جان ماری کو اور تو کچھ نہ سوجھا قصبے کے ایک اونچے گھرانے کا کنڈا جا کھٹکھٹایا۔ عزیزہ فاطمہ نے ساری بپتا کسی سے اتنی بھی ادھار نہ لی تھی۔ غیرت کا یہ عالم تھا کہ پتیلا ابلتے پانی کا پاؤں پر گر گیا اور زاہد اقبال تک کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اب پہلی بار بچے کی زندگی کی بھیک مانگنے مولویوں کے گھرانے تک پہنچی، تو راستے میں ہی گھگھی بندھ گئی۔ کچھ مسئلہ بیان کرنے سے قاصر تھی۔ کچھ یہ فکر تھا کہ کہیں مولوی صاحب لادینی کا فتوٰی ہی نہ لگا دیں۔

مولوی صاحب بڑے گیانی تھے۔ قرآن کریم کی ایک تفسیر لکھ چکے تھے۔ عربی گرامر میں یکتائے زمانہ شمار ہوتے تھے۔ شکل و صورت سے بھی بڑے پاکیزہ، متشرع اور پرہیزگار نظر آتے تھے۔ عرصہ تین سال سے دن میں صرف دوپہر کو شوربے کے ساتھ ایک روٹی جَو کی تناول فرماتے تھے۔ کوئی نماز چھوڑنا تو درکنار انہیں کوئی نماز قضا پڑھے بھی کئی سال گزر چکے تھے۔ باتوں میں کانگڑی کی سی گرمی تھی۔ خوش الحان، خوش اطوار ایسے کہ ان کی صحبت میں انسان کچھ ایسا جذبۂ نیکی سے بھیگ جاتا جیسے ہری ہری گھاس صبح کے وقت میں نم ہو جاتی ہے۔

جب عزیزہ فاطمہ نے اٹک اٹک اور رو رو کر زاہد اقبال کی دماغی حالت بیان کی تو مولوی صاحب نے کمالِ شفقت سے جواب دیا ــــ "سوچنے والا ذہن جوانی میں ضرور ملحد ہوتا ہے، تم بچے کو ہماری طرف بھیج دو طبیعت راستی کی طرف مائل ہو جائے گی؟"

لیکن ہوا یہ کہ جب زاہد اقبال مولوی صاحب کے گھر سے تین گھنٹے کی بیٹھک کے بعد لوٹا تو اور بھی مرے ہوئے کتے کی طرح بےجان سا نظر آ رہا تھا۔ عزیزہ فاطمہ کا دل دھک سے رہ گیا۔

"مولوی صاحب کے گھر گئے تھے زاہد ــــ!"

"گیا تھا؟"

اب پھر دونوں کی گفتگو اٹکنے لگی ــــ

"کیا کہا تھا انہوں نے ــــ؟"

"سامنے قرآن کریم تھا۔ دائیں ہاتھ پر احادیث تھیں، بائیں بازو پر فقہ کے کتب تھے ــــ تین گھنٹے مسلسل وہ بولتے رہے اور میں سنتا رہا ــــ"

"پھر ـــــ؟"

"کل پھر بلایا ہے۔"

"بڑے نیک آدمی ہیں، تم ان کی صحبت میں بیٹھا کرو، انسان بن جاؤ گے۔"

"میں نیک انسانوں کی صحبت پر لعنت بھیجتا ہوں" ـــــ زاہد اقبال نے دانتوں کو پیس کر کہا۔

"زاہد بیٹے ـــــ کہا کہا ـــــ؟"

"جانے دو ماں، پورے تین گھنٹے اپنی علمیت بگھارتے رہے مولوی صاحب ـــــ وہ سمجھتے ہیں کہ صرف وہی پڑھنا جانتے ہیں، صرف وہی نیک ہیں، صرف وہی مسلمان ہیں۔ ماں، میں ایسے خود پسند، خود نما قسم کے لوگوں کے سائے سے بھی ڈرتا ہوں۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہڈیاں اکڑ گئیں ـــــ"

عزیز فاطمہ کا رواں رواں ٹھنڈا پڑ گیا۔ امید کی یہ کرن بھی جھلملائی اور بجھ گئی۔

اس واقعے کے تیسرے دن جب زاہد اقبال اچانک بارش آ جانے پر کھڑکی بند کرنے کے لئے اٹھا تو عین گلی میں ایک تانگہ بھیگتا ہوا نظر آیا۔ گلی کچی اور نشیب میں تھی، دس منٹ کی بارش ہوتی تو گھٹنے گھٹنے کھڑا پڑ جاتا۔ تانگے کے پہیے اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہو رہے تھے۔ ایک طرف تانگے والا اور دوسری طرف ایک تھری پیس سوٹ پہنے ادھیڑ عمر کا دبلا پتلا آدمی پہیے کو نکالنے میں مشغول تھے۔ زاہد اقبال اس اسٹیج میں پہنچ چکا تھا کہ دوسروں کی مصیبت دیکھ کر زہر خند سے آگے نہ بڑھتا۔ لیکن اس ادھیڑ عمر کے آدمی میں کچھ ایسی بات تھی کہ زاہد اقبال نے کھیس کی بکل ماری اور باہر چلا گیا۔

یہ اس کی پروفیسر اعجاز سے پہلی ملاقات تھی۔

دبلا پتلا، ٹھہری ٹھہری آواز والا مجذوب صورت پروفیسر ایک گھڑی ولی اور دوسرے لمحے بچہ نظر آتا تھا۔ بچوں کی طرح اوٹ پٹانگ قسم کی باتوں پر یقین کر لیتا۔ پھر اس کے اندر کا ولی جاگ اٹھتا اور ان سچی باتوں کی نفی کر دیتا جو برسوں سے رسم و رواج کے اعتبار سے بڑی پختہ تھیں۔ پروفیسر قصبے کے کالج میں نووارد تھا اور تانگے میں اس کا چھوٹا سا جستی ٹرنک اور دری میں بندھا ہوا بستر خوب بھیگ رہے تھے جب تانگہ گلی سے نکل گیا اور پروفیسر بھیگے ہوئے مرغے کی طرح پچھلی نشست پر ہچکولے کھاتا نظروں سے اوجھل ہو گیا، تو زاہد اقبال کے دل میں پہلی بار کسی سے ملنے کی آرزو نے جنم لیا۔ لیکن اس آرزو کو پورا کرنے میں بھی پورا ایک مہینہ لگ گیا۔

رمضان کے دن تھے۔ زاہد اقبال روزے تو نہ رکھتا تھا، لیکن ماں کے آرام کی وجہ سے صبح سحری اور شام کو افطار کھا لیتا۔ باقی سارا وقت وہ اپنے لیے کافی بنا کر پی لیتا۔ اور سگریٹیں پھونکتا رہتا۔ عزیز فاطمہ بہت زور مارتی، لیکن وہ دوپہر کے وقت اسے آگ نہ جلانے دیتا۔

روزہ کھلنے میں ابھی کوئی پون گھنٹہ باقی تھا جب وہ پروفیسر اعجاز کے گھر پہنچا۔ دو تین بچے ننگے پیر بالڑھ کے پاس کھیل رہے تھے اور پروفیسر صاحب چھوٹے سے برآمدے میں قصوری مونڈھے پر بیٹھے پنسل تراشنے میں معروف تھے۔ تھوڑی دیر رسمی گفتگو اور تعارف کی منزلیں طے ہوئیں۔ پروفیسر صاحب نے بتایا کہ ان کے تین بچے اور ایک عدد بیوی بھی آچکے ہیں اور اب تنہائی کا احساس جاتا رہا ہے۔

روزہ کھلنے سے چند منٹ پہلے ایک طشتری میں تھوڑے پکوڑے، چائے اور کھجوریں آگئیں ۔

زاہد اقبال کا دل، جو پروفیسر اعجاز سے مل کر تھوڑا سا شگفتہ ہوا تھا پھر بجھ گیا۔

"آپ روزہ رکھتے ہیں پروفیسر صاحب ؟"

"ہاں رکھتا ہوں ——— کیوں ؟"

"آپ ——— سائنس کے پروفیسر ہو کر، لڑکوں کو بوٹنی زوالوجی پڑھانے کے باوجود روزہ رکھتے ہیں ——— ؟"

پروفیسر اعجاز نے آہستہ سے آنکھ ماری اور کہا ——— "بھائی یہ جو میری گھر والی ہے نا، کم پڑھی لکھی ہے، ان کے گھر میں صوم و صلوٰۃ پر بہت پابندی تھی ———"

"اور آپ نے ان کے اصول اپنا لئے ——— کمال کر دیا یعنی ایک بند ذہن کو کھولنے کے بجائے اپنا ذہن بند کر لیا، خوب پروفیسر صاحب۔!"

پروفیسر صاحب کی آواز بڑی مدھم اور تھوڑی سی بے چین سی تھی ———

"سنو میاں، میری تنخواہ کچھ زیادہ نہیں ہے۔ مہنگائی بہت ہے۔ میں چونکہ طبعاً پروفیسر آدمی ہوں، اس لئے بہتر روزی کی تلاش میں نہیں نکل سکتا۔

میری گھر والی ہماری خدمت کرتی ہے۔ کھانا پکاتی ہے کپڑے دھوتی ہے، جھاڑو بہارو پھرتی ہے، وقت پڑنے پر چکی بھی پیس لیتی ہے۔ بھائی جس انسان نے مجھے اپنے پسندیدہ پروفیشن کو برقرار رکھنے میں اتنی مدد دی اس کی خاطر ہم اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ فاقہ کر لیا کریں ایک مہینہ بھر ——— ہیں ؟"

"یعنی آپ روزہ نہیں رکھتے، صرف بیوی کو خوش کرتے ہیں ـــ!"

پروفیسر صاحب نے زاہد اقبال کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ـــ "بھائی اتنا کیا کم ہے کہ ایک دل کو خوش کر دیتے ہیں اتنی سی بات سے ـــ!" زاہد یہ بات سُن کر چپ سا ہو گیا۔

اس کے بعد پروفیسر صاحب سے ملاقاتیں بڑھنے لگی تھیں لیکن ذہنی طور پر وہ پہلے کی طـــرح ابھی تک REVERSE GEAR میں تھا۔ پروفیسر صاحب بھی جب اُس سے بات کرتے لادینی کی کرتے، سائنس کا ذکر کرتے۔ انسان کے ارتقاء کی بات کرتے نہ وہ کبھی MORAL VALUES کے قریب آتے نہ روح کی تلاش میں نکلتے نہ کبھی خدا کو درمیان میں لاتے۔

عزیز فاطمہ کو اتنی خوشی تھی کہ چلو بیٹا کسی کسی دن گھر سے باہر نکلنے لگا۔

اس روز پروفیسر صاحب کی بیگم اندر اونچے اونچے بول رہی تھیں، بچوں کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ پروفیسر صاحب کانوں پر مفلر لپیٹے چور سے بنے بیٹھے تھے، پھر دھائیں دھائیں کچھ مارنے کچھ پھینکنے کچھ پیٹنے کی آوازیں آئیں۔

"آپ اندر جا کر منع کیوں نہیں کرتے اپنی بیگم کو ـــ؟"

"بھائی، یہ اُن کا دارالخلافہ ہے ہم کس حیثیت میں مداخلت کریں!"

"آپ نے پوچھا نہیں کہ وجہ کیا ہے ـــ؟"

"وجہ ہم جانتے ہیں، چلو اٹھو، جہاں پیسہ کم ہو اُس گھر سے ایسی ہی آوازیں آیا کرتی ہیں ـــ اس مہم سے نکل کر کہیں سیر کو چلیں!"

زاہد اقبال نے پہلی مرتبہ پروفیسر صاحب کو اس موڈ میں دیکھا تھا۔ اُن کی چال اُن کی باتیں، ان کے ہاتھ بازو، سب اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ وہ بہت پریشان ہیں۔

"بیوی بچوں کے لئے جتنا کئے جاؤ کم ہے۔ یہ ایسا دوزخ ہے کہ ایندھن کم ہی پڑتا ہے اس کے لئے ہمیشہ!"

"پھر آپ مجھے کیوں کہا کرتے ہیں کہ شادی کر لوں؟"

"جھک مار رہا تھا، بکتا تھا، گردن زدنی تھا ـــ شادی تو احمق مردوں کے لئے ہے۔ عورتیں اپنے بچوں کو پلوانے کی خاطر زر خرید رکھتی ہیں مردوں کو ـــ زنجیر پا کرتی ہیں، گدھا بناتی ہیں۔ ساری عمر روزی

کاٹتے کاٹتے آدمی کی کمر کُبڑی ہو جاتی ہے اور انعام کیا ملتا ہے، جوتے، طعنے، دلآزاریاں ۔۔۔"

"چلئے غصہ تھوک دیجئے حضرت!

اب وہ دونوں تیز رو نہر کے پُل پر تھے۔ نیچے پانی بڑی شائستگی سے بہہ رہا تھا، اور پُل کے دوسرے پار آم کے باغ میں رین بسیرا ڈھونڈنے والی چڑیلوں کے غول بڑا آفت خیز شور مچا رہے تھے۔

"غصہ تھوک دوں؟ ۔۔ کیوں؟ ۔۔ کیا میں انسان نہیں؟ ۔۔ کیا مجھے حق نہیں کہ اپنی زندگی اپنی مرضی کے مطابق بسر کروں؟ کیا مجھے حق نہیں کہ میں جب چاہوں زندہ رہوں جب بیزار ہو جاؤں مر جاؤں؟ ساری عمر کولہو کے بیل بنے رہو، اور اگر جُوا اتار پھینکو اس نجس زندگی کا تو خدا کے گناہ گار بن جاؤ ۔۔"!

پروفیسر تو مکمل طور پر بپھرے ہوئے پانیوں کی طرح جھاگ چھوڑ رہا تھا ۔۔۔

"میں اس زندگی کا بوجھ ایک لمحہ بھر نہیں اٹھا سکتا جو مجھ سے میری آزادی چھینتی ہے جو چکی صبح و شام پیستی ہے ۔۔ میں تو ایسے خدا کو بھی نہیں مانتا جو باندھ کر زندہ رکھنا چاہتا ہے ۔۔ انسان کو!"

"یہی تو میں کہا کرتا تھا آپ کو ۔۔"!

"برخوردار! نظر دوڑاؤ اردگرد، کیا دیا ہے خدا نے اپنی خدائی کو؟ ۔۔ دکھ، ۔۔ مصیبتیں، آلام، آزمائشیں! ۔۔ ارے اوپر مزے میں بیٹھا ہے اور دیکھتا نہیں چھوٹی چھوٹی زندگی میں معذور انسان کس کس طرح پستا ہے کس کس طرح ریزہ ریزہ ہوتا ہے ۔۔"!

اب وہ پل پر چڑھ چکا تھا ۔۔ اور اس پھرتی سے چڑھا تھا کہ زاہد اقبال کو اس گہری صفت کا کوٹ پکڑنے کی بمشکل مہلت ملی تھی۔

"میں پروفیسر اعجاز باسط بہ قائمیٔ ہوش و حواس کہتا ہوں کہ خدا نہیں ہے۔ اس کا اگر وجود ہوتا اور ہم سب اس کی مخلوق ہوتے تو اُسے کسی لمحے کسی گھڑی ہم پر ترس ضرور آتا ۔۔"!

اب پروفیسر پانی میں کود جانے کی پوری کوشش کرنے لگا، اور زاہد اقبال جو اپنے وقت کا بڑا صحت مند اور چھ فٹا جوان تھا پوری طاقت کے ساتھ اسے گرنے سے بچا رہا تھا۔

"تم اُن جونکوں کو مت بتانا جو برسوں سے میرا لہو چوس رہے ہیں کہ اعجاز نہر میں کود گیا۔ بدبخت میری لاش ڈھونڈنے آجائیں گے ۔۔ میں تجہیز و تکفین نہیں چاہتا۔ میں کسی انسان کا ملوث ہاتھ کسی خدا کی ملوث رحمت

کا طلب گار نہیں ہوں ۔۔۔!"

جب کافی دیر ہاتھا پائی ہوتی رہی اور بے قرار پروفیسر مچلتا رہا، تو زاہد اقبال نے اس کے گلے میں ایک مکا رسید کیا اور ڈھیلے جسم کو بڑی مصیبت سے نیچے اتارا۔ جب پروفیسر کو ہوش آیا تو ابھی تک وہ بات کرنے کے قابل نہ تھا۔

"میں معافی چاہتا ہوں پروفیسر صاحب، میں نے آپ پر ہاتھ اٹھایا ۔۔۔!"

تمہارا خیال ہے تمہاری سختی سے میرا ارادہ بدل جائے گا۔ میں آج نہ سہی کل ۔ کل نہ سہی پرسوں، بالآخر اپنی مرضی سے مروں گا ۔ کوئی طاقت مجھے روک نہیں سکتی ۔۔۔!"

اب زاہد اقبال یک دم اندر سے زندہ ہو گیا، اس نے پروفیسر کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگا ۔۔۔

"دیکھئے سر! آپ کے کندھے پر کتنی ذمہ داری ہے۔ آپ کتنی زندگیوں کے ضامن ہیں۔ چلئے آپ کی بیوی سے آپ کے ذہنی اختلافات سہی، لیکن آپ کے بچے تو آپ کی وجہ سے دنیا میں آئے، ان کی زندگی کو تو آپ یوں پس پشت نہیں ڈال سکتے۔ آپ انہیں دنیا میں لائے ہیں تو خدا کے لئے انہیں صحت مند زندگی کا ایک موقع تو دیجئے ۔۔۔ اتنی ذمہ داریاں آپ یکبارگی کیسے جھٹک سکتے ہیں!"

اب پروفیسر کی آنکھوں میں یکبارگی شعلے سے لپکنے لگے، اس نے پورے ہاتھ کا تھپڑ زاہد اقبال کے منہ پر مارا اور چلایا ۔۔۔ "او بدبخت احسان فراموش تجھ پر کوئی ذمہ داری نہیں؟ تو سمجھتا ہے کہ جس ماں نے تجھے جنا، پالا ۔۔۔ اتنا بڑا کیا ۔۔۔ وہ تیری ذمہ داری نہیں ہے؟ تجھ سے کم بختوں کی وجہ سے یہ دنیا اتنی تاریک ہے جو لیتے وقت گونگے ہوتے ہیں اور لوٹاتے وقت بہرے بن جاتے ہیں ۔ تجھ پر بیٹا جان اس دایہ کا قرض ہے جس نے تجھے اتنے سے کو جہان میں لا کر پہلی مرتبہ غسل دیا ۔۔۔ اس درزی کا اس دھوبی کا، اس کھانا پکانے والی کا ۔ تیرا لینے والا ہاتھ تو کھلا ہے چوکڑ چوپٹ، اور دینے والے ہاتھ کی مٹھی یوں بند ہے جیسے سوئی میں کوئی ناکہ بنانا بھول جائے۔"

"اس دنیا میں دکھ بہت ہیں پروفیسر صاحب! میں ان دکھوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

"دنیا کے دکھ کس نے پیدا کئے؟ ۔۔۔ تیری ذہنیت کے لوگوں نے، جو لیتے وقت حریص تھے اور لوٹاتے وقت کنجوس تھے۔ میاں! ہم کیا کہتے ہیں اتنی تعلیم ہم نے کب اور کس کو واپس کی؟ ۔۔۔ تم نے وہ محبت کس دہلیز پر رکھی ۔۔۔ جو تم کو تمہاری ماں نے دی تھی؟ ۔۔۔ جو آدمی صرف ہاتھ پھیلانا جانتا ہے اور

کچھ واپس نہیں کرتا۔ اس نے اس دنیا کی یہ شکل کر رکھی ہے۔ دیکھ لو دنیا کے دکھ میں اضافہ کرنے والوں کی فہرست کتنی لمبی ہے اور اس میں خوشی کا ایک قطرہ ڈالنے والوں کے نام کتنے ہیں؟ ــ کیا منہ دکھاؤ گے اپنے رب کو؟ ــــ زاہد اقبال! تم بھی دکھوں میں اضافہ کرنے والے ہی نکلے! ــ لعنت ہے!

"سائنس پڑھتے رہے ہو کبھی ــــ؟"

"جی!"

"کائنات کی ساری ماڈرن تھیوریاں کس چیز پر مبنی ہیں ــــ؟"

"الیکٹرون پر ــــ!"

"اور الیکٹرون کیا ہے؟ ــ کوئی سائنس داں کچھ کہتا ہے، کوئی کچھ کہتا ہے، یہی بات ہے نا ــ؟"

"جی!"

میاں ایک ذرہ بھر مفروضے پر تکیہ کر کے جس کی ہیئت نامعلوم ہے ایسے مفروضے پر تکیہ کر کے سائنس داں کل کائنات کا سفر کر رہے ہیں، تو کیا تم ایک ایسا مفروضہ اپنی روح کے آرام، اپنی سائیکی کی بقا، اپنے شعور کی جلا کے لئے نہیں کر سکتے جس کا آرام کلی طور پر تمہاری ذات کو ہوگا ــ؟

آج سے اس مفروضے پر زندگی بسر کرو کہ خدا ہے۔ تمہارے لئے اس سے زیادہ اور کسی مفروضے کی ضرورت نہ ہوگی۔"

سنتے ہیں کہ زاہد اقبال نے اس دن کے بعد پھر کبھی اپنی ماں کو الٹی میٹم نہیں دیا۔

سنا ہے پروفیسر اعجاز نے اس کے بعد بھی دوبار خودکشی کی کوشش کی۔

البتہ عزیزہ فاطمہ کے متعلق آج تک کچھ علم نہیں ہو سکا۔